

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

# افغانستان

## رُزْمَگاہِ حق و باطل

سوویت یونین کی یلغار	(۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء)
ڈاکٹر نجیب اللہ کادر	(۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۲ء)
خانہ جنگی کا دور	(۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۶ء)
طالبان کا پھلا دور	(۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء)
امریکی اتحاد کی یلغار	(۲۰۰۱ء تا ۲۰۲۱ء)
طالبان کا دوسرا دور	(۲۰۲۱ء تا ----)

ابو عکْمَال زَاهِدُ الشَّرِيكِي



[www.alsharia.org](http://www.alsharia.org)

# حکم ملی حکومت محفوظ

کتاب : افغانستان: رز مگاه حق و باطل  
تألیف : ابو عمر زاہد الرشیدی  
مرتب : ناصر الدین خان عامر  
ناشر : الشریعه اکادمی، ہائی کالونی، گوجرانوالہ  
اشاعت : ۲۰۲۳ء



## فہرست عنوانات

19.....	عرضِ مرتب.....
21.....	بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی اور افغانستان.....
21.....	ولی خان، مسٹر بھٹو، افغانستان.....
23.....	حضرت شاہ ولی اللہؒ اور افغان فرمائزا احمد شاہ ابدیؒ.....
25.....	افغان صدر محمد داؤد کا دورہ پاکستان.....
<b>27.....</b>	<b>سوویت یونین کی یلغار (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء)</b>
28.....	افغانستان میں رو سی یلغار اور بھارت کی رائے عامہ.....
28.....	مولانا مفتی محمود اور جہاد افغانستان.....
30.....	افغانستان، پولینڈ، اسرائیل.....
32.....	رو سی جاریت اور پاکستان کے انتخابات.....
33.....	تحریک آزادی اور علماء حق.....
35.....	شیخ انہند مولانا محمود حسن دیوبندی.....
39.....	ریبوت کنٹرول لڈ غلامی کا امریکی منصوبہ؟.....
42.....	جہاد افغانستان اور عالمِ اسلام.....
47.....	اقوام متحدہ کی جزیل اسمبلی کا رو سی افواج کی واپسی کا مطالبہ.....
47.....	جہاد افغانستان فیصلہ کن مرحلہ میں!.....
48.....	افغان حریت پسندوں کا جہاد آزادی: پس منظر، شرات، توقعات.....
51.....	خوست کے محاذ پر رو سی افواج کی مراجحت: دورہ افغانستان کی رو واد.....
54.....	افغان مسئلہ پر ”جنیوا معاهدہ“.....
55.....	جزل محمد ضیاء الحق شہید.....
57.....	افغان جاریت اور جنیوا معاهدہ.....
57.....	حضرت مولانا عبدالحق.....

61.....	<b>ڈاکٹر نجیب اللہ کا دور (۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۲ء)</b>
62.....	جہادِ افغانستان کو سبوتاڑ کرنے کی سازش.....
63.....	متحہ حزبِ انتلاف کا قیام اور افغان مجاہدین.....
64.....	یاسر عرفات اور جہادِ افغانستان.....
64.....	صدرِ مملکت غلام احسان خان سے معذرت کے ساتھ.....
65.....	کیا افغان مجاہدین کی جنگ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے؟.....
69.....	ائشؑ عبد اللہ عزام شہید.....
69.....	جہادِ افغانستان کے خلاف امریکی سازش.....
70.....	امریکی امرکی ناقابل قبول شرائط.....
71.....	عالمِ اسلام میں جہاد کی نئی لہر.....
72.....	مسلم سربراہ کا نفرنس: وقت کا اہم تقاضہ.....
73.....	جہادِ افغانستان اور ہمارے دینی مدارس.....
74.....	امریکہ اور عالمِ اسلام.....
75.....	جہادِ افغانستان اور ہماری ذمہ داریاں.....
82.....	جہادِ افغانستان نازک موڑ پر.....
82.....	افغانستان کی تقسیم کے عالمی منصوبہ کا آغاز.....
83.....	نیورلڈ آرڈر: عالمِ اسلام کے خلاف سازش.....
87.....	<b>خانہ جنگی کا دور (۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۶ء)</b>
88.....	”یہی چراغِ جبلیں گے تو روشنی ہوگی“.....
89.....	افغانستان میں پانچ دن.....
99.....	پاکستان کے بارے میں امریکی عزم: وزیرِ عظم پاکستان کے نام کھلاخت.....
103.....	جہادِ افغانستان اور سلطی ایشیائیکی ریاستیں.....
103.....	صومالیہ: مشرقی افریقہ کا افغانستان.....
108.....	افغانستان میں عالمِ اسلام کی آرزوؤں کا خون.....
109.....	دقائی بحث میں کی: قومی خودگشی کے مترادف.....

111.....	مجاہدین کی عالمی تنظیم "حرکت الانصار"
112.....	سرد جنگ کے بعد کی صور تھال اور ولڈ اسلام فورم
116.....	پنجپنیا کے صدر جوہر داؤ دوف کی شہادت
<b>119.....</b>	<b>طالبان کا پہلا دور (۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء)</b>
120.....	افغانستان میں دینی مدراس کے طلیب کی حکومت
121.....	افغانستان میں تین حکومتیں اور عالمی قوتوں کی حکمتِ عملی
122.....	افغانستان میں طالبان کی حکومت اور برطانیہ کے مسلم دانشور
125.....	اسامہ بن لادن اور سعودی علماء کرام کی جدوجہد
126.....	اسامہ بن لادن کے ساتھ ملاقات
129.....	سعودی حکمران خاندان، علماء کرام، اسامہ بن لادن
133.....	ڈیلی ٹیلی گراف اور دیوبندی مکتب فکر
134.....	امریکہ اور حرکت الانصار
135.....	عالمِ اسلام کے دینی حلقات اور امریکہ بہادر
136.....	امریکی جرائم اور شہر سدوم
139.....	طالبان اور داعشی
139.....	اسامہ بن لادن: کل کا مجاہد، آج کا دہشت گرد
142.....	مغربی دانشور اور طالبان کا اسلام
144.....	دو گھنٹے افغان سفارت خانے میں
147.....	طالبان کی حکومت اور اقوام متعدد کا منشور
148.....	ازبکستان میں مساجد کی بندش
149.....	حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی اور جہاد افغانستان
151.....	اسامہ بن لادن پر امریکی حملہ
153.....	طالبان کی مزید کامیابیاں
154.....	ایرانی سفیر کے طالبان حکومت سے چار مطالبات
157.....	وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اور طالبان کا اسلام

158.....	طالبان جیسا نظام اور دینی مدارس.....
160.....	نظامِ عدل آرڈیننس ۱۹۹۹ء اور افغان طالبان.....
164.....	مسیحی کمیونٹی: طالبان کے نقشِ قدم پر.....
164.....	محترمہ بے نظیر بھتو! معاملات کو گذرنہ کریں.....
166.....	نظام حکومت کی اصلاح کیلئے سعودی علماء کی تجویز.....
169.....	مسیحی طالبان اور مسلح جدوجہد کی تربیت.....
170.....	چیھپنیاں میں اسلامی قوانین کا لفاذ.....
170.....	طالبان کے بارے میں ماہی سی کا آغاز؟.....
173.....	اشک آباد کے مذاکرات اور مولانا سمیع الحق کی پیشکش.....
175.....	طالبان اور شامی اتحاد میں مفاہمت.....
176.....	مولانا فضل الرحمن کے بیان پر امریکی رد عمل.....
177.....	شیخ الہند، طالبان، اسامہ بن لادن.....
180.....	مسلم پرنسل لاء اور موجودہ عالمی صور تحال.....
185.....	ڈاکٹر محمد المسعری اور افغان طالبان.....
188.....	خدیو مصر اور خدیو پنجاب.....
190.....	جزل پرویز مشرف سے دینی جماعتوں کی توقعات.....
191.....	عواجم جہوریہ چین کے حکمرانوں سے ایک گزارش.....
194.....	اسامہ بن لادن: اسلام اور مسلمانوں کا خدرار؟.....
196.....	طالبان، امریکہ، اقوامِ متحدہ.....
198.....	امیر امام اللہ خان اور افغانستان میں مغربی ثقافت کی ترویج.....
201.....	افغان طالبان کے خلاف پاکستانی: عالمی استعمار کی نئی صفت بندی.....
203.....	بھارتی طیارے کا انگو اور طالبان.....
205.....	صوبہ سرحد اور افغانستان.....
205.....	جهادی تحریکات، سی ٹی بی ٹی، قرآن کا حکم.....
208.....	امریکی ایجنٹز اور جزل پرویز مشرف.....
211.....	کلمہ بہ زمی (واپس کب جاؤ گے؟)

چینپیا کے مشیر سلیم خان کی گرفتاری.....	213
ملک میں اسلحہ کلچر، دفاتری وزیر داخلم سے اہم نگارشات.....	215
چینپیا کا جہاد آزادی اور مسلم حکومتیں.....	217
سقوطِ ڈھاکہ، جہادِ افغانستان، معاشری خود مختاری.....	218
جہادی تربیتی مرکز اور تحریکِ جعفریہ پاکستان.....	221
افغان اور چین مجاهدین.....	225
”دہشت گردی“ کا امریکی تصور.....	226
طالبان کی اسلامی حکومت اور ڈاکٹر جاوید اقبال.....	227
جہادی تربیتی کیپ: وزیر داخلم کے نام کھلاخت.....	229
پاکستان، افغانستان، ایران کی کفیڈریشن کی تجویز.....	233
جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے دورہ افغانستان کے تاثرات.....	235
جہاد اور قوی اتفاق رائے.....	236
صوفیائے کرام اور مجاهدین.....	238
جزل پروپری مشرف کا امتحان.....	240
جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے چند گزارشات.....	243
افغانستان میں این. جی اوز کی سرگرمیاں اور طالبان کا موقف.....	246
دو دن کا بل کی آزاد فضائیں.....	247
افغان نائب صدر ملام محمد حسن سے ملاقات.....	249
کابل میں ”اکیڈمی آف سائنسز“ کا قیام.....	252
افغانستان کے عدالتی اور تعلیمی نظام پر ایک نظر.....	254
افغانستان میں این. جی اوز کا کردار.....	256
افغانستان کے اخبارات پر ایک نظر.....	258
طالبان حکومت کی مشکلات اور عزم.....	260
حرکتِ المحاذین کا طلبہ سیمینار.....	261
وسطی ایشیائی ریاستیں آزادی کے بعد.....	263
امریکی نائب وزیر خارجہ کارل انڈر فرمٹھ کو پاکستان میں ”طالبانائزیشن“ کا نظرہ.....	265

266.....	ازبک اسلامک فرنٹ پر امریکی پابندی.....
268.....	پاکستان میں افغان طالبان کی تقلید؟.....
269.....	افغانستان کی تعمیر نہ: داکٹر سلطان بشیر محمود کے تاثرات.....
271.....	طالبان حکومت پر اقوامِ متحده کی سلامتی کو نسل کی پابندیاں.....
273.....	اسامیہ بن لادن کی آڑ میں الارٹِ اسلامی افغانستان کا نشانہ.....
273.....	افغان طالبان کی مشکلات اور سنتِ نبویؐ.....
276.....	”بیجاں لائے پرانے شکاری“.....
278.....	غامدی صاحب کا فلسفہ جہاد.....
282.....	افغان طالبان کے ساتھ انہمارِ بیگتی.....
285.....	جہادِ افغانستان میں امریکہ کا کردار.....
288.....	”دفاعِ افغانستان کو نسل“ کا قیام.....
289.....	افغان عوام کی امداد و حمایت کا وقت.....
289.....	وزیر داخلہ پاکستان اور جہادی تظییں.....
290.....	امیر المؤمنین مسلم محمد عمر سے ملاقات.....
292.....	افغانستان پر پابندیوں کے عملی اثرات.....
294.....	افغانستان میں سرمایہ کاری کی اہمیت اور امکانات.....
296.....	چند لمحے احمد شاہ باباؑ کے مزار پر.....
298.....	بتِ شکنی اور طالبان حکومت کا موقف.....
300.....	مولانا فضل الرحمن اور مولانا سعیج الحنف کا قومی مسائل پر انہمارِ بیگتی.....
302.....	امام ولی اللہ دہلویؐ کے خواب کی عملی تعبیر!.....
304.....	جہادِ کشمیر اور جہادِ افغانستان کا موازنہ.....
305.....	افغانستان کی موجودہ صورت حال کا پس منظر اور جناب حکمت یار کا انتخابی فار مولا.....
308.....	جہاد کے بارے میں چند اشکالات کا ازالہ.....
311.....	اقوامِ متحده کی افغانستان پر پابندیاں اور ”الرشید ٹرست“ کا جرأت مندانہ فیصلہ.....
313.....	امریکہ اور برطانیہ کی پاکستان کو طالبان سے فاصلہ رکھنے کی ہدایت.....
314.....	امریکی نائب وزیر خارجہ کا دورہ پاکستان.....

316.....	افغانستان میں عیسائیت کی تبلیغ اور طالبان کا موقف.....
317.....	پاک افغان سرحد کی نگرانی کیلئے اقوام متحده کی ٹیکنیس.....
318.....	سانحہ گیارہ تمبر اور امریکی قیادت کی آزادی.....
320.....	سانحہ گیارہ تمبر کے تناظر میں امریکی عزم اور پاکستان کا کردار.....
324.....	افغانستان پر امریکی حملہ کی معاونت: صدر پرویز مشرف کا سیرت نبوی سے استدلال.....
326.....	افغانستان پر امریکی حملہ کی معاونت: صدر پرویز مشرف کی خود فرمی.....
328.....	افغانستان اور پاکستان: سانحہ گیارہ تمبر کے تناظر میں.....
329.....	سانحہ گیارہ تمبر پر ایک امریکی مذہبی راہنمایا تبصرہ.....
329.....	امریکہ کو رو سی کریل کا مشورہ.....
330.....	افغانستان پر متوقع امریکی حملہ اور عالمی منظر نامہ.....
333.....	سانحہ گیارہ تمبر: لندن میں علماء کا مشترکہ اعلامیہ.....
335.....	کیا امریکہ عالمی قیادت کا اہل ہے؟.....
338.....	علمی ابلاغیتی گھنٹن میں تازہ ہوا کا جھوٹکا.....
<b>341.....</b>	<b>امریکی اتحاد کی یلغار (۲۰۰۱ء تا ۲۰۲۱ء)</b>
342.....	افغانستان پر امریکی حملہ: مقاصد و اهداف.....
343.....	امریکی صدر جارج ڈبلیو بوش کی حیرت انگیز حیرت.....
344.....	ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور.....
345.....	اطہمہ رائے کی آزادی کا مغربی معیار.....
346.....	افغانستان پر جاری امریکی حملہ: برطانوی رائے عامہ کا رد عمل.....
348.....	یہ جنگ فراث ہے: برطانوی صحافی جان پل برج کا تجزیہ.....
352.....	افغانستان کی صور تھاں پر ایک پیش انٹرویو.....
354.....	افغانستان کی تباہی: دانشوروں کی سوچ تاریخ کے آئینے میں.....
358.....	دہشت گردی یا حریت پسندی؟.....
360.....	افغانستان پر امریکی حملہ کی معاونت: پاکستان کیوں مجبور تھا؟.....
363.....	افغانستان میں طویل جنگ کا ایک نیادور.....

364.....	تہذیبی جنگ کا تحفظ: امریکی وزیر خارجہ کوں پاول کا عنديہ
366.....	دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارنٹ
367.....	وہی قاتل، وہی مخیر، وہی منصف ٹھہرے
370.....	سلطان ٹپپ شہید اور افغان طالبان: تاریخی مثال
374.....	امارتِ اسلامی افغانستان کا خاتمہ اور غنی افغان حکومت کے رحمانات
377.....	اقوامِ متحده کے منشور پر نظر ثانی کی ضرورت
380.....	افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت اور وزیر داخلہ کا اعتراضِ حقیقت
382.....	کابل کی نئی حکومت اور اسلامی قوانین
383.....	اسامة بن لادن اور ان کی جدوجہد
388.....	طالبان قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک
389.....	پاکستان میں مذہبی و جہادی جماعتوں پر پابندی
390.....	افغان خواتین و کلاء کے خیالات
391.....	پاکستان کی افغان پالیسی اور عوای جذبات
391.....	مغربی اقوام کی بربریت تاریخ کے آئینے میں
396.....	مولوی نصر اللہ منصور شہید
398.....	شاہِ اردن سے ایک سوال
399.....	افغانستان کے سابق فرمانرواء طاہر شاہ کی واپسی
400.....	دینی مدارس کے خلاف امریکی کارروائیاں
401.....	حضرت مولوی محمد نبی محمدؒ
404.....	سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم
412.....	سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم: چند مزید گزارشات
415.....	دینی مدارس: امداد اور چھاپوں کی زدیں
416.....	روس، عرب، یورپی ممالک کا فلسطین کی حمایت میں متوقع اتحاد
419.....	پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی
421.....	مولانا عاظم طارق کی بھوک ہڑتال اور مولانا فضل الرحمن کا متحسن اقدام
422.....	افغانستان اور عراق کے بارے میں مسلم دنیا کے الگ الگ معیارات

”دہشت گردی“ کے حوالے سے اسلامی نظریاتی کوںل کا سوالنامہ.....	425
دینی کارکنوں اور علماء کرام سے اپیل.....	433
مغربی عوام اور حکمران ہم آہنگ نہیں.....	435
حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ.....	437
امتحبات میں متحده مجلسِ عمل کی کامیابی.....	439
متحده مجلسِ عمل کی کامیابی اور ذمہ داری.....	442
علمی اسلامی تحریکات کی متحده مجلسِ عمل سے وابستہ توقعات.....	443
متحده مجلسِ عمل سے ہماری توقعات.....	445
حضرت عمرؑ کا نظام حکومت اور جناب اسفندیار ولی.....	447
اسامة بن لادن اور یاسر عرفات.....	448
خلافتِ اسلامیہ کا احیا: روئی صدر ولاد بیہر پیوٹن کا خوف.....	450
مولانا مسعود اظہر کی دوبارہ گرفتاری.....	451
امریکی یخار۔ سرحد اسلامی کی قراردادیں.....	452
متحده مجلسِ عمل کی خدمت میں!.....	453
مسلم دنیا اور جرمی.....	454
افغان شہداء کے خون کا ثمرہ.....	455
افغانستان کے بعد عراق.....	457
اسامة بن لادن اور امریکی تحریکِ آزادی کے جنگجو.....	459
ملتِ اسلامیہ کے بھرائی اور ہماری دینی قیادت.....	463
اسامة افلاطی راہنماییں: امریکی کانگریس وومن مارکی کیپٹر.....	466
امام ولی اللہ دہلویؒ اور امارتِ اسلامی افغانستان.....	466
افغانستان میں ہیر و ٹن کا روابر.....	469
محترمہ بنے نظیر بھٹو اور افغان طالبان.....	469
طالبان والے نظام کا ہوا۔.....	471
روایتی اسلام اور روشن خیال اسلام.....	472
کیوباسے رہائی پانے والے ایک مجہد کی داستان.....	476

479.....	شدت پسندی: شاہ فہد اور مہاتیر محمد کا اختلافِ نظر.....
482.....	کیا خلافت کا نظام ناقابلِ عمل ہے؟.....
483.....	نوایزادہ نصراللہ خان مرحوم اور عالیٰ استعمار.....
484.....	مولانا شاہ احمد توینی اور افغان طالبان.....
486.....	خود احتسابی اور ناقدانہ جائزہ.....
486.....	تحریک اسلامی کا جہاد اور صدر جزل پرویز مشرف.....
487.....	مولانا مفتی نظام الدین شامزی شہید.....
493.....	امریکی صدر کا افغان صدر کو مشورہ.....
496.....	بات ملا محمد عمر یا مولوی فضل ہادی شنواری کی نہیں.....
497.....	یا سرفراز مرحوم.....
500.....	چارچوبیوں کی کامیابی اور عالمِ اسلام.....
503.....	سانحہ گیارہ تیر اور امریکی دھونس.....
504.....	گوانٹانامو بے اور افغان قیدیوں کیلئے ذہنی اذیت.....
505.....	جائے سانحہ گیارہ تیر پر چند لمحے.....
507.....	دنیاۓ اسلام میں امریکہ کا تشخص.....
508.....	برطانوی وزیر جیری اسٹکلف کے خیالات.....
511.....	امریکی مفادات اور اسلام آباد کی کمثمنٹ.....
515.....	ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور مولانا فضل الرحمن غلیل.....
517.....	مولوی محمد یونس خاص.....
518.....	سابق امریکی صدر جی کارٹر کے خیالات.....
528.....	حدود آرڈیننس کا قضیہ.....
529.....	غلامی آج کے دور میں.....
530.....	حدود آرڈیننس: ایک اعتراض کا ازالہ.....
532.....	صدر پرویز مشرف کے دس سوالات کا جائزہ.....
534.....	مذہبی انہتا پسندی کے اسباب اور اس کا علاج.....
537.....	جامعہ حفصہ اور لال مسجد کا سانحہ.....

540.....	آج کے فریڈم فائز، دہشت گرد کیوں؟.....
541.....	افغانستان کیلئے دستوری طرز حکومت کی تجویز.....
542.....	ماہنامہ قومی ڈاچسٹ کا انترویو.....
547.....	افغانستان میں افیون کی کاشت کا مسئلہ.....
547.....	طالبان اور القاعدہ پروکالت کی مخالفت کا الزام.....
551.....	غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری.....
552.....	افغانستان کا مسئلہ: پارلیمنٹ کے اجلas سے توقعات.....
555.....	دہشت گردی کے خلاف جنگ پر بریفنگ.....
559.....	”دہشت گردی“ کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد.....
565.....	دہشت گردی کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کا فیصلہ.....
569.....	امریکہ سے پاکستانیوں کی نفرت کے اسباب.....
571.....	صدر بارک اوباما کو امریکی سینیٹر کا حقیقت پسندانہ مشورہ.....
572.....	دہشت گردی کے خلاف جنگ اور غلط مغربی مفروضے.....
576.....	”مشرق و سطی سے جنوبی ایشیا تک، تلاشِ امن“.....
579.....	عالمِ اسلام کے خیالات اور امریکہ.....
580.....	قاهرہ میں صدر اوباما کا خطاب.....
583.....	افغانستان کی صور تحال اور ”ہفتہ نامہ امید“.....
587.....	صدر قذافی کا جزلِ اسمبلی سے خطاب.....
587.....	دنی مدارس پر دہشت گردی کا الزام.....
589.....	جهادِ افغانستان اور افغان طالبان کا پس منظر.....
594.....	دنی مدارس پر دہشت گردی کا الزام.....
595.....	افغان طالبان اور پاکستانی طالبان.....
597.....	جهادِ افغانستان اور پاکستان کے مذہبی حلقة.....
600.....	دنی مدارس پر چھاپوں کا نیارائٹ.....
602.....	مولانا حمید الرحمن عباسی <sup>ؒ</sup> .....
603.....	دو یونی جماعتوں کی خصوصی توجہ کے لیے.....

606.....	فوجوں کے ذریعے دل جیتنے کا فارمولہ.....
607.....	موجودہ حالات اور جزلِ حمیدِ گل.....
610.....	افغانستان کی صورت حال: سابق روئی صدر میتاں گور بچوف کا تجزیہ.....
611.....	جهاد، دہشت گردی، جدو جہد آزادی.....
612.....	حضرت مولانا نور محمد شہید <sup>ؒ</sup> .....
613.....	طالبان کا وجود اور ان کے ساتھ مذکورات.....
614.....	کرنل امیر سلطان تارڑ شہید <sup>ؒ</sup> .....
617.....	مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب.....
619.....	ائشؑ اسامہ بن لادن شہید <sup>ؒ</sup> .....
622.....	اصل دہشت گرد کون؟.....
624.....	ملی مجلس شرعی کی قراردادیں.....
625.....	انتہا پسندی اور اس کی خود ساختہ تعریف.....
628.....	امریکی ڈھنکیاں اور توئی خود منتاری.....
630.....	افغان طالبان کا مختصر پیش منظر.....
633.....	افغان طالبان کی استقامت کو سلام.....
634.....	قرآن کریم کی حرمت کے تقاضے.....
636.....	حضرت شیخِ الہند مولانا محمود حسن <sup>ؒ</sup> اور نظریہ عدم تشدد.....
639.....	امن ضروری ہے اور امن کیلئے انصاف ضروری ہے.....
641.....	خود ہی مدعی، خود ہی گواہ، خود ہی نجح.....
643.....	حضرت مولانا عبدالحق <sup>ؒ</sup> .....
644.....	مشاہیر، نام مولانا سعیح الحق <sup>ؒ</sup> .....
646.....	علماء کرام کی شہادتوں کا سلسلہ.....
648.....	طالبان کیلئے امریکی امداد.....
649.....	حقانی نیٹ ورک اور دفاعِ پاکستان کو نسل.....
650.....	افغانستان کی صورت حال اور قاضی حسین احمد <sup>ؒ</sup> .....
651.....	اسلامی نظام کی جدو جہد اور اس کی حکمتِ عملی.....

652.....	افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: مقاصد و اهداف
654.....	افغان رہنماء مولا ناجلال الدین حقانی کی اپیل
657.....	قطیر میں افغان طالبان کا ذفتر
659.....	افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: نئی حکومت کی ذمہ داریاں
662.....	مالا لے اور ملا لے
664.....	افغان طالبان کی سرگرمیاں
667.....	افغانستان میں غیر ملکی تسلط کی مدد کی شرعی حیثیت
668.....	پاکستانی طالبان کے ساتھ مذکورات اور مولا ناصیح الحق
670.....	اسلام کا نظام حکومت: تصنیفی کاوشیں
672.....	موجودہ صور تھال اور افغان طالبان کا موقف
675.....	دہشت گردی کے خلاف قوی مہم
677.....	آج کے مسلم نوجوان کا مقدمہ
681.....	کل کے مجاہد، آج کے دہشت گرد
683.....	آرمی پیپل اسکول پشاور کا ساخنہ
686.....	افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذکورات
688.....	مل احمد عمر مجاہد <sup>۲</sup>
690.....	جزل حمید گل مرحوم
692.....	توبہ، اصلاح، تلاذی
694.....	مولانا ذاکر شیر علی شاہ <sup>۳</sup>
695.....	تین معاصر بزرگوں کے تصنیفی کارنائے
697.....	پاک امریکہ تعلقات: حقیقت پسندانہ تجزیہ کی ضرورت
699.....	ملا آخرت منصور کی شہادت کے بعد!
701.....	ٹی وی پروگراموں کے طے شدہ اهداف
704.....	شدت پسندی، افغانستان، غیاء دور
706.....	مولانا محمد امین اور کرزی شہیدی <sup>۴</sup> کا واقع
707.....	پاک امریکہ تعلقات: جبر و مکر کی داستان

- صدر ڈو نڈر مپ کا بیان اور امریکی قیادت کی نفیات..... 711  
 ملالہ دیوی اور قندوز کشمیر کے شہداء..... 713  
 موجودہ صورت حال میں افغان طالبان کا موقف..... 715  
 افغان حکومت اور طالبان کے مبینہ مذاکرات: دواہم موقف..... 718  
 خادم الحرمین الشریفین کی خدمت میں موبان گزارش..... 721  
 مولانا جلال الدین حقانی..... 723  
 افغان تازہ حصہ کا تاریخی پس منظر اور اس کا نیا رائٹ..... 726  
 مولانا سعیج الحق شہید..... 727  
 افغان طالبان کو شاہ محمود قریشی کا مشورہ..... 729  
 شکریہ مسٹر ڈو نڈر مپ!..... 730  
 افغانستان سے امریکی فوجیوں کی واپسی..... 732  
 عالمی استغفار کے رو بلوں اور افغان طالبان کا امتحان..... 734  
 پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی..... 737  
 دنیا کی ضرورت خلافاء راشدین والا اسلام ہے..... 738  
 مختلف شعبوں میں علماء اور وکلاء کی مشترکہ جدوجہد کی ضرورت..... 740  
 کشمیر، افغانستان، صدر ڈو نڈر مپ..... 741  
 امت مسلم کی حالتِ زار اور اہلِ دین کی ذمہ داری..... 742  
 کشمیر اور افغانستان کی تازہ صورت حال پر ایک نظر..... 744  
 ”اسلام کاظم سیاست و حکومت“: مولانا عبد الباقی حقانی کی علمی کاوش..... 746  
 کیا امریکہ مشرق و سطی سے نکلا چاہتا ہے؟..... 748  
 مولانا سعیج الحق شہید اور جہاد افغانستان..... 749  
 معاهدات: ذمہ داری یا ہتھیار؟..... 750  
 امریکہ کی عالمی چودھراہٹ کا نیا رائٹ..... 752  
 امریکہ کا پاکستان سے فوجی اڈوں کا تقاضہ..... 754  
 سوویت یونین، افغانستان، امریکی اتحاد..... 755

759.....	طالبان کا دوسرا دور (۲۰۲۱ء۔۔۔)
760.....	افغانستان میں طالبان کا نیا دور: توقعات و خدشات
761.....	افغانستان کی موجودہ صورت حال اور ہماری ذمہ داری
764.....	مسلم حکومتیں اور اسلامی نظام
766.....	”دوہشت گردی“ کے خلاف جنگ میں ناکامی
767.....	افغانستان کا بحران اور ہمارا افسوسناک طرز عمل
769.....	افغانستان کی صورت حال: دینی حقوق کی سرگرمیاں
771.....	۲۰۲۱ء کو ”یوم افغانستان“ منایا جائے
773.....	”عشرہ بیجنی افغانستان“ کا لائحہ عمل
775.....	سودی نظام اور مسلم ممالک
776.....	افغان عوام کے ساتھ بیجنی کی مہم
779.....	امریتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم نہ کرنے کی اصل وجہ
781.....	مسلم وزراء خارجہ کو اسلام آباد میں خوش آمدید
782.....	سلامتی کوں ل اور امریتِ اسلامی افغانستان



## عرضِ مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

برادر مسلم ملک افغانستان کے حوالے سے زیر نظر مجموعہ حضرت مولانا ابو عمار زاہد الراشدی کی مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں پر مشتمل ہے، جو ۱۹۷۳ء سے ۲۰۲۲ء کے عرصہ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ واقعی تسلسل برقرار رکھنے کیلئے مواد کی ترتیب تاریخ اشاعت کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ بہت سی تحریروں کے عنوانات ان کے مرکزی نیتیں کی بہتر عکاسی اور کتاب کے موضوع کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مناسبت کی غرض سے تبدیل کیے گئے ہیں۔ جن تحریروں میں متعلقہ مواد جزوی طور پر آیا ہے ان کے صرف وہی حصے شامل کیے گئے ہیں، البتہ بعض تحریریں مجموعی تاظر برقرار رکھنے کیلئے مکمل شامل کر لی گئی ہیں۔ طالبان کی اسلامی حکومت کا تسلسل ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء کے پہلے دور کے بعد ۲۰۲۱ء میں دوبارہ شروع ہوا ہے تو اس سلسلہ کی اگلی تالیف کا عنوان ”مارٹ اسلامی افغانستان“ ہو گا۔ اس اشاعت میں سامنے آنے والی غلطیوں کی تصحیح اور اس موضوع پر دستیاب ہونے والی مزید تحریروں کی شمولیت اگلی اشاعت میں کردی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔



Source:

<https://www.geneva.mfa.af/en/about-afghanistan/national-emblem.html>

[https://en.wikipedia.org/wiki/Emblem\\_of\\_Afghanistan](https://en.wikipedia.org/wiki/Emblem_of_Afghanistan)

## بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی اور افغانستان

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور۔ ۵ اپریل ۱۹۷۲ء

بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے رہنمای جناب احمد نواز بگتی گذشتہ روز لاہور تشریف لائے اور پارٹی ورکروں کے اجتماع سے خطاب کے علاوہ ایک مقامی روز نامہ کا اخراج یوگی دیا جس میں انہوں نے بلوچستان کے سیاسی حل کے بارے میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے متوجہ اعلان، بلوچستان کی سیاسی صورتحال اور مسئلہ بلوچستان کے صحیح حل کے سلسلہ میں چند فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ بلوچستان کی نازک صورتحال اور وزیر اعظم بھٹو کے متوجہ اعلان کے پیش نظر بگتی صاحب کے ان خیالات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(انہوں نے کہا کہ) میری رائے میں افغانستان کے صدر داؤد خان جیسے ہی اپنا اقتدار مُحکم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے وہ پاکستان کے خلاف اپنی ہمیں تیز کر دیں گے۔ اس میں وہ سرحد پار بلوچستان میں انتہا پسند عناصر کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہیں یہ کامیابی اس لیے حاصل ہو گئی کہ بلوچستان اب ایک ایسا صوبہ ہے جہاں کے عوام کے سیاسی حقوق غصب کیے جا چکے ہیں اور جنہیں ظلم اور متشددانہ کارروائیوں کا ناشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو نے خود کہا ہے کہ بلوچستان میں فوج ملک کے دشمنوں کے خلاف لڑ رہی ہے۔ ایسے ماحول میں وہاں کے عوام کا کابل کا حادی اور ایران کا مخالف ہونا قادر تی امر ہے۔ افغانستان کے اس پر دیکھنا میں شدت آجائے گی کہ بلوچ عوام کو گذشتہ چھپیں برس کے دوران ان کے سیاسی حقوق نہیں ملے، بلوچ عوام اگر افغانستان کے ساتھ ہاتھ ملا لیں تو پھر ان اور بلوچوں کو برابر کے حقوق ملیں گے۔ افغانستان کا یہ پر ایکینٹا اکار گر ثابت ہو گا۔ بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت کا جیلوں میں بند ہونا اس ملک کیلئے سب سے بڑا ملیہ ہے۔ ان رہنماؤں کی عدم موجودگی میں قیادت لازمی طور پر نوجوان اور انتہا پسند عناصر کے ہاتھوں میں چلی جائے گی جن سے سمجھوتہ کرنا یا انہیں راہ راست پر لانا تقریباً ناممکن ہو گا۔ افغانستان کے ساتھ بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے رالٹے کی انویں بھی بے سروپا ہیں۔ ہمارا افغانستان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ہمارا مستقبل تو پاکستان اور اس کی سالمیت کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے سوا ہمارا کوئی مستقبل نہیں۔ (حوالہ نوائے وقت لاہور۔ ۶ اپریل ۱۹۷۲ء)

## ولی خان، مسٹر بھٹو، افغانستان

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور۔ ۲۶ جولائی ۱۹۷۲ء

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے گذشتہ دنوں صوبہ سرحد کے شانی علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے اپنی تقاریر میں

پاکستان کی سرحدوں پر افغانستان اور بھارت کی افواج کے اجتماع کے اکٹاف کے ساتھ ساتھ قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد جناب عبدالولی خان کے خلاف بھی غم و غصہ کا اظہار فرمایا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی نئی بات کرنے کی بجائے وہی باتیں ہیں دھروہ اور ان کے پیشہ و حکمران اس سے قبل متعدد بار کہہ کرے ہیں، لیکن موجودہ ملکی و بین الاقوامی صورتحال کے پیش نظر بھٹو صاحب کی یہ نئی نہم اپنے مالہ و ما علیہ پر غور و خوض کی دعوت دیتی ہے۔

مسٹر عبدالولی خان کے نظریات و افکار پاکستان کے کسی شہری پر پوشیدہ نہیں، وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں ایک مخصوص نقطہ نظر کے حامل سیاستدان ہیں جس کا اظہار وہ کئی بار کر چکے ہیں۔ اور شاید ولی خان کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ چلنے اور ہوا کارخ بدلتا دیکھ کر اپنے موقف میں لچک پیدا کر لینے کی "صلاحیت" سے محروم ہیں، ورنہ آج صورتحال اس سے مختلف ہوتی جو دھکائی دے رہی ہے۔ ولی خان کے خلاف آج تک جتنی باتیں بھی کی جاتی رہی ہیں ان کی تان دوالوں پر آگ روٹتی ہے۔ ایک یہ کہ ولی خان قیام پاکستان کے خلاف تھے، اور دوسری یہ کہ وہ افغانستان جاتے ہیں اور افغان حکمران سے ملتے ہیں۔

جہاں تک قیام پاکستان کی مخالفت کا تعلق ہے، یہ کوئی جرم نہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے ایک باشمور حلقے نے دلائل کی بنیاد پر دیانتداری کے ساتھ قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اور قیام پاکستان کی صورت میں کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس حلقے نے جو خدشات پیش کیے تھے وہ غلط ثابت ہوئے یا صحیح، قیام پاکستان کے بعد اس حلقے نے ملکی سالمیت کے تحفظ اور پاکستان کی فلاح و بہبود کیلئے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا کہ ۱۹۷۱ء میں جب سالمیتِ پاکستان کے بعض نام نہاد ٹھیکیداروں کی سرگرمیاں پاکستان کو دولخت کرنے کا موجب بن رہی تھیں، قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والے حلقہ کے دو ممتاز رہنما مولانا مفتی محمود اور خان عبدالولی خان ڈھاکہ میں ملک کے دونوں حصوں کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنے اور تقسیم ملک کو رونے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اور آج بھی دونوں راہنماؤں سرے سیاسی قائدین کے شانہ بشانہ ملک میں جمہوری عمل کی بھائی اور سالمیتِ پاکستان کے تحفظ کی خاطر سرگرم عمل ہیں۔

باقی رہی افغانستان کی بات تو اس سلسلہ میں ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ مسٹر ولی خان کے موقف کو کلی طور پر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ خان موصوف نے گذشتہ روزِ اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

- وہ حب وطن ہیں اور ان کی حب وطنی ملک کے کسی بھی بڑے شخص سے زیادہ مضبوط ہے۔
- وہ چاہتے ہیں کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی ختم ہو اور دونوں مسلم پڑوں کی ممالک بجا یوں کی طرح امن و آشنا کے ساتھ رہیں۔
- مسٹر بھٹو نے نئی نہم ملک کے داخلی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے شروع کی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ولی خان کا یہ موقف ٹھنڈے دل سے غور و خوض کا طالب ہے۔ اولًا اس لیے کہ یہ مسلم پڑو سی ممالک کا معاملہ ہے اور اس سلسلے میں جو شخص یا علاقہ بھی صلح و امن کی بات کرے گا، ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ثانیًا اس لیے کہ ہمارے خیال میں افغانستان اور پاکستان کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کے عوامل اور اس سلسلہ میں پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان اور صوبہ سرحد کے بعض اقتدار پسند سیاست انوں کے طرز عمل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس لیے خداخواستہ افغانستان کی افواج بقول بھٹو صاحب پاک سرحدوں کی طرف بڑھ رہی ہیں تو بھی حکومت پاکستان کو صلح و امن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے کشیدگی کو کم کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں مسلم برادری اور اسلامی سیکرٹریٹ سے بھی رجوع آئیا جاسکتا ہے۔ آخر مسلم برادری اگر بھٹو اور مجیب کو ایک میز پر بیٹھنے پر آمادہ کر سکتی ہے تو وہ داور بھٹو کو ایک اٹچ پر لانا اس کیلئے کون سا مشکل امر ہے؟

اسی طرح ولی خان کے بار بار افغانستان جانے کے بارے میں بھی بھٹو صاحب کو معقول اور سنجیدہ موقف اختیار کرنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ولی خان کا بیرون ملک جانا ملک کیلئے نقصان دہ ہے تو انہیں حکومت پاکستان باہر جانے کی اجازت کیوں دیتی ہے؟ ولی خان جب بھی ملک سے باہر گئے، حکومت کی اجازت سے گئے۔ اب اگر حکومت کو ان کی سرگرمیوں پر اعتراض ہے تو بیان بازی کی جائے سنجیدگی کے ساتھ اس کا نوٹ لیا جائے اور عدالت کی میز پر ان کے خلاف الزامات کا ثبوت مہیا کر کے آئندہ کیلئے اس صورتحال کا سدباب کر دیا جائے۔ ورنہ اس تاثر کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ بھٹو صاحب بھی اپنے پیشو و حکمرانوں کی طرح سیاسی مخالفین کو کچلنے کیلئے غدار، وطن دشمن اور غیر ملکی ایجنسٹ جیسے مہمل اور مفہوم و معانی سے عاری الفاظ کا سہارا لے رہے ہیں۔

## حضرت شاہ ولی اللہ اور افغان فرمانروا احمد شاہ ابدالی

بفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور --- ۱۴۲۳ھ / ۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب شعور کی آنکھ کھوئی تو سلطنت مغلیہ کا چراغ غمثہمار ہاتھا۔ طوائف الملوكی ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی اور فرگی تاجر کمپنیاں دھیرے دھیرے مغل حکمرانوں کی جگہ لینے کیلئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ مرہٹے ایک طاقتور سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کرتے چارہ ہے تھے اور بر سیغیر ان کے قبضے میں چلے جانے کا خطرہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ حضرت امام ولی اللہ نے فوری حکمت عملی کے طور پر مرہٹوں کی سرکوبی اور ان کے خطرہ سے نجات حاصل کرنے کیلئے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی سے رابطہ قائم کیا اور اس سے مدد مانگی اور احمد شاہ ابدالی، حضرت شاہ صاحب اور دیگر درمند ہندی مسلمانوں کی استدعا پر مرہٹوں کے خلاف ان کی امداد کیلئے آگے بڑھا اور پھر ۶۱ کاماء میں پانی پت کا وہ تاریخی معز کہ پہاڑوں جس نے عظیم تر مہم رہاست کے تصور کو ہمیشہ کیلئے خاک میں ملا دیا۔ مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا۔ دو لاکھ سے زائد مرہٹہ فوجی میدان جنگ میں کام آئے اور احمد شاہ ابدالی جو خود ہندوستان کی بادشاہیت حاصل کر سکتا تھا،

حکومت شاہ عالم ثانی کے پر درکر کے واپس چلا گیا۔

اس خطرہ سے نجات حاصل کرنے کے بعد سلطنتِ مغلیہ کا روز افزوں زوال اور فرنگی کمپنیوں کا بڑھتا ہوا اثرور سوخ حضرت شاہ صاحب کے سامنے تھا۔ فرنگی جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شہید کر کے ۷۵۰ء میں بیگال پر قبضہ کر چکے تھے۔ حیدر آباد کن، اودھ اور میسور پر فرنگی کی لپچائی ہوئی نظریں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانی، احمد شاہ ابدالیؒ عظیم قربانی اور فرアク خدا نامہ ایثار کے باوجود ہوش میں نہیں آیا تھا، ایسے میں حضرت شاہ صاحب نے سلطنتِ مغلیہ کے بوسیدہ گھنٹرات کو سہارا دینے کے بجائے فک کل نظام (ہمہ گیر انقلاب) کا نعرہ لگایا۔

شاہ صاحب یہ سمجھ چکے تھے کہ مغلیہ سلطنت کو جب احمد شاہ ابدالیؒ کی قربانی اور ایثار سہارا نہیں دے سکی تو اس کے دن گئے جا پکے ہیں، اس کو سہارا دینے یا اس کی اصلاح کی توقع رکھنے کے بجائے اس ترقی پذیر قوت کے مقابلے کی تیاری کرنی چاہیے ہے جو سلطنتِ مغلیہ کی جگہ لینے والی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ فرنگی کے تسلط کو ایک یقینی امر سمجھتے ہوئے اس دور رس نگاہ رکھنے والے مرد درویش نے فرنگی کے مقابلے میں ایک فکری و علمی مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی۔

### یکم دسمبر ۲۰۱۲ء کو شاہ ولی اللہ سوسائٹی لاہور کے زیر اہتمام ایک فکری نشست سے خطاب کا کچھ حصہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ اقبالؒ جنوبی ایشیا کے متاز مسلمان مفکرین میں سے تھے۔ دونوں کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ ہے اور دونوں نے اپنے اپنے دور میں ملتِ اسلامیہ کی بیداری کیلئے نمایاں فکری اور سیاسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کا دور وہ ہے جب اور گنریپ عالمگیرؒ کی نصف صدی کی حکمرانی کے بعد مغل اقتدار کے دور زوال کا آغاز ہو گیا تھا اور شاہ ولی اللہؒ گود کھائی دے رہا تھا کہ ایک طرف برطانوی استعمار اس خط میں پیش قدمی کر رہا ہے اور دوسری طرف جنوبی ہند کی مرہٹہ قوت دہلی کے تخت کی طرف بڑھنے لگی ہے، جبکہ علامہ اقبالؒ کو اس دور کا سامنا تھا جب انگریزوں کی غلامی کا طویل عرصہ گزارنے کے بعد بر صغیر کے باشندے اس سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ گویا شاہ ولی اللہؒ غلامی کے امکانات کو دیکھتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے اور علامہ اقبالؒ غلامی کو ہجتتے ہوئے اس سے قوم کو آزادی دلانے کی جدوجہد میں مصروف عمل تھے۔

شاہ ولی اللہؒ کو یہ خطرہ در پیش تھا کہ جنوبی ہند کے مرہٹے دہلی کے اقتدار کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اس کا سدباب انہوں نے یوں کیا کہ افغانستان کے فرمازو احمد شاہ ابدالیؒ کو بر صغیر کے مسلمانوں کی مدد کیلئے دعوت دی جس کے نتیجے میں پانی پت کی خوفناک جنگ میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور شمالی ہند مسلمانوں کیلئے محفوظ ہو گیا، جبکہ علامہ اقبالؒ اس پریشانی سے دوچار تھے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کے بعد اس خط پر مستقبل ووث اور سیاسی عمل کے ذریعے تشكیل پائے گا جس میں ہندو کی واضح اکثریت مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو مندوش کر سکتی ہے، اس کا حل انہوں نے پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی الگ ریاست کی شکل میں نکالا اور بر صغیر کی تعمیم کی تجویز پیش کر کے مسلمانوں کو سیاسی

طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ گویا خطرہ دونوں کو ایک ہی طرح کا درپیش تھا لیکن دونوں نے اس کا حل اپنے اپنے دور کے تقاضوں اور حالات کی روشنی میں الگ الگ تجویز کیا۔

## افغان صدر محمد داؤد کا دورہ پاکستان

بیفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور ۱۹۸۷ء مارچ ۱۹۸۷ء

ہمارے برادر ہمسایہ ملک افغانستان کے سربراہ سردار محمد داؤد پاکستان کا چار روزہ دورہ مکمل کر کے اپنے وطن واپس روانہ ہو گئے ہیں۔ افغان سربراہ کا پاکستان میں جس گرموجوشی اور محبت کے ساتھ خیر مقدم ہوا ہے اس سے ان عناصر کو بہت دکھ ہوا ہو گا جو ایک طویل عرصہ سے ان دو عظیم برادر ملکوں کے درمیان برادرانہ تعلقات کو پھلتا چھولتا نہیں دیکھتا چاہتے، اور جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد تیس برس تک ان تعلقات میں رخنے والے میں کوئی کسر نہیں اٹھا کر گئی۔ دراصل ہماری بقدری سے پاکستان بننے کے فوراً بعد وزارت خارجہ کا فلمدان سر ظفر اللہ خان کے سپرد ہوا جن کے پیشوامرزا غلام احمد قادریانی کے قاصدوں کو غیر افغان حکمران یغزر کردار تک پہنچا چکے تھے اور اس کی یاد ظفر اللہ خان اور ان کے رفقاء کے دلوں میں بھڑک رہی تھی۔ اس لیے افغانستان کے ساتھ تعلقات کا آغاز ہی غلط ہاتھوں سے ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج  
تاثر یا می رو دیوار کج

کے مصدق پاکستان اور افغانستان کے باہمی تعلقات میں بھاری چارے اور بے تکلفی کا وہ رنگ پیدا ہے جو سماں جو دو پڑوں اور مسلمان ملکوں کے تعلقات میں ہونا چاہیے۔ مفاد پرست لوگوں نے دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کر دی اور اسے بلند سے بلند تر کر دینے کی مساعی جاری رہیں۔ عبوری حکومت کے سربراہ جنگل محمد ضیاء الحق مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے خارجہ پالیسی کی گھسی پٹی لائیوں پر چلنے کی بجائے افغانستان کے ساتھ تعلقات کو حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھا جس کا تجھی یہ ہے کہ آئندوں ملکوں کے سربراہ بھائیوں کی طرح مل بیٹھ کر اپنے تعلقات اور تنازعات پر گفت و شنید کر رہے ہیں اور یہ امید ہو چلی ہے کہ غلط فہمیوں کی مصنوعی دیوار رفتہ رفتہ اپنے منطقی انعام کو پہنچ رہی ہے۔

افغانستان صرف ہمارا پڑوں اور مسلمان ملک ہی نہیں بلکہ مذہب کے ساتھ والہانہ محبت اور ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کٹ مرنے کے مثالی جنبہ میں بھی وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ شریک ہے۔ اس لیے باہمی تعلقات کے باب میں اس ثابت پیشرفت پر ہر پاکستانی نے اطمینان کا سانس لیا ہے اور اپنے دل میں مسرت کی لہر محسوس کی ہے۔ اللہ تعالیٰ را محبت کے ان دو راہروں کو نظر بدے سے بچائے، آمین یارب العالمین۔



# سوویت یونین کی یلغار

## (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء)

## افغانستان میں روسی یلغار اور بھارت کی رائے عامہ

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور --- ۱۸ مارچ ۱۹۸۰ء

افغانستان کے مسئلہ پر اندر احکومت روئی مداخلت کی اصولی مخالفت کے باوجود روس کے خلاف کوئی واضح موقف اختیار کرنے کو تیار نظر نہیں آتی لیکن بھارتی رائے عامہ کا رجحان اس سے مختلف ہے۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھارتی باشندوں نے افغانستان میں روئی مداخلت کی مذمت کرتے ہوئے روئی افونج کی واپسی کا مطالبہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد کنوشن اور جلسے منعقد ہوئے ہیں۔ جمیعت علماء ہند نے اپنے ایک جلسہ میں اسی موقف کا اظہار کیا اور دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر بھی اسی نوعیت کی قرارداد منظور کی گئی۔

کمیونزم کی پیشرفت پر بھارتی رائے عامہ کا رد عمل ثابت نہیں ہے۔ بھارتی معاشرہ بنیادی طور پر مذہبی ہے، مختلف مذاہب سے وابستہ لوگ اپنے مذاہب سے اس قدر والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں کہ آپس میں بھی سرپھٹوں سے باز نہیں آتے۔ آئے دن فرقہ والانہ فسادات اس پر واضح ثبوت ہیں۔ ان حالات میں بھارتی معاشرہ کے بارے میں یہ قیاس درست نہیں ہے کہ وہاں کمیونزم قدم جما سکتا ہے یا بھارتی باشندوں کے دل میں کمیونزم کے بارے میں کوئی زرم گوشہ موجود ہے۔ مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی اور بدھ مت آپس میں انتہائی اختلاف رکھنے کے باوجود فس نہ ہب کے تحفظ کیلئے ایک ہی جیسا جذبہ رکھتے ہیں اور افغانستان کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں اس کا حکم کھلا اظہار ہوا ہے۔ اس لیے یہ بات اطمینان کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بھارتی معاشرہ کمیونزم کیلئے تنوالہ ثابت نہیں ہو گا۔

## مولانا مفتی محمود اور جہاد افغانستان

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور --- ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء

مفتی صاحب گی سیاسی جدو جہد کا جو تھا پہلوان کی حب الوطنی ہے۔ وہ اگرچہ تحریک پاکستان میں شامل نہیں تھے بلکہ جمیعت علماء ہند کے پلیٹ فارم پر انہوں نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ہر دور میں پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کی جدو جہد میں انہوں نے شاندار کردار ادا کیا۔

افغانستان میں روئی جاریت کی پر زور مذمت اور افغان عوام کی جدو جہد کی غیر مشروط حمایت کے پیچھے جہاں اسلامی و انسانی ہمدردی کے جذبات کا فرماتھے وہاں مفتی صاحب مر حرم کا یہ احساس بھی اس معاملہ میں کافی حد تک دخیل تھا کہ افغانستان میں روئی جاریت کے سامنے سپر انداز ہونے کا مطلب خود پاکستان کی سالمیت سے ہاتھ دھونا ہے۔ اس لیے وہ کہا کرتے تھے کہ افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی آزادی کیلئے ہی نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت کے تحفظ

کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- اکتوبر ۲۰۰۰ء

..... افغانستان میں سوویت یونین کی فوجیں اتریں توماناً مفتی محمود اکیلے نہیں بلکہ ان کی ساری جماعت میدان عمل میں اتر آئی تھی۔ انہوں نے اس کے خلاف افغان عوام کی مسلح مراجحت کونہ صرف افغانستان کی آزادی کی جنگ اور شرعی جہاد کہا بلکہ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کے تحفظ کی جنگ بھی قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوویت یونین کی نظریں اصل میں پاکستان کے ساحل پر ہیں اور افغانستان اس کا صرف راستہ ہے، اور یہ کہ کہ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے میدان عمل میں کوڈ پڑے تھے۔ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری آج بھی زد میں ہے، اسے آج بھی افغانستان ہی کی جانب سے خطرات لاحق ہیں اور صورت حال جوں کی توں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب سوویت یونین کی افواج تھیں اور اب ان کی جگہ امریکی اتحادی فوجوں نے لے لی ہے۔ میدان جنگ وہی ہے، جنگ کے اہداف بھی وہی ہیں، مرنے والے افغان بھی وہی ہیں اور پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کو روپیش خطرات کا لیوں بھی وہی ہے۔ مگر آن کوئی مفتی محمود نظر نہیں آ رہا جو قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کا پرچم اٹھا کر میدان میں آئے اور قوم کو دعوت دے کے اگر اپنا وطن عزیز ہے اور اس کی وحدت و سالمیت عزیز ہے تو غیر ملکی فوجوں کا راستہ افغانستان میں ہی روک دو، انہیں آگے نہ بڑھنے دو اور ان کے خلاف مراجحت کرنے والوں کے پشتیاب بنوکہ وہ تماری ہی جنگ لڑ رہے ہیں اور پاکستان کی وحدت و سالمیت کیلئے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کی خوبیاں ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں اور پاکستان کی قوی سیاست میں ان کا روشن کردار آنے والی نسلوں کیلئے مشعل راہ ہے۔ انہوں نے جس جرأت، حوصلہ، تذیر، عزیزیت اور حکمت کے ساتھ قوی سیاست میں اہل دین کی قیادت کی اور دینی جدوجہد کے میدان میں پیشرفت کی ہمارے لیے موجودہ بحرانی حالات میں یقیناً وہ راہنمائی اور حوصلہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اس کیلئے ذہنی طور پر تیار ہوں اور مولانا مفتی محمود کی طرح ملی مقاصد اور دینی تقاضوں کی خاطر و قی مقادرات اور خود ساختہ مصلحتوں کی قربانی دینے کیلئے تیار ہو جائیں۔

مابینامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۱۶ء

..... اگرچہ اس وقت افغانستان میں رو سی جاریت کے خلاف افغان مجاهدین کی عسکری مراجحت منظم نہیں ہوئی تھی مگر اس کی شروعات ہو پہلی تھی اور اس کے مسلسل آگے بڑھنے کے رجحانات نمایاں تھے۔ اس کے باراء میں مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی گارجان بالکل واضح تھا کہ وہ اس مراجحت کے حق میں تھے اور اسے شرعی جہاد سمجھتے تھے۔ جبکہ مولانا غلام غوث ہزاروی اس جہاد اور مراجحت کو سپورٹ کرنے کے حق میں نہیں تھے اور اسے خط میں

امرکی عوام کی تیکلیں میں معاونت تصور کرتے تھے۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا ہزارویؒ کے ساتھ میری طویل خط و کتابت ہوئی تھی جس کی میں نے ایک عرصہ تک تاریخی دستاویز سمجھ کر حفاظت کی گردی قسمی سے گذشتہ تین چار سال سے تلاش بیمار اور بار بار تنگ و دود کے باوجود اس کا کوئی سرانگ نہیں مل رہا۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے؟ فیا اسفاہ۔.....

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ اکتوبر ۲۰۲۲ء

..... وطن عزیز کی سالمیت و استحکام کا معاذان کی ترجیحات میں سرفہrst تھا اور عالمی و علاقائی خطرات سے ملک و قوم کو محفوظ رکھنے میں ان کی سوچ اور محنت کار خبیثہ واضح رہا۔ افغانستان میں روئی فوجوں کی آمد کے بعد سب سے پہلے انہوں نے ہی اسے بلوچستان کے ساحلوں تک سوویت یونین کی رسانی کی ہم قرار دے کر افغان مجاہدین کی مزاحمت کو پاکستان کے دفاع کی جنگ سے تعبیر کیا، اور جہاد افغانستان کی نہ صرف کھل کر حمایت کی بلکہ عملی پشت پناہی میں بھی وہ تادم آخر تحریر کر رہے۔ اس پس منظر میں سوویت یونین کی پیاسائی کے بعد جب انہی مقاصد اور ایجاد نے کیلئے امرکی اتحاد اور مغربی استعمار کا مکروہ کھیل سامنے آیا ہے تو امارتِ اسلامی افغانستان کی جنگ اور تنگ و دو اس خطے میں امرکی کمپ کے پھیلیتے ہوئے اثر و سوچ کا راستہ روکنے کیلئے جو کردار ادا کر رہی ہے اس کی اسی سطح پر اور اسی لمحے میں حمایت و امداد کرنے کی ضرورت ہے جس طرح بلوچستان کے ساحلوں کو سوویت یونین کی رسانی سے محفوظ رکھنے کیلئے مولانا مفتی محمود نے جہاد افغانستان کی دو ٹوک جماعت کی تھی۔.....

## افغانستان، پولینڈ، اسرائیل

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور۔ ۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء

افغانستان میں روئی جاریت کی شدت میں ابھی کمی نہیں ہوئی تھی کہ مشرقی یورپ کے ملک پولینڈ میں "کیونسٹ مارش لاء" کا نفاذ اور اسرائیل کی طرف سے جولان کی متنازعہ حیثیت کو ختم کرنے کی کارروائی نے عالمی سیاست کو ایک نیا رخ دے دیا ہے اور پوری دنیا اس نئی کشمکش کے نتائج پر سوچنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

افغانستان میں عالمی کمیونزم اپنے فروغ اور پولینڈ میں بقاء کی جنگ لڑنے میں مصروف ہے لیکن افغانستان میں غیر افغان عوام اور پولینڈ میں آزاد مزدور تنظیم سالیڈیریٹی سوویت یونین کے ارادوں کی تیکلیں میں حائل ہیں۔ کیونسٹ تحریک نے سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ نظام اور استعماریت کے خلاف مظلوم اقوام و طبقات کے حقوق کے تحفظ کے نعرے کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور مظلوم افراد و طبقات نے اسی جذبہ کے تحت کمیونزم کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ لیکن

زیادہ دیر تک یہ تحریک اپنے استعمار شمن کردار کو برقرار نہ رکھ سکی اور مفادات کی جگہ نے خود اسے استعماری قوتوں کی صفائی میں لاکھڑا کیا۔ کمیونزم اصل میں ر عمل تھا استعماریت، سرمایہ داری اور جاگیر داری کی چیزوں کا، لیکن اب خود کمیونزم کی چیزوں اور جروں استبداد کے خلاف ر عمل کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ جسے جروں قوت کے ذریعے بنانے کیلئے سوویت یونین نے پہلے ہنگری اور چیکو سلوکیہ میں فوجی طاقت استعمال کی اور اب پولینڈ کی صورتحال بھی کم و بیش وہی رخ اختیار کرتی جا رہی ہے کہ یا تو روس کو قوت کے ذریعے پولینڈ میں مزدوروں کی آزادی کو دیانا ہو گا اور یا پھر کمیونزم کیلئے بوریا بستی میٹنے کے سوا کوئی چارہ کارباقی نہیں رہ جائے گا۔

پولینڈ کی صورتحال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قیاس کے خلاف نہیں ہو گا کہ کمیونزم کو ”ریورس گیز“ لگ چکا ہے اور اب وہ پیش قدمی کی بجائے دفاع کے مورچوں پر ہے۔ ان حالات میں کسی عنصر کا اس غلط فہمی کا شکار ہو جانا کہ روس افغانستان میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے بعد کمیونزم کی سرحدوں کو وسیع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ روس کو بالآخر افغانستان سے واپس جانا ہے اور عالمی حالات مستقبل کا جو نقشہ دکھاتے ہیں وہ کچھ یوں ہے کہ جاریت اور فوجی مداخلت کے ذریعے روس کی ملک اور قوم کو کتنا ہی نشانہ بنائے لیکن کمیونزم کے نظریاتی تحفظی کی جنگ بالآخر سے اپنی سرحدوں کے اندر ہی لٹھنا ہو گی۔

ادھر پولینڈ کی صورتحال سے فائدہ اٹھانے میں اسرائیل نے جس عجلت اور چاکدستی سے کام لیا ہے اس پر اس کی موقع شناسی کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس نے عالمی رائے عامہ کو پولینڈ کی طرف ہم تین متوجہ پا کر جولان کے اس علاقے کو اسرائیل میں خضم کرنے کی کارروائی مکمل کر لی جس پر اس نے ۱۹۴۷ء میں قبضہ کیا تھا۔ اسرائیل کی اس کارروائی کو اگرچہ عالمی رائے عامہ اور اقوام متحده کی سلامتی کو نسل نے رد کر دیا ہے اور بظاہر امریکہ نے بھی خفیٰ کاظہ بار کیا ہے لیکن اسرائیل کارروائی سے دو باقیں عیاں ہیں:

1. ایک یہ کہ وہ ملتِ اسلامیہ کو تقصیان پہنچانے اور اپنے ناجائز قبضہ کے استحکام کیلئے کوئی موقع ہاتھ سے کھونے کیلئے تیار نہیں۔

2. اور دوسری یہ کہ ظاہری خفتگی کے باوجود اسرائیل کی قوت و طاقت کا اصل سرچشمہ امریکہ بہادر ہے جس کی پشت پناہی کے بغیر اسرائیل کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

جولان کا علاقہ شام کی ملکیت ہے اور زود یاد بیر شام ہی کے پاس واپس جائے گا۔ لیکن اسرائیل کی اس حرکت نے عالمِ اسلام کو سبق دیا ہے کہ اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کی جنگ میں انہیں ہر وقت چونا رہنا ہو گا اور باہمی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنا ہو گی۔

## روسی جارحیت اور پاکستان کے انتخابات

بفت روزہ ترجمان اسلام، لاپور --- ۵ مارچ ۱۹۸۲ء

وزیر داخلہ جناب محمود ہارون نے اپنے دورہ کویت کے دوران کویت کی خبر رسال ابجھنی کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کو علاقائی اور اندر وطنی طور پر درپیش صورتحال پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس ضمن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ افغانستان میں رو سی جارحیت کے جاری رہنے تک پاکستان میں انتخابات نہیں ہو سکتے اور یہ بھی کہا کہ سیاستدان حکومت کو متفقہ سیاسی لائچے عمل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

انٹرویو کے دیگر مندرجات سے قطع نظر ہم جناب محمود ہارون کے ان دوناکات سے اختلاف کی جسارت کریں گے کیونکہ:

1. ہمارے خیال میں پاکستان میں عام انتخابات کے انعقاد کو رو سی جارحیت کے ساتھ مسلک کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہنا بُنی برحقیقت ہے کہ پاکستان میں حالات انتخابات کیلئے سازگار نہیں ہیں۔ ہمارے پڑو سی ملک ایران نے اپنی چوٹی کی لیڈر شپ کے حادثہ میں ہلاک ہونے کے بعد عراق کے ساتھ جنگ کے دوران انتخابات منعقد کرائے ہیں اور ہماری طرح ایران کو بھی رو سی جارحیت کے اثرات کا سامنا ہے۔ ہاں اگر انتخابات کے ضمن میں رو سی جارحیت کے حوالے سے انتخابات کے حامی عناصر بات کریں تو زیادہ بھتی ہے کیونکہ ان کا یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہو گا کہ افغانستان میں رو سی جارحیت کے تسلسل کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں انتخابات کے ذریعے منتخب حکومت کا قیام جلد از جلد عمل میں لایا جائے تاکہ نمائندہ حکومت عالمی برادری میں پاکستان کے موقف کو زیادہ اعتناد اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھا سکے۔

2. اسی طرح جناب محمود ہارون کا یہ کہنا بھی واقعہ کے مطابق نہیں ہے کہ پاکستان کے سیاسی رہنماء حکومت کو متفقہ سیاسی لائچے عمل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ ملک کے تمام قابل ذکر سیاسی رہنماء سیاسی عمل کی بجائی، ۳۷۱ء کے آئین کی بالادستی، سنسنر شپ کے مکمل خاتمه اور انتخابات کے ذریعے نمائندہ حکومت کے جلد از جلد قیام پر متفق ہیں۔ کوئی سیاسی جماعت ایسی نہیں ہے جسے ان نکات سے اختلاف ہو اور یہ چار متفقہ نکات موجودہ سیاسی بحران سے نکلنے کا واحد راستہ ہے جسے اختیار کرنے میں حکومت کو تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔

## تحریک آزادی اور علماءِ حق

بیفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور۔ ۹ اپریل ۱۹۸۲ء

علماء کرام نے بنیادی طور پر پاکستان بنانے کیلئے مندرجہ ذیل شعبوں میں کام کیا:

- بر صیر کے مسلمانوں میں دینی افکار و نظریات اور اقدار و روایات کو اصلی صورت میں زندہ رکھا اور یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دینی اقدار و روایات ہی تحریکِ پاکستان کی کامیابی اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی والہانہ عقیدت کا باعث بنتیں۔
- انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد آزادی کی قیادت، فرنگی راج کے خلاف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ جہاد، بالاکوٹ میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہیدی شہادت، ۱۸۵۷ء کا معرکہ حریت، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ تحریک ریشمی رومال، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترک موالات، تحریکِ بھارت افغانستان، فرنگی فوج میں بھرتی ہونے کی حرمت کا فتویٰ، اور آزادی کا مل کیلئے جمعیت علماء ہند کا نمایاں کردار اس کی مختلف کثریاں ہیں۔
- تحریکِ پاکستان کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام مولانا شیبیر احمدؒ عثمانی، حضرت مولانا ظفر احمدؒ عثمانی اور دیگر سر برادرہ علماء کرام کی تائید و حمایت حاصل رہی۔ حکیم الامت تھانویؒ کی حمایت اور سرحد اور سلہٹ کے ریفارڈم میں حضرت مولانا شیبیر احمدؒ عثمانی اور حضرت مولانا ظفر احمدؒ عثمانی کی خدمات کا اعتراف خود بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے اس وقت کے قوی پریس میں واضح طور پر کیا۔ اور ان کی خدمات کے عملی اعتراف کے طور پر پاکستان کا جنہنہ اکابری میں علامہ شیبیر احمدؒ عثمانی اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمدؒ عثمانی کے ہاتھوں سب سے پہلے لہرا گیا۔

جمعیت علماء کا قیام باتفاق طور پر ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امر تسریں معرض عمل میں آیا۔ اس کا قیام دراصل تحریک ولی اللہی کو اس وقت کے حالات اور تقاضوں کے مطابق از سرنو منظم کرنے کیلئے عمل میں آیا تھا۔ اس جگہ تحریک ولی اللہی کے مختلف ادوار کا ذکر ضروری ہے تاکہ جمعیت علماء ہند کے قیام کا بنیادی مقصد سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بر صیر میں مغلوں کا زوال اور مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالیؒ کو ہندوستان پر حملہ کرنے اور مرہٹوں کا زور توڑنے کی دعوت دی۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کے اہل حق کی معاونت سے پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو فیصلہ کن نشست دے کر ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اس کے ساتھ ہی امام ولی اللہؒ نے آنے والے خطرات کو جھانپ کر اسلام کے اقتضادی، سیاسی اور معاشی نظریاتی کی وضاحت کی اور انقلاب فرانس سے پچاس سال قبل اور کارل مارکس کی پیدائش سے سو سال قبل انسان

کے جھوٹی و افقصادی حقوق قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں ایک فکری و عملی جماعت کی بنیاد رکھ دی، جس جماعت نے بر صیر میں ان مقاصد کیلئے نمایاں خدمات انجام دیں:

1. جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے پورے بر صیر کو اپنے تسلط میں لے کر فرنگی قوانین کے اجراء کا اعلان کیا تو حضرت شاہ ولی اللہ کے جاثین اور تحریک ولی اللہ کے سربراہ شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر فرنگی کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اس کیلئے باقاعدہ جماعت کو عملی طور پر تیار کیا۔

2. حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے سید احمد شہید کے ساتھ مل کر جہاد کا آغاز تحریک ولی اللہ کے سوچ سمجھے پروگرام کے مطابق پشاور کے علاقہ سے کیا۔ تحریک ولی اللہ کی فوج راجھستان، سندھ اور بلوچستان سے ہوتی ہوئی پشاور پہنچی اور اس علاقہ کو اپنی تحولی میں لے کر تحریک ولی اللہ کے پروگرام کے مطابق اس صوبہ میں، جس کی سرحدیں آزاد کشمیر کے پہاڑوں سے خوشاب کی پہاڑیوں تک وسیع تھیں، قرآن و سنت کا نظام نافذ کیا۔ سید احمد شہید نے امیر المؤمنین کی حیثیت سے چھ ماہ اس خطہ پر حکومت کی لیکن پنجاب کی سکھ حکومت نے اسے اپنے اقتدار کیلئے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انگریزی کی مدد سے سازشوں کے جال بچھا دیے چنانچہ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید ۱۸۳۱ء کو بالا کوٹ میں شیر سنگھ کی فوج اور اس کی پشت پر فرنگی ڈپلمیسی کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمائے۔

3. اس کے بعد ولی اللہ تحریک نے جدو جہد کوئے سرے سے منظم کیا جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کا عظیم الشان معزز کہ حریت برپا ہوا۔ اس معزز کہ حریت میں ولی کے محاذ کے سپہ سalar جزل بخت خان روہیا نے سید احمد شہید کے خلیفہ مولوی سرفراز علیؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ اور شاہی کے محاذ پر حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے علمی و روحانی فرزند مولانا محمد قاسم ناٹوپی، حاجی امداد اللہ مہاجر کی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجظ ضامن شہید اور مولانا رحمت اللہ کیر انوئی نے جہاد کی کمان سنپھائی تھی۔ مگر اپنوں کی غداری کی وجہ سے یہ منصوبہ کامیابی کی آخری حد تک پہنچنے پہنچنے ناکام ہو گیا۔

4. ۱۸۵۷ء کے جہاد کی وقتی ناکامی، ہزاروں علماء کی شہادت، فرنگی کی طرف سے ہزاروں دینی مدارس کے خاتمه اور ہندوستان کے سادہ لوح مسلمانوں پر یورپی عیسائی پادریوں کی یک طرفہ فکری یلغار کے بعد تحریک ولی اللہ نے دینی علوم کو زندہ رکھنے کیلئے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور امداد بائیہی کی بنیاد پر اس عظیم تعییی تحریک کا آغاز کیا، مولانا محمد قاسم ناٹوپیؒ اس کے بانی ہیں۔ جبکہ عیسائی پادریوں کی فکری یلغار کو مولانا محمد قاسم ناٹوپیؒ، مولانا رحمت اللہ کیر انوئی، مولانا شرف الحق دہلویؒ اور ان کے رفقاء نے روکا اور اس طرح فرنگی کے فکری و علمی حملہ کو ناکام بنادیا۔

5. دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے والے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اپنے شاگرد مولانا عبد

اللہ سندھیٰ اور دیگر تلامذہ کے ساتھ جمیعۃ الانصار قائم کی جس کا بنیادی مقصد علماء کو انگریز کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کرنا تھا۔ خود حضرت شیخ الہند نے ترکی، افغانستان اور جماز کی حکومتوں کی مدد سے آزادی وطن کی تحریک کا خاکہ تیار کیا جس کے تحت ترکی کی فوج نے افغانستان کے راستے سے ہندوستان پر حملہ کرنا تھا اور تحریک ولی اللہی نے ملک کے اندر علم جہاد و حریت بلند کر کے فرنگی اقتدار کا تحفظہ الثان تھا۔ لیکن تحریک کی دستاویزات قبل از وقت انگریز کے ہاتھ لگ گئیں جس کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور نہ خود انگریز کے بقول فرنگی کو سمندر بھی پناہ نہ دیتا۔ چنانچہ شیخ الہند گوان کے رفقاء مولانا سید احمد مدنی اور مولانا عزیز گل مظلہ اور دیگر احباب سمیت جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔

6. اس منصوبہ میں شرکت کے جرم میں افغانستان کو بھی فرنگی کے غیظاً و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔ افغانستان کو فرنگی تسلط سے بچانے اور تحریک آزادی کیلئے پناہ گزین کیپ کے طور پر محفوظ رکھنے کیلئے تحریک ولی اللہی کے رہنمای مولانا عبد اللہ سندھیٰ نے کابل میں بیٹھ کر فرنگی کے خلاف افغانستان کی مسلح جنگ کی رہنمائی کی جس کے نتیجے میں افغانستان پر جگہی اقتدار قائم نہ ہوسکا۔ غالباً دنیا کا واحد ملک افغانستان ہے جو فرنگی تسلط سے محفوظ رہا، اس کی منفصل روپورٹ مولانا عبد اللہ سندھیٰ کے رفیق ظفر حسین ایک نے اپنی آپ بیتی مطبوعہ قونی کتب خانہ لاہور میں درج کی ہے۔

ان مراحل سے گزر جانے کے بعد جب آئینی جدوجہد کا مرحلہ پیش آیا تو جمیعت علماء ہند کی بنیاد رکھی گئی۔

## شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

۱۱ مارچ ۱۹۸۴ء کو شیخ الہند سوسائٹی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ایک سمینار سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بر صیر پاک و ہند و بغلہ دیش کے ان عظیم رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے برطانوی استعمار کی غلامی کے دورِ عروج میں سورج غروب نہ ہونے والی سلطنت کے غلبہ و استغلاٰ کو نہ صرف یہ کہ خود ذہنی اور شعوری طور پر قبول نہ کیا بلکہ فکر و عمل، جدوجہد و استقامت اور عزم و استقلال کی شمع کو اپنے خون سے روشن کر کے برادران وطن کو آزادی اور استقلال کی اس شاہراہ پر گامزن کر دیا جس پر چلتے ہوئے اس خطے کے عوام نے غلامی کی ہولناک دلدل کو عبور کر کے حریت کے میدان میں قدم رکھا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن گا تعارف دیوبندی فکری اور علمی درس گاہ کے پہلے طالب علم کی حیثیت کرایا جاتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ دیوبند کے قصبہ کی مسجد چھتہ میں انار کے درخت کے زیر سایہ ۱۸۲۲ء کے دوران قائم کیے ہوئے

وائلے دینی مدرسے کے پہلے طالب علم تھے اور اس سبقت کا تاج سعادت آپ کے سر پر حسن و خوبی کے ساتھ جگہ گارہا ہے۔ مگر میرے نزدیک شیخ الہندؒ کا اصل تعارف یہ ہے کہ وہ ان آہوں، تمناؤں، آرزوؤں، سحر خیز دعاؤں اور آنسوؤں کا شہرہ طبیبہ تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اس خطہ زمین میں دین اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کے پارے میں پریشان و مضطرب ہزاروں کڑھتے جلتے دلوں اور جل تھل آنکھوں سے روای دواں تھے۔ دیوبند ایک علمی، فکری اور سیاسی تحریک کا عنوان ہے اور اس عنوان کے ساتھ اگر کسی شخصیت کو ایک جامع اور مکمل علمات کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ذاتِ گرامی ہے۔

شیخ الہندؒ نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھول کر ارد گرد کے ماحول پر نظر ڈالی تو یہ وہ دور تھا جب برطانوی سامراج کے غلبہ کا ناقوس دنیا کے کم و بیش ہر خطہ میں نجح رہا تھا اور عالم اسلام کے پیشتر ممالک برطانوی، فرانسیسی اور ولنڈ بیزی استعمار کی شانچے میں جکڑے جا چکے تھے۔ کم و بیش پانچ سو سال تک عالم اسلام کی قیادت و حفاظت کا فریضہ سرانجام دینے والی ترکی کی خلافت عثمانیہ "یورپ کا مرد بیمار" کا لقب پا کر عالمِ نزع میں قدم رکھ رہی تھی اور خلافت عثمانیہ کی گرفت میں کمزوری کے احساس کے ساتھ ہی عالم اسلام کے روحاںی مرکز کے مکررمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے خلاف استماری قوتوں کی سازشوں کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ دیوبند میں چالیس سال سے زائد عرصہ تک تعلیمی خدمات سرانجام دینے کے بعد جب آپ نے اپنی تدریسی و تعلیمی محنت کے ثرات کو مجتمع کرنے کیلئے "جمعیۃ الانصار" کی تشكیل کی طرف اپنے شاگردوں کی راہنمائی فرمائی تو یہ نقطہ آغاز تھا آپ کی اس جدوجہد کا جو بہت تھوڑے سے عرصہ میں نہ صرف متعدد ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی بلکہ اس کے اثرات افغانستان، ترکی، چجاز مقدس اور عالم اسلام کے دیگر حصوں تک وسیع ہو گئے۔ اور آپ نے نہ صرف بر صغیر پاک و ہند کی آزادی کی تحریک کی راہنمائی اور قیادت کی بلکہ آپ کی فکری جدوجہد سے افغانستان، ترکی اور چجاز کی تحریکات نے بھی استفادہ کیا۔ اور اس موقع پر محض جذبات و عقیدت کے حوالے سے نہیں بلکہ واقعات اور شواہد کے تجزیہ کی بنیاد پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے اس ارشاد کی تصویب و تصدیق کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا جاتا کہ حضرت مولانا محمود حسنؒ کی شیخ الہند کا لقب ان کی علمی حیثیت اور جدوجہد کی وسعت سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ انہیں شیخ العالم کے لقب سے یاد کر کے ہی ان کی شخصیت اور جدوجہد کے اصل دائرہ کار کا اور اک کیا جاسکتا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ بنیادی طور پر بر صغیر پاک و ہند و بلکہ دلش کی جنگ آزادی کے قائد تھے لیکن ان کا دل در دمند عالم اسلام کی اجتماعی مشکلات سے بے گانہ نہ تھا اور ان کی تنگ دو وو کے اہداف میں متعدد ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کے دیگر ممالک میں استعماری قوتوں کی سازشوں اور استھصال سے مسلمانوں کو نجات دلانا بھی شامل تھا۔

متعدد ہندوستان کی جنگ آزادی کا تسلسل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ٹوٹ چکا تھا اور افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ آزاد قبائل کی پیٹ پر قبائلی حریت پسندوں کے معزکہ ہائے حریت اس تسلسل کو باقی رکھنے کی ایک کوشش دکھائی دے رہے تھے۔ مگر قوی سلطن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی استعمار کی عالمی کا طوق گردن سے اتار دینے کی

اس جدو جہد کو حضرت شیخ الہند نے ہی منظم کیا جسے دنیا رشمی رومال کی تحریک کے نام سے یاد کرتی ہے اور جس کیلئے شیخ الہند نے صرف ملک کے اندر لاکھوں لوؤں میں بغاوت اور حریت کی دلپی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکایا تھا بلکہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے ساتھ باقاعدہ منصوبہ بنندی کر کے بیرونی پشت پناہی اور تعاوون کے ساتھ بغاوت کی اس غلیم جدو جہد کو منظوم کر لیا تھا۔ لیکن عالمی جنگ میں ترکی کے حلیف جرمنی کی شکست کے بعد عالمی حالات ساز گارنے ہونے کے باعث یہ جدو جہد پروان نہ چڑھ سکی اور اس کا مقیمہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خاتمه کے ساتھ شیخ الہند گی گرفتاری اور مالا جزیرہ میں نظر بنندی کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ تحریکات آزادی میں مزاحمت، تشدد اور تصادم کی بنیاد پر منظوم کی جانے والی قوی سطح کی آخری تحریک تھی جس کے بعد تحریکات آزادی کا رخ عدم تشدید کی طرف مڑا۔

افغانستان اپنے بہادر عوام کی دینداری اور غیرت و حیثیت کی وجہ سے بے سروسامانی کے باوجود ہندوستان کے مجاہدین آزادی کا ایک روایتی پشت پناہ تھا اور اس کی سرحد کے ساتھ ساتھ آزاد قبائل کی پٹی ہندوستان کی آزادی کی جنگوں کا میں کیپ بنی ہوئی تھی جہاں حاجی صاحب تر نگزی کی قیادت میں عملی جہاد کا سلسہ جاری تھا۔ برطانوی استعمار نے اس پریشانی سے جان چھڑانے کیلئے افغانستان پر قبضہ کرنے کو اپنی حکمت عملی کا حصہ بنالیا اور باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا۔ مگر اس جنگ کے آغاز سے قبل شیخ الہند مولانا محمد حسنؒ کے تلمذ خاص مولانا عبد اللہ سندھی کا بابل پہنچ کر افغانستان میں شیخ الہند کے شاگردوں، خوشہ چینوں اور آزاد قبائل کے حریت پسندوں کے درمیان رابطہ اور اعتماد کا ایک ایسا نظام قائم کر چکے تھے جس کا سامنا برطانوی استعمار کی منظم افواج نہ کر سکیں۔ مولانا سندھیؒ نے کابل میں پہنچ کر افغانستان اور آزاد قبائل میں شیخ الہند کے علمی و فکری اثرات کو مجتنب کر کے ایک ایسی قوت کی شکل دے دی جس نے افغانستان کی جنگ استقلال میں بنیادی کردار ادا کیا اور بالآخر برطانوی استعمار اس بات پر مجبور ہو گیا کہ افغانستان کی آزادی اور استقلال کا احترام کرتے ہوئے اس کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد قرار دے کر اسے عبور نہ کرنے کا سمجھوتہ کرے۔

ترکی کی خلافت عثمانیہ پائی خسوساً تک مسلمانوں کی خدمات سر انجام دینے کے بعد اضھمال کا شکار ہونے کے باوجود ایک حد تک مسلمانوں کی وحدت کی علامت اور قوت و شوکت کے نشان کی بیشیت اختیار کیے ہوئے تھی۔ یورپ کی صیبی قوتوں کو عثمانی خلفاء بالخصوص سلطان محمد فاتح تھی مجاهدان یلغار ابھی تک یاد تھی اور قسطنطینیہ پر مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے دلوں میں لگنے والے گھاؤ مندل نہیں ہوپائے تھے۔ اس لیے ان صیبی قوتوں کی تمام تر حکمت عملی اور پالیسیوں کا محور یہ نتہ قرار دیا گیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو خلافت عثمانیہ کا تیا پانچ کر کے نہ صرف عالم اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے بلکہ کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھین کر یہودیوں کے حوالے کیا جاسکے تاکہ اس عظیم احسان کے صلہ میں صیہونی اور صیبی قوتوں کے درمیان اشتراک و اتحاد کی راہ ہموار ہو اور یہودیوں کی دولت عالمی اثرات اور سازشی ذہن کو مغربی استعمار کے حق میں استعمال کرنے کی صورت پیدا ہو۔ چنانچہ خلافت عثمانیہ کے ایک صوبہ جزاً مقدس کے گورنر شریف مکہ حسین کو انگریزوں نے پورے عرب کی خلافت کا لائچ دے کر بغاوت کیلئے تیار کیا اور تزویں کی خلافت کے خلاف فتویٰ کی آڑ میں ان کے خلاف عالم اسلام میں نفرت اور غیظ و غضب کی آگ بھڑکانے کا سامان مہبیا کیا۔ شریف مکہ حسین کے ایما پر تزویں کے خلاف فتویٰ جب مرتب ہوا اور اس کی ترتیب و اشاعت میں

ہندوستان کے بعض علماء بھی شریک کار ہوئے تو حضرت شیخ الہند ان دونوں حجاز میں تھے، آپ کے سامنے یہ فتویٰ پیش ہوا مگر آپ نے کمال بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ترکوں کے خلاف یہ فتویٰ شریف مکمل بغاوت کی بنیاد بنا جس کے تباہ پر ایک نظر ڈال لیجئے:

• خلافتِ عثمانیہ کے زیر نگیں عرب علاقے کی مستقل عرب حکومتوں میں تبدیل ہو گئے۔

• اسی بذریعت میں استعماری قتوں نے فلسطین میں یہودیوں کو بسانے اور ان کیلئے الگ اسرائیلی ریاست کے قیام کی راہ نکالی۔

• خود خلافت عثمانیہ یہ وارنه سہ سکی اور یورپ کا یہ "مردیبار" آخری بچکی لے کر عالمی نقشے سے غائب ہو گیا۔ مگر اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن<sup>ؒ</sup> کی طرف سے ترکوں کے خلاف فتویٰ پر دستخط سے انکار کے اثرات یہ ظاہر ہوئے کہ پورے ہندوستان میں خلافت عثمانیہ کے حق میں مولانا محمد علی جوہر<sup>ؒ</sup> اور دیگر قوی قائدین کی راہنمائی میں تحریک خلافت کے عنوان سے ایک پر جوش تحریک چل جو آزادی کی آئندہ جدوجہد کی بنیاد ثابت ہوئی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن<sup>ؒ</sup> کے سامنے دراصل پورے عالم اسلام کی آزادی کا تصور تھا اور وہ استعماری قتوں کے زیر تسلط تمام مسلم ممالک کی حریت کیلئے مضطرب تھے۔ لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان استعماری قتوں میں سب سے بڑا استعمار برطانوی سامراج ہے اور اس کی قوت کا اصل سرچشمہ متحده ہندوستان ہے۔ اس لیے عالم اسلام کی آزادی کا دار و مدار اس پر ہے کہ ہندوستان آزاد ہو تو اسکے برطانوی استعمار میں باقی ممالک کو زیر تسلط رکھنے کی سکت باتیں نہ رہے اور پھر دوسرا استعماری قتوں کو بھی مسلم ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہونا پڑے۔ چنانچہ شیخ الہند<sup>ؒ</sup> کی جدوجہد کا اصل ہدف متحده ہندوستان کی آزادی رہا ہے اور اس مضمبوط مٹکنم بنا دیا پر انہوں نے عالم اسلام کی تمام تحریکات آزادی کو نہ صرف فکر و نظر کی تو انکی عطا فرمائی بلکہ جدوجہد عمل اور ایثار و استقامت کا حوصلہ بھی بنداشتا۔

آج شیخ الہند<sup>ؒ</sup> کے اس تصور کی صداقت تاریخ کی ایک روشن حقیقت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی عالم اسلام کے گرد استعماری قتوں کے غالبہ کا حصار دیکھتے ہی دیکھتے رابع صدی سے بھی کم عرصہ میں ٹوٹ گیا ہے اور میں اسے افغانستان اور آزاد قبائل کے ساتھ شیخ الہند<sup>ؒ</sup> کے گھرے فکری، علمی اور سیاسی روابط ہی کا شمرہ قرار دوں گا کہ افغانستان پر روسی استعمار کی مصلحت یلغاردم توڑتی دکھائی دے رہی ہے۔

آج آپ افغانستان میں روس جیسی عالمی استعمار اور سپرپاؤر کے خلاف صاف آراؤ افغان مجہدوں اور حریت پسندوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو ان میں ایک بڑی تعداد ان علماء کی نظر آئے گی جو حضرت مولانا سید حسین احمد<sup>ؒ</sup> مدینی اور حضرت مولانا عبد الحمید<sup>ؒ</sup> کے صرف دو واسطوں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن<sup>ؒ</sup> کی شاگردی کا شرف رکھتے ہیں۔ اور اس طرح عملاً افغانستان کے جہاد کی کڑیاں بھی شیخ الہند<sup>ؒ</sup> اسی تحریک سے جاتی ہیں جس کا مقصد عالم اسلام کو ہر قسم کے استعمار اور سامراج سے نجات دلا کر مکمل آزادی اور غالبہ اسلام کی منزل سے ہمکنار کرنا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن<sup>ؒ</sup>، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد<sup>ؒ</sup> مدینی اور شیخ الحدیث مولانا عبد الحمید<sup>ؒ</sup> کے فکر و عمل اور ایثار و قربانی کے وارث افغان مجہدوں پورے عالم اسلام کے تشکر

کے مستحق ہیں کہ انہوں نے:

- بے سرو سامانی کی حالت میں اپنے وطن کی دینی غیرت و تشخص کا تحفظ کیا۔
- پاکستان اور مشرق و سطی کی طرف رو سی استعمار کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔
- اپنی جرأت و استقامت اور جذبہ جہاد کے ساتھ روس کی ان مسلم ریاستوں میں دینی بیداری کی لہر دوڑادی جو رو سی سامراج کے آہنی شکنجه میں بکھڑی ہوئی ہیں۔ اور آج جب روس جیسی عالمی قوت اپنے زیر تسلط مسلم علاقوں بالخصوص قاز قستان اور ازبکستان میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی دینی بیداری سے خوفزدہ ہو کر افغانستان سے واپسی کی راہیں تلاش کر رہی ہے تو فکر و نظر کی جیہیں نیازِ عالم تصور میں اس عظیم شخصیت کے سامنے خم ہونے کیلئے بے چین ہے جسے دینا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

## ریموٹ کنٹرولڈ غلامی کا امریکی منصوبہ؟

بیفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ۲۶ جون ۱۹۸۴ء

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب استعماری قتوں کے قویٰ محل ہونے لگے اور نوابادیاتی مقبوضات پر ان کی گرفت قائم رہنے کے امکانات کم ہو گئے تو ان غلام ملکوں کے رہنے والے عوام کی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کے آثار پیدا ہو گئے کہ وہ آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد فضای میں سانس لے سکیں اور استعماری قتوں کے مقبوضہ ممالک یکے بعد دیگرے آزاد ہونے لگے۔ لیکن سامراجی طاقتون نے نوابادیاتی مقبوضات پر تسلط سے مکمل طور پر دستبردار ہونے کی بجائے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی کہ یہ ممالک اور اقوام بظاہر آزاد ہو جائیں مگر ان کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی پالیسیوں پر سامراجی آقاوں کی چھاپ اور کنٹرول بدستور قائم رہے۔ چنانچہ آزاد ہونے والے بیشتر ممالک ظاہری غلامی سے نجات حاصل کرنے کے باوجود اپنی پالیسیوں کے لحاظ سے ”ریموٹ کنٹرول غلامی“ کا شکار ہیں اور آج تیسری دنیا اور عالمِ اسلام کے بیشتر ممالک کا حال یہ ہے کہ آزاد اور خود مختار ریاستیں کھلانے کے باوجود وہ

- دفاعی خود مختاری اور خود کفالت کے تصور تک سے نآشناہیں۔
  - کسی نہ کسی عالمی استعماری قوت کے زیر اثر رہنے پر مجبور ہیں۔
  - اقتصادی امداد کے خوشنما عنوان کے تحت ان کی معاشی پالیسیاں امداد دینے والی عالمی طاقتون کے مفادات کے دائرة میں محصور ہیں۔
  - جدید ٹکنالوجی اور توانائی کے اعلیٰ ترین وسائل ان کیلئے شہرجمنوعد ہیں۔
- کم و بیش بھی حال پاکستان کا بھی ہے۔ پاکستان جو بر صیر پاک و ہندو بنگلہ دیش کی اکائی کا ایک حصہ تھا ۱۹۷۷ء میں

تعمیم ہند کے نتیجہ میں وجود میں آیا اور ۱۹۷۲ء کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر ابھرا۔ پاکستان نے آزادی برٹش استعمار سے حاصل کی تھی لیکن اس وقت تک برطانوی استعمار عالمی جنگوں کے نتیجہ میں سمت سماں کر ہے اور برطانیہ تک مخصوص ہو چکا تھا اور اس کیلئے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ پوری دنیا میں مغرب کے سیاسی اور اقتصادی مفادات کے تحفظ کیلئے کوئی روں ادا کر سکے۔ اس لیے وہ اپنی یہ ذمہ داریاں تازہ دم اور تو ان امریکی استعمار کے سپرد کر کے عالمی کردار سے ریٹائر ہو گیا۔

پاکستان نئے کے فوراً بعد طے شدہ منصوبہ کے مطابق پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے نازک منصب پر چودھری ظفر اللہ خان جیسے شخص کو لایا گیا جو مرزاعلام احمد قادریانی کے مخلص بیوی و کارکی حیثیت سے اور اپنے ذاتی کردار کے حاظہ سے بھی برطانوی استعمار کا مکمل وفادار تھا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو برطانوی استعمار کے جانشین امریکی استعمار کے مفادات کے ساتھ میں ڈھانے کیلئے جس محنت، لگن اور خلوص سے کام کیا ہے تناگ و شمرات کو دیکھتے ہوئے اس کی داد دنہ دینانا انصافی کی بات ہو گی۔ جس وقت پاکستان کی خارجہ پالیسی تشکیل کے ابتدائی مرحل میں تھی دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہونے والی تین عالمی صفت بندی کے نتیجہ میں امریکہ اور روس نئی عالمی قوتوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے سامنے آپکے تھے۔ اس وقت پاکستان کی نظریاتی اساس، جنوبی ایشیا کے مخصوص حالات اور عالم اسلام کے مجموعی مفادات کا تقاضا تھا کہ پاکستان عزیمت کاراستہ اختیار کرتے ہوئے ان دونوں عالمی طاقتوں کی کشمکش اور باہمی محاذاہ آرائی میں فرقی نہیں کی جائے مکمل طور پر غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اختیار کر کے عالم اسلام کو متحد کرنے اور ملتِ اسلامیہ کو ایک مضبوط نظریاتی قوت کے طور پر سامنے لانے کی حکمتِ عملی اختیار کرتا۔ لیکن ظفر اللہ خان کی وزارتِ خارجہ نے اس نو تشکیل شدہ ملک کو خارجہ پالیسی کا جو ڈھانچہ مہیا کیا اس نے پاکستان کو بہت جلد امریکی لائبی کے ایک وفادار ملک کی حیثیت دے دی اور بالآخر سے سیٹو اور سینو کے معابدات میں باقاعدہ شریک ہو کر اپنی اس جانبدارانہ حیثیت کا اعلان کرنا پڑا۔

اس خارجہ پالیسی کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں پر امریکی چھاپ گہری ہو گئی۔ چنانچہ ایسا ہوا اور اس حد تک ہوا کہ قوی آسمانی جیسے ذمہ دار ادارے کے ریکارڈ میں ایک اہم ملکی شخصیت کے یہ ریمارکس آئی بھی کسی تذید کے بغیر موجود ہیں کہ پاکستان میں حکومت کی کوئی تبدیلی امریکی کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہ بات اب کسی دلیل کی محتاج نہیں رہی کہ پاکستان کے سیاسی مستقبل کو امریکہ کی دوڑی پارٹیوں ری پبلکن پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی کے درمیان اقتدار اور طاقت کے توازن کے بیانے میں مانجا تاہے اور اقتدار کی سیاست کرنے والے بڑے بڑے پاکستانی سیاستدانوں کو بھی اپنی قسمت کا حال امریکی وزارت خارجہ کے جنوبی ایشیا کے ڈیک کے حکام سے معلوم کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی اور دفاعی اور اقتصادی شعبوں پر اس حد تک کثری و کثری کے صلہ میں امریکہ نے پاکستان کو کیا دیا ہے؟ وہ آرماش کے دو سنگین مرحل ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس کے کردار کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔

ہماری ان گزارشات کا مقصد یہ تاثر دینا ہیں ہے کہ امریکہ کی بجائے دوسری عالمی طاقت روں کے ساتھ واپسی کی صورت میں شاید صورتِ حال کچھ مختلف ہوئی کیونکہ مشرق و سلطی اور افغانستان میں ہم روں کا کردار بخوبی دیکھے چکے ہیں کہ وابستہ ممالک کے ساتھ اس کی وفاداری کبھی یک طرفہ مفادات تک محدود ہے۔ اور چونکہ امریکہ اور روں دونوں استعماری

وقتیں ہیں اس لیے مفادات کے ٹکڑاوے کے باوجود ان کے مزاج، ذہنیت اور طریقہ واردات میں کسی قسم کے فرق اور تقاضا کا تصور کرنے کا طور پر ایک غیر منطقی بات ہوگی۔

ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ بر صغری کی تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کا جھگڑا طے شدہ منصوبہ کے مطابق صرف اس لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ یہ دونوں ملک اپنے وسائل اور توانائیوں کو توافقی پر خرچ کرنے کی وجاءے ایک دوسرے کے خلاف مجاز آ رائی اور نفرت انگلیزی کیلئے وقف کیے رکھیں اور عالمی قوتوں کا دست نگر بننے پر مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ اقوام متحده کی واضح قراردادوں اور فیصلوں کے باوجود اس مسئلہ کے حل میں عالمی طاقتوں کی عدم دمپیشی ان کی اس خواہش کی آئینہ دار ہے کہ مسئلہ کشمیر کا وجود قائم رہے تاکہ ان دونوں ملکوں کی عالمی قوتوں کے ساتھ وابستگی میں کوئی کمزور نہ آنے پائے۔ سابق صدر ایوب خان کے دور میں پاکستان کی سر زمین سے امریکی اڈوں کے خاتمه، پھر اس کے بعد سیٹھوں سے پاکستان کی علیحدگی اور اب غیر جانبدار تحریک کے ساتھ عملی وابستگی کے باعث بظاہر یہ محسوس ہونے لگتا ہا کہ پاکستان شاید مکمل غیر جانبداری کی شاہراہ پر گامزن ہو رہا ہے مگر ایرانی انقلاب کے بعد جنوبی ایشیا میں امریکی مفادات کے محدود ش مقتبل اور افغانستان میں روس کی مسلح مداخلت سے پاکستان کی سالمیت کو درپیش خدشات نے غیر جانبداری کی طرف پاکستان کی خارجہ پائیں کی پیش رفت کوئہ صرف بریک لگادی ہے بلکہ گاڑی روپ روس گیر میں آپھی ہے اور ایک سلیمانی پر پرباہمی مفادات کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا جا رہے۔

اس وقت امریکہ پاکستان کی سیاسی، اقتصادی اور فوجی امداد میں بظاہر خاصی فراغدی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور مبینہ طور پر بعض ناگزیر تحفظات اور مصلحتوں کو بھی نظر انداز کر رہا ہے جس کا مقصد شاید یہ ہے کہ پاکستانی عوام کو اس سلسلہ میں گذشتہ کوتا ہیوں کی تلافی کا احساس دلایا جائے۔ پروپیگنڈا کے عالمی اور قومی مجاز پر اس تاثر کو جاگار کرنے میں امریکہ اور اس کے حواریوں کو ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے لیکن صورت حال کا حقائق اور واقعات کی بنیاد پر تجزیہ کیا جائے تو امریکہ کی اس بظاہر فراغدی اور پاکستان دوستی کے پس منظر میں باہمی مفادات کے مساویانہ اشتراک یا ایک آزاد اور خود مختار قوم کو اس کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے باوقار طور پر مدد دینے کا جذبہ کار فرمادکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس ظاہری فراغدی کی بنیاد بھی اسی مخصوص استعماری ذہنیت اور سامراجی مزاج پر کھڑی نظر آتی ہے جس کا مقصد ضرورت مند ممالک کے گرد اپنے مخصوص استعماری مفادات کے غنجنے کو تنگ سے تنگ کرتے چل جانا ہے۔

اس وقت امریکہ کی سیاست اور کانگریس میں پاکستان کی فوجی اقتصادی امداد کیلئے شرائط کا سلسلہ زیر بحث ہے اور امریکی سینٹ کی سترہ رکنی خارجہ تعلقات کمیٹی کی ایک قرارداد پر امریکہ کے قوی حلقوں نے گور کر رہے ہیں جس میں ان شرائط کا تعین کیا گیا ہے جس کے تحت پاکستان کو اسکے طیارے اور دیگر فوجی و اقتصادی امدادی جانے والی ہے۔

قرارداد کے مندرجات اور شرائط پر گفتگو سے پہلے ہم اس اصولی مسئلہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ آخر پاکستان کو دی جانے والی امداد شرائط کے ساتھ کیوں مشروط ہے؟ شرائط خواہ کچھ بھی ہوں جب اس امداد کا تعلق پاکستان کے یک طرف مفادات سے نہیں ہے اور جنوبی ایشیا میں خود امریکی مفادات کا پلٹا اس سودے میں واضح طور پر جھکا ہوا ہے تو پھر یک طرف شرائط کا کیا جواز ہے؟ یہ درست ہے کہ افغانستان میں مسلح روپی مداخلت اور فوج کشی اور بھارت کی جنوبی قیادت کے

پاکستان دشمنِ عزائم سے پیدا شدہ صورتِ حال میں پاکستان کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ جنوبی ایشیا میں امریکی مفادات کا سہارا لے کر علاقہ میں دفاعی توازن قائم کرنے کیلئے اس سے امداد حاصل کرے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل اسی طرح درست ہے کہ ایران سے رضاشاہ پهلوی کی خصیٰ کے بعد جنوبی ایشیا میں اپنے مفادات کی حفاظت کیلئے امریکہ کے پاس بھی کوئی "گن مین" باتی نہیں رہا اور یہ ایک ایسا خلا ہے جسے پر کیے بغیر اس خطے میں اپنی موجودگی کا تسلسل برقرار رکھنا امریکہ کیلئے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے مفادات صرف پاکستان کے نہیں امریکہ کے بھی ہیں، اور جب مفادات دو طرف ہیں تو ہمی مشترکہ مفادات کے تحفظ کا معاملہ طے کرتے ہوئے یک طرف شرائط کی بات نہ صرف اصولوں کے منافی ہے بلکہ اس سے خود امریکہ کے خلوص اور ذہنیت کا بھی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان کی امداد کیلئے امریکہ کی طرف سے لگائی جانے والی شرائط سے جوتا شراہر تا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ دو آزاد اور خود مختار ملک ایک علاقہ میں یا ہمی مشترکہ مفادات کی بنیاد پر کوئی آزادانہ معاملہ کر رہے ہیں، بلکہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک آقا اپنے نوکر کو کچھ بخشش دے کر ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ پیسے تمہیں اس لیے دے رہا ہوں تاکہ تم فلاں فلاں کام سے باز رہو۔ اور یہ تاثر ایک آزاد اور نظریاتی مملکت کی حیثیت سے پاکستان کیلئے کسی طرح بھی عزت و وقار کا باعث نہیں ہے۔

## جہادِ افغانستان اور عالمِ اسلام

بیفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور۔ ۲۱ اگست ۱۹۸۴ء

(یہ مضمون قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا نور محمد شہید آف وانا کی کتاب "جہادِ افغانستان" کے پیش لفظ کے طور پر تحریر کیا گیا تھا۔)

جہادِ اسلام کے بنیادی احکام میں سے ایک حکم ہے جس پر ملتِ اسلامیہ کی سطوت و شوکت اور غلبہ و اقتدار کا دار و مدار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے جہاد کے احکام و مسائل اسی تفصیل و اہتمام کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں جس تفصیل و اہتمام کے ساتھ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دمگِ احکام شرعیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرون اویں میں اسلام کے احکام کا ذکر جب بھی ہوتا تھا جہاد کا ذکر کران کے ساتھ ہوتا تھا اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد میں فکری یا عملی طور پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ محشیں اور فقہاء نے احادیث اور فقہ کی جتنی کتابیں مرتب کر کے امت کے حوالے کی ہیں ان میں جہاد کے مستقل ابواب قائم کیے ہیں، اس کے مسائل بیان کیے ہیں اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاد کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی کوہان کی بلندی یعنی اس کی برتری اور رفتہ کی علامت قرار دیا ہے اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

"جب تم کاروبار اور کھیتی باری کے پیچھے پڑ جاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی

ذلت مسلط کر دیں گے جو دین کی طرف واپس آئے بغیر تم سے نہیں ہٹے گی۔ ”(ابوداؤد) گویا جہاد مسلمانوں کی عزت و وقار کی علامت ہے اور اس کا ترک کرنا ذلت و رسوانی کا باعث ہے اور یہ ذلت و رسوانی ہم عالم اسلام میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کم و بیش ایک ارب کے قریب تعداد اور چالیس سے زائد باقاعدہ مسلم حکومتوں کے ہوتے ہوئے بھی اسباب و سائل کی فراوانی کے باوجود آج ملتِ اسلامیہ غیروں بلکہ دشمنوں کی دست نگر ہے۔ نظریات اور نظام سے لے کر دفاع اور شکننا لوئی تک ہر معاملہ میں ہم دوسروں کے محتاج ہیں، اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے؟ حافظ ابن حجر الہیشیؒ نے الزواجر عن اقتراف الكبائر میں امام طبرانیؒ کے حوالے سے روایت نقل کی ہے اور اس کی سندر کو حسن قرار دیا ہے جس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

ما ترک قوم الجہاد الا عهم اللہ تعالیٰ بالعذاب۔ (الزواجر ص ۲۱۳)

”کوئی قوم بھی جہاد ترک نہیں کرتی مگر اللہ تعالیٰ اسے عمومی عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔“

اس ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں آج ہم عالم اسلام کی مجموعی صورتِ حال کو دیکھیں تو جہاد جیسے اہم فریضہ کے ترک کر دینے کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا یہ عمومی عذاب باہمی تشتت و افراق، غیر مسلم اقوام کے فکری اور نظریاتی غلبہ، سائنسی و حربی بالادستی اور دشمنوں کی اختیان کی صورت میں بالکل واضح اور روشن دھکائی دیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے ہاتھ میں جب تک جہاد کا پرچم سرپرند رہا ہے مسلمانوں کی بد اعمالیوں کے باوجود کفر کی قوتیں ان کے سامنے سرگاؤں رہی ہیں اور مسلمانوں کی قوت و شوکت پوری دنیا میں مسلم رہی ہے۔ اور جب سے مسلمانوں نے اپنے شب و روز کے اعمال میں سے جہاد اور اس کی تیاری کو نکال دیا ہے ملتِ اسلامیہ کی حیثیت ایک بے بُس اور مقہور قوم کی ہو کر رہ گئی ہے۔ برطانیہ کے ایک سائب وزیر اعظم مسٹر گلڈستھون کے مطابق جہاد کا یہ جذبہ ہی ایک ایسی قوت ہے جو مسلمانوں کو کسی دوسری قوم کا حکوم ہونے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کے مختلف حصوں پر استعماری قتوں کے غلبہ و مسلط کے بعد ان مسلط قتوں کا سب سے بڑا ہدف یہی رہا ہے کہ مسلمانوں میں جہاد کے جذبہ کو سرد کیا جائے اور ان کی عملی زندگی سے جہاد کے شرعی حکم کو بے دخل کر دیا جائے۔ خود ہمارے ہاں بر صغیر پاکستان، بھارت و بنگلہ دیش میں برطانوی استعمار نے اپنے دورِ مسلط میں مختلف مذہبی طبقوں کو صرف اس لیے جنم دیا کہ وہ جہاد کی مخالفت کریں اور مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کو دور کریں۔ مرزا غلام احمد قادریانیؒ کی جھوٹی بیوتوں کا تو مقصود و حیدر یہی تھا۔

خلافتِ عثمانیہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا آخری نشان اور علامت تھی جسے ختم کرنے کیلئے استعماری قتوں نے مسلسل سازشیں کیں اور اب توقعات کے تسلسل اور قرآن و شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے مورخین کیلئے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا کہ ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ کے خلاف عربوں کو ابھارنے اور خلافت کے زپنگین مخفف علاقوں میں بغاوت پیدا کرنے میں مغربی استعمار کی مسلسل سازشوں کا حصہ ہے۔ اور انہی ریشد و ائمیوں کے نتیجہ میں خلافتِ عثمانیہ کا وجود ختم ہوا جس سے استعماری قتوں کے تین بڑے مقاصد تھے:

1. مسلمانوں میں خلافت کا براۓ نام وجود بلکہ اس کا تصور بھی باقی نہ رہے اور مسلمان نظام حکومت کے سلسلہ

- میں جدید افکار و نظریات کو ذہن آتیوں کر لیں۔
2. مسلمانوں میں جہاد کا تصور ختم ہو جائے اور کوئی ایسا ادارہ باقی نہ رہے جو مسلمانوں کو جہاد کیلئے دعوت دے سکے یا انہیں جمع کر سکے۔
  3. مسلمانوں کی اجتماعی قوت (خلافتِ عثمانیہ) کو ختم کر کے فلسطین میں یہودیوں کو بسانے اور ان کی ریاست قائم کرنے کی راہ پر موارکی جائے۔

اب اس کے نتائج کو دیکھ لیں کہ ان تینوں مقاصد میں استعمالی قوتوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ خلافت کا تصور مسلمانوں کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور کم و بیش تمام مسلم حکومتوں کی بنیاد جدید افکار مثلاً جمہوریت یا سو شلزم پر ہے۔ سعودی عرب یا ایک دو اور حکومتوں کی اصولی بنیاد اگرچہ مذہب پر بیان کی جاتی ہے مگر وہاں بھی نظام حکومت اسلامی خلافت نہیں بلکہ بادشاہت ہے اور ملک کا مکمل نظام بھی پورا اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ جہاد کا ذکر اب صرف حدیث اور فقہ کی کتابوں میں رہ گیا ہے، مسلمانوں کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ حتیٰ کہ افغانستان میں خالص شرعی بنیادوں پر ہونے والا جہاد بھی اب مسلمانوں کو کوئی عجیب و غریب سامنہ لگ رہا ہے اور عام مسلمان کا ذہن اس جہاد کو اپنے اندر جگہ دینے میں چلکچاہت محسوس کر رہا ہے۔ فلسطین میں یہودی سلطنت اسرائیل کے نام سے نہ صرف قائم ہو چکی ہے بلکہ عالم عرب اور پورے عالم اسلام کیلئے ایک مصیبت اور چیلنج بھی ہوئی ہے۔

یہی صورتِ حال ہے جسے جانبِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاداتِ گرامی میں (۱) اللہ تعالیٰ کے عمومی عذاب (۲) مسلمانوں کی ذلت (۳) و دُمن کے سلطاط (۴) اور ملتِ اسلامیہ کی بے بسی سے تعبیر کیا ہے۔ بلکہ قرانِ کریم کی آیت کریمہ ولا تلقوا بایدیکم الی التهملکہ کی جو تفسیر صحابی رسول حضرت ابوالیوب انصاریؓ نے کی ہے اسے سامنے رکھا جائے تو یہ خود اختیاری بلاکت کی وہ شاہراہ ہے جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں منع فرمایا ہے۔ امام ترمذیؓ نے جامع ترمذی ص ۱۲۱ ج ۲ میں حضرت ابو عمرانؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے حدیث حسن غریب صحیح قرار دیا ہے۔

”حضرت ابو عمرانؓ کہتے ہیں کہ ہم غزوہ روم کے موقع پر روم کے ایک شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ اچانک رو میوں کا ایک بڑا لشکر قلعہ سے نکل کر ہم پر حملہ آور ہوا۔ ہمارے لشکر میں سے بھی کم و بیش اتنے ہی لوگ یا ان سے زیادہ ان کے مقابلہ کیلئے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک مسلمان نے تباہ آگے بڑھ کر رو میوں پر حملہ کر دیا اور ان کے لشکر میں گھس گیا۔ مسلمان یہ دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ یہ شخص تو اپنے ہاتھوں سے خود کو بلاکت میں ڈال رہا ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التهملکہ) اس پر حضرت ابوالیوب انصاریؓ اٹھے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کریمہ کا یہ مطلب سمجھتے ہو حالانکہ قرآنِ کریم کی یہ آیت ہم انصارِ مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دیا اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو ہم میں سے بعض لوگوں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے بغیر آپس میں خفیہ مشورہ کیا کہ ہمارے اموال اکثر گھروں میں صرف ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اب اسلام کو غلبہ دے دیا ہے اور اس کے مددگار بہت ہو گئے ہیں اس لیے اب اگر ہم گھروں میں رہ کر اپنے اموال وغیرہ کی اصلاح کر لیں اور نقصانات کی تلافی کی کوئی صورت نکالیں تو بہتر ہو گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر یہ آیت کریمہ نازل کر کے ہماری بات کو رد کر دیا کہ وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكہ کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو اور خود اپنے ہاتھوں بلاکت میں نہ پڑو۔ تو اس بلاکت سے مراد اپنے اموال اور کاروبار کی اصلاح کیلئے گھروں میں پیٹھ رہنا اور جہاد کو ترک کر دینا ہے۔“

حضرت ابوالیوب الانصاریؓ کے ارشاد کے مطابق جہاد کو ترک کر دینا خود اپنے آپ کو بلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے اور قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم و مقصد بھی یہی ہے۔ اس تفسیر کی روشنی میں بھی ہم اپنے موجودہ حالات کا تجزیہ کریں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ مسلمانوں نے جہاد کا راستہ ترک کر کے خود کو بلاکت کی موجودہ دلدل میں دھکیل دیا ہے اور ذلت و رسولی ان کا مقدور بن کر رہ گئی ہے۔ ابو داؤد کی ایک روایت کے حوالے سے بات گزرنچکی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکِ جہاد کے باعث مسلط ہونے والی اس رسولی کی پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ذلت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت دین (یعنی جہاد) کی طرف واپسی کے بغیر نہیں ہو گی۔ اس لیے آج عالم اسلام کی اجتماعی مشکلات و مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں جذبہ جہاد کو بیدار کیا جائے اور جہاد کی تحریک کو اس انداز میں منظم کیا جائے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کی نشatah شناختی اور عظمتِ رفتگی بھالی کا نقطہ آغاز ہن سکے۔

اس پس منظر میں جہاد افغانستان کو دیکھا جائے تو یہ ایوی سیوں کے اس تاریک دور میں امید کی ایسی کرن نظر آتی ہے جس سے ملتِ اسلامیہ کے اس عظیم شاہراہ پر گامزن ہونے کے امکانات محسوس ہو رہے ہیں جو عالم اسلام کی سطوت و شوکت اور غلبہ و اقتدار کی منزل کی طرف جاتی ہے۔ افغانستان میں روکی استعمار کی جارحانہ فون کشی اور غلبہ کے خلاف افغانستان کے غیور و جسور حریت پسند مسلمان آزادی کی جو جگگ لٹڑ رہے ہیں وہ شرعی نقطہ نظر سے بلاشبہ جہاد ہے اور دنیاۓ اسلام کے دینی و علمی حلقة اس کے جہاد شرعی ہونے پر متفق ہیں۔ رقم المعرف کو خود جہاد افغانستان کے بعض مورچوں پر جانے کا موقع ملا ہے اور اگوں کے محاذ پر کچھ محاذ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس موقع پر ایک افغان عالم دین کی یہ بات میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے کہ

”ہمیں افغانستان کی موجودہ صورتِ حال کی شکل میں اس جرم کی سزا ملی ہے کہ جب روں نے وہی ایشیا کی مسلم ریاستوں پر قبضہ کیا اور وہاں کے بعض حریت پسند مسلمانوں نے مراجحت اور جہاد کا راستہ اختیار کیا تو ہم یعنی افغانستان کے مسلمانوں نے انہیں ان کے حال پر چوڑ دیا اور ان کی مدنہ کی جس کی وجہ سے وہ پسپا اور مجبور ہو گئے۔ اور وہاں کامیابی کے بعد روں کو افغانستان کی طرف پیش قدمی کا حوصلہ ہوا، اس لیے میں پاکستان کے علماء کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ہماری حالت سے عبرت پکڑیں اور اس جرم کا

ارٹکاب نہ کریں جس کے نتیجے میں ہم یہ بڑی سزا بھگت رہے ہیں۔“

جہاد کے شرعی احکام کے مطابق جس ملک پر کافروں کا انتسلط ہو جائے وہاں کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے جبکہ ان کے قریب رہنے والے مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔ اس مسئلہ کی رو سے ہم اہلِ پاکستان پر جہادِ افغانستان میں حصہ لینا اگر فرضِ عین نہیں تو فرضِ کفایہ تو بہرحال ضرور ہے اور ہم شرعاً اس کے مکلف ہیں کہ جہاد میں جتنا حصہ ڈال سکیں اس سے گرپونہ کریں۔ جہادِ افغانستان میں حصہ لینے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے اور اس کے خلاف مختلف حلقوں کی طرف سے جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں ان کا ازالہ کر کے جہاد کی شرعی حیثیت کو واضح کیا جائے۔

افغانِ مجاهدین کی مسلسل پیش قدمی اور ڈاکٹر نجیب اللہ کے بقول افغانستان کے ۸۰ فیصد علاقوں پر مجاهدین کے کثروں نے روس کے ساتھ امریکہ کو بھی پریشانی سے دوچار کر دیا ہے۔ کیونکہ افغانستان میں ایک خالص دینی حکومت کے قیام سے جہاں روس کو بخمار، تاشقند اور روس میں واقع دیگر مسلم ریاستوں میں دینی بیداری اور آزادی کی تحریکات ابھرنے کا خطرہ ہے وہاں یہ صورتِ حال امریکہ کیلئے بھی قابل برداشت نہیں ہے کہ افغانستان میں قائم ہونے والی دینی حکومت جنوبی ایشیا اور مشرق و سلطی مسلم ریاستوں میں غلبہ اسلام کی تحریکات کیلئے تقویت و تائید کا باعث بنے۔ اور یہ تحریکات افغانِ حریت پسندوں کے پر جوشِ جذبات کی تائید سے اپنے ملکوں میں لادینی حکومتوں اور نظاموں کا تحجۃ الٹ کر دینی حکومتیں قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ بھی وجہ ہے کہ روس اور امریکہ دونوں کی لایاں جہادِ افغانستان کے خلاف نفراتِ الگیز پر اپکینڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ روی لابی اسے امریکہ اور روس کے مفادات کی جنگِ قرار دے کر مسلمانوں کی توجہ اس سے ہٹانے میں مصروف ہے، اور امریکی لابی صرف روی جاریت کے مقابلہ کی حد تک اس کی حمایت کر کے اس سے آگے اس کی شرعی حیثیت اور دینی حکومت کے قیام کے خلاف مسلسل سازشیں کر رہی ہے۔ جبکہ مجاهدینِ افغانستان ان دونوں لابیوں کے اثرات سے بے نیاز ہو کر صرف اس مقصد کیلئے مصروفِ جہاد ہیں کہ افغانستان سے روی افواج کی مکمل اور غیر مشروط واپسی اور اس کے بعد مکمل شرعی نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو۔

جہادِ افغانستان کے خلاف مختلف جہتوں سے پر اپکینڈا میں شدت آرہی ہے۔ باخصوص پاکستان کے عوام کو افغانِ مجاهدین اور مجاہرین سے تنفس اور بے زار کرنے کیلئے بیر و فنی لایاں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو پوری طرح استعمال میں لا رہی ہیں۔ ان حالات میں ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی صاحبِ قلم دانشور جہادِ افغانستان کے اہم موضوع پر قلم اٹھایاں اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے اس کی شرعی و سیاسی حیثیت کو عوام کے سامنے واضح کریں۔ ۱۹۸۷ء کے آغاز میں افغانستان کے ارگون محاذ سے واپسی پر قلم الحروف کو جنوبی وزیرستان کے صدر مقام وانا میں ایک رات قیام کا موقع ملا اور جنوبی وزیرستان کے مجاهدِ عالم دین مولانا نور محمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ مولانا موصوف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ایک کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ کتاب کے مختلف مقالات دیکھنے کے بعد کوئے حد خوشی ہوئی کہ اس سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرنے والے سوالات و اعتراضات کے جوابات مولانا موصوف نے بڑی

محنت اور عرق ریزی کے ساتھ دیے ہیں اور گردو غبار کو خوبصورتی کے ساتھ جھاڑ کر جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت کو بالکل بے غبار انداز میں پیش کر دیا ہے۔ مولانا موصوف محقق عالم اور بے باک خطیب ہیں مگر ان کے پشتون ہونے کے اثرات کتاب کی زبان پر غالب تھے اس لیے میں نے درخواست کی کہ یہ کتاب نظر ثانی اور محنت کیلئے راقم الحروف کے سپر در فرمائیں جو انہوں نے کمالِ شفقت سے قبول فرمائی۔ چنانچہ کتاب کے مسودہ کو از سرِ نوصاف کرنے اور اپنی گلگرانی میں کتابت کرانے کی سعادت مجھے حاصل ہو گئی، فالحمد للہ علی ذلک۔

”جہادِ افغانستان“ کے نام سے یہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، اس امید پر کہ یہ کتاب ان شکوک و شبہات کے خاتمه کا موعودِ زریعہ بنے گی جو افغانستان کے جہادِ آزادی کے بارے میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجاهدینِ افغانستان کو ان کے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائیں اور غیور افغان قوم کی اس عظیم جدوجہد کو عالمِ اسلام میں جہاد کے احیاء اور اسلام کے غالب کائنۃ آغاز بنایں، آمین یا الہ العالمین۔

## اقوامِ متحده کی جنرل اسمبلی کا روسی افواج کی واپسی کا مطالبہ

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء

اقوامِ متحده کی جنرل اسمبلی نے ایک بار پھر افغانستان سے روسی افواج کی مکمل واپسی کا مطالبہ کیا ہے اور اس دفعہ یہ مطالبہ پہلے سے زیادہ اکثریت کے ساتھ کیا گیا ہے جو یقیناً افغان مجاهدین کی عظیم اصولی اور اخلاقی کامیابی ہے۔ روسی حکومت اور کابل کی کٹھ پتی انتظامیہ نے کچھ عرصہ سے جنگ بندی کی یکطرفہ پیشکش اور قومی افغان مصالحت کے عنوان سے سیاسی حرਬے اختیار کر کے دنیا کو یہ باور کرنے کی کوشش شروع کر کھی تھی کہ روں اپنی افواج کی واپس بلانے کیلئے تیار ہے لیکن افغان مجاهدین قومی مصالحت کی طرف پیش رفت نہ کر کے روسی افواج کی واپسی میں تاخیر کا باعث ہن رہے ہیں۔ مگر جنرل اسمبلی کی حالیہ قرارداد کی صورت میں عالمی رائے عامہ نے ان حربوں کو مسترد کرتے ہوئے افغان مجاهدین کے اس موقف کی ایک بار پھر مکمل حمایت کر دی ہے کہ روسی افواج غیر مشرط طور پر افغانستان سے واپس چلی جائیں اور افغان عوام کو پوری آزادی کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا جائے۔

## جہادِ افغانستان فیصلہ کن مرحلہ میں!

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور ۲۵ دسمبر ۱۹۸۴ء

افغان عوام کا جہادِ حریت سیاسی اور فوجی دونوں محاڈوں پر فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ جہادِ آزادی جو آج سے آٹھ نومبر سے پہلے چند سو سفر و شوں کے نعرہ مستانہ کے ساتھ شروع ہوا تھا، قربانی، ایثار اور جہد و استقلال کے کھن

مراحل سے گزرتا ہوا آج اس مرحلہ تک پہنچ چکا ہے کہ افغانستان کے اسی فیصلہ علاقہ پر مجاہدین کا کنٹرول عملًا قائم ہو گیا ہے۔ روں جیسی استعماری قوت اور عالمی طاقت کو افغان مجاہدین کے ہاتھوں ہریمیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ اب واپسی کے ارادہ کے اظہار کے ساتھ اپنے بعد قائم ہونے والی حکومت کے بارے میں تخفیظات کی ملائش میں ہے۔ اقوام متحده کی جزوی اسلامی میں ایک سوتیس ممالک کی حمایت سے منظور ہونے والی قرارداد کے ذریعے عالمی رائے عامہ نے افغان مجاہدین کی جدوجہد اور موقف کی مکمل حمایت کر دی ہے اور وہ افغان زمینے جن کی جرأت قلندرانہ کو آج سے نوسال قبل عقل و دانش سے عاری اور خود کشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا، اب انہیں افغانستان کے مستقبل کے حکمران کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

یہ سب کچھ افغانستان کے غیور علماء اور دیندار عوام کے اس جذبہ و حوصلہ اور عزیمت و استقامت کا صلمہ ہے جس کا اظہار انہوں نے روئی استعمار کے تسلط کے خلاف پورے جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے اور نصف کروڑ کے لگ بھگ افراد کی جلاوطنی اور ڈیپھ ملین کے قریب نفوں کی شہادت کے باوجود غیر ملکی استعمار کے تسلط کو بقول نہ کر کے انہوں نے ایک بار پھر وحشی کردیا ہے کہ حق، خلوص اور جہاد و استقلال کی طاقت آج بھی اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جسے اس زمین و آسمان کے خالق والک کی پیشت پناہی حاصل ہے، یہ طاقت ناقابل شکست ہے، ناقابل انکار ہے اور اس کے ناقابل عبور ہونے پر غیور و جسور افغان عوام نے اپنے خون کے ساتھ ایک بار پھر مہربشت کر دی ہے۔ ہم دعا گوہیں کہ اللہ رب العزت افغان عوام کے جہاد حریت کو اس کے مطہی تیجہ تک پہنچائیں اور افغان مہاجرین و مجاہدین کو ایک آزاد، خود مختار اور اسلامی افغانستان کی تعمیر نو کے ساتھ دنیاۓ اسلام کی راہنمائی کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا  
الله العالمین۔

## افغان حریت پسندوں کا جہاد آزادی: پس منظر، ثمرات، توقعات

بفت روزہ ترجمان اسلام، لاپور --- ۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ء

آج سے آٹھ سال قبل جب روں نے افغانستان کو اپنی مسلسل فوجی یلغار کا نشانہ بنایا تو روں کی عظیم فوجی قوت، افغانستان میں کمپونسٹ لابی کے مؤثر اور مسلسل ورک، اور دینی حلقوں کے نمایاں خلقشار و انتشار کو دیکھتے ہوئے یہ بات عام طور پر زبانوں پر آگئی تھی کہ اب بخارا، تاشقند اور سمرقند کی طرح افغانستان کا یہ خطہ بھی روں کے زیر تسلط مسلم ریاستوں کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ کیونکہ بظاہر افغانستان میں کوئی ایسی قوت دکھائی نہیں دے رہی تھی جو کمپونسٹ لابی کے تسلط اور روئی افواج کی مداخلت کا سامنا کر سکے۔ اور یہ تاثراں قدر عام ہو چکا تھا کہ دریائے خیبر اور دریائے ائک کے اس پار روئی ٹینکوں کے استقبال اور ان پر پھولوں کے ہارنچاہو کر کے اس خطہ کے مبینہ روایتی کردار کو

دہرانے کی تیاری بھی شروع ہو گئی تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ اس قسم کی خبریں سامنے آنے لگیں کہ افغانستان کے مختلف علاقوں میں روئی افواج کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ مزاحمت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ مزاحمت کی ان خربوں پر لوگوں کا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ افغان قوم روایتی طور پر ہتھیار بند ہے اور بعض جذباتی حلقات اپنے قوی مزاج اور روایات کے باعث روئی افواج کی مزاحمت کر رہے ہیں جو چند روز کی بات ہے اور روئی جیسی سپر پاور کیلئے اس نوعیت کی مزاحمت کو نشروں کرنا پچھے زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ مگر یہ تمام تاثرات غلط ثابت ہوئے اور افغانستان کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی بھرت کے ساتھ ساتھ جہاد کے مقدس عنوان پر مزاحمت کی ان کارروائیوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا کہ صرف آٹھ سال کے عرصہ میں نہ صرف روئی کی قیادت کو اپنی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کے عزم کا اظہار کرنا پڑ بلکہ کابل کے سرکاری حلقوں نے یہ تسلیم کیا کہ افغانستان کا اس فیصد علاقہ افغان مجاهدین کے نشروں میں ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت افغانستان میں اسی ہزار مجاهدین روئی افواج کے سلطان کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں اور ان کی جنگ کا دائرہ نہ صرف یہ کہ افغانستان کے طول و عرض تک پھیلا ہوا ہے بلکہ ان کے پر جوش نعرہ ہائے تکبیر نے روئی کے زیر تسلط مسلم علاقوں کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی ہے اور اب روئی کیلئے افغانستان پر اپنے اثرات محکم کرنے سے زیادہ بخارا، تاشقند اور سطحی ایشیا کی دیگر مسلم ریاستوں میں اپنے نظریاتی تسلط کو برقرار رکھنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

افغانستان کی جنگ آزادی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ جنگ اسلامی احکام کے مطابق جہاد کے شرعی فتویٰ کی بنیاد پر لڑی جا رہی ہے اور اس کی قیادت میں علماء کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ افغان مجاهدین کے مختلف گروپوں کی جو قیادت جہاد افغانستان کے عنوان سے دنیا میں متعارف ہوئی ہے اس میں ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب مستند علماء کرام ہیں۔ اسی طرح مخاذِ جنگ پر روئی افواج سے بر سر پیدا کر جا رہیں ہیں جبکہ ایک بڑی تعداد علماء اور دینی مدارس کے طلباء کی ہے جس سے افغانستان کی جنگ آزادی کا دینی اور نظریاتی شخص بالکل واضح اور بے غبار ہو کر سامنے آیا ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ آزادی کا یہ دینی شخص ہی اس وقت امریکہ اور روئی کے درمیان مسئلہ افغانستان پر متوقع مصالحت میں کہاں کی بڑی بن گیا ہے۔

روئی افغانستان سے اپنی افواج واپس بلانے کے عنديہ کا اظہار کر دیا ہے لیکن اسے خطرہ یہ ہے کہ اگر اس کی واپسی کے بعد افغان مجاهدین کی حکومت قائم ہو گئی تو مولویوں کی یہ حکومت و سطحی ایشیا کے مسلم علاقوں پر روئی کے تسلط کیلئے واضح خطرہ ثابت ہو گی اور پھر بخارا اور تاشقند کے علاقوں میں بھی آزادی اور جہاد کے جذبات ابھرنے لگیں گے۔ اس کے برعکس امریکہ اگرچہ سیاسی اور اخلاقی حمایت کے ساتھ افغان مجاهدین کو مدد بھی عملًا فراہم کر رہا ہے لیکن افغانستان میں مجاهدین کی حکومت کا قیام اس کیلئے قابل قبول نہیں کیونکہ کابل میں مولوی کی حکومت اور اس کے ذریعے شرعی نظام کا عملی نفاذ در اصل نکتہ آغاز ہو گا جنوبی ایشیا کی مسلم ریاستوں بالخصوص پاکستان اور چین کے ممالک میں نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں عملی پیشہ رفت کا جسے روکنا ان ممالک میں سامراجی نظام کے روایتی محافظوں کے بس کی بات نہیں ہو گا۔ اور اس طرح

امریکہ کے مفادات اس خطہ میں حفاظت و ممانعت کے سامنے سے محروم ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کو روکنے میں امریکہ اور روس کے مفادات مشترک ہو گئے ہیں لیکن افغانستان کے اسی مقصد حصے پر مجاہدین کے عملی سنٹرول کی موجودگی میں ان کی مرضی کے بغیر کسی حکومت کا قیام ممکن ہی نہیں رہا اور جنیواں مذاکرات کے پارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس اعتماد کی جھلک ہر افغان لیڈر کے چہرے پر بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے۔

گذشتہ ہفتے مجھے مولانا نداء الرحمن درخواستی امیر جمعیت علماء اسلام صوبہ سندھ کے ہمراہ پشاور میں بعض افغان لیڈروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن مولانا میاں عصمت شاہ کا خیل اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا میر محمد یونس خالص، حرکتِ انقلابِ اسلامی کے راہنماء مولانا عبد اللہ استار صدیقی، اور اتحادِ اسلامی افغانستان کے شعبہ سیاسی امور کے سربراہ مولانا محمد یاسر خان سے ہوئی۔ مولوی محمد یونس خالص افغانستان کے بزرگ اور مجاہد عالم دین ہیں، مجازِ جنگ پر بر سر پیدا کر مجاہدین کے ایک بڑے گروپ کی قیادت کر رہے ہیں۔ شہزاد آفاقت کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کا تعلق بھی انہی کے گروپ سے ہے۔

مولوی محمد یونس خالص دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل ہیں اور دارالعلوم میں کچھ عرصہ مدرس بھی رہے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کے ماہر ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ مولانا جلال الدین حقانی بھی دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء میں سے ہیں۔ مولوی محمد یونس خالص کو اس سال افغان مجاہدین کی سات جماعتوں نے اپنے مشترکہ مجاز کا سربراہ چنایا ہے اور اسی حیثیت سے وہ اقوامِ متحدہ کی جزوں اسی بدلی کے اس اجلاس میں بھی مبصر کی حیثیت سے شریک ہوئے ہیں جس میں بھارتی اکثریت کے ساتھ افغانستان سے روئی افواج کی غیر مشروط واپسی کی قرارداد منظور کی گئی ہے۔ انہوں نے ملاقات کے دوران اس بات کا دبے لفظوں میں شکوہ کیا کہ پاکستان کے علماء اور دینی حلقوں میں ہلتے ہجہاد افغانستان کا صحیح طور پر ادارک نہیں کر سکے حالانکہ یہ ان کی فدمہ داری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس خطہ میں امریکہ اور روس کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی ہم کسی کے مفاد کیلئے کام کر رہے ہیں۔ ہماری جنگ کا مقصد افغانستان سے روئی افواج کی واپسی اور مکمل شرعی نظام کا نفاذ ہے اور شریعت اسلامیہ کے عملی نفاذ تک ہماری جنگ جاری رہے گی۔ انہوں نے پاکستان کے علماء اور دینی حلقوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہجہاد افغانستان کی مقصدیت اور اہمیت کا ادارک کریں اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ میں جذبہ جہاد کے احیا کیلئے مؤثر اور بھرپور جدوجہد کریں۔

مولانا عبد اللہ استار صدیقی اور مولانا محمد یاسر خان نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا بلکہ مولانا محمد یاسر خان نے افغان مجاہدین اور پاکستان کے دینی حلقوں کے درمیان تعادن و ارتباٹ کے ایسے امکانات اور گوشوں کی نشاندہی کی کہ ان سے صرف نظر کرنا جہاد افغانستان اور پاکستان کی دینی جدوجہد دونوں سے ناالنصافی کے مترادف ہو گا۔ ان کے جذبات انتہائی قابل قدر اور لا تک تلقید ہیں اور ان کی قلبی خواہش ہے کہ پاکستان کے علماء حق جہاد افغانستان کے ساتھ عملی رابطہ قائم کر کے اس کی تقویت کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ اس آٹھ سالہ جنگ کے تحریکات و ثمرات سے بھرپور استفادہ کریں۔ انہوں نے پر عزم لجھے میں کہا کہ ہمارا بدف صرف افغانستان کی آزادی اور اس میں اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہے بلکہ

اس پہلے ہدف کو حاصل کرنے کے بعد پری دنیا میں باطل نظریات کا مقابلہ اور مسلم ممالک میں اسلام کی بالادستی ہمارا صل مشن ہے جس کیلئے ہم ہر دنی قوت کا تعاون حاصل کریں گے اور اپنے تمام تجربات و وسائل کے ساتھ ہر دنی قوت کا دست و بازو بینیں گے۔

## خوست کے محاذ پر روysi افواج کی مزاحمت: دورہ افغانستان کی روداد

پفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور --- ۱۵ اپریل ۱۹۸۸ء

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے ایک وفد کے ہمراہ راقم الحروف کو مارچ ۱۹۸۸ء کے تیرے ہفتہ کے دوران افغانستان کے محاذ جنگ پر جانے کا موقع ملا۔ وفد میں جمعیت علماء اسلام صوبہ سرحد کے سیکرٹری جزل مولانا حمید اللہ جان، صوبائی سالار قاری حضرت گل شاکر، گوجرانوالہ ڈویژن کے سیکرٹری جزل ڈاکٹر غلام محمد، ضلع گوجرانوالہ کے امیر مولانا عبدالرؤف فاروقی، ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کے مدیر سید احمد حسین زید، جامعہ حنفیہ قاسمیہ نارووال کے خطیب مولانا محمد بھیجی حسن، مجلس تحفظ ختم نبوت کے راہنمای پجوہدری غلام نبی اور ضلع گجرات سے میرے ایک عزیز عبدالرشید شامل تھے۔

یہ دورہ حركة الجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمن خلیل کی دعوت پر کیا گیا اور وہ بھی دورہ میں ہمارے ساتھ شریک رہے۔ اس دورہ کا مقصد محاذ جنگ پر روysi جاریت کے خلاف بر سر پیکار مجاہدین کے ساتھ بھتی کے عملی اظہار کے ساتھ ساتھ جہاد افغانستان کی تازہ ترین صور تحال کا جائزہ لینا اور جنیومنڈ اکرات کے نتیجہ میں طے پانے والے مبنیہ سمجھوتہ کے پس منظر میں مجاہدین کے تاثرات اور آئندہ عوام معلوم کرنا تھا۔

اس سے قبل گذشتہ سال بھی راقم الحروف کو جمعیت علماء اسلام صوبہ پنجاب کے سیکرٹری جزل مولانا بشیر احمد شاد کے ہمراہ افغانستان کے ایک اور محاذ جنگ ارگون تک جانے کا موقع ملا تھا اور حركة الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا قاری سیف اللہ اختر کی دعوت پر کیے جانے والے اس دورہ میں کچھ وقت ارگون چھاؤنی کے سامنے ایک اجزی ہوئی بھتی کی جامع مسجد میں بس رکنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن وقت کی کمی اور بعض دیگر رکاوٹوں کے باعث اس وقت مشاہدات و تاثرات کے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی۔ البتہ اس دفعہ ہمیں مجاہدین کے آخری مورچوں تک جانے کی سعادت حاصل ہوئی اور خوست شہر سے متصل پہاڑی بلند چوٹی پر مجاہدین کے مورچے میں ہم نے دو راتیں گزاریں اور سرکاری فوجوں کے ساتھ مجاہدین کی زمینی اور فضائی لڑائی کا بینی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کیا۔

خوست کا شہروہی عالی شہرت کا حاصل محاذ جنگ ہے جہاں روysi افواج نے مجاہدین کا محاصرہ توڑنے کیلئے بھر پور قوت استعمال کی اور کئی روز کی اس جنگ نے پوری دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کیے رکھی۔ لیکن محاصرہ توڑنے کے باوجود

روسی افواج دو تین روز سے زیادہ اس کیفیت کو قائم نہ رکھ سکیں اور آج پھر خوست کی چھاؤنی اور شہر مجاہدین کے کمل محاصرہ میں ہیں۔ خوست کے ارد گرد تمام پہاڑیوں اور راستوں پر مجاہدین کا قبضہ ہے اور انہوں نے بلندو بالا پہاڑیوں پر اپنے سورچے قائم کیے ہوئے ہیں جہاں سے خوست شہر اور چھاؤنی کی عمارتیں صاف طور پر نظر آ رہی ہیں۔ اس رن وے پر رات کی تاریکی میں طیارے چھاؤنی کیلئے راشن اور دیگر ضروریات لے کر اترتے ہیں اور پھر انہیں میں ہی پرواز کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر اور چھاؤنی کے ساتھ کابل حکومت کا اور کوئی زمینی رابطہ نہیں ہے۔

خوست پہنچنے سے قبل راستے میں سرکاری فوجوں یا اہل کاروں کا کوئی نشان نہیں ملا اور یہ تمام علاقے عملاً مجاہدین کے کنٹرول میں تھا جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنی کاروائیاں اور نقل و حرکت جاری رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے یہ سفر گاڑی پر اور پھر تین چار گھنٹے کا سفر پیدل بھی کیا۔ راستے میں جس بات نے ہمیں سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین رکھا وہ ان ویران بستیوں کا منظر تھا جنہیں روئی افواج نے مسلسل وحشتناک بمباری کے ذریعے کھنڈرات میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہمیں راستے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیاں دھکائی دیں لیکن ان میں سے ایک بھی آباد نہیں تھی۔ مکانات گرے ہوئے تھے اور کوئی بھی آبادی ان میں نہیں تھی۔ اکاڈمکا مکان جو بمباری کی زد سے نیچ گئے وہ مجاہدین کے عارضی ٹھکانوں کے طور پر کام آ رہے ہیں۔ ہم نے ایک رات اسی قسم کے مکان میں گزاری جو خدا جانے کس نے اپنی سکونت کیلئے بنایا تھا لیکن کابل حکومت کی مسلسل بمباری کی تاب نہ لاتے ہوئے علاقے کے دوسرے باشندوں کی طرح وہ بھی بھرت کر کے پاکستان کے کسی کیپ میں منتقل ہو گیا تھا اور اب مجاہدین نے اس مکان کو اپنی سرگرمیوں کا ایک مرکز بنایا ہوا تھا۔

نجیب انتظامیہ اور روئی افواج کے پاس افغان مجاہدین پر بالادستی کا ایک ہی محاذہ ہے اور وہ ہے فضائی جنگ اور وحشیانہ بمباری جس کا جواب دینے کیلئے مجاہدین کے پاس فضائیہ نہیں ہے ورنہ اب سے کافی عرصہ پہلے اس جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ میدانی لڑائی میں مجاہدین کمل طور پر حاوی ہیں اور انہیں نہ صرف جنگی بلکہ نفیسیاتی طور پر بھی بالادستی حاصل ہے جس کا مشاہدہ ہم اپنی انگلھوں سے کیا۔ جس سورچ میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے جہاں سے مجاہدین نے ہماری موجودگی میں خوست کی چھاؤنی پر مارٹر توب سے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ تک گولہ باری کی، اس کی پیروی میں دوسری اطراف کے سورچوں سے بھی چھاؤنی پر متعدد گولے چھینکے گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کے جواب میں ہم پر شدید گولہ باری ہو گی لیکن مجاہدین نے ہمیں کہا کہ آپ آرام کے ساتھ نماز پڑھ کر سو جائیں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہم ساری رات آرام مجاہدین نے سوتے رہے اور خوست چھاؤنی کی طرف سے گولہ باری کا صحن کی نماز تک کوئی جواب نہ آیا۔ مجاہدین نے ہمیں بتایا کہ نجیب انتظامیہ کی افواج اور روئی فوجوں کو حملہ میں پہلی کی کبھی جرأت نہیں ہوئی، جب کبھی پہلی کی ہم نے کی۔ حتیٰ کہ متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ مجاہدین حملہ کر کے ان کا پاکا پاکا ٹھاکر لے آئے لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجاہدین کے خلاف فضائی کارروائیوں میں بھی اسٹینگر مزانیلوں کے استعمال کے بعد وہ پہلا ساز و راب نہیں رہتا ہم اس کے باوجود ان پر بمباری ہوتی ہے اور نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ جس روز ہم رات راغبیلی کے ایک مرکز میں تھے، دوسرے روز صبح مجاہدین کی تربیتی مشقوں کو دیکھ رہے تھے کہ اپنے فضائی اسٹھارہ طیارے نمودار ہوئے۔ ان کے حملہ

سے بچے کیلئے مجاہدین کے ساتھ ہم بھی اکٹے سیدھے زمین پر لیت گئے، ان طیاروں نے ہم سے چند میل کے فاصلے پر بمباری کی جس سے ایک مجاہد شہید اور چھڑخی ہو گئے۔ شہید کے بارے میں بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ وہ نوجوان تھا جس نے رات کو کھانا کھلانے میں ہماری خدمت کی تھی۔ مجاہدین طیاروں کو بھاگنے کیلئے طیارہ شکن توپوں اور اسٹنکر مزائیلوں کا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے طیارے خاصے فاصلے پر رہتے ہوئے بمباری کرتے ہیں جس سے نقصان کا تابع بہت کم ہو گیا ہے۔

ژاور پاکستان کی سرحد کے قریب مجاہدین کا ایک مضبوط مرکز ہے جس کے انجارج کیپٹن اکبر شاہ ہیں۔ یہ پہلے افغان فوج میں کیپٹن تھے اور جہاد کے آغاز کے ساتھ ہی مجاہدین سے آمے اور آٹھ سال سے مسلسل مصروف جہاد ہیں۔ ان کے ساتھ جہاد افغانستان کی تازہ ترین صورت حال کے بارے میں ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی، ہم نے ان سے پوچھا کہ جنیوا مذکورات میں اگر کسی سمجھوتہ پر دستخط ہو گئے اور کابل میں غیر جانبدار حکومت کے قیام کے بغیر روئی افواج کی واپسی اور مجاہدین کی امداد بند کرنے کا فیصلہ ہو گیا تو اس پر مجاہدین کارڈ عمل کیا ہو گا؟ اس کے جواب میں کیپٹن اکبر شاہ نے کہا کہ جہاد جنگ پر لڑنے والے مجاہدین کو جنیوا مذکورات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ جنگ میں ان کا ہدف افغانستان میں ایک مکمل شرعی حکومت کا قیام ہے اور اس ہدف کو حاصل کرنے تک جنگ بند کرنے کا ان کے نزدیک کوئی جواز نہیں ہے۔ جنیوا میں سمجھوتہ کچھ بھی ہو مجاہدین اپنی جنگ جاری رکھیں گے اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کابل میں ایک مکمل اسلامی حکومت کا قیام نہیں ہو جاتا۔ باقی رہا ہماری امداد بند کرنے کا سوال تو میں یہ واضح کر دیا چاہتا ہوں کہ ہمارے جہاد کا انحصار اس امداد پر نہیں ہے، نہ ہم نے کسی طاقت کے کہنے پر جہاد شروع کیا ہے اور نہ ہی کسی کی امداد کی شرط کے ساتھ اس کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب نوسال قبل جہاد کا آغاز کیا تھا اس وقت امریکہ سمیت کوئی بھی قوت ہماری طرف متوجہ نہیں تھی۔ ہم نے اپنی پرانی بندوقوں کے ساتھ روئی افواج کا مقابلہ کیا اور پھر روئی افواج اور ان کے جماعتیوں سے اسلحہ چھین کر جہاد کو جاری رکھا۔ امریکہ اور دوسری جماعتی قوتوں ہماری طرف اس وقت متوجہ ہوئیں جب ہم روئی افواج کے مقابلہ میں اپنی مزاحمت کا وجود تسلیم کر چکے تھے۔ اس لیے اگر ہم اس دور میں جہاد کا آغاز کر کے اپنی یوسیدہ اور پرانی بندوقوں کے ساتھ روئی فوجوں کا راستہ روک سکتے ہیں تو آج بھی بیرونی طاقتوں کی امداد کے بغیر لڑکتے ہیں اور ہم کسی کی امداد کی پرواہ کیے بغیر مکمل فتح تک جہاد کو جاری رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

ہمارا دوسرا سوال یہ تھا کہ افغان مجاہدین کے پاس اسلحہ کے جو موجودہ ذخائر ہیں ان کے ساتھ اس جنگ کو مزید کتنے عرصہ تک جاری رکھا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں کیپٹن اکبر شاہ نے کہا کہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ مزید کوئی امداد املاے بغیر موجودہ اسلحہ کے ساتھ پانچ سال تک اس جنگ کو اسی کیفیت میں جاری رکھا جا سکتا ہے جس کیفیت میں یہ جنگ ہو رہی ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلحہ کی ایک بڑی مقدار وہ ہوتی ہے جو ہم مقابلہ میں کابل انتظامیہ اور روس کی فوجوں سے چھینتے ہیں اور ہمارے پاس موجود اسلحہ کے ذخائر میں ایک معتدله مقدار اسی قسم کے اسلحہ کی ہے۔ اس لیے ہمیں اسلحہ کی فراہمی کے بارے میں کوئی زیادہ پریشانی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم تواند اللہ تعالیٰ کی رضاکاری لڑ رہے ہیں، ہمارا انحصار اور بھروسہ اس کی ذات پر ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ وہ قادر مطلق ہمارے لیے اسباب خود فرم کرے گا

اور مجاہدین کو بالآخر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مکمل فتح حاصل ہو کر رہے گی۔  
 ہمارا پروگرام خوست کے مجاز کے شہر آفاق کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کے ساتھ ملاقات کا بھی تھا لیکن وہ باڑی نام کے ایک اور مجاز پر گئے ہوئے تھے جہاں چند روز قبل مجاہدین نے حملہ کر کے تین موریچے فتح کیے تھے۔ اس معمر کے میں مبینہ طور پر سرکاری فوج کے ساتھ سے زیادہ فوجی مارے گئے اور کم و بیش اتنی ہی تعداد میں گرفتار ہوئے اور اسلحہ کی ایک اچھی خاصی مقدار مجاہدین کے ہاتھ لگی۔ مولانا حقانی اس مجاز پر مصروف تھے اس لیے اس مرد مجاہد کی زیارت کا شرف ہمیں حاصل نہ ہو سکا اور ہم دوروز را غسلی کے مرکز جہاد میں گزار کر ۲۳ مارچ کو واپس بنوں پہنچ گئے۔  
 اس دورہ میں ہمارے تاثرات یہ ہیں کہ مجاہدین کے حوصلے بہت بلند ہیں اور وہ جنیواند کرات کے نتائج سے بے نیاز ہو کر کابل پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرانے کے عزم کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں حزبِ اسلامی افغانستان کے امیر مولوی محمد یوسف خاصل کا یہ مقولہ مجاہدین کے عزم اور موقف کی مکمل ترجیحی کرتا ہے کہ ”ایک مکمل اسلامی حکومت کے قیام کے لغیرِ تھیار ڈالنا ہمارے لیے اجتماعی خودکشی کے متراو ف ہو گا۔“

یہ مقولہ مختلف کتبوں اور کینڈروں کی صورت میں مجاہدین کے مرکاز میں آؤ یا۔ ہے اور انہیں ہر وقت اپنی جدوجہد کے اصل مقصد کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ افغان مجاہدین کی یہ جنگ عالم اسلام میں جہاد کے شرعی فرضیہ کے احیاء کا باعث بن رہی ہے اور یہ جہاد اگر کامیابی سے ہمکنار ہو گیا تو صرف یہ کبیت المقدس، فلسطین، کشمیر، بخارا، اری ٹیریا اور دیگر مقبولہ مسلم علاقوں کی آزادی کی راہ ہموار ہو گی بلکہ عالم اسلام میں مناقنہ سیاست کے خاتمه اور اسلام کے مکمل غلبہ اور نفاذ کی منزل بھی قریب آجائے گی۔

## افغان مسئلہ پر ”جنیوا معاهده“

یافت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۹ اپریل ۱۹۸۸ء

وزیر اعظم جناب محمد خان جو نیجو نے لگزشتہ روز پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جنیوا معاهده پر اپنی حکومت کے موقف کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ ”جنیوا معاهدہ نہ تو بہترین ہے اور نہ ہی جامع۔ تاہم موجودہ حالات کے تحت اس سے بہتر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا۔“

اسی موقع پر وزیرِ مملکت برائے امور خارجہ مسٹر زین نورانی نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”دنیا کی کوئی طاقت نہی افغان حکومت میں مجاہدین اور ان کے رفقاء کی بھروسہ شرکت کو نہیں روک سکے گی۔“

(بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) ۝

اصل مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ، حکومتِ پاکستان اور جنیوا مذکورات میں شریک دوسری قوتوں کے پیش نظر مذکورات اور سمجھوتے کا سب سے اہم مقصد اور بنیادی بدف یہ رہا ہے کہ افغانستان میں کمیونسٹ حکومت اور مجاهدین کو کسی ایک فارمولے پر جمع کر کے مل جل کر افغانستان کا نظام چلانے پر آمادہ کر لیا جائے۔ اور موجودہ جنیوا معاہدہ اسی فکر کا آئینہ دار ہے۔ جبکہ افغان مجاهدین اور ان کی پشت پر پورے عالمِ اسلام کی دینی و نظریاتی قوتوں کا بدف اور مقصد افغانستان میں کمیونسٹ نظام کا مکمل خاتمه اور اس کے ہمندرات پر ایک مکمل اسلامی حکومت کی بلند و بالا عمارت کا قیام ہے۔ اسی لیے افغان مجاهدین نے جنیوا معاہدے کو مسترد کر دیا ہے اور عالمِ اسلام کی دینی و نظریاتی قوتیں اس مسئلہ میں ان کے ساتھ ہیں۔ جمیعت علماء اسلام پاکستان ملتِ اسلامیہ کے اسی نظریاتی اور دینی موقف کے منظہم افہار کیلئے ۱۲۹ پریل کو پورے ملک میں جنیوا معاہدہ کے خلاف ”یومِ سیاہ“ منوار ہے۔ افغان مجاهدین کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ اقتدار میں شرکت کی پیشکش توں سے قبل بھی ڈاکٹر نجیب اللہ کی طرف سے کئی بار ہو چکی ہے جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔ اس لیے مسئلہ افغانستان کا واحد حل آج بھی یہ ہے کہ کمیونسٹ حکمران جس طرح روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر کامل آئے تھے اسی طرح روسی ٹینکوں پر والپس چلے جائیں اور کابل پر مجاهدین کی نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کی جائے۔ اس کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا اور نہ ہی اس کے شعلوں کی پیش سے اردو گرد کے ممالک خود کو محفوظ کرنے کی خواہش کو عملی جامد پہنانیکیں گے۔

## جنرل محمد ضیاء الحق شہید

بیفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور--- ۱۹۸۸ء

ستہ اگست کی شام کو ریڈ یو پاکستان کی اس المناک خبر نے پوری قوم کو سختی کی کیفیت سے دوچار کر دیا کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق بہاولپور کے قریب فضائی حادثہ میں دیگر کئی فوجی افسران کے ہمراہ جاں بحق ہو گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق متعدد اعلیٰ فوجی افسران کے ساتھ بہاولپور ڈو ڈین میں فوجی مشقیں دیکھنے کے بعد بہاولپور سے بذریعہ طیارہ اسلام آباد واپس جا رہے تھے کہ پرواز کے چند منٹ بعد ان کا طیارہ دھماکہ کے ساتھ چھٹ کر زمین سے جا ٹکرایا اور بد قسمت طیارے کے مسافروں میں سے ایک فرد بھی نہ نجسکا۔ اس المناک حادثہ میں جاں بحق ہونے والوں میں صدر کے ہمراہ اعلیٰ فوجی حکام کے علاوہ پاکستان میں امریکی سفیر مسٹر آر نلڈر آئیل اور ان کے فوجی اتاشی بھی شامل ہیں۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق ۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰ اصلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بر سر اقتدار آئے اور انہوں نے نفاذِ اسلام کو اپنی حکومت کا سب سے بڑا مقصد قرار دے کر اس کیلئے وقتیًّا فوقتاً متعدد اقدامات کیے۔ ان کے اقدامات کی ست روی اور پالیسی ترجیحات سے ملک کے دیگر دینی حلقوں کی طرح ہمیں بھی اختلاف رہا یکین یہ بات تمام حلقوں میں یکسان مسلم رہی کہ وہ ایک راسخ اعتقیدہ مسلمان اور شریف النفس انسان ہیں۔

صدر جزبل محمد ضیاء الحق نے افغانستان میں رو سی جاریت سے پیدا شدہ صورتحال کا حس استقلال کے ساتھ سامنا کیا اور افغان مجاهدین کی جس طرح سیاسی اور اخلاقی پشت پناہی کی اس نے افغانستان کی آزادی کیلئے جنگ لڑنے والے مجاهدین کو حوصلہ بخشنا۔ ان کی سیاسی پالیسیوں اور افکار سے ملک کے بیشتر سیاسی حلقوں کو اختلاف رہا مگر پاکستان کے ساتھ ان کی محبت اور ملکی سالمیت وحدت کے تحفظ کیلئے ان کی مخلصانہ کوششیں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

صدر جزبل محمد ضیاء الحق کے ساتھ ایک درجن سے زائد اعلیٰ ترین فوجی افسروں کا جام بحق ہونا بھی ایک بہت بڑا تومنی المیہ اور ناقابلٰ مغلی نقسان ہے۔ طیارہ کا حادثہ کیوں پیش آیا؟ اس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور اس خدشہ کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے کہ بد قسمت طیارہ تحریب کاری کا نشانہ بنا اور کسی سوچ سمجھے منصوبہ کے تحت یہ ہونا ک خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ سینٹ آف پاکستان میں سینئر و فاقی وزیر جناب محمد اسلم خٹک کی اس تقریر نے ان خدشات کو اور زیادہ اجرا کر دیا ہے کہ کچھ عرصہ سے اس قسم کی سازشوں کی اطلاعات مل رہی تھیں اور انہوں نے صدر مرحوم کو خبردار کر دیا تھا۔ صحیح صورتحال تحقیقات کے بعد ہی سامنے آئے گی تاہم اس سلسلہ میں بہت زیادہ محتاط ہونے اور تومنی وحدت و بیکھیت کو برقرار رکھتے ہوئے حادثہ کے حقیقی اسباب کو جلد از جلد بے نقاب کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

صدر جزبل محمد ضیاء الحق کی المناک موت کے بعد یہ بات تومنی اور ہین الاقوای حلقوں کیلئے اطمینان کا باعث بنی ہے کہ آئینی عمل کا تسلسل قائم ہے، سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خان نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھال لیا ہے اور مرکزاً اور صوبوں میں تگران حکومتوں کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ ۱۲ نومبر کو پروگرام کے مطابق عام انتخابات کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اور یہ بات مزید اطمینان کا باعث بنی ہے کہ صدر غلام اسحاق خان کی صدارت میں ہونے والے کاپینہ کے ہنگامی اجلاس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہوں نے شرکت کر کے آئینی عمل کے تسلسل کے ساتھ اپنی موافقت اور ہم آہنگی کا اظہار کیا ہے۔ اور اس طرح وہ تمام خدشات و خطرات سردست ٹھیک ہیں جو صدر ضیاء کی المناک موت کی خبر سننے ہی محب وطن اور پاشور شہریوں کیلئے ذہنی پریشانی اور قلبی اضطراب کا باعث بن گئے تھے۔

ہم آئینی عمل کے تسلسل اور عام انتخابات کے پروگرام کے مطابق العقد کے اعلان کی حمایت کرتے ہوئے قائم مقام صدر جناب غلام اسحاق خان اور ان کے رفقاء کو یقین دلاتے ہیں کہ تومنی وحدت و سالمیت کے تحفظ، آئینی عمل کی بالادستی، اسلامی نظام کے مؤثر نفاذ اور جمہوری عمل کی طرف یقینی پیش رفت کے اقدامات میں انہیں ہماری حمایت اور تعاون حاصل رہے گا۔

ہم دعا گوہیں کہ اللہ رب العزت صدر محمد ضیاء الحق اور دیگر مرحویین کو جوار رحمت میں گلہ دیں، ان کی حنات قبول فرمائیں، سینات سے درگزر فرمائیں اور وطن عزیز پاکستان کو اندروںی و بیرونی سازشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک صحیح اور مکمل اسلامی ریاست کی منزل کی طرف مؤثر پیش رفت کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## افغان جارحیت اور جنیوا معاهده

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور --- ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ء

افغان طیاروں نے پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کو تسلسل سے جاری رکھا ہوا ہے مگر پشاور کے قریب اس نے جس طرح شہری آبادی پر وحشیانہ بمباری کی ہے وہ تمام ہین الاقوامی قواعد و ضوابط اور حدود و قیود کی دھیان بکھرنے کے مترادف ہے۔ افغان انتظامیہ کی اس دہشت گردی کے نتیجہ میں ایک پاکستانی شہید اور متعدد زخمی ہوئے ہیں جنہیں طبی امدادی جارہی ہی ہے۔ افغان طیاروں نے یہ سب کچھ اس وقت کیا ہے جب مجاہدین نے پورے افغانستان میں ان کا ناطقہ بند کر کر کھا ہے۔ اپنی اس اندر ویں نیکش اور پسپائی سے دنیا کی نظریں ہٹانے کیلئے انہوں نے پاکستان کے ساتھ چھپڑ چھڑا کے سلسلہ میں شدت پیدا کر دی ہے۔ افغان طیاروں کی یہ کارروائی جنیوا معاهدہ کی صرف کی خلاف ورزی ہے اور پاکستانی حکمرانوں اور قوموں کے علاوہ جنیوا معاهدے کے دونوں ضامنوں کیلئے باعث تشویش ہے۔ افغان انتظامیہ کی اس تشددانہ دہشت گردی کی ہین الاقوامی سطح پر جو مدت ہو گی وہ اپنی جگہ ہے مگر حکومت پاکستان کو بھی اس معاملہ میں ڈھیلی ڈھائی پالیسی کی بجائے دو ٹوک موقف اختیار کرنا چاہیے۔

## حضرت مولانا عبد الحق

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور --- ۲۳ ستمبر ۱۹۸۱ء

غالبًاً ۳۰ اگست کی صبح کا تصدی ہے راقم الحروف نیویارک کے علاقہ برولین میں ضلع گجرات کے ایک دوست جناب محمد دین کے ہاں قیام پذیر تھا۔ صبح نماز سے پہلے کا وقت تھا، میرے ساتھ کمرہ میں حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی بھی خواب تھے۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ گوجرانوالہ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوں، تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ جناب ظفر علی ڈار میرے کمرہ میں آئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ کو پتہ نہیں کہ شریعت بل کے محک مولانا تمیع الحق کا انتقال کر گئے ہیں۔ میں نے چونک کر پوچھا کہ مولانا تمیع الحق یا مولانا عبد الحق؟ انہوں نے کہا ہاں مولانا عبد الحق کا انتقال گیا ہے، میں نے ابھی ان اللہ و انا یہ راجعون ہی پڑھا تھا کہ مولانا فداء الرحمن درخواستی کی آواز آئی کہ اٹھو ہٹھی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نیند سے بیدار ہوا اور مولانا درخواستی کو خواب سنایا۔ انہوں نے کہا کہ خواب تو اچھا ہے، خواب میں کسی کی موت کی خبر اس کی بتایا، ان کا جواب بھی وہی تھا جو مولانا فداء الرحمن درخواستی سے سن چکا تھا اور خود میں نے بھی تعبیر رویا کی بعض کتابوں میں یہی کچھ پڑھ رکھا تھا۔ مگر کچی بات ہے کہ ان سب امور کے باوجود حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ کی علالت اور تقاضت کی وجہ سے دل کو تردداً اور تکفیر سے نجات نہیں دلا سکتا تھا۔

۸ تبرکو میں منورہ پہنچا تو استاذ محترم قاری محمد اور صاحب نے یہ المذاک خبر سنائی کہ حضرت مولانا عبد الحقؒ کا گذشتہ

روزانہ انتقال ہو گیا ہے، اناللہ داتا الیہ راجعون۔ قاری محمد اور صاحب میرے حفظ القرآن کے شفیق استاد ہیں اور آج کل مدینہ منورہ میں جامعہ محمد بن مسعود کے تحت تحریف القرآن کے ایک مدرسہ میں پڑھا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ خبر ریڈیو سے سنی تھی جس کے مطابق جنازہ بھی ادا کیا جا چکا تھا۔

خواب پیغمبرؐ کے سوا کسی کا جھٹ نہیں ہے لیکن یہ درست ہے کہ خواب میں اللہ تعالیٰ بسا اوقات آنے والے واقعات کی طرف اشارہ فرمادیتے ہیں۔ میرے ساتھ اسی قسم کا واقعہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؐ کے بارے میں بھی رونما ہو چکا ہے۔ مولانا ہزارویؐ کی وفات سے پانچ چھوڑ پہلے کا تصدیق ہے خواب میں دیکھتا ہوں کہ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں علماء کا ایک اجلاس ہے اس میں مولانا غلام غوث ہزارویؐ کریم پر بیٹھے ہیں جبکہ باقی حضرات ان کے سامنے بیٹھے ہیں جیسے سب ان کا خطاب سننے کیلئے جمع ہوں اور میں حسب معمول سیکرٹری کے فرائض انعام دے رہا ہوں۔ اپنے اجتماع میں ایک بزرگ کو دیکھ کر جو کچھ روز پہلے کا تصدیق ہے خواب میں دیکھتا ہوں کہ گورنیش الاحرار مولانا حسیب الرحمن لدھیانویؐ کے بھائی تھے اور تقسیم ہند سے پہلے مجلس احرار اسلام کے سرگرم رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، ان کا چند سال قبل انتقال ہو گیا تھا جس کا مجھے خواب میں بھی اور اک تھا اور اسی لیے بار بار غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ انہیں تو چند سال قبل خود ہم جنازہ پڑھ کے پرد خاک کر کچکے ہیں یہ یہاں کیسے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ بھائی کیوں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہو، میں نے کہا کہ حضرت آپ؟ کہنے لگے کہ ہاں یہ میں ہی ہوں اور بابے کو لینے آیا ہوں۔ بابے سے مراد حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؐ تھے جنہیں جماعتی کارکن محبت سے بابا کہا کرتے تھے۔ صحیح ہوئی تو میں نے سب سے پہلے مولانا علام محمد احمد لدھیانویؐ کو فون پر خواب سنایا اور کہا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا ہزارویؐ کو لینے آرہے ہیں اور پھر اس واقعہ کے چار پانچ دن بعد مولانا ہزارویؐ کا انتقال ہو گیا۔ اس پس منظر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق گنڈی وفات کی خبر اگرچہ میرے لیے کم از کم غیر متوقع نہیں تھی لیکن خبر سنتے ہی دل کی جو کیفیت ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ معاذ ہن جنازہ اور تذین کے مرحل کی طرف منتقل ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ایک مختن سے وجود اور مٹھی بھرپڑیوں کے ڈھانچے کی صورت میں علم و عمل اور خلوص و تواضع کے اس بھرپڑا کو آخر کس حوصلہ کے ساتھ لوگ مٹی کے نیچے دبارہ ہوں گے۔ فوراً مسجد نبویؐ میں حاضری دی، حسن اتفاق سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر شریف کے ساتھ جگہ مل گئی، مسجد نبویؐ کے اس حصہ کو جناب نبی رسالت تائب نے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ فرمایا ہے، وہیں بیٹھ کر حضرت مولانا عبد الحق گنڈی واصل ثواب کیلئے قرآن کریم کا کچھ حصہ تلاوت کیا اور ان کیلئے دعائے مغفرت کی۔ دوسرا روز مکہ مکرمہ میں اللہ رب العزت نے حضرت شیخ الحدیث گنڈی طرف سے طواف بیت اللہ کے سات پھر لگانے اور ایصال ثواب کیلئے قرآن کریم کا کچھ حصہ مسجد حرام میں تلاوت کرنے کی توفیق بھی دے دی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور حضرت مولانا عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات سے نوازیں، آمین یا بار العالمین۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق گنڈی کوں تھے اور ملک و قوم کیلئے ان کی علمی، دینی و سیاسی خدمات کا دائرہ کس قدر وسیع ہے؟ یہ تذکرہ ایک ضمیم کتاب کا مقتضی ہے اور بلاشبہ یہ ان کا حق ہے کہ نیشنل کوان کی تنگ و تاز، جدوجہد و عمل اور

خلوص ایثار کی تابندہ روایات سے آگاہ کیا جائے کیونکہ تاریخ اُسی ہی شخصیات کا مجموعہ ہوتی ہے بلکہ مولانا عبد الحمیں گاوجوہد ایسی ہستیوں میں سے ہے جو خود تاریخ بنایا کرتی ہیں اور جن کی جہاد و عمل کی روایات تاریخ کا مایہ صد افتخار حصہ بنتی ہیں۔ حضرت مولانا عبد الحمیں گاوجوہد ایک مصلح اور استاذ کی زندگی تھی، انہوں نے معاشرہ میں قرآن و سنت کی تعلیم کو عام کیا بلکہ صوبہ سرحد میں دینی تعلیم کو ایک تحریک بنادیا جو آن عظیم درسگاہ دارالعلوم حقانیہ کی قیادت میں جاری و ساری ہے۔ ان کے بلا واسطہ اور بالواسطہ شاگردوں کو شمار کیا جائے تو ہزاروں میں لگتی مشکل ہو جائے گی۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد افغانستان میں روکی جاریت کے خلاف برادرست مصروف جہاد ہے جن میں حزب اسلامی کے امیر مولانا محمد یونس خالص اور پکتیا کے شہر آفاق مکانڈر مولانا جلال الدین حقانی بطور خاص قبل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا عبد الحمیں مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں اجنبی ٹکٹ جیسے معروف سیاست داں کو مولانا مر حوم کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا، ۱۹۷۱ء میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ نصر اللہ خٹک اپنی تمام تر قلمی سامانیوں کے باوجود شکست کھا گئے، اور ۱۹۸۵ء میں انہیں چار پارٹی پر پڑے ہوئے ہی علاقے کے لوگوں نے قومی اسمبلی کا رکن چن لیا۔ قومی اسمبلی میں حضرت مولانا مر حوم کے خطابات علم و دانش، عزم و استقلال اور خلوص و خیر خواہی کا مرتع ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن پاکستان میں اسلامی نظام کا عملی اور مؤثر نقاوذ رہا ہے اور اس مقصد کیلئے انہوں نے کسی ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ شریعت بل کی جدو جہد کے سلسلہ میں قیادت کیلئے ان سے درخواست کی گئی تو فرمائے گلے کہ ”بے جان لاشہ ہوں، بہل جل نہیں سکتا لیکن شریعت کیلئے جہاں حکم ہو جانے کیلئے تیار ہوں، آپ جہاں چاہیں چار پارٹی کو اٹھا کر لے جاسکتے ہیں۔“

یہ امر واقعہ ہے کہ اس جدو جہد میں ضعف، نقاہت اور علاالت ان کے اڑے نہیں آئی، انہیں اسی حالت میں لاہور، بنوں اور راولپنڈی کے اسفار کی زحمت دی گئی جو انہوں نے قبول فرمائی۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کے ساتھ ساتھ افغانستان میں جہاد کی کامیابی اور اسلام کا غالبہ ان کی زندگی کی ایک بڑی تمنا رہی ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو جہاد میں حصہ لینے کی تلقین کرتے، اپنی جیب سے انہیں سفر خرچ دیتے، ان کے حالات کی خبر رکھتے، مشاورت میں شریک ہوتے اور مجاهدین کی کامیابی کیلئے دعا گورہتے۔ الغرض حضرت مولانا عبد الحمیں کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے علماء بلکہ مجاهدین افغانستان بھی اپنے ایک عظیم مری، سرپرست اور دعا گو بزرگ سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے جانشین حضرت مولانا اسماعیل الحق کو توفیق دیں کہ وہ اپنے عظیم باپ کی تابناک روایات و زندہ رکھتے ہوئے قافلہ علماء حق کی قیادت کا فریضہ بہتر طور پر سرانجام دے سکیں، آمین یا رب العالمین۔



ڈاکٹر نجیب اللہ کا دور

(۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۲ء)

## جہاد افغانستان کو سبوتاڑ کرنے کی سازش

بیفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء

جہاد افغانستان کے بارے میں پاکستان کا جو متوازن اور جرأت مندانہ موقف گذشتہ گیا رہا ہے اسے نہ صرف پاکستان کے عوام اور عالمِ اسلام کی بھروسہ تائید حاصل ہے بلکہ عالمی رائے عامہ بھی اقوامِ متحده کی متعدد قراردادوں کی صورت میں اس اصولی موقف کو درست قرار دے چکی ہے۔ پاکستان نے نہ صرف افغان مہاجرین کو اپنے ملک میں پناہ دے کر انسانی ہمدردی اور اسلامی بھائی چارے کی بنیاد پر ان کی حقیقی المقدور خدمت کی بلکہ جہاد افغانستان کی اخلاقی اور سیاسی پشت پناہی کر کے افغان مجاهدین کو یہ حوصلہ بخشکر وہ روئی افواج کو اپنے وطن سے دریائے آموں کے درسری طرف دھکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

افغان مجاهدین روئی افواج کو سرحدوں سے باہر دھکلنے کے بعد روئی جاریت کے بچ کچھ اثرات اور روئس کے چھوڑے ہوئے اسلحہ اور اس کے محفوظوں سے نئنے میں مصروف ہیں مگر کابل پر افغان مجاهدین کی نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہو جانے کا خوف امریکہ، روئی، بھارت اور اسرائیل کو مضطرب کیے ہوئے ہے اور عالمی سطح پر یہ سازشیں ہو رہی ہیں کہ افغان مجاهدین کی جدوجہد کو آخری مرحلہ میں سبوتاڑ کر دیا جائے۔ خان عبد الاولی خان کی طرف سے عالمی رہنماؤں کے نام خطوط میں افغان مجاهدین کی جدوجہد کے خلاف جوزہ افشاٹی کی گئی ہے وہ اسی سازش کی ایک کڑی ہے۔ اور اب یہ خبر اخبارات کی زینت بنی ہے کہ پیپلز پارٹی کی چیئرمین بے نظیر بھو افغان پالیسی پر نظر ثانی کی خواہ شمند ہیں اور انہوں نے اپنے ایک حالیہ بیان میں خان عبد الاولی خان کی مہم کی بالواسطہ حمایت کا عنديہ دیا ہے۔

اگرچہ اس فیصلہ کن مرحلہ میں کوئی سازش بھی افغان مجاهدین کو کابل کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتی لیکن ہم اس کے باوجود حکومت پاکستان اور دیگر طبقات کو خبردار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے عوام، عالمِ اسلام اور عالمی رائے عامہ افغان مجاهدین کے ساتھ ہیں اس لیے وہ افغان مجاهدین کی جدوجہد اور پاکستان کے کامیاب اور باوقار موقف کو سبوتاڑ کرنے کی ناپاک سازش میں شریک نہ ہوں اور اپنے گروہی مفادات کی خاطر پاکستان کی اصول پسندی اور حق پرستی کو دادا پر لگانے سے باز رہیں۔

## متحده حزبِ اختلاف کا قیام اور افغان مجاهدین

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور --- ۲ جون ۱۹۸۹ء

قومی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے موقع پر جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کی قیادت میں متحده حزبِ اختلاف کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے اور جناب جتوئی نے قومی اسمبلی میں قائد حزبِ اختلاف کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ متحده حزبِ اختلاف میں اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ارکان اسمبلی کے علاوہ نوابزادہ نصر اللہ خان، خان عبدالولی خان، مولانا عبد العتار خان نیازی، مولانا فضل الرحمن، جناب غلام مصطفیٰ اکھر اور ان کی جماعتوں کے ارکان بھی شامل ہیں۔

متحده حزبِ اختلاف کے قیام کا اعلان ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں کیا گیا جس میں ان تمام جماعتوں کے پارلیمانی قائد شریک ہوئے۔ اس موقع پر متحده حزبِ اختلاف کے ترجمان کی حیثیت سے نوابزادہ نصر اللہ خان نے مندرجہ ذیل الفاظ میں متحده اپوزیشن کے موقف اور پروگرام کی وضاحت کی۔

”هم وفاتی پارلیمانی نظام، صوبائی خود مختاری، قوانین شریعت کے نفاذ، اقتصادی اور سماجی انصاف، امن و امان اور حکومتی پالیسیوں پر ثابت اور تعمیری تقویٰ جیسے بنیادی معاملات میں مشترکہ طور پر جدوجہد کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔“ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاپور۔ ۵ جون ۱۹۸۹ء)

جبکہ تک قومی اسمبلی میں اپوزیشن سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کے اتحاد کا تعلق ہے ہم اس کا پروجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس سے قومی سیاست میں توازن پیدا ہو گا اور ایک مضبوط اور مستحکم تباadel قیادت ابھرے گی۔ ہمیں متحده حزبِ اختلاف کے مذکورہ بالامقصاد سے بھی کلی اتفاق ہے بالخصوص ان مقاصد میں قوانین شریعت کے نفاذ کے نتائج کی شمولیت ہمارے نزدیک ملک کے دینی حلقوں کی اصولی کامیابی ہے۔ لیکن ایک بات ہمیں شدت سے محسوس ہو رہی ہے کہ ان مقاصد میں افغان مجاهدین کی عظیم جدوجہد کی حمایت کا، ہم مسئلہ غالب ہے جو متحده حزبِ اختلاف میں جہاد افغانستان کے بعض مخالفین کی شمولیت کے پس منظر میں تکلیف دہ حد تک دینی حلقوں کیلئے پریشانی کا باعث بن رہا ہے۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے قیام کے بنیادی مقاصد میں جہاد افغانستان کی مکمل پشت پناہی شامل ہے لیکن اگر قومی اسمبلی کے پلیٹ فارم پر متحده حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی جماعت ہوتے ہوئے بھی اسلامی جمہوری اتحاد کو اس اہم اور نازک دینی و قومی مسئلہ پر خاموشی اختیار کرنا پڑ رہی ہے تو یہ کوئی خوش آئندہ اور اطمینان بخش صورت حال نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی ہائی کمان مسئلہ کے اس پہلو کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے گی اور معاملہ کو اس حد تک نہیں بگڑنے دے گی کہ اس کی سیاسی حکمت عملی پر نظریات سے اخراج اور بے اصولی کا لیبل آسانی کے ساتھ چسپاں کیا جاسکے۔

## یاسر عرفات اور جہادِ افغانستان

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور --- ۳۰ جون ۱۹۸۹ء

فلسطین کی آزاد حکومت کے سربراہ جناب یاسر عرفات گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے اور پارلیمنٹ کے خصوصی اجلاس سے خطاب کرنے کے علاوہ افغان مجاهدین کی آزاد عبوری حکومت کے راہنماؤں سے بھی ملے۔ تویی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق ان کا یہ دورہ ان عالمی کوششوں کا ایک حصہ تھا جو افغان مجاهدین کو نجیب انتظامیہ کے ساتھ مفاہمت پر آمادہ کرنے کیلئے کی جا رہی ہیں۔ لیکن افغان مجاهدین کی قیادت نے جناب یاسر عرفات سے معدرت کرتے ہوئے اپنے اس دلوٹ موقف کا پھر حکومت کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت یا گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جناب یاسر عرفات کو تحریک آزادی فلسطین کے مسلمہ راہنمائی حیثیت سے دنیا بھر میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے پاکستان اور افغانستان کے عوام کو یہ موقع تھی کہ ان کی مسامی اور تنگ دو کارخ فطری طور پر افغان مجاهدین کے عظیم جہاد آزادی کی حمایت میں واضح ہو گا اور وہ کابل میں نجیب انتظامیہ کے خاتمه اور ایک نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے۔ لیکن نہ صرف افغان مجاهدین بلکہ پاکستان کے عوام کو بھی یہ دیکھ کر مایوس ہوئی کہ جناب یاسر عرفات نے اس سفر کی زحمت افغان مجاهدین کو نجیب انتظامیہ کے ساتھ گفتگو اور مفاہمت کا مشورہ دینے کیلئے فرمائی ہے۔

ہم جناب یاسر عرفات کی خدمت میں بصد ادب و احترام یہ گزارش کریں گے کہ اگر وہ جہادِ افغانستان کے اس نازک اور علیین مرحلہ میں کوئی موثر کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت مناسب اور خوش آئند بات ہو گی لیکن اس کا صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ افغان مجاهدین کے اصولی اور نظریاتی موقف کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے روئی قیادت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کابل میں نجیب انتظامیہ کو قائم رکھنے کی ضرورت کر کے افغانستان کے ۸۵ فیصد علاقہ پر قابض افغان مجاهدین کی عبوری حکومت کو افغانستان کاظم و نق سنہلانے کا موقع دے۔ ہمیں یقین ہے کہ جناب یاسر عرفات کا یہ کردار جہاں افغان مجاهدین کے جہاد آزادی کی منطقی تکمیل میں مدد ثابت ہو گا وہاں تحریک آزادی فلسطین کیلئے بھی ایک نظریاتی اور فیصلہ کمن موڑ بن سکے گا جہاں سے وہ شایدیت المقدس کی بازیابی اور فلسطین کی مکمل آزادی کیلئے نئے سفر کا آغاز کر سکیں۔

## صدر مملکت غلام اسحاق خان سے معدرت کے ساتھ

بفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاپور --- ۱۳ جولائی ۱۹۸۹ء

اسلامی جمہوری اتحاد سے تعلق رکھنے والے سینئروں کے ایک وفد نے گذشتہ روز صدرِ مملکت جناب غلام اسحاق خان سے ملاقاتی اور ان سے

- جہاد افغانستان کے بارے میں حکومتی پالیسی میں تبدیلی،
- سندھ میں اسلحہ بھجوانے کے الزامات،
- اور جزئی فضل حق کو قتل کے کیس میں ملوث کرنے کی هم

کے بارے میں اپنے موقف اور جذبات سے آگاہ کیا۔ وفد میں قائد جمیعت مولانا اسماعیل الحق کے علاوہ سینیٹر مولانا قاضی عبد اللطیف، سینیٹر قاضی حسین احمد، سینیٹر محمد علی ہوتی، سینیٹر طارق چودھری، سینیٹر احمد میاں سومرو اور سینیٹر ڈاکٹر بشارت الہی شامل تھے۔

صدر محترم نے جہاد افغانستان کے بارے میں حکومتی پالیسی میں تبدیلی کے تاثر کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ جہاد افغانستان کی حمایت میں پالیسی کا تسلسل قائم ہے۔ ہم صدر محترم سے بصیرات و احترام گزارش کریں گے کہ ان کا یہ ارشاد ہمارے لیے بہت مسرت اور اطمینان کا باعث ہوتا یکین م وجودہ و فاقی حکومت کے برقرار آنے کے بعد

انغان مجاہدین کی عبوری حکومت کو تسلیم کرنے سے مسلسل گریں۔

حکومتی حلقوں کی طرف سے افغانستان میں ٹیکنونگریں کی حکومت قائم کرنے کی تجویز،

انغان مهاجرین کیلئے افغانستان کے اندر الگ علاقہ مخصوص کی تجویز،

اور افغان راجہنماؤں کی طرف سے حکومت پاکستان کی پالیسی میں واضح تبدیلی کے احساس کا اظہار

ہمارے لیے اس خوش آئندی قیمت دہانی کو قبول کرنے میں ایک منطقی رکاوٹ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر صدر محترم اس سلسلہ میں سرکاری روپرتوں سے ہٹ کر صورت حال کی تبدیلی کا خود جائزہ لیں تو انہیں سینیٹروں کے مذکورہ وفد کے موقف سے اتفاق کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

## کیا افغان مجاہدین کی جنگ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے؟

۱۲ نومبر ۱۹۸۹ء کو جامعہ اشرفیہ لاپور میں حرکۃ الجہاد الاسلامی کے سالانہ اجتماع سے خطاب

بعد الحمد لله واصلوا - جناب صدر، قابل احترام علماء کرام اور میرے مجاهد بھائیو!

میں حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا قاری سیف اللہ اختر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس اجتماع میں حاضری اور جہاد افغانستان کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ وقت مختصر ہے اور علماء کرام کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے آپ سے مخاطب ہونا ہے اس لیے انتہائی احتصار کے ساتھ کسی تمہید کے بغیر جہاد افغانستان کے بارے میں عام طور پر کیے جانے والے دو اہم سوالوں کا جائزہ لوں گا۔

میرے محترم بھائیو! آپ حضرات میں سے بہت سے دوست وہ ہیں جو مجاز جنگ پر جا کر عملاً جہاد میں شریک ہو چکے ہیں اور بہت سے نوجوان ایسے ہیں جن کے دلوں میں جہاد کا جذبہ موجود ہے اور وہ مجاز جنگ پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جہاد افغانستان کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے شکوک کا جائزہ لیا جائے تاکہ ذہنوں میں کسی قسم کا خلجان باقی نہ رہے۔ جہاد افغانستان کے بارے میں اس وقت جن دوسراں پر سب سے زیادہ نزور دیا جا رہا ہے ان میں:

1. ایک یہ ہے کہ جب روئی افواج افغانستان سے جلی گئی ہیں تو اب جہاد جاری رکھنے کا شرعی جواز کیا تھی رہ گیا ہے اور کیا افغانستان میں ہونے والی موجودہ جنگ مسلمان کی مسلمان کے ساتھ جنگ نہیں ہے؟

2. دوسرا سوال یہ ہے کہ افغان مجابدین نے اب تک جو جنگ لڑی ہے اس میں انہیں امریکہ، پاکستان اور دوسرے ممالک کی پشت پناہی حاصل تھی مگر اب ان ممالک کی پالیسیوں میں تبدیلی نظر آرہی ہے اور پشت پناہی اور امداد کی پہلی کیفیت باقی نہیں رہی۔ ان حالات میں افغانستان کی جنگ اب کس حال میں ہے، اس کا مستقبل کیا ہے اور اس کے جتنے کے امکانات کس حد تک ہیں؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جہاد افغانستان کا اصل بدف کیا تھا۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ افغان مجابدین نے روئی فوجوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا اس لیے روئی فوجوں کی واپسی کے ساتھ ہی یہ جہاد ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب افغانستان میں جہاد کا آغاز ہوا تھا اور افغان علماء نے جہاد کا فتویٰ دے کر ہتھیار اٹھائے تھے اس وقت افغانستان میں روئی فوجوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ افغان علماء نے کابل میں کیونٹ حکومت نظام کے تسلط اور اسلامی اقدار و روایات کے خلاف کابل کی کیونٹ حکومت کے اقدامات کے علی الرغم علم جہاد بلند کیا تھا۔ روئی فوجیں تو بہت بعد میں آئی ہیں اور اس وقت آئی ہیں جب افغان مجابدین باقاعدہ عملی جنگ کے ذریعے افغانستان کا ایک اچھا ناصا علاقہ کابل کی کیونٹ حکومت کے تسلط سے آزاد کر اچکے تھے۔ روئی فوجیں کابل میں اپنی حکومت اور نظام کو بچانے کیلئے آئی تھیں اور کیونٹ انقلاب کو مجابدین کے ہاتھوں شکست سے بچانے کیلئے جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔

اس پس منظر میں آپ دیکھیں کہ کابل میں جس کیونٹ حکومت اور کیونٹ نظام کے خلاف افغان مجابدین نے جہاد کا آغاز کیا تھا، کیا اس کا خاتمہ ہو گیا ہے؟ اگر کابل کی حکومت موجود ہے اور اپنے نظریاتی موقف اور نظام و انقلاب پر قائم ہے تو اس کے خلاف افغان مجابدین کا جہاد بھی اپنی مکمل شرعی میثمت کے ساتھ جاری ہے۔ یہ جس طرح پہلے دن شرعی جہاد تھا آج بھی شرعی جہاد ہے اور اس وقت تک شرعی جہادر ہے گا جب تک کابل پر کیونٹ حکومت انقلاب کا تسلط ختم نہیں ہو جاتا اور اس کی جگہ ایک خالص نظریاتی شرعی حکومت قائم نہیں ہو جاتی۔

دوسری گزارش سوال کے اس پہلوکے بارے میں ہے کہ یہ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے اور دونوں طرف سے مسلمان ہلاک ہو رہے ہیں۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا کہ جو نہاد مسلمان کفر کی حمایت و حفاظت کیلئے

جنگ لڑ رہے ہیں ان کا مسلمان ہونا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میں انہی بھائیوں کی زبان میں بات کرتا ہوں جو کہتے ہیں کہ یہ مسلمان اور مسلمان کی جنگ ہے اس لیے شرعاً سے جہاد کہنے کا جواز باقی نہیں رہا۔ دیکھیے! جس نوعیت کی جنگ آج افغان مجاہدین رو سی استعمار کے خلاف لڑ رہے ہیں اسی طرح کی جنگ ہمارے اکابر نے برٹش استعمار کے خلاف لڑی تھی۔ برطانوی استعمار نے اسی طرح بر صغیر پاک و ہندو بغلہ دیش پر قبضہ کر کے اپنا نظام مسلط کیا تھا اور ہمارے بزرگوں نے، علماء حق نے، اکابر نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز محمد دہلویؒ نے اس جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور علماء حق نے مختلف مخاذوں پر انگریزوں سے جنگ لڑی تھی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان جنگوں میں فرنگی کی فوجوں میں مسلمان تھے یا نہیں تھے؟ کئی ریاستوں کے مسلم حکمران اور ان کی فوجیں فرنگی مقاصد کیلئے مجاہدین آزادی کے خلاف جنگ میں شریک ہوئی تھیں یا نہیں؟

شہدائے بالاکوٹ کو دیکھ لیجئے۔ امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ اور امام المجاہدین شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جن سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا لیاں کے ساتھ مسلمان نہیں تھے؟ کیا آفارکی فوج میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے شریک ہو جانے سے یہ جنگ بن گئی تھی اور شرعی جہاد نہیں رہا تھا؟ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کو دیکھ لیجئے۔ ہم آج تک اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ مسلمان کہلانے والے نوبوں، جاگیرداروں، سرداروں، خان بہادروں اور وڈیوں نے اس جنگ میں انگریز کا ساتھ دیا تھا، انگریزی فوج کو سپاہی مہیا کیے تھے۔ ہم مرزا غلام احمد قادریانی اور اس کے خاندان کی انگریزی حکومت سے وفاداری ثابت کرنے کیلئے مرزا قادریانی کی کتابوں سے یہ حوالے دیتے ہیں کہ اس کے باپ نے اور دادا نے انگریزی فوج کیلئے ۱۸۵۷ء میں سینکڑوں گھوڑے اور سپاہی مہیا کیے۔ کفر کا فتویٰ تو مرزا غلام احمد قادریانی پر اس کے دعائے نبوت کی وجہ سے لگا ہے، اس کے باپ اور دادا پر توکی نے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا تھا۔ کیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے فرنگی فوجوں میں شامل ہو جانے سے اس کا جہاد ہونا مشکوک ہو گیا تھا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے کیونکہ ہم یہ مانتے ہیں کہ شہدائے بالاکوٹ کی جنگ شرعاً جہاد تھی اور ۱۸۵۷ء کا معزک شرعاً جہاد تھا تو افغان مجاہدین کی جنگ بھی مسلمان اور مسلمان کی جنگ نہیں بلکہ شرعی جہاد ہے۔

ایک بات میں علماء کرام سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی مسلمان کفر کے نظام کا حمایت بن جائے اور نظام کفر میں شامل ہو کر جنگ میں مسلمانوں کے مقابل آجائے تو اس کا حکم شرعاً کیا ہے؟ کیا اس کو گولی مارنے سے اس لیے گریز کریں گے کہ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور کیا اس کو گولی مرنے سے اس جنگ کی شرعی حیثیت تبدیل ہو جائے گی؟ میرے محترم بزرگ اور بھائیو! یہ سب پروپیگنڈا ہے اور جہاد افغانستان کو سبوتاً ذکر کی سازش ہے جس کا مقصود مجاہدین کے حوصلوں کو پست کرنے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کی حمایت سے روکنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اب آئیے دوسرے سوال کی طرف کہ امریکہ اور پاکستان کی افغان پالیسی میں محسوس کی جانے والی منفی تبدیلی کے بعد جہاد افغانستان کس حال میں ہے اور اس کا مقابل کیا ہے؟

اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ کہنا ہی خلاف واقع ہے کہ افغان مجاہدین نے یہ جہاد امریکہ اور دوسرے ممالک کی پشت پناہی کی وجہ سے شروع کیا تھا۔ کیونکہ جب افغان علماء نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور ان کی قیادت میں مجاہدین پہلے کابل

حکومت اور پھر رو سی فوجوں کے خلاف صرف آہوئے تھے تو امریکہ اور دوسرے جمایتوں کا کہیں دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس وقت یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہ چند بے وقوف مولوی ہیں، رو سی فوجوں سے ٹکرانا ان کے بس کی بات نہیں، دو چار ہفتوں میں صاف ہو جائیں گے۔ لیکن جب مجاہدین ڈٹے رہے اور انہوں نے افغانستان کا کم از کم چالیس فیصد علاقہ رو سی فوجوں کے تسلط سے محفوظ کر لیا تو امریکہ اور دوسری طائفیں متوجہ ہوئیں اور انہوں نے افغان مجاہدین کی عملی امداد کی طرف سخیدگی کے ساتھ توجہ دی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جہاد افغانستان کے آغاز کے بعد کم از کم تین سال تک مجاہدین نے تن تہائیں لڑی ہے، رو سی فوجوں کا سلسلہ چھین کر لڑی ہے، بے سرو سامانی کی حالت میں لڑی ہے، فقر و فاقہ اور کسپری کے عالم میں لڑی ہے اور ایمانی قوت کے ساتھ میدان میں ڈٹ کر دنیا کو بتایا ہے کہ ایمان اور جذبہ آج بھی دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔

دوسری بات یہ ہے ان میں رکھیں کہ امریکہ کی امداد کے بارے میں مجاہدین اور ان کے ہمنوا بھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں رہے کہ یہ آخر وقت تک جاری رہے گی۔ سب جانتے ہیں کہ یہ امداد اپنے مفادات کیلئے امریکہ نے دی ہے۔ جب تک رو سی فوجیں افغانستان میں موجود تھیں امریکہ کا مفاد اس میں تھا کہ مجاہدین کو امداد دی جائے اور انہیں مضبوط کیا جائے۔ اور جب رو سی فوجیں چل گئیں تو امریکہ کا مفاد اس میں ہے کہ مجاہدین کو مزور کیا جائے اور کابل پر ان کی حکومت کو قائم ہونے سے ہر قیمت پر روکا جائے۔ یہ صرف امریکہ کا مفاد نہیں بلکہ اسلام آباد، ڈھاکہ، انقرہ، قاہرہ، خرطوم، جکارتہ اور دوسرے تمام مسلم دارالحکومتوں کا مشترکہ مفاد ہے کیونکہ اگر کابل میں خالص نظریاتی شرعی حکومت قائم ہو جاتی ہے تو مسلم ممالک کے دارالحکومتوں میں منافقت کا اسلام کابل کی اسلامی حکومت کا سامنا کرنے کی بہت نہیں رکھتا، اسے میدان سے ہٹا پڑتا ہے، دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اور مسلم ممالک میں منافقاتہ اور دکھاوے کے اسلام کی شکست امریکہ کی شکست ہے، اس کے مفادات کی شکست ہے اور عالم کی بالادستی کی شکست ہے۔ اس لیے سب مل کر اس گھٹ جوڑ میں مصروف ہیں کہ کابل پر مجاہدین کی حکومت قائم نہ ہونے والی جائے اور ظاہر شاہ یا اس قسم کے کسی اور نام سے دکھاوے کی مسلمان حکومت کا مل میں قائم کر دی جائے۔ لیکن میں افغان مجاہدین اور جہاد افغانستان کے زمانے کی بصیرت و جرأت کو سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے اس گھٹ جوڑ کو مسترد کر دیا ہے، وہ لمبی جنگ لڑنے کیلئے تیار ہیں مگر کفر اور منافقت کے ساتھ منافحت پر آ کاہہ نہیں ہیں۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ صورتحال کچھ بدل گئی ہے، حالات میں تغیر آیا ہے، مجاہدین کی مشکلات بڑھی ہیں، ان کی جنگ لمبی ہوئی ہے اور آزمائش کا عرصہ طویل ہو گیا ہے۔ لیکن جہاد کی کامیابی کا راستہ یہی ہے، کفر و منافقت کی کمل شکست اور اسلام کی مکمل بالادستی کا راستہ یہی ہے۔ میں نے مجاہدین کو محاذ جنگ پر دیکھا ہے، ان کے مورچوں میں لیا ہوں اور ان کے عزم و حوصلہ کا مشاہدہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مشکلات ان کی راہ میں حائل نہیں ہوں گی۔ میرا تجھیہ یہ ہے کہ جہاد افغانستان اپنی فطری رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، امریکہ اور اسلام آباد کے رو یہ میں تبدیلی کے باوجود مجاہدین کے قدم رکے نہیں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور فطری رفتار میں بڑھ رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب مجاہدین کا مل پر شریعت اسلامیہ کی بالادستی کا پرچم لہرایں گے اور میرے نزدیک وہ دن جہاد کے اختتام کا دن نہیں ہو گا بلکہ وہی

دن پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں استعماری نظاموں اور منافقتوں کے اسلام کے خلاف جہاد کے آغاز کا دن ہو گا۔ خدا ہمیں وہ دن جلدی دکھائے اور اس دن کیلئے خود کو تیار رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

## الشیخ عبد اللہ عزام شہید

ماہنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- دسمبر ۱۹۸۹ء

گذشتہ روز ایک مجاهد فلسطینی عالم الدکتور ارشح عبد اللہ عزام پشاور میں اپنے دبیلوں سمیت بم کے دھاکہ میں جام شہادت نوش کر گئے، ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ جمع کی نماز پڑھ کر گاڑی میں اپنی رہائش گاہ پر والپس جا رہے تھے کہ گاڑی میں نصب کیا ہوا بم پھٹا اور تینوں باپ میٹے شہید ہو گئے۔

ڈاکٹر عبد اللہ عزام شہید سعودی عرب کے رہنے والے تھے، یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، جہاد افغانستان کے آغاز کے ساتھ ہی جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ملازمت سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے محاذ جنگ پر آگئے۔ مختلف محاذوں پر جنگ میں حصہ لیا، افغان مجاهدین کی حمایت و امداد کیلئے ادارہ قائم کیا، جہاد افغانستان پر مقالات اور تنایں لکھیں، ”الجہاد“ کے نام سے ایک معیاری عربی جریدے کی اشاعت کا اہتمام کیا اور ان جذبہ جہاد سے سرشار عرب نوجوانوں کی راہنمائی اور قیادت کی جو خلف ممالک سے جہاد افغانستان میں شرکت کیلئے محاذوں پر پہنچے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عبد اللہ عزام شہید جہاد افغانستان کو بجا طور پر ملتِ اسلامیہ کی نشانہ ثانیہ کا آغاز سمجھتے ہوئے اس میں شریک تھے اور دنیا بھر کے مسلم علماء کو جہاد میں شریک رکھنے کے خواہ شمند تھے۔ شہادت کی آرزو ان کے دل میں تھی اور زبان ہر وقت شہادت اور جہاد کے ذکر سے تر ہتی تھی۔ انہوں نے اپنی منزل پالی ہے اور اپنے رب کی بارگاہ میں سرخ رو جائیچے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی یہ قربانی اس دنیا میں بھی رائیگاں نہیں جائے گی، افغان مجاهدین کا میابی کی منزل سے ہمکار ہوں گے اور جہاد افغانستان دنیا بھر میں احیائے اسلام کی جدوجہد کا نکتہ آغاز ثابت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر عبد اللہ عزام شہید اور ان کے میثوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور ان کے عظیم مشن کو کامیابی سے ہمکار فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## جہاد افغانستان کے خلاف امریکی سازش

ماہنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۰ء

امریکی سینیٹر مسٹر سٹیفن سولارز ان دونوں پاکستان آئے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھ افغانستان کے مسئلہ پر ایک فارمولائے ہیں جس کا بنیادی نکتہ افغانستان کے سابق بادشاہ ظاہر شاہ کو افغانستان میں کوئی کردار سونپنا بیان کیا جاتا ہے۔

سینیف سولارز و ہی صاحب ہیں جو امریکہ کی رائے عامہ کو پاکستان اور اسلامی قتوں کے خلاف منظم کرنے کی مہم کے سرخیل بننے ہوئے ہیں۔ انہیں پاکستان میں بالخصوص اسلامی قتوں کے آگے آنے اور اسلامی قوانین کے نفاذ و غلبہ سے چڑھے اور وہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کو بر قیمت پر روکنے کی سازش کا ایک اہم کردار ہیں۔

افغانستان میں اس وقت امریکہ اور روس میں اس بات پر تکمیل جاری ہے کہ روس اپنے نجیب اللہ کو کابل کے اقتدار پر مسلط رکھنا چاہتا ہے جبکہ امریکہ ظاہر شاہ کی شکل میں اپنا نجیب اللہ مسلط کرنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن افغان مجاہدین کے لیے، جو افغانستان کو ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست بنانے اور مکمل شرعی نظام نافذ کرنے کیلئے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں، یہ دونوں ناقابل قبول ہیں اور وہ ان دونوں کو مسترد کرتے ہوئے مکمل کامیابی کے حصول تک جہاد جاری رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

افغان مجاہدین یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں رو سی اثر و نفوذ کا دروازہ ظاہر شاہ نے ہی اپنے اقتدار میں کھولا تھا اور ایسی پالیسیوں کا غائز لیا تھا جو بالآخر افغانستان پر رو سی افواج کے تسلط پر منحصر ہوئیں۔ اور جب افغان عوام مسلسل گیراہ سال تک رو سی افواج کی جاریت کے خلاف لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے، ظاہر شاہ نے عسکری، سیاسی یا سفارتی کسی محاڈ پر کوئی رول ادا کرنے کی زحمت گوار نہیں کی، اس لیے ظاہر شاہ کوئی صورت حال میں کوئی کردار سونپنا افغان عوام کی قربانیوں کا مذاق اٹانے کے مترادف ہے جسے کسی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ افغان مجاہدین کا یہ موقف حقیقت پسندانہ ہے اور ایک غیر مدنوقم کے شایانِ شان بھی ہے۔ اس لیے دنیا بھر کی باغیت اور حریت پسند اقوام کو اس موقف کی بھروسہ حمایت کرنی چاہیے۔

## امریکی امداد کی ناقابل قبول شرائط

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۰ء

پاکستان کیلئے امریکی امداد کی بندش اس وقت قوی حلقوں میں زیر بحث ہے اور ملکی و بین الاقوامی پریس میں اس حوالے سے خدشات و توقعات کے اظہار اور قیاس آرائیوں کا سلسہ جاری ہے۔

پاکستان ایک غریب ملک کی حیثیت سے اپنے معاشری توازن کو قائم رکھنے کیلئے بیرونی امداد حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ اور خلیج کے حالیہ بحران نے پاکستان کی میعادت میں عدم توازن کے جن نئے پہلوؤں کو اجاد کر کیا ہے ان کے پیش نظر بیرونی امداد کی ضرورت و اہمیت پہلے سے کمی گناہ رہ گئی ہے۔ پاکستان کو عسکری، فنی اور اقتصادی امداد کیلئے زیادہ تراجمیکہ پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور امریکہ ایک عالمی استعماری قوت کی حیثیت سے پاکستان کی اس مجبوری سے بھروسہ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے پاکستان کی امداد کی بجائی کوئی شرائط کے ساتھ مشروط کر رکھا ہے جن کو پورا کرنے کی صورت میں اس کے پاس ہمیشہ کیلئے امریکہ کا دست نگر اور طفیلی بننے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ ۱۹۸۷ء میں امریکی سینٹ نے پاکستان کی امداد کو جن شرائط کا پابند نیا تھا ان میں سے چند اہم شرائط کا خلاصہ یہ ہے کہ:

- پاکستان ایمیم نہ بنانے کی لیقین دہائی کرائے اور ایمی تحریکیات کو معافی کیلئے کھول دے۔
- پاکستان میں انسانی حقوق کے مغربی تصورات کے منافی کوئی قانون نافذ نہ کیا جائے، یعنی اسلامی حدود کے نفاذ کی طرف پیش رفت نہ کی جائے۔
- قادریاں کے خلاف جو آئینی اور قانونی اقدامات اب تک کیے گئے ہیں ان کی واپسی کا لیقین دلایا جائے۔

(بحوالہ روزنامہ نواز وقت، لاہور۔ ۱۲۵ پر میل ۷۸۴ء)

روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۵ مئی ۱۹۸۷ء)

افغانستان میں روکی جاریت سے پیدا شدہ حالات کے باعث امریکہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ان شرائط سے صرف نظر کرتا ہالیکن اب اس کی یہ مجبوری باقی نہیں رہی۔ جس کی وجہ سے امریکی سینیٹروں نے دوبارہ یہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اور امریکی انتظامیہ پر مسلسل دباو ڈالا جا رہا ہے کہ سینٹ کی طے شدہ مذکورہ بالا شرائط کے بغیر پاکستان کی امداد بحال نہ کی جائے۔ اس پس منظر میں پاکستان کے قوی انتخابات کے نتائج کا شدت کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے جو ان سطور کی اشاعت تک سامنے آچکے ہوں گے۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کی خواہش یہ ہے کہ پاکستان میں ایسی حکومت آئے جو ان شرائط کی پاسداری اس کی توقعات کے مطابق کر سکے، اور اس مقصد کیلئے بعض سیاسی حلے مختلف ذرائع سے امریکہ کو لیقین دہائی کرنے اور اسے اختیار میں لینے کی کوششوں میں مصروف بھی دکھائی دیتے ہیں۔

یہ اونٹ خدا جانے کس کروٹ بیٹھتا ہے لیکن اس صورتحال سے قطع نظر یہ بات اصولی طور پر طے شدہ ہے کہ امریکی سینٹ کی طرف سے پاکستان کی امداد کیلئے عائد کردہ یہ شرائط کسی بھی آزاد، باوقار اور خود مختار ملک کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ اور ان شرائط کو قبول کرنے کا مطلب قومی آزادی اور خود مختاری کو اقتضادی امداد کے عوض گروہ رکھنے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اس لیے ضرورت اس امریکی ہے کہ امریکہ پر یہ واضح کر دیا جائے کہ پاکستانی قوم ایسی کسی امداد پر دچپسی نہیں رکھتی جس کیلئے اسے اپنے اسلامی تشخص اور قومی خود مختاری سے دستبردار ہونا پڑے۔ پاکستان کے قومی سیاسی حلقوں اور ان سے زیادہ دینی حلقوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان امریکی شرائط کے خلاف کلمہ حق بلند کریں، اب وقت آگیا ہے کہ امریکی تسلط کے خلاف رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور پوری قوم کو متحد و منظم کر کے امریکی عوام کے خلاف سد سکندری بنا دیا جائے۔ یہ ذمہ داری سب سے زیادہ ملک کے دینی حلقوں پر عائد ہوتی ہے اور انہیں متحد و منظم ہو کر قومی و دینی مہم کی قیادت کیلئے آگے بڑھنا چاہیے۔

## عالِمِ اسلام میں جہاد کی نئی لہر

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فروری ۱۹۹۰ء

جہادِ افغانستان کے منطقی اثرات رفتہ رفتہ ظاہر ہو رہے ہیں کہ نہ صرف مشرقی یورپ نے روس کی بالادستی کا طوق گلے

سے اتال پھینکا ہے بلکہ وسطیٰ ایشیائی ریاستیں بھی اپنی آزادی اور تشخص کی بحالی کیلئے قربانی اور جدوجہد کی شاہراہ پر گامزن ہو چکی ہیں اور فلسطین، کشمیر اور آذربائیجان کے حریت پسند مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ظلم و استبداد کی قوتیں کے خلاف صفائی آرائیں۔ جہاد کے اسی جذبہ سے کفر کی قوتیں خافق تھیں اور اسے مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کیلئے استعماری طاقتیں گذشتہ دوسروں سے فکری، سیاسی اور تہذیبی سازشوں کے جال بن رہی تھیں لیکن اسلام کی زندہ و متحرک قوت اور جہاد کے ناقابل تفسیر جذبے نے افغانستان کی سنگاخن وادیوں میں ایک ہی جھنکے کے ساتھ اس سازش کا تارو پود کھیڑک رکھ دیا ہے۔ فلسطین میں اتفاقہ کی تحریک فلسطینی مسلمانوں میں آزادی کی تزویہ کے وجود کا احساس دلار ہی ہے، کشمیری حریت پسندوں کی سلح جو جہد نے دنیا کو بھولا بر اسمبلے کشمیر پھر سے یاد دلا دیا ہے اور آذربائیجان میں روی ٹیکنوں کا نشانہ نئے والے غیور مسلمانوں نے اپنے خون کے ساتھ تاریخ کی یہ حقیقت ایک بار قدم کر دی ہے کہ مسلمان کو اس غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ دیر کیلئے مغلوب تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے زیادہ دیر تک قابو میں رکھنا کسی بڑی سے بڑی طاقت کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔

حریت اور غیرت کے یہ شعلے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں مگر استبداد و استعمار کے علم بردار ان شعلوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا دامن بچانے کی فکر میں جہاد کی اس نئی عالمگیری پر کے ساتھ جو شمشہر جہاد افغانستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں اور واشنگٹن، ماسکو اور اسلام آباد جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی نتائج کو رونکنے کیلئے گھڑ جوڑ کر رکھلے ہیں لیکن یہ ان کی بھول اور تاریخ کے عمل سے بے خبری ہے۔ جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی اثرات پوری دنیا کو حصار میں لے رہے ہیں تو کابل کو مصنوعی سہاروں کے ساتھ ”اشرپروف“ رکھنا آخر کرب تک ممکن ہو گا؟ ماسکو، واشنگٹن اور اسلام آباد کو اس حقیقت کا بالآخر دراک کرنا ہو گا کیونکہ اب اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

## مسلم سربراہ کانفرنس: وقت کا اہم تقاضہ

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۰ء

گذشتہ ہفتے سعودی مملکت کے فرمائوزا شاہ فہد کے ساتھ حکومت پاکستان کے ایک وفد کی ملاقات کے حوالے سے یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے کہ شاہ فہد مسئلہ کشمیر پر اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے والے ہیں۔ معلوم نہیں اس خبر کی حقیقت کیا ہے لیکن جہاں تک اسلامی سربراہی کانفرنس کا اجلاس طلب کرنے کی ضرورت ہے اس سے انکار یا صرف نظر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

کشمیری حریت پسند جس جرأت و استقلال کے ساتھ حصول آزادی کیلئے اپنے خون کی قربانی دے رہے ہیں اور افغان مجاہدین کے لیا رہ سالہ کامیاب جہاد آزادی کو آخری مرحلہ میں جس طرح سازشوں کے ذریعے ناکای میں بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مسلم سربراہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور افغانستان و کشمیر کے ساتھ ساتھ فلسطین، آذربائیجان، مورو، ایرانیا، اراکان (برما) اور وسطیٰ ایشیائی مسلم ریاستوں میں ابھرنے والی آزادی کی تحریکات کے حوالے

سے اپنے اجتماعی کردار کا تعین کریں۔

یہ درست ہے کہ مسلم ممالک کے پیشتر موجودہ حکمرانوں کے شخصی اور گروہی مفادات استعماری قوتوں کے ساتھ والستہ ہیں اور وہ اس وقت اس دوران ہے پر کھڑے ہیں کہ عالم اسلام میں آزادی، غلبہ اسلام اور دینی بیداری کے بڑھتے ہوئے رحمانات کا ساتھ دیں یا مسلم ممالک کے موجودہ فرسودہ انتظامی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچوں کے تحفظی کی ناکام تگ و دو میں لگر ہیں۔ لیکن مسلم حکمرانوں کو ایک بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ عالم اسلام اب خواب غفلت سے بیدار ہو رہا ہے اور اگر ان حکمرانوں نے بیداری اور آزادی کی ان لہروں کے خلاف سمت چلنے کی کوشش کی تو تاریخ میں ان کا یہ جرم بھی معاف نہیں ہو گا۔

اس پس منظر میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلم حکمران اگر اپنے ثابت اور مؤثر کردار کا تعین کرتے ہیں تو نہ صرف افغانستان، کشمیر، فلسطین اور دیگر خطوں کے مظلوم مسلمان ان کے شکر گزار ہوں گے بلکہ انہیں اپنی لذشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کا راستہ بھی مل جائے گا۔

## جہادِ افغانستان اور ہمارے دینی مدارس

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جولائی ۱۹۹۰ء

دینی مدارس کے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا ہے اور ملک بھر کے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سالانہ تعطیلات گزارنے کے بعد اپنے تعلیمی سفر کرنے مرحلاہ کا آغاز ماهِ لذشتہ کے وسط میں کرچکے ہیں۔ ملک کے طوں و عرض میں پھیلے ہوئے ان ہزاروں دینی مدارس کا تعلق مختلف مذہبی مکاتبِ فکر سے ہے اور ہر مذہبی مکتب فکر کے دینی ادارے اپنے اپنے مذہبی گروہ کے شخص و امتیاز کا پرچم اٹھائے ہی نسل کے ایک معتقد ہ حصہ کو اپنے نظریاتی حصار اور فقہی دائروں میں جکڑنے کیلئے شب و روز مصروف عمل ہیں۔

اور اب افغانستان کی سیکھا خدا دیوں میں کمیونزم کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا جائزہ لے لیا جائے جس نے رو سی افواج کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کرنے کے علاوہ وسطیٰ ایشیائی مسلم ریاستوں میں دینی بیداری کی ہمروڑا دی ہے اور رو سی استعمار کے آہنی یعنی کوڑھیلا کر کے مشرقی یورپ پر کمیونزم کی گرفت کو کمزور کر دیا ہے۔ افغانستان کے غیور مسلمانوں کے اس عظیم جہاد کی قیادت کا ایک بڑا اور فیصلہ کرن حصہ انہی دینی مدارس کا ترتیب یافتہ ہے۔ اور اس طرح افغانستان کو رو سی کمیونزم کیلئے ”پانی پت“ کا میدان بنادیئے کا کریڈٹ دینی مدارس کے اسی نظام کے حصہ میں آتا ہے۔

الغرض دینی مدارس کی یہ عظیم جدوجہد اور اس کے تنازع و شرات تاریخ کے صفحات پر اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ کوئی ذی شعور اور منصف مزان شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ فرنگی اقتدار کے تسلط، مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار اور صلیبی عقائد و تعلیم کی تزویج کے دور میں یہ مدارس ملی غیرت اور دینی حمیت کا عنوان بن کر

سامنے آئے اور انہوں نے انہائی بے سروسامانی کے عالم میں سیاست، تعلیم، معاشرت، عقائد اور تہذیب و ثقافت کے مخاذوں پر فرنگی سازشوں کا جرأت مندانہ مقابلہ کر کے بر صیر پاک و ہندو بنگلہ دلیش کو اپین بننے سے بچالیا۔ اور یہ بات پورے اعتداد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آج اس خطہ زمین میں مذہب کے ساتھ وابستگی اور اسلام کے ساتھ وفاداری کے جتن مظاہر نے کفر کی لپوری دنیا کو لرزہ براندام کر رکھا ہے، عالم اسباب میں اس کا باعث صرف اور صرف یہ دینی مدارس ہیں۔

## امریکہ اور عالمِ اسلام

مابنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- دسمبر ۱۹۹۰ء

روزنامہ جنگ کرپی نے ۵ نومبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں اپنے واشنگٹن کے نمائندہ خصوصی کے حوالے سے جہاد افغانستان کے بارے میں ایک روپرٹ شائع کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امریکہ اور روس کے درمیان اس امر پر ۱۹۸۵ء میں ہی خفیہ مفاہمت ہو گئی تھی کہ افغانستان سے رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد افغان مجاهدین کو اسلامی حکومت کے قیام کی منزل تک نہ پہنچنے دیا جائے۔

روپرٹ کے مطابق یہ منصوبہ امریکہ کے ممتاز سفارت کار آنجلیانی آرنلڈ رافیل نے تیار کیا تھا جو پاکستان میں امریکہ کے سفیر ہے ہیں اور صدر جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے ساتھ بہاولپور کے ساخنہ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس خفیہ مفاہمت کی رو سے روس نے افغانستان سے اپنی فوجوں کی واپسی کیلئے یہ شرط لگائی تھی کہ امریکہ افغان مجاهدین کو اسلامی حکومت قائم نہ کرنے دے، اور اس شرط کو قبول کرتے ہوئے امریکہ نے صرف رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد افغان مجاهدین کی امداد بند کر دینے کا وعدہ کیا تھا بلکہ نجیب اللہ کو افغانستان کے صدر کے طور پر قبول کرنے کی تعین دہانی بھی کرادی تھی۔

روپرٹ کے مطابق اس مفاہمت کیلئے آرنلڈ رافیل نے رو سی حکومت کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کی تھی اور ان خفیہ رابطوں اور مفاہمت کے بعد معاهدہ جنیوا و جود میں آیا تھا۔

دوسری طرف روزنامہ نوابے وقت لاہور نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں سعودی عرب میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر جیمز لکنزر کے ایک اخباری اثر و یوکا خلاصہ شائع کیا ہے جس میں امریکی سفارت کارنے کہا ہے کہ سعودی عرب اور متحده عرب امارات میں امریکی فوجیں اتنا رہنے کا منصوبہ پندرہ سال قبل تیار کیا گیا تھا، جس کا مقصد تیل کے چشموں پر کثروں حاصل کرنا تھا، لیکن اس وقت حالات ساز گارنے ہونے کی وجہ سے ایسا نہ کیا جاسکا۔

امریکی سفارت کار کے بقول پندرہ سال قبل جب شاہ فیصل شہید نے اسرائیل کی حمایت کرنے والی مغربی قوتوں کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کیا تو امریکی حکام نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ خلیج میں دولائکی تعداد میں فوج اتار دی جائے جو تیل کے چشموں پر کثروں حاصل کر لے، اور یہ فوج اس وقت تک خلیج میں مقیم رہے جب تک تیل کے چشمے خشک نہ ہو۔

جائیں، جس کی مدت اس اثر یوں میں پچاس سال تک لگتی ہے۔ اس پس منظر میں عالم اسلام کے ساتھ امریکہ کے روابط اور طرز عمل کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ایک بار پھر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عالم اسلام کے ساتھ دوستی کا ڈھونگ رچا کر عالمی سطح پر دوسروں کو شکست دینے کے بعد اب امریکہ بہادر کی تمام تر توجہ اس امیر بندوں ہو گئی ہے کہ:

1. عالم اسلام میں نظریاتی آزادی اور دینی بیداری کی تحریکات کو ہر قیمت پر ناکام بنایا جائے۔
2. اور مسلم ممالک کے معاشی وسائل کو اپنے کنٹرول میں لے کر عالم اسلام کو ان سے آزادانہ استفادہ کے موقع سے محروم کر دیا جائے۔

یہ صور تھاں عالم اسلام کے نظریاتی علاقوں بالخصوص دینی تحریکات سے سنبھیہ توجہ اور گہرے غور و خوض کا تقاضا کر رہی ہے، انہیں اسلام کی سربلندی، ملتِ اسلامی کی خود مختاری، اور عالم اسلام کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے رائے عامہ کی تشکیل کے نئے تقاضوں کو محسوس کرنا ہو گا، اس سلسلہ میں اپنی ترجیحات پر نظر ثانی کرنا ہو گی اور وقتی مصالح و مفادات کے حصار کو توڑ کر پیش قدمی کرنا ہو گی۔ اس کے بغیر اب کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا اور اس میں تاخیر کا جو وقت بھی گزرے گا اسے فرض ناٹھا سکی اور مجرمانہ غفلت کے بغیر اور کوئی عنوان نہیں دیا جاسکے گا۔

## جہاد افغانستان اور ہماری ذمہ داریاں

مرکز حضرت عمر، ڈاون، افغانستان --- مارچ ۱۹۹۱ء

مدیر الشریعہ مولانا زايد الرashدی نے شعبان المعتض ۱۴۳۱ھ کے آخری ایام میں حرکۃ المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمن خلیل کی دعوت پر افغانستان کے محاذ جنگ کا دورہ کیا اور مرکز حضرت عمر، مرکز حضرت سلمان فارسی، مرکز خلیل اور مرکز رشید میں مجاہدین سے ملاقاتوں کے علاوہ حرکۃ المجاہدین کے تربیتی کیمپوں میں جہاد کی ٹریننگ لینے والے نوجوانوں سے بھی خطاب کیا۔

مدیر الشریعہ کے چھوٹے فرزند حافظ ناصر الدین خان عامروں پر بھانجے نبیل عدنان خان بھی سفر میں ان کے بمراه تھے۔ مرکز حضرت عمر (ڈاون) میں مدیر الشریعہ کا خطاب بمارے رفیق محترم مولانا اللہ وسایا قاسم نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے مرتب کر کے ارسال کیا ہے جسے ان کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ الشریعہ

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میرے محترم دوستو اور جذبہ جہاد سے سرشار بھائیو! آپ حضرات مختلف علاقوں سے اپنے معمولات، گھر بار، مصروفیات اور مشاغل چھوڑ کر ایک بے آب و گیاہ وادی کی سنگلائی چٹانوں میں جمع ہیں۔ آپ کے بیان جمع ہونے کا ایک مقصد ہے، وہ مقصد آپ لوں میں لیے جو شو و جذبہ کے ساتھ اپنے ایمان کو حرارت دے رہے ہیں،

اللہ تعالیٰ آپ کے اس مقصد میں آپ کو اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ وہ مقصد یہ ہے کہ آج کے دور میں جہاد کا فریضہ مسلمانوں کی عملی زندگی سے نکل چکا ہے، وہ فریضہ مسلمانوں کے عملی زندگی میں دوبارہ آجائے۔ ہم دنیا میں مسلمان کھلاتے ہیں، مسلمان سمجھتے جاتے ہیں لیکن ہمارا اپنے تھیار کے ساتھ، اسلحہ کے ساتھ، زیور کے ساتھ تعلق منقطع ہو چکا تھا، وہ ہمارا تعلق دوبارہ قائم ہو جائے۔ ہم پہلے والے مسلمانوں کی طرح زندگی میں کوئی حرکت پیدا کر سکیں اور عالم اسلام میں جہاد کے عمل کو دوبارہ زندہ کر کے جہاد کی برکات اور اس کے نتائج سے ہم دنیا کو بہرہ دو سکیں۔ یہی مقصد ہے ناجی!۔ ہاں، اس کے سواتوں کی مقصد نہیں ہے۔

سچی بات یہ ہے جناب سور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جوبات ارشاد فرمائی تھی کہ جب تم جہاد کو ترک کر دو گے اور دنیا کے کاموں میں پڑ جاؤ گے تو تم پر ذلت مسلط ہو گی۔ ایک تو عقیدت و محبت کی بات ہے کہ ہم حضور اکرمؐ کے اس ارشاد کو حقیقت جانیں اور جانتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی زبان سے جوبات نکلی ہے وہ سچی ہے اور سچی ہو کر رہے گی۔ یہ عقیدت اور محبت کی بات ہے جو ہر مسلمان کے دل میں اسی درجہ کی عقیدت ہے کہ دنیا بھر کی باتیں غلط ہو سکتی ہیں مگر نبی اکرمؐ کا ارشاد سچا ہے۔ جبکہ عقیدت اور محبت سے تھوڑا سا صرف نظر کرتے ہوئے تاریخ کے میزان پر بھی اخضرست کا یہ ارشاد حرف بحروف پورا اتر رہا ہے۔ جو نقشہ تاریخ ہمارے سامنے کھپتی ہے اور جو نقشہ آن دنیا میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، آج دنیا میں مسلمانوں کی حالت اور گذشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کا جو تاریخی سفر رہا ہے، حضورؐ کے اسی ارشاد کی حرف بحروف تائید کرتا ہے۔ آج دنیا میں عالم اسلام پر ایک نظر ڈال لیں، مسلمان دنیا میں جو ہوتے ہیں ان کی تعداد دنیا میں ایک ارب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اور یقیناً ایک ارب سے زیادہ ہے، مگر یہ ایک ارب سے زیادہ مسلمان دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

- ایک حصہ مسلمانوں کا وہ ہے جو بظاہر آزاد ممالک و اقوام کی حیثیت سے رہتا ہے، چالیں چوالیں حکومتیں ہیں مسلمانوں کی جو آزاد کھلاتے ہیں، مسلمان حکمران ہیں، اقتدار کی بآگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، غالب حصہ مسلمانوں کا خود کو آزاد سمجھ کر زندگی بسر کر رہا ہے۔

- لیکن ایک بڑا حصہ مسلمانوں کا وہ بھی ہے جو غیر مسلم ممالک میں غیر مسلم حکومتوں کے نیچے ظالم اور غاصب حکومتوں کے نیچے ایک غلام قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج کی دنیا کی اصطلاح میں وہ دوسری اقوام کے غلام ہیں، دوسری قوموں کے ماتحت ہیں، ان پر دوسری قوموں کا تسلط ہے غلبہ ہے، جبر و ظلم ہے۔ آپ کشمیر کو دیکھ لیں، اراکان، فلپائن اور مورو کو دیکھیں۔ بخارا، سمرقند، آوز بایجان کو دیکھیں، ایزیزیریا اور فلسطین کو دیکھیں۔ یہ معروف خطے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے مسلمان رہتے ہیں لیکن ان پر حکومت غیر مسلموں کی ہے، ان پر جبر ہے ظلم ہے وہ غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جو آزاد ہیں، ان کی حالت بھی یہ ہے کہ کہنے کو آزاد ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ آزاد کھلانے کے باوجود ہماری پالیسیاں اور ہمارے معاملات ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہیں۔ یہ ایک واضح سی حقیقت ہے ایک زندہ حقیقت ہے۔ ہم اپنی

مرضی سے اپنی پالیسیاں مرتب نہیں کر سکتے، ابتنی مرضی سے اپنے معاملات طے نہیں کر سکتے، ریکوٹ کشمرون غلامی ہم پر مسلط ہے۔ ہم بھی کافر قوموں کے غلام ہیں، کافروں کے ماتحت ہیں، ہمارے معاملات بھی وہیں طے ہوتے ہیں جہاں ہمارے مظلوم اور بظاہر غلام نظر آنے والے مسلمانوں کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ آج دیکھیے، دنیا کا کوئی ایک خط ہے جہاں ہم مسلمان بحیثیت مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کامل طور پر قرآن و سنت کے مطابق بس کر رہے ہوں اور نظام شریعت کامل طور پر نافذ ہو؟ کوئی ایک خط زمین نظر نہیں آتا۔ میں نے مکمل کی شرط لگائی ہے جہاں قرآن و سنت کی حکمرانی کامل طور پر نافذ ہو، شریعت اسلامیہ کی بالادستی کامل طور پر۔ ایک ارب سے زیادہ آبادی اور چوالیں ملکوں میں کوئی ایک خط نظر آتا ہے؟

اس کیفیت میں ہم مسلمان دنیا میں کس حالت میں زندگی بس کر رہے ہیں؟ دنیا میں وسائل ہمارے پاس ہیں، دولت ہمارے پاس ہے، تیل ہمارے پاس ہے، افرادی قوت ہمارے پاس ہے، ذہنی قوت ہمارے پاس ہے، اساب کے اعتبار سے کمی نہیں ہے۔ آپ تصویر کر سکتے ہیں ہم جو دوسری قوتوں کی ترقی کاروباروں تے ہیں کہ امریکہ نے بڑی ترقی کی، روس نے بڑی ترقی کی، چاند پر جائیچنے، سب سے بڑی بات بھی کہی جاتی ہے ناکہ امریکہ اور روس کہاں پہنچے ہیں چاند پر ڈیرے لگا لیے، ہوا کو مسخر کر لیا، کیا آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ کا اپالو الیون جو چاند پر پہنچا تھا، اس اپالو الیون کی منصوبہ بندری کس نے کی تھی، وہ کون سا سائنسدان تھا جس نے اپالو الیون کو تیار کرائی، اپالو الیون بھجوایا، سارے پروگرام کی پلانگ کی اور سارے منصوبہ کا انچارج تھا؟ آپ کا کیا خیال ہے وہ کوئی جر من سائنسدان ہو گا، وہ مسلمان سائنسدان ہے مصرا کا ہے، ڈاکٹر فاروق الیاز اس کا نام ہے۔ سب سے پہلا جو اپالو چاند پر پہنچا مسلمان سائنسدان کے ہاتھوں پہنچا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اساب کی کمی نہیں ہے دولت کی کمی نہیں ہے، ذہانت کی کمی نہیں ہے، دولت جتنی مسلمان کے پاس ہے اور کس کے پاس ہے؟ کویت پر جس دن عراق کا حصہ ہوا تھا دنیا میں سب سے مہنگی کرنی کویت کی تھی۔ اس دن ایک دینار کی پاکستان کے مطابق ۵ روپے قیمت تھی۔ دولت، وسائل، ذہانت، افرادی قوت کس لحاظ سے ہم میں کی ہے؟ لیکن یہ ساری چیزیں کون استعمال کر رہا ہے؟ ہماری افرادی قوت کون استعمال کر رہا ہے؟ ہماری دولت کون استعمال کر رہا ہے؟ ہمارے وسائل کون استعمال کر رہا ہے؟ کافر۔ وجہ؟ آپ سوچ سکتے ہیں دشمن اس حد تک ہوشیار ہے کہ ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہمارے پیسے جیب میں ڈال کر ہمیں ہی مار رہا ہے۔ میں نے غلط بات تو نہیں کی۔ دشمن خلیج میں ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہم سے خرچ و صول کر کے ہمیں ہی ذبح کر گیا ہے۔ ابھی پتہ نہیں کتنے کرنے کے گا۔ پیسے ہمارے خرچ ہوتے ہیں زمین ہماری برباد ہوئی، قوت ہماری تباہ ہوئی ہے اور ذبح کی ہم ہی ہوئے ہیں۔ اور دشمن بڑے آرام سے، بڑے سکون سے، بڑے اعتماد سے، بڑے حسن و خوبی سے اپنا پلان مکمل کر کے مطمئن بیٹھا ہے کہ جس کام کیلئے میں آیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔

یہ ساری بات کس وجہ سے ہے؟ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ گذشتہ دو سو سال میں ہم پر جو غیر ملکی استعماری حکمرانی رہی برطانیہ حکمران رہا ہے، فرانس حکمران رہا ہے، ہالینڈ حکمران رہا ہے، کسی کا انڈونیشیا پر تسلط تھا، کسی کا الجزاير پر تھا، کسی کا پاکستان پر تھا۔ انہوں نے دو سو سال کے عرصے میں کیا کیا ہے؟ یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دو سو سال یہ کیا کرتے

رہے، اس عرصہ میں ہم میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے؟ دوسری قوم جب آتی ہے، اپنا تسلط قائم کرتی ہے تو مغلوب قوموں میں تبدیلی آتی ہے۔ ہم میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ دو مقاصد تھے ان کے اس گذشتہ دوسراں کے عرصہ میں۔ استعماری قوتیں سامراجی قوتیں دو مقاصد لے کر آتی تھیں۔ ہم یقیناً خوش ہیں کہ ہم نے انہیں نکال دیا ہے لیکن ذرا ٹھٹھے دل و دماغ سے سوچیے کہ ان دونوں مقاصد میں وہ کامیاب ہیں۔ ذرا تجزیہ کجھے تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے۔ دونوں مقاصد میں وہ کامیاب ہیں۔ وہ مقاصد کیا تھے؟

مرزا غلام احمد قادری کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، نئی امت قائم کی، انگریز نے اس کو کھڑا کیا سپورٹ کیا، مقصد کیا تھا؟ وہ کیا کہتا ہے کہ میرے نبی بننے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کا تصور ختم کیا جائے، مجھے انگریز نے نبی اس لیے بنایا ہے۔ بچا س سے زیادہ الماریاں بھر جاتی ہیں اس کی تابوں سے، کس بات پر؟ کہ جہاد اب حرام ہو گیا ہے۔ جہاد کا تصور مسلمان اپنے ذہنوں سے نکال دیں، جہاد کی مدت ختم ہو چکی ہے، جہاد کو حرام قرار دینا، جہاد کو مسلمانوں کے ذہنوں سے نکالنا، یہ میری زندگی کا کامش ہے۔ یہاں غلام احمد قادری کھڑا ہوا، ایران میں محمد علی باب کھڑا ہوا، مختلف علاقوں میں انگریز نے مختلف لوگ کھڑے کیے جہاد کے تصور کو مجبور کرنے کے لیے، ختم کرنے کے لیے، مسلمانوں کے ذہنوں سے نکالنے کے لیے۔ مرزا غلام احمد قادری کو ہم نے کافر بھی قرار دے دیا اور اس کی امت کو غیر مسلم اقلیت بھی قرار دلوادیا۔ ان ساری کامیابیوں کے باوجود میں ذرا تیغ سوال کرنے لگا ہوں۔ انگریز اپنے ان گماشتوں کے ذریعے سے مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کا تصور نکالنا چاہتا تھا، اس میں وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام ہوا ہے؟ جوان جھوٹی نبوتوں کا مقصد تھا، ان کے پیچھے جو فلسفہ تھا، اس کا شدن تھا، اس میں کامیابی ہوئی ہے یا ناکامی ہوئی ہے؟ ہم سو فحص اور غیر مسلم اقلیت قرار دے دیں یہ تو عقیدے ایمان کی بات ہے، میں اس فحصے کی تخفیف نہیں کر رہا، معاذ اللہ، لیکن میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز نے اس قسم کے لوگوں کو کھڑا کر کے جو مشن قائم کیا تھا اس میں انگریز کا میاب ہوا ہے۔ انگریز کا کامش یہ تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے دو باقیں نکالی جائیں ایک خلافت کا اسلامی تصور اور دوسرा جہاد۔

آپ کو تاریخ سے تھوڑا بہت تعلق تو ہو گا، یہ موجودہ عرب جو مختلف ملکوں میں بڑا ہوا ہے، خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ خلافت عثمانیہ کا انتہی مركب تھا، خلافت عثمانیہ تو کوں نے قائم کی تھی، پانچ سو سال تک تو کوں نے عالم اسلام کی خدمت کی ہے۔ حرمن کی حفاظت کی ہے، خلافت کا نظام قائم رکھا ہے، قرآن و سنت کے قوانین کسی نہ کسی درجے میں قائم رکھے ہیں۔ صدیوں تک مصر، شام، لبنان سعودی عرب، اردن سب اس کے ماخت صوبے تھے۔ آج سے متusal بہلے انگریزوں نے عربوں کو نیشنلزم کے نام پر بھڑکایا یہ قومیت جو ہے اس درجے کی قومیت جو دوسروں سے نفرت کی بنیاد پر ہو، یہ لعنت ہے۔ تعارف اور شخص و امتیاز کی قومیت کو قرآن تسلیم کرتا ہے لیکن دوسروں سے نفرت کی بنیاد پر جو قومیت ہو وہ ملعون قومیت ہے۔ انگریز نے عربوں کو بھڑکایا کہ تم عرب ہو اور عجمی تم پر حکمران ہیں۔ تم تو عرب ہو رسول اللہ کے خاندان کے ہو۔ عرب بھڑکے ترکی کی خلافت کے خلاف۔ بغاوت کروا کے برطانیہ نے یہ چھوٹے ٹکڑے کیے: اردن علیحدہ، شام علیحدہ، عراق علیحدہ، سعودی ججاز علیحدہ، مصر علیحدہ۔ اس وقت برطانیہ بڑی طاقت تھی اور برطانیہ نے

اس وقت نیوورلڈ آرڈر نافذ کیا اور یہ ٹکڑے چھوٹے چھوٹے کر کے درمیان سے اسرائیل نکلا۔ اسرائیل کوئی بڑا مبارکہ پر بنا ملک نہیں ہے، یہاں مسلمان تھے۔ اس بندرا بانٹ میں جو ترکی کے خلافت بغاوت کروائے، عربوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر، اس وقت برطانیہ عظیمی نے جوابی مرضی کے مطابق نقشہ بنایا، اسی نقشے میں سے اسرائیل کی گنجائش نکالی۔

سمجھ میں آئی یہ بات؟ اب اس کی دوسری قطعہ آرہی ہے۔ پہلی قطعہ پون صدی پہلے برطانیہ نے دی تھی، دوسری قطعہ آرہی ہے اور امریکہ اس کو پورا کر رہا ہے۔ یہ بخش کا جو نیوورلڈ آرڈر ہے یہ ایسے نہیں ہے۔ بخش کا نیوورلڈ آرڈر برطانیہ کے اسی منصوبے کی تکمیل ہے۔ یہ جو کہتے ہیں خلیج کا سیاسی نقشہ تبدیل کریں گے جیسے برطانیہ نے کیا تھا ویسے ہی یہ کریں گے۔ خلیج میں ایک بڑی فوجی قوت تھی جو سازشی عناصر نے گھیر کر تباہ کر دی۔ اب اسرائیل وہاں کی بڑی قوت ہے، امریکہ کی فوجیں وہاں پیشی ہیں، اپنی مرضی سے بندرا بانٹ کریں گے، نقشے بن چکے ہیں۔ اور میرے آپ کے جذبات سے یا میرے آپ کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمیں دکھ تو ہو گا یہ بات کہتے ہوئے سنتے ہوئے کہ یہ ساری ہم یہ سارا پکھ جو بھی ہوا پون صدی پہلے اسرائیل کے قیام کیلئے تھا اور اس کے نتیجے میں اسرائیل قائم ہوا۔ اور اب یہ اسرائیل کی سرحدوں کو عظیم تر اسرائیل میں تبدیل کرنے کیلئے ہے، خدا میری بات پوری نہ کرے لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ یہ ہو گا، حالات اس رخ پر جارہ ہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہ ہو گا۔ عظیم تر اسرائیل کا جو خواب ہے وہ پورا کریں گے۔ مجھے چند دن پہلے ایک دوست نے وہ نقشہ بھجوایا ہے عظیم تر اسرائیل، گیریز اسرائیل جوان کا منصوبہ ہے کہ اتنا بڑا اسرائیل ہم نے بنانا ہے۔ پورا مصر اس میں ہے، پورا شام اس میں ہے، پورا عراق اس میں ہے، آدھا سعودی عرب اس میں ہے، خیری اس میں ہے، مدینہ منورہ اس میں ہے۔ ان کے منصوبہ کے نقشے میں لکھا ہوا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ مدینہ ہمارا تھام نے ہمیں نکلا تھا زبردستی۔ بنو خزر، بنو مصطفیٰ، بنو نفسیر کو تم نے ہمیں نکلا تھا یہ ہمارا ہے۔ امریکہ کا نیوورلڈ آرڈر اس طرح کا منصوبہ ہے جس طرح پون صدی پہلے خلیج کا نقشہ اپنی مرضی سے تبدیل کر دیا اپنے اس طبقے کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اسباب پیدا ہو جائیں کچھ ہماری غیرت جاگ پڑے، آئیں، لیکن ظاہر اس کے اسباب بھی نہیں۔ ہاں اللہ مسبب الاصابہ ہے اس کو تو ایک منٹ نہیں لگتا اس باب پیدا کرنے میں، اللہ تعالیٰ کی کوئی تکونی بات غالب آجائے، ہماری غیرت کہیں سے جاگے، اور شاید ہم اس کیلئے اٹھ کھڑے ہوں تو کوئی رکاوٹ ہو جائے، ورنہ ظاہر اس رخ میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں کہ بخش اپنے نیوورلڈ آرڈر کے ذریعے خلیج کا نقشہ تبدیل کر کے اپنی مرضی کا سیاسی نقشہ بنانے میں اور اسرائیل کو علاقے کا بڑا جوہری بنانے میں ناکام ہو۔ اس کی کامیابی کے راستے کھلے ہیں، رکاوٹ ظاہر کوئی نظر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ پیدا فرمادیں، وہ قادر مطلق ہے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دنیا میں اس حالت میں کھڑے ہیں۔ یہ ساری باتیں کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ہم اپنے بنیادی تصور سے بہت گئے ہیں، بنیادی تصور ہمارا کیا ہے؟ اسلام، قرآن و سنت۔ اسے شریعت کا نام دے دیں، اسے خلافت کا نام دے دیں، کوئی نام دے دیں، دین کی بالادستی کا، جہاد کا تصور۔ دنیا میں یہ منظر مسلمانوں کے حالات کا دیکھ کر اب وہ حدیث پڑھیں جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ”جب تم جہاد کو چھوڑ دو گے خدا تم پر ذلت مسلط کر دے گا۔“ تاریخ کو سامنے رکھ کر دنیا

میں مسلمانوں کے حالات کو سامنے رکھ کر اب اس حدیث کو پڑھیں اب آپ کو صحیح سمجھ میں آئے گی کہ بنی کریمؐ کے ارشاد کا مقصد کیا تھا۔ اب ایک بات اور دیکھیں کہ آنے والا دور آپ دوستوں کیلئے بالخصوص، جو جہاد کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں، جذبہ توبہ ہے تو یہاں آئے ہیں، اللہ اس جذبے کو مکمل فرمائے، اس کی تکمیل کی توفیق دے، اللہ اس شعلے کو اور بھڑکائے آئیں۔ آپ دوستوں کیلئے جو آپ آنے والے حالات کیلئے خود کو تیار کرنا چاہتے ہیں، آنے والا دور بڑا سخت دور ہے، آنے والے دس بیس سال نظریاتی لوگوں کے لیے، جو کسی نظریہ اور مشن کی بات کرتے ہیں، ان کیلئے مشکل ترین دور ہے۔ اور وہ وقت آرہا ہے، حتیٰ یقول الرسول والذین امنوا معه متى نصر الله وہ وقت ابھی نہیں آیا، ابھی آرہا ہے۔ ابھی حالات اس سے برے ہوں گے، حالات اس سے زیادہ خراب ہوں گے۔ وہ کیفیت ابھی نہیں آئی وزلنواز لزاں اشیددا۔ اذاغت الابصار وبلغت القلوب الحنجر۔ ابھی وہ حالات آنے والے ہیں۔

صور تحال یہ ہے کہ یورپ، امریکہ، روس، جاپان اور چین یہ سارے متحد ہو چکے ہیں، ایک بات پر یہ سارے متفق ہیں کہ مسلمان ملکوں میں سے کسی ملک میں بنیاد پرست حکومت نہیں بننے دیں گے۔ ”بنیاد پرست“ کا لفظ تو آپ سنتے ہیں، ہمارے لیے ہر دور میں ایک نئی گالی گھڑی جاتی ہے، پہلے ”رجعت پسند“ کہا جاتا تھا ودقیونسی رجعت پسند۔ اور آج ہمارے لیے نئی گالی کیا ہے، بنیاد پرست۔ یعنی وہ لوگ جو قرآن و سنت کا مکمل نظام خلافت راشدہ کی طرز پر چاہتے ہیں انہیں بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔ اسلام میں کوئی تزمیں کیے بغیر، اسلام کوئے دور کے ساتھ ہم آہنگ کیے بغیر، ہم آہنگ سے مراد یہ ہے ترمیمیں اور تبدیلیاں کیے بغیر، اصل اسلام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، اس کیلئے محنت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کیلئے انہوں نے اصطلاح گھڑی ہے بنیاد پرست۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھیں جب بھی بنیاد پرست کی بات ہوگی تو مراد آپ ہوں گے اور یہ بات یہ لوگ طے کر چکے ہیں کہ بنیاد پرست حکومت دنیا کے کس خطے میں نہیں بننے دیں گے۔ افغانستان کے مسئلہ کے حل میں جو رکاوٹ ہے سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکہ اور روس دونوں متفق ہو چکے ہیں کہ افغانستان میں مولوی کی حکومت نہ بننے دی جائے۔ یہ بات ایک تو میں کہہ رہا ہوں، میں تو خیر کہوں گا ہی، دنیا کے جو تجزیہ نگار ادارے ہیں، آج بھی ایک کا تجزیہ چھپا ہے، پشاور میں کانفرنس ہو رہی ہے اس میں مختلف لوگوں نے تقریبیں کی ہیں، پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم نے بھی تقریبی کی ہے، اس نے بھی تجزیہ کی بات کی ہے، بات اس نے صحیح کی ہے کہ افغانستان کے مسئلہ کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ بڑی طاقتیں کو یہ خدمت ہے کہ یہاں بنیاد پرست حکومت بننے کی اور بنیاد پرست حکومت ان کو کسی طور پر بھی قبول نہیں۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام نافذ ہو، جہاد کا جذبہ زندہ ہو، خلافت اور جہاد دونوں باتوں سے یہ ساری قوتیں خوفزدہ ہیں اور ساری قوتیں متحد ہو چکی ہیں، آپ کا مقابلہ بیک وقت ان سب قتوں سے ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدینیؒ کے حوالے سے ایک بات کا میں ذکر کر رہا تھا کہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کا دور آخری دور تھا، اس کے خلاف پوری ممالک سازش کر رہے تھے، اس زمانہ میں بڑی کمزور حکومت تھی، ترکی کی خلافت ایسی طاقتور نہ تھی، بہرحال نام کی خلافت تھی۔ برطانیہ، فرانس، اٹلی سب مل کر ترکی کے خلاف سازش کر رہے تھے کہ خلافت ختم ہو، اس کا تیا پانچھا ہو، اس کا بیجا اغرق کریں۔ عربوں کو بھڑکا رہے تھے، دوسرے لوگوں کو بھڑکا رہے تھے۔ اس زمانے کی بات

ہے حضرت مدینہ مالا جزیرے میں نظر بند تھے۔ حضرت شیخ الہند کے ساتھ تحریک آزادی کا مسئلہ تھا، حضرت مدینہ نظر بند تھے۔ وہاں کہتے ہیں کہ ایک انگریز افسر تھا فوج کا، وہ بھی کسی جرم میں مالا جزیرہ میں قید تھا، کوئی اس نے جرم کیا ہو گا اپنی فوج میں، اس جرم میں اس کا کورٹ مارشل ہوا تھا اور وہ بھی مالا جزیرہ میں سزا کا کرش رہا تھا۔ وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدینی نے اس سے سوال کیا کہ ترکی کی خلافت اسلامیہ ایک کمزور سی حکومت ہے، نہ اس کے پاس کوئی طاقت، نہ اس کے پاس کوئی قوت ہے، برائے نام ایک ظاہری خلافت کا نام ہے، اور تم سارے یورپ والے مل کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کا تیپانچا کر دیں، اس کا بیڑا غرق کر دیں۔ آخر وجہ کیا ہے، اس سے کیا خوف ہے؟ ایک کمزور سی خلافت ہے برائے نام سی، مسلمان اس سے عقیدت رکھتے ہیں، تم سارے یورپ والے اس کے خلاف برطانیہ بھی، فرانس بھی، اٹلی بھی سب مل کر اس کو شش میں لگے ہوئے ہیں کہ جلدی کسی طریقہ سے ختم کر دیں آخر تمہیں کیا خطرہ ہے خلافت عنانیہ سے؟

اس نے جواب میں کہا کہ مولانا میں اتنا سادہ نہیں سمجھتا تھا آپ کو جتنی سادگی کا آپ مظاہرہ فرمائے ہیں، یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ خلافت عنانیہ دیکھنے میں کمزور حکومت ہے، ان کے پاس فوج نہیں ہے، قوت نہیں ہے، لیکن ان کے دلقطوں میں اتنی طاقت ہے کہ جب تک ہم اس طاقت قوت کو توڑ نہیں لیں گے مطمئن نہیں ہوں گے۔ وہ کون سے لفظ ہیں ایک خلافت اور ایک جہاد۔ اس نے کہا کہ آج دنیا میں قحطی نہیں میٹھا ہوا خلیفۃ المسلمين دنیا کے کسی کافر ملک کے خلاف جہاد کا اعلان کر دے، اعلان اس کا ہو گا جہاد کا امیر المؤمنین کی حیثیت سے۔ مرکش سے لے کر انڈونیشیا تک دنیا کی ہر مسلمان بستی میں نوجوانوں میں ایک بالچل پیدا ہو جائے گی کہ امیر المؤمنین نے کفر کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے، کفر کا مقابلہ ہے۔ اور سب نوجوان ذہنی طور پر اپنے آپ کو جہاد کیلئے تیار کریں گے۔ اس نے کہا یہ قوت جو ہے اس قوت کو کون ختم کر سکتا ہے؟ اس کے الفاظ یہ تھے کہ ہم دلقطوں کی قوت ختم کرنا چاہتے ہیں، امیر المؤمنین نام کی کوئی شے موجود نہ رہے، دنیا میں خلافت نام کا تصور نہ رہے، اور جہاد کا تصور نہ رہے۔

کیا خیال ہے، ان دونوں باتوں میں انگریز کا میاب نہیں ہے؟ کن کن باتوں میں ہمیں ناکام کیا ہے؟ آج ہمیں اسی نقطہ پر واپس جانا ہو گا، ہم جہاد کے تصور کے ساتھ یہ تصور ہنوں میں زندہ کریں کہ ہم نے دنیا میں اسلام کے غلبہ کیلئے محنت کرنی ہے اور وہی غلبہ جو خلافت کے عنوان سے ہو، اسلام کی بالادستی کے عنوان سے ہو، خلافت راشدہ کی پیروی میں ہو۔ کیونکہ جس دروازہ سے انگریز نے ہمیں ناکام کیا ہے ہم اسی دروازہ پر واپس جائیں گے تو کامیابی ہو گی ورنہ نہیں ہو گی۔ ان گزارشات کے ساتھ آپ حضرات کے جذبات اور جوش و خروش کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ہم لوگ اور توکھ نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ آپ حضرات کے ساتھ مل بیٹھیں دوچار باتیں کر لیں۔ اللہ تعالیٰ یہی قبول فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم نئی نسل میں آنے والے مسلمانوں میں، آنے والے دور کے اندر جہاد اور اسلام کی بالادستی کے عنوان کو زندہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا ذریعہ بنالیں، سبب بنالیں کہ ہم اس کو ایک منظم قوت اور تحریک کی حیثیت دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے اپنے دین کا غلبہ کیلئے اور جہاد کے احیا کیلئے کوئی کام لے لیں۔ آمین یا رب العالمین۔

## جہاد افغانستان نازک موڑ پر

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اپریل ۱۹۹۱ء

شعبان المعلم کے آخری ایام میں حکومتِ افغان مجاہدین کی دعوت پر خوست جانے کا اتفاق ہوا اور افغان مجاہدین کے فوجی مرکز، (۱) مرکز حضرت عمر<sup>ر</sup> (۲) مرکز خلیل (۳) مرکز شید اور (۴) مرکز حضرت سلمان فارسی دیکھنے کا موقع ملا۔ معروف افغان کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی سے بھی ملاقات ہوئی۔

افغان مجاہدین ان دونوں نجیب حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے فیصلہ کن جدو جہد کے مرحلہ میں ہیں اور خوست شہر کو فتح کرنے کیلئے کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ خوست کا شہر اور چھاؤنی فوجی لحاظ سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور اس شہر کو پورے جنوبی افغانستان کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے چاروں طرف سے افغان مجاہدین کے محاصہ کے باوجود اس شہر کی حفاظت کیلئے نجیب انتظامیہ پناپورا زور صرف کر رہی ہے، لیکن افغان مجاہدین پر عزم ہیں کہ وہ بہت جلد اس شہر کو فتح کر کے نجیب انتظامیہ کی فوج کو نکالت سے دوچار کریں گے۔

ہم ان صفات پر اس سے قبل بعض امریکی سفارت کاروں کے حوالے سے عرض کرچکے ہیں کہ افغانستان کے بارے میں جنیوں امعاہدہ روس اور امریکہ کی اس درونِ خانہ مقاہمتوں کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا کہ کابل پر افغان مجاہدین کی حکومت کسی صورت میں قائم نہ ہونے دی جائے۔ اس لیے افغانستان سے رو سی فوجوں کی واہی کے بعد افغان مجاہدین کیلئے نہ صرف امریکی امداد اور دلچسپی میں مسلسل کمی ہو رہی ہے بلکہ افغان مجاہدین کے خلاف سازشوں میں بھی امریکہ پروری طرح شریک ہے۔ اور اس طرح افغان مجاہدین رو سی استعمار اور اس کی ایجنت حکومت کے خلاف صبر آزمائگ کے انتہائی مشکل دور سے گزر رہے ہیں، لیکن ان کے عزم و حوصلہ اور موقف کی صداقت کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ مشکلات کا یہ دور بھی زیادہ طویل نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و امداد کے ساتھ وہ کابل پر ایک اسلامی نظریاتی حکومت کا پرچم لہانے میں بہت جلد کامیاب ہوں گے۔ ان شاء اللہ العزیز، و ما ذکر على اللہ بغيره۔

## افغانستان کی تقسیم کے عالیٰ منصوبہ کا آغاز

بیفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- مئی ۱۹۹۱ء

افغان مجاہدین کی خون میں ڈوبی ہوئی چودہ سالہ طویل جدو جہد بالآخر نگ لائی جس کے تیجہ میں افغانستان کے عوام آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوئے اور وہاں پر ایک آزاد اسلامی (عبوری) حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے خلاف امریکہ، روس اور دیگر مغربی ممالک کی سازشیں بھی اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان کی جغرافیائی حیثیت کے پیش نظر دنیا بھر کی غیر مسلم استعماری طائفیں خصوصاً امریکہ بہادر وہاں

ایک آزاد اور خالص اسلامی حکومت کے قیام کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ امریکی سامراج نے اپنی روایت عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان کو تقسیم کرنے کے عالمی منصوبے پر عملدرآمد کا آغاز کر دیا ہے۔ مغربی ذرائعِ ابلاغ میں شائع ہونے والی خبروں میں بھی اس بات کی تصدیق ہو رہی ہے کہ افغانستان کی تقسیم کے بین الاقوامی منصوبے جسے امریکہ کے علاوہ دیگر مغربی ممالک اور روس کی حمایت بھی حاصل ہے، کواب عملی شکل دینے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ منصوبے کے مطابق اگر افغانستان میں ان کی پسند کی حکومت قائم نہ ہو سکے تو اس کی طاقت کو کمزور اور منتشر کرنے کیلئے اسے شمال اور جنوب کے علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو امریکہ بہادر نے افغانستان کو اپنادستِ نگر اور طفیلی ملک بنانے کیلئے ایک پانچ نمائی امن منصوبہ پیش کیا اور عالمی ذرائعِ ابلاغ سے اس نام نہاد من مخصوصہ کا زبردست پر اپیگینڈہ کیا اور میاں نواز شریف اور حکومت پاکستان کے ذریعے اس منصوبہ پر عملدرآمد کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ پھر اس مقصد کیلئے اقوامِ متحده کے خصوصی نمائندے بین سیون کو پاکستان بھیجا۔ بین سیون نے افغانستان میں بر سر اقتدار نجیبِ انتظامیہ کے علاوہ پاکستان اور ایران کے حکمرانوں کے ذریعے اپنے نام نہاد امن منصوبہ کیلئے جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ لیکن جب بین سیون کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو اقوامِ متحده کے سیکرٹری جzel بطر وس عالمی کو بھی ان کی مدد کیلئے پاکستان بھیجن دیا۔

لیکن افغان مجاہدین نے باہمی اتفاق و تحداد سے ان کی کوئی بھی سازش کامیاب نہ ہونے دی۔ اسی دورانِ نجیب نے استغفار دے دیا۔ ادھر افغان مجاہدین کی تنظیموں نے اقوامِ متحده کے اس نام نہاد امن منصوبہ کو ٹھکر کر باہمی مشادرت سے افغانستان میں ایک مشترکہ عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ لیکن پاکستان میں جماعتِ اسلامی اور افغانستان میں جماعت کی ذیلی تنظیم حزبِ اسلامی نے مشترکہ عبوری حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر ہم حکمت یاد سمیت تمام افغان تنظیموں کے سربراہوں سے گزارش کریں گے کہ وہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے معنوی اختلافات کو پس پشت ڈال کر متحدر ہو جائیں اور امریکی سازشوں کو ناکام بنا کر افغانستان میں ایک پائیدار اسلامی حکومت قائم کر کے ایک مضبوط اسلامی بلاک کی رہا ہموار کریں۔

## نیو ولڈ آرڈر: عالمِ اسلام کے خلاف سازش

۱۸ نومبر ۱۹۹۱ء کو جامعہ اشرفیہ لاپور میں حرکۃ الجہاد الاسلامی  
کے سالانہ اجتماع سے خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ صدر ذی وقار قابل صد احترام دوستو، بھائیو اور مجاہد ساتھیو! میں صرف اجتماع میں شرکت اور آپ حضرات کے ہم نشیوں میں نام لکھوانے کیلئے حاضر ہو اہوں، وقت مختصر ہے۔ دیگر حضرات علماء کرام بھی تشریف فرمائیں اور با خصوص مفتی صاحبِ دامت برکاتہم تشریف فرمائیں، اس لیے کسی تمہید کے بغیر صرف دو مختصر باتیں عرض کروں گا۔

ایک تو اس وقت جہاد افغانستان کس پوزیشن میں ہے اس کا نقشہ تھوڑا سا سامنے ہونا چاہیے۔ ایک وقت وہ ٹاچ جب افغانستان کے علماء نے جہاد کا آغاز کیا تو دنیا کے دانشور یہ کہتے تھے۔ یہ پاگل لوگ ہیں روس جیسی سپر پاور چٹان ہے ان سے سر ٹکر اٹکر تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے، لیکن یہ مجاہدین کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج ماں سکو میں روس کا وزیر خارجہ ان ہی مجاہدین سے پوچھتا ہے کہ پرآمن مصالحت اور مفاہمت کی بات ہو سکتی ہے لیکن ہمیں یہ بتاؤ کہ ہم نجیب کا کیا کریں۔ مذاکرات کے حوالے سے جو رپورٹ آئی ہے اس میں روس کا وزیر خارجہ مجاہدین کے وفد کے لیڈر سے پوچھتا ہے کہ ہمیں راستہ بتاؤ نجیب کا ہم کیا کریں۔ یہ مجاہدین کی خلوص کی برکات ہیں اور اللہ رب العزت نے ایک بار پھر دنیا میں یہ عملہ دکھایا ہے کہ مسلمان اگر ایمان کی بنیاد پر جہاد کیلئے خلوص دل کے ساتھ میدان عمل میں ہو تو اللہ کی مدد و امداد بھی مسلمانوں کے ساتھ ہے، مشکلات اگرچہ بہت ہیں اور اس وقت مجاہدین کیلئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مجاہدین کی آخری کامیابی کو روکنے کیلئے امریکہ اور روس دونوں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ امریکہ اور روس کے مفادات مشترک ہیں۔ امریکہ اور روس اکٹھے ہو کر دونوں نے پہنچ باتوں پر اتفاق کیا ہے۔ آج دنیا میں نیورولڈ آرڈر کی بات ہو رہی ہے۔ اس کے حوالے سے بہت کچھ کہا جا رہا ہے لیکن میں اپنے مجاہد بھائیوں سے عرض کروں گا کہ اس نیورولڈ آرڈر کو ہمیں بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ ہے کیا۔ امریکہ اس نیورولڈ آرڈر کے نام سے دنیا کے اندر کیا تبدیلی لانا چاہتا ہے۔

پہلی بات تو یہ نوٹ کر لیں کہ یہ نیورولڈ آرڈر جو بھی سامنے آیا ہے اس پر امریکہ اور روس دونوں متفق ہیں۔ امریکہ اور روس دونوں مل کر دنیا میں ایک نئی تبدیلی اور ایک نئی صورتحال پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان دونوں میں اس پر اتفاق ہے اور بدستی سے ان دونوں کے علاوہ دوسری بڑی طاقتیں بھی جاپان سمیت ان کے ساتھ متفق ہیں۔ صرف چین تھوڑا سا ہٹا ہوا ہے، پرانیں ہٹا رہتا ہے یا ساتھ چلتا ہے، لیکن تمام طاقتیں جو بڑی کھلاتی ہیں وہ اس نیورولڈ آرڈر پر متفق ہیں۔ نیورولڈ آرڈر کیا ہے؟ ہمارے سمجھنے کی اس میں دو باتیں ہیں۔

1. پہلی بات تو یہ ہے کہ افغانستان پر مجاہدین کی حکومت (جس کو وہ بنیاد پرست کہتے ہیں) قائم نہ ہو، اس کا پہلا نقطہ ہے۔

2. دوسرا نقطہ یہ ہے مشرق و سطی میں عرب ممالک پر اسرائیل کی بالادستی فوجی اور سیاسی دونوں اعتبار قائم سے کروائی جائے جسے عربوں کو بخاکران سے تسلیم کروایا جائے۔ اسرائیل کی بالادستی اس طریقے سے قائم کر دی جائے کہ کوئی عرب ممالک اسرائیل کے سامنے سرمنہ اٹھا سکیں۔

3. اسی نیورولڈ آرڈر کی جو تیرسی بنیاد ہے وہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں اس وقت جو دنی بیداری کی تحریکات ہیں جس کو وہ بنیاد پرست تحریکات کہتے ہیں، جو پاکستان میں بھی ہے، جوانوں نیشاں میں بھی ہے، ملائیشیا میں بھی ہے، افغانستان میں بھی ہے، الجماہر میں بھی ہے، ترکی میں بھی ہے، جو خالص اسلام کی بنیاد پر، قرآن و سنت کی حکمرانی کی بنیاد پر، کسی آمیزش کے بغیر قرآن و سنت کے خالص نظام کو اپنے ممالک پر رانگ کرنا چاہتے ہیں، وہ تحریکات اب بھی موجود ہیں، کہیں طاقتور ہیں اور کہیں کمزور ہیں، اور کہیں درمیانی کیفیت کی ہیں، بنیاد پرستی

کی تحریکات، دینی بیداری کی تحریکات، یہ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جاپان اور جمنی سارے ترقی ہو چکے ہیں کہ ان تحریکات کو ہر قیمت پر بنانا ہے۔ ان تحریکات میں سے کسی تحریک کو اس پوزیشن پر نہیں آنے دینا کہ وہ کسی ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے نظام کو نافذ کر سکیں، اور نظام کو نافذ کرنے کے بعد دنیا کے سامنے اسلامی نظام کو صحیح نمونے پر پیش کر سکیں۔ کیونکہ یہ طے ہے کہ آج دنیا میں انسانیت جنم مشکلات سے دوچار ہے، میرا ایمان اور عقیدہ ہے اگر دنیا کے کسی حصہ میں ایک حصہ کی حکومت بھی اسلام کے نظام کو صحیح طور پر نافذ کر کے اس کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دے تو دنیا بیساکی ہے، دنیا ترس رہی ہے کسی اچھے نظام کو، اس نظام کا مقابلہ کرنا پھر کسی کے بس میں نہیں ہو گا۔ اور یہ بات وہ بھی صحیح ہے کہ اگر اسلام صحیح معنوں میں نافذ ہو تو ایک نمونہ آئے گا، ایک مثال سامنے آئی گی، اور پھر یہ جتنے جھوٹے نظام ہیں ان کیلئے راستہ چھوڑے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہو گا۔ کیونکہ روشنی جب آتی ہے تو تاریکی کیلئے ہمگے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں کرہے جاتا۔ تو یہ تیرا نقطہ ہے ان کا کہ دنیا میں بنیاد پرستی کی تحریکات کو کچل دیا جائے۔

4. چوتھی بات نیودوللہ آرڈر کے تحت، امریکہ اور اس کے حواریوں میں اب روس بھی شامل ہے، یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام کا کوئی ملک بھی فوجی لحاظ سے اس قدر طاقتور نہ ہو کہ وہ کسی غیر مسلم ملک بالخصوص اسرائیل کیلئے خطرہ بن سکے۔ آج ہماری ایسی تنصیبات کا مسئلہ ہے، لیکن اسی مسئلہ میں، عراق کے ایسی تنصیبات کا مسئلہ ہے، جہاں کہیں انہیں تھوڑی سی سن گن ملتی ہے کہ وہ مسلمان ملک ایسی تواتائی کی طرف بڑھ رہا ہے تو وہاں فوراً پہنچتے ہیں اور قوت کو تباہ کرنے کیلئے تانے بنے جاتے ہیں۔ آج پاکستان اس قدر خطرات میں ہے کہ وہ ابھی باتوں سے کام بکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر باتوں سے ہم رام نہ ہوئے تو خدا خواستہ خدا خواستہ اس ملک کو بھی وہ اپنے حملوں کی زد میں لاسکتے ہیں، لیکن یہ برداشت کبھی نہیں کریں گے کہ پاکستان یا کوئی اسلامی ملک فوجی اور دفاعی لحاظ سے خود کفیل ہو۔

آج دیکھیے، اتنی بڑی بات کہ آپ ایسی تنصیبات ختم کر دیں، آپ کا ایسی دفاع ہم کریں گے، جیسا کہ عربیوں کا دفاع کر رہے ہیں اسی طرح ہمارا دفاع بھی کریں گے، جیسے کہ عربوں کو بے بس کر دیا ہے۔ عرب ممالک بے بس ہیں لاچار ہیں مجبور ہیں کہ امریکہ کی فوجیں قبول کریں، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ان کیلئے کہ امریکہ کی فوجیں قبول کریں اور اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیں۔ آج پاکستان کیلئے بھی یہی تجویز لے کر آیا ہے امریکی کمانڈر انجیف کہ جناب آپ فوجی قوت کم کریں اور ایسی تنصیبات ختم کر دیں اور فوج کو ایک لاکھ پر لے آئیں۔ آپ کو ایک لاکھ فوج سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے، باقی آپ کا دفاع ہم کریں گے۔ آپ کو ضرورت پیش آئی تو ہماری فوج آئے گی، ہمارا سلحہ آئے گا، ہم دفاع کریں گے۔ چوتھا نقطہ آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ پالیسی طے شدہ ہے کہ دنیا میں اسلام کا کوئی ملک فوجی اعتبار سے خود کفیل نہ ہو سکے، اتنا طاقتور نہ ہو کہ آپ کیلئے خطرہ

بن سکے۔

ان بنیادوں پر دنیا کی طائفیں آگے بڑھ رہی ہیں، اور ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے اگرچہ مشکل ہے اور میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اسی آئندگی پر محسوس کر رہا ہوں جس آئندگی پر ۱۸۵۷ء کی ناکامیوں کے بعد تھے۔ ہمیں اپنی دین اور قوت کو مضبوط کرنا ہے، اپنے آپ کو نظریاتی لحاظ سے مضبوط کرنا ہے، اور جذبہ جہاد کو مسلمانوں کے دلوں میں اجگر کرنا ہے۔ جتنا ہم نظریہ اور فکر کے لحاظ سے اسلام میں پختہ ہوں گے، جتنا ہمارے اندر جہاد کا جذبہ بیدار ہو گا ان شاء اللہ سارے مسائل حل ہوں گے۔ ان ساری قوتوں کا ہم سامنا کریں گے لیکن اسلام کے ساتھ لا زوال وابستگی، فکری وابستگی۔ لیکن جب میں آپ حضرات کے سامنے عرض کرتا ہوں تو اس سے میری مراد جذباتی وابستگی نہیں ہوتی، شعوری وابستگی ہوتی ہے۔ میری گستاخی معاف فرمائیں علماء اور طلباء کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ ہم علماء کہلانے والے اور طلبہ کہلانے والے حضرات کی بھی ۹۰ فیصد کی وابستگی اسلام کے ساتھ شعوری نہیں ہے، عقیدہ اور جذبات کی وابستگی ہے۔

- ہمیں نہیں معلوم اسلامی نظام کیا ہے،

- ہمیں نہیں معلوم کہ سود کا مقابل نظام ہمارے پاس کیا ہے،

- ہمیں نہیں معلوم کہ سیاسی نظام کے خود خال کیا ہیں۔

نے فیصلہ کی بات کر رہا ہوں، اکابر کی بات نہیں کر رہا، اپنے جیسوں کی بات کر رہا ہوں۔ ہمیں نہیں معلوم، ہم نہیں جانتے، نہ ہم پڑھتے ہیں، نہ ہمیں پڑھایا جاتا ہے، نہ ہم مطالعہ کرتے ہیں، نہ ہمیں ترغیب دی جاتی ہے، نہ ہماری ذہن سازی ہوتی ہے۔ ہماری وابستگی اسلام کے ساتھ شعوری نہیں ہے، فکری نہیں ہے، بلکہ عقیدت اور جذبات کی وابستگی ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ سب سے پہلے اسلام کے ساتھ، قرآن اور سنت کے ساتھ، اسلام کے نظام کے ساتھ شعوری وابستگی پیدا کیجئے، اس کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، دنیا کے حالات کا مطالعہ کیجئے، اپنے جذبہ جہاد کو نیورالڈ آرڈر، جو عالم اسلام کے خلاف ایک سازش ہے، اجگر کیجئے، بیدار کیجئے، اس کو وسعت دیجئے، یہی ایک حل ہے ان شاء اللہ، دینی وقتیں بیدار ہوں گی، متحد ہوں گی تو پہلے بھی کفر کو شکست ہوئی ہے، آج بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کفر کو شکست ہوگی۔ واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

خانه جنگی کا دور  
(۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۶ء)

## "یہی چراغِ جلیں گے تو روشنی ہو گی"

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۲ء

علامہ محمد اقبال نے افغانستان پر برطانوی استعمار کی بیلگار کی ناکامی پر فرنگیوں کے جذبات کی عکاسی ان الفاظ سے کی تھی۔

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج  
ملاؤں کے کوہ و دمن سے نکال دو

مگر جب افغانیوں کی غیرت ملی کا تزیحان اور محافظہ ملاؤں فرنگی استعمار کے ہاتھوں افغانستان کے کوہ و دمن سے جلاوطن نہ ہو سکا تو یہ دردسر رو سی استعمار نے اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ اور یہ سوچ کر افغانستان کو ملاؤں اور اس کے دین و ثقافت سے نجات دلانے پر کمر باندھ لی کہ برطانوی استعمار کی کامیابی کی راہ میں شاید جغرافیائی فاصلے رکاوٹ بن گئے ہوں اور رو س اور افغانستان کے درمیان ان فاصلوں کا فندان اس مشن میں رو س کی کامیابی کی ضمانت بن جائے۔ رو حافی اقدار اور اخلاقی روایات کی کارہ بیانی کے مکمل سویت حکمرانوں کی نظر اس "ظاہر" سے آگے نہ جا سکی اور ایمان و لیقین، عزیمت و استقامت اور وارثگی و شیدائیت کی وہ ٹھوس رکاوٹیں ان کی نگاہوں سے او جھل رہیں، جن سے گلکار نے کی عبرت ناک سزا سویت یونین کے افغانیوں کے سامنے سپر انداز ہونے اور پھر ریت کی دیوار کی طرح بکھرتے چلے جانے کی صورت میں تاریخِ عالم کا ناقابل فراموش حصہ بن چکی ہے۔

مسجد کی چٹائیوں میں مانگے تانگے کی روٹیوں کو الحمد للہ کہہ کر حلق سے اتار کر قال اللہ و قال الرسول کا درس حاصل کرنے والے اس ملاؤں کو تہذیب مغرب کے پرستاروں نے کون کو نے طغض سے نہیں نوازا؟ اسے رجعت پسند، دقیقوں، بنیاد پرست، کٹ ملا، عقل و شعور سے عاری، ہٹ دھرم، اندھا مقلد، لکیر کا نقیر، اور جودہ ہنی کا شکار جیسے القابات دیے گئے، اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کا دروازہ اس پر بند کر کے اسے "اچھوت" "بانے کی اجتماعی ہم جلا فی گئی۔ لیکن وقت آنے پر وہی ملاؤں افغانیوں کی غیرت ملی کا عنوان بن کر ابھرا اور اپنے ایمان و لیقین کی قوت کے ساتھ رو سی استعمار کی بیلگار کے سامنے سد سکندری بن گیا۔ آج افغان مجاهدین کی کامیابی پر بارگاہ ایزدی میں پوری امت اسلامیہ سجدہ ریز ہے اور جہاد افغانستان کے ثمرات و نتائج کی فہرست بن رہی ہے۔ سوویت یونین کا خاتمه، مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی، افغانستان کی آزادی اور پورے عالم اسلام میں جہاد کے جذبات کا فروغ ان ثمرات میں سرفہرست نظر آرہے ہیں۔ لیکن ہمیں افغان مجاهدین کے مقدس خون کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر ایک اور فیصلہ بھی کلمہ ہوا دکھائی دے رہا ہے، ملتِ اسلامیہ کو اقبال کا شاہین مل گیا ہے اور اقبال کا مردمومن اپنے چہرے سے تاریخ گئی گرد جھاڑ کر قوم کے سامنے آکھڑا ہوا ہے، اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں کلا شنکوف ہے، اور وہ کابل کی پل خشتی کی مسجد کی بوسیدہ

چھائیوں پر کھڑا تہذیبِ مغرب کے انڈھیروں میں سرگردان امتِ مسلمہ کو آواز دے رہا ہے کہ  
جنہیں حقیر سمجھ کر بجہاد یا تم نے  
یہی چراغِ جلیں گے تو روشنی ہوگی

## افغانستان میں پانچ دن

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جون ۱۹۹۲ء

حرکتِ اجہادِ الاسلامی پاکستان کی دعوت پر مجھے ملک کے سرکردہ علماء کرام کے ایک وفد کے ہمراہ ۳۱ مئی سے ۳ جون تک پانچ روز افغانستان کی سر زمین پر گزارنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل بھی چودہ سالہ افغان جہاد کے دوران حرکتِ اجہادِ الاسلامی اور حرکتِ المجاہدین کی دعوت اور پروگرام کے مطابق ارگون، باڑی، راغبیل، شاور اور خوست کے دیگر محاذوں پر کئی بار گیا ہوں لیکن جہادِ افغانستان کی کامیابی اور مجاہدین کی باقاعدہ حکومت کے قیام کے بعد یہ میرا پہلا دورہ افغانستان تھا۔ حرکتِ اجہادِ الاسلامی پاکستان کے غیور نوجوانوں کی تنظیم ہے جس میں زیادہ تر دینی مدارس کے طلباء اور نوجوان علماء شامل ہیں، اس کے باñی فیصل آباد کے ایک پر جوش نوجوان مولانا ارشاد احمد شہید تھے جنہوں نے جہادِ افغانستان کا آغاز ہوتے ہی پاکستان کے علماء اور دینی مدارس کے طلباء میں یہ ہم شروع کر دی کہ ہمیں اپنے افغان بھائیوں کی مدد کیلئے ان کے ساتھ عملًا شریک جہاد ہونا چاہیے۔ یہ اس نوجوان کے خلوص کی برکت تھی کہ وہ بہت جلد نوجوان علماء اور طلباء کو اس مقصد کی طرف توجہ دلانے میں کامیاب ہو گیا اور حرکتِ اجہادِ الاسلامی کے نام سے ایک باقاعدہ تنظیم وجود میں آگئی۔ اس تنظیم نے ارگون، خوست، جلال آباد اور دیگر محاذوں پر افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لیا اور سینکڑوں پاکستانی نوجوان اس جہاد میں عروں شہادت سے ہمکnar ہوئے جن میں خود مولانا ارشاد احمد شہید، حرکتِ اجہادِ الاسلامی کے کمانڈر خالد زمیر شہید اور میرا بجانجہ حاجی عدیل عمران شہید بھی شامل تھے۔

مولانا ارشاد احمد شہیدگی شہادت کے بعد یہ تنظیم وہ حصول میں بٹ گئی، ایک حصہ حرکتِ اجہادِ الاسلامی کے نام سے مولانا قاری سیف اللہ اختر کی قیادت میں معروف جہاد رہا اور دوسرا حصہ حرکتِ المجاہدین کے نام سے مولانا فضل الرحمن خلیل اور مولانا محمد فاروق کشیری کی قیادت میں جہاد کے مختلف محاذوں پر سرگرم ہو گیا۔ ان تنظیموں کا جہاد افغانستان میں بلاشبہ بہت بڑا حصہ ہے اور میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ جنگ میں اگلے مورچوں اور مشکل مقامات پر یہ پاکستانی علماء اور طلباء رہتے تھے اور افغان کمانڈر مشکل مورچے ان کے حوالے کر کے مطمئن ہو جایا کرتے تھے کہ اب ان مورچوں پر کسی مزید توجہ کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جہادِ افغانستان کے مختلف محاذوں پر ان تنظیموں کے ذریعے شریک جہاد ہونے والے پاکستانی علماء، طلباء اور نوجوانوں کی تعداد ہیں ہزار سے متعدد ہے جن میں سینکڑوں شہداء اور ہزاروں مجرم حین بھی شامل ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جہادِ افغانستان کے دوران پہلی بار ارگون کے محاذ پر جانے کا موقع بھی حرکتِ اجہادِ الاسلامی کے

ذریعے ملا اور مجاہدین کی کامیابی کے بعد آزاد افغانستان کا پہلا سفر بھی حرکت اجہاد الاسلامی کی دعوت و اہتمام کے ساتھ ہوا جس کے امیر اس وقت حیدر آباد سندھ کے نوجوان عالم دین مولانا سعادت اللہ خان اور ناظم عمومی مولانا عبد الحمید عباسی ہیں اور دونوں حضرات اس سفر میں ہمارے ہمراہ تھے۔ افغانستان جانے والے پاکستانی علماء کے وفد میں ساتھ سے زیادہ علماء شامل تھے جن میں مولانا سید انور حسین نقیس رقم، مولانا فداء الرحمن درخواستی، مولانا قاضی عبدالکریم آف کلپی، علامہ ڈاکٹر خالد محمود، مولانا نور محمد آف وانا، مولانا قاضی عصمت اللہ، مولانا قاضی محمد یونس انور، مولانا سجاد بخاری، مولانا حمید الرحمن عباسی، مولانا فیض احمد، مولانا عبد الحمید، مولانا محمد عالم، مولانا قاضی عطاء اللہ، مولانا محمد یعقوب ربانی، مولانا عبد الحمید قریشی، مولانا محمد انور، مفتی فخر الدین عنانی، مفتی شیر محمد علوی، مولانا مفتی محمد عسیٰ خان، مولانا شاہ محمد، مولانا لطیف الرحمن، مولانا کیل احمد شیر وانی، مولانا محمد یوسف، مولانا ارشد حسن ثاقب، حاجی امیر نواز خان الیڈوکیٹ، مولانا میاں عبد الرحمن اور حاجی غلام علی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

۳۱ مئی توارکو ہم تقریباً ایک بجے طور خم سے سرحد عبور کر کے افغانستان میں داخل ہوئے، ویرے کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی کاغذی کارروائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا البتہ حرکت اجہاد الاسلامی کے امیر مولانا سعادت اللہ خان نے متعلقہ حکام سے ملاقات کر کے ائمیں آگاہ کیا کہ پاکستانی علماء کا وفد کابل جا رہا ہے اور وفد کے ارکان کی فہرست بھی ائمیں فراہم کر دی۔ طور خم کی سرحد پر اپنے طن واپس جانے والے افغان مہاجرین کی گہما گہما تھی جو اپنی بھرت اور جہاد میں کامیابی پر شاداں و خرماءں طن واپس لوٹ رہے تھے۔ متعلقہ حکام سے معلوم ہوا کہ اس راستے سے روزانہ اوس طبقاً چار سو خاندان واپس جا رہے ہیں لیکن مہاجرین نے شکایت کی کہ مغرب کے وقت واپسی کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے بعد وہاں پہنچنے والے بیسیوں خاندانوں کو روزانہ رات سرحد پر گزارنا پڑتی ہے جو خاصی پریشان کن بات ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ سرحد پر پاکستانی عملہ معمول کے مطابق ہے جو صبح سے شام تک واپس جانے والے خاندانوں کا اندر آج کرتا ہے، اگر عملہ ڈبل کر دیا جائے اور دو شفشوں کی صورت میں اوقات کار بڑھادیے جائیں تو اس شکایت کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سکیورٹی کے نقطہ نظر سے ایسا کیا جا رہا ہو اور مغرب کے بعد تا قافلوں کا سفر کرنا صلحت کے خلاف تصور کیا ہو لیکن کابل تک جاتے ہوئے اور واپسی پر راستے میں اس کی کوئی وجہ ہمیں نظر نہیں آئی۔

تاقلوں تقریباً ساڑھے تین بجے جلال آباد پہنچا جو اس راستے میں افغانستان کا پہلا شہر ہے اور کابل سے پہلے مجاہدین کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا۔ یہاں مولوی محمد یونس خالص کی حزب اسلامی کے حاجی عبد القدر یہ عبوری حکومت کی طرف سے گورنر ہیں اور یہ صوبہ تنگرہار کا صدر مقام ہے۔ ہم نے پہلی بار کا کھانا یا اور ظہر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلال آباد سے کابل تک سڑک کے دونوں طرف ٹیکلوں اور گاڑیوں کے بے شمار تباہ شدہ ڈھانچے بکھرے پڑے ہیں جو افغان مجاہدین کی عزیت و استقامت کا عنوان نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کابل سے جلال آباد کیلئے مک کے طور پر ہزاروں گاڑیوں پر مشتمل کانوائے کی صورت میں طاقت کے بھرپور مظاہرہ کے ساتھ آتے تھے لیکن راستے میں مجاہدین سڑک پر بارودی سرگلیں بچھا کر اور پل تباہ کر کے اس کانوائے کے جلال آباد پہنچنے اور کابل واپس جانے کے راستے مسدود کر دیتے اور پھر مزے سے ٹینکلوں اور گاڑیوں کا شکار کرتے۔ عام حالات میں پشاور سے

کابل کا سفرچ پھنٹے کا بیان کیا جاتا ہے لیکن سڑک مکمل طور پر تباہ ہے، پل ٹوٹے ہوئے ہیں اور ٹینکوں کے چلنے سے جگہ گڑھے پڑ گئے ہیں اس لیے ہم تقریباً ساڑھے چار بجے جلال آباد سے چل کر رات ایک بجے کے قریب کابل میں داخل ہوئے۔ راستے میں جگہ جگہ ان تباہ شدہ بستیوں کا منظر دیکھا جو کابل حکومت کی وحشیانہ بمباری کا نشانہ بنیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ جس بستی کے بارے میں یہ پتہ چلتا کہ وہاں کوئی مجاهد موجود ہے بمباری کر کے اس پوری بستی کو تباہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ سڑک کے دونوں طرف ایسی بستیوں کے گھنڈرات سو دیت یونین (آنجہانی) اور اس کے حواریوں کی وحشت و بربریت کا ماتم کر رہی ہیں۔

کابل میں ہم وزارت مذہبی امور کے مہمان تھے اور ہمارے لیے انہر کا تینینٹل ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا گیا۔ عبوری حکومت کے وزیر مذہبی امور مولانا ارسلان رحمانی ہیں جن کا تعلق افغانستان میں علماء کی سب سے بڑی جماعت حركت انقلاب اسلامی سے ہے۔ مولانا ارسلان رحمانی صوبہ پکتیا اور ارگون چھاؤنی کے فاتح ہیں اور اپنے علاقے کو کابل کی میونسٹ حکومت سے آزاد کرنے کا یہ دلف انہوں نے دو سال قبل حاصل کر لیا تھا۔ دیکھنے میں سیدھے سادے مولوی لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی دینی مدرسہ میں سبق پڑھا کر آرہے ہیں لیکن ان کا شمار مجاهدین کے چند بھی دار کمائیروں میں ہوتا ہے اور دشمن کے حقوق میں انہیں ”خونخوار مولوی“ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔

کیم جون کو ہمیں کابل کے مختلف حصوں کی سیر کرائی گئی۔ سب سے پہلے ہم پل خشتنی کا تاریخی مسجد میں گئے اور جہاد افغانستان کی کامیابی پر شکرانہ کے نوافل ادا کیے۔ صحابی رسول حضرت تمیم انصاریٰ اور تابعی حضرت لیث بن قیس بن عباس کے مزارات پر گئے۔ کابل میں اسلام حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں پہنچ گیا تھا اور یہاں متعدد صحابہ کرامؓ کی قبروں کی موجودگی بیان کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے مزارات کے ساتھ مساجد بھی ہیں۔

حضرت لیث بن قیس گویہاں شاہ و شمشیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کی مسجد بھی اسی نام سے معروف ہے۔

مغرب کی نماز ہم نے مجدد خاندان کی معروف خانقاہ کی مسجد میں پڑھی اور حضرت نور الملا شیخ نفضل عمر حمد اللہ تعالیٰ کی قبر پر فتح خواہی کی۔ یہ خاندان جو ”ملاشور بازار“ کے نام سے متعارف ہے مجاہد انا اور تاریخی کردار کا حال خاندان ہے اور مجدد الف ثانیؓ اولاد میں سے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پنجاب پر سکھوں کے تسلط کے وقت جب سرہند شریف میں جہاں مجدد الف ثانیؓ کی قبر ہے سکھ حکومت کے مظالم حد سے بڑھ تو یہ خاندان وہاں سے بھرت کر کے کابل آگیا اور نقشبندی سلسلہ کی خانقاہ آباد کی۔ افغانستان اور سلطی ایشیا کی ریاستوں میں نقشبندی سلسلہ کے وسیع اثرات ہیں۔ جماعت اسلامی کے امیر جناب قاضی حسین احمد سے ایک مجلس میں یہ سنکر و سلطی ایشیا کی ریاستوں میں جبر کے مترسالہ دور میں عام مسلمانوں کا تعلق اسلام کے ساتھ قائم رکھنے میں سب سے اہم اور بنیادی کردار نقشبندی سلسلہ کے صوفیاء نے ادا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بلاشبہ یہ کابل کی اسی نقشبندی خانقاہ کا فیض ہے۔ افغانستان کی عبوری حکومت کے سربراہ پروفیسر صغیر اللہ مجددی کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ یہ خاندان ہمیشہ جرأت و استقامت کی علامت رہا ہے اور ہر دور میں حکمران اس کے اثر و سوخ سے خائف رہے ہیں۔ امان اللہ خان کے دور کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز دربار میں اس نے ایک سے زیادہ بیویوں کی شرعی اجازت پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب نبی اکرمؐ کی ازوں مطہرا شاہ کا ذکر اس

انداز سے کیا جس سے معاذ اللہ اہانت رسول کا پھلو نکلتا تھا۔ نور المشائخ حضرت فضل عمر جو وہاں موجود تھے فوڑا کھڑے ہوئے اور تمدن درباری آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بادشاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ امان اللہ! اگر لقصد گھنی کافرشدی (اے امان اللہ!) اگر تو نے یہ جملہ ارادت آنکھ کہا ہے تو کافر ہو گیا ہے۔ یہ جملہ کہتے ہی حضرت نور المشائخ دربار سے نکلے اور کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئے۔ پھر جب افغانستان پر برطانوی استعمار نے حملہ کیا تو اپنے وطن کو انگریزوں سے آزاد رکھنے کے عزم کے ساتھ وطن واپس چلے گئے اور جنگ استقلال وطن میں سرگرم کردار ادا کیا۔

اس دور میں دہلی کی برطانوی حکومت نے پورا ذرور لگایا کہ کسی طرح حضرت نور المشائخ کو کابل جانے سے روکا جائے لیکن وہ کسی نہ کسی طریقہ سے ان کی کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے کابل پہنچ گئے۔ کابل کی اس نقشبندی خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین فضل المشائخ حضرت ابراہیم جان مجدری ہیں جنہیں کیونٹ انتقال (انقلاب ثور) کے پہلے روز ہی خانقاہ میں موجود دوسرا فرادر سمیت گرفتار کر لیا گیا تھا اور خیریہ تھی کہ ان سب کو شہید کر دیا گیا ہے۔ لیکن اب یہ خوشنوار خبر کابل میں لی کہ حضرت فضل المشائخ مدظلہ العالی اپنے رفتاء سمیت محمد اللہ تعالیٰ زندہ ہیں اور وسطیٰ ایشیکی ریاست ازبکستان میں کسی مقام پر نظر بند ہیں۔ اس خبر نے بلاشبہ ہمارے دورہ کابل کی خوشیوں کو دوچند کر دیا، فالمحمد للہ علی ذلک۔ حرکت انقلاب اسلامی کے راہنماء مولانا ناصر اللہ منصور نے بتایا کہ بہت جلد ایک سرکاری وفد ازبکستان جا رہا ہے جو ان مجاهدین آزادی کی رہائی اور وطن واپسی کا اہتمام کرے گا۔ اس ظیعیم خانوادہ کی داستان عزیمت کے حصار سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے کہ یہ رپورٹ اس سے زیادہ تر کہ متحمل نہیں ہے، بہر حال میرے لیے وہ لمحات زندگی کے چند گنے چنے پر مسرت لمحات میں سے ہیں جو اس خانقاہ میں گزرے۔

ہمارے قافلے نے کابل میں جنگی اسلحہ کا میوزیم بھی دیکھا جہاں برطانوی استعمار کے خلاف جنگ میں استعمال ہونے والا سلاح بطور یادگار رکھا گیا ہے اور موجودہ جنگ میں استعمال ہونے والے چند ہوائی جہاز، توپیں، ٹینک اور گاڑیاں بھی ہیں۔ شام کا وقت تھا میوزیم کا گیٹ بند تھا اس لیے اندر رکھا ہوا اسلحہ ہمنہ دیکھ سکے اور باہر کھلی جگہ پڑی ہوئی جیزیں دیکھیں جن میں ”ٹینک“ ۸۱۵ بھی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ انقلاب ثور میں جزل اسلم وطن یارے صدارتی محل پر قبضہ کرنے کیلئے پہلا گولہ اسی ٹینک سے چلا یا تھا اور پھر اس ٹینک کو انقلاب کی یادگار کے طور پر شہر کے ایک چوک میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اب یہ ٹینک میوزیم میں ہے اور انقلاب ثور کی عبرت نکل موت پر آنسو بہار رہا ہے۔ ہم نے کامل کا وہ چوک بھی دیکھا جسے خان عبدالوی خان صاحب کی سرگرمیوں کے حوالے سے ”پشتوستان چوک“ کہا جاتا تھا اور وہاں پشتوستان کا پرچم چند روز قبل تک اہم اتار رہا ہے لیکن اب وہاں حرکت اجنبیا اسلامی کا پرچم پوری آب و تاب کے ساتھ رہا رہا ہے۔

۲ جوں کو مختلف راہنماؤں کے ساتھ ہماری ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ سب سے پہلے مولانا ارسلان رحمانی ہوٹل میں آئے اور مہماں حضرات سے ملاقات کی، ہوٹل کے ہال میں ایک مختصر تقریب ہوئی جس میں وفد کی طرف سے مولانا نو محمد آف وانا نے مولانا ارسلان رحمانی کو جہاد افغانستان کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی اور مولانا رحمانی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جہاد افغانستان میں حرکت اجنبیا اسلامی اور پاکستان کے علماء کے کردار کو سراہا اور کہا کہ ہماری کامیابی کی ایک بڑی وجہ پاکستانی علماء کی پشت پناہی ہے اور ہم ہمیشہ علماء پاکستان کے احسان مندر رہیں گے۔ اس کے بعد یہ قافلہ

مولانا سلان رحمانی کی راہ نمائی میں حرکت انقلاب اسلامی کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حرکت انقلاب اسلامی افغانستان میں علماء کی سب سے بڑی تنظیم ہے جس کے سربراہ مولانا محمد بنی محمدی ہیں۔ مولانا موصوف افغانستان کے سربراہ عالم دین ہیں، ظاہر شاہ کے دور میں پارلیمنٹ کے رکن رہ چکے ہیں، انتہائی مدرس اور زیر ک ہیں، باوقار اور سنجیدہ مزاج کے حامل ہیں۔ جہاد افغانستان کے چودہ سالہ دور میں ان کی جماعت تین حصوں میں بٹ گئی تھی لیکن اب پھر متوجہ ہو گئی ہے۔ متعدد صوبوں میں ان کی جماعت کو مکمل کنٹرول حاصل ہے اور عبوری حکومت میں بھی اسے معقول نمائندگی حاصل ہے۔ کیونکہ پارٹی جو پہلے خلق پارٹی اور پرچم پارٹی کے نام سے تقسیم تھی اور بعد میں ڈاکٹر نجیب اللہ نے وطن پارٹی کے نام سے اسے متوجہ کر دیا تھا اس کا ہیڈ کوارٹر مولانا محمد بنی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی کے حصہ میں آیا ہے، یہ ہیڈ کوارٹر پانچ منزلہ بلڈنگ میں ہے جس میں دو سو کے قریب کرے ہیں اب وہاں حرکت کا دفتر ہے۔ جس ہال میں ڈاکٹر نجیب اللہ حکمران پارٹی کے اجلاؤں کی صدارت کیا کرتا تھا وہاں اب مولانا محمد بنی حرکت انقلاب اسلامی کے اجلاؤں کی صدارت کرتے ہیں اور ہماری ان سے ملاقات بھی اسی ہال میں ہوئی۔

مولانا محمد بنی سے پہلے ہماری ملاقات ان کے نائب مولانا نصر اللہ منصور سے ہوئی جن سے چودہ سالہ جہاد آزادی کے دوران بھی کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ مجہد عالم دین اپنے جوش و جذبہ اور انقلابی مزاج کے باعث ”اپنے بھی خاتمہ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش“ کی عملی تصویر بنا رہا ہے۔ امریکہ نے اپنے مفادات کی خاطر افغان مجاہدین کی امداد کا سلسہ شروع کیا تو مولانا منصور اس کے کئی تقاضوں کو ہضم نہ کر سکے۔ ان کا دھڑکا اس وقت مولانا محمد بنی محمدی سے الگ تھا۔ نصر اللہ منصور کی حرکت انقلاب اسلامی کی امداد بند کر دی گئی اور ان کے ساتھی مجرور ہو کر ان سے الگ ہوتے رہے مگر مصائب و مشکلات کا یہ دوران کے پانے استقلال میں لغزش نہ پیدا کر سکا۔ انہوں نے پاکستانی علماء کے قافلہ سے خطاب کیا اور جہاد افغانستان میں پاکستانی علماء اور طلبہ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے اسے سراہا۔ ان کا کہنا تھا کہ علماء نے اپنے شاگردوں اور معتقدین کی تربیت اور ذہن سازی کی اور نوجوان ان کے کہنے پر جہاد افغانستان میں شریک ہوئے جس پر پوری افغان قوم علماء پاکستان کی شکرگزار ہے۔

مولانا محمد بنی محمدی اپنے مخصوص باوقار انداز میں ہال میں تشریف لائے اور تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ مولانا نصر اللہ منصور نے مہماںوں کا تعارف کرایا، مولانا نور محمد نے وفد کی طرف سے مبارک باد اور اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے تعاون کے جذبات کا اظہار کیا۔ وفد میں شام کے ایک عالم دین اشیخ احمد النبیدی بھی تھے جو شام کے سیکور حکومت کے مظالم کے باعث بھارت کے گذشتہ چودہ سال سے پاکستان میں مقیم ہیں، انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور یہ کہہ کر اہل محفل کے دلی جذبات کی ترجیحی کی کہ آپ حضرات نے چودہ سال تک جو جنگ کی ہے وہ جہاد اصغر تھا، اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کامیابی دی ہے وہ مبارک ہو لیکن اب آپ جہاد اکبر کی طرف آگئے ہیں۔ آپ کا اصل جہاد اب شروع ہوا ہے اور وہ صدیوں کے بعد اسلام کے اپنے نظام حکومت کا احیاء ہے، ایک خالص اسلامی ریاست کا قیام ہے اور خلافت اسلامیہ کی بحالی ہے۔ ہم پہلے جہاد میں بھی آپ کے ساتھ تھے اور اس جہاد میں بھی آپ کے ساتھی ہیں۔ مولانا محمد بنی محمدی نے وفد کا شکریہ ادا کیا، جہاد افغانستان میں پاکستان کے عوام، علماء اور حکومت کے کردار کو سراہا اور تقدیم

دلایا کہ افغانستان میں مکمل اسلامی نظام نافذ ہو گا اور جہاد افغانستان کا اصلی بدب پورا کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر، فلسطین، برا اور دیگر علاقوں میں ہمارے جو مسلمان بھائی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں انہیں ہماری مکمل حمایت حاصل ہو گی اور ہم اپنے حالات پر قابو پانے کے بعد اپنے ان معلوم بھائیوں کی امد اور کی طرف سنجیدہ توجہ دیں گے۔

ہمارے وفد کی دوسری ملاقات افغانستان کی عبوری حکومت کے سربراہ پروفسر صبغت اللہ مجددی سے ہوئی۔ وہ قصر صدارت میں قیام پذیر ہیں، یہ محل ظاہر شاہ کے دور میں بنائے چکے ہے ”قصرِ گل خانہ“، ہللا تھا، پھر بادشاہیت کے خاتمه کے بعد قصر صدارت کے نام سے متعارف ہوا۔ یہ محل ظاہر شاہ، محمد داؤد، نور محمد ترکی، حفیظ اللہ امین، بہرک کارمل اور ڈاکٹر نجیب اللہ کا دور دیکھ چکا ہے اور اب مجددی صاحب کے تصرف میں ہے۔ مجددی صاحب ملاقات کیلئے تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے پیشہ و خدمت کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کرسی پر پہلے وہ بیٹھا کرتے تھے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا ”خدا خیر کرے“۔ بہر حال اس تقریب میں بھی مولانا نور محمد نے پاکستانی علماء کے وفد کی ترجیحی کی اور تشكیر و تبریک کے بعد علماء پاکستان کی طرف سے ایک عرض داشت صدر افغانستان کے حضور پیش کی جس میں کہا گیا ہے کہ

1. مجاهدین کی مختلف جماعتوں کے درمیان یک جہتی اور اتحاد کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔
2. نسلی، علاقائی اور لسانی ترقی کی سازشوں سے افغانستان کو بچاتے ہوئے قوی وحدت اور ملکی سالمیت کے تحفظ کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔
3. مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور مغرب و مشرق کے اثرات سے محفوظ رہتے ہوئے خالص اسلامی نظام حکومت کی تخلیل و نفاذ کو ایت دی جائے۔

عرض داشت میں حکومت افغانستان کو یقین دلایا گیا ہے کہ جہاد افغانستان کی طرح نفاذ اسلام میں بھی علماء پاکستان مکمل طور پر افغان بھائیوں کے پشتیبان ہوں گے۔

پروفسر صبغت اللہ مجددی نے جو ای تقریب میں جہاد افغانستان کے مختلف مراحل کا ذکر کیا اور بتایا کہ انہوں نے چالیس سال قبل ظاہر شاہ کے دور میں اس مہم کا آغاز کیا تھا کہ افغانستان کو کیمیونٹ کے اثرات سے بچایا جائے، اس مقصد کیلئے انہوں نے ”جمعیت علماء محمدی“ قائم کی اور پورے ملک میں علماء کرام کو منظم کیا۔ جس دور میں داؤد خان وزیر اعظم تھے روئی وزیر اعظم خروشیف کی کابل آمد کے موقع پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور وہ ساڑھے چار سال جیل میں رہے اس دوران ایک سال انہوں نے تہہ خانہ میں گزارا اور پورا سال سورج نہیں دیکھا۔ پھر رہائی کے بعد وہ جلاوطن ہو گئے اور مختلف ممالک میں وقت گزارتے ہوئے کوپن بیگن (ڈنمارک) میں اسلامی سنتر قائم کیا اور تعلیم و تربیت کا مسلسلہ جاری رکھا۔ پھر جب افغانستان میں کمیونٹ حکومت کے خلاف جہاد کا آغاز ہوا تو وہ پاکستان آگئے اور جہاد میں شریک ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد افغانستان کا مقصد ہی اسلامی حکومت کا قیام ہے اگر ہم خدا خوستہ ایسا نہ کر سکے تو ہماری چالیس سالہ جدوجہد ضائع ہو جائے گی اس لیے ہم مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کی طرف بترجع بڑھ رہے ہیں اور عبوری حکومت کے قیام کے ساتھ ابتدائی طور پر چند اقدامات کیے گئے ہیں:

1. شراب اور منشیات پر مکمل پابندی عائد کردی گئی ہے اور بازاروں میں موجود شراب اور منشیات کے ذخیرے ضائع کر دیے گئے ہیں۔
  2. پردوے کی پابندی عائد کردی گئی ہے، چنانچہ کابل میں جہاں نوجوان عورتیں سکرت پین کربازاروں میں گھوما کرتی تھیں اب شرعی حجاب کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ اسی طرح ملازمت کرنے والی خواتین کو بھی پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ شرعی پردوے کے ساتھ کام پر آئیں۔
  3. مختلف سطح پر علماء کو قاضی مقرر کیا جا رہا ہے اور عدالتون کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق کریں۔
  4. سکولوں اور کالجوں میں کمیونٹی حکومت کا نصاب ختم کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ علماء پاکستان کی مشاورت کے ساتھ تعلیم کا اسلامی نصاب مرتب کر لیا گیا ہے جس کے مطابق کتابیں چھپ گئی ہیں اور بہت جلد سکولوں میں تقسیم کی جائی ہیں۔
  5. روس کے ساتھ کابل حکومت نے جتنے معابرے کیے تھے وہ سب منسوخ کر دیے گئے ہیں اور ہم نے انہیں تسليم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔
- انہوں نے بتایا کہ قرآن و سنت کی روشنی میں حکومتی ڈھانچے کی تشكیل کا مرحلہ ابھی باقی ہے، ہم اس کیلئے ایک کمیشن قائم کر رہے ہیں جس میں عرب ممالک اور پاکستان کے علماء کو بھی شریک کیا جائے گا اور اسلامی نظام حکومت کا ایک متفقہ ڈھانچہ تشكیل دے کر اس کی بنیاد پر افغانستان کا دستور طے کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مشرق و مغرب کے اثرات سے پاک ایک ایسے نظام حکومت کی تشكیل چاہتے ہیں جو اسلام کے مساوات، معاشرتی انصاف اور جمہوری حقوق کے اصولوں پر مبنی ہو اور ہم بہت جلد ایسا ڈھانچہ تشكیل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔
- پروفیسر صبغت اللہ مجدد کو شکوہ ہے کہ انہیں وقت بہت کم دیا گیا ہے کہ دو ماہ میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی لائبی ان کے اردو گرد کام کر رہی ہے جس کا مقصد عورتی حکومت کے سربراہ کو اس بات پر اڑ جانے پر آمادہ کرتا ہے کہ اسلام میں عورتی حکومت کا کوئی تصور نہیں ہے اور جو ایک بار اقتدار پر آجائے اسے شرعی عندر کے بغیر معزول نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بزرگ نے ان سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ امامت کے انعقاد کیلئے تمام گروہوں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ حضرت علیؑ خلافت تمام گروہوں کے اتفاق کے لغیر ہی منعقد ہو گئی تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کہنے والے افغان مجاهدین کے خیر خواہ نہیں ہیں کیونکہ ان باتوں کا تیجہ افغان مجاهدین میں اختلاف کو بڑھانے اور نتیجتاً افغان قوم کو ایک طویل خانہ جنکی کی طرف دھکلنے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

ہماری رائے یہ ہے کہ جہاد افغانستان میں حضرت پروفیسر صبغت اللہ مجدد کی شخصی اور خاندانی خدمات اور قربانیوں کے اعتزاف کے طور پر کمیونٹی حکومت سے اقتدار و صول کرنے کا جو اعزاز انہیں ملا ہے اسے تاریخ میں اعزاز کے طور پر ہی محفوظ ہونا چاہیے، اس میں وقت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ چند روز یا چند سال مزید صدر رہنے کی

بجائے اقتدار سے اپنے وقت پر معاهدہ کے مطابق عزت و قار کے ساتھ دستکش ہو جانے سے انہیں جو مقام حاصل ہو گا وہ صدارت کے رسمی منصب سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہو گا اور ہمیں امید ہے کہ جناب مجددی چند لوگوں کے غلط مشورے کو قبول کر کے اپنے اس تاریخی اعزاز کو ضائع نہیں کریں گے۔

پاکستانی علماء کی وفد کی ملاقات عالیٰ شہرت کے حامل گوریلیا کمانڈر اور عبوری حکومت کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود سے بھی ہوئی جوئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ تقریباً ہم سب کو پہلی بار اس مجاہد نوجوان کو دیکھنے کا موقع ملا جو مسلسل چودہ سال تک روس اور اس کے حواریوں کے اعصاب پر چھایا رہا ہے اور اب یونیورسٹی ایبل کر مغربی میڈیا کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ احمد شاہ مسعود نے جس دھیمنے اور منطقی انداز میں علماء کے سامنے اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کی اس نے تمام شرکاء محفل کو یہاں متاثر کیا اور اس کی توضیح و انساری اور علماء کے ساتھ عقیدت و محبت کے بلا تکلف افہارنے اس کی شخصیت کے بارے میں پائے جانے والے کئی شکوک و شبہات خود بخود تخلیل کر دیے۔ احمد شاہ مسعود کے ساتھ ملاقات کی تقریب وزارت دفاع کے ہیڈ کوارٹر میں ہوئی۔ تقریب میں مولانا نور محمد آف وانا کے علاوہ جمیعت علماء اسلام پاکستان کے نائب امیر مولانا فداء الرحمن درخواستی نے بھی خطاب کیا جن کے بارے میں اسی محفل میں اکشاف ہوا کہ وہ احمد شاہ مسعود کے اتنا زادہ ہیں۔ احمد شاہ مسعود نے خود بتایا کہ جہاد افغانستان کے آغاز سے انہوں نے رمضان المبارک کے کچھ دن خانپور میں قیام کیا اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی کو بھیایا اور شرکت کی۔ چنانچہ اپنے استاذ زادہ کو جس عقیدت کے ساتھ احمد شاہ مسعود نے رخصت کیا وہ ان کی سعادت مندی کی علامت ہے۔ تقریب کے اختتام پر احمد شاہ مسعود نے اپنی سرکاری گاڑی میں مولانا فداء الرحمن درخواستی کو بھیایا اور سرکاری گاڑی سے کہا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ ہوٹل تک چھوڑ کر آئے۔ یہ گاڑی ڈاکٹر نجیب اللہ کے زیر استعمال رہی ہے، مولانا درخواستی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ سارا راستہ نم آلودہ آگھوں کے ساتھ سمجھان اللہ سمجھان اللہ کا ورد کرتے رہے۔

احمد شاہ مسعود نے اپنے تقریب اپنے گھنٹے کے خطاب میں ان تمام سوالات کا جائزہ لیا جو ان کے بارے میں مغرب و مشرق کا میڈیا مسلسل اٹھا رہا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ہم لوگ جو سوالات کی ایک لمبی قطار ہوں میں سجائے اس محفل میں گئے تھے جب اس نوجوان کا خطاب مکمل ہونے پر ہم نے اپنے سوالات کا ترکش دیکھا تو اس میں کوئی تیر بھی قابل استعمال نہیں رہ گیا تھا۔ وزیر دفاع اور عبوری حکومت کے روح رووال انجیٹر احمد شاہ مسعود نے کہا کہ اسلامی نظام کا نماذج اور ایک مکمل اسلامی حکومت کا قائم دنیا کے ہر مسلمان کی خواہش ہے اور ہمارے جہاد کا مقصد بھی صرف اور صرف یہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد افغانستان کے دوران انہیں جن علاقوں میں کنٹرول حاصل ہواں میں باقاعدہ اسلامی حکومتیں قائم کی گئیں اور شرعی احکام نافذ کیے گئے۔ ان کا اصول یہ رہا ہے کہ معاملات کے فیصلے قرآن و سنت کے ماہر علماء کریں اور انہوں نے ہر معاملہ میں علماء سے ہمیشہ رہنمائی حاصل کی ہے حتیٰ کہ کسی قیدی کی رہائی کا فیصلہ بھی انہوں نے خود کبھی نہیں کیا بلکہ علماء کے فیصلوں پر عمل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب روئی فوجیں افغانستان سے جلی گئیں تو انہوں نے کہا تھا کہ انہی کا بل کی حکومت حاصل کرنے کیلئے دو اڑھائی برس لگیں گے اور گذشتہ سال انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اب نجیب

حکومت بے بس ہو چکی ہے اور موسم گرم شروع ہونے کے بعد ہماری پیش قدمی ہو گئی تو اس کیلئے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ باتی نہیں رہ جائے گا۔ دونوں موقع پر ان کی بات پر یقین نہیں کیا گیا لیکن عملًا وہی ہوا جوانہوں نے کہا تھا۔ پھر جب ہماری فوجی فتح کے آثار نظر آئے گے تو مغربی طاقتوں نے ریشمہ دو ایسا شروع کر دیں اور سیاسی حل کی تجویز سامنے آئی، ہم نے اسے مسترد کر دیا اور کہا کہ جو کام ہم نے جہاد کے ذریعے شروع کیا تھا اسے جہاد کے ذریعے ہی مکمل کریں گے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اسی سال ہماری کامیابی یقینی ہے اور موسم گرم کے شروع ہوتے ہی کابل ہمارے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔ مجھے تین دفعہ مخلوط حکومت بنانے اور شریک اقتدار ہونے کی پیش کش کی گئی جو میں نے مسترد کر دی۔ پھر مغربی طاقتوں کی یہ سیہ کاریاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انہوں نے مجاہدین کی بعض جماعتیں کو قوامِ متحده کے فارمولہ کے مطابق نام نہاد غیر جاندار حکومت کیلئے نام دینے پر آمادہ کر لیا اور بعض نے نام بھی دے دیے۔ ہم نے قائدین سے کہا کہ آپ ایسا نہ کریں ہم کابل کو فتح کریں گے اور کوئی سیاسی حل قبول نہیں کریں گے۔ ان حالات میں شمال کے مرکز مزار شریف میں سرکاری فوجوں میں باہمی اختلاف پیدا ہوا تو ہم نے اس سے فائدہ اٹھانے کی حکمت عملی اختیار کی تاکہ کابل کی طرف پیش قدمی کی صورت میں ہماری توجہ اس طرف سے ہٹائی نہ جاسکے۔ چنانچہ ہم نے سرکاری فوجوں کے باہمی جھگڑے سے فائدہ اٹھایا اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں ہمیں کامیابی ہوئی اور مزار شریف پر ہمارا کنٹول ہو گیا۔

احمد شاہ مسعود نے کہا کہ پھر ہم نے کابل کی طرف پیش قدمی کی اور یہ بات بتانا ضروری ہے کہ میں نے کابل کی طرف پیش قدمی سے پہلے جناب گلبدين حکمت یار کی طرف نمائندے بھیجے اور ان سے کہا کہ آپ آئیں تاکہ ہم مل کر کابل پر حملہ کریں، وہ نمائندے آج بھی موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دیں گے اور جناب حکمت یار بھی انکار نہیں کریں گے کہ ہم نے انہیں کابل پر مشترکہ حملہ کی دعوت دی جوانہوں نے قبول نہیں کی۔ چنانچہ میں نے اکیل پر چڑھائی کافیصلہ کیا اور دو طرف سے آگے بڑھتے ہوئے ہم چاریکار اور بگرام کے مقام پر کابل کے دروازے پر آگر بیٹھے گئے۔ یہاں سے کابل میں داخل ہونا ہمارے لیے مشکل نہیں تھا لیکن میں نے پشاور میں بیٹھے ہوئے قائدین سے کہا کہ آپ حضرات اجتماعی حکومت تشکیل دیں تاکہ ہم سب مل کر کابل میں داخل ہوں۔ چنانچہ میں دس روز تک چاریکار میں انتظار میں بیٹھا رہا اور جب تک پشاور میں عبوری حکومت کافیصلہ نہیں ہو گیا اس وقت تک اپنا ایک آدمی بھی کابل کی طرف روانہ نہیں کیا۔

احمد شاہ مسعود نے کہا کہ اس دوران کابل انتظامیہ کی طرف سے وزیر خارجہ عبدالوکیل میرے پاس چاریکار میں آئے اور کہا کہ میں ان کے ساتھ اقتدار میں شریک ہو جاؤں۔ میں نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور کہا کہ میں آپ کو دو دن کی مہلت دیتا ہوں کہ آپ مجاہدین کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہیں، ہم ہتھیار ڈالتے ہیں۔ میں اس موقع پر بھی کابل میں داخل دفعہ ہاتھ اٹھا کر کہا کہ ہم ہتھیار ڈالتے ہیں، ہم ہتھیار ڈالتے ہیں۔ میں اس موقع پر بھی کابل میں داخل ہو کر اپنی حکومت کا اعلان کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا خ پشاور کی طرف تھا میں وہاں کے فیصلے کا منتظر تھا اور اجتماعی قیادت کے انتظار میں تھا۔ چنانچہ جب حضرت صغیت اللہ مجددی کی سربراہی میں عبوری حکومت کافیصلہ ہوا تو قائدین کے حکم پر میں نے کابل کو جناب حکمت یار کے حملہ آوروں سے خالی کرایا اور اقتدار اجتماعی قیادت کے حوالے ہو گیا۔ لوگ آج یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کیونسوں کے ساتھ اقتدار میں شرکت کر لی ہے، میں پوچھتا ہوں کہ وہ شرکت

کدھر ہے؟ کابل میں حضرت صاحب کی حکومت ہے جو مجاہدین پر مشتمل ہے، تمام صوبوں میں مجاہدین کی حکومتیں ہیں، آپ خود تلاش کریں آپ کو وہ شرکت کہیں نظر آتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شمال اور جنوب کی جنگ ہے یا پشتون اور فارسی کا جنگ ہے اگر ایسا ہوتا تو میں کابل میں تھا داخل ہوتا اور کسی کو قریب نہ آئے دیا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ یہ نہ علاقہ کی جنگ تھی اور نہ زبان کی یہ تو اسلام کی جنگ تھی اور جہاد تھا جو کفر کے خاتمہ اور اسلام کے نفاذ کیلئے بے پناہ قربانیوں کے ساتھ منزل تک پہنچا۔ اسی لیے میں نے اجتماعی قیادت کی بات کی جس کا تجھ یہ ہے کہ آج اجتماعی قیادت آپ کے سامنے کابل میں موجود ہے اور میں بھی اس کا ایک حصہ ہو۔

انہوں نے کہا کہ دوستم ملیشیا کی بات کی جاتی ہے، آپ نے خود کابل میں گھوم پھر کر دیکھ لیا ہے کہ دوستم ملیشیا کہاں کہاں ہے؟ میں انکار نہیں کرتا کہ دوستم ملیشیا کابل میں موجود ہے لیکن اس کی تعداد پورے کابل میں اڑھائی ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور اس کی الگ کوئی کمان نہیں ہے وہ ہماری کمان میں ہے اور ہماری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ اسے بھی کابل سے کالا جاسکتا ہے لیکن میں حکمت عملی سے کام لینے کا قائل ہوں پھر میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ دیکھا! ہم نے ملیشیا کو کابل سے نکلوادیا۔ صرف اتنی بات ہے ورنہ دوستم ملیشیا یہاں کابل میں ہمارے لیے سرے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

جناب احمد شاہ مسعود نے پاکستان کے علماء کا جہاد میں پشت پناہی کرنے اور مبارک باد کیلئے کابل تشریف لانے پر شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر مولانا فداء الرحمن درخواستی نے جمعیت علماء اسلام پاکستان اور حركة الجہاد الاسلامی کی طرف سے جناب احمد شاہ مسعود کو پاکستان کے دورہ کی دعوت دی جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لی اور کہا کہ حالات بہتر ہونے پر وہ پاکستان کے عوام اور علماء کا شکریہ ادا کرنے کیلئے پاکستان کا دورہ کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری جنگ صرف اسلام کیلئے تھی اور ہم افغانستان کو ایک صحیح اسلامی انتہی ایتی ریاست بنانے کا بدھاصل کریں گے۔ ہم نے یہ جنگ علاقہ یازبان کے نام پر نہیں لڑی اور میں قسم کا ہر کہتا ہوں کہ اگر یہ جنگ شمال جنوب کی ہوتی یا پشتونفارسی کی ہوتی تو میں ایک دن کیلئے بھی اس جنگ میں شریک نہ ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ہمیشہ علماء کا احترام کیا ہے اور ان کے فیصلوں کو ترجیح دی ہے بلکہ آخری مرحلہ میں جب پشاور میں اجتماعی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں متفقہ فیصلہ میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ قائدین متفقہ حکومت قائم نہ کر سکے تو میں کمانڈروں اور علماء کا جلاس طلب کر کے ان سے کہوں گا کہ وہ مشترکہ حکومت تشکیل دیں اور میرے ساتھ کابل چل کر اقتدار سنبھالیں لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ قائدین متفق ہو گئے اور کابل میں عبوری حکومت نے اقتدار سنبھال لیا۔

جناب احمد شاہ مسعود نے کشمیر، فلسطین اور برماء کے مسلمانوں کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں اپنے مظلوم بھائی یاد ہیں اور میں کابل میں وزیر دفاع بن کر بیٹھنے سے ان مظلوم بھائیوں کے ساتھ مل کر جہاد میں شریک ہونے کو ترجیح دیتا ہوں لیکن ابھی ہماری مشکلات ہیں، ہم اپنے مسائل پر قابو پالیں تو ان بھائیوں کے ساتھ بھی ضرور شریک ہوں گے۔ ہمارے جذبات اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور حالات سازگار ہونے پر ہماری مدد اور تعاون بھی ان کے ساتھ ہو گا۔ ۳ جوں کو قافلہ کا واپسی کا پروگرام تھا لیکن ہمیں اپنا دورہ پچھ تشنہ سماجیوں ہو رہا تھا۔ ہم جناب حکمت یاد سے نہیں

مل سکتے تھے، پروفیسر عبد الرب ارسوں سیاف سے ہماری ملاقات نہیں ہو سکی تھی، جناب برہان الدین ربانی سے بھی ملاقات نہ کر سکتے تھے اور مردِ مجاهد مولانا جلال الدین حقانی کی زیارت بھی ابھی باقی تھی۔ اس لیے مولانا فداء الرحمن درخواستی، مولانا نور محمد آف وانا، مولانا سعادت اللہ خان، حاجی امیر نواز خان ایڈو وکیٹ، حاجی غلام علی اور رقم الحجوف نے مزید دو روزوہاں رکنے کا فیصلہ کیا جبکہ باقی قافلہ واپس روانہ ہو گیا۔ لیکن بدتری سے پروفیسر سیاف کی اتحاد اسلامی کے ساتھ ایران نواز شیعہ گروپ حزب وحدت کی جھنڑیں شدت اختیار کر گئیں۔ شہر میں چلتا پھرنا مشکل ہو گیا اور قائدین سے رابطے نہ ہو سکے بلکہ ہمیں یہ بتایا گیا کہ ان حالات میں ان قائدین سے ملاقاً توں کیلئے آپ کو مزید چند روز تک رکنا پڑے گا جبکہ زیادہ دنوں کیلئے قیام ہمارے لیے مشکل تھا اس لیے ان قائدین سے ملاقاً توں کیلئے دوبارہ کابل آنے کا ارادہ کر کے تشکیل کا احساس باقی رکھتے ہوئے ۲ جون کو صحیح سات بجے کابل سے روانہ ہو کر شام سات بجے پشاور واپس پہنچ گئے۔

## پاکستان کے بارے میں امریکی عزائم: وزیر اعظم پاکستان کے نام کھلا خط

مابینہ الشريعة، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بگرامی خدمت جناب پیغمبر مسیح مزاری صاحب، وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان  
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ مزاج گراہی؟

گزارش ہے کہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۳۰ اپریل ۱۹۹۳ء میں شائع شدہ آنجلاب کے ایک بیان کے حوالے سے چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کرنا اپنی دینی و قومی ذمہ داری سمجھتا ہوں، امید ہے کہ آنجلاب ان پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ آپ نے اس بیان میں پاکستان کو دہشت گردی ریاست قرار دیئے کی امریکی دھمکی پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

”ہماری حکومت کو شکر کر رہی ہے کہ امریکہ کے اس تاثر کا ازالہ کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ پشاور میں غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکی باشندوں کو کالا جارہا ہے۔“

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ پشاور میں سالہاں سال سے مقیم عرب مجاهدوں کی اچانک گرفتاریاں، حوالات میں ان پر مبینہ تشدد اور انہیں جبراً پاکستان سے نکالنے کی حالیہ کارروائی کا اصل مقصد امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اور اس سے قبل روزنامہ پاکستان لاہور کی ۱۹۹۳ء اکتوبر میں یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ پشاور میں مقیم عرب مجادلین کے خلاف کارروائی کیلئے ان کی فہرستیں حکومت پاکستان کو امریکی سفارت خانہ کی طرف سے فراہم کی گئی ہے۔ پشاور میں مقیم ان عرب مجادلین کے بارے میں، جنہیں آپ نے ”غیر قانونی طور پر مقیم“ کا خطاب دیا ہے، آپ کی

خدمت میں متعلقہ ادaroں کی طرف سے یقیناً کچھ فائلیں پیش کی گئی ہوں گی جو بیوو کریمی کی روایات کے مطابق یک طرفہ اور مخصوص تاثرات پر مبنی ہوں گی، اس لیے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو تصویر کے دوسرے رخ سے بھی آگاہ کیا جائے تاکہ اس معاملہ میں آنحضرت کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

**جناب وزیر اعظم!** یہ عرب باشندے دوچار ہفتون یا چند مہینوں سے پشاور میں قیام پور نہیں ہیں بلکہ دس بارہ سال سے اس علاقے میں رہ رہے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو افغانستان میں رو سی استعمار کے تسلط اور مسلسل جاریت کے خلاف افغان عوام کے جہاد حریت میں شمولیت کیلئے دنیا کے مختلف ممالک با خصوص عرب ملکوں سے آئے ہیں اور جہاد کے دینی جذبہ کے ساتھ جہاد افغانستان میں عملاء شریک رہے ہیں۔ یہ عرب نوجوان افغانستان یا حکومت پاکستان پر بوجہ نہیں بنے بلکہ انہوں نے اپنے ممالک سے جہاد افغانستان کیلئے بے پناہ مالی امداد فراہم کی ہے، ان میں سینکڑوں نوجوان مختلف مجاہدوں پر جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور ہزاروں مغذور ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے افراد آج بھی تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کے درمیان اختلافات کو دور کرنے اور افغانستان کی تعمیر نو میں مؤثر کردار ادا کرنے کیلئے شب و روز مسائی میں مصروف ہیں۔

عرب مجاہدین کے ان گروپوں کا پاکستان کو، عرب حکومتوں کو، اور امریکی حکومت کو شروع سے علم ہے لیکن فرق صرف یہ پڑا ہے کہ جب تک ان مجاہدین کی جدوجہد کے کچھ سیاسی مفادات امریکہ کو بھی حاصل ہو رہے تھے، ان کا وجود گوارا تھا، انہیں عرب مجاہدین کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور ان کی امداد بھی کی جاتی تھی۔ لیکن اب جبکہ ان مجاہدین کے وجود کو امریکہ عالم اسلام میں اپنے عزائم کے حوالے سے نقشان دھ تصور کرتا ہے، اچانک وہ دہشت گرد قرار پا گئے ہیں اور انہیں کچھ کیلئے امریکی حکومت کے ساتھ عرب حکومتوں اور حکومت پاکستان بھی سرگرم عمل ہو گئی ہے۔

**جناب وزیر اعظم!** جہاد افغانستان کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ افغانستان کی آزادی اور اسلامی شخص کے تحفظ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کی جنگ بھی ہے۔ اس لیے کہ آنہدی سوویت یوین کا اصل ہدف بلوجستان کے ساحل تک پہنچ کر گرم پانی کے سمندر اور تمل کے چشمتوں تک رسائی حاصل کرنا تھا، اور بلاشبہ افغان مجاہدین نے اس رویہ یلغار کے سامنے لاشون کی ناقابل تسبیح دیوار کھٹکی کر کے پاکستان کی شمال مغربی سرحد کو ہمیشہ کیلئے اس قسم کے خطرات سے محفوظ کر دیا ہے۔ پاکستان کی سالمیت کی اس جنگ میں ان عرب نوجوانوں کا خون بھی شامل ہے اور اس لحاظ سے ان کا شمار ہمارے قومی محسنوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کسی لامحہ اور مفاد کے بغیر جہاد کے دینی جذبہ کے ساتھ ہماری ملی سالمیت کی اس جنگ میں اپنے مقدس خون کا نذرانہ پیش کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی جدوجہد میں جہاد کی نئی روح پھونکنے والے اور از سر نو مسلسل جہاد فلسطین کا آغاز کرنے والے عرب نوجوان بھی اسی جہاد افغانستان کے فیض یافتہ ہیں، اور بوسنیا کے مظلوم اور بے بس مسلمانوں کو، جو گجرمولی کی طرح سرب دہشت گروں کے ہاتھوں کٹ رہے ہیں، اگر کسی نے عملی مدد فراہم کی ہے اور وہاں پہنچ کر کسی حد تک ان کے دفاع کا بندوبست کیا ہے تو وہ یہی عرب نوجوان ہیں جو ایک عرصہ تک پشاور میں ”غیر قانونی طور پر مقیم“ رہے ہیں، اور مختلف ٹیلوں سے بوسنیا پہنچ کر اپنے مظلوم اور لاچپار مسلمان بھائیوں کی ڈھال بننے ہوئے ہیں۔

جناب وزیرِ اعظم! چاہیے تو یہ تھا کہ حکومت پاکستان ان عرب مجاهدین کو اعلیٰ فوجی اعزازات سے نوازتی اور ان کی خدمات کو قومی سطح پر خراج تحسین پیش کیا جاتا۔ لیکن ہم احسان فراموشی اور ناقدری کا سب قدر اذیتک منظر دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ کے تاثر کا ازالہ کرنے کیلئے ان عرب مجاهدین کے سینوں پر ”دہشت گرد“ کامیڈل آویز اس کر دیا گیا ہے، انہیں جب اپنے پاکستان سے نکال کر ان کے سیاسی مخالفین کی حکومتوں کے حوالے کیا جا رہا ہے، جہاں جیل، تشدد اور اذیت رسانی کا ایک نیا سلسلہ ان مجاهدین کیلئے اپنے خوفناک جڑے کھولے ہوئے ہے۔

جناب وزیرِ اعظم! مجھے ان عرب مجاهدین سے زیادہ پاکستان کی فکر ہے۔ انہیں آپ مجاهدین کہیں یاد ہشت گرد کا خطاب دیں، ان کی خدمات اور مشن میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ جہاں آنحضرتی سودا بیت یونین اور ڈاکٹر نجیب اللہ کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے ہیں وہاں امریکہ اور اس کی حواری حکومتوں کی گولیاں بھی ان کے سینوں میں اس سے بڑا سو راخ نہیں کر سکیں گی۔ وہ تو ایمان اور جہاد کے جذبات سے سرشار ہیں، آزمائش کی اس بھٹی میں کندن بن کر نکلیں گے۔ لیکن تاریخ کے اتنے بڑے سُٹھ پر پاکستان کے سینے کو ”احسان فراموشی“ اور ”محسن کشی“ کے جن تعنوں سے مزین کیا جا رہا ہے، غلاظت کی ان بد نما اور بد بودار داغوں سے ہمارے سینوں کو کون صاف کرے گا؟

جناب وزیرِ اعظم! آپ نے عرب مجاهدین کے خلاف اس کارروائی کا مقصد ہے بتایا ہے کہ اس سے امریکی تاثر کا ازالہ ہو گا اور آپ کو یہ برینگ بھی شاید متعلقہ اداروں کی روپرٹوں کے ذریعے دی گئی ہے، لیکن اس غلط فہمی سے بھی آپ جس قدر جلد نجات حاصل کر سکیں ملک و قوم کے مفاد میں ہو گا۔ اس لیے کہ امریکی تاثرات اور حکومت کی خواہشات صرف عرب مجاهدین کو پشاور سے نکلنے تک محدود نہیں ہیں بلکہ اب تک پاکستان سے امریکہ کے جو مطالبات اور تقاضے ہیں الاتوائی پریس کے ریکارڈ میں آچکے ہیں، ان کی فہرست بڑی بھی ہے جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں مناسب خیال کرتا ہوں:

- امریکہ بہادر کا مطالبہ ہے کہ پاکستان اپنے ایٹھی پروگرام کو امریکہ کی مقرر کردہ حدود میں واپس لے جائے اور دفاعی مقاصد کیلئے ایٹھی تو انائی کے حصوں کے جائز حق سے کلی طور پر دستبردار ہونے کا اعلان کرے۔
- امریکہ کی مرضی ہے کہ پاکستان اپنی دفاعی افواج میں کمی کرے اور دفاعی اخراجات کو اس دائرہ تک محدود کر دے جہاں اس کیلئے بھارت کی بالادستی کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار رہے۔
- امریکہ چاہتا ہے کہ اسلامی جمہوری پاکستان کا اسلامی شخص ختم کر کے اسے ایک سیکولر جمہوریہ کی حیثیت دی جائے۔
- امریکہ کی خواہش ہے کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کے عمل کو ختم کر دیا جائے، نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والی جماعتوں کو فرقہ وارانہ قرار دے کر خلاف قانون قرار دے اور قادیانیوں کے بارے میں آئینی اور قانونی اقدامات کو واپس لیا جائے۔
- امریکہ کا پاکستان سے تقاضا ہے کہ وہ کشمیر کے بارے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کرے تاکہ وادی کشمیر کو

- ایک خود مختار ملک قرار دے کر وہاں امریکہ کا ایک بڑا فوجی اڈہ قائم کیا جاسکے جو چین، جاپان، بھارت، پاکستان اور سلطی ایشیا کے درمیان امریکی مفادات و مقاصد کا نگہبان ہو۔
- امریکہ کی مرضی یہ ہے کہ پاکستان اپنا پورا اثرورسخ افغانستان میں ایک محکم اور نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام کو روکنے کیلئے استعمال کرے، اور افغانستان میں خانہ جنگلی اور انتشار کی فضا قائم رکھنے کیلئے اسلام آباد مسلسل کردار ادا کرتا رہے۔
  - امریکہ بہادر کی منشائی ہے کہ سلطی ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاستوں کو امریکہ کے زیر اثر لانے کیلئے پاکستان ایک وفادار ایجنسٹ کا کردار ادا کرے۔
  - امریکہ بہادر مشرق و سلطی کے مختلف ممالک میں ابھرتی ہوئی اسلامی تحریکات کو اس خطہ میں اپنے مفادات اور اسرائیل کے مستقبل کیلئے خطرہ محسوس کرتا ہے، اور اس کی تمنا یہ ہے کہ ان تحریکات کو سبوتوڑ کرنے اور کچلنے کیلئے پاکستان اس خطہ کی امریکہ نواز حکومتوں کے ساتھ بھر پور تعاون کرے۔

جناب وزیر اعظم! یہ امریکی خواہشات اور تاثرات کا ایک سرسری خاکہ ہے اور ان تمام خواہشات کی تکمیل کر کے ہی آپ امریکہ بہادر سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کی حکمتی پر نظر ثانی کرے، ورنہ ان میں سے کسی ایک مسئلہ پر آپ کا اڑ جانا پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے کیلئے کافی ہے۔ جبکہ ان تمام تاثرات کے ازالہ کے بعد بھی اس امریکی ضمانت نہیں ہے کہ امریکی وزارت خارجہ کا جنوبی ایشیا یا کسی اس وقت تک پاکستان کے حوالے سے امریکی خواہشات و تاثرات کی ایک نئی فہرست تیار نہیں کر چکا ہو گا۔

اس لیے اگر آپ کی حکومت نے ”امریکہ کے تاثرات کے ازالہ“ کی مہم کا میڑا اٹھایا ہے تو میری آپ سے گزارش ہے کہ اس کی آخری حد تک کا بھی ابھی سے تعین کر لیں۔ کیونکہ ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے میرا تمہارہ یہ کہتا ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ ان حقائق سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باعث ابھی تک گولوکی کیفیت میں ہے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی اور رائے عامہ کے بیدار ہونے پر آپ پیچھے کی طرف مڑکر دیکھیں گے تو آگے جانے کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنے کے دروازے بھی آپ پر بند ہو چکے ہوں گے، اور آپ کی حکومت اپنی امریکہ نواز پالیسیوں کے ساتھ ”عبرت سرائے“ دہر رہے اور ہم میں دوستو!“ کا مصدق ابن چکی ہو گی۔

جناب وزیر اعظم! مجھے احساس ہے کہ اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہونے کی وجہ سے انداز بیان کو تجھی کی آمیزش سے محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اس پر آنجاب سے معذرت خواہ ہوں اور ایک بار پھر یہ استدعا کرتا ہوں کہ ایک باشمور مسلمان اور محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے ان حقائق کا جائزہ لیں اور ایسے کسی اقدام سے گریز کریں جو کہ ان جام کا رآپ کے لیے، پاکستان کے لیے، اور پاکستانی قوم کے لے بے وقاری اور بدنامی کا باعث ثابت ہو، بے حد شکریہ۔

والسلام

ابوعمار زاہد الرشیدی

چیزیں ورثا اسلامک فورم  
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

## جہادِ افغانستان اور وسطیٰ ایشیا کی ریاستیں

ماہنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- اگست ۱۹۹۳ء

یہ بات توبیدی ہے کہ وسطیٰ ایشیا کی آزادی جہادِ افغانستان کی رہیں مخت ہے لیکن یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ روس نے اس خط میں آزادی کے نام پر وہی کھیل کھیلا ہے جو اس سے قبل برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ اپنے زیر تسلط مسلم ممالک کو آزادی دیتے وقت کھیل چکے ہیں کہ ان ممالک پر آزادی کا لیبل لگ جائے لیکن ان کا نظام اور حکمران طبقہ وہی رہیں جو استعماری قبضہ کے دوران تھے۔ گذشتہ نصف صدی کے دوران آزاد ہونے والے مسلم ممالک پر نظر ڈال لیں آپ کو یہی صورت حال نظر آئے گی۔ ان ممالک میں نہ نظام بدلائے ہے، نہ معاشرتی زندگی میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ حکمران طبقہ تبدیل ہوئے ہیں۔ اور یہ مسلم ممالک انقلاب کے ایک ایسے عجیب و غریب تصور سے روشناس ہوئے ہیں کہ قومی اور معاشرتی زندگی میں کوئی عملی تبدیلی آئے بغیر ان پر آزادی اور انقلاب کا خوشنا میں چسپا کر دیا گیا ہے۔ خدا جانے کہ ایسے موقع پر میرے ذہن میں ”شراب کی بوتل پر زمزم کالیبل“ کاجاورہ بار بار کیوں گردش کر رہا ہے؟ شاید اس لیے کہ ابھی تک اس کے علاوہ کسی اور عملی تبدیلی کا ادراک نہیں کر پایا۔ بہر حال وسطیٰ ایشیا کی مسلم ریاستوں کی آزادی بھی اس عمل کا تسلسل ہے جس سے اکثر مسلم ممالک گذشتہ نصف صدی کے دوران دوچار ہو چکے ہیں اور یہ بات دن بدن اور زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے کہ افغانستان کے مسئلہ پر جنیوا مدد اکرات کے دوران روس اور امریکہ کے درمیان اس بات پر خنیہ مفاہمت ہو گئی تھی کہ اگر وسطیٰ ایشیا کے معاملات کو کابل میں اسلامی نظریاتی حکومت کے قیم و استحکام کے بعد تک مؤخر کر دیا گیا تو وسطیٰ ایشیا کی مسلم ریاستوں میں آزادی کا عمل مذہبی اور نظریاتی حوالوں سے منظم ہو گا جو امریکہ اور روس دونوں کیلئے خطرناک ہو گا۔ اس لیے کابل پر مجاہدین کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی وسطیٰ ایشیا کے مسلم ممالک کے عوام کو آزادی کا ”لوی پاپ“ دے دیا جائے تاکہ سیکولر نظام اور سکولر حکومتوں کا تسلسل قائم رہ سکے۔

## صومالیہ: مشرقی افریقہ کا افغانستان

ماہنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۳ء

سوویت یوینین کی شکست و ریخت کے بعد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کیونزم کے تارو پود بھرے تو اس عمل سے صومالیہ بھی متاثر ہوا جو افریقہ کا ایک مسلمان ملک ہے۔ آبادی ایک کروڑ سے زائد بیان کی جاتی ہے اور یہ ملک کئی اعتبار سے

افغانستان سے مشاہدہ رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ صومالیہ مشرقی افریقہ میں داخلہ کا دروازہ ہے اور اس کی بندگاہ موغادیشو کو علاقہ میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اور اس طور پر بھی کہ آبادی کی غالب اکثریت مسلمان ہے جس کی اسلام کے ساتھ وابستگی اس قدر گہری ہے کہ مسیحی تبلیغ کے مشنری ادارے اس خط کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں واضح ناکامی محسوس کرتے ہوئے اپنے کمی مشن بند کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ پھر افغانستان کی طرح صومالیہ کا معاشرہ بھی قبائلی طرز کا ہے جس میں باہمی کشمکش بسا اوقات خانہ جنگی کی افسوسناک صورت اختیار کر لیتی ہے اور سب سے بڑھ کر صومالیہ کے علماء بھی ”ہتھیار آشنا“ ہیں اور حالیہ کشمکش میں ان کے کمی مسلح گروپ بر سر پیکار ہیں۔

صومالیہ غلامی کے دور میں تین حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک پر برطانیہ کی عملداری تھی، دوسرا حصہ فرانس کے قبضہ میں تھا، جبکہ تیسرا پر اٹلی کی آفیلی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ آزادی کے بعد برطانوی و صومالی لینڈ نے مشترکہ جمہوریت قائم کر لی جبکہ فرانسیسی صومالیہ بدستور الگ حیثیت رکھتا ہے۔ صومالیہ کا اکثر علاقہ بخیر ہے، کچھ حصہ کاشت ہوتا ہے، کیلا زیادہ پیدا ہوتا ہے، مولیعیوں اور کھالوں کی تجارت بھی ہوتی ہے، اور اب کچھ معدنی ذخائر اور تیل کا سراغ لگا ہے جو ابھی تحقیقی و تجزیہ کے مرحلہ میں ہے۔

بہادر افغانستان کے ہاتھوں سوویت یونین کی پسپائی کے وقت صومالیہ پر سید بارے کی حکومت تھی جو بائیں بازو کے لیڈر اور مشرقی افریقہ میں روی مفادات کے نگہبان کے طور پر متعارف ہیں۔ کلمہ جب تک مضبوط رہا ان کی حکمرانی کا سکھ چلتا رہا مگر سوویت یونین کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد سید بارے کیلئے بھی اقتدار کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا اور صومالیہ خانہ جنگی کی راہ پر چل پڑا۔ خانہ جنگی میں سید بارے کی فوج کے ایک بڑے افسر جزل محمد فرج عدید اور علی محمد نے قوت کپڑی اور اقتدار کی کشمکش نے قبائلی خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ خانہ جنگی نے ملک کی جو تھوڑی بہت پیداوار تھی اسے بھی متنازع کر دیا جس کے نتیجے میں قحط سالی اور بھوک نے صومالیہ کو لپیٹ میں لے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین لاکھ کے لگ بھگ افراد اس خانہ جنگی اور قحط کی بھینٹ چڑھنے ہیں۔ اقوام متحدة نے صومالیہ کے عوام کو خانہ جنگی اور قحط کے اثرات سے بچانے کیلئے مدد اخالت کا فیصلہ کیا اور مشترکہ فوج وہاں اتاری جس میں پاکستانی فوج کے دستے بھی شامل ہیں۔ اقوام متحده کی فوج کو صومالیہ میں جزل فرج عدید کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جن کا گروپ اس خانہ جنگی میں سب سے بڑے اور طاقتور گروپ کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ پاکستان کے فوجی دستوں سے بھی اس گروپ کی جھڑپ ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں طرفین کے متعدد افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ جزل عدید نے اقوام متحدة کی فوج کی آمد کو صومالیہ کے معاملات میں امریکی مدد اخالت قرار دیتے ہوئے اس کی مزاحمت کی اور حالات پر اپنی گرفت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ حتیٰ کہ اب امریکہ ان کا وجود تسلیم کرتے ہوئے مذکورات کی میز پر ان سے مذاہدہ کیلئے پیش رفت کر رہا ہے۔

اسی دوران صومالیہ کے مذہبی گروپ بھی متحد ہو گئے جو اس سے قبل الگ الگ تحرک تھے۔ یہ بھی مسلح کشمکش میں شریک ہیں اور اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے کیلئے سرگرم عمل ہیں۔ ان کا ہدف یہ ہے کہ صومالیہ کو ایک اسلامی نظریاتی ریاست کی حیثیت دے دی جائے جبکہ فرج عدید ایک سیکولر اور قوم پرست رہنمایا ہیں۔ صومالیہ کے مذہبی گروپوں کا موقف یہ ہے کہ اس صورتحال میں پاکستانی فوج کے دستوں کا وہاں بھیجا جانا درست نہیں ہے بلکہ صوص ایسے حالات میں کہ پاک

فوج کو صومالیہ کے مختلف گروپوں کے ساتھ تصادم کیلئے بقول ان کے ایک ایسی حکمت عملی کے تحت استعمال کیا جا رہا ہے جس سے پاکستان کے بارے میں صومالیہ اور افریقہ کے مسلمانوں کا محبت و اعتماد کارشٹہ کمزور ہو رہا ہے اور پاکستان کے بارے میں شکوک و شہہرات جنم لے رہے ہیں۔ صومالیہ کے علماء اور دینی رانہماوں نے اس سلسلہ میں پاکستان کی دینی جماعتوں کے قائدین کو پیغامات بھجوائے اور خطوط ارسال کیے کہ ان کے موقف سے آگاہی حاصل کی جائے اور ان کی مشکلات کو کم کرنے میں تعاون کیا جائے۔

اس پس منظر میں ۱۹ نومبر ۱۹۹۳ء کو جناب مجیب الرحمن شامی مدیر زندگی لاہور، مولانا عبد الرؤوف ملک سیکرٹری جزл متحده علماء کوئسل، اور مولانا محمد مسعود اظہر سیکرٹری جزل حرکت الانصار کے ہمراہ نیروی جانے کا اتفاق ہوا جہاں ہمارا قیام تین روز تک رہا۔ نیروی مشرقی افریقہ کے ملک کینیا کا دارالحکومت ہے جو صومالیہ کے جنوب میں واقع ہے اور صومالیہ کے داخلی حالات محدود ہونے کے باعث وہاں سے رابطہ کیلئے قریب ترین مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ کینیا ہمارے ہاں چائے کے حوالے سے متعارف ہے کیونکہ وہاں کی سب سے بڑی پیداوار چائے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں استعمال ہونے والی کل چائے کا پچاس فیصد کے لگ بھگ حصہ کینیا سے آتا ہے۔ خط استوا کے قریب ہونے کی وجہ سے دن اور رات کا تناسب تقریباً سارا سال یکساں رہتا ہے اور سورج کے طلوع و غروب کے اووقات میں زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ مگر سطح سمندر سے بلندی پر ہونے کے باعث گرمی زیادہ نہیں پڑتی، معتدل موسم رہتا ہے اور بارش بھی اکثر ہوتی رہتی ہے۔ اس طرز سے نیروی کا موسم پسند آیا کیونکہ موسم کا سارا سال اعتدال میں رہنا اور دن رات کے اووقات کا توازن بھی قائم رہنا اس سے قبل کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔

کینیا کی آبادی دو کروڑ کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کا تناسب تیس فیصد بیان کیا جاتا ہے۔ اندیا اور پاکستان سے آگر بس جانے والے مسلمانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ نیروی کے وسط میں مغل طرز تعمیر کی جامع مسجد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، یہ وضع مسجد ۱۹۲۵ء میں تعمیر ہوئی جس کے ساتھ ایک بڑا اسلامک سنٹر ہے جہاں مسلمانوں کی فلاخ و بہبود اور تعلیم کے امور کی نگرانی کی جاتی ہے۔ وہیں فیصل آباد کے مولا ناطق الرسول سے ملاقات ہوئی جو حضرت اسید مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے شاگرد ہیں اور ایک عرصہ سے نیروی میں مقیم ہیں بلکہ اب تو وہاں کے شہری ہیں اور مسلمانوں کی دینی تعلیم، دعوت اسلام اور نوجوانوں کے فلاحی امور کی طرف ہم تج رہتے ہیں۔ نیروی سے باہر بھی ایک تعلیمی ادارہ انہوں نے قائم کر کھا ہے جو اپنے مقاصد کی طرف کامیابی کے ساتھ گامزن ہے۔ وقت کی کمی کے باعث وہ ادارہ نہ دیکھا جاسکا مگر اس کی کارکردگی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے بے حد مسرت ہوئی۔

کینیا بھی ہماری طرح برطانوی استعمار کی نوآبادی رہا ہے اس لیے بود و باش اور عام طرز زندگی میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا۔ البتہ عام زندگی اور دفتری زندگی میں نظم کی صورت حال ہم سے بہتر نظر آئی۔ کینیا کا سکھ شانگ کھلاتا ہے۔ جس روز ہم وہاں پہنچے نیروی ایئر پورٹ پر کرنی کے تباولہ میں ایک امریکی ڈالر کے عوض ۶۵ شانگ ملے۔ گویا پاکستانی روپے کے مقابلہ میں کینیا کا شانگ تقریباً نصف قیمت کا حامل ہے۔ پہلی رات ہمیں وسط شہر کے ایم بسڈر ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا جس کا کراچی پینتالیس ڈارفی کمرہ تھا گردو سرے روز اپنے میزانوں کے ساتھ رابطہ و ملاقات کی سہولت کے پیش نظر

ملیمانی روٹ کے ہرن کورٹ ہوٹل میں منتقل ہو گئے جس کا کرایہ ۳۱۰ امری کمرہ تھا۔ ہوٹل کچھ زیادہ معیاری نہ تھا مگر میزبانوں کے ساتھ رابطہ کی سہولت کے باعث ہم بقیہ دودن و بیس ٹھہرے۔

اس ہوٹل میں ایک پاکستانی نوجوان سے ملاقات ہوئی جو کافی دنوں سے وہاں قیام پذیر تھا۔ اس نے اپنے قیام کا مقصد کار و بار بتایا مگر معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ اور پاکستانی نوجوان بھی ہیں جو بہت دنوں سے اس قسم کے ہوٹلوں میں مقیم ہیں۔ یہ وہ نوجوان ہیں جو امریکہ اور یورپ جانے کے شوق میں ٹریول ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو انہیں مختلف راستوں سے منزل مقصود تک پہنچانے کیلئے فن کا مکال دکھاتے ہیں۔ میں اس قسم کے نوجوان بڑی تعداد میں استنبول اور تاشقند میں بھی دیکھا ہوں۔ ان میں سے بہت سے نوجوانوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ایجنت اپنے میپے کھرے کر کے انہیں اسی قسم کے کسی درمیانی منزل پر چھوڑ کر رفوچکر ہو جاتے ہیں اور وہ ”پائے رفتہ نہ جائے ماند“ کے مصدق اپنی قسمت کو کوستے رہتے ہیں۔

ایمیڈر ہوٹل سے ملیمانی ہوٹل منتقل ہوتے وقت جس ٹیکسی سے ہم نے سفر کیا اس نے اپنے وطن کے ساتھ مشابہت کے احساس کو اور زیادہ اجاگر کر دیا۔ ٹیکسی شکل و صورت کے لحاظ سے برطانوی تھی کہ اسی قسم کی ٹیکسیاں وہاں چلتی ہیں۔ اسے دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید اس معاملہ میں کینیا والے ہم سے کچھ آگے ہیں لیکن ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اطمینان کی ہیں۔ ایک لہر دل و دماغ پر چھاگئی کہ خیر ہے معاملہ اپنے جیسا ہی ہے۔ یعنی صرف اپر کا خول اور باڑی انگش تھاباتی سب کچھ اپنی طرح کا ہی تھا۔ ہمارے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے ار گرد کھڑے کچھ لوگوں کو اشارہ کیا اور وہ گاڑی کو دھکا دینے کیلئے متھر ک ہو گئے۔ یہ ٹیکسی ہمارے اجتماعی نظام کی ہو ہو تصور ہے کہ ظاہری ڈھانچہ مغربی طرز کا لیکن اندر سے پوری مشینزی دھکا شارٹ۔ جبکہ دھکا لگانے والے بھی ورلڈ بینک کے ڈائریکٹروں کی طرح ہماری بے بی پر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے، آپس میں اشارے کر رہے تھے اور ہمیں دھکا دے رہے تھے۔ خدا اکار کے گاڑی اسٹارٹ ہوئی لیکن چند قدم چلی اور اچانک رک گئی۔ معلوم ہوا کہ گاڑی میں تیل ہی نہیں تھا اور ڈرائیور کسی طرح اللہ توکل پڑھوں پہ پٹھنخ جانا چاہتا تھا مگر پڑھوں پہ سے چند قدم پیچھے ”دوچار ہاتھ جبکہ لب با م رہ گیا“ گاڑی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ڈرائیور ٹیکسی سے اڑا، ڈگی سے ایک خالی ڈبہ نکلا اور پڑھوں پہ کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے پڑھوں لا کر گاڑی میں ڈالا اور پھر دھکا شارٹ کے مرحلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ دھکا لگانے والے ہیں بھی آسانی سے مل گئے ہمیں نہیں اڑنا پڑا۔ مگر اب کیفیت یہ تھی کہ گاڑی میں ہم لوگ تشریف فرماتھے، کچھ لوگ گاڑی کو دھکا دے کر اسٹارٹ کرانے کی کوشش کر رہے تھے اور دنوں طرف چھوٹے چھوٹے افغانی بچے ساتھ ساتھ چلے چاہ رہے تھے جو اپنی زبان میں ہم سے سوال کر رہے تھے اور کچھ نہ ملنے پر ہمارا منہ چڑا رہے تھے، دانت نکوس رہے تھے اور عجیب و غریب اشارے کر رہے تھے۔ اس شان و شوکت کے ساتھ ہمارا جلوس نیروں کے ایک کھلے بازار میں فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ تو چلا ہی ہو گا مگر جب انگش گاڑی نے ہم ایشیائیوں کو افریقہ میں ساتھ لے کر آگے بڑھنے سے انکار کریا تو ڈرائیور نے ایک اور ٹیکسی والے سے ہمارا سوادا کر کے ہمیں اس میں منتقل کر دیا اور خدا کا کرکے ہم ہرن کورٹ ہوٹل پہنچے۔ دوسری ٹیکسی بھی انگش طرز کی تھی لیکن کچھ شریف انسل لگتی تھی اس نے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے بعد جتنے دن ہم وہاں رہے انگلش نیکسی سے واسطہ نہیں پڑا۔ جمعہ کی نماز ہم نے اسی جامع مسجد میں ادا کی جس کا ذکر چہلے ہو چکا ہے۔ امام صاحب نے مقامی زبان میں خطاب کیا۔ کینیا کی مقامی زبان سوالی ہے لیکن انگریزی بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ امام صاحب کی زبان تو ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی البتہ فنگتوکا مفہوم ہم مجبی سمجھ رہے تھے۔ ان کا موضوع عالم اسلام کی حالت زار تھا، انہوں نے فلسطین اور افغانستان کا ذکر کیا، عالم اسلام کے اتحادی کی ضرورت پر زور دیا اور مغربی ممالک کے تسلط و بالادستی سے نجات کے احساس کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ مولا ناطق الرسول کے دفتر میں امام صاحب سے ہماری ملاقات بھی ہوئی، اسلام کی بالادستی اور عالم اسلام کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والے مغلب بزرگ ہیں اور ملتِ اسلامیہ کے احوال پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد کے گیٹ پر کچھ پاکستانی احباب مل گئے۔ جناب محبوب الرحمن شاہی ہمارے ملک کے معروف صحافی اور کالم نگار ہیں، روزنامہ جنگ میں ”جلدہ عام“ کے عنوان سے ان کا کالم قاریئن کا وسیع حلقة رکھتا ہے، نیروپی میں بھی انہیں دیکھ کر پچانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ چنانچہ اس حوالے سے متعدد حضرات سے ملاقات ہوئی جن میں پاک فوج کے ایک افسر بھی تھے۔ وہیں ڈاکٹر فاروق صاحب سے ملاقات ہوئی جو گوجرانوالہ میں ہمارے محلہ اینکن آبادی گیٹ کے رہنے والے ہیں اور ایک عرصہ سے نیروپی میں مقیم ہیں۔ ان کے ایک عزیز ریاضر مسجد محمد علی بہٹ چند روز قبل نیروپی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہیں۔ یہاں قتل اور ڈاکہ زندگی اور داتیں عام ہیں، راہ چلنے لوگوں سے سامان اور رقم چھین لینا عام معمول ہے۔ پولیس کے سپاہی بڑے بڑے ڈنڈے اٹھائے ہر وقت گھومتے رہتے ہیں مگر وارداتیں بھی ہوتی ہیں۔ محمد علی بہٹ مر جنم نیروپی میں ایک ہوٹل چلا رہے تھے، شام کے وقت ہوٹل سے باہر نکلے تو ڈاکوؤں نے انہیں گولی مار دی اور گاڑی چھین کر فرار ہو گئے، ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

نیروپی میں ہماری ملاقات راؤ محمد اختر صاحب سے بھی ہوئی۔ یہ پاکستانی بزرگ ہیں جو ایک عرصہ سعودی عرب میں رہے ہیں اور اب نیروپی میں ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی سے بھی تعلق ہے اور نیروپی میں ایک رفاقتی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری واپسی کے روز اپنی رہائش گاہ پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا اور پھر ایک پورٹ پر چھوڑنے آئے بلکہ جہاز پر سوار ہونے تک ساتھ رہے۔ ان کا خصوصی ذوق مساجد کا قیام ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کینیا کی حکومت مسلمانوں کو مسجد کیلئے جگہ بلا معاوضہ دیتی ہے اور اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کینیا کے مختلف حصوں میں مسجدیں بنانے کچے ہیں۔ راؤ محمد اختر صاحب کے ساتھ ملاقات بڑی معلومات افراہی۔

پاک فوج کے بعض افسروں کے علاوہ صومالیہ کی مسلح تنظیموں کے نمائدوں، جامع مسجد نیروپی کے امام صاحب، اور صومالیہ کے معاملات میں دلچسپی رکھنے والے بعض عرب راہنماؤں سے بھی ملاقات ہوئی جن کے ساتھ صومالیہ کے حالیہ تنازعہ کے حوالے سے تفصیلی گفت و شنید ہوئی۔ ان ملاقاتوں اور سفر کے دیگر مشاہدات کے حوالے سے کم از کم میرے تاثرات بھی ہیں کہ صومالیہ کے دینی حلقوں کے اس موقف کو بے وزن قرار دینا مشکل ہے کہ امریکہ نے صومالیہ میں اپنے مقاصد کیلئے اوقام مقتدہ کی چھتری استعمال کی ہے اور پاک فوج کو جان بوجھ کر ایسا کاردار دیا جا رہا ہے جس سے پاکستان اور افریقی مسلمانوں کے درمیان محبت کے رشتے کمزور ہوں اور شکوہ و منافت کی فضائیہ ہو۔ ان کے بقول امریکہ صومالیہ کے ذریعے مشرقی افریقہ کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہے، سوڈان اور ایتھوپیا کی اسلامی تحریکات کو دبانا چاہتا ہے، صومالیہ کو

ایک نظریاتی اسلامی ریاست بننے سے باز رکھنا چاہتا ہے، اور موقع تیل اور معدنی ذخائر کا کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صومالیہ کے دینی راہنماؤں کا کہنا ہے کہ پاکستان اور اس کی فوج کو ان امریکی مقاصد کیلئے آہ کار نہیں بننا چاہیے اور اپنے موجودہ کروار پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ صومالیہ کے دینی راہنماؤں کا یہ موقف سنجدہ توجہ مُستحق ہے اور حکومت پاکستان، حزب اختلاف اور مذہبی راہنماؤں کو اس صورت حال کا پوری ممتازت کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

## افغانستان میں عالمِ اسلام کی آرزوؤں کا خون

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فوری ۱۹۹۳ء

افغانستان میں روئی استعمار کے تسلط کے خلاف غیر افغانوں نے جہاد کے مقدس عنوان پر علم بغاوت بلند کیا تو دنیا کے دینی حلقوں میں جوش و جذبہ کی ایک لہر دوڑ گئی کہ جہاد کا بارکت عمل جو ایک عرصہ سے مغربی استعمار کی سازشوں کے باعث ملتِ اسلامیہ کی عملی زندگی سے نکل چکا تھا ایک بار پھر نظریاتی بنيادوں پر سفرِ نو کا آغاز کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد افغانستان کے دوران نہ صرف پورے عالمِ اسلام کے دل افغان مجاهدین کے ساتھ دھڑکے بلکہ دنیا کے ہر خطہ سے پر جوش مسلم نوجوانوں نے افغانستان کی سر زمین پر پہنچ کر اس جہاد میں عملًا حصہ لیا اور اس طرح جہاد افغانستان عالمِ اسلام کی نظریاتی بیگنی اور دینی تحریکات میں وحدت واشرٹاک کے عنوان کے طور پر دنیا بھر کی توجہات کا مرکز بن گیا۔

جہاد افغانستان کی کامیابی اور کابل میں مجاهدین کی مشترک حکومت کے قیام کے بعد دنیا بھر کی اسلامی تحریکات کو یہ امید تھی کہ اب افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہو گی اور مجاهدین کی جماعتیں اور قائدین مل جل کر افغانستان کی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ اسلام کے عادلانہ نظام کا ایک مثالی عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے جو دیگر مسلم ممالک میں نفاذِ اسلام کی تحریکات کے عزم و حوصلہ میں اضافہ کا باعث ہو گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، بعض افغان راہنماؤں کی ناقبتِ اندیشی اور ہوسِ اقتدار نے عالمِ اسلام کی آرزوؤں کا سر بازارِ خون کر دیا ہے اور کابل کی خوفناک خانہ جنگی نے دنیا بھر کی دینی تحریکات کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔

یہ درست ہے کہ اس خانہ جنگی کے پس منظر میں یہ ورنی لا بیاں کام کر رہی ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس وقت دنیا کا واحد ٹھیکیدار امریکہ افغانستان کے مختلف گروپوں کے پاس موجود اسلحہ کی بھاری مقدار کو کابل کی مشترکہ کمان کی تحریک میں نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ اس کے خیال میں اس صورت میں کابل اس قدر طاقتور ہو جائے گا کہ ارڈر کی دیگر ریاستوں پر اثر انداز ہو سکے گا۔ اس لیے امریکہ اس اسلحہ کو خانہ جنگی میں اسی طرح ضائع کر دنیا چاہتا ہے جس طرح اس نے ایران میں اپنا چھوڑا ہوا اسلحہ عراق ایران جنگ کی صورت میں ضائع کر دیا تھا۔

اسی طرح امریکہ افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے عملی نفاذ کو بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے کیونکہ یہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں کی ناکامی کے بعد عالمِ اسلام اور اسلام کے عادلانہ اور متوازن فلاجی

معاشرہ کا آغاز ہو گا جسے آگے بڑھنے سے روکا نہیں جاسکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ چند ماہ قبل جزل رشید و ستم کے دورہ امریکہ کے موقع پر حکمت عملی یہ طے کر لی گئی تھی کہ یا تو جزل و ستم کے اشتراک کے ساتھ کابل میں ایک ڈھلی ڈھالی حکومت بنو دی جائے اور یا پھر افغانستان کو تقسیم کر کے وسطی ایشیا کی نوازد مسلم ریاستوں اور افغانستان کے درمیان ایک نئی براہ اسٹریٹ فائم کرو دی جائے تاکہ کابل کی حکومت ان ریاستوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ ساری باتیں تسلیم، مگر سوال یہ ہے کہ اس سب کچھ کیلئے آئندہ کارکون ہے اور امریکہ ان مقاصد کیلئے استعمال کسے کر رہا ہے؟ پروفیسر بہان الدین رباني، انجینئر حکومت یار اور انجینئر احمد شاہ مسعود اگر اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر اس سوال کا جواب تلاش کر سکیں تو یہ ان کا پوری امت پر احسان ہو گا۔

اس ساری صورتحال اگر کوئی بات کسی حد تک اطمینان نہیں ہے تو وہ یہ ہے کہ اس افسوسناک خانہ جنگی میں علماء کی جماعتیں برادری شریک نہیں ہیں اور افغان مسلمانوں کا بے مقصد اور بے گناہ خون بہانے کے اس شرمناک عمل میں مولانا محمد بنی محمدی، مولانا محمد یونس خالص، مولانا جلال الدین حقانی، اور مولانا ارسلان رحمانی کا نام سامنے نہیں آ رہا۔ گویا اس کشمکش میں دینی مدارس کی تبیت یافتہ قیادت کا کردار نسبتاً متوازن اور معتدل ہے۔ لیکن ان چاروں بزرگوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ افغان مجاهدین کی خانہ جنگی میں ان کا فرقی کے طور پر سامنے نہ آتا ایک اچھا عمل ہے جس پر وہ بلاشبہ تحسین کے متعلق ہیں لیکن یہ کردار کافی نہیں ہے۔ انہیں خانہ جنگی کو رکونے کیلئے مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنا چاہیے اور آگے بڑھ کر ان لوگوں کو ان کے مقنی طرز عمل کے سنگین نتائج کا احساس دلانا چاہیے جو محض شخصی انا یا گروہی تزییفات کی خاطر شعوری یا غیر شعوری طور پر عالمی استعمار کا آئندہ کارہنگ کر افغانستان کو تباہ کرنے پر قتل گئے ہیں۔

## دافعی بحث میں کمی: قومی خودکشی کے مترادف

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — مئی ۱۹۹۵ء

ان دونوں عامی طاقتوں اور اداروں کی طرف سے پاکستان کو مسلسل یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کرے اور جدید ہتھیاروں کی تیاری سے گریز کرنے کے علاوہ فوج کی تعداد بھی لگھائے۔ خود ہمارے بعض دانشور بھی اسی خیال کا اظہار کر رہے ہیں اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی اور خوشحالی کیلئے دفاعی اخراجات کو کم سے کم کرنا ضروری ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے حضرات دو بالوں کو بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ 1. ایک یہ کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اور اس ناتے سے اسے دنیا بھر کی اسلام دشمن قوتوں سے خطرہ ہے،

2. دوسری یہ کہ پاکستان کا سابقہ بھارت سے ہے جس کی نگر نظر ہندو اکشیت کے ساتھ مسلمانوں کی گذشتہ ایک ہزار برس سے مسلسل مجاز آ رہی ہے۔ اور کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے تب بھی اس تاریخی پس منظر کے

ہوتے ہوئے اس کشیدگی اور حماد آرائی کا ختم ہونا ممکن نہیں ہے۔

ان تاریخی حقوق کے ہوتے ہوئے پاکستان کو دفاعی اخراجات میں کمی اور فوج کو گھٹانے کا مشورہ یقیناً پاکستان کی خیر خواہی نہیں ہے۔ پھر اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ مشورہ اسلامی تعلیمات کے بھی یکسر منافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

”دشمن کے مقابلہ میں جتنی قوت تمہارے بس میں ہو مہیا کرو تاکہ دشمن پر تمہارا رب قائم

رہے۔“ (سورۃ الانفال)

گویا حکم خداوندی کا منشاء ہے کہ مسلمانوں کی دفاعی قوت اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ دشمن کے مقابلہ میں طاقت کا توازن ان کے حق میں ہو کیونکہ اس کے بغیر دشمن پر رب قائم ہونا اور دشمن کا مسلمانوں کی قوت سے مرعوب ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت اس امر پر تتفق ہیں کہ جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری اور مکمل دفاعی یقیناً لوگی کا حصول مسلمانوں کے دینی فرائض میں سے ہے اور اس معاملہ میں کوتاہی کر کے مسلمان حکومتیں اپنی شرعی ذمہ داری سے کوتاہی کی مرتبک ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر بھی اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو اس معاملہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ

”اور اللہ کی راہ میں خرج کرتے رہو اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“ (سورۃ البقرۃ)

اس آیت کریمہ کی تشریح میں امام ترمذیؓ نے صحیح سنڈ کے ساتھ ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ملک کی عمومی اقتصادی صور تحال اور دفاعی اخراجات کے درمیان توازن و تناسب کے سلسلہ میں اسلام کے مزاج اور بہایات کا پتہ چلتا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ معروف صحابی حضرت ابوالیوب анصاریؓ جو رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے موقع پر مسجد نبویؓ اور اس کے ملکہ حبیبہؓ کی تعمیر تک رسول اکرمؐ کے میزان رہے، اور حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں اس وقت کی ایک بڑی قوت سلطنت روما کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے شوق میں بڑھا پے اور ضعف کے باوجود اصرار کر کے لشکر میں شامل ہوئے، ان کی قبررومی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطینیہ (اینیول) میں ہے۔ وہ رومیوں کے خلاف جنگ کے دوران ایک حماد پر تھے جہاں مسلمانوں اور رومیوں کا آمنا سامنا ہوا اور ایک پر جوش مسلمان مجاهد مسلمانوں کی صفائح سے نکل کر اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس گیا جس پر کسی صاحب نے قرآن کریم کی یہ آیت بلند آواز سے پڑھی ولائقہ بادیکم الی التھلکة کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس نوجوان نے اکیلے دشمن کی صفوں میں گھس کر غلطی کی ہے جو اس آیت کریمہ کی منشأ کے خلاف ہے۔

حضرت ابوالیوب انصاریؓ بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے لوگوں کی زبان سے اس آیت کریمہ کا حوالہ سن کر ان کو ٹوکا اور فرمایا کہ تم نے آیت کا مطلب صحیح نہیں سمجھا کیونکہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیت ہم انصار مدینہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس میں ہمیں ایک غلط سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابوالیوب انصاریؓ نے اس کا

پس منظروں بیان فرمایا کہ جناب رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم جب بھرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہم انصار مدینہ سب کچھ چھوڑ چھالا کر آپ کی نصرت و رفاقت میں مصروف ہو گئے۔ بھرت کے دوسرے سال ہی غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مسلسل چند برس ایسے گزے کہ ہم اپنے کاروبار، کھیتی باڑی اور معاشی حالات کی طرف توجہ نہ دے سکے جس سے ہماری معاشی صورتحال ناگفتہ ہو گئی۔ لیکن چند برسوں کے بعد جب مسلمان مضبوط ہو گئے اور کفار کی پے در پے شکستوں کے باعث کچھ استحکام کی صورتحال نظر آنے لگی تو بعض انصار نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب حالات خاصے بدلتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری اس طرح کی مدد کی ضرورت نہیں رہی اس لیے ہمیں جہاد کے معاملات سے قھوڑا صرف نظر کر کے اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور کھیتی باڑی اور کاروبار کے معاملات کی طرف دوبارہ متوجہ ہونا چاہیے۔ اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی کہ

”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کوہلاکت میں نہ ڈالو۔“

اس لیے اس آیت میں ہم انصار مدینہ کو اس سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے اور اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ آیت کریمہ کے مطابق ہلاکت کا راستہ یہ ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیا جائے جس کا نتیجہ لازماً یہ ہو گا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہو گی اور طاقت کا توازن دشمن کے ہاتھ میں چا جائے گا۔

حضرت ابوالیوب انصاریؓ کی اس وضاحت کے ساتھ یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں معاشی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ فوجی اور دفاعی قوت کا توازن و تنااسب اس طور پر قائم رکھنا ضروری ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں فوجی قوت کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی فوجی قوت میں کسی کرنا قرآن کریم کی زبان میں ”قومی خودکشی“ کہلائے گا۔

اس پس منظر میں جب ہم آج پاکستان کو درپیش صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف عالمی سازشوں اور بھارت کی فوجی طاقت میں مسلسل اضافو پر نظر ڈالتے ہیں تو یقیناً پاکستان کی فوجی قوت میں کسی کے مشورے وطن عزیز کے مفاد کے منافی دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے مذکورہ بالادونوں احکام یعنی وقت کی جدید ترین فوجی قوت کے حصول کا حکم اور فوجی اخراجات میں کسی کوہلاکت کا راستہ قرار دینا ہماری فوجی اور دفاعی پالیسی کو واضح طور پر یہ رخ دیتے ہیں کہ ہم دفاع کیلئے ایسی قوت کے حصول کی کوشش کریں اور انصار مدینہؓ کی طرح ہر قسم کی شنگی ترشی اور معاشی نقصانات برداشت کرتے ہوئے پاکستان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک مستحکم اور ناقابل شکست فوجی قوت بنانے کی طرف توجہ دیں۔

## مجاہدین کی عالمی تنظیم "حرکۃ الانصار"

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۵ء

افغانستان میں مسلح رو سی جارحیت کے بعد اس خلط کے غیر علماء اور مسلمانوں نے جہاد کا آغاز کیا تو اس میں دنیا بھر

کے غیرت مند مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے علماء اور دینی کارکنوں نے بھی پورے جوش و جذبہ کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔ پاکستان کے دینی مدارس میں جہاد افغانستان کیلئے علماء اور طلبہ کو منظم کرنے کے کام کا آغاز فیصل آباد کے مجاہد عالم دین مولانا ارشاد احمد شہید نے کیا اور ”حرکتہ الجہاد الاسلامی“ کے نام سے مجاہدین کی جماعت تیار کی جس نے مختلف محاڈوں پر افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد میں عملی حصہ لیا۔ مولانا ارشاد احمد شہید کی شہادت کے بعد یہ جماعت وہ حصوں میں بڑھ گئی۔ مولانا سیف اللہ اختر کی قیادت میں ”حرکتہ الجہاد الاسلامی“ کے پلیٹ فارم پر کام ہوتا رہا اور مولانا فضل الرحمن خلیل کی سربراہی میں ”حرکتہ المجاہدین“ منظم ہو گئی۔ دونوں جماعتوں نے افغانستان کے مختلف محاڈوں کے علاوہ تاجستان، کشمیر اور دیگر علاقوں میں جہاد میں پر جوش حصہ لیا۔ ان کے ذریعہ ہزاروں علماء اور طلبہ نے جہاد کی تربیت حاصل کی، سینکڑوں نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا اور ملک کے دینی مدارس میں جہاد کی فضائیم ہو گئی۔

دو سال قبل اکابر علماء کرام کی محنت سے دونوں جماعتوں میں اتحاد کی راہ ہموار ہوئی اور دونوں تظییموں کے رابہماؤں نے حرکتہ الجہاد الاسلامی اور حرکتہ المجاہدین کی بجائے ”حرکتہ الانصار“ کے نام سے ایک نئے مشتملہ پلیٹ فارم پر کام شروع کر دیا جو اس وقت مقبوضہ کشمیر اور دیگر خطوں میں اپنی حراثت مندانہ جہادی سرگرمیوں کے باعث علمی سطح پر متعارف ہے اور دینی یاداری کی مسلح تحریکات میں ایک باوقار اور منظم جماعت کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل چند غیر مطمئن پیش رفت کا آغاز ہو گیا تو اکابر علماء نے صورتحال کا بر وقت نوٹس لیا اور مجاہدین کے اس وسیع حلقة کو ایک نئے خلفشار سے بچالیا۔ اس سلسلہ میں وعظیم افغان کمانڈروں حضرت مولانا محمد ارسلان رحمانی اور حضرت مولانا جلال الدین حقانی کے ساتھ اثر نیشنل اسلامک مشن کے سربراہ مولانا عبد الحفیظ کمی کی توجہات اور مسائی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے شہانہ روز کی محنت کے ساتھ حرکتہ الانصار اور نو تنشیل شدہ حرکتہ الجہاد الاسلامی کے رابہماؤں میں پیدا ہو جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ان سب کو حرکتہ الانصار کے پلیٹ فارم پر دوبارہ مجمعیت کر دیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف حرکتہ الانصار کی متفقہ قیادت کا چنان اعلیٰ میں آیا ہے بلکہ نیا دستور اور مجلس شوریٰ بھی طے پائی ہے۔

ہم اس ثابت اور مبارک پیشرفت پر مولانا ارشاد ارسلان رحمانی، مولانا جلال الدین حقانی، مولانا عبد الحفیظ کمی اور حرکتہ الانصار کے تمام رابہماؤں اور کارکنوں بالخصوص مولانا قاری سیف اللہ اختر اور مولانا فضل الرحمن خلیل کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی بھرپور کامیابی کیلئے دعا گو ہیں، اللہ ہم ربنا آمین۔

## سرد جنگ کے بعد کی صورتحال اور ولڈ اسلامک فورم

مابنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- اگست ۱۹۹۵ء

افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھوں رو سی استعمار کی پسپائی اور عالمی سرد جنگ کے نتیجہ میں سوویت یونین کے خاتمه کے بعد ملتِ اسلامیہ پوری دنیا میں ایک نئی صورتحال سے دوچار ہو گئی ہے۔ مغرب نے امریکی استعمار کی قیادت میں

کیونزم کے بعد اسلام کو اپناب سے بڑا حرف قرار دیتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کے ان طبقوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے جو اسلام کو اپنی شاخت قرار دیتے ہیں اور مسلم معاشرہ میں اسلامی اصولوں کی بالادستی اور حکمرانی کیلئے بر سر پیکار ہیں۔

ویسٹرن سولائزشن کی بنیاد انسانی معاشرہ کے اجتماعی معاملات میں مذہب کے کسی بھی عملی کردار سے انکار پر ہے۔ مغربی دانشوروں یہ سمجھتے ہیں کہ عالم اسلام کے کسی حصہ میں دینی اقدار کی بنیاد پر صحیح مسلم معاشرہ وجود میں آگیا تو وہ ویسٹرن سولائزشن کیلئے حقیقی خطہ ثابت ہو گا اور اخmal کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتا ہو امغربی معاشرہ تازہ دم اسلامی سوسائٹی کا سامنا نہیں کر سکتے گا۔ اسی نظر کے پیش نظر مغربی حکومتوں، لابیاں اور ذرائع ابلاغ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ایسے اقدامات میں مصروف ہیں جو عالم اسلام میں دینی تحریکات کی راہ میں رکاوٹ بن سکیں اور مسلم ممالک میں بے دینی کے اثرات کو تحکم کر سکیں۔

مغربی دانشوروں کا خیال تھا کہ گذشتہ دو سو سال کے عرصہ میں مسلم ممالک پر مغربی ممالک کے تسلط کے دوران ان علاقوں میں آزاد خیالی اور تہذیب و ترقی کے نام پر مذہبی اقدار سے بے زاری کا جو بیچ بیا گیا ہے اس کی فصل پک چکی ہے اور اب مذہبی حلقوں میں نئے رجحانات کا سامنا کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ اسی طرح مغربی اہل دانش یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف مسلمان ملکوں سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں مغربی ممالک میں آبجی ہے، وہ یا ان کی آئندہ نسل مکمل طور پر مغربی سانچے میں ڈھل کر اپنے علاقوں میں مغربیت کے اثرات کی تقویت کا سامان فراہم کرے گی۔ لیکن مغربی دانشوروں کے یہ دونوں خیال غلط ثابت ہوئے ہیں اور جہاں مسلم ممالک میں دن بدن قوت پکڑتی ہوئی دینی بیداری کی تحریکات نے مغرب کی سیکولر لا یہوں کی توقعات خاک میں ملا دی ہیں وہاں مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں میں اپنے دینی تخشیخ کو برقرار رکھنے کا روز افروز احساں بھی مغربی دانشوروں کیلئے پریشان کن صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے جس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے اور وہ محض چند عبادات یا اخلاقی ہدایات کا مجموع نہیں بلکہ انسانی معاشرہ کی تمام ضروریات پر محیط مکمل نظام حیات ہے جو انسانی معاشرہ میں اپنی ضرورت و افادیت کو فطری انداز میں اجاگر کرتا جا رہا ہے۔ جبکہ تکونی طور پر بھی عالمی سطح پر رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں اسلام کے ساتھ انسانیت کے مستقبل کا رشتہ جوڑتی دکھائی دے رہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان قوتوں کی سرگرمیاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں جو اسلام کا راستہ روک دینا چاہتی ہیں اور عالم اسلام کی دینی قوتوں کے خلاف فیصلہ کن محاذا آرائی کا آغاز کر جکی ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کے ساتھ مغربی قوتوں کا معاملہ اس سے قبل بھی کبھی دوستانہ نہیں رہا لیکن روسی استعمار کے خلاف سرد جنگ کے دوران مسلم ممالک کے ساتھ ظاہر ہمدردانہ تعلق مغرب کی اپنی ضرورت تھا جو اس ضرورت کی حد تک اس دوران ضرور قائم رہا مگر اسی تعلق کے حوالے سے مغرب کو مسلم ممالک کے اندر وہی معاشرہ میں مداخلت کو بڑھانے اور مسلم دار الحکومتوں میں اپنی گھاتیں قائم کرنے کا موقع بھی متاثر ہا ہے جو آج بھی مغربی مغاذات کیلئے پوری کامیابی کے ساتھ استعمال ہو رہی ہیں اور دینی حلقوں کے مقابلے کیلئے رو بلوٹ کا کام مددے رہی ہیں۔

روسی استعمار کا خاتمه اور اس کے تسلط سے افغانستان اور سلطنتی ایشیائی ریاستوں کی آزادی عالم اسلام اور مغربی استعمار

کی مشترکہ ضرورت تھی جس کیلئے ایک عرصہ تک دونوں میں تعاون کی فضاقائم رہی۔ لیکن آج جبکہ مشترکہ شمن سامنے سے ہٹ گیا ہے، عالم اسلام اور مغربی استعمار کے درمیان باہمی تعاون و مفہومت کی مجبوری باقی نہیں رہی تو دونوں ایک دوسرے کے حریف کے طور پر آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ اس میں مغرب کو یہ تفویق بہر حال حاصل ہے کہ وہ مُحکم ہے، منظم ہے، متحد ہے، اس کے وسائلِ مجمعع اور ترقی یافتہ ہیں اور اس کی ترجیحات طے شدہ ہیں۔ جبکہ عالم اسلام منتشر ہے، غیر مُحکم ہے، اپنے وسائل پر اس کا کنٹرول نہیں ہے، اس کی پیشتر حکومتیں مغرب کی ہمدردی اس سے مرعوب ہیں اور ترجیحات تو رہیں ایک طرف اس کے اہداف بھی واضح طور پر متعین نہیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں آپ اس صورتحال کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ اسلام کی بالادستی کا راستہ روکنے کی اس جنگ میں مغرب کی مُحکم حکومتوں، منظم لاہیوں اور ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کا مقابلہ مسلم ممالک کی حکومتوں سے نہیں بلکہ ان دینی تحریکات سے ہے جو اپنی اپنی جگہ پرے اخلاص کے ساتھ جدو چہد کر رہی ہیں۔ لیکن ان تحریکات کے پاس اقتدار اور حکومت کے وسائل ہیں اور نہ وہ باہمی ربط و مشاورت اور مشترکہ قیادت سے بہرہ دو رہیں جو اس جنگ میں ان کیلئے اجتماعی حکمت عملی اور ترجیحات کا تعین کر سکے۔

مغرب اس جنگ کو بھی سرد جنگ کے دائے میں محدود رکھے ہوئے ہے اور اسلحہ اور ہتھیار کا استعمال انتہائی اہم ضرورت کے بغیر اس کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ اس جنگ میں اس کے اصل ہتھیار تعلیم، میدیا اور نفیسیاتی حربے ہیں جن کے ذریعہ وہ ملتِ اسلامیہ کی رائے عامہ کے ذہن کو کنٹرول میں رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہاں تک عالم اسلام کی دینی قوتیں کی رسائی نہ ہو سکے اور دنیا کی مسلم رائے عامہ کی عظیم قوت اسلامی اصولوں کی بالادستی اور ایک صحیح مسلم معاشرہ کے قیام کی طرف پیش رفت نہ کر سکے۔ اس مقصد کے لیے

- مغرب، ولیسٹرن سولائزیشن کو انسانی معاشرت کا نقطہ عروج قرار دے کر اس کی طرف پوری دنیا بانخصوص عالم اسلام کو دعوت دے رہا ہے،
- اسلامی احکام و قوانین کو انسانی حقوق اور سولائزیشن کے منافی قرار دے کر ان کے خلاف نفرت کی فضاقائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے،
- اور عالم اسلام کی دینی تحریکات پر بنیاد پرست اور دہشت گرد کا لیبل چپاں کر کے باقی دنیا کو ان سے دور رکھنے کی تگ و دوکر رہا ہے۔

اس صورتحال میں شدت کے ساتھ اس امر کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ عالمی سطح پر حالات کی تیر رفتار تبدیلی اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے نئے تقاضوں اور ضروریات کی طرف دینی حلقوں کو متوجہ کرنے کیلئے منظم ہمارے قومی مراجح کا حصہ نہیں ہیں سکا اور پہلی چار پانچ صدیوں کو چھوڑ کر ہر دور میں ملتِ اسلامیہ کو نئے تقاضوں کا احساس دلانے کیلئے اہل فکر و دانش کو خاصی چیخ و پکار کرنا پڑی ہے۔ جیسا کہ بر سیغیر کے معرف دانشور مفکر احرار چودھری افضل حق

مرحوم نے قوموں کا مزاج بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریز کوئی کام کرنے سے پہلے سالوں سوچتا ہے اور اس کی منصوبہ بندی کرتا ہے، ہندو مہینوں پہلے سوچتا ہے اور اس کے ثابت اور منقی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے، جبکہ مسلمان کام کرتا جاتا ہے اور سوچتا جاتا ہے۔ اور بر صغیر ہی کی ایک اور قوم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کام کرچکنے کے بعد سوچنے کی عادی ہے۔ مگر مغربی میڈیا کی فسوں کا ری کی داد دینا پڑتی ہے کہ مسلمان کو اس مقام پر بھی نہیں رہنے دیا کہ وہ کام کرتے ہوئے بھی سوچ اور فکر سے کام لے سکے، چنانچہ یہ المناک صور تحال دیکھنا پڑ رہی ہے کہ کام ہو رہا ہے مگر کام کرتے ہوئے بھی اس کے سودوزیاں کے بارے میں سوچنے کی عادت بیدار نہیں ہو رہی۔

مسلم ممالک میں دینی حلقوں اور جماعتوں کی کمی نہیں بلکہ بعض مقامات پر وہ ایک سے دو، اور دو سے تین ہوتی جا رہی ہیں۔ دینی ادارے مسلسل قائم ہو رہے ہیں، سوسائٹیاں بن رہی ہیں، اپنی اپنی بساط کے مطابق سب لوگ کام کر رہے ہیں اور وسائل، محنت اور خلوص کا فقدان بھی نہیں ہے۔ مگر جس چیز کا فقدان ہے وہ ہے: حالات کی تبدیلی کا احساس، تئے تقاضوں سے آگاہی، باہمی ربط و مشاورت کے ساتھ کام کرنے کی ترجیحات اور تقسیم کار کا تعین، اور مشترکہ اہداف کیلئے مشترکہ جدوجہد کا اہتمام۔

دنی اداروں اور تحریکات کی جدوجہد میں یہ خلاحالات کی تیز رفتار تبدیلی کے پس منظر میں اہل فکر و دانش کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہو رہا ہے اور یہی احساس ”ورلد اسلام فورم“ کے قیام کا بنیادی محرك ہے۔ ورلد اسلام فورم کا قائم نومبر ۱۹۹۲ء کے دوران لندن میں عمل میں لایا گیا تھا جب لیشن سٹھون لندن میں الحاج غلام قادر کی رہائش گاہ پر چند اہل فکر مجمع ہوئے، بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی عبدالباقي رحمہ اللہ تعالیٰ کی صدارت میں اجلاس ہوا اور مندرجہ ذیل مقاصد کیلئے فورم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا:

- اسلام کی دعوت اور اسلامی نظام کو جدید اسلوب اور زبان میں دنیا کے سامنے پیش کرنا۔
- اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی سیکولر لایبیوں اور ذرائع ابلاغ غیر مفتی مہم کا ادراک اور تعاقب۔
- جدید ترین ذرائع ابلاغ تک رسائی کی کوشش۔
- عالم اسلام کی دینی تحریکات اور اداروں کے درمیان رابطہ اور مشاورت کا فروغ۔
- مغربی ممالک میں مقیم مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے نظام کو بہتر بنانے کی جدوجہد۔

عام طور پر کسی نئے کام کیلئے نئی جماعت اور حلقة کا قیام ہمارے ہاں ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ جماعت، حلقة یا ادارے کے قیام کے بعد توجہات اور صلاحیتوں کا پیشہ حصہ اپنے وجود کا احساس دلانے، دائرہ کو وسعت دینے اور جدا گانہ شخص کو برقرار رکھنے پر صرف ہو جاتا ہے، جبکہ اصل ہدف و مقاصد توجہات کا بہت کم حصہ حاصل کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ورلد اسلام فورم کے قیام کے ساتھ ہی یہ حکمت عملی اختیار کر گئی تھی کہ فورم کو مستقل جماعت یا فکری حلقة کی شکل دینے کی بجائے ہم نیا دوستوں کی ایک سوسائٹی کے درجہ میں رکھا جائے گا اور جو ادارے، حلقة، جماعتیں اور گروہ مختلف مجازوں پر کام کر رہے ہیں انہی کو توجہ دلا کر اجتماعی مقاصد کی طرف پیش رفت کی کوشش کی جائے

گی۔ گویا اور لد اسلامک فورم تمام علمی و دینی اداروں، جماعتوں اور حلقوں کا خادم ادارہ ہے جس کا کام وقت کے تقاضوں کو محسوس کرنا، ان کی نشاندہی کرنا اور مختلفہ اداروں کو ان کی طرف توجہ دلا کر ان کی بیانیں کا اہتمام کرنا ہے۔ اس کے ساتھ تعلیم اور میدیا کے شعبوں میں خصوصی توجہ دینے کا فصلہ کیا گیا اور اس سلسلہ میں چند عملی اقدامات بھی کیے گئے جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

کسی نئی جماعت یا سوسائٹی کے قیام کے بعد کام کو منظم کرنے کیلئے وسائل و اساب کی فراہی سب سے اہم مسئلہ ہوتی ہے جس کیلئے عام چندے یا مسلم حکومتوں سے راستے کارستہ اختیار کیا جاتا ہے لیکن فورم کیلئے معروف صنیعی حالات میں ان میں سے کوئی طریق کار اختیار کرنا مشکل تھا۔ عام چندہ اس لیے کہ مساجد میں عمومی چندہ کیلئے جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے وہ ہمارے نزدیک باوقار صورت نہیں ہے اور کسی مسلم حکومت کے ساتھ رابطہ سے اس لیے گریز کیا گیا کہ عالم اسلام بالخصوص مغربی ممالک کے مسلمانوں میں مختلف مسلم حکومتوں اور لاپیوں اور ان کے درمیان کشمکش کی جو صورت حال کافی عرصہ سے دیکھنے میں آرہی ہے اس کے پیش نظر کسی مسلم حکومت کی لابی سے وابستہ ہونا فورم کے بنیادی مقاصد سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس قسم کی وفادارانہ وابستگی کے بغیر کوئی حکومت کسی ادارے سے تعاون کیلئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم نے یہ فصلہ کر لیا کہ فورم کے کاموں کو ممبر شپ کی فیض اور اصحابِ خیر کے تعاون سے آگے بڑھایا جائے گا مگر بدستقی سے ہم نے تو زیادہ تعداد میں دوستوں کو ممبر شپ کیلئے آمادہ کر سکے اور نہ ہی اصحابِ خیر کو اپنے پروگرام کی اہمیت سمجھانے میں ہمیں کامیابی ہوئی ہے۔ اس لیے اسab وسائل کا پہلو خاصاً تشنہ ہے اور اس سلسلہ میں فورم مسلسل مقرر و ض اور زیر بارہ ہے۔ اس کے باوجود ورلد اسلامک فورم اپنے قیام کے بعد سے اب تک پونے تین سال کے عرصہ میں جو خدمات سرانجام دے سکا ہے اس کی روپورٹ پیش خدمت ہے۔

## چیچنیا کے صدر جوہر داؤد دوف کی شہادت

مائنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۱۹۹۶ء

چیچنیا کے مجاہد صدر جوہر داؤد دوف گذشتہ دونوں رو سی فوجوں کی گولباری کے دوران ایک سورچہ میں جام شہادت نوش کر گئے، ائمہ و ائمہ راجحون۔ وہ گذشتہ پانچ برس سے رو سی جارحیت کے خلاف اپنی بہادر قوم کی جنگِ آزادی کی قیادت کر رہے تھے۔ جوہر داؤد دوف، ایک ماہر ہوا باز کے طور پر رو سی فوج میں شامل ہے ہیں مگر سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد جب اس خطکی کی ریاستیں آزاد ہوئیں تو چیچنیا کے مسلمانوں نے بھی آزادی کا پرجیم بلند کر دیا اور جوہر داؤد دوف جیسے عظیم مجاہد نے ان کی قیادت سنپھالی۔ چیچنیا ایک ملین کے لگ بھگ آبادی کی ریاست ہے اور یہاں کے مسلمان ہر دور میں رو سی استعمار کے خلاف نبرد آزمار ہے ہیں۔

چیچنیا کے ساتھی داغستان ہے جس کا ذکر بر صیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی میں اکثر ہوتا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے

جسے حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ تحریک کے باقی ماندہ افراد نے معمرک بالا کوٹ کے بعد اپنے مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا۔ اس خطے کو وہ قاف کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور روسی استعمار کے خلاف امام شاملؒ یادگار جنگ آزادی کی تگ و تاز کامرزن بھی یہی خط ہے۔

ہفت روزہ ”العالم الاسلامی“ مکہ مکرمہ نے ۱۵ اپریل ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں چینیا کے ایک اور لیڈر رسولان جبلا توف کے ایک خط کے حوالے سے چینیائی مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں اعداد و شمار کی روپورث شائع کی ہے۔ رسولان جبلا توف چینیا میں صدر جوہر داؤ دوف کے سیاسی حریف سمجھے جاتے تھے اور روسی پارلیمنٹ کے اپنیکر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے روسی حکومت کے نام ایک خط میں بتایا ہے کہ چینیا کی دس لاکھ کے لگ بھگ آبادی میں سے روئی افواج کی حالتی جاریت کے ہاتھوں ساٹھ ہزار سے زائد افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ چار لاکھ کے قریب افراد بھرت پر مجبور ہوئے ہیں اور ایک لاکھ کے قریب زخمی کمی طبی امداد کے بغیر پڑے ہیں۔ اس کتاب کے مطابق چینیا کی چار سو دس بستیوں میں سے تین سو ستر بستیاں تباہ ہو چکی ہیں اور باقی ماندہ لوگوں کی آشوبت مسماں شدہ مکانوں میں زندگی بس کر رہی ہے۔ جبلا توف کا کہنا ہے کہ انہوں نے صدر جوہر داؤ دوف کو مصالحت کیلئے مذاکرات پر آمادہ کر لیا تھا لیکن روسی حکومت نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مسلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے روئی قیادت سے مطالیہ کیا ہے کہ وہ ہٹ دھرمی ترک کر کے جاریت کا سلسلہ روکے اور چینیائی مسلمانوں کا قتل عام بند کرے۔

اس صورتحال کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ بوسنیا کی طرح چینیا کے مسلمانوں کا قتل عام بھی عالم اسلام کی مسلمان حکومتوں اور بین الاقوامی اداروں کا ضمیر بیدار نہیں کر سکا۔ بلکہ بیشتر مسلمان حکومتیں اور ادارے چینیا پر روں کی وحشیانہ جاریت اور مسلمانوں کے قتل عام پر اس درجہ کے رسی احتجاج کا اظہار بھی نہیں کر سکے جس کا بوسنیا کے بارے میں ایک حد تک برائے نام ہوتا رہا ہے۔ شاید رسالتاًب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد گرامی میں اسی صورتحال کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

”تمہارا کیا حال ہو گا جب دنیا کا فرقہ میں تم پر حملہ آور ہونے کیلئے ایک دوسرے کو یوں دعوت دیں

گی جیسے میزان تیار دستِ خوان پر مہمان کو کھانے کی دعوت دیتا ہے؟“

چیز بات ہے آن ہم اپنی بداعمیوں اور قرآن و سنت سے انحراف کی وجہ سے دنیا بھر میں کافر قوموں کیلئے تزویلہ بن چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اجتماعی طور پر استغفار اور اصلاح کے ساتھ اپنی حالت درست کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الہ العالیین۔



# طالبان کا پہلا دور

(۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء)

## افغانستان میں دینی مدارس کے طلبہ کی حکومت

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۱۹۹۶ء

رقم الحروف کو ۹ اور ۱۰ جون کو افغانستان میں طالبان کے دارالحکومت قندھار اور افغانستان کے سرحدی قصبہ پیمن بولڈ کی میں طالبان کے رہنماؤں کے ساتھ افغانستان کی تازہ ترین صورتحال پر گفت و شدید اور افغانستان کے اس خط کے حالات کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ اس دوران جن حضرات سے ملاقات ہوئی ان میں طالبان کے امیر مولوی محمد عمر خوند، چیف جسٹس مولوی سید محمد پاسنی، گورنر قندھار حاجی ملا محمد حسن اخوندزادہ، آئی جی پولیس ملائکہ الصمد ثانی، طالبان کے ترجمان مفتی محمد معصوم افغانی، اور مرکزی مجلس شورای کے دوار کان مولوی محمد صدیق اور مولوی سیف الدین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مولوی سید محمد پاسنی کا شمار علاقہ کے بڑے علماء میں ہوتا ہے، ان کے علاوہ باقی سب مذکورہ حضرات دینی مدارس کے طلبہ بین جو مختلف دینی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور جہاد افغانستان میں عملاً شریک رہے ہیں۔

جہاد افغانستان کے بعد جہاد کے منطقی تنازع یعنی شرعی نظام کا نفاذ اور امن کا قیام سامنے نہ آنے پر یہ لوگ پریشان ہو گئے اور ”تیگ آمد بینگ آمد“ کے مصادق رفتار فتہ منظم ہو کر انہوں نے پہلے سرحدی قصبہ پیمن بولڈ اور پھر صوبائی دارالحکومت قندھار پر قبضہ کر لیا، جس سے ان کا حوصلہ بڑھا اور وہ گذشتہ ڈیڑھ سال کے دوران افغانستان کے تیس میں سے پندرہ صوبوں پر قبضہ کرنے کے بعد کم و بیش تیس ہزار کی مسلح فورس قائم کر کچے ہیں، جوزیاہ تر دینی مدارس کے ان طلبہ پر مشتمل ہے جو جہاد افغانستان کے دوران رو سی جاریت کے خلاف عملاء بر سر پیکار رہے ہیں۔

طالبان کے امیر مولوی محمد عمر خوند ایک سادہ سے مغلص اور دیندار نوجوان ہیں، افغانستان ہی کے دینی مدارس میں پڑھتے رہے ہیں، جہاد افغانستان کے دوران تین بار زخمی ہوئے، ایک آنکھ کو بھی نقصان پہنچا اور ایک بار علاج کیلئے پاکستان لائے گئے، اس کے علاوہ کبھی افغانستان سے باہر نہیں گئے۔

طالبان کا طریق کاری یہ ہے کہ جس علاقے پر قبضہ کرتے ہیں، وہاں کی عام آبادی کو نہتا کر دیتے ہیں۔ کسی عام شخص کے پاس ایک پستول بھی نہیں چھوڑتے، جس کی وجہ سے امن قائم ہونے کے علاوہ اسلامی ایک بہت بڑی مقدار ان کی تجویل میں آجائی ہے۔ اس کے بعد وہاں شرعی عدالتیں قائم کر دیتے ہیں جو قرآن و سنت کے مطابق لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتی ہیں، اور امن و امان کو سادگی کے ساتھ کثروں کرتے ہیں جس کی وجہ سے عوام ان کے ساتھ ہیں۔ قندھار کے بازاروں میں رونق نظر آتی ہے، زراعت اور کھیتی باڑی کی طرف توجہ بڑھ رہی ہے، مہاجرین رفتار فتہ و اپنی آکر آباد ہو رہے ہیں، اور ایک افغان رہنماؤں کے بقول اب قندھار شہر کے اندر کسی عمارت کا خریدنا یا کارائے پر لینا مشکل ہوتا جا رہا

ہے۔

طالبان کو عالمی سطح پر ”بیناد پرست“ سمجھا جاتا ہے، اس لیے انہیں کسی حکومت یا عالمی ادارے کی سپرستی یا ہمدردی حاصل نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے سیاسی تعارف، مالی مشکلات کے حل، اور میڈیا کے ساتھ راستے میں انہیں دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ تاہم امید ہے کہ وہ اپنے خلوص، سادگی اور قناعت کی بدولت بالآخر ان مشکلات پر قابو پالیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مشن میں کامیابی سے نوازیں اور عالمی سازشوں کا شکار ہونے سے بچائیں، آمین یا رب العالمین۔

## افغانستان میں تین حکومتیں اور عالمی قوتوں کی حکمتِ عملی

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۱۹۹۶ء

روزنامہ جنگ لاہور نے ۱۸ اگسٹ ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں واکس آف جمنی کے حوالے سے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ افغانستان میں ربانی حکومت کے احتیاج کو نظر انداز کرتے ہوئے دو امریکی فرموں نے جزل رشید دوستم کے ساتھ تیل کی تلاش اور ازبکستان سے پاکستان تک تیل کی پاپ لائیں تعمیر کرنے کے معاهدے کیے ہیں اور اس پاپ لائن کے تحفظ کیلئے انہوں نے طالبان کے ساتھ بھی معاهدہ طے کر لیا ہے۔

افغانستان کی صورتحال اس وقت یہ ہے کہ وہاں تین الگ الگ حکومتیں قائم ہیں:

1. کابل میں پروفیسر بہان الدین ربانی اور انجینئر گلبیدین حکمت یار کی حکومت ہے جن کے زیر اشرست یا آٹھ صوبے بتائے جاتے ہیں۔
  2. شمال میں مزار شریف پر جزل رشید دوستم حکمران ہیں اور سات صوبے ان کی تجویل میں ہیں۔
  3. جبکہ جنوب اور مغرب کے پندرہ صوبے طالبان کی تجویل میں ہیں اور قندھار ان کا دارالحکومت ہے۔
- امریکہ اور اقوام متحدہ نے ربانی حکومت کو باقاعدہ حکومت کے طور پر تسلیم کیا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود دوستم اور بعض امور میں طالبان کے ساتھ بھی الگ الگ معاملات طے کرنے کی کوششیں جاری ہیں، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ بہادر افغانستان کی موجودہ مقسم شدہ صورتحال کو اپنے مفاد میں سمجھتے ہوئے اسے برقرار رکھنے میں دچپی رکھتا ہے اور خاص طور پر جزل رشید دوستم کی حکومت کو مضبوط و مغلکم دیکھنا چاہتا ہے۔
- اصل بات یہ ہے کہ افغانستان میں رو سی جاریت کے موقع پر امریکہ نے روس کو زج کرنے کیلئے افغانستان کے حریت پسند مجاہدین کی دل کھول کر امد اد کی، لیکن رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد جب کابل پر مجاہدین کی نظر یا قیامتی اسلامی حکومت قائم ہونے کے امکانات واضح ہوئے تو امریکہ اور روس دونوں نے مصالحت کر کے اس کا راستہ روکنے کیلئے

سازشوں کا آغاز کر دیا۔ دونوں کو یہ خطرہ ہے کہ کابل میں اگر محکمہ اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو وہ نہ صرف پاکستان اور جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک پر اثر انداز ہو گی بلکہ وسطی ایشیا کی نوازد مسلم ریاستیں بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکیں گی۔ اس لیے امریکہ اور روس دونوں کی مشترکہ کوشش یہ ہے کہ کابل میں مجاہدین کی کوئی مشترکہ اور مضبوط نظریاتی حکومت نہ بن سکے، بلکہ کابل اور طالبان کی تکمیل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جزل روشنی دوستم کو زیادہ سے زیادہ محکم کر دیا جائے جو جہاد افغانستان کے دوران کمیونٹ جرنیل کے طور پر مجاہدین کے خلاف مسلسل نبرد آزار ہے ہیں اور آخر میں کابل کے قبضہ میں احمد شاہ مسعود کے ساتھ تعاون کر کے وہ مزار شریف سمیت شمال کے بعض اہم علاقوں میں اپنا قبضہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جزل دوستم کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ آزاد خیال مسلمان ہونے کی وجہ سے مغربی مفادات کے زیادہ بہتر حافظ بن سکتے ہیں، اور ان کے زیر تسلط علاقہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے درمیان واقع ہے جو کسی بھی وقت ”بفراسیٹ“ کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ مغربی قوتوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے ہیں اور ان کے استحکام و ترقی میں سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس صحن میں واسی آف گرمنی کی مذکورہ روپورٹ کا یہ حصہ بطور خاص قابل توجہ ہے کہ ”دوستم کا علاقہ امریکہ کی نظر میں ایک ایسی مضبوط دیوار ثابت ہو گا جو کہ افغانستان سے اسلامی بنیاد پرستی کو وسطی ایشیا میں داخل ہونے سے روکے گی۔“

ہمارا خیال ہے کہ افغانستان کے بارے میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی موجودہ حکومت عملی کی تہہ تک پہنچنے کیلئے بھی بات کافی ہے۔ اس پس منظر میں وہ قوتیں جو ربانی حکومت اور طالبان کے درمیان مصالحت کیلئے کسی درجہ میں بھی کوئی کردار ادا کر سکتی ہیں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے تحرک ہونا چاہیے، کیونکہ جہاد افغانستان کے منطقی نتائج حاصل کرنے اور افغانستان کو امریکہ دوستم گڑ جوڑ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

## افغانستان میں طالبان کی حکومت اور برطانیہ کے مسلم دانشور

روزنامہ وفاق، لاہور --- ۱۲ نومبر ۱۹۹۶ء

کابل پر طالبان کے قبضہ کے بعد جہاں ان کے خلاف مغرب کی میڈیا اور میڈیا ایوار میں تیزی آگئی ہے وہاں مغرب میں مقیم مسلم دانشوروں اور علماء میں بھی حرکت پیدا ہوئی ہے اور اس میڈیا اور میں شرکت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ برطانیہ میں اس وقت تک اس سلسلہ میں تین اجتماعات ہو چکے ہیں۔ پہلا اجتماع ولڈ اسلام فورم کے زیر اہتمام ۱۵ اکتوبر کو نار تھ لندن کی مرکزی جامع مسجد فنس بری پارک میں ہوا۔ دوسرا اجتماع پاکستان شریعت کونسل برطانیہ کے زیر اہتمام ۱۳ اکتوبر کو مدرسہ قاسم العلوم واش وڈ بیچ برگھم میں ہوا۔ جبکہ تیسرا اجتماع ۱۹ اکتوبر کو مسلم کمیونٹی سٹرالفورڈ لندن میں مسلم لیگ اصلی

کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ ان اجتماعات میں مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے شرکت کی جن میں سعودی عرب کے جلاوطن اپوزیشن لیڈر ڈاکٹر محمد المسعری، ممتاز شامی عالم اور المہاجر وون کے امیر اشخ عمر بکری محمد، ابادان یونیورسٹی نائجیریا کے پروفیسر داؤد نویبی، ڈاکٹر خالد علوی، بیرونی یوسف اختر، مولانا محمد عیسیٰ منصوری، ڈاکٹر اختر الزمان غوری، بیرونی محمد فاروق، اور فیاض عادل فاروقی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

رقم الحروف کو بھی ان تینوں اجتماعات میں شرکت کا موقع ملا۔ ان ارباب فکر و دانش نے طالبان اور افغانستان کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

## طالبان کی کامیابی پر دینی حلقوں کا اطمینان

ایک حصہ اس مسروت اور اطمینان کے اظہار پر مشتمل ہے جو طالبان کی کامیابیوں پر دنیا بھر کے دینی حلقوں میں پایا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ان حضرات کا کہنا ہے کہ طویل عرصہ کے بعد کسی مسلمان ملک میں یہ عزمن سننے میں آیا ہے کہ وہاں قرآن و سنت کی بلالستی پر بنی کامل شرعی نظام قائم کیا جائے گا۔ اور اعلان کرنے والے بھی دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ ہیں جن کی تعلیم و تربیت دینی ماحول میں ہوئی ہے، اس لیے ان کے دعویٰ اور عزم کی تکمیل کے بارے میں اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ بعض مقررین کا کہنا تھا کہ خلافت، امیر المومنین، اور اسلامی حکومت کا نام سننے کیلئے مسلمانوں کے کان تر گئے تھے اور اب طالبان کی صورت میں اہل اسلام کا یہ دیرینہ خواب پورا ہوتا دھائی دیتا ہے۔

## طالبان کی طرف سے اسلام کے نام پر ناقابل قبول اقدامات کا خدشه

دوسرے نمبر پر مقررین نے اس بات پر اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ طالبان کے تمام تر خلوص، جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود کسی اتفاق کی تکمیل اور اس پر عملدرآمد کے بارے میں تجربہ نہ ہونے کے باعث خدشه ہے کہ وہ اسلام کے نام پر ایسے اقدامات نہ کر بیٹھیں جو آج کی دنیا میں اسلامی نظام کے بہتر تعارف کی بجائے اس کی بدنائی کا باعث بن جائیں۔ ان اہل دانش کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں اسلامی نظام کے حوالے سے بہت سے امور کا طے ہونا باقی ہے جو ظاہر ہے کہ اجتہاد کے ذریعے اہل اجتہاد کے ہاتھوں طے ہوں گے۔ لیکن ایسا کوئی بھی اجتہاد کسی ایک ملک کے مخصوص حالات اور مسائل کے پس منظر میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ پوری دنیا اور عالم اسلام کے اجتماعی اصول اور ضروریات کو سامنے رکھ کر اس عمل کو آگے بڑھنا چاہیے۔ ورنہ اگر ہر ملک کی اسلامی تحریک اجتہادی امور کے حوالے سے الگ الگ تعبیر پر کھڑی ہو گئی تو عالمی سطح پر اسلام کے عالمگیر مذہب اور نظام ہونے کا تصور دھندا بڑھ جائے گا۔ اس ضمن میں ارباب فکر و دانش نے دو تجاویز پیش کی ہیں۔

1. ایک پاکستان کے علماء کرام اور اہل دانش کیلئے ہے، بالخصوص ان علماء کرام کیلئے جن کے اثرات افغانستان کے

علماء اور طالبان میں موجود ہیں کہ یہ اہل علم و اہل دانش باہمی مشاورت کے ساتھ طالبان کی علمی و فکری راہنمائی کا اہتمام کریں۔

2. دوسری تجویز طالبان کیلئے ہے کہ وہ خود دنیا نے اسلام کی علمی شخصیات، دینی اداروں، اور اسلامی تحریکات کے ساتھ اس قسم کے روابط اور مشاورت کا اہتمام کریں کہ ان کا قائم کردہ نظام دنیا بھر کے رہنماء اداروں اور علمی حقوق کے اعتبار سے بہرہ ور ہو اور دنیا کے ہر مسلم ملک کیلئے مثال بن سکے۔

### مغربی میڈیا کی جانب سے طالبان کی کدرار کشی

ان اجتماعات میں شرکت کرنے والے اہل دانش نے طالبان کے حوالے سے مسئلہ کے جس تیرے پہلو پر اظہار خیال کیا وہ طالبان کے خلاف مغربی ذرائع ابلاغ کی عیارانہ ہم ہے جس کا مقصد طالبان کی کردار کشی کے سوا کچھ نہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ مغربی میڈیا نے ایک عرصہ سے اسلام اور دیندار مسلمانوں کو اپنا ہدف بنارکھا ہے کیونکہ مغرب اسلام سے خوفزدہ ہے۔ اور یہ خوف اس کے ذہن پر سور ہو گیا ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اگر صحیح اسلامی نظام نافذ ہو گیا اور ایک مثالی اسلامی حکومت اور سوسائٹی تشکیل پائی تو مغرب کا گھول لالا فلفہ اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکے گا۔ اس لیے مغرب کی یہ طے شدہ پالیسی ہے کہ کسی مسلم ملک میں صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہونے دی جائے اور اسلام کے نفاذ کی علمبردار تحریکات کو اس قدر بدنام کیا جائے کہ رائے عامہ ان کی بات سننے کو تیار نہ ہو۔ آج کل طالبان بھی مغرب کی اسی ہم کا سب سے بڑا نشانہ ہیں اور ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مغرب کے پریس میں چھپ رہی ہیں اور ان پر دلچسپ تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔

مثلاً ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ طالبان نے پولیس کے اہلکاروں کو وردي کے ساتھ نکٹائی پہنچنے سے منع کر دیا ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کو زد کوب کیا گیا ہے۔ اس پر ایک صاحب نے بے ساختہ تبصرہ کیا کہ ”یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ ہم نے کسی فورس کی وردي میں آج تک نکٹائی نہیں دیکھی۔“

اسی طرح چند روز قبل ایک خبر چھپی کہ طالبان نے کابل میں ایسے خوش نوا پرندے جو آزاد کرادیے ہیں جن کے مالکان نے ان پرندوں کو موسیقی اور گانے کی تربیت دے رکھی تھی اور وہ ان سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس خبر پر ایک صاحب کا تبصرہ یہ تھا کہ ”دیکھو! آزادی کے ان ٹھیکیداروں کو پرندوں کو آزاد کرنے پر بھی تکلیف ہو رہی ہے۔“

الغرض طرح طرح کی خبریں اور عجیب و غریب تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔ اس سارے قصے میں مذکور بالا ارباب فکر و دانش کیلئے باعث تشویش بات یہ ہے کہ طالبان کے خلاف توبہت کچھ چھپ رہا ہے اور عالمی میڈیا ان کے خلاف منظم اور مربوط جنگ میں مصروف ہے گر طالبان کو اپنے موقف اور پالیسیوں کو عالمی سطح پر پیش کرنے اور ان کو اپنی باتوں کی خود وضاحت کرنے کا موقع نہیں دیا جا رہا۔

## اسامہ بن لادن اور سعودی علماء کرام کی جدوجہد

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ ۱۹۹۶ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کی ایک خبر کے مطابق سعودی عرب کے ایک جلاوطن لیڈر اسامہ بن لادن نے سعودی حکومت کی یہ پیشکش مسترد کر دی ہے کہ اگر وہ سعودی حکومت کو ایک اچھی اسلامی حکومت قرار دیں تو انہیں سعودی عرب واپس آنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ قریبی ذرائع کے مطابق اسامہ بن لادن کا کہنا ہے کہ سعودی حکومت نے متعدد توانین ایسے نافذ کر رکھے ہیں جو قرآن و سنت کے منافی ہیں، نیز سعودی شاہی خاندان دولت کی ریل پیل کی وجہ سے انتہائی کربٹ ہو چکا ہے اور اس کے حواری ممالک کی مصلح افواج کی جنریہ عرب میں مسلسل موجودگی سے سعودی عرب کی خود مختاری اور حریم شریفین کا قدس مجوہ ہو رہا ہے، اس لیے ان حالات میں وہ سعودی حکومت کی اس پیشکش کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

اسامہ بن لادن سعودی عرب کے ایک متمول خاندان کے فرزند ہیں جو "بن لادن فیلی" کے نام سے تجارتی حلقوں میں خاص معمور ہے۔ اسامہ نے رو سی جاریت کے خلاف افغان مجاهدین کے چہاد آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ مجاهد گروپوں کی دل کھول کر مالی مدد کی اور خود بھی عملاً جہاد میں سالہا سال تک شریک رہے۔ اسامہ بن لادن نے سوڈان میں اسلامی اصلاحات کی حمایت کی اور سوڈان کو معاشی طور پر خود کفیل بنانے کا منصوبہ دیا، اس منصوبہ پر خود سوڈان میں پیش کر عملدرآمد کر لیا، مالی مدد کی اور بھرپور تعاون کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو سوڈان یمنیشہ قط زده ملک سمجھا جاتا رہا ہے ان زرعی اصلاحات اور ترقی کی وجہ سے گندم برآمد کرنے والے ملکوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ اسامہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی جہادی تحریکات کی عملی سرپرستی اور معاونت میں ایک عرصہ سے سرگرم ہیں جس کی وجہ سے امریکہ نے انہیں سرکاری طور پر دہشت گرد قرار دے رکھا ہے، اسی وجہ سے انہیں سعودی عرب سے جلاوطن ہونا پڑا اور پھر سوڈان سے بھی مسلسل امریکی دباؤ اور ڈمکیوں کی وجہ سے نکلا پڑا۔ آج تک اسامہ بن لادن افغانستان میں ہیں اور وہاں سے انہیں نکلنے کیلئے امریکہ طالبان کی حکومت پر مسلسل دباؤ بڑھا رہا ہے۔

اسامہ بن لادن کا موقف یہ ہے کہ

- جزیرہ عرب سے امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی فوجوں کو بلا تاخیر نکال دینا چاہیے،

- سعودی عرب اور تمام ممالک میں خالص اسلامی شرعی حکومت قائم ہونی چاہیے، اور

- عالمی سطح پر خلافتِ اسلامیہ کا احیا ہونا چاہیے، اس مقصد کیلئے وہ مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں۔

اس کے ساتھ سعودی علماء کی اس جدوجہد کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو انہی مقاصد کیلئے کئی سالوں سے جاری ہے۔ ۱۹۹۳ء میں سرکردہ سعودی علماء نے حکومت کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جس میں

- امریکی فوجوں کی واپسی،

- خالص اسلامی حکومت کے قیام،

- سوی میشیت کے خاتمہ، اور
- نظامِ مملکت میں شرعی اصلاحات

کے مطابق کیے گئے ہیں۔ اس کی پادشاہ میں سینکڑوں علماء اور دانشور گرفتار کر لیے گئے جن میں اشیخ سفر الحوالی اور اشیخ سلیمان عودہ جیسے سرکردہ سلفی علماء شامل ہیں اور وہاب بھی جیل میں ہیں۔ انہی علماء کا ایک گروپ لندن میں جلاوطنی کی زندگی برقرار رہا ہے اور لجنة الدفاع عن الحقوق الشرعية کے نام سے سعودی علماء کی ذمکورہ یادداشت کے مطابق جدوجہد میں معروف ہے۔

حر میں شریفین کی حفاظت اور خدمت کے باعث سعودی عرب کی شاہی حکومت کو عالم اسلام میں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس مناسبت سے یہ احترام سعودی حکومت کا ایک حد تک حق بھی ہے۔ لیکن سعودی عرب کے دینی حلقوں اور علماء کی جدوجہد اور مطالبات بھی ایسے نہیں جنہیں آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جاسکے۔ حالات اس قدر پوشیدہ اور مخفی نہیں ہیں کہ انہیں معلوم کرنے کیلئے زیادہ تگ و دو کی ضرورت ہو۔ اس لیے ہمارے خیال میں پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے دینی حلقوں اور اداروں کو اس سلسلہ میں مصلحت بلکہ مذاہشت سے کام لینے کی بجائے کھلی آنکھوں سے صورتحال کا دراک کرنا چاہیے اور سعودی عرب کے علماء اور دینی حلقوں کی اس دینی جدوجہد کی حمایت میں بخوبی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

## اسامہ بن لادن کے ساتھ ملاقات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۳ مارچ ۱۹۹۹ء

اسامہ بن لادن کا نام سب سے پہلے جہاد افغانستان کے دوران خوست میں ساتھا جہاں یا اور کے مقام پر مجاہدین کی عسکری تربیت گاہ تھی۔ دنیا کے مختلف ممالک سے نوجوان جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر وہاں آتے اور چند دن ٹریننگ حاصل کر کے افغان مجاہدین کے ہمراہ روئی استعمال کے خلاف برس پیکار ہو جاتے۔ راقم الاحروف کو متعدد بار حرکت الانصار کی ہائی کمائن کی فرمائش پر ایسی تربیت گاہوں میں جانے کا موقع ملا۔ میرے جیسے لوگ وہاں جا کر عملات کو کچھ نہیں کر پاتے مگر مجاہدین کا خیال تھا کہ ہمارے جانے سے ان کو حوصلہ ملتا ہے، خوشی ہوتی ہے۔ اور خود ہمیں حالات کا براہ راست مشاہدہ کر کے لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کا موقع ملتا ہے، اسی جذبہ کے ساتھ ہم و قاتفوی قاتا ہاں جاتے اور ایک دو روز مجاہدین کے ساتھ تربیت گاہوں اور مورچوں میں گزار کر واپس آ جاتے۔ وہیں ایک تربیت گاہ عرب نوجوانوں کیلئے مخصوص تھی جہاں مختلف عرب ممالک سے آئے ہوئے سینکڑوں نوجوان تربیت حاصل کرتے تھے، مختلف عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوتی تھی اور عالم اسلام کے مسائل پر فتنتو ہوتی رہتی تھی۔

ایک موقع پر یا اور سے میران شاہ تک واپس پہنچانے کیلئے جو گاڑی بھجوائی گئی اس کاڑا یا ایک عرب نوجوان تھا جس کی عمر پہنچل اخبارہ برس ہو گئی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ مدینہ منورہ کا رہنے والا ہے اور دو سال سے جہاد میں

مصروف ہے۔ طن والوں کے بارے میں پوچھتا تو اس نے کہا کہ جہاد میں کامیابی کے بعد ہی طن واپس جانے کا رادہ ہے۔ یہ دور وہ تھا جب انہی خوست فتح میں ہوا تھا۔ وہاں اسماء بن لادن کا نام سننا اور یوں یاد پڑتا ہے کہ شاید کسی موقع پر انہیں دیکھا بھی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ سعودی عرب کے متمويل ترین تاجر خاندان ”بن لادن فٹیلی“ کا ایک نوجوان جس کا نام اسماء ہے، خود بھی جہاد میں عملاء شریک ہے اور زیادہ تراگلے مورچوں میں رہتا ہے اور مجاہدین کے مختلف گروپوں کی دل کھول کر مالی امداد بھی کرتا ہے۔ بلکہ بعض دوستوں نے بتایا کہ جہاد افغانستان میں مالی تعاون اور مجاہدین کی کفارت میں شاید ہی کوئی دوسرا عرب شیخ اس نوجوان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اسماء بن لادن کا نام اس کے بعد مختلف حوالوں سے وقتانہ میں آثار ہا۔

پھر معلوم ہوا کہ جہاد افغانستان میں تربیت حاصل کرنے والے اور جہاد میں عملاء شرکت کرنے والے عرب نوجوان اپنے اپنے ملکوں کی حکومتوں کے ہاں مع桐 قرار پاچکے ہیں۔ ان حکومتوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ جہاد کے جذبہ سے سرشار اور ٹریننگ سے بہرہ وریہ نوجوان اپنے ملکوں میں جذبہ جہاد کے فروع کا باعث بنیں گے اور ان ممالک میں مغربی استعمار کے مسلط کردہ نوابادیاتی نظاموں کیلئے چیخنگ ثابت ہو لے گے۔ اس لیے انہیں دہشت گرد قرار دینے کا فیصلہ ہوا اور ان سے نہیں کیلئے مسلم ممالک کے وزراء داخلہ اور وزراء خارجہ کے مسلسل اجلاس ہونے لگے۔ پاکستان میں ان ”دہشت گروں“ کے خلاف ہم کا آغاز ہوا اور انہیں پاکستان سے نکلنے کیلئے منظہ منصوبہ بنندی کی گئی۔ اس دوران اسماء بن لادن کا نام ایک بار پھر سامنے آیا اور پتختہ چلا کہ یہ نوجوان سوڈان میں بیٹھا ہے اور نہ صرف سوڈان کی نظریاتی اسلامی حکومت کو اقتصادی سپورٹ مہیا کر رہا ہے بلکہ ان عرب نوجوانوں کی پناہ گاہ بھی ہے جو روئی استعمار کے خلاف تاریخی جہاد میں حصہ لینے کی پاداش میں اپنے ممالک کی حکومتوں کے ہاں دہشت گرد اور مفرور قرار پاچکے ہیں۔ سوڈان رقبہ کے لحاظ سے عالم کیلئے کیا اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے اور ہمیشہ قحط سالی کا شکار رہا ہے۔ لیکن چند برسوں سے ڈاکٹر حسن ترابی اور جزل عمر بشیر کی قیادت سے معاشری خود کفارت اور اسلامی اصلاحات کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ سوڈانیوں نے اس راز کو پالیا کہ اسلامی نظام کے حقیقی نغاہ کیلئے اس سے قبل معاشری خود کفارت ضروری ہے ورنہ مغربی ملکوں اور عالمی اداروں کی معاشری امداد کا شکنجه دنیا کے کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ چنانچہ انہوں نے ناکل مما نزع و نلبس مما نصنع (انبا بیوا ہوا کھائیں گے اور ان بنا بیوا ہوا کپڑا بہنیں گے) کا قوی نعرہ لگایا اور مغرب کے آگے بھیجنے والے ہاتھ سمیٹ لیے۔ سوڈانیوں نے زراعت کو فروع دیا، ملک کے اندر سڑکیں تعمیر کیں اور محنت کا راستہ اختیار کیا جس کا شمرہ بارگاہ ایزدی سے یہ ملکہ سوڈان گندم میں خود کھلیں ہو گیا ہے بلکہ ابرا آمد کرنے کی پوزیشن میں ہے جس پر مغرب کے یقین و تاب کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مصر کے صدر حسنی مبارک پر کسی دور میں ہونے والے قاتلانہ حملہ کے ملزمون کو پناہ دینے کے الزام میں سوڈان کو دہشت گرد ملک قرار دیا جا چکا ہے اور امریکہ بہادر سوڈان سے نہیں کیلئے تیار یاں کر رہا ہے۔ جبکہ سوڈان کے جنوب میں عیسائی اقلیت کو ابھار کر اور اسے مالی و عسکری سپورٹ مہیا کر کے سوڈان کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے اور تقصیم کر دینے کے مذموم منصوبہ کو عملی جامہ پہننا یا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سوڈان کی اس معاشری خود کفارت اور نظریاتی پیشہ فرست کے پیچھے اسماء بن لادن کا ہاتھ ہے اور اسماء بن لادن نے سوڈان میں بیٹھ کر نہ صرف

وہاں کی اسلامی حکومت کا حوصلہ بڑھایا بلکہ قومی شاہراہ کی تعمیر میں ہاتھ پڑھا کر سوڈان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اسماء بن لادن کا یہ ”جرم“ ناقابل معافی تھا کہ اس نے ایک غریب مسلمان ملک کو معاشی خود کفالت کارستہ دکھایا، اسلامی نظام کے نفاذی مختکم بنیاد رہا، ممکن کی اور عالمی مالیاتی اداروں کو ایک شکار گاہ سے محروم کر دیا۔ چنانچہ امریکہ بہادر نے گذشتہ سال عالمی دہشت گروہوں کی جو فہرست جاری کی، اس میں اسماء بن لادن کا نام سرفہرست ہے۔ سوڈان کو ہدھکی دی گئی کہ وہ اسامہ کو امریکہ کے ہوالے کر دے ورنہ نتاں بچھتے کیلئے تیار ہو جائے۔

اسماء بن لادن نے سوڈان کو مشکلات سے نکالنے میں مددی تھی اس لیے اس کی مشکلات میں اضافے کا باعث بننا اس غیور عرب نوجوان کی حیثیت و غیرت کے خلاف تھا۔ اس لیے اسماء بن لادن نے چپکے سے سوڈان کو خیر باد کھا اور افغانستان کی آزاد سر زمین میں نیا سکن بنالی۔ اسماء بن لادن کا پاناؤ طن سعودی عرب ہے جہاں اس کا خاندان آج بھی ملک کا متمول ترین تجارتی خاندان ہے، جہاں اس کے الٰہ خاندان ملک کی معاشی ترقی کا ایک اہم کردار ہیں لیکن اسماء پر سعودی عرب کے دروازے بند ہیں۔ اس لیے کہ وہ خلیج عرب میں امریکی افون کی مسلسل موجودگی کا خالف ہے اور اسے عرب ممالک کی خود مختاری کے منافی اور اسرائیل کی تقویت کا باعث سمجھتا ہے۔ وہ سعودی عرب میں اسلامی اصلاحات کا داعی ہے اور ملک کے نظام کو مکمل طور پر اسلامی تعلیمات و ادکام کے ساتھی میں ڈھالنے کی بات کرتا ہے۔ وہ شاہی خاندان کی پریش زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور خلافت اسلامیہ کا احیاء چاہتا ہے اور یہ ”جرم“ آج کے دور میں اتنا بکا نہیں کہ اسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔

رقم الحروف کو گذشتہ ماہ کے اوآخر میں افغانستان جانے کا اتفاق ہوا تو یہی چاہا کہ ملکن ہو تو اسماء بن لادن سے بھی ملاقات کر لی جائے اور اس کا مسکن دیکھ لیا جائے۔ کچھ دستوں سے بات کی توقعات نے موافق تھے اختری کر لیا اور ایک شب ہم کچھ دوست چپکے سے اسماء بن لادن کے کیمپ میں جا پہنچ۔ چند نو تعمیر شدہ کچھ مکانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی اُخچے اسماء بن لادن کی پناہ گاہ ہے جہاں ان کے ساتھ انہی کی طرح کے بہت سے عرب نوجوان قیام پذیر ہیں۔ ایک رات ہم وہاں رہے۔ اُخچے اسماء بن لادن سے ملاقات ہوئی، دلبے لبے قد کا ایک نوجوان، افغانی لباس پہنے ہوئے، سر پر گلہری باندھے، کندھے سے کلاشکوف لٹکائے اور ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح گھماتے ہوئے سامنے آیا تو یوں محسوس ہوا کہ کوئی افغان عالم دین کسی دینی مدرسہ میں سبق پڑھا کر درس گاہ سے باہر نکل رہا ہے۔ اسماء بن لادن کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ ہیں جو اسی خیمه لستی میں قیام پذیر ہیں بلکہ دس تر خوان پر سردادہ کپڑوں میں مبوس تیرہ سال کا ایک بچہ ہمارے ہاتھ دھلاتے ہوئے آگے بڑھا تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دوست نے بتایا کہ اُخچے اسماء کا بیٹا ہے۔ جی چاہا کہ اس بچے کے ہاتھ سے پانی کا برتن لے لوں اور خود اس کے پاؤں دھلانا اس جو سعودی عرب میں اپنے خاندان کے بلند و بالا محلات کے بجائے افغانستان کے ایک کیمپ میں اپنے پر عزم اور مجابد بیاپ کے ساتھ صرف اس لیے صعوبتیں برداشت کر رہا ہے کہ وہ اسلام کی سر بلندی اور نفاذ کا خواہاں ہے اور اس بارے میں کسی مصلحت اور لچک کا روادار نہیں ہے۔

چیزیں بات ہے کہ اسماء بن لادن کا کیمپ دیکھ کر مجھے جناب رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت ابو بصیر کا وہ کیمپ یا داگیا جوان ہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد مظلوم مسلمانوں کو کافروں کے مظالم سے بچانے کیلئے پناہ گاہ کے

طور پر بنایا تھا۔ ابواصیم صحیح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو کر مدد نہیں پہنچے تو جناب رسول اللہؐ معاہدہ کی رو سے انہیں واپس کفار کے پاس بھجوانے کے پابند تھے۔ چنانچہ آپ نے معاہدے پر عمل کر کے انہیں واپس کر دیا۔ مگر ابواصیم نے مکہ مکرمہ واپس جانے کے بجائے راستہ میں سمندر کے کنارے ایک کیپ بنالیا جو دیکھتے دیکھتے کفار کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی محفوظ پناہ گاہ بن گیا اور بالآخر کفار کو خود معاہدہ کی اس شق سے دستبردار ہونا پڑا۔ خدا کرے کہ آج کا یہ ابواصیم بھی مسلمان جہادیں کو محفوظ پناہ گاہ مہیا کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کی یہ جدوجہد دنیا میں اسلام کے غلبہ و نفاذ کا نقطہ آغاز بن جائے، آمین یارب العالمین۔

## سعودی حکمران خاندان، علماء کرام، اسماعیل بن لادن

روزنامہ پاکستان، لاہور ۲۸ اپریل ۱۹۹۶ء

روزنامہ پاکستان اسلام آباد کے مدیر جناب حامد میر نے افغانستان میں سعودی عرب کے ممتاز تاجر اور جہاد افغانستان کے حوالے سے عالی شہرت یافتہ شخصیت اسماعیل بن لادن سے مل کر ایک جرأۃ مندانہ قدم اٹھایا ہے، اس پر وہ بلاشبہ مبارکباد کے ساتھ ساتھ اہل دین کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کیونکہ اس سے انہیں ایک ایسے عنوان پر معلومات حاصل کرنے اور گفت و شنید کا موقع ملا ہے جس کے گرد ہنی تحفظات کا ایک تہہ درتہہ حصار قائم ہو گیا تھا، اور بہت سے حضرات ان ذہنی تحفظات کی وجہ سے اس بارے میں کچھ کہنے اور لکھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود جاب محسوس کر رہے تھے۔

حرمین شریفین کی مسلسل خدمت اور اپنے بعض اسلامی اقدامات کی وجہ سے سعودی عرب کے حکمران خاندان کو عالم اسلام میں ہمیشہ احترام حاصل رہا ہے، اور اس احترام کے باعث ان کے بارے میں کوئی بات کہتے ہوئے اختیاط کے کئی پہلو ملحوظ رکھنا پڑتے ہیں۔ بالخصوص دو امور میں تو آن جبکی سعودی عرب کے حکمرانوں کی تعریف کیے بغیر کوئی بات آگے نہیں بڑھتی:

1. ان میں سے ایک حرمین شریفین کی توسعی اور حجاج کرام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کی پالیسی ہے،
2. اور دوسرا معاشرتی جرائم میں شرعی حدود کے نفاذ کے باعث ان کے بارے میں کوئی بات کہتے ہوئے اختیاط کے ہونا ہے، جس کی مثال اسلامی قوانین کی برکات کے ثبوت میں اکثر دی جاتی ہے۔

لیکن ان دو معاملات سے ہٹ کر قومی زندگی اور اجتماعی معاملات کے دیگر پہلو ایک عرصہ سے توجہ طلب ہیں، اور ان امور میں سعودی عرب کے حکمران خاندان اور دینی حلقوں کے درمیان کشمکش دن بدن واضح ہوتی جا رہی ہے۔

ملکتِ عربیہ سعودیہ کا قیام موجودہ صدی کے تیرے عزیز میں اس وقت عمل میں آیا تھا جب یورپی ممالک کی مسلسل سازشوں کے نتیجے میں عالم اسلام کی نمائندگی کرنے والی ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کا خاتمه ہو گیا تھا۔ عرب نیشنلزم کے نزدیک اگر میں عرب صوبوں کو خلافتِ عثمانیہ سے باغی کر کے مستقل ممالک کی شکل دے دی گئی تھی۔ اور خلافتِ عثمانیہ کی

طرف سے حجازِ مقدس کے گورنر شریفِ مکہ شاہ حسین کو ترکی کی خلافتِ عثمانیہ سے چھکا راحصل کرنے کے باوجود اپنی مستقل حکومت قائم کرنے کیلئے فضاساز گار نہیں مل تھی۔ اور برطانوی استعمار نے ان کے خاندان میں بغاوت و تقسیم کا تجھ بوجران کا پورے عرب کا بادشاہ بننے کا خواب پریشان کر دیا تھا۔ ان حالات میں نجد سے تعلق رکھنے والی دو قوتوں آگے بڑھیں اور ۱۹۲۶ء میں شریفِ مکہ شاہ حسین سے حجازِ مقدس کا کنٹرول حاصل کر کے مملکتِ عربیہ سعودیہ کے نام سے ایک نئی سلطنت کی داغِ میل ڈال دی۔ ان میں:

1. ایک قوت سیاسی تھی جو آل سعود کے نام سے نجد کے ایک علاقہ پر ایک عرصہ سے حکمران چلی آ رہی تھی،
2. اور دوسری قوت مذہبی تھی جو نجد کے عظیم مصلح اشیخ محمد بن عبد الوہاب کے خاندان اور پیر و کاروں پر مشتمل تھی اور عرب قبائل اور عوام کی ایک بڑی تعداد ان سے منسلک تھی۔

اشیخ محمد بن عبد الوہاب کی تحریک شرک اور رسوم و مبادات کے خلاف اصلاحی تحریک تھی، مزاج میں تیزی اور شدت تھی اور بعض دینی معاملات میں جداگانہ رائے اور تقدیر بھی رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے عالمِ اسلام بالخصوص بر صغیر پاک و ہند کے مذہبی حلقوں میں انہیں وہ پذیرائی نہیں ملی جو انہیں نجد و حجاز کے علاقوں میں حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن بہر حال وہ ایک اصلاحی تحریک تھی جس نے قوت حاصل کی اور پھر آل سعود کے ساتھ مل کر نئی قائم ہونے والی سلطنت میں شریک حکومت خاندان کا درجہ حاصل کر لیا۔

بتایا جاتا ہے کہ ”آل سعود“ اور اشیخ محمد بن عبد الوہاب کے خاندان کے درمیان، جسے ”آل شیخ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ خاموشِ معاهدہ طے پا گیا تھا کہ مملکتِ عربیہ سعودیہ کا دستور قرآن و سنت ہو گا، ریاست میں مکمل شرعی نظام نافذ کیا جائے گا، اور قضاء و شرعی نظام ”آل شیخ“ کی تحویل میں ہو گا جو اس حیثیت سے مملکت کے پورے نظام کو شرعی طور پر کنٹرول کرے گا۔

شاہ عبد العزیز بن سعود کے دور میں اس معاهدہ پر پوری طرح عملدرآمد ہوتا رہا اور ملک کے اجتماعی نظام پر شرعی فیصلوں کی چھاپ اور آل شیخ کی بالادستی قائم رہی۔ لیکن ان کے بعد معاملات میں اس درج کی گرجوشی باقی نہ رہی اور پاپیسی امور پر آل شیخ کی بالادستی کا پہلو کمزور پڑتا چلا گیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس علمی و دینی شخصیت نے اختلافات کا دوٹوں اظہار کیا وہ اشیخ محمد ابراهیم بیس جو حکمہ شرعیہ کے سربراہ اور قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ اشیخ محمد بن ابراهیم چار واسطوں سے اشیخ محمد بن عبد الوہاب کے پوتے ہیں۔ شاہ عبد العزیز بن سعود کے برادر نسبتی بیس اور شاہ فیصل شہید کے ماں ہیں۔ اپنے وقت کے بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے، ان کے فناولی دلیک کر ان کی علمی ثقاہت اور جرأۃ و عزیزیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ابتدائی دور میں انہیں تمام حکومتی نظام کے گمراں اعلیٰ کی حیثیت حاصل تھی اور تمام معاملات شرعی توییش کیلئے ان کے سامنے آتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ حکومت نے کچھ شعبوں کو ان کی دسترس سے مستثنی کرنے کی کارروائی کی، مثلاً تجارتی تباہات کے فیصلوں کیلئے شرعی حکمہ کی بجائے الگ تجارتی عدالت قائم کر دی گئی، جس پر اشیخ محمد بن ابراهیم نے احتجاج کیا، اور اس سلسلہ میں ان کے خطوط ان کے مطبوع فتاویٰ میں موجود ہیں، مثلاً:

• اربعین اثنائی ۵۷ھ کو گورنر ریاض کے نام اپنے خطوط میں انہوں نے تجارتی تباہات کو حکمہ شرعیہ سے

الگ کرنے کی کاروائی کو شرعی اصولوں سے متصادم قرار دیا اور اس پر شدید احتجاج کیا۔ اس قسم کے متعدد خطوط حکومت کے مختلف ذمہ داروں کے نام سے انہوں نے تحریر کیے جوان کے مطبوعہ فتاویٰ میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد حکومت نے سرکاری حکاموں کے ملازمین سے متعلقہ تباہات کو بھی حکمہ شرعیہ سے الگ کر کے ان کیلئے مستقل لیبرٹریوں قائم کر دیا، اور اشیخ محمد بن ابراہیم نے متعلقہ حکام کے نام اپنے خطوط میں اس پر بھی احتجاج کیا۔

ان معاملات میں شیخ کا موقف یہ تھا کہ ملک کے اجتماعی نظام کا کوئی حصہ بھی حکمہ شرعیہ کے اختیار سے باہر نہیں ہے، اور شرعی عدالت کو ہر مسئلہ اور معاملہ کا شرعی نقطہ نظر سے جائزہ لینے کا حق حاصل ہے۔ شیخ علمی وجہت اور بزرگی کی وجہ سے ان کے سامنے انکار کی تو کسی میں بہت نہیں تھی لیکن ان کے احتجاج در احتجاج کے باوجود حکومتی نظام میں تبدیلیوں کا پرناہ بدستور آں سعودی مرضی کے مطابق بہتار ہا۔ حتیٰ کہ تجارت معاملات، ملازمتوں کے امور، اور بینکوں کے نظام سمیت ملک کے اجتماعی نظام کا بیشتر حصہ حکمہ شرعیہ کے دائرہ اختیار سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

اشیخ محمد بن ابراہیم کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اپنائی خوددار، غیور اور بے باک علم دین تھے، انہیں ایک موقع پر شاہ فیصل شہید نے وزیر عدل بن ناجا ہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے وزارت کی ضرورت نہیں، جو باتیں میں کہتا ہوں ان پر عمل کرو۔ ان کی حق گوئی کی کیفیت یہ تھی کہ شاہ فیصل شہید کے دور میں ٹیلیویژن کو سرکاری طور پر ملک میں راجح کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی تو انہوں نے شدت سے مخالفت کی کہ اس سے لوگوں کے اخلاق خراب ہوں گے۔ شاہ فیصل شہید نے کہا کہ عام لوگوں کا تقاضا ہے اور ہمیں لوگوں کے جذبات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تو اس پر شیخ نے کہا کہ ہمیں صرف قرآن و سنت کے احکام کا لحاظ رکھنا چاہیے، لوگ اگر کل یہ کہیں کہ ہمیں ملک فیصل کی بجائے کوئی اور حکمران چاہیے تو کیا لوگوں کی یہ بات بھی قبول کرلو گے؟

الغرض اشیخ محمد بن ابراہیم نے ملکی نظام کو مکمل طور پر شرعی احکام کے تابع رکھنے کیلئے پورا ذر صرف کیا اور اپنی زندگی میں حکمہ شرعیہ میں ہر سطح پر قاضیوں کے تقریب و برخواہی پر بھی اپنا کائز رو رکھا لیکن یہ سب کچھ ان کی زندگی تک تھا۔ جب ۱۳۸۹ء میں ان کی وفات ہوئی تو حکمہ شرعیہ کے سربراہ کا یہ منصب ہی سرے سے ختم کر دیا گیا۔ چنانچہ ان کی جگہ اب اشیخ عبدالعزیز بن باز جو انہی کے شاگرد ہیں، سعودی عرب میں سرکاری سطح پر سب سے بڑے علم شمار ہوتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت مفتی کی ہے اور بحیثیت قاضی انہیں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس تفصیل کے ذکر کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ سعودی عرب میں حکمران خاندان اور علماء کے درمیان آج جو کشمکش نظر آرہی ہے وہ نہیں بلکہ اس کی تاریخ نصف صدی پر محیط ہے۔ اور اس کا بنیادی کتلة علماء کا یہ موقف ہے کہ شرعی عدالت اور حکمہ شرعیہ کا کام صرف جرام کی شرعی سزاویں دینا ہیں ہے بلکہ اجتماعی نظام کے دیگر شعبوں مثلاً نظم و نسق، تجارت، میعشت اور دوسرے حکاموں کو بھی شرعی اصولوں کے مطابق چلانا ضروری ہے اور ان کے فیصلے بھی قرآن و سنت کی روشنی میں ہونے چاہیے۔

اس پس منظر میں سعودی عرب کے حکمران خاندان کے ساتھ وہاں کے سرکردہ علماء کرام کی موجودہ کمیٹی کا جائزہ لیا جائے تو مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس کمیٹی کا آغاز اس وقت ہوا جب جولائی ۱۹۹۲ء میں سعودی عرب کے ایک سو سے زائد علماء اور علمی شخصیات نے اپنے دستخطوں کے ساتھ مذکورة النصیحة (خیر خواہی کی یادداشت) کے نام سے ایک مفصل عرضداشت سعودی عرب کے فرمائز و شاہ فہد بن عبد العزیز کی خدمت میں پیش کی جو کتابی سائز کے ایک سوبیں صفحات پر مشتمل ہے۔

اس یادداشت میں ملک کے مجموعی نظام کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے شرعی نقطہ نظر سے مختلف شعبوں میں غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اصلاحات تجویز کی گئی ہیں۔ ان اصلاحات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

- ملک کے اجتماعی نظام پر قرآن و سنت کی مکمل بالادستی قائم کی جائے،
- لوگوں کے شرعی حقوق اور رائے کی آزادی بحال کی جائے،
- سعودی نظام ختم کیا جائے،
- سرکاری دولت کو عیاشیوں اور فضول خرچیوں میں ضائع کرنے کا سلسلہ ختم کیا جائے،
- امریکہ اور دیگر اسلام دشمن مغربی طاقتوں کے ساتھ تعلقات و معابدات پر نظر ثانی کی جائے،
- اور عالم اسلام کی حقیقی وحدت کیلئے جدوجہد کی جائے۔

اس یادداشت کو سعودی عرب کے چار اکابر علماء ائمۃ سفرالجوابی، ائمۃ سلیمان العودہ، ائمۃ عبد اللہ الجبرین، اور ائمۃ عبد اللہ الجلاسی کی تائید بھی حاصل ہے، جن کے خطوط اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہیں۔ اور ان میں اول الذکر دو بزرگ یادداشت پیش ہونے کے بعد سے اب تک زیر حراست ہیں۔ یادداشت پیش ہونے کے بعد سینٹرلوں علماء کرام گرفتار کر لیے گئے، جن میں بہت سے اب بھی جیلوں میں ہیں۔ یادداشت پر دستخط کرنے والے دو اہم راجہنما ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ المسعری اور ڈاکٹر سعد الفقیری لنڈن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف پر جوش تقریریں کرنے والے مجاهد عالم ائمۃ الشیعہ القرنی جلاوطنی اور گرفتاریوں کے مراحل سے مسلسل گزرتے رہتے ہیں۔

لنڈن میں لجنۃ الدفاع من الحقوق الشرعیۃ کے نام سے سعودی علماء کا ایک گروپ ڈاکٹر محمد المسعری کی قیادت میں اپنے مطالبات کیلئے جدوجہد میں مصروف ہے اور ان علماء کو اپنی اس جدوجہد میں ائمۃ امامہ بن لادن کی حمایت حاصل ہے۔ امامہ بن لادن کا موقف بھی اس کا علاوہ کچھ نہیں ہے کہ سعودی عرب میں مکمل شرعی نظام نافذ کیا جائے، سود کا نظام ختم کیا جائے، اور امریکی تسلط سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ انسانی حقوق، آزادی رائے اور قانون کی حکمرانی کے دعویدار مغربی ذرائع ابلاغ اور لاہیاں سعودی عرب کے دینی حقوقوں کی اس جدوجہد کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اور ان کی حمایت کیلئے صرف اس وجہ سے آگے نہیں بڑھ رہیں کہ یہ جدوجہد اسلام کے حوالے سے ہے اور سعودی علماء لوگوں کے حقوق کی بحال کا شریعتِ اسلامیہ کے حوالے سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں عالم اسلام اور خاص طور پر پاکستان کے دینی

حلقوں اور علماء کی جماعتیں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مصلحتوں اور تحریفات کے حصار سے باہر نکلیں اور سعودی عرب کے علماء کرام اور اہل دین کی اس جائز دینی اور شرعی جدوجہد کی حمایت کریں تاکہ سعودی عرب جو حریم شریفین کی وجہ سے پورے عالم اسلام کی عقیدتوں کا مرکز ہے، صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے دنیا کی قیادت کر سکے۔

## ڈیلی ٹیلی گراف اور دیوبندی مکتب فکر

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۱۹۹۸ء

برطانیہ کے مذہبی حلقوں میں ان دونوں ”ڈیلی ٹیلی گراف“ کی ایک روپرٹ کا بہت چرچا ہے جو انکش کے اس معروف اخبار نے دو ہفتے قبل مذہبی حلقوں کے تحریکیے کے شائع کی ہے۔ اس روپرٹ میں خاص طور پر دیوبندی مکتب فکر کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے فروغ میں اس جماعت کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ روپرٹ میں طالبان کی تحریک کا بطور خاص حوالہ دیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں آباد مسلمانوں کام و بیش میں فیصلہ حصہ دیوبندیوں پر مشتمل ہے اور یہ مذہبیت اور بنیاد پرستی کو پھیلانے میں سب سے پیش ہیں۔ روپرٹ میں تبلیغی جماعت اور دیوبندی مدارس کا تذکرہ بھی اسی پس منظر میں کیا گیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ افغانستان میں شکست کے بعد سوویت یونین کے بھرجانے اور کمیونزم کی پسپائی کے نتیجے میں امریکہ واحد سپریاور کے نعرے کے ساتھ سامنے آیا ہے، مغربی ممالک کم و بیش سب کے سب اس کے ساتھ ہیں، اور کمیونزم کے بعد مغربی قوتوں نے اسلام کو اپنابسا سے بڑا حریف قرار دے کر اسلام اور دیندار مسلمانوں کے خلاف مجاز آرائی کا سلسہ شروع کر کھا ہے۔ چنانچہ کمیونزم کے خلاف قائم ہونے والے مغربی ممالک کے فوجی اتحاد ”نیٹو“ کو باقی رکھنے کا جواز اس کے ایک سابق سکرٹری جنرل نے یہی پیش کیا ہے کہ ”ابھی اسلام باقی ہے۔“

عالم اسلام کے ساتھ اس محاڈ آرائی میں مغرب اپنی ترجیحات واضح کرتا جا رہا ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ عالم اسلام کے مذہبی حلقة، عسکری تحریکات، اور نفاذ اسلام کی دائی جماعتیں ہماری حریف ہیں۔ پھر یہ تاثر دیا گیا کہ جنوبی ایشیا (پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش) کے دینی مدارس و مراکز اس بنیاد پرستی کا سرچشمہ ہیں۔ اور اب بات اس رخ پر آگے بڑھ رہی ہے کہ مغرب کے بقول ”فساد“ کی اصل جزو دیوبندی مکتب فکر ہے، اور اسلامی تحریکات اور مذہبی جوش و خروش پر قابو پانے کے لیے سب سے پہلے دیوبندیوں سے شمعنا ہو گا۔ اور ہمارے نزدیک ڈیلی ٹیلی گراف کی مذکورہ روپرٹ اسی ہم کا ایک حصہ ہے۔

رقم لحروف نے ۲۰ اگست ۱۹۹۸ء کو مرکزی جامع مسجد بیگم میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی بارہویں سالانہ عالمی ختم نبوت کانفرنس سے خطاب کے دوران اس روپرٹ کا تفصیلی تحریک کرتے ہوئے یہ عرض کیا ہے کہ اس روپرٹ کا مطالعہ اسلام اور مغرب کی عالمی انکش کے تنازع میں کیا جائے، اور اس کی روشنی میں اپنے اهداف اور ترجیحات کا تعین کیا جائے۔

کیونکہ ہمارے نزدیک یہ رپورٹ دیوبندی جماعت کے لیے ایک تمخّع اور کریٹیٹ ہے جو اسلام اور کفر کے میرے میں دیوبندیوں کے اصل مقام کا تعین کرتی ہے، اور انہیں ان کا یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے کہ امام ولی اللہ دہلوی، امیر المؤمنین سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، مولانا محمد قاسم نانوتوی، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے نام لیواؤں کی اس جماعت کا اصل ہدف اسلام کا غلبہ و تفاظ اور عالمی استعمار کا مقابلہ ہے۔ اس لیے اس قسم کی رپورٹوں سے مرعوب یا محبوب ہونے کی وجہے حوصلہ اور جرأت کے ساتھ ان کا سامنا کرنا ہو گا اور ہوشمندی اور تدریکے ساتھ اپنی ترجیحات کا از سرِ نوجائزہ لینا ہو گا۔

## امریکہ اور حرکة الانصار

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۱۹۹۴ء

امریکی وزارت خارجہ نے اس سال عالمی سطح پر دہشت گرد تنظیموں کی جو فہرست جاری کی ہے اس میں فلسطین میں اسرائیلی حکومت سے بردآزماجاہدین کی جماعت حماں کے ساتھ ساتھ افغانستان اور کشمیر کے جہاد میں شریک حرکتہ الانصار کا نام بھی شامل ہے۔ اور امریکی حکومت نے دنیا بھر کی حکومتوں سے کہا ہے کہ وہ اس فہرست میں شامل تنظیموں کی سرگرمیوں پر پابندی لگائیں، ان کے فنڈز ضبط کر لیں، اور انہیں مختلف ممالک میں آمد و رفت کی سہولتوں سے فائدہ نہ اٹھانے دیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبریں بھی اخبارات کے ذریعے سامنے آ رہی ہیں کہ حکومت پاکستان نے حرکۃ الانصار کو خلاف قانون قرار دینے کی تیاری کر لی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

حرکۃ الانصار بندیادی طور پر پاکستان اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے دینی مدارس کے طلباء، اساتذہ اور دینی کارکنوں کی عالمی تنظیم ہے جس کے تحت ہزاروں افراد نے رو سی جا رہیت کے خلاف جہاد افغانستان میں مسلسل حصہ لیا اور ٹریننگ حاصل کی۔ اور اب اس تنظیم کے تحت بے شمار نوجوان مقبوضہ کشمیر کے اندر مجاہدین کشمیر کے شانہ بشانہ بھارتی فوج کی جا رہیت کے خلاف مصروف کار ہیں۔ اس تنظیم میں دنیا کے بہت سے مسلم ممالک کے نوجوان شامل ہیں اور برصغیر، فلپائن، تاجکستان، صومالیہ، اور دوسرے علاقوں کے مسلم مجاہدین کے ساتھ جہادی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

ہمارے نزدیک امریکہ کی طرف سے حرکۃ الانصار کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کا سب سے بڑا مقصد مقبوضہ کشمیر میں اس کے کردار کو ختم کرنا ہے، کیونکہ اس وقت مقبوضہ کشمیر میں عسکری طور پر سب سے زیادہ فعال اور موئیتے نیم وہاں کی حرکۃ الانصار ہے جس کی موجودگی میں امریکہ کیلئے کشمیر میں اپنے پروگرام کو آگے بڑھانا مشکل ہو گیا ہے، کیونکہ امریکہ ایک عرصہ سے کشمیر کو تقسیم کر کے اس بندر بانٹ میں اپنے لیے وادی کا خطہ حاصل کرنے کا خواہشمند ہے تاکہ وہاں فوجی اڈہ قائم کر سکے، لیکن حرکۃ الانصار اور دیگر مجاہدین تنظیمیں اس امریکی پروگرام کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں اور وہ اس طرح کی دھونس سے انہیں غیر موثر بنا چاہتا ہے۔

امریکہ تو خیر وہی کرے گا جو اس کی پالیسی ہے مگر حکومت پاکستان سے ہم یہ ضرور گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ امریکہ

پرستی میں اس حد تک آگے نہ بڑھے کہ ملک کے بنیادی مسائل اور قومی مفادات ہی کو داؤ پر گاہے کیونکہ یہ ملک اور قوم کے ساتھ صرخ غداری ہو گئی۔

## عالمِ اسلام کے دینی حلقات اور امریکہ بھادر

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ۔۔۔ جنوری ۱۹۹۸ء

”امریکہ اور عالمِ اسلام“ کے عنوان سے الشریعہ کی اشاعت پیش خدمت ہے۔ اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ان مختصر صفات میں ممکن نہیں ہے تاہم ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ عالمِ اسلام کے دینی حلقوں اور امریکہ کے درمیان دن بدن واضح تر ہونے والی فکری اور تہذیبی کشمکش کا عمومی منظر قاریین کے سامنے آجائے اور اس کشمکش میں دینی حلقوں کی پوزیشن اور موقف کا اندازہ ہو جائے۔

افغانستان میں سوویت یوینین کی شکست کے بعد جہاں سوویت یوینین کی عظیم قوت بکھری ہے اور مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی ریاستیں آزاد ہوئی ہیں وہاں عالمی سطح پر طاقت کا توازن بھی ختم ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے بعد امریکہ انا ولا غیری کے نعروہ کے ساتھ دنیا کی تہاچ پڑھراہٹ کو محکم کرنے کیلئے مسلسل اقدامات کر رہا ہے۔ لیکن اس کے دل میں یہ خوف بھی بیٹھا ہوا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ قانون نظرت کے خلاف ہے اور جلد یا بذریعہ کسی نہ کسی طاقت کو اس کے مدعوقے میں سامنے آنے کی صلاحیت رکھنے والی قوتوں کا اندازہ کر کے ان سے نئنی کی مخصوصہ بندی میں مصروف ہے:

- امریکی دانشوروں کا خیال ہے کہ جیسیں مستقبل قریب میں سامنے آسکتا ہے اور اگر ریاستہائے متحده یورپ کا خواب اپنی تعبیر سے عملی طور پر بہرہ دہ جاتا ہے اور اس کی قیادت جرمی یا فرانس کے ہاتھ آ جاتی ہے تو یہ بھی اس کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ خطرناک عالمِ اسلام ہے جو اگرچہ منتشر ہے، جدید شیکنا لو جی اور ایٹھی قوت سے محروم ہے اور سیاسی قیادت بے بہرہ ہے لیکن مرکاش سے اندو نیشیا تک مسلسل آبادی رکھنے والی اس قوت کو اگر نظریاتی سیاسی قیادت مل جاتی ہے اور وہ مغربی ثقافت کے فریب کا جال توڑ کر اپنے ماضی کی طرف واپس پلات جاتی ہے تو اسے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی تلافی کرنے کیلئے چند سالوں سے زیادہ کا عرصہ درکار نہیں ہو گا اور اسے دنیا کی قیادت سنبھالنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

- امریکہ کے دانشوروں کو یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ مسلم ممالک میں مغرب پرست حکمران گروہوں کی پیدا کردہ تمام تر کا دُنیوں کے باوجود اسلامی تحریکات کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے اور ان کے جوش و جذبہ، صلاحیت کا را اور دائرہ عمل میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔

- اس کے علاوہ مغربی لا بیوں نے مسلم ممالک میں اسلام اور مغربی تہذیب کو گلڈ کر کے اسلام کا نیا ایڈیشن

پیش کرنے کیلئے دونہر کی جو قلمروی قیادت کھڑی کی تھی اس کا ظلم ٹوٹ رہا ہے اور ملتِ اسلامیہ اصلی، خالص اور پرانے اسلام کی طرف واپس لوٹ رہی ہے۔

اس لیے آج عالم اسلام کے دینی حلقوں اور مدارس و مرکزوں امریکہ کے نزدیک دشمنوں کی فہرست میں مبہل نمبر پر ہیں اور وہ دنیا کے کسی بھی مسلم ملک میں خالص اسلام کے عملی نفاذ کو روکنے اور اس کے علمبرداروں کو منتشر کرنے اور غیر مؤثر بنانے کیلئے اپنا پوازور صرف کر رہا ہے۔ جبکہ دہشت گردی اور بینا پرستی کے عنوان سے دینی حلقوں کی کردار کشی کیلئے پیشتر عالمی ذرائع ابلاغ وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔

امریکہ نے عالم اسلام میں ان ”خطرات“ سے منٹھنے کیلئے ۱۹۹۱ء میں ہی منصوبہ بندی کر لی تھی جس کی تفصیلات زیر نظر شمارہ میں ڈاکٹر نور محمد غفاری ایم این اے کے مضمون میں آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ قارئین سے اسے بطور خاص ملاحظہ کرنے کی گزارش ہے کیونکہ امریکہ نے اپنی ترجیحات اور حکمتِ عملی اس میں بالکل واضح کر دی ہے اور اس کے بعد اس سلسلہ میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام کا راستہ رونکے کیلئے امریکہ کے عزم اور پروگرام کیا ہے؟ دینی حلقوں، مرکزوں، مدارس، جماعتوں اور شخصیات کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عالمی نکاش کی موجودہ صورتحال کا صحیح ادراک حاصل کریں اور اپنی ترجیحات اور طرزِ عمل پر نظر ثانی کر کے حوصلہ، تدبیر اور منصوبہ بندی کے ساتھ یہ جنگ لڑیں۔ جب جنگ سر پر آئی پڑی ہے اور اسے لڑے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے تو بے دلی اور تذبذب کے ساتھ لڑنے کا فائدہ؟

## امریکی جرائم اور شہر سدوم

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۹ مارچ ۱۹۹۸ء

گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے ایک میکی جریدہ ماہنامہ ”کلام حق“ نے جنوری ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں امریکہ کے ایک دانشور ڈاکٹر حم فال ویل کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ

”اگر خدا نے امریکہ کے گناہ معاف کر دیے تو خدا کو سدوم اور عمورہ سے معافی مانگنا ہوگی۔“

سدوم اور عمورہ ان پانچ بستیوں میں سے ہیں جو حضرت لوط علیہ السلام کے زمانے میں اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خدا کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی، آگ بر سی، اور پھر وہ زمین میں دھنس گئیں۔ آج بھی رہ مردار اسی عذاب الہی کی نشانی کی صورت میں سطح زمین پر ان بستیوں کی تباہی کی یاد زندہ رکھے ہوئے ہے۔ سدوم، عمورہ، اوسمہ، خبیان، اور نفر نامی ان پانچ بستیوں میں سے صرف نفر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کے کھنڈرات خشکی پر پائے جاتے ہیں جبکہ باقی چاروں بستیاں بھی رہ مردار میں غرق ہو چکی ہیں۔ ان بستیوں کے باشندوں کا تصور کیا تھا؟ قرآن کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے دو باتوں کی بطور خاص نشاندہی کی ہے۔ ایک یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام پر ایمان لانے اور ان پر نازل ہونے والی آسمانی تعلیمات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ وہ ہم جنس پرستی کی لعنت کا شکار ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت لوط علیہ السلام کو قوم کی تباہی کی خبر دینے کیلئے اللہ تعالیٰ کے

فرشته آنماکش کے طور پر خوبصورت اڑکوں کی شکل میں آئے تو پوری قوم ان کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے معصوم پیغمبر کو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کیلئے بصد حسرت یہ کہنا پڑا تھا کہ الیس منکم رجل رشید کیا تم میں بات کو سمجھنے والا ایک آدمی بھی نہیں ہے؟

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دھرا تی ہے اور ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ نسل انسانی کا ایک بڑا حصہ آسمانی تعلیمات سے انکار پر ڈھا ہوا ہے اور ہم جنس پرستی کے مادر پدر آزاد کلپر اور فرنیسکس سوسائٹی کا دائرہ پوری دنیا تک وسیع کرنے کیلئے سرگرم عمل ہے۔ اس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس دونوں کاتی ایجنڈے کی تکمیل کیلئے اپنی پوری توانائیاں، وسائل اور صلاحیتیں وقف کر چکا ہے۔ امریکی نفیسیات کو سمجھنے کیلئے اس کے ماضی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، اس لیے کہ امریکی ایک قوم نہیں ہیں۔ بلکہ امریکہ کے دریافت ہونے کے بعد یورپ کے مختلف ممالک کے ان ہم جو اور طالع آزمaloگوں نے ادھر کارچ کیا جو اپنی سوسائٹیوں پر قناعت نہ کر سکے اور نئے دریافت شدہ براعظم میں جا کر ایک جتنی کی شکل اختیار کر گئے۔ انہوں نے اس خط کے اصل باشدوں کو ہدھیلتے دھلکتے ”کارنز“ کر دیا، حتیٰ کہ انہیں ان کی اصل شناخت سے محروم کر کے ”ریڈ انڈین“ کا مصنوعی نام دے دیا اور وہ آج اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ریڈ انڈین جو اس براعظم کے اصل باشدے ہیں آج قومی، سیاسی، تجارتی، اور عملی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتے اور سوسائٹی کا جزو مغلبل بن کر رہ گئے ہیں۔ جبکہ یورپی آباد کاروں نے امریکہ کو اپنی ممن مانیوں کی آماجگاہ بنار کھا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد بودھے برطانوی استعمار کو عالمی معاملات پر اپنی گرفت ڈھیل پڑتی دکھائی دی تو اس نے اس برخوردار کی اٹھتی جوانی کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کی۔ دوسری جنگ عظیم تک ”ریشماءں“ جوان ہو چکی تھی اور نوریافت شدہ براعظم امریکہ میں یورپی آباد کاروں کا جنمہ ایک منظم قوم کی شکل اختیار کر کے عالمی معاملات سے چھپڑ چھڑا کرنے کی پوشش میں آچکا تھا۔ چنانچہ اس نے ہیر و شیما اور ناگا کا سائکی پر ایتم بم گر کر عالمی سیاست میں اپنی آمد کا اعلان کیا۔ یہ امریکہ بہادر کا پہلا عالمی تعارف تھا جس کے بعد یہ نئی عالمی قوت اسی رخ پر آگے بڑھتی چل گئی۔

امریکہ کا دوسرا عالمی کارنامہ اسرائیل کی سرپرستی ہے جہاں اس نے فلسطینیوں کو ان کے وطن سے بے دخل کر کے ریڈ انڈین کا تحریر وہ رانے اور یہودیوں کو وہاں آباد کر کے انہیں ناقابل شکست طاقت کی حیثیت دینے کا برطانوی منصوبہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور آج اسرائیل صرف اور صرف امریکہ کی پشت پناہی کی وجہ سے تمام تر اخلاقی، سیاسی، اور قانونی تقاضوں کو درکرتے ہوئے فلسطینیوں کے وطن پر قابض ہے۔

امریکہ کا تیسرا تجربہ وہ تباہ میں گھنسنے کا تھا جو بری طرح ناکام ہوا اور ویٹ کانگ نے جس عزیمت و جرأت کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کی حفاظت کی، اس کی یاد آتے ہی اب بھی امریکیوں کو جھر جھری آجائی ہے۔

امریکہ کو افغانستان میں اس حد تک کامیابی ملی کہ اس کا سب سے بڑا عالمی حریف سوویت یوینین بکھر گیا جس کے نتیجے میں مشرقی یورپ اور وسطیٰ ایشیا میں امریکہ کا بہادر کوئی شکار گاہیں میسر آگئیں۔ لیکن افغانیوں کی یہ حکمت عملی بھی کامیاب رہی کہ انہوں نے امریکہ کی فوجیں قبول کرنے کی بجائے اس کی مالی، سیاسی، اور عسکری امداد پر قناعت کر کے میدان جنگ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ جبکہ روکی افواج کی واپسی کے بعد مختلف افغان گروپوں کو آپس میں الجھا کر اپنی مداخلت

کارستہ کھلار کھنے کی امریکی پالیسی کو طالبان نے سبو تاش کر دیا۔ آج امریکہ افغانستان کے حوالے سے جیران و پریشان ہے کہ ایک طرف اسے کامل پر طالبان کی حکومت کو ایران اور چین (شیانگ) کے خلاف حرکت میں لانے کے امکانات نظر آرہے ہیں جنہیں وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ جبکہ دوسری طرف افغانستان میں طالبان کا واحد قوت کے طور پر آگے بڑھنا اور بے پک اسلامی نظریاتی ریاست کا قیام اس کیلئے کسی طرح بھی قبل قبول نہیں ہے۔ اور امریکہ اقوام متحده کو آگے کر کے طالبان کو ان دو اهداف سے محروم کرنے کیلئے پورا زور صرف کر رہا ہے۔

امریکہ کا تازہ شکار عراق ہے جسے وہ ایٹھی قوت بننے کی کوشش کرنے کی سزادی رہا ہے۔ اور اسراeel کے ہاتھوں اس کی ایٹھی تنصیبات تباہ کرانے کے بعد سے مسلسل ایسے اقدامات میں مصروف ہے کہ عراق یا خلیج کا لوئی بھی ملک اسراeil کیلئے فوجی خطرہ نہ بن سکے۔ امریکہ اس صورت حال کو خلیج میں اپنی فوجی موجودگی کا حوازن بنانے کیلئے بھی استعمال کر رہا ہے تاکہ تیل کے چشمیں پر اس کا نشروں قائم رہے۔ اور ان مقاصد کیلئے اسے نہ صرف خلیج کی بادشاہیں اور آمریتیں قبول ہیں بلکہ اسے اس خطہ کے عوام کیلئے ووٹ کا حق، رائے کی آزادی، اور دیگر سیاسی و شہری حقوق بجال کرانے سے بھی کوئی دچکپی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اس بات کا تذکرہ دچکپی سے خالی نہیں ہو گا کہ لاہور میں امریکہ کے سابق قونصل جیزل مسٹر رچڈ کی نے ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ سعودی عرب کے دارالحکومت بریاض میں بھی سفارتی خدمات سر انجام دیتے رہے ہیں۔ رقم الحروف نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہاں بھی انہوں نے شہری حقوق کیلئے کبھی بات کی ہے؟ اس پر مسٹر رچڈ کی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر لہاکہ ”وہاں کون ایسی بات کر سکتا ہے؟“ اور اطف کی بات یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنتگار کرنے، قاتل کو تصاص میں کھلے بندوں قتل کرنے، اور شراییوں کو کوڑے مارنے کی جو شرعی سزا یہں افغانستان میں امریکہ کے نزدیک بنیاد پرستی، رجعت پسندی اور تہذیب دشمنی کی علامت قرار پاتی ہیں، سعودی عرب میں انہی سزاویں کے لفاذ اور ان پر عملدرآمد پر امریکہ کو کوئی تکلیف نہیں۔ بات کچھ لمبی ہو گئی ہے لیکن گفتگو جب امریکی جرائم کے حوالے سے ہو رہی ہے تو چند بڑے جرام کا مختصر تذکرہ ضروری تھا۔

امریکہ اور اس کے ”دھیاں“ یورپ کے داخلی معاشرتی جرام کی فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہے جہاں عصمت اور عزت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی، خاندانی سٹم بھر کر رہا گیا ہے، رشتہوں کا نقش پالائی کی آخری حدود کو چھو رہا ہے، اولاد کے دھنکارے ہوئے بوڑھوں کیلئے اولڈ پیپلز ہومزکی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، بن بیانی ماں اور نامعلوم باپوں کی اولاد کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے، ہم جنس پرستی حقوق میں شماری کی جانے لگی ہے جس کیلئے باقاعدہ مظاہرے ہوتے ہیں اور قانون سازی کی حاجی ہے، چوری و دُکیتی کی اور داتوں کے بچھلے سب ریکارڈ ٹوٹ چکے ہیں، اور آسمانی تعلیمات سے اخراج بلکہ انکار اور ان کا نشخراڑانے کی روشن نے مہذب ہونے کی علامت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

ان حالات میں اگر ڈاکٹر جم فال نے امریکہ کے گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے سدوم اور عمورہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھا ہے تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔ امریکہ آج کی دنیا میں سدوم اور عمورہ کے کلچر کا ہی نمائندہ ہے اور اگر اس نے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہ کی تو اسے سدوم اور عمورہ جیسے انجام سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اس لیے کہ فطرت کے قوانین سب کیلئے یکساں ہوتے ہیں اور ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

## طالبان اور داڑھی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۵ مارچ ۱۹۹۸ء

افغانستان میں طالبان کی حکومت نے داڑھی کے مسئلہ پر سختی شروع کی اور داڑھی نہ رکھنے والوں پر تعزیر جاری کی تو بہت سے اہل علم نے اسے محسوس کیا اور کہا کہ یہ سختی غیر ضروری ہے۔ کئی دوستوں نے راقم الحروف سے بات کی تو میں نے عرض کیا کہ یہ مسئلہ شرعی اور علمی نہیں، نفسیاتی ہے۔ اور میرے نزدیک طالبان کا یہ طرز عمل داڑھی کے خلاف پھیلائی جانے والی اس نفرت کا نفسیاتی رد عمل ہے جو مغرب کے درائعِ ابلاغ کا وظیرہ بن گیا ہے۔ کیونکہ مغرب جن چیزوں کو کثر اسلامیت کی علامت کے طور پر پیش کر رہا ہے اس کے رد عمل میں کثر اسلامیت جب اپنے سفر کا آغاز کرے گی تو وہ انہی چیزوں سے بسم اللہ کرے گی۔ اس لیے ان معاملات کو شرعی دلائل اور ترجیحات کے حوالے سے نہیں بلکہ مغرب کے طرز عمل کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

بات صدر محترم جناب محمد فیض تارڑ کی داڑھی سے چلی تھی جو بلاشبہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسے دیکھ کر ناک بھلوں چڑھانے والے بھی کم نہیں ہیں حتیٰ کہ ملک کی اپوزیشن لیڈر محترمہ بنے نظر بھٹونے بھی اپنے جذبات کا اظہار اچھے انداز میں نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ جواب تدریت کی طرف سے انہیں مل گیا ہے کہ جس سیاسی اتحاد کیلئے وہ ایک عرصہ سے سرگرم عمل تھیں اس کا قیام ایک داڑھی والے کی صدارت میں عمل میں لایا گیا ہے، اور محترمہ کو کم از کم ایک سال کیلئے داڑھی والے کی قیادت قبول کرنا پڑ گئی ہے۔

## اسامہ بن لادن: کل کا مجاہد، آج کا دہشت گرد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ اپریل ۱۹۹۸ء

اسامہ بن لادن کے خلاف امریکی کمانڈوز کی وسیع پیلانے پر نقل و حرکت کی خبریں اخبارات میں آرہی ہیں۔ سعودی عرب کے متول تاجرانداں ”بن لادن فیلی“ کے اس چشم و چراغ کو امریکہ نے دہشت گرد فرار دے رکھا ہے اور اس کی گرفتاری کیلئے ایک عرصہ سے سرگرم عمل ہے۔ جبکہ یہ سعودی تاجر امارت اسلامی افغانستان میں قیام پذیر ہے اور والی افغانستان ملا محمد ربانی نے ایک بار پھر اس موقف کا اعادہ کر دیا ہے کہ اسامہ ہمارے مہمان ہیں اور ان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ اسامہ بن لادن پر امریکہ کا الزام ہے کہ وہ عرب ممالک میں دہشت گروں کی سپردیتی کر رہے ہیں، ان کی تربیت کا اہتمام کرتے ہیں، صومالیہ میں ان امریکیوں کے قتل کے ذمہ دار ہیں جن کے قتل کے بعد امریکہ کو صومالیہ سے اپنی فوجیں واپس بلانا پڑی تھیں، اور ریاض میں وہ دھماکے انہوں نے کرائے ہیں جن میں متعدد امریکی جاں بحق ہو گئے تھے۔ اور اب تازہ ترین خبر یہ ہے کہ اسامہ بن لادن نے امریکیوں کے خلاف قتل کا فتویٰ جاری کر دیا ہے کہ جہاں

بھی کوئی امریکی قابوچڑھے اسے قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد دنیا بھر بالخصوص پاکستان میں امریکہ کے سفارتی عملہ اور مرکوز کی حفاظت کے انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں اور سفارتکاروں کی سرگرمیاں اور تقلیل و حرکت محدود کر دی گئی ہے۔

اسامہ بن لادن ان میں سے کسی بات سے انکار نہیں ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کے خلاف حالت جنگ میں ہیں، اور حالت جنگ میں دشمن کو نقصان پہنچانے اور کمزور کرنے کی کوئی بھی کارروائی ان کا حق ہے۔ اس لیے وہ ان میں سے کسی بات پر نہ امت اور معدودت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ اپنے وسائل اور طاقت کی حد تک امریکہ کے خلاف ہر اس اقدام کیلئے پر عزم ہیں جو امریکہ کیلئے کسی بھی درجہ میں نقصان دہ ہو۔

اقام الحروف نے کچھ عرصہ قبل افغانستان میں اسامہ بن لادن سے ملاقات کی تھی جس کی تفصیل ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والے مضمون میں ذکر ہو چکی ہے اور اسامہ کی طرف سے جاری کیے جانے والے بعض اعلانات اور بیانات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اور اسامہ کے درمیان اس کشکش کے حوالے سے ان معروضی حالات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے جنہوں نے سعودی عرب کے شاہی خاندان کے بعد ملک کے امیر تین خاندان کے نازوں میں پلنے والے تجارتی شہزادے کو کندھے پر کاشنکوف لٹکانے، کیپوں کی زندگی بسر کرنے، اور امریکہ جیسی سپر پاور کے خلاف مکانڈو کارروائیوں پر مجبور کر دیا ہے۔ اور یہ اس لحاظ سے اسامہ کا ایک جائز حق بھی ہے کہ میڈیا اور لائنگ کے تمام وسائل اس کے خلاف کیمپ میں ہیں اور اس کی کردار کشی کی یکطرفہ مہم مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جبکہ اسامہ بن لادن کو اس میڈیاوار میں ایک بھی ایسا مورچہ میسر نہیں ہے جسے وہ اپنے دفاع کیلئے آزادی کے ساتھ استعمال کر سکے۔

امریکہ کے خلاف اسامہ بن لادن کی اس جدوجہد کو موقف کے اعتبار سے ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ عالم اسلام کے وسیع تناظر میں ہے، دوسرا حصہ خلیج عرب کے علاقائی دائرے سے متعلق ہے، اور تیسرا حصہ سعودی عرب کی داخلی صورتحال کے حوالے سے ہے۔

اسامہ بن لادن نے اپنی امکنوں بھری جوانی کا ایک بڑا حصہ جہاد افغانستان کی نذر کیا ہے اور عیش و آرام کے اسباب و وسائل سے بھرے بلند و بالا محالات کو چھوڑ کر افغانستان کی سکلار خوادیوں میں پھرلوں اور گولیوں کے درمیان عمر عزیز کا سرکش اور منہ زور حصہ گزار دیا ہے۔ سالہاں تک جہاد میں حصہ لیا، خود جنگ لڑی، اور ہزاروں نوجوانوں کو جنگ میں حصہ لینے کیلئے تیار کیا۔ جان بھی خرچ کی اور مال خرچ کرنے میں بھی کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ وہ دور تھا جب امریکہ اپنی ضرورت و مفادات کیلئے جہاد افغانستان کی پشت پناہی کر رہا تھا اور سوویت یوینیون کو شکست دینے کیلئے افغان جاہدین کی بھرپور حمایت و امداد کر رہا تھا۔ اس دور میں دنیا کے ہر خطے سے مسلم نوجوانوں نے افغانستان پہنچ کر جہاد میں حصہ لیا اور جہاد کی تربیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے دین کی سر بلندی اور اسلام کے غلبہ و نفاذ کے جذبہ سے اپنے دلوں اور دماغوں کی شعیں روشن کر لیں۔

سوویت یوینیون کی نوجیں افغانستان سے واپس ہوئیں تو امریکہ کا خیال تھا کہ مختلف ملکوں سے افغانستان میں آنے

وائے مسلمان نوجوان بھی اپنے اپنے وطن واپس لوٹ جائیں گے اور کرائے کے سپاہیوں کی طرح باق عمر فتح کی سرشاری اور اخبارات میں اپنے کارناموں کی خبریں اور تصویریں چھپوائے میں گزاریں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ان نوجوانوں نے ایک نیاشن اپنے سینوں میں پال لیا کہ اپنے ملکوں میں کفر و استھصال کے ظالموں کے خاتمہ اور اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کیلئے اسی جذبہ کے ساتھ کام کریں گے جس جذبے کے ساتھ افغانستان کی سر زمین پر رو سی استعمار کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ صورت حال امریکہ کے نئے عالمی سیٹ اپ کے یکسر منافی اور مسلم ممالک کی مغرب پرست حکومتوں کیلئے قطعی غیر متوقع اور پریشان کن تھی۔ اس سے منٹھنے کیلئے نئی حکمت عملی طے کی گئی کہ جو لوگ رو سی افواج کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھا کر جاہدین اور حریت پسند کہلاتے تھے، انہیں دہشت گرد کا خطاب دے دیا گیا۔ مسلم ممالک کی حکومتوں نے ان نوجوانوں کو سنبھالنے کیلئے جیل خانے تیار کر لیے، ان کی واپسی کا انتظار کرنے کی وجہے ان کی گرفتاری کے مطالبے ہونے لگے، اور پھاٹکی کے چندوں کی قوت برداشت جا چکی جانے لگی۔

اس فضائیں جب جہاڑ افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف ممالک کے مسلم نوجوانوں کیلئے کوئی پناہ گاہ باقی نہ رہی تو اسامہ بن لادن نے ان کی پناہ گاہ بننے کا فیصلہ کیا۔ سوڈان میں ڈیرہ لگالیا اور سوڈانی حکومت کو معاشری خود کفالت کی مہم میں معاونت و مشاورت مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے مجاہد مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کا کام سنپھال لیا۔ دنیا کے ہر مسلم مجاہد کو سپورٹ کرنا اور اس سے رابطہ رکھنا تو اسامہ بن لادن کے بس کی بات نہیں تھی، لیکن وہ اپنی عزیزیت و استقلال اور جرأت و حوصلہ کے باعث جذبہ جہاد سے رضاہر مسلم نوجوان کا نفیسی تی سہارا ضرور بن گیا۔ اور عالمِ اسلام کے وسیع تناظر میں یہی وہ خطرناک قوت تھی جو امریکہ کیلئے اخطراب کا باعث ہو گئی۔ سوڈان کی زمین اسامہ بن لادن پر تنگ کر دی گئی اور اسے اس ملک کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اب اسامہ بن لادن کا یمن پ افغانستان میں ہے جہاں وہ مہماں کی حیثیت سے مقیم ہے اور اس کی سرگرمیوں کا کوئی ایمانیت و رک نہیں ہے جو ہیں ان القوای ایجنسیوں کی باریک بین نگاہوں سے اوچھل رہ سکے۔ البتہ پوری دنیا کے مسلم مجاہدین کے دلوں میں اس کی محبت و عقیدت دن بدن بڑھ رہی ہے اور اسی وجہ سے امریکیوں کے قتل کیلئے اس کا حالیہ فوئی ایتم بھی سمجھا جا رہا ہے۔

خیچ کے حوالے سے اسامہ بن لادن کی جگہ امریکہ کے ساتھ یہ ہے کہ امریکہ فوجی قوت کے بل بوتے پر اس خطہ میں اپنا تسلط دن بدن مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ اس نے اسرائیل کے مکمل تحفظ کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کو منتظر اور بے بس بنائے رکھنے کیلئے اپنے تمام وسائل وقف کر رکھے ہیں۔ وہ تیل کے چشموں پر غاصبانہ قبضہ جمائے ہوئے ہے اور عرب عوام کو ووٹ، آزادی رائے، اور شہری حقوق سے مکمل طور پر محروم کر دینے والی آمریتیوں کا پشت پناہ بنا ہوا ہے۔ اسامہ بن لادن کا مطالبہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری خیچ سے اپنی فوجیں واپس پلا لیں، عربوں کے تیل اور دولت کا ظالما نہ استھصال بند کریں، اور عرب ممالک اور اقوام متحده کی خود مختاری بحال کروں، تاکہ عرب عوام پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ کسی قسم کے دباؤ اور مداخلت کے بغیر اپنے فیصلے خود کر سکیں۔

سعودی عرب کی داخلی صورت حال میں اسامہ بن لادن کو یہ شکایت ہے کہ وہاں اسلام کی مکمل عملداری نہیں ہے۔ شاہی نظام ہے جو اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، قوی خزانہ شاہی خاندان کے اللوں تملوں میں برباد ہو رہا ہے، سوڈان

معیشت نے ملک کو ہوکھلا کر دیا ہے، سعودی عرب کے عوام کو شریعت اسلامی کے مطابق شہری حقوق حاصل نہیں ہیں، ملک کو امریکہ کے ہاتھوں گروی رکھ دیا گیا ہے، اور سعودی عرب کی موجودہ پوزیشن کی وجہ سے امریکہ اور اسرائیل پورے مشرق و سطی میں من مانی کارروائیاں کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کر رہے۔

یہ ہے حالات و واقعات کا وہ تسلسل جس نے بن لادن فیملی کے اس تجارتی شہزادے کے ہاتھ میں کلاشکوف پکڑا کر اسے امریکہ جیسی سپر پاور کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ وہ امریکیوں کو جہاں ملیں قتل کرنے پر آگیا ہے اور امریکہ اس کی گرفتاری کیلئے بے قرار ہے۔ اس کمکش کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک کافی کی طرح اسامدہ کی گرفتاری کیلئے بھی مقامی اور علاقائی ذرائع کو استعمال کرنے میں امریکہ کا میاہ ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکی استعمار کے تسلط سے خلیج عرب کی آزادی کی جگہ میں اسامدہ بن لادن ایک نئے گوریلا لیڈر کے طور پر تاریخ کے مستقل باب کا عنوان بن جائے۔ اس کا فیصلہ تو تاریخ گرے گی لیکن اس مرحلہ پر ہم اپنی گزارشات کا اختتام بعض حقوقوں کے اس نازک اور چھپتے ہوئے سوال کا جائزہ لیتے ہوئے کرنا چاہیں گے کہ اسامدہ بن لادن آخر ہتھیار کی زبان میں کیوں بات کرتا ہے؟ اور کیا حکومتوں اور نظاموں کے خلاف ہتھیار اٹھانا اور قتل کی ڈھنکیاں دینا دہشت گردی نہیں ہے؟

سوال بجا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیے کہ امریکہ بھی تو خلیج میں ہتھیار کی زبان استعمال کر رہا ہے۔ اس نے اسرائیل کا خیز غیر ملکی قوت کے بل بوتے پر ہی عربوں کے سینے میں گھونپ رکھا ہے، وہ عربوں کے تیل اور دولت پر مسلح فوجوں کی طاقت کے زور پر ہی قابض ہے، اس نے عرب عوام کی شہری آزادیوں اور شرعی حقوق کا استبداد و قیامت کی نالی سے ہی روک رکھا ہے، اور عرب ممالک کی خود مختاری اس کی فوجی چھاؤنیوں کے تہ خانوں میں ہی جکڑی پڑی ہے۔ اس لیے اگر کسی عرب نے ہتھیار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھایا ہے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑی کہ آزادی کی جنگیں اسی طرح لڑی جاتی ہیں۔ پھر ہم تو سید احمد شہید، شاہ اسمائیل شہید، جzel بخت خان، مولانا محمد قاسم، سردار محمد خان کھرل شہید، حافظ ضامن شہید، نقیر اپنی، اور حاجی صاحب ترنسک زنی کے خطے کے لوگ ہیں۔ ہمیں جنگ آزادی اور ہتھیار کا تعلق سمجھنے کیلئے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم تو ان مراحل سے کئی بار گزر چکے ہیں۔ اور جنوبی ایشیا میں امریکہ کی موجودہ پالیسیاں مستقبل قریب میں ہمارے انہی مراحل سے ایک بار پھر گزرنے کی نشاندہ ہی کر رہی ہیں۔

## مغربی دانشور اور طالبان کا اسلام

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۱۹۹۸ء

برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے گذشتہ سال ایک تقریب میں اپنے دانشوروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اسلام کا مطالعہ کریں اور بطور نظام زندگی اور تبادل سسٹم اسے استدی کریں، لیکن اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے دو باتوں کی طرف مت ویکھیں، ایک یہ کہ ہمارے بڑوں نے اسلام کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے، دوسری یہ کہ اس وقت مسلمان کیسے نظر

آرہے ہیں۔

برطانیہ ہی کے ایک ممبر پارلیمنٹ جمہاری شل نے چند سال پہلے لیسٹر میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس اسلام سے ہمارے بڑوں نے متعارف کرایا ہوا اور ہے، جو اسلام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ اور ہے، جبکہ دنیا میں اس وقت موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں میں جو اسلام نظر آتا ہے وہ ان دونوں سے مختلف ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آج اسلام دنیا کی ضرورت بن گیا ہے اور موجودہ سیاسی، معاشرتی سسٹم کی ناکامی کے بعد اب آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی طرف رجوع کیے بغیر نسل انسانی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ جبکہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی اگر محفوظ حالت میں کسی مذہب کے پاس موجود ہیں تو وہ صرف اسلام ہی ہے۔ لیکن کفیوڑاں اس بات نے پیدا کر کھا ہے کہ کتابوں میں جو اسلام ملتا ہے اس کا موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں اور معاملات سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا کو ضرورت دراصل کتابوں والے اسلام کی ہے، ہماری زندگیوں والے اسلام کی نہیں۔ کیونکہ ہمارا یہ برائے نام اسلام تو ہمیں مشکلات و مسائل میں سہارا نہیں دے رہا، دنیا نے انسانیت کے مسائل کیا حل کرے گا؟

بر صغیر کی تحریک آزادی کے عظیم رہنما مولانا عبد اللہ سنہدھی جب ماسکو گئے اور کمیونسٹ لیڈروں سے اسلام کے فلسفہ حیات اور نظام زندگی پر بات کی تو ان سے سوال کیا گیا کہ یا اپنے فلسفہ اور سسٹم دنیا میں کسی جگہ عملاً رانجھی ہے؟ مولانا سنہدھی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج مولانا سنہدھی گا قافیہ اس سوال کے جواب میں خاموش رہنے پر مجبور نہیں ہے، اس لیے کہ طالبان نے کتابوں میں لکھے ہوئے اسلام کو افغانستان کی سر زمین میں عملی شکل دینے کا کام شروع کر دیا ہے اور یہی بات مغرب کے دانشوروں کیلئے سب سے زیادہ پریشانی کا باعث بتی ہوئی ہے۔

اسلام نام ہے سادگی، قناعت اور بھاشی کا۔ اور یہ صرف ہمارے تصوف کے موضوعات نہیں بلکہ سیاست کے بنیادی ستون بھی ہیں۔ سادگی، قناعت اور بھاشی کروڑوں روپے کی لگات سے بننے ہوئے ایوانوں میں لاکھوں روپے کے خرچ سے اجتماعات کر کے ان عنوانات پر لکھ تقریب کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان اصولوں کو ذاتی اور اجتماعی زندگی میں عملاً نافذ کرنے کا نام ہے جس کا بھرپور نمونہ خلفاء راشدین<sup>2</sup>، حضرت عمر بن عبد العزیز<sup>3</sup> یا ان کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی<sup>4</sup> اور سلطان محی الدین اور نگزیب عالمگیر<sup>5</sup> جیسے نیک دل حکمران ہیں۔ اور سیاست و حکومت کا یہی انداز ہے جس کی آج کی دنیا کو ضرورت ہے۔

آج کے دانشوروں میں اس طرز سیاست اور طرز حکومت کو پڑھ کر دنیا کے جغرافیے میں وہ خطے تلاش کرنے لگتے ہیں جہاں اس کی جھلک نظر آتی ہو۔ مگر قدمتی سے دنیا کا کوئی مسلمان ملک اس کی جھلک پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور اب پہلا موقع ہے کہ طالبان کی حکومت سادگی، قناعت اور بھاشی کے ان سنہری اصولوں کو اپنی حکومت اور سیاست کی بنیاد بنا کر دنیا کو کتابوں میں پائے جانے والے خالص اسلام کا عملی نمونہ دکھاری ہے۔ مجھے کابل، قندھار اور جلال آباد میں طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد جانے کا اتفاق ہوا ہے، امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاهد اور ان کی حکومت کے کئی اساطین سے ملاقات اور گفت و شنید ہوئی ہے، ان کا طرزِ بودباش اور لوگوں کے ساتھ معاملات کا انداز دیکھا ہے، سچی بات یہ ہے کہ کتابوں والے اسلام کا عملی نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بیت المقدس کی چاپیاں وصول کرنے کیلئے بذات خود تشریف لے گئے تھے، اس وقت کیفیت یہ تھی کہ کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے تھے، ان کا غلام اوٹ پر سوار تھا اور عکیل امیر المؤمنین کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تاریخ نے ایک اور منظہ بھی دیکھا تھا کہ عیسائی علماء ہاتھوں میں پرانی تباہیں اٹھائے ان میں سے بیت المقدس کے فتح کی نشانیاں پڑھتے جاتے تھے اور ایک ایک نشانی کو حضرت عمرؓ میں دیکھتے جاتے تھے۔ اور بالآخر سب کے سب پکارا ٹھے تھے کہ بیت المقدس کی چاپیاں اس کے حوالے کر دو، ہماری کتابوں کے مطابق بیت المقدس کا فتح یہی ہے۔ آج پھر بیت المقدس فتح کا منتظر ہے اور وہ فتح اسی طرز کا کوئی درویش ہو گا جو دنیا کے پروٹوکول اور پرستی کے جھوٹے ضابطوں کو درکرتا ہو اسادگی، قفاعت اور جفاشی کے ساتھ آگے بڑھے گا اور بیت المقدس پر ایک بار پھر اسلام کا ہالی پرچم اہراے گا۔

ابتدہ طالبان کی بعض ترجیحات کو میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے کہ ممکن ہے میری سوچ ہی کوتاہ ہو۔ اس لیے کہ طالبان کا بنیادی مقصد صحیح ہے، ان کا خلوص اور تقویٰ شک و شبہ سے بالاتر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے رخصتوں کے دامن میں پناہ لینے کی بجائے عزیمت کا راستہ اختیار کیا ہے جو ملتِ اسلامیہ کی اصل منزل ہے۔ اور انہوں نے ہمارے روایتی اسلام کا پرچم بلند کرنے کی بجائے کتابوں والے پرانے اور خالص اسلام کو ملی زندگی میں رانج کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے جس کے بارے میں ماسکو کے میونسٹ لیڈروں نے مولانا عبد اللہ سندھی سے سوال کیا تھا اور جس اسلام کو کتابوں سے تلاش کرنے کا مشورہ شہزادہ چارلس اپنے دانشوروں کو دے رہے ہیں۔ طالبان کوئی حادثہ نہیں بلکہ حالات کے مذکور کا ایک فطری مرحلہ اور تاریخ کے ایک سوال بلکہ چینچ کا عملی جواب ہیں جس کا نسل انسانی کو صدیوں سے انتظار تھا اور جو آسمانی تعلیمات اور وحی الہی کی طرف انسانی معاشرے کی وابسی کا نکتہ آغاز ہیں۔

## دو گھنٹے افغان سفارت خانے میں

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۵ اپریل ۱۹۹۸ء

ورلد اسلام فورم (برطانیہ) کے سیکرٹری جنرل مولانا ضاء الحق سیاکھوی اور ان کے رفیق محترم مولانا اور نگزیب خان نے گذشتہ روز اسلام آباد میں امرت اسلامی افغانستان کا سفارت خانہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو خیال ہوا کہ نئے افغان سفیر ملا عبد الحکیم مجاهد سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی، چلودوں نوں کام اکٹھے ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہم تینوں اور مولانا اللہ و سایا قاسم سفارت خانے جا پہنچے۔ میری بہت سی کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے سے وقت لینے کے ٹکلف میں نہیں پڑتا، موقع پر کام جائے تو بھیک ورنہ پھر سہی کے فارمولے پر کثری عمل کرتا ہوں۔ گیٹ سے چٹ کھجوائی تو جلدی بلا یا گیا۔ سفیر محترم موجود تھے بلکہ افغان وزیر اطلاعات ملا امیر خان متفقی بھی تشریف لائے ہوئے تھے، ان سے غیر متوقع ملاقات کی خوشی ہوئی۔ اس سے قبل کامل میں ان سے مل چکا ہوں، نوجوان ہیں، ذہین ہیں، اور گفتگو کا اچھا

سلیقہ رکھتے ہیں، اردو بول لیتے ہیں اس لیے پاکستانی حضرات کو ان سے گفتگو میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوتی۔ دونوں حضرات اپنی پہلے سے ط شدہ مصروفیات بھگتا رہے تھے اس لیے ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا اور پھر دونوں سے الگ الگ ملاقات ہو گئی۔ پہلے ملا امیر خان مقتی ہمارے پاس انتظار گاہ میں آئے اور وہیں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے، ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا اور انہوں نے میرے والد محترم (شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدر) کا حال بطور خاص دریافت کیا۔

والد صاحب کے براہ راست اور بالواسطہ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد افغانستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی عمر اس وقت پچاسی برس سے زائد ہے اور وہ اب بھی جمیل اللہ تعالیٰ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں بخاری شریف پابندی کے ساتھ پڑھا رہے ہیں۔ والد صاحب پشتوں ہیں اور پشتو میں روانی کے ساتھ گفتگو اور خطاب کرتے ہیں۔ گذشتہ سال قندھار جا کر امیر المومنین ملا محمد عمر مجاهد سے مل چکے ہیں اور اب ضعف و عالت کے باوجود کابل جانے کا شوق رکھتے ہیں، جبکہ اب یہ سفر ظاہران کے بس کی بات نہیں نظر آتا۔

افغان وزیر اطلاعات سے افغانستان کی موجودہ صورت حال اور طالبان کی حکومت کو درپیش مختلف مسائل پر تفصیلی بات چیت ہوئی۔ یعنی الاقوای حقوق کا وہ دباؤ بھی زیر بحث آجیا جو اسلامی احکام و قوانین پر عملدرآمد کے حوالے سے مسلسل بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس دباؤ میں اگرچہ اضافہ ہو رہا ہے لیکن امیر المومنین ملا محمد عمر اپنے عزم پر قائم ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ صرف ایک چنان پرکھڑے ہوں، اردوگرد کا سارا ماحول ان کے خلاف ہو جائے اور کوئی بھی ان کا ساتھ نہ دے تب بھی وہ اسلامی احکام و قوانین پر مکمل عملدرآمد کے موقف پر قائم رہیں گے اور اس مسئلہ پر کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ انہوں کہا کہ امیر المومنین کا یہ عزم ہماری اصل قوت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں ضرور سرخواز کریں گے۔

ملا امیر خان مقتی نے بتایا کہ افغانستان میں کیونٹ دور کے نظام تعلیم کے مکمل خاتمه کے بعد کچھ وقفہ رہا ہے مگر اب تعلیم ادارے دوبارہ کھلنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسے ہیں کے لگ بھگ منے دینی مدارس نے بھی کام شروع کر دیا ہے جن کے نصاب میں انگریزی زبان اور دیگر عصری تقاضوں کو سمویا جا رہا ہے۔ صنعتی حوالے سے انہوں نے بتایا کہ شمال کی کشمکش کی وجہ سے بڑے صنعتکار ایجنسی سرمایہ کاری کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ البتہ قندھار کے اردو تھوڑا بہت کام شروع ہے جسے آہستہ آہستہ بڑھایا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شمال کا مسئلہ اپنی جگہ پر مگر جنوب اور وسط میں تو مکمل امن ہے اور ایسا امن افغانستان کی تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے صنعتکاروں اور تاجریوں کو کسی خوف کے بغیر آنا چاہیے اور سرمایہ کاری کر کے اس شعبہ میں اپنے افغان بھائیوں کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

افغان وزیر اطلاعات نے ایک اور ضرورت کی طرف توجہ دلائی کہ افغان عوام میں دینی مسائل کا شعور بیدار کرنے اور دینی معلومات کو عام کرنے کیلئے دینی لٹریچر کی ضرورت ہے۔ اور وہ ایسی کتابوں کا فارسی اور پشتو میں ترجمہ کرائے انہیں شائع اور تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں مسائل و احکام کو اپنے طریقے سے سمجھایا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی مشہور کتاب ”بیہقی زیور“ کا بطور خاص ذکر کیا جس کا ترجمہ وہ کراچی کے ہیں مگر طباعت کیلئے

و سائل میر نہیں ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ کچھ اصحابِ خیر دچھپی لے کر اُسی پینڈ کتابوں کی طباعت کی ذمہ داری اٹھائیں تو ایک اچھے اور مفید کام میں پیشافت ہو جائے گی۔

مالا امیر خان مقی سے ملاقات کے بعد ہم سفیرِ محترم ملا عبد الحکیم مجاہد سے ملنے کیلئے ان کے کمرے کی طرف بڑھے تو ذہن اس تردید میں تھا کہ اللہ جانے انہیں پہلے کہیں دیکھا ہے یا نہیں۔ لیکن آمناسامنا ہو تو صورت کچھ دیکھی بھائی سی لگی مگر پہچان نہ سکا۔ البتہ انہوں نے معاشرہ کے ساتھ یہ سوال داغ دیا کہ ”راشدی صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟“ مجھے مذدرت کے سوا کوئی جواب نہ سوجھا کیونکہ دماغ کا کمپیوٹر اس کے بغیر کچھ نہیں بتا رہا تھا کہ انہیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔ چنانچہ یہ عقدہ انہیں خود ہی حل کرنا پڑا کہ افغان مجاہدین کے شہید را ہنما مولوی نصر اللہ منصور کے ہمراہ وہ ہمارے ساتھ ایک دفعہ آزاد کشمیر کے سفر میں شریک تھے جہاں مولوی صاحب شہید نے دارالعلوم تعلیم القرآن بالغ کے سالانہ جلسہ سے خطاب کیا تھا۔ مولوی عبد الحکیم مجاہد جامعہ علمون اسلامیہ بنوی ٹاؤن کربلائی کے فاضل ہیں، اردو و عربی کے ساتھ ساتھ انگلش پر بھی دسترس رکھتے ہیں اور معاملہ فہم اور زیر ک عالم دین ہیں۔

افغان سفیر نے اپنی تفصیلی گفتگو میں مختلف امور پر روشنی ڈالی جن میں سے دو باتوں کا تذکرہ اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے ”وسیع البیناد حکومت“ کی اصلاحات کا ذکر کیا جس کا افغانستان کے حوالے سے ایک عرصہ سے چرچا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ اس پر زور دے رہا ہے کہ افغانستان میں وسیع البیناد حکومت قائم کی جائے۔ اس سے ان کی مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ عوام کے مختلف گروہوں اور طبقات کی نمائندگی حاصل ہو، کیونکہ عوام کی اکثریت طالبان کے ساتھ ہے اور طالبان کی حکومت اور نظام میں ہر طبقہ، گروہ، علاقہ، اور زبان کے افراد شامل ہیں۔ بلکہ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ خالص اسلامی ذہن رکھنے والے لوگوں کی تہا حکومت نہ رہے اور اس میں سیکولر اور کمیونسٹ عناصر کو بھی شریک اقتدار کیا جائے تاکہ طالبان اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کے پروگرام پر عمل نہ کر سکیں۔ اس لیے اگر سارا افغانستان ایک طرف ہو جائے اور گفتگی کے چند لوگ دوسری طرف رہ جائیں تب بھی یہ مغربی ممالک یہی مطالبہ کرتے رہیں گے کہ ”وسیع البیناد حکومت“ کے نام پر انہیں ضرور شریک حکومت کیا جائے۔ جبکہ یہ بات ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے کیونکہ جہاد افغانستان کا مقصد ہی اسلامی نظام کا نفاذ تھا، اور طالبان کی تحریک اسی مقصد کو زندہ کرنے اور برداشت کار لانے کیلئے وجود میں آئی ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں کسی چک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ آج امریکہ اور اقوام متحده ہمیں تسلیم نہیں کر رہے لیکن اس سے کیا فرق پڑے گا؟ انہوں نے چین کو بھی ایک عرصہ تک تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اس کی ضد میں تائیوان کو سلامتی کوئی نسل میں بٹھائے رکھا۔ لیکن حقیقت خود کو تسلیم کر لیتی ہے چنانچہ انہیں آخر کار چین کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔ اس لیے ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے اور اس بات کا یقین ہے کہ ہم اگر اپنے عزم اور پروگرام پر قائم رہے اور اس میں مسلسل آگے بڑھتے رہے تو اقوام متحده اور دوسرے ادaroں اور ممالک کیلئے ہمارا وجود تسلیم کیے بغیر کوئی پارہ کار نہیں رہے گا اور وہ حقیقت سے زیادہ دیر تک انکار نہیں کر سکیں گے۔

ہمارے وفد میں شریک مولانا رضاۓ الحق سیاکھوی اور مولانا اور گزریب خان ایک عرصہ سے برطانیہ میں قیام پذیر ہیں

اور مغربی میدیا اور لایوں کی براہ راست زد میں ہیں۔ اس لیے ان کے ذہنوں میں بہت سے سوالات و خدشات تھے، لیکن افغان سفارت خانے میں دو گھنٹے گزارنے کے بعد جب ہم باہر نکلے تو ان کے چہروں کا اطمینان اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ ان خدشات و سوالات سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ اور اس کی دلیل مولانا ضاء الحق کا یہ عزم ہے کہ وہ برطانیہ جا کر طالبان حکومت کے خلاف پھیلائے گئے شلوک و شبہات کے ازالہ کیلئے کام کریں گے اور وہاں کے مسلمانوں کو حاصل صورتحال سے باخبر کرنے کی کوشش کریں گے۔

## طالبان کی حکومت اور اقوام متحده کا منشور

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ جولائی ۱۹۹۸ء

اس بات سے قطع نظر کہ انسانی حقوق کے حوالے سے مغربی ممالک نے ہمیشہ دہرامیار کر کھا ہے۔ کشیر، فلسطین، بوسنیا، چچنیا، اور کوسوو میں انسانی حقوق کی پامالی امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی وہ توجہ کبھی حاصل نہیں کر سکی جوان کے اپنے مفادات کے علاقوں میں ہمیشہ امتیازی حیثیت کی حامل رہی ہے۔ ہمارے نزدیک انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ، اقوام متحده کا منشور، اور اقوام متحده کے متعلقہ اداروں کی قراردادوں کا موجودہ فریم و رک ہی سرے سے تنازع ہے۔ مثلاً نکاح و طلاق اور خاندانی نظام کے بارے میں اقوام متحده کے چار ٹرینے جو اصول بیان کیے ہیں، قرآنی تعلیمات ان کو قبول نہیں کرتیں۔ اور اس چار ٹرکوں من و عن قبول کرنے سے کوئی بھی مسلمان فرد، خاندان، یا قوم بنا دی اسلامی تعلیمات سے مخرف قرار پاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دفعات اس چار ٹریں ایسی موجود ہیں جو اسلامی احکام و قوانین کی نفی کرتی ہیں۔ اور اب جبکہ عالم اسلام کے بیشتر ممالک آزاد ہو چکے ہیں، ان میں سے بہت سے ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری کی تحریکات مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں، دنیا کے نقشہ پر بہت سی مسلم حکومتوں کے گرجہ اور تذبذب کے باوجود عالم اسلام ایک واضح بلاک کی شکل اختیار کرتا نظر آ رہا ہے، اور پاکستان کے ایسی دھماکوں کے بعد طاقت کے عالمی توازن میں بھی عالم اسلام کی پوزیشن پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ اس صورتحال میں اقوام متحده کا منشور اور اس کی آڑ میں امریکہ و دیگر مغربی ممالک کا طرز عمل پہلے سے زیادہ مقتنص ہوتا جا رہا ہے، اور عالم اسلام کی دینی تحریکات اور اسلامی عناصر اس کی مسلسل نفی کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت اب تک جو اقوام متحده کے منشور اور اس کے دیگر متعلقات پر دستخط کرنے سے گریز ہے اس کا بہس منظر بھی یہی ہے۔

تین سال قبل اقوام متحده کی گولڈن جوبلی تقریبات کے موقع پر ملیشیا کے وزیر اعظم جناب مہاتیر محمد نے مسلم ممالک کو تجویز دی تھی کہ وہ انسانی حقوق کے بارے میں مغربی ممالک کے دہرے معیار اور طرز عمل کے خلاف احتیاج کے طور پر اقوام متحده کی گولڈن جوبلی تقریبات کا بایکاٹ کریں۔ لیکن ایک دو کے سوا کسی مسلم حکومت نے اس تجویز کا ثابت جواب نہیں دیا۔ اس موقع پر جناب مہاتیر محمد نے اقوام متحده کے منشور پر نظر ثانی کا مطالبہ بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ بدلتے ہوئے

حالات اور نئے عالمی حقوق کے پیش نظر اقوام متحده کے انسانی حقوق کے چار ٹکوڑے سر نومرت کرنے کی ضرورت ہے۔  
مگر یہ مطالبہ بھی صدابصرح اثابت ہوا تھا۔

## ازبکستان میں مساجد کی بندش

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اگست ۱۹۹۸ء

روزنامہ نیشن لندن نے ۲۶ جون ۱۹۹۸ء کو خبر دی ہے کہ ازبکستان کی حکومت نے تین ہزار مساجد کو بند کر کے ان میں شانگ سنٹر کھولنے کا فیصلہ کیا ہے اور وزارتِ انصاف کے ایک تیجمان کے مطابق بائیس مساجد کو اس پالیسی کے تحت اب تک بند کیا جا چکا ہے۔

وسطیٰ ایشیائی ان ریاستوں میں روس کے کیونٹ اقلاب کے تسلط کے بعد مساجد کو بند کر دیا گیا تھا اور نماز کا اجتماعی اہتمام اور دینی تعلیم منع قرار دے دی گئی تھی۔ رقم الحرف نے چند سال قبل تاشقند اور سرفقت میں خود ایسی مساجد دیکھی ہیں جو کیونٹ دور میں یمنٹ کے گودام اور سینماہال کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں۔

جباد افغانستان کے بعد روس کو اس خطہ سے واپس جانا پڑا اور سوویت یونین بکھر گیا تو یہ ریاستیں آزاد ہوئیں، لیکن ان میں حکومتیں ابھی تک وہی جلی آرہی ہیں جو کیونٹ دور میں تھیں، اس لیے ان کا مざن اور طریق کارا بھی تک وہی ہے۔

آزادی کے بعد مذہبی لوگ جو اس سے قبل زیر زمین تھے اور خفیہ طور پر تہہ خانوں میں نمازوں اور دینی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے، منظر عام پر آگئے۔ مساجد اور مدارس کھلنے کا عمل شروع ہو گیا اور ہزاروں مساجد پھر سے آباد ہو گئیں۔ جس سے دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور رفتہ رفتہ دینی تحریکات مظہم ہونا شروع ہو گئیں جنہوں نے بعض ریاستوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی جدوجہد کا انداز کر دیا۔ یہ صور تحال ان ریاستوں کی پہلی سے جلی آنے والی کیونٹ مزاج حکومتوں کے لیے قابل قبول نہیں تھی، اور انہیں پڑوں میں ترکی کی سیکولر حکومت کے اسلام دشمن اقدامات سے بھی خوصلہ ملا۔ اس لیے ان ریاستوں میں ”ریورس گیئر“ کا عمل شروع ہو گیا ہے اور ازبکستان حکومت کا یہ فیصلہ بھی اسی کا حصہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حکومتی پاکستان اور عالم اسلام کی دیگر حکومتوں اور یمن الاقوامی مسلم اداروں اور تنظیموں کو اس صور تحال کا نوٹس لینا چاہیے اور وسطیٰ ایشیا کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کے لیے ان ریاستوں کی حکومتوں سے رابطہ کرنا چاہیے، تاکہ اس خطہ میں اسلامی اقدار کے احیا کا جو عمل دوبارہ شروع ہوا ہے وہ فطری انداز میں جاری رہ سکے۔

## حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور جہاد افغانستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹۹۸ء

..... افغانستان میں روس کی مسلح افواج کی آمد کے بعد جہاد افغانستان کا آغاز ہوا تو حضرت درخواستی نے افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے قبائلی علاقے کا طوفانی دورہ کیا جہاں ان کے مرید اور شاگردوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ جہاد افغانستان کی حمایت میں پر جوش بیانات جاری کر کے پورے علاقے میں جہاد کے حق میں فضاگرم کر دی، جس کے اثرات مت تک محسوس کیے جاتے رہے۔

افغان مجاہدین کے ایک سرگرم رہنماء مولوی نصراللہ منصور شہید ایک بار شیر انوالہ لاہور میں جمعیت علماء اسلام کے مرکزی اجلاس کے موقع پر آئے اور کہا کہ میں حضرت درخواستیؒ کی زیارت کیلئے آیا ہوں جنہوں نے قبائلی علماء اور عوام کو جہاد افغانستان کی حمایت کیلئے تیار کر کے ہمارا ستھن صاف کر دیا ہے۔

حضرت درخواستیؒ آخر وقت تک علامت، ضعف، اور نقاہت کے باوجود جہاد افغانستان کیلئے فکرمند رہے اور اس سلسلہ میں بہت سے اجتماعات میں شریک ہو کر خطاب کیا۔ ایک موقع پر اسلام آباد میں افغان مجاہدین کی سات بڑی جماعتوں کے سربراہوں کو جمع کر کے انہیں آپس میں متحدر ہنئے اور دشمن کی سازشوں سے خبردار رہنے کی تلقین کی۔ ساتوں بڑے افغان لیڈر حضرت درخواستیؒ کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ لیکن جنہیں خانہ کعبہ کے اندر کیا ہوا معاہدہ متحدنہ رکھ کر حضرت درخواستیؒ کی تلقین ان پر کیا اثر کر سکتی تھی؟.....

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء

..... حضرت درخواستیؒ کے خطابات و تقاریر کا ایک اہم موضوع جہاد ہوتا تھا۔ جس دور میں جہاد افغانستان کا آغاز نہیں ہوا تھا وہ اس وقت بھی عام طور پر جہاد کے فضائل بیان کرتے اور علماء کرام اور دینی کارکنوں کو جہاد میں حصہ لینے کی تلقین کرتے تھے۔ اور جب افغانستان میں جہاد کا عملی آغاز ہوا تو وہ اس جہادی تحریک کے پشت پناہ بن گئے، انہوں نے افغان علماء کی اس جدوجہد کو شرعی جہاد قرار دیا، اس کی حمایت میں ملک بھر کا دورہ کیا اور خاص طور پر افغانستان کی طویل سرحد کے ساتھ قبائلی علاقوں کا طوفانی دورہ اور تفصیلی دورہ کر کے علماء کرام اور عوام کو جہاد افغانستان کی حمایت و نصرت کیلئے تیار کیا۔ پاکستان کے علماء کرام اور کم و بیش سب اہم دینی جماعتوں نے جہاد افغانستان کی حمایت و اعانت کی ہے لیکن اس جہاد کی پشتی بانی میں جو عظیم کردار حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا عبدالحق گاہی ہے وہ افغان جہاد کی تاریخ میں ایک مستقل اور روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔.....

روزنامہ اسلام، لاپور---۸ مارچ ۲۰۰۳ء

..... مقررین اپنے خطابات میں حضرت درخواستی<sup>گی</sup> کی اس چوکھی لڑائی کا تذکرہ کر رہے تھے جو انہوں نے زندگی بھر باطل کے خلاف لڑی اور ان کی بصیرت افروز باتوں کو یاد کر کے ایمان کی تازگی کا سامان کر رہے تھے جن کے ذریعے انہوں نے اہل وطن کو آنے والے فتنوں سے بر وقت خبردار کر دیا تھا۔ جہاد افغانستان میں حضرت درخواستی<sup>گی</sup> کے سرگرم کردار کا بھی تذکرہ ہوا اور ایک مقرر نے بتایا کہ ابھی افغانستان سے مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تھی اور رو سی افواج کے خلاف مسلح مزاحمت کا کوئی واضح پروگرام سامنے نہیں آیا تھا کہ افغان مہاجرین کے ایک یونپ میں حضرت درخواستی<sup>گی</sup> تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطاب کے دوران مہاجر سامعین کی مسلسل اٹھک بیٹھک شروع کرادی۔ بعد میں فرمایا کہ انہوں نے اب جہاد کرنا ہے اور میں ان کو توبیت دے رہا ہوں۔ یہ ان کی خداداد بصیرت کی بات تھی کہ انہوں نے آنے والے دور کی ضروریات سے بر وقت لوگوں کو خبردار کرنا شروع کر دیا تھا۔.....

## ۶ مئی ۲۰۰۳ء کو جمیعت علماء اسلام فیصل آباد کے زیر ابتمام حضرت درخواستی<sup>گی</sup> کی یاد میں منعقدہ ایک اجتماع سے خطاب کا متعلقہ حصہ

..... حضرت درخواستی<sup>گی</sup> میں ہم نے بارہا کیجا کہ ملک میں کسی فتنے نے سر اٹھایا حالات میں کسی بڑی خرابی کے آثار نمودار ہوئے تو حضرت درخواستی<sup>گی</sup> خاپور سے نکل پڑے اور قریب قریب گھوم گئے، کہیں جلسہ سے خطاب کر کے عوام کو اس خطرہ سے آگاہ کر رہے ہیں، کہیں مدرس کے اجتماعات میں علماء کرام اور کارکنوں سے اس فتنے کے مقابلہ کا عہد لے رہے ہیں، کسی کو سامنے کھڑا کر کے اس سے نعرے لگووار ہے ہیں، کسی کی دستار بندی کر کے اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، کسی کو اس کی سستی پر ڈانٹ رہے ہیں اور کسی کو علمی انداز میں اس کی ذمہ داری یاد دلا رہے ہیں۔ حضرت درخواستی<sup>گی</sup> چند دنوں میں ملک کے اکثر حصوں میں گھوم جایا کرتے تھے اور تحریک کی سی کیفیت پیدا کر دیا کرتے تھے، ہم نے دیکھا ہے کہ ان دنوں میں وہ نہ دن کو آرام کرتے تھے، نہ رات کو کہیں نیند کیلئے رکتے تھے، مسلسل سفر ہوتا تھا اور میرے جیسے متحرک کا رکن بھی دو تین روز سے زیادہ ان کے ساتھ مسلسل سفر نہیں کر پاتے تھے۔ پرانے حضرات کو یاد ہو گا کہ افغانستان پر روسی افواج کی یلغار کے بعد افغانستان کے ساتھ ساتھ قبائلی پٹی میں عوام کو جہاد کیلئے تیار کرنے کی غرض سے حضرت درخواستی<sup>گی</sup> کے طرح چند دنوں میں آزاد قبائل میں گھوم گئے تھے، یہ حضرت درخواستی<sup>گی</sup> شبانہ روز محنت، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق<sup>ح</sup> کے علمی اثرات، اور مقرر اسلام حضرت مولانا مفتی محمد کا مضبوط علمی اور سیاسی موقف تھا جس نے جہاد افغانستان کی پشت پناہی کی تھی اور افغان مجاهدین پورے اعتماد کے ساتھ رو سی افواج کے خلاف نبرد آزمہ ہو گئے تھے۔.....

## اسامہ بن لادن پر امریکی حملہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۴۹۸ء

امریکہ بہادر نے بالآخر اسامہ بن لادن کو اپنے حملوں کا نشانہ بنالیا ہے جو اس امر کا اعتراف ہے کہ واحد سپر پاور ہونے کا دعوے دار ملک اپنے ایک دشمن کو قابو کرنے میں تمام ترسوں اور اثرورسوخ استعمال کرنے کے باوجود ناکام رہا ہے۔ اور اب جھنگلاہٹ کا شکار ہو کر طاقت کے بھوٹے استعمال پر اتر آیا ہے۔

اسامہ پر الزام ہے کہ وہ افریقہ کے دو ملکوں میں امریکی سفارت خانوں کی تباہی کا ذمہ دار ہے اور کچھ دیگر امریکی مراکز کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اس لیے امریکہ کیلئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ تمام تربیتیں الاقوامی ضابطوں اور مسلمہ اصول و روایات کو ایک طرف رکھتے ہوئے دو آزاد ملکوں کی داخلی حدود میں محض اس شبہ پر نہیتے شہریوں کی جانوں سے کھیلے کہ اس کے خیال میں وہاں اسامہ بن لادن موجود ہے، یا وہاں امریکی مرکز پر حملہ آور ہونے کیلئے افراد کو تربیت دی جا رہی ہے اور اس کیلئے سامان تیار کیا جا رہا ہے۔ طاقت کی حکمرانی یا جگل کے قانون کا یہ بے رحمانہ اظہار کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ ہر زمانے کے فرعونوں کا وظیر رہا ہے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کبھی کسی فرعون کو اپنے عالم میں کامیاب نہیں ملی اور ہمیشہ اس کی درندگی اور بربریت کا شکار ہونے والے مظلوم، بے بس، اور نہیتے عوام کو ہی سرخ روئی حاصل ہوئی ہے۔

امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے اپنے اس اقدام کا جواز پیش کرنے کیلئے ٹیلی ویژن پر خطاب بھی کیا ہے اور وہ اپنی چھٹیاں مختصر کر کے واٹ ہاؤس واپس پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اب دنیا اتنی سادہ اور بے خبر نہیں ہے کہ وہ ٹی وی پر امریکہ کے صدر کا چہرہ دیکھ کر مطمئن ہو جائے کہ عزت مآب جو کچھ فرمائے ہیں وہی درست ہے۔ بلکہ اب ٹی وی کے سامنے بیٹھنے والا اور اخبار پڑھنے والا عام آدمی بھی بال کی کھال اتارنے لگا ہے۔ آج صحیح راقم الحروف اخبار پڑھنے کیلئے سما تو ہک آں لندن کے علاقے میں حاجی محمد اشرف خان کی دکان پر گیا تو کچھ حضرات اسی موضوع پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔

ایک صاحب کا کہنا تھا کہ صدر بل کلنٹن کے اس اقدام کے پیچے ان کے ذاتی حالات کا فرمایاں اور انہوں نے اس جنہی سکینڈل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کیلئے یہ سب کچھ کیا ہے جس میں انہیں جیوری کے سامنے واٹ ہاؤس کی ایک ملازمت کے ساتھ جنسی تعلقات کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

جبکہ دوسرے صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ اسامہ بن لادن پر دہشت گردی کا الزام لگانے والا امریکہ اور اس کے حواری مغربی ممالک اس حقیقت سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں کہ اس دہشت گردی کا باعث وہ خود ہیں۔ کیونکہ انہوں نے سازش کے تحت عربیوں کی زمین یہودیوں کو دلو اکروہاں اسرائیل قائم کرایا اور اب تک اسے تحفظ فراہم کیے ہوئے ہیں جو اس سارے تھیے کی اصل جڑ ہے۔ پھر امریکہ اور اس کے حواری ممالک مشرق و سطی میں اپنی بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ براجمن ہیں اور من مانی کر رہے ہیں۔ اس لیے اس خطے کے آزادی خواہ لوگوں کیلئے اس کے سوا کون سارا سستہ باقی رہ گیا ہے کہ وہ اپنے حقوق اور آزادی کیلئے وہی کچھ کریں جو ان کے بس میں ہو۔

ایک اور صاحب کا تبصرہ تھا کہ اصل بات یہ ہے کہ صدر بل کلنٹن نے خلیج عرب اور دوسرے علاقوں میں یہود نواز

پالیسی میں تھوڑی سی پچ پیدا کر لی تھی اور عربوں و مسلمانوں کو کچھ مراجعات دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی جس کی سزا یہودی لابی نے انہیں سیکس سینڈل کی صورت میں دی۔ اس سیکس سینڈل میں یہودی لابی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد کلنٹن نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اب مسلمان ملکوں پر یہ تازہ حملہ ان کا "سبدہ سہو" ہے جس کے ذریعے وہ یہودی لابی کو یہ یقیناً دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے پالیسی میں پچ کا خیال ترک کر دیا ہے اور وہ بہت سے سابق امریکی صدور کی طرح یہودی لابی کے ہاتھوں مکمل طور پر استعمال ہونے کیلئے تیار ہیں۔

انہی میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ان مغربی حکمرانوں اور دانشوروں سے جب پوچھا جائے تو ان کا موقف یہ ہوتا ہے کہ دہشت گردی اور انہیا پسندی کا جواب دہشت گردی اور انہیا پسندی نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص اس کار ہتا کرتا ہے تو اس کے اسباب معلوم کرو، اس کے طرز عمل کا پس منظر دیکھو، اور اس کی جڑ تلاش کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔ مگر مسلمانوں کے بارے میں ان کا معیار یہ نہیں ہے اور یہ دوسرے کئی معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی مسلمانوں کیلئے الگ معیار رکھتے ہیں۔

میراخیال تھا کہ اس امریکی اقدام کے بارے میں عام لوگوں کے تاثرات معلوم کرنے کیلئے کچھ حضرات سے ملاقات کروں گا مگر اسی ایک محفل میں دو تین عام شہریوں کی گفتگو سن کر اندازہ ہو گیا کہ افغانستان اور سوڈان پر امریکہ کے فضائلی ملکوں کے جواز میں صدر بل کلنٹن کی منطق عام لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکی۔ اور انہی میں سے ایک صاحب کے قول امریکہ نے یہ حملے کر کے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ اٹھا قصان اٹھایا ہے۔

صدر بل کلنٹن کا کہنا ہے کہ ان کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ دہشت گردی کے خلاف ہے اور وہ دہشت گردی کے مراکز کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر ہم ان سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ "دہشت گردی" کی تعریف کیا ہے؟ کیاسی کے خلاف ہتھیار اٹھانا مطلقاً دہشت گردی ہے؟ اور کیا اپنی آزادی، خود مختاری، اور حقوق کیلئے جا بار اور ظالم قوتوں کو ہتھیار کا جواب ہتھیار کی زبان میں دینا بھی دہشت گردی کہلاتا ہے؟ اگر امریکی صدر کی منطق یہی ہے تو ہم بعد ازاں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ خود امریکے سے بوریا ستریٹینے پر مجبور کیا تھا۔ اس طویل جنگ آزادی میں امریکی حریت پسند بھی اسی طرح برطانوی حکمرانوں کے مراکز کو نشانہ بناتے تھے اور حکمران گروہ کے افراد کو قتل کرتے تھے جن کے ساتھ کمی بے گناہ بھی قتل ہو جایا کرتے تھے۔ تاریخ اٹھا کر امریکہ کی جنگ آزادی کے ان مراحل پر نظر ڈالیے اور ان تمام لوگوں پر دہشت گرد صدر کلنٹن کو یہ یاد دلانے کی شاید ضرورت نہ ہو کہ وہ خود انہی دہشت گردوں کی نسل میں سے ہیں اور ان کے آباء اجداد میں بھی کوئی نہ کوئی اسامہ بن لادن طرز کا دہشت گرد ضرور رہا ہو گا۔

ہم دہشت گردی کے حق میں نہیں اور اس کی کسی شکل کی حمایت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، لیکن ظالم و جابر قوت کے خلاف اپنی آزادی کیلئے ہتھیار اٹھانے والوں کو دہشت گرد کہنے کے روادر بھی نہیں ہیں۔ صدر کلنٹن کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ امریکہ کی سرپرستی میں فلسطین کا علاقہ وہاں کے اہل باشندوں سے چھین کر یہودیوں کے حوالہ کیا گیا ہے۔ اور

علمی رائے عامہ حتیٰ کے اقوام متحده کی قراردادوں کے علی الرغم امریکہ ان یہودیوں کی سلطنت کی مسلسل سرپرستی اور پشت پناہی کر رہا ہے۔ امریکہ اور اس کے حواری ممالک فوجی طاقت کے بل بوتے پر خلیج میں ڈیہ جمائے بیٹھے ہیں اور تیل کے چشمتوں پر قبضے کے علاوہ عربوں کے سرمائے کا وحثیانہ استھان کر رہے ہیں۔ امریکہ کے تسلط کے باعث خلیج عرب کے پیشتر ممالک کے عوام ان شہری آزادیوں اور سیاسی و انسانی حقوق سے مسلسل محروم ہیں جن کا وہ خود پوری دنیا میں چینی پس بن ہوا ہے۔

اس لیے اگر اسماء بن لادن یاد گیر عرب حریت پسند اپنی آزادی، خود مختاری، اور شہری و انسانی حقوق کیلئے اپنے اوپر مسلط ظالم و جابر قوت کو ہتھیار کا جواب ہتھیار سے دینے پر مجبور ہو گئے ہیں اور جانیں ہتھیں پر رکھ کر خلیج عرب سے امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی مسلسل افواج کی واپسی اور فوجی اڈوں کے خاتمے کا مطالباً کر رہے ہیں تو یہ دہشت گردی نہیں بلکہ حریت اور آزادی کی جنگ ہے جو اس خطہ کے عوام کا جائز حق ہے اور صدر کانٹن کو اسے دہشت گردی کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔

## طالبان کی مزید کامیابیاں

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۱۹۹۸ء

افغانستان میں بالآخر طالبان کی اسلامی حکومت نے مزار شریف اور دیگر ایسے علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے جو ان کے خلاف شمالی اتحاد کے کنٹرول میں تھے۔ اور جس وقت یہ سطور تحریر کی جا رہی ہیں وادی پیش شیر کے علاوہ پورے افغانستان پر طالبان کا کنٹرول قائم ہو چکا ہے۔

طالبان دینی مدارس کے طلباء اور اساتذہ پر مشتمل فورس ہے جو جہاد افغانستان کے نتیجہ میں روسی افواج کی واپسی کے بعد افغان مجاہدین کی مختلف جماعتوں کی مشترکہ حکومت کی ناکامی، اور جہادی تنظیموں کے درمیان بڑھتی ہوئی خانہ جنگی کے رد عمل میں ابھری، اور افغان عوام کے تعاون سے اس نے رفتار فتح پورے افغانستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

جہاد افغانستان میں سرگرم کردار ادا کرنے والی تنظیموں کے قائدین کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے اور انہیں باہمی اعتماد کے ساتھ ایک متحده حکومت قائم کرنے پر آمادہ کرنے کیلئے سرکاری اور غیر سرکاری طور پر متعدد کوششیں ہوئیں، اور بالخصوص پاکستان اور سعودی عرب کی حکومتوں نے ان کے درمیان کئی معابدے کرائے جن میں ایک معابدہ پر اتفاق رائے کے اظہار کیلئے ساتوں افغان جماعتوں کے قائدین کو بیت اللہ شریف کا دروازہ کھول کر اس کے اندر جمع کیا گیا اور وہاں سب لیڈروں نے متحدر ہنے کا عہد کیا، لیکن یہ قائدین ان معابدوں پر قائم نہ رہ سکے۔

ایک موقع پر پاکستان کے بزرگ ترین علماء دین اور مجمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواست نے بھی ان ساتوں لیڈروں کو پشاور میں جمع کیا اور انہیں باہم متحدر ہنے اور جہاد افغانستان کے مظائق اور اسلامی تقاضوں کی تکمیل کیلئے مشترکہ جدوجہد کی تلقین کی، لیکن ان افغان قائدین پر کوئی تلقین اثر انداز نہ ہو سکی۔

جس کے نتیجے میں افغانستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے، اور وہ جہادِ افغانستان جس کی بدولت مشرقی پورپ اور سلطی ایشیائی درجنوں ریاستوں کو آزادی ملی اور جرمی دوبارہ متحد ہوا، خود اپنی سر زمین پر ان لیئر ووں کے منفی طرز عمل نے اسی جہادِ افغانستان کے نتائج کو مٹانے شروع کر رکھ دیا۔ جس پر خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی اور افغان مجاهدین کی انہی سات تنظیموں میں شامل دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ نے اپنے اپنے لیئر ووں کے خلاف بغاوت کر دی اور باہم متحد ہو کر قندھار سے اصلاحِ احوال کا آغاز کیا۔ اور یہ ان درویشوں کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج افغانستان ان کی قیادت میں نہ صرف ایک بار پھر متحد ہو گیا ہے بلکہ خانہ جنگلی اور خلفشار کا خاتمه ہوا ہے، اور افغان عوام کو امن و سکون کے ساتھ اسلامی نظام کی برکات سے مستفید ہونے کا موقع مل رہا ہے۔

طالبان اپنے سربراہ امیر المونین ملا محمد عمر اخوند کی قیادت میں اس عزم پر قائم ہیں کہ وہ جہادِ افغانستان کے منطقی تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے افغانستان میں مکمل اسلامی نظام نافذ کریں گے اور اسے ایک مثالی ریاست بنائیں گے۔ اور اسی مقصد کیلئے انہوں نے افغانستان کا سرکاری نام ”امریتِ اسلامی افغانستان“ رکھ دیا ہے۔

طالبان کی اسلامی حکومت کو عالمی رائے عامہ اور استعماری قوتوں کی شدید ترین مخالفت اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی مسلسل سازشوں کا سامنا ہے۔ کیونکہ ایک صحیح نظریاتی اور عملی اسلامی ریاست کا وجود ان میں سے کسی کیلئے بھی قابل برداشت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحده اور امریکہ سمیت دنیا کے بیشتر ممالک اور عالمی ادارے افغانستان پر مکمل کثروں اور مثالی امن و امان کے باوجود طالبان کی اسلامی حکومت کو تسلیم کرنے کیلئے ابھی تک تیار نہیں ہیں۔ اور ان پر مسلسل دباؤ اور اجرا ہے کہ وہ اقوام متحده اور عالمی اداروں کے پروگرام کو قبول کر کے اسلامی نظام کے عملی اور مکمل نفاذ کے عزم میں پچ پیدا کریں اور دنیا کی دیگر بہت سی مسلم حکومتوں کی طرح اسلام کے نام کو محض ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عالمی برادری کے موجودہ اجتماعی دھارے میں شامل ہو جائیں۔

لیکن طالبان کی حکومت ابھی تک اس دباؤ کا مقابلہ کر رہی ہے اور ایک مکمل اسلامی ریاست کے قیام کے عزم پر پختہ دھکائی دیتی ہے۔ اس لیے پاکستان کے دینی حقوق اور سنجیدہ دینی اداروں اور شخصیات بلکہ دنیا بھر کے اسلامی حقوق کی ذمہ داری ہے کہ وہ طالبان کے اس جائز، اصولی اور اسلامی موقف اور عزم کی محابیت کرتے ہوئے انہیں اخلاقی اور سیاسی پسپورٹ اور پشت پناہی فراہم کریں تاکہ وہ زیادہ حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ سکیں۔ ان گزارشات کے ساتھ ہم طالبان کی تازہ فتح یا یوں پر انہیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی مکمل کامیابی اور استقامت کیلئے دعا گویں، آمین یا رب العالمین۔

## ایرانی سفیر کے طالبان حکومت سے چار مطالبات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ ستمبر ۱۹۹۸ء

پاکستان میں ایران کے سفیر جناب مہدی اخوندزادہ نے امریکی عوام کو پاکستان، ایران اور افغانستان کیلئے یکساں طور

پر خطرناک قرار دیتے ہوئے تینوں ممالک پر زور دیا ہے کہ وہ مشترکہ حکمت عملی اختیار کریں۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے پاکستان اور ایران کے درمیان باہمی مفاہمت و تعاون کی ضرورت و اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے افغانستان میں طالبان کی حکومت کے ساتھ بہتر تعلقات کیلئے چار تجویز پیش کی ہیں۔

ہمیں سفیر محترم کی ان تینوں باتوں سے اتفاق ہے۔ اول یہ کہ فی الواقع امریکی عزادم ان تینوں ممالک کیلئے یکساں خطرہ کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں، دو میں یہ کہ تینوں ممالک کو اس سلسلہ میں مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے، اور سوم یہ کہ پاکستان اور ایران کے درمیان اس بارے میں زیادہ باہمی مفاہمت اور تعاون کی ضرورت ہے۔ مگر طالبان کی حکومت کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کیلئے انہوں نے جو مطالبات اور تجویز پیش کی ہیں وہ ہمارے نزدیک بحث طلب ہیں اور ہم اس سلسلہ میں کچھ معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مثلاً ایران کے سفیر محترم نے پہلا مطالبہ یہ کیا ہے کہ طالبان کی حکومت ان ایرانی سفارت کاروں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے جو ان کے بقول مزار شریف پر قبضہ کے موقع پر گرفتار کیے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں جہاں تک ہماری معلومات بیں طالبان کی حکومت کا موقف یہ ہے کہ مزار شریف پر قبضہ کے موقع پر ایرانی ٹونصل خانے میں کوئی شخص موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہاں سے کسی کو گرفتار کیا گیا ہے۔ تاہم دوسرے مقامات سے کچھ ایرانی شہری حرast میں لیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ اسلامی ایک بڑی مقدار بھی تھویں میں لی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ طالبان کے خلاف جنگ میں ان کے مخالف شمالي اتحاد کے ساتھی تھے اور وہ جنگ قیدی ہیں۔ ہم سفارت کاروں کی غیر مشروط رہائی کے مطالبه کی تائید کرتے ہیں لیکن اگر طالبان کا یہ موقف درست ہے تو جنگی قیدیوں کو سفارت کار قرار دے کر ان کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کرنا سفیر محترم کو زیب نہیں دیتا اور نہ ہی اس کی حمایت کی جا سکتی ہے۔

جناب مہدی اخوندزادہ نے طالبان کی حکومت سے دوسرا مطالبہ یہ کیا ہے کہ شمالی اتحادی جماعتوں کو افغانستان کی حکومت میں شریک کیا جائے۔ یہ دراصل اس مطالبہ کا اعادہ ہے جو دنیا کی مختلف حکومتوں کی طرف سے افغانستان میں وسیع البناء حکومت کے قیام کے عنوان سے ایک عرصہ سے کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ مطالبہ بھی قرین انصاف نہیں ہے۔ اول اس لیے کہ شمالی اتحاد میں شامل انہی جماعتوں کی باہمی خانہ جنگی اور اس کے تیجے میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت اور بد امنی کے رد عمل میں ہی طالبان کی تحریک اٹھی تھی۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ طالبان نے ان جماعتوں کی پیدا کردہ بد امنی اور غارت گری سے نجات دلا کر افغان عوام کو امن فراہم کیا ہے۔ اس لیے اگر طالبان ان کی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کر لیتے ہیں تو خود ان کے اپنے وجود کا جواز ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اس دعوے کی اخلاقی بندادوں سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ ان لیڈروں کی اقتدار کی جنگ سے افغان عوام کو نجات دلانے کیلئے میدان میں آئے ہیں۔ دو م اس لیے کہ اب تو میدان جنگ میں بات بہت آگے بڑھ چکی ہے اور شمالی اتحاد کے لیڈر سمیٹ کر ایک محدود خطہ میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے انہیں اقتدار میں شریک کرنے کی تجویز ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص حکومت ایران سے مطالبہ کرے کہ چونکہ مسعود رجایی کی خلق پارٹی اور آیت اللہ شریعت مدار کے حامی علماء بھی ایرانی عوام ہی کے ایک معتذبہ حصے کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ایران میں وسیع البناء حکومت کے قیام کیلئے انہیں بھی اقتدار میں شریک کیا جائے۔ ہمیں

یقین ہے کہ ایران کے سفیر محمد اس تجویز پر لا حول ولا قوہ پڑھنے کے سوا کوئی اور تبرہ نہیں کر سکیں گے۔ ایرانی سفیر کا تیرامطالہ یہ ہے کہ طالبان کی حکومت افغانستان کے داخلی معاملات میں ان کے بقول سخت گیر اور انتہا پسندانہ طرز عمل کو ختم کر کے متوازن پالیسیاں اختیار کرے۔ طالبان کی داخلی پالیسیوں کے بارے میں اس سے پہلے بھی بعض ایرانی لیڈروں کا یہ تبصرہ سامنے آچکا ہے کہ طالبان اسلام کی انتہا پسندانہ تعبیر پیش کر رہے ہیں اور اسلام کی تصویر کو خراب کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی توجہ طلب ہے اس لیے کہ خود ایران کے مذہبی رہنماؤں نے اپنے ملک میں اسلام کی جس تعبیر کو اختیار کیا ہے وہ عالم اسلام کے اجتماعی رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتی اور اس کی بنیاد ایران کی آثرتی آبادی کے فقہی مذہب انشاعشری پر ہے۔ حتیٰ کہ ایرانی دستور کی بنیاد ”ولایت فقیہ“ کے جس فلسے پر ہے وہ خالصتاً فرقہ وارانہ اور انتہا پسندانہ ہے جو موجودہ عالمی رجحانات توکھا، ملت اسلامیہ کی اکثریت کیلئے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود چونکہ وہ ایرانی ہاشمیوں کی اکثریت کے فقہی مذہب کی رو سے ضروری ہے اس لیے اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اور ایرانی قوم کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر اور اسلامی قوئین کے نفاذ میں اپنے اکثرتی مذہب کو بنیاد بنائے، وہ خواہ ان کے علاوہ مسلمانوں کے کسی گروہ کیلئے بھی قابل قبول نہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی اصول پر ایرانی لیڈروں کو افغان عوام کا بھی یہ حق تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ملک میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ میں اسی تعبیر کو اختیار کریں جو ان کی اکثرتی آبادی کے فقہی مذہب سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور جس طرح ایران میں دینی معاملات کو طے کرنے میں وہاں کی اکثرتی آبادی کے فقہی مذہب کے علماء فاسٹل اتحارثی سمجھے جاتے ہیں اسی طرح افغانستان میں بھی افغان علماء کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے فقہی اصولوں کے مطابق دینی اصول و احکام طے کریں۔ اس میں کوئی الجھاو کی بات نہیں اور یہ بالکل سادہ اور منطقی اصول ہے کہ ہر مسلم ملک میں اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریع وہاں کی اکثرتی فقہی مذہب کے مطابق ہو اور اس میں اسی فہرست کے علماء کو تحریثی تسلیم کیا جائے۔

جبکہ تک اسلام کی نیک نامی یادداہی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مقابلے کامیدان ہے، اگر طالبان کی حکومت اپنے دعوؤں کے مطابق افغان عوام کو میں اور خوشحالی کی منزل سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہی وقت طور پر بدداہی کا باعث بننے والی سخت پالیسیاں اپنے نتائج کے لحاظ سے باقی دنیا کیلئے بھی قابل تقدیر ہن سکتی ہیں۔ اور اگر خدا غواست طالبان اپنے دعوؤں کو عملی جامد نہ پہننا سکے تو تاریخ کے عجائب گھر میں انہی بہت سے خانے خالی ہیں کسی ایک میں وہ بھی فٹ ہو جائیں گے۔ لیکن اس کا فیصلہ ہونے میں ابھی کچھ وقت در کار ہے جس کا سب کو حوصلے کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔

جناب مہدی انوندزادہ نے طالبان کی حکومت سے چوتھا مطالبہ یہ کیا ہے کہ وہ بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کو قبول کریں اور ان کی پابندی کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ایرانی سفیر کے اس مطالبے پر سب سے زیادہ تعجب ہوا ہے کیونکہ ایک نظریاتی مذہبی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ان سے کسی بھی درجے میں اس مطالبے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ موجود بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کے فریم ورک کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی بنیاد مغرب کے سیکولر فلسفے اور اقوام متحدہ کے چار ٹرپر ہے جسے اسلامی تعلیمات قبول نہیں کرتیں۔ اور کسی بھی ملک میں

اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا دعویٰ رکھنے والی حکومت کیلئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ موجودہ بین الاقوامی ضابطوں اور اصولوں کی پابندی قبول کرتے ہوئے اسلام کی مکمل عملداری کے پروگرام پر عمل کر سکے۔ اور اگر کوئی مسلم حکومت اس کا دعویٰ رکھتی ہے تو وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ضرور منافقت کر رہی ہے۔ اب تو اس سلسلہ میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا کہ موجودہ عالمی اسٹریکچر اور اسلام آمنے سامنے کھڑے ہیں اور اگلی صدی کی قیادت سنبھالنے کیلئے ایک دوسرے سے نبرد آ رہا ہے۔ ان میں معاہمت و مصالحت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اور اب یہ فیصلہ میدان میں ہی ہو گا کہ اگلی صدی میں انسانی سوسائٹی کی قیادت اسلام اور موجودہ عالمی نظام میں سے کس نے کرنی ہے۔ اس لیے اگر اس فضائیں کوئی شخص کسی اسلامی حکومت یا تحریک کو موجودہ بین الاقوامی ضابطوں اور اصولوں کی پابندی کی تلقین کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ میدان جگ میں اسلام کو کفر کے سامنے ہٹھیار ڈال دینے کا مشورہ دے رہا ہو۔

جناب مہدی اخوندزادہ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کی اسلامی تحریکات کی طالبان کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی صرف اس وجہ سے ہے کہ طالبان کی حکومت اپنے ملک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کی دعوے دار ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والے بین الاقوامی ضابطوں اور قویین کو قبول نہیں کر رہی۔ گذشتہ سال اندرن میں چند اسلامی تحریکات کے ایک اجلاس میں ایک ممتاز عرب دانشور نے کہا ہم تو صرف اس بات کو دیکھ رہے ہیں کہ طالبان موجودہ عالمی سسٹم کے فریم ورک کو قبول کر کے اسلام کو اس کے تابع کرتے ہیں یا اسلام کو اس کے مقابل ایک مستقل سسٹم کے طور پر پیش کر کے ایک نئے عالمی دور کا نقطہ آغاز بننے ہیں۔ کیونکہ یہی اصل ٹرنگ پوانٹ ہے جہاں سے اسلام کی طرف انسانی معاشرہ کی واہی کا سفر شروع ہو گا۔ اور کیا عجید کہ قدرت نے یہ سعادت طالبان کے حصے میں ہی لکھ رکھی ہو۔ اس لیے ہم جناب مہدی اخوندزادہ اور ایرانی حکومت کے ذمہ دار حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ معروضی حقائق کو نظر انداز نہ کریں اور طالبان کی اسلامی حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی بجائے اسے سپورٹ کریں۔ اور اس نقطہ بلکہ پورے عالم اسلام میں امریکہ کے خطرناک عزم کو نکام بنانے کیلئے فرقہ وارانہ ترجیحات اور تحفظات سے بالاتر ہو کر باہمی تعاون کو فروغ دیں، کیونکہ موجودہ عالمی تناظر میں امریکہ کو شکست دینے اور اس کے اسلام دشمن عزم کو خاک میں ملانے کا واحد راستہ یہی ہے۔

## وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اور طالبان کا اسلام

مابنا نہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۱۹۹۸ء

وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے گذشتہ دنوں مہمند اجنبی میں قبائلی عوام سے خطاب کرتے ہوئے افغانستان میں نفاذِ اسلام کیلئے طالبان کی اسلامی حکومت کے اقدامات کا ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ طالبان نے اسلامی نظام کے ذریعے ملک کے بڑے حصے میں امن قائم کر دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی امن کے قیام کیلئے اس طرح کے نظام کی ضرورت ہے۔

اس پر دنیا بھر کے زمائنِ ابلاغ اور اخبارات میں تھرے ہو رہے ہیں اور سیکولر حلقے اس بیان پر نکتہ جھینک کر رہے ہیں۔ مگر ہم میاں محمد نواز شریف کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہیں کہ طالبان کی اسلامی حکومت نے فی الواقع اپنے زیر نگیں علاقوں میں مثالی امن قائم کر دیا ہے، جو اسلامی قوانین کی برکت ہے اور دن کی روشنی کی طرح ساری دنیا کو نظر آ رہا ہے، اس لیے ہیں بھی اگر امن قائم کرنا ہے اور قتل و غارت، کرپش، دہشت گردی اور بدآمنی سے نجات حاصل کرنا ہے تو اسی نفع پر خالص اسلامی قوانین عمل آنفال کرنا ہوں گے، ورنہ وطن عزیز بدآمنی اور لا قانونیت سے نجات حاصل نہیں کر سکے گا۔

ابتدہ اس کے ساتھ وزیرِ اعظم سے یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ طالبان جیسا اسلام نافذ کرنے کیلئے خود بھی طالبان جیسا بنا ضروری ہے، کیونکہ آم کا پھل ہی کے درخت سے حاصل کیا جاسکتا ہے، خود و جھاڑیوں کے کنارے دامن پھیلائے کھڑے رہنے سے کانٹوں کے سوا کچھ بھی پلے نہیں پڑتا۔

## طالبان جیسا نظام اور دینی مدارس

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹۹۸ دسمبر

ہمارے معاشرے میں عام آدمی کا تعلق دینی تعلیم کے ساتھ قائم رکھنے اور دینی علوم کی حفاظت و ترویج کیلئے دینی مدارس نے گذشتہ سو، سو اسوسی ایونی ہے، وہ بلاشبہ ہماری ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اور کسی سرکاری امداد کے بغیر عام لوگوں کے رضا کار ان تعاون سے انتہائی سادگی، فناعت اور کم سے کم خرچ کے ساتھ اپنے اهداف میں پیشہ رفت کر کے دینی مدارس کے اس نیٹ ورک نے جو سب سے بڑا مقصود حاصل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال کے ارشاد کے مطابق یہ خطہ اپین بننے سے فتح گیا ہے، اور صدی سے زیادہ عرصہ تک فرنگی اقتدار اور مغرب کی فکری اور ثقافتی بلغار کا شکار رہنے کے باوجود اس خطہ کے مسلمانوں کا اپنے دینی عقائد، روایات، ماضی اور اسلاف کے ساتھ ہذا ہنی رشتہ نہ صرف قائم ہے بلکہ دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہی بات مغرب کی سیکولر لایبیوں کیلئے پریشانی کا سب سے بڑا مسئلہ نی ہوئی ہے جس کا اظہار ان دینی مدارس کے خلاف مغربی ابلاغ کے منقی پر اپیگنڈا اور کردار کش مہم سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

ان دینی مدارس نے اسلامی علوم و اقدار کے تحفظ و دفاع کی جنگ کامیابی کے ساتھ لڑی ہے، اور اس تحفظاتی اور دفاعی جنگ کے دور میں دینی مدارس کے تنظیمیں نے بہت سے ایسے تحفظات اختیار کر لیے تھے جو عام لوگوں اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ مگر اس دفاعی جنگ کو صحیح ترتیب کے ساتھ لڑنے کیلئے ضروری تھے اور ان تحفظات کے بغیر یہ مدارس نہ اپنی صاف بندی صحیح رکھ سکتے تھے اور نہ ہی متعین اهداف کی طرف ضروری پیشہ رفت ان کیلئے ممکن تھی۔ انہی تحفظات میں ایک بات دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں ان مدارس کے تنظیمیں اور امانتہ کا بے پچ رویہ تھا کہ وہ تمام تحریص و تخفیف کے باوجود نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کو قبول اور اختیار کرنے

کے روادار نہیں ہوئے اور اصحابِ کہف کی طرح ایک غار میں داخل ہو کر خود کو اردو گرد کے ماحول سے کلی طور پر لا تعلق کر لیا۔

یہ بات بہت سے دانشوروں کے نزدیک قابل اعتراض تھی مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طرز عمل اس بہض کی طرف بڑھنے کیلئے ناگزیر تھا جو دینی مدارس قائم کرتے وقت اس تحریک کے بانیوں کے ذہنوں میں تھا، کیونکہ اگر یہ دینی مدارس اپنی جد اگاہ روشن ترک کر کے ”اجتمائی دھارے“ کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جاتے تو ان کی آخری منزل بھی عملاً وہی ہوتی جو اجتماعی دھارے کیلئے اس دھارے کی حدود تعین کرنے والوں نے طے کر کھی تھی۔ اور اگر یہ دینی مدارس اجتماعی دھارے کے ساتھ بہ جانے کی بجائے اس اجتماعی دھارے کا رخ اپنے اہداف کی طرف موڑنے کی کوشش میں کامیاب دھکائی دے رہے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے کہ پچک رویہ ہے جو ان دینی مدارس نے اپنے نصباب و نظام کے حوالے سے اختیار کیے رکھا اور تمام تر طعن و تشنج اور تقيیدات و اعتراضات کے باوجود انہوں نے اپنی مقرر کردہ حدود سے باہر بھاگنے سے بھی گریز کیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی باشعور شخص صرف نظر نہیں کر سکتا مگر وقت اب بہت آگے بڑھ گیا ہے اور ہم تحفظ اور دفاع کے دور سے نکل کر پیش قدمی اور اقدام کے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت اور پاکستان میں طالبان کی طرز کے اسلامی نظام کی خواہش کا ہر سطح پر اظہار اس پیش قدمی اور اقدام کے دور کا عملی آغاز ہے، اس لیے ہماری دیانت دارانہ رائے ہے کہ دینی مدارس کو اب ان تحفظات پر زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہیے جو تحفظ اور دفاع کی جدوجہد کیلئے تو ضروری تھا مگر اب وہ پیش قدمی اور اقدام کی جدوجہد کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کو ”دفعی جنگ“ اور ”اقدائی پیشرفت“ کے درمیان فرق کا ادراک کرنا چاہیے اور ان ضروریات کا احساس کرنا چاہیے جو اسلام کے نفاذ کے حوالے سے ناگزیر تقاضوں کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور ان ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ان دینی اداروں اور مدارس کے علاوہ اور کوئی قابلِ اعتماد نظام اس وقت موجود نہیں۔

مثلاً انی ضروریات میں ایک ضرورت اسلامی نظام کو چلانے کیلئے رجال کار کی فراہمی کی ہے کیونکہ ایسے افراد کی تیاری انتہائی ضروری ہے جو دینی علوم پر ماہر اندسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ آج کے علمی نظام اور ملک کے اندر وہی سُسمُم کے اہم پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہوں، اور خدا بیوں کی نشانہ ہی کے علاوہ ان کو دور کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ ایسے افراد اگر دینی مدارس تیار نہیں کریں گے تو انہیں یہ بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ کوئی اور ادارہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس ضرورت کو پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہو۔ اس لیے جس طرح دفاع اور تحفظ کے دور میں دینی مدارس نے وقت کے چینچ کو قبول کر کے خود کو اس مشن کیلئے وقف کر دیا تھا، اس طرح انہیں پیشرفت اور اقدام کے نئے دور کا چینچ بھی قبول کرنا ہو گا۔ اور اگر خدا نخواستہ ان کی سُستی اور بے پرواہی سے اقدام اور پیشرفت کی یہ جدوجہد کامیابی کے مطلوبہ اہداف حاصل نہ کر سکی تو اس کی ذمہ داری عند اللہ اور عند الناس انہی مدارس پر ہوگی اور ان کا کوئی عذر اس بارے میں نہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مسموع ہو گا اور نہ ہی تاریخ اپنے صفحات میں اسے جگہ دینے کو تیار ہوگی۔ چنانچہ دینی مدارس کے جو مختلف وفاق مختلف مذہبی مکاتب فکر کے حوالے سے کام کر رہے ہیں، ان سب کے ارباب بست و کشاد سے ہماری استدعا

ہے کہ وہ اپنے طور پر اور مشترک طور پر بھی نفاذ اسلام کی عملی ضروریات کا جائزہ لیں اور انہیں اپنے نصاب و نظام میں ایڈ جسٹ کرنے کی راہ نکالیں تاکہ وہ وقت کے اس چلنگ کا صحیح طور پر سامنا کر سکیں جو اسلامی نظام کے نفاذ و تطبیق کے ضمن میں اس وقت دینی حقوقوں کو درپیش ہے۔

اس اصولی گزارش کے ساتھ ایک عملی تجویز بھی ہم ان وفاقوں اور بڑے دینی مدارس کے منتظرین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں کہ سر دست درس نظامی کے فضلاء کیلئے بڑے مدارس میں ایک خصوصی کورس کا اہتمام کیا جائے جس کا سرسری خاکہ ہمارے ذہن میں یوں ہے:

- ان فضلاء کو دنیا کے بڑے مذاہب کا قابلی مطالعہ کرایا جائے۔
  - تاریخ عالم اور تاریخ اسلام ترتیب کے ساتھ پڑھائی جائے۔
  - مختلف شعبہ ہائے زندگی کے حوالے سے اسلام کا بطور نظام مطالعہ کرایا جائے۔
  - اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں رائج نظاموں سے متعارف کرایا جائے۔
  - مغرب کے سیکولر فلسفہ اور نظام سے مکاحقة روشناس کرایا جائے۔
  - عربی اور انگریزی زبان پڑھائی جائے اور کم از کم اردو میں صحفی اسلوب کے ساتھ مضمون نویسی کی مسٹنگ کرائی جائے۔
  - مطالعہ اور تحقیق کا ذوق بیدار کیا جائے اور مختلف موضوعات پر اچھی گفتگو اور اچھی تحریر کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔
  - اس دوران میں جو فضلاء میٹرک پاس نہیں ہیں، انہیں میٹرک کی تیاری کر ادی جائے اور جو میٹرک کر چکے ہیں، انہیں ایف اے کی تیاری کرائی جائے۔
- یہ کورس دو سال کا ہو تو زیادہ بہتر طریقہ کے ساتھ چالایا جاسکتا ہے اور اگر ضروری ہو تو اسے کھیچ تان کر ایک سال کے دورانیہ میں بھی ایڈ جسٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس کورس کے اختتام پر امتحان پاس کرنے والے فضلاء کو ”شہادۃ الکمل“ کی باقاعدہ سندوں کی جائے اور اس کیلئے فضلاء کو باقاعدہ مہم کی صورت میں تیار کیا جائے۔ امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد اس تجویز کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں گے اور آنے والے دور کی ناظری ضروریات کا ادراک کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کیلئے عملی پیشافت سے گریننیں کریں گے۔

## نظامِ عدل آرڈیننس ۱۹۹۹ء اور افغان طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲ جنوری ۱۹۹۹ء

گورنر سرحد نے گذشتہ ہفتہ مالاکنڈ ڈوبیزین اور ضلع کوہستان میں ”شرعی نظامِ عدل آرڈیننس ۱۹۹۹ء“ کے نفاذ کا اعلان

کیا ہے اور مختلف اخبارات میں اس سلسلہ میں شائع ہونے والی تفصیلات کے مطابق اس آڑپنیس کی روئے ضلع سوات، ضلع دیر، ضلع چجزال، ضلع کوہستان اور مالانڈ کے وفاقي کے زیر اعتمام علاقے پر مشتمل خطے میں عدالتون کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے مقدمات کے فیصلے شریعت اسلامیہ کے مطابق کریں گے جبکہ غیر مسلموں کے خاندانی مقدمات کے فیصلے ان کے مذہبی احکام کے مطابق ہوں گے۔ اس مقصد کیلئے قاضیوں کے تقریباً اعلان کیا گیا ہے جن کی کو *لیفیکیشن* یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کسی تسلیم شدہ اسلامی یونیورسٹی سے شریعت میں ایل بی کی ڈگری حاصل کرچکے ہوں یا ایم اے اسلامیات کے ساتھ انہوں نے شریعت کو رس بھی کر لیا ہو۔ ان قاضی صاحبان کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ مقدمہ کی ساعت کے دوران کسی مستند عالم دین کو اپنے ساتھ مشاورت میں شریک کریں گے۔ جبکہ علمائے کرام کو مقدمات میں بطور وکیل پیش ہونے کی اجازت ہوگی۔ اس کے علاوہ اس سارے عمل کی گمراہی کیلئے پشاور ہائی کورٹ اور وفاقی شریعت کوثر میں مالانڈ بیچ قائم کیے جائیں گے۔

آڑپنیس کا مکمل اردو متن کسی اخبار میں ہماری نظر سے نہیں گزرا لیتھ مختلف قومی اخبارات نے مذکورہ بالانکات کو بطور خاص شائع کیا ہے اور وزیر اعلیٰ سرحد جناب مہتاب عباسی نے اس کے ساتھ ہی قوم کو یہ خوش خبری دی ہے کہ حکومت نے ملک میں نفاذ شریعت کا آغاز کر دیا ہے اور بہت جلد پورے ملک تک یہ سلسلہ وسیع کر دیا جائے گا۔

نفاذ شریعت کی جدوجہد کے ایک کارکن کے طور پر اس پیشرفت کا خیر مقدم کرنے اور اس پر حکمرانوں کو مبارکباد پیش کرنے کو ہی چاہتا ہے لیکن مااضی کے تجربات اور مستقبل کے خدشات نے ذہن میں تحفظات کا کچھ ایسا تاباہ بن رکھا ہے کہ خیر مقدم اور مبارکباد کے الفاظ زبان اور قلم کی نوک پر بار بار آگر کر جاتے ہیں اور انہیں اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ مااضی کے تجربات کا دامن بڑا وسیع ہے اور اس میں ملک گیر سطح پر نافذ ہونے والے نصف درجن کے لگ بھگ آڑپنیسوں کے علاوہ مالانڈ کے اسی خطے میں چند سال قبل نافذ ہونے والا شریعت آڑپنیس بھی موجود ہے۔ یہ سب آڑپنیس وقتاً فوقتاً نافذ ہوئے، ان پر شادیاں بنے جائے گئے، قوم کو اصلاح احوال کی خوبخبریاں دی گئیں اور خدمتِ اسلام کے بڑے بڑے تنخوا حکمرانوں نے اپنے سینوں پر سجائے گلر تیجہ وہی ”ڈھاک کے تین پات“ کے سوا کچھ نہیں برآمد ہوا اور ان میں سے کوئی آڑپنیس بھی قوم کو نہ امن فراہم کر سکا اور نہ ہی اس کی دیگر مشکلات میں کوئی کی لاسکا۔ مستقبل کے خدشات بھی مااضی کے انہی تجربات کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں اور ان کو سامنے لائے بغیر گورنر سرحد کے اس اقدام کے بارے میں شرح صدر کے ساتھ کچھ کہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افغانستان میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے تنازع و شرات کو دیکھتے ہوئے ہماری اسٹیبلشمنٹ نے پیش بندی کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ حکمت عملی اختیار کی ہے کہ نوازابادی تی سمٹ کو بچانے کیلئے سعودی عرب کی طرز پر صرف عدالتی نظام کو نفاذ شریعت کی تجربہ گاہ بنادیا جائے اور وہ بھی سارے ملک میں یکبار گی نہیں بلکہ دھیرے دھیرے اس کام کو آگے بڑھایا جائے۔ سعودی عرب میں یہی ہے کہ عدالتی نظام اسلامی ہے مگر اس کے علاوہ معیشت، سیاست اور ایڈمنیسٹریشن کے قومی شعبے اسلامی تعلیمات کی پابندی سے آزاد اور فرد واحد یا زیادہ سے زیادہ ایک خاندان کے تابع فرمان ہیں۔ البتہ عدالتی شبھے میں شرعی قوانین کے نفاذ کا فائدہ یہ ہے کہ جرائم پر کافی حد تک کنسروول ہے اور سعودی عرب میں جرائم کی شرح دوسرے کئی ممالک سے بہت کم

- ہے، لگتا ہے کہ ہمارے حکمران اسی تحریر کو ہر اناچاہتے ہیں جس میں انہیں تین واضح فائدے دکھائی دے رہے ہیں:
- امن و امان کی صورتحال بہتر ہوگی اور جرائم پر کسی حد تک کنٹرول ہو جائے گا۔
  - علامے کرام کی ایک بڑی تعداد اس عمل میں کھپ جائے گی اور قومی زندگی کے دیگر شعبوں میں شرعی قوانین پر عملدرآمد کے مطالبات جدوجہد ڈھپلی پڑ جائے گی۔
  - عدالتی شعبجہ کے سوابقی تمام امور میں فرنگی دور کا چھوڑا ہوا نوآبادیاتی نظام محفوظ رہے گا اور اس سے مفادات حاصل کرنے والے طبقات کی موجودہ پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
- اس کا ایک بڑا فائدہ عالمی قوتون کو بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں ان کے مفادات پر کوئی زندگیں پڑے گی اور کاروبار زندگی یوں ہی چلتا رہے گا اور اس کے ساتھ ہی افغانستان میں طالبان کا اسلامی انقلاب بھی اپنے ملک کی حدود سے تجاوز نہیں کر سکے گا جس کا دائرہ وسیع ہونے کا خوف بڑی طاقتون اور ہمارے ملک کے مراعات یافتہ طبقوں کو مسلسل اضطراب سے دوچار کیے ہوئے ہے۔

یہ سب فوائد ضروری نہیں ہے کہ حاصل ہوں مگر ہماری استیبلمنٹ کے شہدماغ یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ عدالتی شعبجہ میں شرعی قوانین کی دھیرے اور "کنٹرولڈ" پیشرفت کے ساتھ وہ نتیجہ حاصل کر لیں گے جسے محاورے کی زبان میں "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہیں جائے" کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا عمللا ایسا ہو گا؟ اور کیا ان اقدامات کے ذریعے ملک میں امن و امان کے قیام اور جرائم پر کنٹرول کا مقصود حاصل ہو جائے گا؟ ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو گا اور پاکستان کے حالات کو سعودی عرب پر قیاس کرنا دشمنی کی بات نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ سعودی عرب میں جس وقت یہ نظام طے ہو رہا ہے اسی وقت یہ طے پاکستانی قومی زندگی کے مذہبی، عدالتی اور تعلیمی شعبوں پر آل شیخ (شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کا خاندان) کا کنٹرول ہو گا اور باقی سب امور آل سعود ( سعودی شاہی خاندان ) کے سپرد ہوں گے اور وہ بادشاہت کے عنوان سے ملک کا نظام چلائیں گے، اس وقت عالم اسلام اور عالم عرب کی شکست و ریخت کا دور تھا، خلافت عثمانیہ بھر گئی تھی اور مغربی طاقتوں خلیج عرب میں کامل طور پر بر امداد ہو گئی تھیں۔ اس لیے دنیٰ حقوقوں نے سب کچھ جاتا دیکھ کر کچھ نہ کچھ باقی رہنے پر قناعت کر لی مگر اب صورت حال بدل چکی ہے۔ خلیج پر امریکہ کے مکمل تسلط کے باوجود خود سعودی عرب کے اندر اس نظام کے خلاف دنیٰ حلقوں بغاوت کرچکے ہیں، علماء قربانیاں دے رہے ہیں، متعدد اکابر علماء جیلوں میں ہیں اور بہت سے دانشوار جلاوطن ہیں جبکہ سعودی عرب میں کامل اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے امام بن لادن کی صورت میں ایک جاندار اور تو ادا آواز عالمی فرم پر موجود ہے، اس لیے آج کے دور میں پاکستان کو سعودی عرب کے پون صدی پہلے کے ماحول پر قیاس کرنا اور خود سعودی عرب میں امریکہ کی عسکری قوت کی بنیاد پر مصنوعی تنفس کے سہارے زندگی کے دن گزارنے والے نظام کا پاکستان میں تحریر کرنے کی خواہش کرنا کم از کم الفاظ میں حماقت ہی کہلاتے گا۔

اس گزارش کے بعد، ہم دو عملی اجھنوں کی طرف بھی اس آرڈیننس کے حوالے سے توجہ دلانا چاہیں گے۔ ایک توہہی کہ قومی زندگی کے باقی شعبوں مثلاً معیشت، قانون سازی، ایڈ منسٹریشن اور دیگر معاملات میں مروجہ نوآبادیاتی نظام باقی

رہے گا تو صرف عدالتی شعبے کے اسلامی نظام کی اس کے ساتھ ایڈ جسٹمنٹ کیسے ہو گی؟ یہ تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے کسی شوقین مزانج ڈرائیور کو ہندرا کار کا گیر بکس اچھا لگا ہے اور وہ اسے فورڈ ٹرک میں فٹ کر کے اسٹرینگ سنجال نئے کیلئے بے تاب ہو رہا ہے کہ دیکھوں اب گاڑی کتنی اچھی چلتی ہے۔ یا کسی من چلے نواب کو مس ورلڈ کی ناک بھاگنی ہے اور وہ مچل رہا ہے کہ کسی طرح اسے ناک کا معاوضہ دے کر پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کی ناک اپنے چہرے پر فٹ کرالے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ ہندرا کار کا گیر بکس بہت اچھا ہے مگر اس کے صحیح کام کرنے کیلئے باقی مشتری بھی اسی کار کی ضروری ہے ورنہ اس کی اچھائی کسی کام کی نہیں رہے گی اور اسی طرح مس ورلڈ کی ناک بہت خوبصورت ہے مگر اس کی تمام تر خوبصورتی اسی چہرے کے ساتھ ہے اور اسے کسی اور چہرے پر فٹ کرنے سے اس کا سارا حسن خاک میں مل کر رہ جائے گا۔ اس لیے اسلام کا عدالتی نظام بہت اچھا ہے اور بلاشبہ امن کا خاصمن ہے لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ قومی زندگی کے دیگر سب شعبے بھی اسلامی احکام کی پابندی میں اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوں ورنہ صرف عدالتوں کا شرعی نظام قوم کو وہ ننانچے نہیں دے سکے گا جس کی خوبخبریاں ہمارے حکمران قوم کو مسلسل سنارہ ہیں۔

دوسری عملی الجھن یہ ہے کہ مالاکنڈ ڈویژن اور ضلع کوہستان میں الگ طور سے نافذ کیا جانے والا یہ عدالتی نظام جیسا کہ نظر آ رہا ہے کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے موجودہ نظام کے تابع ہے اور اس سلسہ میں فائل اتحاری مروجہ نظام کوہی حاصل ہے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر الگ نظام کا فائدہ کیا ہے؟ یہ ناک تم تجوہ توہم پہلے ہی ملک گیر سطح پر کرچکے ہیں کیونکہ وفاقی شرعی عدالت کے متعدد فیصلے سپریم کورٹ کے فریزر میں مendum پڑے ہیں اور سپریم کورٹ قرارداد مقاصد کے حوالے سے اپنے فیصلے میں قطعی طور پر یہ قرار دے چکی ہے کہ وہ قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس لیے اگر مالاکنڈ ڈویژن اور ضلع کوہستان کی شرعی عدالتوں کے فیصلوں نے بھی اسی "ریڈ لائن" پر جا کر پھٹ پھٹا کر رہ جانا ہے تو پھر اس سارے لھیل کا مقصد کیا ہے؟

الغرض شریعت اسلامیہ کا نفاذ کئی حوالوں سے ہماری سب سے اہم قومی ضرورت بن چکا ہے۔ اس لیے بھی کہ ہم مسلمان ہیں اور قرآن و سنت کے احکام کے افرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے عقیدہ کے لحاظ سے پابند ہیں، اس لیے بھی کہ پاکستان کا مقصود قیام ہی اسلامی معاشرے کا قیام ہے جو کامل اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے بھی کہ امن کے قیام اور قومی وحدت کے بھاو کیلئے اسلامی اصولوں اور قوانین کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا، اور اس لیے بھی کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ اسلامی نظام کے عملی نفاذ اور اس کے نتیجے میں امن کے قیام کا واضح نقشہ سامنے آنے کے بعد اسے مزید نالئے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی۔ مگر اسلام

- جزوی نہیں بلکہ مکمل،
- دکھاوے کا نہیں بلکہ عملی،
- اور موجودہ نوآبادیاتی سسٹم کے ساتھ ایڈ جسٹمنٹ کی شکل میں نہیں بلکہ اس کے مکمل خاتمے کے بعد اس کی جگہ لینے کی صورت میں

آئے گاتوبات بنے گی۔ ورنہ نفاذِ شریعت آڑپنہوں کی کہانیاں تو ہم ایک عرصہ سے سنتے آ رہے ہیں، ایک کہانی اور سبی!

## مسیحی کمیونٹی: طالبان کے نقشِ قدم پر

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فوری ۱۹۹۹ء

روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ جنوری ۱۹۹۹ء کے مطابق صوبہ سرحد میں مسیحی کمیونٹی کے کچھ افراد نے ”مسیحی طالبان تنظیم“ قائم کر لی ہے اور بھارت میں مسیحی اقلیت پر انتہا پسند ہندوؤں کی طرف سے ہونے والے مظالم کے خلاف پشاور میں احتجاجی مظاہرہ کیا ہے۔ خبر کے مطابق اس تنظیم کے رہنماؤں کا ہنا ہے کہ وہ افغانستان کی طالبان اسلامی تحریک کی کامیابی سے متاثر ہو کر اپنی تنظیم کو طالبان سے منسوب کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں امن بحال کر کے لوگوں کو مذہب کی طرف راغب کیا ہے اور سماجی برائیوں سے جنگ کی ہے اسی طرح ان کی بھی خواہش ہے کہ پاکستان کے عیسائی اپنے مذہب کی طرف لوٹ آئیں اور سماجی برائیوں سے چھکا راحصل کریں۔

یہ طالبان کی اسلامی حکومت کا کرشمہ اور ان کے خلوص کا ثمرہ ہے کہ ان کی کامیابیوں کو غیر مسلم بھی تسلیم کر رہے ہیں اور مذہب کی طرف واپسی کیلئے ان کی پیروی کارستہ اختیار کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر طالبان اپنے خلوص اور خاص اسلامی اقدار کے ساتھ بے چک و بائشی اور وفاداری پر اسی استقامت کے ساتھ قائم رہے تو وہ دنیا بھر میں آسمانی تعلیمات کی طرف نسل انسانی کی واپسی کیلئے ہراول دستہ ثابت ہوں گے اور ان کی برکت سے انسانی معاشرہ ایک خوشگوار انقلاب کے دور میں داخل ہو گا۔

## محترمہ بے نظیر بھٹو! معاملات کو گڈمڈ نہ کریں

مابنا نامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- فوری ۱۹۹۹ء

قائد حزب اختلاف محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک حالیہ مضمون میں موجودہ حکومت کی پالیسیوں پر تقدیم کرتے ہوئے دیگر مسائل کے ساتھ مالاکنڈ ڈیشن میں نفاذِ شریعت آڑپنیں اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے معاملات پر بھی بحث کی ہے۔ محترمہ کا موقف ہے کہ پاکستان کو سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دینا چاہیں بلکہ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ جبکہ ہماری معلومات کے مطابق خود حکومت پاکستان نے بھی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے اور اس کیلئے حالات کو سازگار بنانے پر کام کیا جا رہا ہے۔ مگر دینی اور قومی نقطہ نظر سے یہ موقف درست نہیں ہے اور ہمارے نزدیک اس معاملہ میں حکومت اور اپوزیشن دونوں اسلام اور پاکستان کے مفادات کی مکہبائی کرنے کی بجائے عامی استعمار کے ایجادے پر کام کر رہی ہیں کیونکہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کا اصولی مطلب ایسی پروگرام پر عالمی اداروں کی نگرانی اور کثشوں کو قبول کرنا ہے۔ وہ

علمی ادارے جو اقوامِ متعدد کے نائٹل کے ساتھ صرف اور صرف امریکی مفادات کے محافظت بنے ہوئے ہیں اور انہیں دنیا پر امریکہ کی چودھراہٹ مسلط کرنے اور اس کے نیوور لڈ آرڈر کی عملداری کے سوا اور کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے، اس لیے کوئی باشمور مسلمان اور محب و طن پاکستانی اس کی محابیت نہیں کر سکتا۔

محترمہ بے نظیر بھٹونے (افغان) طالبان کے اسلامی اقدامات کو ہدف تنقید بناتے ہوئے مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذ شریعت کے حالیہ اقدامات پر بھی گلتہ چینی کی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ:

”پاکستان ایک مسلم ریاست ہے جو اعتدال پسند ملکوں کے جھرمٹ میں ہے، یہ جھرمٹ بحر اوقیانوس میں انڈو نیشیا سے شروع ہو کر ملیشیا، بگلہ دیش، ترکی، اردن اور مصر سے ہوتا ہوا جر الکاہل کے ساحلوں پر مرکاش میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ مالاکنڈ میں ایک چھوٹی سی چنگاری جنگل کی آگ کی طرح درہ خجراہ سے ہوتی ہوئی بیجن کے صوبہ سکیانگ تک پہنچ سکتی ہے۔ طالبان بر انڈ طرز زندگی کا رائے و نظر کے جنوب میں کوئی وجود نہیں۔ یہ نگ نظری اور متعصباہ نظام اس دھرتی کیلئے قابل قبول نہیں ہے جہاں اسلام کا پیغام صوفیوں اور اولیاء کے ذریعے پھیلا ہے جن کے محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیتے ہوئے نئے حضرت فرید گنج شکر کے مزار، ملتان کی غالقا ہوں، اوج شریف، شاہ عبداللطیف بھٹائی، پچل سرمست اور لاں شہباز قلندر کے مزاروں پر گائے اور سنے جاتے ہیں۔ پاکستان ایک کثیر الاقساط معاشرہ ہے جو ایران اور افغانستان کی صورت حال سے مختلف ہے جہاں یک رنگی پائی جاتی ہے۔ ایک خاص متعصباہ نظام قائم کرنے کی کوشش سے جنوبی پاکستان شمالی پاکستان سے جدا ہو جائے گا۔“ (حوالہ روزنامہ اوصاف اسلام آباد۔ ۱۹۹۹ء۔ فروری)

محترمہ بے نظیر بھٹو اچھی طرح جانتی ہیں کہ مالاکنڈ میں شرعی قوانین کے نفاذ کا جو ڈھانچہ دیا گیا ہے وہ مروجہ نو آبادیاتی سسٹم کے نیٹ ورک کے اندر ہے اس لیے اس سے ملک میں طالبان طرز کے اسلامی انقلاب یا تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ چھوٹے سے چھوٹے امکان کو بھی نظر انداز کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اور انہوں نے اس چنگالری کو جس طرح شعلہ جو الہ بنا کر پیش کیا ہے اس کی روشنی میں ملک کے حکمران طبقات کی سوچ کے ساتھ ساتھ ان کی آئندگی عنانِ ام کی جھلک اور جنوبی پاکستان میں سرائیکی، سندھی، مہاجر اور بلوچی قومیتوں کے نام پر اٹھائے جانے والے طوفان کے اصل رخ کا بھی جنوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو جس فکر و دانش کی نمائندگی کر رہی ہیں اس کے نزدیک سوسائی میں اسلامی احکام و قوانین کی پابندی کا اہتمام اور اس میں ریاتی اداروں کا کردار تعصب کھلاتا ہے اور قرآن و سنت کے قواعد و ضوابط سے آزاد معاشرہ اور اسلام کی بجائے مغربی فلسفہ و نظام کی نمائندگی کرنے والے ریاتی ادارے ”اعتدال پسند“ کے میڈل کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ منطق نہیں بلکہ گذشتہ تین سو برس سے مغرب ہمیں یہی سبق پڑھانے میں مصروف ہے اس لیے ہمیں ان کی طرف سے مغرب کی ترجمانی پر کوئی تجویز نہیں ہے۔ البتہ اس ترجمانی اور نمائندگی میں صوفیے کرام اور اولیائے عظام کو

بلاؤ جہ گھیٹنا اور انہیں ”فری سوسائٹی“ کے علمبردار کے طور پر پیش کرنا سرازیری دیتی ہے۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر، شاہ عبداللطیف بھٹائی، لال شہباز قلندر اور دیگر صوفیے کرام ہماری تاریخ کا قابل فخر سرمایہ ہیں مگر ان کامیدان غیر مسلم معاشرہ کو اسلام سے متعارف کرنے، غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے اور فرد کی بحیثیت فرداصلاح کامیدان تھا۔ اس کے تقاضے وہی تھے جو انہوں نے کمال حکمت و تدبیر سے پورے کیے اور اس میدان میں آج بھی ان کی تعلیمات اور اسہم سب کیلئے مشغول راہ ہے۔ مگر ایک اسلامی معاشرہ کی تشكیل، اسلامی ریاست کا قائم اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری کامیدان اس سے مختلف ہے، اس کے تقاضے اس سے بالکل الگ ہیں اور اس کے قائدین بھی قطعی طور پر مختلف بزرگ ہیں۔ یہ میدان حضرت عمر بن الخطاب، عمر بن عبد العزیز اور اونگزیب عالمگیر کامیدان ہے اور اس میں انہی کی راہنمائی کام آئے گی۔ محترمہ بے نظیر بھروسے کزارش ہے کہ وہ معاملات کو گذرنہ کریں اور فوج کے کمانڈر کو عدالت کا حجج اور پولیس کے افسروں کو پولویٹ اور سفارتکار بنانے کی کوشش نہ کریں کہ یہ فطرت اور انصاف کے تقاضوں سے انحراف اور اسلام کے اجتماعی کردار سے بغاوت ہے۔

## نظام حکومت کی اصلاح کیلئے سعودی علماء کی تجاویز

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ فروری ۱۹۹۹ء

اب سے دو سال قبل افغانستان میں جلال آباد کے قریب ایک خفیہ مرکز میں اشیخ اسماء بن لاون سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ ایک رات رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کے عزم و حوصلہ، جوش و جذبہ، حکمت و تدبیر اور خلوص و للہیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ شخص عالم اسلام کی بیداری میں اہم کردار ادا کرے گا۔ مگر یہ موقع نہیں تھی کہ اسی جلدی اور اس سطح پر اسے پذیرائی ملے گی کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی ظاہری قوت امریکہ کے طاقتوں حکمران صدر کلمائن کیلئے ڈراؤنے خواب کی شکل اختیار کر جائے گا۔ آج اسماء بن لاون کی روپیشی امریکہ اور اس کے حواریوں کیلئے متقل مسئلہ بن گئی ہے اور چھپا ہوا اسماء نفیتی طور پر سامنے چلتا پھر تا نظر آنے والے اسماء سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ اس لیے آج پھر وہ عالمی ذرائع بارا غ کا موضوع ہے اور اس کے حوالے سے وسیع تا نظر میں میدیا ہرین اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں۔

پاکستان کے صحافیوں میں سے شیخ اسماء بن لاون کے ساتھ سب سے پہلا اثر ویو جناب حامد میر نے روزنامہ پاکستان اسلام آباد کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ جبکہ اسماء کے موقف اور جدوجہد کے بارے میں ابتدائی ایک دو کالم رقم الحروف نے لکھے تھے۔ اس وقت ہمیں یہ کہا جاتا تھا کہ آپ لوگوں نے بہت مشکل گھٹائی میں قدم رکھ دیا ہے مگر ہمیں یقین تھا کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے اسلام کے لیے، ملت اسلامیہ کے لیے، اور سچائی کیلئے کیا ہے اس لیے ہماری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ چنانچہ آج جب کہ نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر اسماء بن لاون اخبارات و جرائد کا سب سے اہم موضوع ہے اور اس کے موقف اور جدوجہد کے مختلف گوشے منظر عام پر آرہے ہیں، ہم اپنی چھوٹی سی کاوش کے بالا اور

ہونے پر خوشی اور اطمینان کے ساتھ بارگاہ ایزوی میں سجدہ ریز ہیں۔

روزنامہ اوصاف سے پہلے روزنامہ پاکستان اسلام آباد میں میرے مضامین جن دوستوں کی نظر سے گزرتے رہے ہیں انہیں ”سعودی حکمران خاندان اور اہل دین کی شخص“ کے عنوان سے مضمون ضرور یاد ہو گا جو ۲۸ اپریل ۱۹۹۷ء کو روزنامہ پاکستان کے لاہور ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اسماء بن لادن کے ساتھ جناب حامد میر کے تفصیلی انش رو یو کے حوالے سے سعودی عرب کے دینی حلقوں کی جدوجہد کے بارے میں کچھ معروضات پیش کی گئی تھیں اور یہ عرض کیا تھا کہ اس جدوجہد میں اسماء بن لادن تنہا ایک شخص نہیں ہیں بلکہ وہ سعودی عرب کے دینی حلقوں اور دانشوروں کے ایک بہت بڑے طبق کی نمائندگی کر رہے ہیں جو سالہا سال سے سعودی عرب کے داخلی نظام کی اصلاح اور یورپی مداخلت کے خاتمه کیلئے جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس مضمون میں مذکورة النصیحہ کے عنوان سے ایک یادداشت کا نزکہ بھی تھا جو سعودی عرب کے علماء کرام کی طرف سے شاہ فہد کو پیش کی گئی تھی۔ اس یادداشت کی پاداش میں سینکڑوں علماء کرام اور دانشور گرفتار کر لیے گئے تھے جن میں سے ذاٹر محمد سعید اور ذاٹر سعد فقیر یجیے اصحاب جلاوطن ہو کر لندن میں بیٹھے ہیں جبکہ اشیخ سفر الحوالی اور اشیخ سلیمان عودہ جیسے اکابر علماء ۱۹۹۲ء سے اب تک مسلسل جیل میں ہیں۔

آج کی صحبت میں اس یادداشت کا تھوڑا سا خلاصہ پیش کرنے کو چاہتا ہے تاکہ اس جدوجہد کا ایک خاکہ قارئین کے سامنے آجائے جس کیلئے سعودی عرب کے علماء اور دانشوروں صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ اور جس کیلئے اشیخ اسماء بن لادن ایک عظیم مجاہد اسلام کے طور پر عالمی فورم پر اپنے ملک کے دینی حلقوں اور دانشوروں کی جرأت و عزیمت کے ساتھ تمجیبی کر رہے ہیں۔

مذکورة النصیحہ کے عنوان سے یہ یادداشت عربی زبان میں ہے جو ۱۳۸۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس پر ۱۰۹ حضرات کے دستخط ہیں جن میں اکثریت ممتاز علماء کرام، وکلاء، اساتذہ اور دانشوروں کی ہے۔ یہ یادداشت جولائی ۱۹۹۲ء میں شاہ فہد کو پیش کی گئی۔ یادداشت کے آخر میں دستخط کرنے والوں کے نام اور ان کے دستخطوں کے عکس موجود ہیں اور ان کے علاوہ سعودی عرب کے چار اکابر علماء کرام (۱) اشیخ عبد اللہ الجبلی (۲) اشیخ سلیمان عودہ (۳) اشیخ سفر الحوالی اور (۴) اشیخ عبد اللہ الجبرین کے تصدیقی خطوط کے فوٹو بھی اس کے ساتھ منتشر ہیں۔ جبکہ اکابر علماء کی سرکاری کمیٹی نے اشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن الباز کی سربراہی میں اس یادداشت پر جو تقدیر کی ہے اور حکومت پر تکتہ چینی کے اس طریقے سے جو اختلاف کیا ہے وہ بھی لکھا بچھ میں شامل ہے۔

اس یادداشت میں ملک کی داخلی، خارجی، دفاعی، معاشری، انتظامی اور قانونی پالیسیوں پر الگ الگ بحث کرتے ہوئے ان میں خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور شرعی نقطہ نظر سے اصلاحی تجویز پیش کی گئی ہیں۔ ان سب تجویز کا احاطہ تو اس مختصر کالم میں ممکن نہیں ہے، البتہ ان میں سے چند تجویز کا نزکہ کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشیخ اسماء بن لادن اور سعودی عرب کے دیگر علماء اور دانشوروں کا اصل موقف اور مشن کیا ہے جس کیلئے وہ محاذ آرائی، جلاوطنی اور قید و بند کے مراحل سے دوچار ہیں۔

- عدالتی نظام کے حوالے سے یادداشت میں ”شرعی عدالت عالیہ“ کے خاتمہ پر نکتہ چینی کی گئی ہے جو سعودی عرب کے موجودہ مفتی اعظم اشیخ عبدالعزیز بن باز کے پیش رواشنخ محمد بن ابراء یہ مسک قائم تھی۔ وہ ملک کے چیف جسٹس تھے، حکومت کے غیر شرعی فیصلوں پر کڑی گرفت کرتے تھے، اور انہوں نے مالی معاملات، سروں رولن، تجارتی قوانین اور دیگر شعبوں کو شرعی عدالت سے مستثنی قرار دینے کے حکومتی اقدام پر سخت تنقیدیں تھیں۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد یہ پوسٹ ہی ختم کر دی گئی اور ان کے جانشین شیخ بن باز کو قاضی القضاۃ کی بجائے مفتی اعظم کی حیثیت دے دی گئی۔ یادداشت میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس صورتحال کو ختم کرتے ہوئے ”حکمہ شرعیہ کہری“، یعنی شرعی عدالت عظیمی بحال کی جائے اور قومی زندگی کے تمام شعبوں کو شرعی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں شامل کیا جائے۔
- انسانی حقوق کے حوالے سے یادداشت میں تجویز کیا گیا ہے کہ لوگوں کا رائے دینے کا حق بحال کیا جائے اور اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اخبارات اور تقاریر و بیانات پر سمسندر ختم کیا جائے۔ آزاد اداروں اور تنظیموں کے قیام میں رکاوٹ ختم کی جائے۔ علماء کرام اور مبلغین پر اجتماعات اور خطبلات کیلئے سرکاری اجازت کی شرط ختم کی جائے۔ ریاست کو مملکت کے تمام شہریوں کے بنیادی حقوق مثلاً خوارک، رہائش، تعلیم وغیرہ کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ گھروں کی تلاشی اور بلاوجہ گرفتاریوں کا سلسلہ بند کیا جائے۔ کسی شخص کو عدالتی فیصلے کے بغیر ایک دن سے زائد حرast میں نہ رکھا جائے۔ اور عدالتی فیصلے کے بغیر نہ کسی کے گھر کی تلاشی لی جائے اور نہ کسی کو سفر سے روکا جائے۔
- یادداشت میں کہا گیا ہے کہ سرکاری منصب کی تقسیم میں ایلیٹ کو بنیاد بنا�ا جائے اور علاقائی اجراء داری کا تاثر ختم کیا جائے کیونکہ علاقائی عصیت جاہلی عصیت ہے۔
- یادداشت میں کہا گیا ہے کہ بیرونی قرضوں اور امداد کے حصول کا سلسلہ ترک کر کے ملکی وسائل کے اندر رہتے ہوئے تمام مالیاتی امور طے کیے جائیں۔ قناعت اور کفایت شعاری اختیار کی جائے۔ سرکاری خزانے سے بڑی عمارتوں کی تعمیر روک دی جائے۔ مالدار خاندانوں کو سرکاری خزانے سے عطایات نہ دیے جائیں، ان کی بجائے مخدوروں اور ضرورت مندوں کے وظائف مقرر کیے جائیں۔ شادی کے قابل نوجوانوں کو شادی کیلئے امدادی جائے اور بچوں کے وظیفے مقرر کیے جائیں۔
- یادداشت میں دفاع کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ملک کے دفاع کیلئے دوسرے ملکوں پر انحصار ختم کیا جائے اور اس سلسلہ کے تمام معابدے منسوخ کیے جائیں۔ مملکت کی خود مختاری اور قارکو بحال رکھا جائے۔ اسلحہ کی فیکریاں قائم کی جائیں اور کم از کم پانچ لاکھ افراد پر مشتمل باقاعدہ قوی فوج قائم کر کے اس کے علاوہ ملک کے ہر نوجوان کو فوجی تربیت دینے کے بعد ریزرو فورس بھی بنائی جائے۔

- یادداشت میں کہا گیا ہے کہ تیل کی پیداوار کو محمد و دار اس کے نرخوں کو ایک سطح پر رکھنے کی عالمی پالیسی مسترد کر کے خود مختار پالیسی اختیار کی جائے اور بین الاقوامی مارکیٹ کے نرخ کے مطابق تیل فروخت کیا جائے۔
- یادداشت میں خارج پالیسی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ عالم اسلام کے اتحاد کو اپنا اصل بدف قرار دیا جائے۔ عالمی اداروں میں اسلام اور مسلمانوں کی بھروسہ و کالت کی جائے۔ اور عالمی طاقتون بالخصوص مغربی اداروں کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہ کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہو یا اس سے سعودی عرب کی خود مختاری اور سیاسی وقار پر حرف آتا ہو۔

یہ صرف چند تجویز کا خلاصہ ہے جو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ مذکورة النصیحہ میں سعودی عرب کی قومی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور قرآن و سنت کی روشنی میں اصلاح احوال کی جامع تجویز پیش کی گئی ہیں جو یادداشت پیش کرنے والے علماء کرام اور دانشوروں کی اسلام دوستی اور حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ان کی جرأت و حوصلہ، بیدار مغربی اور معاملہ فہمی کی بھی غمازی کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اس مشن میں جلد از جلد کامیابی عطا فرمائیں تاکہ سعودی عرب ایک خود مختار اور با وقار اسلامی ملک کی حیثیت سے عالم اسلام کی صحیح قیادت کر سکے، آمین یا رب العالمین۔

## مسیحی طالبان اور مسلح جدوجہد کی تربیت

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۱۹۹۹ء

ہم نے ”نصرۃ العلوم“ کے گذشتہ شمارے میں صوبہ سرحد میں ”مسیحی طالبان تنظیم“ کے نام سے عیسائی نوجوانوں کی ایک تنظیم کے قیام کا ذکر کیا تھا اور عرض کیا تھا کہ یہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی تحریک کے اثرات ہیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اپنی کمیونٹی کو مدد ہب کی طرف راغب کرنے کیلئے طالبان کے طریق کار کو اپنارہ ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں کچھ مزید تفصیلات سامنے آئی ہیں جس سے تصویر کا دوسرا رخ بھی کچھ کچھ نظر آنے لگا ہے۔

چنانچہ روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۳ فروری ۱۹۹۹ء کے ادارتی شذرہ میں برطانوی اخبار ”انڈی پینڈنٹ“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ پاکستانی عیسائی نوجوانوں نے مسلمانوں کی عسکری تحریکوں کے کمپیوں میں فوجی تربیت حاصل کرنا شروع کر دی ہے اور ایک رپورٹ کے مطابق ۵۳ عیسائی نوجوانوں نے اسلامی نام اختیار کر کے مجاہدین کی دو مختلف تنظیموں کے کمپیوں میں مسلح جدوجہد کی ٹریننگ حاصل کی ہے جس پر خود کی تھوک لچرچ نے بھی تشویش کا اظہار کیا ہے۔

”انڈی پینڈنٹ“ کی یہ رپورٹ ملک کے سرکاری اداروں اور دینی حلقوں کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے کیونکہ عالمی ادارے جس طرح پاکستان کی مسیحی کمیونٹی کو ایک عرصہ سے پاکستان کے نظریاتی اور اسلامی شخص کے خلاف منظم اور متحرک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے پیش نظر اس خدشہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں طے شدہ منصوبے کے تحت عیسائی نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد مسلح جدوجہد کی ٹریننگ دلو اکر پاکستان کے دینی حلقوں اور محب وطن عناصر کے

خلاف دہشت گردی کا ایک اور محاذ توہین کھولا جا رہا؟ اس لیے ہم ملک کی دینی قیادت، مجاہدین کی تنظیموں اور سرکاری اداروں سے گزارش کریں گے کہ وہ "انڈی پینڈنٹ" کی اس روپورٹ کا گھر اپنی کے ساتھ جائزہ لیں اور اس خدشہ کی روک تھام کیلئے وقت القدامت کریں۔

## چیچنیا میں اسلامی قوانین کا نفاذ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۱۹۹۹ء

حال ہی میں مسلح رو سی جارحیت کے مقابلہ میں استقامت کا مظاہرہ کرنے والی چھوٹی سی مسلم ریاست چیچنیا میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا آغاز ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی پریس کے مطابق چین صدر ارسلان مسحادوف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ قرآن و سنت کی بنیاد پر شرعی قوانین نافذ کر دیے گئے ہیں جو معاشرے کے تمام شعبوں پر لا گو ہوں گے۔ انہوں نے بتایا کہ اسلامی نظام حکومت کا خاکہ بھی تیار کر لیا گیا ہے جسے قوی کانگریس سے منظوری کے بعد نافذ کر دیا جائے گا۔

یہ خبر ہمارے لیے خوشی اور سرست کا باعث ہے کہ ایک مسلم ریاست میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا آغاز ہوا ہے اور شرعی نظام کی برکات سے ایک مسلم قوم بہرہ ور ہو رہی ہے۔ جس پر صدر ارسلان مسحادوف اور چین قوم کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم دعا گویں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عزم میں کامیابی سے ہمکار فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس خبر میں ہمارے لیے حضرت کا پہلو بھی ہے کہ ہمیں فریگی استعمار سے آزادی حاصل کیے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک ہم قرآن و سنت کو اپنے ملک کا پریم لاء تسلیم کرنے کا مرحلہ بھی نہیں طے کر پائے، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## طالبان کے بارے میں ماہیوسی کا آغاز؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ مارچ ۱۹۹۹ء

اسلام آباد میں امارت اسلامی افغانستان کے سفیر مفتی سعید الرحمن حقانی کا ایک اثریو یو "اوصاف" میں نظر سے گزرا جس میں انہوں نے طالبان حکومت کو درپیش مشکلات اور معروضی مسائل کے حوالے سے طالبان کی پالیسیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے فرمودات میں سے دو باتوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو افغانستان کی تقسیم کے خلافات کے پس منظر میں انہوں نے کہا ہے کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان تقسیم ہو۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ خدشہ بلکہ نظرے ایک عرصہ سے افغان عوام کے سروں پر لٹک رہا ہے اور عامی طاقتلوں کا منصوبہ ہی یہ ہے کہ افغانستان کو شمال اور جنوب میں تقسیم کر کے کابل اور سطحی ایشیا کے درمیان "بفرائیٹ" قائم کر دی

جائے تاک کابل کی نظریاتی اسلامی حکومت سطھی ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاستوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ کابل میں ایک مستحکم اور نظریاتی اسلامی حکومت کا قیام اور اردو گرد ممالک پر اس کے اثر انداز ہونے کے امکانات عالمی قتوں بالخصوص امریکہ کیلئے سہان روح بننے ہوئے ہیں۔

اس وقت اس ایجنسٹے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ کام ہو رہا ہے کہ کابل میں کسی نظریاتی اسلامی حکومت کو مستحکم نہ ہونے دیا جائے۔ اور اس کے شمال اور جنوب دونوں اطراف میں اثر انداز ہونے کے امکانات کو محدود کر کے اس کے اثر انداز ہونے کا رخ مشرق اور مغرب کی طرف موڑ دیا جائے۔ تاکہ جہاں اسلام آباد اور سطھی ایشیا کو طالبان کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا اہتمام ہو وہاں سنیانگ اور تہران کے بارے میں امریکی ایجنسٹے کو آگے بڑھانے کیلئے طالبان ہی کی قوت استعمال میں آجائے۔ یہ ایک گہری اور خطرناک چال ہے جو عالمی سیاست کی بساط پر اس وقت پوری مہارت کے ساتھ کھیل جا رہی ہے اور پاکستان کی افواج کو طالبان کے اثرات سے بچانے کیلئے امریکہ کی طرف سے پاک فوج کے ساتھ تعلقات کا رک بھالی کی نئی پالیسی بھی اسی گیم کا حصہ ہے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب طالبان نے قندھار اور اس کے ساتھ گیارہ صوبوں کا کنٹرول حاصل کر لیا تھا مگر کابل اور ہرات ایکی ان کی دسترس میں نہیں آئے تھے۔ طالبان کا ایک وفد پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے دینی مدارات میں زیر تعلیم افغان طلبہ کو ترقیت دے رہا تھا کہ وہ تعلیمی سرگرمیوں کو کچھ عرصہ کیلئے معطل کر کے طالبان فورس میں شامل ہوں تاکہ طالبان کی تحریک جلد کی تیجی پر پہنچ سکے۔ یہ وفد گرو جانوالہ بھی آیا اور رقم المعرف کے ساتھ اس کے ارکان کی ملاقات ہوئی۔ میں نے اس وقت اس وفد سے عرض کیا تھا کہ طالبان کے خلوص، جذبہ، دینداری اور ایثار میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور ہم ہر وقت ان کی کامیابی کیلئے دعا گورہتے ہیں۔ مگر موجودہ تناظر میں دو باتوں کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے:

1. ایک یہ کہ طالبان کی تحریک کہیں غیر شعوری طور پر افغانستان کی تقسیم کا باعث نہ بن جائے، کیونکہ طالبان کی ذمہ دار قیادت کا بیشتر حصہ پشتون رہنماؤں پر مشتمل ہے اور فارسی بان کیمیوں کو طالبان کی لیڈر شپ میں اس نوعیت کی نمائندگی حاصل نہیں ہے جو افغانستان کی تقسیم کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔

2. جبکہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ طالبان کی قیادت کے ذہن میں اسلامی نظام اور آج کے حالات میں اس کی تطبیق کا عملی خاکہ کیا ہے، یہ بات کچھ واضح نظر نہیں آ رہی۔ اس لیے کہیں ابیانہ ہو کہ طالبان کی اسلامی حکومت پرے خلوص اور جذبہ للہیت کے ساتھ نفاذ اسلام کیلئے جو عملی اقدامات اپنے ذہن اور ترجیحات کے مطابق کرے وہ باقی دنیا نے اسلام میں کنفیوشن کا باعث بن جائیں۔ اور اس سے مسلم ممالک کی اسلامی تحریکات کو قوت ملنے کی وجہے ان کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ ہو جائے۔

اس واقعہ کوئی سال گزر چکے ہیں اور اس کے بعد کابل، ہرات، جلال آباد اور مزار شریف جیسے اہم مرکز بھی طالبان کے زیر تسلط آچکے ہیں اور معاملات کافی آگے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میراڑ ہن ان خدشات سے نجات حاصل نہیں کر سکا اور دونوں حوالوں سے کوئی ایسی تبدیلی ایکی تک سامنے نہیں آئی جو ان خدشات کے دھبوں کو ڈھن کی سلیٹ سے صاف کرنے میں معاونت کرتی ہو۔ اس لیے اگر اسلام آباد میں متعین افغان سفیر مفتی سعید الرحمن حقانی یہ کہہ

رہے ہیں کہ طالبان کی حکومت افغانستان کی تقسیم کو روکنے کیلئے ہر ممکن اقدامات کرے گی تو ان کا یہ ارشاد یقیناً خوشی اور اطمینان کا باعث ہے اور ہم ان کی کامیابی کیلئے سراپا دعا ہیں۔ مگر اتنی گزارش ضرور کرنا چاہتے ہیں کہ افغانستان کی تقسیم کو روکنے اور اس سلسلہ میں عالمی سازشوں اور امریکی عوام کو ناکام بنانے کیلئے کچھ عملی اقدامات کی بھی ضرورت ہے جن سے طالبان کی حکومت پوری طرح باخبر ہونا بھی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر افغانستان اور وطنی ایشیا کو امریکہ کی نئی شکار گاہ بنانے سے نہیں روکا جاسکے گا۔

افغان سفیر کے مذکورہ اثر و یو کا دوسرا ہم نکتہ اسامہ بن لادن کے بارے میں ہے جس میں انہوں نے اس بات کا اعتراض کیا ہے کہ اسامہ بن لادن سعودی عرب کی حکومت کے ساتھ طالبان کی اسلامی حکومت کے تعلقات میں بگاڑ کا باعث بنے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگائی گئی ہے اور وہ ناراض ہو کر روپوش ہو گئے ہیں۔ اس کا عام سامنطلب یہ ہے کہ طالبان کی حکومت نے سعودی عرب اور اسامہ بن لادن میں سے ایک کے اختیاب میں سعودی حکومت کو ترقیج دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اسامہ بن لادن سے مواصلات اور روابط کی سہولتیں واپس لے کر اس فیصلہ پر عملدرآمد کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔

اس پر ان حلقوں نے یقیناً اطمینان کا سانس لیا ہو گا جو ایک عرصہ سے طالبان کے رہنماؤں کے کانوں میں ٹھہر پھس کر رہے تھے کہ ایک شخص کی غاطر حکومت کو ناراض کرنا انش مندی نہیں ہے کہ اسامہ ایک شخص ہے جو اپنی حکومت کا باغی ہے اور اسے اس حد تک اہمیت دینا عقائدی کی بات نہیں ہے کہ سعودی حکومت کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ آجائے۔ مگر اسلامی تحریک کے میرے جیسے نظریاتی کارکنوں کیلئے یہ فیصلہ الجھن کا باعث بنتا ہے اور نفاذ اسلام کی جدوجہد کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان ہزاروں کارکنوں کو مایوسی ہوئی ہے جو طالبان کی اسلامی تحریک کو دنیا میں احیائے اسلام کا نقطہ آغاز بھج کر اپنی تمام تر دعائیں، تمنیاں اور ہمدردیاں اس کیلئے وقف کیے ہوئے ہیں۔

کیونکہ اسامہ بن لادن ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک سوچ اور فکر کا نام نہ ہے جو اسلام کی سر بلندی اور دنیا میں اسلام کے دبارة غلبے اور نفاذ کیلئے موجودہ عالمی نظام اور یہن الاقوای استعماریت کے پورے نیٹ ورک کو مسترد کر کے اسلام کو اس کے مقابل ایک مستقل نظام کے طور پر لانے کیلئے کوشش ہے۔ اور طالبان کے ساتھ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور نظریاتی کارکنوں کی ہمدردیوں اور حمایت کی سب سے بڑی وجہ میں ہے کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ طالبان کی اسلامی حکومت موجودہ عالمی سسٹم میں ایڈ جسٹ ہونے کی بجائے اسلام کو موجودہ عالمی نظام کے بالکل متواتری نظام کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ اور وہ اقوام متحده، امریکہ اور موجودہ مسلمان حکومتوں کے نیٹ ورک کا حصہ نہیں بننا پاہتی، اسی وجہ سے اس نے اسامہ بن لادن کو تحفظ اور امن فراہم کر رکھا ہے اور اس کے بارے میں امریکی مطالبات کو خاطر میں نہیں لارہتی۔

دونوں راستے بالکل واضح ہیں۔ ایک طرف موجودہ عالمی نظام ہے، امریکی قیادت ہے، یہن الاقوای ادارے ہیں اور انہی کے زیر سایہ چلنے والی مسلم حکومتوں ہیں۔ جبکہ دوسری طرف اسلامی تحریکات ہیں، اسلام کے غالبہ کا عزم ہے اور ایڈ جسمنٹ کی بجائے موجودہ نیٹ ورک کو کلیٹا مسترد کرتے ہوئے اسلام کے اجتماعی اور عالمی کردار کا احیاء ہے۔ پہلا راستہ

سہولتوں کا ہے، آسائشوں کا ہے اور موجودہ عالمی سسٹم سے بے پناہ فائدے حاصل کرنے کا ہے۔ جبکہ دوسرا راستہ ایثار کا ہے، قربانی کا ہے، فقر و فاقہ کا ہے۔ ایک راستہ شاہ فہد کا ہے جبکہ دوسرا راستہ اسمام بن لادن کا ہے۔ یہ فیصلہ کن دور ہا ہے جہاں سے طالبان کی اسلامی حکومت نے بالآخر ایک طرف کو مژہ جانا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا انہی کا کام ہے کہ وہ کھڑکار جرتے ہیں۔ البتہ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات طالبان کی قیادت سے عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کا احیا اور غلبہ تو مقدر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ یہ غلبہ موجودہ عالمی سسٹم اور اس کی آلہ کا مسلم حکومتوں کے ساتھ مفاہمت کی صورت میں نہیں ہو گا بلکہ اسمام بن لادن جیسے مجاہدوں اور درویشوں کے ہاتھوں ہو گا۔ اس لیے اگر اس عالمی انقلاب کا نقطہ آغاز بننا طالبان کے مقدار میں نہیں ہے تو اس سے اسلامی تحریکات کو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ فطرت کا قانون اور تاریخ کا عمل اٹل ہوتے ہیں اور پھر:

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی!

## اشک آباد کے مذاکرات اور مولانا سمیع الحق کی پیشکش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۱ مارچ ۱۹۹۹ء

آج چھج دو اچھی خبریں پڑھنے کو ملیں اور ذہن کی اسکرین پر خوشی کی کریں جملمانے لگیں۔ ایک خبر اشک آباد میں طالبان اور شمالي اتحاد کے مذاکرات کی کامیابی کی ہے جو کم و بیش سبھی اخبارات نے شائع کی ہے جبکہ دوسرا خبر مولانا سمیع الحق کی طرف سے مولانا فضل الرحمن کے ساتھ اتحاد کی پیشکش ہے جو انہوں نے ”وصاف“ کو انشرو یو دیتے ہوئے کی ہے۔

افغانستان کے بارے میں ایک مضمون میں رقم الحروف نے عرض کیا تھا کہ استعماری قتوں کی دیرینہ خواہش ہے کہ افغانستان شمال اور جنوب میں تقسیم ہو جائے اور شمال میں ایک ایسی ریاست قائم ہو جو کابل کی نظریاتی اسلامی حکومت اور وسطی ایشیائی نوازاد مسلم ریاستوں کے درمیان ”بفرائیٹ“ کا کام دے۔ اس تقسیم کو روکنے کیلئے ضروری تھا کہ یا تو طالبان شمالی اتحاد کے خلاف مکمل فتح حاصل کر کے پورے افغانستان کا کنٹرول حاصل کر لیں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو شمالی اتحاد کو اعتناد میں لے کر عالمی مداخلت کے امکانات کو کم سے کم کرنے کی صورت اختیار کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے راستے میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملنے پر طالبان نے دوسرا راستہ اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے جو عالمی حالات کے موجودہ تناظر میں آخری چارہ کار کے طور پر بہتری معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ مذاکرات مزید آگے بڑھے تو افغانستان میں ایک مستحکم حکومت کے قیام اور تباہ حال افغانستان کی تعمیر نو کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔

اس لیے ہم اس مفاہمت کا خیر مقدم کرتے ہوئے دعا گویں کہ اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کریں اور افغان قوم کیلئے بہتر مستقبل کا زینہ بنائیں، آمین۔ اس میں جہاں اطمینان کا ایک پہلو ہے کہ مذاکرات میں طالبان کا سامنا جzel دوستم اور جzel عبد الملک جیسے کمیونٹ لیڈروں سے نہیں بلکہ پروفسر رہان الدین رباني اور احمد شاہ مسعود جیسے جہادی

راہنماؤں سے ہے، جن سے تمام تر اختلاف کے خلاف دس سالہ جہاد افغانستان میں ان کے نمایاں کردار کو ظفر انداز نہیں کیا جاسکتا اور باہمی اختلافات پر خوش اسلوبی سے قابو پایا جائے تو وہ طالبان کے فطری اور نظریاتی حلیف ثابت ہو سکتے ہیں۔ مگر خدشے کا ایک پہلو بھی موجود ہے کہ کابل میں مشترکہ قومی حکومت کے قیام سے افغانستان کا رخ ایک خالص نظریاتی اور بے پاک اسلامی ریاست کی بجائے عالمی برادری کیلئے قابل قبول مسلم ریاست کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ اور ہمارے خیال میں ان مذکورات کی کامیابی کے بعد عالمی ادراوں کی جدوجہد اسی ہدف کیلئے وقف ہو جائے گی کہ دیگر بہت سے مسلم ممالک کی طرح افغانستان بھی اسلام کا پرچم تھامے ہوئے دنیا کے موجودہ عالمی کلچر اور بین الاقوامی سسٹم کا ایک قابل قبول یا کم از کم گوارا حصہ بن جائے اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کا دہ خواب پورانہ ہونے پائے جو وہ دنیا کے نقشے پر ایک خالص نظریاتی اور مثالی اسلامی ریاست کے ابھرنے کے حوالے سے ایک عرصہ سے دیکھ رہی ہیں۔

بہر حال یہ طالبان کی قیادت کا امتحان ہے اور میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ خلافت راشدہ کی طرز پر خالص اور اصلی اسلام کے ساتھ ان کی کمثنت آگر قائم رہی تو انہیں اسلامی تحریکات کے نظریاتی کارکنوں کی حمایت، دعائیں اور تعاون پرستو حاصل رہے گا۔

مولانا سمیع الحق کی طرف سے مولانا فضل الرحمن کو اتحادی پیشکش کے حوالے سے عرض ہے کہ جمیعت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود کی وفات کے بعد وہ حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایم آر ڈی کی شکل میں پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کا مسئلہ اختلاف کا باعث بنا تھا۔ حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی، حضرت مولانا عبد اللہ انور اور ان کے رفقاء پیپلز پارٹی کے ساتھ ایم آر ڈی میں شریک کا رہنے کے خلاف تھے جبکہ مولانا فضل الرحمن کے ساتھ جماعتی راہنماؤں کا ایک بڑا گروہ ایم آر ڈی میں شامل ہو گیا تھا۔ جمیعت علماء اسلام وہ حصوں میں بٹ گئی، ایک حصہ درخواستی گروپ اور دوسرے فضل الرحمن گروپ کہلایا۔ راقم الحروف اس کنشکش میں حضرت درخواستی کے ساتھ تھا اور ان کے گروپ کا ایک سرگرم کردار تھا۔

ایم آر ڈی ختم ہوئی تو وجد اختلاف ختم ہو جانے کی وجہ سے بہت سے جماعتی حقوق کی طرف سے تحریک ہوئی کہ اب جمیعت کو پھر سے متحد ہو جانا چاہیے کیونکہ پالیسی کا کوئی نمایاں اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔ راقم الحروف بھی اتحادی اس کوشش میں پیش پیش رہا اور اب بھی ہے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور مولانا فضل الرحمن کے درمیان اتحاد طے پائیا اور جمیعت علماء اسلام کے متحد ہونے کا اعلان کر دیا گیا مگر حضرت درخواستی کی جمیعت کے سیکرٹری جنzel مولانا سمیع الحق اور ان کے رفقاء نے اس اتحاد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ”مولانا سمیع الحق گروپ“ کے نام سے الگ گروپ بنایا جو بھی تک قائم ہے۔ اسی وجہ سے جمیعت علماء اسلام اب بھی دو ڈھروں میں منقسم نظر آتی ہے اور اس کے اتحادی کوئی کوشش کا رکن نہیں ہو رہی۔

اس صورتحال میں سرحد اور بلوچستان میں دونوں ڈھروں کے اختلافات اور قومی انتخابات میں ایک دوسرے کے مقابلہ کی وجہ سے جمیعت علماء اسلام کی پالیمانی قوت دن بدن سکرٹری جاہی ہے اور ملک بھر میں نفاذ اسلام، عالمی استعمار کے عزمائی کی روک تھام اور قومی مسائل میں ایک مضبوط آواز کے طور پر جدوجہد کا وہ مقام اور کردار جمیعت علماء اسلام کو

حاصل نہیں رہا جو بیس سال قبل اسے حاصل تھا۔ اور جمیعت علماء اسلام کے نظریاتی کارکنوں اور اس کے ہی خواہ علماء کرام کی یہ خواہش حضرت میں بدلتی جا رہی ہے کہ اے کاش! جمیعت علماء اسلام ایک بار پھر متعدد ہو کر قومی سیاست میں اپنا جائز مقام بحال کر لے۔

اس پس منظر میں مولانا ہمایق الحق کے اعلان پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی اور مولانا فضل الرحمن کی خدمت میں دو گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ انہیں یاد ہو گا کہ ۱۹۹۵ء کے عام انتخابات سے پہلے مولانا عبد الغفیض کی اور راقم الحروف ان دونوں حضرات اور ان کے علاوہ مولانا عظم طارق کے پاس حاضر ہوئے تھے اور گزارش کی تھی کہ

1. جمیعت علماء اسلام کو متعدد کر کے حسب سابق ایک جماعت کی شکل دے دی جائے۔

2. یہ قابل عمل نہ ہو تو جمیعت علماء اسلام کے دونوں دھڑے اور سپاہ صحابہ انتخابی اتحاد بنانے کا کٹھے ایکشن لڑیں۔

3. یہ بھی مشکل ہو تو کم از کم درجہ یہ ہے کہ جن سیٹوں پر باہمی مقابلہ ہوتا ہے اور آپس کے مقابلہ کی وجہ سے سیٹیں ضائع ہو جاتی ہیں ان پر باہمی انڈر استینڈنگ کر کے باہمی مقابلہ سے گریز کیا جائے تاکہ انتخابی حلقوں محفوظ رہیں۔

اس وقت ہماری یہ گزارشات قبول نہیں ہوئی تھیں، لیکن یہ تجویز ہماری طرف سے آج بھی موجود ہیں اور ایک بار پھر گزارش ہے کہ دونوں راہنماؤں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لین۔

دوسری گزارش ہے کہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد، امریکی استعمار کے عزم کے مقابلہ اور دینی مدارس و مرکز کے تحفظ جیسے اہم اهداف کی خاطر دیوبندی مکتب فکر کی اکثر و پیشتر دینی و سیاسی جماعتوں کا ایک متعدد مجاز "جلسہ عمل علماء اسلام پاکستان" کے نام سے گذشتہ سال قائم ہوا تھا جس میں جمیعت علماء اسلام کے دونوں دھڑے اور سپاہ صحابہ بھی شامل ہیں۔ مگر کچھ ذہنی تختہ نظرات کی وجہ سے دونوں جماعتوں کی قیادت خود اس میں آگے آنے سے گریز کر رہی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ متعدد مجاز ایک اچھا فورم ہے اور اگر مولانا فضل الرحمن اور مولانا ہمایق الحق خود آگے بڑھ کر اس کی قیادت کریں تو علماء دیوبندی منتشر قوت کو ایک بار پھر متعدد کیا جا سکتا ہے۔ اور دونوں لیڈروں کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دیوبندیوں کی قوت اگر کسی بھی حوالے سے متعدد ہوگی تو اس کا سیاسی فائدہ انہی دو قائدین کو ہو گا، اس لیے حوصلہ کر کے آگے بڑھیں اور علماء اور کارکنوں کی دعائیں لیں۔

## طالبان اور شمالی اتحاد میں مفاہمت

مہینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اپریل ۱۹۹۹ء

گذشتہ ہفتہ ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد میں افغانستان کی طالبان حکومت اور ان کے مخالف شمالی اتحاد کے درمیان مذاکرات کے پہلے دور کے بعد دونوں فریقوں کی طرف سے اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان میں قومی حکومت

کے قیام پر اتفاق ہو گیا ہے، اور طالبان کی حکومت نے شمالی اتحاد کو حکومت کے علاوہ مخففہ اور عدیلیہ میں نمائندگی دینے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ جبکہ عید الاضحیٰ کے بعد مذکورات کے دوسرے دور میں مستقل جنگ بندی اور دیگر امور طے کر لیے جائیں گے۔

طالبان کی اسلامی حکومت پر ایک عرصہ سے ہیں الاقوایی دباؤ تھا کہ وہ اقتدار کو بلا شرکت غیرے اپنے پاس رکھنے کی وجہے "وسیع البیان" حکومت قائم کرے جس میں افغانستان کے تمام نسلی گروہوں کو نمائندگی دی جائے۔ جبکہ طالبان کا موقف یہ تھا کہ چونکہ انہوں نے افغانستان میں خانہ جنگی پر قابو پا کر امن قائم کیا ہے، ملک کے بہت بڑے حصے میں ان کا کثروں ہے، اور دارالحکومت کامل بھی ان کے پاس ہے، اس لیے دنیا کے مسلمہ اصولوں کے مطابق انہیں افغانستان کی جائز حکومت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ مگر اقوام متحده اور دیگر عالمی اداروں اور مغربی حکومتوں کے ساتھ ساتھ کم و بیش سب مسلم حکومتوں نے بھی طالبان کے اس جائز اور اصولی موقف کی حمایت کرنے کی وجہے ہیں الاقوایی دباؤ کا ساتھ دینے میں عافیت سمجھی، جس کے نتیجے میں اشک آباد کے یہ مذکورات اور ان کا مذکورہ نتیجہ سامنے آیا ہے۔

ہمارے نزدیک مغربی حکومتوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ کابل کا اقتدار صرف طالبان کے پاس نہ ہو بلکہ مختلف نسلی گروہوں کے نام سے ایسے حضرات کو بھی حکومت کا حصہ دار بنادیا جائے جو افغانستان کو خالص اسلامی اور "مولویانہ" ریاست بننے سے روک سکیں۔ اور بظاہر لگتا ہے کہ اس مقصد میں عملی پیشرفت ہو رہی ہے، کیونکہ شمالی اتحاد میں جہاں چند جہادی گروپ شامل ہیں وہاں ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو جہاد افغانستان کے دوران مجاہدین کے خلاف روئی افواج کے شانہ بشانہ صفائی کر رہے ہیں، اس لیے ان کی شمولیت کے ساتھ قومی حکومت کا جو نقشہ سامنے آئے گا وہ مذکورہ خدمتات اور خطرات سے خالی نہیں ہو گا۔

تاہم شمال کی جنگ کے خاتمه اور مستقل جنگ بندی سے طالبان کی حکومت کو افغانستان کی تعمیر نوکی طرف زیادہ توجہ دینے کا موقع ملے گا اور وہ اپنے مسائل کو مزید دلجمی کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کر سکیں گے۔ البتہ ان کا محاذِ جنگ عسکری میدانوں سے مذکورات کی میزکی طرف منتقل ہو جائے گا اور افغانستان کو ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست بنانے کیلئے اب انہیں ٹیبل ناک اور ڈپلو میسی کی جنگ لڑنا پڑے گی۔ جس میں ان کا سامنا اگرچہ ہوشیار اور تحریک کار رہنماؤں سے ہے مگر طالبان کے خلوص، دینداری اور اسلام کے ساتھ ان کی محبت کے باعث ہمیں امید ہے کہ انہیں اس محاذ پر بھی پہپائی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اور ہم اس نئی آزمائش پر ان کی ثابت قدمی اور کامیابی کیلئے دعا گو ہیں، آمین یارب العالمین۔

## مولانا فضل الرحمن کے بیان پر امریکی رد عمل

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- ۱۶ اگست ۱۹۹۹ء

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن کے اس بیان پر امریکہ نے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے کہ

امریکہ نے اسامہ بن لادن یا طالبان کے خلاف کوئی کارروائی کی تو پاکستان میں امریکی باشندے محفوظ نہیں رہیں گے۔ اس پر برطانیہ نے مولانا فضل الرحمن کے معاشرت کر دیے ہے اور اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ کے ذمہ دار حضرات نے مولانا فضل الرحمن سے ملاقات کر کے ان سے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی ہے۔ جبکہ اخباری اطلاعات کے مطابق مولانا فضل الرحمن نے اپنے موقف کو درست قرار دیتے ہوئے امریکی سفارت کاروں سے کہہ دیا ہے کہ اگر امریکہ افغانستان پر بلا جواز فضائی حملہ کر سکتا ہے اور پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مجہدین کو نشانہ بناسکتا ہے تو پاکستان میں امریکی باشندوں کے تحفظ کی ضمانت دینا بھی مشکل ہے۔

امریکہ اس وقت اناربکم الاعلیٰ کے نعرے کے ساتھ دنیا کے واحد چوبدری کی حیثیت سے اپنا یہ حق سمجھتا ہے کہ وہ حصے چاہے اور جب چاہے اپنی جاریت کا نشانہ بنائے اور کوئی اسے روکنے والا نہ ہو۔ گذشتہ سال افغانستان اور سوڈان پر امریکی فضائی حملے اسی فرعونیت کا شاہکار تھے اور اب پھر وہ عرب مجہاد اسامہ بن لادن کے خلاف کارروائی کے عنوان سے افغانستان پر منے جملوں کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اس لیے ہمارے خیال میں مولانا فضل الرحمن نے امریکہ کو یہ انتباہ کر کے اہل حق کی صحیح ترجمانی کی ہے اور اس پر وہ بلاشبہ مبارکباد اور تحسین کے مستحق ہیں۔

اس کے ساتھ ہم ایک اور گزارش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جب جمیعت علماء اسلام کے دونوں دھڑوں کے قائدین مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق مل کر امارت اسلامی افغانستان کی شرعی حکومت کی حمایت و امداد کر رہے ہیں، غیر عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے والے عظیم عرب مجہاد اسامہ بن لادن کا ساتھ دے رہے ہیں اور امریکی عزائم کی مدد میں پوری جرأت کے ساتھ پیش پیش ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اس متفقہ پالیسی کو موثر طور پر آگے بڑھانے کیلئے دونوں متحد ہو جائیں؟ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ جمیعت علماء اسلام کے اتحاد کی طرف وہ جو قدم بھی بڑھائیں گے ملک بھر کے اہل حق کی انہیں بھرپور تائید حاصل ہوگی، اور ایسا ہونے کی صورت میں اہل حق کی طاقت ایک بار پھر مجمع ہو کر عالمی استعمار کے کمر وہ عزم اور مدد موم ارادوں کی راہ میں ناقابل تغیر دیوار بن جائے گی۔

## شیخ الہند، طالبان، اسامہ بن لادن

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۲۵ اگست ۱۹۹۹ء

امریکہ بہادر کو مولانا فضل الرحمن کی اس بات پر بہت غصہ آیا ہے کہ اگر امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا یا اسامہ کو اس کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچا تو پاکستان میں امریکی باشندے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ جمیعت علماء اسلام کی امریکہ مخالف ریلی کے حوالے سے مولانا فضل الرحمن کا یہ اعلان جب میں نے لنڈن کے اخبارات میں پڑھا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بات طبع نازک پر گراں گر رے گی مگر اس کا رد عمل اس سطح پر ہو گا اس کا اندازہ نہیں تھا۔ امریکی سفارت کا رجس طرح متحرک ہوئے اور برطانیہ نے جس طرح مولانا فضل الرحمن کو ویزادینے میں لیت و لعل سے کام لیا اس کے بعد اس مسئلہ میں امریکہ کے احساسات و جذبات کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

امریکہ کا ہنا ہے کہ اسمام بن لادن ڈھشت گرد ہے اور اس سے امریکہ کو خطرہ ہے اس لیے طالبان اسمامہ کو امریکہ کے حوالہ کر دیں ورنہ اسمامہ کے خلاف سخت کارروائی کی زد میں وہ بھی آئیں گے۔ اس کے جواب میں جمیعت علمائے اسلام کے دونوں دھڑلوں کے رہنماؤں مولانا نفضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق نے جو مضبوط موقف اختیار کیا ہے وہ فی الواقع قابل تائش ہے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے قافلہ سے اس کے تاریخی پس منظر میں اسی رد عمل اور موقف کی توقع کی جاسکتی تھی۔

رقم الحروف ان دونوں خلاف عثمانیہ کے آخری دور کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے اس سیاسی مرکزو کو ختم کرنے اور امت مسلمہ کی وحدت کا شیرازہ بکھیرنے میں کس کس نے لیا کردار ادا کیا ہے؟ عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید کی ذاتی ڈائری کا عربی ترجمہ اس وقت میرے سامنے ہے جو ۱۹۰۹ء سے ۱۸۷۲ء تک خلیفۃ المسلمين رہے جبکہ ترکی کے علاوہ مصر، عراق، شام، فلسطین، اردن، حجاز مقدس، الجزاير، لیبیا، اور تیونس سمیت پیشتر عرب علاقے خلاف عثمانیہ کا حصہ رہ چکے تھے اور اس وقت بھی ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب خطے سلطان عبدالحمید کی قلمروں میں شامل تھے۔ اس ڈائری کے اہم حصے تو کسی اور موقع پر قاریین کی خدمت میں پیش کیے جائیں گے البتہ اس کے مندرجات سے اس منظم منصوبہ بندی اور مسلسل ٹگ و دو کا ایک خاکہ ضرور سامنے آ جاتا ہے جو خلاف عثمانیہ کا تیا پانچ کرنے، تیل کے موقع چشمتوں کا کثڑوں حاصل کرنے، خلیج میں فوجی بالادستی قائم کرنے، اور اسرائیل کے نام سے یہودیوں کو فلسطین پر مسلط کر کے ان کی ریاست قائم کرنے کیلئے مغربی قوتوں نے کی۔ اور اس سے خلیج کی گنجش کا اصل منظر سامنے آ جاتا ہے کہ مغربی ملکوں کیلئے یہ خطہ کس قدر اہم ہے اور وہ اس کیلئے اخلاق و دیانت کے تمام تراصوروں کی قربانی دینے کیلئے بلا وجہ تیار نہیں ہوئے۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اسمام بن لادن کا قصہ مغض ایک بہانہ ہے اور امریکہ کے نزدیک اصل مسئلہ طالبان کا ہے جنہیں وہ اسمامہ کی آڑ میں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ حی کہ میر گھم کی یعنی الاقوی ختم نبوت کافرنیش میں مولانا نفضل الرحمن کی جمیعت کے ایک ذمہ دار عہدے دار نے یہ کہہ بھی دیا کہ اسمام بن لادن کی بات تو صرف ڈرامہ ہے اصل قصہ طالبان کا ہے۔ مگر ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ موقف وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کے سامنے تاریخ کا پس منظر نہیں ہے اور جو خلیج میں یہودیوں اور مغربی ممالک کے مفادات کی گہرائی اور گیرائی سے بے خبر ہے۔ ہمارے نزدیک اسمامہ اور طالبان دونوں اصل مسئلے ہیں جو اتفاق سے اس طرح لازم و ملزوم ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا اب کسی کیلئے ممکن نہیں رہا۔ اسمامہ خلیج عرب میں یہودیوں اور مغربی ممالک کے مفادات اور ان مفادات کی آڑ میں عرب ممالک پر مغربی ملکوں کے عسکری تسلط کے خلاف صدائے احتیاج کا نام ہے۔ کیونکہ جب اسمامہ یہ کہتا ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری خلیج عرب سے اپنی فوجیں نکال لیں اور عرب ممالک کو آزادی اور خود مختاری کی فضای میں اپنے فضلے خود کرنے کا موقع دیں تو اس کی تکلیف برادر است وائٹ ہاؤس کو ہوتی ہے۔ اور ہونی بھی چاہیے کہ مفادات اور لوٹ گھوٹ کا جو نیٹ ورک ایک صدی کی مسلسل محنت کے ساتھ خلیج عرب میں مغربی حکومتوں نے قائم کیا ہے اس کو بھرتے دیکھنا وائٹ ہاؤس کیلئے ممکن نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے اسمامہ بن لادن دنیا کا سب سے بڑا ڈھشت گرد قرار پایا ہے کہ وہ خلیج عرب میں مغربی ملکوں کے نیٹ ورک کیلئے خطرہ ہن گیا ہے۔ ایسا خطرہ جو ہر وقت مغربی حکمرانوں کے اعصاب پر سوار

رہتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے خلیج میں اپنے مفادات کی دوڑ کو اطمینان کے ساتھ جاری رکھنا مغربی حکمرانوں کیلئے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ اسامہ محفض ایک بہانہ ہے درست سوچ نہیں ہے۔

اسی طرح طالبان بھی امریکہ اور مغربی ملکوں کے نزدیک اصل مسئلہ کی حیثیت رکھتے ہیں کونکہ دنیا کے کسی خطے میں خالص اسلامی احکام و قوانین کا تقاضا اور ان پر بے چک عملدرآمد امریکہ اور اس کے حواری مغربی ممالک کے نزدیک اب قابل قبول نہیں رہتا ہے کیونکہ وہ اپنے زعم میں عالمی سطح پر ایک ایسا تابانا بن چکے تھے کہ اگر کہیں اسلامی احکام و قوانین کا تقاضا ہو بھی تو وہ اقوام متحده کے چارڑ کو تسلیم کرتے ہوئے موجودہ عالمی نظام کے نیٹ ورک کے اندر ہوتا کہ مروجہ ورلڈ سٹرم کیلئے وہ چلیج نہ بن سکے۔ مگر طالبان نے اس ٹائم کو توڑ دیا ہے اور وہ اس عالمی نظام کے سامنے "سرندر" ہونے کیلئے آمادہ نہیں ہو رہا ہے، اس لیے امریکہ اس مسئلہ کو بھی تاثویح حیثیت نہیں دے سکتا۔ البتہ یہ بات امریکہ کے حق میں جاری ہی ہے کہ اس کے دونوں بڑے دشمن اکٹھے ایک ہی نشانے کی زد میں نہیں اور وہ ایک تیر سے بیک وقت دونوں شکار کھیل سکتا ہے۔

آج سے پرانے صدی قبل جب خلافتِ عثمانیہ کے خاتمه اور عرب دنیا کو کوئی حصول میں بانٹ کر اس بذریعہ میں یہودیوں کیلئے اسرائیل کے نام سے الگ علاقہ مخصوص کرنے کے منصوبے پر عملدرآمد جاری تھا تو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے اس کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسی پاداش میں مکمل مدد میں خلافت عثمانیہ کے باعث گورنر نزیریف مکہ حسین نے انہیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دیا تھا اور وہ کم و بیش چار سال ماٹا کے جزیرہ میں نظر بذریعہ میں تھے۔ چنانچہ میرے جیسے نظریاتی کارکن کیلئے یہ بات بے حد اطمینان کی ہے کہ آج اسی منصوبے کے فائل حصے کو عملی جامد پہنچا یا جاری ہے تو شیخ الہند ہی کے قافلہ سے تعلق رکھنے والے دولیڈ راس منصوبہ کو چلیج کرنے کیلئے میدان میں کھڑے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق دو یا تین واسطوں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے شاگرد ہیں اور انہی کے فکری و علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں ان کے اعلانات کو اسامہ بن لادن یا طالبان کی حمایت نہیں کہتا بلکہ شیخ الہند گی جدوجہد کا تسلیم سمجھتا ہوں۔

آج ہم اگر اسامہ یا طالبان کے حق میں بات کرتے ہیں تو ان پر ہمارا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ ہم تو اپنے بھولا ہوا سبق یاد کر رہے ہیں اور اپنے مااضی کے ساتھ روشنی جوڑ کر اپنے حال کو تباہ ک اور مستقبل کو روشن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں اگر کوئی احسان ہے تو وہ ہم پر طالبان اور اسامہ بن لادن کا ہے کہ انہوں نے ہمیں ہمارا مااضی یاد دادا دیا ہے اور بھیڑوں کے گلے میں پلنے والے شیر کے بچ کو چشمے پر لے جا کر صاف پانی کے آئینے میں اس کا چورہ دکھا دیا ہے۔ امریکہ بھی شیخ الہند کے گروہ سے بے خبر نہیں ہے اور وہ اپنے پر انسان "دوستوں" کو خوب پیچانتا ہے اس لیے مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق کے اعلانات پر اس کی بے چینی بلاوجہ نہیں ہے۔ البتہ ایک حرست دل میں بھی باقی ہے کہ اگر سعودی عرب کا اسامہ بن لادن اور قدر ہمارے طالبان کیجا ہو سکتے ہیں تو کوڑہ جنک کے مولانا سمیع الحق اور ڈیرہ اساعیل خان کے مولانا فضل الرحمن کے کیجا ہونے میں آخر کیا رکاوٹ باقی رہ گئی ہے؟

## مسلم پرنسنل لاء اور موجودہ عالمی صورتحال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۱۳۱ آگسٹ ۱۹۹۹ء

**۱۲۰** اگست ۱۹۹۹ء کو مرکزی جامع مسجد گلاس گو برطانیہ میں جمیعت اتحادِ اسلامیین کے زیر اہتمام ایک نشست میں "مسلم پرنسنل لاء" کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کچھ عرصہ سے یورپ میں مختلف حلقوں کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو پرنسنل لاء میں اپنا جد اگانہ شخص تسلیم کرنے کیلئے آواز بلند کرنی چاہیے۔ سرکردہ علماء کرام کی یورپی کونسل نے دو ماہ قبل جرمی میں معروف سکارلر ڈائلر محمد یوسف قرضاوی کی زیر صدارت اجلاس منعقد کر کے اس تجویزی طرف دینی اداروں کو توجہ دلائی ہے اور برطانوی دارالامراء کے مسلمان رکن لارڈ نذر احمد نے بھی ایک حالیہ تقریر میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہرہ رہا ہوں لیکن قبل اس کے کہ غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں مسلم اقلیتوں کیلئے مسلم پرنسنل لاء کی اہمیت پر کچھ عرض کروں خود مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں مسلم پرنسنل لاء کی صورتحال کے بارے میں گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے شخصی قوain میں اور فیملی لاز خود مسلم ممالک میں خطرے میں ہیں اور مسلم حکومتوں پر بین الاقوامی طور پر دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے ممالک میں عمومی قوain اور خاص طور پر پرنسنل لاء یعنی نکاح و طلاق اور وراثت سے متعلقہ قوain کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کیلئے قرآن و سنت کے بیان کردہ ضابطوں میں تبدیلی کریں اور انہیں عالمی معیار کے مطابق بنائیں۔ اس سلسلہ میں بین الاقوامی معیار سے مراد اقوام متحده کا بنیادی حقوق کا چارٹ اور اس کی تشریح میں اقوام متحده کے مختلف اداروں اور کافرنسوں کی قراردادیں ہیں جن کی بہت سی باتیں نکاح و طلاق اور وراثت کے بارے میں قرآن و سنت کے صرخ احکام سے مقصاد ہیں۔ اسی لیے بین الاقوامی اداروں اور لاہیوں کی طرف سے مسلم ممالک سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جب وہ اقوام متحده کے رکن ہیں اور اقوام متحده کے چارٹ پر دستخط کر کے ہیں تو انہیں اس کے مطابق اپنے قوain میں تہذیب کرنی چاہیے اور اقوام متحده کے چارٹ اور اس کے اداروں کے فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے۔ اقوام متحده کے چارٹ کی بنیاد پر موجودہ بین الاقوامی قوain اور قرآن و سنت کے شرعی احکام میں کیا فرق اور تضاد ہے؟ اس کو واضح کرنے کیلئے دو تین پاؤں کو بطور مثال ذکر کرنا چاہوں گا۔

1. بین الاقوامی قوain کے مطابق کوئی بھی مرد اور عورت رنگ و نسل اور مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر آپس میں آزادانہ مرضی سے شادی کر سکتے ہیں، مگر اسلام میں مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم مرد سے نہیں ہو سکتا، اسی طرح مسلمان مرد بھی اہل کتاب کے علاوہ کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والی خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جس کا اظہار آپ کے سامنے اس وقت ہوتا ہے جب بیہاں کسی مغربی ملک میں

کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلمان نوجوان کے ساتھ عدالت کے ذریعے شادی کر لیتی ہے، لیکن جب آپ عدالت سے رجوع کرتے ہیں کہ اسلام اس شادی کی اجازت نہیں دیتا تو یہاں کی عدالت آپ کا اعتراض سننے کیلئے تیار نہیں ہوتی اور مروجہ بین الاقوامی معیار کے مطابق نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دے دیتی ہے بلکہ یہاں کا ستم اس شادی کو مکمل تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔

2. اسی طرح نکاح کا رشتہ ختم کرنے میں مروجہ بین الاقوامی قانون خاوند اور یہوی کا یہاں حق تسلیم کرتا ہے کہ دونوں میں سے جو بھی چاہے اس رشتہ کو ختم کر سکتا ہے۔ جبکہ اسلام نے نکاح کا رشتہ غیر مشروط طور پر ختم کرنے کا حق خاوند کو دیا ہے جسے قرآن کریم نے بیدہ عقدۃ النکاح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جبکہ عورت کو یہ حق برداشت اور غیر مشروط طور پر نہیں دیا گیا بلکہ خلع کے عنوان سے عورت کا یہ حق عدالت پر اسیں کے ذریعے تعلیم کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ پچھلی ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام عورت کو نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا حق غیر مشروط طور پر ختم کر سکتا ہے۔ اسی وجہ پر بھی ہوں مگر یہ عورت کا یہ حق عدالت پر اسیں کیلئے تیار نہیں ہو گی کہ چونکہ شرعی قوانین کی رو سے طلاق دینے کا حق صرف اسے ہے اس لیے یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ قانونی طور پر وہ طلاق واقع ہو جائے گی اور یہاں کا ستم اس طلاق کا تحفظ بھی کرے گا۔

3. اس کے علاوہ وراثت کے معاملہ میں بھی قرآن کریم نے حصول کی جو تقسیم کی ہے وہ واضح طور پر غیر مساویانہ ہے۔ خاوند کے فوت ہو جانے کی صورت میں یہوی کو ایک صورت میں آٹھواں اور دوسرا صورت میں چوتھا حصہ ملتا ہے، اور بیٹی کا حصہ ہر صورت میں بیٹی سے نصف ہوتا ہے۔ جبکہ بین الاقوامی قانون اس سلسلہ میں برادری کا مقاضی ہے اور قرآن کریم کے بیان کردہ غیر مساویانہ حصول کو غیر منصفانہ قرار دیتا ہے۔ لہذا جب وراثت کے قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ حصول پر نظر ثانی کر کے ان میں ترمیم کی جائے۔

یہ تین مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ نکاح، طلاق اور وراثت کے باب میں قرآن و سنت کے بیان کردہ قوانین آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین سے متفاہم ہیں اس لیے اقوام مختلف ادaroں سمیت بین الاقوامی حقوق کی طرف سے مسلم ممالک پر یہ دو مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے قوانین میں رو بدل کر کے انہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائیں۔

اس پر مسلم ممالک اور حکومتوں کا رد عمل تین طرح کا ہے۔

1. ایک رد عمل ترکی کا ہے کہ اس نے پون صدی قبل ہی قرآن و سنت کے احکام سے اعلانیہ دستبرداری اختیار کر کے مغربی قوانین کو قبول کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلہ پر سختی کے ساتھ قائم ہے۔ بلکہ اگر ترکی میں اس

حوالے سے قرآن و سنت کے احکام کی طرف واپسی کا معمولی سار بجان بھی نظر آنے لگتا ہے تو ریاستی قوانین اور ادارے اسے روکنے کیلئے پوری طرح سرگرم ہو جاتے ہیں۔

2. دوسرا دعمل امارت اسلامی افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام کے ساتھ بے پہل و ابتدگی قائم رکھتے ہوئے اقوام متحده کے چارٹر اور اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والے مروجہ بین الاقوامی قوانین کو قبول کرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں۔ اور ان کا یہ انکار بھی اس بات کی ایک بڑی وجہ ہے کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر کشرول اور دارالحکومت کا قبضہ حاصل کرنے اور اپنے زیرِ تسلط علاقے میں مکمل امن قائم کر لینے کے باوجود ان کی حکومت کو اقوام متحده میں تسلیم نہیں کیا جا رہا اور انہیں اقوام متحده میں افغانستان کی نشست سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

3. ترکی اور افغانستان کے فیصلے تدویٹ اور غیر ممکن ہیں جو سب کے سامنے ہیں۔ لیکن ایک تیرا دعمل بھی ہے جو پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک کا ہے کہ قرآن و سنت پر عملدرآمد کا ٹائیل بھی ہاتھ میں رہے اور مغرب کو بھی مطمئن رکھا جائے۔ اس کیلئے ایک الگ راستہ اختیار کیا گیا کہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی ایسی تعبیر و تشریح کی جائے جس سے قوانین کو مغرب کے معیار کے قریب تر لایا جائے۔ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں مسلم فیملی لازارڈ بینس یعنی عالمی قوانین کے نفاذ کی صورت میں ہوئی تھی جس کی متعدد دفعات کو ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا لیکن اس کے باوجود وہ نافذ ہوئے اور ابھی تک ریاستی قوت کے بل بوتے پر مسلسل نافذ ا عمل ہیں۔ ان قوانین میں سے صرف ایک کی مثال دوں گا کہ نکاح کے فارم میں خادمی کی طرف سے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دینے کا خانہ رکھ کر ہم نے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے پاکستان میں عورت کو بھی طلاق کا حق دے دیا ہے۔ اسی سے باقی قوانین کے رخ کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اب اقوام متحده کی قاہرہ اور یونیونگ میں ہونے والی خواتین کانفرنسوں کے بعد ان کی قراردادوں اور فیصلوں کی روشنی میں اگلے مرحلوں کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک حاضر سروں جمیں کی سربراہی میں قائم ہونے والی ”خواتین حقوق کمیشن“ نے کچھ عرصہ قبل جو سفارشات پیش کی ہیں وہ قانون سازی کیلئے وزارت قانون کی میز پر ہیں۔ ان میں واضح طور پر سفارش کی گئی ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح طلاق کا کامل حق دیا جائے اور وراثت کے حصول کی غیر مساویانہ تقسیم ختم کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی عدالتوں میں بھی اس نوعیت کے فیصلے ہونے لگے ہیں مثلاً لاہور ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا ہے اور سنده ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں وراثت میں بیٹی کے نصف حصے کو انصاف کے منافی قرار دے دیا ہے۔ اس طرح ہم نے

قرآن و سنت کا نائل برقرار رکھتے ہوئے بین الاقوامی معیار کے قریب آنے کیلئے شرعی احکام کی تجارتی اور منافع تعمیر و تشریف کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات کی وضاحت ضروری تھجھتا ہوں کہ بین الاقوامی قوانین کے معیار کو پورا کرنے اور مغربی اداروں کو مطمئن کرنے کیلئے قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی تجارتی اور حکومتی عمل ممالک کی حکومتوں اور حکومتی اداروں کا ہے جبکہ عام مسلمانوں اور ملتِ اسلامیہ کی رائے عامہ نے اس عمل کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ہر مسلمان ملک میں دینی حلقة اور عام مسلمان قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی اسی تعمیر و تشریف پر سختی سے عمل پیرا ہیں جو چودہ سو سال سے اجتماعی طور پر چلی آرہی ہے اور وہ اس میں کسی قسم کا روبدل قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ دینی ادارے ہر جگہ اس کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ چنانچہ بھگہ دلش سے لندن آئے ہوئے ہمارے پرانے بزرگ مولانا حبی الدین خان نے بتایا ہے کہ بغلہ دلش کی ہائیکورٹ نے کو میلا کے ایک مقدمہ میں طلاق یافتہ خاتون کو سابقہ خاوند کی طرف سے زندگی بھرنا و نفقہ دیے جانے کا حکم صادر کر دیا تو سرکردہ علماء کرام نے شریعت کو نسل قائم کر کے اسے پرمیم کورٹ میں چلینچ کیا اور عدالت عظیمی نے علماء کرام کا موقف سننے کے بعد ہائیکورٹ کے فیصلے کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے دیا۔

الغرض یہ ایک الگ کشمکش ہے جو مسلمان حکومتوں اور دینی حلقوں کے درمیان جاری ہے اور عام مسلمان ہر ملک میں قرآن و سنت کے حوالے سے علماء کرام اور دینی حلقوں کے ساتھ ہیں۔

یہ قدرے تفصیل میں نے اس لیے عرض کی ہے تاکہ آپ حضرات کے سامنے وہ صور تحوال واضح ہو جو اس وقت مسلم ممالک میں نکاح و طلاق اور وراثت کے اسلامی قوانین کے حوالے سے مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اسی بنیاد پر میں نے عرض کیا ہے کہ مسلم پرنسل لاء خود مسلم ممالک میں خطرہ میں ہیں اور انہیں مغربی ممالک کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کیلئے ایک مسلسل عمل جاری ہے۔ اور صرف پرنسل لاء اور خاندانی قوانین کی بات ہیں بلکہ قرآن و سنت کے بہت سے دیگر احکام و قوانین بھی مغربی دباؤ کی زد میں ہیں۔ مثلاً قوام متحده کے چارٹر کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ کسی مجرم کو دی جانے والی سزا اہانت، ذہنی اذیت اور جسمانی اشتمال سے خالی ہونی چاہیے۔ یعنی سزا ایسی ہو کہ اس میں مجرم کی توبینہ نہ ہوتی ہو، وہ ذہنی اذیت کا شکار نہ ہو اور اسے جسمانی اشتمال بھی نہ بننا پڑے۔ چنانچہ اس بنیاد پر ہاتھ کاٹنے، سنگار کرنے، کوڑے مارنے اور کھلے بنوں عام لوگوں کے سامنے سزا دینے کے سب قواعد و ضوابط اس بین الاقوامی معیار کے منافی قرار پاتے ہیں۔ جرائم کی شرعی سزاوں کی بین الاقوامی اداروں کی طرف سے جو مخالفت ہوتی ہے اس کی وجہ بھی ہے اور جرائم کی شرعی سزاوں کو بعض سماں لیڈروں کی طرف سے وحشیانہ اور خالمانہ قرار دیے جانے کا پس منظر بھی بھی ہے۔

اس حوالے سے مغرب والوں کا موقف تو سمجھ میں آتا ہے کہ بہت سے اسلامی احکام و قوانین ان کے بقول آن کے بین الاقوامی معیار کے منافی ہیں اس لیے اگر مسلم ممالک نے بین الاقوامی برادری کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں اس کے احکام و ضوابط بھی قبول کرنا ہوں گے۔ اسی طرح بین الاقوامی اداروں کی یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جن مسلم ممالک نے اقوام متحده کی رکنیت قبول کر کے اس کے چارٹر پر دخوط کیے ہوئے ہیں انہیں اس بین الاقوامی معاهدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ البتہ ان مسلم حکومتوں کا طرز عمل سمجھ سے بالاتر ہے جو بین الاقوامی معیار اور قرآن و سنت کے قوانین کو ساتھ ساتھ لے کر

چنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کو شش میں شرعی احکام کا علیہ بگاڑ دینا چاہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد کی وہ بات پسند آئی ہے جو انہوں نے اقوام متحده کی پچاس سالہ تقریبات کے موقع پر مسلم حکومتوں کے سامنے رکھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں اقوام متحده کے دو ہرے طرز عمل پر احتجاج کے طور پر مسلم ممالک کو اقوام متحده کی پچاس سالہ تقریبات کا بایکاٹ کرنا چاہیے اور اقوام متحده کے چارٹر پر نظر ثانی کر کے اسے از سرنو مرتب کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے، کیونکہ یہ چارٹر پر بچاس سال قبل ترتیب دیا گیا تھا جب اکثر مسلم ممالک غلامی کی حالت میں تھے جبکہ آج صور تحال بدل گئی ہے اس لیے عالم اسلام کے موقف اور پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اس چارٹر پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت مہاتیر محمد کی یہ بات مسلم حکومتوں نے قبول نہیں کی لیکن یہی موقف حقیقت پسندانہ ہے اور مسلم ممالک کو بالآخر اسی موقف پر آنا ہوگا۔

یہ تو ہے صور تحال مسلم پر شل لاء کے حوالے سے خود مسلم ممالک کی۔ اب آئیے ان ممالک کی طرف جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں بھارت کے مسلمان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ تمام تر مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے خاندانی قوانین کا تحفظ کیے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی سر برائی میں تمام مکاتب فکر کا مشترکہ ”آل انڈیا مسلم پر شل لاء بورڈ“ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے پر شل لاء کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بھارت میں ”کامن سول کوڈ“ کے نفاذ کے نام سے مسلمانوں کے جدا گانہ شخصی قوانین کو ختم کرنے کی مہم ایک عرصہ سے چل رہی ہے اور مسلمانوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ قومی بیکھتی کی خاطر نکاح و طلاق اور وراثت میں اپنے جدا گانہ مذہبی قوانین سے دستبردار ہو کر کامن سول کوڈ قبول کر لیں۔ چنانچہ بھیاں بھی کامن سول کوڈ سے مراد ہی ہیں الاقوامی قوانین اور معیار ہے جس کا تذکرہ میں نے پہلے اقوام متحده کے چارٹر کے حوالے سے کر دیا ہے۔ مگر انہیں مسلمان اس معاملہ میں بالکل بے پاک ہیں اور پر شل لاء میں اپنے مذہبی احکام و قوانین کے تحفظ کا پوری طرح عزم کیے ہوئے ہیں جس پر وہ بلاشبہ تبریک و تحسین اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

جہاں تک مغربی ممالک کا تعلق ہے، میں نے چداییے مسائل کا بتداء میں ذکر کر دیا ہے جن کا سامنا آپ حضرات کو بھیاں درپیش ہے۔ مثلاً مسلمان لڑکی کی غیر مسلم لڑکے سے شادی، مسلمان بیوی کا عدالتی سسٹم کے ذریعے خاوند کو طلاق دینا، اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم۔ اس قسم کے مسائل آپ حضرات کو مسلسل پیش آتے ہیں اور آپ جب مذہب اور اپنی روایات کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو آپ کی بات ٹھیک طور پر نہیں سنی جاتی۔ لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں، لڑکے بانی ہو جاتے ہیں، انہیں اس سلسلہ میں ریاتی سسٹم کی طرف سے مکمل تحفظ و پشت پناہی مہبیا ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے مسلم خاندان تنزیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جبکہ عالمی صور تحال یہ ہے کہ پر شل لاء اور لکچر میں ہر قوم کے جدا گانہ تشخص کے حق کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کو پر شل لاء بلکہ بنس لاء میں بھی اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے اور ان کیلئے الگ عدالتیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ بھیاں برطانیہ میں بھی یہودیوں کو جدا گانہ پر شل لاء کا تحفظ حاصل ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو بھی پر شل لاء میں اپنے جدا گانہ تشخص کو تسلیم کرانے کیلئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بھیاں کی حکومت کو اس سے

کوئی انکار ہو گا کیونکہ اسی برطانیہ نے جب بر صیر پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور برمپر مشتمل متحده ہندوستان میں مغلوں سے اقتدار حاصل کیا تھا تو مغلوں کے دور سے چلا آنے والا عدالتی نظام ختم کر دیا تھا۔ اس وقت متحده ہندوستان کی عدالتوں میں قتاوی عالمگیری نافذ تھا جس کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس عدالتی نظام کو ختم کر کے انگریزی قوانین نافذ کر دیے تھے جو اب تک چلے آرہے ہیں۔ لیکن انہوں نے پرشل لاءِ یعنی نکاح و طلاق اور وراثت کے باب میں مسلمانوں کا یہ حق اس وقت بھی بحال رکھا تھا کہ وہ ان معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں اور ”محمدن لاء“ کے نام سے پرشل لاء اور خاندانی قوانین میں مسلمانوں کا جداگانہ شخص تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس دور میں جبکہ ہم برطانوی استعمار کے غلام تھے اور برطانیہ کی نوابادی تھے ہمارے اس حق سے انکار نہیں کیا گیا تھا تو آج برطانیہ میں رہنے والے مسلمان غلام نہیں بلکہ برابر کے شہری ہیں تو ان کے اس حق کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو پرشل لاء میں جداگانہ شخص فراہم کیا گیا ہے۔ خود پاکستان کے دستور میں ان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے اور سب سے پہلے علماء کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں اس اصول کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا کہ پرشل لاء میں تمام اقلیتوں کو اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔ اس لیے جب پاکستان میں عیسائی اقلیت اور دیگر اقلیتوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا گیا تو برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرنے میں بھی کوئی چجانب نہیں ہونا چاہیے۔

ان گزارشات کے ساتھ میں مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے خاندانی نظام کے تحفظ کی طرف توجہ دیں اور پرشل لاء میں اپنا جداگانہ شخص تسلیم کرانے کیلئے منظم جدوجہد کا آغاز کریں کیونکہ اس کے بغیر وہ خاندانی نظام کے حوالے سے درپیش ان مسائل اور مشکلات سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے جنہوں نے مغرب میں رہنے والے ہر حساس اور دیندار مسلمان خاندان کو پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن جدوجہد سے میرا مقصد لڑائی جھگڑا اور بے کا شور و غوغائیں ہے بلکہ جدوجہد سے مراد یہ ہے کہ معقولیت اور منطق کے ساتھ اپنا موقف متعلقہ اداروں اور شخصیات کے سامنے پیش کیا جائے، اس کیلئے لائنگ کی جائے، برینگ کی جائے اور رائے عامہ کو موثر طریقہ سے ہموار کر کے مغرب کی حکومتوں کو اس کیلئے آدھ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے اس مسلمہ حق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے اپنے ملکوں میں اسے دستوری تحفظ فراہم کریں۔

## ڈاکٹر محمد المسعری اور افغان طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳ ستمبر ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر محمد المسعری سعودی عرب کے معروف دانشور ہیں جو گذشتہ پانچ بر سر سے لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور لجنۃ الدفاع عن الحقوق الشرعیۃ (شرعی حقوق کے دفاع کی کمیٹی) کے نام سے سعودی عوام کے شرعی

و سیاسی حقوق کی بحالی کیلئے سرگرم عمل ہیں۔ وہ نومبر ۱۹۸۶ء میں مکہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد محترم اشیخ عبداللہ بن سلیمان المسعری کا شمار سعودی عرب کے سرکردہ علماء کرام میں ہوتا ہے جو قضا کے مختلف مناصب پر فائز رہے اور دیوانِ ظالم کے رئیس کے عہدہ پر بھی کام کیا۔ جبکہ ان کے نناناٹھی محمد عبد الرزاق حمزہ امام الحرمین تھے اور انہیں ملک کے اکابر علماء کرام میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد المسعری نے ابتدائی اور خانوی تعلیم سعودی عرب میں حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے جرمنی چلے گئے۔ گیراہ سال وہاں رہے اور فرنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ۱۹۷۶ء میں وطن واپس آئے اور ریاضی یونیورسٹی میں استنسنٹ پروفیسر اور پھر پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جرمنی میں قیام کے دوران انہیں اخوان المسلمون، حزب التحریر اور دیگر اسلامی تحریکوں سے متعارف ہوئے جو مختلف عرب ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ و احیا کیلئے کام کر رہی ہیں اور ان میں سے بعض کے ساتھ انہیں کام کرنے کا موقع بھی ملا۔

۱۹۹۲ء میں سعودی عرب کے سرکردہ علماء کرام اور دانشوروں نے خلیج میں امریکہ کی مسلح مداخلت کے خلاف اور سعودیہ کے داخلی نظام کی اصلاح کیلئے مذکورة النصیحة (نیر خواہی کی یادداشت) کے نام سے شاہ فہد کو ایک عرض داشت پیش کی تو اس پر دستخط کرنے بلکہ اس کیلئے کام کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد المسعری بھی شامل تھے۔ اس عرض داشت کی پاداش میں دیگر علماء کرام اور دانشوروں کے ساتھ وہ بھی اگر فشار ہو گئے۔ چھ ماہ جبل میں رہے، پھر کسی ذریعہ سے جبل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اتنا ہی عرصہ مختلف علاقوں میں سرگردان رہنے کے بعد میں کے راستہ سے لندن پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور یہاں آگریساں پناہ حاصل کر لی۔

اقوام متحده کے بارے میں ڈاکٹر محمد المسعری کا کہنا ہے کہ یہ تنظیم یہودی مفادات کے تنخیط کیلئے قائم کی گئی تھی اور اپنے قیام کے بعد سے اب تک وہی کام کر رہی ہے۔ اس لیے مسلمان ممالک کے اس میں شامل ہونے اور شامل رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اقوام متحده کا منشور اور چار ٹرکفر کے قوانین پر مبنی ہے اور سیکولر اسلام کا علمبردار ہے جس کی قرآن و سنت کی رو سے کوئی کنجائش نہیں ہے۔ لہذا اقوام متحده میں شمولیت کا مطلب یہودیت اور عالمی کفر کے ساتھ اتحاد ہے، اس لیے مسلم ممالک کو اقوام متحده سے الگ ہو کر اپنی الگ اقوام متحده تشكیل دینی چاہیے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہو گا کہ مسلم ممالک کفر کے عالمی نظام میں شریک ہونے سے بچ جائیں گے اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ عالمی سطح پر توازن کی قوت ان کے ہاتھ میں آجائے گی۔ انہوں نے کہا کہ امارات اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت نے اقوام متحده میں شامل نہ ہو کر درست کیا ہے مگر ابھی اس سلسلہ میں ان کی پالپسی دو ٹوک اور واضح نہیں ہے۔ انہیں کھلے طور پر کہہ دینا چاہیے کہ وہ اقوام متحده میں شمولیت کے خواہشند نہیں ہیں بلکہ حالات مناسب ہونے پر عالم اسلام کی الگ اقوام متحده قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس معاملہ میں طالبان تھا نہیں ہوں گے بلکہ اس وقت بھی دنیا میں سو ٹریلینڈ ایک ایسا ملک ہے جو اقوام متحده کا رکن نہیں ہے۔ اور اگرچہ اقوام متحده کے بہت سے شعبوں کے دفاتر اور مرکز جنیوا میں ہیں جن سے سو ٹریلینڈ مالی مفادات حاصل کر رہا ہے لیکن خود سو ٹریلینڈ اقوام متحده کا رکن نہیں ہے اور اس سلسلہ میں سو اس حکومت کا موقف یہ ہے کہ انہیں اقوام متحده کے منشور اور ڈھانچے سے اتفاق نہیں ہے اس لیے وہ اس میں باضابطہ طور پر شامل نہیں ہوں

۔

طالبان حکومت کے بارے میں ڈاکٹر المسعری نے کہا کہ طالبان خلاص لوگ ہیں، مجاهد ہیں اور ان کی حکومت ایک اسلامی حکومت ہے جس کی وہ محابیت کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کیلئے دعا گو ہیں۔ لیکن طالبان کی حکومت کا نظام اور بہت سے اہم معاملات میں اس کی ترجیحات واضح نہیں ہیں جس سے اہم پیدا ہو رہا ہے۔ طالبان کو اپنا نظام باقاعدہ طور پر تشکیل دینا چاہیے، اس کا اعلان کرنا چاہیے اور اس کیلئے عالم اسلام کے دانشوروں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ طالبان نے اپنے داخلی نظام کی بنیاد فتنہ حقوقی اور فتاویٰ عالمگیری پر رکھی ہے مگر میرے خیال میں انہیں فتاویٰ عالمگیری کی وجہ سے اس کے مرتب کرنے والے حکمران سلطان اور گزیب عالمگیری پر وہی کرنی چاہیے جنہوں نے اس وقت کے منتخب ارباب علم و دانش کو جمع کر کے اس دور کے تقاضوں کے مطابق فتاویٰ عالمگیری کے نام سے ایک نظام مرتب کرایا اور اسے نافذ کیا۔ یہ ایک مسلم حکمران کی پہلی ذمہ داری ہے اور آج افغانستان کے امیر ملا محمد عمر کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ انہیں سلطان اور گزیب عالمگیری طرح حاکم وقت کی حیثیت سے ارباب علم و دانش کو جمع کرنا چاہیے اور فتاویٰ عالمگیری کی طرز پر آج کے دور کے تقاضوں کے مطابق مکمل اسلامی نظام مرتب کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد المسعری نے کہا کہ میں ملا محمد عمر اور ان کے رفقاء کو دو باتوں کا مشورہ دوں گا۔ ایک یہ کہ اپنا دائرہ کارکسی ایک فقہی مذہب تک محدود نہ رکھیں بلکہ قرآن و سنت کو اصل سرچشمہ قرار دیتے ہوئے تمام فقہی مذاہب سے ضرورت کے مطابق استفادہ کریں۔ اور اصحاب علم و فن سے استفادہ میں بجل سے کام نہ لیں بلکہ اگر کسی معاملہ میں غیر مسلم اہل فن کی ضرورت پڑ جائے تو ان سے استفادہ سے بھی گریز نہ کریں۔ اور دوسرا مشورہ یہ ہے کہ اپنی پیچان پر کسی ایک مسلک کی پچھاپ نہ لگنے دیں، ان کا دیوبندی ہوناشک و شبہ سے بالاتر ہے اور انہیں اس پر فخر بھی ہونا چاہیے لیکن عالمی سطح پر ان کی پیچان اس حوالے سے نہیں ہوئی چاہیے۔ اس سلسلہ میں انہیں دو مثالیں سامنے رکھنی چاہیں۔ سعودی حکومت نے اپنی پیچان سلفی اور وہابی تحریک کے حوالے سے کرائی ہے اور ریاستی پالیسی کی ترجیحات میں اس کو نمایاں جگہ دی ہے جس کا نتیجہ یہ لکھا ہے کہ وہ تمام ترکو شوشوں کے باوجود عالم اسلام کے علمی و دینی حقوق کا اس درجے کا اعتماد حاصل نہیں کر سکی جس کی وجہ سے خواہشمند رہتی ہے۔ اسی طرح ایران نے کامیاب انقلاب کے بعد اپنی پیچان پر اثنا عشری چھاپ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی تمام تر دعوؤں اور ٹگ و دو کے باوجود عالم اسلام میں اپنی تہائی اور اجنبيت کو کم نہیں کر سکا۔ طالبان کو اس سے پچنا چاہیے کیونکہ اس کا نہ صرف انہیں نقصان ہو گا بلکہ عالمی سطح پر نماذِ اسلام کی جدوجہد اور اسلامی تحریکات کی حمایت میں وہ جو کردار ادا کرنا چاہتے ہیں یا کر سکتے ہیں وہ کمزور پڑ جائے گا۔ اس لیے طالبان کو اپنے فکر و عمل کا دائرہ وسیع رکھنا چاہیے تاکہ عالم اسلام کی اسلامی تحریکات کو ان سے رابطہ رکھنے اور دنیا کے کسی بھی خطہ میں اسلامی نظام کے نفاذ کی خواہشمند مسلمان حکومت کو ان سے استفادہ کرنے میں کوئی جواب محسوس نہ ہو۔

۔۔۔

## خديو مصر اور خديو پنجاب

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء

میاں شہباز شریف صاحب پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہیں اور وزیر عظم میاں نواز شریف کے بھائی ہیں۔ ان کے بیرونی دوروں کے بارے میں مختلف حلقوں کی طرف سے خدشات اور شبہات کا انہما کیا جا رہا ہے۔ ایک سیاسی رہنمائی بیہاں تک کہہ دیا ہے کہ پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے وزراءً اعلیٰ کو بھی یہ حق دیا جائے کہ وہ بیرونی دورے کریں اور اپنی ذمہ داری پر بیرونی اداروں کے ساتھ معاملات طے کریں۔

سیاسی رہنماؤں کے خیالات اور چھوٹے صوبوں کے خدشات اپنی جگہ گر مجھے اسماعیل پاشا یاد آ رہے ہیں جو خلافت عثمانی کی طرف سے اس کے ایک صوبے مصر پر حکمران تھے اور ”خديو مصر“ ہلاتے تھے۔ سو اصلی پہلے کی بات ہے کہ خلیفہ عثمانی سلطان عبدالعزیز مرحوم سے انہوں نے یہ اجازت لی کہ وہ مصر کیلئے بیرونی ممالک سے اپنے طور پر بھی مالی اور تجارتی معاملات طے کر سکتے ہیں۔ سلطان مرحوم نے اجازت دے دی جس کے بعد خديو مصر کے وارے نیارے ہو گئے۔ اسماعیل پاشا نے مغربی ممالک سے بے تحاشا قرضے لیے اور انہیں بلڑنگوں اور سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ سرکاری مسودہ نمائش اور الاؤں تمللوں میں اٹادیا۔ حتیٰ کہ صرف مصر کے بیرونی قرضوں کی مقدار دولت عثمانی کے مجموعی قرضوں کے برابر پہنچ گئی اور خلافت عثمانی کو وہ قرضے ادا کرنے کیلئے مغربی ممالک میں اپنے اٹاٹے بینچ پڑے۔

وہ زمانہ گزر اور سلطان عبدالحمید مرحوم کا زمانہ آگیا۔ اس وقت برطانیہ اور فرانس دونوں مصر پر نظریں جماعتیتھے تھے اور دونوں کی فوجی قوت مصر کے داییں بائیں موجود تھی۔ بیرونی قرضوں اور اشاؤں کی فروخت کے باعث مصر کے اندر بحران پیدا ہو گیا۔ خديو مصر نے اپنی کامپینی میں برطانوی اور فرانسیسی لا ہیوں کی نمائندگی کرنے والے دو غیر مسلم وزیر شامل کر لیے جس کے تیجے میں مصر کی فوج کی تعداد نصف سے بھی کم کر دی گئی اور ہزاروں افسروں اور سپاہیوں کو فرار گر دیا گیا۔ اس سے مصر کا اندر ویں بحران شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا اور بات بغاوت تک جا پہنچی۔ برطانیہ اور فرانس نے عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید سے مطالبہ کیا کہ وہ مصر کی بغاوت اور خلفشار پر قابو پانے کیلئے فوج کشی کریں۔ سلطان نے یہ کہ کر انکار کر دیا کہ وہ خلیفۃ المسلمين ہیں اور اپنی ہی مسلم رعایا کے خلاف فوج کشی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مصر کے اندر ویں حالات کا بہانہ بن کر برطانیہ نے مصر میں فوجیں داخل کر دیں اور قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔

میں نے مصر پر برطانوی قبضے کے پس منظر کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر اس میں اور بھی بہت سی اندر ویں کہانیاں ہیں جن کی بازگشت ہمیں آج کے حالات میں بھی اپنے ارد گرد صاف طور پر سنائی دے رہی ہیں۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے بیرونی دوروں کو میں اسی پس منظر میں دیکھ رہا تھا مگر میاں شہباز شریف نے گذشتہ روز پر لیں کا نفرنس کر کے اس کے ایک پہلو کو خود ہی نمایاں کر دیا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں دہشت گردی کی حالیہ وارداتوں کا رشتہ طالبان کی اسلامی مملکت کے ساتھ جوڑ کر جو کچھ کہا ہے اس سے ان کے دورہ امریکہ اور امریکی کام کے ساتھ ان کی ملاقوں کے مقاصد کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔ وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین اس سے قبل کہہ چکے

بیں کہ پاکستان میں فرقہ دارانہ دہشت گردی کی یہ بہر قرقہ دارانہ کتبکش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بیرونی ایجنسیوں بالخصوص ”را“ کی کارستنی ہے۔ گورنر پنجاب نے یہی بات زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی ہے۔ مگر میاں شہباز شریف کا اصرار ہے کہ یہ سب کچھ طالبان نے کرایا ہے اور اس کے حوالے سے انہوں نے طالبان کے خلاف باقاعدہ سرکاری ہم کا آغاز بھی کر دیا ہے۔

میاں شہباز شریف کا کہنا ہے کہ افغانستان میں عسکری تربیت کے اڈے ہیں جہاں نوجوانوں کو فوجی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ مگر انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ یہ تربیتی مرکزوں ہی ہیں جن میں تربیت حاصل کر کے نوجوانوں نے روئی استعمار کے خلاف پاکستان کی سالمیت کی جنگ لڑی ہے اور فوجی ٹریننگ کے یہ اڈے وہی ہیں جہاں سے تربیت پانے والے نوجوان کشمیر میں اپنے مجاہد کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ مصروف جہاد ہیں۔ بلکہ بوسنیا، چیچنیا، داغستان اور کوسووو کے مجاہدین بھی انہی مرکزوں کے تربیت یافتے ہیں۔ ان تربیتی مرکزوں میں یقیناً کچھ ایسے لوگوں نے بھی ٹریننگ حاصل کی ہوگی جنہوں نے اس ٹریننگ سے غلط فائدہ اٹھایا ہے، مگر چند افراد کے غلط کردار کے باعث اگر میاں شہباز شریف افغانستان میں موجود عسکری تربیت کے مرکزوں کو دہشت گردی کے اڈے قرار دے رہے ہیں تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ یہ کہہ کر جہاد افغانستان اور جہاد کشمیر دونوں کی نفی کر رہے ہیں، اور روس و بھارت کے سیاسی موقف کی حمایت بھی کر رہے ہیں۔

پاکستان میں دہشت گروں کی وارداتیں مذموم ہیں اور اس امکان کو بھی ہم رد نہیں کرتے کہ دہشت گردی کے مرتکب کچھ افراد نے افغانستانی کیمپوں میں تربیت حاصل کی ہوگی۔ مگر اس کی آڑ میں مجاہدین کو تربیت دینے والے عسکری مرکزوں کی کراداری اور ان کے خلاف ہم جوئی پاکستان کا نہیں بلکہ امریکہ کا ایجنسڈا ہے۔ کیونکہ امریکہ یہ چاہتا ہے کہ ایشیا کے اس خطے میں طالبان کا کردار آگے نہ بڑھے اور وہ اس سر زمین کو آزادی کے ساتھ اسلامی قوتوں کو جیتن کے خلاف اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر سکے جس کی وہ ایک عرصہ سے خواہش رکھتا ہے۔

اس پس منظر میں ہم میاں شہباز شریف صاحب سے با ادب یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ جو کردار ادا کرنا چاہیں ہیں بڑے شوق سے کریں، انہیں ہر رول ادا کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن تاریخ میں ہر کردار کیلئے ایک مخصوص باب ہوتا ہے، اس کا مطالعہ بھی کر لیں۔ اور بطور خاص ”خدیو مصر“ اسماعیل پاشا کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں۔ اگر انہیں کہیں اور سے اس سلسلہ میں معلومات میسر نہ ہوں تو تاریخ کے اس حصے کے بارے میں مستند لٹریچر ہم ان کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ خدو یہ مصر کی پالیسیوں کے نتیجے میں تو برطانیہ کی فوجیں مصر پر قایض ہوئی تھیں، لیکن ”خدیو پنجاب“ کے منصوبوں میں یہ کردار کس ملک کی فوج کیلئے تجویز کیا گیا ہے؟ میاں صاحب خود ہی وضاحت فرمادیں تو ان کا بے حد کرم ہو گا۔

## جزل پرویز مشرف سے دینی جماعتوں کی توقعات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۲۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء

افغانستان میں جہادی ٹریننگ کے مرکز، طالبان کی اسلامی حکومت، پاکستان کے دینی مدارس اور دہشت گردی کی وارداتوں کے حوالے سے میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کی پریس کانفرنسوں کے بعد ملک کے دینی حقوقوں میں یہ خدشات بڑھتے جا رہے تھے کہ حکومت، طالبان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دینی مرکزوں مدارس کے خلاف بھی کسی کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس پس منظر میں مجلس عمل علماء اسلام پاکستان نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں علماء کونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس صورتحال میں حکومتی اقدامات اور عزادم سے منع کیلئے کوئی لاحظہ عمل طے کیا جاسکے۔ مجلس عمل علماء اسلام پاکستان دینی جماعتوں کا متحده مجاز ہے جس میں دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی کم و بیش سب دینی و سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفر اس متحده مجاز کے سربراہ ہیں جبکہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند مولانا سید عطاء المون شاہ بخاری رابطہ سیکر ٹری کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

شرکاءِ مغلن نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ پاک فوج میں خلفشار پیدا کرنے کی سازش ناکام ہو گئی ہے اور سابقہ حکومت نے واٹگلشن کے حکمرانوں کی آشیباد سے طالبان کی اسلامی حکومت اور پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف جس کارروائی کا عزم ظاہر کیا تھا اور جس کیلئے مدارس دینیہ کی فہرستیں اور کوائف مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے وہ کارروائی وقت طور پر رک گئی ہے۔ مگر ان دونوں حوالوں سے نئی حکومت کے عزم کے بارے میں ابھام بدستور موجود ہیں اور جب تک نئے حکمرانوں کی پالیسی اور ترجیحات سامنے نہیں آتیں اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے یہی مشورہ ہوا کہ چند روز تک صورتحال واضح ہونے پر از سر نو علماء کونشن بلایا جائے تاکہ دینی حقوقوں کے آئندہ لاحظہ عمل کا تعین کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی مشورہ میں یہ بات طے پائی کہ مجلس عمل کی طرف سے ایک "یادداشت" جزل پرویز مشرف کو بھجوائی جائے جس میں ان توقعات اور خدشات کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے جو ملک کی حالیہ تبدیلیوں کے بعد دینی حقوقوں کے ذہنوں میں ابھر رہے ہیں اور جن سے ملک کی نئی حکومت کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں شرکاءِ مغلن نے جن امور کا تذکرہ کیا ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

1. اول یہ کہ آئین متعطل ہو جانے کے بعد آئین کی اسلامی دفعات بالخصوص قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی دستوری ترمیم کے بارے میں ابھام پیدا ہو گیا ہے اور ان دفعات کا قبول ان میں الاقوامی لایوں کی تقویت کا باعث بن سکتا ہے جو پاکستان کے دستور سے اسلامی دفعات کو حذف کرنے اور پاکستان کو سیکولر قرار دلوانے کیلئے مسلسل مصروف عمل ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ فوجی حکمران دستور پاکستان کی اسلامی دفعات بالخصوص قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی آئینی دفعے کے بارے میں اپنے موقف کا دلوک اعلان

کریں تاکہ دستور پاکستان کی نظریاتی حیثیت اور نئی حکومت کے حوالے سے بے جا شکوک و شبہات نہ پھیل سکیں۔

2. دوم یہ کہ فرقہ وارانہ وہشت گردی کے عنوان پر گذشتہ برسوں میں جو تباہی مچی ہے اس کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس دوران سنی اور شیعہ مکاتب فکر کے سینکڑوں علماء اور ارکین جاں بحق ہوئے ہیں، ہزاروں افراد کے خلاف مقدمات درج ہیں جن میں بہت سے لوگ سالہا سال سے جیلوں میں بند ہیں۔ سینکڑوں افراد پولیس مقابلوں میں مارے گئے ہیں مگر فرقہ وارانہ کشیدگی اپنے تمام تراصبوں و عوامل سمیت پوری طرح بدستور موجود ہے۔ اس لیے نئی حکومت کو چاہیے کہ وہ پیریم کورٹ کے نجی سربراہ میں اعلیٰ عدالتی انکواڑی کمیشن قائم کرے جو سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کرے، دونوں طرف کے مارے جانے والے رہنماؤں اور کارکنوں کے مقدمات کا جائزہ لے، پولیس مقابلوں میں مارے جانے والے افراد کے کیسوں کی انکواڑی کرے اور ملک بھر کے تھانوں میں درج ان ہزاروں مقدمات کی میراث کی بنیاد پر چھان بچنک کرے جو دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے خلاف درج کروار کئے ہیں اور جن میں سے اکثر مقدمات کی بنیاد مخفی مخاصمت اور عناد ہے۔ جبکہ ان مقدمات کے تحت بہت سے افراد سالہا سال سے جیلوں میں بند چلے آ رہے ہیں۔

3. سوم یہ کہ مسئلہ کشمیر، طالبان، اسامہ بن لادن اور پاکستان کے دینی مدارس کے بارے میں امریکی دباؤ کو مسترد کرنے کا واضح اعلان ضروری ہے۔ اور اس سلسلہ میں شرکاء محفل نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ اگر فوجی حکومت امریکی دباؤ کو مسترد کر کے قومی و قاری اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے مضبوط موقف اختیار کرے تو اسے ملک کے عوام بالخصوص دینی حلقوں کی طرف سے بھرپور حمایت ملنی چاہیے اور ایسی صورت میں مجلس عمل علماء اسلام پاکستان کو سرگرم کردار ادا کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔

## عوامی جمہوریہ چین کے حکمرانوں سے ایک گزارش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹۹۹ اکتوبر ۲۳

عوامی جمہوریہ چین ہمارا عظیم پڑو سی ملک ہے اور پاکستان کے ان دوستوں میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے ہر آڑے وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا۔ مگر گذشتہ ایک ہفتہ کے دوران دو تین خبریں ایسی آئی ہیں جنہوں نے پاک چین تعلقات کے حوالے سے محبوطن پاکستانیوں کو بے چینی سے دوچار کر دیا ہے۔

\* ایک خبر تو راسترکی جاری کر دہ ہے جو لاہور سے شائع ہونے والے ایک قومی اخبار نے ۱۲ اکتوبر کو شائع کی ہے کہ

چین کے شورش زدہ صوبے ٹنبیانگ (سکیانگ) میں عدالت نے بم دھماکوں اور ڈکتیوں کی منصوبہ بندی کرنے پر تین مسلمان علیحدگی پسندوں کو سزاۓ موت سنادی ہے اور ان کے چھ دیگر ساتھیوں کی سزاۓ موت کو عمر قید میں بدل دیا ہے۔

- دوسری خبر این این آئی نے ہندوستان نائمز کے حوالے سے جاری کی ہے کہ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف نے واشنگٹن کے دورہ میں امریکی حکام کے ساتھ جو سمجھوتہ کیا ہے اس میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ پاکستان چین کے ساتھ امریکہ کے معاملات میں امریکہ کا ساتھ دے گا۔
- جبکہ تیسرا خبر حرکت المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمن خلیل نے گذشتہ ہفتے پر یہ کانفرنس میں بتائی ہے کہ رابطہ عالم اسلامی نے ان سے رابطہ قائم کر کے ترغیب دی تھی کہ وہ سکیانگ میں مسلمانوں کو جہاد آزادی کیلئے تیار کرنے میں کردار ادا کریں مگر انہوں نے چین کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔

سکیانگ چین کا وہ سرحدی صوبہ ہے جو پاکستان کے ساتھ ملتا ہے اور اسے چینی ہرکتان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کاشنگن اسم کا معروف شہر بھی اسی صوبہ میں ہے۔ اس صوبہ کی مجموعی آبادی ایک کروڑ بیان کی جاتی ہے جس کی اسی فیصد آثریت مسلمان بتائی جاتی ہے۔ کمیونٹ افقلاب کے بعد اس خط کے مسلمانوں نے اپنی آزادی برقرار رکھنے کیلئے مزاحمت کی اور علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے شاگرد مولانا ثبوت اللہ ایغور شہیدی کی قیادت میں کمیونٹ فوجوں کے ساتھ سالہاں تک مقابلہ کیا۔ مگر وہ شہید ہو گئے، مزاحمتی تحریک دم توڑ گئی اور ان کے قربی رفقاء بھرت کرنے پر مجبور ہو گئے جن میں ایک بزرگ مولانا نیاز محمد ختنی بھی تھے۔ مولانا مرحوم قیام پاکستان کے بعد حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی کے ہمراہ بہاولنگر آگے اور مرکزی عیدگاہ میں جامع العلوم کے نام سے دینی درسگاہ قائم کی جو آج بھی ان کے فرزند مولانا جلیل احمد انہوں کی نگرانی میں تعلیمی خدمات میں مصروف ہے۔

جہاد افغانستان اور اس کے نتیجہ میں وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی کے اثرات چین کے اس مسلم آثریت کے صوبے پر پڑنے کی لازمی اور فطری بات تھی اور یہ بھی صاف نظر آرہا تھا کہ امریکہ چین کے خلاف جو عزم رکھتا ہے اور اس کی بڑھتی ہوئی قوت کو غیر مؤثر بنانے کیلئے اس کے اردو گرد حصار قائم کرنے کی جو کوشش کر رہا ہے اس میں سکیانگ کے مسلمانوں کا مسئلہ اس کیلئے ایک مفید تھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ حالات کی ترتیب بtarی ہی ہے کہ امریکہ اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کے تقاضوں سے غافل نہیں رہا اور مذکورہ بالا بخروں سے امریکی پروگرام کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

خود راقم الحروف سے بھی اس مسئلہ پر بعض اسلامی تحریکات نے رابطہ قائم کیا اور اسی سال اگست کے دوران لندن میں اس سلسلہ میں ایک مختصر ری مشاورت بھی ہوئی جہاں کچھ دوستوں کا تقاضہ تھا کہ سکیانگ کے مسلمانوں میں آزادی کے روز افرزوں جذبات کو فروغ دینے کیلئے کام کیا جائے۔ مگر میں نے ان سے عرض کیا کہ ہم اس حوالے سے بہت نازک صورتحال سے دوچار ہیں اور کوئی قدم پوری طرح سوچے سمجھے بغیر اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایک طرف

سکنیاگ میں بنتے والے اسی لاکھ کے لگ بھگ مسلمانوں کا مسئلہ ہے جو جہاد افغانستان اور سطحی ایشیائی مسلمان ریاستوں کی آزادی کے تناظر میں ان سے پچھے نہیں رہنا چاہتے اور اپنے شخص اور آزادی کیلئے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں۔ وہاں آزادی کیلئے مزاحمتی تحریک پیدا ہو چکی ہے، بزرگوں افراد بھرت کر کے قاز قستان اور دوسرے ملکوں میں جا چکے ہیں، خود پاکستان بملکہ اسلام آباد میں بھی ہم نے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جو سکنیاگ سے تعلق رکھتے ہیں اور ریاتی جرسے بے بس ہو کر سرحد پار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان مسلمانوں کی جدو جہد اور قربانیوں سے قطعی طور پر لائق رہنا شرعی اصولوں اور غیرت و حمیت کے تقاضوں کے منافی ہے۔ مگر دوسری طرف امریکہ اور اس کے حواری بعض دیگر ممالک اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے اور اس کے ذریعے جی بن کا شیرازہ بکھیرنے کیلئے بالکل تیار بیٹھے ہیں جو موجودہ حالات میں نہ صرف پاکستان کے وجود اور اس کی سالمیت وحدت کیلئے انتہائی اقتضان دہ بات ہو گی بلکہ عالمی سطح پر بھی امریکہ کی واحد اجراہ واری کو مستلزم کرنے اور اس کے نتیجہ میں عالم اسلام کی تباہی پھیلانے کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے یہ بات ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ کسی ایسی تحریک کو سپورٹ کریں جو عالم اسلام کے مقابلے میں امریکہ کی قوت میں اضافہ پر ملتی ہوئی ہو۔

رقم الحروف نے ان دوستوں سے عرض کیا کہ میرے نزدیک جیبن کے حکمرانوں کو اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ اس خط کے معروضی حقائق کا سامنا کریں اور سکنیاگ کے مسئلہ کو کسی ایسی حکمت عملی کے ساتھ حل کریں کہ وہاں کے مسلمان محرومی کے احساس سے نجات حاصل کر لیں اور امریکہ کو موقع نہ ملے کہ وہ اس مسئلے سے فائدہ اٹھا کر جیبن کے خلاف کوئی نیا محاڑا گرم کر سکے۔

جباں تک پاکستان کے دینی حقوقوں کا تعلق ہے، ایک تاریخی حقیقت کی طرف جیبن کے محترم حکمرانوں کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کمیونسٹ ہونے کے ناطے سے ہمارے نزدیک روس اور جیبن میں کوئی فرق نہیں تھا اور کمیونزم کے دونوں فلسفے ہمارے نقطہ نظر سے کیاں کفر کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن روس کے عزائم توسعہ پسندانہ تھے اور اس نے ہمیشہ پاکستان کے مقابلہ میں بھارت کو سپورٹ کیا جبکہ جیبن نے اپنے کمیونزم کے فلسفہ کو اپنی سرحدوں تک محدود رکھا اور پاکستان کو دوستی کی نصافر، ہم کی۔ اس لیے پاکستان کے دینی حقوقوں کی کمیونزم کے خلاف جدو جہد میں ان کا ہدف ہمیشہ روس رہا جبکہ جیبن کے خلاف پاکستان کی کسی دینی جماعت نے کبھی کوئی تحریک نہیں چلائی جو اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ پاکستان کے دینی جماعت کا مکمل اور اک رکھتے ہیں بلکہ دوست اور دشمن کی پیچان سے بھی بہرہ ور ہیں۔ مگر تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بھتی اور اب وقت آگیا ہے کہ جیبن کے حکمران اور داشتور معروضی حالات اور مستقبل کے خطرات کا صحیح طور پر اندازہ کریں اور جنوبی اور سطحی ایشیا کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احساس کرتے ہوئے افہام و تفہیم کے ساتھ امریکی یلغار کا راستہ روکنے کیلئے مشترکہ حکمت عملی کا راستہ اپنائیں کیونکہ دونوں کا مفاد اور بقاہ اسی میں ہے۔

## اسامہ بن لادن: اسلام اور مسلمانوں کا غدار؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- نومبر ۱۹۹۹ء

اسامہ بن لادن اسلام اور مسلمانوں کا غدار ہے اور اس کی سعودی شہریت منسوب خلیلی کی جانبی ہے اس لیے اگر اسے امریکہ کے حوالے کر دیا جائے تو سعودی حکومت کو کوئی تشویش نہیں ہوگی۔ خبر کے مطابق سعودی وزیر دفاع نے یہ بات واشنگٹن میں اخبار نویسیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہی ہے۔

اسامہ بن لادن کے خلاف امریکہ نے ایک عرصہ سے جو ہم چلا رکھی ہے اس کے پس منظر میں سعودی شہزادے کی یہ بات کسی طور پر بھی خلاف توقع نہیں ہے اور موجودہ حالات کے تناظر میں اس کے علاوہ وہ کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ہم بڑے ادب کے ساتھ سعودی حکمرانوں سے یہ گزارش کریں گے کہ نہ صرف یہ کہ یہ بات قطعی طور پر خلاف واقعہ ہے بلکہ اسلام کی غلط تربیتی اور اسلامی تعلیمات کو سمجھ کرنے کی کوشش ہے جسے کسی صورت میں بھی قول نہیں کیا جاسکتا۔ بات صرف سعودی حکومت یا سعودی یہ کے مروجہ سٹم اور قواعد و ضوابط کی ہوتی تو اسے سعودی حکمرانوں کی مجبوری قرار دے کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا گربات اسلام کے حوالے سے ہوئی ہے اور اسامہ کی مددت کرنا ہمارے نزدیک اسلام سے غداری اور مجاہدین کے مقدس خون کا مذاق اٹانے کے مترادف ہو گا جسے کم از کم بے حمیتی اور بے غیرتی سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اسامہ بن لادن سعودی عرب کے ایک متول خاندان کا فرد ہے جس نے سالہا سال تک رو سی جاریت کے خلاف جہاد افغانستان میں بنس نفیس حصہ لیا اور مختلف مجاہد گروپوں کی خلیفی مالی امداد کرنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں مسلم اور عرب نوجوانوں کو جہاد کی عملی ٹریننگ دلوالے کا اہتمام کیا۔ افغانستان سے رو سی نوجوانوں کی واپسی کے بعد جب مختلف مسلم ممالک سے تعلق رکھنے والے تربیت یافتہ مجاہدین کی فہرستیں ان ممالک کی حکومتوں کو امریکی سی آئی اے نے فراہم کیں اور یہ طے پایا کہ ان مجاہدین کو ان کے ملکوں میں واپس بھجو کر ریاقت قوانین کے شکنچ میں جکڑ دیا جائے تو اسامہ بن لادن نے سوڈان میں ڈریہ لگالیا۔ اور وہ سوڈان کی حکومت کا زراعت میں خود کفالت اور سڑکوں کی تعمیر میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ ان مجاہدین کی پناہ گاہ بن گیا جن کو امریکہ اور اس کے حواری مسلم حکومتوں کے دباو پر پاکستان سے نکال دیا گیا تھا گروہ واپس ملکوں میں واپس جانے کی بجائے اسامہ بن لادن کے پاس جا پہنچے اور اس کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

اسامہ بن لادن نے سعودی عرب کے اندر ان علماء کرام اور دانشوروں کی جدوجہد کی حمایت کی جو مطلق العنان ہادشاہت اور مختلف سرکاری اداروں میں رائج نہیں شرعی قوانین کے خاتمه اور مکمل شرعی نظام کے نفاذ کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں، اور خلیج عرب میں امریکہ اور اس کی اتحادی ممالک کی مسلح افواج کی موجودگی کو عرب عوام کی آزادی اور عرب ممالک کی خود مختاری کے منافی اسرائیل کی ناجائز حکومت کے تحفظ اور حریم شریفین کی آزادی و تقدس کیلئے نظرے سمجھتے ہوئے خلیج سے غیر ملکی افواج کے اخلاء کا مطالبہ کر رہے ہیں جو بیان شہبہ ایک جائز اور ناگزیر مطالبہ اور عرب علماء و عوام کا سلمہ حق ہے۔ اس لیے سوڈان پر امریکہ کی طرف سے دباو ڈالا گیا کہ اسامہ کو سوڈان سے نکال دیا جائے اور اس میں اس حد تک

اضافہ کیا گیا کہ خود اسامہ بن لادن نے سوڈان کو مشکلات سے بچنے کیلئے اسے چھوڑ دیا اور افغانستان آگئے۔ یہاں انہیں نظریاتی طور پر ان سے ہم آہنگ طالبان کی اسلامی حکومت کی اخلاقی حمایت میسر آئی جو امریکہ اور اس کے حواری مسلم حکومتوں کیلئے سوہان روح ہن گئی اور اسی کرب و اضطراب میں تمام اخلاقی و قانونی حدود کو چھلانگتے ہوئے سوڈان اور افغانستان کو فضائی حملوں کا شانہ بناؤالا۔ مگر اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا اور اب وہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے افغانستان کے خلاف پابندیاں لگانے کا اعلان کر رہا ہے۔

اسامد پر الزام ہے کہ اس نے امریکہ کے خلاف مختلف مقامات پر دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے اور وہ دنیا بھر کے دہشت گروں کو امد اد دے رہا ہے۔ جبکہ اس کا اصل قصور یہ ہے کہ وہ سعودی عرب کے اندر مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور خلیج عرب سے امریکی افواج کی واپسی کیلئے جدو جہد کر رہا ہے۔ اور امریکہ یہ بات اچھی طرح مجحتا ہے کہ سعودی عرب میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام اور خلیج سے امریکی فوجوں کی واپسی کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کو پورے عالم اسلام سے دلیس نکالا مل جائے گا اور اس نے نیوورلڈ آرڈر کے نام پر دنیا کی واحد پوہراہٹ اور اجارہ داری کا جو پلان بنارکھا ہے وہ نایکیں نایکیں فش ہو کر رہ جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی امریکہ کیلئے یہ بات بھی کسی طور پر قبل قبول نہیں ہے کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت نے اقوام متحده کے چار ٹرکو نظر انداز کرتے ہوئے مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے جو پروگرام شروع کر رکھا ہے وہ پایہ تکمیل تک پہنچنے اور دنیا کے سامنے ایک نظریاتی اسلامی حکومت اور مشائی اسلامی معاشرہ کا نمونہ ابھرے۔ اس لیے امریکہ اسامہ بن لادن کو ہدف قرار دے کر اسے سزادینے کے جنون میں اس حد تک مبتلا ہو چکا ہے کہ اس کیلئے قانونی اصولوں اور اخلاقی قدروں کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی اور وہ طالبان کو بائیکاٹ اور دیگر کارروائیوں کی مسلسل ڈھمکیاں دے رہا ہے۔

امارت اسلامی افغانستان اور اسامہ بن لادن کے درمیان موجودہ بحران سے نکلنے کیا ترتیب طے پائی ہے اس کا رخ ان سطور کی اشاعت تک واخخ ہو چکا ہو گا۔ مگر ہم اس بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں، یہ آزادی کے حصول اور خود مختاری کے تحفظ کی جگہ ہے اور اسلام کی بالادستی اور اسلامی احکام و قوانین کی بالادستی کا معركہ ہے، جنگلوں اور معمر کوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا آیا ہے۔ اور معاملات جہاں تک پہنچ گئے ہیں وہاں اسامہ بن لادن کی ذات اور اس کی جان کا مسئلہ اب کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہا، اس مرد مجاهد نے اپنے مشن اور جذبات دونوں کو دنیائے اسلام کے ہزاروں مجاہدین کے سینوں میں منتقل کر دیا ہے اور اگر اسے شہادت کی وادی سے بھی گزرنا پڑتا تو وہ نہ صرف سرخو ہو گا بلکہ دنیا بھر میں امریکہ اور اس کے حواریوں کے خلاف صفت آراء مجاہدین کے جذبات اور عزم میں اس کی شہادت سے اضافہ ہو گا۔

البتہ اسامہ بن لادن کو اسلام کا غدار قرار دینے والے نام نہاد مسلم حکمرانوں کو نو شہید دیوار ضرور پڑھ لینا چاہیے کیونکہ اسلام امریکہ کا نام نہیں کہ اس کے ناپاک مفادات اور مکروہ عزائم کی مخالفت اسلام سے غداری قرار پائے۔ وہ مسلم حکمران جنہوں نے اپنے ملکوں میں اسلامی احکام و قوانین کا راستہ روک رکھا ہے، خلیج میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی مسلح افواج کو بھار کھا ہے، عرب عوام کی آزادی اور عرب ممالک کی خود مختاری کو دنیاوی مفادات کی خاطر امریکہ کے لاکروں میں گروئی رکھا ہوا ہے اور اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف عالمی استعمار کے ایجنسیز کی تکمیل کیلئے آلہ کا رجنے ہوئے

ہیں، انہیں اپنے چہروں سے امریکی نقاب ہٹا کر ایک بار معروضی حالات کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لینا چاہیے تاکہ انہیں ”اسلام کا نادر“ تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

## طالبان، امریکہ، اقوام متحده

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - دسمبر ۱۹۹۹ء

امریکی صدر مل کاشن نے اعلان کیا ہے کہ وہ دہشت گردوں کی سرپرستی کرنے پر طالبان کو سزا دینا چاہتے ہیں، انہوں نے کہا کہ افغانستان پر عائد کی جانے والی پابندیوں کا مقصد طالبان تحریک کو عالمی برادری سے دہشت گردی سمیت اہم معاملات پر عدم تعاون کی راہ اپنانے کی سزا دینا ہے۔

اس سے قبل اقوام متحده کے سیکرٹری جنرل کوئی عنان جزوی اسی میں سالانہ روپورٹ پیش کرتے ہوئے کہمچکے ہیں کہ افغانستان دینا بھر کے مذہبی دہشت گردوں کی آمادگاہ بنانا ہوا ہے اور ان کے خیال میں افغانستان میں خانہ جنگی، وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اور مذہبی انتہا پسندی کی لہری صدی میں افغانستان اور اس کے ہمسایہ ممالک کی سلامتی کیلئے ایک عظیم خطرہ بن جائے گی۔ مسٹر کوئی عنان کا کہنا ہے کہ افغانستان مذہبی انتہا پسندوں کی پرورش گاہ ہے اس کا جھپٹا ہے جہاں پاکستان سمیت عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے کم عمر بچوں کو طالبان کے ساتھ چہار میں جھونکا جاتا ہے۔

بل کاشن اور کوئی عنان کی طالبان کے بارے میں یہ شکایات نہیں ہیں اور وہ ایک عرصہ سے ان الزامات کا تکرار کر رہے ہیں لیکن اصل میں انہیں تکلیف اس بات پر ہو رہی ہے کہ ان کے بیانات، وسیع تر پر اپیگنڈے اور طالبان کی کردارشی کی مہم پر پاکستان اور جنوبی ایشیا کے مسلمان ”ایمان“ نہیں لائے اور ان الزمات کو مسترد کرتے ہوئے طالبان کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ امریکی حکومت اور اس کی آلہ کار اقوام متحده کے بزرگمہروں کا خیال تھا کہ وہ جو ارشاد فرمائیں گے وہ سمجھا جائے گا، ان کی قراردادوں اور فیصلوں کو صحیحہ آہمنی تصور کیا جائے گا اور جب وہ طالبان کی کردارشی کی عالمی مہم اور میڈیا کے تابروٹریوں کے بعد افغانستان پر پابندیاں عائد کریں گے تو اس خطے کے عوام سجدہ شکر بجا لائیں گے کہ امریکہ بہادر نے دہشت گردوں سے ان کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے اور وہ طالبان سے لائقی اختیار کرتے ہوئے اقوام متحده اور امریکہ کو اپنانجات دہنہ تسلیم کر کے ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ طالبان کے ساتھ اس خطے کے عوام کی ہمدردیاں بڑھ گئی ہیں اور اہل داشت پہلے سے زیادہ اعتماد اور حوصلہ کے ساتھ طالبان کا دفاع کر رہے ہیں۔ پاکستان نے افغانستان کے بارے میں عالمی برادری کے نام نہاد تاکشل میں پیٹا ہوا امریکی ایجنسیاں من و عن قبول کرنے سے مغدرت کر دی ہے، ایران نے افغانستان کے ساتھ تجارت کیلئے پیش رفت کی ہے اور پاکستان کی دینی جماعتیں افغانستان اور طالبان کی حمایت میں پہلے سے زیادہ متحرک اور سرگرم ہو گئی ہیں۔

کاشن اور کوئی عنان کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ انہوں نے طالبان پر دیوبندی کا لیبل چسپاں کر کے پاکستان کے بہت سے دینی حلقوں کو ان سے دور رکھنے کی جو منصوبہ بندی کی تھی اور میں الاقوامی پریس کی روپرٹوں میں اسے دیوبندیوں

کی حکومت قرار دے کر طالبان کو کارز کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ بھی کامیاب کا ہدف حاصل نہیں کر سکی۔ اور طالبان کو جہاں مولانا فضل الرحمن اور مولانا آمیج الحق کی قوی آواز کی پشت پناہی حاصل ہے وہاں وہ مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبد اللہ خان نیازی، قاضی حسین احمد، لشکر طیبہ اور علماء ساجد نقوی کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو رہے ہیں اور طالبان کی تحریک کو کارز کرنے کا امریکی منصوبہ فلاپ ہوتا جا رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسٹر کلنٹن کا "حقائق نامہ" اور کوئی عنان کی یہ روپڑ اسی غصہ کا انہمار ہے جو انہیں اپنی پالیسیوں میں ناکامی پر جیتن سے بیٹھنے نہیں دے رہا۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ طالبان آج بھی وہی ہیں جو روس کے خلاف جہاد کے موقع پر تھے، اس وقت بھی انہوں نے ڈاڑھیاں رکھی ہوئی تھیں، ان کی عورتیں پردے سے باہر نہیں آتی تھیں، وہ تب بھی نمازیں پڑھتے تھے، دنیا بھر سے مسلمان نوجوان جہاد کی تربیت کیلئے ان کے پاس آتے تھے، وہ اس وقت بھی اسلام کی بالادستی اور اسلامی نظام کے نفاذی بات کرتے تھے، ان کے دل اس وقت بھی شرعی قویں کے نفاذ کیلئے دھرکتے تھے اور روس کے خلاف وہ جنگ بھی انہوں نے جہاد کے نام پر لڑی تھی، اس لیے آج افغانستان کے کمپیوں میں اور طالبان کے حلقوں میں کوئی نئی بات نہیں ہو رہی۔

وقت زیادہ نہیں گزرا، ابھی چند سال پہلے کی بات ہے اور اگر اقوام متحده کو اور امریکہ بہادر کو شوق ہے تو آئیں ہم انہیں دعوت دیتے ہیں کہ غیر جاندار مبصرین کا ایک کمیشن مقرر کر لیں اور افغانستان میں روس کے خلاف لڑی جانے والی جنگ اور اب امریکہ کی بالادستی اور اس کے گماشتوں کی مداخلت کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا باہمی موازنہ کر لیں اور کوئی ایک نئی بات دکھادیں جو اس دور میں نہیں ہوتی تھی اور اب ہوتی ہے۔ انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اس جنگ اور آج کی جنگ کے حوالے سے افغانستان کے حالات، مجاہدین کے طرز عمل اور کمپیوں کی صورت حال میں کوئی فرق دکھا دیں تو ہم ان کے موقف کی حمایت پر سنجیدگی سے غور کرنے کیلئے تیار ہوں گے۔

امریکہ کو شکایت ہے کہ روس کے خلاف جنگ میں اس نے افغان مجاہدین کی حمایت کی تھی اور ساتھ دیا تھا اس لیے اب افغان مجاہدین کو آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلتا چاہیے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ امریکہ نے ساتھ دیا تھا لیکن امریکہ نے اپنی حمایت کا چھل وصول کر لیا ہے اور سودا بیت یوینین کی مکالست و ریخت کی صورت میں نتاںج حاصل کر لیے ہیں۔ جبکہ وہ خود سارے نتاںج حاصل کر کے افغان عوام کو ان کے حصے کے نتاںج سے بہرہ در ہونے کا حق نہیں دے رہا اور انہیں اپنی جزو و جهد کے جائز اور منطقی ثمرات سے محروم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جسے کم از کم الفاظ میں کمینگی سے ہی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

ہم مسٹر کلنٹن اور کوئی عنان سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ افغان عوام اور طالبان میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ جب روپی استعمار کے خلاف نبرد آ رہا تھے اس وقت بھی ان کا واحد ہدف اپنی خود مختاری اور دینی شخص کا تحفظ تھا اور آج جب انہیں امریکی سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے تب بھی ان کی جنگ اپنے دینی شخص اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے ہے۔ تبدیلی اگر آئی ہے تو اس کا مشاہدہ کرنے کیلئے کلنٹن اور کوئی یونی کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے کوئی بات ان سے اوپھل نہیں رہے گی۔ اس لیے آج اگر عالم اسلام کی رائے عامہ بالخصوص جنوبی ایشیا کے مسلمان اور پاکستان کے دینی و سیاسی حلقے افغانستان کے بارے میں امریکہ اور اقوام متحده کے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے موقف کو قبول نہیں کر رہے اور

منافقت کو دیکھ کر انہوں نے منہ درمری طرف پھیر لیا ہے تو اس میں طالبان کا کیا قصور ہے؟ یہ تو مکافاتِ عمل ہے اور منافقت کا مخفی انجام ہے جس سے امریکہ اور اقوام متحده کو اب بہر حال گزرنہ ہے۔

## امیر امان اللہ خان اور افغانستان میں مغربی ثقافت کی ترویج

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ۹ دسمبر ۱۹۹۹ء

مارچ ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ خان نے اپنے والد امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد افغانستان کی بادشاہت سنبھالی تو صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ افغانستان ایک آزاد ملک کہلاتا تھا مگر امیر حبیب اللہ خان اور ان کے والد امیر عبد الرحمن کے برطانوی حکومت کے ساتھ معاهدوں کی بدولت پالیسیوں پر انگریزوں کا ریبوٹ کشروں قائم ہو چکا تھا۔ ان معاملات کے تحت نہ صرف چڑال، وزیرستان، خیبر، چاغن، چمن، پشتون، پارچتار، اور کرم کے علاقوں انگریزوں کے حوالہ کر دیے گئے تھے بلکہ ۱۹۰۵ء میں کیے جانے والے ایک معاهدہ کی رو سے امیر حبیب اللہ خان نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ کے عوض افغانستان کے خارجہ معاملات کا کشروں بھی انگریزوں کی تحمل میں دے رکھا تھا۔

امیر امان اللہ خان نے بادشاہت سنبھالتے ہی افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جس میں افغان قوم نے اپنے حکمران کا بھرپور ساتھ دیا اور بالآخر مختلف جھڑپوں اور محاذ آرائی کے بعد برطانوی حکومت نے ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو افغانستان کی آزادی کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کامیابی کے بعد امیر امان اللہ خان نے ملک کے نظامی اصلاح اور دستوری ماحول قائم کرنے کی طرف توجہ دی اور متعدد اصلاحات نافذ کیں جو افغان قوم کو ہضم نہ ہو سکیں اور جنوری ۱۹۲۹ء میں ایک تاجک سردار بچ سقہ نے، جسے پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے تاجک ڈاکو لکھا ہے، کابل پر قبضہ کر کے امان اللہ خان کو اقتدار سے محروم کر دیا اور وہ اقتدار کے دوبارہ حصول کی ایک کوشش میں ناکامی کے بعد اٹلی چلے گئے۔

امیر امان اللہ خان جس وقت افغانستان میں یہ اصلاحات نافذ کر رہے تھے اس وقت ایک ہندوستانی دانشور عزیز ہندی بھی وہاں موجود تھے جو ۱۹۱۸ء میں بھارت کر کے کابل گئے تھے۔ وہ وہاں دس سال قیام کے بعد وطن واپس آئے، انہوں نے امان اللہ خان کے دور حکومت اور اصلاحات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور ان مشاہدات پر مشتمل ساڑھے چار سو صفحات کی ایک کتاب ”زوال غازی امان اللہ خان“ کے نام سے لکھ کر انہیں تاریخ کا حصہ بنادیا۔ عزیز ہندی وطن واپسی کے بعد بغاوت کے الزام میں گرفتار ہو گئے تھے اور انہوں نے یہ کتاب سترہ جیل میان میں لکھی جو ۱۹۳۳ء میں ان کی رہائی کے بعد شنائی بر قی پر میں امر ترس سے شائع ہوئی۔

امیر امان اللہ خان افغانستان میں سیاسی اور ثقافتی انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے جس کیلئے انہوں نے یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کے جدید لکچر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یورپی ثقافت کو افغانستان میں طاقت کے زور پر راجح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ عزیز ہندی کے بقول امان اللہ خان نے سردار محمود خان یاور کے ذمہ لگا رکھا تھا کہ وہ ان کے واپس

آنے تک افغانستان میں رائے عامہ کو شفاقتی انقلاب کیلئے ہمار کرنے کی کوشش کریں اور خاص طور پر آزاد خیالی اور برہمنہ روئی کا پرچار کریں۔ برہمنہ روئی کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورتوں کیلئے پرداہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ پھرے کے پردے کو کونوںامنوع قرار دے دیا جائے۔ میر امام اللہ خان کی وطن واپسی پر جب محمود خان یاور نے انہیں اپنی کارکردگی کی روپورٹ پیش کرنا پاہی تو انہوں نے کہا کہ ”بس بس محمود خان رہنے دو یہ باتیں اس طرح حاصل نہیں ہو سکتیں، مصطفیٰ کمال نے مجھے کہا ہے کہ انہیں محض سنگین کی نوک سے رانچ لیا جاسکتا ہے اور میں اب انہیں بہ نوک سنگین رانچ کر کے رہوں گا۔“

عزیز ہندی نے امیر امام اللہ خان کے ترکی کے دورہ اور جمہوریہ ترکیہ کے بانی و صدر مصطفیٰ کمال اتنا ترک کے ساتھ ان کی ملاقات و گفتگو کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور وہ مکالمہ بھی اپنے الفاظ میں نقل کر دیا ہے جو ان کے قول اس ملاقات میں دونوں لیڈروں کے درمیان ہوا تھا۔

- مصطفیٰ کمال اتنا ترک نے امیر امام اللہ خان سے کہا کہ وہ جس طرح کی اصلاحات نافذ کرنا چاہتے ہیں اس کیلئے ضروری ہے کہ انہیں عوام میں حد درجہ کی مقبولیت حاصل ہو تاکہ کوئی طبقہ اصلاحات کی راہ میں مزاحمت کی جرأت نہ کر سکے۔ امام اللہ خان نے اس کے جواب میں کہا کہ ملانے (علماء) اگرچہ طاقتور گروہ ہیں مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ مزاحمت کر سکیں۔

- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ اگر اصلاحات کے نتیجہ میں بغاوت ہو گئی تو اسے کچھ کیلئے فوج کا کامل طور پر وفادار ہونا ضروری ہے۔ امام اللہ خان نے جواب دیا کہ میری فوج پوری طرح وفادار ہے اور ہر طرح کی بغاوت کو کچھ کیلئے میرے ساتھ ہو گی۔

- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ اگر کسی جگہ بغاوت ہو گئی تو محصولات کی وصولی میں رکاوٹ ہو گی، جنگ کی وجہ سے راستے محدود ہو جائیں گے جس سے تجارت کمزور پڑ جائے گی اور آدمی کم ہو جائے گی، اس لیے مالی حالات کا مختتم ہونا ضروری ہے تاکہ صورتحال کنٹرول میں رہے۔ امام اللہ خان نے کہا کہ ان کی مالی حالت پوری طرح مختتم ہے اور بوقت ضرورت ان کے دوست ان کی مدد کریں گے۔

- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ اندر ورنی شورش اور بغاوت کی صورت میں بین الاقوامی حمایت اور تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ امام اللہ خان نے جواب دیا کہ انگریزوں اور روس دونوں کے ساتھ ان کے معاملات موجود ہیں جو اپنے معاملات کی پاسداری کریں گے اور ضرورت پڑنے پر مالی مدد بھی مل سکتی ہے۔

اس طرح کی تفصیلی گفتگو کے بعد مصطفیٰ کمال نے امام اللہ خان سے جو آخری بات کی اسے عزیز ہندی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ

- مصطفیٰ کمال نے کہا کہ ترکیہ میں اصلاحات کو بھی خوش آمدید نہیں کہا گیا بلکہ ہم نے بہ نوک سنگین ان کو رانچ لیا

ہے۔ کسی ملک کے باشندے اپنے پرانے عقائد و خیالات اور رسم و رواج کی پابندیوں کو از خود خریدنے ہیں کہا کرتے تا آنکہ حکومت وقت ان کے بر علیہ جر و قوت کو استعمال نہ کرے۔ مصطفیٰ کمال سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد امان اللہ خان والپس افغانستان پہنچے تو ان کی ذہنی حالت یہ ہو چکی تھی کہ وزارت خارجہ کے ہال میں علماء کرام کا ایک وفد ان کی پذیرائی اور ملاقات کیلئے آیا مگر امیر امان اللہ خان نے سابقہ دستور اور اسلامی طریقہ کے مطابق ان سے سلام اور مصافحہ کرنے کی بجائے ہبیت اتنا کریور پری طریقہ سے ان کے سلام کا جواب دیا اور ایک ہاتھ سے ہر ایک کے ساتھ خشک مصافحہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اسی مجلس میں ایک بڑے عالم ”مال صاحب چکنور“ کے ہاتھ میں موٹے دنوں کی تسبیح دیکھ کر امان اللہ خان نے کہا کہ ”یہ کیا اونٹ کی لیڈینیوں سے کھلی رہے ہو؟“ کسی مصاحب نے تھوڑی دیر کے بعد ملا صاحب چکنور کی بزرگی اور مقام کی طرف توجہ دلائی تو بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ ”کوئی سار پچھ بھی ہو میں ان سب کو جلد انسان بنادوں گا۔“

اس فضائل امان اللہ خان نے اس شافتی انقلاب کا آغاز کیا جسے ”۱۹۲۸ء کا انقلاب افغانستان“ کہا جاتا ہے اور اس کی شروعات جن اصلاحات سے ہوئی ان میں مردوں کیلئے مغربی لباس کے استعمال کی پابندی، ایک سے زیادہ نکاح کی قانونی ممانعت، اور پرده کے قانونی خاتمہ کے قوانین شامل تھے جن کیلئے ملبوں میں نگران مقرر کیے گئے کہ کوئی عورت برق پہن کر گھر سے باہر نہ لٹکے۔ اور سڑکوں پر پولیس کھڑی کر دی گئی جو ہر اس گزرنے والے سے جرمانہ وصول کرتی تھی جس نے یورپی لباس نہ پہن رکھا ہو۔ ادھر گھر کی حالت یہ تھی کہ عزیز ہندی کے بقول ایک روز کسی خادمہ سے قرآن کریم کے کچھ اور اق گر گئے جو اس نے اٹھا کر چومنا شروع کر دیے تو بادشاہ بیگم نے اسے ٹوکا کہ یہ کیا کر رہی ہو؟ اس نے کہا کہ یہ کلام پاک ہے۔ اس پر بادشاہ بیگم نے کہا کہ اس سے بڑھ کر بھی کتابیں لکھی جائیں گی اس لیے ان عقائد کو تھہ کر کے رکھ دو اور آدمیت سیکھو۔

اس پس منظر میں امیر امان اللہ خان نے افغانستان میں جس شافتی انقلاب کی طرف پیش رفت کرنا چاہی اس کا نتیجہ ”بچ سقہ“ کی صورت میں ہی نمودار ہونا تھا کہ یہ فطری عمل ہے جسے روکا نہیں جاسکتا۔ اس لیے اگر آج بھی کسی کے دماغ میں کسی مسلم معاشرہ میں یورپی شافت کو بہ نوک سکین راج گرنے کا اور ولیسٹرن کلچر کو فروغ دینے کا تھیال کلبلا رہا تو اسے ”بچ سقہ“ کا یہ کردار اپنے سامنے ضرور رکھنا چاہیے کیونکہ ترکی کے ایک تجربہ کے بعد دنیا کا کوئی اور مسلم ملک اس راستہ پر چلنے کیلئے آج تک تیار ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتا ہے۔

## افغان طالبان کے خلاف پابندیاں: عالمی استعمار کی نئی صفت بندی

بفت روزہ المہلاں، اسلام آباد --- ۵ جنوری ۲۰۰۰ء

اقوامِ متحده کی سلامتی کو نسل نے اماراتِ اسلامی افغانستان کے خلاف نئی پابندیوں کا اعلان کر دیا ہے اور ان پابندیوں سے براہ راست متاثر ہونے والے پاکستان کے سوا کسی مسلمان ملک کو اس پر سی احتجاج کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ سلامتی کو نسل میں موجود ملائیشیا نے بھی ایک برادر مسلم ملک کے حق میں کلمہ نیز کہنے کی وجہ سے اس اجلاس سے غیر حاضری کو ترجیح دی ہے جس میں طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف اقتصادی پابندیوں کی قرارداد منظور کی گئی ہے۔ اس سے افغانستان کی اسلامی حکومت یا بالفاظ دیگر عالمی نقشہ پر نمودار ہونے والی واحد اسلامی نظریاتی ریاست کے خلاف عالمی صفت بندی کی کیفیت دیکھی جاسکتی ہے اور یہ بات سامنے آجائی ہے کہ خالص اور عملی اسلامی نظام کو روکنے اور ناکام بنانے کیلئے صرف امریکہ اور روس ہی متحد نہیں ہوئے بلکہ نام نہاد مسلم حکومتوں نے بھی اپنا وزن انہی کے پڑتے میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

جبکہ تک اقتصادی پابندیوں اور معافی ناکہ بندی کا تعلق ہے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جس نظام اور فلسفہ فکر کی خاطر طالبان اس ظلم کا شکار ہو رہے ہیں اور جس دین کا پرچم اٹھانے کی پاداش میں نہیں بھوک اور افلان میں ہوش یا اضافے کی اس دلدل میں دھکیلا جا رہا ہے اس کا آغاز بھی آج سے چودہ سو برس قبل انہی حالات میں اور اسی قسم کی کیفیات میں ہوا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ ایک بار پھر پیچھے مڑکر اس مقام پر جا کھڑی ہوئی ہے جب مکرمہ مسیح جناب نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے ساتویں سال قریش کے قبائل نے آپ کے خاندان بنو ہاشم کا اقتصادی بائیکاٹ کر دیا تھا اور بنو هاشم شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے ”سیرۃ النبی“ میں اس اقتصادی بائیکاٹ اور محاصرہ و ناکہ بندی کی تفصیلات بیان کی ہیں جن کے مطابق تمام قبائل نے اس قرارداد پر اتفاق کر لیا تھا کہ ”کوئی شخص نہ خاندانِ ہاشم سے قربات کرے گا، نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کیلئے حوالے نہ کر دیں۔“

طالبان حکومت کے خلاف سلامتی کو نسل کی قرارداد کا مطالعہ کر لیں آپ کو بھی میری طرح یہی محسوس ہو گا کہ یہ قرارداد چودہ سو سال کی اسی قرارداد کی نقل و تشریح ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے قبائل نے طے کی تھی اور اس کی اہمیت بڑھانے کیلئے اسے بیت اللہ شریف کے دروازے پر لاکا دیا گیا تھا۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ

”تین سال تک بونہاشم نے اس حصار میں بستر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ لل کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں صحابہ سے مذکور ہے کہ ہم لل کے پتے کھا کھا کر بسر کرتے تھے یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے چنانچہ سہیلیٰ نے روضِ الانف میں تصریح کی ہے۔ حضرت سعد بن الجی و قاصٰ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سو کھا ہوا چڑھا تھا آگیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ ان سعد نے روایت کی ہے کہ پچھے جب بھوک سے روتے تھے تو بہر آواز آتی تھی، قریش سن کر خوش ہوتے تھے۔“

تین سال تک مسلسل ان مصائب اور تکالیف کے باوجود جب جناب بنی اکرمؐ کی دعوت میں کوئی فرق نہ آیا اور اس کا دائرہ نگہ ہونے کی بجائے وسیع ہوتا گیا حتیٰ کہ حضرت ابوذر غفاریؐ جیسے بزرگ بھی باہر سے آگرا اس دور میں مسلمان ہوئے اور کھلے بندوں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو پابندیوں اور ناکہ بندی کی ناکامی دیکھتے ہوئے خود قریش ہی کے کچھ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے اس معابدہ کو چاک کر دیا۔

طالبان بھی اسی اسلام کے علمبردار اور حضرت محمدؐ کے پیروکار ہیں اور اسی اسلام کو انسانی معاشرہ میں از سر نو نافذ و جاری کرنے کے داعی ہیں، اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ اگر وہ اپنے عزم پر قائم رہے اور جیسا کہ امارت اسلامی افغانستان کے سربراہ امیر المؤمنین ملا محمد عمر حفظ اللہ تعالیٰ نے ان پابندیوں کو مسترد کرنے، عرب مجاهد اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہ کرنے، اور نفاذ اسلام کا عمل جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے، انہوں نے تکالیف اور اذیتوں کی پرواہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا تو ان کے خلاف عائد کی جانے والی یہ پابندیاں بھی اسی طرح ناکام ہو جائیں گی جیسے قریش کا معابدہ بونہاشم کے خلاف فیل ہو گیا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں یہیں بھی اپنی ذمہ داریوں کا احسان کرنا چاہیے، یہ درست ہے کہ پاکستان کے اکثر دینی حلقوں اور سرکردہ زمماء نے طالبان حکومت کے خلاف ان پابندیوں کی مذمت کرتے ہوئے طالبان کے ساتھ ہمدردی، بیک جھقی اور ہم آنگی کا اظہار کیا ہے جو بہت خوش آئندہ ہے۔ مگر صرف اتنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کیلئے سنجیدہ عملی محنت کی بھی ضرورت ہے جو ہمارے خیال میں مندرجہ ذیل صورتوں میں ہو سکتی ہے۔

1. امارت اسلامی افغانستان کی مالی معاونت کیلئے باقاعدہ ہم منظم کی جائے اور کوشش کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ احباب کو توجہ دلا کر سفارت خانہ امارت اسلامی افغانستان ہاؤس نمبر ۱۸ اسٹریٹ ۹۰ جی ۳/۶ اسلام آباد کے ذریعے امدادی رقم یا سامان بھجوانے کا اہتمام کیا جائے۔

2. امارت اسلامی افغانستان کی حمایت اور امریکی عزم کی مذمت کیلئے رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور دینی جماعتیں اس سلسلہ میں مشترکہ جدوجہد کی طرف پیش رفت کریں۔

3. تاجروں اور صنعتکاروں کو افغانستان میں تجارت اور سرمایہ کاری کی ترغیب دی جائے اور اس مقصد کیلئے فوری اور ہنگامی بنیادوں پر کام کیا جائے۔

4. مسلم حکومتوں اور اسلام آباد میں ان کے سفارت خانوں کو خطوط، وفود اور یادداشتوں کے ذریعے ان کی بے حسی کی طرف توجہ دلائی جائے اور ان کی غیرت کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے۔
5. امریکی مصنوعات کے بایکاٹ کیمپ چلانی جائے اور عوام کو اس کیلئے تیار کیا جائے۔

## بھارتی طیارے کا اغوا اور طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۹ جنوری ۲۰۰۰ء

بھارتی طیارے کے اغوا کے باقی پہلوؤں سے قطع نظر اب تک کے حالات میں جو دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہوئی ہیں ان میں ایک مسئلہ کشمیر کی نزدیک اور عینکی کا پہلو ہے جس نے دنیا بھر کو ایک بار پھر اس بات کا احساس دلادیا ہے کہ اس مسئلہ کو اس خطہ کے عوام کی خواہش کے مطابق حل نہ کیا گیا تو جنوبی ایشیا میں من کا قیام بھی نہیں ہو سکے گا اور آزادی کشمیر کی تحریک بھی آگے بڑھنے کے معروف راستوں کو مقینہ پا کر دیگر تحریکات آزادی کی طرح کوئی نیا رخ اختیار کر سکتی ہے۔

دوسری پہلو امارت اسلامی افغانستان کی حکمران جماعت "طالبان" کی معاملہ فہمی اور ترب و حوصلہ کا ہے جس نے دنیا کو پہلی بار اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور طالبان کو محض ایک خونریز اور جنگجو قوت کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنے والوں نے یہ منظرا بینی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے ان نوجوانوں نے صرف ہاتھوں میں کلاشیف کی نہیں اٹھا کھلی بلکہ ان کے سینوں میں انسانیت کیلئے دھڑکنے والے دل اور کھوپڑیوں میں انسانیت کے مفاد میں سوچنے والے دماغ بھی موجود ہیں۔ اور وہ جہاں میدان جنگ میں دشمن کو تباکوں پنچے چبوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہاں مشکل سے مشکل حالات میں انسانی جانوں کے تحفظ اور امن کو یقینی بنانے کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہیں۔ چنانچہ برطانوی اخبار "گارجین" کی ایک روپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

"بھارتی طیارے کی ہائی جیکنگ کے معاملہ سے نبرد آزما ہونے کے طریق کار اور طرز عمل سے طالبان عالمی ہیرو بن گئے ہیں اور محض چچہ بفتے قبل امامہ کی حوالگی سے انکار، منتیات کی سمگانگ اور دہشت گردی کے حوالے سے پوری دنیا کے لعن طعن کا نشانہ بننے والے طالبان اب بہت بہتر حالات میں ہیں اور طالبان حکومت تسلیم نہ کرنے والا بھارت بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ طالبان انتہائی تعمیری کردار ادا کر رہے ہیں۔"

بھارت نے جب اپنے اغوا شدہ طیارے کو اپنے ہی شہر امرتسر کے ایئر پورٹ سے دوبارہ پرواز کا موقع دیا تو بھارتی حکمرانوں کا خیال تھا کہ یہ طیارہ لازماً پاکستان ہی کے کسی ایئر پورٹ پر اترے گا لیکن طیارہ جب قندھار ایئر پورٹ پر اترتا تو بھارت کے ساتھ اور بھی بہت سی قوتوں اور لا بیوں کے منہ میں پانی بھر آیا کہ اب تو ایک تیر سے دوشکار ہوں گے، طالبان

ان معاملات میں ناتج بہ کاری کی وجہ سے ہائی جیکنگ کے جال میں پھنس جائیں گے اور انہیں پاکستان کے ساتھ نہیں کر کے پاکستان اور طالبان کو دنیا بھر میں ”میڈیاوار“ کا نشانہ بنایا جاسکے گا۔ مگر طالبان کی اسلامی حکومت نے جس ہوش مندی اور تقدیر کا مظاہرہ کیا اس نے پوری دنیا کو جیران و ششدیر کر دیا ہے۔

گذشتہ شب برطانیہ کے شہر ٹوکنگ کے پاکستان سنٹر میں تراویح میں قران کریم مکمل ہونے پر ایک تقریب تھی جس میں رقم الحروف کو بھی انہمار خیال کی دعوت دی گئی۔ مجھ سے پہلے اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے عالمی جماعت اہل سنت کے سربراہ مولانا ضیاء الحق سیاٹھوی نے اس صورتحال پر دلچسپ تبصرہ کیا جو اس حوالے سے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے کے جنبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس بات کا بار بار خیال آتا تھا کہ طالبان کے خلاف دنیا بھر کے جدید ذرائع ابلاغ جس طرح مسلسل پر اپیکنڈا کر رہے ہیں اس کا توڑ کرنے کیلئے طالبان کو بھی ابلاغ کے ان جدید ذرائع کو استعمال میں لانا چاہیے، اور طالبان کے ایسا نہ کرنے پر بہت سے دوسرے دوستوں کی طرح انہیں بھی غصہ آتا تھا، مگر طالبان کی اسلامی حکومت ان ذرائع کو اختیار کرنے سے مسلسل گریزیاں رہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے غیب سے یہ انتظام کر دیا کہ بھارتی طیارے کے اس انغو کے باعث دنیا بھر کے میڈیا کی توجہ قدمدار پر رہی اور ایک ہفتہ تک مسلسل دنیا کے لوگ طالبان کو پتی آنکھوں سے دیکھتے رہے کہ وہ کس سادگی اور حوصلہ کے ساتھ حالات کو برداشت کر رہے ہیں اور کس تذری اور سنجیدگی کے ساتھ ہائی جیکنگ جیسے سُگین معاملہ سے نہ رہے ہیں اور اس طرح وہی ذرائع ابلاغ جو اس سے قبل طالبان کو صرف ایک جنگجو اور لڑاکا گروپ کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں انہی ذرائع ابلاغ نے دنیا کو طالبان کی امن پسندی، انسان دوستی اور مہمان نوازی کا یہ روپ بھی دکھادیا ہے جس سے ان کے خلاف شکوک و شبہات کم ہوں گے۔

ہائی جیکنگ اپنی تمام تر تعلیمی اور قابل نفرت ہونے کے باوجود ایسٹم بم سے زیادہ خطرناک نہیں ہے اور نہ ہی اس کے نقصانات اور تباہ کاری کا دائرة ایسٹم بم سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ لیکن ایسٹم بم کو ایک جدید ترین تھیار کے طور پر امن کا ضامن سمجھا جاتا ہے اور امن کی گارنٹی کیلئے بہت سے ممالک نے اس کی تیاری اور تنصیب کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اس لیے اگر حریت پسندوں نے ریاست میں بھارتی افواج کے وحشیانہ جبر و شدید اور اس پر عالمی قوتوں کی مسلسل بے حدی اور بے توہی کے خلاف احتجاج کے طور پر ہائی جیکنگ جیسے سُگین جرم کا راستہ اختیار کیا ہے تو اسے ان کی مجبوری، بے بُی اور لاچاری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اور قوموں کی آزادی کی تحریکات میں کبھی کھمار ایسا بھی ہوتا ہے جس کا اظہار ایک اخباری رپورٹ کے مطابق بھارتی طیارہ اغوا کرنے والے ہائی جیکروں نے کیا ہے اور جہاز سے نیچے اترنے سے قبل تمام یہ غنائم مسافروں سے اس عرصہ کے دورن ہونے والی زحمت پر مذدرت طلب کی اور کہا کہ ”ہم مجبور تھے کیونکہ یہ ہماری جدو جہد آزادی کا مسئلہ تھا۔“

بہر حال بھارتی طیارے کے انگو سے یہ غنائم مسافروں کی رہائی تک اس ساری صورتحال کے چند پہلو ہمارے لیے اطمینان کا باعث بنے ہیں، وہ یہ ہیں کہ طیارے کے سینکڑوں مسافرجان کی سلامتی اور امن کے ساتھ گھروں میں پہنچ گئے ہیں اور مولانا مسعود اظہر، عمر سعید شیخ اور مشتاق احمد زرگر کو سالہا سال کی بھارتی قید سے رہائی مل گئی ہے۔

## صوبہ سرحد اور افغانستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ جنوری ۲۰۰۰ء

تیری گزارش یہ ہے کہ یہ بات عام ذہنوں میں الجھن کا باعث بنی ہوئی ہے کہ پاکستان تو ایک ملک ہے، بہاں ایک روز متفقہ عید کیوں نہیں ہوتی؟ جبکہ مرکزی سطح پر روزیت ہال کمیٹی بھی قائم ہے جس میں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام موجود ہیں اور انہی کے فیصلے پر چاند کے دیکھے یا نہ دیکھے جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں مرکزی روزیت ہال کمیٹی کے فیصلے کی پرواد نہیں کی جاتی اور عام طور پر ایک روز قبل عید منائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس کا تھواڑا سا پیس منظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کے اس علاقے کے لوگ جہاں زیادہ تر پشتون آباد ہیں اپنے آپ کو لکھر اور شافت کے لحاظ سے افغانستان کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں اور اپنی روایات و اقدار میں اپنے افغان بھائیوں کے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ واقع ہے کہ افغانستان میں ہمیشہ سے ایک روز پہلے عید ہوتی ہے جس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ پتوں کہ وہاں کی غالب اکثریت خلقی ہے اور وہ احتفاف کے اصول کے مطابق اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرتے ہوئے سعودی عرب میں روزیت ہال کے اعلان پر عید کر لیتے ہیں، یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ افغانستان کی مغربی سرحد کا پاکستان کے ساتھ وقت کا اتنا فرق موجود ہے کہ پاکستان میں نظر نہ آنے والا چاند افغانستان کے مغربی حصے میں اسی روز نظر آ سکتا ہے، اس لیے وہ ایک روز پہلے چاند دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے جب افغانستان میں عید ہو جاتی ہے تو افغانستان کی سرحد سے ملنے والے پاکستانی علاقوں میں عید نہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

## جہادی تحریکات، سی ٹی بی ٹی، قرآن کا حکم

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۳ جنوری ۲۰۰۰ء

ایک قومی اخبار کے لاہور ایڈیشن کی رپورٹ کے مطابق چیف ایگریکٹو جزل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں کے ساتھ ملاقات کے دوران ان پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگاسکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جاسکتا ہے جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جاسکا تھا۔ مذکورہ رپورٹ میں اعلیٰ عسکری ذرائع کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ جزل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں کو بتا دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا نہ ہی فریضہ اور اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نہ جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں نہیں دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا پنجاب یا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جاسکتا۔

اس سے قبل یہ خبریں قومی پریس کے ذریعے سامنے آچکی ہیں کہ امریکی سینیٹروں نے جزل پرویز مشرف کے ساتھ

ملاقاتوں میں جن امور پر زور دیا ہے ان میں سی ٹی بی ٹی (Comprehensive Test Ban Treaty) پر و تختن کرنے، حرکتِ المجاہدین اور دیگر جہادی تنظیموں پر پابندی لگانے، مولانا مسعود اظہر کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے، ان کے خلاف دہشت گردی کے الزام میں مقدمہ درج کرنے، اور عرب مجاہد اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں تعاون کرنے کے تقاضے بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ لیکن جزبل پرویز مشرف نے یہ کہہ کر پاکستانی عوام کے جذبات کی تحقیق ترجیحی کی ہے کہ وہ جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگاسکتے۔ جزبل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جہاد اور جہادی تنظیمیں صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کا دائرہ پورے عالمِ اسلام تک پھیلا ہوا ہے اور جہاد کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے اسے لیے اسے روکنا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی قوتوں کیلئے پریشانی کی اصل بات بھی یہی ہے کہ جہاد کا دائرة پوری دنیا میں وسیع ہوتا جا رہا ہے، ورنہ جب تک جہاد کا یہ عمل صرف افغانستان تک محدود تھا اور اس کی زد صرف روس پر پڑ رہی تھی اس وقت تک مغربی ملکوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ اس سے خوش تھے اور جہادی تنظیموں کی حمایت و امداد میں بھی فراغدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس وقت ان کا خیال یہ تھا کہ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد افغانستان کی جہادی تنظیمیں شاید امریکہ کے سامنے اپہار تنگر میں سجدہ ریز ہو جائیں گی اور بہادر آسمانی کے ساتھ انہیں کچھ اور تھکی دے کر سنیاںگ میں چین کے خلاف صفت آرا کر دے گا۔ مگر ان مجاہدین تنظیموں نے یہیں کی طرف رج کرنے کی بجائے پہلے خود امریکہ سے نمٹ لیا زیادہ ضروری سمجھا اور نہ صرف یہ کہ فلسطین، کشمیر، صومالیہ، بوسنیا، کسوو، جیچنیا، مورو، ارکان اور اب انڈونیشیا میں جہاد کا چرچا ہونے لگا۔ بلکہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی مسلح افواج کی موجودگی ان مجاہدین کو زیادہ کھلکھلنے لگی اور مختلف مسلم ممالک سے جہاد افغانستان میں شرکت کیلئے آنے والے نوجوانوں نے اپنے اپنے ملکوں کی مغرب نواز اور امریکہ پرست حکومتوں کیلئے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں تو امریکہ بہادر کو یہ بات سمجھ آئی کہ یہ مجاہدین تو فی الواقع جذبہ جہاد سے سرشار ہیں۔ اسی جذبہ جہاد کو ختم کرنے کیلئے برطانوی استعمار کو مرزا غلام احمد قادری اور زار شاہی روس کو محمد علی باب اور بہاء اللہ شیرازی جیسے جھوٹے نبی کھڑے کرنا پڑے تھے اور جس جہاد سے جان چھڑانے کیلئے ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کا تیلپا نچہ کیا گیا تھا۔

امریکہ بہادر کو یہ بات بھی تکلیف دے رہی ہے کہ جن مجاہدین کو روس کے خلاف اسلحہ خود اس نے فراہم کیا تھا اور ان میں سے بہت سے نوجوانوں کو ٹریننگ بھی دی تھی وہی مجاہدین اب خود امریکہ کے سامنے کھڑے ہیں اور پوری دنیا میں اس کیلئے چیلنج کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس لیے اب امریکہ جہاد کی آواز کو دنیا سے ختم کرنا چاہتا ہے، مجاہدین کے عالمی نیٹ ورک کو توڑنے کے درپے ہے اور جہادی تحریکوں کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں بدنام کرنے اور مسلم ممالک کی ریاستی قوت کے ذریعے انہیں کچلنے کی منصوبہ بندی کیے بیٹھا ہے۔ مگر اب وقت گزر جا ہے کیونکہ جہادی تحریکات نے پوری دنیا میں وسیع نیٹ ورک قائم کر لیا ہے اور ان کی جڑیں مسلمان عالم میں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ انہیں ختم کرنے کی امریکی خواہش حسرت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ مغرب استعمار کیلئے اب دانت پینے کے سوا کوئی چار باقی نہیں رہا۔

اس لیے ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرو یونی مشرف کو جہادی تحریکات کے بارے میں ملت اسلامیہ کے جنبات کی صحیح ترجیحی کرنے اور امریکی سینیٹروں کو معروضی حقوق سے آگاہ کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جنرل صاحب! یہ سی ٹی بی ٹی کا چکر بھی اسی ایجمنٹ کا حصہ ہے اور امریکی خواہشات اور مطالبات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو جہادی تحریکات پر پابندی لگانے اور ایٹھی پرو گرام پر یعنی الاقوای کنٹرول قبول کرنے کے ان دونوں مطالبات میں کوئی نیادی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں تقاضوں کی علت اور پس منظر ایک ہی ہے اور دونوں کا مقصد بھی ایک ہے کہ عالم اسلام اس قابل نہ رہے کہ وہ بھارت اور اسرائیل جیسی مسلمان دشمن طاقتوں کیلئے خطرہ بن سکے، تاکہ خلیج عرب میں اسرائیل کی بالادستی اور جنوبی ایشیا میں بھارت کی تھنیداری قائم کرنے کا منصوبہ کسی رکاوٹ کے بغیر پایا تکمیل تک پہنچ جائے اور مسلم دنیا کو ایک بار پھر صدیوں کی غلامی کے نئے شکنج میں جکڑا جاسکے۔ امریکہ بھارت کو ایٹھی طاقت تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے اور اسرائیل کے پاس ایٹھم بھوں کی موجودگی پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر پاکستان کا ایٹھی قوت ہونا اسے کسی قیمت پر گوار نہیں ہے، اور وہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک کو اسلام، جہاد اور ایٹھی قوت تینوں سے محروم کر دینے کیلئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے اور اسی لیے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کیلئے پاکستان پر مسلسل دباو ڈھا جا رہا ہے۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حاوی عناصر کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس معاهدے پر دستخط کر دینے سے پاکستان کی ایٹھی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اس کے عوض ملک کو بہت سی مراعات حاصل ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ جب ایٹھی قوت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا تو بہت سی مراعات آخر کس چیز کے عوض حاصل ہوں گی؟ اور مغرب کا یہودی سماں ہو کارہم پر کس لیے اتنا مہربان ہو رہا ہے کہ کوئی معاوضہ وصول کیے بغیر وہ ہمیں مراعات سے مالا مال کر دینا چاہتا ہے؟ ہمیں جن اقتداری سہولتوں کی خوشخبری دی جا رہی ہے اور جس معاشی خوشحالی کے سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں آخر وہ کس چیز کے بدالے میں ہیں؟ سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں سے پاکستان کی ایٹھی پوزیشن میں کوئی فرق نہ پڑنے کا ڈھنڈو رہ چکیا ہے اور دانشور اگر اس گھنی کو سمجھا سکیں اور مغرب کے یہودی سرمایہ کاروں کی ہم پر متوجہ بے تحاش انداز شافت کی وجہ بتا سکیں تو ان کی بے حد نوازش ہوگی۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دینے کی حمایت میں یہ بات بھی کہا جا رہی ہے کہ دستخط کر دینے کا مطلب ایٹھی پرو گرام کو روں بیک کرنا نہیں بلکہ مزید آگے بڑھنے سے روکتا ہے، جبکہ ہم اس وقت اتنی ایٹھی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں کہ ہمیں اس میں مزید پیشرفت کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اگر اپنے ایٹھی پرو گرام پر سی ٹی بی ٹی کے ذریعے یعنی الاقوای کنٹرول قبول کر لیتے ہیں اور خود کو ایک معاهدہ کا پابند کر لیتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس یعنی الاقوای کنٹرول کی کنٹرولنگ اخراجی آئندہ ہمیں اس ایٹھی پرو گرام کو روں بیک کرنے کیلئے کبھی نہیں کہے گی؟ آخر اس معاملہ میں کنٹرولنگ اخراجی خود ہم تو نہیں ہیں بلکہ یہ پوزیشن اُنہی یعنی الاقوای اداروں اور قوتوں کو حاصل ہے جو نصف صدی سے ہمارے خلاف بھارت اور اسرائیل کو ہر طرح سپورٹ کرتے چلے آرہے ہیں اور ہماری کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان قوتوں اور اداروں کو ہم گذشتہ پہچاں بر سے دیکھ رہے ہیں بلکہ بھگت رہے ہیں اس لیے ان کی کی بات اور کسی وعدے پر

بھروسہ آخر کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

چنانچہ ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے یہ گزارش کریں گے کہ جس طرح انہوں نے جہاد اور جہادی تحریکات کے بارے میں امریکی سینٹروں کے سامنے اپنے ایمانی جذبات اور پاکستانی عوام کے دلی احساسات کی بھروسہ ترمیحانی کی ہے اسی طرح ایسی پروگرام اور سی فلٹی کے بارے میں بھی اپنے ملک کے غیر عوام کے جذبات سے امریکہ اور دیگر عالمی قوتوں کو پورے حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ آگاہ کر دیں۔ اور پھر یہ مسئلہ صرف جذبات و احساسات کا ہی نہیں بلکہ ہمارے عقیدہ و ایمان کا بھی ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف جنگی قوت حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کی حد بھی بیان کی ہے ترہبون بہ عدو اللہ وعدوکم (الانفال) کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب قائم ہو یعنی مقابلہ میں طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے جب تک ایسی توانائی اور جدید ترین جنگی قوت کے حوالے سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان طاقت کے تناسب میں توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آجاتا اور مسلم ممالک ترہبون بہ عدو اللہ کی پوزیشن میں نہیں آجائتے، ایسی قوت میں کسی پیشافت پر پابندی قبول کرنا قرآن کریم کی منش اور حکم کے خلاف ہے، وہی قرآن کریم ہے ہاتھ میں لے کر بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے لاکھوں مسلمانوں کے سامنے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا دستور یہ قرآن ہو گا اور اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور دستور کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے جنرل صاحب سے یہ استدعا ہے کہ جہاد اور جہادی تحریکات کی طرح جہادی قوت کے بارے میں بھی قرآن کریم کے حکم اور مسلمانوں کے دینی و ملی جذبات سے مغربی قوتوں کو دوڑوک طور پر آگاہ کر دیں کہ ملک اور قوم دونوں کا مفاد اسی میں ہے۔

## امریکی ایجنڈا اور جنرل پرویز مشرف

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۰ء

امریکی نائب وزیر خارجہ مسٹر انڈر فرتھ گذشتہ دونوں اسلام آباد آئے اور چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف اور دیگر مقدار شخصیات سے ملاقات کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے انتباہ کیا کہ پاکستان کو اپنی سرحدی حدود میں کام کرنے والے انتہا پسند اسلامی گروپوں پر پابندی عائد کرنا ہو گی جو میں الاقوامی برادری کیلئے بڑا خطہ بننے ہوئے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق مسٹر انڈر فرتھ نے کہا کہ حرکۃ المجبدين سمیت بہت سے مسلح اسلامی گروپ دہشت گردی کر رہے ہیں اس لیے ان پر پابندی لگائی جائے۔ اس کے ساتھ ہی امریکی سینٹروں کے وفد کے حالیہ دورہ پاکستان کے اختتام پروفد کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری کیلئے پانچ شرائط پیش کی گئی ہیں۔ روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ جنوری ۲۰۰۰ء کی روپورٹ کے مطابق امریکی وفد کی پیش کردہ شرائط یہ ہیں:

- دہشت گردی اور مذہبی غنیاد پرستی کا ازالہ۔
- جمہوریت کی بحالی کیلئے طریقہ کار اور ثامن فریم ورک۔

- ایسی و سچی ترقیاتی اصلاحات جن میں جہوری اصلاحات جرکپڑ سکیں۔
- سیٹی بیٹی پر دھنخدا اور نیو کلیانی ہتھیاروں پر پابندی کیلئے عالمی کوششوں میں تعاون۔
- اور اپنے تمام شہروں کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی آزادیوں کو تیقینی بنانا۔

جہاں تک امریکی مطالبات اور شرائط کا تعلق ہے یہ نہیں ہیں بلکہ ایک عرصہ سے یہ شرائط الفاظ اور عنوان کی تبدیلوں کے ساتھ بار بار سامنے آتی ہیں اور امریکی حکومت اور شرائط کی تکمیل کیلئے حکومت پاکستان پر مسلسل دباؤ جاری رکھے ہوئے ہے۔ مگر امریکی صدر مسٹر مل کنٹن کے مجوزہ دورہ بھارت سے قبل اس سلسلہ میں کسی حقیقی فیصلہ کیلئے پاکستان پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ مسٹر کنٹن بھارت کے ساتھ پاکستان کا دورہ بھی کر سکیں اور امریکہ کی منصوبہ بندی میں جو بھی ایشیا اور کشمیر کے حوالے سے جو پروگرام پہلے سے طے شدہ ہے وہ اس کے آغاز کا اعلان کر سکیں۔

امریکہ کی مجبوری یہ ہے کہ جہاد کے جس عمل اور مجاہدین کے جن گروپوں کو اس نے اپنے روایتی حریف سوویت یوینین کے خلاف افغانستان کے جہاد آزادی میں سپورٹ کیا تھا اور مالی، عسکری اور تربیتی امداد مہیا کی تھی، امریکہ نے ان سے یہ توقع بھی وابستہ کر لی تھی کہ مجاہدین کی یہ یوینین کے خاتمه اور روس کی شکست کے بعد امریکہ کی احسان مندرجہ ہیں گی اور امریکہ آئندہ بھی انہیں اپنے مقاصد اور پروگرام کیلئے حسب منشاء استعمال کر سکے گا۔ مگر جہاں افغانستان میں امریکی امداد حاصل کرنے والے افغان گروپوں کے ہاتھ سے وہاں کا اقتدار نکل گیا اور طالبان کے نام سے ایک نئی قوت نے افغانستان کا کنٹرول حاصل کر کے امریکی ایجنسی کیلئے آنکھ کاربننے سے انکار کر دیا وہاں مجاہدین کی تنظیموں نے بھی اپنی سرگرمیوں کیلئے نئے محاڈوں کا انتخاب کیا اور امریکی اشاروں کی پرواکیے بغیر کشمیر، فلسطین، یوسینی، صومالیہ، کسووو اور جیجینیا کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کیلئے سرگرم ہو گئیں۔ امریکہ کی خواہش تھی کہ طالبان اور جہادی تنظیمیں سنکیانگ میں وہاں کے مسلمانوں کیلئے جہاد آزادی کا میدان گرم کر کے چین کو بھی سوویت یوینین کی طرح شکست دینے کے امریکی پروگرام کا حصہ بنیں مگر ان مجاہدین کی ترجیحات میں خلیج عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی، کشمیر کی آزادی، یوسینی، کسووو اور جیجینیا کے مظلوم مسلمانوں کی امداد اور فلسطین کی حقیقی آزادی جیسے معاملات زیادہ ضروری اور مقدم قرار پائے جس سے امریکہ کا نیوورلڈ آرڈر اور اس کی عالم اسلام پر بالادستی کا منصوبہ فلاپ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ چنانچہ اسی غصہ میں امریکہ بہادر ان جہادی تحریکیات کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں ختم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جن کی وہ خود روئی استعمار کے خلاف حمایت و امداد کرتا رہا ہے۔ اور امریکی نائب وزیر خارجہ اور سینیٹروں کے حالیہ دورہ پاکستان کا پس منظر بھی یہی ہے مگر چیف ایگزیکٹو جزل پروپری مشرف نے امریکی سینیٹروں کے وفد کو ملاقات کے دوران جو جواب دیا ہے وہ ہمارے نزدیک پاکستانی عوام کے جذبات کی صحیح ترجیحی کرتا ہے اور معروف و صیحتی حالات میں ایک غیر حکمران کی حیثیت سے انہیں یہی جواب دینا چاہیے تھا۔

چنانچہ روز نامہ جگ لاهور ۷ اجنوری ۲۰۰۰ء کے مطابق:

”چیف ایگزیکٹو جزل پروپری مشرف نے امریکی سینیٹروں کے وفد کو دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جاسکتا ہے جیسے روس کے

خلافِ جہاد کو نہیں روکا جاسکتا تھا۔ اعلیٰ عسکری ذرائع نے ”جگ“ کو بتایا کہ جزل پرو یور مشرف نے امریکی سینٹروں پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں بنیادی فرق کو سمجھنا ہو گا۔ ان اعلیٰ عسکری ذرائع کے بقول جزل پرو یور مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتایا کہ پاکستان نے دہشت گردی اور ہائی جیکنگ کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور کرتا رہے گا تاہم جہاں تک جہاد کا تعلق ہے یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے، دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا نام ہی فریضہ نجات ہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر کی وجہ پر جنینہ جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جاسکتا۔“

ہمارے خیال میں جزل پرو یور مشرف کی اس دو ٹوک وضاحت کے بعد اس سلسلہ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ البتہ جزل صاحب کو پاکستانی عوام کے جذبات کی اس جرأۃ مندانہ ترجیحی پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم ان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ امریکہ کی دیگر شرائط کے بارے میں بھی وہ دو ٹوک اور صاف انداز میں وضاحت کر دیں کہ ہم ایک اسلامی ریاست کے باشندے ہیں اور اسلام صرف ہمارا سرکاری مذہب ہی نہیں بلکہ دستور پاکستان کی صراحت کے مطابق قومی دستورِ حیات اور حکومتی پالیسیوں کا سرچشمہ بھی ہے، اس لیے جمہوریت، آزادی، حقوق اور ایسی قوت سمیت تمام امور کے بارے میں ہم وہی پالیسی اختیار کر سکتے ہیں جس کی قرآن و سنت کی تعلیمات میں گنجائش ہو۔

اس کے ساتھ ہی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کی حمایت کرنے والے حقوقوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس پر دستخط کر دینے سے پاکستان کی موجودہ ایسی پوزیشن پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر اصولی طور پر دو باقاعدے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

- سی ٹی بی ٹی پر دستخط سے ایسی پروگرام بین الاقوامی کنشٹروں میں چلا جائے گا اور ہم اس کے بارے میں کسی آزادانہ فیصلے کے مجاز نہیں رہیں گے۔ پھر اس بات کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے کہ پروگرام کنشٹروں کرنے والی بین الاقوامی اتحاری پاکستان کے ایسی پروگرام کو روپیں بیک اور ختم کرنے کیلئے آئندہ کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔
- سی ٹی بی ٹی کا مقصد ظاہر ایسی پروگرام کو مزید آگے بڑھنے سے روکنا ہے جبکہ جنگی قوت کے بارے میں قرآن کریم کا حکم یہ ہے کہ وقت کی جدید ترین جنگی قوت حاصل کرو اور اس قوت کی حد بھی قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ ترهبون بے عدو واللہ وعدو کم اس قوت کے ذریعے دشمن پر تمہارا رب قائم ہو۔ جس کا مطلب اصطلاحی معنوں میں یہ ہے کہ طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے ایسی قوت اور وسائل کے لحاظ سے جب تک توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آجاتا ایسی قوت میں مزید پیش رفت پر باندی کو قبول کرنا قرآن کریم کی منشائے خلاف ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح جہاد اسلامی

تعلیمات کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں جزیل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے اس مذہبی فریضہ کی ادائیگی سے نہیں روکا جاسکتا اسی طرح ایسی قوت کا اس حد تک حصول کہ تو ازن کا پڑا مسلمانوں کے حق میں جھک جائے، یہ بھی ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور اس بدف کے حصول سے قبل ایسی پروگرام میں مزید پیش رفت پر پابندی کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

ہمیں امید ہے کہ جزیل پرویز مشرف اور ان کے رفقاء اس صورتحال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لین گے اور جہادی تحریکات کی طرح سی بی بی کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات کے حوالے سے امریکہ کو دلوںک جواب دے کر دنی میت اور قومی غیرت کا بروقت مظاہر کریں گے۔

## کلمہ به زئی (واپس کب جاؤ گے؟)

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- فوری ۲۰۰۴ء

محترم مجبرا (ر) ہمیں پرویز نے گذشتہ روز اپنے کالم میں افغان مہاجرین کے حوالے سے ایک خوبصورت سوال اٹھایا ہے کہ ”کلمہ به زئی؟“ (یعنی واپس کب جاؤ گے؟)۔ مجبرا صاحب کا ارشاد ہے کہ افغان مہاجرین جب رو سی جاریت کا شکار ہونے کے بعد بھرت کر کے پاکستان آئے تو پاکستانی عوام نے ان کا خیر مقدم کیا تھا لیکن ان مہاجرین میں ایسے لوگ بھی بڑی تعداد میں آگئے جنہوں نے پاکستان میں جائیدادیں خریدیں اور کاروبار بڑھانے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ اور اب یہ لوگ پاکستانی قوم کیلئے وباں جان بنتے جا رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس مبینہ عوامی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ

”بائیس سال پہلے سرحد پار سے آنے والے اپنے مہمانوں کی آمد پر اگر ہم خوش ہوئے تھے تو اللہ اب ہمیں یہ موقع بھی کوئی فراہم کرے کہ ہم ان کی رخصت پر بھی مسرور ہوں۔“

جبکہ تک بھرت کا تعلق ہے مجبرا صاحب کو یہ بات یقیناً معلوم ہو گی کہ شرعاً بھرت کے ساتھ ہی مہاجر کا تعلق اپنے وطن کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ فقہی احکام کی رو سے شرعاً بھرت کی صورت میں اپنے سابقہ مکانوں اور جائیدادوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے رفقاء کے ہمراہ مکرمہ سے مدینہ منورہ بھرت کی تو اگرچہ صرف آٹھ برس کے بعد مکرمہ میں ان کا اقتدار قائم ہو گیا تھا اور وہ فارج کی حیثیت سے دوبارہ مکرمہ میں داخل ہو گئے تھے لیکن جناب رسول اللہ سمیت ان مہاجرین میں سے کسی نے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر دوبارہ مکرمہ کو وطن نہیں بنایا تھا اور اپنی بھرت پر قائم رہے تھے۔ انہیں فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد بھی مدینہ منورہ کی آبادی کے ایک حصے کی طرف سے مسلسل یہ طفے سننے پڑے تھے کہ یہ مہاجرین ہم پر بوجھ بن گئے ہیں اور انہیں اب مدینہ منورہ سے چلے جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ایسے بعض افراد کے طعنوں کا خود قرآن

کریم نے بھی تدرکہ کیا ہے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود رسول اکرمؐ اور ان کے مہاجر ساتھیوں نے مکہ مکرمہ واپس جانا قبول نہیں کیا تھا اور بھرت کا شرعی مسئلہ بھی بھی ہے۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد جوانے وطن کے حالات کچھ بہتر ہونے پر واپس جانی گئی ہے ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور انہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہیے ورنہ اگر وہ اڑ جاتے اور بھرت کے شرعی احکام کا عذر ہمارے سامنے رکھ دیتے تو ہمارے پاس انہیں زبردستی واپس بھینجنے کا کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ ہم اصولاً اس بات سے متفق ہیں کہ افغانستان کے حالات ساز گار ہونے پر افغان مہاجرین کو وطن واپس لوٹ جانا چاہیے اور ہمارے خیال میں جن علاقوں کے حالات ساز گار ہوئے ہیں وہاں کے مہاجرین کی اکثریت واپس جا چکی ہے۔ اور اب صرف ان صوبوں کے لوگ یہاں رہ گئے ہیں جہاں کے حالات ابھی مہاجرین کی واپسی کیلئے ساز کار نہیں ہیں۔ یا ایسے لوگ باقی ہیں جو شروع سے ہی بھرت کی نیت سے نہیں بلکہ بھرت کے نام پر مفادات اٹھانے، کاروبار چکانے، اسلحہ و منشیات کی سمگلنگ کرنے اور گند پھیلانے کیلئے آئے تھے۔ اور ان کے تعاقبات یہاں اپنے مزان اور مقام کے لوگوں سے ہو گئے تھے اس لیے انہیں اپنے مقاصد پورے کرنے میں کوئی وقت پیش نہیں آئی اور نہ ہبہ اب وہ یہاں سے واپس جانے کیلئے تیار ہیں کیونکہ ان کے بھائی بندیہاں ہر شعبے میں موجود ہیں اور انہیں پورا تحفظ فرم کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر اس قسم کے مفاد پرست افراد کو یہاں سے نکل جانے کیلئے کہا جائے بلکہ ان کے اخراج کیلئے قانون سازی کا بھی کوئی مرحلہ آئے تو ہم اس کی حمایت کریں گے۔

لیکن ایسا کوئی افغان بھائی جو واقعہ بھرت کی نیت سے پاکستان آیا تھا، اس نے یہاں پاکستان کے عوام اور حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی بجائے شریف شہری کے طور پر وقت گزارا ہے اور اس کا ریکارڈ درست ہے تو اگر وہ یہاں رہنا چاہتا ہے تو یہ نہ صرف اس کا شرعی حق ہے بلکہ آج کے موجودہ بین الاقوامی قوانین بھی اسے یہ حق دیتے ہیں کہ اتنا عرصہ پاکستان میں شریف اور قانون کا احترام کرنے والے شہری کے طور پر رہنے کے بعد وہ یہاں کی شہرت حاصل کر سکے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ افغان مہاجرین ہمارے پاس پاکستان میں آنے والے پہلے مہاجرین نہیں ہیں، اس سے قبل مشرقی پنجاب، یوپی، بہار اور مقبوضہ کشمیر کے لاکھوں مہاجرین یہاں آپنے ہیں اور پاکستانی معاشرہ میں ہم ہو کر شریف شہریوں کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ کاروبار بھی کرتے ہیں، انہوں نے جانیدادیں خیر کی ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ ٹرانسپورٹ کے شعبے سے وابستہ ہیں اور ان کے کچھ افراد بھی سمگلنگ، لاقانونیت اور دیگر غیر قانونی وغیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ کشمیر جلد آزاد ہو اور ہمارے کشمیری بھائی قوی آزادی کی نعمت عظمی سے جلد از جلد سرفراز ہوں، لیکن کیا کشمیر کے آزاد ہو جانے کے بعد پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں کشمیری بھائیوں کیلئے بھی محترم یہ میر (R) سہیل پرویز صاحب انہیں وبال جان قرار دیتے ہوئے ان سے سوال کریں گے کہ ”وہ کب واپس جا رہے ہیں؟“

اس لیے اس حوالے سے ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمارے جو بھی مسلمان بھائی خواہ کشمیری ہوں یا افغان، پاکستان آگئے ہیں اور ہمارے قانون اور اقدار و روایت کی پابندی قبول کرتے ہیں، انہیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ملک

کے حالات درست ہونے کے بعد بھی اگر یہاں رہنا چاہیں تو آزادی کے ساتھ رہ سکتیں۔ البتہ مجرر (R) ہمیں پرویز صاحب کا یہ خوبصورت سوال ”مکہہ ہے زئی؟“ پچھا اور لوگوں کے سامنے پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جو دو صدیاں قبل تجارت کے بہانے یہاں آئے تھے اور مسلسل ساز شیں کر کے ہماری آزادی اور خود مختاری غصب کرنے کے بعد ہمارے مالک بن بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمارے قانون اور اقدار و روایات کی پابندی کرنے کی وجایے انہیں جڑ سے اکھڑا پھینکنے کیلئے اپنا پورا ذوز صرف کیا اور اپنے نظام و قوانین کو طاقت کے زور سے ہم پر مسلط کر دیا۔ انہوں نے ہماری صنعت و تجارت کے نظام کو تباہ و بر باد کر کے اپنی تجارت اور صنعت کا سکہ جمایا، ہمارے وسائل اور دولت کی وحشیانہ لوث مار کر کے اپنی تجویریاں بھریں اور ہمیں اپنے ہی ملک میں خود اپنے وسائل اور دولت سے براہ راست اور آزادانہ استفادہ کرنے کے حق سے محروم کر دیا۔ انہوں نے جب یہ سمجھا کہ اب ان کا خود یہاں زیادہ دیر ہنا ممکن نہیں رہتا تو اپنی گگہ اپنی ”پنگ“ کو ہماری گردنوں پر سوار کر دیا جو پیر تسمہ پا بن کر ہمارے کندھوں مسلط ہے۔ اور اس کی راہنمائی اور نگرانی و کثروں کیلئے بدشی آقاوں کی ایک پوری فوج ظفر مون سفارت کاروں، اقتصادی مشوروں، این جی اوز، فی ماہرین اور دانشوروں کی شکل میں ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا ہمارے ساتھ اعتمادی، فکری، تہذیبی یا جغرافیائی کسی لحاظ سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ زبردستی ہمارے مہمان بلکہ وہی آئی پی مہمان بنے بیٹھے ہیں۔ اس لیے جی چاہتا ہے کہ راقم الحروف اور محترم مجرر (R) ہمیں پرویز مل کر ایک مشترکہ کالم لکھیں جس میں زبردستی کے اس ”مہمان و بال جان“ کی چرہ دستیوں اور ستم ظریفیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس سے یہ سوال کیا جائے کہ ”مکہہ ہے زئی؟“ واپس کب جاؤ گے؟

## چیچنیا کے مشیر سلیم خان کی گرفتاری

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۶ فروری ۲۰۰۰ء

چیچنیا کے سابق صدر اور موجودہ حکومت کے مشیر سلیم خان کی اسلام آباد میں گرفتاری کی خبر پڑھی تو سانٹے میں گیا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ سلیم خان اسلام آباد پہنچیں گے تو انہیں ایک مجاہد اور مجاہدوں کے غیور نمائندہ کے طور پر پروٹوکول دیا جائے گا، جہاد کشمیر اور جہاد افغانستان میں مجاہدین کی پشت پناہی کرنے والے ادارے جہاد چیچنیا کے سرکاری سفیر سے وہاں کے حالات معلوم کر کے انہیں تعاون کا تقین دلائیں گے، اور رو سی جاریت کا دلیرانہ سامنا کرنے والے غیور مسلمانوں کی پشت پر ہاتھ رکھیں گے۔ کیونکہ ابھی چند روز قبل پاکستان کے چیف ایگریٹو جزل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹوں سے بات چیت کرتے ہوئے چیچنیا کے جہاد کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جہاد اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور مسلمان جہاں کہیں بھی جہاد کرتے ہیں خواہ کشمیر ہو چیچنیا وہ اپنے مذہبی فرض کی تعیل کرتے ہیں اس لیے انہیں جہاد سے روکا نہیں جاسکتا۔

جزل صاحب کے اس ارشاد کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ چیچنیا کے جہاد کے بارے میں پاکستان کے عوام اور حکومت

کے جنبات مختلف نہیں ہیں اور رو سی جارحیت کا شکار ہونے والے مجاہدین کو پاکستان کے عوام اور حکمرانوں کی کیساں تائید و حمایت حاصل ہے۔ لیکن سلیم خان کے ساتھ خفیہ اداروں کے اس شرمناک طرز عمل نے ان تمام اندازوں کو غلط ٹھہرایا ہے۔ سلیم خان نے کہا ہے کہ رو سی فوجوں نے ان کے جسموں کو زخمی کیا مگر پاکستان کے خفیہ اداروں نے ان کی روکو زخمی کر دیا ہے۔ ان کی یہ بات درست بھی ہے کہ یہ زخم جسموں کے زخم سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور آسانی سے مندل نہیں ہوتا۔ سلیم خان ہمارے مہمان ہیں جس طرح اسماء بن لادن افغانستان کے مہمان ہیں اور دونوں جہادی تحریکوں کے نمائندے ہیں۔ ایک مشرق و سطی میں امریکی تسلط کے خلاف معرکہ آ را ہے اور دوسرا رو سی فیڈریشن کی تحریک کے شکار مظلوم مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اسماء بن لادن کی گرفتاری کیلئے امریکہ ایک عرصہ سے جارحیت کے شکار مظلوم مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ افغانستان کی امارت اسلامی اپنے اس اصولی موقف دانت پیش رہا ہے مگر غیور طالبان کے سامنے اس کا بس نہیں چل رہا۔ افغانستان کی امارت اسلامی اپنے اس اصولی موقف پر پوری سختی کے ساتھ قائم ہے کہ اسماء بن لادن ہمارا مہمان ہے اور وہ اپنے مہمان کو ملک سے چلنے کیلئے نہیں کیسیں کے اور نہ ہی اس کے کسی دشمن کے خواہ کریں گے۔ اس موقف کی خاطر طالبان نے امریکی بمباری برداشت کی ہے، فتدھار کے عین وسط میں دہشت گردی کا سامنا کیا ہے، اقوام متعدد کی پاندیاں قبول کی ہیں اور عالمی میڈیا کی نفرت اگئیں ہم کو برداشت کیا ہے مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ اپنے موقف پر قائم ہیں۔ افغان حکمران ملا محمد ربانی نے ابھی اسلام آباد میں ایک بار پھر یہ کہہ کر اپنے موقف کا اعادہ کیا ہے کہ اسماہ ہمارا مسئلہ ہے اور اس پر ہمارا موقف سب کے سامنے واضح ہے۔

دوسری طرف ہم نے اپنے مہمان کو جس سلوک کا محتقн ٹھہرایا ہے اس نے پورے عالم اسلام کے سامنے ہماری گروہ جو کہا دی ہے۔ یہ درست ہے کہ امریکی صدر بل کائنٹن کے جنوبی ایشیا کے دورہ کے پروگرام میں ابھی تک پاکستان شامل نہیں ہو سکا اور یہ بھی درست ہے کہ چینیا کے مظلوم اور مجاہد مسلمانوں کی پاکستان کے عوام اور دینی جماعتوں کی طرف سے مسلسل حمایت پر رو سی حکمران ناراض ہیں۔ ہمارے خفیہ اداروں کو اس پر پریشانی ہے اور خاص طور پر امریکہ کے صدر کے پاکستان نہ آنے کا تصور ہی ہمارے حکمران طبقوں میں شامل بہت سے افراد کی نیزیں حرام کرنے کیلئے کافی ہے۔ لیکن کوئی ادارہ اس حد تک بھی حواس باختہ ہو سکتا ہے، اس کا کم از کم مجھے اندازہ نہیں تھا۔

میں حامد میر صاحب کا شرکر گزار ہوں کہ انہوں نے سلیم خان سے خود مل کر میرے جیسے لاکھوں بلکہ کروڑوں پاکستانیوں کے جنبات ان تک پہنچا دیے اور ہماری ترجیحاتی کردی، اللہ تعالیٰ انہیں جزاۓ خیر دیں اور اس جرأۃ قلندرانہ پر استقامت نصیب فرمائیں، آمین۔ وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کا کہنا ہے کہ اس واقعہ پر پریس میں کچھ نہ کہا جائے اور کچھ نہ لکھا جائے۔ وہ یقیناً کی مصلحت کے تحت یہ بات کہہ رہے ہوں گے لیکن مجھے ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے اس لیے کہ چینیا کے سابق صدر اور مجاہدین کے نمائندہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس پر اگر احتجاج بھی نہ ہوا اور عوام اور دینی حلقوں کا رد عمل بھی سامنے نہ آئے تو اس سے چینیا کے مسلمانوں کے دل پر لگنے والا زخم اور زیادہ گہرا ہو جائے گا اور وہ خود کو مزید تہا محسوس کرنے لگیں گے۔ پھر یہ تاثر بھی ابھرے گا کہ شاید پاکستان کے عوام، دینی حلقة اور صحافی بھی شاید خفیہ اداروں کے لوگ ہیں جو اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ کوئی طرز عمل اختیار کرنے سے قبل امریکی اور

روسی حکمرانوں کے چہروں کے نزاویے دیکھتے ہیں اور ان کی پیشانیوں کی ٹکنیں شمار کرتے ہیں۔ اس لیے خامد میر کے ساتھ میں بھی اپنے معزز مہمان سلیم خان کے سامنے پوری پاکستانی قوم باخصوص دینی حلقوں کی طرف سے شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں اور ان سے ہونے والی اس بدسلوکی پر معافی مانگتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی سلیم خان کی توبین کرنے والے خفیہ اداروں کے ان افسران سے جن کے حکم پر یہ سب کچھ ہوا یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکی صدر کا پاکستان نہ آنا اور روسی حکمرانوں کا اظہار ناراضگی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے لوگ اس حد تک بدحواس ہو جائیں اور بالکل ہی ”بونر“ جائیں۔ ابھی تعيش کے اور بھی بہت سے امتحان باقی ہیں اس لیے اپنے حواس قائم رکھیں اور امریکہ اور روس کی چاکری کرنے کی بجائے کہیں سے غیرت و محیت کا درس بھی لے لیں۔

## ملک میں اسلحہ کلچر: وفاقی وزیر داخلہ سے اہم گزارشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ فوری ۲۰۰۰ء

گذشتہ دنوں ملک میں امن و امان کے حوالے سے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کے بعد وفاقی وزیر داخلہ لیٹھنینٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر نے اخباری نمائندوں کو برینگ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں اسلحہ کلچر کو ختم کرنے کیلئے اقدامات کیے جارہے ہیں، اور اس سلسلہ میں اسلحہ کی نمائش پر پابندی اور فائزنگ کی قانونی ممانعت کے علاوہ ان دینی طلبہ کی حوصلہ ٹکنی بھی پروگرام میں شامل ہے جو افغانستان جا کر اسلحہ کی تربینگ حاصل کرتے ہیں۔ وزیر داخلہ نے پریس برینگ میں کہا کہ اس حوالے سے افغانستان کی حکومت سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اسلحہ چلانے کی تربیت دینے والے مرکزوں بند کر دے اور پاکستان سے اسلحہ کی تربیت کیلئے افغانستان جانے والے دینی طلبہ کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ جناب معین الدین حیدر کا کہنا ہے کہ پاکستان بھر کے دینی مدارس کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو اسلحہ کی تربیت دیتے ہیں البتہ کم و بیش چارہزادی مدارس میں ایک فصیل تعداد ایسے مدارس کی ضرورت ہے جو اپنے طلبہ کو ہتھیار چلانے کی تربینگ دلانے کا اہتمام کرتے ہیں اور اسی کی روک تھام کیلئے اس قسم کے اقدامات ضروری ہو گئے ہیں۔

جبکہ تک ملک میں اسلحہ کو کثراول کرنے اور جرائم کی روک تھام کیلئے اسلحہ رکھنے اور چلانے پر پابندی کے مجوزہ اقدامات کا تعلق ہے ہم اس کی حمایت کرتے ہیں۔ کیونکہ دہشت گردی، فوجداری جرائم اور لا قانونیت کی صورتحال یقیناً یہ رخ اختیار کرچکی ہے کہ اسلحہ کو مکمل طور پر کثراول کر کے شہریوں کو نہتا کر دینے کے سواب کوئی چارہ کا رہا قائم نہیں رہ گیا۔ اصولی طور پر ہم اسلحہ رکھنے کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ یہ سنت رسول ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو ہتھیار رکھنے اور اس کی تربیت دینے کی بداہیت کی ہے لیکن ہمارے ہاں معروفی صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ اسلحہ غلط لوگوں کے ہاتھ میں زیادہ ہے اور کثرہ پیشتر غلط مقاصد کیلئے استعمال ہو رہا ہے۔ اس لیے جس طرح امارت اسلامی افغانستان کی حکومت نے ملک میں امن و امان کیلئے سب لوگوں سے اسلحہ واپس لینے اور شہریوں کو نہتا کر دینے کی پالیسی اختیار کی ہے اور اس کے خاطر خواہ تباہ سامنے آ رہے ہیں اسی طرح ہمارے ہاں بھی اس بات کی ضرورت بڑھتی جا رہی

ہے کہ اس معاملہ میں ہم بھی طالبان کی پیروی کریں اور ہر قسم کے اسلحہ کو سرکاری تحویل میں لے کر ”وپن لیں سوسائٹی“ کی طرف قدم بڑھائیں۔

ابتداء اس حوالے سے دوضروری گزارشات جناب معین الدین حیدر اور ان کی وساطت سے امن عامدہ کے دیگر ذمہ دار حضرات اور اداروں کی خدمت میں پیش کرنے کو بھی چاہتا ہے۔ ایک یہ کہ اسلحہ اگر واپس لینا ہے تو پھر کسی استشان کے بغیر سب لوگوں سے واپس لیا جائے اور افغانستان کی طرح کسی ایک شخص کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہ رہنے دیا جائے کیونکہ اسلحہ پر کنشروں کی پالیسی کا عملی فائدہ صرف اسی صورت میں ہو گا۔ ورنہ اگر وایتی انداز میں جن لوگوں تک پولیس کی رسائی ہے ان سے تو اسلحہ لے لیا جائے لیکن جو با اثر اور جراحت پیشہ افراد و گروہ اس رسائی کی رخچ سے باہر ہیں ان کا اسلحہ بدستور ان کے پاس رہے تو اس سے جرائم میں کمی کی بجائے مزید اضافہ ہو گا اور وہ پہلے سے زیادہ بے خوف ہو کر اسلحہ استعمال کریں گے۔

چند سال پہلے جب ہمارے ہاں گوجرانوالہ میں فدا حسین مرحوم ایس ایس پی ہوا کرتے تھے اس زمانہ میں بخوب حکومت نے لوگوں سے اسلحہ واپس لینے کی مہم شروع کی تھی۔ اس سلسلہ میں فدا حسین مرحوم نے ہم سے بات کی کہ لوگوں سے اسلحہ واپس دلوانے میں علمائے کرام پولیس سے تعاون کریں جس پر میں نے عرض کیا کہ اگر یہ پالیسی سب کیلئے بکساں ہے تو ہم تعاون کرنے، لوگوں کو اسلحہ کی واپسی کی ترغیب دینے بلکہ پولیس افسروں کے ساتھ مل کر چھاپے مارنے کیلئے بھی تیار ہیں۔ لیکن اگر صرف فارمیٹی پورا کرنا مقصد ہے تو ہمیں اس سے معدود سمجھا جائے۔ اس موقع پر میں نے ایس ایس پی مرحوم کو شہر کے چند با اثر افراد کے بارے میں کہا کہ ان کے گھروں اور ڈیروں پر اسلحہ کے انبار موجود ہیں خود آپ بھی اُنہیں اچھی طرح جانتے ہیں، جس روز ان لوگوں کے ڈیروں پر چھاپے مار کر ان کا اسلحہ قبضہ میں کریں گے اس سے اگلے روز ہمیں بالیں ہم پولیس افسروں کے ساتھ عموم سے اسلحہ واپس لینے کی مہم میں شریک ہو جائیں گے۔ ہماری اس گزارش کا کوئی جواب نہ ملا اور اسلحہ پر کنشروں کی یہ مہم دم توڑ کر رہ گئی۔

جناب وزیر داخلہ سے گزارش ہے کہ اس قسم کی مہم سے تو گریزی کریں کہ شریف شہری اور قانون کی زد میں آجائے والے لوگ مزید نہ ہنگے ہو جائیں لیکن جن افراد اور گروہوں کے پاس اسلحہ کے انبار موجود ہیں اور جن کے جرائم اور اسلحہ کی حفاظت کرنے والے ان کے عزیز، رشتہ دار اور بھائی بند خود امن تامم کرنے والے اداروں میں نمایاں بھروسے پر بنٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے اسلحہ کے استعمال میں مزید بے خوف ہوتے چلے جائیں۔ ہاں اگر قانون سب کیلئے بکساں اور طرز عمل سب کے ساتھ ایک جیسا ہو تو ہم اسلحہ سے معاشرہ کو پاک کر کے جرائم اور دہشت گردی کو نکشوں کرنے کی مہم کا ساتھ دیں گے۔ البتہ اس سلسلہ میں ہماری تجویز یہ ہے کہ امارت اسلامی افغانستان کے کامیاب تجربہ سے استفادہ کیا جائے اور طالبان کی حکومت سے تجربہ کار مشیر حاصل کر کے ان کی راہنمائی میں اسلحہ کنشروں پالیسی کی تفصیلات طے کی جائیں۔

دوسری گزارش اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ جناب معین الدین حیدر کے بقول امارت اسلامی افغانستان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اسلحہ کی تربیت دینے والے کمپ بند کر دے کیونکہ ان سے پاکستان کے بعض افراد تربیت لے کر اس کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے وزیر داخلہ کے علم میں یقیناً ہو گی کہ افغانستان کے ان کمپوں سے صرف

پاکستان کے ایک فیصلہ دینی مدارس کے چند طلبہ تربیت حاصل نہیں کرتے بلکہ دنیا بھر کی جہادی تحریکات کے مجاہدین نے انہی کمپوں سے تربیت پائی ہے۔ کشمیر، چیچنیا، فلسطین، مورو، اراکان، بوسنی، کوسوو اور دیگر علاقوں میں جو مجاہدین کفر کی طاقتوں کے مقابلہ میں ہتھیار بکف ہیں ان کی بڑی اکثریت نے افغانستان کے انہی کمپوں میں ٹریننگ حاصل کی ہے۔ ہمارا جناب معین الدین حیدر سے سوال یہ ہے کہ افغانستان کے تربیتی کمپ بند کرنے کے بعد ان کے پاس کشمیر، چیچنیا، فلسطین، کوسوو اور بوسنیا جیسے مظلوم خطوں کے مجاہدین کیلئے اسلحہ کی ٹریننگ کا مقابلہ انتظام کیا ہے؟ کیا پاک فوج اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے؟ اگر ایسا ہو جائے تو ہم خود جناب معین الدین حیدر کے ساتھ قدر ہار جا کر امیر المؤمنین ملام محمد عمر مجاہد سے افغانستان میں موجود اسلحہ کی ٹریننگ کے کمپ بند کرنے کی درخواست کرنے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن اگر افغانستان کے کمپ پاکستان کے دباؤ کی وجہ سے خدا غوثتہ بند ہو جاتے ہیں اور دنیا میں مختلف مقامات پر کفر کے خلاف پنج آرمائی کرنے والے مجاہدین کی ٹریننگ کا کوئی مقابلہ انتظام بھی نہیں ہو پاتا تو امرت اسلامی افغانستان کی حکومت سے اسلحہ کی تربیت کے کمپ بند کرنے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ طالبان کی حکومت مجاہدین اور جہادی تحریکات کے بارے میں امریکی ایجنسی کو تسلیم کر لے اور عالمی استعمار کی خواہشات اور مطالبات کے آگے سرمنڈر ہو جائے۔ اس لیے ہم حکومت پاکستان کے اس موقف کی حمایت نہیں کر سکتے اور بڑے ادب کے ساتھ لیفٹیننٹ جزل (ر) معین الدین حیدر سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ میاں محمد نواز شریف، میاں شہباز شریف اور جزل ضیاء الدین بٹ کے ایجنسی سے جزل پر ویز مشرف اور لیفٹیننٹ جزل معین الدین حیدر کا ایجنسی اعوام کو ابھی تک بظاہر مختلف دکھائی دے رہا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ نہ صرف دونوں ایجنسیوں کا یہ فرق قائم رہے بلکہ جزل (ر) معین الدین حیدر جب افغان حکمرانوں سے گفت و شدید کیلئے کامل اور قدر ہار تشریف لے جائیں تو ان کے ہاتھ میں وہی فائل نہ ہو جو جزل ضیاء الدین بٹ کے ہاتھ میں تھی۔

## چیچنیا کا جہاد آزادی اور مسلم حکومتیں

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۴ء

روزنامہ پاکستان لاہور کے افروزی ۲۰۰۰ء کی ایک رپورٹ کے مطابق چیچنیا کے سابق صدر اور موجودہ چیچن صدر کے نمائندہ جناب زیلم خان نے لاہور ہائیکورٹ بار کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ چیچنیا کے مسلمانوں پر روسی افواج کے مظالم کے ذمہ دار مسلم ممالک ہیں، کیونکہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ چیچنیا کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ چیچنیا پر روسی افواج کی یلغار پر خاموشی اختیار کر کے روس کو چیچن مسلمانوں پر مظالم توڑنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ زیلم خان نے کہا کہ ۱۹۹۱ء میں جب چیچنیا نے اپنی آزاد حکومت کا اعلان کیا تھا اگر مسلم ممالک اس وقت اسے تسلیم کر لیتے تو آج ان حالات کی نوبت نہ آتی، مگر مسلمان حکومتوں نے چیچن حکومت کو تسلیم نہ کیا جس کے تیجے میں روس کو چیچنیا پر فوجی چڑھائی کا موقع مل گیا۔ انہوں نے کہا کہ روس نے اژور سوخ استعمال کر کے ترکی اور سعودی عرب سمیت بہت سے ممالک کو چیچن

حکومت کو تسلیم کرنے سے روکا۔

جناب زیلم خان کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے، انہوں نے مسلمان حکومتوں کی جس بے رخی اور سرد مہری کا ذکر کیا ہے اسے دنیا بھر کے مسلمان محسوس کر رہے ہیں۔ اور یہ مسلم حکمرانوں کی بے حصی کا تیجہ ہے کہ روشنیوں چیزوں دار الحکومت گروزني پر غاصبانہ قبضہ جمائے پیشی ہیں اور چیزوں مجاهدین پہاڑوں میں اپنا ہیڈ کوارٹر منتقل کر کے آزادی کیلئے گوریلا جنگ پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بلکہ ہمارے ہاں پاکستان میں تو مزید ظلم یہ ہوا کہ چیزوں حکومت کے نمائندہ زیلم خان جب اسلام آباد پہنچنے تو انہیں خفیہ اداروں کے اہل کاروں نے حرast میں لے لیا اور ان کے ساتھیوں کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا، جو مجاهدین کے ایک غیور نمائندہ اور چیزوں حکومت کے معزز نمائندہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ایک مسلم حکومت کے الہکاروں کا شرمناک سلوک تھا اور اس کی ہر سطح پر مذمت کی گئی ہے۔

مگر اس کے باوجود چیزوں مجاهدین نے جس حوصلہ اور عزم کے ساتھ چہاد جاری رکھا ہوا ہے وہ ان کی عزیمت و استقامت کا مظہر ہے۔ ہم ان مجاهدین کی کامیابی اور استقامت کیلئے دعا گو ہیں اور مسلم حکومتوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ چیزیاں کے مظلوم مسلمانوں کی حالتِ زار کی طرف توجہ دیں اور چیزوں حکومت کو تسلیم کر کے چہاد آزادی میں اسے اخلاقی، سفارتی اور عسکری امداد فراہم کریں۔

## سقوطِ ڈھاکہ، جہادِ افغانستان، معاشی خود مختاری

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳ مارچ ۲۰۰۰ء

محترم راجہ اور صاحب کا کہنا ہے کہ

”سامراج سے آزادی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم پانچ سال کیلئے اپنی ساری ترجیحات معطل کر دیں، صرف پانچ سال کیلئے اپنے سارے اہم مسائل طلاق نسیاں کی نذر کر دیں اور معاشی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ جس دن ہم معاشی طور پر مضبوط اور آزاد ہو گئے اس دن دنیا کی کوئی قوت، کوئی سامراج اور کوئی سازش ہمیں غلام نہیں رکھ سکے گی۔“

اس سلسلہ میں میرے ذہن میں ایک اشکال ہے جس پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں مگر اس اشکال پر کچھ عرض کرنے سے پہلے راجہ صاحب کے مضمون کے بعض دیگر مندرجات کے حوالے سے تاریخ گاریاڑ درست رکھنے کیلئے چند معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

راجہ صاحب نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے المیہ کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کی ”گوتاہ فکر فوجی، سیاسی اور مذہبی قیادت“ کو اس کا ذمہ دار ہٹھرا یا ہے اور سب کو ایک ہی لائخی سے ہاکنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس ایکشن میں مذہبی جماعتوں میں سب سے زیادہ نشیئن جمیعت علماء اسلام اور جمیعۃ العلماء پاکستان نے حاصل کی

تھیں جن کی قیادت مولانا مفتی محمود اور مولانا شاہ احمد نورانی کر رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ مشرقی پاکستان میں بھی خان کے فوجی ایکشن کو جماعت اسلامی کی حمایت حاصل تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا مفتی محمود اور مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی خان کو سپورٹ نہیں کیا تھا۔ بلکہ راجہ انور صاحب کے مددوں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے جب منتخب پارلیمنٹ کا ڈھاکہ میں طلب کیا جانے والا اجلاس متواتی کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے ”ادھر تم ادھر ہم“ کا نعرہ لگایا تھا اور ان کے لاہور کے جلسہ میں یہ ہمکی دی گئی تھی کہ آسمبلی کے اجلاس میں شرکت کیلئے ڈھاکہ جانے والے ممبران آسمبلی کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی تو اس کے جواب میں مولانا مفتی محمود نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اس ہمکی کو مسترد کرتے ہیں اور آسمبلی کے اجلاس میں شرکت کیلئے ضرور ڈھاکہ جائیں گے۔

اس وقت کی صورتحال کا اصل منظر یہ ہے کہ نو منتخب دستور ساز آسمبلی کا ڈھاکہ سیشن ماقبلی کرنے اور مشرقی پاکستان پر فوجی ایکشن کے سلسلہ میں بھی خان کے اقدامات کو جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور جماعت اسلامی نے سپورٹ کیا تھا۔ جبکہ آسمبلی کی دو بڑی مذہبی جماعتوں جمعیت علماء اسلام اور جمیعۃ العلماء پاکستان نے تو اذن اور اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے اپنا جادا گانہ تشخیص قائم رکھا تھا۔ اس لیے کسی استثناء کے بغیر اس دور کی پوری مذہبی قیادت کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار قرار دینا اور اس پر کوتاہ فکر کی پھیلتی کشرا جو انور صاحب کی دلی خواہش تو ہو سکتی ہے مگر حقائق کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی طرح راجہ صاحب نے یہ لکھ کر بھی تاریخی حقائق کو غلط رخ دینے کی کوشش کی ہے کہ ۱۹۸۰ء میں سرزی میں افغانستان پر امریکی سائبان تلے جوہنی روں کے خلاف غلغٹہ جہاد بلند ہوا ہم فوراً اس کھیل کا پانچواں پیادہ بننے پر آمادہ ہو گئے۔

میں نہیں سمجھتا کہ راجہ انور جیسا دانا و بینا اور سردو گرم چشیدہ شخص واقعات کے اصل تسلیم سے اس تدریبے خبر ہو سکتا ہے کہ وہ جہاد افغانستان میں امریکی سائبان کی لمبائی کو ۱۹۸۰ء تک کھینچ لے جانے میں بھی کوئی حرجنگ محسوس نہ کرے۔ بلکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ جب ببر ک کارمل کو کابل کے اقتدار پر بٹھانے اور اسے تحفظ دینے کیلئے روں نے مسلح افغان کو افغانستان میں اتنا تھا تو ابتدائی تین سال تک مجاهدین اس حالت میں جنگ لڑتے رہے کہ اکثر ان کے پاس دو وقت کھانے کی روٹی نہیں ہوتی تھی۔ راجہ صاحب چاہیں تو میں ان نوجوانوں سے ان کی ملاقات کر سکتا ہوں جو اس دور میں خوست کی پہاڑیوں پر مولوی جلال الدین حقانی کے ساتھ کئی ہفتے تک جہاد میں شریک رہے اور اس کیفیت کے ساتھ شریک رہے کہ کئی کئی روز مسلسل پیدل چل کر مورچوں تک پہنچا کرتے تھے اور انہیں دن رات میں ایک وقت سوکھی روٹی پیاز کے ساتھ میسر ہوتی تھی۔ راجہ صاحب موصوف کی ملاقات لاہور کے اس مردو رویش سے بھی کرانی جا سکتی ہے جو ایک ایک دکان پر گھوم کر مجاهدین کیلئے آٹے کے تھیلے جمع کرتا تھا اور مہینہ ڈیڑھ کے بعد انہیں دن رات میں ایک وقت سوکھی روٹی کرتا تھا کہ مجاهدین کو دو وقت کھانے کو خشک روٹی تول مل جائے۔ اس مردو رویش کا نام مولانا حمید الرحمن عباسی ہے جو آج بھی شیر انوالہ گیت لاہور کی جامع مسجد میں خاموشی کے ساتھ قرآن و حدیث پڑھانے کی خدمت میں مصروف ہے۔ اور راجہ صاحب کو ان بوتل بھوں کی زیارت بھی کرانی جا سکتی ہے جو روایتی اسلحہ میسر نہ آنے کی وجہ سے مجاهدین نے خود ایجاد

کیا تھا اور بوتل میں صابن اور پڑول کا محلول تیار کر کے وہ اس تکنیک سے ٹینک پر مارتے تھے کہ دیکھتے ہیں دیکھتے ٹینک جل کر بے کار ہو جاتا تھا۔

مجاہدین نے مسلسل تین سال تک جنگ اس بے سرو سامانی اور کسپہر سی کی حالت میں لڑی ہے۔ حتیٰ کہ جب چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر افغانستان کے کم و بیش ستر فیصد علاقوں پر مجاہدین نے کشرون حاصل کر لیا تو اس کے بعد امریکہ اور دوسرے ممالک اپنے مفادات کیلئے اس میں شریک ہو گئے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ اس مرحلہ پر مجاہدین کو امریکہ کی حمایت قبول کرنا چاہیے تھی یا نہیں۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ مجاہدین نے امریکہ کی حمایت قبول کرے غلطی کی جس کی سزا افغانستان اب تک بھگت رہا ہے۔ مگر جہاد افغانستان کے اس سارے عمل کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ امریکی سائبان تک شروع نیا گیا تھا اور مجاہدین کے ساتھ نا انصافی ہے۔

راجہ صاحب نے چین گن مجاہدین کے معزکہ کا بھی ذکر کیا ہے اور انہیں شکوہ ہے کہ چین گن مجاہدین نے صرف دو ہزار نیم مسلح گوریلوں کے ساتھ روسی جنگی طاقت کے خلاف برد آزمہ ہو کر جذباتی خود کشی کی ہے اور چین گن عوام کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے روس کی غلامی میں دینے کی سازش کی ہے۔ مگر وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ آزادی کی جگلوں میں طاقت کا توازن نہیں دیکھا جاتا بلکہ جذبہ حریت اور صرف جذبہ حریت اس کی بنیاد بنتا ہے۔ ورنہ خود ہمارے ہاں عظیم تر رطابیہ کی خوفناک جنگی قوت کی موجودگی میں سکھوں کے ساتھ شہدائے بالا کوٹ کی جنگ بھی خود کشی کی جذباتی کوشش قرار پائے گی اور اس کے ساتھ بیگان کے حاجی شریعت اللہ اور تیتو میر، سندھ کے پیر صبغۃ اللہ الشہید، پنجاب کے سردار احمد خان کھرل شہید اور صوبہ سرحد کے حاجی تنگ زئی اور فقیر اپنی سمیت عظیم مجاہدین آزادی کے بیسوں مرکے بھی راجہ انور صاحب کے فلسفہ کے مطابق جذباتی خود کشی کی کوشش قرار پا جائیں گے۔ جبکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ ہماری آزادی کے اصل معمار وہی ہیں اور انہی کے مقدس خون کی برکت سے ہم آج ایک آزاد مملکت کے شہری کھلاتے ہیں۔ اس لیے چینیا کے مجاہدین کو اگر وقت طور پر روی فوجوں کے سامنے پسپائی اختیار کرنا پڑی ہے تو کوئی بات نہیں، آزادی کی جنگوں میں ایسا ہو تارہتا ہے۔ مگر قومیں جب آزادی حاصل کرنے پر تمل جاتی ہیں تو انہیں کوئی طاقت زیادہ دیر تک غلام بنا کر نہیں رکھ سکتی۔ چینیا بالآخر آزاد ہو گا اور اسے جب بھی آزادی ملی اس کی تاریخ میں گروزی کے مجاہدین اور شہداء کو وہی مقام حاصل ہو گا جو ہماری جنگ آزادی میں مذکورہ بالا مجاہدین اور شہداء کو حاصل ہے۔

ان معروضات کے بعد راجہ صاحب کے اس فلسفہ کی طرف آتا ہوں کہ سامراج سے آزادی حاصل کرنے کیلئے معاشی طور پر خود مختار ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر سامراج سے کبھی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں ہے لیکن اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاشی خود مختاری کیلئے بھی سامراج سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ جب تک سامراج کا پنجہ ہماری گردن سے ڈھیلا نہیں ہو گا اس وقت تک معاشی خود مختاری کے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہو گی۔ ہم اس کا مشاہدہ مشرق وسطیٰ میں کرچکے ہیں کہ عربوں کی معاشی حالت ہم سے کہیں بہتر تھی اور قدرت نے انہیں تیل کی عظیم دولت سے نواز تھا لیکن چونکہ ان کی گردن سامراج کے شکنچ میں جگڑی ہوئی ہے اس لیے ان کی دولت اور معاشی بہتری ان کے کسی کام نہیں آئی بلکہ الاٹاں کیلئے عذاب بن کر رہ گئی ہے۔

اپنا پانچھوڑے نظر ہے، راجح صاحب اور ان کے ہمنواں کا موقف یہ ہے کہ آزادی کیلئے معاشری خود مختاری اور مضبوطی ضروری ہے، جبکہ ہم فقیروں کا نصف نظر یہ ہے کہ معاشری خود مختاری اور مضبوطی کیلئے آزادی ضروری ہے کیونکہ غلام جتنی چاہے کمالی کرے اور جتنی چاہے دولت جمع کر لے وہ بالآخر آتاق کے خزانوں کی زینت ہی بنتی ہے۔ اس لیے ایک دوسرے سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کو طعنے دینے اور پھبٹیاں کرنے کا کوئی موقع ہے۔ اپنے اپنے رخ پر لگے رہیں اور ایک دوسرے کو کوس کرو وقت ضائع نہ کیجئے، قوم کو آزادی اور معاشری خود مختاری دونوں کی کیسا ضرورت ہے، دونوں میں سے جو گروہ بھی اپنے ہدف کی طرف سبقت کر گیا وہ دوسرے کیلئے یقیناً تقویت اور کامیابی کا باعث ہی بنے گا۔

## جهادی تربیتی مراکز اور تحریکِ جعفریہ پاکستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء

افغانستان میں جہادی تربیت کے عسکری کیمپوں کے بارے میں ایک کالم میں ہم نے گزارش کی تھی کہ ان کی بندش کا مطالبہ درست نہیں ہے کیونکہ کشمیر، فلسطین، بوسنیا، کوسوو، چیچنیا، مورو، اراکان اور دیگر علاقوں میں مسلمان مجاہدین آزادی اور اپنے اسلامی شخص کے تحفظ کیلئے جو جنگ اڑ رہے ہیں اس جنگ کا ترتیب سرچشہ بھی کیمپ ہیں اور ان کیمپوں کے بند ہونے کا براہ راست نقصان ان جہادی تحریکات کو ہو گا اس لیے امریکہ ان کیمپوں کی بندش کا مطالبہ کر رہا ہے لہذا ان کیمپوں کی بندش کا مطلب دنیا بھر کی جہادی تحریکات کو ایک بہت بڑے سہارے سے محروم کر دینا ہو گا۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہو سکتا ہے ان کیمپوں سے تربیت حاصل کرنے والے کچھ افراد نے پاکستان میں اس تربیت کا غلط استعمال بھی کیا ہو جس سے ملک میں دہشت گردی کو فروغ حاصل ہوا ہے اور لا قانونیت میں اضافہ ہوا ہے لیکن ایسے افراد کا تناسب بہت کم ہے اس لیے ان کی روک تھام کیلئے کوئی اور بندوبست ہونا چاہیے اور چندی فصل لوگوں کے غلط کردار کی وجہ سے سرے سے ان کیمپوں کو بند کرنے کا مطالبہ کر کے امریکی ایجنڈے کو آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔

اس پر تحریک جعفریہ پاکستان کے مولانا ظہار بخاری صاحب کا درج ذیل خط موصول ہوا ہے:

”محترم جناب مولانا زاہد الرشدی صاحب۔“

السلام علیکم، مراجع گرامی!

گذشتہ دونوں (۲۸ فروری ۲۰۰۰ء) روزنامہ اوصاف میں آپ کا کالم ”وزیر داخلہ سے دو اہم گزارشات“ کے عنوان سے پڑھا جس میں آپ نے اسلحہ کی نمائش پر پابندی اور افغانستان میں موجود دہشت گردی کے کیمپوں کے حوالے سے اپنا موقف واضح کیا ہے۔ اول الذکر مسئلہ پر آپ کی تجویز سے ہم کافی حد تک اتفاق کرتے ہیں لیکن آخر الذکر مسئلہ کے ضمن میں نہ صرف اختلاف رکھتے ہیں بلکہ حقائق

کی روشنی میں اس کی وضاحت بھی آپ کو اسال کر رہے ہیں تاکہ آپ سمیت ہر انصاف پسند اور باشمور شہری حقیقت حال سے آگاہ ہو سکے۔

وطن عزیز میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کا آغاز ایک مخصوص شدت پسند گروہ کی فتویٰ سازی اور غلیظ نعروہ بازی کی وجہ سے ہوا جس میں ان ملاوں نے ایک خاص ایجنسی کے تحت سادہ لوح اور جنوباتی نوجوانوں کو شیعہ عوام کے قتل عام پر اسلامیا جس کا انجام ”لشکر جہنمگوی“ کی تشكیل تک پہنچا، آج یہی گروہ دہشت و دھشت کا سرخیل ہے۔

اسلامی جہاد پر عالم اسلام کے تمام مکاتب فکر نہ صرف متحد و متفق ہیں بلکہ اسے اصول دین میں شمار کرتے ہیں۔ مسلک اہل بیت میں جہاد انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ آج پوری دنیا میں تمام مکاتب و ممالک کے پیروکار اپنے دائرہ میں جہاد کے ذریعے امریکہ، روس، اسرائیل، ہندوستان اور دیگر استعماری طاقتوں کے خلاف بر سر پیکار ہیں۔ اور حیدر کار کی جرأت و بہادری سے الہام حاصل کرتے ہوئے دشمنان اسلام پر اسلام کا سکے جمار ہے ہیں۔

گذشتہ دہائی میں نام نہاد سپر پا پور روس کے خلاف افغانستان کے مخاذ پر مختلف جہادی قویں نمودار ہوئیں اور پھر متحد ہونے کے بعد منتشر ہوئیں۔ یہاں ہم جہادی قوتوں کے باہمی اختلافات سے قطع نظر جہاد کے اس طریقہ کے نقصانات پر بات کریں گے جس کی وجہ سے امت مسلمہ باہمی نزاں کی کیفیت سے دوچار ہوئی۔ افغانستان سے رو سی افواج کے انخلا کے بعد جہادی قویں کشمیر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ تقریباً اسی دور میں یا پھر تھوڑے ہی عرصے بعد پاکستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات کا آغاز ہوا۔ ان واقعات کے ملزمان اور مجرمان گرفتار ہوتے رہے اور انہوں نے فرقہ وارانہ دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والوں، فرقہ وارانہ دہشت گردی کی وجوہات، اسباب فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات کا آغاز ہوا۔ ان واقعات کے ملزمان اور ایجنسیوں کے کردار کے بارے میں جیران کن اور ہوشیار اکشافات کیے۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم سے لے کر ایک تھانے کے ایسی ایج اوتک تمام نے وقتاً فوتاً فرقہ وارانہ دہشت گردی کے اسباب و مضرمات اور حقائق کو بے نقاب کیا۔

انہی حقائق میں سے ایک حقیقت یہ بھی سامنے آئی کہ افغانستان میں موجود جہادی تربیتی کیپوں میں پاکستان کے شیعہ سنی عوام کو قتل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور مخصوص نظریات کے حامل افراد نوجوانوں کے ذہن زہر آلوک کر کے انہیں جنونی بنا کر لوگوں کے قتل کیلے تیار کرتے ہیں اور یہ نوجوان گروہوں، لشکروں اور گینگز کی شکل میں پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور منظم منصوبہ بندی کے تحت فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات کرتے ہیں۔ دو تین ماہ قبل معروف اشتہاری دہشت گرد راحیل نے

گرفتاری کے بعد جو اکشافات کیے تھے وہ دیگر اخبارات کی طرح آپ کے اخبار اوصاف میں بھی جل سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے جس میں اس نے کھلے عام کہا کہ ہم ایک فرقہ کے پیر و کار کو قتل کرنا واجب سمجھتے ہیں اور ہمارے مرکز افغانستان میں موجود ہیں نیز ہمارے تربیت کیپ لشکر جہنگوی کے کمانڈر اب بھی چلا رہے ہیں۔

گذشتہ دور حکومت میں وزیر اعظم نواز شریف، وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے واضح بیانات اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جزل کے دورہ افغانستان نے ہماری طرف سے کئی سالوں سے پیش کیے جانے والے موقف کی تائید کر دی جس میں ہم نے کہا کہ دہشت گردی کے سرچشمے افغانستان میں موجود ہیں۔ آج بھی جزل پرویز مشرف اور وزیر داخلہ جزل معین الدین حیدر نے ان کیپوں کے بارے میں تشویش ظاہر کر کے نہ صرف ہمارے موقف پر مہر تصدیق ثبت کی ہے بلکہ وطن عزیز کی خیر خواہی کرتے ہوئے اور امن و امان کے قیام کیلئے ان کیپوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے یہ مقصد لینا کہ حکومت پا تحریک جعفریہ جہاد کی حامی نہیں قطعاً درست نہیں ہے۔

جہاد کی حمایت پاک فوج اور اس کے ادارے سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ یہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی بھی مغلص و محب وطن پاکستانی اور مسلمان جہاد کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ البتہ جہاد کی آڑ میں عبادت گاہوں تک میں مسلمانوں کے قتل عام اور باہمی کشت و خون کرنے والے فرقہ پرست جنونیوں کی کارروائیوں سے ہر مسلمان پریشان ہے۔ افغانستان میں دہشت گردی کے تربیت کیپوں کی موجودگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں دہشت و بربریت کی علامت سمجھا جانے والا شخص اور دہشت گروں کا سر غمہ ریاض بسرا اور اس کے ساتھی کابل کے نواح میں موجود ہیں اور بقول عوامی اخبارات اور دہشت گروں کے اکشافات کے وہ دہشت گروں کے کیپ بھی چلا رہا ہے اور امارت اسلامی افغانستان اس طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی بلکہ حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کے مطالبے پر پس و پیش اختیار کر رہی ہے۔

آپ جیسے بالغ نظر اور وسیع القلب شخص کی طرف سے اس طرح کا موقف تجب خیز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ارض وطن پر مسلمانوں کی وحدت و بیگتی کے فروغ، فرقہ وارانہ دہشت گردی کے ناسروں کے خاتمے، امن و امان کے قیام، اسلامی مسالک و مکاتب کے اتحاد کی خاطر اپنے نقطہ نظر میں اصلاح کریں گے اور ہمارے نقطہ نظر کو اپنے کالم میں جگہ دے کر اس طرح کے سلیمانی مسائل کے حوالے سے عوام میں پائی جانے والی تشویش کا خاتمہ کریں گے۔ ہم آپ کے عملی اور تحریری تعاون (بذریعہ اوصاف) کے منتظر ہیں۔

### نیک خواہشات کے ساتھ

والسلام، سید اظہار بخاری

### انچارج میڈیا سیل تحریک جعفریہ پاکستان“

ہمیں واقعاً اس سے قبل یہ معلوم نہیں تھا کہ افغانستان میں عسکری تربیت کے مرکز کی بندش کے سلسلہ میں امریکہ کے ساتھ تحریک جعفریہ پاکستان بھی شریک ہے اور ہمارا خیال تھا کہ تحریک جعفریہ شاید ہماری طرح اس عسکری تربیت کے غلط استعمال کی روک تھام پر زور دے رہی ہے۔ مگر اس خط سے واضح ہوا ہے کہ تحریک جعفریہ ان کیمپوں کی مکمل بندش چاہتی ہے اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان کیمپوں کو بند کرنے کیلئے جزل ضیاء الدین بٹ نے آئی اسی کے سربراہ کی حیثیت سے افغانستان کا جو دورہ کیا تھا سے تحریک جعفریہ کی حمایت حاصل تھی۔

خط قاریئن نے پڑھ لیا ہے، ہم اس پر کوئی تفصیل تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ان کالموں میں ہم اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کرچے ہیں۔ البتہ بطور یاد دہانی دو امور کا اعادہ اس خط سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کیلئے کر رہے ہیں:

1. ایک یہ کہ واقعات کی ترتیب یہ نہیں ہے جو اس مکتب میں ظاہر کی گئی ہے بلکہ اصل ترتیب یہ ہے کہ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد پاکستان میں تحریک نفاذ فتنہ جعفریہ کا قائم عمل میں لا یا گیا جس نے انقلاب ایران کی نمائندگی کے دعے کے ساتھ پاکستان میں فتنہ جعفریہ کے متوالی نفاذ کا مطالبہ کیا اور اس مقصد کیلئے اسلام آباد کے سول سیکرٹریٹ کا محاصرہ کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے رد عمل کے طور پر سپاہ صحابہ<sup>ؒ</sup> وجود میں آئی اور اس نے تشدد کے جواب میں تشدد کی پالیسی اختیار کی اور دونوں طرف کے تشدد میں روز بروز اضافہ کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے ان کالموں میں تشدد اور جواب تشدد دونوں کو ہمیشہ غلط قرار دیا ہے اور آج بھی دونوں کو غلط کہتے ہیں۔

2. دوسرا گزارش یہ ہے کہ سید اظہار بخاری صاحب نے اپنے مکتب میں شیعہ رہنماؤں اور کارکنوں کے قتل عام کا ذکر کیا ہے جو بلاشبہ اور افسوسناک اور انتہائی افسوسناک ہے لیکن وہ دوسری طرف کا ذکر اس طرح گول کر گئے ہیں جیسے ان کے مخالف کمپ پی میں سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ اس دوران اہل سنت کے مذہبی رہنماؤں اور کارکنوں کے قتل کا تناسب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چونکہ دونوں طرف ہونے والے واقعات قاریئن کے سامنے ہیں اس لیے اس کے ذکر کو مزید بڑھا کر ہم تخفیٰ یادوں کو پھر سے تازہ نہیں کرنا چاہتے مگر ایک سادہ سوال ہے کہ اگر شیعہ رہنماؤں اور کارکنوں کو قتل کرنے والے ”دہشت گروں“ نے افغانستان کے کیمپوں میں ٹریننگ حاصل کی ہے تو سی رہنماؤں اور کارکنوں کا وسیع پیانا نے پر قتل عام کرنے والے ”دہشت گروں“ کے تربیتی مرکز کہاں ہیں؟ اور اگر ان کیمپوں کا سراغ مل جائے تو کیا تحریک جعفریہ

پاکستان ان کی بندش کا مطالبہ کرنے میں بھی اسی مستعدی اور سرگرمی کا مظاہرہ کرے گی؟ ہمارے خیال میں اس قسم کی یکطرفہ سوچ نے معاملات کو یہاں تک پہنچایا ہے ورنہ اگر دونوں فریق معروضی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے انصاف کے مسلم تقاضوں کو نظر انداز نہ کریں تو صورتحال اب بھی قابو میں آسکتی ہے۔ ہم ملک کے سنجیدہ حلقوں کی اس خواہش کے ساتھ متفق اور اس کے موید ہیں کہ جہادی تربیت کے مرکز میں ٹریننگ حاصل کرنے والوں کو ملک کے داخلی معاملات بالخصوص فرقہ وارانہ کشیرگی میں ملوث نہیں ہونا چاہیے اور اس کے سد باب اور روک تھام کیلئے پاکستان، افغانستان اور ایران کی حکومتوں کے درمیان باضابطہ طور پر جو معقول ستم طے کیا جاسکتا ہے ہم اس کا خیر مقدم کریں گے بشرطیکہ یہ نظام یکطرفہ نہ ہو بلکہ دونوں طرف کے ”دہشت گروں“ کا راستہ روکنے والا ہو۔ لیکن اپنے اس موقف پر ہم آج بھی قائم ہیں کہ دہشت گردی کی روک تھام کے نام پر سرے سے ان کیمپوں کی بندش کا مطالبہ خالصتاً امریکی ایجاد ہے اور ہم دنیا بھر کی جہادی تحریکات سے بے وفائی کرتے ہوئے اس امریکی ایجاد کے کوآگے بڑھانے والی کسی کارروائی یا تجویز کی حمایت نہیں کر سکتے۔

## افغان اور چیچن مجاہدین

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — اپریل ۲۰۰۴ء

میر اسوال راجح صاحب محترم سے یہی تھا کہ جو کچھ ہمارے ان بزرگوں نے بر صیری میں برطانوی استعمار کے خلاف کیا تھا وہی کچھ افغانستان اور چیچنیا کے مجاہدین نے روئی استعمار کے خلاف کیا ہے۔ وہی فتویٰ جہاد ہے، وہی مکملیک ہے، وہی جذبہ آزادی ہے اور وہی بے سر و سامانی کے باوجود وقت کی بہت بڑی قوت کے ساتھ ملکرانے کا عمل ہے۔ اس لیے اگر ہمارے مجاہدین آزادی قویٰ ہیرو ہیں اور ان کی جدوجہد کو خود کشی سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے تو ان کے نقش قدم پر چلنے والے افغان مجاہدین اور چیچن مجاہدین بھی اسی طرح کے قویٰ ہیرو ہیں اور انہیں صرف اس وجہ سے اعزاز سے محروم نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی جنگ آزادی میں ان کاسامنا روک سے ہوا ہے اور ہورہا ہے۔

راجح صاحب محترم کیلئے میری یہ گزارش بہت اطمینان کا باعث ہے کہ افغان مجاہدین نے امریکہ کی امداد قبول کر کے غلطی کی تھی۔ میں اس رائے پر اب بھی قائم ہوں لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ امریکی امداد قبول کرنے والے جہادی گروپ آج بھی امریکی کمپ میں ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے افغان عوام کی قربانیوں کو قبول کرتے ہوئے مکونی طور پر طالبان کو آگے کر دیا ہے جنہوں نے امریکی امداد کی خوست کو ایک طرف کر کے افغان عوام کے جذبات کی صحیح ترجیhan اور جہاد کے منطقی ثمرات کو صحیح رخ پر رکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ اور میرے نزدیک یہ بارگاہ ایزدی میں افغان عوام کے خلوص اور قربانیوں کی قبولیت کی دلیل ہے کہ جہاد افغانستان میں امریکی امداد کے منحوس اثرات بہت جلد ”کھڑے لائے“ لگنے لیں۔

راجہ صاحبِ محترم کا ذہن اس بات کو بھی قول نہیں کر رہا کہ صرف (ان کے بقول) دو ہزار چین مجہدین نے رو سی فوج کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ جنگ آزادی کیسے ہو گئی ہے اور اسے خود کشی سے کیوں تعبیر نہیں کیا جاتا؟ انہوں نے اس حوالے سے یہ بھی سوال کیا ہے کہ آخر یہ کس کی سنت ہے؟ اس کے جواب میں اسلامی تاریخ کے سینکڑوں ایسے معزکوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن میں مٹھی بھر مسلمانوں نے دشمن کی افواج قاہرہ کا بے گجری کے ساتھ مقابله کیا۔ ان میں سے صرف ایک واقعہ کا نذکرہ سردست کر رہا ہوں۔

حضرت عمر بن الخطاب کے دورِ خلافت میں رومیہ الکبریٰ کی عظیم سلطنت کی افواج کے مقابلہ میں ایک محاڑ پر حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح اسلامی لشکر کی مکان کر رہے تھے، دشمن کی فوج کی تعداد تین لاکھ جبکہ مسلمانوں کی تعداد ۳۰۰ ہزار تھی۔ جب آمنا سامنا ہوا تو دشمن نے دو لاکھ چالیس ہزار فوج کو ریزو میں ایک طرف رکھتے ہوئے ساٹھ ہزار فوج کو مسلمانوں کے سامنے کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تیس ہزار فوج کا مقابلہ اس ساٹھ ہزار کے لشکر سے ہو گا اور جب دونوں لشکر جنگ میں تھک ہار جائیں گے تو دو لاکھ چالیس ہزار کی تازہ دم ریزو فوج اچانک حملہ کر کے مسلمانوں کا صفائی کر دے گی۔ حضرت ابو عبیدہ نے دشمن کی چال کو محسوس کرتے ہوئے ساتھیوں کے مشورہ سے فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی تھوڑی سی فوج کو مقابلہ میں کھڑا کر کے باقی فوج کو ریزو میں رکھنا چاہیے تاکہ تازہ دم فوج کا مقابلہ تازہ دم فوج سے ہی ہو۔ یہ طریقے کے انہوں نے حضرت خالد بن ولید سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آپ مجھے اسلامی فوج میں سے اپنی مرضی کے صرف ساٹھ افراد منتخب کرنے کا اختیار دے دیجیے، میں ان ساٹھ نوجوانوں کے ساتھ ساٹھ ہزار کے اس لشکر سے خود ہی نہٹ لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خالد بن ولید نے صرف ساٹھ نوجوانوں کی مکان کرتے ہوئے ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل فوج کو میدان جنگ میں عبرناک شکست سے دوچار کر دیا۔ یہ معزکہ اس قدر معروف ہے کہ اس پر عرب شعراء نے مجہدین کی تعریف میں تصدیق کئے جن میں سے ایک شعر اس وقت میرے ذہن میں آ رہا ہے:

غراستون بم ستون الفا

ومع بذا تولوا مدربينا

ترجمہ: ساٹھ مجہدین نے ساٹھ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیا اور ساٹھ ہزار کا لشکر کثرت کے باوجود میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس لیے راجہ اور صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اگر رو سی وحشیوں کے خلاف بدعا میں کوئی حریج محسوس نہ کرتے ہوں تو حضرت خالد بن ولید کی سنت زندہ کرنے والے چین مجہدین کو خود کشی کا طعنہ دینے کی بجائے ان کی کامیابی کیلئے بارگاہ ایزدی میں دعا کریں۔

## "دہشت گردی" کا امریکی تصور

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — اپریل ۲۰۰۴ء

آخر میں کچھ بات ”دہشت گردی“ کے حوالے سے بھی ہو جائے کہ آخر امریکہ کے نزدیک اس کی تعریف کیا ہے؟ افغانستان کے حوالے سے دیکھ لیں کہ وہی عمل افغان مجاهدین روس کے خلاف کریں تو امریکہ کے نزدیک یہ ان کا جہاد آزادی ہے۔ اور اسی لمحے میں وہ امریکی مداخلت کو قبول کرنے سے انکار کریں تو وہ دہشت گردی قرار پائے۔ امریکی سفیر یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ طالبان نے اسماء بن لادن کو پناہ دے رکھی ہے اس لیے وہ دہشت گرد ہیں، اس لیے کہ اسماء بن لادن کو امریکہ نے دہشت گرد قرار دیا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دہشت گردی کا کوئی معروف اصول اور قانون بھی ہے یا امریکہ ہی دنیا کا واحد معیار ہے کہ جسے امریکی حکومت دہشت گرد کہہ دے اس پر وحی آسمانی کی طرح ایمان لانا پوری نسل انسانی کے ذمہ فرض ہو جاتا ہے؟

جناب ولیم بی مائلم سے بڑے ادب کے ساتھ ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر بافرض کسی وقت کوئی بڑی قوت امریکہ کی کسی ریاست میں اپنی فویس اتار کر اس کے تمام وسائل پر قبضہ کر لے، اور امریکہ میں ایسی حکومت ہو جو وہاں کے عوام کو ووٹ اور رائے کا حق دینے سے صاف انکار کر رہی ہو، اور اس شخصی آمربیت اور قابض فوجی قوت کے درمیان گھٹ جوڑ کے خلاف آواز اٹھانے اور اپنی بات کہنے کا کوئی فورم موجود نہ رہا ہو، ایسے حالات میں اگر کوئی باغیرت امریکی شہری اسماء بن لادن کی طرح جنگ آکر غیر ملکی افواج کے تسلط سے اپنے وطن کو نجات دلانے کیلئے ہتھیار اٹھا لے تو کیا سفیر محترم اسے بھی دہشت گرد قرار دے دیں گے؟ اور آئندہ کیا، امریکہ تو ماضی میں اس مرحلے سے گزر چکا ہے کہ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف امریکی قوم نے اسی طرح ہتھیار بکاف ہو کر آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اور جناب ولیم بی مائلم شاید یہ یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ امریکہ جس طرح آزادی کی بات کر رہا ہے خود اس کی اپنی آزادی کے پیچھے اسماء بن لادن طرز کے کئی ”دہشت گرد“ تاریخ کے جھروکوں سے جھانک رہے ہیں۔ اور صرف برطانوی استعمار کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا عمل نہیں بلکہ افغانستان میں طالبان اور شامی اتحاد کی بامی جنگ کی طرح بلکہ اس سے کہیں خوفناک خانہ جنگی بھی امریکی آزادی کی بنیادوں میں صاف دکھائی دے رہی ہے۔

لہذا اپنے لیے الگ اور دوسروں کیلئے الگ معیار قائم نہ کیجئے، اور جن مرحل سے خود گزر کر اس مقام پر بیٹھے ہیں، دوسری قوموں کو ان مرحل سے گزرتے ہوئے ان پر بچھتیاں کس کراور انہیں طعن و نظر کا نشانہ بنائے کہ خود اپنے ماضی کی نفع نہ کیجئے کہ یہ زندہ اور انصاف پسند قوموں اور افراد کا شیوه نہیں ہوتا۔

## طالبان کی اسلامی حکومت اور ڈاکٹر جاوید اقبال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۳ اپریل ۲۰۰۰ء

معاصر قومی اخبار روزنامہ نوائے وقت نے گذشتہ روز ادارتی شذرہ میں یہ خوشنگوار اکٹھاف کیا ہے کہ فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے گذشتہ دونوں افغانستان کا دورہ کیا ہے اور واپسی پر اکٹھاں میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے

طالبان کے اسلامی انقلاب کی تعریف کی ہے اور اسے ایک کامیاب انقلاب قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں امن قائم کیا آج کے دور میں اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مذکورہ ادارتی شدراہ کے مطابق ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس ارادے کا اظہار کیا ہے کہ وہ پاکستان میں طالبان اور ان کے طرز حکومت کے بارے میں پائی جانے والی غلط نہیں کے ازالہ کیلئے آواز اٹھائیں گے۔

جہاں تک طالبان کے طرز حکومت کا تعلق ہے اس میں کوئی مشک نہیں کہ انہوں نے سادگی، قناعت اور فرض شناسی کے حوالے سے ان عادل حکمرانوں کی یاد تازہ کر دی ہے جن کا تذکرہ ہم اب تک صرف کتابوں میں ہی پڑھتے آرہے ہیں۔ خود راقم الحروف کو بھی طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد دوبار افغانستان جانے کا موقع ملا ہے اور امارت اسلامی افغانستان کے سربراہ ملا عمر سے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ مجھے ان کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی بے تکلفی، قناعت اور اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ بے پاک کمٹھنٹ ہے جس کیلئے وہ دنیا کی ہر قوت اور ہر دباؤ کا سامنا کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے معیار زندگی کو تنا آگے بڑھایا ہی نہیں کہ انہیں عالمی مالیاتی اداروں کے سامنے جھوپی پھیلانے پر مجبور ہوتا پڑتے۔ جہاں ایک وفاقی وزیر کی تختواہ ہزار بارہ سورو پے پاکستانی کے لگ بھگ ہوا اور جہاں وفاقی وزیر کے ناشتہ میں دو دھکے بغیر چائے کے ساتھ رات کی بیچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے ہوں وہاں ولیمک اور آئی ایف کیا کریں گے؟ اور یہی راز ہے طالبان کی کامیابی کا کہ انہوں نے اپنی چادر مپ رکھی ہے اور اپنے پاؤں کو اس کی حدود کے اندر رہنے کا عادی بنالیا ہے۔

اسی طرح افغانستان جیسے فساد زده ملک میں جہاں ایک شہر میں درجنوں مسلسل گروپ باہم متصادم رہتے ہیں اس درجہ کا امن قائم کرنا کہ طالبان کی ہر حرکت کو ناندہ انداز میں جانچنے والا اور لذمیدیا بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے بلاشبہ اس دور میں اسلام کا ہمجزہ ہے اور اس حقیقت کا عملی اظہار ہے کہ انسانی معاشرہ میں امن کی ضمانت اسلامی احکام و قوانین کے عملی نفاذ کے ذریعے کی دی جاسکتی ہے۔

طالبان نے امن کے قیام کیلئے کوئی لمبی چڑھی محنت نہیں کی اور نہ ہی مختلف ملکوں میں کمپنیں بھیج کر ان کے نظاموں کو استدی کیا ہے بلکہ صرف دو کام کیے ہیں۔

1. ایک یہ کہ تمام شہریوں سے اسلحہ واپس لے کر انہیں نہ تکر دیا،

2. دوسرا یہ کہ معاشرتی جرائم پر قرآن و سنت کی بیان کردہ شرعی سزاوں کو عملانافذ کر دیا ہے۔

اس بارے میں انہوں نے کسی روز عایت سے کام نہیں لیا، کسی وی آئی پی کا لحاظ نہیں کیا اور قانون کے سامنے کسی فردیاگروہ کے امتیاز کو سر نہیں اٹھانے دیا۔ اس لیے وہ یہ بات کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ ان کا زیر حکومت علاقہ اس وقت دنیا کا سب سے پر امن علاقہ ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال ہمارے ملک کے معروف دانشور ہیں، صاحب علم ہیں، صاحب مطالعہ ہیں اور علامہ محمد اقبال کے فرزند کی حیثیت سے امتیازی تعارف رکھتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام اور اسلام کی تشریع کے حوالے سے اب تک ان کی

سوچ جمہور علماء سے ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ انہیں جب بھی موقع ملا ہے انہوں نے ترکی کے سیکولر انقلاب کی حمایت کی ہے اور اسی طرز کے ”اجتہاد“ کو پاکستان میں فروغ دینے کی بات کی ہے جسے پاکستان کے دینی حقوق میں کبھی اپچھانیں سمجھا گیا اور خود ہم نے بھی متعدد مواقع پر اپنے مضامین میں ان کے انکار پر کھلے بندوں تقید کی۔ لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال کے دورہ افغانستان کی اس اچانک خبر نے جہاں خوشی کے ایک نئے احساس سے دوچار کیا ہے وہاں اس حقیقت کے ایک بار پھر اور اس کا موقع بھی فراہم کیا ہے کہ محض سنی سنائیاتوں اور میڈیا کی پھیلائی ہوئی خبروں کی بنیاد پر کسی معاشرہ اور قوم کے پارے میں تاثرات قائم کر لینا درست طرز عمل نہیں ہوتا بلکہ صحیح تاثر وہاں کے حالات کا خود مشاہدہ کر لینے کے بعد ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ ہم ایک طرف تو ڈاکٹر جاوید اقبال کے تفصیلی تاثرات کے منظر ہیں کہ انہوں نے جو کچھ افغانستان میں دیکھا اس کے پارے میں ان کی ثابت یا نفی رائے کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ وہاں سب کچھ تو مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہو گا، کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی ہوں گی اور ان کی شناخت ہی بھی اہل دانش کا کام ہے بشرطیکہ وہ خلوص دل سے اصلاح احوال کے جذبہ کے ساتھ ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم دیگر اہل دانش سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ طالبان اور افغانستان کے پارے میں ولد میڈیا کے تھروں اور خروں پر انحصار کرنے کی بجائے خود وہاں جائیں، حالات کا مشاہدہ کریں، انقلاب کا تجزیہ کریں اور اس کی خوبیوں کا فراخ دلی سے اعتراض کرنے کے ساتھ ساتھ کمزوریوں اور خامیوں کی نیک نیت کے ساتھ شناخت ہی کریں۔ آخر ہم بھی نصف صدی سے ملک میں اسلامی نظام کا خواب کیچہ رہے ہیں اور اس کیلئے کسی ماڈل کی تلاش میں ہیں۔ اس ماڈل سسٹم کی تلاش میں مغرب اور مشرق کے کئی ملکوں میں ہمارے دانشوروں کے وفد جا چکے ہیں اور کئی نظاموں کا ہم نے مطالعہ کیا ہے۔ یہ قریب اور پڑوس کا نظام بھی ایک نظر دیکھ لیں، ہو سکتا ہے کہ ہمارا کام یہیں بن جائے۔

## جہادی تربیتی کیمپ: وزیر داخلہ کے نام کھلا خط

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۸ اپریل ۲۰۰۰ء

بعد از سلام مسنون!

گزارش ہے کہ گذشتہ روز ایک قوی اخبار نے آجنباب کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ ”امریکہ کی طرف سے پاکستان سے دہشت گردی کی روک تھام کیلئے اقدامات کرنے کے مطابق پر لندن میں اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے وزیر داخلہ نے صحافیوں کو بتایا کہ انہوں نے طالبان کی حکومت پر وضاحت کر دیا ہے کہ وہ اپنی سر زمین پر موجود تمام ترتیبیں کیپ بند کر دے جہاں پر پاکستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مسلح تربیت حاصل کرتے ہیں۔“ وزیر داخلہ معین الدین حیدر نے کہا ہے کہ

”انہوں نے سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد پر بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ قتل و غارت گری بند کر دیں اور اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو حکومت ان کے خلاف سختی سے نہٹے گی۔“

میں اس سلسلہ میں آنجلاب کی توجہ چند حقائق کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ افغانستان میں موجود عسکری تربیت کے کیمپوں اور طالبان کی اسلامی حکومت کے بارے میں ایک عرصہ سے عالمی سطح پر اس تاثر کو جاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کیمپوں میں دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے اور طالبان حکومت اس دہشت گردی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں سنی شیعہ کشمکش اور باہمی قتل و غارت کے عنصر کو شامل کر کے اس تاثر کو یہ رخ دیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کرنے والے سب لوگ انہی کیمپوں میں تربیت پاتے ہیں اس لیے پاکستان میں فرقہ وارانہ امن کے قیام کیلئے یہ ضروری ہے کہ افغانستان کے ان جہادی تربیتی مرکزوں کو بند کر دیا جائے۔

یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے جو مغربی میڈیا اور مغرب کی سیکولر ایمیل مقتضم طور پر پھیلا رہی ہیں اور امریکہ اس میں قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے جس نے جنوبی ایشیا میں اپنے استحصالی اور استعمار پسندانہ عزائم کو بروئے کار لانے کیلئے یہ مکنیک اختیار کی ہے اور میں آنجلاب سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کا اصل منظر نہیں ہے جو درلٹ میڈیا کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور آپ جیسے سنجیدہ حضرات نے مجھی اگر اس کی تائید شروع کر دی ہے، اس سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ امریکہ جنوبی اور سطحی ایشیا کے حوالے سے اپنے ایجنسی کے لیے اس خط کے حکمران طبقہ کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور جنوبی ایشیا کے دورہ سے صدر کائنٹن کے خالی ہاتھ واپس جانے کا تاثر امریکی ذرائع ابلاغ کی طرف سے طے شدہ پالیسی کے تحت اندر وطن خانہ طے ہونے والے معاملات پر پر دہ ڈالنے کیلئے دیا جا رہا ہے۔

جناب والا! امریکہ اس خط کے مبنی میں جو کچھ چاہتا ہے وہ یقیناً آپ سے مخفی نہیں ہو گا، میں یاد ہانی کے طور پر بعض اہم امور کا ذکر اس عربی میں مناسب سمجھتا ہوں:

- امارت اسلامی افغانستان کی حکومت نے مغربی ثقافت اور اقوامِ متحده کے منشور کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن و سنت اور فرقہ اسلامی کی بنیاد پر خالص اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا جو عزم کر رکھا ہے وہ امریکہ کیلئے قبل قبول نہیں ہے اور امریکہ طالبان پر دباؤ ڈال کر انہیں ”وسیع الہبیاد حکومت“ کے نام پر ایک ایسی مشترکہ حکومت کا حصہ بننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے جو دنیا کی بہت سی دیگر مسلم حکومتوں کی طرح ”اسلام اسلام“ کا راگ تو الاپتی رہے مگر افغانستان میں اقوامِ متحده کے منشور کے نفاذ اور مغربی ثقافت اور کلچر کے فروغ میں رکاوٹ نہ بنے۔

- اس خط کی معيشت پر پہلے سے حاصل بالادستی کو امریکہ ”ازادانہ تجارت“ اور ملٹی بیٹھنل کمپنیوں کے ذریعے مکمل اجراء داری اور کنٹرول میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور چین سمیت کسی بھی دوسری قوت کے اس میں در آنے کے امکانات کو مکمل طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔

- امریکہ چین کے خلاف بھارت کی سربراہی میں تحدہ مجاز کے قیام میں اسلامی جمہوریہ پاکستان اور امارتِ اسلامی افغانستان کو رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان رکاوٹوں کو اس قدر کمزور کر دینا چاہتا ہے کہ وہ امریکہ یا بھارت کے کسی بھی اقدام کی راہ میں کسی درجہ میں بھی حائل نہ ہو سکیں۔
- امریکہ اور بھارت کو مشترک طور پر پریشانی یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کے خلاف جو مجاہدین سالہا سال سے بردآزمائیں اور جن کی جدوجہد اور قربانیوں کی وجہ سے مسئلہ کشمیر ایک بار پھر عالمی ایجمنٹے میں اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے ان مجاہدین نے افغانستان کے انہی تربیتی مرکزیں ٹریننگ حاصل کی ہے اور ان تربیتی مرکزوں کو بند کرائے بغیر کشمیری مجاہدین کی پلائی لائن کو کھانا نہیں جاسکتا اور نہ ہی مسئلہ کشمیر کی اہمیت کو کم کیا جاسکتا ہے۔
- امریکہ کو یہ بھی پریشانی ہے کہ افغانستان میں جو تربیتی مرکز خود اس کے تعاون سے قائم ہوئے تھے اور جن مرکز نے افغان قوم کو روپی افواج کے مقابلہ میں صفائحہ کے سویت یوین کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تھا ان مرکزوں سے دنیا بھر کے دیگر مسلم مجاہدین نے بھی عسکری تربیت حاصل کر لی ہے اور بوسنیا، کوسوو، فلسطین، کشمیر، چینیا، مورو، ارakan اور صومالیہ وغیرہ میں اسلام کی سر بلندی کے نام سے صفائحہ ہو چکے ہیں جس سے دینی حلقة ان کے ساتھ بھر پور تعاون کر رہے ہیں جس سے مسلم دنیا میں جہاد کا وہ عمل اور جذبہ ایک بار پھر عالمی سطح پر منظم ہو رہا ہے جسے ختم کرنے کیلئے مغربی طاقتیں دو صدیوں سے اپنے تمام وسائل کے ساتھ مصروف کار رہی ہیں مگر ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود فلسطین سے انڈونیشیا تک اور چینیا سے صومالیہ تک پوری دنیا میں پھر سے جہاد کے نعرے پورے جوش و خروش کے ساتھ گونج رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے امریکہ افغانستان کے ان تربیتی مرکزوں کو جلد بند کرنے کیلئے بے چین ہے۔

جناب وزیر داخلہ! جہاں تک پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کا تعلق ہے یہ بلاشبہ انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے اور اس کی روک تھام کیلئے حکومت پاکستان اور تمام تر قومی حقوقوں کو سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کرنی چاہیے۔ لیکن اس فرقہ وارانہ قتل و غارت کا ذمہ دار افغانستان کے تربیتی کمپیوں کو ٹھہراانا اور اس کی آڑ میں طالبان حکومت سے ان مرکزوں کا بندش کا مطالبہ کرنا سراسر انصافی اور ظلم ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان کمپیوں سے تربیت پانے والے کچھ افراد پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت میں ملوث ہوئے ہوں گے لیکن یہ ادارے میں ہوتا ہے۔ اگر پاکستان کی جیلوں اور مقدمات کے ریکارڈ کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لے لیا جائے کہ ملک بھر میں قتل و غارت کرنے والے افراد نے اسلحہ چلانے کی ٹریننگ کہاں کھاں حاصل کی ہے تو ان میں بقیباً ایسے افراد تک آئیں گے جنہوں نے اسلحہ کی تربیت پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مرکزوں میں حاصل کی ہو گی۔ لیکن کوئی بھی باہوش شخص محض اس بنا پر پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مرکزوں میں بدآمنی اور قتل کا ذمہ دار قرار نہیں دے گا اس لیے کہ چند افراد کی

انحرافی کارروائیوں کو اداروں اور مرکز کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا۔ اسی طرح افغانستان کے تربیتی مرکزوں کو بھی پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا باعث اور ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے اصل عوامل اور سرچشمے کچھ اور ہیں اور اگر آپ ان اسباب و عوامل کی نشاندہی اور سدباب میں سنجیدہ ہیں تو میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سپریم کورٹ کے نجی کی سربراہی میں اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن قائم کیا جائے جو آزادانہ اکواڑی کے ذریعے سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ کے اسbab و عوامل اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے سرچشمتوں کی نشاندہی کرے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آزادانہ اعلیٰ سطحی عدالتی اکواڑی کے ذریعے پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کے فروغ میں افغانستان کے تربیتی مرکزوں کا کوئی کردار سامنے آیا تو اس کے سدباب اور روک تھام کیلئے ہر اقدام کی حمایت کی جائے گی مگر محض امریکی رپورٹوں کی بنیاد پر افغانستان کے تربیتی مرکزوں کو پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا ذمہ دار قرار دے کر ان کی بندش کیلئے طالبان حکومت پر کسی بھی قسم کے دباؤ کی پالیسی کو ہم جہاد کے خلاف امریکی ہم کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس کی کسی درجہ میں تائید کیلئے تیار نہیں ہیں۔

جناب معین الدین حیدر! میں آپ کو چیف ایگزیکیوٹیو جزل پرویز مشرف کے وہ ریمارکس یاد دلانا چاہتا ہوں جو انہوں نے جووری ۲۰۰۰ء کے وسط میں امریکی سینٹروں کے دورہ پاکستان کے موقع پران سے گفتگو کے دوران دیے تھے اور جنہیں ایک قوی اخبار نے ان الفاظ میں رپورٹ کیا تھا کہ

”چیف ایگزیکیوٹیو جزل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے وفد کو دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جاسکتا ہے جیسے روں کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جاسکا تھا۔ اعلیٰ عسکری ذرائع کے مطابق جزل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں بنیادی فرق کو سمجھنا ہو گا۔ ان اعلیٰ عسکری ذرائع کے بقول جزل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتایا کہ پاکستان نے دہشت گردی اور ہائی جیکنگ کی ہمیشہ مدت کی ہے اور کرتا ہے گا تا ہم جہاں تک جہاد کا تعلق ہے یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔ دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا ذمہ بھی فریضہ نہ جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہادی تنظیموں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیموں کی شیمیہ ہو یا چیختیا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جاسکتا۔“

جناب وزیر داخلہ! جہاد اور دہشت گردی کے حوالے سے ہمارا موقف بھی یہی ہے اور ہم اس پر بدستور قائم ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف آپ کے ہر منصافانہ اقدام کی حمایت کریں گے مگر دہشت گردی کے خلاف کارروائی کے نام پر جہاد کے عمل، جہادی تحریکات اور جہادی تربیتی مرکزوں کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی پاکستان کے دینی حلقوں کیلئے قطعی طور پر قابل قبول نہیں ہوگی۔ امید ہے کہ آجنب اسی پالیسی ترجیحات میں جہاد اور دہشت گردی کے اس بنیادی فرق کو ملاحظہ کر کر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں گے۔

## پاکستان، افغانستان، ایران کی کنفیڈریشن کی تجویز

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۸ اپریل ۲۰۰۰ء

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گذشتہ روز لاہور میں منعقدہ ایک تقریب میں اپنے دورہ افغانستان کے تاثرات بیان کرتے ہوئے تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان، افغانستان اور ایران پر مشتمل کنفیڈریشن قائم کی جائے اور تینوں ملک اپنے سائل کیجا کر کے عالم اسلام کے وسیع تراجمدی طرف پیش رفت کا آغاز کریں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے طالبان کی اسلامی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے کہہا ہے کہ طالبان نے افغانستان میں مثالی امن قائم کیا ہے اور وہ انہائی مشکلات اور تنکالیف کے باوجود پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ہمیں احساس تک نہیں ہے، اس لیے ان کی تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں عمومی سطح پر افغانستان کی حکومت اور عوام کے ساتھ تعاون کیلئے ”افغان فند“ قائم کیا جائے اور طالبان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جائے۔ اس سے قبل تنظیم اسلامی پاکستان کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد بھی پاکستان اور افغانستان پر مشتمل کنفیڈریشن قائم کرنے کی تجویز پیش کرچکے ہیں مگر ان کی تجویز میں ایران کا ذکر نہیں تھا جبکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے پاکستان اور افغانستان کی اس مجموعہ کنفیڈریشن میں ایران کو شامل کرنے کی تجویز بھی دی ہے۔

جہاد افغانستان کے نتیجے میں وسطیٰ ایشیا سے رویٰ استعمار کی پہنچی کے بعد وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے مستقبل کے سیاسی نقشے کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے اور ہر طبقہ کے اہل دانش اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سلسلہ میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ دہلی سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی مقالے صورتحال کے اس رخچی نشاندہی کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ بھارت کے انہائی پسند ہندوؤں میں وسطیٰ ایشیا، افغانستان اور پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں اس خط میں مغل ایسا پسر دوبارہ زندہ تو نہیں ہو رہا؟ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر خود راقم الحروف کا وجدان بھی یہی کہتا ہے کہ ایک طرف پاکستان، افغانستان اور وسطیٰ ایشیا میں بڑھتے ہوئے روایط اور دوسری طرف جنوبی ہند میں ہندو انہیا پسندی کی روایغروں میں ہوتی ہوئی جذباتی تحریکات سے یوں لگتا ہے جیسے ہم پانی پت کی چوتھی اور آخری لڑائی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں جو غالباً وہی لڑائی ہو گئی جسے بعض احادیث کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”عنودہ ہند“ سے تعبیر کیا ہے اور جس کے بارے میں بعض اللہ والوں کی پیشین گوئیاں تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہیں کہ یہ فیصلہ کن اور آخری جنگ ہو گئی جس کے بعد اس خطے میں اسلام کا پرچم ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ لہرائے گا اور مشرق و سطحی اور مشرق بعید کی اسلامی قوتوں کے درمیان جنوبی ایشیا کی یہ پٹی جو خلیج کے طور پر حائل دکھائی دیتی ہے مکمل طور پر کاٹ دی جائے گی۔

اس لیے تاریخی عمل کے ایک منطقی مرحلہ کے طور پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک ایسا تعلق ناگزیر دکھائی دیتا ہے جو دونوں کو ایک متحد قوت کی شکل دے دے اور دونوں کی قوت وسائل اور توانائیاں کیجا ہو کر ایک بار پھر اسی طرح جنوبی ہند کی انہیا پسند اور جنوبی ہندو قوت کے سامنے متحد ہو کر صرف بندی کریں جس طرح رہوں کی خوفناک بیخار کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی دعوت پر دوائی افغانستان احمد شاہ عبدالی نے پانی پت کے میدان میں معرکہ پاکر کے

مرہٹوں کی قوت کو توڑ کر کھدیا تھا۔ مگر اس میں ایران کی شرکت کی بات تاریخی پس منظر کے حوالے سے ہماری سمجھے بالاتر ہے اور ہم اس کے بارے میں اپنے تحقیقات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔

ماضی کاریکاریوں کہتا ہے کہ ایران کے صفوی حکمرانوں نے جہاں ایک طرف ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف معزز کر کارزار ہر دور میں سرگرم رکھا، اب وہ سلطی ایشیا میں اپنے اثرور سونگ کو بڑھانے اور متحده ہندوستان کی مسلم حکومت کو خلافت عثمانیہ سے کاٹ کر کھنکی پالیسی پر بھی مسلسل عمل پیرا رہے، اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہی پران افغانوں کے کی حکومت قائم نہ ہونے پائے جو مذہبی طور پر اہل السنۃ والجماعۃ کے خالص رجحانات کے حامل تھے۔ چنانچہ افغانوں کے مقابلہ میں مغل حکمران ہر دور میں ایران کے صفوی بادشاہوں کے منظورِ نظر رہے اور بابر بادشاہ کو نہ صرف سرقدار کے قبضہ میں صفویوں کا تعاون حاصل رہا بلکہ شیرشاہ سوری کے ہاتھوں بابر کی شکست کو اس کے بیٹھے ہمایوں کے ذریعے دوبارہ شکست میں تبدیل کرنے میں بھی صفوی بادشاہت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ جبکہ شیرشاہ سوری کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اہل سنت کے عقائد اور رجحانات کا حامل تھا اور اس کے شاہی سماں پر ایک طرف اس کا نام بطور بادشاہ درج تھا اور دوسرا طرف حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کے اسماءؓ گرامی کندہ تھے جو شیرشاہ سوری کی حکومت کے مذہبی رجحانات کی نشاندہی کر رہے تھے۔

تاریخؓ کے ایک طالب علم کے طور پر میر امطاع الدین یہ کہتا ہے کہ اگر شیرشاہ سوری کے جانشینوں کو ہمایوں کے ہاتھوں شکست نہ ہوتی اور افغان حکومت کی جگہ دہلی میں مغل حکومت قائم نہ ہوتی تو بر صغیر پاک و ہندو بلکہ دیش میں اسلام ایک اسلامی نظریاتی حکومت کے طور پر سامنے آتا، اور اس خطے کا نہ صرف خلافت عثمانیہ کے ساتھ باقاعدہ تعلق قائم ہو جاتا بلکہ دعوت و تبلیغ کے مسلسل ماحول کی وجہ سے یہ صورت حال یقیناً نہ سامنے آتی کہ انگریزوں کے ہاتھوں مغل حکومت کے خاتمه کے بعد بھی اس خطے میں ہندوؤں ہی کی اکثریت باقی رہتی۔ مگر افغانوں کے مقابلہ میں مغلوں کا مزاج نسبتاً سیکولر تھا جنہوں نے مذہب کی بجائے علاقائی کلچر کے فروع کو ترجیح دی اور اسلامی حکومت کی راہ ہموار کرنے کی بجائے مسلم حکومت کے ٹائل پر قیامت کرتے ہوئے پورے جنوبی ایشیا میں اسلام کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ شیرشاہ سوری کی حکومت کے خاتمه میں یقیناً اس کے جانشینوں کی نااہلی کا بڑا خل تھا مگر اس میں سب سے اہم کردار ایران کے صفوی حکمرانوں کا رہا ہے۔ اور اس کے بعد بھی دہلی کے معاملات میں ان کی مداخلت کا یہ حال تھا کہ اور گزریب عالمگیر کی اسلامی حکومت کو کامیاب ہوتا دیکھ کر اس کے بیٹھوں اور اہل خاندان کو ور غلانے اور پھر دہلی پر نادر شاہ کے حملہ، وحشیانہ قتل عامہ اور لوٹ مار کے مرحل طے کر جانے میں بھی اپنی حکمرانوں کو کوئی عار محسوس نہیں ہوئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دلی پر جب تک مسلمان حکومت رہی اسے ایرانیوں کی مداخلت کا ہمیشہ سامنا رہا۔

چنانچہ جب میرے جیسا طالب علم اس تاریخ کو پڑھتا ہے تو اسے یہ سن کر ہی پریشانی ہونے لگتی ہے کہ کیا پاکستان اور افغانستان کی حکومتیں ایک بار پھر اسی دور میں واپس چلی جائیں گی اور ہمارے مقدر میں کیا کوئی اور نادر شاہ بھی تاریخؓ نے اپنے دامن میں چھپا رکھا ہے؟ اس لیے محترمڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے بصد ادب و احترام گزارش ہے کہ عالم اسلام کے اتحاد کیلئے ان کا جذبہ اپنی جگہ قابل قدر ہے اور بلاشبہ یہ ان کے عظیم باپ علامہ محمد اقبال کی خواہش اور آرزو بلکہ ہر

پاشور اور حساس مسلمان کی تمنا ہے، مگر اس کیلئے تباویز کا خالک مرتب کرتے ہوئے زمینی حقائق اور تاریخی پس منظر کو نظر انداز نہ کریں۔ کیونکہ ماضی کے تلتھ تجربات سے آنکھیں بند کرنی جائیں میں مستقبل کے نقشے میں صحیح رنگ بھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

## جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے دورہ افغانستان کے تاثرات

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۰ء

مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال کے فرزند اور لاہور ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گذشتہ دنوں افغانستان کا دورہ کیا ہے اور واپسی پر لاہور میں ایک تقریب کے دوران اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انہوں نے افغانستان کے انقلاب کو ایک کامیاب اسلامی انقلاب قرار دیتے ہوئے کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں امن قائم کیا ہے وہ اس دور میں اور کوئی نہیں کر سکا اور یہ اسلامی احکام کے نفاذ کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان اسلام اور پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے ہمیں مغرب کے دباؤ کے تحت طالبان کو ناراض نہیں کرنا چاہیے اور ان سے ہر ممکن تعاون کرنا چاہیے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۳ پریل ۲۰۰۰ء کے مطابق ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ افغان خواتین کے بارے میں مغرب منفی پر اپیگنڈا کر رہا ہے اور طالبان ہماری جنگ لڑ رہے ہیں جس کا یہیں احساس تک نہیں۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں وسیع البناء حکومت ہمارے مفاد میں نہیں ہے اور ہم نے مغرب کے کہنے پر طالبان کا ساتھ چھوٹا تو ہمیں شدید نقصان ہو گا۔

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کا شمار ہمارے ملک کے لبرل دانشوروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہمیشہ علماء کے طبقہ کی مخالفت کی ہے، اور اجتہاد کے نام پر اسلامی احکام و قوانین کی جدید تعبیر و تشریح کی بات کی ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر جاوید اقبال تک کی ان اصلاحات کی بھی حمایت کرتے رہے ہیں جن کے تحت مصطفیٰ کمال اتنا ترک نے خلافتِ عثمانیہ اور اس کے ساتھ اسلامی قوانین کے پورے نظام و ترکی سے اکھاڑ پھیکا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کا دورہ افغانستان اور ڈاٹی مشاہدہ کی بنیاد پر ان کی طرف سے طالبان کی حکومت کی حمایت کا یہ روحان بلاشبہ حالات میں بہت بڑی تبدیلی کی غمازی کرتا ہے، اور طالبان کی اسلامی حکومت کی مخلصانہ پالیسیوں کی شہادت دیتا ہے۔

اس لیے ملک کے دیگر دانشوروں سے بھی یہی گزارش کریں گے کہ وہ مغربی میڈیا کے پروپیگنڈا پر انحصار کرنے کی وجہے خود افغانستان جا کر حالات اور حقائق کا مشاہدہ کریں اور اپنے مظلوم اور غیور افغان مسلم بھائیوں کو اس مشکل اور نازک مرحلہ سے وقار اور کامیابی کے ساتھ باہر نکالنے میں ان سے عملی تعاون کی کوئی صورت نہیں۔

## جہاد اور قومی اتفاق رائے

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- مئی ۲۰۰۰ء

راجہ انور صاحب محترم کی دوسری شکایت یہ ہے کہ جہاد افغانستان کے بارے میں ان کے سوال کا جواب تشنہ رہ گیا ہے۔ اگر وہ جواب کے حسب منشاء ہونے کی بات کرتے تو مجھے مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی مگر جواب کے تشنہ رہ جانے کی بات ہوئی ہے تو اس سلسلہ میں مزیدوضاحت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔

راجہ صاحب محترم کو جہاد افغانستان کو جہاد تسلیم کرنے میں اشکال ہے، وہ اس کیلئے یہ دلیل دے رہے ہیں کہ جہاد کا یہ فتویٰ کسی مجاز اتحاریٰ نے نہیں دیا تھا اور مجاز اتحاریٰ ان کے نزدیک صرف ایک اسلامی حکومت ہے، اور اگر اس کا وجود نہ ہو تو قومی اتفاق رائے یا افغانوں کی زبان میں ”لو یہ جرگہ“ اوس کی جگہ دی جاسکتی ہے، لیکن وہ علماء کو یہ حق دینے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ وہ جہاد کا فتویٰ دیں۔ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ ان سے فتویٰ لینے کے بعد جہاد کا اعلان کرے، اور نہ ہی حکومتی اتحاریٰ کی عدم موجودگی میں علماء کرام کو یہ فتویٰ دینے کا اختیار حاصل ہے، اس لیے ان کے نزدیک جہاد افغانستان کو جہاد کہنا درست نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں رقم الحروف نے راجہ صاحب کے ایک سوال پر عرض کیا تھا کہ یہ بات درست ہے کہ اسلامی حکومت کی موجودگی میں جہاد کے اعلان کا اختیار صرف حکومت کا حاصل ہے اور اس کے سوا کسی اور کو یہ حق نہیں ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت کا وجود نہ ہو اور کفار کے غلبہ و تسلط کا خطرہ پیش آجائے، یا کوئی برائے نام مسلم حکومت موجود ہو اور وہ غلپرپانے والے کفار کے ہاتھوں کٹھپتیں بن کر رہ جائے تو ملی آزادی اور قومی خود مختاری کے تحفظ کیلئے جہاد کے اعلان کا حق علماء کو منتقل ہو جاتا ہے، اور یہ صرف حق اور اختیار نہیں ہوتا بلکہ ذمہ داری اور فرض بن جاتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ملت کی قیادت کرتے ہوئے حملہ آوروں کے خلاف صفت آراہو جائیں۔

اس سلسلہ میں واضح شعری اور فقہی احکام موجود ہیں، لیکن ان سے قطع نظر ایک مشترک اصول علمی سطح پر بھی تسلیم شدہ ہے کہ ”اتھاریٰ“ کا خلا کبھی کسی جگہ نہیں رہتا۔ اور اگر کہیں اصل اتحاریٰ موجود نہ رہے تو اسے پر کرنے کیلئے جو بھی آگے آجائے اور اس کے فرائض سنبھال لے، خلا اور تعطیل سے بچھے کیلئے اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ ہم اصول کو اپنی قومی زندگی میں کئی بار بھگت چکے ہیں اور اس وقت بھی اسی مرحلہ میں ہیں۔ میں نے اس سلسلہ میں بر صغیر پاک و ہند کی جنگ آزادی کی مثال دی تھی کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کے اقتدار پر قبضہ کر کے مغل بادشاہ کو ایک کٹھپتی کی حیثیت دے دی تو برائے نام مغل حکمران کے موجود ہوتے ہوئے بھی شاہ ولی اللہ دہلویٰ کے جانشین شاہ عبدالعزیز محمد ث دہلویٰ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور اسی فتویٰ کی بنیاد پر آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی۔

میری گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر مخدہ ہندوستان میں علماء کا فتویٰ برطانوی استعمار کے خلاف جہاد آزادی کی بنیاد بن سکتا ہے تو افغانستان میں بھی رو سی استعمار کے خلاف علماء کا فتویٰ جہاد کی بنیاد قرار پا سکتا ہے، اور اس کے شرعی جہاد ہونے میں شبک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ورنہ اگر افغان علماء کو جہاد کا فتویٰ دینے کا حق نہیں تھا تو شاہ عبدالعزیز دہلویٰ اور دوسرے

علماء ہند کو بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا، اور راجہ صاحب کے اس فلسفہ کے مطابق بر صغیر پاک و ہند کا جہاد آزادی بھی شرعی جہاد کی بجائے فساد قرار پاتا ہے۔ میں نے راجہ صاحب سے ان دونوں کے درمیان فرق پوچھا تھا مگر انہوں نے اس کا کوئی جواب دینے کی بجائے میرے جواب کو تثنیہ قرار دینے میں عافیت سمجھی ہے۔

میرے نزدیک راجہ صاحب کی اصل مجبوری یہ ہے کہ ان کے گراموفون کی سوتی کامل پرائی کر رہے گئی ہے اور اس سے آگے یا پیچے ہونے کیلئے تیار نہیں ہے۔ ورنہ وہ اگر کابل کی سڑک سے بلند ہو کر تھوڑے سے وسیع تناظر میں جائزہ لے لیں تو مسئلہ کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ عالم اسلام میں استعماری قوتوں کے خلاف جہاں بھی آزادی کی جنگ جہاد کے عنوان سے لڑی گئی ہے وہاں اصل قوت محکمہ علماء ہی کی تھی اور انہی کے فتویٰ پر جہاد آزادی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ بر صغیر پاک و ہند اور افغانستان سے ہٹ کر ایک اور مسلم ملک کی جنگ آزادی پر نظر ڈال لیں جس نے مسلسل جہاد آزادی کے ذریعے فرانسیسی استعمار سے آزادی حاصل کی ہے۔ میری مراد الجزاں سے ہے جہاں اشیخ عبد الحمید بن بادیسُ اور اشیخ بشیر الابراهیمیؒ قیادت میں علماء کرام نے فرانسیسی استعمار کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور خود بھی اس جہاد آزادی میں عملًا شریک ہوئے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ تاریخی واقعہ قاریئن کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ اشیخ عبد الحمید بن بادیسؒ جن کا شمار الجزاں کی جنگ آزادی میں بن بیبلہ، یوم الدائن اور بوضیاف کے ساتھ صفت اول کے راہنماؤں میں ہوتا ہے، حضرت مولانا سید حسین احمد مدینیؒ کے شاگرد ہیں اور انہی کے حکم پر انہوں نے الجزاں کی جنگ آزادی میں علماء کرام کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ وہ فرانسیسی استعمار کے مظالم کی وجہ سے بھرت کر کے الجزاں سے مدینہ منورہ چلے گئے تھے، یہ دور تھا جب حضرت مولانا سید حسین احمد مدینیؒ صبح نبویؒ میں حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ بن بادیسؒ نے ان سے حدیث شریف پڑھ کر اجازت حاصل کی تو حضرت مدینیؒ نے انہیں حکم دیا کہ وہ مدینہ منورہ میں قیام کرنے کی بجائے اپنے وطن الجزاں واپس جائیں اور علماء کرام کو منظم کر کے فرانسیسی استعمار کے خلاف جہاد آزادی میں حصہ لیں۔ چنانچہ شیخ بن بادیسؒ نے استاد کے حکم پر مدینہ منورہ میں رہنے کا ارادہ ترک کیا اور الجزاں واپس جا کر علماء کرام کو جہاد آزادی کیلئے تیار کیا۔

راجہ صاحب محترم کا کہنا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی اتحاری موجود نہ ہو تو جہاد کے فتویٰ کیلئے قومی اتفاق رائے ضروری ہے، ورنہ وہ شرعی جہاد نہیں ہو گا۔ راجہ صاحب سے گزارش ہے کہ یہ بات قطعی طور پر قابل عمل نہیں ہے اور اس کے علاوہ شرعی احکام اور ملی روایات کے بھی منافی ہے۔ ملت اسلامیہ کی تحریکات آزادی میں کسی جگہ بھی اس کا اہتمام ضروری نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی کسی ملک میں اس کا اہتمام کرنا ممکن تھا۔ بر صغیر پاک و ہند میں اگر شاہ عبد العزیز دہلویؒ جہاد کا فتویٰ دینے سے پہلے قومی اتفاق رائے کے حصول کیلئے نکل کھڑے ہوتے تو یہ آج تک حاصل نہ ہو پاتا۔

اور اگر بر صغیر پاک و ہند، افغانستان اور الجزاں کے حوالے سے بات راجہ صاحب کی سمجھ میں نہ آرہی ہو تو اس تناظر کا دائرہ تھوڑا سا اور وسیع کرتے ہوئے ایک اور حوالے سے راجہ صاحب سے یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ جب دینام میں

امرکی فوجیں اتری تھیں تو کامریہ ہو چیز منہ اور ویت کانگ نے امرکی فوجوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کیلئے کون سے قومی اتفاق رائے کا اہتمام کیا تھا؟ اور اگر وہ راجہ صاحب کے اس فاسد کے پیچھے چل پڑتے تو کیا ویتمام سے امرکی فوجوں کا انخلا کبھی ممکن ہوتا؟ اس لیے اگر ویت کانگ کو اس فاسد کی پابندی سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے تو پھر اے افغانوں کو بھی ”معانی“ دے دینے میں کیا حرج ہے؟

## صوفیائے کرام اور مجاہدین

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۲ مئی ۲۰۰۰ء

راجہ انور صاحب نے اپنے تفصیلی مضمون میں بعض امور کی وضاحت کیلئے فرمایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگادی ہے کہ علم الکلام کی موثیقائیوں میں نہ پڑوں۔ مگر میرے لیے اس شرط کو پورا کرنا مشکل ہے اس لیے کہ اگر بات علم الکلام سے متعلق ہو گی تو اس کی وضاحت کیلئے علم الکلام کے اصولوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو گا، ورنہ اگر انجینئرنگ کے کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے میڈیکل سائنس کے اصولوں کو تذکرہ کرنے بیٹھ جاؤ گا تو خود راجہ صاحب موصوف کو شکایت ہو گی۔ مثلاً انہوں نے عقائد و نظریات کا ذکر کرتے ہوئے ان دونوں کو غیر جامد اور متحرک قرار دیا ہے جس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ اس امرکی وضاحت میں سابقہ مضمون میں کرچکا ہوں کہ عقائد اور چیزوں میں اور نظریات ان سے مختلف امور کا نام ہے۔ اب ان میں سے عقائد کا تعلق علم الکلام سے ہے اس لیے اس حوالے سے جوبات بھی ہو گی علم الکلام کے اصولوں کی روشنی میں ہو گی اور اس اصول سے صرف نظر کرنے کا مطلب گفتگو اور مباحثہ کے مسلمات اور طے شدہ قواعد و اصول سے اخراج ہو گا جو کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں ہے۔

عقائد و نظریات کے بارے میں چند ضروری امور کی وضاحت گذشتہ مضمون میں کرچکا ہوں البتہ اس میں ایک پہلو قدرے تشنہ رہ گیا تھا جس کی تکمیل کیلئے تھوڑا سا تکمیر ضروری ہو گیا ہے، امید ہے کہ تاریخن، اس تکمیر کو محسوس نہیں کریں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عقائد کی بنیاد وحی الہی، آسمانی تعلیمات، حقائق ثابتہ اور نصوص صریح پر ہوتی ہے اس لیے ان میں نہ کبھی تغیری ہوا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ یہ قطعی طور پر جامد اور غیر متحرک ہیں اور انسان کی عقل، شعور اور مشاہدہ جتنا بھی ترقی کر جائے بنیادی عقائد میں کسی طرح کا کوئی فرق رونما نہیں ہو گا۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا وجود قائم رہے گا، اس کی توحید موجود رہے گی، اور اس کی صفات و اختیارات میں کوئی فرق واقع نہیں ہو گا۔ البتہ عقائد کی تعبیر و تشریح اصحاب علم کے پاس موجود و میسر معلومات اور ان کی قوت اور اک پر موقوف ہے اس لیے اس بارے میں ارباب علم و دانش کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ جبکہ افکار و نظریات کا انحصار انسانی فکر و شعور پر ہے اور افکار و نظریات کے باب میں انسانوں کا آپس میں مکمل طور پر متنق ہونا کہیں بھی ضروری نہیں ہے۔

اس اصول کی وضاحت کے بعد میں نے عرض کیا تھا کہ معاملہ وہاں گزبر ہوتا ہے جہاں ان تینوں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اس فرق کی وضاحت تشنہ رہ گئی تھی کہ جس طرح کچھ مہیٰ حلقة عقائد کی طرح ان کی تعبیر و تشریح

اور افکار و نظریات کو بھی جامد اور غیر متغیر قرار دے کر ان پر عقائد کی طرح ڈٹ جاتے ہیں جس سے تازعات جنم لیتے ہیں اور فرقہ بندی کا ماحول پیدا ہوتا ہے، اسی طرح دوسری طرف جب ہمارے بعض دانشور تعبیر و شریخ اور افکار و نظریات کی طرح عقائد کو بھی متھک اور غیر جامد قرار دے کر ان میں تغیر و تبدل کا تقاضا کرنے لگتے ہیں تو دین کا پورا اٹھانچہ ہی سبو تاڑ ہو کرہ جاتا ہے۔ اور قدیم و جدید کے درمیان فکری کشمکش کا موجودہ تناظر انہی دو انتہاؤں کے ٹکراؤ اور تصادم کے نتیجے میں نظر آ رہا ہے۔ ورنہ اگر تینوں امور کو اپنے اپنے دائرہ میں رکھا جائے تو ہر تازعہ کا حل نکل آتا ہے۔

مذہبی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے راجہ انور صاحب نے سوال اٹھایا ہے کہ سعودی عرب، مرکاش، ایران، پاکستان، افغانستان اور دیگر ممالک میں فقہی مذاہب مختلف ہیں اور کسی ملک میں وہاں کی فقہ سے وابستگی نہ رکھنے والے کسی مسلمان کا اقتدار میں آنا مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ کوئی پریشانی اور الجھن کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ بات مسلمہ طور پر طے ہو چکی ہے کہ جس ملک کے باشندوں کی اکثریت جس فقہ سے تعقیل رکھتی ہے وہاں اسی اکثریت کا فقہی مذہب نافذ اعلیٰ ہو گا اور اس پر کسی دوسرے کو اعتراض نہیں ہو گا۔ مثلاً سعودی عرب میں حنفی فقہ نافذ ہے جو دیگر تمام فقہی مذاہب کے پیروکاروں کیلئے ملکی قانون کے طور پر قبل قبول ہے۔ جبکہ افغانستان میں فقہی کو ملکی قانون کا درجہ دیا گیا ہے اور دنیا کے کسی خط کے غیر حنفی حضرات کو اس پر کوئی مشکال نہیں ہے۔ اس لیے جب ان فقہی مذاہب کے علمبردار ایک دوسرے کے اصول اور فطری حق کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس کا احترام کر رہے ہیں تو میرے خیال میں محترم راجہ انور صاحب کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

راجہ صاحب محترم نے صوفیاء کرام اور مجاہدین کے الگ الگ راستوں کی شاندیہ کی ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مجاہدین کی طرح تواریخ اسلام کا نعرہ لگانے کی وجہ سے صوفیاء کرام کی طرح خاموشی، محبت اور رواداری کے ساتھ اسلام کی دعوت دیبازی دادہ موکثر ہے۔ لیکن راجہ صاحب یہ تاریجی حقیقت نظر انداز کر گئے ہیں کہ صوفیاء کرام اور مجاہدین کا راستہ کبھی ایک دوسرے سے منفصل اور مختلف نہیں رہا، دونوں ایک دوسرے کے کام میں ہمیشہ معافون و مددگار رہے ہیں۔ میں اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں ہندوستان پر ہونے والے تین بڑے عسکری جملوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

سلطان محمود غزنویؓ ہمارے مجاہدین اور فتحیں میں بلند مقام رکھتے ہیں اور ہند کو مسلمانوں کے حق میں مسخر کرنے میں ان کے جملوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان پر ان کی فوج کشی کے دوران اس وقت کے چشتیہ سلسلہ کے سب سے بڑے بزرگ خواجہ ابو محمد چشتیؓ بذات خود اپنے سینکڑوں مریدوں کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوئے اور اٹھائی میں عملًا حصہ لیا۔

سلطان شہاب الدین محمد غوریؓ کا ذکر خود راجہ انور صاحب نے بھی کیا ہے لیکن انہیں شاید یہ بات یاد نہیں رہی کہ سلطان شہاب الدین محمد غوریؓ کو ہندوستان پر لٹکر کشی کی دعوت ہی سلطان الاولیاء حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتیؓ نے دی تھی۔ اور نہ صرف ان کے مریدوں نے بلکہ بعض مصدقہ تاریجی روایات کے مطابق خود خواجہ اجمیریؓ نے بھی سلطان غوریؓ کے پرچم تلے جہاد میں عملًا حصہ لیا تھا اور اسی کے نتیجے میں اس خطہ میں پہلی مسلم ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا۔

مغلوں کے اخبطاط و زوال کے دور میں جب جنوبی ہند کے مرہٹے انہا پسند انہ اور جنوبی ہندوازام کا پرچم اٹھائے شماں ہند کے مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کیلئے طوفانی یلغار کی صورت میں آگے بڑھ رہے تھے تو ان کے مقابلہ میں دہلی کی مسلم قوت کو کمزور دیکھتے ہوئے اس وقت کے سب سے بڑے صوفی اور فلسفی عالم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے قدمدار کے والی احمد شاہ ابدالی گوہندوستان پر لشکر کشی کی دعوت دی تھی اور اسی دعوت پر احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر شماں ہند (موجودہ پاکستان) کے مسلمانوں کو جنوبی مرہٹوں کی یلغار سے ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا تھا۔

یہ تاریخی حقائق ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ صوفیاء کرام اور مجاهدین کے راستے کبھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں رہے اور طریق کار الگ الگ ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان نہ صرف تعلقات کا مر وجود رہے ہیں بلکہ انہوں نے ہر دو میں ایک دوسرے سے تعاون بھی کیا ہے۔

## جنرل پرویز مشرف کا امتحان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ مئی ۲۰۰۰ء

سپریم کورٹ آف پاکستان کے بارہ نجی صاحبان نے متفقہ طور پر جزل پرویز مشرف کے بارہ اکتوبر کے اقدام کو نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا ہے اور انہیں تین سال تک عام انتخابات کرانے کی ہدایت کرتے ہوئے آئین میں تزیم کا اختیار بھی سونپ دیا ہے۔ جزل محمد ضیاء الحق مرحوم کو بھی سپریم کورٹ نے اسی نوعیت کا اختیار دیا تھا مگر اس میں تین سال کے عرصہ کی قید نہیں تھی۔ چنانچہ جزل مرحوم نے اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے مختلف اقدامات کے ذریعے گیارہ سال تک اقتدار کو اپنے پاس رکھا تھا اور اگر بہاو پور کا سامنہ پیش نہ آتا تو بظاہر ابھی اقتدار سے ان کا الگ ہونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

جزل پرویز مشرف نے بارہ اکتوبر کو میاں محمد نواز شریف کی حکومت بر طرف کرتے ہوئے آرمی چیف کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو ان کا یہ اقدام آئین سے ماورا ہونے کے باوجود نہ صرف پاکستانی عوام نے اسے قبول کرتے ہوئے اس میں خیر مقدم اور خوش آمدید کارنگ بھر دیا تھا بلکہ بین الاقوامی اداروں اور امریکہ سمیت مغربی حکومتوں نے بھی اس کے بارے میں ”گوارا ہے“ کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے کہ میاں محمد نواز شریف کی حکومت عالمی قوتوں اور پاکستانی عوام دونوں کی توقعات پر پوری نہیں اتری تھی اور یہی وقت دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں وہ دونوں کے اعتماد سے محروم ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے بارہ اکتوبر کے اقدام کو دونوں حلقوں میں اپنے انداز سے قبول کر لیا گیا اور اب سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے سنڈ جواز بھی فراہم کر دی ہے۔

اس عدالتی مینڈیٹ کے بعد جزل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا رجح کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ چند روز تک ہو جائے گا بلکہ کچھ کچھ ہو بھی رہا ہے۔ مگر ہماری فقیرانہ رائے ہے کہ جزل پرویز مشرف بھی میاں محمد نواز شریف کی طرح اسی منحصر کا

شکار ہو چکے ہیں کہ عالمی اداروں اور پاکستانی عوام میں سے کس کو خوش رکھنا ہے اور ان میں سے کس کے اعتماد پر پورا اتنا نہ کی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی خواہشات، توقعات اور ترجیحات مختلف بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور دونوں کو یہی وقت خوش رکھنے کی کوئی کوشش اب میاں نواز شریف کے حشر سے سبق حاصل نہ کرنے کی کوشش ہی قرار دی جاسکتی ہے۔

مغربی ممالک اور عالمی اداروں کی توقعات اور ایجنسیاں کچھ اس طرح ہے کہ:

- پاکستان جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی قبول کرتے ہوئے کشمیر سے دستبردار ہو جائے، چین کے خلاف امریکہ کے قائم کردہ متحده محاڈ میں شریک ہو، اور نیپال، سکم اور بھوٹان کی طرح ایک طفیلی ریاست کی حیثیت اختیار کرے۔
- پاکستان صنعتی ترقی کا خواب دیکھنا چھوڑ دے، وسطی ایشیا کی منڈی کی طرف لمحائی ہوئی نظر سے دیکھنے کی وجہے ایک زرعی ملک کی حیثیت پر اکتفا کرے اور صنعتی ممالک کیلئے وسطی ایشیا کی مخصوص ایک گزر گاہ بن جانے کے ساتھ ساتھ خود بھی منڈی بننا قبول کرے۔
- مشرق و سطی میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کیلئے خطرات کا باعث بننے کی وجہے ان کے استحکام اور ترقی کیلئے کردار ادا کرے۔
- حکومت پاکستان میں الاقوامی مالیاتی اداروں اور بڑی حکومتوں کے قرضے اور سود کی قسطیں بہر صورت ادا کرنے کیلئے اپنے عوام پر ٹیکیں گے اور جو بڑھاتی چلی جائے اور مالیاتی اداروں کو یہ موقع فراہم کرتی رہے کہ وہ پاکستانی عوام کو کوئی ریلیف فراہم کرنے کی وجہے ان کے گرد معاشی پابندیوں اور نیکیوں کے حصار تنگ سے تگلگ ترکتے چلے جائیں۔
- پاکستان اپنی شمال مغربی سرحد پر افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کی تقویت اور استحکام کا باعث نہ بنے بلکہ طالبان کو کسی طرح گھیر گھار کر شملی اتحاد کے ساتھ مخلوط حکومت کیلئے آمادہ کرے تاکہ افغانستان کی حکومت میں اسلامیت کے عنصر کو جس حد تک ممکن ہو کم کیا جائے۔
- پاکستان کے اندر دینی مدارس جہادی تحریکات اور مذہبی اقدار کی حوصلہ شکنی کی جائے اور شفاقت و کلچر کی آڑ میں حلال و حرام کے تصور سے ناؤشنا معاشرت کے فروع کی مہم کو ہر طبقہ پر عالم کیا جائے۔ ظاہریات ہے کہ یہ ایجنسیاں کی کوئی ایک شق بھی پاکستانی عوام کیلئے قابل قبول نہیں ہے۔ بلکہ اپنے پڑوس میں طالبان حکومت کی سادگی، قاععت پسندی، دینی حمیت، قوی غیرت اور قرضوں کیلئے عالمی طاقتوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے کی روشن کو دیکھ کر پاکستانی عوام کا بھی جی چاہتا ہے کہ:
- ان کے ملک کا نظام تبدیل ہو، پروٹوکول اور پرستیج کے تکلفات سے انہیں نجات ملے اور انہیں قاععت پسند

- اور کفایت شعار حکمران اور افسران میسر ہوں۔
- انہیں طبقاتی امتیاز سے چھکارا حاصل ہو، وسائل اور دولت کی غلط تقسیم اور ہوش ریاضتی تفاوت کی لعنت سے جان چھوٹے۔
- قرضوں کا شکنجه ٹوٹے، قوی دولت لوٹنے والوں کا حقیقی احتساب ہو اور ان سے قوی دولت اور اثاثے واپس لیے جائیں۔
- وہ مذہبی عدم رواداری اور فرقہ وارانہ تشدد کی دلدل سے نکلیں اور ایک پر امن اور خوشحال قوم کی حیثیت سے انہیں اقوام عالم کی برادری میں جائز اور باوقار مقام حاصل ہو۔
- پاکستان کی شرگ کشمیر سے بھارت کا آہنی پنجہ ہٹے اور کشمیری عوام آزادی حاصل کریں۔
- اسلامی ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خوشنگوار ہوں اور ایک مضبوط اسلامی بلاک تشکیل پائے۔
- بیت المقدس آزاد ہو اور فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق ملیں۔
- جنوبی ایشیا میں بھارت کے ساتھ برابری کی بنیاد پر باوقار تعلقات قائم ہوں، طاقت کا کوئی بھی عدم توازن اس خطے میں بھارت کی بالادستی کا ذریعہ نہ بنے۔ اور افغانستان اور سلطی ایشیائی مسلم ریاستوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات اسلامی اخوت کی بنیاد پر مستحکم مسٹحکم تر ہوتے چلے جائیں۔
- یہ دو ایجمندوں کا تکراوہ ہے اور دو پروگراموں کا تصادم ہے۔ اس لیے جزل پرویز مشرف کا اصل امتحان اب شروع ہوا ہے کہ وہ ان میں سے کس کا ساتھ دیتے ہیں اور کس پروگرام کو قبول کرتے ہیں۔ جزل صاحب بر سر اقتدار آئے تو بہت سے دوست پوچھتے تھے اور اب بھی مختلف حضرات دریافت کرتے رہتے ہیں کہ جزل پرویز مشرف کس کے نمائندے ہیں اور کس لائب سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں ان سے عرض کرتا تھا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دو دھاری تلوار کس طرف چلے گی۔ یہ آنے والا وقت بتائے گا اور جزل پرویز مشرف کا ایجمنڈ اور ترجیحات نشاندہی کریں گے کہ وہ اصل میں کس کی نمائندگی کر رہے ہیں۔
- میرے خیال میں وہ وقت آگیا ہے اور پریم کورٹ کے فیصلے نے جزل پرویز مشرف کو اس فیصلہ کن دورا ہے پر لاکھڑا کیا ہے جہاں سے انہوں نے بہر حال کسی طرف ٹرن لینا ہے۔ میں اس ناکر مرحلہ پر جزل پرویز مشرف سے یہ عرض کرنا جانتا ہوں کہ صرف اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ صرف ایک شخص کا ٹرن نہیں بلکہ جنوبی ایشیا، سلطی ایشیا، مشرق و سلطی اور عالم اسلام کے جمیعی تناظر میں پوری امت مسلمہ کا ٹرن بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وائٹ ہاؤس اور کعبۃ اللہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہوئے ابھی طرح سوچ سمجھ لیں اور پوری طرح جائزہ لے لیں کہ وہ تاریخ کے صفات میں اپنی تصویر صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری یا پھر میر جعفر، میر صادق اور شریف مکہ حسین میں سے کس کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں؟

## جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے چند گزارشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ جون ۲۰۰۰ء

گذشتہ ماہ کے دوران گوجرانوالہ میں حركة الجہاد الاسلامی، باغ آزاد کشمیر میں جیش محمد اور پروردشیں یا لکوٹ میں حركة الجہادین کے چند پروگراموں میں شرکت اور مجہد نوجوانوں سے گفتگو کا موقع ملا، ان سے چہاد اور جہادی تحریکات کے حوالے سے جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بر صغیر پاک و ہندو بنگلہ دیش کی تحریک آزادی میں حضرت مولانا عبد اللہ سنہی ایک بلند مرتبہ رہنما اور مفکر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں، انہوں نے آزادی ہند کی خاطر زندگی کا ایک بڑا حصہ جلاوطنی میں گزارا اور تحریک آزادی کو عالمی سطح پر متعارف کرنے کیلئے سرگرم کردار ادا کیا۔ ان کے رفقاء میں ایک نام مولانا منصور انصاری کا بھی آتا ہے جو ان کے انتہائی قریبی ساتھی تھے اور جب ایک مرحلہ میں برلن میں پروفیسر برکت اللہ بھوپالی گی سربراہی میں "آزاد ہند گور نمائش" کے نام سے جلاوطن حکومت کی بنیاد کھلی گئی اور مولانا عبد اللہ سنہی گواں کا وزیر خارجہ مقرر کیا گیا تو ان کی نیابت کے طور پر مولانا منصور انصاری کا انتخاب کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے طالب علمی کے دور میں ان کے درسالے دیکھے تھے جو فارسی میں تھے اور ان میں دنیا کے مختلف نظام ہائے حکومت اور اسلامی ریاست کے دستوری خاکے پر بحث کی گئی تھی۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے ان میں سے ایک رسالہ میں مولانا منصور انصاری نے حضرت عیین علیہ السلام کے نزول اور حضرت امام مہدیؑ کے ظہور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان دو بزرگوں کی تشریف آوری سے قبل دنیا میں دو کام عملاً مکمل ہو چکے ہوں گے۔ ایک یہ کہ پوری دنیا نے اسلام میں عالمی سطح پر بنیادی دینی تربیت یعنی نماز، روزہ اور دیگر احکام اسلامی اور دینی اخلاق کے حوالے سے ایک تربیت یافتہ جماعت وجود میں آچکی ہوگی۔ اور دوسرا یہ کہ جہاد کی تیاری اور ٹریننگ کے شعبہ میں بھی عالمی طور پر ایسی جماعت تیار ہو چکی ہوگی کہ دونوں بزرگ اسے لے کر عالمی استعمار اور یہودیت کے مقابلہ میں صاف آہوں کیے گوئکہ نزول اور ظہور کے بعد اتنا وقت نہیں ملے گا کہ وہ افراد جمع کریں، انہیں جماعت کی شکل دیں، ان کی تربیت کا اہتمام کریں اور ان کو معاشرتی انقلاب اور عسکری مذاہاری کیلئے تیار کریں۔ یہ دونوں کام ہو چکے ہوں گے اور دونوں بزرگ تشریف لا کر ان دونوں جماعتوں کی قیادت سنبھالتے ہوئے میدان جنگ میں کوڈ پڑیں گے۔ مجھے اب پوری عمارت یاد نہیں ہے مگر بنیادی خیال مولانا انصاری کا بھی ہے جسے میں نے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور اگر مولانا انصاری یہ بات نہ لکھتے تو بھی حضرت عیین علیہ السلام کے نزول اور حضرت امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں جناب رسالت تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشین گوئیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس لگتی ہے۔

یہ بات پڑھنے کے بعد ایک عرصہ تک میں اس شش وغیرہ میں رہا کہ یہ دو جماعتوں کوئی ہو سکتی ہیں؟ پہلی جماعت کے بارے میں تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ تبلیغی جماعت ہو اس لیے کہ اس کا دائرہ پوری دنیا تک وسیع ہو رہا ہے اور اس میں مختلف اقوام و ممالک اور ہر رنگ و نسل کے لوگوں کی مسلم شمولیت جاری ہے، نیز اس کا بنیادی کام ایک مسلمان کی دینی و اخلاقی تربیت اور اسے مسجد کے ساتھ جوڑ دین کے بنیادی اعمال پر لانا ہے۔ اس لیے اس جماعت

کی محنت اسی نیچے پر محسوس ہوتی ہے جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ لیکن جہادی تربیت اور عسکری ٹریننگ والی جماعت کو نبی ہے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور آج سے پندرہ میں سال پہلے تک ذہن اس الجھن کا حل تلاش کرنے میں لگا رہا۔ کبھی کبھار مسلم ممالک کی مسلح افواج کا تصویر ذہن میں آتا گزد ہے، ان اس فوج اجھن دیتا کہ ان افوانح کی تربیت اور ذہن سازی اس ماحول میں نہیں ہوتی کہ وہ دین کے کسی کام آسکیں بلکہ ان میں سے کوئی فوج خود کو اپنے ملک کے دینی حلقت کے خلاف استعمال ہونے سے بچائے اور وقت آنے پر حضرت علیؑ اور حضرت امام مہدیؑ کی جہادی افواج کے خلاف صاف آرا ہونے سے باز رہ جائے تو اسلام اور ملتِ اسلامیہ پر یہی اس کا سب سے بڑا احسان ہو گا۔ لیکن کسی مسلم ملک کی موجودہ فوج سے یہ موقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ دین کے حوالے سے مسلمانوں کے کسی کام آئے گی اور اسلام کا پرچم بلند کر کے عالمی استعمار اور یہودیت کے خلاف صاف آ رہو گی۔ بہرحال ذہن اس الجھن میں تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جہاد افغانستان کا پرچم بلند ہوا اور رو سی استعمار کے خلاف یہ دس سالہ جہاد پوری دنیا کے مجاہد نوجوانوں کا ٹریننگ سنٹر بن گیا اور آج صرف پندرہ میں سال کے بعد میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ جہاد کا عمل پوری دنیا میں پھیل گیا ہے اور دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں جہاد کے نعرے نہ گونخ رہے ہوں اور جہاد کے دینی جذبہ سے سرشار ہزاروں نوجوانوں کا دل عالم کفر سے پنج آرمائی کیلئے نہ مچل رہا۔

بوسیا، کوسوو، فلسطین، کشیر، چینیا، صومالیہ، اری ٹیڈیا، ارakan، مورو، انڈونیشیا اور دیگر علاقوں میں جہاد کا جو عمل سامنے آچکا ہے اس نے کفر کی آنکھیں کھول دی ہیں اور میری ذہنی الجھن بھی حل کر دی ہے کہ دنیا میں عالمی سطح پر جہادی تربیت اور عسکری ٹریننگ سے بہرہ ور ایک عالمی فوج وجود میں آچکی ہے جو حضرت علیؑ کے نزول اور امام مہدیؑ کے ظہور کے ساتھ ان کے پرچم تلے متعدد ہو کر عالمی کفر اور اس کے یہودی قائدین کے خلاف صاف آ رہو کر معرکہ کا رزار گرم کر سکتی ہے۔ اس لیے میں اپنے وجود ان اور تاریخی مطالعہ کی بنیاد پر عالمی تبلیغی جماعت اور دنیا میں اسلام کی جہادی تحریکات کوہی دو جماعتیں سمجھتا ہوں جن کا تذکرہ مولانا منصور انصاریؑ نے کیا تھا۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ایک جماعت کا شعبہ سول ہے اور دوسری جماعت کا میدان عسکری ہے لیکن دونوں کا رخ اور جہت ایک ہی ہے۔ اس لیے میں مجاہد نوجوانوں سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا عزم بلند رکھیں اور خود کو اس عالمی اسلامی فوج میں شاملیت کے جذبے کے ساتھ تیار کریں جس کی قیادت حضرت علیؑ اور حضرت امام مہدیؑ نے کرنی ہے اور دنیا میں ایک بار پھر خلافت اسلامیہ کا آبیا کرنا ہے۔ یہ کشیر، چینیا، فلسطین، ارakan اور مورو کے معرکے درمیانی مرحلے ہیں اور ٹریننگ اسکیمیں ہیں جو تکونی طور پر جاری ہیں۔ اصل معرکہ ابھی آگے آنے والا ہے جو عالمی ہو گا، فیصلہ کن ہو گا اور آخری ہو گا اور ہر جہادی تحریک کے ہر کارکن کو اس کیلئے ذہنی اور عملی طور پر پوری طرح تیار رہنا چاہیے۔

جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں کہ یہ جہادی تحریکات جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں جہاد افغانستان کے ثمرات ہیں اور افغان علماء اور مجاہدین کی عظیم خدمات کا نتیجہ ہیں۔ جبکہ جہاد افغانستان کے ثمرات صرف مسلمانوں اور مجاہدین تک محدود نہیں رہے بلکہ دنیا بھر نے ان ثمرات کو سمیٹا رہے:

- آج امریکہ رو سی استعمار کی نکست کے بعد جو عالمی فتح کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے یہ افغانستان کے غیر عوام کے جذبہ حریت اور قربانیوں کا شمر ہے ورنہ امریکہ ان تناخ کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔
- یورپ کے مالک مخدود ہو رہے ہیں اور ریاستہائے متحدہ یورپ کا ایجنسڈ آگے بڑھ رہا ہے تو یہ افغان مجاہدین کی جدوجہد کا صدقہ ہے ورنہ یورپی ممالک اس اتحاد کا خیال بھی ذہن میں نہیں لاسکتے تھے۔
- جرمی ایک بار پھر مخدود ہو گیا ہے اور دیوار برلن ٹوٹ گئی ہے تو یہ افغان عوام کی عظیم قربانیوں کا شمر ہے ورنہ جرمی کے دونوں حصے کبھی خواب میں بھی مخدود ہونے کی بات اپنے ذہنوں میں نہیں لاسکتے تھے۔
- وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کو آزادی ملی ہے اور بالٹیک خط کی مسجدی ریاستیں آزادی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ یہ افغان عوام کے خون کا صدقہ ہے ورنہ ان ممالک کے عوام تو آزادی کے تصور تک سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔
- پاکستان کی ہزاروں کلو میٹر لمبی شاخ مغربی سرحد محفوظ ہو گئی ہے اور پاکستان اپنے روایتی حریف بھارت کے مقابلہ میں بہتر پوزیشن میں آگیا ہے تو یہ بھی جہاد افغانستان کی برکات ہیں۔ لیکن تاریخی ستم ظریبی کا یہ کتنا خوفناک منظر ہے کہ جن اقوام و ممالک نے افغان عوام کی قربانیوں کے شہر اسے میٹیں اور لاکھوں افغان مجاہدین کے خون کے صدقے آزادی اور وحدت کے او ہورے خوابوں کی تعبیر حاصل کی ہے آج وہی سب مل کر افغانستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں اور افغان عوام کو اس جہاد کے منطقی اور نظریاتی شہر اس سے محروم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ میرے خیال میں چشم فلک نے اس سے قبل پوری تاریخ میں احسان فراموشی کا اس سے المناک منظر نہیں دیکھا ہو گا اور تاریخ عالم اپنی ابتداء سے اب تک بے وفاکی اور خود غرضی کی اس سے بڑی کوئی مثال پیش کرنے سے یقیناً قادر ہے گی۔ مگر یہ موجودہ کافر اور منافق اقوام کا طرز عمل ہے اور ان دو طبقوں سے اسی قسم کے طرز عمل کی توقع کی جا سکتی ہے۔
- البتہ جہادی عمل سے والبستہ نوجوانوں اور جہادی تحریکات کے قائدین کی یہ دنی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے طرز عمل سے گریز کریں اور جہاد کے دنی جذبہ اور عمل کے دنیا بھر میں پھیلنے کے اصل سرچشمہ اور منبع کے طور پر افغانستان کو نظر انداز نہ کریں بلکہ جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی مقاصد کی تکمیل کیلئے اپنے اپنے دائرہ میں تعاون کا سلسہ جاری رکھیں۔ جہاد افغانستان کی منطقی اور نظریاتی منزل یہ ہے کہ وہاں کمیونٹی دور سے چلا آنے والا نظام مکمل طور پر ختم ہو اور پورے افغانستان میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں آئے۔ اور اب تک کے حالات کا انتار چڑھاہ شہادت دیتا ہے کہ اس منزل تک ثابت اور سنجیدہ پیش رفت صرف طالبان نے کی ہے اور وہ نہ صرف اس مشن اور ہدف کیلئے پوری طرح سمجھیہ ہیں بلکہ عالمی دباؤ اور داخلی مشکلات و مصائب کے باوجود اپنے اس پروگرام میں کسی قسم کی لپک پیدا کرنے کے روادر نہیں ہیں۔
- مجاہدین سے ایک گزارش یہ ہے کہ اس فطری اصول کو بادر کھیں کہ جب کام میں پھیلا دہوتا ہے تو تقسیم بھی ہوتی

ہے۔ کہنے بڑے ہوتے ہیں تو بہت جاتے ہیں، ایک کنبہ کئی کنوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، الگ الگ مکانات میں بننے لگتے ہیں بلکہ ایک ہی مکان کے اندر کئی دیواریں کھینچ دی جاتی ہیں، بھائی بھائی سے اور پیٹا بیپ سے الگ ہو جاتا ہے، اور مزاجوں کا اختلاف مال اور بیٹی کو ایک جگہ اکٹھے نہیں رہنے دیتا۔ اس لیے تقسیم میں کوئی برائی نہیں ہے، یہ فطری بات ہے، البتہ تقسیم کے بعد رشتوں کا تعلق ضرور قائم رہنا چاہیے اور باہمی تعلقات کار میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ بیٹھنے باپ سے الگ ہو کر نیا گھر رسالیا ہے مگر دونوں میں باپ بیٹھے کار شتہ قائم ہے اور شفقت و احترام کے تعلقات موجود ہیں تو تقسیم سے کسی کا کچھ نہیں بلکہ الگ محبت کے دائرے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دو بھائی اکٹھے نہیں رہ سکے اور الگ الگ مکان میں چلے گئے ہیں مگر اس کے بعد دونوں بھائیوں میں بھائی چارہ موجود ہے اور چھوٹے بڑے کافرن قائم ہے تو الگ الگ ہونے کا کوئی تقصیان نہیں ہے۔ اس لیے مختلف جہادی تحریکات کے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الگ الگ جہادی گروپوں سے نہ گھر ایں البتہ آپس میں تعلقات کار قائم رکھیں، ایک دوسرے کا احترام کریں، ایک دوسرے کی کمزوریوں پر پردہ ڈالیں اور ایک دوسرے کی خوبیوں سے استفادہ کریں۔

اجتماعی زندگی کا اصول ہی یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی خوبیوں کو بیکا کر کے قوت بنا دیا جائے ورنہ ساری خوبیاں کسی ایک انسان میں اکٹھی نہیں میں گی۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس ایک بار کسی مسجد کے منتظمین آئے کہ ہمیں خطیب مہیا کر دیں اور اس کے ساتھ ہی خطیب کے اوصاف گنتا شروع کر دیے۔ جب پانچ چھوٹے صفات گن چکے تو شاہ جی نے کہا کہ بس بس! میری ساری زندگی کی لڑائی یہی ہے کہ اب کوئی نیابی نہیں آئے گا مگر تم مجھ سے نبی کا تقاضا کر رہے ہو۔ کیونکہ جتنے اوصاف تم نے گئے ہیں یہ کسی بی میں ہی اکٹھے ہو سکتے ہیں اور یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اللہ کے بندوں کسی شخص میں دو خوبیاں ہوں گی تو دو خامیاں بھی ہوں گی، اس لیے سب کو بقول کرنا ہو گا۔ چنانچہ مجاہدین سے میری گزارش بھی یہی ہے کہ ایک دوسرے میں کمزوریاں تلاش نہ کرو اور ایک دوسرے کے عیوب نہ اچھا لو بلکہ اچھائیاں تلاش کر کے ان سے استفادہ کرو اور اگر کوئی کمزوری نظر آئے تو اس پر پردہ ڈالو اور خاموشی کے ساتھ اصلاح کی کوشش کرو کیونکہ جماعتیں اسی طرح اپنے مقاصد میں آگے بڑھتی ہیں۔

## افغانستان میں این جی اوز کی سرگرمیاں اور طالبان کا موقف

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۰۰ء

amarِ اسلامی افغانستان میں طالبان کی حکومت نے گذشتہ دونوں ایک امریکی خاتون کو افغانستان سے نکال دیا جو ایک این جی اکے حوالے سے وہاں مصروف کا رتحی اور مبینہ طور پر رفایی کاموں کی آڑ میں جاسوسی سرگرمیوں میں ملوث پائی گئی تھی۔ اس پر اقوام متحده کے رابط افسر ایک ڈیبل میلن بیخنچ اور انہوں نے طالبان کی حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ این جی اوز کیلئے کام کرنے والی خواتین کی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ ڈالیں، لیکن طالبان نے ان کا موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۲۱ جولائی ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق اقوام متحده

کے نمائندہ سے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ خواتین کے حقوق کے خلاف نہیں اور وہ ہی ان کی ملار متون کے خلاف ہیں، لیکن افغانستان میں ایسی این جی اوز کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو فلاحتی کاموں کی آڑ میں جاسوسی میں ملوث ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ طالبان حکومت کا یہ موقف ایک اصولی اور جائز موقف ہے اور تمام ترشیحات و مصائب اور رکاوٹوں کے باوجود طالبان کا اپنے اصولی موقف پر قائم رہنا لائق صد تحسین ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ایسی این جی اوز کا جال بچھا ہوا ہے جو رفاقتی کاموں اور عام لوگوں کے مفادات کے حوالے سے بے پناہ رقوم صرف کر کے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی ہیں، اور اس کی آڑ میں نہ صرف جاسوسی بلکہ فکری انتشار پیدا کرنے اور مغرب کی بے حیاثافت کی راہ ہموار کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔ اس لیے حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے طول و عرض میں کام کرنے والی ہزاروں این جی اوز کی سرگرمیوں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے اور ایسی این جی اوز پر کسی رورعایت کے بغیر پابندی لگادی جائے جو اسلامی روایات و اقدار اور ملکی مفادات کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث پائی جائیں۔

## دو دن کابل کی آزاد فضا میں

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۰ اگست ۲۰۰۸ء

حرکتہ الجہاد الاسلامی العالمی گوجرانوالہ کے سربراہ قاری عبد القادر صاحب علماء کرام اور دیگر دینی کارکنوں کا ایک گروپ کابل لے جانے کیلئے تیار کر رہے تھے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ششمہ ایامی امتحان کی تعظیلات کی وجہ سے میرے پاس تین چار دن کی گنجائش تھی اس لیے میں بھی گروپ میں شامل ہو گیا۔ قاری صاحب نے اس گروپ کو ادھرا در گھماتے ہوئے ۱۲ اگست ہفتہ کورات سائز ہے نوبج کے لگ بھگ کابل پہنچا دیا۔ مختلف جہادی تحریکات کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ علماء کرم اور دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والے سمجھدار حضرات خود کا بدل جائیں، وہاں کے حالات کا جائزہ لیں، طالبان حکومت کی کارکردگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، ان کے خلاف عالمی سطح پر کیے جانے والے پروپیگنڈہ کی حقیقت معلوم کریں، موجودہ بحرانی کیفیت میں امارت اسلامی افغانستان کی مشکلات اور ضروریات کا خود اندازہ کرتے ہوئے ان سے تعاون کی ممکنہ عملی صورتیں تلاش کریں، اور انہیں بروئے کار لانے کیلئے سنجیدہ پیش رفت کریں۔

میں اس سے قبل دو دفعہ کابل جا چکا ہوں، ایک بار پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی کی عبوری صدارت کے دور میں جکہد وہ اس عبوری صدارت کو طول دینے کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ پاکستان کے سرکرد علماء کرام کا ایک بھرپور وفد کابل گیا جس میں بڑے بڑے بزرگوں کے ساتھ میں بھی ایک کارکن کے طور پر شامل تھا۔ مجددی صاحب کے ساتھ میری پرانی بیاد اللہ ہے، ان کی خاندانی عظمت اور تاریخی کردار کے حوالے سے ان سے ہمیشہ محبت اور عقیدت رہی ہے، اور وہ میری دعوت پر ایک بار گوجرانوالہ بھی تشریف لا چکے ہیں۔ انہوں نے صدارتی محل میں پاکستانی علماء کرام کے ساتھ ایک نشست

کا اہتمام کیا اور ان سے مشورہ کے طور پر یہ دریافت کرنا چاہا کہ عبوری دور کے چھ ماہ مکمل ہونے پر ان کیلئے اقتدار کو چھوڑنا ضروری ہے یا وہ اس اقتدار کو اس کے بعد بھی اپنے پاس رکھ سکتے ہیں؟ ہمارے بعض بزرگوں نے ان کے حق میں تاویلات کا دروازہ کھولنے کی مگر میں نے ان سے اس محفل میں صاف عرض کیا کہ انہوں نے چھ ماہ کی عبوری مدت کیلئے ایک طے شدہ معاملہ کے مطابق اقتدار سننجلہا ہے اس لیے قرآن کریم کے حکم کی رو سے عہد کی پاسداری ہر حال ضروری ہے۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ان کی خصوصیت کا اختیاب تاریخی حوالے سے ان کا بہت بڑا کریٹ اور اعزاز ہے۔ لہذا میرا مشورہ ہے کہ وہ اس تاریخی اعزاز کو اپنے لیے کافی سمجھتے ہوئے باوقار طور پر مدت گزرتے ہی اقتدار سے الگ ہو جائیں اور اپنے خاندان کے اس تاریخی اعزاز کو دھندا لے کارستہ اختیار نہ کریں۔

دوسری بار جب میں کامل گیا تو طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی مگر ابھی ابتدائی مرحلہ تھے اس لیے مشکلات اور وسائل کے بھنور میں تھی۔ اور انتظامی و حکومتی امور میں طالبان کی ناجربہ کاری بجا ہے خود ایک بہت بڑا منسلک بھی ہوئی تھی۔ لیکن اب مجھے مذکورہ وفد کے ہمراہ تیسری بار کامل جانے اور دو روز قیام کرنے کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اگرچہ مشکلات میں کمی کی بجائے اضافہ ہوا ہے مگر طالبان الہاکاروں نے جس بہت اور محنت کے ساتھ اپنی ناجربہ کاری پر قابو پایا ہے اور ایثار و استقامت کے ساتھ معاملات کو کثروں کرنے کی کوشش کی ہے اس کے اثرات کا بل میں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگے ہیں۔ کابل کی رو تھیں بحال ہو رہی ہیں، بازاروں کی چیل بیل میں اضافہ ہوا ہے، چجھے سر شام کا بل کے راستے بند ہو جانے کی بجائے اس کی مدت رات دس بجے تک بڑھادی گئی ہے۔ طالبان کے آنے سے پہلے شام چھ بجے کا بل کے راستے بند ہو جاتے تھے مگر انہوں نے اسے رات دس بجے کر دیا ہے۔ جراحت میں کمی ہوئی ہے اور بعض باروں تھیں میں نصف شب کے بعد ہم نے خود اسی دکانیں دیکھیں ہیں جن کے دروازے باہر سے کھلے تھے۔ بازار میں پڑھے ہوئے عام استعمال کے سامان پر صرف کپڑے کا پردہ ڈال کر اسے ڈھک دیا گیا تھا اور دو کانڈار خود گھر میں مزے کی نیند سورا تھا۔ سرکاری دفاتر میں عوام کی آمد و رفت اور الہاکاروں کی کار کردگی بھی اطمینان بخش ہے اور کامل ایک بار پھر بارونق اور پر امن شہر کا روپ دھار تاجر ہا ہے۔

ہمارے وفد میں دیگر بہت سے حضرات کے علاوہ مولانا منظور احمد چنبوی کے بڑے فرزند مولانا محمد الیاس چنبوی، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے نائب مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی، اور مدرس مولانا ظفر فیاض، نیز گوجرانوالہ ہی کے مولانا قاری یعقوب تبسم اور مولانا ظہیر الدین بار بھی شریک تھے۔

اس دوران ہمیں جن حضرات سے ملاقات اور گفت و شنید کا موقع ملا ان میں امارت اسلامی افغانستان کے نائب صدر ملا محمد حسن، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولانا نور محمد ثاقب، کامل یونیورسٹی کے چانسلر مولانا پیر محمد روحانی، فالخ ار گون مولانا ارسلان رحمانی، نامور افغان کمائٹر مولوی سیف الرحمن منصور، آلیڈی آف سائنسز کے ڈپٹی ڈائریکٹر مولانا فرید الدین محمود، اور وزارت صحت میں بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ کے ڈائریکٹر مولانا شمس الدین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ملاقاتوں کے حوالے سے افغانستان کے تازہ ترین حالات کے بارے میں حاصل ہونے والی

معلومات اور اپنے تاثرات اسی کام میں مختلف عنوانات کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

ہم نے پاکستان کا یوم آزادی شہادی اتحاد کے خلاف برسر جنگ طالبان مجاهدین کے ساتھ ان کے اگلے مورچوں میں منایا۔ چودہ اگست کو ہم چاری کار اور بگر ایز پورٹ کے قریب اگلے مورچوں میں گئے اور مجاهدین کے ساتھ کچھ وقت گزار۔ وہاں بر صیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کے شہداء، تحریک پاکستان کے شہداء اور جہاد افغانستان کے شہداء کے ایصال و ثواب کیلئے قرآن خوانی کی گئی۔ اور طالبان کی اسلامی حکومت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی وحدت و سالمیت کی حفاظت اور پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست بنانے کیلئے خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔

اس موقع پر راقم الحروف نے ان مجاهدین سے باتیں کرتے ہوئے دو گزار شات کیں۔ ایک یہ کہ ہمیں پاکستان کا یوم آزادی طالبان مجاهدین کے ساتھ مناتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے چودہ اگست ۱۹۷۸ء کو انگریز حکمرانوں سے آزادی حاصل کی تھی مگر انگریز نظام ہم پر نصف صدی گزر جانے کے باوجود بدستور مسلط ہے اور ہماری آزادی ابھی ناکمل ہے۔ جبکہ افغانستان کے لوگوں نے رو سی فوجوں اور کمیونسٹ نظام دونوں سے آزادی حاصل کر لی ہے اور کمل آزادی کی فضائیں سانس لے رہے ہیں۔ اس مناسبت سے طالبان مجاهدین سے گزارش ہے کہ وہ ہمارے لیے بطور خاص دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرح ہمیں بھی کمل آزادی اور اسلامی نظام کی منزل سے ہمکنار کریں۔

دوسری گزارش یہ کی کہ اس وقت دنیا بھر کی نظریں امارت اسلامی افغانستان پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ خالص نظریاتی اور اسلامی حکومت اگر کامیاب ہوئی ہے تو دنیا بھر میں اسلامی تحریکات کو حوصلہ اور قوت حاصل ہو گئی اور مسلم ممالک میں کفر کے نظام سے نجات اور اسلامی نظام کے نفاذ کا دروازہ کھل جائے گا۔ جبکہ طالبان کی اسلامی حکومت کے استحکام کا دارو مدار شمال کی جنگ پر ہے اور اسی وجہ سے دنیا بھر کا کفر اس جنگ میں طالبان کی مخالفت پر متحod ہو گیا ہے۔ اس پس منظر میں معروضی صور تحال یہ بن گئی ہے کہ پوری دنیا میں اسلامی نظام کے نفاذ میں پیش رفت کا دارو مدار طالبان کی اسلامی حکومت کی کامیابی اور استحکام پر ہے۔ اور طالبان کی حکومت کی کامیابی اور استحکام کا دارو مدار شمال کی جنگ میں ان کی قیمت پر ہے۔ اس لیے آپ مجاهدین بہت اہم اور فیصلہ کن جنگ میں مصروف ہیں اور ہم آپ حضرات کے ساتھ کمل ہم آہنگی کا انہصار کرتے ہوئے اس جنگ میں طالبان حکومت کی جلد اور کمل فتح کیلئے دعا گو ہیں، آئین یارب العالمین۔

## افغان نائب صدر ملام محمد حسن سے ملاقات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ اگست ۲۰۰۰ء

ہماری خواہش تھی کہ طالبان حکومت کے سربراہ ملام محمد ربانی سے ملاقات ہو جائے مگر جب ان کے سیکرٹریٹ سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ علاالت کی وجہ سے ملاقاتوں سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں اور ان کی ایک دو روز کی مصروفیات پہلے سے طے شدہ ہیں اس لیے فوری طور پر ملاقات مشکل ہو گئی۔ دوسری طرف ہماری مجبوری یہ تھی کہ ایک دو روز سے

زیادہ کابل میں قیام کی ہمارے پاس گنجائش نہیں تھی، اور ہم نے کابل پہنچنے سے قبل کابل حکومت کو کوئی بیٹھگی اطلاع بھی نہیں دی تھی اس لیے زیادہ زور نہیں دے سکتے تھے۔

البته نائب صدر ملام محمد حسن صاحب نے ہمیں بجودہ اگست کو گیارہ بجے کا وقت مرحمت فرمادیا اور ان سے تفصیلی ملاقات اور گفت و شنید کا موقع مل گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات تھی، سابقہ تعارف نہیں تھا، اس کے باوجود انہوں نے جس خوش دلی اور بے تکلفی سے ہمارے ساتھ بات چیت کی اس سے ہمارے گروپ کے شرکاء بہت متأثر ہوئے۔ مزاج میں سادگی ہے، دھیمے لجھے میں گفتگو کرتے ہیں، اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی سوال کا جواب لشنا نہ رہے۔ اس لیے جب سوال و جواب کا سلسلہ زیادہ طویل ہونے لگا تو انہوں نے گھری کی طرف دیکھا اور ہم گفتگو کا دائرہ سنتھے ہوئے ان سے اجازت کے طلبگار ہوئے۔

انہوں نے افغانستان کی عمومی صور تحال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہم اس وقت آزمائش اور امتحان کے مرحلہ میں ہیں۔ ایک طرف شمال کی جگ نے ہمیں ہم تین متوجہ کر رکھا ہے، دوسری طرف یعنی الاقوای پاپندیوں کے باعث مشکلات و مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے، اور تیسرا طرف مسلسل خشک سالی بھی ہمارے لیے آزمائش بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود ہمارے عزم میں بھکر اللہ تعالیٰ کوئی کمزوری نہیں ہے اور ہم نے طے کر رکھا ہے کہ اسلام کی سربلندی اور اسلامی نظام کے نفاذ کے پروگرام میں کوئی چک نہیں آئے گی۔ اور جب تک ایک طالب بھی باقی ہے اسلامی نظام کے نفاذ کا پرچم سربلند رہے گا۔

انہوں نے کہا کہ ہمارے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ہم عثمانی ایسپاڑ (خلافت عثمانی) کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں اور اپنے انقلاب کو درآمد کر کے دوسرے ممالک کیلئے مشکلات کا باعث بنیں گے۔ لیکن میں اس سلسلہ میں دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ اسلامی نظام کا نفاذ ہمارا واحد مقصد ہے، اس سے ایک اچھے بھی پچھے نہیں ہیں گے۔ اور اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے ہمارے سامنے آئیں میں اور نہونہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ ہے۔ ہم اس کی پیروی کی کوشش کر رہے ہیں اور اسی طرح کا اسلام نافذ کرنا چاہرہ ہے ہیں جس طرح کا اسلام صحابہ کرام کے دور میں نافذ تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اپنے ملک کی حدود میں کر رہے ہیں اور اپنے ملک کے عوام کی خواہشات کے مطابق کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ عزم اور فیصلہ ہے کہ افغانستان کی حدود میں اسلام اور صرف اسلام کا نفاذ ہو گا لیکن ہم دوسرے کسی ملک کے معاملہ میں مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہماری خواہش ضرور ہے کہ دنیا کے تمام مسلم ممالک اپنے اپنے ممالک میں اسلام نافذ کریں اور اگر کوئی مسلم ملک اس مقصد کیلئے آگے بڑھتا ہے تو ہم اس سے بھی تعاون کریں گے۔ لیکن اپنی طرف سے کسی ملک پر انقلاب مسلط کرنے اور مسلم ملکوں کے معاملات میں مداخلت کا کوئی پروگرام ہم نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی کو ایسا خطرہ محسوس کرنا چاہیے۔

افغان نائب صدر ملام محمد حسن نے کہا کہ میں پاکستان کے علماء کرام، صحافیوں، اور دانشوروں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ افغانستان آئیں، یہاں کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، ہمارے بارے میں عالمی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈہ کی حقیقت معلوم کریں، اور اس بے بنیاد پروپیگنڈے کے توڑ کیلئے ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے

معاملات میں رہنمائی کیلئے بھی علماء کرام اور دانشوروں کی راہ دیکھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اہل علم و انش اپنا وقت فارغ کر کے تشریف لائیں اور ہمارے حالات، ضروریات، اور مشکلات کا جائزہ لے کر ہماری رہنمائی فرمائیں۔

وفد میں شامل ایک تاجر و دوست کے سوال پر ملا محمد حسن نے کہا کہ پاکستان کے تاجر اور سرمایہ کار اگر افغانستان میں آگر سرمایہ کاری کرنا چاہیں تو تجارت اور صنعت دونوں میدانوں میں ہم ان کا خیر مقدم کریں گے۔ اور اپنے حالات کے دائرہ میں جو سہولت ہمارے بس میں ہو گی فراہم کریں گے لیکن کوئی آئے تو ہمی۔ افغان نائب صدر نے یہ بات زبان سے تو نہیں کہی مگر ان کا لجھ بتا رہا تھا کہ شاید وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ زبانی جمع خرچ تو بہت ہوتا ہے مگر کوئی عملی کام کیلئے آگے نہیں بڑھتا۔ جبکہ ہم اس انتظار میں ہیں کہ پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے اصحاب صنعت و تجارت اور ارباب خیر آگے آئیں اور افغانستان کی تعمیر نو میں تعاون کرتے ہوئے صنعت و تجارت کے شعبوں میں سرمایہ کاری کے علاوہ صحت، تعلیم، سڑکوں کی تعمیر، اور عوامی فلاں کے دیگر کاموں میں بھی طالبان کی اسلامی حکومت کا ہاتھ ہٹائیں۔

ہماری دوسری امام ملاقات مولانا ارسلان رحمانی سے ہوئی جو پرانے علماء میں سے ہیں اور ایک دینی درسگاہ میں دینی علوم کی تعلیم دیتے ہوئے چہاد کے میدان میں آگئے۔ انہوں نے پنکتیکا کے صوبے میں مجاہدین کی قیادت کی اور ارگون کی چھاؤنی فتح کرنے کی وجہ سے فاتح ارگون کہلاتے ہیں۔ وہ کسی بڑے منصب پر توفی نہیں ہیں لیکن طالبان حکومت کے دماغوں میں شمار ہوتے ہیں اور انہم معاملات میں ان کی مشاورت اور رہنمائی سے طالبان حکومت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ان مجاہد علماء میں سے ہیں جو اپنی سنیارٹی کی پرواکیے بغیر طالبان حکومت کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور ایک کارکن اور خدمت گار کے طور پر اسلامی حکومت کی خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔ اور یہی بات ان کے خلوص اور قابلیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

مولانا ارسلان رحمانی کے ساتھ بھی میرا بہت پرانا تعلق ہے اور وہ چہاد کے ابتدائی دنوں میں گوجرانوالہ تشریف لا چکے ہیں۔ انہیں ہماری کابل حاضری کی پیشگوئی اطلاع نہیں تھی اس لیے جب ہم ان کے گھر پہنچنے تو وہ خوش ہونے سے زیادہ پریشانی میں پڑ گئے۔ کیونکہ وہ اسی وقت ایک امام مسئلہ کیلئے پنکتیکا روانہ ہونے والے تھے اور اگر ہم سے ٹھوڑی سی مزید تاخیر ہو جاتی تو وہ کابل سے روانہ ہو چکے ہوتے اور ہماری ملاقات نہ ہو پاتی۔ وہ بار بار افسوس کا اظہار کر رہے تھے کہ آپ ایسے وقت میں آئے ہیں کہ میں ایک انتہائی ضروری سفر پر روانہ ہو رہا ہوں جبکہ میری خواہش تھی کہ آپ سے تفصیلی بات چیت ہو اور ہم مختلف امور پر اطمینان سے تباہہ خیالات کریں۔

مولانا ارسلان رحمانی نے اس موقع پر چند باتیں کیں جن میں بطور خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ افغانوں نے اس سے قبل بھی امت کی رہنمائی کی ہے کیونکہ امام اعظم ابوحنیفہؓ کا تعلق کابل سے ہے، حدیث نبویؓ کی چھ بڑی کتابوں (صحاح ستہ) میں سے پانچ کے مصنفوں کا تعلق بھی اسی علاقہ سے ہے، اور آج افغان پھر اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے امت کی رہنمائی کیلئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے دنیاۓ اسلام بالخصوص پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں سے گزارش ہے کہ وہ اس عظیم اور مقدس مشن میں افغان علماء اور عوام کے ساتھی بنیں اور افغانستان میں نماذل اسلام کی جدوجہد کو چیل تک پہنچانے کیلئے امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں۔

## کابل میں "اکیڈمی آف سائنسز" کا قیام

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۶ اگست ۲۰۰۰ء

کابل کے حالیہ سفر کے دوران جن دو باتوں پر مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوئی آج کے کالم میں ان کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک خوشی معروف افغان کمانڈر مولوی سیف الرحمن منصوری سے ملاقات ہے جو میرے انتہائی مخلص دوست مولوی نصراللہ منصور شہید کے فرزند ہیں جنہیں دیکھ کر شہید دوست کی یاد تازہ ہو گئی۔

مولوی نصراللہ منصور شہید کا تعلق حرکت انقلاب اسلامی سے تھا اور وہ صاحب فکر اور صاحب رائے عالم دین تھے۔ جہادی معاملات اور ان کے تنازع و عاقب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کو جہاد افغانستان کے بارے میں باخبر رکھنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کیلئے سب سے زیادہ محنت کی۔ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور حضرت مولانا مفتی محمود کے ساتھ خصوصی عقیدت رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جہاد افغانستان کے آغاز کے فوراً بعد حضرت درخواستی اور مولانا مفتی محمود نے قبائلی اور سرحدی علاقوں کا دورہ کر کے جہاد افغانستان کی حمایت اور مجاہدین کی پشت پناہی کیلئے اس خطہ کے عوام کو جس طرح تیار کیا اس سے ہمارے حوصلوں میں اضافہ ہوا اور جہاد کے میدان میں ہمارے پاؤں جم گئے۔

میرے ساتھ بھی ان کا مشقانہ اور مخلصانہ تعلق تھا اور میں پاکستان کے بعض دروں میں ان کے ساتھ شریک رہا۔ وہ دو باتوں پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ ایک یہ کہ مجاہدین کے مختلف گروپ باہمی اتحاد کر کے ایک کمان کے تحت کاروائیاں کریں۔ اس مقصد کیلئے محنت کر کے ایک موقع پر انہوں نے ایک اتحاد بنوایا مگر وہ اتحاد مختلف گروپوں کو اکٹھا کرنے کی بجائے خود ایک گروپ کی شکل اختیار کر گیا جس کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرا وہ امریکی امداد اور مغربی ممالک کے تعاون کو ایک خاص دائرہ تک محدود رکھنے کی بات کرتے تھے اور اس تعاون کو جہادی معاملات میں مداخلت کی صورت میں قبول کرنے کیلئے تیار ہیں تھے۔ اس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اپنی اس آزادانہ سوچ کے باعث پورے جہادی نیٹ ورک سے ہتھی طور پر آٹھ ہو گئے اور انہیں حالات کی گئنی نے ایران پہنچا دیا جس پر ہمارے بہت سے ساتھی ان سے ناراض ہو گئے۔ مگر مجھے ان کی افاد طبع، سوچ اور مجبوریوں کا علم تھا اس لیے ان کا ایران جانا میرے لیے تشویش کا باعث نہ بنا اور ہمارے تعلقات بدستور پہلے کی طرح استوار رہے۔

طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد انہوں نے اپنی سنیارٹی اور خدمات کا حوالہ دیے لغیر پورے خلوص کے ساتھ انہیں سپورٹ کیا مگر ان کی گاڑی میں بم کے دھماکے نے انہیں عروس شہادت سے ہمکنار کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے خاندان کے ساتھ طالبان حکومت کے روابط سے میں بالکل بے خبر تھا اس لیے جب ان کے بیٹے مولوی سیف الرحمن منصور کو طالبان کی سرکاری فونج کے ایک کمانڈر کی صورت میں دیکھا تو مجھے جو خوشی ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جہاد کے دوران زخمی ہو گئی تھیں اور بعض انگلیاں کٹ گئی ہیں لیکن وہ اس کے باوجود جگنی خدمات میں معروف ہیں اور ایک بریگیڈ کی کمان کر رہے ہیں۔ حالیہ سفر میں ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں،

میں انہیں دیکھ کر اپنے شہید دوست کو یاد کرتا رہا اور بیٹے کے روپ میں باپ کی شبیہہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ دوسری خوشی مجھے کابل کے اس سفر میں "اکیڈمی آف سائنسز" کو دیکھ کر ہوئی جس کا باقاعدہ نام پشتو میں "علوم اکادمی" ہے۔ میرے میزان اس کا ترجیح "ریسرچ اکیڈمی" کرتے تھے لیکن میں نے اس کا ترجیح "اکیڈمی آف سائنسز" کیا ہے۔ اپنے میزان کے ساتھ کابل کے ایک روڈ پر گزرتے ہوئے علوم اکادمی کے بورڈ پر نظر پڑی تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ علوم کی تحقیق و ریسرچ کا ادارہ ہے جو طالبان کی حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا ہے۔ مجھے خوشنگوار حریت ہوئی اور میں نے اپنے میزان سے عرض کیا کہ یہ تو میرے اپنے ذوق اور شعبہ کا کام ہے جس کا کابل کے حوالے سے ایک عرصہ سے خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس لیے اس ادارہ کو ضرور دیکھنا ہے اور اس کے ذمہ دار حضرات سے بات کرنی ہے۔

چنانچہ مولانا الیاس چنیوٹی اور دیگر فرقاء کے ہمراہ تھوڑی دیر کیلئے وہاں حاضری ہوئی۔ اکیڈمی کے ڈائریکٹر مولانا خلیل اللہ فیروزی موجود نہیں تھے البتہ ان کے نائب مولانا فرید الدین محمود سے ملاقات ہو گئی جو بنیادی طور پر استاد ہیں اور اس وقت بھی طلبہ کی ایک کلاس کو تعلیم دے رہے تھے۔ اکیڈمی بالکل ابتدائی مرحل میں ہے، الماری میں چند کتابیں پڑھتی تھیں اور ڈپٹی ڈائریکٹر ہمیں اکیڈمی کے مقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے بے سروسامانی کاشکوہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ اکیڈمی مختلف علوم و فنون کے حوالے سے افغانستان کی موجودہ معروف صور تحال کا جائزہ لینے، مختلف شعبوں میں تحقیقی کام اور افراد کار کے خلاء کی نشاندہی کرنے، اور ریسرچ کے کام کو آگے بڑھانے کیلئے قائم کی گئی ہے۔ لیکن ضروری وسائل کے فقدان کے باعث ابتدائی اور بنیادی کام کیلئے بھی ہمارے پاس اسباب اور افراد کی کمی ہے اور ہم کام کو صحیح طور پر منظم نہیں کر پا رہے۔ البتہ خواہش ضرور موجود ہے اور چند نوجوان اس سلسلہ میں مدد و دائرہ میں کچھ نہ کچھ کر بھی رہے ہیں جو کام کی نویعت اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں نے اس پیش رفت پر خوشی کا اظہار کیا اور اسے وقت کی سب سے اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے پاکستان شریعت کو نسل اور الشریعہ اکادمی گجرانوالہ کی طرف سے مکمل تعاوون کا لیقین دلایا۔ میں نے انہیں دعوت دی کہ اگر اکیڈمی آف سائنسز کابل کے ذمہ دار دوست کسی وقت اسلام آباد آئیں تو مختلف شعبوں کے ماہرین اور ارباب علم و دانش کے ساتھ ان کی نشست کا اہتمام کیا جاسکتا ہے جو اس علمی و فکری کام کی حدود اور اساسی اصولوں کے تعین، اور اسے آگے بڑھانے کے بارے میں اسbab وسائل اور افراد کار کی فراہمی کیلئے مفید ثابت ہوگی۔ راقم الحروف نے "وولد اسلامک فورم" کی طرف سے بھی انہیں تعاوون کا لیقین دلایا اور گزارش کی کہ ہم لندن میں افغان دانشوروں کی میزانی اور علوم و فنون کے مختلف مراکز تک ان کی رسانی کیلئے خدمت کا شرف حاصل کر کے خوشی محسوس کریں گے۔

مولانا فرید الدین محمود نے اس پیشکش پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ امارت اسلامی افغانستان کی حکومت سے اجازت حاصل کر کے اسلام آباد آنے کا پروگرام بنائیں گے تاکہ اس سلسلہ میں مزید تعاوون کے عملی امکانات کا جائزہ لیا جا سکے اور اس میں پیش رفت کا طریقہ کارٹے کیا جاسکے۔

## افغانستان کے عدالتی اور تعلیمی نظام پر ایک نظر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۲ اگست ۲۰۰۰ء

کابل میں دو روزہ قیام کے دوران جن انہم شخصیات سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں ان میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولانا نور محمد شاقب اور کابل یونیورسٹی کے چانسلر مولانا پیر محمد روحانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان ملاقاتوں میں مولانا محمد الیاس چنیوٹی بھی بھرا تھے۔

مولانا نور محمد شاقب نوجوان علماء میں سے ہیں، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ مختلف کے فاضل ہیں، انہوں نے دورہ حدیث کے امتحان میں دارالعلوم حقانیہ اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان دونوں میں اول پوزیشن حاصل کی تھیں۔ ملاقات ہوئی تو یہ احترام سے ملے اور کہنے لگے کہ میں آپ کاشاگرد ہوں، دورہ حدیث سے پہلے موقف علیہ کے درجہ میں ایک سال میں نے مدرسہ انوارالعلوم مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں مشکوہ شریف اور بدایہ حضرت مولانا تقاضی حمید اللہ خان سے اور جلالین شریف آپ سے پڑھی تھی۔ یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی اور دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی کہ ہم دینی مدارس میں جو تحفظی بہت تعلیمی خدمات سرانجام دیتے ہیں اس کے نتائج کسی نہ کسی جگہ تو مسلمانوں کی عملی اور اجتماعی زندگی میں نظر آنے لگے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نظر بدمستحکم اور وہ دن لا یہ کہ ہم پاکستان کی اجتماعی اور قومی زندگی میں بھی دینی مدارس کی تعلیمی خدمات کے اثرات و نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، آمین یا رب العالمین۔

مولانا نور محمد شاقب سے افغانستان کے عدالتی نظام کے بارے میں چند پہلوؤں پر فتنگا ہوئی، انہوں نے بتایا کہ افغانستان میں عدالتی سطح پر شرعی نظام پہلے سے چلا آرہا تھا جو صرف کیونٹ دور میں پچھے عرصہ معطل رہا۔ اس کے بعد ہم نے دوبارہ اسے شروع کر دیا ہے اور چونکہ عدالتی سٹم، قواعد اصول اور ڈھانچہ پہلے عملاً موجود رہا ہے اس لیے کوئی دقت پیش نہیں آئی اور ہم پورے اعتناء اور نظم و ضبط کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہی فرمائش پر عدالتی اصول و ضوابط کی ایک مطبوعہ کاپی بھی مجھے مرحمت فرمائی جو ۲۶۳ دفعات پر مشتمل ہے اور پشتہ اور فارسی دو زبانوں میں ہے۔ یہ اصول و ضوابط ظاہر شاہ کے دور میں جمادی الثانی ۷۸ء میں نافذ کیے گئے تھے۔ یعنی اب سے کوئی چوالیں برس قبل ان کا نافذ عمل میں آیا تھا اور اب نیا نظام بھی انہی اصولوں کی روشنی میں چلا یا جا رہا ہے۔ ان اصول و ضوابط کی رو سے افغانستان کے عدالتی نظام کی بنیاد فقہ حنفی پر ہے اور قاضی حضرات قرآن و سنت کی اسی تعبیر کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند ہیں جو نفقة حنفی کی صورت میں کتابوں میں موجود ہے، اور جو ظیم مسلم سلطنتوں خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت میں صدیوں تک نافذ ا عمل رہی ہے۔

افغان چیف جسٹس نے بتایا کہ ہمارے ہاں ابتدائی عدالت دو ماہ میں کسی بھی کیس کا فیصلہ کر دینے کی پابندی ہے۔ جبکہ ہائی کورٹ میں اپیل کی ساعت ایک ماہ میں اور سپریم کورٹ میں بیس دن کے اندر مکمل ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی قاضی مقررہ مدت کے اندر فیصلہ نہیں کر پاتا تو اسے تاخیر کی وجہ کی وضاحت کرنا پڑتی ہے جو قابل قبول نہ ہونے کی صورت میں

قاضی کے خلاف تادیبی کارروائی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مذکورہ عدالتی اصول نامہ کی دفعہ ۱۰ میں بھی لکھا گیا ہے کہ اگر قاضی کسی معمولی عذر کے بغیر تاخیر کرے گا تو اسے معزولی کے علاوہ دیگر تعزیری سزا کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

مولانا پیر محمد روحانی ان مجاہد علماء میں سے ہیں جنہوں نے جہاد افغانستان میں عملی حصہ لیا اور سالہ بارہ تک روایتی فوجوں کے خلاف میدان جنگ میں شردار آزمار ہے۔ وہ فاتح خوست مولانا جلال الدین حقانی کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے ہیں اور تعلیمی کام کا وسیع تجربہ رکھنے کے باعث انہیں کابل یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کابل یونیورسٹی کے کم و بیش تمام شعبے دوبارہ شروع ہو گئے ہیں اور ان سب فیکلٹیز میں مجموعی طور پر اس وقت سماڑھے چھ ہزار سے زائد طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں تین ہزار کے لگ بھگ طلباء ہائل میں مقیم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے طب، سائنس، انجینئرنگ اور دیگر شعبوں کے نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ ہر فیکلٹی میں "شقافتِ اسلامی" کے نام سے ضروریات دین کے نصاب کا اضافہ کر دیا ہے جس میں عقائد، عبادات، معاملات، حقوق، اخلاق، اور دیگر ضروریات کے بارے میں قرآن و سنت اور فقہ کی ضروری تعلیمات کو سودا گیا ہے۔ تاکہ مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے والے دینی لحاظ سے بھی اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہوں اور ایک دیندار مسلمان کے طور پر اپنے اپنے شعبہ میں ملی و قومی خدمات سرانجام دے سکیں۔

انہوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں سماڑھے پانچ سو کے قریب اساتذہ کام کر رہے ہیں جبکہ شقافتِ اسلامی کے نصاب کی تعلیم کیلئے سماڑھ ستر اساتذہ کا اضافہ کیا گیا ہے جن کیلئے مستند عالم دین ہونا شرط ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے پاس اسلامی جذبات سے سرشار نظریاتی اساتذہ کام کر رہے ہیں جن کی تجوہیں بہت معمولی ہیں اور ایک پروفیسر کی تجوہ پاکستانی کرنی کے حساب سے پندرہ سوروپے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن وہ اس کے باوجود ملی خدمت کے جذبے سے تعلیمی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اساتذہ کو قبول نہیں کیا بلکہ بعض اساتذہ تو ایسے ہیں کہ شام کو پارٹ ٹائم کی تجوہ پر ملازمت کی پیشکش کی گئی ہے مگر انہوں نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ بعض اساتذہ تو ایسے ہیں کہ شام کو پارٹ ٹائم پر ایکویٹ ملازمت کر کے اپنے آخرات پورے کرتے ہیں۔ مگر چونکہ تعلیم کے ساتھ ان کا نظریاتی اور شعوری تعلق ہے اس لیے وہ اس سے واپسی کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ کابل میں طالبان کی حکومت قائم ہونے تک سکولوں میں وہی پرداں سیکولر نصاب تعلیم راجح تھا اور مخلوط تعلیم کا نظام بدستور چلا آرہا تھا۔ اور یہ دونوں باتیں ہمارے لیے قطبی طور پر قابل قبول نہیں تھیں اس لیے ہمیں مجبوراً لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ مکمل طور پر بند کرنا پڑا جسے اب ابتدائی سطح پر دوبارہ شروع کر دیا گیا ہے اور ہزاروں بچیاں پر امری سطح کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ جبکہ نیا نصاب تعلیم مرتب کرنے کا کام جاری ہے اور اس کے ساتھ لڑکیوں کیلئے جدا گانہ سکولوں کی تعمیر اور انہیں گھروں سے باپرہ دلانے لے جانے کا انتظام فراہم ہوتے ہیں اور پر کی سطح پر بھی زنا نامہ تعلیم کا سلسلہ بند رکھ آگے بڑھایا جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ افغانستان کیلئے اقوام متحده کے نمائندے نے بھی ان سے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور انہیں

یونیورسٹی کا دورہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ہماری موجودہ تعمیرات اور انتظامات طالبہ کیلئے بھی ناکافی ہیں اور ہمیں مزید تعمیرات کی ضرورت ہے جن کیلئے ہمارے پاس فنڈ نہیں ہیں۔ اس لیے اگر ہمارے معمراً لڑکیوں کی تعلیم کیلئے الگ عمارت کی تعمیر اور آمد و رفت کے باپر دو انتظامات کیلئے تعاون کریں اور ضروری فنڈ فراہم کر دیں تو ہم کسی تاخیر کے بغیر ہائی سکول اور کالج و یونیورسٹی کی سطح پر بھی لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے کیلئے تیار ہیں۔

مولانا پیر محمد روحاںی نے بتایا کہ نیا صاحب تعلیم مرتب کرنے کا کام جاری ہے اور ہم اختر میڈیٹ تک ضروریات دین اور ضروری عصری علوم کا مشترکہ نصاب مرتب کر رہے ہیں جو سب طالبہ اور طالبات کیلئے لازمی ہو گا اور اس کے بعد طالبہ کے ذوق و صلاحیت اور ملکی ضروریات کے پیش نظر الگ الگ شعبوں کی تعلیم کا نظام وضع کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ ہم نے زیر و پوائنٹ سے کام شروع کیا ہے اور دھیرے دھیرے بذریعت آگے بڑھ رہے ہیں اس لیے بہت سا خلاء دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن جب ہم آگے بڑھیں گے اور یہ نظام تکمیل تک پہنچ گا تو سب لوگ مطمئن ہو جائیں گے۔

## افغانستان میں این جی اوز کا کردار

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۲۹ اگست ۲۰۰۰ء

میرے افغانستان جانے کے مقاصد میں ایک بات یہ بھی تھی کہ بین الاقوامی ادارے اور غیر ملکی این جی اوز وہاں افغانستان کی تعمیر نو کے عنوان سے جو کام کر رہی ہیں ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔ اسی سلسلہ میں دو اصحاب سے ملاقات ہوئی اور ان سے ان اداروں کی سرگرمیوں کے حوالے سے مختصر تبادلہ خیالات ہوا۔ ایک وزارت صحت میں بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ کے ڈائریکٹر مولانا شمس الدین حقیار ہیں جو وزارت صحت سے متعلق این جی اوز کی نگرانی کرتے ہیں۔ اور دوسرے جانب سہیل فاروقی ہیں جو کسی سرکاری منصب پر نہیں ہیں مگر این جی اوز کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ مغربی ممالک سے آنے والی این جی اوز کی بجائے مسلم ممالک کی این جی اوز اور رفاهی ادارے افغانستان کی تعمیر نو اور افغان عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیں اور آگے آئیں، تاکہ ان منفاسد اور خرابیوں سے بچا جاسکے جو مغربی ممالک کی این جی اوز کے تحرک ہونے سے سامنے آرہے ہیں۔ سہیل فاروقی صاحب اس سلسلہ میں پاکستان کے کئی شہروں کا دورہ کر چکے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ پاکستان سے جو اصحاب خیر طالبان حکومت سے تعاون کر رہے ہیں یا کرناچاہتے ہیں وہ چھپ چھپا کر اور انفرادی طور پر نہیں بلکہ سامنے آکر اور منظم صورت میں کریں تاکہ ان کے تعاون کا افغان رائے عامہ کو بھی علم ہو۔ اور یک طرفہ جو تاثر قائم ہو رہا ہے کہ افغان عوام کی امداد کیلئے صرف مغربی ممالک کے ادارے ہی دلچسپی رکھتے ہیں، اس کا ازالہ ہو سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کے عوام اور اصحاب خیر طالبان حکومت کی بہت امداد کر رہے ہیں لیکن چونکہ وہ انفرادی طور پر ہوتی ہے اور بہت سے اصحاب خیر سمجھتے ہیں کہ اس تعاون کے ظاہر ہونے سے ان کے ثواب میں فرق آئے گا اس لیے افغان عوام کیلئے پاکستانی بھائیوں کی امداد نظر نہیں آتی۔ جبکہ موجودہ حالات میں اس کی ضرورت ہے کہ یہ امداد نظر آئے اور وہ افغان عوام

کو معلوم ہو کہ ان کی بحالی اور تعمیر نو میں ان کے پاکستانی بھائی بھی پوری طرح شرک ہیں۔ مولانا شمس الدین حقیار نے بتایا کہ بیرونی ممالک سے آنے والی این جی او ز کو افغان حکومت کے ساتھ باقاعدہ معابدہ کرننا پڑتا ہے کہ افغانستان کی حدود میں امارتِ اسلامی افغانستان کے قوانین کا پوری طرح احترام کریں گی اور اگر ان کا کوئی کارندہ افغانستان میں کسی جرم کا ارتکاب کرے گا تو اسے اس ملک کے قوانین کے تحت سزا دی جائے گی۔ اس معابدہ کے تحت این جی او ز افغانستان میں کام کر رہی ہیں اور ہم ان کی سرگرمیوں کی پوری طرح مگر اپنی کرتے ہیں۔

افغانستان میں کام کرنے والی غیر ملکی این جی او ز کے بارے میں چند شکایات سننے میں آ رہی ہیں۔ ایک یہ کہ طالبان حکومت نے سابقہ دور کے جن کمیونٹ افسران اور الہکاروں کو ملازمت سے فارغ یا ماتھاں میں سے بیشتر این جی او ز میں کھپ کے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ این جی او ز ان افراد کو کھانے میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں جس کی وجہ سے بہت سی این جی او ز کا مل حکومت کے سابق کمیونٹ الہکاروں کی پناہ گاہیں بلکہ کمین گاہیں بن گئی ہیں۔

دوسری شکایت یہ ہے کہ ان این جی او ز میں بین الاقوامی اداروں کے انتظامی اور غیر ترقیاتی اخراجات کا تابع بہت زیادہ ہے۔ یعنی ان کے فراہم کردہ فنڈز میں سے افغان عوام کی ضروریات پر رقم کم خرچ ہوتی ہے اور ان اداروں کے اپنے دفاتر، عملہ کی تجوہوں، آمد و رفت اور دیگر ضروریات پر اس سے کہیں زیادہ رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ مثلاً سہیں فاروقی صاحب نے بتایا کہ افغانستان کیلئے اقوام متحدہ کا سالانہ فنڈ ۲۰۰ ملین ڈالر ہے مگر اس کا ۸۰ فیصد انتظامی اخراجات پر لگ جاتا ہے اور صرف ۲۰ فیصد رقم افغان عوام کی فلاج و بہبود پر خرچ ہو پاتی ہے۔

پھر یہ شکایت بھی سننے میں آئی ہے کہ بعض این جی او ز عوام کو امداد دینے سے زیادہ امداد دینے کے عمل کو فلمانے اور ان کی ویڈیو تیار کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں بطور مثال بتایا گیا کہ ایک بستی میں خواتین میں روٹیاں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا مگر پہلی بار عورتیں مطلوبہ تعداد میں نہیں آئیں تو ان کو روٹی نہیں ملی۔ دوسری بار پھر اعلان کیا گیا اور جب خاصی تعداد میں خواتین جمع ہو گئیں تو پہلے ان کی ویڈیو بنائی گئی اور پھر روٹیاں تقسیم کی گئیں۔ حالانکہ ویڈیو بنانا افغانستان میں منع ہے اور افغان قوانین کی خلاف ورزی کے ضمن میں آتا ہے۔

دوسری طرف طالبان حکومت کی صورتحال یہ ہے کہ خشک سالی، بین الاقوامی پابندیوں اور مسلسل حالت جنگ کی سے طرف مشکلات کے باوجود عام اشیائیے صرف پر ٹکس لگانے سے گریز کیا جا رہا ہے تاکہ عام شہریوں کو ضرورت کی چیزیں سنتے داموں ملتی رہیں۔ جبکہ وزراء اور افسران معمولی تجوہوں پر گزارہ کر رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض و فاقہ وزراء تک کی تجوہیں پاکستانی کرنی کے حساب سے دوہر اروپے سے زیادہ نہیں بنتیں۔ یہی وجہ ہے کہ عین حالت جنگ میں بھی کابل میں آئی کی ایک لکوکی بوری سات سوروپے میں، چینی بارہ روپے فی کلو، گھنی کا بڑا کنٹرپاچ سوروپے، پیڑوں اٹھارہ روپے لیٹر، اور بکرے کا گوشت چالیس روپے فی کلو کے حساب سے مل رہا ہے۔ اور جو گاڑی بھاری بھر کشم ڈیوٹی کے باعث پاکستان میں تین سو تین لاکھی ملی ہے افغانستان میں برائے نام کشم ڈیوٹی کی وجہ سے ایک لاکھ روپے میں مل جاتی ہے۔

اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ طالبان حکومت نے خود قاععت اور کلفایت شعاری کا اختیار کرتے ہوئے اپنے عوام کو ٹکیسوں کے غیر ضروری بوجھ سے بچایا ہوا ہے۔ مگر طالبان حکومت کے بس میں صرف بیکی ہے کہ وہ اپنے اخراجات کو کم

سے کم کر کے عوام کو سہولت پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ جن کاموں کیلئے فنڈر کی ضرورت ہے ان کو پورا کرنا ان کے اختیار سے باہر ہے۔ مثلاً سڑکوں کی حالت انتہائی ناگفته ہے، خصوصاً پشاور سے کابل جانے والا روڈ جو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے پوری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اور ان سڑکوں وغیرہ کی تعمیر کیلئے طالبان حکومت کے پاس مطلوبہ فنڈر موجود نہیں ہیں۔ جبکہ ہین الاقوامی ادارے امداد اور تعاون کیلئے جو شرکاء عائد کر رہے ہیں ان کو پورا کرنا طالبان حکومت کیلئے ممکن ہی نہیں۔ ان میں سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ طالبان حکومت اقوام متحده کے چارٹر اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفے کو قبول کر کے شرعی قویں کے عملی نفاذ سے دستبردار ہو جائے۔ ظاہر ہاتھ ہے کہ ایسا کرنے سے تو طالبان کے وجود اور ان کے اقتدار کا جواز ہی ختم ہو کرہ جائے گا۔

ان حالات میں افغانستان کے عوام اور طالبان حکومت کی مشکلات و مسائل اور ضروریات کو سمجھنا اور ان کا حقیقت پسندانہ چائزہ لیتے ہوئے افغان عوام کی بحاجی اور افغانستان کی تعمیر نو میں ان سے تعاون کرنا نہ صرف دنیا بھر کی مسلم حکومتوں کی ذمہ داری ہے بلکہ اسلامی رفاقت اداروں، مسلم این. جی اوز اور اصحاب خیر کا بھی فرض بتاتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اس مشکل اور آزمائش کے مرحلہ میں افغان بھائیوں کا ہاتھ تھام کر انہیں مسائل و مشکلات کے اس بھنوں اور دلدل سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

## افغانستان کے اخبارات پر ایک نظر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۳۰ اگست ۲۰۰۴ء

میں افغانستان کی حدود میں ۱۲ اگست کو دوپہر کے وقت داخل ہوا اور ۱۵ اگست کو اسی وقت افغانستان سے واپسی پر پاکستان کی حدود میں قدم رکھا۔ اس طرح مجھے افغانستان میں تین دن گزارنے کا موقع ملا جس کے دوران کابل کے علاوہ جلال آباد، سروپی اور قروہ باغ کے علاقوں میں بھی تھوڑے وقت کیلئے جانے کا موقع مل گیا۔

ان تین دنوں میں میری نظریں بازاروں میں کسی ایسے اسٹال کی تلاش میں رہیں جہاں اخبارات و رسائل فروخت ہوتے ہوں مگر کوئی اسٹال اس قسم کا میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ واپسی پر جلال آباد کے ایک بازار میں چھوٹا سا اسٹال نظر آیا جس کے باہر ایک ڈوری پر ”نگرہار“ نامی اخبار لٹکا ہوا دکھائی دیا جو پشتو زبان میں ہے۔ یہ اخبار نگرہار صوبے کے نام پر اس کے دار الحکومت جلال آباد سے شائع ہوتا ہے۔ چار صفحے کے اس اخبار کی قیمت پوچھی تو اسٹال کے مالک نے، جو نو عمر لڑکا تھا، دروپے بتائی مگر اس نے ہمیں مہمان سمجھتے ہوئے اخبار بالاقیمت ہمارے حوالے کر دیا۔

اخبارات و رسائل کسی سوسائٹی کی مجموعی صور تھال کی عکاسی کرتے ہیں بشرطیہ وہ آزاد ہوں اور پورے اعتقاد کے ساتھ معاشرہ کے مجموعی حالات کو آئینہ کی سکرین پر دکھائیں ہوں۔ آزادی سے مراد صرف ریاتی پابندیوں اور پالیسیوں سے آزادی نہیں بلکہ آزاد صحافت کیلئے ان غیر مرأتی اور ریوٹ کنٹرول قدغنیوں اور رکاوٹوں سے آزادی بھی ضروری ہوتی ہے جو در پردہ لاپیوں اور خفیہ اداروں کی طرف سے غیر محسوس طور پر اخبارات و جرائد کے گرد ایک ناقابل عبور حصار کی

صورت میں قائم کر دی جاتی ہیں۔ اور بڑے بڑے خود مختار اور طاقتور نظر آنے والے اخبارات و رسائل بھی اپنے لیے اشاعی مواد کے اختباں اور پالیسی ترجیحات کے تعین میں ان رکاوٹوں کو عبور نہیں کرپاتے۔

میرا خیال تھا کہ کسی اسئل سے اخبارات و جرائد کا اختباں کروں گا اور انہیں سامنے رکھتے ہوئے افغانستان میں صحفت کی موجودہ صورت حال کے بارے میں کچھ لکھوں گا۔ مگر کابل سے صرف روزنامہ ”ھیواد“ کا ایک پرچہ اپنے میزبان کے گھر سے ملا جکہ جلال آباد سے روزنامہ ”منگھر“۔ البتہ مولانا محمد الیاس چنیوٹی نے اچھا کیا کہ میرے اس ذوق اور تلاش کو محسوس کرتے ہوئے ”کابل ناگز“، ”انیس“ اور ”شریعت“ کا ایک ایک شمارہ میرے لیے لیتے آئے۔ چونکہ وہ میرے بعد دو دن وہاں رہے اس لیے روزنامہ انیس کا ۱۲ اگست کا شمارہ بھی ان کی وساطت سے دیکھنے کو مل گیا۔

”کابل ناگز“ چار صفحات کا الگش ہفت روزہ ہے جس کے چیف ایڈٹریٹر عیسیٰ خان ہیں اور یہ اخبار الیبرальнی پبلشنگ ہاؤس کابل سے شائع ہوتا ہے، اس کی قیمت ایک ہزار افغانی یا دو روپے پاکستانی ہے۔ اس کا ایڈریس پوسٹ بکس ۱۵۲۰ پی او کابل اور فون نمبر ۷۸۳۸ ۷۸۳۸ ہے۔ پونکہ میں الگش نہیں پڑھ سکتا اس لیے اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

روزنامہ ”ھیواد“ کابل سے شائع ہوتا ہے، پشتو زبان میں ہے، اس کے مدیر ملا اسد اللہ حنفی ہیں، امارت اسلامی افغانستان کے مرکزی ادارہ نشریات کی طرف سے چھپتا ہے، چار صفحات کا اخبار ہے، اور اس کا ۱۲ اگست کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ میں پشتو نہیں پڑھ سکتا مگر اس کا ایک صفحہ فارسی میں بھی ہے جو مفہوم سمجھنے کی حد تک پڑھ لیتا ہوں۔ چونکہ ۱۲ اگست پاکستان کا یوم آزادی ہے اس لیے طبعی طور پر یہ دیکھنے کو جی چاہا کہ اس اخبار میں پاکستان کے یوم آزادی کے حوالے سے کوئی مضمون یا خبر چھپی ہے یا نہیں۔ مگر اخبار کے چاروں صفحات پر نظر ڈال کر افسوس ہوا کہ اس سلسلہ میں کوئی مواد مضمون یا خبر کی صورت میں موجود نہیں تھا۔

پشتو اخبار ”شریعت“ ہفت روزہ ہے جس کے مدیر عبد الرحیم ثاقب ہیں اور یہ بھی امارت اسلامی افغانستان کے مرکزی شعبہ نشریات کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔

”انیس“ فارسی روزنامہ ہے جو کابل سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے بانی کے طور پر غلام مجید الدین انیس کا نام پیشانی پر درج ہے اور ناشر ”مدرسہ نشریاتی انیس کابل“ ہے۔ ایڈریس پوسٹ بکس ۵۴۹ کابل ہے۔ اخبار میں فارسی کے ساتھ ساتھ کچھ مضمین اور خبریں پشتو میں بھی ہیں۔ اخبار انیس کا ۱۲ اگست کا شمارہ میرے سامنے ہے اور پونکہ یہ دن افغانستان میں ”یوم استقلال“ کے طور پر منایا جاتا ہے اس لیے زیادہ تر مضمین اور کچھ خبریں استقلال کے حوالے سے ہیں۔

افغانستان میں ”یوم استقلال“ برطانوی استعمار کے خلاف افغانستان کی جنگ آزادی میں کامیابی اور برطانیہ کی طرف سے افغانستان کی آزادی کو تسلیم کرنے کی خوشی میں منایا جاتا ہے جو ۱۹۱۹ء میں ”معاہدہ راولپنڈی“ کی صورت میں تسلیم کی گئی تھی۔ اس سے قبل افغانستان پر برطانوی فوجوں کی یلغار ہتی تھی اور متعدد بار کابل، قندھار اور جلال آباد پر برطانوی فوجوں کا قبضہ ہوا۔ اور ایک مرحلہ پر وائی افغانستان امیر عبد الرحمن خان نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ کے عوض افغانستان کے بیرونی معاملات کا کنٹرول تحریری طور پر برطانوی حکومت کے سپرد کر دیا۔ گرماج ۱۹۱۹ء میں امیر عبد

الرحم خان کے پوتے امیر امان اللہ خان نے برطانوی استعمار سے مکمل آزادی کا اعلان کر کے جگ چھپڑی جس میں برطانوی فوجوں کو افغان حریت پسندوں کے مقابلہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور پھر اس کے پیچے میں اسی سال اگست میں مذکورہ معاهدہ ہوا اور افغانستان کی آزادا اور خود مختار حیثیت کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

اگلش، فارسی اور پشتون کے یہ سب اخبارات چار چار صفحات کے ہیں، ان میں جاندار کی تصویر نہیں ہے، کسی عنوان پر تجویزی مضمایں اور فچروں کا کوئی سلسلہ موجود نہیں ہے، اور مراسلات کا کوئی کالم بھی نظر سے نہیں گزرا۔ جبکہ میرے لیے کسی اخبار کا سب سے زیادہ دلچسپی کا کالم یہی ہوتا ہے اور اسی سے میں سوسائٹی کے مجموعی رجحانات کا اندمازہ کرتا ہوں۔ یہ اخبارات چونکہ سرکاری طور پر شائع ہوتے ہیں اس لیے انہیں حکومتی خبر نامہ یا گزٹ کہنا زیادہ مناسب ہو گا جس سے حکومتی پالیسیوں اور ترجیحات کا پتہ چل جاتا ہے۔ جبکہ اخبار اس سے بالکل مختلف چیز ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک ”آئینہ“ کی ہوتی ہے جو چہرے کے حسن و فتح دونوں کو یکساں دکھانے تو اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ ورنہ کسی صاف اور شفاف آئینے پر بھی اپنی مرضی کے نقش و نگار مر قسم کر دیے جائیں تو وہ اپنے تمام تر حسن اور چک کے باوجود آئینہ کھلانے کا سختی نہیں رہتا۔

## طالبان حکومت کی مشکلات اور عزم

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۴ء

گذشتہ ہفتہ کے دوران راقم الحروف کو حركة الجہاد الاسلامی کے ایک وفد کے ہمراہ کابل جانے کا موقع ملا۔ مدیر نصرۃ العلوم حاجی محمد فیاض خان سواتی اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے مدرس مولانا ظفر فیاض بھی وفد میں شامل تھے۔ راقم الحروف ۱۳ اور ۱۴ اگست دو روز کابل میں گزار کرواپس آگیا جبکہ وفد کے دیگر کان غزنی اور قندھار بھی گئے اور براستہ کوئی واپس آئے۔

ہم نے کابل میں دو روزہ قیام کے دوران طالبان حکومت کے جن ذمہ دار حضرات سے ملاقات کی ان میں سے امارت اسلامی افغانستان کے نائب صدر مال محمد حسن، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولانا نور محمد شاقب، کابل یونیورسٹی کے چانسلر مولانا پیر محمد روحانی، اور ممتاز افغان کمانڈر مولانا ارسلان رحمانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس سفر اور کابل وغیرہ میں میزبانی کے انتظامات حركة الجہاد الاسلامی العالی نے کیے جس پر ہم سفر کے منتظم فاری عبد القادر صاحب اور حركة الجہاد الاسلامی کے دیگر ذمہ دار حضرات کے شکر گزار ہیں۔

افغانستان کے اس سفر میں وہاں کی صورت حال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کر کے خوشی ہوئی کہ مسائل و مشکلات میں مسلسل اضافہ کے باوجود طالبان کی اسلامی حکومت کے اہلکار پورے صبر و حوصلہ، ایثار و استقامت اور قیاقت و کفایت شعاری کے ساتھ حکومتی نظام چلارہے ہیں، جو بلاشبہ قابلِ رشک اور لائق تقدیم ہے اور طالبان کے خلوص اور دینی تربیت کا ثمرہ ہے۔

اس سلسلہ میں مزید تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک مثال کا ذکر کردیا کافی معلوم ہوتا ہے کہ طویل خشک سالی، ہین الاقوامی اقتصادی پابندیوں اور مسلسل حالتِ جنگ کے باوجود طالبان حکومت عام آدمی کے استعمال میں آنے والی ایشیا پر ٹکس کرنے سے گریز کر رہی ہے، جو خود مشقت اٹھا کر عوام کو سہولت پہنچانے کی بہترین مثال ہے۔ اور اسی وجہ سے کابل میں عام شہریوں کو چینی ۱۲ روپے (پاکستانی) فی کلو، آٹے کی ۸۰ کلو کی بوری ۴۰۰ روپے، بکرے کا گوشت ۲۰ روپے فی کلو، گھی کا ڈب (کنستر) ۵۰۰ روپے، اور پیروں ۱۸ روپے فی لیٹر کے حساب سے فراہم ہو رہا ہے۔ اور جو گاڑی ہمارے ہاں پاکستان میں کئی گناہ کشم ڈیوٹی ادا ہونے کے بعد تین سو اتنی لاکھ میں ملتی ہے وہ افغانستان میں معمولی کشم ڈیوٹی کی وجہ سے ایک لاکھ روپے میں مل جاتی ہے۔

البتہ افغانستان میں سڑکوں کی حالت انتہائی ناگفتہ ہے اور جنگ کی تباہ کاری کے بعد انہیں دوبارہ بنانے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عالیٰ مالیاتی ادارے اور ترقی یافتہ ممالک افغانستان کو جن شرائط پر امداد دینا چاہتے ہیں وہ طالبان کی اسلامی حکومت کیلئے قابل قبول نہیں ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم شرط اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کو قبول کر کے اسلامی احکام و قوانین کے عملی نفاذ سے دستبردار ہونا ہے۔ جس کیلئے طالبان حکومت تیار نہیں ہے اور پورے عزم و استقامت کے ساتھ مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے موقف پر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں افغان نائب صدر ملا محمد حسن نے ہمارے وفد سے ملاقات کے دوران کہا کہ ہم وہی اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے دور میں نافذ تھا اور اس بارے میں ساری دنیا و سری طرف ہو جائے ہم کسی کی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ طالبان کی اسلامی حکومت کو اس مبارک عزم پر قائم رکھیں اور انہیں مشکلات و مسائل کے بھنوں سے نجات دلا کر استحکام اور ترقی کی راہ پر گامزن فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

## حرکۃ المجاہدین کا طلبہ سیمینار

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۶ ستمبر ۲۰۰۴ء

کراچی میں حرکۃ المجاہدین کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے "طلباء سیمینار" میں شرکت کیلئے ۳۳ انتربر کورٹ مولانا اللہ و سایا قاسم اور سید سلمان گیلانی کے ہمراہ کراچی پہنچا تو ایئر پورٹ پر ہی اطلاعِ مل گئی تھی کہ انتظامیہ نے نشترپارک میں حرکۃ المجاہدین کو سیمینار منعقد کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے اور نشترپارک کو پولیس کی گاڑیوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے تاکہ حرکۃ کے نوجوان وہاں سیمینار کے انتظامات نہ کر سکیں۔ لگشن اقبال میں حرکۃ کے ترجمان ہفت روزہ "اہل الہلال" کے دفتر ہنچ کر مزید تفصیلات معلوم ہوئیں اور پتہ چلا کہ گھنٹو جاری ہے مگر انتظامیہ کے اربابِ حل و عقد اس بات پر مصروف ہیں کہ یہ سیمینار نشترپارک میں نہ ہو بلکہ کسی اور جگہ منعقد کر لیا جائے۔ حرکۃ کے نوجوانوں کا اصرار تھا کہ اگر انتظامیہ کو ممکن کرنا تھا تو یہ بات چند روز پہلے کہہ دی جاتی کیونکہ سیمینار کا اعلان اور اس کی تشویش کافی دنوں سے ملک بھر میں

ہو، یہ تھی مگر سب اعلانات، رابطوں اور انتظامات کے مکمل ہونے کے بعد صرف ایک دن پہلے نشترپارک کو منوع قرار دینا سخت نا انصافی بلکہ جانبدارانہ طرز عمل کی غمازی کرتا ہے۔ کیونکہ اب نہ دوبارہ تشریف ہو سکتی ہے اور نہ ہی مختلف مقامات پر احباب سے رابطے کر کے سب کو متبادل جگہ کے بارے میں بتایا جاسکتا ہے۔ حرکت کے نوجوانوں کو اس بات کا غصہ تھا کہ انہی ماضی قریب میں نشترپارک میں فلاں فلاں تنظیم کے جلسے ہو چکے ہیں تو حرکت کے سیمینار میں کیا خرابی نظر آ رہی ہے کہ انتظامیہ نشترپارک میں اس کے انعقاد کی روادرار نہیں ہے۔

میرے لیے اس موقع پر انتظامیہ کے کسی ذمہ دار سے بات کرنا اور ان سے اس صورتحال کی وجہ معلوم کرنا تو بہت مشکل تھا البتہ ارباب نظم و نقد کے موقف کا بالواسطہ طور پر جتنا علم ہو سکا اس کے مطابق ظاہری بات تو یہ تھی کہ وہ امن عامہ کے نقطہ نظر سے نشترپارک میں اس سیمینار کے انعقاد کو درست نہیں سمجھ رہے تھے لیکن یہنے اس طور پر یہ بات بھی صاف پڑھی جا رہی تھی کہ اتنی مصروف اور تاریخی جلسے گاہ میں "حرکتہ المجاہدین" کے اتنے بڑے جلسے کا انعقاد امریکہ بہادر کو زیادہ ناگوار گزرنے گا جس نے حرکتہ المجاہدین کو دہشت گرد تنظیم قرار دے رکھا ہے اور جس کی طرف سے حرکتہ المجاہدین پر پابندی کا بار بار مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وائٹ ہاؤس کی چشم شتمگیں کا سامنا کرنا پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے کسی بھی حصے کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے بالآخر اسی صبح تک حرکتہ المجاہدین کی قیادت کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ طلباء سیمینار کا انعقاد نشترپارک کی بجائے گلشنِ اقبال کے اردو سائنس کالج کی گروئنڈ میں کر لیں جو اگرچہ نشترپارک کی طرح معروف نہیں ہے مگر وسعت میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

اس صورتحال پر حرکتہ المجاہدین کے چند پر جوش نوجوانوں کا تباہہ یہ تھا کہ ہمارے سیمینار کو ناکام بنانے کی جان بوجھ کر سازش کی گئی ہے مگر میں نے ان سے عرض کیا کہ نشترپارک میں اجازت دینے سے انکار کر کے اور ایک دن قبل بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ پارک کا گھیرا کر کے انتظامیہ نے ان کے سیمینار کی پچاس فیصد کامیابی کا اعلان خود ہی کر دیا ہے اس لیے وہ پریشان ہے ہوں اور باقی پچاس فیصد کامیابی کو تینی بنانے کیلئے شام تک اطلاعات اور رابطوں کے مجاز پر ڈٹ جائیں تاکہ پابندی لگانے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ زندہ جماعتیں کیلئے یہ پابندی اور نقل مکانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے ہدف تک پہنچ جایا کریں ہیں۔

میرا خیال تھا کہ چونکہ متبادل انتظامات اور لوگوں کو جگہ کی تبدیلی کی اطلاع دینے کیلئے صرف ایک دن کا وقت ملا ہے اس لیے حرکت کے نوجوان اگر اس خلا کو پچاس فیصد بھی پر کر لیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ لیکن رات کو جب اردو سائنس کالج کے گروئنڈ میں سیمینار میں شرکت کیلئے پہنچا تو حاضرین کی تعداد اور نوجوانوں کا جوش و خروش دیکھ کر پہلے یہی محسوس ہوا کہ جلسہ شاید نشترپارک میں ہی ہو رہا ہے کیونکہ کسی بھی حوالے سے کوئی کسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ گواہ حرکت کے نوجوانوں نے اسے بھی "محاذِ جنگ" تصور کرتے ہوئے ہنگامی بنیادوں پر سارے متبادل انتظامات بر وقت کر دیا لے تھے۔ حاضری کے اعتبار سے یہ سیمینار کراچی کے چند بڑے جلوسوں میں شمار کیا جاسکتا ہے اور نظم و نقد کو جس طرح حرکت کے نوجوانوں نے کنٹرول کیا اس نے افغانستان کی طرح پاکستان کی سر زمین پر بھی لوگوں کو یہ مشاہدہ کر دیا کہ ڈاڑھیوں والے اور مسجد کی چٹائی پر بیٹھ کر سبق پڑھنے پڑھانے والے اگر نظم و نقد کے محاذ پر آ جائیں تو یہ میدان بھی ان کیلئے اجنبی

نہیں ہے۔

میرے لیے مجاہدین کی سب جماعتیں اور گروپ کیساں حیثیت رکھتے ہیں، جو جہادی تنظیم اپنے کسی پروگرام میں شرکت کی دعوت دیتی ہے اسے بلا جھگٹ قبول کرتا ہوں لیکن حرکتہ المجاہدین کا نام چونکہ امریکی حکمرانوں کی زبان پر بار بار آتا ہے اس لیے اس کے ساتھ طبعی طور پر زیادہ قبیل انس محسوس کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے ختم نبوت کے محاذ پر کام کرنے والی ہر جماعت کا خادم ہوں اور ہر ایک سے ہر ممکن تعاون کرتا ہوں لیکن چونکہ مرزا طاہر احمدی کی زبان پر مولانا مظفر احمد چنیوٹی کا نام بار بار آتا ہے اس لیے اس میدان میں مولانا چنیوٹی کے ساتھ میرا انس طبعی طور پر زیادہ ہے، یہ بھی ایک معیار ہے۔

مجھے سیمینار میں خطاب کیلئے کہا گیا تو میری گفتگو کا آغاز اسی نکتے سے ہوا کہ میں زندہ دلان کرچی کا شکر گزار ہوں اور انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ حرکتہ المجاہدین کی دعوت پر رکاوٹوں کے باوجود اتنی عظیم تعداد میں جمع ہو کر انہوں نے حرکتہ المجاہدین کو دہشت گرد قرار دینے کے امریکی فیصلے کو مسترد کر دیا ہے اور وائٹ ہاؤس کو یہ پیغام دے دیا ہے کہ ہم نہ تو حرکتہ المجاہدین کو دہشت گرد جماعت سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس پر پابندی کی کسی کارروائی کو برداشت کر پائیں گے۔

## وسطی ایشیا کی ریاستیں آزادی کے بعد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۳۰ ستمبر ۲۰۰۰ء

نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی انتظامیہ نے ازبکستان سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کی تنظیم "ازبک اسلامک فرنٹ" کو بھی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کر کے اس پر پابندی لگانے کا اعلان کر دیا ہے۔ رپورٹ میں امریکی حکم خارجہ کے شعبہ انسداد دہشت گردی کے کو اڑی ٹینیز مائیکل شیہان کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ عام طور پر دہشت گرد تنظیموں کی فہرست پر دو سال کے بعد نظر ثانی ہوتی ہے اور کسی نئی تنظیم کو اسی موقع پر فہرست میں شامل کیا جاتا ہے لیکن ازبک مجاہدین کی اس تنظیم کی سرگرمیوں کے پیش نظر دو سال کی اس مدت کے دوران ہی روٹین سے ہٹ کر اسے فہرست میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس سے امریکہ کے نزدیک دہشت گرد تنظیموں کی تعداد ۲۹ ہو گئی ہے۔

ازبکستان وسطی ایشیا کے ان ممالک میں سے ہے جو سوویت یوینین کے بکھرے کے بعد آزاد ہوئے ہیں اور غالب مسلم اکثریت کے ممالک ہیں۔ تاشقند اور سرفند جیسے معروف شہر اسی ازبکستان میں ہیں اور ایک زمانہ میں یہ خطہ اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے مرکز میں شہار ہوتا تھا۔ مگر روس میں کمیونٹ افلاط کے بعد یہ علاقہ بھی کمیونزم کے زیر تسلط آگیا اور اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و اقدار کی روایات قصہ پاریہ بن کر رہ گئیں۔ کم و بیش پون صدی تک وسطی ایشیا کے یہ ممالک کمیونزم کے غلبہ کا شکار ہے اور جہاد افغانستان کے نتیجے میں جب سوویت یوینین کا آہنی شکنجه ڈھیلا ہوا تو سوویت یوینین کی یہ ریاستیں دنیا کے نقشہ پر آزاد ممالک کی حیثیت سے نمودار ہو گئیں۔

ازبکستان کے آزادی کی حدود میں قدماں رکھنے کے بعد راقم الحروف کو وہاں جانے کا موقع ملا ہے اور تاشقند و سرفند

میں چند روز گزارنے کے علاوہ سرقت سے چند میل کے فاصلے پر ”خربتگ“ میں حضرت امام جماری کے مزار پر حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ یہ چند سال پہلی کی بات ہے جب وہاں بند مساجد و بارہ محل رہی تھیں اور اسلامی روایات و اقدار کا ایک بار پھر احیاء ہو رہا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہزاروں مساجد ایسی ہیں جو پون صدری کا عرصہ مقفل رہی ہیں اور بہت سی مساجد کو دوسرے مقاصد کیلئے استعمال میں لایا جاتا رہا ہے۔ تاشقند کی ایک بڑی مسجد ہم نے دیکھی جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ چالیس سال تک یہ مسجد سینٹ کے گودام کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ سرفتنڈ کی مرکزی جامع مسجد میں بھی حاضری ہوئی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اس مسجد کا مین ہال تقریباً نصف صدی تک سینماہاں بنارہا۔

عام زندگی میں نمازوں غیرہ عبادات کا اظہار ممکن نہیں تھا، کچھ لوگ چوری چھپڑتے تھے۔ ایک عالم دین نے بتایا کہ ملازمت سے دوپہر کے وقفے کے دوران وہ کھانے کیلئے گھر آتے تو ٹوبھر کی نماز اس کی گفتگو سے پڑھتے تھے کہ ایک شخص دروازے پر پہر دیتا تھا تاکہ کسی کے دیکھنے کا خطرہ محسوس ہو تو وہ نماز پڑھنے والے کو نماز تورنے کا اشارہ کر سکے۔ قرآن کریم کا چھاپنا اور پڑھنا شیر ممنوع تھا، حتیٰ کہ آزادی کا پرچم لہائے جانے کے بعد وہاں کے مسلمانوں کا باتی دنیا کے مسلمانوں سے سب سے بڑا تقاضہ یہ تھا کہ انہیں قرآن کریم کے جس قدر نئے مہیا کیے جاسکیں کیے جائیں۔ چنانچہ سعودی عرب اور مصری حکومتوں اور پاکستان کے دینی اداروں نے کروڑوں کی تعداد میں قرآن کریم چھپا کر ان ممالک میں تفہیم کرائے۔

لیکن ان ممالک کی بدمتی یہ رہی کہ آزادی کا لیبل چسپاں ہونے کے باوجود ان ریاستوں میں حکومتی ڈھانچے، ریاتی نظام اور حکمران کلاس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور آزادی کے منتظم اور رکھوالے بھی وہی قرار پائے جو آزادی سے قبل کیونٹ نظام کو چلانے کے ذمہ دار تھے اور چلاتے آرہے تھے۔ اس طرح وسطیٰ ایشیا کے مسلمان شکار ہو چکے ہیں کہ کہنے کو ہمیں آزادی مل گئی اور ہم ”ٹریجیڈی“ ہوئی جس کا اس سے قبل ہم جنوبی ایشیا کے مسلمان شکار ہو چکے ہیں کہ کہنے کو ہمیں آزادی مل گئی اور ہم پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ملک کی حیثیت سے آزاد اقوام کی فہرست میں شمار کر لیے گئے مگر سیاست و معیشت اور عدالت و معاشرت کا نظام وہی رہا جو غلامی کے دور میں تھا، بلکہ حکمران کلاس اور طبقات بھی وہی رہے جو برطانوی استعمار کے معاون و مددگار کے طور پر آزادی سے قبل اس خط میں حکمرانی کرتے چلے آرہے تھے۔ اور اس فہم کی آزادی نے ہمارے معاشرتی نظام اور ڈھانچے کو ترقی اور بہتری کی طرف لے جانے کی بجائے تذبذب، انارکی اور دو عملی کی دلدل میں دھکیل دیا۔

ازبکستان اور وسطیٰ ایشیا کی دیگر مسلمان ریاستوں کے ساتھ بھی یہی الیہ پیش آیا ہے کہ جب افغانستان میں رو سی افواج کی شکست یقینی ہو گئی اور یہ واضح نظر آنے لگا کہ رو سی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کے سواب کوئی راستہ باقی نہیں رہا گیا تو شکست خورده رو سی دانشوروں سے زیادہ فتح امر کی دانشوروں کو اس بات کی فکر لاحق ہو گئی کہ افغانستان سے رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد جب کابل میں مجاہدین کی حکومت قائم ہو گئی تو اس کی بنیاد اسلام پر ہو گئی، یہ اسلام محض دکھاوے کا نہیں بلکہ عملی ہو گا اور اس کے اثرات صرف افغانستان تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ اردو گرد کے ممالک بالخصوص پاکستان اور وسطیٰ ایشیا کی ریاستوں کا اس سے متاثر ہونا لازمی بات ہے۔ اس لیے کابل میں خالص اسلامی حکومت کے قیام کو روکنے اور قائم ہو جانے کی صورت میں اس کے اردو گرد اثر انداز ہونے کی صلاحیت کو محدود کرنے کیلئے ایک نئی منصوبہ

بندی کی گئی جس کیلئے امریکہ کے سابق صدر مسٹر نکسن نے سب سے نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر رو سی دانشوروں کو دعوت دی کہ وہ امریکہ کے ساتھ اپنے اختلافات کو ختم کر دیں تاکہ امریکہ اور روس دونوں مل کر اپنے مشترکہ دشمن سے نمٹ سکیں جو ”احیائے اسلام“ کی ایک نئی لہر کی صورت میں خودار ہو رہا ہے اور کامل اس کے مرکز کے طور پر سامنے آنے لگا ہے۔

چنانچہ مسٹر نکسن کی تحریک پر نئی منصوبہ بندی ہوئی جس کے تحت ”جنیوا امن معاهدہ“ ہوا، امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ کا خاتمه ہوا اور بالٹیک ریاستوں کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کی ”نقذ آزادی“ کو غیرممتسمجھا گیا تاکہ کم از کم وہاں کے ریاضتی نظام اور حکومتی طبقات کو کسی متوقع انقلاب سے محفوظ رکھا جاسکے، حتیٰ کہ ان میں سے کسی ملک کے عوام اس نظام یا حکمران گروہ کی تبدیلی اور وہاں اپنے عقائد و روحانیات اور آزادی کے تقاضوں کے مطابق نئے نظام کے نفاذ کیلئے جدوجہد کرتے ہیں تو انہیں بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دے کر امریکہ اور روس دونوں ان کے خلاف سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

ازبک اسلامک فرنٹ کا معاملہ بھی یہی ہے کیونکہ وہ ان گروہوں میں سے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب سوویت یوینین بکھر گیا ہے تو وسطی ایشیا کے مسلمان ممالک سے کیوں نہ دور کی یاد گار نوآبادیاتی نظام کا بھی خاتمه ہونا چاہیے۔ ازبک اسلامک فرنٹ پر امریکہ کا لازم یہ ہے کہ اس نے ہتھیار اٹھا کرے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب منطق، دلیل اور استدلال کے سارے راستے بند کر دیے جائیں تو حق مانگنے والوں کے پاس ہتھیار اٹھانے کے سوکون سارستہ باقی رہ جاتا ہے؟ اور ترکی اور الجماہریہ میں رائے عامہ کا حشر سامنے آنے کے بعد امریکہ عالم اسلام کی تحریکات کو ہتھیار پھینک کر دلیل سے بات کرنے کے کون سے فلسفے کا سبق پڑھانا چاہتا ہے؟

## امریکی نائب وزیر خارجہ کارل انڈرفورٹھ کو پاکستان میں ”طالبانائزیشن“ کا خطرہ

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۰ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳۱ ستمبر ۲۰۰۰ء کے مطابق امریکہ کے نائب وزیر خارجہ مسٹر کارل انڈرفورٹھ نے کہا ہے کہ وہ طالبان کی حکومت کو صرف امریکہ اور دوسرے ممالک کیلئے ہی خطرہ نہیں سمجھتے بلکہ پاکستان کیلئے بھی خطرہ قرار دیتے ہیں کیونکہ انہیں تشویش ہے کہ پاکستان بھی طالبانائزیشن کا شکار ہو کر ایک زیادہ بنیاد پرست ملک بن سکتا ہے۔

amerikyik.com

امریکی حکمرانوں کے اس خدشے اور خطرہ کا اصل پس منظر یہ ہے کہ

- طالبان حکومت کے اکثر ایکار چونکہ پاکستان کے دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، اور ان کے پاکستان کے دینی حلقوں اور عوام کے ساتھ نہ صرف خوشگوار تعلقات ہیں بلکہ باہمی محبت و احترام اور تعاون و استفادہ کا رشتہ

- بھی موجود ہے،
- اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی امریکی حکمرانوں کیلئے مسلسل پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے کہ پاکستان سے جو لوگ افغانستان جاتے ہیں اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں وہ طالبان کی دینداری، سادگی، قیامت، عوام دوستی اور کفایت شعاری کے ساتھ ساتھ ان کی انتظامی صلاحیتوں اور وہاں کے ماحول میں شرعی قوانین کے نفاذ کی برکات دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔
  - حتیٰ کہ جسٹس ڈائٹر جاوید اقبال صاحب جیسے حضرات جو ناقدانہ نظر سے وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے جاتے ہیں، واپس آگر ان کیلئے بھی طالبان کے طرز حکومت کو سراہے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔
- اس لیے امریکی حکمران یہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کے عوام میں طالبان حکومت کے بارے میں جو ثابت جذبات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں، ان کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے ملک میں حکمرانی اور نظم و نسق کے حوالے سے اسی قسم کی قیادت کو سامنے لانے کے بارے میں سوچنے لگیں، جو طالبان کی پیروی کر کے ملک کو بدآسمانی اور عالمی طاقتلوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکتی ہو۔ مسٹر کارل انڈر فرٹھ کے مذکورہ بیان میں یہی خوف جھک رہا ہے اور امریکی حکمران پاکستان کے حکمران طبقات اور ادویوں کے ذہنوں پر بھی یہی خوف مسلط کر کے انہیں پاکستان میں طالبان کے اثرات کو کم اور محدود کرنے کیلئے سخت اقدامات پر آمادہ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اب ایسا کرنا ممکن نہیں رہا کیونکہ پاکستان کے دینی حلقوں میں طالبانائزیشن کا شعور دن بدن بڑھ رہا ہے اور عوام بھی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، جریلوں اور بیوروکریٹس پر مشتمل اسٹبلمنٹ کے طرز حکومت اور طالبان کے اندازِ حکمرانی میں زمین و آسمان کے فرق کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے اگر ملک کے عوام نے طالبانائزیشن کو اپنے دکھوں کا مد او استحقچے ہوئے اسے خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کر لیا تو ان شاء اللہ امریکی حکمرانوں کا یہ داویاً ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکے گا۔

## ازبک اسلامک فرنٹ پر امریکی پابندی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۰ء

ہفت روزہ الہلال کریمی نے ۲۲ تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں ”بیویارک ٹائمز“ کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ امریکی حکومت نے ازبک مجاہدین کی تنظیم ”ازبک اسلامک فرنٹ“ کو بھی دہشت گرد قرار دے کر اس پر پابندی لگانے کا اعلان کیا ہے۔ خبر کے مطابق امریکی حکمہ خارجہ کے انسداد دہشت گردی کے شعبہ کے انچارج مائنگل شیان نے بتایا ہے کہ دہشت گرد تنظیموں کی نہرست پر نظر شانی کر کے اسے دوبارہ جاری کرنے کا کام عام طور پر دو سال بعد کیا جاتا ہے لیکن ازبک اسلامک فرنٹ کی سرگرمیوں کے پیش نظر دنیا بھر کی دیگر اسلامی تحریکات کو اس قسم کی کارروائی کا اشارہ دینے کے لیے دو سالہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اسے دہشت گرد نیم قرار دے کر اس کا نام منوع جماعتیں کی نہرست میں

شامل کر دیا گیا ہے۔ جس سے امریکی حکومت کی طرف سے دنیا بھر میں دہشت گرد قرار دی جانے والی تنظیموں کی تعداد انتیں ۲۹ ہو گئی ہے۔

ازبک اسلامک فرنٹ کا تعلق وسطیٰ ایشیائی ایک مسلم ریاست ازبکستان سے ہے جو جہاد افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین کے بکھر جانے کے بعد اس خطہ کی دیگر مسلم ریاستوں کے ساتھ آزاد ہوئی تھی، لیکن ان سب ریاستوں کے حکومتی ڈھانچے اور نظامِ ملکت حتیٰ کہ حکمران ٹیمیں بھی بدستور وہی چلی آ رہی ہیں جو روسی تسلط کے دوران کیونٹ حکومت کے طور پر ان کا نظام سنبھالے ہوئے تھیں۔ جبکہ ازبک اسلامک فرنٹ اور اس جیسی متعدد دیگر تنظیموں ان ریاستوں میں اس مقصد کے لیے سرگرم عمل ہیں کہ سوویت یونین سے گلوخلاصی کے بعد کیونٹ نظام اور اس دور کے حکمران طبقوں سے بھی نجات حاصل کی جائے اور ان ممالک میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں لاایا جائے۔ ان میں بعض مسلح تحریکیں ہیں، اور علمی و فکری تحریکات بھی ہیں، جن کا طریق کار ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ لیکن ہدف سب کا یہی ہے کہ کیونٹ نظام اور کیونٹ دور کی حکومتوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قازقستان، آذربائیجان اور وسطیٰ ایشیائی دیگر مسلم ریاستوں میں قرآن و سنت کا نظام نافذ کیا جائے۔ اور امریکہ کی طرف سے ازبک اسلامک فرنٹ کو دہشت گرد قرار دینے کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے اثرات کو وسطیٰ ایشیائی ان ریاستوں تک پھیلنے سے روکا جائے۔

در اصل جہاد افغانستان کے دوران روی افواح کی شکست کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اس بات کی منصوبہ بنندی شروع ہو گئی تھی کہ افغان مجاہدین کے نظریاتی اثر و رسوخ اور جہادی دائرہ کو وسیع نہ ہونے دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے امریکہ کے سابق صدر آنجلیانی نکسن نے بہت فعال اور متحرک کردار ادا کیا تھا، اور روی دانشوروں کو انہوں نے ہی اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ امریکہ کے خلاف مجاز آرائی ترک کر دیں تاکہ امریکہ اور روس دونوں مل کر اپنے مشترکہ دشمن اسلام کے خلاف صفت آ رہو سکیں۔ اسی مفہومت کے نتیجے میں وسطیٰ ایشیائی ریاستوں پر سوویت یونین کا شکنچہ ڈھیلا کر دیا گیا تھا تاکہ وہ اس ظاہری آزادی پر قناعت کرتے ہوئے کیونٹ نظام کے خلاف بغاوت پر نہ اتر آئیں۔ لیکن یہ فسول زیادہ دریتک نہیں چل سکا اور وسطیٰ ایشیائی ان مسلم ریاستوں کے عوام دھیرے دھیرے اس حقیقت کو سمجھتے جا رہے ہیں کہ آزادی کے نام پر ان ٹکلیوں میں کیونٹ نظام اور کیونٹ حکومتوں کو بدستور باقی رکھنے کا ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ اس لیے وہاں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے اور مختلف گروپ اس کے لیے متحرک ہو رہے ہیں جن کا راستہ روکنے کے لیے امریکہ نے مذکورہ کاروائی کی ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وسطیٰ ایشیاء کے مسلمان بالآخر کیونٹ نظام اور حکومتوں سے بھی جلد نجات حاصل کر لیں گے۔

## پاکستان میں افغان طالبان کی تقلید؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۰ء

اس ضمن میں ایک اور غلط فہمی کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض دوست بھولپن کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں خاصتاً علماء کی بنیاد پر شرعی عدالتی نظام قائم کیا ہے اسی طرح ہم بھی یہاں کر لیں گے۔ لیکن یہ بات سادگی اور جذباتیت پر مبنی ہے اس لیے کہ افغانستان میں جب طالبان نے اقتدار سنگاہاتوں وقت ان کے ملک میں نظام نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی اور پرانا نظام کھنڈر کی شکل اختیار کر کا تھا جس پر کسی رکاوٹ کے بغیر انہوں نے نئے نظام کی بنیاد رکھ دی۔ جبکہ پاکستان میں صورتحال قطعی طور پر مختلف ہے یہاں نہ صرف ایک منظم نظام موجود ہے بلکہ اس کی حفاظت کرنے والے طبقات بھی پوری طرح چوکس اور طاقتوں ہیں۔

- اس نظام سے کسی نئے نظام کیلئے جگہ خالی کرنے کی ایک صورت تو وہی ہے جو افغان مجاہدین نے اختیار کی اور پرانے نظام کو کھنڈر میں تبدیل کرنے کیلئے انہیں پندرہ لاکھ جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ لیکن اگر موجودہ معروف صیحات میں یہ قابل عمل نہ ہو اور رقم الاحروف کی دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ یہ راستہ پاکستان میں فی الواقع قابل عمل نہیں ہے،
- تو پھر دوسری صورت یہی ہے کہ مروجہ نظام میں شامل ان افراد سے راہ رسم بڑھائی جائے جو اپنی مجبوریوں کے باعث اس سسٹم میں شریک ہیں مگر قرآن و سنت پر ایمان رکھتے ہیں اور شرعی نظام و قوانین کے نفاذ کے خواہاں ہیں اور انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے مروجہ نظام کی بھول بھیلوں سے نکلنے کی راہ تلاش کی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اوپر کی سطح کو چھوڑ کر مروجہ نظام کے ہر شعبے کے اہلکاروں کی غالباً اکثریت انی لوگوں پر مشتمل ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات پر لقین رکھتے ہیں اور ملک میں فی الواقع شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ علماء کرام انہیں شرعی قوانین کا مخالف سمجھنے کی وجہ سے ان کی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے ان سے روابط استوار کریں، ان کی فکری و نظریاتی تربیت کریں، انہیں قرآن و سنت کی تعلیمات اور اسلامی نظام کی ضروری باتوں سے آگاہ کریں اور نفاذ اسلام کے حوالے سے ان کی ذہن سازی کریں۔ مجھے لیقین ہے کہ آگر نفاذ اسلام کی خواہاں دینی یا جماعتیں اور مرکزاً اپنی ترجیحات پر نظر ثانی کرتے ہوئے صرف پانچ سال کیلئے اس رخ پر محنت کر لیں تو ملک میں ایک خوشنگوار انقلاب کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسا انقلاب جس کیلئے خون اور جانوں کی قربانیوں کی شاید ضرورت نہ پڑے۔ البتہ یہ انقلاب علماء کرام اور دینی راہنماؤں سے مصروفیات، ترجیحات، فرقہ وارانہ بالادستی کے رجحان، باہمی معاصرانہ چشمک اور بلا شرکت غیرے ”قائد انقلاب“ بننے کی خواہش کی قربانی کا ضرور تھا کرتا ہے۔ اور جس روز ہماری مذہبی قیادت اور جنرال پانچ چیزوں کی قربانی دینے کیلئے تیار ہو گئی اس روز پاکستان میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## افغانستان کی تعمیرِ نو: ڈاکٹر سلطان بشیر محمود کے تاثرات

بفت روزہ المہل، اسلام آباد --- ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء

”امہ تعمیر نو افغانستان“ کے چیئرمین ڈاکٹر سلطان بشیر محمود صاحب گذشتہ روزگور انوالہ تشریف لائے اور جامع مسجد تقویٰ پیپریز کالوں میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کرنے کے علاوہ البرق میرج ہاں جی ٹی روڈ گور انوالہ میں حرکت الحجاء دین کی طرف سے دی گئی افطار پارٹی میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے جس کے اہتمام میں جناب عنان عمر باشی اور ناصر محمود باشی ایڈیو کیٹ نے سرگرم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ تعارف تو ایک عرصہ سے تھا کہ وہ ایک معروف انجینئر اور سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ محب وطن شہری اور قرآن کریم کا واسع مطالعہ رکھنے والے دانشور بھی ہیں، وہ قرآنی علوم و معارف کو سائنس کی زبان میں لوگوں تک پہنچانے کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ مگر اس سے قبل ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے راقم الحروف ان سے ملاقات کی خواہش کے ساتھ افطار پارٹی میں شریک ہوا جہاں ان کی پر مفرغ گفتگو سننے کا موقع مل گیا۔

ڈاکٹر صاحب کا پر انانام سلطان بشیر الدین محمود ہے۔ جب پہلی بار ان کا نام سنائیکی کی کتابچہ میں پڑھا تو نام کی وجہ سے پہلا تاثر بھی ذہن میں ابھرا کہ شاید کوئی قادریانی مشتری ہوں گے مگر اسلام آباد کے دوستوں نے بتایا کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان اور قرآنی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے جذبے سے سرشار دانشور ہیں۔ ان کی ایک کتاب میں خود ان کے اپنے تحریر کردہ پیش لفظ سے معلوم ہوا کہ نام کی اس مشابہت نے انہیں اور بھی بہت سے حلقوں میں مشکوک بنار کھاتھا کیونکہ مرزا غلام احمد قادریانی کے بیٹے اور جانشین مرزا بشیر الدین محمود کے نام کی وجہ سے ان کا نام سنتے یا پڑھتے ہی ان کے قادریانی ہونے کا تاثر ذہنوں میں ابھرنے لگتا تھا۔ حالانکہ ان کے خاندان میں کسی سطح پر بھی قادریانیت کے کوئی اثرات نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی تاثر کو ختم کرنے کیلئے انہوں نے اپنا نام ”سلطان بشیر محمود“ رکھ لیا ہے۔ گذشتہ روز افطار پارٹی میں ملاقات ہوئی تو انہیں دیکھ کر خوشی ہوئی اور ان کی مختصر گفتگوں کر مزید اطہیناں ہوا کہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف عالمی کفر کی سازشوں کا ادراک اور ان کے توڑ کیلئے واضح ذہن رکھنے والوں کی اب ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کی نہیں رہی، اور ملک کی اعلیٰ ذہانت کے حلقوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو اسلام، عالم اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے مفادات کیلئے سرگرم بھی رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان بشیر محمود صاحب نے افطار پارٹی میں افغانستان کے حوالے سے گفتگو کے دوران تازہ ترین صور تحال پر روشنی ڈالی، طالبان حکومت کے خلاف بڑھتے ہوئے عالمی دباؤ کا ذکر کیا، اس کی وجوہات بیان کیے، اور افغانستان کی تعمیر نو کیلئے ”امہ تعمیر نو“ کے پروگرام کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے پاکستان کے شہریوں بالخصوص تاجروں اور صنعتکاروں پر زور دیا کہ وہ افغانستان کی تعمیر نو اور طالبان حکومت کے استحکام کی ضرورت کو محسوس کریں اور کفر کی عالمی یلغار سے طالبان حکومت کو بچانے کیلئے اپنا کردار بروقت ادا کریں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کا مفاد اس خطے میں مشترک ہے اور دونوں کا فتح و نقصان ایک ہے، اس لیے اگر افغانستان کو نقصان پہنچتا ہے تو پاکستان اس کے اثرات

سے محفوظ نہیں رہے گا۔ ان کے خیال میں طالبان حکومت اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے اور ہمیں یعنی پاکستانیوں کو اس صورتحال کا صحیح طور پر ادراک کرنا چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران طالبان کی حکومت افغانستان کی پہلی حکومت ہے جو پاکستان کے حق میں ہے اور دہلی کی بجائے اسلام آباد سے وابستگی رکھتی ہے۔ طالبان حکومت کے پیشتر افراد پاکستان کے دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں اور پاکستان سے محبت رکھتے ہیں، اس لیے پاکستان کو اس حکومت کو چانے کیلئے خود اپنے مفاد کے خاطر بھی سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ اور روس گذشتہ دو عشروں میں صرف ایک بات پر متفق ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ طالبان کی حکومت کو ہر قیمت پر ناکام بنایا جائے اور ختم کر دیا جائے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ طالبان نے اسلام کا عادلانہ نظام عملًا نافذ کر دیا ہے اور اسلامی قوانین کے تحت پر امن معاشرہ اور فرنی ٹکیں معیشت کاملی نمونہ دکھا کر اسلام کی برکات کی عملی شکل دنیا کے سامنے پیش کر دی ہے جو امریکہ، روس اور کفرنگی دیگر سب قوتوں کیلئے ناقابل قبول بلکہ ناقابل برداشت ہے، چنانچہ طالبان حکومت کو ناکام بنانے کیلئے پوری دنیا کی کفرنگی متحد ہو گئی ہیں۔ ان حالات میں ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے اور اسلام اور اسلامی تحریکات کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگر خدا نجاست طالبان کی اسلامی حکومت ناکام ہو گئی تو عالم اسلام پر اس کے اثرات کیا ہوں گے۔

ڈاکٹر سلطان بشیر محمود نے کہا کہ افغانستان اور طالبان کو سپورٹ کرنے اور عالمی کفرنگے خلاف انہیں تحفظ فراہم کرنے کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ پاکستان کے صنعتکار اور تاجر افغانستان میں سرمایہ کاری کی طرف متوجہ ہوں جہاں کام کا وسیع میدان ہے، ٹکیں فرنی معیشت ہے، حکومتی اہل کاروں کا رویہ حوصلہ افزائے، امن ہے، روپے و مال کا تحفظ ہے، اور شرعی قوانین کے تحت تحفظ کے ساتھ ساتھ بے پناہ برکات بھی ہیں۔

انہوں نے کہا کہ افغانستان میں معدنیات کے وسیع ذخائر ہیں، تیل ہے، گیس ہے، لوہا ہے، اور یونیتی پتھر ہے جسے نکالنے کیلئے مغربی ممالک کی درجنوں کمپنیاں قطار میں کھڑی ہیں لیکن طالبان حکومت ان کی بجائے پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کی طرف دیکھ رہی ہے اور انتظار میں ہیں کہ پاکستان کے تاجر اور صنعتکار آئیں اور معدنیات نکالنے کا کام سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ان فیکٹریوں کا کنٹرول بھی سنبھالیں جو بنڈ پڑی ہیں اور وہ سرمایہ کاری کرنے والی پارٹیوں کی منتظر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ہدانا ہے کہ اگر ہم نے توجہ نہ دی اور طالبان حکومت ان کاموں کا ٹھیک مغربی کمپنیوں کو دینے پر مجرور ہو گئی تو اسی صورت میں صرف افغانستان نہیں بلکہ خود پاکستان کا بھی بہت بڑا نقصان ہو گا۔

ڈاکٹر سلطان بشیر محمود صاحب کے ارشادات کا مختصر خلاصہ پیش کر کے میں اب ملک بھر کے ارباب داش سے عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ اس اہم ملی ضرورت کو محسوس کریں اور دیندار تاجریوں اور صنعتکاروں کو اس طرف توجہ دلانے کیلئے اپنا اثرور سونخ استعمال کریں۔

## طالبان حکومت پر

# اقوام متحده کی سلامتی کونسل کی پابندیاں

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۱ء

اقوام متحده کی سلامتی کونسل نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف دباؤ بڑھانے کیلئے تینی پابندیوں کا اعلان کر دیا ہے، جن میں طالبان پر دہشت گردی کی سرپرستی کرنے اور عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو امریکہ کے سپردنه کرنے کے الزامات عائد کرتے ہوئے دنیا بھر کی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ طالبان حکومت کے ساتھ اقتصادی اور موacialاتی بایکاٹ کریں۔

طالبان حکومت کے خلاف ان پابندیوں کی بات ایک عرصہ سے چل رہی تھی اور امریکہ کے اشارے پر عراق، سوڈان اور لیبیا کی طرح افغانستان کو بھی اقتصادی ناکہنڈی کا نشانہ بنانکر عالمی استعمار کے سامنے گھٹھنے لیکن پر مجبور کرنے کیلئے اس قسم کی پابندیوں کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں، جو بالآخر سلامتی کونسل کی قرارداد کی صورت میں سامنے آئیں ہیں، اور اس کی پیشان اور ملاکشیا کے سوا سلامتی کونسل کے دیگر تمام اراکان نے حمایت کی ہے، جبکہ چین اور ملاکشیا نے بھی ان پابندیوں کی مخالفت کرنے اور افغان عوام کے حق میں کوئی کلمہ خیر کہنے کی بجائے سلامتی کونسل کے مذکورہ اجلاس سے غیر حاضر رہنے کو ترجیح دی ہے۔

ادھر اقوام متحده کی جزوی آئینی کے ۵۵ ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے مستقل مندوب شمساہد احمد نے ان پابندیوں پر احتیاج کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ افغانستان کے ایک حصے پر پابندیاں عائد کر دی جائیں، جبکہ ان کے مخالفین کو اسلحہ اور اقتصادی امداد دینے کیلئے آپ کے دروازے کھلے ہیں؟ انہوں نے پاکستان کی طرف سے سلامتی کونسل سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس قرارداد کا از سر نوجائزہ لے۔

علاوہ ایں روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۲۲ دسمبر ۲۰۰۰ء کے مطالب اسلام آباد میں وزارت خارجہ کے ترجمان ریاض محمد خان نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ افغانستان کے خلاف عائد کی جانے والی ان پابندیوں سے پاکستان بھی شدید متأثر ہو گا، اس لیے پاکستان نے متاثر فرقی کی حیثیت سے اس مسئلہ کو سلامتی کونسل کے سامنے از سر نوجائزہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسری طرف طالبان حکومت کے وزیر خارجہ مولوی وکیل احمد متولی نے کابل میں پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران سلامتی کونسل کی پابندیاں مسترد کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ عرب مجاہد اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر امریکہ کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اسامہ بن لادن کے مسئلہ کو امریکہ نے صرف بہانہ بنارکھا ہے اور وہ دراصل طالبان حکومت کو اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی وجہ سے بہر صورت ختم کر دینا چاہتا ہے، لیکن امیر المؤمنین محمد عمر نے امریکی دباؤ کو قبول نہ کرنے اور اسلامی احکام و قوانین پر عملدرآمد کو بہر حال جاری رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔

جبکہ تک امارتِ اسلامی افغانستان کی اسلامی حکومت کے خلاف سلامتی کو نسل کی عائد کر دہ پاندھیوں کا تعلق ہے، یہ قطعی طور پر غیر متوقع نہیں ہیں اور کافی دنوں سے عالمی استعمار کے ایوانوں میں یہ کچھڑی پک رہی تھی۔ لیکن اس مسئلہ میں مسلمان حکومتوں اور خاص طور پر اسلامی سربراہ کافرنیس کی تنظیم کا کردار بہت مایوس کن ہے، اور یوں محسوس ہو رہا ہے کہ بیت المقدس، بوسنیا، چیچنیا، کشیر اور عالمِ اسلام کے دیگر حساس معاملات کے حوالے سے اقوامِ متعدد کے مناقفانہ کردار، دوغلی پالیسی، اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف کھلمنکھلماعاونانہ طرزِ عمل کے باوجود مسلم حکمرانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں، اور وہ دو حصہ میں سربراہی کافرنیس منعقد کر کے وقت طور پر غصہ کا اظہار کرنے کے بعد پھر سے اپنے سابقہ کردار پر قانع ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کا "تصور" اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس نے دنیا کے دیگر مسلم حکمرانوں کی طرح اسلام کا نام لے کر مناقفانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے اسلامی نظام کے عملی نفاذ کا راستہ اختیار کر رکھا ہے جو امریکہ، روس اور چین سمیت دنیا میں کفر کی کسی قوت کو گوارا نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے طالبان حکومت کے خلاف اسی طرح کا متعدد مجازِ قائم ہو گیا ہے جیسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عرب قبائل نے متعدد ہو کر غزوہ احزاب کے موقع پر مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا تھا، اور کفر کی اس وقت کی تمام قویں اسلام کا راستہ روکنے کیلئے متعدد ہو گئی تھیں۔ لیکن ہمارا ایمان ہے کہ جس طرح مدینہ منورہ کے ہزار ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کے خلاف پورے عرب قبائل کا اتحاد اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا، اسی طرح افغانستان کی طالبان حکومت اگر اپنے عزم پر قائم رہی تو دنیا نے کفر کا یہ اتحاد اس کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ اس آزمائش سے سرخو ہو کر کرنی آب و تاب کے ساتھ دنیا کے سامنے آئیں گے۔

البتہ طالبان کے حوالے سے بے تيقینی، تندب، متفاوت اور دو عملی کا بیکار ہونے والی مسلمان حکومتوں، اداروں، تنظیموں اور حلقوں سے ہم یہ گزارش کریں گے کہ وہ غزوہ احزاب کے واقعات و نتائج کا ایک بار پھر مطالعہ کرتے ہوئے اس آئینے میں اپنے چہروں کے خدوخال کا ضرور جائزہ لیں تاکہ کل جب غبار چھٹے تو اپنے کردار کے اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب کے بارے میں ان کے دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم سلامتی کو نسل کی پاندھیاں مسترد کرنے کے بارے میں طالبان حکومت کے دو ٹوک اعلان کی مکمل حمایت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت طالبان حکومت کو اس علیین اور صبر آزمائش سے ہا وقار طور پر سرخو کرتے ہوئے دنیا میں خلافتِ اسلامیہ کے احیا اور اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کا ہر اول دستہ بنائیں، آئین یا رب العالمین۔

## اسامہ بن لادن کی آڑ میں امارتِ اسلامی افغانستان کا نشانہ

مابینہ نصراۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۱ء

اسلام آباد میں امارتِ اسلامی افغانستان کے سفیر مولوی سید محمد حقانی نے گذشتہ روز پر یہس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ پر اذمانت لگایا ہے کہ وہ اسامہ بن لادن کی آڑ میں افغانستان کو اسلامی نظام کے نفاذ پر انتقامی کارروائی کا نشانہ بنا رہا ہے اور معصوم افغان شہریوں کے خلاف دہشت گردی کی کارروائی کر رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے کئی بار امریکہ سے تقاضا کیا ہے کہ اسامہ بن لادن کے خلاف کوئی ثبوت ہے تو فراہم کیا جائے، لیکن امریکہ ابھی تک کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکا اور یک طرف پر و پیگٹڈا کے زور سے عالمی رائے عامہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

افغانستان ان دنوں امریکہ اور اس کے ایسا پر اقوامِ متحده کی طرف سے عائد کی جانے والی اقتصادی پابندیوں کے حصار میں ہے۔ اور عراق، سودان اور لیبیا کے بعد امریکہ نے اب افغانستان کے عوام کو اپنی معاذن انتقامی کارروائیوں کیلئے چن لیا ہے۔ ان ممالک کا قصور یہ ہے کہ وہ دنیا میں امریکہ کی واحد پوچھراہٹ کو تسلیم کرنے اور ہر معاملہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن یہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اور بھروسہ رکھنے والی غیور افغان قوم کو جس طرح روس کی مسلح انٹرکریشنی اس کی آزادی اور قوی خود مختاری سے محروم نہیں کر سکی، اسی طرح امریکی اقتصادی ناکہ بندی بھی افغان عوام کی دینی حیثیت وغیرت کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گی اور افغانستان ان شاء اللہ تعالیٰ اس بحران میں سرخرو ہو گا۔

## افغان طالبان کی مشکلات اور سنتِ نبوی

جنوری ۲۰۰۱ء کے دورانِ دوبئی کی مسجدِ بلال بن رباح میں خطاب

بعد الحمد والصلوة۔ آج کے اس اجتماع سے جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمن تفصیلی خطاب کریں گے۔ ان سے قبل مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کو کہا گیا ہے، اس لیے بطور تمہید چند باتیں آپ سے عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے ہمارے فضل دوست مولانا مفتی عبدالرحمن نے اپنے خطاب میں افغانستان کی طالبان حکومت کا ذکر کیا ہے اور اسے درپیش مشکلات کا حوالہ دیا ہے۔ بلاشبہ طالبان آج کے دور کا مظلوم ترین طبقہ ہے جس کے خلاف کفر و نفاق کی پوری دنیا متحد ہو گئی ہے اور انہیں عالمی استعمار کے سامنے جھکانے یا مٹا دینے کیلئے منصوبے بن چکے ہیں۔

طالبان کا تصور صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا صرف نام نہیں لیتے بلکہ اپنے ملک میں اسلامی احکام و قوانین کو عملی طور پر نافذ کھی کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کے بین الاقوامی دباؤ کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا اصل جرم یہی ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف پابندیوں اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے، اس سے قبل بھی اہل حق اس قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے آرہے ہیں حتیٰ کہ خود نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ مکرمہ کے کفار کی طرف سے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا جب قریش کے باقی خاندانوں نے بونہاشم سے مطالبہ کیا تھا کہ محمدؐ کو قتل کیلئے ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن بونہاشم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں قریش کے تمام قبائل نے مل کر بونہاشم کا سو شل بائیکاٹ کر دیا اور جناب رسول اللہؐ اپنے خاندان سمیت شعبابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔

کفار کی طرف سے ان کے خلاف یہ پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ ان کے ساتھ لیں دین نہیں ہو گا، ان سے رشتہ داری قائم نہیں کی جائے گی، ان کے پاس خوراک وغیرہ کی کوئی چیز نہیں جانے دی جائے گی اور ان کی معاشی ناکہ بندی ہو گی۔ اس دوران آنحضرتؐ اور ان کے ساتھیوں کوں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ حضرت سعد بن ابی وقاصؐ کے اس ارشاد سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہم درختوں کے پتے کھا کر گزارے کیا کرتے تھے اور راستے میں پڑا ہوا خشک چڑھاٹھا لیتے تھے اور اسے گرم پانی میں زرم کر کے چاکر نگل لیا کرتے تھے۔

سیرت کی تابوں میں لکھا ہے کہ وادی میں بھوکے پنجے جب روتے چلاتے تو ارد گرد گھومنے والے مشرکین یہ آوازیں سن کو خوش ہو اکرتے تھے۔ اس کیفیت کے ساتھ بی اکرمؐ اور ان کے خاندان کو محصور رہنا پڑا لیکن مشرکین کی عائد کردہ یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہ روک سکیں اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عمل نہ صرف جاری رہا بلکہ اس دوران حضرت ابوذر غفاریؐ اور بہت سے دیگر حضرات نے اسلام قبول کیا اور مشرکین کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی پابندیاں اور ناکہ بندی تین سال گزرنے کے باوجود کارگر نہیں ہو رہی تو کچھ سمجھ دار مشرکین نے آگے بڑھ کر وہ معاهدہ ختم کر دیا۔ اس لیے آج بھی یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہیں روک سکیں گی اور اگر طالبان حکومت اپنے مشن اور پروگرام پر استقامت کے ساتھ گامزن رہی تو پابندیاں لگانے والوں کو بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا فیصلہ کس قدر غلط تھا۔

میں اس موقع پر اس صورت حال کے حوالے سے آپ حضرات کی خدمت میں ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشکلات و مصائب کے بارے میں اسلام کا مزانج کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اس پر سیرت نبوی سے دو واقعات پیش کروں گا تاکہ یہ بات ہمارے سامنے رہے کہ مشکلات و مصائب کے دور میں سنت نبوی کیا ہے۔ ایک واقعہ تو اس وقت کا ہے جب آنحضرتؐ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف تحریرت کی۔ اس وقت ظاہری کیفیت یہ تھی کہ خود اپنی جان کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا، رات کی تاریکی میں چھپ کر مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، سفر کیلئے عام راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ خفیہ راست سے سفر کر رہے تھے۔ حضرت صدیقؓ اکبرؓ کے ہمراہ تین دن تک غار ثور میں روپوش رہے اور راستے میں چلتے ہوئے کسی کو اپنے نام بتانے میں بھی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ تو ظاہری کیفیت تھی کہ بظاہر جان کا بچانا مشکل ہو رہا تھا لیکن اسی دوران سر اقہم بن مالکؓ جناب بنی اکرمؐ کو راستے میں ملے اور پکڑنے میں ناکام ہو کر اماں چاہی تو حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ ”سر اقہم، میں تمہارے ہاتھوں میں کسری بادشاہ کے لکنگن دیکھ رہا ہوں“

یہ حضن اتفاق نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت کا بھی اظہار تھا جس میں ہمارے لیے دو سبق ہیں۔ ایک یہ کہ خدائی فیصلے ظاہری حالات پر نہیں ہوتے۔ ظاہری حالات جس قدر بھی ناموفق ہوں، اگر مسلمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہے اور اس کا ایمان و تلقین پختہ ہے تو ظاہری حالات کی ناساز گاری اس کا کچھ

بھی نہیں لگاڑ سکتی۔ اور دوسرا بینق یہ ہے کہ مسلمان کو ظاہری حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، مشکلات کتنی ہی کیوں نہ ہوں، اسے اپنا بدف سامنے رکھنا چاہئے اور ٹارگٹ میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہئے۔ اب دیکھیے کہ جناب رسول اللہ ظاہری طور پر کس حال میں ہیں کہ چھپ کر اور جان بچا کر مدینہ منورہ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نظر کہاں ہے؟ کسری کے کنگنوں پر جو اس وقت کی ایک بڑی سلطنت کا حکمران تھا اور سراقہ بن ماں کے سے فرمایا جا رہا ہے کہ اسے کسری کے کنگن پہنچا گے اور پھر یہ صرف ایک وقتی بات نہیں تھی بلکہ پیش گوئی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب کے دور خلافت میں فارس فتح ہوا، کسری کے شاہی خزانے غیمت کے مال میں مدینہ منورہ آئے، ان میں وہ کنگن بھی تھے جو کسری بادشاہ دربار میں پہنچا کرتا تھا۔ حضرت عمر بن الخطاب نے سراقہ بن ماں کو بولایا اور یہ کہہ کر تھوڑی دیر کیلئے کسری کے کنگن انہیں پہنچا کر اگرچہ سونے کے کنگن پہنچا مرد کیلئے جائز نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کو پورا کرنے کیلئے میں یہ کنگن کچھ دیر کیلئے تمہیں پہنچا رہا ہوں۔ اس طرح رسول اکرم نے ہمیں سبق دیا کہ مشکلات و مصائب اور حالات کی ناسازگاری سے گھبرا کر مایوس کاشکار نہیں ہونا چاہئے اور اپنے ہدف اور ٹارگٹ میں کوئی کمزوری نہیں دکھانی چاہئے۔

دوسراؤ اعجھی اسی نوعیت کا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بدر واحد کی جنگ میں ناکام و نامراد ہو کر قریش کد نے یہ بات سمجھ لی کہ وہ اکیلے جناب نبی اکرم کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے عرب قبائل سے گھڑوں کے مسلمانوں کے خلاف ان کا متحدہ محاذ بنویا اور ایک بہت بڑا شکر لے کر مدینہ منورہ کی طرف یلغار کر دی۔ یہ غزوہ احزاب کی بات ہے جسے غزوہ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف عرب قبائل کا بہت بڑا شکر لے کر مدینہ منورہ کی طرف یلغار کر دی اور ان کے ساتھی تھے جن کی تعداد چھوٹے بڑے سب ملا کر ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ آپ نے مدینہ منورہ کے دفاع کیلئے حضرت سلمان فارسی کے مشورہ سے خندق کھونے کا پروگرام بنایا اور خود صحابہ کرام کے ساتھ مل کر دن رات خندق کھونے میں مصروف رہے۔ قرآن کریم نے سورۃ الاحزاب میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اہل ایمان کو یاد دلایا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب تم پر چاروں طرف سے شکر چڑھ دوڑے تھے، جب تمہاری آنکھیں خوف کے مارے پھر اگئی تھیں، جب خوف کی شدت سے تمہارے دل سینوں سے اچھل کر حلق میں پھنس گئے تھے، جب تم اللہ تعالیٰ کی مدد کے بارے میں گمانوں کا شکار ہونے لگے تھے، جب مومنوں کو ازاں میں ڈال دیا گیا تھا اور جب ان پر شدید زلزلے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

یہ اس وقت کی ظاہری کیفیت تھی جس کا نقشہ قرآن کریم ان الفاظ میں کھیچ رہا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ بہت سے خندق کھونے والوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا اور بعض لوگوں نے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھ تھے حتیٰ کہ ایک صاحب نے آخرست کو اپنے پیٹ سے کپڑاٹھا کر دھایا کہ اس نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے تو آپ نے اپنے پیٹ مبارک سے کپڑاٹھا کر دھایا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اس صورت حال میں جب ظاہری طور پر سخت مایوسی اور شدید خوف کی کیفیت مدینہ منورہ کی آبادی کا احاطہ کیے ہوئے تھی، حضور سے خندق میں ایک چنان کے سخت ضربوں کے باوجود نہ ٹوٹنے کی شکایت کی گئی، چنانچہ آپ خود تشریف لے گئے اور کdal کی ایک ہی

ضرب سے چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ جب آپ نے ک DAL سے چٹان پر ضرب لگائی تو وہاں سے چپک اٹھی اور اللہ کے بنی نے فرمایا کہ ”مجھے اس چپک میں قیصر و کسری کے محلات دکھائی دیے ہیں“

ظاہر ہی کیفیت دیکھیے کہ خوف اور مایوسی کا کیا عالم ہے؟ اور اس حالت میں نظر کی بلندی ملاحظہ کیجئے کہ اس وقت کی دوسب سے بڑی سلطنتوں کے شاہی محلات دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری تھی اور یہ سبق تھا کہ ظاہری حالات سے مایوس نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھو، اس پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مشن پر گامزن رہو اور اپنے ٹارگٹ اور ہدف میں کوئی کمزوری نہ آنے دو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر ساز و سامان اور لشکر کی ثرثت کے باوجود قبائل عرب کی یہ یلغار ناکام ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے جناب بنی اکرم کو نہ صرف فتح عطا فرمائی بلکہ اس پیش گوئی کے مطابق قیصر و کسری کے شاہی محلات بھی اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں کو عطا فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے کہ آزمائش اور ابتلاء کے اس سخت ترین دور کے بعد غزوہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد اس طرح کی کہ ہوا کو تیز کر دیا اور غبی لشکر آسمان سے اتارے جنہوں نے محاصرہ کرنے والے کافروں کے لشکر کو تتر بر کر دیا اور وہ کوئی مقصد حاصل کیے بغیر ناکام و ایس لوٹ گئے۔ اس لیے ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ طالبان کی اسلامی حکومت اگر اسلام کے مکمل اور عملی نفاذ کے مشن پر قائم رہتی ہے اور ظاہری حالات کی ناسازگاری سے خویزدہ نہیں ہوتی تو اس کیلئے بھی غیب کی قدر تیس حرکت میں آئیں گی اور امریکہ کی قیادت میں علمی استعمار کا ان کے خلاف متعدد محاذ اسی طرح ناکام ہو گا جس طرح جناب رسول اللہ کے خلاف قبائل عرب کا اتحاد ناکام ہو گیا تھا۔ البتہ ہمیں اس حوالے سے اپنی ذمہ داریوں پر ضرور نگاہ رکھنی چاہئے کہ اپنے مظلوم طالبان بھائیوں کی اس مشکل وقت میں ہم کیا مدد کر سکتے ہیں اور ان کا ہاتھ کس طرح بٹا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقہ سے نباہنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## ”نیا جال لائے پرانے شکاری“

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- جنوری ۲۰۰۱ء

مسٹر اسٹیفن پی کو ہن نے جارج ڈبلیویش کے دور صدارت میں موقع امریکی پالیسیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسٹر بش کی حکومت پاکستان کی حکومت پر سی ٹی بی ٹی پر دستخط کیلئے دباؤ نہیں ڈالے گی کیونکہ ری پبلکن پارٹی خود سی ٹی بی ٹی کی مخالفت کرتی رہی ہے، اس لیے اس حوالے سے پاکستان پر بنیں الاقوامی دباؤ خاصاً کم ہو جائے گا۔ انہوں نے دینی مدارس کے مسئلہ کو بھی اظہار خیال کا موضوع بنایا ہے اور کہا ہے کہ بعض امریکی پالیسی ساز ادارے ان دونوں جائزہ لے رہے ہیں کہ پاکستان کیلئے تعلیمی شعبے میں امداد میں اضافہ کیا جائے۔ یہ امداد ایسے دینی مدارس کو جدید بنیادوں پر استوار

کرنے کیلئے استعمال کی جا سکتی ہے جہاں اندیشہ ہے کہ بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کی سوچ پر دو ایسا چڑھائی جاتی ہے اور بعض میں تسلیت بھی دی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسے ادارے اگر جدید تعلیم سے بہرہ ور ہوں تو اس کا فائدہ پاکستان کو بھی ملے گا۔

جہاں تک پاکستان پر دباؤ کم ہونے کی بات ہے اگر ایسا ہوا تو ہمیں خوشی ہوگی۔ اور یہ بات اس سے پہلے بھی ایک عوامی تاثر کے طور پر موجود ہے کہ پاکستان کے حوالے سے ری پبلکن پارٹی کے روایہ میں ڈیموکریٹ پارٹی کی بہ نسبت کچھ نہ کچھ فرق ضرور موجود ہوتا ہے اور بعض دوست اس سلسلہ میں ماضی کی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس قسم کے کسی فرق کے مؤثر ہونے کے امکانات بہت کم دکھائی دیتے ہیں اس لیے کہ اگر ایک طرف سے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے سلسلہ میں دباؤ میں کچھ کمی ہوگی تو وہ سری طرف افغانستان کے حوالے سے پاکستان کو اس سے کہیں زیادہ دباؤ کا خشار کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے، جس کا عملی اظہار سلامتی کو نسل کی اس حالیہ قرارداد کی صورت میں ہو چکا ہے جس میں طالبان حکومت کو ہشت گردی اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں تعاون نہ کرنے کے ارادات کا شانہ بنا کر تمام ممالک سے ان کے اقتصادی، سفارتی اور موصلاتی بائیکاٹ کیلئے کہا گیا ہے۔ اور پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان نے طالبان حکومت پر سلامتی کو نسل کی طرف سے لگائی جانے والی ان تین پابندیوں کے پاکستان پر اثر انداز ہونے کے امکانات کا ذکر کرتے ہوئے قرارداد پر نظر ثانی کیلئے سلامتی کو نسل سے دوبارہ جو جمع کے عنیدیہ کا اظہار کیا ہے۔

طالبان حکومت کی طرف سے ان پابندیوں کو مسترد کرنے اور اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر امریکہ کے حوالے نہ کرنے کے دو ٹوک اعلان کے بعد ان پابندیوں کے عملالاگو ہونے اور پاکستان پر ان کے شدت کے ساتھ اثر انداز ہونے کے بارے میں اب کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا۔ اس لیے امریکی ماہر کی طرف سے پاکستان پر دباؤ کم ہونے کے امکان کا اظہار ہمارے لیے کسی خوش نہیں بن سکتا اور بات صرف بیتربالنے اور ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لینے کی باقی رہ جاتی ہے۔ ہمارے لیے طالبان حکومت پر لگائی جانے والی یہ پابندی قطعی طور پر غیر متوقع نہیں ہے بلکہ ہمیں اس میں اتنی دیر ہونے پر تجھ ہو رہا تھا اس لیے کہ طالبان حکومت نے قرآن و سنت کے قوینیں کے عملی نفاذ اور ٹکیں فری معیشت کے قیام کی صورت میں ایک نئے نظام کا جو تجربہ کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ امریکہ اور روس سمیت کسی بڑے ملک اور موجودہ عالمی نظام کیلئے قابل قبول نہیں ہے۔ اور طالبان کو دراصل اسی کی سزا دینا مقصود ہے لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اگر طالبان حکومت اپنے عزم پر قائم رہتی ہے تو اس کے خلاف عالم کفر کا یہ اتحاد بھی اسی طرح ناکام ہو گا جس طرح غزوہ احزاب کے موقع پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صرف ڈیڑھ ہزار ساتھیوں کے خلاف پورے عرب قبائل کے متعدد محاذ کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔ بات صرف استقامت، صبر اور حوصلہ کی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ طالبان حکومت کے اہل کار اور غیور افغان عوام رو سی استعمار کی یلغار کی طرح امریکی استعمار کے اس نئے حملہ اور یلغار سے بھی سرخو نکلیں گے کیونکہ وہ صبر، حوصلہ، استقامت اور قناعت و جفاشی کی اسلامی تعلیمات سے صرف آگاہ ہی نہیں بلکہ اپنے مزاج، عادات اور ٹکلپ کے لحاظ سے ان کے خوگر بھی ہیں۔

باقی رہی بات دینی مدارس کیلئے امریکہ کی نئی امداد کی توبیہ بھی ”نیا جال لائے پرانے شکاری“ کے مصدق اپائی میں

کسی تبدیلی کی بجائے پیغیر ابدال نہ ہی کا ایک انداز ہے۔ کیونکہ دینی مدارس پر پابندی لگوانے کام از کم انہیں ریاست اداروں کے کثرتوں میں دینے کے تمام حرے ناکام ہو چکے ہیں اور اب تجویف کی بجائے تحریک اور لاجج ہی کا ایک راستہ باقی رہ گیا ہے جسے آزمائے کیلئے امریکی پالیسی سازادارے ضرور سوچ بچار کر رہے ہوں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ امریکی پالیسی ساز ایجمنی عقل سے اتنے عاری نہیں ہوئے ہوں گے کہ وہ دینی مدارس کے طلباء اور علماء کو اس امید پر فذر فراہم کر دیں کہ جدید تعلیم سے آرستہ ہو کر ان کی "بنیاد پرستی" میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ بنیاد پرستی تو اس نظام تعلیم کے تربیت یافتہ افراد کے ذہنوں سے بھی نہیں نکالی جاسکی جو دینی مدارس کے مقابلہ پر قائم کیا گیا تھا اور مسٹر اور ملائی تفریق قائم کر کے ملا کو غیر موثر بنانے کیلئے تمام ریاتی وسائل وقف کر دیے گئے تھے۔ لیکن آج ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد انہی پالیسی سازوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ مسٹر اور ملائیں سے زیادہ بنیاد پرست کون ہے؟

امریکی امداد کا زہر قبول کرنے کی حمایت تو ہم کسی حالت میں نہیں کر سکتے لیکن دینی مدارس میں ضروری جدید تعلیم کو شامل کرنے اور علماء و طلباء کو جدید علوم اور تکنیک سے آرستہ کرنے کے ہم خود بھی داعی ہیں۔ البتہ ایک فرق ہے کہ امریکی پالیسی سازوں کو جدید تعلیم کے ذریعے علماء کی بنیاد پرستی میں کمی کا کوئی امکان نظر آرہا ہو گا جبکہ ہمیں جدید علوم، عالی زبانوں اور ایلان عامہ کے ترقی یافتہ وسائل سے ہر دو ہونے کی صورت میں دینی مدارس کی بنیاد پرستی دو آتش ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر ایک امریکی دانشور کی اس پیشکش پر ہم یہ ضرور عرض کرنا چاہیں گے:

بہر رنگ کہ خواہی جامد می پوش  
من انداز قدت رائی شناسم

## غامدی صاحب کا فلسفہ جہاد

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء

محترم جاوید احمد غامدی صاحب کو مختلف جہادی گروپوں کی طرف سے جہاد کے نام پر مسلح سرگرمیوں پر اشکال ہے اور وہ ان کے اس عمل کو جہاد تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ جہاد کا اعلان صرف ایک مسلم حکومت ہی کر سکتی ہے اس کے سوا کسی اور کو جہاد کا اعلان کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ مگر ہمیں ان کے اس ارشاد سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ جہاد کی مختلف عملی صورتیں اور درجات ہیں اور ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے خلاف جہاد کا اعلان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ایک اسلامی یا کم از کم مسلمان حکومت اس کا اعلان کرے۔ لیکن جب کسی مسلم آبادی پر کفار کی یخار ہو جائے اور کفار کے غلبے کی وجہ سے مسلمان حکومت کا وجود ختم ہو جائے یا وہ بالکل بے بس دکھائی دینے لگے تو غاصب اور حملہ آور قوت کے خلاف جہاد کے اعلان کیلئے پہلے حکومت کا قیام ضروری نہیں ہو گا اور نہ ہی عملًا ایسا ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسے مرحلہ میں مسلمانوں کی اپنی حکومت کا قیام قابل عمل ہو

تو کافروں کی بیلگار اور تسلط ہی بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ صورت پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب مسلمانوں کی حکومت کفار کے غلبہ اور تسلط کی وجہ سے ختم ہو جائے، بے س ہو جائے، یا اسی کافر قوت کے ہاتھوں کٹھپتی بن کر رہ جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے حالات میں کیا کیا جائے؟ اگر جاوید غامدی صاحب محترم کا فلسفہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ ضروری ہو گا کہ مسلمان چہلے اپنی حکومت قائم کریں اور اس کے بعد اس حکومت کے اعلان پر جہاد شروع کیا جائے۔ لیکن پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہو گا کہ جب مسلمانوں نے اپنی حکومت بحال کر لی ہے تواب جہاد کے اعلان کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی ہے؟ کیونکہ جہاد کا مقصد تو کافروں کا تسلط ختم کر کے مسلمانوں کا اقتدار بحال کرنا ہے اور جب وہ کام جہاد کے بغیر ہی ہو گیا ہے تو جہاد کے اعلان کا کون سماں باقی رہ جاتا ہے؟

اس کی ایک عملی مثال سامنے رکھ لیجئے کہ فلسطینی عوام نے تنظیم آزادی فلسطین کے عنوان سے غیر سرکاری سطح پر اسرائیل کے خلاف مسلح جدو جہد کا آغاز کیا۔ سالہا سال کی مسلح جدو جہد کے نتیجے میں مذاکرات کی نوبت آئی اور ان مذاکرات کے بعد ایک ڈھینی ڈھانی یا الی ٹکری حکومت جناب یاسر عرفات کی سربراہی میں قائم ہوئی جو اس وقت بین الاقوامی فورم پر فلسطینیوں کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اگر مسلح جدو جہد نہ ہوتی تو مذاکرات اور حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ مسلح جدو جہد کسی حکومت کے اعلان پر نہیں بلکہ غیر سرکاری فورم کی طرف سے شروع ہوئی اور اسی عنوان سے مذاکرات کی میز بچھنے تک جاری رہی۔ یہاں عملی طور پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت مسلح جدو جہد کے نتیجے میں قائم ہوئی ہے نہ کہ حکومت نے قائم ہونے کے بعد مسلح جدو جہد یا جہاد کا اعلان کیا۔ لیکن اگر غامدی صاحب کے فلسفہ کو قول کر لیا جائے تو یہ ساری جدو جہد غلط قرار پاتی ہے۔ اور ان کے خیال میں فلسطینیوں کو یہ چاہیے تھا یا شرعاً ان کیلئے جائز راستہ یہ تھا کہ وہ چہلے ایک حکومت قائم کرتے اور پھر وہ حکومت جہاد کا اعلان کرتی، تب ان کی مسلح جدو جہد غامدی صاحب کے نزدیک شرعی جہاد قرار پا سکتی تھی۔

خود ہمارے ہاں بر صغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے بعد مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے کٹھپتی کی حیثیت اختیار کر لی اور عملاً انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو اس وقت کے علماء کے سرخیل حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ اور پھر بالا کوٹ کے معمر کے تک اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں مسلح جہاد آزادی کے مختلف مراحل تاریخ کا حصہ بنے۔ جہاد کا یہ اعلان بھی غیر سرکاری فورم کی طرف سے تھا اور شاہ عبد العزیز دہلویؒ یا انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے والے دیگر علماء کو کوئی سرکاری اختیاری حاصل نہیں تھی۔ اس لیے غامدی صاحب کے فلسفہ کی رو سے یہ سارا عمل غیر شرعی قرار پاتا ہے۔ محترم غامدی صاحب یا ان کا کوئی شاگرد رشید اس دور میں موجود ہوتا تو وہ شاہ عبد العزیز دہلویؒ کو یہی مشورہ دیتا کہ حضور! آپ کو جہاد کے اعلان کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ہی حکومتی معاملات میں فریق بننے کا آپ کیلے کوئی جواز ہے۔ آپ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ حکومت کی راہ نمایی کریں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آئندہ کارکی حیثیت اختیار کر جانے والے مغل بادشاہ کو مشورہ دیتے رہیں اور اس سے کہیں کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف جہاد کا اعلان کرے، کیونکہ اس کے سوا جہاد کا اعلان کرنے کا شرعی اختیار اور کسی کے پاس نہیں ہے۔

جہاد افغانستان کی صور تعالیٰ کم و بیش اسی طرح کی ہے کہ جب کابل میں رو سی فوجیں اتریں، مسلح غاصبانہ قبضہ کے بعد افغانستان کے معاملات پر روس کا کنٹرول قائم ہو گیا اور ببرک کارمل کی صورت میں ایک کٹھ پتلی حکمران کو کابل میں بٹھادیا گیا تو افغانستان کے مختلف حصوں میں علماء کرام نے اس تسلط کو مسترد کرتے ہوئے حملہ آور قوت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ بعد میں ان کے باہمی روابط قائم ہوئے تو فتنہ رفتہ وہ چند گروپوں کی صورت میں کیجا ہو گئے۔ پھر انہیں رو سی فوجوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں ثابت قدم کیا کہ باہمی قوتیں متوجہ ہوئیں اور روس کی شکست کی خواہاں قتوں نے ان مجہدین کو سپورٹ کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں روس کو افغانستان سے انکننا پڑا اور سودیت یوینین کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ غامدی صاحب کے اس ارشاد کی رو سے یہ سارا عمل غیر شرعی اور ناجائز ہھر تا ہے اور ان کے خیال میں افغان علماء کو از خود جہاد کا اعلان کرنے کی بجائے ببرک کارمل کی رہنمائی کرنے تک مدد و درہ نہ ناچا ہے تھا، اور اس سے درخواست کرنی چاہیے تھی کہ چونکہ شرعاً جہاد کے اعلان کا اختیار صرف اس کے پاس ہے اس لیے وہ رو سی حملہ آوروں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے، تاکہ اس کی قیادت میں علماء کرام جہاد میں حصہ لے سکیں۔

فرانسیسی استعمار کے تسلط کے خلاف الجزاں کے علماء کو بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہاں کے قوم پرست لیڈروں، بن باللہ، بودیں اور یونیاف کے ساتھ ساتھ اشیخ عبد الحمید بن بادیں اور اشیخ بشیر الراہی کی جیسے اکابر علماء نے بھی مسلح جدوجہد کی قیادت کی۔ انہوں نے فرانسیسی استعمار کے خلاف مسلح جدوجہد کو جہاد قرار دیا، اس کیلئے علماء کی باقاعدہ جماعت بنائی، اور جمعیت علماء الجزاں کے پلیٹ فارم سے سالہا سال تک غاصب حکومت کے خلاف مسلح جنگ لڑ کر الجزاں کی آزادی کیلئے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ بلکہ اشیخ عبد الحمید بن بادیں گویہ مشورہ ہی ان کے اتنا محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدفنی نے دیا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مولانا مدفنی ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم تھے اور مسجد نبوی میں حدیث نبوی پڑھایا کرتے تھے۔ اشیخ عبد الحمید بن بادیں نے ان سے حدیث پڑھی اور وہیں مدینہ منورہ میں کسی جگہ بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرنے کی اجازت طلب کی تو شیخ مدفنی نے ان سے کہا کہ ان کا ملک غلام ہے اس لیے وہ اپس جائیں اور علماء کرام کو منظم کر کے اپنے وطن کی آزادی کیلئے جہاد کریں۔ اگر اس وقت شیخ بن بادیں کے ذہن میں کوئی ”دانشور“ یہ بات ڈال دیتا کہ آپ لوگوں کو از خود مسلح جدوجہد شروع کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے اور جہاد کیلئے کسی مسلم حکومت کی طرف سے اعلان ضروری ہے تو وہ بھی مدینہ منورہ میں کوئی علمی مرکزو قائم کر کے بیٹھ جاتے اور الجزاں کی جنگ آزادی کا جو حشر ہوتا وہ ان کی بلا سے ہوتا رہتا۔

غامدی صاحب محترم کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ساتوں صدی ہجری کے آخر میں عالم اسلام کے خلاف تاتاریوں کی خوفناک یلغار کے موقع پر جب دمشق کے حکمران سراسیگی اور تنذیب کے عالم میں تھے اور عوام تاتاریوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو اس موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے از خود جہاد کی فرضیت کا اعلان کر کے عوام کو اس کیلئے منظم کرنا شروع کر دیا تھا جس کے نتیجے میں حکمرانوں کو حوصلہ ہوا اور عوام نے شہر چھوڑنا تک کیا۔ ورنہ اگر ابن تیمیہ بھی غامدی صاحب کے فلسفہ پر عمل کرتے تو بغداد کی طرح دمشق کی بھی اینٹ سے اینٹ نک جاتی۔

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ مارچ ۲۰۰۱ء

اس اصولی بحث کے بعد میں جہاد کے مسئلہ کی طرف آتی ہوں جس میں ہمارے درمیان اختلاف کا نکتہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے ملک یا آبادی پر کفار کا تسلط قائم ہو جائے تو کیا مسلمان آبادی یا ان کے علماء کسی باضابطہ حکومت کے قیام کے بغیر اس تسلط کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ ایسی صورت میں علماء کرام کو جہاد کے اعلان کا حق حاصل ہے اور ان کے اعلان کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگ شرعاً جہاد کہلاتے گی۔ جیسے جنوپی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف، الجزاں میں فرنیسی استعمار کے تسلط کے خلاف، اور افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ علماء کے فنوئی پر جہاد کے عنوان سے لڑی گئی ہے۔ مگر معز احمدان میں سے کسی جنگ کو جہاد قرار دینے کیلئے تیار نہیں ہیں اور انہوں نے جواب میں فرمایا ہے کہ قرآن کریم نے ان کے بقول مسلمانوں کی آبادی پر کافروں کے تسلط کی صورت میں دو ہی راستے بتائے ہیں۔ پہلا راستہ یہ کہ اگر بھرت کا راستہ اور مقام موجود ہو تو وہ وہاں سے بھرت کر جائیں۔ اور دوسرا یہ کہ اگر بھرت قابل عمل نہ ہو تو صبر و شکر کر کے بیٹھے رہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حالات کی تبدیلی کا انتظار کریں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں سورۃ النساء، سورۃ الانفال اور سورۃ الاعراف کی بعض آیات کریمہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ وہ مسئلہ کی نوعیت ہی کو سرے سے نہیں سمجھ سکے۔ کیونکہ ان آیات کریمہ میں ان مسلمانوں کیلئے احکام بیان کیے گئے ہیں جو کافروں کی سو سائیٰ میں مسلمان ہو گئے ہیں اور ان کے زیر اثر رہ رہے ہیں۔ ان کیلئے حکم یہ ہے کہ اگر وہاں سے بھرت کر سکتے ہیں تو نکل جائیں ورنہ صبر و حوصلہ کے کے ساتھ حالات کی تبدیلی کا انتظار کریں۔ جبکہ ہم جس صورت پر بحث کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی پر باہر سے اگر کافروں نے تسلط جمالیا ہے اور مسلمان اکثریت پر کافر اقلیت کا جبرا و اقدار قائم ہو گیا ہے اس صورت میں محترم غامدی اور ان کے تلامذہ میں مسلم اکثریت کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اپنا علاقہ کافر غالباً بین کے حوالہ کر کے وہاں سے چلے جائیں یا ان کے جزو و ظلم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے جائیں۔ ورنہ ہمیں توجہ بندی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس سے بر عکس رہنمائی ملتی ہے۔

یمن کا علاقہ جناب بنی اکرم کے دور میں مسلم مملکت میں شامل ہو گیا تھا اور شہر بن باذان کو رسول اللہ نے اپنی طرف سے وہاں کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ یمن کے مختلف علاقوں میں حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو مویی اشترؓ، اور دوسرے عمال کا تقرر کیا تھا۔ مگر اسود عنیٰ نے نبوت کا دعویٰ کر کے صنعا پر چڑھائی کی اور شہر بن باذان کو قتل کر کے یمن کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ مقتول گورنر کی بیوی کو زبردست اپنے حرم میں داخل کیا، یمن کے مختلف علاقوں سے جناب بنی اکرم کے مقرر کردہ عاملوں کو نکال دیا، اور اس طرح یمن کا صوبہ اسلامی حکومت سے نکل کر کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس پر تین حضرات حضرت فیروز و ملکؓ، حضرت قیس بن مکشوؓ، اور حضرت دادوؓ یہ نے باہمی مشورہ کر کے گوریا طرز جنگ پر شخون مارنے کا پروگرام بنایا۔ مقتول مسلمان گورنر شہر بن باذان کی بیوی سے جو اسود عنیٰ نے زبردستی اپنے حرم میں داخل کر رکھی تھی، ان تینوں حضرات نے رابطہ کر کے ساز باز کی جس کے تحت اس نے رات کو اسود عنیٰ کو بہت زیادہ شراب پلادی، ان حضرات نے محل کی دیوار میں نقب لگا کر اندر داخل ہونے کا راستہ نکالا اور رات کی

تاریکی میں اسود عنی اور اس کے پھرہ داروں کو قتل کر کے اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ یہ گوریلا کارروائی تھی اور مسلسل کارروائی تھی۔ اس میں معز احمد صاحب کو بیچنیا کچھ اخلاقی خرابیاں نظر آئیں ہوں گی اور بلا ضرورت قتل و غارت بھی دکھائی دیتی ہوگی۔ لیکن عملًا یہ سب کچھ ہوا جس کے نتیجے میں یمن پر مسلمانوں کا اقتدار دوبارہ بحال ہوا۔ اور جناب نبی اکرمؐ کو جب ان کے وصال سے صرف دو روز قبل وحی کے ذریعے اس کارروائی کی خبر ملی تو آپ نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے صحابہ کرامؐ کو یہ خوشخبری سنائی فائز فیروز کہ فیروزا پے مشن میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت فیروز ولیؐ جب اس کامیابی کی خبر لے کر مین سے مدینہ منورہ پہنچنے تو جناب نبی اکرمؐ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رپورٹ خلیفہ اول حضرت صدیقؓ اکبرؓ کو پیش کی اور انہوں نے اس پر اطمینان اور مسرت کا اظہار فرمایا۔

اس لیے محترم معز احمد صاحب سے عرض ہے کہ جن آیات کریمہ سے انہوں نے استدلال کیا ہے ان کا مصدقہ یہ نہیں ہے بلکہ اس کی عملی شکل وہی یمن والی ہے کہ جب کسی مسلمان ملک پر کافروں کا تسلط قائم ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس تسلط سے بجات حاصل کرنے کیلئے جو صورت بھی اس وقت کے حالات کی روشنی میں اختیار کر سکیں اس سے گریزناہ کریں۔ اور وہ کافروں ظالم قوت کے جابرانہ تسلط کے خلاف مراجحت کی جو صورت بھی اختیار کریں گے وہ حضرت فیروز ولیؐ گی اس گوریلا کارروائی اور شخون کی طرح جہاد ہی کہلائے گی۔

## افغان طالبان کے ساتھ اظہارِ یکجہتی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ جنوری ۲۰۰۱ء

مولانا سمیع الحق مبارکباد کے مستحق ہیں کہ امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف اقوامِ متحده کی سلامتی کو نسل کی طرف سے پابندیوں کے اعلان کے بعد انہوں نے دینی حلقوں کی قیادت کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کا بروقت اہتمام کیا۔ گذشتہ سال جب افغانستان پر امریکی حملہ کے خطرات نظر آنے لگے تو مولانا فضل الرحمن نے عوامی بیداری کی مہم شروع کر کے امریکہ پر واضح کر دیا تھا کہ افغانستان پر حملہ اس قدر آسان نہیں ہے اور ایسا کرنا پاکستان کے عوام کے غنیوں غصب کو بھڑکانے کے مترادف ہو گا۔ اور اب جبکہ سلامتی کو نسل کی آئیں امریکہ نے طالبان حکومت کو بے دست و پا کرنے اور اس کیلئے افغان عوام کو بھوکارنے کا پروگرام بنایا ہے تو مولانا سمیع الحق نے آگے بڑھ کر ملک کی دینی قیادت کو طالبان حکومت کی پشت پر کھڑا کر دیا ہے اور امریکہ کو عملًا یہ پیغام دے دیا ہے کہ افغانستان کو عراق، لیبیا اور سوڈان نے سمجھا جائے کیونکہ افغانستان کی سرحدیں پاکستان کے ساتھ ملتی ہیں، وہی پاکستان جس نے جہاد افغانستان میں اپنے افغان بھائیوں کیلئے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں راستوں سے تعاون و حمایت کے تمام ممکنہ دروازے کھوں دیے تھے۔ اس لیے اب اگر امریکہ بہادر پاکستان کے سرکاری راستوں پر سلامتی کو نسل کی پابندیوں کے پتھر کھڑے کرنے میں بالفرض کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو افغان عوام کے ساتھ تعاون و حمایت کے غیر سرکاری راستے اس کی دسترس سے باہر ہیں اور پاکستان کی دینی

قیادت اپنے افغان بھائیوں کو سلامتی کو نسل کی پابندیوں کے مقی اثرات سے بچانے کیلئے سنجیدگی کے ساتھ متحرک ہو گئی ہے۔

طالبان کی حمایت میں اکوڑہ خٹک میں ہونے والی "متحدہ اسلامی کا نفرنس" میں مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا معین الدین لکھوی، جزل حمید گل، جناب اجمل خٹک، حافظ سعید احمد، مولانا مسعود اظہر، مولانا فضل الرحمن خلیل، مولانا محمد اکرم اعوان، مولانا عظم طارق، مولانا امان اللہ خان اور دیگر قائدین کا یک زبان ہو کر سلامتی کو نسل کی پابندیوں کو مسترد کرنا اور حکومت پاکستان سے ان پابندیوں کو مسترد کرنے کا مطالبہ کرنا ایک اہم پیش رفت ہے جس سے دنیا کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ نے طالبان کے خلاف امریکی الزامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ ان الزامات کو محض ایک بہانہ تصور کرتے ہوئے سلامتی کو نسل کی قرارداد کو اس امریکی مہم کا حصہ سمجھتے ہیں جو طالبان حکومت کو صرف اور صرف اسلامی نظام کے نفاذ پر سزا دینے کیلئے شروع کی گئی ہے۔ اور چونکہ پاکستان کے عموم اور دینی حقوقوں کی اپنی منزل بھی اسلامی نظام کا نفاذ اور معاشرہ میں قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری ہے اس لیے ان کے تزدیک طالبان کو اس کی سزا دینے کا مطلب پاکستان میں اسلامی نظام کا راستہ روکنے اور اس حوالے سے پاکستانی عوام کو ڈرانے دھکانے کے مترادف بھی ہے۔ لہذا اکوڑہ خٹک کی "متحدہ اسلامی کا نفرنس" کے اعلانات اور مشترکہ اعلامیہ صرف طالبان کی حمایت نہیں بلکہ خود پاکستان میں نفاذ شریعت اسلامیہ کی جدوجہد کی طرف سے امریکہ کی اس بالواسطہ ڈھکی کو مسترد کرنا بھی ہے اور اس بروقت پیشافت اور پیش بندی پر مذکورہ کا نفرنس کے تمام شرکاء تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

اکوڑہ کا نفرنس میں رقم الحروف بھی شریک تھا بلکہ اس کا نفرنس میں شرکت کیلئے مجھے دو میں کا سفر دو دن آگے کرنا پڑا۔ میں نے اپنے ٹریوں ایجینٹ کو جنوری منگل کو دو میں جانے کا شیڈول دے رکھا تھا مگر کا نفرنس کی اہمیت کی وجہ سے پروگرام مؤخر کر کے ہفتہ کی صبح دو میں پہنچا اور یہ سطور وہیں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ شدید سردی کے موسم میں تمام جماعتوں کی اعلیٰ قیادت کا اکوڑہ خٹک جیسے دیہیاتی ماحول میں پہنچنا اور کا نفرنس کی کاروائی میں پورے جوش و جذبہ کے ساتھ شریک ہونا جہاں میرے جیسے کارکنوں کیلئے اس اطمینان کا باعث تھا کہ ملک کی دینی قیادت کو مسئلہ کی اہمیت اور عسکری کا پوری طرح احساس ہے وہاں امریکہ بہادر کیلئے بھی اس میں واضح پیغام ہے کہ جنوبی ایشیا کے حوالے سے اس کے ایجینٹس کی پیشافت میں دینی حقوقوں کی روایتی اور بے چک رکاوٹ موجود ہے جس کی پشت پر رائے عامہ اور اسٹریٹ پاور کی ایک مضبوط قوت ہے۔ اس لیے امریکہ اگر اس خطہ میں اپنے مقتبل کے دائی مفادات کے تحفظ میں سنجیدہ ڈچپی رکھتا ہے تو اسے "اسلام دشمن" کی عنیک اتار کر اس خطہ کے عوامی منظروں کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا ہو گا ورنہ برطانوی استعمار اور اس کے بعد رو سی استعمار کی طرح اسے بھی اس خطہ سے اپنا بوریا بستیرتھیٹنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔

مولانا شاہ احمد نورانی تو کا نفرنس کے آغاز کیلئے دیے گئے وقت کے مطابق پورے دس بج تشریف لے آئے جبکہ ابھی منتظرین بھی کا نفرنس شروع کرنے کیلئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے جس کی پاسداری سب حضرات کرنے لگیں تو بہت سا قبیتی وقت ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مولانا نورانی نے ایک اور اچھی روایت یہ نبھائی کہ

کانفرنس کے داعی مولانا اسمعیل الحق نے وقت کی کمی کا ذکر کر کے قائدین سے پانچ پانچ منٹ میں اخبار خیال کی درخواست کرتے ہوئے مولانا نورانی کو افتتاحی خطاب کی دعوت دی تو انہوں نے پورے پانچ منٹ میں اپنی گفتگو مکمل کر لی، اس خوبصورت کے ساتھ کہ موضوع کے حوالے سے کوئی بات تشنہ نہیں تھی۔ اور اس میں بعد میں آنے والے مقررین کیلئے واضح طور پر ”کاہیزیلان“ موجود تھی کہ انہوں نے کیا کہنا ہے اور اس کانفرنس نے کیا کرنا ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی جب اکوڑہ پہنچ تو ہم لوگ مولانا اسمعیل الحق کی رہائش گاہ پر مہماںوں کا انتظار کر رہے تھے، اس موقع پر ایک ہلاکا چھالا سالطینہ بھی ہو گیا۔ میں مولانا نورانی سے ملا تو گلے لگاتے ہوئے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگے کہ آپ ان دونوں یہیں ہیں (یعنی ملک میں ہی ہیں) میں نے عرض کیا کی جی ہاں! تو فرمایا کہ میں بھی ان دونوں یہیں ہوں۔ اس پر ارد گرد موجود حضرات نے قہقہہ کے ساتھ رسید دی کہ وہ ہمارے اس سوال وجواب سے محفوظ ہوئے ہیں۔ مولانا کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ زیادہ وقت ملک سے باہر گزارتے ہیں اور کچھ عرصہ سے میرے بارے میں بھی یہ تاثر پھیل رہا ہے حالانکہ میں سال میں صرف دو تین ماہ کیلئے ملک سے باہر جاتا ہوں مگر عمومی تاثر کچھ ایسا بن گیا ہے کہ جب بھی کسی دوست سے کچھ وقفہ کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو اس کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ باہر سے کب واپس آئے ہیں؟

بہرحال اکوڑہ کانفرنس ایک اچھی اور بروقت پیش رفت ہے جس نے دینی حلقوں کی جدوجہد کو نیا اور عملی رخ دے دیا ہے اور ”فاعل افغانستان و پاکستان کوسل“ کے نام سے مشترکہ فورم کے قیام کے ساتھ ملک کی دینی قیادت جس عملی مہم کا آغاز کر رہی ہے اس کے اثرات پورے جنوبی ایشیا کے حوالے سے انتہائی دور رہ ہوں گے بشرطیکہ اسے محض رسمی امور تک محمد و دنہ رکھا جائے بلکہ مشترکہ اعلامیہ میں دیے گئے نکات کی روشنی میں عملی طور پر سنجیدگی کے ساتھ جدو جہد کو آگے بڑھایا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ”فاعل افغانستان کوسل“ کیلئے ایک مضبوط مرکزی ڈھانچہ جلد از جلد تفصیل دیا جائے جس کے تحت کم از کم صوبائی سطح پر بآہی رابطہ و تظییم کے ڈھانچے فوری طور پر قائم کر دیے جائیں اور ان کے اجلاس منعقد کر کے حکمت عملی بروقت ترتیب دی جائے۔ مختلف شہروں میں مشترکہ جلسوں اور سینیارز کا اہتمام کیا جائے جس کیلئے مرکزی قائدین وقت کی قربانی دیں اور جہاں بھی جلسہ ہو اس میں مرکزی قائدین میں سے کوئی بزرگ ضرور شریک ہوں جو صورتحال پر تفصیل سے روشنی ڈال سکیں۔

**مشترکہ اعلامیہ کے اعلان کے مطابق:**

۱۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان سینکڑوں میل لمبی سرحد کے ساتھ ساتھ قبائلی علاقوں کے عوام کو بیدار

کرنے کیلئے بطور خاص مہم جلالی جائے تاکہ اقوام مختلف کی طرف سے سرحدات کی نگرانی کے نام پر افغانستان

کی ناکہ بندی کے پروگرام کو ناکام بنایا جاسکے۔

۲۔ مرکزی قائدین کا ایک بھروسہ و فداء اسلام آباد میں کچھ دن گزارے اور حکومت پاکستان کے ذمہ دار حضرات

کے علاوہ مسلم ممالک کے سفارت خانوں، اقوام متحده کے مرکزاً اور خاص طور پر چین کے سفارت خانے کا

دورہ کر کے انہیں پاکستان کے عوام اور دینی حلقوں کے جذبات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

- تاجروں، صنعتکاروں اور اصحاب خیر کو امارتِ اسلامی افغانستان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ امداد و تعاون کیلئے توجہ دلائی جائے اور کوشش کی جائے کہ تعاون و امداد کی عملی صورت برآ راستِ اسلام آباد میں افغان سفارت خانہ کے ذریعے ہو۔
- قومی پریس، سیاسی جماعتوں کے قائدین، تعلیمی اداروں کے اساتذہ و طلبہ اور بار کو نسلوں کو صورتحال سے باخبر رکھنے اور انہیں اس جدوجہد کیلئے اعتماد میں لینے کا بطور خاص اہتمام کیا جائے۔
- بیرونی دنیا بالخصوص مغربی ممالک میں جن دینی جماعتوں کے حلقے موجود ہیں وہ ان کی اس مسئلہ کے حوالے سے بریفنگ کا اہتمام کریں اور انہیں توجہ دلائیں کہ وہ ان ممالک کی رائے عامہ، پریس اور انسانی حقوق کے اداروں کو افغان عوام کی حالت زار اور امریکہ کے ناجائز طرزِ عمل سے باخبر کرنے کیلئے منظم کام کریں۔

## جہادِ افغانستان میں امریکہ کا کردار

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ جنوری ۲۰۰۱ء

اکوڑہ جنگ کی متحده اسلامی کانفرنس میں پاکستان شریعت کوئسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا صلاح الدین فاروقی میرے ساتھ تھے، واپسی پر رات ٹیکسلا میں انہی کے ہاں قیام کیا۔ حسب سابق انہوں نے عشاء کے بعد ایک مسجد میں قرآن کریم کے درس اور اس کے بعد نوجوانوں کے ساتھ سوال و جواب کی نشست کا اہتمام کر لیا۔ ایک عرصہ تک میرا یہ معمول رہا کہ شمال کی طرف سے کسی بھی سفر میں ایک رات ٹیکسلا میں گزارنا تھا اور یہاں ایک نشست ایسی ہو جاتی تھی جس میں مختلف نوعیت کے سوال و جواب ہوتے اور شرکاء محفل کے ساتھ مجھے بھی یہ فائدہ ہوتا کہ متعدد مسائل پر ذہن ایک بار پھر حاضر ہو جاتا اور نت نئے نکات ذہن میں ابھرتے۔ کچھ عرصہ کے وقفہ کے بعد گذشتہ ایک دو سالوں سے یہ روایت پھر سے زندہ ہو گئی ہے، اسی حوالے سے اس رات بھی اچھی خاصی نشست ہو گئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نشست کے اہم سوالات و جوابات کی ایک جھلک قارئین کے سامنے بھی آجائے۔

سوال: کیا افغانستان کی جنگ دراصل امریکہ اور روس کی جنگ تھی جو امریکہ کے کہنے پر شروع ہوئی اور دینی حلقے امریکہ کیلئے استعمال ہو گئے؟ کیا اب بھی ایسا نہیں لگتا کہ امریکہ ہی کوئی چاہا ہے جس کی وجہ سے دینی حلقے پھر سے متحرک ہو رہے ہیں؟

میں نے اس سوال کے جواب میں یہ عرض کیا کہ اس سلسلہ میں دو باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ یہ بات تاریخی طور پر غلط ہے کہ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ امریکہ کے کہنے پر اڑی گئی ہے۔ اس لیے کہ افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح افواد کی آمد پر مولوی محمد بنی محمدی، مولوی جلال الدین حقانی، مولوی محمد یونس خاں، مولوی ارسلان رحمانی اور دیگر جن علماء کرام نے اپنے اپنے علاقوں میں جہاد کا فتویٰ دے کر اس کا عملی آغاز کیا تھا ان کا امریکہ کے

ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر شرعی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے جہاد کا فتویٰ دیا اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں اس کا آغاز کر دیا۔ اس وقت ان کے پاس پرانا رواجی اسلحہ بھی مناسب مقدار میں نہیں تھا، وہ یوتلوں میں پڑول اور صابین کے محلول بھر کر ان بوتل بھول سے ٹیکلوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ اور شروع کے کم و بیش تین سال تک یہ کیفیت رہی ہے کہ وہ بہت معمولی اسلحہ کے ساتھ اور انتہائی تقریباً فاقہ کے ماحول میں محض ایمانی قوت کے ساتھ رو سی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ البتہ اس دوران جب انہوں نے افغانستان کے اچھے خاصے علاقے پر کنٹرول حاصل کر لیا تو امریکہ اور دیگر ممالک ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور پھر جس جس نے بھی روس کے ساتھ کوئی حساب چکانا تھا وہ اس جنگ میں کوڈ پڑا۔ اس کے بعد امریکہ اور اس کے ساتھیوں نے اسلحہ بھی دیا، دولت بھی دی اور ہر طرح کی امداد کی۔ چنانچہ یہ کہنا تورست ہے کہ اس جنگ میں امریکہ کا بھی مفاد تھا اور اس نے اپنے مفاد کی خاطر افغان مجاهدین کی بھرپور مدد کی ہے، لیکن یہ کہنا قطعی طور پر غلط اور حقائق کے منافی ہے کہ افغان جہاد امریکہ کے کہنے پر شروع کیا گیا تھا اور افغان علماء نے اس معز کے میں امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔

دوسری بات، یہ کہنا درست ہے کہ رو سی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان کے نام پر لڑی جانے والی یہ جنگ ابتدائی تین چار سال کے بعد افغان مجاهدین اور امریکہ کی مشترک جنگ بن گئی تھی جس میں دونوں نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ افغان مجاهدین کو یہ فائدہ پہنچا کہ امریکہ کے تعاون کی وجہ سے ان کی جنگ آسان ہو گئی۔ جبکہ امریکہ کو یہ فائدہ پہنچا کہ اپنی باقاعدہ فور سزا استعمال کیے بغیر اس نے سوویت یونین کو شکست دے کر نہ صرف اس کے خلاف سرد جنگ جیتی بلکہ ویتنام کی بہریت کا بدلہ بھی لے لیا۔

لیکن اس سوال کا جواب دینا بھی باقی ہے کہ ان دونوں میں سے کس نے دوسرے کو استعمال کیا؟ اس سوال کے جواب کیلئے ہمیں جنگ کے بعد کے حقائق پر ایک نظر ڈالنا ہوگی۔ اور میں اس سلسلہ میں بھی ایک سادہ سامعیار اور کسوٹی پیش کرتا ہوں کہ اگر تو جنگ کے خاتمہ اور روس کی شکست کے بعد افغان مجاهدین کی قیادت امریکہ کے ایجنڈے پر چل رہی ہے اور افغانستان میں امریکہ کی پالیسیوں پر عمل ہو رہا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کر لیتے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے کہ امریکہ نے افغانستان میں اپنے مفاد کیلئے مولوی کو استعمال کر لیا ہے اور افغان مولوی نے جہاد کے نام پر امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ لیکن اگر افغان مولوی نے جنگ کے بعد والے افغانستان میں امریکہ کی پالیسی اور پہنچوں نے اپنے ایجنڈے پر عمل شروع کر رکھا ہے اور وہ امریکہ کی طرف سے تمام تر مخالفت، ڈیکھیوں اور پہنچوں کے باوجود اپنے ایجنڈے پر قائم ہے تو ہمیں پورے شرح صدر کے ساتھ تاریخ کے اس فیصلے کو قبول کرنا ہو گا کہ افغان مولویوں نے اپنی جنگ کیلئے امریکہ کو استعمال کیا ہے۔ اور امریکہ بہادر اپنے تمام تر جاہ و جلال اور شکوه و دبدبہ کے باوجود افغانستان کی سنگلاخ زمین پر سادہ، غریب اور بے سروسامان مولوی کے ہاتھوں بری طرح استعمال ہو گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہی پیچ و تاب امریکہ کو اس حوالے سے کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہا۔

سوال: اگر افغان جنگ کیونزم کے خلاف تھی تو یہ جنگ روس کے کیونزم کے خلاف کیوں لڑی گئی

ہے اور جیتن کا کمیونز ماس جنگ کے اثرات سے کیوں حفظ ہے؟

میں نے عرض کیا کہ روس کے کمیونز م اور چین کے کمیونز میں ایک بنیادی فرق تھا۔ وہ یہ کہ روس کے کمیونز م نے اپنے پاؤں پھیلا کر بوری دنیا پر اپنے فلسفہ کے تسلط کیلئے مہم شروع کر کھی تھی۔ اور سلطی ایشیا اور افغانستان کو عبور کرنے کے بعد اس کا اگلانشنا پاکستان تھا جس کیلئے یہاں بھی خاصاً اور ہو چکا تھا۔ جبکہ چین کا کمیونز م جیسا کیسا بھی ہے اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر ہے اور ملک سے باہر توسعہ پسندانہ عزادم اور پروگرام نہیں رکھتا۔ اس لیے ہمیں اس سے اپنے لیے کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لہذا افغان مولوی یا جنوبی ایشیا کے دینی حلقوں نے روس کے خلاف جو جنگ لڑی ہے وہ دراصل کمیونز م کے خلاف نہیں بلکہ اس کے توسعہ پسندانہ عزادم اور پروگرام کے خلاف تھی، اور اپنے عقائد و روایات اور ملی تشخص کے تحفظ کیلئے تھی۔

اب اس خطے کے دینی حلقوں کو بھی خطرہ امریکہ کی طرف سے درپیش ہے کہ وہ نیورالڈ آرڈر کے نام پر اور اقوام متحده کے انسانی حقوق کے منشور کی آڑ میں مسلمانوں کو اسلام کے معاشرتی کردار اور اسلامی عقائد و احکام کے عملی نفاذ کے حق سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ اس لیے وہی دینی حلقة اب امریکہ کے خلاف صفت بندی میں مصروف ہیں۔ چین کی طرف سے اس قسم کی کوئی مہم نہیں اس لیے اس کے خلاف ہماری کوئی جنگ بھی نہیں ہے اور ہم ایک عظیم اور دوست پژوں کی حیثیت سے اس کا احترام کرتے ہیں۔

**سوال:** چین کے صوبے سنیانگ کے مسلمانوں پر ہونے والے ریاتی جر اور سینکڑوں مسلمان

نوجوانوں کی شہادت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا کہ یہ مسئلہ موجود ہے اور ہمیں اس کی غنی کا احساس ہے۔ مگر ہم اس مسئلہ کے حوالے سے امریکی عزادم سے بھی باخبر ہیں اور کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتے کہ امریکہ اس مسئلہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چین کے خلاف کوئی مجاز گرم کر سکے۔ البتہ سنیانگ کے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے بارے میں چینی حکومت سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسہ میں سنجیدگی سے توجہ دے۔ اور پاکستان کی دینی قیادت جہاں چینی حکمرانوں سے طالبان اور امریکہ کے سوال پر بات کرنے کی خواہ شمند ہے وہاں سنیانگ کے مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں بھی بات ہوگی۔ تاکہ یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے اور امریکہ اسے چین کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔

اس موقع پر میں نے یہ بھی عرض کیا کہ جنوبی ایشیاء کے دینی حلقات اب امریکہ کے خلاف صفت آراء ہو چکے ہیں اور امریکہ نے خود سلامتی کو نسل کی قرارداد کی صورت میں اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس لیے اب آزمائش اور ابتلاء کا ایک اور دور شروع ہونے والا ہے جس میں اور کئی باتوں کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اس خطے میں استعمار کے اصل دشمن کوئی ہیں اور استعمار دشمنی کے نام پر دولت اکٹھی کر کے چوری کھانے اور کھوکھلے نعرے لگانے والے کوئی ہیں۔

## "دفاع افغانستان کونسل" کا قیام

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فوری ۲۰۰۱ء

۱۰ جنوری ۲۰۰۱ء کو دارالعلوم ختنیہ اکوڑہ خنک میں جمیعت علماء اسلام کے رہنماء مولانا سعیج الحجت کی دعوت پر "متحده اسلامی کانفرنس" کے عنوان سے ملک کی دینی جماعتوں کے قائدین کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں افغانستان کی طالبان حکومت کے خلاف اقوام متحده کی سلامتی کونسل کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی مذمت کرتے ہوئے امارتِ اسلامی افغانستان کے ساتھ مکمل تیکھتی کا اظہار کیا گیا۔ اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان پابندیوں کو قبول کرنے کی بجائے انہیں مسترد کرنے کا اعلان کرے، اور اسلامی سربراہ کانفرنس کا ہنگامی اجلاس طلب کر کے طالبان حکومت کو باقاعدہ تسلیم کرنے اور مذکورہ پابندیوں کے خلاف ان کی حمایت و تعاون کا اہتمام کیا جائے۔

اس کانفرنس میں مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا معین الدین لکھوی، مولانا مامن اللہ خان، مولانا محمد اکرم اعوان، مولانا محمد عاظم طارق، اور ڈاکٹر اسرار احمد سمیت مختلف مکاتب فکر کی اہم جماعتوں کے قائدین نے شرکت کی۔ اور سب نے یہی زبان طالبان حکومت کے خلاف سلامتی کونسل کی پابندیوں کو امریکہ کے اسلام دشمن عوام کی آئینہ دار، اور افغانستان میں نافذ ہونے والے اسلامی نظام کے خلاف معاذناہ کارروائی قرار دے کر طالبان حکومت کو ان ناروا اور طالمانہ پابندیوں کے خلاف مکمل حمایت و تعاون کا یقین دلایا، اور اس کی عملی حمایت و معاونت کیلئے "دفاع افغانستان کونسل" قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادھر مولانا فضل الرحمن کی قیادت میں جمیعت علماء اسلام پاکستان نے بیت المقدس اور افغانستان کے بارے میں امریکہ کے معاذناہ کردار اور مسلم بیزار طرز عمل کی مذمت کرتے ہوئے ملک بھر میں امریکی مصنوعات کے بازیکاث کی مہم شروع کرنے کا اعلان کر دیا ہے جسے ملک کی بہت سی دیگر جماعتوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں اقدامات بروقت اور ضروری ہیں جن سے افغانستان کی اسلامی حکومت اور بیت المقدس کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والے فلسطینی مجاہدین کے ساتھ پاکستانی عموم کی ہم آنکھی اور تیکھتی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور امریکہ اور اس کے کمپ کی طرف سے اسلام اور دیندار مسلمانوں کے خلاف کیے جانے والے مسلسل اقدامات کے پس منظر میں یہ دینی حیثیت اور قومی غیرت کا تقاضہ بھی ہے۔ مگر اس کیلئے ضروری ہے کہ اس مہم میں باہمی اشتراک و تعاون کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا جائے، اور مشترکہ جدوجہد کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیتے ہوئے ملک بھر میں رائے عامہ کو اس جدوجہد کیلئے منظم و بیدار کرنے کیلئے مریبوط مخت کی جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے دینی حلقوں اگر اپنے مذکورہ اعلانات کے مطابق منظم اور مسلسل جدوجہد کا بھی اہتمام کر لیں تو طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف سلامتی کونسل کی یہ پابندیاں بھی اسی طرح بے اثر ثابت ہوں گی جس طرح امارتِ اسلامی افغانستان کو اسلامی قوانین سے روکنے کیلئے اس سے قبل ڈالا جانے والا یعنی الاقوامی دباو ناکام ثابت ہوا ہے۔

## افغان عوام کی امداد و حمایت کا وقت

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۱ء

افغان دفاع کو نسل نے امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کی حمایت میں سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ اور مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ زعماء پر مشتمل اس کو نسل کے مرکزی قائدین مولانا معین الحق، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا معین الدین لکھوی، قاضی حسین احمد، ڈاکٹر اسرار احمد، جزل (ر) حمید گل، مولانا عظیم طارق اور دیگر حضرات نے اسلام آباد میں مختلف سفارتی نمائندوں سے ملاقاتوں کے دوران افغان سلطنت پر پاکستان کے دینی حقوقوں کے موقف کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طالبان حکومت کے خلاف امریکہ کے ایسا پر اقوام متحدہ کی سلامتی کو نسل کی طرف سے عائد کی جانے والی پابندیاں سراسر ظالمانہ اور معاندانہ ہیں، پاکستان کی رائے عامہ انہیں مسترد کرتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ افغانستان کی اسلامی حکومت کے حق میں پاکستان کے دینی حقوقوں کا یہ اتحاد نیک فال ہے، جس سے طالبان حکومت کو بھی یقیناً تقویت حاصل ہوگی، اور خود پاکستان کے اندر اسلام شمن عناصر اور بعض علمی قوتوں کی ان سرگرمیوں کی راہ میں بھی رکاوٹ پیدا ہوگی جو پاکستان کے اندر اسلامی شخص سے محروم کرنے اور سیکولر ریاست بنانے کیلئے دن بدن آگے بڑھ رہی ہیں۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ان سرگرمیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا جائے اور طالبان حکومت کی اخلاقی اور سیاسی حمایت کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی اور مالی معاونت کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔ کیونکہ خشک سالی، مسلسل جنگ، اور اقتصادی پابندیوں کے باعث اس وقت افغان عوام کی سب سے بڑی ضرورت معاشری بحالی اور وہاں کے غریب عوام کو بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ہے۔

اس لیے پاکستان کے دینی حقوقوں اور اصحابِ خیر کو چاہیے کہ وہ افغان عوام اور طالبان حکومت کو مالی امداد اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی طرف بھرپور توجہ دیں اور آزمائش کے اس مرحلہ میں اپنے افغان بھائیوں کو تہرانہ چھوڑویں۔

## وزیرِ داخلہ پاکستان اور جہادی تنظیمیں

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۱ء

ملک بھر میں ان دونوں وفاتی وزیرِ داخلہ جناب معین الدین حیدر کے حالیہ بیانات پر بحث و تجھیص کا سلسہ جاری ہے جن میں انہوں نے جہادی تنظیموں کی سرگرمیوں کو ہدفِ تقدیم بنا ہے اور اس عنیدیہ کا اظہار کیا ہے کہ جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کی جا رہی ہے تاکہ وہ جہاد کے نام کھلے بندوں چندہ نہ کریں اور اسلام کی بر سر عالم نمائش نہ کر سکیں۔ وزیرِ داخلہ کا کہنا ہے کہ جہادی تنظیمیں اسلحہ کی بر سر عالم نمائش کر کے امن کی صورت حال کو گاڑنے کا باعث بن رہی ہیں اور چندہ کے نام پر

لوگوں سے زبردستی بھتہ و صول کرتی ہیں۔

لیکن پنجاب کے گورنریفینٹ جزل (ر) محمد صدر نے وزیر داخلہ کے ان بیانات سے اتفاق نہیں کیا اور واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اسلام کی نمائش اور زبردستی بھتہ کی وصولی اگر کرپی میں ہو تو ہو سکتی ہے لیکن پنجاب میں اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے اس لیے پنجاب میں جہادی تظییموں کے چندہ جمع کرنے پر پابندی نہیں لگائی جا رہی۔

ہمارے خیال میں کرپی کے حوالے سے بھی وفاقی وزیر داخلہ کا یہ کہنا حقائق پر مبنی نہیں ہے کہ وہاں جہادی تظییموں جہادی چندہ کے نام پر زبردستی بھتہ و صول کر رہی ہیں اور اسلام کی عام نمائش ہو رہی ہے۔ کیونکہ کرپی اور حیدر آباد وغیرہ میں اسلام کی نمائش اور زبردستی بھتہ کی وصولی کا کام جو عناصر کر رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں اور یہ کام ایک عرصہ سے ہو رہا ہے۔ جہادی تحریکیں تو بہت بعد میں کرپی میں متحرك ہوئی ہیں، ان سے بہت پہلے قوم پرست اور لسانی تحریکیں جبری بھتہ اور اسلام کی نمائش بلکہ خانہ جنگی کا لپچر عام کرچکی ہیں، اور حکومت تمام تدعیوں کے باوجود اب تک ان پر قابو پانے میں ناکام رہی ہے۔

اس لیے ہم وزیر داخلہ سے گزارش کریں گے کہ وہ ان لوگوں کو ضرور قابو کریں جو خانہ جنگی کو فروغ دیتے ہیں، علاقائیت اور لسانیت کو بھار کر قوم میں تفریق پیدا کرتے ہیں، اور گروہی عصیت کے نام پر بے گناہ لوگوں کا خون بہاتے ہیں، لیکن ان کی کارروائیوں کو خواہ مخواہ جہادی تحریکیوں کے کھاتے میں ڈال کر بیرونی آقاوں کو خوش کرنے اور ان کے سامنے نمبر بنانے کی کوشش نہ کریں۔

## امیر المؤمنین ملا محمد عمر سے ملاقات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء

اس دفعہ عید الاضحیٰ کے بعد تعطیلات کے تین چار یا میلے کی تعداد میں سیاکھ اور ڈیال کے علاقوں میں گزارنے کا ارادہ تھا اس لیے عید کے دوسرے روز سفر کے آغاز کیلئے جہلم میں اپنی چھوٹی ہمیشہ کے گھر پہنچ چکا تھا۔ لیکن پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی نے موبائل فون پر قابو کر لیا۔ ان کا ارادہ قدمدار جانے کا تھا اور چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ قدمدار چلوں۔ مولانا درخواستی اس سے قبل قدمدار نہیں گئے تھے اور اپنے ادارہ جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نار تھکرپی کی طرف سے کچھ رقم طالبان حکومت کی امداد کیلئے بھی دینا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اس بھانے قدمدار دیکھ لیا جائے اور طالبان حکومت کے ذمہ دار حضرات بالخصوص امیر المؤمنین ملا محمد عمر سے بھی ملاقات ہو جائے۔ کچھ دوستوں نے تھوڑی بہت رتم مجھے بھی طالبان حکومت تک پہنچانے کیلئے دے رکھی تھی اس لیے ہم دونوں کا پروگرام طے ہو گیا۔

میں ڈیال اور سیاکھ کے دوستوں سے فون پر معذرت کر کے گوجرانوالہ واپس آگیا اور جمعہ پڑھا کر دوسرے روز کوئے پہنچ گیا جہاں مولانا فداء الرحمن درخواستی اپنے فرزند مولانا رشید احمد درخواستی کے ہمراہ میرے انتظار میں تھے۔ تو اوار کو کوئے

میں افغان توصل خانے نے ہمیں بطور مہمان و صول کیا اور ہم ظہر کے بعد روانہ ہو کر عشاء تک قدمہ پہنچ گئے۔ قدمہ کے کور کمانڈر ملا اختر محمد عثمانی ہمارے میزان تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور مدرسہ نصرۃ اللہ گوجرانوالہ میں دورہ تفسیر کے دوران انہوں نے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدر سے قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر بھی پڑھی ہے۔ ہم تین دن ان کے مہمان خانے میں رہے۔ انہی دنوں قطر اور مصر کے علماء کرام بھی بتوں کو مسماਰ کرنے کے سوال پر بات چیت کرنے کیلئے قدمہ آئے ہوئے تھے اور ان کی آمد کا خاصاً چرچا تھا۔ اس سے قبل پاکستان کے وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر بھی قدمہ جا کر طالبان حکومت کے سربراہ سے بت نہ توڑنے کی سفارش کر چکے تھے جو قول نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس فضائیں جب ہم پہنچے تو ہمارے میزان نے سوال کیا کہ کیا آپ حضرات بھی بتوں کے بارے میں آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہم بھی اسی سلسلہ میں آئے ہیں لیکن ہماری گزارش ہے کہ یہ کام شروع کر دیا ہے تواب پیچھے ہٹنا درست نہیں ہے اور اس کام کو جلد از جلد مکمل کر دیں۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ بتوں کو مسماਰ کرنے کے اس عمل کے شرعاً صحیح اور ضروری ہونے میں توسرے سے کوئی کلام ہی نہیں ہے لیکن اگر کام شروع کرنے سے قبل ہم سے دریافت کیا جاتا تو ممکن ہے ہم بھی یہ عرض کرتے کہ اس کے مناسب وقت کیلئے زیادہ سے زیادہ اصحاب علم و دانش سے مشورہ کر لیں۔ مگر اب جبکہ اس کا خیر کا آغاز ہو چکا ہے تو ہم اس کو جلد از جلد مکمل کرنے کے حق میں ہیں اور اس میں کسی قسم کی نرمی کو اب درست نہیں سمجھتے۔

امیر المؤمنین ملا محمد عمر سے ہماری ملاقات منگل کے روز ہوئی۔ ہمارے میزان ہمیں لے کر ان کی قیام گاہ پر پہنچے تو ان کی رہائش گاہ سے باہر کھلے میدان میں نگی زمین پر کچھ علماء کرام دائرہ کی شکل میں بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھ کر ہم نے سمجھا کہ شاید گھر کے اندر باری باری حضرات کو ملاقات کیلئے بلا یا جا رہا ہے اور یہ حضرات اپنی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ لیکن جب قریب ہوئے تو دیکھا کہ ملا محمد عرب بھی انہی لوگوں کے ساتھ خالی زمین پر اُلتی مارے بیٹھے ہیں اور ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں پہلے بھی دیکھ کر حکما تھا اس لیے پہچان لیا لیکن مجھے مولانا درخواستی کو یہ بتانا پڑا کہ یہ صاحب جہنوں نے درمیان سے اٹھ کر ہمارے ساتھ معاشرہ کیا ہے یہی طالبان حکومت کے سربراہ امیر المؤمنین ملا محمد عمر ہیں۔

یہ منظر بیکھ کر وہ حدیث یاد آگئی کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے درمیان بے تکلفی کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور بسا واقعات باہر سے آنے والے کو بیٹھنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہ دیکھ کر یہ پوچھنا پڑتا تھا کہ تم میں مدد کون ہیں؟ آج اسی سنت کو اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ ہوتے دیکھ کر جو خوشی ہوئی اسے میں الغاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت افغانستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولوی نور محمد شاقب امیر المؤمنین کو عرب علماء کے وفد کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر رہے تھے۔ یہ گفتگو پشتہ میں ہو رہی تھی جس کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا لیکن بعد میں ہمیں اس کا جو خلاصہ بتایا گیا اس کے مطابق ملا محمد عمر نے یہ کہا تھا کہ ان بتوں کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ ان کی عبادت نہیں ہوتی تھی اور یہ صرف نماکش اور یادگار کے طور پر تھے۔ اس لیے کہ عبادت صرف سامنے کھڑے ہو کر سر جھکانے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کی اور ہستی یا چیز کے بارے میں دل میں تنظیم اور محبت کے وہ

جنبات رکنا بھی عبادت کے زمرے میں شامل ہے جو جذبات صرف خاتق و مالک حقیق کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں، تقطیعی جذبات رکھنے والا ہزاروں میل دور کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اختیار حاصل ہونے کے بعد ہم نے ان بتوں کو توڑنے میں اب تک جوتا خیر کی ہے وہ ہماری کوتاہی ہے اور شاید اسی وجہ سے ہم بارش سے بھی مسلسل محروم چلے آرہے ہیں اور پورے افغانستان میں طویل عرصہ کے بعد بارش کا نزول ہوا ہے۔

امیر المومنین کے ساتھ اس مختصر ملاقات کے علاوہ طالبان حکومت کے دیگر ذمہ دار حضرات سے بھی ہماری گفتگو ہوئی۔ ہم بازار گئے، مختلف دکانوں میں گھوسمے، بہت سے لوگوں سے باتیں کیں، افغان وزارت خارجہ کے دفتر میں گئے، مختلف اہل کاروں سے افغانستان کی موجودہ صورت حال بالخصوص اقوام متحده کی پابندیوں کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں اور افغان معاشرہ پر ان پابندیوں کے اثرات کا جائزہ لیا۔ ان کی تفصیلات آئندہ چند کالموں میں قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## افغانستان پر پابندیوں کے عملی اثرات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۳ مارچ ۲۰۰۱ء

قدھار حاضری کا ایک مقصد اقوام متحده کی سلامتی کو نسل کی طرف سے افغانستان پر عائد کی جانے والی پابندیوں کے اثرات کا جائزہ لینا بھی تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد حکام سے گفتگو کے علاوہ ہم نے بازاروں میں گھوم پھر کر اشیاء صرف کی دستیابی اور ان کی قیمتیوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

ہمارے نیزبان ملا اختر محمد عثمانی نے، جو قدھار کے کورسمنڈر ہیں، سلامتی کو نسل کی پابندیوں کے اثرات و نتائج کے بارے میں سوال کے جواب میں کہا کہ ان پابندیوں کی وجہ سے مسلمان بھائیوں کی توجہات اور خاص طور پر پاکستان کے اہل دین اور اہل خیر کی حمایت و تعاون میں اضافہ ہوا ہے۔ اور دنیا بھر کے دیندار حلقوں ہمارے لیے دعاوں کے ساتھ ساتھ حمایت و معاونت کا بھی اہتمام کر رہے ہیں جس پر ہم خوش ہیں۔ اس سے ہمارا حوصلہ و اعتماد بڑھا ہے اور یہ ہمارے لیے ایک قیمتی اتنا شے ہے۔

کراچی میں امارت اسلامی افغانستان کے قونصل جزل ملار حمت اللہ کا کاظمزادہ بھی ان دونوں قدھار میں تھے بلکہ امیر المومنین ملا محمد عمر سے ملاقات میں ہماری ترجیحانی بھی انہوں نے کی۔ ان سے اس سلسلہ میں تفصیلی بات چیت ہوئی، انہوں نے کہا کہ سلامتی کو نسل کی پابندیوں کے بعد ہمیں تین طرح کی تبدیلیوں اور تغیرات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک یہ کہ بین الاقوامی پابندیوں کی وجہ سے افغانستان کرنی کی قیمت تقریباً چالیس فیصد تک مزید گرگئی ہے جس سے عام آدمی کی قوت خرید بری طرح متاثر ہوئی ہے اور اشیاء صرف بیلے سے زیادہ مہنگی ہو گئی ہیں۔ یہ بات ہم نے بھی محسوس کی اس لیے کہ تقریباً آٹھ ماہ قبل جب میں کابل گیا تھا تو ایک سودا یا ایک سو پندرہ روپے پاکستانی کے عوض ایک لاکھ افغانی ملتا تھا مگر اب کرنی کا ریٹ پوچھتا تو اسی روپے پاکستانی کے عوض ایک لاکھ افغانی ملتے ہیں اور اشیاء صرف کی قیمتی میں بھی اسی تناسب

سے اضافہ ہوا ہے۔

حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی نے قندھار سے ایک چپل خریدا جو کریمی کا بنا ہوا تھا مگر قندھار کی نسبت سے خریدا گیا۔ جبکہ میں نے ایک کتب خانہ سے دو کتابیں خریدیں۔ ایک عبد الحمی مرحوم کی فارسی میں ”تاریخ معمقر افغانستان“ ہے اور دوسری ایک اطالوی دانشور ڈاکٹر پیو کارلو تریزیو (Dr. Pio-Carlo Toranzio) کی کتاب ۔۔۔۔۔ اور افغانستان کے خطہ میں روس اور برطانیہ کی رقبات و کشمکش کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ یہ کتابیں مجھے سوا سور و پاکستانی یعنی تقریباً ڈیڑھ لاکھ افغانی میں ملیں۔ مولانا درخواستی نے ایک دکان سے ہمیں آنس کریم کھلانی جو دراصل فریزر میں الگی ہوئی کسٹرڈ کھیر تھی اور پندرہ ہزار افغانی میں ایک پلیٹ (تقریباً تیرہ روپے پاکستانی) میں مل رہی تھی۔ بہر حال افغان کرنی کی قیمت میں واضح کی اور اشیاء صرف کی قیمتوں میں اسی تناسب سے اضافہ ہم نے دیکھا جو افغانستان کے خلاف بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں کا لازمی نتیجہ ہے اور اس سے بلاشبہ افغان عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔

ملار حمت اللہ کا کازادہ نے کہا کہ سلامتی کو نسل کی پابندیوں کا دوسرا اثر عملی طور پر یہ ہوا ہے کہ امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف عالمی پریس اور بین الاقوامی سیکولر حلقوں کے مسلسل معاذانہ پر ایگینٹھ کے جواب میں طالبان حکومت کے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کیلئے جو افغان مشن مختلف ملکوں میں جاتے تھے اور ان کی بات کسی نہ کسی حد تک پکھ لے گوں تک پہنچ جاتی تھی، ان سفارتی مشنوں کی آمد و رفت میں سلامتی کو نسل کی پابندیوں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس طرح طالبان حکومت کو عالمی رائے عامہ کے سامنے اپنے موقف کی رواہ راست وضاحت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔

افغان قونصل جزل کے طابق ان پابندیوں کا تیرساڑیہ ہوا ہے کہ جنگ سے متاثرہ ایسے زخمی اور مریض جن کا علاج ملک میں نہیں ہو سکتا تھا، وہ کسی نہ کسی طرح علاج معاوچہ کیلئے ہر دن ملکوں بالخصوص مغربی ممالک میں چلے جاتے تھے۔ مگر اب ایسا ممکن نہیں رہا اور اس قسم کے سینکڑوں مریض علاج معاوچہ کی سہولت سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس کے علاوہ اور کوئی عملی تبدیلی ان پابندیوں کی وجہ سے نمودار نہیں ہوئی، بالخصوص عالم لوگوں کو ضرورت کی اشیاء بازار میں دستیاب ہیں کیونکہ پاکستان، ایران اور ترکمانستان کے راستوں سے اشیاء خورد و نوش اور دیگر عام ضروریات کی اشیاء مارکیٹ میں پہنچ رہی ہیں اور افغان عوام کو اس سلسلہ میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہے۔

البتہ ایک بات بطور خاص ہم نے محسوس کی کہ بازار میں ایرانی مال کا تناسب زیادہ ہے اور نسبتاً وہ ستائیجی ہے۔ اس کی وجہ ایک افغان افسر نے ہمارے دریافت کرنے پر ہے بتائی کہ ہم پاکستانی تاجروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے جبکہ ایرانی تاجر پوری منصوبہ بندی کے ساتھ افغان مارکیٹ میں اپنا اثرور سون خبر ہانے کیلئے کام کر رہے ہیں اور انہیں اس سلسلہ میں ایرانی حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ افغان افسر نے کہا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ پاکستانی تاجر ادھر متوجہ ہوں اور افغان مارکیٹ میں اپنی جگہ بنائیں۔ اس کیلئے ہم ہر قسم کی سہولت فراہم کرنے کو تیار ہیں لیکن ۔۔۔۔۔ رسمک نہیں لے رہے جبکہ ایرانی تاجروں نے تمام تحفظات بالائے طاق رکھ دیے ہیں اور افغان مارکیٹ میں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کیلئے ہر قسم کا رسک لے رہے ہیں جس کی وجہ سے ایرانی مال افغانستان کے

بازاروں میں ہر طرف نظر آتا ہے۔

یہ بات جب میں نے گجرانوالہ کے بعض تاجر دوستوں سے کی تو انہوں نے کہا کہ اس کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ ایرانی صنعت کار اور تاجر کو اپنے ملک میں ان ٹیکسوں کا سامان نہیں ہے جنہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ اس لیے ایرانی تاجر اپنی اشیاء کو افغان مارکیٹ میں جس پر چون نرخ پر فروخت کر رہا ہے وہ ہماری کاست سے بھی کم ہے اور اس صورت حال میں ہم ایرانی مال کا مقابلہ کرہی نہیں سکتے۔ ان تاجر دوستوں کا کہنا ہے کہ ایرانی حکومت اپنی پالیسیوں میں خود مختار ہے اس لیے وہ اپنے صنعتکاروں اور تاجروں کو نئی منڈیاں بنانے کیلئے ہر قسم کی سہولت دے سکتی ہے، جبکہ ہماری میں ایف کا نئروں ہے اس لیے ہماری حکومت چاہے بھی تو ہمیں وہ سہولتیں اور ٹیکسوں میں چھوٹ نہیں دے سکتی جو افغان مارکیٹ میں ایرانی مال کا مقابلہ کرنے کیلئے بہر حال ضروری ہیں۔

## افغانستان میں سرمایہ کاری کی اہمیت اور امکانات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ مارچ ۲۰۰۱ء

افغان توصل جزء ملک رحمت اللہ کا کا زادہ نے یہ بتا کرم از کم مجھے توجیہ ان کر دیا کہ دو سال قبل دوسری میں مختلف ملکوں کی مصنوعات کی بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی جس میں لیدر، قالین اور کشیدہ کاری کے شعبوں میں ۳۴ ممالک میں افغان مصنوعات سرفہرست رہی تھیں اور اس پر ایک پڑوسی ملک کے تاجر کف افسوس ملتے رہ گئے تھے۔ جیرانی اور تجوب کے ساتھ مجھے خوشی بھی ہوئی کہ مسلسل جنگ کی تباہ کاربیوں اور مکمل بے سروسامانی کے ماحول میں اگر افغان صنعت کار اور ہنرمند بین الاقوامی نمائش میں اپنے لیے نمایاں جگہ بناسکتے ہیں تو سازگار فضا اور اسباب و وسائل کی فراہمی کی صورت میں وہ یقیناً اس سے کہیں بہتر پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ افغان صرف لڑنے مرنس کے میدان کے لوگ نہیں بلکہ ہنر اور صنعت کے شعبوں میں بھی اپنی ذہانت اور بہادری کا سکھہ منواسکتے ہیں بشرطیکہ انہیں مناسب ماحول میسر ہو، ضروری اسباب و وسائل مہیا ہوں، اور حوصلہ افزائی و قدر دافنی کی فضا فراہم ہو جائے۔ افغانوں کے بارے میں یہ بات تو عام مشاہدہ کی ہے کہ وہ محنت اور جفاشی کے عادی ہیں اور محنت و مشقت کے کسی کام کو اپنے لیے عار کا باعث نہیں سمجھتے۔ خود ہمارے ہاں محنت و مشقت کے جن کاموں کو افغانوں نے سنبھال رکھا ہے وہ شاید کوئی دوسرا طبقہ اس طرح سنبھال سکے۔ جو تے پاش کرنے سے لے کر لکڑیاں کاٹنے تک، رات کو چوکیدارہ کرنے اور سڑکوں کی روڑی کوٹنے تک کے کام ان کے کھاتے میں ہیں۔ کبھی کبھی بعض دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں افغانوں نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں یہ واپس کیوں نہیں جانتے؟ لیکن جب ان سے عرض کیا جاتا ہے کہ محنت و مشقت کے جو کام ان افغانوں نے اپنے حصہ میں لے رکھے ہیں ان کے جانے کے بعد یہ کام کون سنبھالے گا، اور اگر کوئی سنبھال بھی لے تو اس دل جمعی، دیانت داری، محنت اور یکسیوں کے ساتھ ان کاموں کو اور کون کر پائے گا؟

الغرض افغان قوم جہاں جنگو ہے وہاں محنت و مشقت کی خونگر بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت اور ہنرمندی کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے لیکن ان کی زندگی کا یہ پہلو اکثر دنیا کی نگاہوں سے اوچھل ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اگر اس سمت ان کی تصحیح را ہمنامی ہوا اور انہیں حوصلہ افزائی اور وسائل فراہم ہو جائیں تو بہت جلد وہ ترقی یافتہ یا کم از کم ترقی پذیر ممالک میں نمایاں جگہ بناسکتے ہیں۔

طالبان حکومت نے افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار افغان عوام سے اسلحہ واپس لے کر اور شرعی حدود عملانہ نذر کے افغان معاشرہ کو باہمی قتل و قتال سے نجات دلائی ہے۔ اور خدا اکرے کہ شمال کی جنگ جلد اپنے مطلقی نتیجہ تک پہنچ جائے تو اس کے بعد بلاشبہ افغان معاشرہ ایک پر امن معاشرہ کے طور پر نئے دور کا آغاز کرے گا۔ پھر افغان قومی صلاحیتیں یکسوئی کے ساتھ تعمیر نہ اور صنعت و حرفت کیلئے وقف ہوں گی اور نہ صرف افغانستان ایک مثالی اسلامی اور فلاجی ریاست کی صورت میں ابھرے گا بلکہ پاکستان، ایران اور وسطی ایشیائی ریاستیں بھی افغان قوم کی ان صلاحیتوں کے نتائج و ثمرات سے اپنے اپنے حوصلہ اور ظرف کے مطابق فائدہ اٹھائیں گی لیکن اس کیلئے ابھی سے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

جو ملک اور قوم اس وقت آنے والے حالات کا صحیح طور مشاہدہ کر کے اس کے مطابق منصوبہ بندی کرے گی وہی مستقبل کے نقشہ میں اپنے لیے صحیح جگہ حاصل کر سکے گی۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ عالمی نظام خود اپنے پھیلائے ہوئے حکومت و فرب کے جال میں بری طرح الجھ کر رہا گیا ہے۔ اس کی پسپائی بلکہ موت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا نظام ابھر رہا ہے جس کی بنیاد یقین و ایمان، آسمانی تعلیمات، دینی اخلاقیات، سودی اور استحصالی معیشت کے خاتمه، اور انسانیت کی بھلائی پر ہے۔ اور افغانستان کا کردار اس میں ہر اول دستہ کا نظر آتا ہے۔ اس لیے پاکستانی تاجروں، صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں کو آنکھیں کھولنی چاہیں اور تحفظات کے دائرہ سے نکل کر کھلی فضائیں موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لینا چاہیے۔ افغانستان میں اس وقت سرمایہ کاری کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ وہاں کی مارکیٹ اپنے پاکستانی بھائیوں کے انتظار میں ہے، بند کارخانے پاکستانی صنعت کاروں کی راہ دیکھ رہے ہیں، اور زیریز میں پیچھے ہوئے معدنیات کے بیش تیمت اور وسیع ذخائر پاکستان کے ہنرمندوں اور سرمایہ کاروں کو دعوت عمل دے رہے ہیں۔

ایک معاملہ میں میرے سوال پر افغان قنصل جزل ملا رحمت اللہ کا کازادہ نے یہ بھی بتایا کہ وہ می کے اوائل میں کرباجی میں افغان مصنوعات کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں مختلف حلقوں سے رالمی قائم کر رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ پاکستان کے مختلف شہروں میں افغان مصنوعات کی نمائش ہو جبکہ پاکستانی مصنوعات کا افغانستان میں عمومی تعارف کرنے کیلئے کابل، قندھار اور دیگر شہروں میں ان کی نمائش کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے طالبان حکومت ہر ممکن سہولیات مہیا کرنے کیلئے تیار ہے۔ طالبان حکومت کے ایک اور اعلیٰ افسر نے کہا کہ مغربی ممالک کی بہت سی کمپنیاں اور ادارے افغانستان میں سرمایہ کاری کیلئے لائن میں لگے ہوئے ہیں مگر ہم ان کو راستہ نہیں دے رہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس کام کیلئے مسلم ممالک آگے آئیں اور ان میں سے بھی ہماری سب سے پہلی ترجیح پاکستان ہے لیکن ہم

زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکیں گے اور نہ ہماری ضروریات ہمیں زیادہ دیر تک انتظار کی اجازت دیں گی۔ اس لیے اگر ہم اس خلا کو پر کرنے کیلئے مغربی ممالک اور دیگر غیر مسلم ممالک کے مالیاتی اداروں کو راستہ دینے پر آخر کار مجبور ہو گئے تو اس سلسلہ میں غفلت سے کام لینے والے ہمارے مسلمان بھائی اس کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکیں گے۔

ملار حمت اللہ کا کازاڈہ نے کہا کہ افغانستان میں سرمایہ کاری کیلئے ڈاکٹر سلطان بشیر محمد صاحب کا گروپ زیادہ بہتر اور منظم طریقہ سے کام کر رہا ہے، خواہش مند حضرات ان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اور اسلام آباد میں افغان سفارتخانہ کے علاوہ کربلی میں خود ان سے بھی اس پتہ پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ مکان نمبر ۲۷، گلی نمبر ۱۱/۳۳، خیابان شمشیر فیز ۷ ڈائنس سوسائٹی کربلی۔

## چند لمحےِ احمد شاہ بابا کے مزار پر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ مارچ ۲۰۰۱ء

قدھار جانا ہو اور احمد شاہ ابدالی<sup>ؒ</sup> کے مزار پر فاتحہ خوانی کیلئے حاضری نہ ہو، یہ میرے جیسے تاریخ کے طالب علم کیلئے ممکن ہی نہیں۔ گذشتہ دفعہ جب قدھار گیا تو احمد شاہ ابدالی<sup>ؒ</sup> کے مزار پر بھی گیا۔ اس وقت مزار کے دروازے کھلے تھے اس لیے یونچ تھے خانے میں اتر کر قبر کی پائی پر کافی دیر کھڑا رہا اور فاتحہ خوانی کے بعد تصور کی دنیا میں احمد شاہ بابا سے راز و نیاز میں مصروف رہا۔ مگر اس بار حضرت مولانا فراء الرحمن درخواستی کے ہمراہ حاضری ہوئی تو دروازے بند تھے اس لیے بابر کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی اور ”خلوت“ میسر نہ ہونے کی وجہ سے راز و نیاز کا شوق بھی ادھورا رہ گیا۔

احمد شاہ ابدالی<sup>ؒ</sup> کو افغان عوام محبت و عقیدت سے احمد شاہ بابا کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اسی عقیدت سے اس عظیم افغان فرمازروں کی قبر پر حاضری بھی دیتے ہیں جس نے اٹھار ہویں صدی عیسوی میں قدھار میں افغان سلطنت کی بنیاد رکھی اور صرف ربع صدی کے عرصہ میں اس کی سرحدیں دریائے آموسے دریائے سندھ تک اور بتت سے خراں تک وسیع کر کے اب تک عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی<sup>ؒ</sup> ۲۷۱ء میں ملتان میں پیدا ہوا۔ افغانستان کے ابدالی قبیلہ کے پولپلزی خاندان کی سدوزی شاخ سے اس کا تعلق ہے۔ اس کا باپ سردار زمان خان مر حوم ہرات پر ایرانیوں کے قبضہ کی مراجحت کرتا ہوا گنرا کام رہا اور ایرانی ہرات پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد سردار زمان خان کے بھائی ذوالفقار خان نے ایرانیوں کے خلاف بغاوت کی مگر وہ کامیاب نہ ہوا اور ۱۳۳۷ء میں ہرات پر ایرانی قبضہ مکمل ہو گیا۔ سردار زمان خان کا بیٹا احمد خان ایرانی فرمازرو نادر شاہ کی فوج میں بھرتی ہوا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث ایک سپاہی کے منصب سے ترقی کرتے ہوئے صرف تین برس کی عمر میں سپہ سالار کے مقام تک جا پہنچا۔ مگر ۲۷۲ء میں قزباشوں کے ہاتھوں نادر شاہ قتل ہوا تو احمد خان نے دیگر افغان فوجیوں کے ہمراہ وطن واپسی کی راہ اختیار کی، قدھار میں افغان سلطنت کی بنیاد رکھی، احمد شاہ کا لقب پایا، اور در درال (موتیوں کا موتی) کا خطاب حاصل کیا جس کی وجہ سے اسے درانی کہا جاتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی<sup>ؒ</sup> نے ۲۷۳ء میں وفات

پائی مگر اس دوران مسلسل مرکز کے آرائی اور فوجی مہماں میں اس نے اپنی سلطنت کو دریائے آمو سے دریائے سندھ تک اور تبت سے خراسان تک وسیع کر لیا جس میں کشمیر، پشاور، ملتان، سندھ، بلوچستان، ایرانی خراسان، ہرات، قندھار، کابل اور پنجشیر کے علاقے شامل تھے۔

احمد شاہ ابدالی<sup>۱</sup> نے ہندوستان پر نو حملے کیے اور ایک مرحلہ پر لا ہور اور سر ہند پر قبضہ کر کے انہیں بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر اس کا سب سے بڑا معمر کہ پانی پت کی تیسری لڑائی ہے جس میں اس نے جنوبی ہند کے جنوں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی یلغار کا راستہ روکا اور شمالی ہند کے اس خطہ کو، جسے آج پاکستان کہلانے کا شرف حاصل ہے، بمیشہ کیلئے مسلمانوں کے نام مخصوص کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغل بادشاہت زوال کا شکار تھی۔ اسے ایک طرف سمندر پار سے تجارت کے نام پر آنے والی کمپنیوں نے، جن میں برطانیہ اور فرانس کی ایسٹ انڈیا کمپنیاں سرفہرست تھیں، دھکلنا شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف سے جنوبی ہند کے انتہا پسند ہندوؤں یعنی مرہٹوں کی فوج دہلی پر قبضہ کیلئے بے چین تھی۔ تیسرا طرف پنجاب میں سکھوں نے اپنی قوت اور خود مختاری کے اظہار کا آغاز کر دیا تھا۔ اور اسی فضائیں ایرانی فرمانرواندار شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے اس کی ایسٹ سے ایسٹ بجاتی تھی اور وہ قتل عام کیا تھا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی<sup>۲</sup> جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی علمی و دینی قیادت کا علم اٹھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے دہلی کی طرف ہندو مرہٹوں کی یلغار کو شمالی ہند کے مسلمانوں کیلئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہوئے مغل بادشاہت کو اس کے مقابلے بے بس پا کر احمد شاہ ابدالی<sup>۳</sup> سے مدد کی فریاد کی۔ مرتبتے بھی اپنے مقابلہ میں افغانوں کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے اور ۱۷۵۸ء میں پنجاب کو افغانوں سے خالی کرانے کی ہمیں میں پشاور تک یلغار کر چکے تھے۔ اس پس منظر میں افغانوں کی یہ ابھرتی ہوئی قوت ہی عالم اسباب میں شمالی ہند کے مسلمانوں کا سب سے بڑا سہارا ہن سکتی تھی۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی<sup>۴</sup> کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی<sup>۵</sup> نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کے مقابلہ کیلئے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو تاریخی شکست سے دوچار کرنے کے بعد دہلی کی حکومت ایک بار پھر مغل بادشاہ محمد شاہ کے پس در کر کے اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔

”تاریخ مختصر افغانستان“ کے مصنف عبدالحی جیبی مرحوم کا کہنا ہے کہ احمد شاہ ابدالی حنفی المذہب عالم تھا، دینی احکام کا پابند اور متشرع حکمران تھا۔ اور شعر و شاعری اور ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا۔ پیشتوں میں احمد شاہ ابدالی گادیویان عبدالحی جیبی مرحوم نے ہی شائع کیا ہے جواہر ہائی ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں غزل، رباعی، قطعات، اور محاسن وغیرہ کی مختلف شعری اصناف شامل ہیں۔ تصوف و سلوک میں اپنے وقت کے دوڑے شیوخ حضرت شاہ فقیر اللہ جلال آبادی<sup>۶</sup> اور حضرت میاں محمد عمر پشاوری<sup>۷</sup> سے اس کا ارادت کا تعلق تھا۔ اور سلوک و معرفت کے مسائل پر بھی اس کا شاعرانہ کلام موجود ہے جس کی شرح پشاور کے قاضی ملا محمد غوث نے ”شرح الشرح“ کے نام سے لکھی تھی۔

احمد شاہ ابدالی<sup>۸</sup> فرمانروائی کا یہ پہلو تاریخ کی نظر میں عجیب اور ناقابل فہم ہے کہ اس نے مسلمان سرداروں اور حکمرانوں پر تسلط حاصل کرنے اور انہیں میدان جنگ میں شکست دینے کے باوجود ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا اور ان کے علاقوں پر مسلسل قبضہ برقرار رکھنے کی بجائے انہی کو مناسب شرائط پر ان کے علاقے لوٹا دیے۔ مؤرخ جیبی

مرحوم نے احمد شاہ عبدالیٰ کے اس طرز عمل کو تاریخی طور پر عجیب قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ دہلی، بخارا، خراسان، سندھ اور بلوجستان کے حکمرانوں کے ساتھ اس نے بھی معاملہ کیا۔ اور پانچ پت کا معاملہ تو ہمارے سامنے ہے کہ مرہٹوں کی خوفناک شکست کے بعد اگر احمد شاہ عبدالیٰ دہلی میں بیٹھ جاتا اور ہندوستان پر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیتا تو دنیا کو کوئی طاقت اسے اس اقدام سے نہیں روک سکتی تھی۔ بلکہ تاریخ کے میرے جیسے طالب علم کی نظر میں اس وقت احمد شاہ عبدالیٰ کے دہلی میں بیٹھ جانے کی صورت میں نہ صرف فرنگیوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے بلکہ سکھوں کی روز افروز سرکشی بھی کشڑوں میں رہتی۔ لیکن احمد شاہ عبدالیٰ نے اپنی افتاد طبع اور اس کے ساتھ اپنے پیچھے قندھار میں بغاوت کے آثار دیکھ کر واپس لوٹ جانے کو ترجیح دی۔

مؤرخ جیبی مرحوم نے احمد شاہ عبدالیٰ کے اس طرز عمل پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ عبدالیٰ کا یہ رویہ اس دنیا کے معاملات کے حساب سے نہ تھا۔ گویا حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک احمد شاہ عبدالیٰ کا معاملہ تکوینیات اور عالم غیب سے تھا کہ وہ اپنے ذمہ داری ادا کر کے اسی طرح واپس چلا گیا۔

## بت شکنی اور طالبان حکومت کا موقف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اپریل ۲۰۰۱ء

عید الاضحیٰ کے بعد پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمن درخواست کے ہمراہ قندھار جانے کا اتفاق ہوا اور طالبان حکومت کے سربراہ امیر المونین ملا محمد عمر اور دیگر سرکردہ حضرات سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا۔ امیر محترم کے فرزند مولانا شاہ احمد درخواستی بھی ہمارے ساتھ تھے، اور ہمارا قیام قندھار کے کوکمانڈر ملا اختر عنانی کے ہاں تھا جو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورہ تفسیر قرآن کریم میں شریک رہ چکے ہیں۔

ان دونوں قندھار میں قطر اور مصر کے بعض سرکردہ علماء کرام کا وفد بھی آیا ہوا تھا جو طالبان حکومت کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ بتوں کو مسامار کرنے کا جو عمل آپ لوگوں نے شروع کر کھا ہے وہ مصلحت کے خلاف ہے۔ ان علماء کی امیر المونین سے ملاقات نہیں ہو سکی البتہ افغانستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولوی نور محمد ثاقب سے ان کے مذاکرات ہوئے مگر وہ افغان حکام کو اپنے موقف پر قائل نہ کر سکے۔ مولوی نور محمد ثاقب افغانستان کے سرکردہ علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں اور مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔

قریبی حقوقوں کے مطابق مولوی نور محمد ثاقب صاحب نے عرب علماء سے دریافت کیا کہ ایک اسلامی ریاست میں کھلے بندوں بت اور مجسمے نصب ہوں تو اسلامی حکومت کی ذمہ داری کیا ہے؟ جواب میں عرب علماء نے کہا کہ شرعاً ایسے بتوں اور مجسموں کو لوڑنا اسلامی حکومت پر واجب ہے۔ افغانستان کے قاضی القضاۃ نے دریافت کیا کہ اگر ان بتوں کو مسامار کرنا واجب ہے تو پھر آپ حضرات ہمیں اس عمل سے رک جانے کا مشورہ کیسے دے رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ہم مصلحت کی خاطر یہ کہہ رہے ہیں۔ اس پر مولوی نور محمد ثاقب نے یہ بصیرت افروز جواب دیا کہ شرعی واجبات میں کسی اور

مصلحت کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ شریعت کے فرض اور واجبات خود مصلحت پر منی ہوتے ہیں۔

چنانچہ وفد طالبان کو حکومت کو قائل نہ کر سکا اور بے نیل مرام واپس لوٹ گیا۔ امیر المؤمنین ملا محمد عزیز حفظہ اللہ تعالیٰ والایہ اللہ بنصرہ العزیز سے ہماری ملاقات ہوئی تو اس میں مولوی نور محمد بھی شریک تھے اور انہوں نے امیر المؤمنین کو اس موقع پر عرب علماء سے گفتگو کی کچھ تفصیل سنائی۔ جس پر امیر المؤمنین نے کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ ان بتوں کی پوجا نہیں ہوتی تھی اور یہ محض نمائش اور یاد گار کیلئے تھے، اس لیے کہ پوجا اور عبادت صرف سامنے آکر سر جھکانے کا نام نہیں بلکہ ہزاروں میں دور اُن کیلئے تظمیم اور محبت کے وہ جذبات بھی عبادت کے زمرہ میں آتے ہیں جو غالباً کائنات کی ذاتِ گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اختیار ملنے کے بعد ان بتوں کو سماڑ کرنے میں ہم نے جو تاخیر کی ہے وہ ہماری غلطی ہے اور اسی وجہ سے دوسرے بارش نہیں ہو رہی تھی، اور اب جبکہ ہم نے بتوں کو توڑنے کا عمل شروع کیا ہے تو پورے افغانستان میں بارانِ رحمت کا نزول ہو گیا ہے۔

ہم نے قدر چار میں تین روزہ قیام کے دوران بطور خاص یہ بات محسوس کی کہ افغانستان کے خلاف اقوام متحده کی سلامتی کو نسل کی پابندیوں سے افغان حکومت اور عوام کی مشکلات میں اضافہ ضرور ہوا ہے مگر ان کے چہروں پر اس سلسلہ میں پریشانی اور اضطراب کے اثرات نہیں ہیں بلکہ وہ پورے حوصلہ اور اعتدال کے ساتھ ان پابندیوں کو برداشت کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کے عمل کو بہر حال مکمل کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ آزمائش اور ابتلاء کے اس نازک مرحلہ میں امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کیلئے استقامت و کامیابی کی دعاؤں کا اہتمام کریں اور اس کے ساتھ اپنے مظلوم افغان بھائیوں کی امداد اور معاونت کیلئے بھی ہر ممکن عملی صورت اختیار کریں۔

#### ۲۰۱۸ء کے دوران الشريعہ اکادمی گوجرانوالہ میں تعارفِ مذاہب کے حوالے سے منعقدہ ایک نشست سے گفتگو کا متعلقہ حصہ

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ذکر اذکار اور اخلاقیات کے لحاظ سے بدھ مت کوئی آسمانی مذہب لگاتا ہے۔ ذرائعِ ابلاغ آج کل تو اور ہیں، اس زمانے میں بلند مقامات اور چیانوں وغیرہ پر اپنے قوانین کندہ کروادیتا تھا۔ مانسہرہ میں آثار میں نے دیکھے ہیں، افغانستان میں بامیان کا بت بدھا کے بڑے بتوں میں سے تھا جو طالبان نے توڑا تھا۔ ایک بہت بڑی پہلوڑی کو تراش کر مہما تابدھ کا بت بنا لیا گیا تھا۔ جب طالبان نے اپنے دور حکومت میں اسے توڑا تو عالمی سطح پر اقوام متحده میں، دنیا میں اور جاپان میں کہرام مجھ گیا تھا کیونکہ جاپان تو بدھوں کا ملک ہے اور انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب طالبان نے بامیان کا بت توڑنے کا فیصلہ کیا تو جاپان نے پیشش کی تھی کہ اس کے عوض جو تم چاہو ہم دینے کو تیار ہیں یہ بت ہمارے حوالے کر دو۔ بہر حال یہ سارا اعلاق بکال کے ساتھ بہار تک ان کی حکومت میں شامل تھا۔ یہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔

## مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق کا قومی مسائل پر اظہارِ یکجہتی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ---، اپریل ۲۰۰۱ء

مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق نے قومی مسائل پر تیکھی کا اظہار کر کے ملک بھر کے دینی کارکنوں کیلئے مزید اطمینان کا سامان فراہم کر دیا ہے اور اس سے ۹، ۱۰، ۱۱ اپریل کو پشاور میں منعقد ہونے والی "خدماتِ دارالعلوم دیوبند کائفنس" کیلئے دیوبندی جماعتوں اور کارکنوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا ہے۔

کچھ عرصہ قبل جمیعت علماء پاکستان کے نورانی اور نیازی گروپوں میں اتحاد کا اعلان ہوا اور مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا عبد اللہ خان نیازی متعدد جمیعت کے پلیٹ فارم پر پھر سے بیجا ہوئے تو سنجیدہ دینی کارکنوں نے اس پر مسrt کا اظہار کرتے ہوئے یہ امید اپنے دلوں میں پھر سے زندہ کر لی تھی کہ ہو سکتا ہے جمیعت علماء اسلام میں یہ بھی صورتحال پیدا ہو جائے۔ پھر آزاد کشمیر کی سب سے پرانی جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کائفنس کے دو حصے متعدد ہوئے اور سردار محمد عبدالقیوم خان نے سردار سکندر حیات خان کے والد مر جووم کی بر سی پر اچانک ان کے ہاں پہنچ کر جس تذیر اور اشارہ کا مظاہرہ کیا اس سے مسلم کائفنس کے دونوں حصوں کے اکٹھا ہونے کی راہ ہموار ہو گئی چنانچہ سردار محمد عبدالقیوم خان کی قیادت میں پھر سے یہ جماعت متعدد ہو چکی ہے۔ آل جموں و کشمیر مسلم کائفنس اگرچہ خط کشمیر میں مسلم لیگ ہی کا دوسرا نام ہے لیکن آزادی کشمیر اور ریاست میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے حوالے سے اس کا کردار پاکستان کی مسلم لیگ سے قدرے مختلف دکھائی دیتا ہے اور اس میں اسلام کے عملی نفاذ سے دلچسپی رکھنے والے کارکنوں کا تناسب زیادہ ہے۔ اس لیے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کی حیثیت سے مجھے مسلم کائفنس کے دولت ہونے پر دکھ ہوا تھا اور اب متعدد ہونے پر اسی طرح خوشی بھی ہوئی ہے۔

اس فضامیں دیوبندی مکتب فکر کے کارکنوں کیلئے یہ بات پر یہاں کا باعث بن رہی تھی کہ گذشتہ دونوں مولانا سمیع الحق نے افغانستان پر اقوام متعدد کی پابندیوں کے خلاف اکوڑہ ملتک میں دینی جماعتوں کی کائفنس طلب کی تو اس میں مولانا فضل الرحمن نے خود شریک ہونے کی بجائے نمائندہ بھیجنے پر اتفاق کی تھا اور ان کے قریبی حلقوں نے اس کی توجیہ یہ کی تھی کہ اس مشترکہ اجتماع کیلئے مولانا فضل الرحمن کو براہ راست اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ چنانچہ "خدماتِ دیوبند کائفنس" کیلئے جب مولانا فضل الرحمن نے عمومی رابطہ نہم کا آغاز کیا تو یہ تاثرعام ہونے لگا تھا اور اس کی ملکی چھلکیاں اخبارات میں بھی دکھائی دینے لگی تھیں کہ شاید اب کی بار مولانا سمیع الحق کی اس کائفنس میں براہ راست شرکت یقینی نہ رہے گر مولانا فضل الرحمن مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حضرت مولانا امان اللہ خان اور مولانا گل نصیب خان کے ہمراہ خود مولانا سمیع الحق کے گھر جا کر انہیں کائفنس میں شرکت کی دعوت دی اور اس طرح تمام منقی تاثرات اور خدشات کا خاتمه کر دیا۔ اس سے صورتحال میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ جمیعت علماء اسلام (ف) اور جمیعت علماء اسلام (س) کے کارکن یکساں

جو شد خروش کے ساتھ پشاور کا فرنس میں شرکت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مولانا نفضل الرحمن گذشتہ روز گوجرانوالہ تشریف لائے اور والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدر، حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، حضرت مولانا حمید اللہ خان اور راقم الحروف کو کا فرنس میں شرکت کی دعوت دینے کے علاوہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں اساتذہ و طلبہ کے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔ اس موقع پر میں نے کا فرنس کے ساتھ میں ان کی مسلسل محنت کا ذکر کرتے ہوئے کہ جس طرح ”پکے پیریں“ (دل جمعی اور سنجیدگی کے ساتھ) کا فرنس کیلئے تنگ و دوکر رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اور ان کے رفقاء اس کا فرنس کو دیوبندی مکتب فکر کی تمام جماعتوں اور مرکز کا نمائندہ اور بھرپور اجتماع بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے انہیں مولانا سمیح الحق کے گھر جا کر خود دعوت دینے پر بھی داد دی اور اس پر اطمینان کا ظہار کیا۔

میں توجہ یوپی اور مسلم کا فرنس کے حوالے سے اس سے اگلی بات بھی عرض کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس وقت بڑے خوشگوار موٹیں تھے اس لیے میں نے منہ بند رکھنا مناسب سمجھا۔ یہ بات میں کچھ عرصہ پہلے تک مختلف مجالس اور مصائب میں عرض کرتا رہا ہوں مگر اس سے میرے یہ دونوں بھائی ناراض ہو جاتے ہیں جبکہ میں ان میں سے کسی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا اس لیے اب یہ بات لکھنا اور کہنا چوڑ دی ہے۔ بہر حال اب تک کی صورتحال میں دو پہلو نمایاں ہیں اور دونوں خوشگوار اور حوصلہ افزائیں۔

- ایک یہ کہ مولانا سمیح الحق نے ”خدماتِ دارالعلوم دیوبند کا فرنس“ میں شرکت کی دعوت قبول کر لی ہے جس سے کارکنوں کی پنجی سطح پر دھیرے دھیرے رینگنے والی غلط فہمیوں کا خاتمه ہو گیا ہے۔
- دوسرا یہ کہ مولانا نفضل الرحمن نے ”دفاع افغانستان کونسل“ کے فورم پر افغان کا زکیلے مشترکہ جدوجہد کے عزم کا اظہار کیا ہے اور پھر دونوں نے یک زبان ہو کر اعلان کیا ہے کہ ان کے درمیان بین الاقوامی مسائل اور نفاذ اسلام کی جدوجہد کے حوالے سے کوئی اختلاف نہیں اور وہ ان مسائل کیلئے مشترکہ جدوجہد کریں گے۔ اس وقت امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو ناکام بنانے، پاکستان میں این جی اوزار ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے قومی معاملات پر بین الاقوامی کنٹرول مسلط کرنے اور دینی قوتوں کو بدنام اور بے اثر کرنے کیلئے عالمی سطح پر جس منصوبے اور ایجادے پر تیزی کے ساتھ کام ہو رہا ہے اس کی روک تھام کیلئے ملک کے تمام دینی علقوں بالخصوص دیوبندی مکتب فکر کی جماعتوں اور اس سے بھی زیادہ جمیعت علماء اسلام کے دونوں حصوں کے رہنماؤں اور کارکنوں میں زیادہ سے زیادہ تکمیل، ہم آہنگی اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہم ”خدماتِ دیوبند کا فرنس“ کو اس ہم آہنگی اور اشتراک عمل کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تو عالمی استعمار کے اس ایجادے کو بے اثر کرنے میں بھی ان شاء اللہ العزیز کامیاب رہیں گے۔

## امام ولی اللہ دہلوی کے خواب کی عملی تعبیر!

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۱۱ اپریل ۲۰۰۱ء

خواب کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزو قرار دیا ہے۔ اور بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرم نے ارشاد فرمایا ہے کہ نبوت کے اجزاء یعنی وحی کی اقسام میں سے صرف ایک قسم باقی رہ گئی ہے جو اچھے خواب کی صورت میں ہے، اور جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ بسا واقعات اپنے نیک بندوں کو آنے والے حالات و واقعات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ مگر شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جدت اور دلیل صرف پیغمبر کا خواب ہے، یا وہ خواب جو کسی مومن نے دیکھا اور رسول اللہ نے سن کر اس کی توثیق فرمادی۔ جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کیا تو بیداری میں اس خواب کو وحی الہی سمجھتے ہوئے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ یا جیسے دنیا بھر میں اسلام کا سب سے زیادہ اور ہر وقت گونجنے والا شعار اذان ہے جس کی بنیاد خواب پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن زیاد نے خواب میں ایک شخص کو اذان کے کلمات بلند آواز سے پکارتے سناؤ انہوں نے جناب نبی اکرم کو اپنے اس خواب سے آگاہ کیا جس پر رسول اللہ نے ہر نماز سے پہلے ان الفاظ کو اعلان کے طور پر بلند آواز سے پکارنے کا حکم دیا جو اذان کہلاتی ہے۔

جناب نبی اکرم صاحبِ کرام کو اپنے خواب بتایا کرتے تھے اور ان کے خواب سن کر تعبیر سے آگاہ کیا کرتے تھے۔ امام بخاری نے بخاری شریف میں ”تاتب التعبیر“ کے نام سے مستقل باب قائم کیا ہے جس میں ساٹھ سے زیادہ روایات اس خواب سے نقل کی ہیں۔ لیکن پیغمبر کے خواب یا پیغمبر کے سامنے پیش کیے جانے والے خواب کے سوا اور کوئی خواب اس معنی میں شرعی جدت اور دلیل نہیں ہے کہ اس پر کسی فیصلے حکم کی بنیاد رکھی جائے خواہ وہ کسی بھی شخصیت کا خواب ہو۔ البته خوب خبری اور کسی معاملہ کی پیشگی اطلاع کے طور پر خواب کی اہمیت و افادت آج بھی موجود ہے۔ اس پس منظر میں حضرت امام ولی اللہ دہلوی کے ایک خواب کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے اپنی معروف کتاب ”فیوض الحرمین“ میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے یہ خواب ۲۱ ذی قعده ۱۳۴۳ھ کو حرم پاک میں جمعِ کی شب کو دیکھا جس کے اہم امور یہ ہیں۔

شاہ صاحب نے خواب میں دیکھا کہ مسلمانوں پر کافروں کا غلبہ ہو گیا ہے، کافروں نے اہل اسلام سے ان کے ممالک اور اموال چھین لیے ہیں، ان کی اولادوں کو غلام بنالیا ہے، اور مسلمانوں کے شہروں میں اسلام کے شعائر مغلوب اور کفار کے شعائر غالب ہو گئے ہیں۔ اس صورت حال پر اہل زمین اللہ تعالیٰ کے شدید غضب کا سامنا کر رہے ہیں اور شاہ صاحب خواب کے دوران ملا اعلیٰ میں غضب الہی کے مظاہر دیکھتے ہیں۔ شاہ صاحب خود بھی غیظ و غضب سے بھر گئے ہیں اور ان کے گرد ایسے لوگوں کا جم غیر جمع ہو گیا ہے جو غضب سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں مختلف ممالک کے لوگ ہیں، سوار بھی ہیں اور پیدل بھی ہیں۔

شاہ صاحب اس خواب میں خود کو ”قائمِ ازمان“ کی صورت میں دیکھتے ہیں جس سے مراد وہ ہستی ہے جسے اللہ تعالیٰ

کسی نظامِ خیر کے نافذ کرنے کیلئے سب کے طور پر ذریعہ بنالیتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق دنیا میں نظامِ خیر کے قیام کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔ خواب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے گرد غیظ و غضب سے بھرے ہوئے دنیا بھر کے مسلمان جم غفاری کی صورت میں گھیر اداں کران سے سوال کرتے ہیں کہ آج کے دور میں اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے؟ حضرت شاہ صاحبؒ ان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ فک کل نظام کہ تمام نظاموں کو توڑ پھوڑ دینا ہی اس وقت اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کا حکم ہے تاکہ دنیا کے تمام مروجہ نظاموں کا خاتمه ہو اور قرآن و سنت کا نظام ان نظاموں کی جگہ لے سکے۔

تحریک ولی اللہی سے تعلق رکھنے والے مختلف ارباب علم و دانش نے مختلف اوقات میں اس خواب کی مختلف تعبیریں، بیان کی ہیں جو اس وقت تک کے حالات کی روشنی میں ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس خواب کی وہ عملی تعبیر اب ظاہر ہوئی ہے جو امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کی صورت میں ہے۔ ہماری اس گزارش کو سمجھنے کیلئے حضرت شاہ صاحبؒ کے دور سے لے کر اب تک پیش آنے والے حالات پر ایک نظر ڈالیجیے۔ دنیا کے مختلف بلکہ بیشتر مسلم ممالک پر کفر کی طاقتون کا غلبہ قائم ہوا اور کم و بیش دو صدیوں تک قائم رہا۔ اسلامی احکام و قوانین منسوب تحریک کے کفر و ظلم کے نظام مسلط کر دیے گئے، مسلمانوں کے اموال اور وسائل کا استھصال کیا گیا جواب تک جاری ہے، دنیا بھر کے مسلمانوں کی عملی حالت غلاموں جیسی ہے، اور عالمی استعمار کے احکام اور فیصلوں کے سامنے وہ مکمل طور پر بے لبس ہیں۔

کفر و استھصال کے اس غلبہ کے خلاف مختلف مسلم ممالک میں آزادی اور جہاد کی تحریکیں منظم ہوئیں جو عالمی کفر اور استعمار کے خلاف غیظ و غضب سے بھری ہوئی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جماعت اور تحریک کو عالمی کفر کے خلاف بغاوت کیلئے اللہ تعالیٰ نے بطور سبب اور آلہ کے اختیار فرمایا، چنانچہ اسی جماعت نے جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کو شکست دی، وسطی ایشیا اور افغانستان سے روئی استعمار کو پسپا کیا، اور آج امریکی استعمار کے خلاف سب سے مضبوط اور بے چک تحریک کا پرچم بھی اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں رفتہ رفتہ تحریک ولی اللہی کے اس ماثوٰ کی طرف آ رہی ہیں کہ فک کل نظام یعنی دنیا کے تمام مروجہ نظاموں کا مکمل خاتمه کیے بغیر اسلام نافذ نہیں ہو سکتا اور دنیا کے کسی مروجہ نظام کے ساتھ اسلام کی ایڈجسٹمنٹ ممکن نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکری تحریک کا سب سے بڑا علمبردار دارالعلوم دیوبند ہے جس نے ایک سو چالیس سال کی جدوجہد کے ذریعہ اسلامی تعلیمات و احکام اور تہذیب و ثقافت کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ جنوبی ایشیا کے لاکھوں مسلمانوں کو مختلف شعبوں میں اس کی حفاظت و ترویج اور نفاذ و غلبہ کیلئے تیار کیا ہے۔ اور اسی علمی و فکری تحریک کی ایک شاخ ”طالبان“ نے امارتِ اسلامی افغانستان میں فک کل نظام کا عملی مظاہر کر دکھایا ہے کہ اپنے ملک میں کفر کے ہر نظام کے اثرات کو مٹا دالا ہے اور ہر قسم کے مروجہ سسٹم کو جڑ سے الکھاڑ پھینکا ہے جس سے قرآن و سنت کے شرعی نظام کے عملی اور حقیقی نفاذ کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔

طالبان کے طرز حکومت میں ہمارے بہت سے دوستوں کو شدت دکھائی دے رہی ہے اور وہ ان کے بعض اقدامات کو انتہا پسندانہ قرار دے رہے ہیں لیکن اگر وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ماثوٰ فک کل نظام کی روشنی میں دیکھیں تو اس بات کا انہیں بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا کے مروجہ نظاموں کے مکمل خاتمه کے بغیر قرآن و سنت کے

احکام و قوانین کا عملی نفاذ اور خلافتِ اسلامیہ کا احیاء ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا کے موجودہ نظاموں کا خاتمه طالبان حکومت کے طرزِ عمل کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور جو تحریکات اور فکری حلقوں موجودہ عالمی سسٹم اور موجودہ نظاموں کے اس پرچر کے اندر رہتے ہوئے ایڈ جسٹسٹ اور مقاہمت کے ذریعے نفاذِ اسلام کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ غلط فہمی اور مغالطے کا شکار ہیں۔ ہمارے نزدیک امام ولی اللہ دہلویؒ کے اس تاریخی خواب کی عملی تعبیر اپنے آخری مرحلہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ دنیا میں اسلام کا دوبارہ نفاذ و غلبہ کی جدوجہد فک کل نظام کے الہامی ماٹو اور پرچم کے ساتھ کامیابی کی منزل تک پہنچے گی۔

## جہاد کشمیر اور جہاد افغانستان کا موازنہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۳ اپریل ۲۰۰۱ء

پاکستان کے بعض علمی حلقوں اور شخصیات کو اشکال ہے کہ کشمیر کا جہاد افغانستان کی طرح کا نہیں ہے اس لیے کہ افغانستان میں جہاد کا فتویٰ علماء نے دیا تھا اور جہادی گروپ اس کی بنیاد پر روتنی استعمار کے خلاف جہاد کر رہے تھے، بلکہ ان کے خیال میں کشمیری مجاہدین کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ اپنے عمل اور فیصلوں میں آزاد نہیں ہیں بلکہ ایجنسیوں کا کٹھول ان پر حاوی ہے اور کثری و رarقتو نے خود جہاد کا کوئی اعلان نہیں کیا، اس لیے ان حضرات کے نزدیک جہاد کشمیر کو افغانستان کی طرح کے شرعی جہاد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن میرے نزدیک اس کی حیثیت ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے اس لیے کہ یہ مفروضہ صرف اس صورت میں قبول کیا جاسکتا ہے جب جہاد کشمیر کا نقطہ آغاز موجودہ جہادی گروپوں کی حالیہ جدوجہد کو قرار دیا جائے جبکہ فی الواقع صورت حال یہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل تاریخی تناظریہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد کشمیری علماء نے جن میں امیر شریعت مولانا عبد اللہ کفل گڑھی، مولانا غلام حیدر جنڈالوی، مولانا محمد یوسف خان آف پلندری، مولانا عبد الحمید قاسمی، مولانا محمد عبد اللہ سیاکھوی، مولانا مظفر حسین ندوی اور دیگر سرکردہ علماء شامل تھے، ڈوگرہ حکمرانوں کے تسلط کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا اور اس کی بنیاد پر خود میدان جہاد میں نکل کر آزادی کشمیر کیلئے جہاد کا آغاز کیا تھا جس کے نتیجے میں آزاد کشمیر کی موجودہ ریاست قائم ہوتی۔ اس کے بعد نہ ان علماء نے اپنایہ فتویٰ واپس لیا اور نہ ہی کشمیری عوام آزادی کے مطالبہ اور جدوجہد سے دستبردار ہوئے۔

اس لیے جہاد کشمیر کا موجودہ راؤنڈ اسی تسلسل کا حصہ ہے اور اس کی شرعی اسas بھی نہ کوہہ بالا علماء کرام کے اسی فتویٰ پر ہے جس کے ذریعے انہوں نے ڈوگرہ استعمار سے جنگ لڑ کر آزاد کشمیر کا خطہ آزاد کرایا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی جہاد کشمیر میں زیادہ تر حصہ دینی جماعتیں، دینی مدارس کے طالبہ اور علماء کرام کا ہے جو اصل فرقی ہیں جبکہ حکومت پاکستان اور ایجنسیوں کی حیثیت آج بھی اسی طرح کے معادن کی ہے جس طرح کی معاونت ان کی طرف سے جہاد افغانستان کو حاصل رہتی ہے۔ البتہ سرحدی حالات اور علاقائی مجبوریوں کا دائرہ اس سے قطعی مختلف ہے اور وہی فرق بعض ذہنوں کو بلاوجہ

اُبھن میں ڈالے ہوئے ہے۔ میر اخیال کے بارے میں تحقیقات کا اظہار کرنے والے حضرات اس مسئلہ کو قومی حالات کی بجائے تاریخی تناظر کے وسیع دائرہ میں دیکھیں تو ان کا اشکال خود بخور فتح ہو جائے گا اور وہ بھی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ کشمیری عوام کی یہ جدوجہد شرعی جہاد کا درجہ رکھتی ہے جس کی حمایت و امداد ہماری دینی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

## افغانستان کی موجودہ صورتحال کا پس منظر اور جناب حکمت یار کا انتخابی فارمولہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ اپریل ۲۰۰۱ء

حزبِ اسلامی افغانستان کے سربراہ انجینئر گلبیدین حکمت یار نے گذشتہ روز تہران میں پاکستانی رہنماؤں محترم قاضی حسین احمد، جناب وسیم احمد سجاد اور جناب الی بخش سومرو سے لفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان کوکومت کے سربراہ امیر المؤمنین ملا محمد عمر اگر ایکشن میں منتخب ہو جائیں تو وہ انہیں امیر المؤمنین تسلیم کر لیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ملا محمد عمر کو ایک خط میں فارمولہ پیش کیا ہے کہ وہ اپنی سربراہی میں عبوری حکومت قائم کریں گے۔ جس میں تمام گروپوں کو نمائندگی دی جائے اور تمام اضلاع کے نمائندوں پر مشاورتی کونسل قائم کی جائے جو ایکشن کرائے۔ روزنامہ اوصاف کی روپورٹ کے مطابق جناب حکمت یار نے یہ بھی بتایا کہ ان کے خیال میں طالبان حکومت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی کیونکہ روس نے یورپی یونین کی مدد سے بیس ہزار افراد پر مشتمل فوج تیار کر لی ہے جو طالبان پر حملہ کرنے والی ہے، اس دوران طالبان کے زیر قبضہ علاقوں میں اندر وہی شورشیں بھی ہوں گی جن کی وجہ سے طالبان حکومت کا باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔

انجینئر گلبیدین حکمت یار افغانستان کے ان رہنماؤں میں شامل ہیں جنہوں نے افغانستان پر روسی استعمار کے تسلط کے خلاف جرأت مندانہ جنگ لڑی اور میدان جنگ میں روسی افواج کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے سفارتی مخاذ پر بھی رو سی جاریت کو بے نقاب کرنے کیلئے تحرک کردار ادا کیا۔ وہ حزبِ اسلامی افغانستان کے ایک مؤثر دھرمی کے سربراہ تھے یہی وجہ ہے کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد جب افغان مجاهدین کے مختلف گروپوں پر مشتمل مشترکہ حکومت تشكیل دی گئی تو انہیں اس کا وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ اس مشترکہ حکومت میں پروفیسر بہان الدین کو صدر، جناب حکمت یار کو وزیر اعظم اور کمانڈر احمد شاہ مسعود کو وزیر دفاع مقرر کیا گیا تھا لیکن یہ ٹیم مل جل کر ملک کے نظام کو نہ سنپھال سکی اور گلبیدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کی شخصی مخاصمت اور ایک دوسرے کے کو برداشت نہ کرنے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ مجاهدین کی حکومت مسلسل عدم استحکام کا شکار رہی بلکہ کابل جو گذشتہ جنگ کے دوران محفوظ رہ گیا تھا ان دونوں رہنماؤں کی اقتدار کی جنگ میں اس کی ایئٹ سے ایٹنٹ نہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ربانی، حکمت یار اور مسعود

پرمشتمل ٹیم میں اندر اسٹینڈنگ ہوتی اور یہ تینوں رہنمابا ہمی اعتماد اور تعاون کے ساتھ ملک کا نظام سنبھالتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ:

- افغانستان کو ایک مسحک حکومت نصیب ہوتی،

- مجاہدین کے باقی تمام گروپوں کیلئے ان کے ساتھ چلنے اور ان سے تعاون کرنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہتا،

- روں اور مجاہدین کی جنگ میں محفوظ رہنے والے کابل کی تباہی نہ ہوتی،

- اور طالبان ملیشیا کا سرے سے کوئی وجود نہ ہوتا۔

لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ گلبدين حکمت یار اور احمد شاه مسعود کی باہمی آوریزش اور ایک دوسرے کو اقتدار میں غیر موثر بنا نے کی شکنش نے افغانستان کو رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد خوفناک خانہ جنگی سے دوچار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ملک بھر میں انارکی پھیلی اور اس کے بعد عمل میں طالبان ملیشیا نے جنم لیا جس نے تمام گروپوں کو ایک طرف کرتے ہوئے افغانستان میں خانہ جنگی ختم کر کے امن قائم کیا اور کابل، جلال آباد، مزار شریف، قندھار اور دیگر شہروں میں ایک دوسرے سے گھنگھا چہادی لیدروں کو میدان سے باہر کر دیا۔

آج امریکہ، بھارت، اسرائیل، روں اور یورپی یونین کو طالبان حکومت سے جہاں یہ تکلیف ہے کہ طالبان اسلام کے بارے میں بے چک رو یہ رکھتے ہیں اور انہوں نے کتابوں میں جس اسلام کو پڑھ رکھا ہے اسے کسی رو بدل کے بغیر ناذکرنے میں لگے ہوئے ہیں وہاں اس کے ساتھ یہ بات بھی مغربی ممالک کیلئے تکلیف ہے کہ طالبان کے آنے سے افغانستان کے بیشتر علاقوں میں ایک گروپ کی حکومت قائم ہو گئی ہے جو اگر افغانستان کے باقی حصے پر بھی کشوروں حاصل کر لیتی ہے تو یہ پورے افغانستان پر وین پارٹی گورنمنٹ ہو گئی جس کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے مغرب اور اقوام متحده کو بہر حال اس کی ترجیحات اور موقف کا احترام کرنا ہو گا۔ اور حکومت میں مختلف گروپوں کی شمولیت کی صورت میں ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے اور بارگینگ میں اپنے مفادات کیلئے راستے نکالنے کی سہولت مغربی ملکوں کو حاصل نہیں رہے گی۔ اسی وجہ سے اقوام متحده، امریکہ، روں اور دیگر عالمی طبقیں مسلسل اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ وسیع الیناد حکومت یا عوامی انتخابات کے عنوان سے مختلف گروپوں کو کسی نہ کسی طرح افغانستان کی حکومت میں شامل کر دیا جائے تاکہ انہیں اپنے مفادات کا کھیل کھیلنے کیلئے اپنی مرضی کا وسیع میدان مل سکے۔ لیکن طالبان حکومت اس چال کو پوری طرح سمجھ رہی ہے اور مغربی ملکوں کو کوئی راستہ دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔

جہاں تک ایک اسلامی حکومت اور امارت شرعیہ کیلئے عوامی اتحاد کے حامل ہونے کی بات ہے، ہم اسے ضرری سمجھتے ہیں اور ہمارا موقف بھی یہ ہے کہ اسلامی حکومت اور خلافت عوام کے اعتماد کے ساتھ ہی قائم ہو سکتی ہے جس کی واحد صورت اس دور میں ایکیش ہے۔ لیکن ایکیش کیلئے فضاساز گار ہونا اور کسی مناسب فریم ورک کا ہونا بھی ضروری ہے جس کیلئے افغانستان کے موجودہ حالات بالکل سازگار نہیں ہیں:

- افغان عوام مختلف ملکوں میں بھرے پڑے ہیں،

- افغانستان کو عالمی اقتصادی پابندیوں کا سامنا ہے،
  - انہیں امریکہ، روس، بھارت اور یورپی یونین کی پشت پناہی سے جاری شال کی جنگ کا سامنا ہے،
  - اور انہیں مختلف لاہیوں اور قوتوں کی مسلسل ریشہ دوایوں اور مداخلت کی صورتیں درپیش ہے۔
- ان حالات میں یہ کہنا کہ وہ پہلے ایکشن کرائیں اور اس کے بعد جناب حکمت یار ان کی حکومت کو تسلیم کریں گے دراصل طالبان حکومت کو یورپی یونین، امریکہ اور روس کے ایجنسیوں کے سامنے سپر انداز ہونے کا مشورہ دینا ہے۔
- پھر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ افغانستان سے رو سی فوجوں کے چلے جانے اور افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کی مشترکہ حکومت قائم ہو جانے کے بعد کابل اور افغانستان کو جس خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑا اور جو خوفناک تباہی پھیلی اس کے اصل فریق جناب حکمت یار اور احمد شاہ مسعود تھے اور ان کی باہمی اقتدار اور بالادستی کی جنگ میں جو خونزیزی اور قتل و غارت ہوئی اس کی ذمہ داری میں یہ دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ حکومت یار اور احمد شاہ مسعود کی خانہ جنگی کے رد عمل میں ابھرنے والی طالبان ملیشیا ان میں سے ایک کے خلاف تو بر سر پیکار رہے ہے اور دوسرے کے سر پر فکری قیادت اور ہنماں کا تاج سجادے۔
- چنانچہ ہم ہڑے ادب کے ساتھ جناب حکمت یار سے عرض کرنا چاہیں گے کہ ان کی اس حالیہ گنتگونے بات واضح کر دی ہے کہ مقاصد اور نتائج کے حوالے سے ان کی اور احمد شاہ مسعود کی جدوجہد میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ جو مقاصد احمد شاہ مسعود عسکری قوت کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں بالکل وہی مقاصد اور نتائج جناب حکومت یار سفارتی جنگ کے ذریعے حاصل کرنے کے دریے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک طالبان حکومت کے ساتھ ہمدردی یہ نہیں ہے کہ انہیں افراتفری کی اس فضائی ایکشن کی راہ پر ڈال کر افغان عوام کو ایک نئے فکری انتشار سے دوچار کر دیا جائے اور افغان معاشرے میں مغربی حکومتوں اور لاہیوں کی مداخلت کی راہیں تلاش کی جائیں۔ بلکہ افغان عوام اور ان کی اسلامی حکومت کے ساتھ ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ:
- طالبان حکومت کو تسلیم کیا جائے، اسے مٹکم کرنے میں تعاون کیا جائے اور اس کے خلاف مغرب کے ایجنسیوں اور عزادارِ کوواخ طور پر مسترد کرنے کا اعلان کیا جائے۔
  - ایسے حالات پیدا کرنے میں ان کا ساتھ دیا جائے کہ وہ پورے افغانستان کا کنشروں حاصل کرنے کے بعد افغان مہاجرین کی واپسی کا اہتمام کریں، ایک اسلامی حکومت کا دستور تشکیل دیں، حکومتی ڈھانچے اور نظام کے خدو خال طے کریں، اور اس کی روشنی میں عام انتخابات کرا کے عوامی اعتماد کی حامل حکومت کے قیام کی راہ ہموار کریں۔

باقی رہی بات روس اور یوپی یونین کی مدد سے یہی ہزار فوج کی تیاری اور طالبان حکومت کے خلاف اس کے حملہ آور ہونے کے پروگرام کی تو ہمارے نزدیک یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو افغان عوام کا مزید کوئی امتحان مقصود نہیں ہے اور وہ طالبان حکومت سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو طالبان اس مرحلہ سے بھی سرخوئی کے

ساتھ گزرا جائیں گے اور امریکہ، روس اور یورپی یونین کا یہ گلہ جوڑان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ لیکن اگر خدا نخواستہ ان کیلئے کریلا اور بالا کوٹ جیسے مراحل تقدیر نے طے کر رکھے ہیں تو نظریاتی تحریکوں کو ان مراحل سے بھی بسا اوقات گزرنا پڑ جاتا ہے اور ہم جناب حکمت یار اور ان کی طرح روس، امریکہ اور یورپی یونین سے امیدیں والستہ کر لینے والے حضرات سے ہٹے ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہیں گے کہ بالا کوٹ میں سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء کے ذمہ ہو جانے سے بر صیغہ پر فرنگی حکمرانوں کے تسلط کو جو از فراہم نہیں ہو گیا تھا اور نہ ہی ان شہداء کی جدوجہد کو منزل تک پہنچنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک سکی تھی۔

## جہاد کے بارے میں چند اشکالات کا ازالہ

مہمانہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- منی ۲۰۰۱ء

محترم جاوید احمد غامدی کے بعض ارشادات کے حوالے سے جو گفتگو کچھ عرصے سے چل رہی ہے اس کے ضمن میں ان کے دو شاگردوں جناب معزاجمجد اور ڈاکٹر محمد فاروق خان نے ماہنامہ اشراق لاہور کے می ۲۰۰۱ء کے شمارے میں کچھ مزید خیالات کا انتہا رکیا ہے جن کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جناب غامدی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ جہاد کے اعلان کا حق اسلامی ریاست کے سوا کسی کو نہیں ہے جس کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ اگر کسی مسلم علاقہ پر کافروں کا تسلط قائم ہو جائے اور اسلامی ریاست کا وجود ہی ختم ہو جائے تو علماء کرام اور دینی قیادت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کافرانہ تسلط کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مزاحمت کریں اور اسلامی اقتدار بحال کرنے کی کوشش کریں۔ جیسا کہ یمن پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی اسود عنی نے قبضہ کر لیا تھا اور حضرت فیروز دہلی ہر ان کے رفقاء نے گوریلا طرز پر شب خون مار کر اسود عنی کو قتل کر دیا تھا جس سے اس کی حکومت کا خاتمه ہوا اور مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گیا۔ اس لیے اب بھی ایسی صورت میں کافروں کے تسلط کا شکار ہونے والے مسلمانوں کیلئے شرعی مسئلہ یہی ہے کہ وہ اس تسلط کو قبول نہ کریں، اس کے خاتمہ کیلئے جوان کے بس میں ہو کر گزریں اور اس سلسلے میں ان کی جدوجہد کو شرعی جہاد کا درجہ حاصل ہو گا۔

معزاجمجد صاحب نے ہمارے استدلال کو درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ”یہ واقعہ اس طرح رونما ہوا ہی نہیں جیسا کہ مولانا نے بیان فرمایا ہے۔“ لیکن خود انہوں نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں اس بات کو من و عن تسلیم کیا گیا ہے کہ اسود عنی کو حضرت فیروز دہلی اور ان کے رفقاء نے قتل کیا تھا جس سے اس کی حکومت ختم ہو کر مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گئی تھا البتہ اتنے واقعہ کو بعدہ تسلیم کرتے ہوئے معزاجمجد صاحب نے اس میں دو اضافے فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت فیروز دہلی اور ان کے رفقاء کو اس کارروائی کا حکم خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد اس مسئلہ پر یمن کے مسلمانوں کا اجتماع ہوا

جس میں اسود عنی کے خلاف کارروائی کیلئے اجتماعی مشاورت ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تفصیل سے ہمارے بیان کردہ واقعہ کی تزدید کس طرح ہو گئی ہے موصوف اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ واقعہ اس طرح رونما ہوا ہی نہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ واقعہ تو وہ بھی وہی بیان کر رہے ہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ باقی روایتی یہ بات کہ یہ کارروائی حضرت فیروز دلیلیؒ اور ان کے رفقاء نے از خود نہیں کی تھی بلکہ جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت اور دوسرے مسلمانوں کے مشورہ سے کی تھی تو اس سے ہمارے موقف کی مزید تائید ہوتی ہے۔ مگر اس کی وضاحت سے قبل اس امر کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیروز دلیلیؒ کیلئے جناب نبی اکرمؐ کی اس ہدایت کا ہمیں بھی علم تھا لیکن چونکہ وہ روایت جناب غامدی صاحب کے اصولوں کے مطابق ”خبریت“ کے قابل قبول معیار پر پوری نہیں اترتی تھی اس لیے ہم نے اس کا حوالہ نہیں دیا اور نفس واقعہ کا ذکر کر دیا۔ البتہ مسلمانوں کی مشاورت کا واقعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا جس کا معزا مجد صاحب نے ذکر کیا ہے، معلومات میں اس اضافے پر ہم ان کے شکرگزار ہیں۔

ویسے استبطاط و استدلال، تعمیر و تشریح اور اصول سازی کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے کہ جس بات پر جی چاہا سے قبول کر لیا اور جسے ذہن نے قبول نہ کیا اس سے انکار کر دیا۔ جی نہ چاہا تو جم کے بارے میں بخاری اور مسلم کی روایات قابل قبول قرار نہ پائیں اور کہیں ”بُغَيْرَ“ پھنس گیا تو ”اصابہ“ کی روایت کا سہارا لینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوا۔

### جو چاہے آپ کا حسن کر شمہ ساز کرے

واقعات کی ان تفصیلات کو تسلیم کرتے ہوئے جو جناب معزا مجد صاحب نے بیان کی ہیں ہماری گزارش ہے کہ اس سے ہماریہ موقف مزید پختہ ہو گیا ہے کہ کسی مسلم علاقہ پر کافروں کے تسلط کی صورت میں وہاں کے مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اس تسلط کے خاتمہ کیلئے جدو چہد کریں اور اس سلسلہ میں جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت یہی ہے جو حافظ اہن جھگی اصحاب کے حوالے سے معزا مجد صاحب نے نقل کی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے حضرت فیروز دلیلیؒ اور ان کے رفقاء کو اسود عنی کے خلاف کارروائی کا حکم دیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معزا مجد صاحب کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بحیثیت حاکم دیا تھا اور ہمارے نزدیک اس میں ان کی پیغمبرانہ حیثیت بھی شامل ہے۔ اس لیے اب بھی اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مسلم علاقہ پر کافروں کا تسلط ہو جائے تو وہاں کے مسلمانوں کیلئے جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت اور حکم وہی ہے جو یہن کو اسود عنی کے تسلط سے آزاد کرانے کیلئے حضرت فیروز دلیلیؒ اور ان کے رفقاء کو دیا گیا تھا۔

پھر یہ نکتہ بھی یہاں قابل غور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر صوبہ میں بغاوت کو کچلنے کیلئے صرف ریاتی کارروائی کرنا ہوتی تو اس کیلئے فون کشی مدینہ منورہ سے ہوتی گر نبی اکرمؐ ریاست کی طرف سے یہ فون کشی کرنے کی بجائے یہن کی مقامی آبادی کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ اسود عنی کے تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ ”اصابہ“ کی جس روایت کا معزا مجد صاحب نے حوالہ دیا ہے اس کے مطابق نبی اکرمؐ نے حضرت فیروز دلیلیؒ اور ان کے رفقاء کو اسود عنی کے خلاف ”محاربہ“ کا حکم دیا ہے۔ اب محاربہ کے معنی و مفہوم کے بارے میں اور کسی کو تردد ہو تو ہو مگر غامدی صاحب کے شاگردوں سے یہ توقع نہیں کی ہو سکتی کہ وہ اس کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہوں گے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معزا مجد

صاحب اس واقعہ کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس کے پیچے جناب بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و ہدایت کا تذکرہ بھی کرتے ہیں لیکن ان سب کچھ کے باوجود اس واقعہ کو جہاد کی حیثیت دینے میں تالیم نہیں ہے جیسا کہ ان کا ارشاد گرامی ہے کہ:

”یہ جابر و غاصب قوم کے خلاف گروہ بندی اور جتحا بندی کر کے جہاد کرنے کا واقعہ نہیں بلکہ ایک غاصب حکمران کے قتل کا واقعہ ہے۔ گروہ بندی اور جتحا بندی کر کے جہاد کرنا اور کسی (اپنچھے یا برے) حکمران کے قتل کی سازش کرنا دو بالکل الگ معاملات ہیں۔“

واقعہ کی ان تفصیلات کو ایک بار پھر ترتیب وار دیکھ لیں جو خود معزاً مجذد صاحب نے بیان کی ہیں کہ یہن میں اسود عنی کے تسلط کے بعد جناب بنی اکرم نے یہن کے لوگوں کو اس کے خلاف محاربہ کا حکم دیا۔ اس حکم کے بعد یہن کے مسلمانوں کا مشاورتی اجتنع ہوا جس میں اسود عنی کے خلاف کارروائی کے فریقوں کا جائزہ لیا گیا، اس کے بعد حضرت فیروز دبلیو، حضرت قیس بن کوشٹ اور حضرت دادو یہنے گروپ بنایا اور اسود عنی کے حرم میں زبردست شامل کی جانے والی خاتون آزادوں کے ساتھ ساز بآذ کر کے اسود عنی کو قتل کر دیا۔ اور پھر معزاً مجذد صاحب کے حوصلہ کی داد دیجئے کہ اس سب کچھ کے باوجود ان کے نزدیک اس کارروائی کو شرعی جہاد کی حیثیت حاصل نہیں ہے اور وہا سے ”محض ایک غاصب حکمران کے قتل کی سازش“ ہی تصور کر رہے ہیں۔ اور مزید لطف کی بات یہ ہے کہ واقعہ کی یہ ساری تفصیلات خود بیان کرنے کے بعد معز امجذد صاحب اس سے نتیجہ یہ انداز کر رہے ہیں کہ:

”اس ساری کارروائی کا عملی ظہور اسود عنی کے اپنے گروہ میں پھوٹ پڑنے اور اس کے اپنے ہی عمال کی طرف سے اس کے قتل کو کامیاب بنانے کی صورت میں ہوا۔“  
اس ذہنی گورکھ دھندرے پر اس کے سوا کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے کہ:  
نہاتھ باغ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہم نے عرض کیا تھا کہ دمشق پر تاتار یوں کی یلغار کے موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا جو کسی ریاستی نظام کے تحت نہیں بلکہ آزاد امام حیثیت سے تھا۔ اس لیے ہمارے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ اگر حالات ایسی صورت اختیار کر لیں تو علماء کو حق حاصل ہے بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور امت کی عملی قیادت کریں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب نے اس واقعہ کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ ابن تیمیہ نے یہ فتویٰ دے کر ریاستی نظام کو سہارا دیا تھا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اور نہ ہی اس سے ہمارے موقف میں کوئی فرق ہی پڑتا ہے۔ اصل بات اپنی جگہ قائم ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے یہ فتویٰ کسی ریاستی نظم کے تحت دیا تھا یا آزاد امام حیثیت سے اپنی و علمی ذمہ داری سمجھتے ہوئے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا؟ اس بات کی کوئی واضح تصریح ڈاکٹر صاحب نہیں کر سکے۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان نے الجزاں کی جنگ آزادی کی تاریخ یوں بیان کی ہے کہ ۱۹۵۳ء میں محاڑہ حریت وطنی قائم ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں قاہرہ میں فرحت عباس کی سربراہ میں الجزاں کی جلاوطن حکومت قائم ہوئی اور ۱۹۶۲ء میں الجزاں آزاد ہو گیا۔ یہ

ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا اور اس کی پشت پر علماء کے مسلسل جہاد آزادی، بالاکوٹ اور شامی کے معزروں، قبائلی عوام کی جنگ، حاجی شریعت اللہ<sup>رض</sup>، سردار احمد خان کھڑل، حاجی صاحب ترنگ زنی اور تینویں میر کے معزرا کہہئے حریت اور لاکھوں علماء کرام اور عوام کی جانوں کی قربانیوں کو پوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جیسے ان واقعات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ الجراہر کی جنگ آزادی ۱۹۵۸ء میں شروع ہو کر صرف آٹھ سال میں منزل تک نہیں پہنچ گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے لاکھوں مجاهدین آزادی کا خون ہے اور ان میں وہ غریب مولوی بھی شامل ہیں جن کا نام لیتے ہوئے محترم غامدی صاحب کے شاگردوں کو نہ جانے کیوں جواب محسوس ہوتا ہے۔ اشیخ عبدالحمید بن بادیس<sup>ر</sup> اور اشیخ ابراهیم<sup>ر</sup> تو جہاد آزادی کے صاف اول کے لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے باقاعدہ جہاد اور قائم کر کے جہاد میں حصہ لیا تھا۔ انہی علماء کی وجہ سے لاہور میں الجراہر کے جہاد آزادی کی حمایت میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری<sup>ر</sup> کی قیادت میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کی مہم چلانی گئی تھی۔ الجراہر کی آزادی کے بعد اشیخ ابراهیم<sup>ر</sup> لاہور تشریف لائے تھے جن کا شاندار استقبال کیا گیا تھا اور اشیخ بن بادیس<sup>ر</sup> انہی خدمات کے اعتراف میں لاہور میونپل کار پوریشن نے ایک سڑک کو بن بادیس روڈ کے نام سے موسم کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب نے جہاد افغانستان کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ہے مگر کیا جمال کہ کسی غریب مولوی کا نام ان کی نوک قلم پر آنے پائے سوائے مولوی محمد یونس خالص کے کہ ان کا تذکرہ انجیسٹر گلبدین حکمت یار کی جماعت میں تفریقی بیان کرنے کیلئے ضروری ہو گیا تھا۔ حالانکہ مولوی محمد بنی محمدی، مولوی جلال الدین حقانی، مولوی نصر اللہ منصور اور مولوی ارسلان رحمانی جہاد آزادی کے عملی قائدین میں سے ہیں۔ جبکہ مولوی جلال الدین حقانی نے خوست چھاؤنی کی فتح میں اور مولوی ارسلان رحمانی نے ارگون چھاؤنی کی فتح میں مجاهدین کی خود کمان کی تھی۔ لیکن چونکہ مولویوں کے ذکرے سے جہاد کی شرعی حیثیت کا تاثر ابھرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اسے صرف جنگ آزادی کی حد تک دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے مولویوں کا تذکرہ ہی سرے سے غائب کر دیا ہے۔

## اقوام متحده کی افغانستان پر پابندیاں اور "الرشید ٹرست" کا جرأت مندانہ فیصلہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ جون ۲۰۰۱ء

ایک قوی روزنامہ نے لندن کے اخبار ٹیلی گراف کے حوالے سے یہ رپورٹ شائع کی ہے کہ برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرانے پاکستان کے وزیر خارجہ جناب عبدالستار سے اپنی حالیہ گفتگو میں خبردار کیا ہے کہ پاکستان طالبان کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنے والے دعاویٰ برادری سے دور ہوتا چلا جائے گا۔

یہ انتباہ ایسے موقع پر کیا گیا ہے جب کہ اقوام متحده نے کابل میں بے سہار افغان عوام کو خوراک مہیا کرنے کیلئے قائم کی گئی ۱۵۵ ایکریاں (تھور) بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس کا اصرار ہے کہ ان بیکریوں پر کام کرنے والے اہل کاروں بالخصوص عورتوں کے سلسلہ میں افغانستان کی طالبان حکومت اپنے مقابی قوانین پاسداری کرنے کی بجائے اقوام متحده کے قوانین کا اطلاق قبول کرے۔ جس کے بارے میں طالبان حکومت کے ذمہ دار حضرات کمی بار کہہ چکے ہیں کہ اقوام متحده کے متعدد قوانین اور ضابطے شریعت اسلامیہ سے متصادم ہیں اور وہ اسلام کے قوانین و احکام کے خلاف کسی قانون یا قاعدہ کو قبول نہیں کر سکتے۔

اقوام متحده کے ان تھوروں کے ذریعے کابل کے تقریباً پونے تین لاکھ افراد کو خوراک مہیا کی جا رہی تھی جن میں غرباً، ماسکین اور یوائیں شامل ہیں لیکن اقوام متحده نے ان بے کس اور افلاس زدہ افغان عوام کی ضروریات کو پیش نظر کھنے کی وجہ سے اپنے قوانین و احکام پر عملدرآمد کو ترجیح دی ہے۔ جس سے ایک بار پھر واٹھ ہو گیا ہے کہ افغانستان میں جنگ زدہ عوام کی امداد اور بحالی کے نام پر اقوام متحده اور مغربی ممالک کے پروگراموں کا اصل مقصد افغان عوام کی امداد اور ان کی ناگزیری ضروریات کو پورا کرنا نہیں بلکہ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے قوانین اور کلچر کو ان پر مسلط کرنا ہے اور انہیں بہر حال مغربی ثقافت اور کلچر کو قبول کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ مگر طالبان حکومت ہر قسم کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے شریعت اسلامیہ کے احکام و قوانین کے ساتھ اپنی دوڑوں کٹمنٹ کا بار بار اعلان کر رہی ہے اور وہ اس بارے میں لاٹچیا خوف کے کسی حریب کو کارگر ہونے کا موقع نہیں دے رہی۔ چنانچہ اقوام متحده کی طرف سے ان تھوروں کو بند کر دینے کے اعلان کے بعد بھی طالبان حکومت کے وزراء نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ اقوام متحده کا مقصد شرعی قوانین میں چک پیدا کرنے کیلئے دباؤ ڈالنا ہے مگر طالبان حکومت نے اس سلسلہ میں کسی بھی دباؤ کو قبول کرنے کا حقیقی فیصلہ کر رکھا ہے اور اس کیلئے وہ کوئی بھی قربانی دینے کیلئے تیار ہے۔

مغربی ممالک نے امریکہ کی قیادت میں اقوام متحده کی چھتری تلنے طالبان حکومت کو دنیا میں یکہ و تھا کر دینے اور افغان عوام کو بوجہ کامارے کا یہ پروگرام ایک عرصہ سے شروع کر لکا ہے اور برطانوی وزیر خارجہ کی طرف سے پاکستان کو طالبان کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنے کے اس انتباہ کا مقصد بھی بھی ہے کہ پاکستان سے طالبان حکومت کو جو حمایت، امداد اور پشت پناہی فراہم ہو رہی ہے اس کا راستہ بند کیا جاسکے۔ کیونکہ مغربی حکومتیں بجا طور پر یہ سمجھتی ہیں کہ اگر پاکستان کی طرف سے طالبان حکومت کے ساتھ تعاون اور حمایت کا سلسلہ جاری رہا تو اقوام متحده اور مغربی ممالک کی پابندیاں ان کا کچھ بھی نہیں رکھ سکیں گی اسی لیے وزیر خارجہ جناب عبد اللہ اسٹار کو برادر است گفتگو میں یہ انتباہ کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ لیکن جیک شرکویہ معلوم نہیں کہ پاکستان صرف حکومت کا نام نہیں بلکہ اس ملک میں کروڑوں ایسے مسلمان بنتے ہیں جو طالبان حکومت کے ساتھ محبت اور عقیدت کا رشتہ رکھتے ہیں، پاکستان میں دینی حلقتے ہیں جنہوں نے افغان جہاد میں اپنے افغان بھائیوں کی مکمل پشت پناہی کی ہے، ہزاروں علماء، طلبہ اور دینی کارکنوں نے رو سی استعمار کے خلاف لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا ہے اور وہ اب بھی جہاد افغانستان کے نظریاتی و منطقی نتائج کی تکمیل کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس لیے اقوام متحده یا جیک شرکا کے کہنہ پر حکومت اگر طالبان کے ساتھ فاصلے قائم کرنے یا رکھنے کی کوئی حکمت عملی

ٹے کرتی ہے تو وہ صرف اسی کے دائرہ تک محدود رہے گی اور پاکستان کے دینی حلقوں اور مسلمانوں کے جو تعلقات محبت و عقیدت طالبان کے ساتھ استوار ہو چکے ہیں انہیں ختم یا کم کرنا اب کسی کے بس میں نہیں رہا۔ اور یہ بات نظری اور خیالی نہیں بلکہ اس کی عملی مثال بھی سامنے آچکی ہے کہ کراچی کے "الرشید ٹرسٹ" نے اقوام متحده کی کابل میں بندرگی جانے والی ۱۵۵ ایکریوں کا انتظام سنبھالنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں الرشید ٹرسٹ کے نمائندے طالبان حکومت کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ مل کر عملدرآمد کیلئے سروے مہم کا آغاز کر چکے ہیں۔

الرشید ٹرسٹ ایک عرصہ سے حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی کی سرپرستی میں افغانستان اور دیگر علاقوں میں مظلوم اور بے شہار اسلامانوں کی ادا اور بحالی کیلئے سرگرم عمل ہے اور وقوع خدمت سرانجام دے رہا ہے، لیکن اس کی طرف سے اقوام متحده کے بند کیے ہوئے توروں کا انتظام سنبھالنے کا یہ فیصلہ فی الواقع بہت بڑا ہے جس پر بی بی سی نے بھی حیرت کا اظہار کیا ہے۔ بی بی سی کا کہنا ہے کہ پونے تین لاکھ افراد کو منتقل بنیادوں پر خوارک کی فراہمی ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کیلئے ہر ماہ اڑھائی ہزار ٹن لگدم در کار ہو گی اور سالانہ لگت آٹھ میلین ڈالر کے لگ بھگ پہنچ سکتی ہے۔ مگر الرشید ٹرسٹ نے ایک حالیہ نشریہ میں کہا ہے کہ وہ بیندار اور مخیر مسلمانوں کے تعاون سے اس خدمت کو سرانجام دینے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الرشید ٹرسٹ نے یہ اعلان کر کے بہت بڑا چینچ قبول کیا ہے اور اقوام متحده پر واضح کیا ہے کہ پاکستان کے عوام اور دینی جماعت افغانستان میں اسلامی قوانین پر کامل عملدرآمدیاں میں مغربی ممالک کی خواہش کے مطابق چک پیدا کرنے کی اس نکاش میں نہ صرف افغان عوام کے ساتھ ہیں بلکہ ان کی بھروسہ عملی امداد اور پشت پناہی کیلئے بھی تیار ہیں۔ لیکن الرشید ٹرسٹ کو اس میدان میں تھا چھوڑ دینا بھی دانش و حمیت کی بات نہیں ہو گی اس لیے ہم دیگر رفاهی اداروں اور دینی حلقوں سے گزارش کریں گے کہ وہ بھی صورتحال کی نزاکت اور گلکنی کو محسوس کریں اور اپنے افغان بھائیوں کی مدد، حمایت اور پشت پناہی کیلئے آگے بڑھیں جنہیں دنیا کے لفڑی صرف اس لیے بھوکارانے پر تل کئی ہے کہ وہ اسلامی احکام و قوانین پر ہر حالت میں عمل کرنے کا تھیہ کیے ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی دباؤ قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہیں۔

## امریکہ اور برطانیہ کی پاکستان کو طالبان سے فاصلہ رکھنے کی ہدایت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۰۱ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۹ جون ۲۰۰۱ء کی روپورٹ کے مطابق امریکی وزارت خارجہ نے حکومت پاکستان سے کہا ہے کہ وہ طالبان حکومت کے ساتھ فاصلہ رکھے اور طالبان کی حمایت سے باز رہے ورنہ اسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس سے قبل برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا بھی پاکستان کے وزیر خارجہ جناب عبد اللہ اسٹار کے ساتھ گفتگو میں یہ بات کہہ چکے

بیں۔

امریکہ اور دیگر مغربی ممالک طالبان کی بے چک اسلامی پالیسیوں سے نالاں ہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہے کہ پاکستان کے اثرورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے طالبان حکومت کو اسلامی قوانین کے نفاذ میں چک پیدا کرنے پر مجبور کیا جائے۔

- لیکن ایک طرف طالبان حکومت نے دو ٹوک اعلان کر دیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کی چک پیدا نہیں کریں گے اور نہ ہی اس حوالے سے کسی کادباو قبول کریں گے،
- اور دوسری طرف حکومت پاکستان کے ذمہ دار حضرات متعدد بار واضح کر چکے ہیں کہ وہ طالبان حکومت سے برادری کی سطح پر ہی بات کر سکتے ہیں، اور ان کی مرخصی کے خلاف ان سے کوئی بات دباؤ کے ساتھ منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

یہ صورتحال امریکہ اور اس کے حواری ممالک کیلئے پریشان کن ہوتی جا رہی ہے اور وہ تمام ترعاً ای اثرورسوخ اور سطوت و حشمت کے باوجود امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کے بارے میں بے ہمی محسوس کرتے ہوئے مسلسل دانت پیش رہے ہیں۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ طالبان حکومت اگر اسلامی احکام و قوانین کے حوالے سے اپنے عزم پر قائم رہتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا کچھ نہیں بگڑ سکے گی اور وہ بالآخر دنیا کو ایک بار پھر اسلام کے عادلانہ نظام کا عملی نقشہ اور اسلامی سوسائٹی کی عملی شکل دکھانے میں کامیاب ہوں گے۔

## امریکی نائب وزیر خارجہ کا دورہ پاکستان

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — اگست ۲۰۰۱ء

جنوبی ایشیا کیلئے امریکہ کی نائب وزیر خارجہ محترمہ کریم شینارو کا ان دونوں جنوبی ایشیا کے دورے پر ہیں اور جس وقت یہ سطور تحریر کی جا رہی ہیں وہ اسلام آباد میں پاکستانی حکام سے مذاکرات میں مصروف ہیں۔ جبکہ امارتِ اسلامی افغانستان کے سفیر محترم ملا عبد السلام ضعیف سے بھی ان کی ملاقات ہونے والی ہے۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد کریم شینارو کا کام یہ پہلا دورہ پاکستان ہے اور اخباری اطلاعات کے مطابق ان کے ایجنسٹے میں

1. پاکستان میں جمہوریت کی بحالی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کی روک تھام،

2. افغانستان کے خلاف اقوام متحده کی پابندیوں پر مؤثر عمل درآمد،

3. عرب مجاهد اسماء بن لادن کو امریکہ کی حوالے کرنے کا سوال،

4. اور کشمیر کے حوالے سے پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کو کرنے

کے مسائل سرفہrst ہیں جن کے بارے میں وہ متعدد بیانات میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکی ہیں۔

جنوبی ایشیا کے حوالے سے امریکہ کا یہ ایجنسٹا کوئی نیا نہیں ہے اور نہ امریکہ میں حکومت کی تبدیلی اور کلمنٹن کی جگہ

خارج ڈیلویشن کی بطور صدر آمد سے اس ایجنسی کے اسے ایجنسی کے توانی پالیسی میں کوئی فرق سامنے آیا ہے۔ امریکہ کے ایجنسی کے بنیاد اس کے اس زعم پر ہے کہ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور واحد سپرپاؤر ہے اس لیے دنیا کے ہر خلیے میں سیاست و معیشت اور قانون و عدالت سے لے کر اخلاق و معاشرت تک تمام شعبوں میں اس کی مرضی، خواہش اور پالیسی پر عمل ہونا چاہیے اور دنیا کے ہر ملک اور قوم کو صرف اور صرف امریکی مفادات کے تحفظ اور پھیل کے حوالے سے اپنی پالیسیاں مرتب کرنی چاہیں۔ امریکہ اپنی اس بالادستی کیلئے انسانی حقوق کے نعرے، جمہوریت کے پرچار اور اقوام متحده کے فیصلوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے لیکن یہ محض فریب کاری ہے جس کا صرف دو عملی مشاوں سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

1. ایک یہ کہ امریکہ پاکستان میں جمہوری عمل کی جلدی بحالی کا خواہاں ہے اور پاکستان میں آنے والی نئی امریکی سفیر نے صاف طور پر کہا ہے کہ بطور سفیر ان کی پہلی ترجیح پاکستان میں جمہوری عمل کی بحالی ہوگی۔ لیکن مشرق و سطحی کے ممالک میں امریکہ کو جمہوریت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور چونکہ وہاں شخصی امریتیں اور بادشاہیں امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے زیادہ مفید ثابت ہو رہی ہے اس لیے امریکے نزدیک ان ممالک کے عوام کی سیاسی آزادیوں، شہری حقوق اور جمہوری تقاضوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور امریکہ پورے مشرق و سطحی میں آمریتیوں اور بادشاہتوں کا سب سے بڑا محافظہ بنا ہوا ہے۔

2. دوسری مثال بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسرائیل اقوام متحده کی قراردادوں اور فیصلوں کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرتا چلا آرہا ہے اور اب بھی اعلانیہ خلاف ورزی کر رہا ہے لیکن اسرائیل کو ان اسرائیل کی روزی روزیوں سے روکنے کیلئے اقوام متحده کی مائیٹر ٹیول کو مشرق و سطحی بھجوانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جبکہ اس کے بر عکس افغانستان کی سرحدوں پر صرف اس لیے اقوام متحده کی مائیٹر ٹیبلیں بھجوانے کیلئے امریکہ سب سے زیادہ متحکم ہے کہ امریکہ کے اندازوں، توقعات اور خواہشات کے علی الرغم افغانستان کے عوام اقوام متحده کی اقتصادی پابندیوں کے باوجود اس طرح بھوکے نہیں مر رہے جس طرح امریکہ انہیں بھوکار کر اپنے سامنے بھکانا چاہتا تھا، اور وہاں نہ صرف طالبان کی حکومت کا روپار حکومت پورے اعتدال کے ساتھ چاری رکھے ہوئے ہے بلکہ افغان عوام کو طالبان حکومت کے خلاف بھڑکانے اور بغایت پرآمادہ کرنے کا کوئی حر جب کامیاب نہیں ہو رہا۔

امریکی پالیسیوں میں کھلے تضاد کی یہ دو واضح مثالیں ہمارے سامنے ہیں جن کی بنیاد پر یہ بات کسی شک و شبہ سے بالآخر ہے کہ جمہوریت، انسانی حقوق، امن اور معاشرتی ترقی کے حوالے سے امریکہ کے نعرے اور دعوے کسی اصول اور فلسفہ کے فروغ کیلئے نہیں بلکہ محض اپنے مفادات کے حصول اور تحفظ کیلئے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک یہی سب سے بڑی وجہ ہے اس امریکی کہ امریکہ کو تمام تگ و دو کے باوجود دنیا پر اپنی پالیسیاں ہر حال میں مسلط کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو رہی

اور دنیا کے ہر خلطے میں اس کی مخالفت اور اس کے خلاف نفرت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ہم امریکی حکمرانوں سے گزارش کریں گے کہ وہ جنوبی ایشیا کے ممالک پر اپنی یک طرف پالیسیاں طاقت کے زور پر مسلط کرنے کی پالیسی پر نظر ثانی کریں اور دوسروں کے خلاف طاقت اور دباؤ کے اندازہ نہند استعمال کے بجائے اپنی پالیسیوں کے تضادات اور طرزِ عمل کے دو غلے پن کا جائزہ لیں۔ محض طاقت کا استعمال نہ پہلے کبھی انسانی تاریخ کے کسی دور میں اپنے مطلوبہ اور مزعومہ مقاصد حاصل کر سکا ہے اور نہ اب کسی کو محض قوت اور طاقت کے سہارے اپنے مزعومہ مقاصد تک پہنچنے کی توقع کرنی چاہیے۔

## افغانستان میں عیسائیت کی تبلیغ اور طالبان کا موقف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۷ اگست ۲۰۰۱ء کی خبر کے مطابق:

”افغانستان میں طالبان نے ”شیلر ناؤ“ نامی انتہائی تنظیم کے دفاتر کو بند کر دیا اور عملے کے چوہیں افراد کو گرفتار کر لیا جن میں چچ غیر ملکی خوتین اور دو غیر ملکی مرد بھی شامل ہیں۔ بی بی سی کے مطابق عملے کے ایک افغان الہکار کے گھر سے باہل ملی اور ایک کمپیوٹر اور کمپیوٹرڈسکس جن میں باہل کا مودا ہے۔ یہ گرفتاری انتہائی سنگین نوعیت کا معاملہ ہے چونکہ جنوری میں طالبان کا فتویٰ آچکا ہے کہ اسلام چھوڑنے والے افغانیوں کیلئے سزا موت ہو گی اور کسی افغانی کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کرنا ریاست کے خلاف جرم ہو گا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس فتویٰ کے تحت کارروائی ہوئی ہے۔ افغانستان میں شیلر ناؤ انتہائی تنظیم کے عملے میں تیرہ غیر ملکی افراد ہیں جو خواک کی فراہمی اور بہبود آبادی کے کام میں مصروف ہیں۔“

افغانستان کے بارے میں ایک عرصہ سے یہ خبریں آرہی تھیں کہ خوارک کی فراہمی اور انسانی ہمدردی کے دیگر امور کی انجام دہی کے نام سے جو غیر ملکی این جی اوز وہاں کام کر رہی ہیں ان میں سے بعض عیسائیت کی تبلیغ اور افغان عوام کو مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دینے میں مصروف ہیں۔ اور بعض خبروں کے مطابق بہت سے افغانوں کو ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائی بنالیکیا ہے۔ اس خبر سے ان باتوں کی تصدیق ہو گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے عالمی ادارے اور ولادہ میڈیا ایک بار پھر امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف پروپیگنڈا اور طالبان حکومت پر دباؤ بڑھانے کی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔

جبکہ طالبان حکام کا کہنا ہے کہ بیرونی این جی اوز کو ایک معابدہ کے تحت افغانستان میں کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جس میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ریاست کے سرکاری مذہب اسلام کے خلاف کسی قسم کی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوں گے، اور خلاف ورزی کی صورت میں ان کے خلاف افغانستان کے رائجِ الوقت قانون کے تحت کارروائی کی جائے

گی۔ اس لیے ان گرفتار افراد نے افغانستان کے قانون اور مذکورہ معاهدہ کی خلاف ورزی کی ہے اور انہیں معاهدہ کے مطابق سزا کا سامنا کرنا ہو گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ طالبان حکومت کا یہ اقدام بالکل جائز اور منصفانہ ہے، اس لیے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اسلام میں مرتد ہونے اور ارتاد پھیلانے کی شرعی سزا موت ہے، اور اسلام ہی افغانستان کا راجح وقت دستور و قانون ہے جس کی پابندی کا ان این جی اوز نے افغانستان کی حکومت سے معاهدہ کر رکھا ہے۔ اس لیے اس مسلمہ بین الاقوامی قانون کے تحت کسی بھی ملک میں معاهدہ کے تحت جانے والوں کو معاهدہ اور اس ملک کے قانون کی پابندی کرنی چاہیے، غیر ملکی این جی اوز کو افغانستان میں مذہبی تبلیغ اور ارتادی سرگرمیوں کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، اور اگر انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے تو انہیں اس کی سزا ملنی چاہیے تاکہ اور کسی کو اس قسم کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ صرف افغانستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے بہت سے مسلم ممالک کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ افغانستان میں اسلامی نظریاتی حکومت موجود ہے اس لیے اس کا نوٹس لے لیا ہے جبکہ بگلہ دیش، تائجیریا اور انڈونیشیا سمیت بہت سے مسلمان ملکوں میں اور خاص طور پر پاکستان میں کام کرنے والی سینکڑوں این جی اوز کی سرگرمیاں بھی مسلمانوں کو ان کے مذہب، عقائد اور لکچر سے بیگانہ کرنے اور باغی بنانے کی مساعی پر مشتمل ہیں۔ اور بعض این جی اوز تو حکلم کھلاعیسا بیت کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کو مرتد بنارہی ہیں۔

اس لیے مسلمان حکومتوں اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کو اس قسم کی ارتادی سرگرمیوں کی روک تھام کیلئے عالمی سطح پر کوئی موثر حکمت عملی طے کرنی چاہیے۔

## پاک افغان سرحد کی نگرانی کیلئے اقوام متحده کی ٹیمیں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۹ اگست ۲۰۰۱ء کو اسلام آباد میں افغان ڈیپنس کو نسل کا اہم اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا ہمیشہ الحق نے کی، جبکہ مولانا فضل الرحمن، مولانا فراء الرحمن درخواستی، جناب لیاقت بلوج، جزل (ر) کے ایم اظہر، جزل (ر) حمید گل اور مولانا محمد احمد لدھیانوی سمیت مختلف دینی جماعتوں کے زعماء نے اس میں شرکت کی، اور امارتِ اسلامی افغانستان کے خلاف اقوامِ متحدة کی سلامتی کو نسل کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی مانیٹر گرکیلئے پاک افغان سرحد پر اقوامِ متحدة کی مانیٹر گر ٹیموں کی تعینات کو پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت قرار دیتے ہوئے اس کی مدد مت کی۔ اجلاس میں حکومت پاکستان سے مانیٹر گر ٹیموں کو مسترد کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ ان ٹیموں کی سرگرمیوں کی مزاحمت کی جائے گی۔

جبکہ روزنامہ نوازے وقت لاہور ۱۹ اگست ۲۰۰۱ء کی خبر کے مطابق قائمی علاقہ میں مولانا امام اللہ خان کی زیر صدارت

منقد ہونے والے جمیعت علماء اسلام کے کونشن میں اعلان کیا گیا ہے کہ قبائلی علاقوں میں اقوامِ متحده کی نائیٹنگ ٹیوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور ان ٹیوں کے افراد اپنی حفاظت کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اقوامِ متحده اور امریکہ کی معاندانہ کاروائیوں کے خلاف امارتِ اسلامی افغانستان کی حمایت میں پاکستان کے دینی حلقوں کی یہ بیداری نیک فال اور خوش آئند ہے، لیکن اسے مزید منظم کرنے اور اس کا دائرة زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے مظلوم افغان بھائیوں کی پشت پناہی کا فرض بروقت ادا کر سکیں۔

## سانحہ گیارہ ستمبر اور امریکی قیادت کی آزمائش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۸ ستمبر ۲۰۰۱ء

گیارہ ستمبر کو امریکہ کے دو بڑے شہروں نیویارک اور واشنگٹن میں جو قیامتِ صغیری پاہ ہوئی ہے اس نے ظاہری طور پر دھکائی دینے والے معروضی حقائق کا نقشہ ایک بار پھر پڑھ کر رکھ دیا ہے۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا بلکہ اس سے قبل بھی تاریخ نے کئی بار یہ منظر دیکھا ہے کہ حالات و واقعات کاظاہری منظر کچھ اور نظر آہا ہے مگر سمندر کی پر سکون سطح کی تہہ میں کسی طوفان نے جب انگڑائی لی ہے تو سطح سمندر اور اس پر نظر آنے والا پورا منظر ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ نیویارک کا ولڈ ٹریڈ سٹریٹ میں نے ۱۹۸۷ء میں دیکھا جب مولانا میاں محمد اجمل قادری مجھے سیر و سیاحت کیلئے اپنے ساتھ امریکہ لے گئے تھے۔ تب میرے ہم زلف محمد یونس صاحب نے نئے نیویارک میں آباد ہوئے تھے اور وہی ہمارے میزبان تھے۔ ہم ایک روز ولڈ ٹریڈ سٹریٹ دیکھنے گئے، اتنی بلند بالا اور پر شکوہ عمرات دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ اس کی غالباً ۱۰ویں منزل پر تفریق گاہ تھی جہاں تک ہم پہنچے، بال اس سے نیچے تھے اس لیے نیویارک شہر کا منظر صاف دھکائی نہیں دے رہا تھا، چنانچہ وہیں تھوڑی دیر گھومے پھرے اور پھر واپس آگئے۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کی شام کو جب میرے چھوٹے بیٹے حافظ عاصم خان نے انٹریٹ کے ذریعے حاصل ہونے والی یہ خبر مجھے سنائی کہ دو ہوائی جہاز ملنگے سے ورلڈ ٹریڈ سٹریٹ کی یہ محیر العقول بلڈنگ زمین بوس ہو گئی ہے تو چند لمحے لیقین نہ آیا لیکن جب تفصیلات سنیں اور رات ۹ بجے کے خبر نامے میں اس کے مناظر دیکھئے تو اس دلخراش منظر پر لیقین کیے بغیر کوئی چارہ کارناہ رہا۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سٹریٹ اور واشنگٹن میں وزارتِ دفاع کے مرکزیتیٹا گاں میں اغوا شدہ مسافر ہوائی جہازوں کے ذریعے فدائی حملوں سے ہونے والے عظیم مالی نقصان اور ہزاروں بے گناہ انسانی جانوں کے ضیاع سے ہر شخص کو دکھ ہوا ہے۔ دنیا کے ہر ذی ہوش انسان نے اس پر صدمہ و افسوس کا اظہار کیا ہے اور ہم بھی امریکی قوم بالخصوص متأثرین کے خاندانوں کے اس غم میں ان کے ساتھ شریک ہیں اور دعا گوہیں کہ ہلاک ہونے والوں میں جو بھی مغفرت کے مستحق ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور سب ہلاک شدگاں کے خاندانوں کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین ثم آمین۔

جہاں تک اس کے اسباب و عوامل اور نتائج و عوایب کا تعلق ہے اس کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنا ہم

ضروری سمجھتے ہیں۔ ان حادثات کے بعد ظاہر ایسا لگتا ہے کہ امریکی حکومت نے سارے امیر اسامہ بن لادن پر ڈالنے اور اس کی آڑ میں افغانستان کے خلاف کوئی بڑا فوجی ایکشن لینے کا فیصلہ کر لیا ہے جو ممکن ہے ان سطور کی اشاعت تک وقوع پذیر بھی ہو چکا ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ محض غصہ بکانے، امریکی قوم کو واقعی تسلیم دینے، اور افغانستان کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنانے کا عمل ہو گا۔ کیونکہ جب تک چھان بین اور تحقیقات کے ذریعے کوئی واضح رخ سامنے نہیں آجاتا اس وقت تک کسی کے خلاف اس قسم کی کوئی کارروائی شاید خود امریکی رائے عامہ کی نظر میں بھی قریں انصاف نہیں ہو گی۔ جبکہ اس سے قبل اول کا ہاماک سٹرنر کی تباہی کے موقع پر امریکی حکمران یہ تجربہ کر چکے ہیں کہ ابتداء میں رد عمل اور انتقام کا نشانہ مسلمان اور عرب نوجوان بن رہے تھے لیکن تحقیقات کے بعد یہ حرکت ایک ما یوس امریکی نوجوان کی نکلی جس کا مسلمانوں اور عربوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے ہم کسی درجہ میں یہ امید کر سکتے ہیں کہ امریکی حکمران غصہ اور جوش کے ساتھ ساتھ ہوش اور راضی کے تجربہ سے بھی استفادہ کریں گے اور ان کے فوری اشتغال کا نزلہ افغانستان کے عضوِ ضعیف پر نہیں گرے گا۔

بعض اخبارات میں ایک جاپانی قیظیم کی طرف سے بھی اس المیہ کی ذمہ داری قبول کرنے کا تذکرہ ہوا ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ صرف عالمی رائے عامہ کو یاد بانی کرنے کی ایک کوشش ہے کہ جس دہشت گردی کا نشانہ آج امریکہ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ بڑی اور خوفناک دہشت گردی کا نشانہ جاپان کے عوام ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکہ کے ائمیں حملوں کی صورت میں بن چکے ہیں اور ان حملوں میں ہزاروں نہتے اور بے گناہ شہری المناک ناگاہنی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ البتہ اگر امریکی قیادت اپنے غصہ اور انتقامی جذبہ پر تھوڑا سا قابو پا کر ٹھہنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس صورتحال پر غور کیلئے آمادہ ہو تو ہم اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اپنی تمام تر تنگی اور تباہ کاری کے باوجود ایک رد عمل ہے۔ اور کسی بھی رد عمل کو اس عمل سے الگ کر کے دیکھنا قرین انصاف نہیں ہوتا جس کے جواب میں وہ ظہور میں آتا ہے۔ امریکی حکمرانوں کو اس رد عمل کے اصل عوامل تک پہنچنے کیلئے اس عمل کا ادراک کرنا ہو گا جس نے کسی بھی گروہ کے انتہا پسندوں کو اس حد تک آگے جانے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہزاروں بے گناہ جانوں کے ساتھ ساتھ خود اپنی جانوں کے تلف ہو جانے کو بھی انہوں نے اس قدر آسانی کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں موت کے سپرد کرنا تا آسان نہیں ہوتا اور کوئی انتہائی مجبوری، بے بُی اور ما یوس ہی انسان کو اس مقام تک لے جاتی ہے۔

چنانچہ اگر امریکی قیادت دہشت گردی کے خاتمے کے اعلان اور دعویٰ میں سمجھیدہ ہے تو اسے دہشت گردی اور اس کے اسباب و عوامل کے ساتھ مختلف قوام اور گروہوں کو دہشت گردی کی انتہائی منزل تک لے جانے والے مجرمکات کا جائزہ بھی لیتا ہو گا۔ اس لیے کہ آگ ہو گی تودھواں بھی اٹھے گا اور ار گرد کے ماحول میں پیش بھی موجود ہے گی، صرف دھویں کو کشوں کرنے یا ار گرد کی تپی ہوئی دیواروں پر پانی ڈالنے سے کچھ خاص فائدہ نہیں ہو گا بلکہ اس کیلئے آگ کو بچانا ضروری ہے۔ اور یہ آگ نا انصافی، جانبداری، منافقت، استھصال، اور ہر حال میں ایک گروہ کی بالادستی قائم کرنے کا وہ عالمی نظام ہے جس نے پوری دنیا کے امن کو داؤ پر لگا دیا ہے اور انسانیت ایک بار پھر عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی دکھائی دے رہی ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ امریکہ جس جمہوریت اور انسانی حقوق کی باقی دنیا کیلئے دہائی دیتا ہے اسے خلیج عرب کے مالک کیلئے بھی تسلیم کر لے، فلسطینیوں کے جن جائز حقوق کو اقوام متحده کا عالمی فورم تسلیم کرتا ہے امریکہ ان کا احترام کرتے ہوئے اسرائیل کی ناجائز پشت پناہی ترک کر دے، افغانستان کے عوام کو اپنے ملک میں اپنی مرضی کے ساتھ زندگی بر کرنے کا موقع دے، اور دنیا بھر کے مخفف ممالک و اقوام کو طاقت اور سرمائے کے ہیر پھیر کے ذریعے زبردستی اپنا زیر دست رکھنے کی پالیسی پر نظر ثانی کر لے تو کسی کو امریکی عوام کے ساتھ کیا دشمن ہے کہ وہ اپنی جان کو قربان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جانوں کے بھی درپے ہو جائے؟

ان گزار شات کے ساتھ ہم اس عظیم اور المناک سانحہ والیہ کے موقع پر امریکی حکومت، عوام اور متاثرہ خاندانوں کے ساتھ ان کے غم میں شرکت کا اظہار کرتے ہیں اور امریکی قوم کے ساتھ پوری ہمدردی، خیر خواہی اور خلوص رکھتے ہوئے اس استدعا کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ محض رد عمل کے اظہار کی وجہ سے صورتحال کو عمل اور رد عمل دونوں کے مجموعی تناظر میں دیکھا جائے اور دونوں کے اباب و محركات کو کثیرول کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ ورنہ کوئی بھی یکطرفہ رد عمل اس قسم کے خوفناک واقعات میں اضافہ کا باعث توبن سکتا ہے انہیں روکنے کیلئے قطعاً مفید ثابت نہیں ہو گا۔

## سانحہ گیارہ ستمبر کے تناظر میں امریکی عزادم اور پاکستان کا کردار

۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو مسجدِ امن، بالغبانپورہ، لاہور میں خطاب

**بعد الحمد والصلوة۔** محترم بزرگ اور دوست! اس وقت پوری دنیا میں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں ہونے والے حادثات اور ان میں ہزاروں جانوں کے ضائع ہو جانے کے بعد اس پر امریکہ کے رد عمل اور اس سے پیدا شدہ صورتحال پر بحث کا سلسلہ جاری ہے اور میں بھی اسی حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

نیویارک کے ولڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن کے پینٹاگون سے انغوашہ طیاروں کے نکرانے سے جو عظیم جانی و مالی نقصان ہوا، اس سے سب لوگوں کو دودھ ہوا ہے لیکن امریکہ نے اس کی ذمہ داری عرب مجاهد اسامہ بن لادن پر ڈال کر اس کی آڑ میں افغانستان پر حملہ کرنے کا جو اعلان کیا ہے، اس سے صورتحال میں اور کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ افغانستان کی طالبان حکومت سے امریکہ کا مطالبہ ہے کہ وہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دے مگر طالبان حکومت کا موقف یہ ہے کہ امریکہ کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کرے، اس کے مطالبہ پر غور کیا جائے گا۔ محض شک یا الزام پر وہ ایک مجاهد کو، جوان کا مہمان ہے، امریکہ کے سپرد کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی افغان علماء کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسامہ بن لادن اپنے طور پر افغانستان چھوڑ دیں مگر انہیں امریکہ یا کسی اور ملک کے سپرد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طالبان حکومت کا یہ موقف بہت پرانا ہے اور اس سے پہلے بھی امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کی طرف

سے کہا جا پکھا ہے کہ اسماء بن لاون رضا کارانہ طور پر افغانستان سے چلے جائیں تو ان کی مرضی ہے مگر انہیں بطور ملوم کسی ملک کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ افغان علماء کی مجلس شوریٰ نے یہی بات اب ذرا مختلف انداز میں کہی ہے اور اسی سے وقت طور پر کشیدگی میں کسی حد تک کمی کے آثار پیدا ہوئے ہیں مگر امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بوش نے آج امریکی الیوان نمائندگان سے خطاب کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ مسئلہ صرف اسماء کا نہیں بلکہ وہ دہشت گروں کے نیٹ ورک کو توڑنا چاہتے ہیں اور دنیا بھر میں دہشت گروں کے تمام مرکزوں کو شناختہ بتانا چاہتے ہیں۔

امریکہ کے نزدیک عالمِ اسلام کی جہادی تحریکات دہشت گروں کے خلاف کارروائی کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد یہی جہادی تحریکات ہوتی ہیں جو مرکش سے انڈونیشیا تک اور چینپیا سے صوبائیہ تک پھیلی ہوئی ہیں اور کشمیر، فلسطین، چینپیا اور مورو سمیت مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو غاصب اور مسلط قوتوں سے نجات دلانے کیلئے عسکری جدوجہد کر رہی ہیں۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کا کہنا ہے کہ ان سب دہشت گروں نے افغانستان میں ٹریننگ حاصل کی ہے، اس لیے افغانستان کو تباہ کرنا امریکہ کیلئے ضروری ہو گیا ہے اور اسی ہدف کو حاصل کرنے کیلئے امریکہ بھر پر جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہم پہلے ہی عرض کیا کرتے تھے کہ اسماء بن لاون کا نام صرف بہانہ ہے، اصل مسئلہ جہادی تحریکات ہیں جو امریکہ اور اس کے حواری ممالک کیلئے ناقابل برداشت ہوتی چاہی ہیں اور اب صدر بیش نے صاف طور پر تمام جہادی تحریکات کے خاتمہ کو اپنا سب سے بڑا ہدف قرار دے کر ہمارے ان خدمات کی تقدیق کر دی ہے۔

مگر اس میں ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ امریکہ افغانستان پر حملہ کیلئے ہمارے کندھے پر بندوق رکھنا چاہتا ہے اور پاکستان کی زمین اور فضائی حملہ آور ہو کر امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو ختم کرنے کے درپے ہے اور مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے ارباب اختیار امریکہ کو افغانستان پر حملہ کیلئے زمینی اور فضائی سہولتیں فراہم کرنا چاہتے ہیں اور اسے اسلام اور پاکستان کے مفاد کا تقاضا بتا رہے ہیں۔ صدر پاکستان جzel پرو یور مشرف صاحب نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے جس طرح افغانستان پر حملہ کیلئے امریکہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی کا دفاع کیا ہے، وہ انتہائی حیران کن ہے اور میں اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہ رہا ہوں۔

صدر محترم نے جناب بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طبیہ کا حوالہ دیا کہ آنحضرتؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے یہودیوں سے صلح کا معابدہ کر کے کفار کم کے خلاف اسد اور خدق کی جنگیں لڑی تھیں جبکہ اس کے بعد حدیبیہ میں کفار کم کے سے جنگ نہ کرنے کا معابدہ کر کے خیر میں یہودیوں سے جنگ جیتی تھی اس لیے یہ عین حکمت اور داشت کا تقاضا ہے اور سنتِ نبوی کی پیروی ہے۔ لیکن جzel صاحب کا یہ استدلال درست نہیں ہے اس لیے کہ بنی اکرم کے سامنے دونوں قومیں کافر تھیں اور دونوں دشمن تھے۔ ان سے بیک وقت لڑنے کے بجائے حضورؐ نے ایک وقت میں ایک دشمن سے صلح کرنے اور دوسرے دشمن کے خلاف جنگ لڑنے کی حکمت عملی اختیار فرمائی جو فی الواقع داشت مندی کی بات تھی لیکن یہاں ایک طرف امریکہ ہے جس کی مہربانیاں نصف صدی سے ہم بھگت رہے ہیں اور دوسری طرف طالبان کی اسلامی حکومت ہے جس کی باقی تمام باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی یہ حقیقت ہے کہ کابل میں طالبان حکومت کا وجود ہی پاکستان

کی شمال مغربی سرحد کے تحفظ کی صفائح ہے۔ اس لیے اس صورتحال پر جناب بنی اکرمؐ کی مذکورہ حکمت عملی کا احراق نہیں کیا جاسکتا اور اسے غلط فہمی یاد ہو کر کے عنوان سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلام کی تعلیم کا تاریخ کے اس عظیم واقعہ سے پتہ چلتا ہے جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صفت آتھیں اور دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے کے درپے تھے۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسیحی سلطنت روم کے بادشاہ قیصر نے حضرت معاویہؓ کو پیش کش کی تھی کہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں وہ ان کی مدد کر سکتا ہے مگر حضرت معاویہؓ نے اسے انتہائی سختی کے ساتھ رد کر دیا اور وہ جواب دیا جو اسلامی تاریخ کا روشن باب اور قیامت تک آنے والے مسلم حکمرانوں کیلئے مشعل را ہے۔ انہوں نے قیصر روم کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

”میری حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ دو بھائیوں کی لڑائی ہے جس سے تمہیں فائدہ اٹھانے کا موقع

نہیں دیا جائے گا اور اگر تم نے حضرت علیؓ کے خلاف فون کخشی کی تو تمہارے مقابلے میں حضرت علیؓ کے

پرچم تھے سامنے آنے والا سب سے پہلا سپاہی معاویہ ہو گا“

یہ اس کیفیت کی بات ہے جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ایک دوسرے کے خلاف حالتِ جنگ میں تھے جبکہ ہماری طالبان کے ساتھ کوئی جنگ بھی نہیں ہے اس لیے ہمارے لیے اسلام کی تعلیم یہی ہے جو حضرت معاویہؓ نے قیصر روم کے نام اپنے خط میں بیان فرمائی ہے۔

جزل صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ہم نے امریکہ کو حملہ کی سہولتیں فراہم نہ کیں تو بھارت ایسا کر دے گا اور پھر امریکہ بھارت کے ساتھ ہو جائے گا جس سے ہمارے کشمیر کا ذوق نقصان پہنچے گا۔ میرے نزدیک یہ انتہائی بھولپن ہے اور یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جو امریکہ کو جانتا نہیں ہے۔ امریکہ کے بارے میں یہ موقع رکھنا خود فربی بی ہے جس کا شکار ہم سے پہلے ہمارے عرب بھائی ہو چکے ہیں۔ ہمارے برادر عرب ملکوں نے اسی موقع اور امید پر امریکہ دوستی کا پرچم اٹھایا تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں امریکہ ان کا لحاظ کرے گا اور ان کے امریکہ کا ساتھی بننے سے اسرائیل اور عربوں کے حوالے سے امریکہ کی پالیسیوں میں توازن قائم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور ساری دنیا یہ منظر دیکھ رہی ہے کہ امریکہ نے اپنی فوجیں سعودی عرب اور کویت میں بٹھا کر ہیں اور پشت پناہی اسرائیل کی کر رہا ہے۔ وسائل عربوں کے استعمال کر رہا ہے اور تحفظ اسرائیل کو فراہم کر رہا ہے اس لیے ہمارے مہربانوں کوی غلط فہمی ذہن سے نکال دینی چاہئے کہ امریکہ پاکستان میں بیٹھ جائے گا تو بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی حمایت بھی کرے گا اور پاکستان میں اس کی موجودگی سے پاکستان کے کشمیر کا ذوق کوئی فائدہ بھی پہنچے گا۔ پھر یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب امریکہ کے بقول وہ جہادی تحریکات کا خاتمہ کر دے گا، پاکستان کو افغانستان سے لڑادے گا اور چین کے سر پر فوجیں بٹھا کر پاک چین تعلقات میں رخنہ پیدا کر دے گا تو پھر کون سا کشمیر کا ذوق باقی رہ جائے گا جسے بچانے کی ہمارے حکمران فکر کر رہے ہیں؟ ”کشمیر کا ذوق“ اگر ہے تو وہ مجاہدین کی قربانیوں کی وجہ سے ہے جنہوں نے ہزاروں شہداء کاغذوں دے کر اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ جب یہ مجاہدین اور ان کے گروپ ہی دہشت گرد قرار پا کر پاکستان کے ہاتھوں امریکی انتقام کا نشانہ بن جائیں گے تو کشمیر کا وجود ہی کہاں باقی رہے

جائے گا؟

صدر محترم کا ارشاد ہے کہ ہم امریکہ کو افغانستان کے خلاف سہولتیں فراہم کر کے اپنی ایسی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا تحفظ کر سکیں گے مگر یہ بات بھی خود فربی ہے اس لیے کہ ہماری عسکری صلاحیت میں اضافے اور ایسی پروگرام کے بارے میں امریکہ اب تک جو کچھ کہتا آ رہا ہے، اس کے پیش نظر ہم اس قدر فاصلے سے اپنی ایسی تنصیبات کو امریکی مداخلت سے محفوظ تصور نہیں کر رہے توجہ وہ گوارد، کونکا اور پشاور میں آئیٹھے گا تو پھر ایسی تنصیبات کے تحفظ کی گارنٹی کون دے سکتا ہے؟ اس لیے ہم دیانت داری کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ ہماری ایسی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا تحفظ امریکہ کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنے میں ہے، اسے اپنی داخلی حدود میں برآجمن ہونے کا موقع دینے میں نہیں۔

جزل پرویز مشرف صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ امریکہ کو سہولتیں دینے کی پالیسی سے ہمیشہت کو سنبھال دینے میں مدد ملے گی اور ہمارے معاشری حالات سدھ رجائیں گے۔ میں اس کے جواب میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات ان عرب ممالک سے دریافت کر لیجئے جن کے کندھے پر دس سال سے امریکہ سوار ہے اور اس نے وہاں اپنی فوجیں بٹھار کھی ہیں کہ امریکہ بہادر کی تشریف آوری اور اس کی فوجوں کی آمد سے ان کی معیشت کو لکنا سہارا ملا ہے؟ ان میں سے سعودی عرب کی حالت آج یہ ہے کہ تیل کی دولت سے مالا مال اس ملک کو اپنا بجٹ کا خسارا پورا کرنے کیلئے عمرہ جیسی عبادت کو بزنس کے حساب سے ڈیل کرنا پڑ رہا ہے اور قرضے لینے کیلئے مجبور ہونا پڑا ہے اس لیے ہمارے نزدیک یہ بات بھی خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے کہ امریکہ کو افغانستان کے خلاف فوجی سہولتیں دینے سے پاکستان کی معیشت سدھرنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

حضرتِ محترم! میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے اصل مقصد کو پہچانیں اور اس کا اور اک حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ میرے نزدیک امریکہ کے موجودہ عالمی کردار اور بھاگ دوڑ کے بنیادی مقاصد تین ہیں:

1. ایک یہ کہ دنیا بھر کی جہادی تحریکات کو دہشت گردی کا نام دے کر سختی کے ساتھ کچل دیا جائے اور افغانستان کو اس تمام تر دہشت گردی کا سرچشمہ قرار دے کر طالبان حکومت کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ اپنی مرضی کی حکومت بٹھائی جائے۔

2. دوسرا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں فکری ہم آہنگی اور نظریاتی یونیگلت کے فروع کو سلطی ایشیا ک پھیلنے سے روکا جائے۔ ان اثرات کے وسیع ہونے کے امکانات کو سامنے رکھ کر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ یہ خطہ اگر دوبارہ آٹھا ہو گیا تو بہت بڑی قوت بنے گا اور اسے بھارتی حقوق میں ”مغل امپائر“ کے زندہ ہونے سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اسے روکنے پر امریکہ اور بھارت دونوں متفق ہیں جس کی واحد صورت پاکستان اور افغانستان کی دوستی کو توڑنا ہے اور امریکہ اسے توڑنے کیلئے پاکستان کو افغانستان کے خلاف حملوں میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔

3. امریکہ کا تیسرا مقصد چین کے خلاف حصار قائم کرنا اور پاکستان میں بیٹھ کر پاک چین دوستی میں رخنے ڈالنا ہے۔

تاکہ جیلن اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے قابل نہ رہیں اور امریکہ ان کے حوالے سے آسمانی کے ساتھ من مانی کر سکے۔

ان حالات میں آپ خود سوق لیں کہ جب خداخواستہ پاکستان کے تعلقات جیلن اور افغانستان دونوں کے ساتھ خراب ہو جائیں گے اور مجاهدین کے گروپوں کو بھی دہشت گرد قرار دے کر خود پاکستان کے ہاتھوں گراونڈ کر دیا جائے گا تو خطے میں خود پاکستان کی حیثیت کیا رہ جائے گی اور کیا کل کوئی صاحب یہ کہنے کیلئے کھڑے نہیں ہو جائیں گے کہ کشمیریوں کے ساتھ ہمیں بہت ہمدردی ہے اور ہمیں ان کی فکر، بہت زیادہ ہے لیکن خود پاکستان کی سالمیت ہمارے لیے سب سے مقدس ہے اس لیے کشمیریوں کو بھول جائیے اور پاکستان کے وجود کا تحفظ کیجئے۔

محترم بزرگ اور دوست! میں نے حالات کا نقشہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور میری آپ سے گزارش ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس صورتحال کا جائزہ لیں۔ یہ اسلام کے مفاد کی بات ہے، پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ ہے اور طالبان کی اسلامی حکومت کے مقابلہ کا سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک کی دینی جماعتیں نے اس سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے، وہ بالکل درست اور ملک و ملت کے مفاد کا تقاضا ہے اس لیے سب دوستوں کو چاہئے کہ وہ اس موقف کو زیادہ سے زیادہ پچھلائیں اور دینی قوتوں کو مضبوط کریں کیونکہ اس وقت دین، ملک اور قوم کے تحفظ کا یہی ناگزیر تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

## افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: صدر پرویز مشرف کا سیرت نبوی سے استدلال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۰ ستمبر ۲۰۱۴ء

صدر جزل پرویز مشرف کے خطاب میں یہ بات مجھے اچھی لگی ہے کہ انہوں نے حوالہ اور استناد کیلئے قرآن کریم اور سنت نبوی سے رجوع کیا ہے، ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے سربراہ کا یہی حق بتا ہے کہ وہ قرآن و سنت سے راہنمائی حاصل کرے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں بھی قرآن و سنت کو یہ ریاتی پاٹی اور قوینین کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ البتہ قرآن و سنت سے استفادہ کیلئے ان اصول و ضوابط کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے جو راہنمائی وہدیت کے ان دو سرچشمتوں سے استفادہ کیلئے امت کے جموروں اہل علم کے ہاں مسلم چلے آرہے ہیں۔ ورنہ اگر ہر شخص اپنی مرضی اور فہم کے مطابق قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے واقعات کو اپنے موقف کے حق میں پیش کرنے لگے تو قرآن و سنت راہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہیں گے بلکہ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائیں گے۔

صدر صاحب نے افغانستان پر حملہ میں امریکہ کی معاونت کے جواز میں جناب رسول اللہؐ کے اسوہ حسنہ سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ رسالت مآب نے بھارت کے بعد مدینہ منورہ میں یہودی قبائل کے ساتھ معابدہ کر کے بدر،

احد اور نندق کے معروں میں کفار مکہ کو شکست دی اور اس کے بعد عدیبیہ میں کفار مکہ سے معاهدہ کر کے غزوہ خیر میں بیہودیوں کی شکست کی راہ ہمواری، اس لیے حکمت اور دانش کے تحت کسی کافر قوم سے وقت مصالحت کا جواز موجود ہے۔ صدر مشرف کا یہ استدلال درست نہیں ہے، اس لیے کہ جناب نبی اکرمؐ کے دونوں طرف کافر اقوام تھیں اور دونوں دشمن تھیں۔ آنحضرتؐ نے دونوں سے یہک وقت جنگ کو حکمت کے خلاف سمجھتے ہوئے یہ حکمت عملی اختیار کی مگر یہاں یہ صور تھاں نہیں ہے۔ یہاں ایک طرف کافر قوم ہے اور دوسری طرف مسلمان بھائی ہیں۔ ایک طرف وہ طاقت ہے جس نے گذشتہ نصف صدی میں پاکستان کے ساتھ دوستی کے تمام ترمذ معاہدوں کے باوجود ہر نازک مرحلہ میں پاکستان سے بے وفائی کی ہے، جبکہ دوسری طرف وہ قوم ہے جس نے گرم پانیوں کی طرف سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے قدم روک کر پاکستان کی جغرافیائی سالمیت کا تحفظ کیا ہے۔ ایک طرف وہ ملک ہے جس کے ایجادے میں پاکستان کے جغرافیہ کو تبدیل کرنا اور اسے امیٰ صلاحیت سے محروم کرنا شامل ہے، جبکہ دوسری طرف وہ ملک ہے جس میں طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کا وجود ہی پاکستان کی شمال مغربی سرحد کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس لیے میں صدر جزل پروپر مشرف سے بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ سیرت طیبہ کا حوالہ دینے سے قبل اس بات کا ایک بار پھر جائزہ لے لیں کہ وہ کس کے ساتھ معاہدہ کر رہے ہیں اور کس کے خلاف کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی صدر صاحب اس سوال کا جواب بھی مرحمت فرمادیں کہ جناب رسول اللہؐ اس حکمت عملی کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو کفار مکہ اور بیہود خیر میں سے کس کے زمرہ میں شمار کیا ہے؟

جزل صاحب کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دورِ خلافت میں جب وہ امیرِ شام حضرت معاویہؓ کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور دونوں طرف مسلمان فویس آمنے سامنے ایک دوسرے کے خلاف معزکہ آراء تھیں اس وقت کی سپر پاور و من ایکپاٹ کے بادشاہ قیصر روم نے حضرت معاویہؓ کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہے۔ مگر حضرت معاویہؓ نے اس کے جواب میں جو تاریخی موقف اختیار کیا تھا وہ قیامت تک ایسے معاملات میں مسلم حکمرانوں کیلئے مشعل راہ ہے۔ ان کا یہ جواب تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہے جس میں انہوں نے قیصر روم کو مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ

”حضرت علیؓ کے خلاف میری جنگ دو بھائیوں کی لڑائی ہے جس سے تمہیں فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دوں گا۔ اور اگر تم نے علیؓ کے خلاف فونکشی کی تو علیؓ کے پرچم کے نیچے تمہارے خلاف میدان جنگ میں اترنے والا سب سے پہلا ساپنی معاویہ ہو گا۔“

اور صدر صاحب کو یہ بتانے کی شاید ضرورت نہ ہو کہ یہ اس دور کی بات ہے جب دو مسلمان حکمران ایک دوسرے کے خلاف حالت جنگ میں تھے اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ یہاں تو پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کے رشتہ سے بند ہے ہوئے ہیں، دونوں کے مفادات مشترک ہیں، دونوں ایک دوسرے کے لپتی بان ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ یہی وہ رشتہ ہے جسے توڑنے کیلئے امریکہ اور

بھارت دونوں مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ اس لیے ان حالات میں اگر صدر جزل پرویز مشرف افغانستان کے خلاف امریکی حملوں میں امریکہ کو پاکستان کی زمین یا فضائیہ، اور اس کے فرقی بننا چاہتے ہیں تو یہ ان کی مصلحت کا تقاضا ہو سکتا ہے، یا طالبان کے طرز حکومت سے اپنے مفادوں اور عیش پرستی کو خطہ محوس کرنے والے مراعات یا فائٹ طبقوں کی ضرورت تو ہو سکتی ہے، اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ یا اسلامی تاریخ کی شاندار روایات کا آئینہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔

## افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: صدر پرویز مشرف کی خود فریبی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء

صدر جزل پرویز مشرف نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے جن ترجیحات کا اعلان کیا ہے وہ صرف ان کی نہیں بلکہ پاکستان کے ہر شہری کی ترجیحات ہیں۔ میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں جو پاکستان کی سالمیت اور قوی وحدت کے تحفظ کو دوسرا ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں اور پاکستان کی عسکری اور امنی صلاحیت کو ہر حالت میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ تاثر دینا کہ جو لوگ امریکہ اور افغانستان کے حالیہ تازع کے تنازع میں صدر پرویز مشرف سے اختلاف کر رہے ہیں ان کی ترجیحات اس سے مختلف ہیں، قطعی طور پر غلط بات ہے۔ بات ترجیحات کی نہیں بلکہ انہیں بروئے کار لانے کیلئے طریق کارکی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان ترجیحات پر عملدرآمد کیلئے صدر صاحب نے جو راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے خطاب میں جس طریق کار کا عنديہ دیا ہے وہ ان ترجیحات کے نفاذ و عملداری کا نہیں بلکہ خدا خواستہ انہیں سبو تاثر کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اس طریق کار سے پوری دیانتداری اور شرح صدر کے ساتھ اختلاف کر رہے ہیں۔

صدر پرویز مشرف نے امارت اسلامی افغانستان پر حملوں کیلئے امریکہ کو سہولتیں فراہم کرنے کی پالیسی کے حق میں کہا ہے کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو بھارت یہ کرگز رے گا اور وہ امریکہ کو اس مقصد کیلئے سہولتیں فراہم کرنے کی پیشکش کر چکا ہے، اس لیے ہم بھارت کو سبقت کا موقع نہیں دینا چاہتے کیونکہ اس سے امریکہ بھارت کے ساتھ ہو جائے گا اور ہمارے کشمیر کا کوئی نقصان پہنچنے گا۔

چیزیں بات ہے کہ صدر صاحب کے اس بھولپن پر مجھے ہنسی آتی ہے اس لیے کہ یہ بات وہ شخص تو کہہ سکتا ہے جس نے امریکہ کو پہلی بار دیکھا ہو، اس کی تاریخ، اس کے قوی مزاج سے کوئی واقفیت نہ رکھتا ہو مگر ایسے ملک کے سربراہ کے منہ سے یہ بات بھولپن اور سادگی ہی کہلائے گی جو گذشتہ نصف صدی سے ”امریکہ دوستی“ کے مسلسل چرکے کھارہا ہے۔ امریکہ کے بارے میں یہ توقع رکھنا خود فریبی کی انتہا ہے کہ وہ افغانستان کے خلاف پاکستان کی زمین یا فضا استعمال کرنے کے بعد اس خطہ میں اپنی ترجیحات بدل دے گا اور بھارت کو اپنے مخالفین میں شمار کر کے کشمیر کو آزادی دلوانے کیلئے پاکستان کی سپورٹ کرے گا۔

پاکستان کے ساتھ اس وقت امریکہ کا مفاد صرف اس قدر ہے کہ وہ پاکستان اور افغانستان کی نظریاتی وحدت کو توڑنا چاہتا ہے، ان کی باہمی دوستی کو شتمی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے، پاکستان اور افغانستان کے وسطی ایشیا کے ساتھ روابط کو ختم کرنا چاہتا ہے، اور چین کے خلاف اپنے مجوزہ حصار کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب کچھ حاصل ہوجانے کے بعد امریکہ کی ترجیحات بدستور وہی رہیں گی جو پہلے چلی آرہی ہیں اور جن ترجیحات میں پاکستان کو بھارت پر ترجیح دینا یا مکام از کم اس کے برابر رکھنا بھی امریکی مفادات سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے صدر مشرف اور ان کے ساتھ اس مسئلہ کو پاک بھارت تباہ معاہدہ اور تکمیل کے تناظر میں دیکھنے والے دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی سوچ اور مطالعہ کا دائرہ کشاہد کریں اور وسیع تر عالمی ناظر میں امریکہ کے مفادات، پالیسیوں اور عزم کا جائزہ لیں۔

جزل پرویز مشرف سے زیادہ کون اس بات سے واقف ہو گا کہ عربوں نے بھی اسی غلط فہمی میں امریکی کیمپ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے عروج کے دور میں روس کے کیمپ میں شمار ہونے والے بعض عرب ممالک اسی توقع پر امریکی کیمپ میں پلے گئے تھے کہ ہم اس خطہ میں امریکہ کو سوئیں فرماہم کریں گے تو امریکہ ہمارے ساتھ ہو جائے گا، اور جب امریکہ ہمارے ساتھ ہو گا تو فلسطین کے مسئلہ کے حل کیلئے ہمیں رعایتیں دے گا اور اسرائیل کے مقابلہ میں ہمیں ترجیح دے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ کا ہوا؟ صدر صاحب کو اگر خود واقفیت نہ ہو تو رادر مسلم ملک عرب جہوریہ مصر کے صدر جناب السنی مبارک سے کسی وقت رازداری کے ساتھ پوچھ لیں کہ اسرائیل کے مقابلہ میں ترجیح اور مسئلہ فلسطین کے حل میں تعاون کی توقع پر امریکہ کے ساتھی بننے والے ملکوں کے ساتھ امریکہ بہادر نے کیا سلوک کیا ہے؟

فلسطین کی صورتحال سب کے سامنے ہے، وہاں اسرائیل کے جبروت شدہ، فلسطینیوں کے قتل عام، اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کرنے کی مسلسل سازیں کسی ذی شعور شخص سے مخفی نہیں ہیں۔ جبکہ اسرائیل کے مقابلہ جو عرب ممالک کھڑے ہیں وہ سب کے سب امریکہ کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے امریکہ کو تیل کے چشمیوں پر بالادستی دلائی ہے، فوجی استعمال کیلئے زمین اور اڈے فرماہم کر رکھے ہیں، اور امریکہ کی ہاں ملانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، صرف اس لیے کہ اسرائیل کے مقابلہ میں امریکہ انہیں بھی کچھ رعایت دے دے۔ لیکن امریکی دوستی کے اس فریب نے انہیں معروف محاورے ”دھوپی کا کنٹا گھر کا نہ گھاٹ کا“ کے مصدق اقوام عالم کی برادری میں بے بی اور عبرت کی تصویر بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس لیے جزل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ ہماری ترجیحات بھی دوستی ہیں جو انہوں نے بیان کی ہیں، ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہے تو سب کچھ ہے، ہمیں بھی اس بات کا شعور ہے کہ ملکی میکم کو ملکم کرنا ہماری اولین ضرورت ہے، ہم بھی پاکستان کے حساس مرکزاً یعنی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا ہر قیمت پر تحفظ چاہتے ہیں، اور ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ مسئلہ کشمیر جلد از جلد حل ہو اور امریکہ سمیت سب عالمی قوتوں اس میں انصاف کا ساتھ دیں۔ لیکن اس کا صحیح راستہ امریکہ کے ساتھ قرب بڑھانا اور اسے اپنی داخلی حدود میں عسکری دخل اندازی اور رسائی کے موقع فرماہم کرنا نہیں بلکہ اس کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنا ہے۔ ہم اس وقت انتہائی نازک موڑ پر کھڑے ہیں، جس طرف بھی مڑ گئے واپسی

کیلئے دور دور تک کوئی "بیرون" نہیں ہے، اس لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔

## افغانستان اور پاکستان: سانحہ گیارہ ستمبر کے تناظر میں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۱ء

۱۱ اگست ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے دشہروں نیویارک اور واشنگٹن میں ہونے والے بڑے سانحات میں ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا ہے جس پر دنیا کے ہر شخص کو افسوس ہے، مگر امریکہ کی قیادت اس پر سچ پا ہو کر جس بدحواسی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس نے اہل دنیا کو افسوس اور رنج کے ساتھ ساتھ تجہب اور جیزت سے بھی دوچار کر دیا ہے۔ یونکہ امریکہ کسی ثبوت کی فراہمی کی ضرورت محسوس کیے بغیر اور معاملہ کو کسی غیر جانبدار فورم کے سامنے لائے بغیر از خود عرب مجاهد اسماء بن لاون کو اس کا مجرم قرار دے رہا ہے، اور افغانستان کی طالبان حکومت پر اسماء بن لاون کو بینا و دینے کا الزام عائد کر کے اس پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہے، حتیٰ کہ امریکہ نے اس حملہ میں پاکستان کو شریک کا رتبہ کی دعوت بلکہ ڈمکی دے کر اس کیلئے بھی مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔

ستم ظرفی کی انتہا یہ ہے کہ اس معاملہ میں امریکہ خود ہی مدعی، خود ہی گواہ اور خود ہی رنج کا منصب سنبھالے ہوئے ہے۔ اور امریکی قیادت طالبان کے اس مطالبہ کو انتہائی رعوبت کے ساتھ رد کر چکی ہے کہ اگر اسماء بن لاون کے خلاف کوئی ثبوت ہے تو اسے سامنے لایا جائے، اور کسی ثبوت کے بغیر محض شک اور قیاس آرائی کی بنیاد پر اسے مجرم قرار نہ دیا جائے۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں امریکہ کا موقف انصاف کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا اور اسے ہٹ دھرمی کے سوا اور کسی عنوان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ اصل مقصد یہ نظر آتا ہے کہ امریکہ ان سانحات کو صرف افغانستان کے خلاف کارروائی کیلئے بطور بہمان استعمال کرنا چاہتا ہے، جس کا مقصد:

- امارتِ اسلامی افغانستان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو ختم کر کے وہاں لبرل طرز کی کوئی تبادل مسلمان حکومت قائم کرنا،
- پاکستان کی ایسی تنصیبات اور دیگر حساس عسکری مراکز پر نگرانی کا نظام قائم کرنا،
- اور عوای جمہوریہ یمن کے پڑوں میں امریکہ کی فوجی موجودگی کی راہ ہموار کرنا ہے، جو جنوبی ایشیا کے حوالے سے امریکہ کے ایجادے کا اہم حصہ ہے۔

اس پس منظر میں افغانستان کے خلاف امریکہ کے فوجی عزائم میں اسے تعاون فراہم کرنے کی بات صرف افغانستان کے نہیں بلکہ خود پاکستان کے مفادات کے بھی منافی ہے۔ اور ہم حکومت پاکستان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی تحقیقی فیصلہ کرتے ہوئے ان معروضی حقائق اور ملکی مفادات کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرے گی۔

## سانحہ گیارہ ستمبر پر ایک امریکی مذہبی راہنما کا تبصرہ

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۱ء

نیویارک کے ولڈ ٹریٹ سٹر اور واشنگٹن میں بیننا گون کی عمارت سے انبوشہ طیاروں کے نکرانے سے جو قیامتِ غیری پا ہوئی ہے اس پر سب سے زیادہ حقیقت پسندانہ تصریح خود امریکہ کے ایک پروٹسٹنٹ مذہبی راہنمایجیری فالول نے کیا ہے، جسے روزنامہ نوازے وقت لاہور نے ۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں ”کر سیمین براؤ کا سٹنگ نیٹ ورک“ کے حوالے سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

”نیویارک اور واشنگٹن میں حالیہ حملوں کی ذمہ داری حقوقِ نساں اور شہری آزادی کے گروپوں پر عائد ہوتی ہے اور ہم جنس پرست، اسقاطِ حمل کے حامی، بت پرست اور سیکولر لوگ بھی اس ذمہ داری میں شریک ہیں، اور امریکی زمین پر ان بدترین اور دہشت ناک حملوں کے شاید ہم پوری طرح مستحق ہیں۔ یہ خوزیرِ حملے مزید تباہی کی محض ابتداء ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ اسی طرح پر دے اٹھاتا ہا تو امریکہ کے دشمنوں کو وہ کچھ کرنے کا موقع ملے گا جس کے شاید ہم مستحق ہیں۔ سول بریز یوین میں اس صورت حال کی ذمہ دار ہے اور اسقاطِ حمل کا بھی اس میں عملِ دخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تحسین نہیں اڑایا جاسکتا۔ جب ہم چالیس ملین معمصوں پر کو ضائع کر دیں گے تو اس طرح ہم اللہ تعالیٰ کو ناراضی ہی کریں گے۔ اسی طرح بت پرستی کرنے والے، اسقاطِ حمل اور حقوقِ نساں کے حامی، ہم جنس پرست جنہوں نے ایک تبادل لائف سسٹم بنارکھا ہے، اور وہ سب لوگ جنہوں نے امریکہ کو سیکولر بنانے کی کوشش کی، ہم ان لوگوں کو ہی ان واقعات کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔“

گوبیا پروٹسٹنٹ راہنمایجیری فالول نے آسمانی تعلیمات کی روشنی میں ان حقیقی اسباب کی نشاندہی کی ہے جو قوموں کی بربادی اور ان پر اس قسم کے خداوندی عذاب کا باعث بنتے ہیں۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے صحیح بات کہی ہے اور درست سمت امریکی قوم کی راہنمائی کی ہے۔ لیکن امریکی معاشرہ تو ایک عرصہ ہوا آسمانی تعلیمات سے دستبردار ہو کر سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کو اپنا حاکم مطلق قرار دے چکا ہے، اس کیلئے ان نصیحتوں کی یا حیثیت باقی رہ گئی ہے؟

## امریکہ کو رو سی کرنل کا مشورہ

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ جنگ لاہور ۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان میں پانچ برس تک جنگ لڑنے والے رو سی کرنل یوری شاما نوف کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے امریکہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ افغانستان سے جنگ نہ لڑے، یہ ان کیلئے ویتنام

سے دس گنازیادہ تباہ کرن ملک ثابت ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے لڑنے کیلئے افغانستان جانے والے امریکیوں، ان کی ماوں، بہنوں اور بھائیوں پر ترس آ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں پہلا عظیم پناہ گاہیں ہیں، میزائل افغانوں کا کچھ نہیں بگاہ سکتے، اگر امریکی افغانستان گئے تو افغانوں کو لڑائی کیلئے تیار پائیں گے، انہوں نے روں کے خلاف تباہ کن جنگ لڑنی اور بہت اچھی طرح لڑے۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب روں نے افغانستان میں فوجیں اتنا تھیں اور افغان عوام نے ان کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا تو برطانیہ کی وزیر عظم مارکریٹ تھیچہرے نے بھی اس قسم کا مشورہ روئی لیڈروں کو دیا تھا، اور خود ماسکو جا کر روئی قائدین سے کہا تھا کہ وہ افغانوں سے پنج آزمائی نہ کریں اور ہمارے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ برطانوی استعمار نے بھی بر صیر پاک و ہند پر قبضہ کرنے کے بعد افغانستان پر قبضہ کرنے کیلئے فوجیں بھیجی تھیں مگر انہیں عبرتیک شکست ہوئی تھی، حتیٰ کہ ایک معمر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں صرف ایک برطانوی فوجی زندہ فوج کروائیں آیا تھا جس نے اپنے ساتھیوں کے عبرتیک حشر سے برطانوی افسران کو آگاہ کیا تھا۔ اور پھر برطانیہ عظمیٰ نے افغانستان سے جنگ جاری رکھنے کا ارادہ تزک کر کے افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کر لیا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح روئی لیڈروں نے برطانیہ کے مشورہ کو قبول نہیں کیا تھا اور ان کے تجربہ پر قناعت کرنے کی وجہے خود تجربہ کرنا ضروری سمجھا تھا، اسی طرح امریکی لیڈروں کی شاید برطانیہ اور روں کے تجربہ پر اکتفا نہ کریں اور اپنا الگ تجربہ کرنا چاہیں۔ وہ خود کو دنیا کی واحد سپر پاور سمجھتے ہیں اور اپنا فتح و نقصان خود بہتر سمجھتے ہیں، اس لیے ان سے اس سے زیادہ کیا عرض کیا جا سکتا ہے:

رموزِ	ملکتِ	خوش	خرداں	داند	داند
-------	-------	-----	-------	------	------

## افغانستان پر متوقع امریکی حملہ اور عالمی منظر نامہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء

افغانستان پر امریکہ کے فوری حملہ کا خطہ ٹھیک جانے کے بعد عالمی میڈیا کا رخ ان اسباب و عوامل کی نشاندہی اور ان پر بحث و تھیس کی طرف بدل رہا ہے جو اور لد لڑیڈ سٹر اور بینٹا گلوں کے انتہا کے المناک و اعماق کے باعث بنے۔ اور اس وقت بھارت اور اسرائیل دونوں کی وہ کوششیں ناکام ہوتی نظر آ رہی ہیں جو انہوں نے انتہا کے حداثات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امارتِ اسلامی افغانستان اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کو امریکی حملوں اور مداخلت کی زدیں لانے کیلئے شروع کی تھیں۔ بھارت اور اسرائیل نے اسامہ بن لادن، افغانستان اور پاکستان کے خلاف جس نفرات اُنگیز ہم کا آغاز کیا تھا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اشتغال میں اضافہ ہو، کشیدگی بڑھے اور اس اشتغال کی نھیں ایسا میں امریکہ افغانستان پر چڑھ دوڑے جس کے نتائج سے پاکستان کسی صورت بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن پاکستان کی دینی جماعتیں کی مشترکہ جدوجہد، رائے عامہ کی بیداری، جزل پر ویر مشرف کی حکمت عملی اور اعتدال پسندی، عالمی راہنماؤں اور حلقوں کی مسال کو شنوں کے باعث

اس کا فوری خطرہ ٹل گیا ہے اور جوش و اشتعال کی بجائے ہوش و حکمت عملی کا پھلوخجہ بے لمحہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ بعض سنجیدہ حلقة ہوش اور حکمت عملی کے تحت مستقبل میں متوقع امریکی حملوں کو زیادہ خطرناک قرار دے رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کی جانے والی امریکی کارروائیاں نہ صرف افغانستان کیلئے زیادہ نقصانات کا ذریعہ نہیں گی بلکہ پاکستان کیلئے بھی زیادہ خطرناک ہوں گی۔ لیکن اس کے باوجود فوری کارروائی کے ملے جانے کے امکان کو اس حوالے سے غنیمت سمجھا جا رہا ہے کہ اس سے ہر فریق کو اپنی مرضی کے مطابق صفت بندی کرنے کا موقع ملے گا اور عالمی برادری کو بھی اپنی ترجیحات نسبتاً زیادہ پر سکون ماحول میں از سرنوٹے کرنے کی سہولت حاصل ہوگی۔

بھروسہ تک جنگ کا تعلق ہے وہ ناگزیر ہو چکی ہے۔ مغرب کے رہنماؤں میں اس جنگ کے لیبل کے بارے میں تو اختلاف پایا جاتا ہے مگر جنگ اور لمبی مدت کی جنگ کے ناگزیر ہونے پر مغرب کے تمام لیڈر تلقین ہیں اور اس کیلئے سب تیاریاں کر رہے ہیں۔ امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بوش نے پہلے اسے "صلیبی جنگ" "قرار دیا" مگر بعد میں اس پر معذرت کر دی۔ پہنچنا گون نے افغانستان کیلئے اپنے فوجی آپریشن کا نام "آم پر لیشن انفیٹ جسٹش" رکھا تھا جس کا معنی حقیقی انصاف ہے۔ مگر اس پر اعتراض کیا گیا کہ حقیقی انصاف تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں، چنانچہ یہ نام تبدیل کر کے اب اسے "آم پر لیشن اینڈ یورنگ فریڈم" کا عنوان دیا گیا ہے۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلر یہ اپنے بیانات اور مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں میں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ جنگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ صرف دہشت گردی کے خلاف ہوگی۔ مگر اٹلی کے وزیر اعظم نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ ہماری جنگ اسلام کے خلاف ہے۔ بعض مغربی دانشور اسے "سو لائزشن وار" کہہ رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب اپنی مخالف تہذیبوں سے آخری جنگ کرنے جا رہی ہے۔ جبکہ مخالف تہذیبوں میں اسلام اور چینی تہذیب کو سرفہرست سمجھا جا رہا ہے۔

الغرض اس میں تواحتلاف موجود ہے کہ اس جنگ کو کس عنوان سے تعبیر کیا جائے مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ جنگ ہوگی اور وقتی کارروائی کی بجائے طویل جنگ ہوگی جس کیلئے مغرب پوری طرح تیاری میں ہے اور منظم منصوبہ بندی کے ساتھ نئی صفت بندی کر رہا ہے۔

اس جنگ کا منظر نامہ یہ ہے کہ عالم اسلام کی رائے عامہ اور دینی حلقة ایک طرف ہیں جو امریکہ کی ڈھیکیوں اور جنگی عزائم کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تصور کرتے ہیں اور اس کے خلاف مذا آراء ہو رہے ہیں۔ مگر افغانستان اور ایران کو چھوڑ کر باتیں کم و بیش تمام مسلمان ممالک کی حکومتیں اپنے عوام کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر امریکہ کی حمایت میں بلکہ اس کے کیمپ میں کھڑی ہیں۔ صرف ایران واحد ملک ہے جو امریکی کیمپ کی مسلسل کوششوں کے باوجود افغانستان کے خلاف امریکی پروگرام میں شریک ہونے کیلئے ابھی تک تیار نہیں ہوا، غالباً امکان یہ ہے کہ اسے امریکی کیمپ میں لانے کی کوشش آئندہ بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ جبکہ باقی مسلم حکومتوں میں اس بات کی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ ان میں سے کون امریکہ کا زیادہ وفادار ہے اور کون اس جنگ میں امریکہ اور اس کے مغربی کیمپ کو زیادہ سہولتیں فراہم کر سکتا ہے۔

ان مسلمان حکومتوں کو یہ خطرہ ہے کہ عالم اسلام میں تیزی سے ابھرتے اور پھیلتے ہوئے جن رجحانات کو وہ امریکہ اور مغربی کیمپ کی پیروی میں بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے رجحانات قرار دے رہے ہیں وہ مسلم ممالک کے موجودہ

سیاسی ڈھانچوں اور نواب آبادیاتی نظاموں کے خاتمہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ اور یہ رجحانات افغانستان کی طرح دیگر مسلم ممالک میں بھی مروج ریاتی ڈھانچوں کی توڑ پھوڑ اور اسلامی تعلیمات پر مبنی نئے انتقالی نظام کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہ مسلم حکومتیں اپنے سیاسی وجود اور نواب آبادیاتی ریاتی ڈھانچوں کے تحفظ کیلئے خود کو اس بات پر مجبور پار ہی ہیں کہ وہ امریکہ کا ساتھ دیں اور یہ حکومتیں اپنے ملکوں کے عوام کے جذبات و احساسات کو کچلتے ہوئے انہی کے خلاف امریکی کیپ میں کھڑی ہیں۔ حالانکہ یہ مجبوری ان کی خود ساختہ ہے جو انہوں نے امریکہ اور دیگر مغربی ملکوں سے مفادات حاصل کر کے اور بین الاقوامی قرضوں کے جال میں پھنس کر خود پیدا کی ہے۔ اور اگر وہ اپنے ملکوں کی رائے عامہ کے ساتھ کھڑے ہو کر اور عوامی رجحانات کا ساتھ دے کر اس جال اور مجبوری کو توڑنا چاہیں تو یہ بات ان کیلئے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس کشمکش میں ایک اور بات مزید نکھر کر سامنے آئی ہے کہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی حکومتیں جمہوریت اور رائے عامہ کے جن اصولوں کا مسلسل پر چار کر رہی ہیں وہ محض ڈھونگ ہیں۔ انہیں مسلم ممالک کی رائے عامہ، مسلم عوام کے شہری حقوق، اور ان ممالک میں جمہوریت سے کوئی لچکی نہیں ہے۔ ہم ایک عرصہ سے یہ بات کہتے آ رہے ہیں کہ جمہوریت، رائے عامہ اور شہری حقوق کے نعرے صرف ہاتھی کے دھانے کے دانت ہیں۔ جبکہ اس کے کھانے کے دانت اور ہیں جنہیں وہ صرف ضرورت کے وقت ظاہر کرتا ہے اور اپنا کام نکال لیتا ہے۔

چند روز قبل جب امریکہ کی طرف سے پاکستان پر سخت دباؤ تھا کہ وہ اس بات کا ہاں یا اس میں فوری جواب دے کے وہ افغانستان کے خلاف جملوں میں امریکہ کا ساتھ دے گایا نہیں تو ایک امریکی رہنماؤں کے ٹیلی و بیزن انٹر ویو میں اس طرف توجہ دلائی گئی کہ پاکستان کی رائے عامہ اس بات کی حمایت نہیں کر رہی کہ حکومت پاکستان افغانستان کے خلاف امریکی جملوں میں افغانستان کے خلاف فرقی بنے۔ اس پر اس امریکی لیڈر نے ملا تامل جواب دیا کہ ”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔“ اس کا مطلب واضح ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ امریکی لیڈروں کی نظر میں یہ حیثیت نہیں رکھتی کہ پاکستان کی حکومت کسی بنیادی فیصلے کے موقع پر اس کا بھی لحاظ کرے۔ اگرچہ حکومت پاکستان نے ایسا نہیں کیا اور مشرف حکومت نے اپنی حکمت عملی طے کرتے وقت امریکی دباؤ اور پاکستانی رائے عامہ کے رجحانات دونوں کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس سے مغربی ممالک کے اس طرز عمل کی ایک بار پھر نشاندہ ہو گئی ہے کہ ان کے نزدیک جمہوریت، رائے عامہ اور شہری حقوق کے نعروں کی حیثیت اصولوں کی نہیں ہے کہ وہ ہر جگہ یہاں لا گو ہوں بلکہ یہ صرف ہتھیار ہیں جنہیں ضرورت کے وقت اور ضرورت کے مطابق کسی بھی جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس بھرمان میں سب سے زیادہ مالی اسلامی سبر براہ کافرنس تنظیم (او آئی سی) کے بارے میں ہوئی۔ اس کے سیکرٹریٹ نے اپنے طرز عمل سے عام مسلمانوں کے ان تاثرات کی تصدیق کر دی کہ اس تنظیم کا رول بین الاقوامی برادری میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا نہیں ہے بلکہ مسلمان ممالک میں بین الاقوامی قوتوں اور خاص طور پر امریکی مفادات کی نمائندگی اور تحفظ کا ہے۔ ورنہ اس قدر علیین بھرمان میں بھی اس کی خاموشی کسی طرح سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اب سننا ہے کہ پاکستان کی کوششوں سے مسلم ممالک کے وزراء خارجہ کا اجلاس بلانے کیلئے تحریک ہو رہی ہے۔ مگر وہ لد ٹریئیٹ سنشر اور پینٹا گلوں کے سامنات کے فوراً بعد عالمی سطح کے بھرمان کے آغاز اور شدت کے دور میں او آئی سی کو باہمی

مشاورت اور عالم اسلام کی راہنمائی کے لیے جس طرح متحرک ہونا چاہیے تھا اس کے فقدان نے عام مسلمانوں کے ذہنوں میں اس تنظیم کی افادیت کو اور زیادہ مشکوک بنادیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ او آئی سی متحرک کردار ادا کر کے عالم اسلام کی مشکلات میں کمی کر سکتی ہے مگر اس کیلئے شرط یہ ہے کہ امریکہ کی چھتری سے نکل کر یہ تنظیم آزاد اور خود خنوار ادارہ کی حیثیت سے اپنے کردار کا تعین کرے۔

## سانحہ گیارہ ستمبر: لندن میں علماء کا مشترکہ اعلامیہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء

لندن پہنچتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ولڈ ٹریڈ سٹر اور پیٹنٹاگون کے سانحات کے بعد عالمی میڈیا کی ہمس جہتی یلغار اور شدید امریکی ردعمل کے اظہار نے مسلمان حقوقوں کو اس حد تک ششدیر کر دیا ہے کہ انہیں کسی اجتماعی اور متوازن موقف اور طرزِ عمل پر لانے کیلئے خاصی محنت کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی نمائندگی میں نمایاں طور پر دو قسم کی آوازیں میڈیا میں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک طرف وہ آواز ہے جسے انتہا پسندانہ اور جذبائی قرار دیا جا رہا ہے اور اس کے نتائج سے یہاں کے مسلمان خطرات محسوس کر رہے ہیں۔ اور دوسری آواز خالعمنا معدرات خواہاں ہے جس کا مقصد دینی حقوقوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے امریکہ کے موقف اور پروگرام کی اعلانیہ حمایت ہے۔ جبکہ ان دونوں کے درمیان معتدل اور متوازن موقف کیلئے کوئی سنجیدہ کام نہیں ہو رہا جو کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کی غالب اکثریت کا موقف ہے لیکن اس کے اظہار کی کوئی منظم صورت سامنے نہیں آ رہی۔

اس احساس کے تحت پہلے لندن میں اور پھر منگھم میں ولڈ اسلامک فورم کے ذریعے احباب سے ملاقاتوں اور مشاورت کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں جمیعت علماء برطانیہ، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، جمیعت الحدیث برطانیہ، یوکے اسلامک مشن، جماعت اہل سنت برطانیہ، مرکزی جمیعت علماء برطانیہ اور دیگر اہم جماعتوں کے قائدین سے صلاح مشورہ کے بعد ۲ ستمبر کو پاکستان میں یومِ بیہقی کے موقع پر منگھم میں مولانا بوتان قادری کی صدرارت میں مختلف دینی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ اس میں اگلے ہفتے کے دوران تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور دینی حقوقوں کا مشترکہ اجلاس وسیع پیمانے پر طلب کرنے کا فیصلہ ہوا جس کیلئے مولانا بوتان قادری، مولانا احمد ادیحی اور قاری عبد الوافی پر مشتمل رابطہ کمیٹی قائم کی گئی جبکہ موجودہ حالات کی روشنی میں مندرجہ ذیل مشترکہ اعلامیہ کی ابتدائی طور پر منظوری دی گئی۔

• ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن کے سانحات میں بے گناہ انسانوں کی موت پر ہر شخص کو دکھ ہے اور ہم سب متاثرہ خاندانوں اور امریکی عوام کے دکھ میں شریک ہیں۔

• دنیا کا کوئی مذہب اور مہندب فلسفہ دہشت گردی اور بے گناہ انسانوں کی خوزیری کو وہ انہیں رکھتا اور اسلام بھی امن و سلامتی کے مذہب کی حیثیت سے اس کا روادار نہیں ہے۔ اس لیے دہشت گردی کے خاتمه کیلئے

مہم کوئی بھی شروع کرے اسے دنیا کے تمام امن پسند لوگوں کی طرح مسلمانوں کی حمایت بھی یقیناً حاصل ہوگی۔

دہشت گردی کے اسباب و عوامل، محکمات اور پس منظر کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف دہشت گردی کے خاتمه کی مہم یک طرفہ اور ادھوری ہوگی جس کے تناخ شبت کی بجائے منفی برآمد ہوں گے اور دہشت گردی کا دائرہ وسیع ہو گا۔ اس لیے یہ ناگزیر بات ہے کہ دہشت گردی کے خلاف مہم کے اهداف میں دہشت گردی کے اسباب و عوامل کے خلاف مہم کو بھی شامل کیا جائے تاکہ بات مکمل اور منطقی ہو اور تمام اقوام اس میں شریک ہو سکیں۔

- غاصب اور مسلط اقوام کے تسلط کے خلاف آزادی اور خود مختاری کی جگہ لڑنے والی اقوام مثلاً فلسطین، کشمیر، چینیا وغیرہ کی مسلح جدوجہد کا دہشت گردی کے اطلاق سے استثناء و امتیاز ضروری ہے۔ ورنہ مظلوم اور زیر تسلط اقوام کی آزادی کیلئے بین الاقوامی اصول اور عالمی حمایت بے معنی ہو کرہ جائے گی اور دہشت گردی کے خلاف چالائی جانے والی مہم مظلوم اقوام کو مزید دبانے کا ذریعہ بن جائے گی۔

- اسامہ بن لادن کی طرف سے اس تبر کے سامنات میں ملوث ہونے کی واضح تردید کے بعد کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اسامہ کو مجرم قرار دینا اور اسے یا اس کی بنیاد پر افغانستان کی طالبان حکومت کو کسی کارروائی کا نشانہ بنانا انصاف کے مسلم اصولوں کے منافی ہو گا جس کا پوری دنیا میں شدید ر عمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایک بین الاقوامی فورم تشكیل دیا جائے جس میں سلامتی کو نسل، او آئی سی اور عوامی جمہوریہ چین کی باضابطہ نمائندگی ہو اور اس فورم کے سامنے متعلقہ ثبوت لا کر اس کی تجاویز اور فیصلوں پر عملدرآمد کا ہتمام کیا جائے۔ اس کے بغیر کوئی بھی کارروائی انصاف کی بجائے انتقام پر منی قرار پائے گی۔

- پاکستان کی سالمیت و وحدت اور قومی خود مختاری نیز وطن عزیز کی عسکری و ایمنی صلاحیت کا تحفظ سب امور پر مقدم ہے۔ اور حکومت پاکستان کے ہر ایسے اقدام کی بھروسہ حمایت تمام پاکستانیوں کی ذمہ داری ہے جس کا مقصد پاکستان کی نظریاتی حیثیت، سالمیت، وحدت، خود مختاری، عسکری صلاحیت و ایمنی مرکزی حفاظت، اور وطن عزیز کو یہ ورنی مداخلت و اثرات سے بچانا ہو۔ ہم پاکستان کی حکومت، سیاسی جماعتوں اور دینی حلقوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کی بجائے باہمی مشاورت اور اعتماد کے ساتھ پاکستان کو اس سنگین بحران سے نکالنے کیلئے مشترکہ جدوجہد کریں۔

- او آئی سی، رابطہ عالم اسلامی، مؤتمر عالم اسلامی اور عالم اسلام کے دیگر بین الاقوامی اداروں کو اس موقع پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے کی بجائے تحرک ہونا چاہیے اور اس سنگین بحران میں عالم اسلام کی راہ نمائی کے ساتھ ساتھ امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے، جنگ کے امکانات کو روکنے، اور

- دہشت گردی کے خلاف مجوزہ ہم کو صحیح رخ پر ڈالنے کیلئے موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔
- برطانیہ اور یورپ میں مقیم مسلمانوں میں بھتی اور ہم آنٹنی کے فروع کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔
- اس لیے تمام مکاتب فکر کی دینی و سیاسی جماعتیں کی ذمہ داری ہے کہ وہ باہمی رابطہ و مشاورت میں اضافہ کریں اور مسلمانوں کے ملی جذبات کی باوقار نمائندگی کے ساتھ ساتھ یورپ کی مقامی آبادی اور مسلمانوں کے تعلقات میں کسی بھی طرف سے رخنہ پیدا کرنے کی نہ موم کوششوں سے باخبر رہیں۔ نیز مقامی آبادی کے ذمہ دار حقوقوں اور شخصیات کے ساتھ روابط استوار کر کے انہیں اعتماد دلائیں کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اور مسلمان امن پسند شہری ہیں۔ اور یہ کہ مسلمان نہ صرف دہشت گردی کے خلاف ہر سنجیدہ ہم میں تعاون کیلئے تیار ہیں بلکہ دہشت گردی کے اسباب و حرکات کے خلاف قوم متحدة کی مشترکہ جدوجہد کو بھی ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ دنیا میں حقیقی امن صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے۔
  - یہ بھی وقت کا تقاضا ہے کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے استحکام کیلئے ملک میں فوری طور پر نظامِ مصطفیٰ نافذ کیا جائے اور پاکستان کے خلاف قادیانیوں اور دیگر سازشی گروہوں کی سرگرمیوں پر کثری نظر رکھی جائے۔

## کیا امریکہ عالمی قیادت کا اہل ہے؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء

ایران کے روحاں پیشوا آیت اللہ خامنہ ای نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم افغانستان پر حملہ کیلئے امریکہ کی کسی قسم کی مدد نہیں کریں گے اور ہم آنٹنی کے خلاف ہیں کیونکہ ہمارا مسلم پڑوں ملک پہلے ہی مفلوک الحال ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف ہم یا میں کیلئے کسی عالمی ہم کی قیادت کا اہل نہیں، امریکہ کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ امریکہ ایک طرف عالمی تعاون کیلئے بہت زیادہ امیدیں والبستہ کر رہا ہے جبکہ دوسری طرف عالمی ممالک کی تعمیم ملوظ نہیں رکھ رہا جو ایک نفرت انگیز رویہ ہے۔ انہوں نے امریکی صدر کے اس بیان پر تقدیم کی جس میں امریکی صدر نے تمام ممالک سے کہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں یا دہشت گروں کے ساتھ ہیں۔ ایرانی رہنماء نے کہا کہ نہ ہم امریکہ کے ساتھ ہیں اور نہ دہشت گروں کے ساتھ ہیں کیونکہ امریکہ کے ہاتھ صیہونی ریاست کے مظالم اور جرائم سے داغدار ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایرانی رہنماء کے خیالات موجودہ حالات میں عالم اسلام کی رائے عامہ کے جذبات کی صحیح ترجیحی کرتے ہیں لیکن ان پر تبصرہ سے قبل ایران کے حوالے سے ایک اور خبر ملاحظہ فرمائیں کہ گذشتہ روز برطانوی وزیر خارجہ جیک شرافت ہر ان کا دورہ کرنے کے بعد اسرائیل پہنچ تو وزیر اعظم ایریل شیرون نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا

اور اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون بیجنز نے بھی برطانوی وزیر خارجہ کے اعزاز میں دیا جانے والا عشا یہ منسوج کر دیا۔ اس پر برطانوی وزیر عظم ٹوپی بلیزرنے فون پر براد راست اسرائیلی وزیر عظم سے بات کی جس کے بعد برطانوی وزیر خارجہ کی اسرائیلی وزیر عظم سے ملاقات ہو سکی۔ اسرائیلی رہنماؤں کے غصے کی وجہ دورہ ایران کے موقع پر ایرانی اخبارات میں شائع ہونے والا برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کا ایک مضمون بناء ہے جس میں انہوں نے امریکہ میں دہشت گردی کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

”دہشت گردی کے فروغ میں یہ غصہ بھی کار فرماء ہے کہ فلسطین میں کئی سالوں سے جو واقعات رونما

ہو رہے ہیں اس پر غصہ و ناراضی پائی جاتی ہے۔“

خبر کے مطابق اسرائیلی حکمران اس جملے پر بہت زیادہ سچ پا ہوئے ہیں اور انہوں نے محسوس کیا ہے کہ فلسطین میں رونما ہونے والے تشدد کی ذمہ داری اسرائیل پر ڈالی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ولڈ ٹریڈ سنٹر اور بیننگاگوں کے دھماکوں کی دھول بیٹھنے کے بعد ان اسباب و عوامل پر غور کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے جو حالات کو اس انتہا پر لانے کا باعث بنے ہیں اور ان اسباب و عوامل میں اسرائیل کا کردار بھی دھیرے دھیرے نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید تاریخ کے استاذ مارک المٹڈ کا ہے جس میں انہوں نے اسرائیلی وزیر عظم شیرون کو سور کا دماغ رکھنے والا اور انتہا پسند قرار دیتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے کہا ہے کہ

”انہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امریکہ کی حمایت کے بغیر اسرائیل کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اگر امریکہ اس کی پچاس سال سے بھر پور حمایت نہ کر رہا ہوتا تو وہ کب کاختم ہو جا کہا ہوتا۔ اس لیے اسے امریکہ کی راہ میں روٹا بننے کی بجائے تعاون کا رویہ اپنانا چاہیے۔ اپنی بقا، دفاع اور معاشی خوشحالی کیلئے وہ امریکی امداد کا محتاج ہے، اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ گیارہ تمبر کے حداثے میں جتنے امریکی مارے گئے ہیں اتنے اسرائیلی ۱۹۴۸ء سے اب تک ہونے والی تمام جنگوں میں نہیں مارے گئے۔“ وولد ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے والے صرف ایک جہاں میں جتنے مسافر مارے گئے اتنے اسرائیلی پی ایل او، حماں یا حزب اللہ کے حملوں میں نہیں مرے۔“

ہمارے خیال میں امریکہ میں ہونے والی مبینہ دہشت گردی کے اسباب و محکمات کی نشاندہی اور ان میں اسرائیلی کردار کی اہمیت کے حوالے سے برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کا مذکورہ مضمون اور برطانوی اخبار ڈلی میل میں شائع ہونے والا پروفیسر مارک المٹڈ کا یہ تبصرہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے ان نئے رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے جو اگرچہ پہلے بھی موجود تھے گردنے ہوئے تھے کہ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی مسلسل پشت پناہی اور تعاون کے اثرات امریکہ کے حق میں ثابت نہیں ہیں۔ البتہ گیارہ تمبر کے واقعات کے بعد دیگر سمجھیدہ دانشور بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ دہشت گردی کے خاتمه کیلئے مشرق و سطحی میں اسرائیلی کردار کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کی طرف برطانوی وزیر خارجہ نے

اپنے مذکورہ بالامضوں میں اشارہ کیا ہے۔ یقیناً اسرائیل کے اس کردار کو نمایاں کرنے اور عالمی رائے عامہ کو اس کی طرف متوجہ کرنے میں ایرانی حکومت کے دوٹوک موقف اور جرأت مندانہ طرز عمل کا بھی دخل ہے بلکہ موجودہ تناظر میں یہ کریٹ ایران ہی کو جاتا ہے کہ اس نے اسرائیل کو اس موقع نے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا اور دہشت گردی کے فروغ میں اسرائیل کردار کو نمایاں کر کے عالمی راہنماؤں اور دانشوروں کو اس بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ہمیں ایرانی پیشواعجنب آیت اللہ خامنہ ای کے اس ارشاد سے بھی اتفاق ہے کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف یا عالمی امن کے حق میں کسی مہم کی قیادت کا اہل نہیں ہے کیونکہ اس کا اپنਾ کردار دوہرے پن کا حامل ہے اور اس کے اپنے ہاتھ دہشت گردی کی سرپرستی اور معاونت سے داغدار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کے پاس اسباب و سائل کی فراوانی ہے۔ دولت، اسلحہ، تیکنالوجی اور دنیا بھر میں معاونین اور حمایتیوں کا ایک وسیع حلقة اسے میسر ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس کا دوہر امعیار و کردار کسی عالمی مہم میں اس کی قیادت کی اہلیت کو منکوک بنا دیتا ہے۔ کیونکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ

1. امریکہ خود کو نسل پرستی اور دہشت گردی کا مخالف قرار دیتا ہے لیکن وہ اسرائیل کی نسل پرست اور دہشت گرد حکومت کی مسلسل اور مکمل پشت پیاسی کر رہا ہے۔

2. امریکہ اقوام متحده کے فیصلوں کو بزور قوت نافذ کرنے کا علیحدہ دار ہے لیکن کشمیر کے بارے میں اقوام متحده کے فیصلوں اور وعدوں کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔

3. امریکہ شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کا پرجم اٹھائے ہوئے ہے لیکن خلیج عرب کے ممالک میں اس کی فوجی موجودگی ان ملکوں کے عوام کے شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کی بھائی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

4. امریکہ رائے عامہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اسی کو کسی ملک کے فیصلوں کی بنیاد قرار دیتا ہے لیکن موجودہ مہم میں امریکہ کا ساتھ دینے کے بارے میں پاکستان اور دیگر بہت سے ممالک کی رائے عامہ کی قطعاً کوئی پرواہ کیے بغیر ان حکومتوں پر مہم میں شامل ہونے کیلئے دباؤ ڈالے ہوئے ہے۔

5. امریکہ قوموں کی آزادی اور ممالک کی خود مختاری کے احترام کا ذہنی دراپیٹتا ہے لیکن دہشت گردی کے خلاف خود اپنی طے کردہ مہم میں دنیا بھر کے ممالک کو ”ساتھ دوورہ دشمن سمجھے جاؤ گے“ کے خالص فرعونی لمحے میں دھماکا کر اس نے اقوام و ممالک کی آزادی و خود مختاری کا مذاق اڑایا ہے۔

ان حالات میں ایرانی پیشواعجنب آیت اللہ خامنہ ای کا یہ ارشاد کہ ”امریکہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کی قیادت کا اہل نہیں“ صرف ان کے اپنے جذبات کا اظہار نہیں بلکہ عالمی رائے عامہ بالخصوص دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں کیلئے دعوت فکر بھی ہے جسے نظر انداز کر دینا اسرانا انصافی اور زیادتی کی بات ہوگی۔

دہشت گردی کا کوئی بھی حامی نہیں ہے اور دنیا کے سب باشمور انسان اس کے خاتمہ کیلئے کردار ادا کرنے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن دہشت گردی کے ساتھ ساتھ اس کے اسباب و مجرکات اور عوامل کی بیچ کئی بھی ضروری ہے۔ اور اس عالمی مہم

کی قیادت کیلئے کسی ایسے ملک کو آگے آنا چاہیے جس کا پناہا من صاف ہو۔ ہیر و شیما، ناگا ساکی، ویتمان، فلسطین، افغانستان، اور سوڈان کے نبنتے شہریوں پر برم بر سانے والے اور مشرق و سطح کے عوام کی سیاسی آزادیوں اور شہری حقوق کا خون کرنے والے ملک کے ہاتھ میں دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کی قیادت کا پرجی آخ رس طرح دیا جا سکتا ہے؟

## عالیٰ ابلاغیاتی گھنٹن میں تازہ ہوا کا جھونکا

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۵ اکتوبر ۲۰۱۴ء

لندن کے ایک اخبار کی خبر ہے کہ امریکی حکومت نے عربوں کے سامنے اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کیلئے الجزیرہ ٹی وی پر وقت خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی ورلد اسلام فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری نے مجھے منگھم فون کیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میڈیا اور میں بھی مجدد اللہ تعالیٰ مسلمان اس سطح پر آگئے ہیں کہ الجزیرہ ٹی وی نہ صرف مغربی ذرائع ابلاغ کا مقابلہ کر رہا ہے کہ بلکہ امریکہ تک کو اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

الجزیرہ ٹی وی خلیج عرب کی ریاست قطر کا ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل ہے جس کی نشریات عربی میں ہوتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ اس نے خربوں تک رسائی اور انہیں بروقت دنیا کے سامنے لانے کی تکنیک میں اس حد تک مخت اور تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے کہ مغرب کے اشٹری ٹی وی چینل افغانستان کے بارے میں اس کے حوالے سے خبریں دینے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ اس میں بنیادی طور پر اس بات کا بھی دخل ہے کہ طالبان حکومت نے صرف الجزیرہ ٹی وی کو ہی افغانستان میں روپرٹنگ کی اجازت دے رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ذہانت، تکنیک اور ضروری وسائل کے بروقت استعمال نے الجزیرہ کو عالمی ذرائع ابلاغ کی صفت میں لاکھڑا کیا ہے۔

یہاں (برطانیہ) کے عام مسلمان جب سی این این اور بی بی سی سمیت بہت سے ٹی وی چینلوں پر ”خاص پا جزریہ“ کی پٹی کے ساتھ روزانہ خبریں اور روپرٹیں دیکھتے ہیں تو انہیں خو شگوار حیرت ہوتی ہے اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ کی صفت میں ایک چینل ایسا بھی شامل ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ کے یک طرف پر اپیکنڈے اور روپرٹنگ کو نیشن کر سکتا ہے۔ جبکہ بہت سے لوگوں کا تاثر ہے کہ اس بار امریکی حملوں اور افغانستان کے خلاف مغربی مہم کے بارے میں عالمی رائے عامد کے ایک بڑے حصے نے جو احتیاجی روشن اختیار کی ہے اور خاص طور پر عرب ممالک میں احتجاج و اضطراب بلکہ مزاحمت و انکار کے جو رجنات ابھر رہے ہیں ان کے پس منظر میں بھی الجزیرہ ٹی وی کی کاوش کا فرمانظر آ رہی ہے۔

میں نے الجزیرہ ٹی وی کی کاوش کا فرمانظر آ رہی ہے اور مجھے اس کی یہ روشن پسند آئی ہے کہ اس نے مغربی چینلوں کی طرح تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرنے کی بجائے تمام متعلقہ پہلوؤں کو اپنے ناظرین کے سامنے رکھا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں عرب مجاهد امام سہیں لادن کا اخزو یو پیش کیا ہے وہاں برتاؤںی وزیر عظم ٹوٹی بلیز کو بھی اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کا پورا موقع فراہم کیا

ہے۔ اس کی متوازن پالیسی کی وجہ سے اس پر لوگوں کا اعتماد بڑھا ہے اور اسے بہت سے دیگر ٹوی جیٹلر کیلئے خبروں اور رپورٹوں کے مانذکی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی خوشی کی وجہ اور بھی ہے کہ وہ اور راقم الحروف گذشتہ دس برس سے ”ورلد اسلامک فورم“ کے پلیٹ فارم سے حصہ واپس کر رہے ہیں کہ آج کا دور میڈیا کا دور ہے جس میں میڈیا اور لانگ جنگ ہتھیاروں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ منصوری صاحب تو میڈیا کو کسی بھی جنگ کا ”مقدمۃ الجیش“، یعنی ہراول دستہ قرار دیتے ہیں۔ امر واقع بھی یہی ہے کہ اگر آج کی ترقی یافتہ اقوام کسی ملک یا قوم کے خلاف جنگ کا فیصلہ کرتی ہیں تو پہلے میڈیا اور پروپیگنڈا کی طاقت سے اسے دنیا کے سامنے مجرم کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں اور پھر اسے بدنای کے شکنچ میں پوری طرح کس کر ہتھیاروں کی ضرب لگانا شروع کرتی ہیں۔ خلائقی جنگ میں ایسا ہی ہوا تھا اور اب بھی مغرب کا یہی ارادہ اور پروگرام تھا انکر الجریہ ٹوی آئڑے آگیا اور اس نے تصویر کا دوسرا رخ اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا کہ اب مغربی حکومتوں اور ذرائع ابلاغ کیلئے بھی پکڑنے والی مشکل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ حکومت نے امریکی ریڈیو اور ٹوی دی چینز پر امارتِ اسلامی افغانستان کے امیر ملا محمد عمر اور اسامہ بن لادن کے انشرو یونٹ کرنے پر پابندی لگانا چاہی تو ان کیلئے اس پابندی کو قبول کرنا ممکن نہ رہا۔

اس سے قبل یہ خبر بھی سامنے آچکی ہے کہ امریکی وزارت خارجہ نے واکس آف امریکہ کو ہدایت کی ہے کہ طالبان حکومت کے امیر ملا محمد عمر اور دیگر طالبان لیڈروں کے بیانات نشر نہ کیے جائیں کیونکہ امریکی حکومت اسے مناسب نہیں سمجھتی۔ اس کے جواب میں واکس آف امریکہ کے صحافیوں نے اسے آزادی رائے اور اظہار رائے کے حق کے منافی قرار دیتے ہوئے اس پر احتجاج کیا ہے۔ الجریہ ٹوی اور واکس آف امریکہ کے بارے میں امریکی حکومت کے اس طرز عمل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رائے اور اس کے اظہار کی آزادی کا نہر مغرب کے نزدیک کسی اصول یا اخلاق کے حوالے سے نہیں بلکہ ہتھیار کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جوباتِ مغرب کے حق میں ہو سے پیش کرنے اور پھیلانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو لیکن جوباتِ مغرب کے مفاد کے خلاف ہو تو اس میں کلام ہے کہ اس کے اظہار کی آزادی ملنی چاہیے یا نہیں۔

مل محمد عمر اور اسامہ بن لادن کو ہی لے لیجیے کہ اگر امریکی حکومت کے موقف کو وقت طور پر تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کی حیثیت صرف ملزم کی بنتی ہے کہ امریکہ نے ان پر ایک فرد جرم عائد کی ہے۔ اسے نہ کسی عدالت میں ٹرائل کیا گیا ہے، نہ کسی فورم پر اس کے ثبوت پیش کیے گئے ہیں، اور نہ ہی دوسرے فریق کو صفائی کا موقع دیا گیا ہے۔ لیکن امریکی قیادت نے یہ سارے مراحل از خود طے کر کے یعنی خود ہی مدعی، خود ہی گواہ اور خود ہی نجج بن کر سزا دینے کیلئے کوڑے بھی بر سانے شروع کر دیے ہیں۔ اور امریکہ بہادر کو اصرار ہے کہ جنہیں وہ ملزم قرار دے رہا ہے انہیں اپنی بات کہنے کا موقع نہ دیا جائے اور دنیا کا کوئی کوئی یو بیٹی ٹوی ایڈیشن کی نفعی کر رہے ہوں، اور اپنی صفائی پیش کر رہے ہوں۔

اب عالمی منظر بدل چکا ہے، لوگ دوسری طرف بھی دیکھ رہے ہیں، ان کی باتیں بھی سن رہے ہیں اور ان کے

موقف اور مجبور یوں پر بھی غور کر رہے ہیں۔ اس لیے طاقت، طاقت اور محض طاقت کے بل پر دنیا سے کوئی بات منوٹا ممکن نہیں رہا۔ اور امریکہ بہادر کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ طاقت اور اسلحہ کے بل پر کسی کو وقتی طور پر دبایا، عارضی طور پر چپ کر ادینا، اور کچھ عرصہ کیلئے اٹھنے کے قابل نہ رہنے دینا تو ممکن ہے اور شاید افغانستان میں امریکہ ایسا کر بھی گزرے لیکن دباؤ، ہمکی اور تشدید کے ذریعے سے کسی سے بات منوایا ممکن نہیں ہے۔ خلیج میں اس نے تجوہ کر لیا ہے جہاں اس نے عراق پر مسلسل بمباری کر کے اسے تباہ حال کر دیا اور جہاں اس کی فوجیں آج بھی بر اجمن ہیں۔ لیکن اس کے سب سے بڑے اتحادی ملک سعودی عرب کی طرف سے فوجی اڈے دینے سے انکار اور برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیز کو سعودی عرب کے دورہ سے روک دینے اور نیز چھوٹی سی ریاست قطر میں میڈیا کے اتنے بڑے مورچے کا قیام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خلیج کے حوالے سے اس کی پالیسیاں دولت کی لوٹ مار سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکیں اور اس خطہ میں اس کا مستقل ایجنس آج بھی سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ اس لیے امریکہ آگر اس تجوہ کو وظی اور جنوبی ایشیا میں بھی دہرانا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے دہرانے لیکن یہ بات اسے نوٹ کر لئی چاہیے کہ نشانجہ کے لحاظ سے یہ تجوہ بھی پہلے سے خلاف نہیں ہو گا بلکہ اس کا دورانیہ بھی شاید اس سے بہت کم ہو۔

خیر بات انجیرہ ہٹی وی کی ہسور ہی تھی کہ اس نے عالمی میڈیا کے مجاز پر مغربی ذرائع ابلاغ کی بکھر فہم کا راستہ روک دیا ہے اور اب اس نے ایک ماہ بعد انگلش چینل کے آغاز کا اعلان کر کے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا ہے جس پر ہم انجیرہ ہٹی وی کے کار پر دازان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا گویں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبولیت سے نوازے اور اس عظیم مورچے کو نظر بدے سے محفوظ رکھتے ہوئے عالم اسلام اور عرب دنیا کی زیادہ دیر تک خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

# امریکی اتحاد کی یلغار

## (۲۰۰۱ء تا ۲۰۲۱ء)

## افغانستان پر امریکی حملے: مقاصد و اهداف

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۱ء

امریتِ اسلامیہ افغانستان پر امریکہ اور برطانیہ کے حملوں کے خلاف عالمی رائے عامہ مسلسل غم و غصہ کا اظہار کر رہی ہے مگر تادم تحریر (۱۳ اکتوبر) حملوں کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اور امریکی صدر جارج بوش نے حملوں کا اذرہ وسیع کرنے، جنگ کو لمبی مدت تک جاری رکھنے، اور جنگ بند ہونے کے بعد بھی افغانستان میں موجود رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ حملہ ظاہر عرب مجاهد اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہ کرنے پر طالبان حکومت کو سزا دینے کیلئے کیے جا رہے ہیں جن میں نہیں عوام اور غریب شہری نشانہ بن رہے ہیں، لیکن امریکی صدر کے مذکورہ بالا اعلانات سے واضح ہو گیا ہے کہ اصل منشہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس بہانے جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا میں فوجی موجودگی کا راستہ ہموار کیا جا رہا ہے۔ اور جس طرح خلیج عرب میں عراق اور کویت میں تبازعہ کھڑا کر کے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں بر اجانب ہو گئی تھیں، اسی طرح افغانستان کے مسئلہ کو جان بوجھ کر بغاڑا جا رہا ہے تاکہ اس خطہ میں فوجیں اتنا نہ کندی اور وسطی ایشیا میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کو میں سے نکلنے سے پہلے ہی کنٹروں کر لینے کے منصوبے کو عملی جامد پہنچا جاسکے۔

امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بوش اور برطانوی وزیرِ اعظم بارباریہ کہہ رہے ہیں کہ ان کی جنگ اور مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے اور ان کی نظر میں اسلام امن پسندیدہ ہے اور مسلمان امن پسند قوم ہیں، لیکن صدر امریکہ نے اس جنگ کو ”صلیبی جنگ“، ”قرار دے کر اور برطانوی وزیرِ اعظم نے ایک حالیہ مضمون میں طالبان کے طرز حکومت کو طعن و تقدیق کا نشانہ بنا کر اپنے اصل جذبات کا اظہار کر دیا ہے۔ اور اس سے قبل ان ممالک کے مسلسل طرزِ عمل سے یہ بات دنیا کے اسلام پر پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اس جنگ کا ہدف صرف اٹخ اسامہ بن لادن اور طالبان کی اسلامی حکومت نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی جهادی تحریکات، دینی حلنت اور قرآن و سنت کے ساتھ بے چک و بیٹگی رکھنے والے مسلمان ہیں۔ اور مغربی حکمران دنیا کو برآمد کرنا چاہتے ہیں۔

برطانوی وزیرِ اعظم ٹونی بلیزٹر کا ایک مضمون روزنامہ جنگ لندن نے ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے طالبان کی حکومت کو ہدفِ تقدیق بناتے ہوئے کہ طالبان اور اسامہ بن لادن ”ایک دشمنی اور غیر رواہر نظام“ پوری مسلمان دنیا کو برآمد کرنا چاہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسامہ اور طالبان سے مغربی حکمرانوں کو اصل شکایت مہی ہے کہ وہ افغانستان میں اسلامی نظام کا کامیاب تحریک کرنے کے بعد پوری دنیا کے اسلام میں نفاذِ اسلام کی تحریکات کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں۔ اور مغربی حکمرانوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر افغانستان میں یہ نظام کا کامیاب ہو جاتا ہے تو دنیا کے دوسرے مسلم ممالک

تک اس نظام کا دائرة و سیع ہو جائے گا۔ اور مسلم ممالک کو اپنے کنٹرول میں رکھنے اور ان کے وسائل اور صلاحیتوں کا مسلسل استحصال کرتے رہنے کیلئے مغرب نے ان پر جو نوآبادیاتی اور استحصالی نظام طاقت اور سازشوں کے زور پر مسلط رکھا ہوا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ہمارے نزدیک اس سارے قضیے کا اصل نکتہ یہ ہے اور باقی سارے عوامل بھی اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب کا استحصالی اور سرمایہ دارانہ نظام اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہے، اس کی گرفت عالمی نظام پر ڈھیل پڑتی جا رہی ہے اور تاریخ کا پہیہ حرکت میں آگیا ہے۔ اس لیے افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی اور غریب عوام پر وحشیانہ بمباری اور ان کے قتلِ عام سے اس خطے کے مسلمانوں کیلئے مشکلات توکھڑی کی جاسکتی ہیں اور چند سال مزید انہیں پریشان اور مضطرب رکھا جاسکتا ہے، لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ اور سیکولر نظام کو بچانے اور اسلام کے عادلانہ اور فطری نظام کو روکنے کی کوئی کوشش اب زیادہ دیر تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس میں دنیاۓ اسلام کی دینی قیادتوں اور اسلامی تحریکات کا امتحان ضرور ہے کہ وہ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کیلئے باہمی رابطہ و مشاورت اور حوصلہ و تدریک کس حد تک مظاہرہ کرتی ہیں۔

## امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی حیرت انگیز حیرت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۴ء

معروف کالم نگار جناب ارشاد احمد حقانی نے جنگ لندن میں ۱۳ اکتوبر کو شائع ہونے والے کالم میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی ایک حالیہ گفتگو کا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے کہ

”بیش نے کہا کہ مجھے اس نفرت پر حیرت ہے جو اسلامی دنیا میں لوگ امریکہ کیلئے رکھتے ہیں۔ میں جیران ہوں کہ ہمارے اور ہمارے ملک کے بارے میں دوسرے لوگوں میں کس قدر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ اکثر امریکیوں کی طرح مجھے بھی اس نفرت کو سمجھنے میں سخت دقت پیش آتی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہم امریکی کتنے بچھے لوگ ہیں۔“

صدر بش کو عالم اسلام میں امریکہ کے خلاف پائی جانے والی عمومی نفرت پر حیرت ہو رہی ہے، اور ہمارے لیے ان کی یہ ”حیرت“ سخت تجھ اور حیرت کا باعث بن رہی ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور حکومت کے سربراہ کو ان اسباب و عوامل تک رسائی میں مشکل پیش آ رہی ہے جو دنیاۓ اسلام میں ان کے ملک کے خلاف نفرت کے فروغ کا باعث بننے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کے جو ادارے اور ایجنسیاں دنیا کے حالات معلوم کرنے، عالمی سطح پر مختلف اقوام کے رجحانات و خیالات سے باخبر ہونے اور امریکی قیادت کو ان سے باخبر رکھنے پر مامور ہیں، اور جو اس مقصد کیلئے اربوں ڈالر سالانہ صرف کڑا لئے ہیں، وہ صدر امریکہ کو صحیح صورت حال سے باخبر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

اور اگر وہ باخبر کھنے کی کوشش کرتے ہیں تو صدر امریکہ کے نزدیک ان کی روپرٹوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ وہ ان پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کر سکیں۔

اسی سے کسی قوم اور ملک کے خلاف امریکی قیادت کے فیصلوں کے جواز اور معقولیت کی سطح کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس سے قطع نظر صدر بیش کے ان ریمارکس کے حوالے سے سوال یہ ہے کہ جب امریکی صدر بیش کو امریکہ کے خلاف عالمِ اسلام کی نفرت کی وجہ ہی ابھی تک سمجھ نہیں آئی تو وہ ”صلیبی جنگ“ کا نعروہ لگا کر مسلمانوں کے خلاف میدانِ جنگ میں کس بنیاد پر کوڈ پڑھے ہیں؟

## ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ جنگ لندن ۲۰۰۱ء کے مطابق ساہ تھہ ہسپیٹن یونیورسٹی میں ایک درخت پر مقامی کوںسل کی طرف سے ایک خط چسپاں کیا گیا ہے جس میں کوںسل کی لیکل سرو سمز کے سربراہ کے دستخطوں کے ساتھ اس درخت کو قبین دلایا گیا ہے کہ اسے کاثانہیں جائے گا۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس درخت کو چند دوسرے درختوں کے ساتھ کاٹ کر ان کی جگہ دوسرے درخت لگانے کا منصوبہ تھا۔ جس پر کچھ مقامی لوگوں نے اعتراض کیا تو کوںسل نے درخت کو کاٹنے کا فیصلہ تبدیل کر دیا، اور درخت کو مخاطب کر کے اسے تحریری یقین دہائی کرائی ہے کہ اسے کاثانہیں جائے گا۔ اس نوٹ میں درخت سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ اس سلسلہ میں اپنا موقف پیش کرنا چاہے تو تحریری طور پر پیش کر سکتا ہے۔

جانوروں اور درختوں کے تحفظ کے سلسلہ میں برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں کے ہمدردانہ طرزِ عمل کے حوالے سے اس قسم کی خبریں آئے دن اخبارات کی زیست بنتی رہتی ہیں کہ چند افراد کے توجہ دلانے پر جانوروں اور درختوں کو نہ صرف ہلاکت اور ضائع ہونے سے بچایا جاتا ہے بلکہ ان کے تحفظ کیلئے باقاعدہ بجٹ بناۓ جاتے ہیں اور اس پر کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف انسانوں کے بارے میں ان حکومتوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ اپنے استھانی نظام کو بچانے اور دنیا پر چودھراہٹ قائم رکھنے کیلئے لاکھوں انسانوں کے قتل عام سے ان کے ہاتھ رُگین ہیں اور عالمی رائے عامہ ان کی اس سفاری پر مسلسل چیخ و پکار کر رہی ہے مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو لندن کی سڑکوں پر ہونے والے اس مارچ اور مظاہرہ میں راقمِ الحروف بھی شریک تھا جس میں افغانستان پر امریکہ و برطانیہ کے محملوں کو بلا جواز قرار دیتے ہوئے بے گناہ افغانیوں کے قتل عام کی مذمت کی گئی اور افغانستان پر بمب اری فی الفور بند کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مظاہرہ میں مختار پورٹ کے مطابق پچھیں ہزار افراد شریک ہوئے جن میں ہرمذہب، ہر کتبِ فکر، ہر علاقہ اور ہر رنگِ نسل کے لوگ شامل تھے۔ اور سب نے منتفع طور پر افغان عوام کے قتل عام کی مذمت کرتے ہوئے جنگ بند کرنے اور مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کا مطالبہ کیا۔ مگر چند افراد کی درخواست پر ہسپیٹن یونیورسٹی کے ایک درخت کو تحفظ فراہم کرنے والی برطانوی حکومت نے ہزاروں برطانوی

شہریوں کے اس احتجاج کا نوٹس لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی، اور برطانیہ کی شراکت کے ساتھ امریکی حملے افغانستان پر بدستور جاری ہیں۔ غالباً اسی کیفیت اور صورتحال کیلئے کہا گیا ہے کہ ”ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور“

## اظہارِ رائے کی آزادی کا مغربی معیار

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۱ء

مغرب کو رائے کی آزادی اور اس کے اظہار کے حق پر بڑا ناز ہے اور دوسری اقوام و ممالک پر اس کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا ہے کہ وہ اظہارِ رائے کے اس معیار کو پورا نہیں کرتے جو مغرب کے نزدیک ضروری ہے۔ لیکن مغرب کا اس سلسلہ میں اپنا طرزِ عمل کیا ہے، اس کا انداز روزنامہ جنگ لندن ۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کی اس خبر سے کیا جاستا ہے کہ ”امریکی وزارتِ خارجہ نے عالمی نشریاتی ادارے والیں آف امریکہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ افغانستان کے حکمران ملا محمد عمر اور دوسرے طالبان را ہنماؤں کے انترو یو نشرنہ کرے۔ وزارتِ خارجہ کے ترجیhan رچرڈ باؤچر نے کہا ہے کہ امریکی حکومت کے خیال میں یہ درست نہیں ہے کہ طالبان را ہنماؤں کے انترو یو امریکی ریڈ یو ایشن سے نشر کیے جائیں، اور امریکہ میں یکس ادا کرنے والے عوام بھی طالبان را ہنماؤں کے انترو یو نشر ہونے کو پسند نہیں کریں گے۔ والیں آف امریکہ کے صحافیوں نے وزارتِ خارجہ کی اس ہدایت پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس اقدام کو صحافتی اصولوں کے منافی اور آزادی اظہار پر قدغن قرار دیا ہے۔“

اسی طرح امریکی وزیر خارجہ کو لن پاؤں نے گذشتہ روز دولتِ قطر کے حکمران سے فون پر بات کرتے ہوئے ان سے تقاضہ کیا ہے کہ الجزیرہ ٹی وی کو گاہم دی جائے اور اس کی نشریات پر پابندی لگائی جائے۔ الجزیرہ ٹی وی کی نشریات عربی زبان میں ہوتی ہیں، اس کا ہیڈ کوارٹر قطر میں ہے، اس نے خبروں کے معیار اور وسعت میں ولڈ میڈیا میں یہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ بہت سے مغربی ٹی وی ایشن الجزیرہ سے خبری حاصل کر کے اس کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ اور اس نے مغربی ذرائع ابلاغ کی اجراء داری کو توڑتے ہوئے اٹھنے اسامة بن لادن اور طالبان حکومت کے موقف کو تفصیل کے ساتھ عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کیا ہے، جس سے دنیا کے ایک بڑے حصے تک افغانستان کے بارے میں صحیح خبریں پہنچ رہی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ امیر قطر نے امریکی وزارتِ خارجہ کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ الجزیرہ ایک پرائیویٹ ادارہ ہے جو اپنی پالیسیوں میں آزاد ہے اور اس پر کوئی پابندی اظہارِ رائے کی آزادی کے منافی ہوگی۔ ہم دولتِ قطر کے اس موقف کا خیر مقدم کرتے ہوئے امریکی حکمرانوں سے عرض کریں گے کہ خود اپنے پڑھائے ہوئے سبق کو دہراتے جانے پر وہ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟

## افغانستان پر جاری امریکی حملہ: برطانوی رائے عامہ کار د عمل

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ نومبر ۲۰۰۱ء

گلاس گو برطانیہ کے بڑے شہروں میں سے ہے جہاں مجھے ہر سال دو چار روز کیلئے حاضری کا موقع ملتا ہے۔ اس سال بھی معقول کے مطابق حاضری ہوئی مگر نئی بات یہ ہوئی کہ مجلس احرار اسلام پاکستان کے سینکڑی اطلاعات عبداللطیف خالد چیمہ مجھ سے پہلے بیہاں آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجلس احرار اسلام سکاٹ لینڈ کے زیر اہتمام مرکزی جامع مسجد گلاس گو میں ”عالم اسلام کی موجودہ صور تحال اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں“ کے عنوان سے ایک جلسہ کا اہتمام کا رکھا تھا جس میں مہماں خصوصی کی کرسی پر انہوں نے مجھے بٹھا دیا۔ جلسہ میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث مکاتب فکر اور جماعت اسلامی کے سرکردہ علماء کرام نے شرکت کی۔ بعض حاضرین کا کہنا تھا کہ استمر کے ساتھ کے بعد پہلا موقع ہے کہ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام مشترکہ فورم سے اس مسئلہ پر اظہار خیال کر ہے ہیں۔

گلاس گو مقامی آبادی افغانستان پر امریکی حملوں کے خلاف دوبار مظاہرہ کر چکی ہے۔ ۷۲ اکتوبر کو ہونے والے مظاہروں میں رقم الحروف نے بھی جمعیت علماء برطانیہ کے رہنماؤں امام احسان نعمانی، مجلس احرار اسلام کے رہنماء عبد اللطیف خالد چیمہ، اور شیخ عبد الواحد کے ہمراہ شرکت کی۔ یہ مظاہرہ گلاس گو کے جاری سکواڑ میں ایک اسٹوڈنٹ نتھیم کی طرف سے کیا گیا اور اس میں مختلف جماعتوں کے رہنماؤں کے علاوہ اسکاٹ پارلیمنٹ کے مقامی ممبر ٹانی شیروں نے خطاب کیا۔ مظاہرین نے مختلف کتبہ اخخار کھے تھے جن پر جنگ بند کرو، جنگ نہیں امن، دہشت گردی کا علاج دہشت گردی نہیں جیسے نمرے درج تھے۔ ایک کتبہ پر ”تین دہشت گرد بھائی: بش، بلیسر اور بن لادن“ لکھا ہوا تھا۔ مقررین کی تقریروں کے دوران ریلی کے شرکاء تالیوں اور سیٹیوں کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

اسکاٹ پارلیمنٹ کے ممبر نے برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیسٹر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے پارلیمنٹ میں بحث و مباحثہ کیے بغیر اور ہم سے پوچھے بغیر جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا ہے جبکہ ہم اس جنگ کی حمایت نہیں کرتے اور نہتے افغان شہریوں پر بھاری اور ان کے قتل عام کو ظلم تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے افغانستان پر جملے روئے کا مطالبا کرتے ہوئے وزیر اعظم ٹونی بلیسٹر سے کہا کہ وہ اس معاملہ کو پارلیمنٹ میں لائیں اور رائے شماری کرائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ ارکان پارلیمنٹ کی رائے کیا ہے۔

ریلی میں ایک افغان طالبہ نے بھی تقریکی جسے سب سے زیادہ داد ملی۔ اس طالبہ کا نام حورا قادر ہے اور اس نے انگلش میں پر جوش انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ بش اور بلیسٹر افغانستان میں جو مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں ان میں کامیابی نہیں ہو گی کیونکہ افغان قوم نے ہمیشہ اپنی آزادی برقرار رکھی ہے اور وہ اب بھی اپنی آزادی کا تحفظ کرے گی۔

برطانوی دارالعلوم میں جنگ کے خلاف آواز بلند کرنے میں ممبر پارلیمنٹ جارج گیلوے سب سے پیش پیش ہیں اور ان کا تعلق بھی گلاسگو سے ہے۔ انہوں نے عراق پر امریکی جاریت کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اب افغانستان پر امریکی حملوں کے خلاف بلند آواز کے ساتھ کلمہ نہ تن بلند کر رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے گذشتہ دنوں برطانوی اور اسکا شپارلیمنٹ کے مسلمان ممبروں کا شکوہ کیا ہے کہ وہ انصاف کا ساتھ دینے کی وجہے وزیر اعظم ٹونی بلیز کی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں لندن کے ایک اخبار میں جارج گیلوے کا بیان شائع ہوا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

گلاسگو کیلوں سے لیبر ممبر پارلیمنٹ جارج گیلوے نے ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز کے مسلمان ارکان کو چیخنے کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ مباحثہ کریں کہ افغانستان میں امریکہ اور برطانیہ کی جنگ کیسے جائز ہے اور اس کی کیوں حمایت کی جائے؟ انہوں نے کہا کہ ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز کے مسلمان ارکان مباحثہ کیلئے جگہ اور سامعین کا خود اختیاب کریں۔ انہوں نے کہا کہ وہ مسلمان ارکان پارلیمنٹ سے یہ بحث کرنا چاہتے ہیں کہ وہ افغانستان پر حملوں کیلئے کیا جو از پیش کرتے ہیں اور تین ہفتوں سے روزانہ پو بیس گھنٹے بمباری کی کیوں حمایت کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جنگ کے خلاف انہیں روزانہ ہزاروں خطوط آرہے ہیں جن میں سے اکثر خط مسلمانوں کے ہیں، وہ بمباری کے خلاف سخت مشتعل ہیں۔ جارج گیلوے نے کہا کہ یہ امر افسوسناک ہے کہ وہ اور دیگر ارکان پارلیمنٹ ایک عرصہ سے یہ جنگ لڑ رہے تھے کہ مسلمانوں کو ارکان پارلیمنٹ بنا جائے لیکن دکھ کی بات ہے کہ وہ مسلمانوں کی جائے وزیر اعظم کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

جارج گیلوے نے (سب سے پہلے) جب پارلیمنٹ میں افغانستان کے خلاف امریکی حملوں پر احتجاج کیا تھا اور جنگ کے خلاف آواز بلند کی تھی تو وہ تھا تھے لیکن اب ان کی حمایت پارلیمنٹ کے اندر اور باہر بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسرے ارکان پارلیمنٹ بھی رفتہ رفتہ ان کی مہم میں شریک ہو رہے ہیں اور عوامی سطح پر جنگ کے خلاف احتجاج کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

لندن میں گذشتہ ہفتے بہت بڑی ریلی ہوئی تھی اور ۱۸ نومبر کو لندن میں جنگ کے خلاف اس سے بھی بڑی منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جس کا اہتمام سی این ڈائی اور گرین پارٹی جیسی جماعتیں کر رہی ہیں۔ مسلم پارلیمنٹ کے لیڈر ڈائٹر غیاث الدین اس مقصد کیلئے تحریر ہیں کہ اس ریلی میں مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں۔ گذشتہ روز انہوں نے درلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیینی منصوری سے ملاقات کی جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر دونوں رہنماؤں نے ۱۸ نومبر کی ریلی کو کامیاب بنانے اور اس میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی شرکت کو تلقینی بنانے کیلئے مشترکہ رابطوں کا فیصلہ کیا۔

اس کے علاوہ گذشتہ ہفتہ بہت بڑی ریلی میں جمعیت علماء برطانیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری تصویر الحق کی دعوت پر مختلف دینی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اجلاس میں طے پایا کہ ۱۸ نومبر کو منظم میں جنگ کے خلاف ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جائے گا جس سے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام خطاب کریں گے۔

الغرض برطانیہ میں عوامی سطح پر اور مسلمانوں کے دینی حلقوں میں جنگ کے خلاف بیداری بڑھ رہی ہے اور اس پس منظر میں گلاسگو کی مرکزی جامع مسجد میں مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہونے والا مذکورہ مشترکہ جلسہ بھی

خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جملہ سے رقم الحروف اور جناب عبداللطیف خالد چیمہ کے علاوہ جمعیت علماء برطانیہ کے رہنماء مولانا صاحبزادہ امداد اکسن نعمانی، ولڈ اسلامک مشن کے رہنماء علامہ فروغ القادری، جمیعت اہل حدیث کے رہنماء مولانا محمد اریں مدنی، یوکے اسلامک مشن کے رہنماء مولانا عبد الرحمن عابد، اور مرکزی جامع مسجد گلاسکو کے خطیب مولانا حبیب الرحمن نے خطاب کیا۔ علامہ فروغ القادری گلاسکو میں مولانا شاہ احمد نورانی کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ نمائندگی صرف ولڈ اسلامک مشن تک محدود نہیں بلکہ ان کی وضع قطع، انداز گفتگو اور تازہ تازہ معلومات میں بھی مولانا نورانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور اس قسم کی نتیجیں اور ٹوڈی پوائنٹ گفتگو اس مکتب فکر میں مولانا نورانی کا کوئی نمائندہ ہی کر سکتا ہے۔

رقم الحروف نے اپنی گفتگو میں اس لکتے پر زیادہ زور دیا کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو اپنے ملک کے قوانین کی پابندی اور اپنے معاهدات اور حلف کی پاسداری کرتے ہوئے ظلم کی مخالفت اور مظلوموں کی حمایت کیلئے قانونی ذرائع اختیار کرنے چاہیں۔ اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی آواز بلند کرنے کیلئے مسلمان جو کچھ کر سکتے ہیں اس سے انہیں گریز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جنگ کے خلاف آواز بلند کرنے والے حلقوں کے ساتھ شریک ہوں، میدیا والانگ کے محاذ پر متحرک ہوں، بے گھر مسلمانوں کی امداد کیلئے مالی تعاون کو منظم کریں، اور مسلم حکومتوں پر دباؤ و ڈالیں کہ وہ افغانوں کے قتل عام پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے کی بجائے امریکی حملوں کو رکاوے کیلئے اپنا اثر و سخن استعمال کریں۔

## یہ جنگ فراد ہے: ب्रطانوی صحافی جان پلجر کا تجزیہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- نومبر ۲۰۰۱ء

گذشتہ روز گلاسکو میں مجلس احرار اسلام سکاٹ لینڈ کے صدر شیخ عبد الواحد کی رہائش گاہ پر مختلف ٹوی چینز پر خبریں بیکھ رہا تھا۔ انگریزی نہ جانتے والے میرے جیسے لوگوں کیلئے پاکستانی چینل پر ایم ٹوی اور سکائی ٹوی کے اردو پروگراموں کے علاوہ اے آر او انی کا چینل موجود ہے جبکہ عربی سمجھنے والوں کیلئے قطر کا الجمزیرہ ٹوی اور شب و روز معلومات اور دستاویزی پروگرام اس انداز سے پیش کر رہا ہے کہ اور کسی چینل کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ ایسے تو قادیانیوں کا چینل بھی ایم ٹوی (اسلم ٹوی اور احمدیہ) کے نام سے شب و روز مسلسل مصروف رہتا ہے لیکن اس کے پروگرام میں اپنے ناظرین کو حالات حاضرہ اور عالمی صور تحال سے باخبر رکھنا سرے سے شامل ہی نہیں اور اس کے تمام تر پروگرام اپنے مذہب کی تبلیغ اور اسلام کے نام پر اپنے معتقدات کو پیش کر کے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش پر مشتمل ہوتے ہیں کہ حقیق اسلام صرف ان کے پاس ہے اور ”اصلی تے ڈوے مسلمان“ وہی ہیں۔

البتہ کبھی بھی مغربی میدیا کا رخ اور انداز معلوم کرنے کیلئے دوسرے چینز پر بھی نظر ڈالنی پڑ جاتی ہے اور کوئی انگریزی جاننے والا دوست پاس موجود ہو تو اس کی مدد سے پکچرے کے ساتھ ساتھ خبر بھی بچھنے بچھنے پلے پڑ جاتی ہے۔ لبی سی کاچوپیں گھنٹے خبریں نشر کرنے والا چینل سامنے تھا اور اسکرین پر چند نو عمر لڑکے اور لڑکیاں گفتگو کر رہی تھیں۔ مجھے بتایا گیا

کہ لنڈن کے ویسٹ منٹر کے ملاقہ میں ان لڑکوں اور لڑکیوں کوور لڈر ٹریڈ سٹر اور پینٹنگاون پر اُتھر کے حملوں کی فلم دکھائی گئی ہے اور ان سے باری باری ان کے تاثرات دریافت کیے جا رہے ہیں۔ ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گئی اور غالباً کسی اسکول کی طالبہ تھی، اس کی زبان سے اسمامہ بن لادن کا نام سن کر میں اپنے ساتھ بیٹھے دوست سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکی کہہ رہی ہے کہ گیارہ تبر کے واقعات انتہائی افسوسناک اور تکمیل دوست سے پر اسے بہت صدمہ ہوا ہے، امریکہ ان واقعات کا مجرم اسمامہ بن لادن کو قرار دے رہا ہے جبکہ اسمامہ نے انکار کیا ہے اور امریکہ کہتا ہے کہ اس کے پاس ثبوت موجود ہیں تو ان واقعات کی فلم دکھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ ثبوت اور پروف کیوں نہیں دکھائے جاتے؟ ہم وہ ثبوت بھی اس فلم کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔

امریکہ گیارہ تبر کے واقعات کا ذمہ دار اسمامہ بن لادن کو ظہرانے کے ثبوت پیش کرنے کی پوزیشن میں ہے یا نہیں مگر یہ بات دن دفعہ ہوتی جا رہی ہے کہ خود مغرب کی رائے عامہ امریکہ کے اس دعویٰ کو کسی واضح دلیل کے بغیر قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اور عام آدمی کی کہ پہلوں پر بھی یہ حقیقت کھلتی جا رہی ہے کہ اصل قصہ کچھ اور ہے اور امریکہ اپنے اصل اہداف پر پرداز ڈالنے کیلئے اسمامہ بن لادن اور طالبان کا نام استعمال کر رہا ہے۔ ہم یہ پروگرام دیکھ کر اس پر آپس میں تصریح کر رہے تھے کہ شیخ عبد الواحد نے بتایا کہ برطانوی اخبار ڈیلی مرسی کی توان کی بڑی سرفی ہی ہے کہ ”یہ جنگ فراؤ ہے۔“ اور اس سرفی کے تحت ایک سینئر برطانوی کا تجزیہ شائع ہوا ہے جس میں جنگ کے اصل مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

گلاس گو سے لنڈن پہنچا تو ایک اور دوست جن کا تعلق لاہور سے ہے، ڈیلی مرس کا یہ پرچہ سنبھالے میرے منتظر تھے اور مجھے اس کا ترجیح سنا نے کی تیاری میں تھے۔ ڈیلی مرس کا یہ شمارہ ۱۲۹۴ تبر کا ہے اور اس کی بڑی سرفی یہ ہے کہ

This war is a fraud  
یہ جنگ فراؤ ہے۔

یہ ایک برطانوی صحافی جان پلجر (John Pilger) کے تجزیاتی مضمون کا عنوان ہے۔ جان پلجر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کا شمار برطانیہ کے سینئر صحافیوں میں ہوتا ہے اور اب تک وہ صحافتی خدمات کے حوالے سے چالیس کے لگ بھگ ایوارڈ حاصل کرچکے ہیں جن میں ”سال کا بہترین صحافی“ کا ایوارڈ بھی شامل ہے جو انہیں ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۹ء میں دو بار ملا اور ۱۹۸۰ء میں انہوں نے ”سال کا بہترین بین الاقوامی رپورٹر“ کا ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ جبکہ انہوں نے مذہل ایسٹ، افریقہ اور دوسرے علاقوں میں صحافی خدمات سر انجام دیں جن میں متعدد جنگوں کی رپورٹیں بھی شامل ہیں۔ جان پلجر نے اس عنوان کے تحت موجودہ صورت حال کا جو تجزیہ کیا ہے اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں ہے بلکہ امریکہ کے خفیہ استعماری ایجنسیاکی تکمیل کیلئے ہے جس کا مقصد پوری دنیا میں نوآبادیات کا ایک نیا نظام قائم کر کے اس پر تسلط جانا ہے۔ برطانیہ اس میں صرف معاون ہے اور وزیر عظم ٹونی بلیئر نے اس جنگ میں جو رول اختیار کیا ہے اس سے برطانوی فوجوں کو ”گرائے کے سپاہی“ یا اس سے کچھ بہتر پوزیشن کے سوا کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔

یہ بات ثابت کرنے کیلئے کہ یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں ہے ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ تین ہفتوں کی مسلسل

بمباری میں کوئی دہشت گرد قتل یا گرفتار نہیں ہوا اور نہ ہی کسی مبینہ دہشت گرد کو کوئی لفڑان پہنچا ہے بلکہ غریب شہری بمباری کا نشانہ بن رہے ہیں۔ جھونپڑیوں، ہستاولوں، امدادی مرکزوں، ریڈ کراس کے اڑوں اور خوارک کے ذخیروں پر بم گرائے جا رہے ہیں جس کا مقصد صرف عوام کو مارنا ہے اور دنیا کا سب سے طاقتور ملک سب سے کمزور اور غریب ملک کے بھوکے عوام پر بم رہا ہے۔ اس جنگ میں ”کلستر بم“ استعمال کیے جا رہے ہیں جو صرف لوگوں کو مارنے اور آبادیوں کو نشانہ بنانے کیلئے بنائے گئے ہیں۔ ان بیوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ صرف عام لوگوں کو مارنے کیلئے ہی استعمال ہو سکتے ہیں اور اگر کوئی ہتھیار ریاستی دہشت گردی کیلئے سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتا ہے تو وہ یہی بم ہے جو امریکہ افغانستان کی شہری آبادی پر یہ کہہ کر گرا رہا ہے کہ اس کا مقصد عوام کو مارنا نہیں ہے۔

گیارہ سال کے واقعات میں کوئی افغانی ملوث نہیں ہے اور جن لوگوں کے اس سلسلہ میں نام لیے جا رہے ہیں ان میں ایک بھی افغانی نہیں ہے لیکن اس کی سزا افغان عوام کو دی جا رہی ہے۔ اسماعیل بن لادن کو ان واقعات کا مجرم قرار دیا جا رہا ہے جو خود امریکہ کی پیداوار ہے، اسے امریکہ نے روس کے خلاف جنگ کی ٹریننگ دی اور سپورٹ کیا۔ اسے یہی اے نے امدادی اور اس کی اور اس کے ساتھیوں کی ٹریننگ امریکہ اور جرمی میں ہوئی۔

افغانستان پر جب طالبان کی حکومت قائم ہوئی تو امریکہ نے خاموشی اختیار کی اور خفیہ طور پر طالبان حکومت سے رابطہ قائم کیا۔ یہ رابطہ امریکی ریاست ٹیکساں کے دارالحکومت ہیوستن کی ایک کمپنی نے کیا جس کا نام ”یونوکال“ ہے جس میں امریکی حکومت کی درپرداخت خواہش اور حمایت شامل تھی۔ طالبان حکومت کے نمائندوں کے ساتھ اس تجارتی کمپنی کے مذاکرات ہوئے جن کا مقصد وطنی ایشیا کی ریاستوں سے تیل اور گیس حاصل کرنے کیلئے افغانستان کے اندر سے پانچ لاکن گزارنے پر طالبان کو آمادہ کرنا تھا۔ امریکہ کا خیال تھا کہ طالبان کو افغانستان میں سعودی عرب کی طرز کی حکومت اور نظام قائم کرنے پر آمادہ کر لیا جائے گا جس میں عوام کو حقوق حاصل ہونے یا نہ ہونے گروہ طی ایشیا کے تیل کے ذخائر پر امریکی کنٹرول کیلئے افغانستان ایک کالوں کی حیثیت اختیار کر لے تو افغانستان کی تعمیر نو بھی سعودی عرب کی طرز پر کر دی جائے۔ گر طالبان حکومت کے ساتھ امریکہ کی یہ ڈیل کامیاب نہ ہو سکی جبکہ امریکہ کی اس خطے کے حوالے سے سب سے بڑی ترجیح یہی ہے کہ اسے وطنی ایشیا کے تیل اور گیس کا کنٹرول حاصل ہو جائے جو مدل ایسٹ کے بعد دنیا میں تیل اور گیس کے سب سے بڑے ذخائر ہیں اور جن تک رسائی افغانستان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

امریکہ کی یہ جنگ صرف اس مقصد کیلئے ہے اور حیرت کی بات ہے کہ امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل نے کھلم کھلا اس عنديہ کا اظہار کر دیا ہے کہ ماڑیٹ طالبان امریکہ کی حمایت سے قائم ہونے والی کمزوری حکومت کو قبول کر لیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کا اصل مقصد افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا ہے اور اس پر صرف دکھاوے کیلئے ”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ اس جنگ میں دراصل امریکی خواہشات کا فرمایا ہیں اور جب ہمارے لیڈر جنگ کی طوالت کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جنگ پچاس سال تک بھی جاری رہ سکتی ہے تو انسان کا سانس رک جاتا ہے۔ جہاں تک دہشت گردی کا تعلق ہے اس کو روکنے کا راستہ نہیں ہے بلکہ اس سے دہشت گردی کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو گا۔

گلیارہ سبیر کو امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی افسوساً کے جواب میں افغان عوام کے خلاف دہشت گردی کے ارتکاب اس سے زیادہ افسوسناک ہے۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیزہ اگر دہشت گردی کو روکنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اسلحہ کی فروخت کو روکیں۔ یہ مناقفت کی انتہا ہے کہ جس روز امریکہ میں ولڈر ٹریڈ سٹر اور پینٹاگون کو دہشت گردی کا ناشانہ بنایا جا رہا تھا اسی دن لندن کے ڈاک لینڈ کے علاقہ میں برطانوی اسلحہ کی نمائش کا افتتاح تھا۔ اس اسلحہ میں کلستر ہم اور میراکل بھی شامل ہیں اور اس اسلحہ کی خریداروں کو حکومتیں ہیں جو اپنے عوام پر ظلم ڈھاتی ہیں، جنہوں نے اسلحہ و طاقت کے زور پر عوام کے حقوق دبارکے ہیں۔ یادہ گروہ یہ اسلحہ خریدتے ہیں جو دنیا میں دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ برطانوی حکومت ایک طرف ایسے اسلحہ کی فروخت کا اہتمام کرتی ہے اور دوسری طرف دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نامہ لگایا جاتا ہے، یہ مناقفت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وزیر اعظم ٹونی بلیزہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اخلاقی قدروں کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارے اندر جو اخلاقی حس اور صلاحیت موجود ہے، ہم اس کی بنیاد پر یہ جنگ جیت لیں گے لیکن یہ اخلاقی قدروں خود ساختہ ہیں اور اسی طرح کی ہیں جیسے پرانے نوآبادیاتی دور میں استعماری قوتیں کچھ اخلاقی قدروں کو عنوان بنانے کر کمزور ممالک کے خلاف جنگ کیلئے بھری ہیڑے روانہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان اخلاقی قدروں کا انتخاب استعاری قوتیں خود کرتی ہیں اور ان کی بنیاد معموضی حقائق پر نہیں بلکہ اپنے مفادات پر ہوتی ہے۔ اگر بات اخلاقی قدروں کی ہے تو وزیر اعظم ٹونی بلیزہ یہ بتائیں کہ انہوں نے اسرائیل سے فلسطین کے مقبوضہ علاقے آزاد کرنے کیلئے کیا کچھ کیا؟ اس کیلئے سلامتی کو نسل کی واضح قرارداد موجود ہے کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلا جائے اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ خالی کر دے۔ لیکن اسرائیل اس کے باوجود اپنی ضد پر قائم ہے جبکہ اقوام متحدہ کے فیصلے خاموش ہیں۔ کیونکہ اقوام متحدہ اب صرف امریکہ اور برطانیہ کا نام ہو کرہ گیا ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہی وہاں سے ہوتا ہے۔ اس کے بر عکس عراق کو مسلسل بمباری کا ناشانہ بنایا گیا ہے جہاں پانچ لاکھ بچے بھوک سے مر گئے ہیں اور معروف اخبار وال اسٹریٹ جرٹل نے دو سال قبل ایک رپورٹ میں کہا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کو اب عراق میں کوئی ہدف نظر نہیں آ رہا ہے کیونکہ شایدی وہاں کوئی مکان ایسا باقی رہ گیا ہو جو ان کی بمباری کا ناشانہ نہ بنتا ہو۔

میں عراق گیا تو ایک عورت نے مجھے بتایا کہ اس کا خاوند چراو باتھا جو کھل میدان میں کریاں چرار باتھا، اس کے چار بچے بھی ساتھ تھے کہ اچانک دو جہاز آئے اور ان پر بمب رسا کر چلے گئے جس سے اس کا خاوند اور چار بچے جاں بحق ہو گئے۔ اس عورت نے کہا کہ میں اس جزا کے پائلٹ سے ملنا چاہتی ہوں اور اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس نے کیا دیکھ کر مکریوں کے اس ریوڑ اور اس کے چڑوا ہے کو بمباری کا ناشانہ بنایا تھا؟ امریکہ اگر دہشت گردی کو ختم کرنا چاہتا ہے تو قلوریڈا کے ساحل کا رج کرے جہاں سی آئی اے نے ٹارچ سیل قائم کر رکھے ہیں اور جہاں لوگوں کو لا کر تشدید کا ناشانہ بنایا جاتا ہے۔ پھر ان مراکز کا رج آیا جائے جہاں جنوبی امریکہ کے ظالم اور ڈکٹیٹر حکمرانوں کو پناہ دی جاتی ہے اور سی آئی اے انہیں فنڈر فرما ہم کرتی ہے۔ یہ دہشت گروں کے اصل مراکز ہیں جن کا خاتمه ضروری ہے مگر اس کی بجائے کمزور مکلوں کو دبا کر اور انہیں حلول کا ناشانہ بن کر اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ قرار دیا جا رہا ہے جو سراسر جھوٹ اور فرافڑ ہے۔

## افغانستان کی صورتحال پر ایک پینل انٹرو یو

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ نومبر ۲۰۰۱ء

گذشتہ روز لندن کے ٹی وی چینل اے آر اوائی ڈیجیٹل کے پینل انٹرو یو کے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ موضوع "افغانستان کی صورتحال" تھا اور شرکاے گفتگو میں دیگر حضرات کے علاوہ برطانوی دارالامراء کے رکن لارڈ نزیر احمد بھی شامل تھے۔ اردو اور انگلش کے ایک گھنٹے کے اس ملے جلے پروگرام میں ٹیلی فون پر جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد اور صدر پاکستان جzel پرویز مشرف کے ترجمان جzel راشد قریشی سے بھی رابطہ کیا گیا اور پینل کے شرکاء نے ان سے سوالات کیے۔ ان کے علاوہ سیاکلوٹ اور کرپی کے کچھ ناظرین نے بھی فون پر سوالات کیے اور اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اے آر اوائی ڈیجیٹل کے پی جے میر صاحب نے پروگرام کنٹرکٹ کیا، ان کا پہلا سوال مجھ سے تھا کہ کیا آپ طالبان کی حمایت کرتے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو دوسرا سوال ہوا کہ طالبان کی حمایت کس وجہ سے کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا اس لیے کہ طالبان ایک جائز موقف کیلئے لڑ رہے ہیں، وہ جہاد افغانستان کے مطلقی اور نظریاتی نتائج کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ان پر یہ جنگ ٹھوںی گئی ہے اور وہ مظلوم ہیں اس لیے میں ان کی حمایت کرتا ہوں۔ اس پر لارڈ نزیر احمد صاحب نے کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کے حوالے سے طالبان کے موقف سے اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ جب امریکہ اور عالمی برادری نے ان سے مطالبہ کیا کہ اسامہ بن لادن ولڈ ٹریڈ سٹرپر حملہ کا مجرم ہے اس لیے اسے امریکہ کے حوالہ کر دیا جائے تو انہیں یہ مطالبہ مان لینا چاہیے تھا۔ آخر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی توحیح حدیبیہ کے موقع پر صحابی رسول حضرت ابو جندلؓ کو فارمکہ کے مطالبہ پر ان کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے گزارش کی کہ یہ بات دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

1. ایک اس وجہ سے کہ جناب رسول اللہؐ نے صلح حدیبیہ میں قریش کے مطالبہ پر حضرت ابو جندلؓ کو ان کے حوالہ کر دیا تھا لیکن یہ ایک معاهدہ کا نتیجہ میں تھا۔ کفار مکہ کے ساتھ آنحضرتؐ کا باقاعدہ معاهدہ ہوا تھا جس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ قریش مکہ کا کوئی شخص انہیں چھوڑ کر حضورؐ کے پاس جائے گا تو آپ اسے واپس کر دیں گے۔ یہ معاهدہ طے پانے کے بعد حضرت ابو جندلؓ پا یہ زنجیر حضورؐ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ میں مکہ مکرمہ سے بھرت کر کے آپ کے ساتھ مدینہ منورہ جانا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں معاهدہ کر چکا ہوں اس لیے ساتھ نہیں لے جاسکتا چنانچہ ابو جندلؓ کو قریش مکہ اپنے ساتھ واپس لے گئے۔ لیکن امریکہ اور طالبان کے درمیان تو کوئی معاهدہ نہیں ہے، نہ مجرموں کے باتی تباadelہ کا کوئی معاهدہ موجود ہے اور نہ ہی امریکہ نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ اس لیے اسامہ بن لادن کے حوالے کرنے کا مطالبہ کا ہی سرے سے کوئی جواز نہیں بنتا۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ نے اسماء بن لادن کو مجرم قرار دے دیا ہے تو میر اسوال یہ ہے کہ اس کیس میں امریکہ کی حیثیت مدعی کی ہے یا مجرٹیٹ کی؟ اگر امریکہ مدعی ہے تو وہ کوئی غیر جاندار عدالت ہے جس نے امریکہ کے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے اسماء بن لادن کو مجرم قرار دیا ہے؟ طالبان نے اسماء کی حوالگی سے انکار نہیں کیا، صرف ثبوت مانگے ہیں اور غیر جاندار عدالتی فورم کی تشکیل کا مطالبہ کیا ہے اور ان کا یہ موقف جائز ہے۔

گفتگو میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ طالبان پاکستان کے مخالف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بالکل نہیں، طالبان نے کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی اور نہ اب کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان کے موقف سے اختلاف اور چیز ہے اور پاکستان کی مخالفت اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے۔ ہمیں ان دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے۔

پھر یہ کہا گیا کہ پاکستان سے جو لوگ افغانستان میں لڑنے کیلئے جا رہے ہیں وہ پاکستان کے خلاف لڑیں گے۔ اس کا جواب قاضی حسین احمد صاحب نے دیا کہ طالبان نے کسی کو اپنے ملک میں لڑنے کیلئے بلا یا ہے اور نہ کوئی جا رہا ہے یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ جبکہ میں نے عرض کیا کہ جو لوگ افغانستان میں جا کر جہاد میں شریک ہونے کا عزم ظاہر کر رہے ہیں وہ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ امریکہ کے خلاف لڑنے کا عزم رکھتے ہیں اور امریکہ کے خلاف جنگ کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان تو اس جنگ میں خود کو فریق ہی تسلیم نہیں کر رہا تو اس کے خلاف جنگ کیسی؟

پہلی گفتگو میں ایک اور سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ قاضی حسین احمد نے اپنی ٹیلی فونک گفتگو میں کہا کہ جزل پرو یور مشرف اپنے موقف میں تنہا ہیں اور ان کے ساتھ ایک محمد دو ٹولہ ہے جبکہ پوری قوم ان کے اس موقف کے خلاف ہے۔ اس پر کہا گیا کہ دینی جماعتوں کو توبار لیمنٹ میں کبھی ایسی نمائندگی حاصل نہیں رہی کہ وہ پوری قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتیں اس لیے یہ کہنا کہ قوم ان کے ساتھ ہے مشکل بات ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس مسئلہ کا حل مشکل نہیں ہے، میری تجویز یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ قوم کا اجتماعی موقف کیا ہے، یا مיעطل پار لیمنٹ کا صرف اس مسئلہ پر دو گھنٹے کا اجلاس طلب کر لیا جائے اور اس سے استفسار کیا جائے کہ موجودہ حالات میں جزل پرو یور مشرف اور دینی جماعتوں میں سے کس کا موقف درست ہے اور قومی جذبات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر عوامی ریفرنڈم کرا لیا جائے، خود بخود فیصلہ ہو جائے گا کہ قوم اس مسئلہ میں کس کے ساتھ ہے۔

میں نے ریفرنڈم کا نام لیا تو گفتگو میں شریک ایک خاتون جنلسٹ شیری رحمان نے صدر ضیاء الحق مرحوم کے ریفرنڈم کا ذکر چھپر دیا کہ انہوں نے ریفرنڈم کرایا تھا لیکن اس کیلئے جو الفاظ ڈیزائن کیے گئے تھے وہ مضکمہ خیز تھے۔ میں نے گزارش کی کہ الفاظ باہمی مشورہ سے ڈیزائن کر لیے جائیں اور عوام سے ان کے مطابق پوچھا جائے، آخر عوام سے پوچھیں تو یہی!

میں نے عرض کیا کہ ہم پر سمجھتے ہیں کہ جزل پرو یور مشرف نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ حالات کے جبر کا نتیجہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر حالات کا یہ جبر نہ ہوتا اور جزل پرو یور مشرف آزاد فضائیں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تو ان

کافیصلہ یہ نہ ہوتا۔ البتہ انہوں نے فیصلہ کرنے میں جلدی سے کام لیا ہے اور اپنی قوم اور بین الاقوامی مسلم برادری کو اعتماد میں لینے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا اور اس کا اعلان کرنے کے بعد صلاح مشورے شروع کیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور صدر پرویز مشرف فیصلہ کرنے سے قبل ملک کی دینی و سیاسی جماعتیں موشورہ میں شریک کر لیتے اور عالم اسلام کے رہنماؤں سے مشاورت کے ساتھ ساتھ او آئی سی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیتے تو کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا اور حالات اس مقام تک نہ پہنچ جس کا ہم آج سامنا کر رہے ہیں۔

سیالکوٹ سے ایک صاحب نے فون پر سوال کیا کہ جس طرح نیٹو کے ممالک نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ان میں سے کسی ایک پر حملہ نیٹو کے سب ارکان پر حملہ متصور ہو گا اس طرح کا کوئی معابدہ مسلم ممالک آپس میں کیوں نہیں کر لیتے؟ اس پر گفتگو میں شریک مصری صحفی عبد اللہ جودہ نے کہا کہ یہ بات نظر یاتی لحاظ سے تو ٹھیک ہے مگر عملاً مشکل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بے شک اس میں علمی مشکلات ہیں لیکن عالم اسلام کیلئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسلم دنیا کو بالآخر اس نکتے پر آنا ہو گا اور مشکلات کا حل نکالتے ہوئے نیٹو کی طرز کے مسلم بارک کی تشکیل کرنا ہو گی۔

پیش گفتگو میں نکانہ صاحب کے ناظم رائے محمد نواز کھل بھی شریک تھے، انہوں نے صدر جzel پرویز مشرف کے موقف کی تائید کی اور کہا کہ ان کیلئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے طالبان کی بھی حمایت کی اور کہا کہ مسلمان کی حیثیت سے ہمارے دل طالبان کے ساتھ ہیں اور ہم ان کیلئے دعا گیں۔

پیش کے سب شرکاء کا اس بات پر اتفاق تھا کہ سب کچھ کے باوجود افغانستان کی شہری آبادی اور متعین اهداف سے ہٹ کر امریکی اور برطانوی طیاروں کی بمباری قلعی طور پر غلط اور افسوسناک ہے اور موجودہ صور تحال میں صحیح بات یہی ہے کہ افغانستان پر رضائی حملے فوری طور پر بند کیے جائیں اور جنگی کارروائی روک کر مذاکرات اور سیاسی ذراعے سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

## افغانستان کی تباہی: دانشوروں کی سوچ تاریخ کے آئینے میں

روزنامہ پاکستان، لاپور ۱۹ نومبر ۲۰۰۴ء

صدر محترم جzel پرویز مشرف کا خیال ہے کہ طالبان نے ہماری بات نہیں مانی اس لیے انہیں اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور ہمارے بعض سیاسی و مذہبی دانشوروں کا بھی یہی ارشاد ہے کہ طالبان اگر اسامہ بن لادن کو امریکہ کے پسروں کی بات مان لیتے تو افغان عوام کو اس ہولناک تباہی سے بچایا جاسکتا تھا جو بمباری اور بھوک کی صورت میں ان پر نازل ہوئی ہے۔

ہمارے ان دانشوروں کی مجبوری یہ ہے کہ یہ کتاب اور تھیوری کی دنیا کے لوگ ہیں جو ہر مسئلے کا حل اسی میں تلاش کرتے ہیں جبکہ طالبان کا تعلق عمل اور پریکیل کے جہان سے ہے۔ اس لیے انہیں جب کچھ لوگ دانش و حکمت اختیار کرنے اور صرف ایک مہماں کی نظر اپنے لوگوں کو نہ مروانے کا مشورہ دیتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بین

الاقوای یونیورسٹی کا کوئی پروفیسر پہلوانی کے فن پر دو چار کتابیں پڑھ کر اکھڑے کے تماشا یوں میں کھڑا ہو گیا ہے اور کشتی میں ایک دوسرے سے نبرد آزمائپہلوانوں کو کتاب ہاتھ میں لے کر داؤ تیج تارا ہے۔

ہماری ابھن یہ ہے کہ حالات کے جبر اور جابر و قہر قتوں کی فرعونیت کے سامنے سراٹھا کھڑے ہونے کی ہم نے اپنے اندر ہمت نہ پائی اور گردن جھکا کر ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اور جو چند سرپھرے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر سر اٹھائے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے ہیں ان پر بھی ہمیں غصہ آرہا ہے کہ یہ بے وقوف اس طرح کیوں کھڑے ہیں اور انہوں نے ہماری طرح سر جھکا کر جان بچانے کی ”دانش و حکمت“ کیوں اختیار نہیں کی؟ لیکن یہ پہلا موقع نہیں ہے، تاریخ اس سے قبل بھی اس قسم کے منظردیکھ پچھلی ہے اور ایسے سرفوشوں کا جنون ہی ہمیشہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر رہا ہے جنہوں نے قوت، طاقت اور جبر و تشدید کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا ہے اور اپنے اس انکار کی آبرو قائم رکھنے کیلئے اپناب کچھ اور کر دیا ہے۔ آئیے ذرا تاریخ کے جھروکوں سے ایسے چند مناظر پر ہم بھی نظر ڈال لیں۔

### بنوہاشم کا سوشنل بائیکاٹ

یہ مکرمہ ہے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک، بہت پرسی، اور جہالت کے ماحول میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے عقیدہ کا اعلان کر کے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے کر پوری سوسائٹی میں پہلی پیدا کر دی ہے۔ قوم مخالف ہو گئی ہے، ارباب اقتدار اس دعوت کو اپنے لیے خطرہ سمجھ رہے ہیں، اور اصحاب دانش کو اپنی حکمت و دانش کے سارے بیانے ٹوٹنے دکھائی دے رہے ہیں۔ جناب بنی اکرم اور ان کے چند رفقاء کے خلاف طعن و تنشیع، تشدد و اذیت، اور مخالفت و عناد کا بازار گرم کر دیا گیا ہے۔ قبانی روایات کے مطابق آنحضرت کے سرپرست اور ان کے خاندان کے سربراہ جناب ابوطالب پر دباؤ بڑھ رہا ہے کہ اس نوجوان کو بتؤں کی مخالفت سے باز رکھو، اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اس کی سرپرستی چھوڑ کر اسے ہمارے حوالے کر دو، ہم خود اس سے نمٹ لیں گے۔ جناب ابوطالب نے نہ تو اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلمہ پڑھا ہے اور نہ ان کا دین قبول کیا ہے۔ لیکن ان کی حفاظت کو اپنی خاندانی اور اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ان کے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ ادھر مخالفت بڑھ رہی ہے اور دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ قریش کے تمام خاندان متحد ہو کر ابوطالب کے پاس آگئے ہیں کہ یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے کہ محمد گوہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہم تمہیں بھی اس کا ساتھی شمار کریں گے اور جو معاملہ اس کے ساتھ ہو گا وہی تمہارے ساتھ بھی ہو گا۔

اگر یہ آج کی حکمت و دانش کا دور ہوتا تو جناب ابوطالب کیلئے یہ بات بہت آسان ہوئی کہ اپنی جان بچانی ضروری ہے اور دوسروں کی خاطر خود کو خطرے میں ڈال لینا عقلمندی نہیں ہے۔ لیکن بھی حکمت و دانش اس معیار کو نہیں پہنچی تھی اس لیے جناب ابوطالب نے حضرت محمد گو قریش کے حوالے کرنے سے دلوںک انکار کر دیا جس کے نتیجے میں خاندان بنوہاشم کا سوشنل بائیکاٹ کر دیا گیا اور جناب ابوطالب ایمان نہ لاتے ہوئے بھی اپنے بھتیجے کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ یہ بائیکاٹ تین سال جاری رہا، بھوک اور فقر و فاقہ نے اس گھٹائی میں ڈیرے ڈال رکھے تھے اور بچوں کی بھوک اور پیاس پر تباہی لگانے والے بھی موجود تھے۔ مگر نہ جناب رسول اللہ نے اپنے موقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی

اور نہ ہی کسی مرحلہ میں جناب ابوطالب کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر کچھ عقائد و کی بات مان لیتا تو خاندان بونا شم پر بھوک اور فقر و فاقہ کی یہ مصیبت نہ ٹوٹی۔

### کربلا کا محاصرہ

یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت سیدہ فاطمہؓ کے لخت گجر ہیں جن کا نام حضرت امام حسینؑ ہے۔ انہوں نے امیر المومنین حضرت معاویہؓ وفات کے بعد ان کے بیٹے یزید کو خلیفہ مانتے اور اس کی بیعت سے انکار کر دیا ہے۔ حضرت حسینؑ کو فے والوں نے خطوط لکھ کر بیان کر دیا کہ آپ تشریف لائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہیں۔ وہ مدینہ منورہ سے خاندان سمیت چل پڑے مگر کربلا تک پہنچنے پہنچنے صورتحال تبدیل ہو گئی۔ کوئے پر یزید کے گورنراہن زیاد کا نکشوں قائم ہو چکا تھا۔ حضرت امام حسینؑ کے نمائندے حضرت مسلم بن عقیلؑ یو شہید کیا جا چکا تھا اور اب امام حسینؑ کے استقبال کیلئے کوئے سے ان کے عقیدت مندوں کا گردہ نہیں آیا تھا۔ بلکہ مراجحت کیلئے ابن زید کی فوج عمر بن سعد کی کمان میں کربلا پہنچ کر راستہ روکے کھڑی تھی اور حضرت امام حسینؑ سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ یزید کی خلافت تسلیم کرنے کا اعلان کر کے اس کی بیعت کو یا پھر خود کو تھیار ڈال کر ہمارے حوالے کر دو۔

حضرت امام حسینؑ نے فرمایا کہ مجھے یزید کے پاس مشق لے چلو، میں خود اس سے بات کر لوں گا، یا مجھے واپس مدینہ مدینہ جانے دو، میں اپنے گھر بیٹھ جاؤں گا، یا کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو جہاں کافروں کے خلاف کسی معركہ میں مصروف ہو جاؤں گا۔ لشکر کا کمانڈر عمر بن سعد اس پیشکش کو معقول قرار دیتے ہوئے اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ کوئی درمیان کی راہ نکل آئے گی اور خاندان نبوت کے ساتھ مراجحت کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر گورنر کو فہمہ ابن زید کیلئے یہ بات قابل قبول نہ تھی۔ اس نے اپنے کمانڈر کو جواب دیا کہ ہم نے کہہ دیا ہے کہ حسین خود کو ہمارے حوالے کر دیں، اس کے سوا کوئی بات قابل قول نہیں ہے۔ اگر وہ تھیار ڈال کر خود کو تمہارے حوالے نہیں کرتے تو ان کا سر قلم کر کے ہمارے پاس لاو، اگر تم اس بات میں جھجک دکھاؤ گے تو تمہیں بھی عبرتیک سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اب امام حسینؑ کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے کہ سر جھکا کر خود کو ابن زید کے حوالے کرتے ہوئے اپنی اور اپنے خاندان کی عورتوں و بچوں کی جانبیں پاپھر ابن زید کے بھیجے ہوئے لشکر کے ہاتھوں خاندان سمیت ذبح ہونے کیلئے تیار ہو جائیں۔ اس وقت حضرت امام حسینؑ کے گرد و پیش غالباً کوئی دانشور موجود نہیں تھا، کوئی ڈبلومیٹ بھی نہیں تھا، اور شاید کوئی فقیر عصر بھی قریب قریب نہیں تھا۔ ورنہ ”حکمت و دانش“ کا یہ سبق انہیں بھی پڑھایا جا سکتا تھا کہ جب جان بچانے کی اور کوئی صورت ممکن نہ رہے تو سر جھکا لینے میں کوئی حرخ نہیں ہوتا، اور اپنے ساتھ مخصوص بچوں اور عورتوں کو بھی نظرے میں ڈال لینا کوئی عقائد و کی بات نہیں ہے، اور یہ کہ جب طوفان آتا ہے تو عقائد لوگ کھڑے رہنے کی وجاء پہنچ جایا کرتے ہیں اور طوفان کے گزر جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ یا ممکن ہے کہ اصحاب دانش کی کوئی کھیپ وہاں موجود ہو اور اس نے مشوروں سے نوازا بھی ہو مگر امام حسینؑ نے ان مشوروں کو درخواست، سمجھتے ہوئے اپنے انکار کا بھرم قائم رکھنے کو ترجیح دی۔ اور تاریخ کاریکارڈ بھی کہتا ہے کہ امام حسینؑ نے جب وہ قبر کی رعونت کے سامنے سر جھکا نے کا

راس استغفار نہیں کیا اور خاندان کے معصوم پکوں اور خوبین سمت مقدس جانوں کا نذر انہیں پیش کر کے بتا دیا کہ سب لوگ سرجھ کانے والے نہیں ہوتے، کچھ سراٹھا کر بھی چلتے ہیں، اور یہی لوگ تاریخ کے روشن ابواب کا عنوان ہوا کرتے ہیں۔

## شیر کی ایک دن کی زندگی

یہ میسوسور ہے۔ سلطان حیدر علی کا میسوسور، اور سلطان فتح علی ٹپو کا میسوسور جو بر صیر پاک و ہندو بلکہ دلش میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف مراجحت کا آخری مورچ تھا اور جس مورچے پر قابض ہونے کے بعد انگریز حکمرانوں کو یہ اعلان کرنے کا حوصلہ ہوا تھا کہ ”آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔“

بیگان میں نواب سراج الدولہ شہیدیگی شکست کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس اقتدار اور نوآبادیاتی تسلط کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کے طور پر سلطان فتح علی ٹپو بر صیر پاک و ہندو بلکہ دلش میں تحریک آئی جنگ لڑ رہا تھا، اور تمہارہ رہا تھا۔ پڑوس کی مسلم ریاست حیدر آباد نے ٹپو کا ساتھ دینے کی بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کیپ میں رہنے کو ترقیجی اور ترکی کی خلافت عثمانیہ مدد کیلئے سلطان ٹپو کی درخواست مسترد کر کے اسے انگریزوں کے خلاف مراجحت نہ کرنے کی تلقین کر چکی تھی۔ مگر سلطان ٹپو کا جنون کسی بات کی پرواہیں کر رہا تھا، نہ اسے حیدر آباد کی مسلم ریاست کی پالیسی کی کچھ پرواہ ہے، اور نہ خلافت عثمانیہ کی تلقین سے کوئی ڈچپی۔ بلکہ اس پر ایک ہی جنون سوار ہے کہ کسی طرح بر صیر پاک و ہندوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا جائے اور سلطنت خداداد میسوسور کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان کی آزادی کی حفاظت کی جائے۔

یہ وہ وقت تھا جب برطانیہ اور فرانس بھی ایک دوسرے کے دشمن تھے اور بر صیر پاک و ہندوں فرانسیسی بھی برطانیہ کی طرح قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلطان ٹپو نے اس کشمکش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس نے فرانسیسیوں کا تعاون حاصل کرنے کیلئے ان کے کچھ لوگوں کو اپنی افواج میں شامل کر لیا۔ یہ بات برطانوی حکمرانوں کیلئے اشتعال اور غیظ و غضب کا باعث بنی اور انہوں نے اسے بہانہ بن کر دھمکی دی کہ ہمارے دشمن فرانسیسیوں کو فوج سے بکال دوورنے جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ سلطان ٹپو بھجو رہا تھا کہ انگریزوں نے اس کی سلطنت پر حملہ تو ویسے بھی کرنا ہے مگر وہ اس کیلئے فرانسیسیوں کی موجودگی کا بہانہ کر رہے ہیں۔ اس لیے اس نے انگریزوں کی کوئی بھی شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ سلطان ٹپو کی فوج کے فرانسیسی افسروں سلطان ٹپو کے پاس آئے اور کہا کہ اگر اس سے انگریزوں کا غاصد و قتی طور پر بختدا ہوتا ہے تو یہیں کوئی اعتراض نہیں، آپ ہمیں ان کے حوالے کر دیں۔ اس وقت بھی کسی نہ کسی دانشور، ٹپو میٹ، یافقیہ عصر نے سلطان ٹپو کو یہ مشورہ ضرور دیا ہو گا کہ کوئی حرب کی بات نہیں، وقت بکالو اور سر پر آئی ہوئی جنگ کو سر دست ثالثے کی کوشش کرو کہ یہ حکمت دانش کا راستہ بھی ہے اور عقلمندی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مگر سلطان ٹپو نے کسی بھی مشورے پر کان نہ دھرا، تمام شرطیں بے نیازی کے ساتھ مسترد کرتے ہوئے میدان جنگ میں دشمن کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ہزاروں جاں ثاروں کی قربانی پیش کر کے خود بھی حریت پسندوں اور عزم و استقامت کی شاہراہ کے مسافروں کو یہ سبق دیتے ہوئے اپنی جان پر کھلیں گیا کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیوڑی کی سوسائی کی زندگی سے بہتر ہے۔“

## دہشت گردی یا حریت پسندی؟

روزنامہ پاکستان، لاپور۔ ۲۵ نومبر ۲۰۰۱ء

امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل نے یہ کہہ کر ایک بار پھر امریکی اتحادی کی حاليہ جنگ کے اصل مقصد کو واضح کر دیا ہے کہ ”جب تک تہذیب مکمل طور پر محفوظ نہیں ہو جاتی، دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رہے گی۔“ اس سے قبل جنگ کے آغاز میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بیش نے اس جنگ کیلئے ”صلیبی جنگ“ کی اصطلاح استعمال کی تھی اور اس کے بعد ایک موقع پر کہا تھا کہ ہم تہذیب کے تحفظ کیلئے لڑ رہے ہیں۔ اور اٹلی کے وزیر عظم نے مغربی تہذیب کی برتری کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا تھا کہ اس تہذیب کی حفاظت کی جائے گی۔ اور برطانوی وزیر عظم ٹونی بلیئرنے اپنے مضمون میں، جو روز نامہ جنگ لندن میں ۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا تھا، طالبان حکومت کو چارچ شیٹ کرتے ہوئے صاف طور پر کہا تھا کہ ”وہ ایک دقینوں اور غیر وادار نظام پوری مسلمان دنیا کو برآمد کرنا چاہتے ہیں۔“

صور تھاں یہ ہے کہ جس ”دہشت گردی“ کے خلاف مغرب نے جنگ شروع کی ہے اس کی کوئی تعریف معین نہیں ہے جبکہ عالمی رائے عامہ کے بہت سے لیئر بار بار مطالبہ کر رہے ہیں کہ دہشت گردی کی واضح تعریف معین کی جائے اور اس کی حدود واضح کی جائیں تاکہ آزادی کی تحریکات اور جبر و تشدد کے خلاف دفاع کیلئے ہتھیار اٹھانے والے مظلوموں کو دہشت گردی کے الزام سے الگ کیا جاسکے۔ مگرناہ قوامِ متعددہ اور نہیں ہی حملہ آور قوام اس کی طرف توجہ دینے کیلئے تیار ہیں۔ انہوں نے دہشت گردی کا کوئی معین مفہوم مطے کیے بغیر جنگ کا بگل بجادا ہے جس کا مطلب اس کے سوچ کچھ نہیں ہے کہ انہیں دہشت گردی یا اس کے خاتمہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ صرف دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارثہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں تاکہ جس کا نام وہ چاہیں اس پر لکھ کر اس کے خلاف کارروائی کر سکیں۔

چند سال قبل سے واقعات کے تسلسل کو اس کے اصل تناظر میں دیکھیں تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب افغانستان میں روی جاریت کے خلاف جہاد آزادی جاری تھا اور ابھی روی افواج نے افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، البتہ یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ افغان مجاہدین کا راستہ روکنا باب زیادہ درست تک ممکن نہیں ہو گا اور روی افواج کو بالآخر افغانستان سے نکلنا ہو گا، اس وقت امریکہ کے ایک سماق صدر جناب نکسن تمام تراختلافات اور محاذ آرائی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے روس پہنچ گئے تھے اور انہوں نے روی دانشوروں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ہماری جنگ کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں جودی بیداری ابھر رہی ہے اور جہادی تحریکات جس طرح منظم ہو رہی ہیں وہ ہم دونوں کیلئے مشترکہ خطرہ ہیں، اس لیے ہمیں باہمی محاذ آرائی ترک کر کے اس مشترک دشمن سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کرنی چاہیے۔

سابق امریکی صدر نکسن کے اس دورہ روس کے بعد امریکہ اور روس میں گنتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور افغانستان سے روی فوجوں کی واپسی کے حالات سامنے آئے تھے۔ اس موقع پر روی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان میں حکومت کے معاملات کو جان بوجھ کر مبہم چھوڑ دیا گیا تھا اور پاکستان کے صدر جزل ضیاء الحق مرحوم اور وزیر عظم جناب محمد خان جو نجی مرحوم کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات کا پس منظر بھی بھی تھا۔ صدر جزل ضیاء الحق مرحوم روی

فوجوں کی واپسی سے قبل کابل کی حکومت کا معاملہ طے کرنا چاہتے تھے تاکہ مجاہدین رو سی فوجوں کے جانے کے بعد افغانستان کی حکومت سنہال نہیں، جبکہ جو نیجہ مرحوم کابل کی حکومت کا معاملہ طے کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور رو سی افواج کی واپسی کے بعد کابل کی حکومت کا معاملہ ممکن چھوڑ دیتے ہیں کیا بات اتفاقی نہیں بلکہ امریکہ اور روس دونوں کی طے شدہ تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ روس کی واپسی کے بعد مختلف افغان گروپوں میں اقتدار کیلئے کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، اسے باہر سے ایندھن فراہم کیا جاتا رہے گا، اور مجاہدین کی وہ اسلامی نظریاتی ریاست وجود میں نہیں آسکے گی جسے امریکہ اور روس دونوں اپنے لیے مشترکہ خطرہ سمجھ رہے تھے۔

آج مغربی لیڈر بار بار یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے افغانستان کو روس کے خلاف جنگ کے بعد اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور اب وہ ایسا نہیں کریں گے۔ حالانکہ یہ سرسری بات نہیں بلکہ طے شدہ منصوبے کا حصہ تھی جس کا مقصد واضح تھا کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف گروپ کابل کی حکومت کیلئے ایک دوسرے کے خلاف مستقل طور پر صرف آراء ہوں اور جب وہ تحکم ہار کر باہر سے تعاون اور امداد کیلئے رجوع کریں تو امریکہ اور روس باہمی مشورہ سے وہاں کوئی ایسا حکومت بنوادیں جو ان کے عالمی نظام میں تو شریک ہو لیکن افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کا ذریعہ نہ بن سکے۔ مگر مجاہدین کے مختلف گروپوں میں طویل خانہ جنگی کے بعد عمل میں سامنے آنے والے طالبان نے افغانستان کے ایک بڑے حصے کو خانہ جنگی سے نجات دلا کر اور ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم کر کے اس منصوبے میں رخنہ ڈال دیا۔ انہوں نے نہ صرف امن و امان کی صورتحال کو سلی بخش بنایا بلکہ افغان معاشرے کو ہتھیاروں سے پاک کرنے اور ہیر و تن کے کاروبار کو مکمل طور پر بند کرنے کا محیر العقول کارنامہ بھی سرانجام دے ڈالا۔ اگر وہ اپنے اس عمل کے ساتھ اسلام کا نام نہ لیتے اور قرآن و سنت کے احکام و قوینین کے نفاذ کی بات نہ کرتے تو آج وہ دنیا میں ایک آئندہ میں گورنمنٹ اور ایک ہیر و پارٹی کے طور پر متعارف ہوتے اور انہیں پوری دنیا میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ طالبان کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے صاف طور پر اعلان کیا کہ وہ سب کچھ اسلام کیلئے کر رہے ہیں اور اسلامی احکام کے تحت کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں مغرب کے نظام، فلسفہ، اور تہذیب کیلئے خطرہ سمجھ لیا گیا اور ایسا سمجھنے والوں نے کوئی غلطی نہیں کی کیونکہ

1. خانہ جنگی سے نجات،

2. اسلامی قوانین کے ذریعے معاشرتی جرائم پر کنشروں،

3. لاءِ ایڈ ارڈر کی مثالی صورت حال،

4. منیات کا مکمل خاتمه، اور

5. بیرونی قرضوں سے بے نیازی اختیار کر کے سادگی اور قناعت کے ساتھ نظام حکومت چلانے کی جو روشن انہوں نے کامیابی کے ساتھ اپنالی تھی اگر انہیں اس پر آٹھ دس سال تک چلنے کا موقع دیا جاتا تو دنیا کے سامنے فی الواقع ایک ایسی ریاست اور معاشرے کا نقشہ علمی طور پر آجاتا جس کے سامنے مغربی فلسفہ و نظام اور تہذیب و

شقافت کا چراغ زیادہ دیر تک نہ مل سکتا۔ اور کم از کم عالم اسلام کے متعدد ممالک میں اس طرز کے نظام حکومت اور فلسفہ حیات کی علمبردار دینی قوتوں کو تقویت حاصل ہوتی اور اسلامی نظام کی طرف مسلم ممالک کی وابہی کی راہ کھل جاتی۔ اس کے علاوہ تاریخ کے ریکارڈ پر ایک اور شہادت بھی موجود ہے کہ جب سوویت یونین کے خاتمه کے بعد نیٹو کے اس وقت کے سیکرٹری جنرل سے پوچھا گیا کہ نیٹو کا قیام ہی سوویت یونین کے خلاف عمل میں لایا گیا تھا تواب سوویت یونین کے عالمی منظر سے ہٹ جانے کے بعد نیٹو کو باقی رکھنے کا کیا جواز ہے؟ تو انہوں نے بے ساختہ کہہ دیا تھا کہ ”ابھی اسلام باقی ہے۔“ چنانچہ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر مغربی لیڈروں نے جس نئی جنگ بلکہ عالمی دہشت گردی کا آغاز کیا ہے وہ دراصل عالم اسلام میں دینی ہیداری کی ابھرتی ہوئی لہر کو دبائے اور مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے غاصبانہ سلطاط کے خلاف منظم ہونے والی مسلح جہادی تحریکات کو کچھنے کیلئے ہے۔ تاکہ دنیا میں کوئی ایسی نظریاتی اسلامی ریاست قائم نہ ہوپائے جو اس وقت دنیا میں موجود استحصالی نظام، مغرب کی مادر پر آزاد شقافت، اور لا دینی فلسفہ کیلئے خطرہ بن سکے۔ اور اس جنگ میں مسلم ممالک کے وہ تمام حکمران گروہ اور طبقات مغرب کے ساتھ شریک اور اس کے فطری حلیف ہیں جو مغرب کے پروردہ ہیں اور مغرب کی نمائندگی کرتے ہوئے عالم اسلام کی سیاست و معیشت اور ٹکڑوں کو مغرب کے ہاتھوں گروہ کر کر اپنے اقتدار اور عیاشیوں کو طول دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سب کچھ سے قطع نظر مغربی لیڈروں بالخصوص جارج ڈبلیو بش، ٹوینی بائسر، اور کولن پاؤل سے یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جناب! تہذیب و ثقافت کی جنگ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ اخلاقی اقدار کے سہارے اڑی جاتی ہے اور جن تہذیبوں کی اخلاقی اقدار و روایات بے حوصلہ ہو جائیں، ہتھیاروں کی جھنکار ان کو کبھی سہارا نہیں دیا کرتی۔ کیا یہ مغربی لیڈر تاریخ کے اس نوشتہ پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کریں گے؟

## افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت: پاکستان کیوں مجبور تھا؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ نومبر ۲۰۰۱ء

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے جبکہ تمہاری بہت سی حرکتیں اللہ تعالیٰ در گزر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ فاطر کی آخری آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اہل زمین کی ہر حرکت پر گرفت شروع کر دیں تو روئے زمین پر ایک کیڑا بھی رینگنے نہ پائے لیکن اللہ تعالیٰ اکثر معاملات کو مؤخر کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ انسانی سوسائٹی میں جو مصیبت اور پریشانی بھی آتی ہے وہ انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے اکثر اعمال کو در گزر کر دیتے ہیں یا آخرت کے دن کیلئے مؤخر کر دیتے ہیں۔ اور صرف بعض باتوں کا اس دنیا میں موادخہ فرماتے ہیں جس کے نتیجے میں

انسانی سوسائٹی مشکلات و مصائب سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اس قانون اور ضابطے کے بیان کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ روئے زمین پر انسان اس کائنات کے خالق والک کے احکام و قوانین کی جس قدر پابندی کرے گا اسی قدر فساد اور خرابی سے محفوظ رہے گا۔ اور جہاں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و فرمانیں سے ہٹ کر من مانی اختیار کرے گا یہ بات نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنے گی بلکہ اس سے سوسائٹی کے نظام میں بھی بگاڑ پیدا ہو گا اور اس بگاڑ کے اثرات پورے معاشرے پر مجموعی طور پر پڑیں گے۔ ایک سادہ سی مثال سے اس بات کو سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک مشینری بنا نے والی فرم اپنی مشینری کو مارکیٹ میں سمجھنے کے ساتھ اس کا تعارف اور اس کے چلانے کیلئے ہدایات بھی بھجواتی ہے۔ اگر مشین کو ان ہدایات کے مطابق چلایا جائے گا تو صحیح چلتی رہے گی اور اگر چلانے والے ہدایات کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی سے مشینری کو چلانے کی کوشش کریں گے تو خرابیاں پیدا ہوں گی اور مشین صحیح طریقے سے کام نہیں کر پائے گی۔ انسانی سوسائٹی بھی ایک مشینری ہے جس کے پر زے انسان ہیں۔ ہم اس مشین اور اس کے پرزوں کو بنانے والے نہیں بلکہ استعمال کرنے والے ہیں۔ بنانے والی ذات اور ہے جس نے اس ساری کائنات کو بنایا ہے اور وہ اسے کشوں بھی کر رہا ہے۔ جبکہ ہمیں اس نے وحی الہی اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے ذریعے واضح ہدایات دی ہیں کہ انسانی معاشرہ کے اجتماعی نظم اور اس کے کل پرزوں کے طور پر انسانی افراد اپنے شخصی نظام کو بنانے والے کی ہدایات کے مطابق چلاتے رہیں گے تو یہ مشینری اپنے مقاصد کیلئے کام کرتی رہے گی ورنہ فساد و نما ہو گا اور خرابیاں پیدا ہوں گی۔

انسانی معاشرہ میں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے مصائب و مشکلات اور تکالیف و آلام میں خود انسانی اعمال کے سبب کے طور پر کار فرما ہونے کا ایک پہلو تو باطنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نافرمانیوں سے ناراض ہوتے ہیں اور جب ان کی ناراضگی بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کا اظہار سزا و عذاب کے طور پر انسانی سوسائٹی کے کسی نہ کسی حصے میں ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر ظاہری اسباب کے حوالے سے دیکھا جائے اور انسانی معاشرہ میں روزمرہ آنے والی مصیبتوں، آزمائشوں اور آنکتوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی انسانی غلطی اور کچھ لوگوں کی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور دکھائی دے جاتی ہے اور صاف طور پر بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بحران اور الیہ فلاں غلطی اور حرکت کے نتیجے میں پیش آیا ہے۔

دور حاضر میں عالم اسلام کے دو بڑے المیوں کا طور مثال ذکر کیا جائے تو ایک فلسطین کا مسئلہ ہے اور دوسرा افغانستان کے حوالے سے پاکستان پر عالمی جبر کا معاملہ ہے جس نے حکومت کو اپنے ملک کے مفادات اور عوام کے جذبات کی پروارکیے بغیر افغانستان پر مغربی حملہ آوروں کا ساتھی بننے پر مجبور کر دیا۔ فلسطین کا مسئلہ ہمارے سامنے ہے کہ فلسطین کے عوام در بر پھر رہے ہیں اور اسرائیل کے علاقوں پر قابض ہو کر اسرائیلی ریاست قائم کر چکا ہے بلکہ اسرائیل کے اصل دائرہ سے باہر بھی انہیں ایک فلسطینی قوم کی حیثیت سے آزاد ریاست کے قیام کا حق دینے پر تیار نہیں ہے۔ فلسطینی اپنی آزادی اور آزاد ریاست کے قیام کیلئے جنگ اٹھ رہے ہیں، ان کا قتل عام ہو رہا ہے لیکن عالمی سطح پر ان کی شنوائی اور دادرسی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

مسئلہ فلسطین کی ابتداء کا جائزہ لیں تو یہ بات تاریخ کے ریکارڈ میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ آج سے ایک صدی

قبل فلسطین میں یہودیوں کی کوئی آبادی نہیں تھی، فلسطین ترکی کی خلافت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا جبکہ عالمی یہودی تنظیم کے راہنمائیک دوباروں کا بار بار طواف کر رہے تھے کہ انہیں فلسطین میں بننے کی اجازت دی جائے۔ مگر خلافت عثمانیہ اس کیلئے تیار نہیں تھی۔ خلیفہ عثمانی سلطان عبد الحمید شانی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ عالمی صیہونی تحریک کا لیڈر ہر تزل کئی بار اس سے ملا اور فلسطین میں جگہ خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر سلطان موصوف پوئنکہ اسرائیلی ریاست کے قیام کے سلسلہ میں یہودیوں کے عزائم سے آگاہ تھے اس لیے انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ خلافت عثمانیہ کے زیر کنٹرول کسی اور علاقے میں یہودیوں کو حصتی وہ چاہیں زمین بلا معاوضہ دی جاسکتی ہے لیکن فلسطین کی ایک انج زمین بھی یہودیوں کو دینے کیلئے وہ تیار نہیں ہیں۔ اسی کی پاداش میں سلطان عبد الحمید کے خلاف ترکی میں تحریک منظم کی گئی۔ سلطان نے لکھا ہے کہ اس کیلئے وہ لمحہ زندگی کا سب سے زیادہ صدمہ و حرست کالمح تھا جب اسے خلافت سے معزولی کا پروانہ دینے کیلئے وہ یہودی آیا جو چند سال قبل ہر تزل کے ساتھ سلطان سے فلسطین میں زمین حاصل کرنے کی درخواست لے کر آیا تھا۔

سلطان عبد الحمید معزول ہو گئے اور اس کے بعد آنے والے بعض خلفاء کو رام کر لیا گیا بلکہ رفتہ رفتہ خلافت کا نظام ہی ختم کر دیا گیا۔ اب یہودیوں نے فلسطین میں زمین کی خریداری کا کام شروع کیا تو کوئی ریاتی ادارہ اس کی روک تھام کیلئے موجود نہیں تھا۔ چنانچہ اس خلاء کو علماء کرام نے پر کیا اور آگے بڑھ کر یہ فتویٰ دیا کہ فلسطین کی زمین یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ میں نے اس فتویٰ کے بارے میں سن رکھا تھا مگر فتویٰ ریکارڈ میں مل نہیں رہا تھا۔ گذشتہ دونوں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی آخری تصنیف ”بودار المنادر“ کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس میں یہ فتویٰ مل گیا۔ یہ سوال ان سے بھی کیا گیا تھا اور اس پر ان کا فتویٰ ۱۳۵۵ھ کا جاری کردہ ہے یعنی اب سے کوئی ستر برس قبل۔ گویا یہی وہ دور تھا جب یہودی فلسطین میں وسیع پیمانے پر زمینوں کی خریداری کر رہے تھے اور فلسطینی دگنیٰ تینی قیمت کی لائچ میں اپنی زمینیں یہودیوں کو فروخت کر رہے تھے۔ اس پر علماء کرام نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے فتویٰ صادر کیا کہ چونکہ فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا منصوبہ سامنے آچکا ہے اور زمین خرید کر وہ اس کیلئے بیس بنا تھا جب تک ہیں اس لیے فلسطین میں یہودیوں کو زمین فروخت کرنا شرعاً حرام ہے۔ اس فتویٰ کو مولوی کی دیوانگی قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا اور فلسطینیوں نے دگنیٰ تینی قیمتوں پر اپنی زمینیں فروخت کر کے یہودیوں سے دام کھرے کیے جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

افغانستان کے مسئلہ میں حکومت پاکستان کی موجودہ پالیسی کو عالمی جبرا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ مگر اس بے بُسی اور مجرموں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں یہ بات سرہست دکھائی دیتی ہے کہ امیر ممالک اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے لیے ہوئے قرضے ہمارے لیے وباں جان بن گئے ہیں اور قرضوں کے اس خوفناک جاں نے ہماری معیشت کے ساتھ ساتھ قومی پالیسیوں اور ملی مفادات کو بھی جکڑ لیا ہے۔ اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ ہم شمال مشرقی سرحد پر ایک دوست حکومت سے محروم ہو چکے ہیں بلکہ اس سے خود کو محروم کرنے کے عمل میں ہم خود بھی شریک ہیں۔ ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے خاتمه کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے

اور افغانستان میں بیشتر علاقوں پر کنٹرول رکھنے والی حکومت کو ختم کر کے قبائلی نگاش اور خانہ جنگی کا دور دا پس لانے میں ہم بھی شریک ہیں۔

مگر اس سے قلعے نظر اس کے ایک سبب بلکہ سب سے بڑے سبب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کچھ شریف لوگ اس وقت بھی ہمیں سمجھا رہے تھے، جب ہم قرضوں کے سہارے اپنی معيشت کا ڈھانچہ تشقیل دینے میں مصروف تھے، کہ قرضوں کے چکر میں نہ پڑو، اپنی چادر کے مطابق پاؤں پچھلانا یکھواڑ اور تعیش و لگزشی کا ماحول ختم کر کے اسلامی نظام اور خلفاء راشدین کے طرز عمل کے مطابق سادگی و قناعت کا راستہ اختیار کرو۔ مگر سادگی کے اس سبق اور تلقین کو بھی سادگی پر محدود کر لیا گیا اور کہا گیا کہ یہ لوگ تو آج کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، علمی ماحول سے بے گانہ ہیں، اور جدید دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی سوچ سے محروم ہیں۔ اس بات کو بھی ایک لمحہ لکھنے بھول جائیے کہ یہ قرضے کن لوگوں نے حاصل کیے، کہاں استعمال ہوئے اور اب بھی مغربی ملکوں کے بیانوں میں کس کس کے اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ ان قرضوں نے قوم کو بے بُسی اور لاچاری کے کس مقام پر پہنچا دیا ہے؟ اور یہی مفہوم ہے سورۃ اشوریٰ کی آیت ۳۰ کا کہ ”تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔“

## افغانستان میں طویل جنگ کا ایک نیا دور

مہمانہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۱ء

افغانستان میں امریکی اتحاد کی وحیانہ بمباری بدستور جاری ہے اور اس بمباری کی مدد سے شمالی اتحاد نے کابل، ہرات اور مزار شریف سمیت بہت سے شہروں کا کنٹرول حاصل کر لیا ہے، جبکہ قندھار میں محصور طالبان پر بمباری ہو رہی ہے اور قندھار ملکتہ علاقوں سمیت طالبان کے قبضے میں ہے۔

طالبان کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے شہری آبادی کو امریکی بمباری سے بچانے اور اپنی جگلی حکمتِ عملی کو نیا رخ دینے کیلئے کابل اور دیگر شہر خالی کیے ہیں، امریکی اتحاد سے نکالت قبول کرنے کی بجائے نئی حکمتِ عملی کے تحت طویل جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا ہے، اور افغانستان سے امریکی تسلط کے خاتمه تک ان کی جدوجہد جاری رہے گی۔

حالات نے اب تک جو رخ اختیار کیا ہے اس کے پیش نظر افغانستان میں مستقبل کے حوالے سے دو امکانات دکھائی دے رہے ہیں:

1. ایک یہ کہ طالبان قندھار اور جنوبی افغانستان کے چند دیگر علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں اگر کامیاب رہے تو افغانستان ”جنوبی افغانستان“ اور ”شمالی افغانستان“ کے ناموں سے دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ اسی طرح جیسے امریکی مداخلت سے کوریا اور ویتنام جنوبی اور شمالی حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے، جس کے بعد ویتنام تو طویل گوریلا جنگ کے نتیجے میں امریکی تسلط سے نجات حاصل کر کے دوبارہ محمد ہو گیا، مگر شمالی کو یا اور جنوبی کو یا کی تقسیم ابھی تک قائم ہے۔ قندھار پر طالبان کا کنٹرول قائم رکھنے کی صورت میں افغانستان کی

یہ تقسیم نمایاں ہوتی نظر آرہی ہے۔ سرِ دست یہی ہو گا اور اس کے بعد اگر طالبان شمالی افغانستان کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھ سکے تو ویتنام کی طرح جانگل لڑائی کے بعد افغانستان کے دوبارہ متحد ہونے کے امکانات موجود ہیں۔

2. اور اگر خدا نخواستے قندھار بھی طالبان کے ہاتھ سے نکل گیا اور طالبان نے شکست قول نہ کرتے ہوئے جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ قائم رکھا تو پھر وہی صورت عود کر آئے گی جو کابل میں روشنی فوجوں کی آمد کے وقت تھی کہ کابل پر روس نواز بیرک کار مل اور ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت تھی، جس کے کنشروں میں کابل اور دیگر شہر تھے۔ جبکہ افغان مجاہدین شہروں سے باہر پہنچوں پر مورچے بن کر گوریلا کارروائیاں کر رہے تھے، اور انہی گوریلا کارروائیوں کے تیجے میں انہوں نے نہ صرف روس کو فوجیں واپس بلانے پر مجبور کر دیا تھا بلکہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کابل میں روس نواز حکومت بھی اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکی تھی۔

بہر حال جو صورت بھی ہوا افغانستان ایک نئی اور طویل جنگ کے دور میں داخل ہو رہا ہے، جس میں ایک طرف امریکہ اور روس سیاست کم و بیش سمجھی بڑے ممالک ہیں، اور مسلم حکومتوں کی مجموعی طاقت بھی انہیں کے ساتھ ہے، جبکہ دوسری طرف طالبان ہیں جنہیں عالم اسلام کے دینی حلقوں کی حمایت و تعاون حاصل ہے۔

ہمیں لیکن ہے کہ اگر طالبان اپنے موقف اور عزم پر قائم رہے تو وقت پسپائی کا یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں ہو گا اور افغانستان ایک اسلامی ریاست کے طور پر اپنا شخص باقی رکھنے میں ضرور کامیاب ہو گا۔ نظریہ اور عقیدہ کی جنگوں میں پلاسی، سرنگا پشم، بالا کوٹ اور ۱۸۵۱ء کے مراحل آیا کرتے ہیں، اور ان آزمائشوں سے گزر کر اپنے مشن اور پروگرام پر قائم رہنے والی قومیں بالآخر آزادی کی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جایا کرتی ہیں، اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو، آمین یارب العالمین۔

## تہذیبی جنگ کا تحفظ: امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل کا عندیہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۱ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۲۱ نومبر ۲۰۰۱ء کے اداریہ میں امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل کے ان ریمارکس کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ”جب تک تہذیب مکمل طور پر محفوظ نہیں ہو جاتی دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رہے گی“

گویا کولن پاؤل نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اصل مسئلہ دہشت گردی کا نہیں بلکہ ”تہذیب کے تحفظ“ کا

ہے، اور امریکی اتحاد کی جنگِ دہشتِ گردی کے خلاف نہیں بلکہ مغربی تہذیب و ثقافت کو بچانے کیلئے ہے، جسے مغربی لیڈروں کے بقول افغانستان میں ایک نئی تہذیب کے ابھرنے سے خطراتِ لاحق ہو گئے ہیں۔

ہم ایک عرصہ سے یہ عرض کر رہے ہیں کہ مغرب اور عالمِ اسلام کے درمیان کشمکشِ نظریہ اور ثقافت کی کشمکش ہے، جس کے ساتھ عالمِ اسلام کے معاشری وسائل پر کنٹرول کا ہدف بھی شامل ہو گیا ہے۔ اور افغانستان میں امریکیہ کی معزز کر آرائی صرف اسامہ بن لادن اور ان کے نیٹ ورک کو تباہ کرنے کیلئے نہیں بلکہ طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو ختم کرنے اور وسطیٰ ایشیا میں زیر زمین موجود تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کا کنٹرول حاصل کرنے کیلئے ہے۔ اور اسی وجہ سے امریکہ اس خط میں مستقل طور پر موجود رہنے کی راہ ہموار کرتا جا رہا ہے۔

طالبان کی حکومت میں امریکہ کو ایک نئی تہذیب کے ابھرنے یا مغربی تہذیب کیلئے خطرہ بننے کے آثارِ دکھانی دے رہے ہیں، اور انہی آثار کو جڑ سے اکھڑانے کیلئے امریکہ نے افغانستان پر دھشیانہ بمباری کر کے اس کی رہی ہی عمارتوں کو بھی کھنڈرات میں تبدیل کر دیا ہے۔ بہت سے دوستوں کو یہ بات سمجھ نہیں آرہی کہ طالبان کی کمزوری حکومت اور افغان جیسی غریب اور بے سہارا قوم امریکی ثقافت اور مغربی کلچر کیلئے کیسے خطرہ بن سکتی ہے؟ مگر مغربی دانشور اتنے سادہ نہیں کیونکہ انہوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ

- طالبان نے محض عقیدہ اور ایمان کی قوت کے سہارے افغانستان میں اپنے زیرِ قبضہ علاقہ کو مثالی امن و امان فراہم کر دیا۔

- قرآن و سنت کے شرعی احکام و قوانین کی بنیاد پر امام اینڈ آرڈر کی صورت حال کو انتہائی خراب حالات میں بھی بہتر بنانکر ایک دفعہ دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ افغان معاشرہ کو ہتھیاروں اور میثاقیات سے کمل طور پر پاک کر کے اکیسویں صدی میں اسلام کا زندہ مجہزہ دکھایا۔

- علمی سسٹم کو من و عن قبول کرنے کی بجائے اس کے خلافِ اسلام حصول کی نشاندہی کی اور اس حوالے سے اپنے تحفظات کو قائم رکھا۔

- اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی پالیسی اختیار کر کے بیرونی قرضوں اور بین الاقوامی اداروں کے مشروط تعاون کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ اور حکومتی شعبوں میں سادگی اور قناعت کے حوالے سے حضرت عمر بن عبد العزیزؓ یاد تازہ کر دی۔

- نظامِ مملکت کی بنیاد انسانی خواہشات پر رکھنے کی بجائے آسمانی تعلیمات اور قرآن و سنت کے ساتھ بے پلک وابستگی قائم رکھنے کا اعلان کیا۔

یہ اس ”نئی تہذیب“ کے بنیادی خدوخال ہیں جو افغانستان میں ابھرتی نظر آئی اور مغربی لیڈروں نے دیکھا کہ مسلم ممالک کے عوام میں اس نئی تہذیب سے ڈپسی بڑھ رہی ہے اور اس کے حامیوں کو تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ اس لیے اسے مغربی تہذیب کیلئے خطرہ قرار دیتے ہوئے امریکی اتحاد نے اس پر دھاوا بول دیا، اور اب مغربی لیڈر خوش ہو رہے

- بیں کہ انہوں نے اس نئی تہذیب کو بمباری کے ذریعے افغانستان کے چند شہروں میں شکست دے کر مغربی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، لیکن یہ ان کی بھول ہے۔ عقیدہ اور ثقافت کی جنگ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ اخلاق و اقدار کی قوت سے لڑی جاتی ہے، جس کا ایک ہلاکا سا مظاہرہ دنیا نے افغانستان کی اس جنگ میں بھی دیکھ لیا ہے کہ
- ایک طرف امریکی اتحاد کی وحیانہ بمباری سے ہندرات میں تبدیل ہوئے افغان شہر، اور شہائی اتحاد کے انتقام کا نشانہ بننے والے طالبان کی نئی لاشوں کے ڈھیریں،
  - اور دوسری طرف اس حالت میں بھی طالبان نے افغانستان میں گرفتار ہونے والی مغربی خاتون صحافی کو مہمان کے طور پر رکھنے کے بعد رہا کیا ہے، اور عسیائیت کی تبلیغ میں پکڑے جانے والے آٹھ افراد کو کابل چھوڑتے وقت اپنے ساتھ لے جا کر ان کی محفوظ رہائی کو قیمتی بنایا ہے۔ جبکہ انہی میں سے دو خواتین نے رہائی کے بعد اخباری بیانات میں کہا کہ طالبان نے انہیں عزت و احترام کے ساتھ بہنوں کی طرح رکھا۔ دونوں تہذیبوں کے منظر دنیا کے سامنے ہیں اور کوئن پاؤں درست کہتے ہیں کہ یہ تہذیب کے تحفظ کی جنگ ہے۔ البتہ ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو تہذیب اپنے اخلاق و اقدار میں مقابلہ کا حوصلہ نہ پا کر ہتھیار اٹھایا کرتی ہے وہ تاریخ میں کبھی خود کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

## دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارنٹ

مائنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۱ء

- روزنامہ جنگ لاہور ۲۰ نومبر ۲۰۰۱ء کے مطابق دولتِ قطر کے امیر شیخ محمد بن خلیفة الثانی نے گذشتہ روزِ متحده عرب امارات کی مشاورتی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہ دہشت گردی اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ میں بلیک لسٹ کی جانے والی "حزب اللہ" اور دیگر تنظیمیں گیارہ تجسسی دہشت گردی میں ملوث نہیں تھیں، انہیں بلیک لسٹ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ انہوں نے دہشت گردی اور اسلام کے درمیان کسی تعلق کو بھی مکمل طور پر مسترد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ عرب اور اسلامی ممالک نے اسی بنا پر یہ اصولی موقف اختیار کیا ہوا ہے کہ دہشت گردی اور اپنے ملک کو قبضے سے آزاد کرانے کیلئے عوام کی جانب سے کی جانے والی جدوجہد میں واضح فرق ہے۔ قطر کے امیر نے لبنانی تنظیم حزب اللہ اور اپنے ممالک کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والی دیگر حریت پسند تنظیموں کو امریکہ کی جانب سے بلیک لسٹ کرنے کے اقدام کی مخالفت کی ہے۔
- دوسری طرف امریکی صدر جارج ڈبلیو. بیشن نے واشنگٹن میں فلپائنی صدر سے اپنی ملاقات میں انہیں پیش کی ہے کہ فلپائن کے مسلم آکثریتی علاقہ "مورو" کی آزادی کیلئے مسلح جنگ لڑنے والے "ابوسیاف گروپ" سے منشی

کیلئے امریکہ فلپائن کی حکومت سے تعاون کیلئے تیار ہے۔

- اور بھارت میں امریکی سفیر رابرٹ بلیک ویل نے دہلی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دہشت گرد صرف دہشت گرد ہوتے ہیں، انہیں مجاهد آزادی نہیں کہا جاسکتا۔ روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ نومبر ۲۰۰۱ء کے مطابق امریکی سفیر نے واضح طور پر کہا کہ امریکہ اور بھارت کے خلاف دہشت گردی ختم ہونے تک جنگ جاری رہے گی اور کشمیری تنظیموں کے اثنائے شمجد کر دیے جائیں گے۔

گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد جب امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کر کے اس کیلئے متحده محاڑ بنائے کا اعلان کیا تھا تو عالمی سطح پر مطالباً کیا گیا تھا کہ پہلے دہشت گردی کی تعریف معین کی جائے، اور دہشت گردی اور جدو جہد آزادی کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے۔ امریکہ، اقوام متحده اور مغربی لیڈروں میں سے کسی نے اس مطالباً کو درخواستِ اعتناء سمجھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ”دہشت گردی“ کی تعریف معین کر کے اور آزادی کی تحریکات کو مستثنیٰ کر کے خود کو محدود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور اس بات کو مہم رکھ کر دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارثت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے تاکہ اس پر جس کا نام چاہے لکھ لیں اور اسے دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑیں۔ چنانچہ ان کی یہ حکمتِ عملی فلسطین، کشمیر اور مورو کے حوالے سے سامنے آچکی ہے اور رفتہ رفتہ پورے عالمِ اسلام کی تحریکاتِ آزادی کے پارے میں ان کے عزائم کھلتے جا رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں امیر قطر نے دہشت گردی اور جدو جہد آزادی میں فرق کے حوالے سے جن تخفیفات کا اظہار کیا ہے، اور عرب ممالک اور اسلامی ممالک کے جس موقف کا ذکر کیا ہے، اس کے اظہار کا وقت وہ تھا جب وہ امریکہ کے متحده محاڑ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر رہے تھے، اور اقوام متحده میں دہشت گردی کے خلاف امریکی کارروائی کو جواز کی سند دینے کی قرارداد کی حمایت کر رہے تھے۔ اس وقت اگر عرب ممالک اور مسلم ممالک اس موقف پر ڈٹ جاتے اور اس کیلئے عالمی سطح پر لابنگ کر کے اپنے موقف کو منوانے کی سنجیدہ محنت کرتے تو یہ بات منوائی جا سکتی تھی۔ مگر یہ موقع گنوادینے کے بعد اب قطر کے امیر کو دہشت گردی اور جدو جہد آزادی کا فرق یاد آ رہا ہے، جبکہ اقوام متحده اور خود مسلم ممالک کی منظوری کے ساتھ ”دہشت گردی کے الزام کا بے نام وارثت“ امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور اس پر نام درج کرنے کا نام تراختیار وائٹ ہاؤس کے پاس ہے، اس لیے

اب پچھتائے کیا ہوت  
جب چڑیاں چک گئیں کھیت

## وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۵ دسمبر ۲۰۰۱ء

صدر جزل پرویز مشرف نے گذشتہ دونوں ایک گفتگو میں یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ افغانستان کے حوالے سے ان کی

پالیسیوں کے مخالفین دانش اور دلیل کی بجائے جذبات کی بات کر رہے ہیں۔ حیرت کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ کے حالیہ راؤنڈ کے آغاز سے پہلے ہی دلیل اور دانش کو پیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا اور اس کی جگہ طاقت اور دھونس نے لے لی تھی۔ اب جبکہ جنگ خاصی بڑھ چکی ہے اور ایک نئے دور میں داخل ہونے والی ہے تو جزوی پروزی مشرف کو دلیل اور دانش اچانک کیسے یاد آگئی ہے؟

- اد اسکرپٹ کے نیوارک اور پینٹاگون کے سامنحات کے بعد جب امریکہ نے اس کا مجرم اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا تو دلیل اور دانش نے امریکہ سے تقاضا کیا تھا کہ کسی کو مجرم قرار دینے سے پہلے ثبوت فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے اور ان ثبوتوں کے موثر ہونے کا فیصلہ بھی مدعی کی بجائے کوئی غیر جانبدار فورم کیا کرتا ہے۔ لیکن دلیل اور دانش کو یہ کہہ کر چپ کر دیا گیا کہ ہم یہ بات بہتر سمجھتے ہیں اس لیے تم خاموش رہو۔
- امریکہ نے طالبان حکومت سے اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تو طالبان نے دلیل اور دانش کی بات ہی کی تھی کہ ثبوت فراہم کیے جائیں اور فریقین کیلئے قابل X قبول ٹریبوں تکمیل دیا جائے تو وہ اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کیلئے تیار ہیں۔ مگر طالبان کی بات یہ کہہ کر مسترد کر دی گئی کہ چونکہ ہم طاقت رکھتے ہیں اور بالادست ہیں اس لیے ہم خود ہی مدعی، خود ہی گواہ، اور خود ہی نجی ہیں۔ تم ایک غریب اور بے بس قوم ہو اس لیے تمہارے سامنے کوئی ثبوت پیش کرنا اور تمہارے کسی مطالبہ پر توجہ دینا ہمارے اٹیٹس کے منافی بات ہے۔
- امریکہ نے جب اقوام متحده کے سامنے اپنائیں رکھا اور اس سے دہشت گردی کے خلاف کارروائی کیلئے این اوسمی مانگا تو دلیل اور دانش نے ڈرتے ڈرتے وہاں بھی عرض کیا تھا کہ ”دہشت گردی“ کی تعریف طے کر لی جائے اور اس کی حدود متعین کر لی جائیں تاکہ دہشت گردی کے خلاف کارروائی کی زدیں وہ مظلوم اور مجبور اقوام نہ آجائیں جو اپنی آزادی اور شخص کیلئے قابض اور مسلط قوتوں کے خلاف صرف آ رہیں۔ مگر دلیل اور دانش کی آنکھوں پر یہ کہہ کر پیٹی باندھ دی گئی کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا، ابھی امریکہ کو اپنے ایجادے کی تکمیل کرنی ہے، جب وہ ایجادہ کسی فیصلہ کن اسٹیٹ تک پہنچ جائے گا تو دہشت گردی کی تعریف متعین کرنے کی درخواست پر بھی غور کر لیا جائے گا۔

- امریکہ نے افغانستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے پوری دنیا کو وارنگ دی کہ جو اس جنگ میں عملی طور پر ہمارا ساتھ نہیں دے گا اور دہشت گردی کے خلاف ہمارے اتحاد کا سرگرم رکن نہیں بننے گا اسے دشمن تصور کیا جائے گا۔ دلیل اور دانش نے اس وقت بھی اپنا فرض ادا کیا تھا کہ جنگ میں کسی ایک طرف فریق بننے کی بجائے ایک راستہ غیر جانبدار رہنے کا بھی ہوتا ہے جو ہر شخص اور قوم کا حق سمجھا جاتا ہے، اس حق سے ملکوں اور قوموں کو محروم کر دینا داشتمانی کی بات نہیں ہے۔ مگر دلیل اور دانش کے بیوں پر یہ کہہ کر ٹیپ لگادی گئی کہ

- ہر معاملہ میں تمہارا بولنا ضروری نہیں ہے کبھی چپ بھی ہو جایا کرو۔ • امریکہ نے پاکستان کو جنگ میں فرنٹ لائن اسٹیٹ قرار دے کر اس سے فوری طور پر جواب مانگا کہ دو ڈوک طور پر یہ فو ایتا کہ تم کس کے ساتھ ہو؟ دلیل اور داشت نے اس وقت بھی جھبھری لی تھی اور زیر لب منمنائی تھی کہ یہ قوی خود مختاری کے تصور کے خلاف بات ہے۔ اور پاکستان سے کسی معاملہ میں آزادانہ فضا میں فیصلہ کرنے کا حق ہی سرے سے چھین لینا اقوام متعدد کے ان اصولوں کے بھی منافی ہے جس کا ہیڈ کوارٹر خود امریکہ کے شہر نیویارک میں ہے۔ مگر یہ کہنے پر دلیل اور داشت کے منہ پر الٹے ہاتھ کی ایسی زور دار چیخت پڑی تھی کہ اسے دوبارہ یہ بات کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ • امریکہ نے ولڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات میں اسامہ بن لادن کے ملوث ہونے کے شواہد پیش کیے اور برطانوی حکومت نے بڑے اہتمام سے انہیں پریس کیلئے جاری کیا تو دلیل اور داشت نے برطانوی پریس اور ممتاز برطانوی ماہرین قانون کا سہارا لے کر ان کی زبان سے کہا تھا کہ ان پیش کردہ شواہد کی بنیاد پر تو کسی کیس کو قابلِ سماعت قرار دینا اور مجرم پر فرد جرم عائد کرنا یہ سرے سے مشکل ہے۔ اسے مجرم قرار دینا اور اس کیلئے سزا کا اعلان کرنا ان شواہد کے حوالے سے کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر دلیل اور داشت کی اس بات کا جواب یہ دیا گیا کہ ثبوت فراہم کرنا، انہیں عدالت میں پیش کرنے کے قابل بناانا، اور ان پر مخالفانہ دلائل کا سامنا کرنا، یہ سب ترقی یافتہ اور امیر ملکوں کے چونچلے ہیں۔ غریب اور بے بس ملکوں میں ان کا کیا کام؟ ان کیلئے تو صرف ہمارا فرمان کافی ہے، اس لیے اگر ہم نے انہیں دہشت گرد کہہ دیا ہے تو وہ دہشت گرد ہیں۔ دلیل اور داشت کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ • امریکی طیاروں نے افغانستان کے بھوکے، نہتے اور بے قصور عام شہریوں کو بمباری کا نشانہ بنانا شروع کیا تو دلیل اور داشت نے گزارش کی تھی کہ شہریوں پر بمباری کرنا اور انہیں بلا وجہ موت کے گھاٹ اتنا عقائدندی کی بات نہیں ہے۔ اگر امریکی سراغر سماں ادارے اپنے اهداف کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تو ان کی ناکامی کی سزا عام شہریوں کو دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ مگر دلیل اور داشت کو اس کے جواب میں یہ سننا پڑا کہ یہ غصے اور انتقام کا محل ہے، اس لیے جب تک افغانستان کی ایجنسی سے ایسٹ نہیں نجاتی ہمارا غصہ ٹھہڈا نہیں ہو گا اور نہ ہم دلیل اور داشت کی کوئی بات سننے اور سمجھنے کے قابل ہوں گے۔ صدر جزل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ ا استمر کو پہنائی جانے والی عینک اتار کر کھلی آنکھوں کے ساتھ عالمی منظر کو بیکھیں جہاں دلیل اور داشت سرائیگی کے عالم میں ایک طرف طاقت اور دھونس کے خوفناک جلا دکے کوڑے کے سامے میں ہمیکی کھڑی ہے۔ اور ذاقریب جا کر کانوں کو اس کے منہ کے قریب کریں تو وہ بے چاری اب بھی ”جان کی امان پاؤں تو۔۔۔“ کا درکرنے میں مصروف ہے۔ اور پھر صدر محترم اذرا دل پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں کہ جب وہ خود یہ کہتے ہیں

کہ طالبان نے ہماری بات نہیں مانی اس لیے انہیں بربادی کا سامنا کرنا پڑا، اور اگر تم امریکہ کی بات نہ مانتے تو ہمیں بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا، تو کیا اس واضح اعتراض کے بعد بھی دلیل اور دانش کا نام لینے کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

## سلطان ٹیپو شہید اور افغان طالبان: تاریخی ممائیل

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۰ دسمبر ۲۰۰۱ء

افغانستان کے بڑے شہروں پر طالبان کا کنٹرول ختم ہونے سے بعض حلقوں میں افسوس و حسرت کا یہ تاثر بھر رہا ہے کہ مدت توں بعد ایک نظریاتی اسلامی ریاست کا عملی نقشہ سامنے آیا تھا مگر اب اس کا جاری رہنا مشکل نظر آ رہا ہے۔ پھر خدا جانے کب ایسے امکانات پیدا ہوں گے کہ ہماری آنکھیں خدا کی زمین پر خدا کے اکام کو نافذ ہوتا دیکھ سکیں گی۔ مجھ سے بھی کچھ دوستوں نے اس سلسلہ میں بات کی ہے مگر میں نے ان سے عرض کیا ہے کہ ماہیوں ہونے کی بات نہیں ہے، مشکلات آتی رہتی ہیں اور نظریاتی تحریکوں کو مد و جزر کے کئی مرحلوں سے گزرنما پڑتا ہے اس لیے وقتی حالات سے حقیقی نتیجہ اخذ کر لینا اور ماہیوں کا شکار ہو جانا درست عمل نہیں ہے۔

اول تو یہ بات ہی محل نظر ہے کہ بڑے شہروں میں کنٹرول نہ رہنے سے طالبان کا وجود ختم ہو گیا ہے، کیونکہ طالبان نے بڑے شہروں کو خود خالی کیا ہے اور اپنی فور سز کوہ ان پہاڑوں پر لے گئے ہیں جن پہاڑوں میں رہتے ہوئے افغانوں نے روئی استعمار کے خلاف دس سال تک جنگ لڑی تھی اور بالآخر اسے افغانستان چھوڑ دیئے پر مجبور کیا تھا۔ اسی طرح مستقبل قریب کا نقشہ بھی یہی نظر آ رہا ہے کہ طالبان ان پہاڑوں پر مورچ چڑن ہو کر امریکی اتحادی فوجوں اور ان کی حمایت سے خنثی والی کابل حکومت کے خلاف گوریلا جنگ لڑیں گے، افغان قوم کی روایات کے مطابق جلد یا بدری امریکی اتحادی کی فوجوں کو افغانستان چھوڑ دیئے پر مجبور کر دیں گے، اور روس کے بعد امریکی پشت پناہی سے قائم ہونے والی کابل حکومت کیلئے بھی اپنا وجہ برقرار رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

لیکن اگر خدا نخواستہ طالبان کا وجود ختم بھی ہو گیا اور وہ افغانستان کا کنٹرول دوبارہ حاصل نہ کر سکے تو بھی تاریخ میں ان کا یہ کردار کم نہیں ہے کہ انہوں نے ساری دنیا کی مخالفت اور دشمنی کے باوجود افغانستان میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ اور اس کی برکات کا عملی نمونہ آج کے دور میں دنیا کو دکھادیا۔ اور شرعی قوانین کے ذریعے ایک تباہ شدہ معاشرہ میں مکمل امن قائم کر کے ثابت کر دیا ہے کہ آج بھی انسانی سوسائٹی کو امن قرآن و سنت کے فطری قوانین کے ذریعے ہی مل سکتا ہے۔ اس لیے اگر خدا نخواستہ طالبان اپنی حکومت کا تسلیل قائم نہ رکھ سکے تو بھی اس دور میں مکمل شرعی نظام کے نفاذ کا آغاز اور اس کا عملی نقشہ پیش کرنا ان کا وہ روشن کارنامہ ہے جو دنیا میں کسی بھی اسلامی حکومت کے قیام کیلئے ہمیشہ مشعل را رہے گا، اور اس کے آغاز کا کریڈٹ ہمارے دور کے حوالے سے طالبان کے نام پر تاریخ کے ریکارڈ میں درج ہو چکا ہے۔ باقی رہی پات ایک اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کے ختم ہونے کی تواریخ سے قبل کئی پار ایسا ہو چکا ہے۔

اندلس میں صدیوں تک اسلامی حکومت رہی ہے جو آج موجود نہیں ہے۔ شہدائے بالا کوٹ نے ۱۸۳۰ءے میں پشاور میں اسلامی حکومت قائم کی تھی جو ایک سال بھی نہ چل سکی مگر ان کا مشن بدستور زندہ ہے اور طالبان کی یہ حکومت بھی اسی مشن کا تسلسل ہے۔ اس طرح کے ساتھ تاریخ میں کئی بار ہوئے ہیں مگر اسلام کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ نہ صرف موجود ہے بلکہ فطری انداز میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ اسلام ایک زندہ نہ ہب ہے اور اسے قیامت تک زندہ رہنا ہے، زندہ جسم میں زخم لگتے ہیں اور مندل ہو جاتے ہیں، گھاؤ لگتے ہیں اور بھرجاتے ہیں، بسا اوقات اعضا بھی ٹوٹ جاتے ہیں مگر جسم کی زندگی اور نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس پس منظر میں اخبار ہوئیں صدی عیسوی کے دوران جنوبی ہند میں قائم ہونے والی ایک اسلامی ریاست کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ۷۹۶ءے میں قائم ہوئی اور ۷۹۹ءے میں سلطان ٹیپو گی شہادت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لیکن چالیس سال سے بھی کم عرصہ قائم رہنے والی اس اسلامی ریاست نے بر صیری کے مسلمانوں کو زندہ رہنے اور آزادی کے حصول کیلئے لڑنے مرنے کا خوصلہ بخشتا۔ آنے کم آزاد ہیں اور پاکستان کے نام سے ایک اسلامی ریاست کا پرچم دنیا میں ہمراۓ ہوئے ہیں تو اس کے پیچھے ”سلطنتِ خداداد میسور“ کا چالیس سالہ شاندار دور اور سلطان ٹیپو اور ان کے رفقاء کی قربانیاں بھی تاریخی پس منظر کے طور پر کار فرمان نظر آ رہی ہیں۔

سلطان ٹیپو گا تعلق ایک عرب خاندان سے تھا، اس خاندان کے ایک بزرگ حسن بن یحییٰ پندر ہوئی صدی عیسوی کے ساتوں عشرے میں خلافت عثمانی کی طرف سے مکہ مکرمہ کے گورنر رہے ہیں، ان کے خاندان کے کچھ لوگ تلاش روزگار میں بغداد، ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے پنجاب میں آبے اور ایک عرصہ پنجاب میں گزارنے کے بعد جنوبی ہند کی طرف نکل گئے۔ سلطان ٹیپو کے دادخواج محمد مغلیہ دور میں سپاہیانہ خدمات سرانجام دیتے رہے جبکہ والد حیدر علی میسور کی ریاست میں راجہ کرشنا راج کی فوج میں ایک عام سپاہی کے طور پر بھرتی ہوئے اور خداداد صلاحیتوں اور نمایاں خدمات کی وجہ سے سپہ سالار کے منصب تک پہنچ گئے۔ ۷۸۷ءے میں میسور کی ریاست راجہ کرشنا راج کے ساتھ اردوگرد کے راجاؤں کی مسلسل کشکش اور جنگلوں کی وجہ سے صرف ۳۲۳ گاؤں تک محدود رہ گئی اور راجہ کیلئے اس کو باقی رکھا بھی مشکل ہو گیا تو سپہ سالار حیدر علی نے ریاست پر قبضہ کر لیا اور ”سلطنتِ خداداد میسور“ کے نام سے مستقل حکومت قائم کر لی۔ سلطان حیدر علی اور اس کے فرزند سلطان ٹیپو نے تھوڑے عرصہ میں ہی اس سلطنت کا دارہ اس قدر وسیع کر لیا کہ اس کی سرحد شمال میں دریائے کرشا اور جنوب میں کیرالہ تک پھیل گئی جبکہ اس کار قبہ اس دور میں آسی ہزار مرلیں میل بتایا جاتا ہے۔

یہ وہ دور تھا جب دہلی کی مغلیہ سلطنت کمزور پڑ چکی تھی اور اس پر قبضہ کرنے کیلئے ایک طرف سے انگریز آگے بڑھ رہے تھے جو ۷۸۵ءے میں بیگانل کے نواب سراج الدولہ شہید گو شکست دے کر اپنی حکومت کو مستحکم کر چکے تھے جبکہ دوسری طرف سے مرہٹوں کی طاقت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دور میں حیدر آباد بھی ایک طاقتور ریاست تھی جاتی تھی مگر اسے انگریزوں نے اپنے گماشتوں کے ذریعے قابو میں رکھا ہوا تھا جنچھ اس نے ہمیشہ اس خطے میں انگریزوں کا ہی ساتھ دیا۔ حیدر علی گی قائم کر دیا یہ نئی ریاست ان سب طاقتوں کو لکھ کر تھی اور ان سب نے باری باری اور پھر متعدد ہو کر

اس سلطنت کو ختم کرنے کی کوششیں کی مگر حیدر علیؒ نے انتہائی حوصلہ اور تدریک کے ساتھ ان سب قتوں کا مقابلہ کیا اور سلطنت خداداد کا وجود نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کی وسعت، ترقی اور استحکام میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ۷۷ء میں انگریزوں، مرہٹوں، حیدر آباد، اور تمال ناؤ کی ریاست ارکاتھ کے نواب محمد علی کی متحده فوجوں نے جزء سلطنت کی قیادت میں سلطنت خداداد پر دھاوا بول دیا۔ دوسال لڑائی جاری رہی جس میں حیدر علیؒ کو فتح ہوئی اور متحده محاڑ کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ۸۰ء میں دوسری جنگ ہوئی اس میں بھی حیدر علیؒ نے کامیابی حاصل کی اور ان کے حیدر علیؒ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان فتح علیؒ ٹیپو تخت نشین ہوا تو یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انگریز، مرہٹے اور ان کے ساتھ حیدر آباد اور ارکاتھ کی مسلم ریاستیں اپنے پڑوں میں ایک نئی اسلامی ریاست کے وجود کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور اسے ہر قیمت پر ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ سلطان ٹیپو ایک نیک دل، عالم، بہادر اور حوصلہ مند حکمران تھا جس نے تخت سنجھ لئے تھی اپنے پہلے اعلان میں اس بات کا حلف اٹھایا کہ ”انگریزوں کو اس ملک سے باہر نکالنے کے لیے، جو ہمارے حقیقی دشمن ہیں، پورے ہندوستان کے لوگوں کو متحد کروں گا۔“

اس نے سلطنت میں اسلامی احکام پر عمل کا اہتمام کیا، قاضی مقرر کیے، قرآن کریم کی تعلیم کا اہتمام کیا اور دینی شعائر و اقدار کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس کی دینداری کا عالم یہ تھا کہ جب اس نے شاہی محل کے ساتھ علیؒ کے نام سے نئی مسجد بنوائی تو اس کے افتتاح کے موقع پر اعلان کیا کہ میری خواہش ہے کہ وہ بزرگ پہلی نماز پڑھا کر مسجد کا افتتاح کریں جو صاحب ترتیب ہوں یعنی بالغ ہونے کے بعد ان کی کوئی نماز قضاۓ ہوئی ہو۔ یہ اعلان سن کر کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی تو بالآخر سلطان ٹیپو نے یہ کہتے ہوئے خود آگے بڑھ کر نماز پڑھانی کہ ”بھگر اللہ میں صاحب ترتیب ہوں۔“

سلطان ٹیپو کے بارے میں ان کے سوانح بگار لکھتے ہیں کہ قدرتی طور پر ان کی داڑھی نہیں تھی اس لیے ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے انہیں عالم نہیں سمجھا جاتا اور نہ وہ پختہ عالم دین اور انتہائی نیک و متفقی شخصیت کے حامل تھے۔ سلطان ٹیپو نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کو نزدیک کا سب سے بڑا شدن ترار دیا اور دہلی کے مغل حکمرانوں کے علاوہ حیدر آباد دکن کے نظام سے بھی بار بار رابطہ قائم کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اسے اپنا حریف نہ سمجھیں اور ساتھ دیں تاکہ سب مل جل کر انگریزوں سے ہندوستان کو خالی کر سکیں۔ لیکن حیدر آباد دکن کے مسلمان حکمرانوں نے اس بات پر بھی توجہ نہ دی حتیٰ کہ ایک موقع پر سلطان ٹیپوؒ کی طرف سے آپس میں رشتہ داریاں قائم کرنے کی تجویز بھی مسترد کر دی اور ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔

سلطان ٹیپوؒ نے اپنی ریاست میں انگریزوں کے ساتھ تجارت کو منوع قرار دیا اور غیر ملکی مصنوعات پر پابندی لگا کر ریاست میں تھیمار سازی، گھٹری سازی، برتن سازی، اور پیچی سازی کے بڑے بڑے کارخانے بنوائے اور زراعت کو ترقی دینے کیلئے اقدامات کیے۔ خود سلطان ٹیپوؒ نیم ملکی مصنوعات کے استعمال سے گریز کرتا تھا اور اس نے ہمیشہ دیسی کپڑا

پہنچا۔ سلطان ٹیپو نے خلافت عثمانیہ کے سلطان سلیم کو دو بار وندھیج کر پیش کی کہ انگریزوں سے خلافت عثمانیہ اور ہندوستان دنوں کو خطرہ ہے اس لیے اگر خلیفہ عثمانی عدن کی بندرگاہ سلطان ٹیپو کو کرایہ پر دے دے تو انگریزوں کے خلاف جنگی محاڑ کو مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ سلطان سلیم نے خلافت کی طرف سے سلطان ٹیپو کی بادشاہت کی توثیق توکدوی مگر انگریزوں کے خلاف اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا بلکہ سلطان ٹیپو کو مشورہ دیا کہ وہ اگر ادھر سے یلغار کرے تو سلطان ٹیپو سے دوستی کر لے۔ سلطان ٹیپو نے افغانستان کے حکمران زمان شاہ سے رابطہ کیا کہ وہ اگر ادھر سے یلغار کرے تو سلطان ٹیپو جنوب سے پیش رفت کرے گا اور دنوں مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں گے۔ زمان شاہ جو احمد شاہ ابدالی گا پوتا تھا اس نے سلطان ٹیپو کی یہ پیشکش قبول کر لی اور تیس ہزار سے زائد فوج لے کر کابل سے چل پا۔ مگر انگریزوں نے ایران کے بادشاہ کو کسی طرح ورغلائ کر افغانستان پر اس سے جملہ کر دیا اور شیعہ سن کلکش کو بجاہار کر ہرات کے گورنر زکو زمان شاہ کے خلاف بغاوت پر اکسایا جس کی وجہ سے زمان شاہ سلطان ٹیپو کی مدد کیلئے نہ پہنچ سکا اور اسے راستہ سے واپس جانا پڑا۔

خلافت عثمانیہ کو سلطان ٹیپو نے باہمی معاهدہ کی تحریری پیشکش کی جس کے اہم نکات یہ ہیں:

1. عدن کی بندرگاہ سلطان ٹیپو کو کرایہ پر دی جائے گی۔
2. انگریزوں کے خلاف خلافت عثمانیہ کے فوجی تعاون کے اخراجات سلطان ٹیپو برداشت کرے گا۔
3. خلافت عثمانیہ کو انگریزوں کے خلاف تعاون کی ضرورت پڑنے پر سلطان ٹیپو اپنے خرچ پر فوجی تعاون کرے گا۔

مگر سلطان ٹیپو یہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور انگریزوں کے خلاف اسے جنگ نہ صرف یہ کہ تنہا لڑنا پڑی بلکہ پڑوس کی دو مسلم ریاستوں حیدر آباد اور ارکاتھ نے انگریزوں کے ساتھ متحده محاڑ میں شامل ہو کر سلطان ٹیپو کا مقابلہ کیا۔ سلطان ٹیپو پورے شعور کے ساتھ انگریزوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک بڑا خطرہ سمجھتا تھا اور اس نے ایک جنگ کے موقع پر انگریز جزل میکلوڈ کو اپنے خط میں لکھا کہ

”مستند کتابوں سے ظاہر ہے کہ آپ جو اپنے آپ کو مسح علیہ السلام کا یہ وکار کہتے ہو صحیح نہیں ہے۔ یہ

دعویٰ آپ کا غلط ہے کیونکہ اصل انجیل میں شیعیت کی پیشکش کی ہدایت نہیں ہے، یہ تو صرف مشرکین کا ودیہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا تھا، تم لوگوں نے انجیل کی تعلیم کے خلاف شراب پینا، خنزیر کا گوشت کھانا اور سود کھانا شروع کر دیا ہے اور ہر وہ کام جو نہ صرف مذہبی بلکہ انسانی نقطہ نظر سے بھی منوع ہے اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر حضرت مسح علیہ السلام اور تمام برگزیدہ لوگ تم سے نفرت و کراہت کرتے ہیں اس لیے تم سے لزاوا جب ہے۔“

اس کیفیت میں انگریزوں نے حیدر آباد، مرہٹوں اور ارکاتھ کو ساتھ ملا کر متحده محاڑ بنا لیا اور ”سلطنت خداداد میسور“ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ انگریز گورنر زجل لاؤڈ میز لی نے سلطان کو ڈمکی دی کہ اس نے برطانیہ کے

دشمن فرانسیسیوں کو فوج میں بھرتی کیا ہوا ہے وہ انہیں فوراً تھال کر انگریزوں کو بھرتی کرے اور بنگلور کی بندراگاہ انگریزوں کیلئے خالی کر دے ورنہ اس پر حملہ کر دیا جائے گا۔ اور اس خط کے ساتھ نوٹس یہ تھا کہ چوبیں گھنٹوں کے اندر اندر اس خط کا جواب دیا جائے۔ سلطان نے یہ دھمکی مسترد کر دی جس پر انگریزوں کے متحفہ مجاز نے میسور پر حملہ کر دیا۔ سلطان ٹپو گا وزیر میر صادق انگریزوں سے ملا ہوا تھا اس نے جنگ کی ساری منصوبہ بندی دشمن کو بتا دی اور دشمن کے کمانڈروں کو اندر کی صور تھال سے آگاہ کیا۔ اس کے باوجود انگریزی فوجوں کی یلغار سلطان ٹپو کے آہنی عزم کے سامنے کئی روز رکی رہی۔ ایک روز سلطان ٹپو قلعہ سے باہر نکل کر انگریزی فوجوں سے برہ راست جنگ میں مصروف تھا کہ اچانک دشمنوں کا زیادہ بجوم دیکھ کر اس نے واپس قلعہ میں جانا چاہا، میر صادق یہ منتظر کیجھ رہا تھا اس نے سلطان کو آتا دیکھ کر قلعہ کا دروازہ بند کر دیا جس سے سلطان ٹپو دشمنوں کے نرغے میں پھنس گیا۔

میر صادق کو تو اسی وقت سلطان ٹپو کے ایک وفادار سپاہی احمد خان نے یہ کہہ کر تلوار کے ایک ہی وار سے چہنم رسید کر دیا کہ ”سلطان کو دشمنوں کے حوالے کر کے خود نیچے کر کھاں جا رہے ہو؟“ جبکہ سلطان ٹپو نے آخری دم تک مقابلہ کیا اور آخری لمحات میں جب اس کے ایک خادم راجح خان نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی جان بچانے کیلئے خود کو دشمن کے حوالہ کر دے تو سلطان نے پلٹ کر غصہ سے کہا کہ

”میرے نزدیک شیر کی ایک دن کی زندگی گیئڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

اور اس طرح سلطان ٹپو نے بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے ۱۸۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا۔ سلطان کی لاش پر کھڑے ہو کر انگریز کمانڈر فرط مسرت سے چھپا تھا کہ ”آج سے ہندوستان ہمارا ہے“ اور اس طرح سلطان ٹپو کے ساتھ ہی اس کی اسلامی ریاست بھی دنیا کے نقشہ سے معدوم ہو گئی۔

## امارتِ اسلامی افغانستان کا خاتمه اور نئی افغان حکومت کے رجحانات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ دسمبر ۲۰۰۱ء

کابل پر امارتِ اسلامی افغانستان کا کنٹرول ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سنجا لئے والے شمای اتحاد کے وزیر انصاف نے ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ طالبان کے سخت قوانین ختم کر دیے جائیں گے اور کسی کو ہاتھ کاٹنے، سگسار کرنے، اور کوڑے مارنے کی سزا آئندہ نہیں دی جائے گی بلکہ صدر داؤد خان کے دور کے قوانین واپس لائے جائیں گے جن کے بارے میں ایک قومی اخبار نے میک دسمبر کو یہ خبر شائع کی ہے کہ کابل کے ایک پیچیں سالہ شخص نے بتایا ہے کہ اسے طالبان حکومت نے اس جرم میں ایک سال قید کی سزا دی تھی کہ اس نے گرل فرینٹر کھی ہوئی تھی جبکہ صدر داؤد خان کے دور میں اسے جرم تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کابل کی نئی حکومت کے رجحانات کیا ہیں اور طالبان

حکومت نے شرعی نظام کے نفاذ کو جہاد افغانستان کا ملکی تقاضا قرار دیتے ہوئے اس کی طرف جو پیش رفت کی تھی اسے کابل کی نئی حکومت کس حد تک جاری رکھنے کیلئے تیار ہو گی؟

جہاں تک شرعی قوانین کے نفاذ کو جہاد افغانستان کا ملکی تقاضا قرار دیتے ہوئے اس میں کوئی مشکل نہیں کہ رو سی استعمار کے خلاف جہاد کا اعلان ہی اس نبیاد پر ہوا تھا کہ کمیونزم کا فرانہ نظام نافذ ہو گیا ہے اور اسے ختم کر کے شرعی نظام کا نفاذ مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اگر اب بھی افغانستان میں صدر داد دے کے دور کے قوانین نے ہی واپس آتا ہے تو سرے سے اس جنگ کی شرعی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جو جنگ کمیونسٹ نظام کے خاتمه کیلئے ”جہاد افغانستان“ کے نام سے اڑی گئی تھی اور جس میں موجودہ شماں اتحاد میں شامل، ہم را ہمنا بھی پیش چھے۔ باقی رہی یہ بات کہ طالبان نے جو قوانین نافذ کیے تھے وہ سخت ہیں تو ان کی سختی اپنے جگہ مکار نہیں ”طالبان کے قوانین“ قرار دے کر مسترد کرنا کسی ایسے شخص یا گروہ کو زیب نہیں دیتا جو مسلمان کہلاتا ہے اور قرآن کریم پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس لیے کہ سنگار کرنے، کوڑے مارنے، اور ہاتھ کاٹنے کی سزا میں طالبان کی تجویز کردہ نہیں بلکہ قرآن کریم نے ان کی صراحت کی ہے اور یہ سزا میں قرآن کریم میں بدستور موجود ہیں۔

گذشتہ دنوں اقوام متحدہ کی جزوی اسلامی کی ”اسانی حقوق کیمیٹی“ نے ایک قرارداد میں ایران کو بھی وارنگ دی ہے کہ وہ سنگار کرنے، کوڑے مارنے، ہاتھ کاٹنے اور سرعام سزاد دینے کے قوانین تبدیل کرے۔ شاید اسی لیے افغانستان میں شماں اتحاد کے وزیر انصاف کو اقوام متحدہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے پیشگی یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ افغانستان کی نئی حکومت ملک میں طالبان کے نافذ کردہ شرعی قوانین کا تسلسل جاری نہیں رکھے گی۔

ہم ایک عرصہ سے عرض کر رہے ہیں کہ افغانستان کے حوالے سے امریکی ایجنڈے کی سب سے اہم شق طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنا تھا کیونکہ یہ دنیا کی واحد مسلم حکومت تھی جو اسلام کا صرف نام نہیں لیتی تھی بلکہ اس نے سوسائٹی میں قرآن و سنت کے بیان کردہ قوانین کو من و عن نافذ کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا اور وہ اس میں کس قسم کی لپک اختیار کرنے کیلئے کسی طرح بھی تیار نہیں تھی۔ طالبان حکومت کی بعض تعبیرات یا ترجیحات سے اختلاف ہو سکتا ہے اور خود ہم نے بھی متعدد بار طالبان حکومت کے بعض ذمہ دار حضرات سے ان تعبیرات و ترجیحات کے حوالے سے بات کی ہے اور اپنے تجھظات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تعبیرات و ترجیحات کا فرق اور چیز ہے اور سرے سے ان قوانین کو ہی ”طالبان کے سخت قوانین“ قرار دے کر مسترد کر دینا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ اور مغرب دراصل یہی چاہتا ہے کہ ”وحشانہ سزا میں“ اور ”دہشت گردی“ کے نام سے شرعی قوانین کے خلاف وسیع تر معاندانہ پر اپیگنڈا کر کے، نیز عسکری قوت اور معاشی دباو کے ذریعے انہیں اس بات کیلئے تیار کیا جائے کہ وہ شریعت کے ان احکام و قوانین سے دستبردار ہو جائیں جو مغرب کے عالمی نظام سے مطابقت نہیں رکھتے اور جن کی موجودگی میں مسلمان معاشرہ کو مغربی ثقافت کے دائرہ میں لانا ممکن نہیں ہے۔

مغرب اور اس کے ہمنواں کیلئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ سب قوانین قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں جو چودہ سو برس سے بالکل محفوظ حالت میں مسلمانوں کے پاس نہ صرف موجود ہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اس

حافظ و قراء مسلم اس کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں اور وہ اتنے اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سناتا ہے کہ اس کے کسی لفظ یا جملے کو آگے پیچھے کرنا یا اس کے بیان کردہ کسی قانون اور ضابطے کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً مذہب کے نام پر اور مذہب کے تحفظ کیلئے جنگ کو مغرب کے ہاں ”دہشت گردی“ بھجا جاتا ہے اور امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف موجودہ عالمی جنگ کا مقصد صرف یہی ہے کہ دنیا بھر کے ان لوگوں کو ختم کیا جائے جو مذہب کے ساتھ مذہب کے فروغ یا تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھاتے ہیں۔ جبکہ اسلام میں یہ جنگ ”جہاد“ ہلاتی ہے اور اس پر قرآن کریم کی سینکڑوں آیات موجود ہیں جو پوری صراحت کے ساتھ جہاد کے احکام و قوانین بیان کرتی ہیں اور مسلمانوں کو جہاد فی سیل اللہ کی ترغیب دیتی ہیں۔ مگر قرآن کریم نے جہاد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ سب کچھ مغربی فلسفہ کی رو سے انتہا پسندی اور دہشت گردی شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم اور سنت نبوی نے چور کا ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنکسار کرنے، جھوٹی تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنے، قاتل کو قصاص میں قتل کرنے، ڈاؤک کے ہاتھ پاؤں کاٹنے، اور مجرم کو سرعام سزا دینے کے احکام دیے ہیں جو مغربی فلسفہ کی رو سے وحشیانہ سزا یں کہلاتی ہیں۔

چنانچہ اب یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے کہ اقوام متحده کے منشور، جزوی اسلامی کی قراردادوں، مغربی لا یہوں کے مطالبات، اور امریکہ کی دھونس کا صل مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن و سنت کے احکام سے دستبرداری پر مجبور کیا جائے اور ”انسانی حقوق کے چار ٹریگی“ پاندی کے نام پر انہیں مغربی تہذیب و ثقافت کے دائرہ میں لایا جائے۔ یہ ہم آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے جاری ہے جب بہت سے مسلم ممالک پر برطانوی، فرانسیسی اور پر انگلیزی استعمار نے قبضہ کر کے وہاں صدیوں سے چلے آنے والے شرعی قوانین کو ختم کر دیا تھا اور مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو یہ سمجھانا شروع کیا تھا کہ اب ان قوانین کا دور نہیں رہا، زمانہ بہت ترقی کر چکا، سائنس نے بہت سے نئے حقائق دریافت کیے ہیں اور ٹینکنالوجی بہت آگے بڑھ گئی ہے، اس لیے خاندان اور معاشرہ کے حوالے سے ان قوانین کیلئے دنیا میں اب کوئی جگہ نہیں رہی جو قرآن و سنت میں بیان کیے گئے ہیں۔

اس مقصد کیلئے خود مسلمانوں میں بہت سے ایسے فکری حلقوں کو کہے جنہوں نے قرآنی احکام و قوانین کی من مانی تشریح کر کے مسلمانوں کو مغربی فلکر و فلسفہ کے سامنے سر جھکانے کی سر توڑ کوشش کی۔ مگر مسلم ممالک کے حکمران گروہوں اور ان کے ساتھ ایک محدود مغرب زدہ طبقہ کے علاوہ کسی نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ آج بھی دنیا کے ہر خطے میں عام مسلمانوں کی اکثریت اپنے ایمان و بقین پر قائم ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو قیامت تک نافذ اعمال رہے گی اور اس کی تعبیر و تشریح صرف وہی قبول ہوگی جو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جو کہ سیرت و سنت اور حدیث کے ذخیرہ میں پوری طرح موجود و محفوظ ہے۔

چنانچہ ان قوانین کو طالبان کے قوانین یا ایرانی حکومت کے قوانین کا نام دینے یا دہشت گردی اور وحشیانہ سزا یں قرار دینے کی اس نئی عالمی مہم کا تیجہ بھی پہلے سے مختلف نہیں ہو گا۔ دنیا بھر کا عام مسلمان قرآن و سنت پر دو ٹوک ایمان اور ان کے ساتھ بے چک کمٹنٹ رکھتا ہے، اسے امریکی بمباری اور اقوام متحده کی قراردادوں کے ذریعے قرآن و سنت کے صریح احکام سے دستبردار کرنے کا خواب بھی پورا نہیں ہو گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## اقوام متحده کے منشور پر نظر ثانی کی ضرورت

روزنامہ پاکستان، لاپور --- ۱۲ دسمبر ۲۰۰۱ء

اقوام متحده کی جزوی انسانی حقوق کمیٹی نے کچھ عرصہ قبل اسلامی جمہوریہ ایران کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مرتكب قرار دیتے ہوئے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں ایرانی حکومت سے متعدد قوانین اور پالیسیوں کی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ قرارداد ۵۲ کے مقابلہ میں اے ووٹوں سے منظور ہوئی ہے۔ قرارداد کے خلاف ووٹ دینے والوں میں اکثریت مسلم ممالک اور سابق کمیونٹ ملکوں کی ہے جبکہ ۴۱ ممالک رائے شماری سے غیر حاضر ہے جن میں زیادہ افریقی ممالک ہیں۔ اخباری روپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جزوی اسلوبی اگلے ماہ اس قرارداد کی حقیقی منظوری دے گی۔

قرارداد میں ایرانی حکومت سے جن قوانین کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے ان میں بطور خاص (۱) سرعام سزا دینے (۲) باتھیاپاؤں کاٹنے (۳) سنگار کرنے (۴) بعض غیر سنگین جرم اور موت کی سزا دینے (۵) اور کوڑے مارنے کی سزا میں بھی شامل ہیں جنہیں قرارداد میں ”وحشیانہ سزا میں“ قرار دیا گیا ہے۔ خیال ہے کہ جزوی اسلوبی کی طرف سے اس قرارداد کی حقیقی منظوری کے بعد اگر ایران نے ان قوانین میں روبدل نہ کیا تو اس کے خلاف اقوام متحده کی طرف سے اتنا ہی احکامات اور پابندیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اس سے قبل افغانستان میں کابل کا کنشروں حاصل کرنے والے شہانی اتحاد کے وزیر قانون اور وزارت انصاف کے ایک ڈائریکٹر نے گذشتہ روز ایک انٹرویو میں واضح کیا ہے کہ طالبان دور کے ”سخت قوانین“ تبدیل کیے جا رہے ہیں اور صدر داؤد خان کے دور کا قانونی نظام واپس لایا جا رہا ہے۔ شہانی اتحاد کے ان راہنماؤں کے بقول خاص طور پر سنگار کرنے، کوڑے مارنے اور باتھ کاٹنے جیسی سزا میں منسوج کر دی جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی ایک قومی خبرانے طالبان حکومت کے دور میں ایک سال قید کاٹنے والے پینتیس سالہ افغان شہری کا انٹرویو شائع کیا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ طالبان حکومت نے اسے گرل فرینڈر کھنے کے جرم میں سزا دی تھی جبکہ صدر داؤد کے دور میں یہ جرم نہیں تھا۔ دوسرا طرف سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ کے اس حالیہ اخباری بیان کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی میڈیا قرآن کریم کے احکامات کے خلاف زہریا پر اپیگنڈا کر رہا ہے۔

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال کے بارے میں اقوام متحده کی انسانی حقوق کمیٹی، امریکی وزارت خارجہ کے جنوبی ایشیا ڈائیک اور ایمنسٹی ائٹرنسیشنل کی چند سال کی مسلسل روپورٹوں میں ان امور کا تذکرہ ہوتا رہا ہے اور خود پاکستان کے بعض سیاسی راہنماؤں کی طرف سے کوڑے مارنے، سنگار کرنے اور باتھ کاٹنے کی سزاوں کو کھلماں کھلانے کا قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کلمکش کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ یہ بات واضح طور پر سامنے آجائے کہ اقوام متحده اور مغربی ممالک کا اس بارے میں موقف کیا ہے اور وہ اس قسم کی قراردادوں اور روپورٹوں کے ذریعے مسلم ممالک سے کیا تقاضہ کر رہے ہیں۔

اقوام متحده نے انسانی حقوق کے جس چار ٹکوڈنیا بھر میں انسانی حقوق کے تحفظ اور عملداری کی بنیاد پر کھاہے اس

کی دفعہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ  
”کسی شخص کو زہنی اذیت، جسمانی تشدید اور عزت نفس کے منافی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور  
نہ ہی اسی سزا دی جائے گی۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی جرم کی سزا کا ذہنی اذیت، جسمانی تشدید اور تنزلیل کے عناصر سے خالی ہونا ضروری ہے۔ جبکہ اسلام میں معاشرتی جرائم کی جو سزا یہیں مقرر کی گئی ہیں ان میں یہ تینوں ہاتھیں پائی جاتی ہیں، مثلاً:-  
• سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ میں کہا گیا ہے کہ ڈھینتی اور قتل کے مرتكب افراد کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں اور انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔

- اسی سورہ کی آیت ۳۸ میں کہا گیا ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔
- سورہ نور کی آیت ۲ میں کہا گیا ہے کہ زنا کرنے والے مرد اور عورت دونوں کو سوسوکوڑے مارے جائیں۔
- اسی سورہ کی آیت ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ کسی پاک دامن عورت پر بدکاری کی جھوٹی تہمت لگانے والے کو اسی کوڑے مارے جائیں۔
- سورہ نور کی آیت نمبر ۲ میں کہا گیا ہے کہ بدکاری کی سزا سرعام دی جائے تاکہ لوگ اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

فقط ہمارے امت کا کہنا ہے کہ سورہ نور میں مذکورہ زنا کی سزا غیر شادی شدہ مرد اور عورت کیلئے ہے جبکہ شادی شدہ مرد اور عورت زنا کے مرتكب ہوں تو تورات میں ان کیلئے سنگسار کرنے کی سزا مقرر تھی جسے بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا اور متعدد کیسوں میں تورات کے اسی قانون کے مطابق مجرموں کو سنگسار کرنے کی سزا دی۔

یہ چند حالہ جات اس بات کیوضاحت کیلئے دیے گئے ہیں کہ ہاتھ کاٹنے، پاؤں کاٹنے، سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور سرعام سزادی نے کے یہ قوانین ایرانی حکومت یا طالبان حکومت کے خود ساختہ ہیں بلکہ قرآن کریم کے بیان کردہ ہیں جن پر صدیوں تک امت میں عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن چونکہ ان سزاویں میں جسمانی تشدید، ذہنی اذیت اور عزت نفس مجروح ہونے کے واضح پہلو موجود ہیں اس لیے اقوام متحده کے انسانی حقوق کے چار ٹرکی رو سے یہ قوانین وحشیانہ قرار پاتے ہیں اور ان کے نفاذ سے اقوام متحده کے اصولوں کی رو سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

ایران کے خلاف اقوام متحده کی مذکورہ قرارداد میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ کسی سنگین جرم کے بغیر موت کی سزا دینے کا سلسہ ختم کیا جائے۔ یہ بہت دلچسپ نظرت ہے اس لیے کہ اسلام میں زنا، ارتضاد اور توبین رسالت کے جرائم میں موت کی سزا یہیں مقرر ہیں اور یہ تینوں امور اقوام متحده کے تزدیک سنگین جرم نہیں ہیں بلکہ سرے سے انہیں جرم ہی تصور نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ مذہب تبدیل کرنے کے عمل کو اقوام متحده کے منشور کی دفعہ ۱۸ میں انسانی حقوق میں شمار کیا گیا

ہے اور کسی بھی معاملہ میں رائے قائم کرنے اور اس کے کھلماں انہار کو ہر شخص کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اقوامِ متحده کے منشور اور اس کی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلم ممالک سے انسانی حقوق کے عملی احترام کیلئے اس کے مطالبہ کی زد میں جو قوانین آتے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جو قرآن و سنت کے بیان کردہ ہیں اور اسلامی شریعت کے قوانین تصور کیے جاتے ہیں۔ ہم نے ان سب اسلامی قوانین کا احاطہ نہیں کیا جو اقوامِ متحده کے منشور سے مکراتے ہیں بلکہ بطور نمونہ صرف چند ایک کانتنڈر کیا ہے تاکہ عالمی سطح پر موجودہ تہذیبی اور ثقافتی شکل مشکالہ پہلو واضح طور پر سامنے آسکے جو اس وقت دنیا بھر میں اقوامِ متحده کے منشور کی بنیاد پر کیساں قوانین کے نفاذ کیلئے کی جانے والی جدوجہد کا اہم عنوان بن چکا ہے۔

اقوامِ متحده کی اب تک کی قراردادوں اور پورٹوں میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مسلم ممالک اپنے قانونی نظاموں کو اقوامِ متحده کے منشور اور قراردادوں کے مطابق تبدیل کرتے ہیں تو انہیں نکاح، طلاق، وراثت، زنا، شراب، چوری، ڈیکت، تردف، ارتاد اور ناموس رسالت چیزیں بہت سے معاملات میں قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے صریح احکام سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ قرآن و سنت کے ان واضح احکام و قوانین سے دستبرداری اختیار کیے بغیر اقوامِ متحده کے انسانی حقوق کے چارٹر پر اس طرح کا عملدرآمد ممکن ہی نہیں ہے جس کیلئے اقوامِ متحده کی جزوی اسلامی مسلسل قراردادیں منظور کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور ایران کے خلاف بھی اس نے اسی مقصد کیلئے یہ قرارداد منظور کی ہے۔ اقوامِ متحده کا موقف یہ ہے کہ جن ممالک نے انسانی حقوق کے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں وہ اس پر عملدرآمد کے پابند ہیں اس لیے انہیں اس منشور اور اس کی وضاحت میں اقوامِ متحده کی منظور کردہ قراردادوں پر کمل عملدرآمد کا اہتمام کرنا چاہیے اور یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

اب ایک طرف قرآن و سنت کے واضح احکام ہیں اور دوسری طرف اقوامِ متحده کا منشور اور جزوی اسلامی کی قراردادیں ہیں جنہوں نے مسلم حکمرانوں کو دورا ہے پر کھڑا کر دیا ہے اور ان کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا کہ وہ یا تو اقوامِ متحده کے منشور پر کیے گئے دستخطوں کی پاسداری کرتے ہوئے اس کے تمام مطالبات کو منظور کر کے ترکی کی طرح باقی سلم مکلوں میں بھی اسلامی قوانین کو شجرِ منوعہ قرار دے دیں، یا پھر اقوامِ متحده کے منشور کی قرآن و سنت کے منانی دفعات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے خلاف تحفظات کا انہصار کریں اور ان کی تجدیل کیلئے مضمون دباوڑا لیں۔

یہ بات ایک حقیقت ہے کہ نصف صدی قبل جب اقوامِ متحده نے انسانی حقوق کا یہ چارٹر منظور کیا تھا تو اس وقت مسلم دنیا کی وہ پوزیشن نہیں تھی جو آج ہے، پیشتر ممالک غلام تھے اور جو چند مسلم ملک آزاد کھلاتے تھے وہ بھی ایک منظم گروپ کے طور پر اپنی بات پیش نہیں کر سکتے تھے۔ جبکہ آج اقوامِ متحده میں سائٹھ کے قریب مسلم ممالک کا گروپ موجود ہے اور اسے یہ پوزیشن حاصل ہے کہ اگر مسلم ممالک قرآن و سنت کے ساتھ عملی وابستگی اور دینی حیثیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقوامِ متحده کے منشور پر نظر ثانی کا مطالبہ کریں اور اس منشور کے ذریعہ پوری دنیا پر مغربی تہذیب و ثقافت مسلط کرنے کی کوششوں کے خلاف ڈھ جائیں تو وہ مغرب کی اس ثقافتی بیگار کو بریک لگا سکتے ہیں جو امریکہ کی فوبی قوت اور اقوامِ متحده کے منشور اور قراردادوں کے زور پر پوری دنیا کے مسلم معاشرے کو اپنی پیٹ میں لینے کیلئے مسلسل آگے بڑھ رہی

ہے۔

چند سال قبل ملائیشیا کے وزیرِ اعظم مہاتیر محمد نے مسلم حکومتوں سے کہا تھا کہ وہ اقوامِ متحده کے طرزِ عمل اور پالیسیوں کے خلاف منظم گروپ کے طور پر احتجاج کریں اور اجتماعی دباؤ ڈال کر اقوامِ متحده کو اپنے منشور اور پالیسیوں پر نظر ثانی پر مجبور کریں۔ ہمارے نزدیک مسلم حکومتوں کیلئے آج بھی باوقار راستہ یہی ہے، ورنہ دنیا بھر کے مسلم حکمران یہ بات نوٹ کر لیں کہ اگر انہوں نے اسلامی شریعت کے صریح منافی اقوامِ متحده کے فیصلوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تو وہ اس عمل میں تنہا ہوں گے اور مسلم دنیا کے عوام کو اقوامِ متحده کے منشور کی خاطر قرآن و سنت کے ارشادات سے دستبردار ہونے کیلئے وہ کبھی تیار نہیں پائیں گے۔

## افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت اور وزیر داخلہ کا اعترافِ حقیقت

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۰ دسمبر ۲۰۱۴ء

وفاقی وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل جناب معین الدین حیدر نے گذشتہ دنوں دارالعلوم کو رنگی کرایچی میں علماء کرام سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرنا حرام ہے لیکن مجبوری کی حالت میں حرام کھانا بھی جائز ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح معین الدین حیدر اپنی تمام ترجیحات کی وجہ اصولی طور پر ہمارے ساتھ اس موقف میں متفق ہو گئے ہیں کہ اماراتِ اسلامی افغانستان کے خلاف امریکہ کا ساتھ دینا مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرنا ہے۔ ہمیں ”اعترافِ حقیقت“ کے اس حصہ سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ مجبوری اس درجہ کی تھی کہ اس میں حرام کھانا بھی جائز ہو جاتا، یوں کہ شریعت نے بعض حالات میں ضرورت کی حد تک حرام کھانے کی اجازت دی ہے لیکن اسے صرف مجبوری کی بجائے ”اضطرار“ کی کیفیت کے ساتھ مشروط کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ اگر اضطرار اس درجہ کا ہو کہ فی الواقع ہلاکت کا خطرہ ہو اور دوسرا کوئی تبادل نہ ہو تو حرام کھانے کی اجازت ہے، اور حرام بھی صرف اس تدرک کے اس سے جان قچ جائے اس سے زیادہ اس حالت میں بھی حرام کھانے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کرنے سے قبل ایک واقعہ کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جب باقی ماندہ پاکستان میں جنابِ ذوالفقار علی بھٹو مر جوم نے اقتدار سنبھالا اور صوبہ سرحد میں نیپ (بیشتر عوای پارٹی) کے تعاون سے مولانا مفتی محمود وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے وزارتِ اعلیٰ کا حلف اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے صوبہ سرحد میں شرکاب کی تیاری، فروخت اور استعمال پر کمل پابندی کا اعلان کیا۔ اس پر وفاقی حکومت نے صوبہ سرحد کی حکومت کو لکھا کہ شرکاب کی مدد میں صوبائی حکومت کو لا کوں روپے کا جو

مکیں وصول ہوتا ہے وہ ختم ہو جائے گا جس سے بجٹ میں خسارہ ہو گا اور وفاقی حکومت اس خسارے کو پورا کرنے کیلئے کوئی تعاوون نہیں کرے گی۔ اس کا جواب مفتی صاحب نے یہ دیا کہ طحیک ہے ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے خسارہ پورا کر لیں گے اور اس مدد میں وفاق سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد وفاقی حکومت کا دوسرا خط انہیں موصول ہوا کہ صوبہ سرد میں غیر مسلم بھی رہتے ہیں جن پر شراب کی پابندی ختم کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ شراب کے حرام ہونے کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا اور اگر غیر مسلم شراب بیش گے تو ان پر ہمارا قانون لاگو نہیں ہو گا، لیکن انہیں شراب مہیا کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے، اس لیے صوبائی حکومت اس طرح کی دکانیں نہیں کھلوا سکتی۔ تھوڑا عرصہ گزرا تو وفاقی حکومت نے تیسرا خط بھجوادیا کہ شراب بعض بیماریوں میں علاج کے طور پر استعمال ہوتی ہے اس لیے اس قسم کی بیماریوں کیلئے شراب کی کچھ دکانیں کھلوانا ضروری ہیں۔ اس پر مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرد کے ہیلائھ سیکرٹری کی سربراہی میں ایک میڈیکل بورڈ بنایا اور اسے یہ کہا کہ ایسی بیماریوں کی نشاندہی کرو جو مہلک ہوں اور شراب کے علاوہ ان کا اور کوئی مقابل علاج نہ ہو۔ میڈیکل بورڈ نے بہت تلاش کیا مگر انہیں کوئی بیماری نہ ملی مگر اس کی حقیقتی روپورث کی تیاری ابھی جاری تھی کہ صوبہ بلوچستان میں مینگل حکومت کی بلا جواز بزرطی کے خلاف احتجاج کے طور پر مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرد کی وزارت اعلیٰ سے استغفار دے دیا، ورنہ یہ گفتگو خدا جانے اور کس انداز میں آگے بڑھتی۔

اس لیے یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا حکومت پاکستان کی مجبوری فی الواقع اس درجہ کی تھی کہ اسے شرعی اضطرار قرار دے کرتے ہوئے حرام کے ارتکاب کا جواز فرمائی کر دیا جائے جو افغانستان میں پاکستان کی دوست حکومت کے خاتمه، افغان عوام پر وحشیانہ بمباری اور کامل پر پاکستان دشمن شہابی اتحاد کے تسلط کی راہ ہموار کرنے کے امریکی اقدامات کے ساتھ تعاوون بلکہ ان میں عملًا شرکت کی صورت میں سامنے آپکا ہے۔ ہمارے خیال میں معاملہ ایسا نہیں تھا اور مجبوری کو جس درجہ میں حکومت پاکستان نے خود پر مسلط کر لیا تھا اس سطح کی مجبوری نہیں تھی۔ کیونکہ گیارہ تبرکے واقعات کے حدود میں خصوصی طور پر امریکی دباؤ کا شکار ہوئے وہ اس طور پر خود ہی حقیقی فیصلہ کرنے کی بجائے حالات کا برقرار ادازہ کرتے ہوئے تھی اور یہیں القوائی سطح پر بھی خواہوں اور دوستوں سے رابطہ و مشاورت کا اہتمام کر لیتے تو امریکی دباؤ کے آگے سیاسی یا اخلاقی رکاوٹ کھڑی کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا۔ مگر یہاں عملًا یہ ہوا کہ شخص واحد نے خود کو ”عقل“ کل ”بیحچت“ ہوئے فیصلہ صادر کر دیا اور پوری قوم سے یہ تقاضا کیا گیا کہ چونکہ ہم نے فیصلہ کر دیا ہے اس لیے سب کو ہمارے پیچھے ہر حال میں چلانا ہو گا۔

اس تاریخی لمحہ پر ہم سے جو تاریخی غلطی سرزد ہوئی اس کے نتائج و عوائق سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں اور جوں جوں امریکی بمباری کی دھوکہ بیٹھے گی اور مستقبل کا منظر مزید واضح نظر آنا شروع ہو گا ہمارے وزیر داخلہ مختارم پر اس ”حرام کام“ کے مزید اسرار و موز بھی ان شاء اللہ کھلتے چلے جائیں گے۔ مگر سر دست ہم جناب معین الدین حیدر سے ان کے اس ارشاد گرامی کے حوالے سے دو سوال کرنا چاہتے ہیں:

1. ایک یہ کہ یہ درست ہے کہ اضطرار کی حالت میں زندگی بچانے کیلئے ضرورت کی حد تک حرام کھانے کی واقعی

شریعت نے اجازت دی ہے تو کیا افغانستان میں ان کی یہ ضرورت اب تک پوری ہو گئی ہے یا اور شہروں کی تباہی اور لوگوں کی لاشوں کی ضرورت ابھی باقی ہے؟ یادو سرے لفظوں میں ہمارے حکمرانوں کو اپنی جائیں بچانے کیلئے اور کتنے افغانوں کا خون در کار ہے؟ 2 اور دوسرا سوال یہ کہ جب وہ خود اس کو حرام کہہ رہے ہیں اور مجبوری کے درجے میں اس حرام کے استعمال کا اعتراض کر رہے ہیں تو اس عمل کے ساتھ دانش، حکمت اور تدریس کا جوڑ لگا کر ان مقدس الفاظ کی معنویت کو دھنڈلانے میں آخر کون سی دانش پہنچا ہے؟

## کابل کی نئی حکومت اور اسلامی قوانین

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۲ء

روزنامہ جنگ لاہور کیم ۲۰۰۱ء کی ایک خبر کے مطابق کابل کا کنٹرول سنپھانے والے شمالی اتحاد کی وزارتِ انصاف کے ڈائریکٹر نور محمد امیری نے ایک انٹرو یو میں کہا ہے کہ افغانستان میں اب سرعام پھانسی، سکساری، اور مردوں عورت کی تمیز کیے بغیر کوڑے لگانے کی سزا میں نہیں دی جائیں گی اور طالبان کے ان سخت قوئیں کو بدل دیا جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ سابق صدر داود خان کے دور کے قانونی نظام کو واپس لایا جائے گا اور اب طالبان جیسا سلوک نہیں ہو گا۔ طالبان حکومت سے دنیا کو اصل شکایت ہی یہ تھی کہ انہوں نے افغان معاشرہ میں معاشرتی جرائم کی شرعی سزاوں کا فناذ کر دیا تھا اور ان پر پوری طرح عملدرآمد بھی ہوتا تھا۔ جس سے مسلسل جنگ کی تباہی اور اقتضادی بر بادی کے باوجود مثالی طور پر امن قائم ہو گیا تھا اور افغان عوام سکون سے زندگی بر کرنے لگے تھے۔ یہ سزا میں اگرچہ ظاہر سخت ہیں لیکن کسی بھی معاشرہ میں حقیقی امن کے قیام کی ضامن ہیں، اور یہ سزا میں طالبان حکومت کی تجویز کردہ نہیں بلکہ قرآن و سنت میں واضح طور پر ان کی صراحت موجود ہے اور صدیوں تک خلافت کے نظام کے تحت دنیا کے ایک بڑے حصے میں نافذ اعلیٰ رہی ہیں۔

مغربی دنیا اور اس کی تہذیب و ثقافت پر ایمان لانے والے مسلم حکمرانوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر طالبان حکومت کا یہ نظام کامیابی کے ساتھ چند سال اور جل گیا تو باقی دنیا بالخصوص مسلم ممالک میں بدآمنی اور لا قانونیت سے دوچار عوام کیلئے اس نظام میں کشش بڑھنے لگے گی، اس لیے انہوں نے مل جل کر طاقت اور قوت کے زور سے طالبان حکومت کو ختم کر دیا ہے۔ اور اب امریکہ کی سرپرستی میں بننے والی کابل حکومت کی طرف سے اس واضح اعلان نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا اصل مقصد دہشت گردی پر قابو پانیں بلکہ افغانستان میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اسلامی نظام کو ختم کرنا تھا۔

## اسامہ بن لادن اور ان کی جدوجہد

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جنوی ۲۰۰۲ء

(لابور کے ایک دینی حلقوے کی طرف سے بھیجے گئے سوالات کے جوابات)

**سوال:** تمبر کے حمل کے بعد جو حالات پیش آئے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

**جواب:** اکتوبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور واشنگٹن میں پنٹاگون کی عمارت سے جہاز ٹکرانے کے جو واقعات ہوئے ہیں، ان کے بارے میں حتیٰ طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کس نے کیے ہیں، اور خود مغربی ایجنسیاں بھی اس سلسلے میں مختلف امکانات کا اظہار کر رہی ہیں۔ لیکن چونکہ امریکہ ایک عرصہ سے معروف عرب مجاهد اسامہ بن لادن اور عالمِ اسلام کی مسلح جہادی تحریکات کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنارہاتھا، اور خود اسامہ بن لادن کی تظمیم ”القاعدہ“ کی طرف سے امریکی مرکزاً اور تنصیبات کو نشانہ بنانے کے اعلانات بھی موجود تھے، اس لیے امریکہ نے ان حملوں کا ملزم اسامہ بن لادن کو ٹھہرانے اور افغانستان کی طالبان حکومت سے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے کا فوری مطالبہ کر دیا اور اقوامِ متحده اور ولڈ میڈیا کے ذریعے سے وہ دنیا کو یہ باور کرنے کی کوشش میں لگ گیا کہ ان حملوں کی ذمہ داری اسامہ بن لادن پر ہی عائد ہوتی ہے۔

جبکہ تک ان حملوں کا تعلق ہے، دنیا کے ہر یا شعور شخص نے ان کی نہ موت کی اور ان میں ضائع ہونے والی ہزاروں بے گناہ جانوں کے نقصان پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن امریکہ نے اس پر جس رو عمل کا اظہار کیا اور اس رو عمل پر اپنے آئندہ اقدامات کی بنیاد رکھی، اس کے بارے میں واضح تاثیر ہے تھا کہ اس رو عمل کی بنیاد حوصلہ و تدبیر پر نہیں بلکہ غصے اور انتقام پر ہے، اور عام طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ امریکہ بہر صورت فوری انتقامی کارروائی کرنے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہادی تحریکات کو کچل دینے پر تل گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہونے والے مسلسل اقدامات نے اس عمومی تاثر و احساس کی قدرتی کر دی ہے۔

جبکہ تک اشخ اسامہ بن لادن اور افغانستان کی طالبان حکومت کے موقف کا تعلق ہے، ان کے طریقہ کار اور ترجیحات سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود اصولی طور پر ان کا موقف درست تھا اور امریکہ کا موقف اس کے مقابلے میں کمزور اور بے وزن تھا۔ اسی لیے امریکہ نے کارروائی میں عجلت سے کام لیا تاکہ اکتوبر کے واقعات کے نتیجے میں اسے علمی سطح پر جو ہمدردی حاصل ہوئی ہے، اس کے خلاف اپڑ جانے سے قبل وہ سب کچھ کر دیا جائے جس کیلئے امریکی دماغ اور ادارے کئی سال سے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

اسامہ بن لادن روس کے خلاف جہاد افغانستان میں عملی شرکیت تھے اور امریکہ بھی اس جہاد کا سب سے بڑا سپورٹر تھا، اسی لیے اس دور میں مغربی ذرائع ابلاغ اور خود امریکی ادارے انہیں ایک عظیمِ مجاہد کے طور پر پیش کرتے رہے اور جہاد افغانستان کے خاتمے کے بعد اسامہ بن لادن ایک ہیرو کے طور پر اپنے وطن واپس جا پکے تھے۔ لیکن جب انہوں

نے دیکھا کہ خود ان کے اپنے ملک سعودی عرب اور اس کے ساتھ پورے عرب خطے کو امریکہ کے ہاتھوں وہی صورتحال در پیش ہے جو جہاد افغانستان سے قبل افغانستان کو روں کے ہاتھوں در پیش تھی تو ان کیلئے اس صورتحال کو قبول کرنا ممکن نہ رہا۔ انہوں نے دیکھا کہ

- خلیج عرب میں امریکی فوجیں مسلسل بیٹھی ہیں جس کی وجہ سے عرب ممالک کی آزادی اور خود مختاری ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے،
- عرب ممالک کی دولت اور تیل کا بے دردی کے ساتھ استحصال کیا جا رہا ہے،
- عرب عوام کو انسانی، شہری اور شرعی حقوق حاصل نہیں ہے اور اپنے حقوق کیلئے آواز اٹھانے کا کوئی موقع بھی میر نہیں ہے،
- جبکہ فلسطین کے خلاف اسرائیل کی جاریت اور شند میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور فلسطینی عوام پر ان کی اپنی زمین تنگ کر دی گئی ہے۔

تو انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور مطالبہ کیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں خلیج عرب سے نکل جائیں۔ لیکن چونکہ ان کے ملک میں اس قسم کی بات کہنے اور کوئی سیاسی مہم چلانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس لیے انہیں مجبوراً اس رخ پر آنا پڑا کہ وہ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے شند کاراستہ اختیار کریں اور خلیج عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی کیلئے اسی قسم کی جدوجہد منظم کریں جس طرح کی جدوجہد کا تجربہ افغانستان سے روئی فوجوں کی واپسی کیلئے اس سے قلیل ہو چکا تھا اور وہ خود اس میں شریک رہے تھے۔

اسامہ بن لادن کے طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس بات سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا موقف اور مطالبہ اصولی طور پر درست تھا۔ اور اس بات سے اختلاف کرنا بھی ممکن نہیں ہے کہ سعودی عرب اور خلیج عرب کے دیگر ممالک میں سیاسی جدوجہد کے راستے کمکل طور پر مدد و ہونے کی وجہ سے اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کیلئے اپنے جذبات اور موقف کے اظہار کیلئے صرف ایک راستہ باقی رہ گیا تھا جسے شند کاراستہ کہا جاتا ہے اور جس پر اسامہ بن لادن کو مطعون کیا جاتا ہے، لیکن طعن تنشیع کرنے والے اس معروضی تمازن سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ ان حالات میں ان کیلئے اس کے سوکوئی اور راستہ اختیار کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اسامہ بن لادن کا خیال تھا کہ وہ جہاد افغانستان میں ٹریننگ لینے والے دنیا بھر کے مجاہدین کو ایک نظم اور پروگرام میں مشک کریں گے اور اس طرح ایسا مزاجمتی گروپ وجود میں آجائے گا جو عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں ہونے والے جزو شند کے خلاف ”پریشر گروپ“ کا کام کرے گا، اور شاید وہ اس کے ذریعے سے اسرائیلی جاریت کے سامنے کوئی رکاوٹ کھٹری کرنے اور خلیج عرب میں امریکی فوجوں کے خلاف اس حد تک دباو منظم کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو امریکہ کو خلیج عرب میں اپنی فوجوں کی موجودگی کے تسلیم پر نظر ثانی کیلئے مجبور کر سکے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے سوڈان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا لیکن امریکی دباؤ کی وجہ سے سوڈان کی حکومت کیلئے اسامہ بن لادن کا وجود برداشت کرنا ممکن نہ

رہا۔ چنانچہ وہ سوڈان چھپوڑ کر افغانستان آگئے جہاں طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور وہ ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام اور امریکہ کے تسلط سے عالم اسلام بالخصوص خلیج عرب کی آزادی کے حوالے سے اسماء بن لادن کے موقف سے متفق تھی۔ ان کے ساتھ وہ ہزاروں عرب مجاہد بھی افغانستان آگئے جو جہاں افغانستان میں شریک تھے اور اسلامی جذبات سے سرشار ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے ملکوں میں واپس جانے کی صورت میں حکومتوں کی طرف سے انتقامی کارروائیوں اور ریاتی جرکان شانہ بننے کے نظرات سے دوچار تھے۔

طالبان حکومت نے نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ موقف اور جذبات کی ہم آہنگی اور دینی حیثیت میں شرکت کی وجہ سے دونوں میں ایسے تعلقات کا رجھی قائم ہو گئے کہ انہیں ایک ہی منزل کے سافر سمجھا جانے لگا۔ اس کے باوجود طالبان حکومت نے انتہر کے واقعات کے بعد یکطرفہ موقف اختیار نہیں کیا بلکہ ان واقعات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر ثبوت فراہم کر دیے جائیں تو وہ اسماء بن لادن کو حوالے کر دینے کے مطالبے پر غور کرنے کیلئے تیار ہیں، یا کسی ایسے ہیں الاقوای فورم کے حوالے بھی کر سکتے ہیں جو غیر جانبدار ہو۔ مگر امریکہ نے رعوت اور ہٹ دھرمی کے ساتھ ان کے اس جائز موقف کو مسترد کر دیا اور اپنے الزامات کو ہی قطعی ثبوت قرار دیتے ہوئے افغانستان پر حملہ کا اعلان کر دیا جس کے ذریعے سے امریکہ نے وہ دونوں مقاصد حاصل کر لیے جو اس نے پہلے سے طے کر کر تھے اور انتہر کے واقعات ان کیلئے محض بہانہ ثابت ہوئے۔

**سوال:** افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا خاتمه ہوا ہے۔ اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

**جواب:** طالبان حکومت قائم ہوتے ہی مجھے یہ خدشہ محسوس ہونے لگا تھا اور میں نے کئی مضامیں میں اس کا اظہار بھی کیا کہ اس حکومت کو برداشت کرنا نہ صرف یہ کہ امریکہ کیلئے ممکن نہیں ہے بلکہ وہ مسلمان حکومتیں بھی اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہیں جو اپنے ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریکات کا سامنا کر رہی ہیں۔ کیونکہ طالبان حکومت کی کامیابی کا واضح مطلب یہ ہوتا کہ مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریکات کو تقویت حاصل ہوتی اور ایک کامیاب حکومت کی صورت میں عملی آئندہ میں بھی مل جاتا۔ اس لیے امریکہ اور فرنگی دیگر طاقتیوں کے ساتھ ان مسلم حکومتوں کا اتحاد ایک فطری بات تھی اور ان سب نے مل کر ایک ایسی حکومت کو ختم کر دیا ہے جو اپنی کامیابی کی صورت میں دونوں کیلئے خطرہ بن سکتی تھی۔ خطرہ اس معنی میں نہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی قوت ہوتی بلکہ اس معنی میں کہ موجودہ عالمی سسٹم سے ہٹ کر اور اس سے بغافت کر کے ایک الگ نظریہ اور فلسفہ کے تحت بننے والی کسی حکومت کی کامیابی سے ان تمام قوتوں اور عناسروں کو بغافت کارستہ مل جاتا جو موجودہ عالمی سسٹم سے مطمئن نہیں ہیں اور اس سے چھکارا حاصل کرنے کیلئے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ اسی لیے اسے بہت بڑا خطرہ سمجھا گیا اور اسے ختم کرنے پر دنیا کی سب حکومتیں اپنے تمام تراخیات کے باوجود متفق ہو گئیں۔

امریکہ اور اس کی زیر قیادت عالمی استعمار کو عالم اسلام سے کوئی فوجی، سیاسی یا معاشری خطرہ نہیں ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان ہی ہے۔ بلکہ فوجی، سیاسی اور معاشری طور پر پورا عالم اسلام امریکہ کے شکنچے میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے۔ مگر مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفہ و نظام کے مقابلے میں اگر کسی فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت میں لکھرا ہونے

کی قوت و صلاحیت موجود ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ اور اس کے اتحادی اسلامی تحریکات کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں اور بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت کو اگر دنیا کے کسی خطے میں ایک ریاتی سٹم کے طور پر قدم جانے کا موقع مل گیا تو وہ موجودہ عالمی نظام اور مغربی فلسفہ و ثقافت کیلئے حقیقی خطرہ بن سکتا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ عالمی سٹم کے ارباب حل و عقد نے قطعی طور پر یہ بات طے کر رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کو نے میں کوئی ایسی مسلمان حکومت وجود میں نہ آنے پائے جو موجودہ عالمی سٹم اور یہاں الاقوامی نیٹ ورک سے ہٹ کر ہو، یادوسرے لفظوں میں اقوام متحدہ کی بالادستی قبول کرنے کے بجائے وہ اپنا کوئی الگ ایجنسڈار کھتی ہو۔ افغانستان میں طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو تسلیم نہ کرنے اور اب اسے فوجی طاقت کے زور پر ختم کر دینے کا بھی یہی پس منظر ہے۔

البتہ طالبان حکومت کے خاتمے پر انہی افسوس اور صدمہ کے باوجود کسی حد تک یہ بات اطمینان بخش ہے کہ طالبان حکومت کا خاتمہ فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت میں مغرب کی بالادستی کے خواہ سے نہیں ہوا بلکہ محسن مادی طاقت، جبر و تشدد اور عسکری قوت کے زور پر اسے ہٹایا گیا ہے۔ فکر و فلسفہ اور نظام و ثقافت اگر زندہ ہوں تو عسکری ناکامیاں زیادہ دیر تک ان کا راستہ نہیں روک سکتیں اور وہ کسی نہ کسی طرح سے اپنے اطباء اور پیش قدمی کے راستے کاکل لیا کرتے ہیں۔

**سوال:** مستقبل میں افغانستان کی صور تحوال کیا ہوگی؟

**جواب:** میرے خیال میں امریکی اتحادی پشت پناہی سے قائم ہونے والی حکومت افغانستان میں امن قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوگی اور افغانستان کے سب قبائل کو مطمئن کرنا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔ یہ صرف اسلام اور ایمان کی قوت تھی جس نے قبائلی تھبیات اور علاقائی امتیازات کو دبارکھا تھا۔ اس کا پردہ ہٹ جانے کے بعد اب تمام معاملات قبائل اور علاقائیت کے خواہ سے طے پائیں گے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان عصیتوں میں اضافہ ہو گا۔ جبکہ مغربی قوتوں کا مفاد بھی اسی میں ہو گا کہ یہ عصیتوں بڑھیں اور اختلافات و تفرقہ کا ماحول قائم رہے تاکہ وہ اس کی آڑ میں افغانستان پر اپنا نشروں زیادہ دیر تک قائم رکھ سکیں اور سطحی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے خواہ سے اپنے ایجنسڈے کی تکمیل کر سکیں۔

دوسری طرف طالبان تحریک نے میدان جنگ سے پسپائی اختیار کی ہے، ذہنی طور پر شکست اور دستبرداری قبول نہیں کی۔ اور ان کی افرادی قوت بڑی حد تک محفوظ ہے اس لیے وہ کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ منظم ہوں گے اور مزاحمت کا راستہ اختیار کریں گے جس کی حمایت و تعاون کرنا اس خطے کی ان تمام قوتوں کی مجبوری بن جائے گا جو امریکہ کی بیہاں مستقل موجودگی کو اپنے مفادات کیلئے خطرہ تصور کرتے ہیں۔ وقتی لشکر کشی میں امریکی اقدامات کا ساتھ دینا اور بات ہے اور اس خطے میں امریکہ کی مستقل فوجی موجودگی کو قبول کرنا اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ اس لیے اس کا فائدہ ہر اس قوت کو ہو گا جو افغانستان میں امریکی اتحادی فوجوں کی مستقل یا زیادہ دیر تک موجودگی کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کرے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ طالبان کی یہ مزاجمتی تحریک دوبارہ منظم ہونے میں ایک سال اور اپنے ہدف تک پہنچنے میں

پانچ چھ سال کا عرصہ لے سکتی ہے اور افغان قوم کے مزاج، روایات اور تاریخی تسلسل کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس کی کامیابی میں شک اور تردی کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔

سوال: القاعدہ اور طالبان کو نشانہ بن کر امرت مسلمہ پر جو ظلم کیا گیا ہے، اس میں اسلامی ممالک کی کیا ذمہ داری ہے؟  
جواب: میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ موجودہ مسلم حکومتیں عالمی نظام اور اقوام متحدہ کے نیٹ ورک کا حصہ ہیں، وہ اس سے بغاوت اور اخراج کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس لیے ان سے کسی ذمہ داری کی ادائیگی بلکہ کسی بھی درجے میں کسی خیر کی توقع کرنا ہی فضول ہے۔ اسلامی تحریکات کو مسلم عوام سے اپنارشتہ استوار کرنا ہو گا اور انہی کے اعتماد اور تعاون سے اپنے کام کو آگے بڑھانا ہو گا، اس کے سوا ان کیلئے کوئی راستہ نہیں ہے۔

سوال: مستقبل میں مجاہدین کو کس طرح کالائج عمل اختیار کرنا چاہیے؟ باخصوص اب جبکہ پاکستان میں بھی مجاہدین کے خلاف عملی کارروائی ہونے کی توقع ہے؟

جواب: میں اصولی طور پر تشدد کے حق میں نہیں ہوں اور پُرآمن سیاسی جدوجہد کا قائل ہوں۔ اسی وجہ سے جہاں سیاسی جدوجہد کے راستے کھلے ہوں وہاں کسی قسم کی پُر تشدد تحریک کو جائز نہیں سمجھتا، اور پاکستان میں بھی نقاذاً اسلام کی جدوجہد کیلئے تشدد اور عسکریت کا راستہ اختیار کرنا میرے نزدیک درست طرز عمل نہیں ہے۔ البتہ جہاں عالمی جمیعت ایتی تشدد کی فضاموجوہ ہو اور اس کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے، اپنے حقوق کیلئے آواز اٹھانے، اور سیاسی دباؤ ڈالنے کے تمام راستے مدد و دہوں، وہاں احتجاج کرنے اور کامیہ حق بلند کرنے والوں کی طرف سے تشدد کا راستہ اختیار کرنے کو ان کی مجبوری سمجھتا ہوں اور مجبوری ہی کے درجے میں ان کی حمایت کو دینی حیثت کا تقاضا انصور کرتا ہوں۔ اسی طرح جن غیر مسلم ممالک میں مسلم اکثریت کے خاطے اپنی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں، ان کی جدوجہد میرے نزدیک جہاد ہے۔ اس پس منظر میں جہادی تحریکات کیلئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ مل بیٹھ کر اپنی پالیسی اور طریق کار کا از سر نوجائز ہے، اپنی غلطیوں کی نشاندہی کریں، ترجیحات پر نظر ثانی کریں، اور اہل علم و دانش کو اعتماد میں لے کر اپنا آئندہ طرز عمل طے کریں۔

میرے نزدیک جن باتوں نے جہادی تحریکات کو نقصان پہنچایا ہے، ان میں چند اہم امور یہ ہیں:

1. اصل اہداف سے ہٹ کر جذباتی نعروہ بازی میلادی ملک کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے پاکستان میں طالبان کی طرز پر انقلاب لانے، اور مغربی ملکوں کے مرکزوں کو نشانہ بنانے کی باتیں، جنہوں نے ان سب قتوں کو نہ صرف چوکناکیا بلکہ متحد بھی کر دیا۔

2. ایجنسیوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اختلاط اور اس اختلاط میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی در پرداہ کوششیں جن کی وجہ سے پالیسی سازی اور فیصلوں کی قوت بذریعہ جہادی تحریکات کی لیڈر شپ کے ہاتھوں سے نکلتی چلائیں۔

3. باہمی مشاورت، تعلقات کار اور انڈر سینیٹ نگ کے ضروری اہتمام سے گریز۔

4. ملک کے داخلی معاملات باخصوص فرقہ وارانہ امور میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ملوث ہونا۔

۵۔ اور اہل علم و دانش سے صرف تعاون اور سرپرستی کے حصول پر قناعت کرتے ہوئے ان سے راہنمائی اور مشاورت کی ضرورت محسوس نہ کرنا۔

یہ اور اس قسم کی دیگر کئی باتیں ہیں جنہوں نے جہادی تحریکات کو نقصان پہنچایا اور ان کے مقابل عناصر کو اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے جہادی تحریکات کو اپنی پالیسیوں اور طریق کار کا از سرنو جائزہ لینا چاہیے اور اہل علم و دانش کی راہنمائی میں لا جگہ عمل اور ترجیحات کا پھر سے تعین کرنا چاہیے۔

سوال: حال ہی میں انڈین پارلیمنٹ پر فدائی حملہ ہوا ہے، اس کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: یہ حملہ جس نے بھی کیا ہے، اس نے انڈیا کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کارروائی کی راہ ہموار کرے اور امریکہ کو جہادی تحریکوں کے خلاف دباؤ بڑھانے میں اس سے سہولت حاصل ہوئی ہے۔ اس پس منظر میں مجھے یہ حملہ کسی بین الاقوامی پلان کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

سوال: مسئلہ کشمیر اور فلسطین کے مسئلے میں امریکہ کیا ب سنجیدگی سے غور کرے گا؟ میری مراد اس سے اقوام متحدہ ہے۔

جواب: فلسطین اور کشمیر دونوں جگہ امریکہ کی دلچسپی یا اقوام متحده کی تھوڑی بہت حرکت کا بنیادی سبب مزاجتی تحریک اور مجاہدین کا کسی حد تک دباؤ ہے۔ یہ دباؤ موجود رہا تو شاید اقوام متحده اور امریکہ کسی درجے میں ان مسائل کے حل میں دلچسپی لیں۔ اور اگر یہ دباؤ ختم ہو گیا یا جیسا کہ خود امریکہ کا پروگرام ہے کہ مجاہدین کے اس دباؤ کو بزور بازو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد حالات کے نارمل ہو جانے پر امریکہ، اقوام متحده یا دیگر مغربی قوتوں کیلئے کوئی درد سرباقی نہیں رہے گا کہ وہ ان مسائل کے حل میں دلچسپی لیں، اور پھر عربوں اور پاکستان کو آزادی اور اطہیناں کی فضائیں اقتضادی اور معماشی ترقی کا موقع بھی فراہم کریں۔ یہ سب باتیں امریکہ کے اپنے مفادات کے خلاف ہیں اس لیے اس سے یا اقوام متحده سے اس سلسلے میں کسی ثابت کردار کی توقع ایک خوش نہیں اور خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔

## طالبان قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فوری ۲۰۰۲ء

روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء کی روپورٹ کے مطابق امریکی وزیر دفاع رمزفیلڈ نے پیشناگان میں پریس برینفلنگ کے دوران کہا ہے کہ طالبان کے جن قیدیوں کو قیش کیلئے کیوبا کے قریب امریکی بیس میں منتقل کیا جا رہا ہے ان سے جنیوا کنوشن کے مطابق جنگی قیدیوں جیسا سلوک نہیں کیا جائے گا کیونکہ جنگی قیدی نہیں ہیں۔

روپورٹ کے مطابق افغانستان میں طالبان اور القاعدہ کے سینکڑوں ارکان کو حراست میں لیا گیا ہے جن میں سے اب تک ساڑھے چار سو افراد کو امریکہ کے حوالے کیا جا رہا ہے جنہیں کیوبا کے امریکی بیس میں بتدریج منتقل کیا جا رہا ہے۔ بعض دیگر اخباری رپورٹوں کے مطابق ان قیدیوں کی ذاٹھیاں اور سر کے بال موٹھ دیے گئے ہیں اور انہیں ان کے

لباس اتنا وکر صرف نیکروں میں جہاز پر سوار کیا گیا ہے۔  
یہ تو صرف وہ باتیں ہیں جو دیکھنے والوں کے نوٹس میں آگئی ہیں، اس کے علاوہ ان قیدیوں کو جس وحشانہ تشدد کا  
نشانہ بنایا جا رہا ہے اس کا اندازہ مذکورہ حرکت کے ساتھ ساتھ امریکی وزیر دفاع کے اس بیان سے بھی کیا جا سکتا ہے جس  
میں انہوں نے قیدیوں کو جنگی قیدی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ جنیوا کنو نوش نے جنگی  
قیدیوں کیلئے جن قواعد و ضوابط کا تعین کر رکھا ہے ان کا اطلاق ان قیدیوں پر نہیں کیا جائے گا۔

امریکہ اور اس کے حواری پوری دنیا میں انسانی حقوق، اقوام متحده کے فیصلوں اور جنیوا کنو نوش کے اصولوں کا پرچار  
کرتے رہتے ہیں اور ان کے زبردستی نفاذ کیلئے خدائی فوجدار بنے ہوئے ہیں، لیکن انہی فیصلوں اور اصولوں کو خود اپنے لیے  
تسلیم کرنے سے امریکہ نے انکار کر دیا ہے۔ جس سے ہمارے اس موقف کی ایک بار پھر تصدیق ہو گئی ہے کہ انسانی حقوق،  
اقوام متحده کا منشور، اور یعنی الاوقا میں اصولوں کا پرچار امریکہ کی طرف سے اصولوں کے طور پر نہیں بلکہ یہ اس کے ہتھیار  
ہیں جو اس نے صرف غریب ممالک کو دبائے اور مظلوم اقوام پر اپنا تسلط قائم کرنے کیلئے اپنارکھے ہیں۔

امریکہ کا یہ دوہر امعیار کوئی نہیں، اس سے قبل امریکہ کئی بار اس دوہرے معیار کا عملی مظاہرہ کر چکا ہے۔ اس لیے  
اس پر حیرت و تجہب کا کوئی محل نہیں، البتہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی مسلسل دہائی دینے والے مسلم حکمرانوں کی خاموشی اور  
بے حسی ضرور باعثِ تجہب ہے جو اس سب کچھ کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی ”خاموش تماشائی“ بنے ہوئے ہیں۔

## پاکستان میں مذہبی و جہادی جماعتوں پر پابندی

مہمان نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فوری ۲۰۰۲ء

صدر جزل پرویز مشرف نے لشکر طیبہ، حیثیں محمد اور سپاہ صحابہؓ سمیت متعدد مذہبی و جہادی تنظیموں کو خلاف قانون  
قرار دے دیا ہے جس کے تحت ان تنظیموں کے ہزاروں افراد کی مسلسل گرفتاریوں کے علاوہ ان کے سینکڑوں دفاتر بند کر  
دیے گئے ہیں اور اکاؤنٹس مخدود کر دیے گئے ہیں۔ صدر پرویز مشرف نے پابندی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ  
تنظیمیں دہشت گردی میں ملوث ہیں اس لیے ان پر پابندی لگانا ضروری ہو گیا تھا۔

ہمارے خیال میں صدر محترم کا صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے ضروری  
ہے کہ ان تنظیموں کے خلاف سپریم کورٹ میں باقاعدہ ریفرنس پیش کیا جائے اور ان کے خلاف الزامات باضافہ طور پر  
سامنے لا کر انہیں عدالتی سطح پر صفائی کا موقع دیا جائے۔ اس کے بغیر ان جماعتوں پر پابندی اور ہزاروں علماء و کارکنوں کی  
گرفتاری کو بہر حال بے انصافی اور بلا جواز ہی تصور کیا جائے گا۔ اس لیے ہماری گزارش ہے کہ حکومت یا تو یہ کیس باقاعدہ  
طور پر سپریم کورٹ میں پیش کرے اور یا پھر پابندی واپس لے کر انہیں حسب سبق سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع دیں،  
کیونکہ انصاف اور عدل کا تقاضا بہر حال یہی ہے۔

## افغان خواتین و کلاں کے خیالات

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فوری ۲۰۰۲ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۰ فروری ۲۰۰۲ء کی روپورٹ کے مطابق طالبان حکومت کی آمد کے بعد کابل سے پشاور شفث ہونے والی چند سرکردہ خواتین نے گذشتہ روز لاہور ہائیکورٹ کا دورہ کیا، اور ہائیکورٹ بار کے صدر مزل خان ایڈووکیٹ کی طرف سے دیے گئے استقبالیہ میں شرکت کے علاوہ پرنسپل میں کافرنز سے بھی خطاب کیا۔ افغان خواتین کا گروپ ۲۲ خواتین پر مشتمل تھا جن کی قیادت آصفہ کاکڑ ایڈووکیٹ اور مریم تاجک ایڈووکیٹ کر رہی تھیں۔ اور ان میں زیادہ تر ایڈوکیٹس، حج اور پروفیسر خواتین تھیں جو کافی عرصہ سے پاکستان میں موجود ہیں۔

روپورٹ کے مطابق تمام خواتین پر دیے گئے تھیں اور پرنسپل کافرنز میں انہوں نے طالبان حکومت اور افغان خواتین پر طالبان کے ظلم و ستم کے سلسلہ میں کیے گئے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں۔

اس موقع پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمیں تحفظ صرف اسلامی نظام میں مل سکتا ہے اور ہمیں افغانستان میں مغرب کا نظام نہیں چاہیے۔ آصفہ کاکڑ ایڈوکیٹ نے کہا کہ ۱۹۷۶ء میں بھی افغانستان میں مکمل اسلامی نظام رائج تھا، اس وقت بھی مختلف جرائم کی سزا میں اسلامی قوانین اور شریعت کے مطابق دی جاتی تھیں، تمام قانونی ادارے فقہ حنفی کے تحت کام کرتے تھے، افغانستان میں فیصلی خواتین بھی موجود تھیں اور لویہ جرگہ میں بھی خواتین کی نمائندگی ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم افغانستان میں مکمل اسلامی نظام چاہتی ہیں اور مغرب کا نظام نہیں چاہتیں۔

ہمیں جدید تعلیم یافتہ سرکردہ افغان خواتین کے ان خیالات سے خوش ہوئی ہے اور اس سے ہمارے اس لیقین میں اضافہ ہوا ہے کہ افغانستان میں کچھ بھی کر لیا جائے، غیور افغانوں کو ان کے دین اور دینی روایات سے دور کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم ان ممزز خواتین سے یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر وہ فی الواقع اسلامی نظام اور شریعت کی بالادستی کو افغانستان میں برقرار رکھنا چاہتی ہیں تو وہ امریکہ اور مغربی ممالک کی سریستی کے ماحول میں ممکن نہیں ہے۔ اور اس کیلئے مغربی فلسفہ و نظام سے مرعوب قیادت کی بجائے مغرب کے فکر و فلسفہ کا حوصلہ و جرأت کے ساتھ سامنا کرنے والی قیادت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طالبان کی صورت میں نیک دل، سادہ منش، قاععات پسند اور رائج العقیدہ قیادت افغانوں کو دی تھی جس کی قدر نہیں کی گئی، اب اس کے بعد اسلامی نظام اور شریعت کی باتوں کو خود فریبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

## پاکستان کی افغان پالیسی اور عوامی جذبات

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۰۲ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۹ افروری ۲۰۰۲ء کی روپورٹ کے مطابق صوبائی وزیر قانون ڈاکٹر خالد راجھانے گذشتہ روزخانہ فرہنگ ایران لاہور کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ افغانستان کے مسئلے پر حکومتی پالیسی عوامی جذبات کے بر عکس تھی۔ انہوں نے کہا کہ دہشت گردی اور جہاد میں بڑا فرق ہے۔ اگر ہم یہ کہنا بند ہو گئے تو دارہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ مغرب کو اس وقت مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے خوف ہے اور وہ اس جذبے کو غرق کرنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ایک صدی قبل جب برطانیہ سپرپاور تھا اس نے ۱۸۸۰ء میں افغانستان پر حملہ کیا تو وہاں سے صرف ایک ڈاکٹر زندہ بچ کر آیا تھا، شکست کھانے کے بعد انگریزوں نے اس کے بارے میں غور کرنا شروع کیا کہ وہ افغانستان سے کیوں ہارے ہیں؟ اس پر ۱۹۰۲ء میں ایک روپورٹ لکھی گئی جس میں برطانیہ کی شکست کی بنیادی وجہ یہ بتائی گئی کہ برطانوی فوجی سرپرلوپ پہنچ کر لڑتے تھے جبکہ افغان سرپرپڑیاں باندھ کر لڑتے تھے، انہیں موت سے خوف نہیں تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اگر مارے گئے تو یہی بلکہ ہمارا کفن بن جائے گی، لہذا اس جذبہ جہاد کے ہوتے ہوئے افغانستان کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ اگر انہیں شکست دیتی ہے تو مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو ختم کرنا ہو گا۔ لہذا یہ منصوبہ بندی بڑی دیر سے جاری ہے۔

ہمیں خالد راجھا صاحب کے ارشادات سے مکمل اتفاق ہے لیکن اتنی گزارش بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان ارشادات کی جگہ قوصل خان کی تقریب نہیں بلکہ حکومت پاکستان کا کوئی پالیسی ساز فورم تھا، اے کاش! راجھا صاحب نے یہ باتیں پالیسی طے ہوتے وقت وہاں فرمائی ہوتیں۔

## مغربی اقوام کی بربریت تاریخ کے آئینے میں

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۶ فروری ۲۰۰۲ء

محض سے بعض دوستوں نے پوچھا ہے کہ کیوں کے امریکی تفیشی مرکز میں جن طالبان اور القاعدہ کے ارکان کو لے جایا گیا ہے اور وحیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اس کے بارے میں آپ نے اسکے تک کیوں نہیں لکھا؟ میں نے ان دوستوں کو جواب دیا کہ یہ سب کچھ میرے لیے خلاف توقع نہیں ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے تو قع کے مطابق ہو رہا ہے اور ایسا ہی ہونا تھا۔ اس لیے مجھے بطور خاص اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی سر دست ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اور یہ صرف میری بات نہیں جس شخص کی بھی تاریخ پر نظر ہے اور وہ مغربی اقوام کے دکھانے کے دانتوں کے ساتھ ساتھ کھانے کے دانتوں سے بھی واقف ہے اس کیلئے امریکہ کا یہ طرز عمل خلاف توقع اور قابل تجسس نہیں ہے کہ اس نے افغانستان کے خلاف

باقاعدہ اعلان جنگ کرنے اور ہر مرحلہ پر اسے جنگ قرار دینے کے باوجود اپنے شکست خودہ مخالفین میں سے گرفتار شد گان کو جنگ قیدی تسلیم نہیں کیا۔ اور امریکہ پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود کیوبا کے تقیشی مرکز میں لے جائے جانے والے قیدیوں کو وہ حقوق اور سہولتیں دینے کیلئے تیار نہیں ہے جو ”جنیواں توشن“ کے واضح فیصلوں کے مطابق انہیں ہر حال میں حاصل ہونی چاہیں۔ یہ طاقت کی حکومت اور جنگل کے قانون کا مظاہرہ ہے جو پہلی بار نہیں ہے بلکہ مغربی اقوام اس سے قبل بیسوں بار ایسا کرچکی ہیں۔

طالبان اور القاعدہ کے قیدیوں کے ساتھ امریکی حکومت کا موجودہ روایہ صرف ان لوگوں کیلئے تجربہ اور حیرت کا باعث ہو سکتا ہے جو امریکی اتحاد کو اقوام متحده کے منشور، جنیواں توشن کے فیصلوں، اور امریکہ یا دیگر مغربی ملکوں کے دساتیر و قوانین کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اصول پسند توں ہیں جو اصول و ضوابط کی جنگ لڑتی ہیں۔ لیکن جو حضرات ان اقوام کے ماضی اور مفتوح اقوام کے ساتھ ان کے طرز عمل کے تسلسل سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ امریکی اتحاد کے نزدیک اصول و ضوابط اور اخلاق و اقدار کی حیثیت صرف تھبیاروں کی ہے جنہیں وہ اپنی مخالف اقوام و ممالک کے خلاف خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب انہی اصول و ضوابط پر خود عمل کی پاری آتی ہے تو ”وی آئی پی“ کے مقام پر فائز ہو کر اپنے آپ کو اس سے مستثنی قرار دے لیتے ہیں۔ یہ نسلی برتری یا وی آئی پی ہونے کی بات محض اندازہ نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ کے اعتقادی اور تہذیبی پس منظر کا حصہ ہے جس کی نشاندہی قرآن کریم نے سورہ البقرہ کی آیت ۸۰، سورہ المائدہ کی آیت ۱۸ اور دیگر مقابلات پر کی ہے کہ یہ دونوں قومیں خود کو باقی امتیوں سے ممتاز اور وی آئی پی بھتی ہیں۔ یہودیوں کا ہبنا ہے کہ ہم انہیاء کر رائی کی اولاد ہیں جبکہ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ قیامت تک جو گناہ بھی کریں گے ان سب کا فارہ حضرت علیؑ ان کے بقول سولی پر چڑھ کر دے گئے ہیں۔ اس لیے بالادستی، برتری اور کسی بھی قسم کی مسئولیت سے بالاتر ہونے کی بات یہود و نصاریٰ کی جبلت اور مزان میں شامل ہے جس کا مظاہرہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور آج بھی امریکی اتحاد اسی جبلت و فطرت کا کھلے بنندوں اظہار کر رہا ہے۔

میں اپنے قاریئن کو مشورہ دوں گا کہ وہ کیوبا کے تقیشی مرکز میں طالبان اور القاعدہ کے قیدیوں کے ساتھ امریکی طرز عمل پر حیرت کا اظہار کرنے کی بجائے اور اس سلسلہ میں امریکہ سے کسی خیر اور انصاف کی توقع بلکہ خوش فہمی رکھنے کی بجائے مغربی اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور ان ”کارناموں“ پر ایک نظر ڈالیں جو انہوں نے مختلف ممالک و اقوام کو غلام اور نوابادی بنانے کے بعد گذشتہ صدیوں میں ان سے روار کئے تھے۔ خود ہمارے ہاں بر صیری میں فرنگی حکومت قائم ہونے کے بعد گذشتہ صدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اور انہیں جس اذیت ناک اور روشنست ناک تشدد کا نشانہ بنایا گیا وہ آج بھی تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ اگر مقابل کر کے دیکھا جائے تو بر صیری میں برطانوی حکمرانوں کے تشدد و بربریت کا شکار ہونے والے حریت پسندوں اور کیوبا میں امریکی تشدد کا نشانہ بننے والے مظلوم قیدیوں کی حالت زار میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔

کچھ عرصہ قبل سابق ڈپٹی میسردہ بھی مولانا مدد صابری مرحوم کی کتاب ”تاریخ جرم و سزا“ دیکھنے کا موقع ملا، آج کل پھر اس کی تلاش میں ہوں گرد سنتیاب نہیں ہو رہی۔ اس میں انہوں نے ان مظالم کی تفصیل بیان کی ہے جو ۱۸۵۷ء کی

جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے بر صغیر کے عوام کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانے کیلئے ردار کھٹے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تہذیب و تمدن کے علمبردار برطانوی افسران نے اپنے مخالفین کو

1. توپ کے منڈ پر باندھ کر گولے سے اڑادیا تھا،

2. گھنٹوں تک زمین میں گاڑ کر ان پر بھوکے کتے چھوڑے گئے تھے،

3. اور زندہ انسانوں کو سور کی کھالوں میں سی کراؤں میں جلا دیا تھا۔

امریکی استعمار بھی اسی برطانوی استعمار کا جانشین ہے اس لیے اس سے اس کے علاوہ اور کس طرز عمل کی توقع کی جاسکتی ہے؟ مولانا امداد اللہ صابری مرحوم کے علاوہ معروف احرار الحاج مرزا غلام نبی جانباز مرحوم نے بھی اپنی کتاب ”بڑھتا ہے ذوق جرم میراہ سزا کے بعد“ میں اس تشدد و بربریت کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکی عزائم، طرز عمل اور ہٹ دھرمی کے پس منظر اور اسباب کو سمجھنے کیلئے ان دو کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

اس وقت میرے سامنے گورنمنٹ ڈگری کا چکنگو جو جرنوالہ کے ادبی مجلہ ”مہک“ کا گورنواں نمبر ہے جو ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء کے دورانیہ میں شائع ہوا تھا۔ گیارہ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل اس خیم نمبر میں گورنواں کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے معلومات کا گراں قدر ذخیرہ مرتب صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۹۷۹ء میں روٹ ایکٹ کے نفاذ کے موقع پر ملک بھر میں ابھرنے والی سیاسی احتجاجی تحریک اور اس میں شریک ہونے والوں پر مہذب برطانوی حکومت کے مظالم کی پکھنچ تفصیل بیان کی گئی ہے جس کے بعض حصے لاطور نمونہ نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ بات قارئین کے علم میں ہو کہ طالبان اور القاعدہ کے قیدیوں کے ساتھ امریکی اتحاد کا طرز عمل کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ ان کی جبلت اور تاریخ کا حصہ ہے۔

۷۱۹۱ء میں نیشنل کانگریس نے مطالبہ کیا تھا کہ اس سال کے اندر اندر مکمل طور پر ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ اس خیال سے انقلاب پسندوں نے تحریک آزادی شروع کر دی۔ وائرسے نے ان حالات اور تحریک کے اسباب کی تحقیق کیلئے ایک ایسی روپورٹ تیار کی جس میں ہندوستانیوں کی تحریک آزادی کو مکمل طور پر دبانے کی سفارش کی۔ ۱۹۷۹ء میں ایک روٹ ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے باعینہ تحریکوں کو سختی سے دبادینے کا اختیار حکومت کو دے دیا گیا اس سلسلہ میں ملزمون کیلئے صفائی کے امکانات کم رہ گئے، گواہ حکومت جس کو چاہے گرفتار کر لے اور جیسا چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے۔ اس روٹ ایکٹ کے خلاف ستیگہ یعنی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی جس کی غرض یہ تھی کہ روٹ ایکٹ کو حکومت منسوخ کر دے۔ گاندھی جی نے جنگ عظیم اول میں لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ دل کھول کر مالی اور جانی قربانی دیں۔۔۔۔۔ اب انگریزوں کی تنگ نظری سے مایوس ہو گیا اور اس نے بھی لوگوں کو پر امن مظاہرے اور شورش کرنے کی امداد دی لیکن لوگ پر امن نہ رہ سکے۔ عوام نے کئی سرکاری عمارت کو نذر آتش کر دیا، ریلیں کی پڑیاں اکھیز دیں، پل توڑ دیے، عدالتوں اور سکولوں کو آگ لگادی، تارکات دی تاکہ حکومت کا کام معطل ہو جائے۔ آخر چند مقامات مثلاً گورنواں، لاہور اور امرتسر میں مارشل لاء کا دیا گیا جہاں ٹکشیاں بازاروں میں لگا کر ہر اس آدمی کو بیدار کئے گئے جس

نے کسی گورے کو سلام نہ کیا۔ کئی لوگوں کو پتھر ہوئی زمین پر گھسیا گیا، کئی سر کردہ و کلاہ اور لوگوں کو گرفتار کر کے جمل خانوں میں اذیتیں دی گئیں، کئی ایک کی جائیداد ضبط کر لی گئی، امر تسریں نہیں ہندوستانیوں پر جلیانوالہ میں بغیر اطلاع دیے جزل ڈار نے گولی چلا دی، باغ چونکہ آبادی میں گھر اہوا تھا وہاں سے آسانی سے نکلنا مشکل تھا، تجھے یہ ہوا کہ ہزاروں آدمی ہلاک ہوئے۔

۱۹۱۹ء کو وزیر آباد میں مکمل ہڑتال رہی اور عوام نے اپنے غیظ و غضب کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ دوسرے دن ڈپٹی کمشنر گورنال کر قتل اور بیران فوج اور پولیس کے جلو میں وزیر آباد میں وارد ہوا، اس نے آتے ہی سر کردہ اور مشتبہ لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور ان لوگوں کے ساتھ بھی اس نے اپنی روایات کے مطابق انسانیت سوز سلوک کیا۔ پکڑ دھکڑا اور دارو گیر کا یہ سلسہ ۱۸ اپریل کو وزیر آباد میں ایک دربار منعقد ہوا جس میں ڈپٹی کمشنر نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

”پاگل اور بے وقوف لوگوں اس نوم نے یہ سمجھ لی کہ سرکار انگلینڈ کی حکومت ختم ہو گئی، اب تمہارے پاگل پن کا علاج کیا جائے گا۔ ہم نے تمہارے پاگل پن کا علاج دریافت کر لیا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حکومت کو اختیار ہے کہ وہ جس آدمی کی جائیداد چاہے ضبط کر سکتی ہے، اس کے مکان کو گرا کر ملیا میٹ کر سکتی ہے، نہیں نہیں اگر وہ چاہے تو اس کو نذر آتش کر کے راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہے۔ اور آج یہاں اپنے حکم سے سردار جماعت سنگھ بنا کی تمام جائیداد بحث سرکار ضبط کرنے کا حکم دیتا ہوں۔“

اس کے بعد وزیر آباد میں مارشل لاء لگا گیا۔ مارشل لاء کے احکامات وہدیات پر مشتمل اشتہارات دیواروں پر چپاں کر دیے گئے، بالخصوص ان لوگوں کے مکانوں پر جنہوں نے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ راہنماؤں اور ان کے اعزہ کے مکانوں پر خاص طور پر یہ اشتہارات آؤزیں اس کیے گئے اور وہ لوگ جنہوں نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا ان کو حکم دیا گیا کہ وہ ان اشتہارات کی حفاظت کریں۔ چنانچہ لوگوں کو دن میں کئی بار اور رات کو جا جا کر ان اشتہاروں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ مارشل لاء کے حکم کے مطابق ان اشتہارات کو پھاٹانا یا انہیں نقصان پہنچانا جرم تھا۔ ایک جگہ خود پولیس ہی نے اشتہار پھاڑ دیا چنانچہ جس آدمی کے مکان پر وہ اشتہار تھا اور جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس اشتہار کی نگہداشت کرے دونوں کو سر بازار کوڑے لگائے گئے، اسی طرح ایک اشتہار بارش کی وجہ سے ضائع ہو گیا تو اس پر متعلقہ شخص کو بید کھانے پڑے۔

کر قتل اور بیران کی آمد کے بعد حافظ آباد میں عجیب و غریب اعلان کیا گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ جو شخص بھی اپنے سر پر گپٹی پاندھتا ہے وہ صحن سات بجے تھصیل کے ساتھ مکتی میدان میں جمع ہو جائے، جو شخص دیوبہ دانستہ نہیں آئے گا یا پیاری وغیرہ کا بہانہ بنائے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔ اس اعلان کی وجہ سے کم و بیش تمام بالغ مرد تھصیل کے پاس جمع ہو گئے، انہیں وہاں دن بھر بٹھائے رکھا گیا، اس گروہ میں سے پولیس مقدمات کیلئے جھوٹے گواہ تیار کرتی تھی، جو شخص غداری اور گواہی پر آمادہ ہو جاتا اسے اس جری حاضری سے رخصت مل جاتی اور شہر کے شرافت کی یہ تنڈل کم و بیش ڈیڑھ ماہ تک جاری

رہی۔

گوجرانوالہ شہر کے جیا لے اور زندہ دل بائیوں کا احتجاج جب کسی طرح فرنگی حکمرانوں کے کنٹروں میں نہیں آ رہا تھا تو ان پر بات قاعدہ طیاروں سے بمباری کی گئی جس کی کیفیت ”مہک“ کے مضمون نگارنے یوں بیان کی ہے کہ ”شور، ہنگامہ، آگ، لوٹ مار کا ایسا سماں تھا کہ دیکھنے والے خوفزدہ ہوتے جاتے تھے۔ اسی شور و شر میں ہوائی جہازوں کی گونج پیدا ہوئی اور پھر یہ گونج اس طرح ہر شور پر غالباً آئی کہ اس گونج کے علاوہ باقی کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ لیکن چار جنگی جہاز آنا گاتا شہر کے اوپر پہنچ چکے تھے، وہ زیادہ سے زیادہ سود و سوٹ کی بلندی پر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چکر لگا رہے تھے، ان کی گھن گرج سے شہر کا شہر، ہر اس اور خوفزدہ ہو گیا، سڑکیں بازار گلیاں ویران ہو گئیں۔ مشین گنوں سے گولیوں کی بوجھاڑ اور جہازوں کی آواز سے لوگ اس قدر ہر اس اس ہوئے کہ تھوڑی دیر تسلیہ کا میدان حشر شہر خوشاب بن چکا تھا۔ پورے شہر میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، ہوئی جہاز اتنے نیچے تھے کہ شہر کی بلند عمارتوں سے ان کا فاصلہ پانچ چھ فٹ ہی کا تھا۔ پورے شہر میں جب کوئی آدمی نظر نہ آیا تو ہوائی جہازوں نے شہر کے آس پاس گاؤں پر پرواز کی۔ دھلے سے کچھ لوگ شہر کی طرف آ رہے تھے ان لوگوں کو منتشر کرنے کیلئے ہوائی جہاز سے بم گرایا گیا جس کی آواز شہر کے کونے کونے میں سنی گئی۔ پھر اپر تلنے دو تین بم پھیلکے گئے، زمین تھر تھر اگئی، لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ لا شوں کا قیمہ فضامیں اڑنے لگا گر جا گھکے لوگ بمباری سے خوفزدہ ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے لیکن اپر تلنے دو بم ان پر بھی گرائے گئے اور مشین گنوں سے گولیاں برسائی گئیں۔ شہر کے لوگ بھی گھروں سے نکل کر کھلی فضامیں پہنچا چاہتے تھے، ایسے ہی بدھواں کا ایک گروہ خالصہ ہائی سکول کے چھن میں جمع ہو گیا لیکن ایک بم گرا اور ان کے پر نیچے اٹا دیے گئے۔ اس کے بعد شہر پر اور تیلے آشین کے آس پاس کئی بم گرائے گئے، مشین گنوں سے لگا تار فائزگ کی گئی اور تقریباً پون گھنٹہ ان کی زندگیوں سے کھینلے کے بعد ہوائی جہاز لا ہو کی طرف واپس ہوئے۔“

مہذب اور متعدد مغربی اقوام کا یہ سلوک ان شہریوں کے ساتھ تھا جو ان کی حکومت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک قانون کی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن جن لوگوں نے مغرب کی بالادستی کو سرے سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ہتھیار بند ہو کر ان کے مقابلہ پر آگئے ہیں ان کے بارے میں امریکہ سے جنیوائنشن کی قراردادوں پر عملدرآمد کی توقع رکھنے والوں کی سادگی اور بھولپن پر آخر کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے؟

## مولوی نصر اللہ منصور شہید

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ مارچ ۲۰۰۲ء

گردیز میں طالبان اور القاعدہ کے ساتھ امریکی اتحادی تازہ جھڑپوں کے بعد جو نام سب سے نمایاں طور پر سامنے آیا ہے وہ کمانڈر سیف الرحمن منصور کا ہے جس نے امریکی فوجوں کی بالادستی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور فتح یا شہادت کے عزم کے ساتھ امریکی فوجوں کے سامنے ڈٹ گیا ہے۔ اس جنگ کا نتیجہ کیا لکھتا ہے یہ وقت بتائے گا لیکن سیف الرحمن منصور کی قیادت میں افغان اور عرب مجاهدین کی اس محرکہ کے آرائی نے ایک بار پھر سلطان ٹپو شہید گی یاد تازہ کر دی ہے جس نے چاروں طرف سے انگریزی فوجوں میں گھر جانے کے بعد اپنے ہی ایک ساتھی کی طرف سے تھبیار ڈالنے اور جان بچانے کی تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ ”شیری کی ایک دن کی زندگی گیدڑی کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

سیف الرحمن منصور روس کے خلاف دس سال تک جنگ لڑنے والے افغان مجاهدین کے ایک بڑے کمانڈر مولوی نصر اللہ منصور کا بیٹا ہے جو میرے دوستوں میں سے تھے اور ایک مدرسی ہوش اور معاملہ فہم رہنمای تھے۔ مولوی نصر اللہ منصور کو میں نے پہلی بار شیر انوالہ لاہور میں دیکھا تھا، یہ وہ دور تھا جب افغان علماء نے رو سی افونج کے خلاف مسلح جدو جہد کا اعلان کر دیا تھا اور پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے متعدد افغان رہنمایا پاکستان کے مختلف حصوں کے دورے کر رہے تھے۔ شیر انوالہ لاہور میں جمیعت علماء اسلام پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تھا، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اجلاس کے صدر تھے اور قائد جمیعت حضرت مولانا مفتی محمود بھی اجلاس میں شریک تھے۔ مولوی نصر اللہ منصور وہاں پہنچے، میں نے ان سے تشریف آوری کی غرض پوچھی تو بتایا کہ وہ مقصد لے کر آیا ہوں، پہلے نمبر پر حضرت درخواستی گی زیارت کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے افغانستان اور پاکستان کے درمیان قبائلی کا تقسیلی دورہ کر کے جہاد افغانستان کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور قبائلی مسلمانوں کو افغان مجاهدین کی حمایت و تعاون کیلئے تیار کیا ہے اور دوسرے نمبر پر حضرت مولانا مفتی محمود اور جمیعت کے دیگر اکابر سے جہاد افغانستان کی تازہ ترین صورت حال پر مشاہرت کی خواہش رکھتا ہوں۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ منصور کی بار پاکستان آئے اور مختلف شہروں کے دورے کیے، بعض دوسروں میں مجھے بھی ان کے ساتھ شرکت و رفاقت میں اور بہت سے علماء کرام اور مرکز کے ساتھ ان کے تعارف میں تھوڑا بہت میرا حصہ بھی شامل ہے۔

مولوی نصر اللہ منصور کا تعلق مولوی محمد بنی محمدی کی جماعت ”حرکت انتساب اسلامی“ سے تھا اور وہ مولوی محمد بنی محمدی کے بعد اس جماعت کے بڑے لیڈر شمار کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جہادی سرگرمیوں میں بیسانیت پیدا کرنے کے لیے چھ جماعتوں نے ”اتحاد اسلامی افغانستان“ کے نام سے متحدہ محاذ قائم کیا تو مولوی نصر اللہ منصور کو اس کا سیکرٹری جzel منتخب کیا گیا لیکن وہ زیادہ دیر دوسرے لیڈروں کے ساتھ نہ چل سکے اور پالیسی اختلاف نے نہ صرف ان کا راستہ دوسرے افغان لیڈروں سے الگ کر دیا بلکہ وہ کچھ عرصہ کیلئے پس پر وہ چلنے پر بھی مجبور ہو گئے۔ ان کا اختلاف دیگر افغان لیڈروں کے ساتھ امریکی امداد کو قبول کرنے کے خواہ اور وہ اس سلسلہ میں اپنے بعض تحفظات سے دستبردار

ہونے کیلئے تیار نہیں تھے۔

ان کالموں میں کئی بار عرض کیا جا پکھا ہے کہ جہاد افغانستان کے ابتدائی دو تین سال افغان مجاهدین نے صرف اپنے عزم و استقلال کے سہارے جگ ٹڑی ہے، امریکہ یا کسی دوسرے ملک کی عملی امداد اس دوران انہیں حاصل نہیں تھی۔ پاکستان ان کی پناہ گاہ تھا اور مدد و حدد تک کچھ تعاون بھی انہیں میسر تھا لیکن بنیادی لڑائی انہیں دو تین سال تک تھا لڑنا پڑی۔ اور جب انہوں نے پرانی بندوقوں اور بوتل بیوں کے ساتھ رو سی فوجوں کا مقابلہ کر کے افغانستان کا ایک معقول علاقہ رو سی فوجوں کی دسترس سے نکال لیا تو پھر امریکہ اور دوسری قوتوں اس طرف متوجہ ہوئیں اور افغان مجاهدین کو ایک زندہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے ان کی حمایت و امداد کیلئے پیش رفت کی۔

یہ اسی دور کی بات ہے جب امریکی نمائندے افغان مجاهدین کے مختلف گروپوں کے ساتھ گفت و شنید کر رہے تھے اور باہمی تعاون کی تفصیلات طے ہو رہی تھیں، مولوی نصر اللہ منصور اس کو جہاد افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے خطرناک بات سمجھتے تھے اور ان کا تقاضا تھا کہ امریکہ اور دیگر مغربی ملکوں کی حمایت کو ایک حد تک مدد و درکھا جائے اور پالیسی سازی کے معاملات میں انہیں کسی درجہ میں شریک نہ کیا جائے۔ لیکن ان کی بات نہ چل سکی اور وہ بد دل ہو کر نہ صرف عملی سرگرمیوں سے وقتی طور پر کنارہ کش ہو گئے بلکہ ایران چلے گئے جہاں انقلاب آج کا تھا اور انقلابی حکومت کی زیر قیادت پورا ایران امریکہ کے خلاف ایک مضبوط مورچہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ مولوی نصر اللہ منصور کے ایران چلے جانے پر ہمارے کئی دوست جز بزر ہوئے، بعض بزرگوں نے مجھ سے بھی بات کی کہ تمہارے دوست کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور تم اس سے بات کرو کہ وہ ایران سے واپس آکر دیگر افغان لیڈروں کے ساتھ مل کر کام کرے۔ لیکن میں مولوی نصر اللہ کے موقف، مزاج اور پوزیشن کو سمجھتا تھا اور اصولی طور پر بھی ان سے کسی حد تک متفق تھا اس لیے میں نے خاموشی مناسب سمجھی اور حالات میں تبدیلی کا انتظار کرتا رہا۔

اس کے بعد مولوی نصر اللہ منصور سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب رو سی افواج افغانستان سے واپس جا چکی تھیں اور پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی نے افغانستان کے عبوری صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ اس موقع پر پاکستان سے علماء کرام کا ایک وفد کابل گیا جس میں پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمن درخواستی اور راقم الاحروف کبھی شامل تھے، کابل میں پروفیسر مجددی کی معاونت میں مولوی محمد نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی پیش پڑی اور مولوی نصر اللہ منصور اپنا اختلاف ختم کر کے حرکت انقلاب اسلامی میں واپس آگئے تھے۔ ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکمران پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ان دونوں حرکت انقلاب اسلامی کی تحریم میں تھا جہاں مولوی محمد نبی محمدی کے ساتھ پاکستانی علماء کے وفد کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا اہتمام و انتظام مولانا نصر اللہ منصور کے ذمہ تھا اور اسی حوالے سے ان سے ملاقات ہوئی۔ مولوی نصر اللہ منصور پارٹی کی طرف سے ہمارے میزبان تھے اور انہوں نے ہمارے قیام کا اہتمام اثر کا نٹ نیٹھی ہوٹل میں کر رکھا تھا۔ علماء کا وفد اپنا دورہ مکمل کر کے پاکستان کیلئے روانہ ہو رہا تھا کہ میں نے اور مولانا فداء الرحمن درخواستی نے کچھ روز مزید کابل میں قیام کا ارادہ کر لیا۔

مولانا فداء الرحمن درخواستی کے رکنے کی وجہ کمانڈر احمد شاہ مسعود تھے جو اس وقت مجددی حکومت میں افغانستان

کے وزیرِ دفاع تھے اور حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی کے شاگرد ہونے کے ناطے ان کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ جبکہ میری دلچسپی کی وجہ مولوی نصراللہ منصور تھے جن سے کئی برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی اور میں ان سے ماضی اور مستقبل دونوں حوالوں سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہم ابھی ایک دن ہی رک پائے تھے کہ کابل شہر میں حزب وحدت اور استاذ سیاف کے گروپوں میں شدید لڑائی چھڑ گئی۔ ہمارا ہوٹل بھی اس خانہ جنگی کی زد میں تھا اور کئی گولے ہوٹل کی عمارت کی حدود میں ہمارے سامنے آ کر گرپکے تھے۔ اس دوران مولوی نصراللہ منصور ہوٹل آئے اور کہا کہ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں اور ہم نے سخت لڑائی چھڑ جانے کی وجہ سے فیصلہ کیا ہے کہ آپ دونوں حضرات کو جلد از جلد پاکستان واپس پہنچا دیا جائے۔ اس لیے مزید قیام کا ارادہ ترک کر کے واپسی کی تیاری کریں۔ چنانچہ ہمیں اسی روز رات پشاور پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد میرا ارادہ تھا کہ مناسب موقع پر افغانستان جاؤں تاکہ مولوی نصراللہ منصور سے ضروری معاملات پر گفتگو کر سکوں لیکن چند دنوں کے بعد یہ خبر آئی کہ وہ ہم کے ایک حادثہ میں جام شہادت نوش کر گئے ہیں، اتنا اللہ و اتنا الی راجعون۔

اس پس منظر میں جب یہ پتہ چلا کہ گردیز میں امریکی فوجوں کے خلاف اس نئی مزاحمت کی قیادت کمانڈر سیف الرحمن منصور کر رہا ہے تو مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی اس لیے کہ کمانڈر سیف الرحمن منصور مولوی نصراللہ منصور شہید کا پیتا ہے، اس کی رگوں میں ایک غیر مندب اپ کا خون گردش کر رہا ہے اور مولوی نصراللہ منصور کے دوستوں اور دشمنوں دونوں کو اس سے یہی توقع ہو سکتی تھی۔

## شاہِ اردن سے ایک سوال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ مارچ ۲۰۰۲ء

اور اگر شاہ عبداللہ محترم زیادہ ناراض نہ ہو جائیں تو تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان سے یہ سوال پوچھنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ ابھی گذشتہ سال افغانستان پر امریکہ کی فونکشی اور وحشیانہ بمباری کے دوران شاہِ اردن سمیت اکثر عرب حکمرانوں نے جو یہ راگ الپاناشروع کر دیا تھا کہ ہم دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے ساتھ ہیں لیکن کسی عرب ملک پر حملہ برداشت نہیں کیا جائے گا، اس کے پیچے کون سا غلفہ کار فرماتا ہے؟ اور افغانستان اور عربوں کو الگ الگ حیثیت میں رکھنے اور دیکھنے والا تعصب کون سی نسل سے تعلق رکھتا ہے؟ بات اگر اصول اور انصاف کی ہے تو ہم عرب حکمرانوں سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آج عراق پر مجوزہ امریکی حملے کو مسترد کرنے اور امریکہ سے عراق کے خلاف الزامات کا ثبوت فراہم کرنے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں۔ عرب حکمرانوں کے یہ مطالبات اور ان کی یہ اصول پسندی اب سے صرف چھ ماہ قبل کون سے فریز مریں مجدد پڑی تھی۔

عراق پر امریکہ کے مجوزہ حملہ کی ہم بھی مذمت کرتے ہیں اور اسے بھی اسی طرح وحشت درندگی سمجھتے ہیں جیسی

و حشت و درندگی کا اظہار امریکہ نے افغانستان میں کیا ہے، لیکن ہمارے لیے عراق اور افغانستان کو الگ الگ عینکوں سے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ جتنے الوداع پر ہمارا غیر متزلزل ایمان ہے جس میں رسالت مبارکہ نے عرب و مسلم میں فرق کے تصور کی نفی کرتے ہوئے تمام انسانوں کے خون مال اور آبرو کو کیساں قبل احترام قرار دیا تھا اور اسے اسلام کی عالمگیریت کی بنیاد کے طور پر پیش فرمایا تھا۔

شاہزادن اور دیگر عرب حکمرانوں سے ہماری مذکوبانہ اور عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ امریکہ اور صہیونیوں کو نسلی اور قومی تعصب سے نجات حاصل کرنے کا درس ضرور دیں، اس درس میں ہم بھی ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس تعصب سے پچھا چھڑانے کی کوشش کریں کیونکہ اس کے بغیر نہ عالم اسلام متعدد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسے مصائب و آلام کی دلدل سے نکالنے کے کوئی راہ لکھ سکتی ہے۔

## افغانستان کے سابق فرمانروا ظاہر شاہ کی واپسی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۲ء

افغانستان کے سابق فرمانروا خاہ شاہ کم و بیش تیس سال کی جلاوطنی کے بعد گذشتہ روز وطن واپس پہنچے ہیں۔ انہیں تقریباً تیس برس قبل عین اس وقت جبکہ وہ بیرون ملک دورے پر تھے، داؤد خان نے معزول کر کے ملک کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کے بعد سے ظاہر شاہ و میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس دوران ان کے ملک پر روسی افوaj نے قبضہ کر لیا اور افغانستان کے علماء کرام اور غیور دیندار عوام نے رو سی جارحیت کے خلاف علمی جہاد بلند کر کے لاکھوں جانوں کی قربانی دی اور رو سی فوجوں کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ مگر افغانستان پر ایک عرصہ تک حکومت کرنے والے ظاہر شاہ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنے ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے کی جدوجہد میں کوئی حصہ ڈال سکیں۔ البتہ افغانستان میں مجاهدین کے اثر و سورج کو کم کرنے اور سابقہ لبرل ماحول کو بحال کرنے کیلئے ان کا نام و قیامت فوتی سامنے آتا رہا، اور مجاهدین کے اقتدار کا راستہ روکنے کیلئے ان کی وطن واپسی کوششیں ہوتی رہیں۔

اس کے بعد افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی اور طالبان نے افغانستان کے بڑے علاقہ کو خانہ جنگلی سے نجات دلا کر ایک مستحکم حکومت کے ذریعے امن بحال کیا تو افغانستان کے اس سابق فرمانروا کو ان کے حق میں ملکہ خیر کہنے کی توفیق نہ ہوئی۔ البتہ جب طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف امریکہ کی قیادت میں عالمی اتحاد قائم ہوا، اور قوت و طاقت کے زور پر ایک نوزائدہ اسلامی ریاست کو ہبھر حال پکل دینے کی کارروائی منظم کی گئی، تو اس کارروائی کو ظاہر شاہ کی مکمل حمایت و تائید حاصل تھی۔ اور افغانستان کے نتیجے اور غریب عوام پر جو قیامت صغری بپا ہوئی اس میں ظاہر شاہ کا پورا پورا ہاتھ کار فرماتھا۔

اور آج اسی کارروائی کو استحکام دینے اور افغانستان کے قبائل کوئے امریکی نظام کی حمایت پر آمادہ کرنے کیلئے ظاہر شاہ کو

افغانستان لا یا گیا تاک ان کے بڑھا پے کو افغانستان میں امریکی پروگرام کی تجھیل کیلئے استعمال کیا جاسکے۔ مگر افغانستان کے اس ۷۸ سالہ سابق فرمازوں کو شاید اس بات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہے کہ وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے، حالات نے تبدیلی کے کئی مرحلے کر لیے ہیں، اور افغانستان کے عوام نے دین اور جہاد کے عنوان سے لاکھوں جانوں کا نذر رانہ پیش کر کے اپنی دینی روایات اور افغان کلچر کی اقدار کو اور زیادہ محکم کر لیا ہے، جنہیں بمبماری اور بربریت کے زور سے وقتی طور پر دبایا تو جا سکتا ہے لیکن افغان عوام کو ان دینی اقدار اور افغان ثقافت سے محروم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ظاہر شاہ کی واپسی پر کابل میں قندھار کے گورنگل آغا نے ان کے اعزاز میں جس دعوت کا اہتمام کیا، اس میں روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ اپریل ۲۰۰۲ء کی خبر کے مطابق ۷۸ سالہ ظاہر شاہ نے ڈھول کی تھاپ پر قص کر کے اپنی آمد کے مقاصد کو واضح کیا ہے، اور افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کیلئے گذشتہ تیس برس کے دوران آگ اور خون کا دریا عبور کرنے والے مجاہدین اور لاکھوں شہداء کے بارے میں ان کی خاموشی نے ان کے دل کی کیفیت کو ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ مجاہدین اور شہداء کی عظیم قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی اور وہ بالآخر روسی استعمار اور اس کے حواریوں کی طرح امریکی استعمار اور اس کے حواریوں کے تسلط سے بھی افغانستان کو نجات دلانے میں کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## دینی مدارس کے خلاف امریکی کارروائیاں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- منیٰ ۲۰۰۲ء

قبائلی علاقہ میں مبینہ دہشت گردوں کی تلاش کی اڑا میں دینی مدارس کے خلاف امریکی کمانڈوز پاکستانی فورسز کی مدد سے جو کارروائیاں مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں وہ ہر محب وطن شہری کیلئے چینی اور اضطراب کا باعث ہیں، اور تو می خود مختاری اور دینی تشخیص کے خلاف کی جانے والی ان کارروائیوں کے خلاف ملک بھر میں احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ جمعہ کو جمیعت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن کی ایڈیل پر ملک کے مختلف شہروں میں احتجاجی مظاہرے ہوئے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ دینی مدارس و مراکز کے خلاف یہ کارروائیاں بند کی جائیں اور امریکیوں کو دینی مدارس کے خلاف اس قسم کی حد روجہ اشتعال انگیز حرکتوں سے روکا جائے۔

دوسری طرف روزنامہ نوائے وقت لاہور ۸ مئی ۲۰۰۲ء کی خبر کے مطابق بھارت کے صوبہ مغربی بنگال کی حکومت نے امریکی قنصلر کے ایک مدرسہ میں جانے کا نوٹس لے لیا ہے اور اس کی تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے۔ خبر کے مطابق مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر بڈھا ویب بھٹاچاریہ نے ملکتہ شہر کے ایک مدرسہ میں نصاب کے معافانہ کیلئے امریکی قنصلر کے جانے کے واقعہ کا نوٹس لیا ہے اور چیف سیکرٹری کو واقعہ کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔ خبر کے مطابق صوبائی حکومت نے اسے بھارتی معاملات میں مداخلت قرار دیا ہے۔

ہم حکومت پاکستان سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر امریکی خواہشات اور دباؤ کی اس شدید و ہند میں اسے قومی خود منصاری اور ملی وقار کے ناظر تھے براہ راست دکھائی نہیں دے رہے تو کم از کم وہ مغربی بیگانگی کی حکومت کے اس اقدام سے ہی را ہنماں حاصل کرے کہ زندہ قومیں اور آزاد ممالک اپنے معاملات میں غیر ملکی مداخلت پر کس طرح کاطرہ عمل اختیار کیا کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے حکمرانوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ امریکہ کی دھاندیوں اور چیزوں کے خلاف اپنے ملک کے وقار اور قومی آزادی کے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں۔

## حضرت مولوی محمد نبی محمدی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۰۰۲ء

گذشتہ روز ایک قومی اخبار کے آخری صفحہ پر چھوٹے سے چوکھے میں یہ خبر نظر سے گزری کہ افغانستان کے بزرگ عالم دین مولوی محمد نبی محمدی انتقال کر گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اسے نیرنگی زمانہ کا کرشمہ کہیے یا گردش حالات کا نتیجہ کہ مولوی محمد نبی محمدی جیسے بزرگ عالم دین کی وفات پر چند سطروں کی ایک خبر کے بعد قومی پریس میں مکمل خاموشی کی کیفیت طاری ہے۔ ورنہ اگر یہی بات ایجھے دونوں میں ہوتی تو نہ صرف افغانستان میں قومی سٹھ پر ان کا سوگ منایا جاتا بلکہ پاکستان میں بھی کئی دونوں تک ان کی خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ رہتا۔

مولوی محمد نبی محمدی کا تعلق افغانستان کی ولایت لوگر سے تھا اور وہ بلاشبہ اپنے دور میں افغانستان کے سر کرده، ذہین ترین اور مدد بر علاماء میں سرفہرست تھے۔ مولوی محمد نبی محمدی ان علماء میں سے تھے جنہوں نے افغانستان میں رومنی اثرات کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی فکری مزاحمت کا راستہ اختیار کیا اور کیونزم کے اثر و نفع سے افغانستان کو بچانے کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔ وہ رومنی افواج کی باقاعدہ آمد سے قبل اپنے علاقے سے افغان پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور ایوان میں بہر کرمل کے ساتھ اسلام اور کیونزم کے حوالے سے ان کے طویل پارلیمنٹی مباحثے افغان تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ ان مباحثوں کی ایک مطبوعہ رپورٹ مولوی محمد نبی محمدی نے خود مجھے ایک ملاقات میں دی تھی جن کا پیشتر حصہ پشتوی افارسی میں ہونے کی وجہ سے میں ان سے پوری طرح استفادہ تونہ کر سکا لیکن ایک تاریخی دستاویز کے طور پر وہ رپورٹ اب بھی میری فائلوں میں محفوظ ہو گی۔

مولوی صاحب جید اور پختہ کار عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے والے زیرِ ک را ہنما اور حق بات کھلے بندوں کہنے اور حق کی خاطر عملی جدوجہد کے حوصلہ سے بہرہ دو لیڈر بھی تھے۔ مجھے ان سے کئی بار ملنے کا موقع ملا اور تفصیلی گفتگو ہوئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ افغانستان کے جتنے علماء سے بھی اب تک ملا ہوں ان میں سب سے زیادہ مولوی محمد نبی محمدی فہم و فرستہ اور معاملہ نہیں نے مجھے متاثر کیا۔ اور میں اپنے دوستوں کے حلقہ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں ”افغانستان کا مفتی محمود“ کہا کرتا تھا۔ وہ افغانستان میں رومنی اثر و نفع کے خلاف شروع سے متحرک تھے اور اس مقصد کیلئے انہوں نے ”حرکتِ انقلاب اسلامی“ کے نام سے جماعت قائم کی تھی جو ایک دور میں افغانستان میں علماء کی

سب سے بڑی تجارت تھی۔ وہ اگر روئی فوجوں کی والیکی اور مجاہدین کی عبوری حکومت کے قیام کے بعد پروفسر برہان الدین ربانی اور انجینئر حکمت یار کا راستہ روکنے کو ہی اپنا واحد ہدف قرار دیئے کی جبائے امن کا ماحول فراہم کر کے عام انتخابات کی کوئی صورت نکال لیتے تو میر اندازہ تھا کہ اس وقت مولوی محمد بنی محمدی کی "حرکت انقلاب اسلامی" اور انجینئر حکمت یار کی "حزب اسلامی" افغانستان کی دو سب سے بڑی پارٹیوں کی حیثیت سے سامنے آتیں۔ لیکن قدرت کو ایسا منظور نہ تھا اور کابل کے کنٹرول پر احمد شاہ مسعود اور حکمت یار کی جنگ نے حالات کا رخ ایسا پلٹا کہ آج نہ صرف افغانستان بلکہ جنوبی محمدی کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کیلئے پاکستانی قافلہ کے ساتھ بھارت گئے۔ یہ قافلہ حضرت مولانا مفتی محمود کی قیادت میں تھا جبکہ مولوی محمد بنی محمدی ایک عام فرد کے طور پر قافلہ میں شامل تھے جو خاموشی کے ساتھ گئے اور تقریبات میں شرکت کے بعد خاموشی کے ساتھ واپس آگئے۔ اس کے بعد مجھے ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پشاور میں مولوی محمد بنی محمدی کے ہیئتکوارٹر میں ان سے تفصیلی اشرونیو کا موقع ملا جس میں افغانستان کی تاریخ، افغان معاشرہ میں علماء کے کردار، کیونزم و بدل از م کے فروع، روئی اثرات کے نفع، افغان علماء و عوام کے جہاد، آزادی اور افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے کئی گھنٹے گفتگو ہوئی۔

میں بہت سے افغان لیڈروں اور علماء سے ملا ہوں اور ان سے لگفت و شنید کی ہے لیکن مولوی محمد بنی محمدی جیسی معاملہ فہمی کسی اور میں نہیں دیکھی۔ حتیٰ کہ میرے نزدیک ان کی بھی انتہادرجہ کی معاملہ فہمی بہت سے موقع پر ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ مولوی صاحب کے ساتھ اس کے بعد بھی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور قدمدار پر طالبان کے قبضہ کے بعد جب مجھے قدمدار جانے کا موقع ملا اس وقت تک کابل طالبان کے قبضہ میں نہیں آیا تھا اور احمد شاہ مسعود کے ساتھ طالبان حکومت کے مذاکرات کی تجویز ہو رہی تھی۔ تب مولوی محمد بنی محمدی اور مولوی محمد یونس خالص بھی قدمدار میں تھے۔ میں ان سے ملا اور اس حوالے سے گفتگو ہوئی، مولوی صاحب کا موقف یہ تھا کہ ربانی حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات کی ضرورت تو ہے لیکن حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کی روشنی میں یہ تجہیز نہیں ہوگی۔ میں نے امیر المؤمنین ملا محمد عمر سے بھی مختصر ملاقات میں اس کا تذکرہ کیا، ان کا مفترض ترین جواب دو لفظوں میں تھا کہ "فائدہ نہیں ہے۔"

اس وقت میرا تاثر یہ تھا کہ مولوی محمد بنی محمدی اور مولوی محمد یونس خالص "طالبان انقلاب" کے خاموش سرپرستوں میں سے ہیں اور طالبان کو مکمل سپورٹ کر رہے ہیں۔ لیکن ان دو بزرگ ترین شخصیات کو نئے نظام میں جو مقام ملنا چاہیے وہ انہیں نہیں مل رہا جس کے اثرات ان دونوں بزرگوں کی گفتگو میں بھی ہیں السطور محسوس ہو رہے تھے۔ طالبان رہنماؤں کے تقویٰ، خلوص، دیانت، ایثار، قناعت اور بہت سے حوالوں سے طالبان حکومت کی شاندار کامیابی کے باوجود فطری طور پر تصویر کا دوسرا رخ بھی موجود تھا اور ایسی کوتا ہیوں اور کمزور ہیوں کی موجودگی بھی تاگزیر تھی جو ان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ میں اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں جس میں اس پہلوپر بھی گزارشات پیش

کروں گا۔ البتہ اس موقع پر صرف اتنی بات عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالبان قیادت اپنی صفوں سے باہر اپنے بھی خواہوں اور معادین کی درجہ بندی نہیں کر سکی کہ کس کو کس مقام پر رکھنا ضروری ہے اور کس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ طالبان قیادت اپنے دوستوں اور بھی خواہوں کے جذبات، وسائل اور خدمات سے تصحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکی جس کا اسے بہر حال نقصان ہوا۔ اور یہی بات مولوی محمد بنی محمدیؒ اور مولوی محمد یونس خالص کے حوالے سے مجھے مسلسل کھلتی رہی۔

مولوی محمد بنی محمدیؒ سے میں پاکستانی علماء کے اس وفد کے ساتھ بھی ملا جو عبوری صدر پر فیسر صبغۃ اللہ مجددی سے ملاقات اور انہیں مجاہدین کی حکومت کے قیام پر مبارک باد دینے کیلئے کابل گیا تھا۔ اس وقت مولوی محمد بنی محمدیؒ موجودی صاحب کے نائب کی حیثیت حاصل تھی۔ سابق حکمران پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ان کی تجویل میں تھا جسے انہوں نے حرکتِ انقلاب اسلامی کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت دے دی تھی۔ اور سیاسی معاملات میں ان کی ٹیم اور پارٹی سب سے زیادہ متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ پاکستانی علماء سے اسی ہیڈ کوارٹر میں ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے مفصل گفتگو کے بعد بہت سے سوالات کے جوابات بھی دیے۔ اس وقت میرا تاثریہ تھا کہ مجددی حکومت کے داخلی معاملات پر مولوی محمد بنی محمدیؒ کا کثرہ ول بڑھ رہا ہے اور وہ افغانستان کے مستقبل اور نئے نظام کے بارے میں بھی ایک واضح ذہن اور پروگرام رکھتے ہیں۔ وہ جس اعتماد کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے اور مستقبل کے نقشے کے حوالے سے جو خطوط واضح کر رہے تھے اس میں میں میرے جیسے سیاسی کارکن کیلئے اطمینان اور تسلی کا بہت سامودا موجود تھا۔ اور میں ذاتی طور پر اس اطمینان کے ساتھ ہی واپس آرہا تھا کہ افغانستان اب ایک متوازن اسلامی سیاسی نظام اور مُعْتَکم حکومت کی طرف پیش رفت کرے گا اور افغانستان کی تعمیر نو اور اسلامی حیثیت کی بحالی کے عمل کا آغاز ہو جائے گا۔ لیکن اسی روز کابل میں ”حزبِ وحدت“ اور ”اتحادِ اسلامی“ کے درمیان شدید گول باری سے نئی خانہ جنگی کا دور شروع ہو گیا جس نے ان توقعات اور امیدوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

مولوی محمد بنی محمدیؒ بیاسی سال کی عمر میں وفات پاپکے ہیں اور ان کی موت کی خبر پڑھ کر صاحبی کی یادوں کا ایک طویل اور متنوع سلسلہ ذہن کی سکرین پر یکے بعد دیگرے ابھر رہا ہے۔ مجھے مولوی صاحبؒ کی وفات کے غم کے ساتھ ساتھ یہ غم بھی ستارہ ہے کہ ان کے علم و فضل، فہم و مذہب اور حکمت و دانش سے دشمنوں نے ضرور زک امہلی مگر ان کے دوست کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور افغانستان کے بارے میں ان کی نیک تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کی کوئی سیمیل پیدا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

## سیرت نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم

۱۶ مئی ۲۰۰۲ء کو شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام  
"سیرۃ النبیؐ کانفرنس" سے خطاب

بعد الحمد والصلوة۔ میں شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں شرکت اور گفتگو کے اعزاز سے نوازا اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرماتے ہوئے کچھ مقصود کی باتیں کہنے، سننے اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق سے نوازیں، آئین یارب العالمین۔ مجھے گفتگو کیلئے "سیرت نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم" کا عنوان دیا گیا ہے جس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ حتمی کہ تذکرہ بھی اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے اس لیے بہت سے امور کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک ایسے سوالات کا جائزہ لینا چاہوں گا جو جہاد کے حوالے سے آج کے دور میں عالمی سطح پر موضوع بحث ہیں اور ان کے بارے میں ثابت اور منفی طور پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے۔

"جہاد" کا الفاظ لغوی مفہوم کے حوالے سے کوش، محنت و مشقت اور تگ و دوکی مختلف شکلوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسے دینی پس منظر میں لیا جائے تو اسلام کی سر بلندی، دعوت و تبلیغ، ترویج و تفہیم، اور تحفظ و دفاع کیلئے کی جانے والی مختلف النوع عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنی خواہشات پر کثرول اور نفس کی اصلاح کی مسائی پر بھی جہاد کا لفظ بولا گیا ہے جس کی قرآن و سنت میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن جہاد کا ایک خصوصی مفہوم جنگ اور محاربہ بھی ہے جسے قرآن کریم میں "جہاد فی سبیل اللہ" اور "قتال" کے عنوان سے تعمیر کیا گیا ہے اور سینکڑوں آیات قرآنی اور ہزاروں احادیث نبویہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور اس جہاد کے فضائل، احکام، مسائل اور مقدادیت پر قرآن و سنت میں پورے اہتمام کے ساتھ جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ہے اللہ کے دین کی سر بلندی کیلئے کافروں کے خلاف میدان جنگ میں صفت آراؤ کر ہتھیاروں کے ساتھ ان سے معمر کہ آرائی کرنا اور قتل و قتل کے ذریعے سے کفر پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا جس کی اہمیت و فضیلت پر قرآن کریم اور سنت نبویؐ کی سینکڑوں تصریحات گواہ ہیں۔ اور اس کو آج کے دور میں اس وجہ سے سب سے زیادہ تقدیر و اعتراض کا ناشناہ بنایا جا رہا ہے کہ جدید عقل و دانش کے نزدیک عقیدہ و مذہب کے فروع اور غلبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا تہذیب و تمدن کے تقاضوں کے خلاف ہے اور ایسا کرنا بینا در پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے دائرے میں آتا ہے۔

اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کیوضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عقیدہ و مذہب کیلئے ہتھیار اٹھانے اور باطل مذاہب پر حق مذہب کی بالادستی کیلئے عسکری جنگ لڑنے کا آغاز حضرت محمد رسول اللہؐ نے نہیں کیا بلکہ جہاد کا یہ عمل آسمانی ادیان میں پہلے سے تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے اور جناب نبیؐ اکرمؐ نے اس حوالے سے تاریخ میں کسی نئے عمل اور اسلوب کا اضافہ کرنے کے بعد آسمانی مذاہب کی ایک مسلسل روایت کو قرار رکھا ہے۔ چنانچہ جس طرح قرآن کریم میں جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ پیا جاتا ہے، اسی طرح باہل میں بھی ان مجاہدین اور مذہبی جنگوں کا ذکر موجود ہے جو بنی

اسرا ایک نے اپنے نہب کے دفاع اور اپنی آزادی اور شخص کے تحفظ کیلئے لڑیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم نے فلسطین کی سر زمین پر لڑی جانے والی ایک مقدس جنگ کا سورہ المقرۃ میں تذکرہ کیا ہے جو جالوت جیسے خالق حکمران کے خلاف حضرت طالوت کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت بادشاہ کا مجرا نہ طور پر خاتمه ہوا۔ اس جنگ کا نتیجہ باہل میں بھی موجود ہے اور اس میں حضرت طالوت کو ”ساوں بادشاہ“ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر آج کی جدید دانش کو نہب کے نام پر ہتھیار اٹھانے پر اعتراض ہے تو اس کا ہدف صرف قرآن کریم اور جناب نبی اکرم کی ذات گرامی نہیں بلکہ اصولی طور پر باہل اور بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ اس کی زد میں ہے، صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ باہل کے ماننے والوں نے باہل پر ایمان کے دعوے کے باوجود اس کے عملی احکام اور ماضی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے جبکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے تمام تر عملی کمزوریوں کے باوجود اپنے ماضی اور قرآنی احکام و تعلیمات سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

اس وضاحت کے بعد جہاد کی مقصدیت کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا مقصد آخر پرست نے اعلاء کلمہ اللہ قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جس کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں حکم اور قانون کا درجہ انسانی خواہشات اور ظریف و گمان کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور آسمانی تعلیمات کو حاصل ہونا چاہیے۔ اور کلمۃ اللہ کی اسی سربلندی کیلئے قرآن کریم اور جناب نبی اکرم نے انسانی نہب کی ان دینی معزکہ آرائیوں کے تسلسل کو باقی رکھا ہے تاکہ کسی دور میں بھی انسانی خواہشات اور عقل و گمان کو دوہی الہی اور آسمانی تعلیمات پر غلبہ حاصل نہ ہونے پائے اور انسانی سوسائٹی پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی عمل داری کے جس مشن کیلئے حضرت انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے ہیں، اس میں تعقل واقع نہ ہو۔ چنانچہ جناب رسول اللہ نے ایک ارشاد مبارک میں یہ کہہ کر اس جدوجہد کے قیامت تک جاری رہنے کا اعلان فرمایا ہے کہ الجہاد ماضی الیوم القیامۃ۔

یہ فکر و فلسفہ کی جنگ ہے، اسلوب زندگی کی معزکہ آرائی ہے، اور تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے جس میں شروع سے آسمانی نہب کا یہ موقف رہا ہے اور اب آسمانی نہب و ادیان کے حقیقی وارث کی حیثیت سے اسلام کا موقف بھی یہی ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہ نمائی اور اس کے مسائل کے حل کیلئے انسانی خواہشات اور عقل و دانش تہما کفایت نہیں کرتیں بلکہ ان پر آسمانی تعلیمات کی گرانی ضروری ہے کیونکہ اس ”چیک اینڈ پبلش“ کے بغیر انسانی خواہشات اور انسانی عقل کیلئے پوری نسل انسانی کی ضروریات و مفادات میں توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن آج کا سب سے بڑا ملیہ یہ ہے کہ تہذیب جدید نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری کا اعلان کر کے خواہشات اور عقل ہی کو تمام امور کی فائیل اختاریٰ قرار دے رکھا ہے جس سے توازن بگزگیا ہے، اجتماعی اخلاقیات دم توڑگی ہیں، طاقت کا بے لگام گھوڑاوحی الہی کی لگام سے آزاد ہو گیا ہے، اور پوری دنیا میں ہر طرف جنگل کے قانون کا دور دورہ ہے۔

آج کی جدید دانش نے چونکہ نہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے شاخی زندگی کے دائروں میں محدود کر دیا ہے اس لیے عقل جدید کے نزدیک نہب کو وہ مقام حاصل نہیں رہا کہ اس کیلئے ہتھیار اٹھائے جائیں اور اس کے فروغ و تفہیز کیلئے عسکری قوت کو استعمال میں لا یا جائے ورنہ ہتھیار تو آج بھی موجود ہیں اور جتنے ہتھیار آج پائے جاتے ہیں اور تیار ہو

رہے ہیں، انسانی تاریخ میں اسے قبل کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ ہتھیار استعمال بھی ہوتے ہیں اور وہ تباہی لاتے ہیں کہ اس سے قبل کی انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے مگر ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والوں کے مقاصد اور عنوایات مختلف ہیں:

- جرمی نے جرمن نسل کی برتری کے عنوان سے ہتھیار بنائے اور دو عظیم جنگوں میں پوری دنیا کیلئے تباہی کا سامان فراہم کیا۔
  - روس نے محنت کشوں کی طبقاتی بالادستی کے نام پر عسکری قوت کا بے تحاشا استعمال کیا اور نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو تباہ کیا۔
  - اسرائیل ایک نسلی مذہب کی برتری کیلئے اپنے سائز سے سینکڑوں گنازیاہ ہتھیار جمع کیے ہوئے ہے اور فلسطینیوں کی مسلسل نسل کشی میں مصروف ہے۔
  - اور امریکہ نے مغربی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام پر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔
- سوال یہ ہے کہ اگر نسلی برتری، طبقاتی بالادستی، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھانا اور صرف اٹھانا نہیں بلکہ اسے وحشیانہ انداز میں انہاد حضنداً استعمال کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا وہ بہشت گردی نہیں ہے تو آسمانی تعلیمات کے فروغ اور وحی الٰہی کی بالادستی کیلئے ہتھیار اٹھانے کو کون سے قانون اور اخلاقیات کے تحت دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے؟

باقی تمام پہلواؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے آج کی معروضی صور تھاں میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے طرز عمل کا جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کا نام لینے والوں کے خلاف ”علمی اتحاد“ کے پرچم تلتے جو حشیانہ فوکشی جاری ہے، اس کے جواز میں اس کے علاوہ اب تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکی کہ اسلام کا نام لینے والے ان مبینہ انتہا پسندوں سے آج کی علمی تہذیب کو خطرہ ہے، بالادست ثقافت کو خطرہ ہے، اور یہیں الاقوامی نظام کو خطرہ ہے، اس لیے ان انتہا پسندوں کا خاتمه ضروری ہے۔ اور تم ظریبی کی انتہا یہ ہے کہ عقیدہ و مذہب کیلئے ہتھیار اٹھانے کو دہشت گردی کہنے والے خود ایک مذہب اور عقیدہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے ہوئے میدان جنگ میں مسلسل صفائیں۔

میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھانے اور اسے بے دریغ استعمال کرنے کا ایک فرقی کو حق حاصل ہے تو اس کے خلاف دوسرے عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے علیحداروں کو ہتھیار اٹھانے کے حق سے کسی طرح محروم نہیں کیا جاسکتا اور ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے کیلئے یہ کوئی وجہ جوائز نہیں ہے کہ چونکہ ایک فرقی کے پاس ہتھیار بنانے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اسے ان ہتھیاروں کے استعمال کے موقع زیادہ میسر ہیں، اس لیے اسے تو ہتھیار بنانے اور چلانے کا حق حاصل ہے، اور دوسرافریق اس صلاحیت میں مکروہ اور ان موقع کی فراوانی سے محروم ہے اس لیے اس کا سرے سے کوئی حق نہیں ہے۔

آج امریکہ اور اس کے اتحادی اس بات پر مطمئن ہیں کہ جو جنگ واثر ہے ہیں، وہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر اڑی جاری ہے، انسانیت کی بھلائی کی جنگ ہے، اور ان کے بقول اعلیٰ تین تہذیبی اقدار کے تحفظ کی جنگ ہے۔ جنگ کی اسی مقصودیت کی وجہ سے انہیں اس عظیم جانی و مالی نقصان کی کوئی پرانی بھر میں ان کے ہاتھوں مسلسل جاری ہے۔ انسان مر رہے ہیں، عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں، بچے یتیم ہو رہے ہیں، عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو رہی ہیں، ملکوں اور قوموں کی میعثیتیں تباہ ہو رہی ہیں، اور امن و امان کا توازن مسلسل بگرتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے چونکہ اپنے زعم کے مطابق یہ سب کچھ اعلیٰ مقاصد کیلئے کر رہے ہیں اور ان اقدامات کے ذریعے سے اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا تحفظ کر رہے ہیں اس لیے ان کے خیال میں یہ سب کچھ جائز ہے اور جنگ کا حصہ ہے جس کی چون وچرا کے بغیر پوری نسل انسانی کو برداشت کرنا چاہیے۔ یہی بات اسلام کہتا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ نسل انسانی کیلئے نجات کا راستہ انسانی خواہشات اور صرف انسانی عقل نہیں ہے بلکہ وحی الہی کی گمراہی اور آسمانی تعلیمات کی برتری انسانی سوسائٹی کیلئے ضروری ہے۔ اور اسلام کے نزدیک انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور تہذیبی روایات کا سرچشمہ انسانی خواہشات اور عقل مختص نہیں بلکہ وحی الہی اور آسمانی تعلیمات ہیں اس لیے ایک مسلمان اگر ان مقاصد کیلئے ہتھیار اٹھاتا ہے تو دنیا کی مسلمہ روایات اور تاریخی عمل کی روشنی میں اسے یہ کہہ کر اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا کہ مخالف فرقی کے نزدیک اس کا یہ عمل دہشت گردی قرار پا گیا ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد قرآن و سنت کی رو سے جہاد کی چند عملی صورتوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں:

- قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے حوالے سے جہاد کے ایک حکم کا تذکرہ سورۃ المائدہ میں کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے چکل سے بنی اسرائیل کو بکال کر سحرائے سینا میں نیمہ زن ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو حکم ملا کہ وہ بیت المقدس کو عماقلہ سے آزاد کرنے کیلئے جہاد کریں اور آگے بڑھ کر حملہ آور ہوں۔ مگر غلامی کے دائرے سے تازہ تازہ نکلنے والی مرعوب قوم کو اس کا حوصلہ نہ ہوا اور پھر اس کے چالیس سال بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل نے حضرت یوحش بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جنگ لڑ کر بیت المقدس کو آزاد کرایا۔
- قرآن کریم نے بنی اسرائیل ہی کے حوالے سے ایک اور جہاد کا تذکرہ کیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں کہ جا لوٹ نامی ظالم بادشاہ نے فلسطین کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے بنی اسرائیل کو مظلوم کا شکار بنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر طالوت بادشاہ کی قیادت میں بنی اسرائیل کی مٹھی بھر جماعت نے جا لوٹ کا مقابلہ کیا اور اسے میدان جنگ میں شکست دے کر فلسطین کے علاقے آزاد کرائے۔

- جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کفار مکہ کے خلاف پہلے بڑے معز کے کی قیادت بدر کے میدان میں کی اور قریش کو شکست دے کر شاندار کام یابی حاصل کی۔ یہ جنگ قریش کے کے ان عزائم

- پر ضرب لگانے کیلئے بپاہوئی تھی جوہ اسلام کو ختم کرنے اور جناب بنی اکرم اور ان کی جماعت کو ناکام بنانے کیلئے اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد احمد اور احزاب کی جنگیں بھی اسی پس منظر میں تھیں اور اس کشکاش کا خاتمہ اس وقت ہوا جب آپ نے ۸ھ میں خود پیش قدمی کر کے مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا۔
- یہ یہود مدنیہ کے ساتھ آنحضرت نے امن و امان کے ماحول میں وقت بسر کرنے کی کوشش کی لیکن یہودیوں کی سازشوں اور عہد شتنیوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ رہا تو آپ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مرکز خیبر پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا اور یہود کا زور توڑ دیا۔
  - قیصر روم کے باج گزاروں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور یہ خبر ملی کہ خود قیصر روم مدنیہ منورہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے تو جناب بنی اکرم نے مدنیہ منورہ میں اس کا انتظار کرنے کے بجائے شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کی اور توک میں ایک ماہ قیام کر کے روی فوجوں کا انتظار کرنے کے بعد ہاں سے واپس تشریف لائے۔
  - یہ تو چند کھلی جنگیں ہیں جو علانية لڑی گئیں لیکن ان سے ہٹ کر ایسی متعدد کارروائیاں بھی سیرت النبی کے ریکارڈ میں ملتی ہیں جنہیں چھاپے مار کارروائیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
  - مدنیہ منورہ کے ایک سازشی یہودی سردار کعب بن اشرف کو جناب بنی اکرم کے ایسا پر حضرت محمد بن مسلمہ اور ان کے رفقاء نے شب خون مار کر قتل کیا۔
  - خیبر کے نواح کے ایک اور سازشی یہودی سردار ابو رافع کو جناب بنی اکرم کے حکم پر حضرت عبد اللہ بن عتیقؓ نے اسی قسم کی چھاپے مار کارروائی کے ذریعے سے قتل کیا۔
  - جناب بنی اکرم کی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں یہیں کے اسلامی صوبہ پر ایک مدعا نبوت اسود عنی نے قبضہ کر کے آنحضرتؐ کے مقرر کردہ گورنر کو شہید کر دیا اور اسلامی ریاست کے عمال کو یہیں چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو آپ کے ایسا پر حضرت فیروز دیلیؓ اور ان کے رفقاء نے چھاپے مار کارروائی کر کے اسود عنی کو رات کی تاریکی میں قتل کیا اور یہیں پر اسلامی اقتدار کا پرچم دوبارہ لہرا دیا۔
  - صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی بعض ناجائز اور یہیں کے طرفہ شرائط کے خلاف دبا دلانے کیلئے حضرت ابو بصیرؓ اور حضرت ابو جندلؓ نے سمندر کے کنارے ایک باقاعدہ چھاپے مار کیپ قائم کیا اور قریش کا شام کی طرف تجارت کا راستہ غیر محفوظ بنادیا جس سے مجبور ہو کر قریش کو صلح حدیبیہ کے معاملے میں شامل اپنی یہیں طرف شرائط واپس لینا پڑیں اور ابو بصیرؓ کی چھاپے مار کارروائیوں سے نگ آکر قریش کو حضورؐ سے دوبارہ گفتگو کرنا پڑی۔

جناب بنی اکرم نے میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے کے ساتھ ساتھ میڈیا کے محاذ پر بھی کفار کے خلاف صرف آرائی کی چنانچہ غزوہ احزاب کے بعد حضورؐ نے مدنیہ منورہ کے ایک اجتماع میں باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کیا کہ اب قریش

کہ کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کی جرات نہیں ہو گی لیکن اب وہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور مسلمانوں کے خلاف پورے عرب میں پر اپنگندے اور منافرت انگیزی کا بازار گرم کریں گے۔ آپ نے اس موقع پر شعرو خطابت سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرام کو مدینہ میں آنے کی ترغیب دی چنانچہ حضرت حسان بن ثابت<sup>ؓ</sup>، حضرت عبد اللہ بن رواحہ اور حضرت کعب بن مالک<sup>ؓ</sup> نے کھلے بندوں اعلان کر کے یہ مذاہ پر کفار کے محاذ پر حملوں کا پوری جرات کے ساتھ مقابله کیا۔

زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے لیکن ان گزارشات سے اتنی بات ضرور سامنے آئی ہو گی کہ جناب رسول اللہ نے اسلام کی سر بلندی اور امت مسلمہ کے تحفظ و استحکام کیلئے موقع محل کی مناسبت سے جنگ کی ہر ممکنہ صورت اختیار کی اور مذاہ آرائی کے جس اسلوب نے بھی آنحضرت کے سامنے اپنا چینچ رکھا، اسے جواب میں مايوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

آج کے حالات میں جہاد کے حوالے سے دوسرا عام طور پر کیے جاتے ہیں:

1. ایک یہ کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا کسی علاقے میں جہاد کیلئے ایک اسلامی حکومت کا وجود اور اس کی اجازت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں حضرت ابو بصیر کا یکپ اور حضرت فیروز بدیلی<sup>ؓ</sup> کی چھاپہ مار کارروائی میں ہمارے سامنے واضح مثال کے طور پر موجود ہے۔ حضرت ابو بصیر<sup>ؓ</sup> نے اپنا یکپ حضور کی اجازت سے قائم نہیں کیا تھا لیکن جب یہ یکپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو آپ نے نہ صرف اس کے نتائج کو قبول کیا بلکہ قریبیش کی طرف سے یک طرفہ شرائط سے دستبرداری کے بعد اس یکپ کے مجاہدین کو باعزم طور پر والپس بلا لیا۔ اسی طرح یمن پر اسود عنی کا غیر اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد جناب نبی اکرم نے مدینہ منورہ سے فوج بھیج کر لشکر کشی نہیں کی بلکہ یمن کے اندر مسلمانوں کو بغایت کرنے کا حکم دیا اور اسی بغایت کی عملی شکل وہ چھاپہ مار کارروائی تھی جس کے نتیجے میں اسود عنی قتل ہوا۔

2. دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر جہاد شرعی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے تو جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں اقلیت Minority کے طور پر رہتے ہیں، ان کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا ان کیلئے جہاد میں شمولیت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں دو واقعات کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان<sup>ؓ</sup> اور ان کے والد محترم جناب رسول اللہ<sup>ﷺ</sup> خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کی خدمت میں جہاد میں شمولیت کیلئے حاضر ہو رہے تھے کہ راستے میں کفار کے ایک گروہ نے گرفتار کر لیا اور اس شرط پر انہوں نے ہمیں رہا کیا ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر حصہ نہیں لیں گے۔ اس پر آنحضرت نے یہ فرمایا کہ انہیں بدر کے معركے میں شریک ہونے سے روک دیا کہ اگر تم نے اس بات کا وعدہ کر لیا ہے تو اس وعدہ کی پاسداری تم پر لازم ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد

محترم موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معركے میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول اکرمؐ قبائلیں قیام فرماتھے اور ابھی مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے لیکن حضرت سلمان فارسیؓ کا ذکر نہ بدر کے مجاہدین میں ملتا ہے اور نہ وہ احمد ہی میں شریک ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت آزاد نہیں تھے بلکہ ایک یہودی کے غلام تھے چنانچہ غالباً سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کی شمولیت جس پہلے غزوے میں ہوئی، وہ احزاب کا معمکر ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کے معروضی حالات اور ان کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا ہے اس لیے جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں رہتے ہیں اور ان کے ان ریاستوں کے ساتھ وفاداری کے معاهدات موجود ہیں، ان کیلئے ان معاهدات کی پاسداری لازمی ہے۔ البتہ اپنے ملکوں کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور ہمدردی و خیر خواہی کیلئے وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، وہ ان کی ذمہ داری ہے اور اس میں انہیں کسی درجے میں بھی کوتاہی روانہی رکھنی چاہیے۔ گذشتہ سال افغانستان پر امریکی حملہ کے موقع پر میں برطانیہ میں تھا۔ مجھ سے وہاں کے بہت سے مسلمانوں نے دریافت کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہودیوں کی پیرودی کرنا چاہیے اور ان سے کام کا طریقہ سیکھنا چاہیے کیونکہ یہودی ان ممالک میں رہتے ہوئے جو کچھ یہودیت کے علمی غلبہ اور اسرائیل کے تحفظ و دفاع کیلئے کر رہے ہیں، اسلام کے غلبہ اور مظلوم مسلمانوں کے دفاع کیلئے وہ سب کچھ کرنا مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ مگر یہ کام طریقہ اور ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے اور جن ملکوں میں مسلمان رہ رہے ہیں، ان کے ساتھ اپنے معاهدات اور کمٹٹیت کے دائرے میں رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔

1. آج دنیا کی عمومی صورت حال پھر اس سطح پر آگئی ہے کہ خواہشات اور محدود عقل پرستی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور آسمانی تعلیمات کا نام لینے کو جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ آج کی اجتماعی عقل نے اللہ تعالیٰ کی حاکیت سے انکار کر کے حاکیت مطلقہ کا منصب خود سنبھال لیا ہے اور وحی الہی سے راہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اس کے نشانات و اثرات کو ختم کرنے کی ہر سطح پر کوشش ہو رہی ہے۔ اس فضائی اعلاء کلمہ اللہ کا پرچم پھر سے بلند کرنا اگرچہ مشکل بلکہ مشکل تر دکھائی دیتا ہے لیکن جناب نبی اکرمؐ کی سنت و سیرت کا تقاضا یہی ہے کہ نسل انسانی کو خواہشات کی غالی اور عقل حُضُن کی پیرودی کے فریب سے نکالا جائے اور اسے آسمانی تعلیمات کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے وحی الہی کے ہدایات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔

2. اس کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان جس مظلومیت اور کسپری کے عالم میں ظالم اور مسلط قوتوں کی چیڑہ دستیوں کا شکار ہیں اور انہیں جس بے رحمی اور سُنگ دلی کے ساتھ ان کے مذہبی تشخص کے ساتھ ساتھ قوی آزادی اور علاقائی خود مختاری سے محروم کیا جا رہا ہے، اس کے خلاف کلمہ حق بلند کرنا اور ان مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جرکے ماحول سے نجات دلانے کیلئے جو کچھ ممکن ہو، کر گزرنایہ بھی حضورؐ کی تعلیمات

- وارشادات کا ایک اہم حصہ ہے جس سے صرف نظر کر کے ہم آپ کی اباع اور پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ان عظیم تر ملی مقاصد کیلئے جدوجہد کے مختلف شعبے ہیں۔ فکر و فلسفہ کامیابان ہے، میڈیا اور انفرمیشن شیکنا لو جی کی جوانان گاہ ہے، تہذیب و ثقافت کا ماحصلہ ہے، تعلیم و تربیت کا درجہ ہے، لائبریری اور سفارت کاری کا شعبہ ہے، اور عسکری صلاحیت کے ساتھ ہتھیاروں کی معز کہ آرائی ہے۔ یہ سب جہاد فی سیل اللہ کے شعبے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں ”سنن نبوی کی روشنی میں جہاد کا مفہوم“ یہ ہے کہ:
- نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محس کی پیروی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی حکیمت اور آسمانی تعلیمات کی عمل داری کی طرف لانے کیلئے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔
  - اسلام کی دعوت اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو نسل انسانی کے ہر فرد تک پہنچانے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق اسے دعوت اسلام کا مقصد و افادیت سمجھانے کا اہتمام کیا جائے۔
  - ملتِ اسلامیہ کو فکری وحدت، سیاسی مرکزیت، معاشری خود کفالت، ٹیکنالو جی کی مہارت، اور عسکری قوت و صلاحیت کی فراہمی کیلئے بھرپور وسائل اور توانائیاں بروئے کار لائی جائیں۔
  - مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کیلئے تگ و دوکی جائے نیز دینی تعلیم و تربیت کے نظام کو ہر سطح پر مربوط و منظم کیا جائے۔
  - مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جری سے نجات دلانے اور ان کے دینی شخص اور علاقائی خود مختاری کی بحالی کیلئے ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔
  - مسلم ممالک میں قرآن و سنت کی عملداری اور شرعی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کر کے تمام مسلم ملکوں کو عالمی سطح پر کفیل ریشن کی صورت میں خلاف اسلامیہ قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔
  - دینی جذبہ و غیرت کے تحت ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں ہتھیار اٹھانے والے مجاہدین کو عالمی استعمار کے ہاتھوں ذبح کرانے اور ان کے قتل عام پر خوش ہونے کے بجائے ان کو بچانے کی کوشش کی جائے اور اس عظیم قوت کو ضائع ہونے سے بچانے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرتے ہوئے انہیں ملتِ اسلامیہ کیلئے حقیقی معنوں میں ایک کارامد قوت بنانے کی راہ نکالی جائے۔
  - اسلامی تعلیمات، قرآن و سنت کے قوانین اور جہاد کے بارے میں عالمی استعمار اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے یک طرفہ اور معاندانہ پروپیگنڈے سے متاثر و مرعوب ہونے کے بجائے اس کو مسترد کیا جائے اور دلیل و منطق کے ساتھ اسلامی احکام اور جہاد کی ضرورت و افادیت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔

یہ کام دراصل مسلم حکومتوں کے کرنے کے ہیں اور انہیں ادائی سی کے عملی ایجنسٹے کا حصہ ہونا چاہیے لیکن اگر دینی مرکزوں اور اسلامی تحریکات بھی باہمی ربط و مشاورت کے ساتھ ان مقاصد کیلئے مشترکہ پیش رفت کا اہتمام کر سکیں تو حالات کو خاصاً بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

## سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم: چند مزید گزارشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۹ مئی ۲۰۰۲ء

شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کی سالانہ سیرت کانفرنس میں ”سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم“ کے عنوان سے راقم الحروف کی گزارشات قارئین کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ اس کانفرنس میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی اور دیگر علماء کرام نے بھی خطاب کیا جبکہ مہمان خصوصی اسلامی نظریاتی کوسل کے چیزیں میں ڈاکٹر ایس ایم زمان تھے جنہوں نے اپنے اختیاری خطاب میں راقم الحروف کی معروضات کو سیرتِ انہی کے صحیح ر斧 پر مطالعہ کی کوشش قرار دیا اور کہا کہ آج کے علمی حالات اور مشکلات و مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے سیرتِ نبویؐ کے اسی طرز کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے میری گزارشات کے حوالے سے دو پہلوں پر اپنے تحفظات کا بھی اظہار فرمایا جن کے بارے میں خود میرا بھی خیال ہے کہ ان کی وضاحت ضروری تھی اور یہ وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے خطاب کے بعد اس اس سیرت کانفرنس میں مزید کچھ گزارش کرنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے ان امور کی طرف توجہ دلانے پر ڈاکٹر ایس ایم زمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ”نوائے قلم“ کے ذریعے ان کے بارے میں ضروری معروضات پیش کر رہا ہوا۔

ایک بات تو یہ ہے کہ مذہب کیلئے ہتھیار اٹھانے سے کیا مراد ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ:

- اگر تو اس سے مراد مذہب کے دفاع کیلئے ہتھیار اٹھانا ہے تو اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے،
- اور اگر اس کا مطلب مذہب کی تبلیغ کیلئے ہتھیار اٹھانا ہے تو یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور قرآن کریم نے سورہ بقرہ آیت ۲۵۵ میں صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ ”دین کے معاملہ میں کوئی جر نہیں۔“

مجھے ڈاکٹر صاحب موصوف کی دونوں ہاتوں سے اتفاق ہے لیکن یہ معاملہ ان دو صورتوں میں محدود نہیں ہے بلکہ ایک اور صورت بھی درمیان میں موجود ہے جس کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے عام طور پر یہ الجھن پیش آ جایا کرتی ہے۔ وہ ہے کچھ قوموں اور گروہوں کا اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نسل انسانی تک اسلام کا پیغام پہنچانے میں رکاوٹ بننا۔ اور اسلام نے کافر قوتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حکم اسی صورت میں دیا ہے جبکہ وہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچنے میں رکاوٹ

بن جائیں، کیونکہ اسلام یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو پیغام ہے صرف وہی نسل انسانی کی نجات کا ضامن ہے اور انسانی معاشرہ اس کے بغیر نجات و فلاح اور امن و خوشحالی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو لوگ شخصی یا مقامی دائرہ میں اسلام قبول نہیں کرتے لیکن اسلام کی دعوت میں بھی رکاوٹ نہیں بنتے، اسلام ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ لیکن جو کافر اسلام قبول نہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف اس قدر معاندانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ اس کی دعوت میں رکاوٹ بن جائیں تو اسلام ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی بات کرتا ہے۔ یہ ہتھیار اٹھانا کسی کو قبول اسلام پر مجبور کرنے کیلئے نہیں بلکہ اسلام کی دعوت میں رکاوٹ بننے سے روکنے کیلئے ہے۔ چنانچہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے حوالے سے اپنے کمانڈروں کو یہی ہدایات دی ہیں کہ:

1. سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کرو، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے اور کوئی تنازع باقی نہیں رہتا۔

2. لیکن اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو وہ سرے نمبر پر کافروں کے سامنے یہ پیشش رکھنے کی بہادیت جناب نبی اکرم کی طرف سے دی گئی ہے کہ اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے اسلام کی بالادستی (علمی کردار) کو قبول کرو، اگر وہ یہ درجہ قبول کر لیں تو بھی ان کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا بلکہ اسلامی ریاست ان کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اسے نجاتی ہے۔

3. اس کے بعد تیسرا درجہ میں یہ بات ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں اور اسلام کی بالادستی کو قبول نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں مزاحم ہیں اور رکاوٹ بن رہے ہیں، چنانچہ اس صورت میں جناب نبی اکرم نے ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا ہے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ قرار دیتے ہوئے اس کا مقصد اعلاء کلتہ اللہ بتایا ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے امریکہ اور اس کے اتحادی یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت جو عالمی نظام اور یہاں الاقوامی سسٹم موجود ہے اور جس تہذیب و ثقافت نے اس وقت پوری دنیا کو گھیرے میں لے رکھا ہے وہی سسٹم اور ثقافت نسل انسانی کیلئے سب سے بہتر ہے اور اس سے بہتر کسی سسٹم اور کلچر کا کوئی امکان نہیں ہے، اس لیے دنیا کا جو ملک اور قوم ان کے نزدیک اس نظام و ثقافت کے علمی کردار کیلئے خطرہ قرار پاتا ہے وہ اس کے خلاف چڑھ دوڑتے ہیں، اس کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے ہیں اور پھر ہزاروں انسانوں کی ہلاکتوں کے باوجود بڑے خنکرے ساتھ اس اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے عالمی تہذیب کو بچالیا ہے اور ورلڈ سسٹم کو رورپیش خطرات کو ختم کر دیا ہے۔

میں اس مرحلہ میں اپنے اس موقف کا پھر اعادہ کرنا چاہوں گا کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک تہذیب اور نظام کو نسل انسانی کیلئے سب سے بہتر سمجھتے ہوئے اس کے عالمی غلبہ کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھائیں تو وہ کسی دوسری تہذیب اور نظام کے علمبرداروں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتے کہ وہ اگر اپنے نظام و تہذیب کو نسل انسانی کیلئے دیانتداری کے ساتھ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں تو اس کیلئے عالمی کردار کے قیام اور تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھائیں۔ اور اگر امریکی

اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھتے ہوئے دوسرے فرقی کو اس حق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو اس کا نام انصاف نہیں بلکہ یہ جنگل کا قانون اور طاقت کی حکمرانی ہے جو طاقت اور اسلحہ کے زور پر تو قائم کی جاسکتی ہے لیکن اخلاقی جواز اور انصاف کی بنیاد سے محروم ہونے کی وجہ سے اسے قائم کرنا بھی ممکن نہیں رہا اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی امکان ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم زمان نے دوسرا سوال یہ اٹھایا کہ میں نے جن چھاپ مار کارروائیوں کا حوالہ دیا ہے ان کے حوالے سے دہشت گردی کی ایسی کارروائیوں کی حمایت نہیں کی جاسکتی جن میں بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں اور نہ ہی ایسی کسی کارروائی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے جس میں کسی بستی، چوک یا ریڑھی میں بم رکھ کر بے گناہ شہریوں کے جسموں کے پرچے اڑا دیے جاتے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر مخترم کے اس ارشاد سے بھی مکمل اتفاق ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ ہر چھاپ مار کارروائی دہشت گردی نہیں ہوتی اور ہمیں چھاپ مار کارروائیوں اور دہشت گردی میں فرق کرتے ہوئے ان کے درمیان کوئی حد فصل قائم کرنا ہوگی۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف، ابو رافع اور اسود عنسی کے قتل کیلئے جن کارروائیوں کا حکم دیا وہ چھاپ مار کارروائیاں ہیں اور حضرت ابو بصریؓ نے سمندر کے کنارے عسکری یکمپ قائم کر کے قریش مکہ کے خلاف جو کارروائیاں کیں وہ بھی چھاپ مار کارروائیاں ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کارروائیاں متعین اہداف کیلئے تھیں اور ان کا دائرہ بھی اہداف تک محدود رہا۔ جبکہ بد رکی جنگ سے قبل ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کو روکنے کیلئے جناب نبی اکرمؐ کی تیاری اور قریش کے تجارتی راستے میں چھاپ مار کر یکمپ قائم کر کے حضرت ابو بصریؓ کا قریش کی شام کے تجارت میں رکاوٹ ڈالنا، یہ دشمن کی معیشت پر ضرب لگانے کی کارروائیاں تھیں اور یہ بھی جنگی حکمت عملی کا حصہ ہونے کی وجہ سے دہشت گردی نہیں ہیں۔

البتہ اس سے ہٹ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سول آبادی اور بے گناہ اور غیر متعلق شہریوں کو نشانہ بنانے کی اجازت نہیں دی، اس کے بارے میں آپؐ کی واضح بدیات موجود ہیں۔ اور اسی وجہ سے غیر متعلقہ، بے گناہ اور نہتے شہریوں کو کسی قسم کی عسکری کارروائی کا نشانہ بنانا، اسی طرح کسی بس یا چوک میں بم رکھ کر یا کسی مسجد یا امام بارگاہ میں بم پھینک کر بے گناہ لوگوں کی جانوں سے کھلینا یقیناً دہشت گردی ہے جس کی کوئی بھی ذی شعور شخص حمایت نہیں کر سکتا۔

مگر ایک سوال باقی ہے کہ کسی ضروری ہدف کو نشانہ بناتے ہوئے اگر ناگزیر درج میں کچھ بے گناہ زد میں آرہے ہوں تو پھر کیا آجائے؟ تو اس کے بارے میں ابواؤ شریفؐ کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ کا واضح ارشاد موجود ہے کہ ایک غزوہ میں آپؐ سے سوال کیا گیا کہ دشمن کی قوت توڑنے کیلئے فلاں جگہ شب خون مارنا ضروری ہو گیا ہے مگر دبائ کچھ غیر متعلقہ لوگ بھی موجود ہیں جو حملہ کی صورت میں زد میں آسکتے ہیں۔ تو نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ ”وہ بھی انہی میں سے ہیں“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگی ضروریات کیلئے اگر کہیں کارروائی ناگزیر ہو جائے اور اس کارروائی کی زد میں غیر متعلقہ لوگ آرہے ہوں تو مجبوری کے درج میں اسے گوارا کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے امریکی اتحاد نے اہداف کو نشانہ بناتے ہوئے ہزاروں بے گناہ افغانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اس کا جواز صرف یہی پیش کیا جاتا ہے کہ جنگی کارروائی کیلئے ایسا ناگزیر تھا اور اس سے کوئی مفر نہیں تھا۔

امید ہے کہ ڈاکٹر ایم ایم زمان کے اٹھائے ہوئے دو سوالوں کی مناسب وضاحت قاریین کے سامنے آئی ہوگی، اس سلسلہ میں اگر مزید کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اس کیلئے بھی حاضر ہوں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## دینی مدارس: امداد اور چھاپوں کی زد میں

روزنامہ پاکستان، لاہور ۲۰۰۲ء

ایک طرف صورتحال یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے امریکہ کی زیرقیادت عالمی اتحاد کے ساتھ مل کر دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ طالبان حکومت دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی تھی اور دینی مدارس افغانستان میں خالص نظریہ اور دینی بنیادوں پر قائم طالبان حکومت کو دیکھ کر مطمئن تھے کہ ان کی ڈیڑھ صدی کی محنت رنگ لے آئی ہے اور اسلام کی جن تعلیمات کو انہوں نے گذشتہ دوسرا سے محنت، قاعات، فاقہ، کشی اور قربانیوں کے ساتھ زمانے کی دست برداشت کر کھا ہوا تھا وہ نہ صرف محفوظ ہے بلکہ عملی اور اجتماعی زندگی میں ان کی عملداری کے امکانات بھی نظر آنے لگے ہیں۔ لیکن امریکی اتحاد نے حکومت پاکستان کے تعاون سے طاقت کے بل پر اس حکومت کا خاتمه ہی نہیں کیا بلکہ اس کے عملی اور فکری سرچشمہ دینی مدارس کے خلاف وسیع تراویقی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا ہے جن کا سلسلہ افغانستان سے آگے بڑھتا ہوا پاکستان کے مختلف شہروں تک پھیلتا جا رہا ہے۔ دینی مدارس پر چھاپے مارے جا رہے ہیں، علماء اور کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں، خوف وہارس کی فضا قائم کی جا رہی ہے اور دینی مدارس کے ساتھ تعاون کرنے والے اصحاب خیر کو ڈرایادھم کیا جا رہا ہے۔ امریکی کمانڈوز کی رہنمائی میں پاکستانی فورسز اس وقت پاکستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس کے خلاف جو کارروائیاں کر رہی ہیں اور جس طرح دینی حلقوں کو خوف زدہ اور ہر اس کیا جا رہا ہے اس فضائیں دینی مدارس کیلئے تیرہ ارب روپے کی امداد اور ان کی اصلاح و ترقی کے سرکاری اقدامات کو ایک سنگین مذاق اور زخمیں پر نمک چھڑکنے کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے؟

موجودہ حکومت اگر دینی مدارس کے نظام و نصاب کی اصلاح میں مختص ہے اور خلوص دل کے ساتھ ان کی امداد کرنا چاہتی ہے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ

- ملک بھر میں دینی مدارس کے خلاف کی جانے والی کارروائیاں فی الفور بند کر دی جائیں،
- امریکی کمانڈوز سے دو ٹوک طور پر کہہ دیا جائے کہ القاعدہ کے ارکان کی ملاش کی آڑ میں ہم اپنے دینی تعلیم کے نظام اور ماحول کو ڈسٹرپ نہیں کر سکتے،
- دینی مدارس کو ایسا و انتظامی خود منصاری کے تحفظ کی دو ٹوک گارنٹی دی جائے،
- نصاب و نظام کے معاملہ میں انہیں ڈیکشن دینے کی بجائے مشاورت کے ذریعے ضروری اصلاحات کی راہ ان کے وفاقوں کے ذریعے ہموار کی جائے،

- اور دینی حلقوں اور مدارس کے بارے میں امریکہ اور بھارت کے ایجنسٹے سے لاتعلقی کا واضح طور پر اعلان کیا جائے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خادموں سے فرمایا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو غلاموں کی طرح زدہ کوب نہ کیا کریں کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی اچھی نہیں ہو گی کہ دن کے وقت وہ انہیں تھپٹ مبارے ہے، ہوں اور شام کو پھر انہیں گلے لگانے کیلئے بھی آگے بڑھیں۔ حکمران بھی گھر کے سربراہ کی طرح ہوتا ہے، اسے بھی اگر گھر کے افراد کے تعاون کی ضرورت ہے تو اسے جناب نبی اکرم کی اس نصیحت کا لحاظ رکھنا ہو گا۔ یہ تو کوئی شرافت کی بات نہیں سمجھی جائے گی کہ ایک طرف دینی مدارس چھالپوں کی زد میں ہوں، رات کی تاریکی میں ان کی دیواریں پھلانگی جا رہی ہوں، اساتذہ و طلبہ کو زدہ کوب کیا جا رہا ہو اور جیل کی کالی کوٹھڑیوں کو مولویوں سے بھرا جا رہا ہو اور دوسری طرف وفاتی وزیر نہ ہی امور تیرہ ارب روپے کے نوٹ تھالی میں رکھ کر دینی مدارس کے دروازوں پر دستک دے رہے ہوں۔ ان حالات میں تو امداد اور نصیحت کی بات کوئی عام آدمی بھی قبول نہیں کرتا، حکومت نے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد سے اس کی توقع کیسے کر لی ہے؟

## روس، عرب، یورپی ممالک کا فلسطین کی حمایت میں متوقع اتحاد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۸ جولائی ۲۰۰۲ء

ایک قومی اخبار کی روپورٹ کے مطابق فلسطین کی حمایت میں روس، عرب اور یورپی ممالک کا اتحاد وجود میں آنے والا ہے، جبکہ فلسطین پر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف روس اور یورپی یونین کے بعض ملکوں کے درمیان خفیہ اتحاد ہو گیا ہے۔ ان یورپی ممالک نے روس کو یقینی دلایا ہے کہ وہ فلسطین کی حمایت پر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف اسٹینڈ لیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ روس نے اسلامی یورپی ملکوں کے سربراہوں سے رابطہ کیے ہیں اور اسرائیلی مظالم رکوانے کیلئے اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ ان ذرائع کا کہنا ہے کہ فلسطین کے اندر اسرائیل جو مظالم اور تباہ کاریاں کر رہا ہے اس سے اکثر یورپی ممالک کے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ امریکہ کی حمایت کے بغیر اسرائیل یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔

ادھر امریکہ اس موقف پر ڈٹا ہوا ہے کہ فلسطینی ریاست کے قیام کی صورت میں یا سر عرفات کا کوئی کردار نہیں ہو گا اور فلسطینی عوام کو یا سر عرفات کے علاوہ اپنا کوئی دوسرا لیڈر منتخب کرنا ہو گا، ورنہ یا سر عرفات کے دوبارہ منتخب ہونے کی صورت میں امریکہ فلسطینی ریاست کی حمایت اور تعاون سے دست کش ہو جائے گا۔

خبراری روپرتوں کے مطابق امریکہ کے اس موقف کے خلاف غزہ کے علاقہ میں ہزاروں فلسطینیوں نے یا سر عرفات کے حق میں مظاہرہ کیا ہے اور صدر بخش کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا ہے کہ فلسطینی عوام اپنی قیادت بالخصوص یا سر عرفات کو تبدیل کریں۔ مظاہرین نے ہوائی فائرنگ کی اور کہا کہ آزاد نہ انتخاب ہمارا حق ہے، ہم بمش کی ڈکٹیشن قبول

نہیں کریں گے اور ہمارا انتخاب اور لیڈر یا سر عرفات ہے۔ جب کہ امریکی وزیر خارجہ کوں پاؤں نے ایک ٹوں وی اٹھو دیو میں کہا ہے کہ واشنگٹن نے فلسطین کے صدر یا سر عرفات سے تمام رالٹے منقطع کر دیے ہیں اور فی الحال انہیں بحال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ یا سر عرفات امریکہ کی خواہش کے مطابق فلسطینیوں کی قیادت کیلئے کسی نئے آدمی کو سامنے لایا جائے پرنا کام رہے ہیں۔ کوں پاؤں نے کہا کہ اب امریکہ سمجھتا ہے کہ فلسطینیوں کی قیادت کیلئے کسی نئے آدمی کو سامنے لایا جائے جو امریکی خواہشات کے مطابق قیادت کرے، پونکہ یا سر عرفات امریکی خواہشات پر پورا اتر نے میں ناکام رہے ہیں اس لیے اب امریکہ انہیں ہٹا کر ہی دم لے گا۔

روس کی طرف سے فلسطینیوں کی حمایت اور اس سلسلہ میں اسلامی ممالک اور یورپی ملکوں کے ساتھ روس کے رالٹوں کی خبر سے اب سے کوئی تیس پہلے کا منظر نامہ پھر سے سامنے آگیا ہے جب دنیا دیں اور بائیں بازو کے عنوان سے دو بڑے چودھریوں کے درمیان میٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف امریکہ تھا وہ دوسری طرف روس۔ اور ان کی قیادت میں دو بڑے بلاک قائم تھے جن کے مابین سرد جنگ کا سلسلہ جاری تھا، جس سے کمزور ممالک اور اقوام کو یہ سہولت میسر تھی کہ اگر ایک چودھری کی طرف سے ظلم اور نا انصافی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو وہ دوسرے چودھری کا سہارا لے کر خود کو کسی حد تک محفوظ کر لیا کر تی تھیں۔ مگر اب یہ صورت حال باقی نہیں رہی کہ ”افغان وار“ میں روس کی ہربیت کے بعد امریکہ دنیا کا واحد چودھری اور حکمران بن گیا اور اس کے مقابل کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی جو اس کے کسی اقدام کو چیلنج کر سکے اور اسے مظلوم اقوام کے ساتھ زیادتی سے روک سکے۔

اس وقت عالمی صورت حال کچھ عیوب سی تھی اور مسلم ممالک بھی تقسیم کے اس عمل سے محفوظ نہیں تھے:

- مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو امریکہ کی محلی سرپرستی اور پشت پناہی حاصل تھی، جواب تک مسلسل جاری ہے بلکہ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔
- جبکہ عرب ممالک دو حصوں میں تقسیم تھے: ایک حصہ سعودی عرب کی قیادت میں امریکی کیمپ میں تھا اور دوسرے کیمپ مصر کے جمال عبدالناصر مرحوم کی سربراہی میں روس کی بھی خواہوں میں شمار ہوتا تھا۔
- عرب قوم پرستی کی تحریک کو روس کی حمایت حاصل تھی اور وہ عرب ممالک میں اپنا اثر و سونگ بڑھانے کیلئے اپنے حامی عرب ممالک کے ساتھ اقتداری اور فی تعاون میں بھی پیش پیش تھا۔
- ۱۹۷۴ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں خوفناک پٹائی کے بعد روسی کیمپ کے عرب ممالک میں یہ احساس اپھرنا شروع ہوا کہ روس کی حمایت اور تعاون ان کیلئے کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہو رہا، اس لیے اب ان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ امریکی کیمپ میں اپنے لیے جگہ تلاش کریں تاکہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے امریکہ کی پالیسیوں میں توازن کی کوئی صورت نکل آئے، اور وہ علاقے میں اسرائیل کے ساتھ اپنے معاملات کو بیٹھنے کر سکیں۔ چنانچہ صدر ناصر مرحوم کے آخری دور میں اس رخ پر کام شروع ہو گیا تھا جسے ان کے جانشین اور سادات مرحوم نے تکمیل تک پہنچایا اور عربوں نے ”کیمپ ڈیوڈ“ سمجھوتے کی صورت میں اپنا

مستقبل امریکہ کے ساتھ وابستہ کر لیا۔

• یاسر عرفات اس کشمکش میں اس کیمپ کے آدمی تھے جو روں کے ساتھ وابستگی رکھتا تھا اور انہوں نے اسی پس منظر میں قوم پرستی کی بنیاد پر فلسطین کی آزادی کی تحریک کو آگے بڑھایا تھا۔ انہوں نے ایک عرصہ تک آزادی فلسطین کیلئے مسلح جنگ لڑی اور گوریلا کارروائیوں کی قیادت کی، اسی وجہ سے امریکہ کو بہت دیر تک اس میں تماں رہا کہ وہ یاسر عرفات کو فلسطینیوں کے لیڈر کے طور پر قبول کرے۔ یاسر عرفات پر امریکہ کے دروازے بند تھے اور ایک موقع ایسا بھی آیا کہ یاسر عرفات کو اقوام متحده کی جزوں سمبلی میں فلسطینیوں کی نمائندگی کیلئے آنا تھا گہر امریکہ نے انہیں ویزادینے سے انکار کر دیا تھا۔

یاسر عرفات کو امریکی کیمپ میں جانے کیلئے عسکری سرگرمیوں سے دستبردار ہونا پڑا، وہی کیمپ سے تعلقات منقطع کرنا پڑے، بلکہ خدا جانے کون کون سی لیقین دہانیوں سے گزرنما پڑا، تب جا کر یاسر عرفات کو امریکی کیمپ میں قدم رکھنے کی اجازت ملی۔ مگر اس کے بعد امریکہ کی طرف سے ایک نئی شرط سامنے آئی کہ یاسر عرفات خود تو عسکری سرگرمیوں اور جہادی عمل سے دست کش ہو گئے ہیں اور گوریلا جنگ کی بجائے سیاسی مذاکرات کی میز پر آئیٹھے ہیں، مگر فلسطینی عوام میں عسکری کارروائیوں کے رجحان کو مکمل طور پر ختم کرنے اور جہادی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری بھی یاسر عرفات کو قبول کرنا ہوگی، ورنہ انہیں جہادی سرگرمیوں سے دستبرداری کے موقف میں سنجیدہ تصور نہیں کیا جائے گا۔

ان شرائط اور لیقین دہانیوں کے بعد فلسطین کی ایک ادھوری اور غیر رسمی سی برائے نام حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا صدر یاسر عرفات کو منتخب کیا گیا۔ اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ فلسطین میں عسکریت پسندی کے رجحانات کو مکمل طور پر ختم کریں اور جہادی گروپوں کو عسکری سرگرمیوں سے باز کریں، ورنہ بصورت دیگر انہیں پوری طرح پکل دینے میں اسرائیل کے ساتھ شریک ہوں۔ یاسر عرفات اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور اپنی بساطی کی حد تک ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود حماس اور دیگر جہادی گروپوں کی عسکری سرگرمیاں نہ صرف جاری ہیں بلکہ ان سے اسرائیل کے مظالم اور وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف مزید شدت پیدا ہو رہی ہے، اور ان فلسطینیوں کے خودکش حملوں نے اس خطہ میں اسرائیل کی عسکری بالادستی کے خواب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔

اسی پس منظر میں امریکہ کی یکطریفہ اور جارحانہ پالیسیوں کے رد عمل میں روں اور یورپی یونین کے بعض ممالک کے درمیان نئے رابطوں کی یہ خبر خوش آئند ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ضمیر بالکل ہی موت کے گھاٹ نہیں اتر لیا بلکہ اس میں زندگی کی کچھ مرق باقی ہے۔ خدا کرے کہ روں، یورپی یونین اور اسلامی ممالک کے یہ رابطے جلد کسی تیجے تک پہنچیں کیونکہ عالم اسباب میں اسرائیل اور امریکہ کے وحشیانہ مظالم اور سنگدلانہ طرز عمل سے رہی ہیں فلسطینی قوم کو کسی حد

تک بچالینے کی اب بھی صورت باقی رہ گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی پریشان کر رہی ہے کہ بالکل بھی صورتحال کشمیر میں پیش آنے والی ہے بلکہ اس کی شروعات ہو گئی ہیں۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس نے بھی یا سر عرفات بننا ہے اس غیر کوچادی سرگرمیوں کو مکمل طور پر کچلنے کی صورت میں جب امریکی غیظ و غضب کا نشانہ بننا ہو گا تو اسے کون سہارا دے گا؟ یا سر عرفات تواضی میں رو سی کیپ میں رہے ہیں اس لیے پرانے تعلقات ہمدردیاں بروئے کار لانے کا کوئی امکان نظر آ رہا ہے۔ ہم تو شروع سے ہی امریکی کیپ سے والبستہ ہیں اور اس حد تک والبستہ ہیں کہ سوویت یوینین کے خاتمه اور اس کے بعد افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے خاتمه میں بھی خود ہمارا خون شامل ہے، جس کی وجہ سے ہماری تباہی میں رو سی امریکہ سے بھی وقدم آگے ہے۔ اس لیے جو بزرگ بھی مسئلہ کشمیر کے حوالے سے یا سر عرفات بننے جا رہے ہیں ان سے ہماری گزارش ہے کہ اس وقت کیلئے کوئی نہ کوئی پناہ گاہ ضرور سوچ رکھیں جب امریکہ ہمارا آدھا کام نکل جانے اور باقی آدمیے کام کا ان ہاتھوں پورا ہونے کا امکان باقی نہ رہنے پر بڑی بے نیازی کے ساتھ یہ فرمادے گا کہ ”گیٹ آٹ! اب تمہاری ضرورت باقی نہیں رہی۔“

## پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی

روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۶ اگست ۲۰۰۴ء

مولانا عاظم طارق کی بھوک ہر ہتال کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے اور اس کی پیچیدگی اور غمغینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر حافظ سعید کا تعلق اہل حدیث مکتب فکر سے ہے، انہوں نے ”لشکر طیبہ“ کے نام سے مجاہدین کی جماعت بنائی جس نے بہت جلد مجاہدین کی تنظیموں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مجاہدین کی حمایت کیلئے شروع سے سرگرم عمل رہے جبکہ افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت اور امریکی عزائم کی مدت و مختلف میں پروفیسر حافظ محمد سعید ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی جماعت کو نہ صرف امریکہ کی طرف سے دہشت گرد قرار دیا گیا بلکہ پاکستان میں بھی اس پر یابندی لگادی گئی جس پر انہوں نے ”جماعۃ الدعوۃ“ کے نام سے ایک نئی دینی و سیاسی جماعت کی تشکیل کا اعلان کر دیا اور لشکر طیبہ کو کشمیر کے دائرہ میں مدد و درکار کے پاکستان میں اس کی سرگرمیاں ختم کر دیں۔ تب سے وہ جماعت الدعوۃ کے امیر ہیں اور ملک کی دینی سیاست میں سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔

حافظ محمد سعید کو افغانستان پر امریکی حملہ کے موقع پر ”فاعل پاکستان و افغانستان کوسل“ کے مشترکہ فورم سے احتجاجی مہم میں متحرك کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا۔ کئی ماہ کے بعد وہ رہا ہوئے لیکن کچھ دونوں کے بعد دوبارہ گرفتار کر لیے گئے، ان کی گرفتاری کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں اور حکومتی حلقوں کی طرف سے ان خبروں پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی۔ لیکن جب گذشتہ دونوں ان کی الہیہ مختتمہ نے لاہور ہائی کورٹ میں ان کی گرفتاری یا نظر بندی کے خلاف رٹ دائز کی تو

صومائی حکومت نے عدالت عالیہ کے سامنے یہ موقف اختیار کر کے سب کو حیرت زده کر دیا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو حکومت نے گرفتار نہیں کیا اور وہ حکومت کی تجویل میں نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں صومائی حکومت کو علم ہے کہ وہ کہاں ہیں؟ اس کے بعد جب وفاقی حکومت سے دریافت کیا گیا تو حکومت پاکستان کے وکیل نے بھی لاہور ہائیکورٹ میں وہی موقف دہرا�ا جو صومائی حکومت اس سے قبل پیش کر چکی تھی۔

اس طرح اب صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید غائب ہیں، ان کے گھروالوں کو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں اور وہ معلومات حاصل کرنے کیلئے عدالتوں کا دروازہ ٹھکانہ نہ پر مجبور ہیں۔ دوسری طرف حکومت نے واضح طور پر ان کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے کہ نہ انہیں گرفتار کیا گیا ہے اور نہ ہی حکومت ان کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔

ہمارے خیال میں حکومت کا یہ کہنا قرین قیاس نہیں ہے اور پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں اس درجہ کی لاعلمی کا اظہار کر کے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ورنہ اگر حکومت کا یہ موقف درست ہے تو اس کا اظہار اس وقت ہونا چاہیے تھا جب حافظ سعید کی دوبارہ گرفتاری کی خبریں قوی اخبارات میں شائع ہوئیں اور مسلسل کئی روز تک اس گرفتاری پر احتیاج بھی ہوتا رہا۔ اگر حکومت نے انہیں گرفتار نہیں کیا تھا تو اس کا فرض بنتا تھا کہ اسی وقت حکومت کی طرف سے ان خبروں کی تردید جاری کی جاتی اور واضح طور پر قوم کو بتایا جاتا تھا کہ یہ خبریں غلط ہیں اور حکومت نے انہیں حرast میں نہیں لیا۔ حافظ صاحب ملک کی معروف دینی شخصیت ہیں اور ایک دینی سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں۔ ان کی گرفتاری کی خبروں پر حکومت کا خاموش رہنا اور کئی ماہ گزر جانے کے بعد ہائیکورٹ میں اس سے بے خبری کا اظہار کرنا نہ تو قانون و ضابطہ کی زبان میں درست طرز عمل ہے اور نہ ہی اخلاقی طور پر اس کا کوئی جواز بنتا ہے۔

دوسری طرف ایک خبر کے مطابق حافظ محمد سعید کی اہمیت نے اپنے شوہر کی گمشدگی یا گرفتاری کے کیس میں صومائی وزیر مذہبی امور مفتی غلام سرور قادری کو فریق بنانے کی درخواست دے دی ہے جنہوں نے مبنیہ طور پر ایک اثر و یو میں کہا تھا کہ حافظ محمد سعید حکومت کی حرast میں ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کیس کی عینی میں اس بات سے کئی لگنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید ان حضرات میں سے ہیں جن کے بارے میں امریکہ اور بھارت دونوں ملکوں کی حکومتیں اس بات میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اس کا حلم کھلا مطالہ کر چکی ہیں کہ انہیں آزاد نہ چھوڑ جائے، ان کی سرگرمیوں کو ختم کرایا جائے بلکہ انہیں ایک دہشت گرد کے طور پر امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا جائے۔ اس لیے ان کی گرفتاری کی واضح خبروں کے کافی عرصہ بعد حکومت کی طرف سے ان کے بارے میں بے خبری کا اعلان ذہنوں میں یہ شک پیدا کرتا ہے کہ کہیں انہیں کسی خفیہ ڈیل کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے تو نہیں کر دیا گیا؟ اور صدر جزل پرویز مشرف نے امریکی وزیر خارجہ کو ان پاول کی آمد کے موقع پر جو یہ اعلان فرمایا ہے کہ ہم نے تشویر میں ”دہشت گردی“ کو ختم کرنے کیلئے بہت کچھ کر دیا ہے۔ کہیں اس بہت کچھ میں پروفیسر حافظ محمد سعید کی ”گمشدگی“ بھی تو شامل نہیں ہے؟

ہمارے ہاں اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں اور ہضم بھی ہو جایا کرتی ہیں اس لیے ہمارا یہ خدشہ بے جانیں ہے۔ ہم

نے ملا عبد السلام ضعیف کو افغانستان کا سفیر تسلیم کر کھاتا اور ان کے کاغذات سفارت باقاعدہ ایوان صدر میں بول کیے گئے تھے لیکن افغانستان میں ان کو سفیر مقرر کرنے والی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب وہ سفیر نہ رہے تو ان کے ساتھ ڈیلینگ کے سفارتی تقاضے، ضوابط اور اخلاق کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے موجود تھا، جبکہ انہوں نے سیاسی پناہ کی درخواست بھی دے رکھی تھی، جو ہمارے ہاں زیر غور تھی۔ دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ کسی سفارت کارکی سیاسی پناہ کی خطرہ بھی نظر آ رہا ہو۔ مگر ہم نے ایسا کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ سفارتی ادب نے ہمارا دم من پکڑا اور نہ ہی قانون و ضابطہ کی کوئی دفعہ ہمارا ہاتھ روک سکی۔ چنانچہ ایک مسلسلہ سفارت کار ہمارے ہاتھوں جنگی مجرم کا درج پا کر دشمن کی حرast میں ہے جس کے بارے میں وحشیانہ تشدد کی خبریں بار بار عالمی پر لیں میں آ رہی ہیں اور چند روز سے اسی تشدد کی وجہ سے ان کی موت اور شہادت کی خبریں بھی منتظر امام پر آنا شروع ہو گئی ہیں۔

اس پس منظر میں جماعت الدعوۃ پاکستان کے امیر اور ملک کے معروف سیاسی و دینی رہنمایا پرو فیصل حافظ محمد سعید کی گمشدگی ملک بھر کے دینی حلقوں اور محب وطن عناصر کیلئے سخت پریشانی اور اضطراب کا باعث بن گئی ہے اور پروفیسر صاحب محترم کی زندگی کے حوالے سے علیین اور شدید خدشات ذہنوں میں ابھر رہے ہیں۔ اس لیے حکومت پاکستان یا پنجاب حکومت عدالت عالیہ میں یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو جاتی کہ اسے پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے اور اس نے انہیں حرast میں نہیں لیا۔ بلکہ یہ حکومت کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن عوام کے سامنے واضح کرے اور ان کی رہائی یا بصورت دیگر بازیابی کیلئے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے فوری اور ٹھوس اقدامات کرے۔ ورنہ اگر حکومت نے اس حوالے سے سنجیدگی کا مظاہرہ نہ کیا تو عوام کے ذہنوں سے اس شبہ کو کالانا مشکل ہو جائے گا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو خفیہ ڈبل کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اب بے خبری کے اظہار کے ذریعے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

## مولانا اعظم طارق کی بھوک ہریتال اور مولانا فضل الرحمن کا مستحسن اقدام

مابنامہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ --- ستمبر ۲۰۰۴ء

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن نے میانوالی جیل میں اسیر کالعدم سپاہ صحابہ کے سربراہ مولانا اعظم طارق سے ملاقات کر کے ان کی ایک ماہ سے زائد عرصہ سے جاری بھوک ہریتال ختم کرادی ہے اور ان کی مسلسل گرفتاری کو فسونا کے قرار دیتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کی رہائی کیلئے متعلقہ حکام سے بات چیت کر رہے ہیں۔

مولانا اعظم طارق کو افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد اس کے خلاف ”دفعہ پاکستان و افغانستان کو نسل“ کی احتجاجی

تحریک میں سرگرم کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا جس کے بعد سے وہ مسلسل زیر حراست ہیں اور متعلقہ عدالتوں سے ان کی صفائحہ ہو جانے بلکہ لاہور ہائیکورٹ کی طرف سے ان کی رہائی کے واضح حکم کے باوجود انہیں رہا کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کر دی تھی۔

مولانا اعظم طارق کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ چونکہ مولانا موصوف حنفی سے قوی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبر رہے ہیں، اور اب بھی وہ ایکشن میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے انہیں ایکشن سے دور رکھنے کیلئے ایک طے شدہ پالیسی کے تحت زیر حراست رکھا جا رہا ہے، اور یہ بات ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ حکومت کی طرف سے آزادانہ اور شفاف انتخابات کے دعووں کے بھی منافی ہے۔

ہم مولانا افضل الرحمن کے اقدام کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انہوں نے خود جیل جا کر مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال ختم رہائی اور انہیں ان کی رہائی کیلئے ہر ممکن تعاون کا لیتھن دلایا۔ مولانا فضل الرحمن صاحب، جمیعت علماء اسلام کے دیگر قائدین بلکہ متعدد مجلسِ عمل کے رہنماؤں سے ہماری درخواست ہے کہ مولانا اعظم طارق اور ان کے علاوہ مولانا محمد مسعود اظہر، پروفیسر حافظ محمد سعید اور دیگر ایسے سینکڑوں گرفتار علماء کرام اور دینی کارکنوں کی رہائی کیلئے سنجیدگی کے ساتھ حکومت سے بات چیت کریں۔ جن کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے برادر اسلامی ملک افغانستان پر امریکہ کے حملہ کے خلاف احتجاج کا جائز حق استعمال کیا اور اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے اپنے مظلوم افغان بھائیوں کا ساتھ دیا۔ ہمیں امید ہے کہ متعدد مجلسِ عمل کی قیادت اس سلسلہ میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی قدم اٹھائے تو ان مظلوم دینی رہنماؤں اور کارکنوں کی رہائی کی صورت نکل سکتی ہے۔

## افغانستان اور عراق کے بارے میں مسلم دنیا کے الگ الگ معیارات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۳ ستمبر ۲۰۰۲ء

ایک سال قبل گیارہ ستمبر کے روز نیویارک کے ولڈ ٹریڈ سٹر اور واشنگٹن کے پینٹاگون پر ہونے والے خودکش حملوں کی یاد مٹائی جا چکی ہے۔ ان حملوں میں ہزاروں افراد جا بحق ہوئے اور اس کارروائی نے پوری دنیا کی سیاست کا رخ تبدیل کر دیا۔ سیاسی و ابتدیوں کے پیانے بدلتے گئے، اخلاق و اقدار کے معیار تبدیل ہو گئے، حقوق و مفادات کی کثیر نے ایک نیا انداز اختیار کر لیا، دنیا کی واحد طاقت ہونے کے نشان سے سرشار امریکہ کیلئے یہ وار ہوش و حواس سے محرومی کا باعث بن گیا، بے بس مظلوموں پر خوفناک قیامت ٹوٹ پڑی، اور تاریخ عالم میں ایک بار پھر عقل و خرد کے ساتھ اصول و شرافت کو بھی پاپاں کر دیا گیا۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو نیویارک اور واشنگٹن پر جو قیامت ٹوٹی تھی اس کی ہوں لانی اپنی جگہ مگر اس کی آڑ میں امریکہ کی خدائی کو تسلیم نہ کرنے والوں پر جو قیامت ٹوٹی ہے وہ ختم ہونے میں نہیں آرہی۔ اس قیامت کے بطن سے

نئی نئی قیامتیں جنم لیتی چلی جا رہی ہیں اور اس سب کچھ کے باوجود "دنیا کے بادشاہ" کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

تبہی کاشکار ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جگہ ایک تقریب منعقد ہوئی ہے جو اس حوالے سے منعقد ہونے والی سب سے بڑی اور سب سے اہم تقریب تھی۔ اس میں ایک سال قبل اس مقام پر جال بھت ہونے والوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت گردی سے نمٹنے کیلئے منع عزم اور پروگرام کا اعلان کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک چھوٹی سی تقریب ہم نے بھی مرکزی جامع مسجد شیر انوالہ باغ گوجرانوالہ میں منعقد کی جو صبح گیارہ سے دو بنجے تک رہی۔ اس میں بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پیٹنٹا گون کے جملوں میں جال بھت ہونے والے بے گناہ شہریوں کی موت پر صدمہ کا اظہار کیا گیا اور ان کے خاندانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اہل علم و دانش کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی کہ وہ گیارہ تبرکے ساختہ میں ہونے والے نقصانات کے ساتھ ساتھ اس کے رد عمل میں بے میں اور نہتے لوگوں پر ڈھانی جانے والی قیامتیں کے نقصانات کا بھی جائزہ لینی اور دانش و انصاف کے حوالے سے فیصلہ کریں کہ دہشت گردی کے اس مقابلہ میں جیت کس پہلوان کی ہوئی ہے؟ اور دہشت گردی کا جواب اس سے بڑی دہشت گردی کے ساتھ دینے والوں نے انسانیت اور تہذیب و تمدن کی کون سی خدمت کی ہے؟

اس مقامی تقریب کی صدارت مولانا قاضی حمید اللہ خان نے کی جبکہ اس سے خطاب کرنے والوں میں جے یو آئی کے مولانا محمد احمد خان، جے یو پی کے مولانا مفتی غلام فرید رضوی، جعیت اہل حدیث کے مولانا محمد عظم، بریلوی مکتب فکر کے مولانا خالد حسن مجددی، ان کے علاوہ مولانا سید عبد المالک شاہ، مولانا ایوب صدر، اور مولانا حافظ گلزار احمد آزاد بھی شامل ہیں۔

رالم الحروف نے اس سینما کے دائی کی حیثیت سے چند گزارشات پیش کیں اور عرض کیا کہ گیارہ تبرک اور اس کے بعد ایک سال کے دوران ہونے والے واقعات پر میرے نزدیک سب سے بہترین تبصرہ اقوام متحده کی کمشنز برائے انسانی حقوق میری رابشن نے کیا ہے۔ یہ خاتون آئرلینڈ کی صدر رہ چکی ہیں اور ابھی حال ہی میں اقوام متحده کی کمشنز برائے انسانی حقوق کے منصب سے سکدوش ہوئی ہیں۔

میری رابشن نے اپنے الوداعی انٹرویو میں کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر دنیا بھر میں انسانی حقوق کو پاہاں کیا جا رہا ہے اور دنیا بھر میں بہت سے ممالک دہشت گردی کے خلاف لڑائی کو شہری اور سیاسی آزادیاں ختم کرنے کیلئے ایک بہانے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد انسانی حقوق کی پالائی کارچان پیدا ہوا ہے اور بعض ملکوں میں اختلاف رائے رکھنے والوں پر دہشت گردی کا ٹھپپے لگاتے ہوئے آزادی اظہار کو کچلا جا رہا ہے۔ لوگوں کو بھی مدت کیلئے زیر حراست رکھا جا رہا ہے، بیش انتظامیہ نے طالبان اور القاعدہ کے سینکڑوں قیدیوں کو گوانشنا موبے (کیوبا) میں کوئی ایزام عائد کیے بغیر بند کر رکھا ہے اور اس نے دنیا بھر میں انسانی حقوق کے معیار میں تنزلی کی مثال قائم کر دی ہے۔

محترمہ میری رابشن کا یہ تجزیہ حقیقت پسند افراد اور گروہوں کیلئے لمجہ فکری ہے جس پر دنیا بھر کے انصاف پسند

لوگوں کو توجہ دینی چاہیے۔ راقم الحروف کی دو سری گزارش ۲۰۰۱ء کے بعد مسلم ممالک کے حکمرانوں کے طرز عمل کے بارے میں تھی کہ ہمارے مسلمان حکمرانوں نے اس ساختہ کے بعد کہا تھا کہ ہم امریکہ کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں اور اس کے سوا ہمارے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ امریکہ نے بھی ان سے دو ٹوک کہہ دیا ہے کہ ہمارا عملی طور پر ساتھ دو ورنہ تمہیں دشمنوں کی صفت میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن آج عراق کے معاملہ میں عرب اور دیگر مسلم حکمران امریکہ کا ساتھ نہ دینے کا اعلان کر رہے ہیں اور عراق کے خلاف امریکی ایڈمات کے ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے مسلم حکمرانوں میں امریکہ کا ساتھ نہ دینے کے اعلان کا حوصلہ اور ایڈمات کا ثبوت طلب کرنے کی جرأت ایک سال قبل کہاں تھی؟ اور صرف ایک سال بعد اس حوصلہ اور جرأت کوئی زندگی کہاں سے مل گئی ہے؟ یہ ثبوت افغانستان کے حوالے سے طلب کیوں نہیں کیے گئے اور وہاں امریکہ سے یہ کہنے کی جرأت کیوں نہیں کی گئی کہ ہم اس جنگ میں تمہارا ساتھ دینے سے قاصر ہیں؟

ہم عام مسلمانوں کے نزدیک تو افغانستان اور عراق دونوں پر امریکی حملہ یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور ہم دونوں ملکوں کے مظلوم عوام کے ساتھ ہیں لیکن مسلم حکمرانوں نے افغانستان اور عراق کیلئے الگ الگ معیار کیے قائم کر لیا ہے اور ان کی مجبوری و بے بُسی ایک سال گزرنے سے بھی پہلے امریکہ سے ثبوت طلب کرنے اور ساتھ نہ دینے کے اعلان کے حوصلہ میں کیسے تبدیل ہو گئی ہے؟ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مسلم حکمران افغانستان کی اسلامی نظریاتی حکومت سے خود خائف تھے اور انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر یہ حکومت کا میاب ہو گئی تو ان کے ملکوں میں استعمار کے مسلط کردہ نظاموں اور جبر و استھصال کے طریقوں کو کامیاب رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے خود انہوں نے اپنے سرپرست سے کہہ کر افغانستان کی اسلامی نظریاتی حکومت کا دھڑن تختہ کرادیا جبکہ عالم اسلام کی رائے عامہ کے سامنے جواب دیتی سے بچنے کیلئے خود پر مجبوری اور بے بُسی کی مصنوعی چادر تار رکھی ہے۔ ورنہ صرف ایک سال کے دوران افغانستان اور عراق کے حوالے سے مسلم حکومتوں کے موقف اور پالیسی میں اس بنیادی تبدیلی کی اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

سیمینار کے شرکاء اور مقررین نے اس عزم کا اظہار کیا کہ گیراہ مقرر کے ساختہ کی ازاں میں عالم اسلام پر جو یک طرف جنگ مسلط کی گئی ہے اس میں ظلم و جبر اور دہشت و بربریت کا پورے حوصلہ اور صبر کے ساتھ مقابلہ کیا جائے گا۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان ملکوں کے اندر ظلم و جبر اور استھصال کے جو نظام مسلط ہیں اور عالمی سطح پر جبر و استھصال کا جو شکنجه دن بدن سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے انہیں عقیدہ و ایمان اور دین کی قوت کے ساتھ ہی شکست دی جاسکتی ہے۔ اور حذیبة ایمانی ہی ایک ایسی قوت ہے جو وسائل و اساب کی کمی بلکہ فقدر ان کے باوجود بڑی سے بڑی قوت اور طاقت کا سامنا کر سکتی ہے اور اسے شکست دے سکتی ہے۔ اس لیے عالم اسلام اور پاکستان دونوں کی سالمیت اور خود منصاری کا تقاضا ہے کہ دینی قوتوں کو قائم کیا جائے، انہیں مضبوط کیا جائے اور انہیں سیاسی و اخلاقی سپورٹ دی جائے کیونکہ یہی ایک قوت ہے جو دنیا کے اسلام اور پاکستانی قوم کو جبر و استھصال کے شکنجه سے نجات دلا سکتی ہے۔

## "دہشت گردی" کے حوالے سے اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ—اکتوبر ۲۰۰۲ء

### سوالنامہ

اسلام امن و آشنا اور صلح و سلامتی کا مذہب ہے، اس نے انسانی زندگی کی حرمت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے اور اگر کسی مسلمان ملک میں غیر مسلم اقلیت آباد ہو تو اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا پورا الحاظ رکھا گیا ہے، نیز بھی زندگی سے متعلق معاملات میں انہیں اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اس نے نہ صرف ظلم و تعدی سے روکا ہے بلکہ ظلم کے جواب میں دوسرے فریق کے بارے میں حد انصاف سے مجاوز ہو جانے کو ناپسند کیا ہے اور انتقام کیلئے بھی مہذب اور عادلانہ اصول و قواعد مقرر کیے ہیں۔ لیکن قدمتی سے زیادہ تر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی نیت سے اور کسی قدر غلط فہمیوں کی بنا پر اس وقت عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا ہے اور اس جھوٹ کو اس قدر دہرا لیا گیا ہے کہ اب ایک طبقہ اسلام اور دہشت گردی کو مترادف سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں علماء، فقہاء اور ارباب افتاء کی ذمہ داری ہے کہ دہشت گردی کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کو واضح کریں اور اسلام نے امن، صلح، عدل، مذہبی رواداری اور غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کی جوہدایات دی ہیں، ان کو واضح کریں تاکہ لوگوں کے سامنے اسلام کی حقیقی اور سچی تصوری آسکے۔ اس پس منظر میں درج ذیل سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں:

1. اسلامی نقطہ نظر سے "دہشت گردی" کی تعریف اور حقیقت کیا ہے؟
2. یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات حکومتوں اپنے ملک میں بننے والے تمام طبقات کے ساتھ عدل و مساوات کا سلوک نہیں کرتیں بلکہ بعض طبقات کے ساتھ سیاسی و معاشری نا انصافی روا رکھی جاتی ہے اور کبھی تو ان کے جان و مال کے تحفظ میں بھی دانستہ کوتاہی سے کام لیا جاتا ہے یا سرکاری سطح پر ایسی تدبیریں کی جاتی ہیں کہ وہ طبقہ جانی و مالی نقصان سے دوچار ہو۔ تو کیا حکومتوں کے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ رویے پر بھی دہشت گردی کا اطلاق ہو گا؟

3. اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ نا انصافی روا رکھی جاتی ہے تو اس پر احتجاج اور رد عمل کا اٹھا جائز ہے یا وجہ؟ اس پر روشنی ڈالنے ہوئے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ کیا مظلوم کا ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی

- دہشت گردی کے دائرے میں آتا ہے؟
4. اگر ایک طبقہ کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو جس میں اس طبقہ کے کچھ افراد شریک ہوں تو کیا مظلوموں کو ظلم کرنے والے گروہ کے ان لوگوں سے بدلہ لینا جائز ہے جو بے قصور ہوں اور جو خود اس ظلم میں شامل نہ ہوں؟
5. مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟
6. جہاں بھی دہشت گردی پیدا ہوتی ہے، وہاں اس کے کچھ بنیادی اباب و محکمات ہوتے ہیں، جیسے کسی گروہ کے ساتھ معاشی یا سیاسی نا انصافی، یا کسی گروہ کے اندر رفاقت و قوت کے ذریعے حکومت اور معاشی وسائل پر تسلط حاصل کر لینے کی خواہش۔ ان اسباب کے تدارک کیلئے اسلام کیا بدایات دیتا ہے؟
7. اگر کسی گروہ یا فرد کی جان و مال یا عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ حتیٰ القدر مدافعت واجب ہے، مباح ہے یا مستحب؟ نیز حق مدافعت کے حدود کیا ہیں؟

## جواب

نحمدہ تبارک و تعالیٰ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ جمعین۔

اسلام بلاشبہ صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا دین ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور ایمان کا ایک معنی یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کے شرے لوگ حفظور ہیں اور مومن وہ ہے جسے دوسرے لوگ اپنی جان و مال پر امین سمجھیں اور انہیں اپنی جان و مال اور آبرو کے حوالے سے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام اعتماد و توازن کا دین ہے جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کا راستہ بھی بتاتا ہے اور اس کی تلقین کرتا ہے۔ ظلم و تعدی اور جبر و نا انصافی انسانی سوسائٹی کے لوازم میں سے ہے جو نسل انسانی کے آغاز سے جاری ہے اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اس لیے ایک جامع اور مکمل ضابطہ حیات اور نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام ظلم و تعدی کو روکنے اور جبر و نا انصافی کے سدباب کیلئے بھی ایک مستقل فلسفہ و نظام رکھتا ہے جس کی تفصیلات قرآن و حدیث اور فتنہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ہر دور میں اس زمانے کے مقضیات اور احوال کی روشنی میں فقهاء امت اس فلسفہ و نظام کی احکام و قواعد کی شکل میں وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔

خلافت راشدہ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے خاتمه (۱۹۴۲ء) تک چونکہ اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی سطح پر تسلیل کے ساتھ موجود رہا ہے اس لیے ہر دور میں نئے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کا حل بھی ساتھ ساتھ سامنے آتا رہا ہے جس میں قضاء کے اجتہادی فیصلوں کے علاوہ ارباب علم اور اصحاب استنباط کی آزادانہ اجتہادی کاؤشیں بھی شامل ہیں اور انسانی سوسائٹی کے حالات میں تغیر کے ساتھ ساتھ اجتہادی دائرة میں ضرورت کے

مطابق شرعی احکام و قوانین میں ضروری تغیر و تبدل کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے البتہ خلافت کے زوال و ادبار کے دور میں بد قسمی سے اجتماعی زندگی کے مسائل و ضروریات کی طرف اہل علم و دانش کی توجہ کم ہوئی گئی اور بیرونی افکار و نظریات اور فلسفہ و تہذیب کے مسلم معاشرے میں فوج کے باعث اور اس سے پیدا ہونے والی آزاد روی کی وجہ سے ارباب فقہ و استنباط تحفظات کا شکار ہو کر ”جود“ پر قناعت میں عافیت محسوس کرنے لگے تو جدید پیش آمدہ مسائل اور فکری و علمی چیلنجز کے حوالے سے استنباط اور اجتہاد کا وہ تسلسل قائم نہ رہ سکا جو تجزیٰ سے آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی رفتار کا ساتھ دے سکتا اور اگرچہ بہت سے علمی اداروں اور شخصیات نے اس خلا کو پر کرنے کی اپنے طور پر کوشش کی لیکن تفییزی اور اجتماعی اجتہاد و استنباط کے فقاد ان اور شخصیات و مرکز کے انفرادی اجتہاد و استنباط میں فطری اختلاف کے باعث وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو اس اجتہاد و استنباط کا اصل مقصد و ہدف تھے اور باہمی ربط و مفہومت کا کوئی سُسٹم موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ نظری و فکری خلفشار کا عنوان بن گئے۔

خلافت غنائیہ کے خاتمے اور اقوامِ متحدة کے تحت اس کے منشور کے حوالے سے منعِ عالمی نظام کے آغاز کے بعد دنیا کی صور تحال یکسر تبدیل ہو گئی تھی اور بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ ساتھ ہمارے داخلی اجتماعی نظام کے احکام و قوانین کا بھی ایک بڑا حصہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوئے اجتہاد و استنباط کے ایک بیج اور ہمہ گیر عمل سے گزارے جانے کا مقاضی تھا لیکن عالمی سطح پر ملتِ اسلامیہ کے پاس اس کا کوئی فورم موجود نہیں تھا، مسلم حکومتوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انفرادی طور پر اس عمل کا اہتمام کرنے والے مرکزوں شخصیات پر علاقائی، گروہی اور طبقائی رجحانات کا غلبہ فطری امر ہے اس لیے یہ خالانہ صرف باقی چلا آ رہا ہے بلکہ فطری انداز میں نہ ہونے کی وجہ سے فکری خلفشار اور انتشار کی کیفیت نمایاں نظر آ رہی ہے اور اس وقت ہماری صور تحال یہ ہے کہ:

- ایک طرف عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات مذکور کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور وہ مسلم ممالک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور عالمی سطح پر خلافت کے ایکی خواہاں ہیں۔
- دوسری طرف مغرب کے سیکولر فلسفہ، نظام اور ثقافت کی مسلم ممالک میں ترویج و نفاذ کیلئے اقتصادی، سیاسی اور عسکری بالادستی کے ساتھ، نیز مسلمان کھلانے والی حکومتوں کے تعاون سے پیش رفت جاری ہے۔
- تیسرا طرف کم و بیش تمام مسلم ممالک اقوامِ متحدة کے مجرکی حیثیت سے اور اس کے منشور و قوانین پر دخیل کرنے کے باعث قانونی اور اخلاقی طور پر آج کے عالمی نظام کا حصہ ہیں جس کا بڑا حصہ اپنے مقاصد و اهداف اور قوانین و ضوابط دونوں حوالوں سے اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔
- چوتھی جانب عالم اسلام میں دینی بیداری کے رجحانات، اسلامی تعلیمات کے مرکز، قرآن و سنت کے ساتھ غیر مشروط اور بے چک کمٹھنے کے جذبات اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے عالمی سطح پر احیا کیلئے اسلامی تحریکات کے عزائم مبینہ دہشت گردی کے خلاف اس عالمی جنگ کا برہ راست ہدف ہیں جس کی فوج کشی کا شکار اسی وجہ سے افغانستان بن چکا ہے اور مذکورہ بالاعزائم و جذبات رکھنے والی ہر طبقہ اس جنگ

کی ”ہٹ لسٹ“ میں شامل ہے۔

ان کے علاوہ معروضی حقائق و حالات کا ایک پانچواں دائرہ یہ بھی ہے کہ عالم اسلام کے وسائل خود مسلمانوں کے کثروں میں نہیں ہیں، مسلم ممالک اقتصادی اور معاشری طور پر پربین الاقوامی والیاتی اداروں کے تہہ در تہہ جال میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، مسلم حکومتیں سیاسی، معاشری، عسکری اور انتظامی شعبوں میں کوئی بنیادی فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں ہیں اور دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی مسلم حکومت کے اختیارات و معاملات کے گرد ایک غیر مرئی ”ریلیانس“ موجود ہے جس کو کراس کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔

اس وسیع تناظر میں دہشت گردی کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لینا یقیناً ایک اہم بات ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس جزوی مسئلہ سے پہلے بہت سے اصولی معاملات اہل علم کی توجہات کے مستحق ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل یہ مسئلہ ہے کہ عالم اسلام کو اس منصہ سے نکالنے اور اس کی آزادی و خود مختاری بحال کرنے کیلئے ہمارے ارباب علم و دانش جہد و عمل کا کون ساختا کر جو یہ کرتے ہیں؟ اور وہ ملتِ اسلامیہ کو موجودہ صورتحال پر قناعت کرنے یا اس سے جان چھڑانے کیلئے کچھ کر گزرنے میں سے کون ساراستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں؟ پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دہشت گردی کی اسلامی حیثیت اور اس کے بارے میں شرعی احکام و قوینیں کی وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ اور اس کی اصل غرض کیا ہے؟ اگر تو اس کا مقصد عالم اسلام کی دینی تحریکات کی راہنمائی کرنا ہے اور ان کو یہ بتلانا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی خود مختاری کی بجائی، خلافتِ اسلامیہ کے احیا، عالم اسلام کے وسائل کی بازیابی اور مسلم اقوام و ممالک کے گرد عالمی استعمار کے حصار کو توڑنے کیلئے ان کی جدوجہد کو ان شرعی حدود کا پابند رہنا چاہیے اور انہیں ارباب علم و دانش کی راہنمائی کے دائرے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تو یہ ایک مغاید اور ثابت عمل ہے جس کی ضرورت مسلم ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر اس سارے عمل کی غرض دہشت گردی کے حوالے سے عالمی استعمار کو مطمئن کرنا اور قاعدین و متحفظین کو ان کے قعود و تخلف کیلئے جواز اور اس کے دلائل فراہم کرنا ہے تو اس سے زیادہ قابل نفرین عمل کا موجودہ حالات میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جبکہ تک عالم اسلام کی بعض عسکری تحریکات پر ”دہشت گردی“ کا لیبل چپاں کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ایک اصولی بات ہر شخص کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عمل کے احکام سے رد عمل کے احکام مختلف ہوتے ہیں اور کسی ایکشن پر جن قواعد و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے، اس کے رہی ایکشن پر انہی قواعد و ضوابط کا کلیغاً اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اصول دنیا کے ہر قانونی نظام میں تسلیم شدہ ہے اور قرآن کریم نے بھی سورۃ النساء آیت ۱۲۸ میں اس اصول کو اس حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ کسی شخص کا بری بات کو ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے مگر مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم و زیادتی کو روارکھنے والے خالم کی برائی کو ظاہر کرے۔ گویا جس بات کی ایکشن اور عمل میں شرعاً اجازت نہیں ہے، رہی ایکشن اور رد عمل میں قرآن کریم اس کی اجازت دے رہا ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائی چاہیے کہ کوئی مظلوم رد عمل میں کوئی ایسی بات کر گزرتا ہے جس کی عام حالات میں اجازت نہیں ہے تو اس کی مظلومیت کا

لماطر کھتے ہوئے اس معاملے میں اس سے درگز کر دینا ہی اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔ اس لیے واقعی پس منظر کی تفصیل میں جائے بغیر اصولی طور پر یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی جن تحریکات اور گروپوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، ان کے بارے میں اس بات کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ اگر وہ غلبہ اور اقتدار کے شوق میں ایسا کر رہے ہیں اور حکمرانی کی حرص نے انہیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے تو ان کے دہشت گرد ہونے میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اگر انہیں کسی طرف سے ہونے والے مظالم اور جرنے دہ عمل کے طور پر اس راستے پر ڈالا ہے اور جبر و استبداد کے حصار کو توڑنے میں دیگر کسی متبادل حرہ اور کوشش میں کامیابی کا کوئی امکان نہ دیکھتے ہوئے ”نگ آمد بچگ آمد“ کے مصدقہ وہ ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں تو انہیں اس رعایت سے محروم کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ النسا کی آیت ۱۸ میں مظلوموں کیلئے بیان فرمائی ہے۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہم ان سوالات کی طرف آتے ہیں جو مذکورہ بالا سوال نامہ میں اٹھائے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے دہشت گردی کی تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآن کریم نے سورۃ المائدہ کی آیت ۳۳ میں ”محاربہ“ کا حکم بیان فرمایا ہے، ہمیں اس پر غور کر لینا چاہیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو سزا مکتبت بتایا ہے، ان کے دو صفحے بیان فرمائے ہیں:

- ایک یحربون اللہ و رسولہ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑتے ہیں جس سے مراد ہمارے خیال میں یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے قائم کردہ نظام سے بغاوت کرتے ہیں۔
- دوسرا یسعون فی الارض فسادا کہ وہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں جس کا معنی آج کی معروف زبان میں یہ ہو گا کہ وہ امنِ عامہ کیلئے خطرہ بن جاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں ہمارے ناص فہم کے مطابق جو لوگ کسی جائز اور قانونی سیاست کے خلاف ناجائز طور پر بغاوت کرتے ہیں اور عام شہریوں کی جان و مال کیلئے بلاوجہ خطرہ بن جاتے ہیں، وہ دہشت گرد کہلائیں گے۔ کسی حکومت کے جائز اور قانونی ہونے کیلئے اس دور کے عرف کو دیکھا جائے گا کہ اس وقت بین الاقوامی تعامل اور عرف کی رو سے کون سی حکومت کو جائز اور قانونی سمجھا جاتا ہے جبکہ بغاوت کے جائز یا ناجائز ہونے میں بھی اسی بین الاقوامی عرف کا اعتبار ہو گا لیکن اس میں ایک بات کو ملحوظ رکھنا ہو گا کہ عرف اور تعامل اور چیز ہے اور کسی مخصوص مسئلہ پر عالمی برادری کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے جس کا تجربہ ہمیں حال ہی میں افغانستان کے حوالے سے ہوا ہے کہ وہاں طالبان کی حکومت نے ملک کے ۹۰ فیصد علاقہ کا کنشوں حاصل کر لیا تھا، دارالحکومت کا مل بھی ان کے کنشوں میں تھا اور ان کے زیر انتظام میں امن کا قیام اور ان کے احکام کی عمل داری بھی تسلیم شدہ ہے۔ آج کے بین الاقوامی عرف میں کسی حکومت کو تسلیم کرنے کیلئے یہ باتیں کافی سمجھی جاتی ہیں بلکہ اس سے کم تراہدافت حاصل کرنے والی حکومتیں بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود عالمی برادری نے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس پر فونکشی کر کے اسے جرأتمن کر دیا۔ اس لیے ہمیں حقیقی عرف و تعامل اور وقتی طرز عمل میں فرق کو ملحوظ رکھنا ہو گا اور اب تو یہ فرق اس تدریجی خواج ہو گیا ہے

اور بڑھتا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی قوانین و ضوابط، اخلاقیات اور عالمی سیاست کی پیشتر اقدار و روایات کا مفہوم و معیار تک بدل کر رہا گیا ہے۔

دوسرے سوال اس حوالے سے ہے کہ کوئی حکومت اپنے ملک کے کسی طبقہ کے ساتھ انصاف نہیں کرتی اور ان کے سیاسی حقوق اور جان و مال تک کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو کیا اس حکومت کے ایسے طرز عمل کو بھی دہشت گردی قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں گزارش ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعیت کے کسی طبقہ کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھتی ہے اور اس محروم رکھنے میں ریاتی جرکا ایسا عضر بھی شامل ہو جاتا ہے جس سے اس طبقہ کے وجود اور اس کے افراد کی جان و مال کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں تو یہ بات یقیناً ریاتی دہشت گردی کہلاتے گی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ ناصلانی روکھی جاتی ہو تو اس پر احتجاج اور رد عمل کی کیا حیثیت ہے؟ اور کیا مظلوم کاظم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی دہشت گردی کہلاتے گا؟

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا دنیا کے ہر قانون میں حق حاصل ہے اور اسلام بھی اسے یہ حق دیتا ہے۔ اب اس حق کی درجہ بندی کہ یہ جائز ہے یا واجب، اس کا انحصار اس وقت کے حالات پر اور مظلوم کی صواب دید پر ہے۔ اسلام میں اس میں دور بے رکھے ہیں: عزیت اور رخصت۔ اگر وہ عزیت پر عمل کرتا ہے اور اپنے حق کیلئے ظالم کے خلاف جدوجہد کرتا ہے تو اس کا حق حاصل ہے اور اگر صبر و تحمل کے ساتھ رخصت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کیلئے اس کا جواز بھی ہے چنانچہ جناب نبی اکرم کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اپنی جان کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی عزت کی حفاظت میں مارا گیا، وہ بھی شہید ہے۔ اس ارشاد نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ رخصت پر عمل کی اجازت ہے، لیکن ترجیح بہر حال عزیت ہی کو حاصل ہے۔

باقی رہی بات ہتھیار اٹھانے کی توفہائے کرام کی تصريحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص اور انفرادی معاملات میں تو قانون کو ہاتھ میں لینے اور ہتھیار اٹھانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے اور ایسا کرنا بغاوت کے زمرے میں آئے گا البتہ اجتماعی معاملات میں

- مسلم حکمران کی طرف سے کفریوں کے ارتکاب اور

- مسلم اکثریت پر غیر مسلم اقلیت کا جری اقتدار قائم ہو جانے کی صورت میں

ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہے جو بسا اوقات فرض کا درجہ بھی اختیار کر جاتا ہے جیسا کہ دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور دیگر اکابر علماء کرام نے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا۔

حملہ آور وقت کے خلاف اپنی آزادی اور خود منماری کیلئے ہتھیار اٹھانے کے حق کو دنیا کے ہر قانون میں تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے حریت اور آزادی کی جنگ سے تعمیر کیا جاتا ہے اور اسے دہشت گردی قرار دینا ایسا ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کیلئے بن امریکی حریت پسندوں نے ہتھیار اٹھائے تھے اور اس جنگ میں انہوں نے متعلقہ اور

غیر متعلقة ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، وہ حریت پسند نہیں بلکہ دہشت گرد تھے اور اسی طرح دنیا بھر کی وہ تمام اقوام و ممالک دہشت گرد قرار پائیں گے جنہوں نے غیر ملکی قابضین اور نوابادیاتی حکمرانوں کے خلاف جنگ لڑکر آزادی حاصل کی ہے۔

چو تھا سوال یہ ہے کہ اگر کسی طبقہ کے کچھ افراد نے ظلم کیا ہے تو کیا مظلوموں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس طبقے کے دوسراے افراد کو انتقام کا نشانہ بنائیں جو اس عمل میں شریک نہیں تھے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جہاں تک غیر متعلقة لوگوں کو انتقام کا نشانہ بنانے کا تعلق ہے، اسلام اس کی کسی صورت میں اجازت نہیں دیتا۔ یہ بھی اسی طرح کاظم ہو گا جس کا وہ مظلوم خود نشانہ بن چکے ہیں۔ البتہ ظالموں کے خلاف کارروائی کے دوران کچھ لوگ ناگزیر طور پر زد میں آتے ہوں تو ان کا معاملہ مختلف ہے۔ جناب نبی اکرم نے جہاد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور غیر متعلقة افراد کو قتل کرنے سے صراحتاً منع کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلم شریف کتاب الجہاد میں حضرت صعب بن جحامتؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہؐ ہم ایک جگہ شب خون مارنا چاہتے ہیں مگر وہاں عورتیں اور بچے بھی ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ ہم منہم ”وہ انہی میں سے ہیں“ یعنی اگر وہ شب خون (چھاپے مار کارروائی) کی زد میں ناگزیر طور پر آتے ہیں تو وہ انہی میں شمار ہوں گے اور ان کی وجہ سے کارروائی روکی نہیں جائے گی۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟

اس کے جواب میں ہمارا طالب علمانہ نقطہ نظر یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی مسلم حکومت ایسی نہیں ہے جس پر خاص اسلامی حکومت کا اطلاق کیا جاسکے یا جسے خلافت کا قائم مقام قرار دیا جائے اور اس کے دائرے میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمیوں کا درجہ دینا شرعاً ضروری ہو جبکہ کم و بیش تمام مسلم ممالک اقوام متعدد کے منشور پر دستخط کرنے کے علاوہ اس حوالے سے دیگر بین الاقوامی معابدوں کی پابندی بھی قبول کر چکے ہیں اس لیے جب تک خلافت کا جایا نہیں ہوتا اور خالصتاً اسلامی شرعی حکومت قائم نہیں ہو جاتی، ہم ”یثاق مدینہ“ کی طرز پر بین الاقوامی معابادات کے پابند ہیں اور ہمیں ان پر عمل درآمد کرنا چاہیے الیہ کہ ان میں سے کوئی بات کسی مسلمان ملک کی خود مختاری و سالمیت اور مسلمانوں کے مل مغاد کیلئے صریحاً خطرے کا باعث ہو تو اس میں وہ ملک ضروری تحفظات اختیار کر سکتا ہے۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ دہشت گردی کے ہر جگہ کچھ نہ کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ اسلام ان اسباب کے تدارک کیلئے کیا بدایات دیتا ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ دہشت گردی فی الواقع بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام تو عام معاشرتی جرائم میں بھی مجرم کیلئے سخت سزا میں تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ جرم کے اسباب و عوامل کے تدارک کا حکم دیتا ہے اور ان دو ای کا راستہ روکتا ہے جو کسی شخص کو جرم تک لے جاتے ہیں۔ اسلام کا یہی اصول دہشت گردی کے بارے میں بھی ہے۔ اس پس منظر میں ہمارے نزدیک دہشت گردی کے حوالے سے دو محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مجاز یہ ہے کہ جو عالمی قویں

”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ کا عنوان اختیار کر کے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو نثار گت بنائے ہوئے ہیں، انہیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ جس کو تم دہشت گردی قرار دے رہے ہو، یہ دراصل رد عمل ہے ان مظالم اور جبر و انصافی کا جو ان اقوام و ممالک اور طبقات پر مسلسل روار کئے جا رہے ہیں اور اس رد عمل کو جبر اور تشدد کے ذریعے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں جبر و تشدد سے مزید منافرت بڑھتی ہے اور جذبات میں شدت پیدا ہوتی ہے اس لیے اگر تم دہشت گردی کو ختم کرنے میں سنجیدہ اور مخلص ہو تو تمہیں جبر و تشدد اور عسکری جنگ کا راستہ ترک کر کے مفہومت اور مذاکرات کا راستہ اپنانا ہو گا۔ ظالم اور مظلوم کے فرق کو محسوس کرو، مظلوم کی مظلومیت کو تسلیم کرو، ظالم کو ظالم قرار دو اور مسلمہ اصولوں کی روشنی میں مظلوم اقوام و طبقات کو ظلم و استھان سے نجات دلانے کیلئے سنجیدہ پیش قدی کرو ورنہ تمہاری یہ جنگ دہشت گردی کے خاتمے کیلئے نہیں بلکہ اس کے فروع کیلئے متصور ہو گی اور دہشت گردی کا جواب اس سے بڑی دہشت گردی کے ذریعے دے کر تم خود سب سے بڑے دہشت گرد قرار پاؤ گے۔

دوسری طرف عالم اسلام کی ان عسکری تحریکات سے بھی گنتیگوی ضرورت ہے جو مختلف مجازوں پر مصروف کار ہیں اور جنہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کو کچلنے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ ان تحریکات کی قیادتوں کو دو باقیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہر منٹے کامل ہتھیار نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر جگہ ہتھیار اٹھانا ضروری ہے۔ جہاں کسی مسئلہ کے حل کا کوئی مقابل راستہ موجود ہے، اگرچہ وہ لمبا اور صبر آزمائی کیوں نہ ہو، وہاں ہتھیار سے کام لینا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں شاید شرعاً جائز بھی نہ ہو۔ ہتھیار تو آخری حریب ہے۔ جہاں اور کوئی ذریعہ کام نہ دیتا ہو اور کسی جگہ مسلمانوں کا وجود اور دینی شخصیتی خطرات سے دوچار ہو گیا ہو تو آخری اور اضطراری حالت میں ہتھیار اٹھانے کی گنجائش نکل سکتی ہے اس لیے اضطرار بلکہ ناگزیر اضطرار کے بغیر ہتھیار کو باتھ میں نہ لیا جائے۔

دوسری بات ان سے یہ عرض کرنے کی ہے کہ آزادی، قومی تشخص اور خود مختاری کیلئے اضطرار کی حالت میں قویں ہتھیار اٹھایا کرتی ہیں۔ یہ زندہ قوموں کا شعار ہے اور آزادی کی عسکری تحریکات سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے لیکن غیر متعلقہ لوگوں کو نشانہ بنانا اور بے گناہ لوگوں کا خون بہاناتہ شرعاً جائز ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی اور قانون و ضابطہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان تحریکات کو اس حوالے سے شرعی احکام و قوانین کی پابندی کا ایک بار پھر عہد کرنا چاہیے اور شرعی احکام بھی وہ نہیں جو خود ان کے ذہن میں آجائیں بلکہ وہ قوانین و ضوابط جو امت کے اجتماعی تعامل و توارث کے ساتھ تسلیم شدہ چلے آرہے ہیں اور جنہیں وقت کے اکابر علماء و فقهاء کی طرف سے ضروری قرار دیا جا رہا ہو۔ اس کے بغیر کوئی بھی تحریک اور جدو جہد تمام تر خلوص و جذبہ اور ایثار و قربانی کے باوجود خلفشار پیدا کرنے کا باعث بنے گی اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی ہو گی اس لیے ایسی تحریکات کو کسی بھی ایسی بات سے قطعی طور پر گیر کرنا چاہیے جو:

- معروف اور مسلمہ شرعی اصولوں کے مطابق نہ ہو۔
- جس سے مسلمانوں کی مشکلات میں بلاوجہ اضافہ ہوتا ہو۔
- جو اسلام کیلئے بدنامی کا باعث بن سکتی ہو۔

• اور جس سے خود ان تحریکات کی قوت کار اور دائرہ عمل منتشر ہوتا ہے۔  
ساتوں سوال یہ ہے کہ کسی گروہ یا فرد کی جان و مال اور عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ دفاع واجب ہے یا مستحب؟

اس سلسلے میں اصولی طور پر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے جب اپنی جان، مال، اور آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والے مسلمان کو شہید قرار دیا ہے تو ان تینوں حوالوں سے دفاع کا حق اور اس کی فضیلت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں رہ جاتی البتہ ایک اور بات عرض کرنا بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ جان بچانے کو فقہاء کرام نے فرض قرار دیا ہے اور جہاں جان کے تحفظ کا مسئلہ آجائے، وہاں اضطرار کی حالت میں خنزیر کا گوشہ بقدر ضرورت کھانے کو بھی بعض فقہاء نے فرض بتایا ہے تو اس اصول کی رو سے کسی فرد یا گروہ کیلئے یہ بات بھی فرض ہی کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر اسے اپنے وجود اور جان کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اسے بچانے کیلئے جو صورت دفاع کی ناگزیر ہو، وہ اسے اختیار کرے اور اس دفاع کی حد بھی وہی ہے جو حالت اضطرار کی دیگر صورتوں میں ہے کہ جتنی کارروائی سے جان بچ سکتی ہو، اسی حد تک اجازت ہے، اس سے زیاد کی نہیں۔

## دینی کارکنوں اور علماء کرام سے اپیل

روزنامہ اسلام، مظفر آباد۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۲ء

”پاکستان شریعت کو نسل“ کا انتخابی اور حکومتی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے قیام کے ساتھ واضح کر دیا گیا تھا کہ انتخابی سیاست اور اقتدار کی کشمکش سے الگ تھلگ رہتے ہوئے پاکستان شریعت کو نسل ملک میں

- اسلامی نظام کے نفاذ،
  - دینی قوتوں میں رابطہ و مفاہمت کے فروغ،
  - اور اسلام مخالف لا بیوں اور سرگرمیوں کے تعاقب کیلئے فکری اور علمی محاذ پر کام کرے گی۔
- چنانچہ اسی دائرہ میں رہتے ہوئے کو نسل اپنے وسائل اور استطاعت کے دائرة میں سرگرم عمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ پاکستان شریعت کو نسل کا کوئی بھی رکن یا عہدیدار کسی بھی سیاسی فورم سے انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے اور کسی بھی سیاسی جماعت کی رکنیت اختیار کر سکتا بشرطیکہ وہاں بھی پاکستان شریعت کو نسل کے مذکورہ بالاتین مقاصد کیلئے محنت کرتا رہے۔

موجودہ عالمی اور ملکی حالات کے پیش نظر پاکستان کی اسلامی حیثیت اور ملک کے دینی حلقوں اور مرکز کے مستقبل کے حوالے سے ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات انتہائی اہمیت اختیار کر گئے ہیں اس لیے اقتدار کی کشمکش سے قطع نظر ملی، قوی و دینی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان شریعت کو نسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی اور سیکڑی جزل راقم الحروف کی طرف سے حسب ذمیل اپیل جاری کی جا رہی ہے، ملک بھر کے احباب سے گزارش ہے کہ اسے زیادہ سے

زیادہ حضرات تک پہنچانے کی کوشش کریں اور خواص و عوام کو اس موقع پر ان کی دینی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کیلئے بھرپور کردار ادا کریں۔

السلام و علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ  
مکرم!

گزارش ہے کہ وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی عالمی اور ملکی سطح پر اسلام دشمن عناصر کی مکروہ ساز شوں کی زدیں چلا رہا ہے اور اس بات کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے کہ:

1. پاکستان خود مختاری اور آزادی کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو۔

2. پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت مُستحکم نہ ہونے پائے۔

3. پاکستان میں جاگیردارانہ اور نوابادیاتی استھانی نظام کے خاتمہ اور اس کی جگہ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کی جدوجہد میں کوئی عملی پیشرفت نہ ہو سکے۔

4. پاکستان معاشری اور عسکری طور پر خود مختار اور بادشاہی حیثیت نہ حاصل کر سکے۔

5. پاکستان کی دینی قوتوں میں خلقشار کی فضاقائم رہے اور وہ پاکستانی قوم کی قیادت کیلئے اجتماعی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہیں۔

6. پاکستان میں فاشی اور عربیانی پر مشتمل مغربی اور ہندوکشیر کے اثرات کو وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے۔

7. پاکستان میں دینی ادارے مرکزاً اور شخصیات کی کردار کشی کر کے عوام کو ان سے دور رکھا جائے۔

8. ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے والے پاکستان سے عالم اسلام بالخصوص ملتِ اسلامیہ کے دینی علقوں نے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں ان کی تکمیل کی کوئی عملی صورت پیدا نہ ہو۔

9. نئی نسل کو ہر قیمت پر دین اور دینی اثرات سے دور رکھا جائے، اور

10. بالآخر پاکستان کو ترکی کی طرح ایک سیکولر ریاست اور معاشرہ کا درجہ دے دیا جائے۔

گذشتہ سال ۲۰۲۱ ستمبر کے سانحات کی آڑ میں افغانستان پر امریکی اتحاد کے محلے اور دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور جہادی قوتوں کے خلاف منقی پروپیگنڈے اور اقدامات کے ساتھ اس مہم کو مزید تیز کر دیا گیا ہے اور عالمی استعمار اپنے مقامی معاونین کے تعاون سے پاکستان کو سیکولر ملک کی حیثیت دینے کے ابجٹے پر تیز فتاویٰ کے ساتھ اپنے کام کو آگے بڑھا رہا ہے۔

ان حالات میں ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ہونے والے عام انتخابات انتہائی اہم حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور

- پاکستان کی اسلامی حیثیت کے حفاظ

- وطن عزیز کی خود مختاری اور قومی آزادی کی بحالی

• اور دینی مرکز کے معاشری کردار

کے حوالے سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ملک کا ہر ووٹر اپنی ترجیحات کا از سرنو جائزہ لے اور برادری ازم، دھڑے بندی اور سیاسی والستگیوں سے بالاتر ہو کر اس ایکشن میں ایسے افراد کو سامنے لانے کیلئے کردار ادا کرے جو دینی سوچ، نظریاتی کردار اور ملیٰ حمیت و غیرت کے حامل ہوں۔ کیونکہ ایسے حضرات ہی موجود بھر جان سے ملک و قوم کو با وقار طور پر نکال کر خود مختاری، آزادی اور اسلامی تشخیص کی شاہراہ پر گامزن کر سکتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ اس موقع پر بھی دینی تقاضوں اور ملیٰ ضروریات کو قبیلہ، برادری، لوکل دھڑے بندی اور سیاسی والستگیوں پر قربان کر دیا گیا تو پاکستان کے گرد استعماری نظام کا شکنجہ سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور ملک و قوم کی رہی سی آزادی بھی ختم ہو کرہ جائے گی۔

یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ ملک کی دینی جماعتیں ”تحمدہ مجلس عمل“ کے نام سے متحد ہو کر ان انتخابات میں قوم کے سامنے آئیں اور تمام دینی مکاتب فکر نے اجتماعی دینی قیادت کی علمی شکل ملت کے سامنے پیش کر دی ہے جس سے یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اس قیادت کو پاکستان کے عوام نے ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں آگے آنے کا موقع فراہم کیا تو وطن عزیز کو عالمی استعمار کے مفادات اور سازشوں کی دلدل سے نکالنے، نوابادیاتی استحصالی نظام کے خاتمه، اسلامی نظام کے نفاذ اور قومی خود مختاری کی بحالی کی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس لیے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام، دینی کارکنوں اور غیور مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے ایکشن کو ”ٹیکسٹ کیس“ سمجھتے ہوئے اس میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کی کامیابی کیلئے متحرک ہو جائیں اور صرف دوٹ دینے پر اتفاق کرنے کے بجائے اپنے حلقوں اثر میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کیلئے کام کریں اور انہیں کامیاب بنانے کیلئے مقامی حالات کی روشنی میں جو عملی کردار بھی ادا کر سکتے ہوں اس سے گریزناہ کریں۔

”تحمدہ مجلس عمل“ سے ہٹ کر چند دیگر ہنماوں کے حوالے سے بھی گزارش کرنا ضروری ہے جن میں راولپنڈی سے محترم راجہ ظفر الحق، کوہاٹ سے حاجی جاوید ابراءیم پر اچھے اور جنگ سے مولانا عظم طارق بطریق خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات اگرچہ متحدہ مجلس عمل کی طرف سے امیدوار نہیں ہیں لیکن اپنے نظریاتی کردار اور خدمات کے تسلسل میں بھرپور اعتماد کے حامل ہیں اور یہ جس فورم سے بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں بنجپنچے، ان شاء اللہ تعالیٰ حق کی آواز بلند کریں گے اور حق کا ہی ساتھ دیں گے۔ اس لیے ملک بھر میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کو کامیاب بنانے اور ان کیلئے بھرپور محنت کرنے کی اپیل کے ساتھ ساتھ ان تین حضرات کے حلقوں سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اور دینی کارکنوں سے بطور خاص گزارش ہے کہ وہ ان کی کامیابی کیلئے ہر ممکن محنت کریں اور ان سے بھرپور تعاون فرمائیں۔

## مغربی عوام اور حکمران ہم آہنگ نہیں

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء

----

۲۸ ستمبر ۲۰۰۲ء کو لندن میں عراق پر متوجہ امریکی حملے کے خلاف عوامی مظاہرہ تھا۔ گذشتہ سال انہی دنوں میں افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف لندن میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا تھا جس میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا۔ مغربی ممالک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان کے حوالے سے امریکہ اور برطانیہ کی قیادت میں قائم عالمی اتحاد کے عزائم کو ان کے اصل پس منظر میں سمجھتے ہیں اور اسے سراسر ظلم قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف آواز بھی باند کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ برطانیہ میں عوامی سٹھ پر تین باتوں پر غصے کا سر عام اظہار ہو رہا ہے:

1. ایک تو اسرائیل کی دہشت گردی اور امریکہ کی طرف سے اس کی مسلسل پشت پناہی کا منظر یہاں کے عوام کے ذہنوں میں دن بدن اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔

2. دوسرا وہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ جنگ صرف اور صرف تیل کے چشمتوں پر قبضہ جمانے کیلئے ہے۔

3. اور تیسرا نمبر پر افغان، کشمیری، عراقی اور فلسطینی عوام کی مظلومیت کا احساس بھی عالمی میڈیا کے یک طرف

پر و پیگٹنے کے باوجود اضافہ پذیر ہے۔

گذشتہ سال اس حوالے سے لندن اور گلاسگو میں ہونے والے عوامی مظاہروں میں شریک ہو کر میری اس رائے کو تقویت حاصل ہوئی کہ حالیہ عالمی کمپنیز میں ہمیں مغربی ممالک و اقوام کو اقوام و ممالک کے طور پر اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ جس طرح مسلم ممالک میں حکومتوں کے اہداف عوام کے جذبات سے مختلف ہیں، اسی طرح مغربی ممالک میں بھی حکومتوں اور بالادست قوتوں کے اہداف و عزائم کا عوام کے اہداف و احساسات سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ان دونوں میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے ارباب فکر و دانش مغرب کی رائے عامہ سے اس کی نسبیت اور ذہنی سٹھ کے مطابق برادری راست مخاطب ہو کر اس کے سامنے لپنا مقدمہ صحیح طور پر پیش کر سکیں تو ممکن یا، رائے عامہ، بیریفگ اور لاہنگ کے مغربی ہتھیاروں کو مغرب کی بالادست قوتوں کے اسلام دشمن عزائم کے خلاف استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔

”ورلڈ اسلام فورم“ گذشتہ دس سال سے ارباب علم و دانش کو اسی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن بدشیتی سے ایک محدود حلقہ کے سوا ہم اس ضرورت کا احساس عام کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ حالانکہ نہ صرف مسلمانوں کی مشکلات اور عالم اسلام کے مسائل کے حوالے سے بلکہ اسلام کی دعوت اور اسلامی تعلیمات کے فروع کے سلسلے میں بھی یہ صورت حال واضح ہے، مگر کام کا ایک وسیع میدان سامنے موجود ہونے کے باوجود مسلم ادارے اور تنظیمیں اس کے نائزیر تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہیں یا ان کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔

چند سال قبل برطانیہ کے ایک معروف ادارہ اسلام فاؤنڈیشن لیسٹر میں، جو جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر مختار پر ویسٹر خور شید احمد کی سر برائی میں کام کر رہا ہے، ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی پارلیمنٹ کے رکن جم مارشل نے کہا تھا کہ ہمارے سامنے اسلام کی مختلف تصویریں ہیں جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں:

• اسلام کا جو نقشہ ہمارے بڑوں نے ہمیں بتا رکھا ہے وہ اور ہے،

- جو اسلام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ اس سے قطعی خلاف ہے،
  - اور جس اسلام کا مشاہدہ ہم اپنے اردو گردہ ہنے والے مسلمانوں کی عملی زندگی میں کر رہے ہیں، وہ ان دونوں سے الگ ہے۔
- جمارشل کا کہنا تھا کہ یہ ”کیو نیکیشن گپ“ ہے جسے دور کر دیا جائے تو یہاں کے لوگ اسلام کی بات سننے کیلئے تیار ہیں۔

یوسف اسلام یہاں کے معروف مسلم ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں میں تعلیمی مجاز پر گران قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک موقع پر مغربی ممالک میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور مسلمانوں کے مسائل کی تربیتی کیلئے مسلم ممالک سے آنے والے علماء کرام اور دانشوروں کے بارے میں کہا کہ آپ لوگوں کاالمیہ یہ ہے کہ جن کے پاس علم ہے ان کے پاس زبان نہیں ہے، اور جو یہاں کی زبان اور اسلوب کے مطابق بات کہنے کی اہلیت رکھتے ہیں ان کے پاس مطلوبہ علم نہیں ہے۔ اس لیے آپ پہلے اس مسئلہ کا حل نکالیں، اس کے بعد آپ یہاں کے معاشرے کو اپنی بات صحیح طور پر پہنچا سکیں گے۔

چند سال قبل ولڈ اسلام فورم کے سینکڑی جزل مولانا ضاء الحق سیاحوی کے ہمراہ مجھے پوچھ کے ایک بڑے پادری صاحب سے ملاقات کا موقع ملا اور ان سے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ جن میں انسانی معاشرہ میں بڑھتی ہوئی دلی بے چینی، فکری انتشار اور اس کے ساتھ ہے جیاں، بد کاری، حرام خوری اور خدائی احکامات سے بغاوت کے تیزی سے پھیلتے ہوئے رجحانات بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ہم دونوں کی تشویش و اضطراب کی نوعیت کیساں تھیں لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس صورتحال کا آپ کے پاس کیا حل ہے تو انہوں نے کسی تکلف اور ذہنی تحفظ کے بغیر بے ساختہ کہہ دیا کہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے اور ہم تو اس کیلئے آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی معاشرہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور عالم اسلام کی مشکلات و مسائل، دونوں حوالوں سے بات کہنے اور باضمیر لوگوں کو توجہ دلانے کی گنجائش موجود ہے اور بات سننے والوں کی کمی نہیں ہے۔ البتہ اس کیلئے یہاں کی زبان، اسلوب، نفیسیات اور عوای مزاج کو سمجھنے اور اس کے مطابق بات کرنے کی ضرورت ہے جس کا ہمارے ہاں سرے سے فقدان ہے، اور اسی وجہ سے مغربی ممالک میں دعوتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ہر طرف دکھائی دینے باوجود دنیوں مسلم معاشرہ میں اس کے خاطر خواہ اثرات نظر نہیں آرہے۔

## حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۴ء و ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۶ء

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے اور میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفر ردامت بر کا ہم کے

دورہ حدیث کے ساتھی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے کچھی کو اپنی علمی و دینی جوانان گاہ بنایا اور بہت جلد ملک کے بڑے مفتیان کرام میں ان کا شمار ہونے لگا۔ وہ بلند پایہ مفتی تھے، اپنے معاصر مفتیان کرام سے بعض مسائل میں علمی بنیاد پر اختلاف بھی رکھتے تھے جیسا کہ ہر علم اور مفتی کا حق ہے، ان کے کچھ تفادات بھی تھے جو علمی حلقوں میں موضوع بحث بنے رہتے تھے، لیکن ان کا علمی مقام اور ترقیت ہمیشہ علمی حلقوں میں مسلم رہی اور ان کی علمی تحقیقات کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہوئے اہل علم ان سے مسلسل استفادہ کرتے تھے۔ مگر مجھے ان کی جس ادائے سب سے زیادہ ممتاز کیا وہ ان کا ذوقِ تربیت تھا اور اس کے ساتھ خدمتِ خلق کے جذبے کو عام کرنے کا اسلوب جس نے انہیں اپنے معاصر علماء کرام میں ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت عطا کر دی تھی۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی کے ساتھ میری عقیدت دو حوالوں سے ہے:

- ایک حوالہ تو مشترک ہے کہ وہ ہمارے ملک کے نامور مفتیان کرام میں سے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا سید محمد یوسف بنوری کے ساتھ ایک دور میں ایسے مفتیان کرام میں تیسرے اہم مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی کا سامنے آتا تھا، جن سے مسائل معلوم کرنے کیلئے عامۃ الناس کی ایک بڑی تعداد تو رجوع کرتی تھی تھی مگر ان بزرگوں کو ملک بھر کے علماء کرام میں بھی مراجع کی حیثیت حاصل تھی کہ علماء کرام اور مفتیان کرام اپنی الحجنوں اور علمی اشکالات کو دور کرنے کیلئے انہی سے رجوع کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔
- جبکہ دوسرا حوالہ یہ ہے کہ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفردار مت بر کا ہم اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی دورہ حدیث کے ساتھی تھے اور دونوں نے غالباً سن ۱۹۳۲ء / ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد فی اور دیگر اہم ائمۃ کے سامنے زانوئے تلمذ تھے کہ کچھ سند فراغت حاصل کی تھی۔

حضرت مفتی صاحبِ فقہ و افتاء کے شعبہ میں بلند پایہ استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر اور تجوہ کار رہ جانی مرتبی بھی تھے اور وہ اپنے تلامذہ کے علمی معیار پر نظر رکھنے کے علاوہ ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا تربیت کا نظام بہت سخت تھا، وہ اپنے مریدی کی دینی یاد نیاوی و جاہمت کا لحاظ رکھ کر بغیر اور اس کی رعایت کرنے کی بجائے تربیت کے قواعد و ضوابط کی پابندی پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اسی طرح کی جملک حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی کے نظام تربیت میں بھی نظر آتی تھی۔

مفتی صاحب مرحوم نے جس حرأت و حوصلہ کے ساتھ جہاد افغانستان کو سپورٹ کیا، مجاہدین کی سرپرستی اور پشت پناہی کی، طالبان کی اسلامی حکومت کی حمایت کیا اور داد کا اہتمام کیا اور علماء اور دینی حلقوں کو جتنی کی حمایت کی محتاج تھی مسالل محنت کی، اس نے خیر القرون کے مجاہد علماء کرام کی یاد تازہ کر دی۔ اور ان کے قائم کردہ "الرشید ٹرست" نے رفاهی میدان میں نمایاں کارنائے سرانجام دیے۔ ہمارے دینی حلقوں میں دینی مدارس کی محنت اگرچہ خود ایک بہت بڑی سماجی اور تعلیمی خدمت کا درجہ رکھتی ہے، جس کا اعتراف صدر جزل پوری مشرف نے اپنی نشری تقریر

میں ان الفاظ کے ساتھ کیا تھا کہ یہ دینی مدارس سب سے بڑی این جی اور ہیں جو لاکھوں طلبہ کو نہ صرف مفت تعلیم فراہم کرتے ہیں بلکہ لاکھوں نادار افراد کو رہائش، خوراک اور علاج معا الجہ کی سہولتیں بھی مہیا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تعلیم سے ہٹ کر دوسرا شعبوں میں سماجی خدمات کا دینی حقوق میں جو خلاف انتہا جو غیر ملکی این جی اور زمین کے سماجی خدمات کے نیٹ ورک اور خاص طور پر پاکستان میں مسیحی مشربیوں کی سماجی سرگرمیوں کے پس منظر میں بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس خلا کو پر کرنے کی خدمت حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی سے لی اور مفتی صاحب نے الرشید ٹرسٹ کے ذریعے سماجی خدمات کے ان تمام شعبوں کی طرف اصحاب خیر کی توجہ دلانی جن کا تنزکہ امام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جانب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی خدمات کے حوالے سے بخاری شریف کی روایت میں کیا ہے۔

مجھے گذشتہ دونوں اندرن جاتے ہوئے کرباچی میں ایک دن رکنے کا موقع ملا اور جامعہ انوار القرآن آدم ناؤن نار تھے کرباچی میں بخاری شریف کے اختتام کی سالانہ تقریب میں شرکت کے علاوہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی کے قائم کردہ اداروں میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔۔۔۔۔ سب سے زیادہ مسٹر الرشید ٹرسٹ سے متعلق بیان بیک دیکھ کر ہوئی جس کا حال ہی میں افتتاح ہوا ہے اور جس میں خون کے حصوں، ٹیسٹ، حفاظت اور نادار افراد کو اس کی صحیح حالت میں مفت فراہمی کا نظم و نقش دیکھ کر حضرت مفتی صاحب گیلیے بے ساختہ دل کی گہرائیوں سے دعائیں لکھیں۔ میں نے مغربی ممالک کے جدید ترین ہسپتال دیکھے ہیں لیکن جدید ترین مشینری، مہارت اور کارکردگی کے لحاظ سے مجھے ان کے مقابلہ میں اس بیک دیکھ میں کوئی کمی دکھائی نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب گونجت الغردوں میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ملک کے دیگر دینی اداروں اور شخصیات کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

## انتخابات میں متعدد مجلسِ عمل کی کامیابی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۲ء

عام انتخابات کے نتائج نے ایک دنیا کو حیران و شذرکر دیا ہے اور ان کے بارے میں سب کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ خود میر الاندازہ یہ تھا بلکہ برطانیہ آمد کے بعد اکثر دوست مجھ سے پوچھتے رہے تو میں ان سے بھی کہتا تھا کہ متعدد مجلسِ عمل میں کے لگ بھگ سیٹیں قومی اسمبلی میں حاصل کر پائے گی، اور اگر اسمبلی میں مجلسِ عمل کی قیادت اسی طرح اکٹھی رہی جس طرح اس ایکشن کمپین میں اس نے یہ گھنی کا اغہار کیا ہے اور اگلے انتخابات تک یہ اتحاد قائم رہا تو مجلسِ عمل کے ملک گیر سطح پر ایکشن جیتنے کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔ اگلے انتخابات کے بارے میں تو میر الاندازہ اب بھی بھی ہے کہ:

- اگر پارلیمنٹ کے اندر مجلسِ عمل نے ٹیم ورک کا ماحول پیدا کر لیا،
- اقتدار میں شامل ہونے کی بجائے اپوزیشن میں بیٹھ کر عوامی جذبات کی بے لائگ ترجیحی کی،
- عوام کے حقیقی مسائل اور قومی خود مختاری کی بحاجی کو اپنے ایجادنے میں اولیت دی،

• اور پالینٹ سے باہر بھی مجلس عمل میں شامل جماعتوں نے عوامی سطح پر اپنے اتحاد و اشتراک کا مظاہرہ مسلسل جاری رکھا

تو الجزا کے اسلامک سالویشن فرنٹ کی طرح پاکستان میں دینی جماعتوں کی متحده مجلس عمل بھی اگلے عام انتخابات میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن حالیہ انتخابات کے نتائج خود میرے لیے بھی خونگوار حیرت کا باعث بنے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میں گوجرانوالہ شہر اور کراچی کے ایک آدھ پروگرام کے سوا اس انتخابی مہم کو خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا اور اپنے سابقہ تجربہ کے ساتھ ساتھ اخبارات کی خبریں اور تجزیے ہی میری معلومات کا بڑا ذریعہ رہی ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، بہر حال مجھے انتخابات میں ان نتائج کی توقع نہیں تھی اور دس اکتوبر کی شام کو جوں جوں انتخابی نتائج کی تفصیلات معلوم ہوتی گئیں میری حیرت اور تعجب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے تعجب اور حیرت میں افسوس، حسرت اور غصہ کا عصر شاہ لکھاں تھا لیکن دنیا بھر کے دینی کارکنوں کی طرح میرے تعجب اور حیرت میں خوشی اور نشکر کے جذبات موجز ہے۔

میں دس اکتوبر کی شام کراوی (برطانیہ) میں مولانا قاری عبدالرشید رحمانی کے ہاں تھا جو اتنا ذلاستہ حضرت مولانا رسول خان ہزارویؒ کے پوتے ہیں اور کراوی کی جامع مسجد میں خطیب و امام ہیں۔ جمعیت علماء برطانیہ کے قاری محمد ہاشم بھی وہیں تھے جو اپنے موبائل فون پر مسلسل معلومات حاصل کر رہے تھے اور مجھے آگاہ کرتے جاتے تھے۔ ان کی خوشی قابل دید تھی اور میری خوشی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا حتی کہ رات گئے برگھم سے مولانا قاری تصور الحق نے مجھے بطر خاص فون کر کے اطلاع دی کہ میرے شہر گوجرانوالہ سے متحده مجلس عمل کے امیدوار مولانا قاضی حمید اللہ خان نے بھی قومی اسمبلی کی سیٹ جیت لی ہے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

متحده مجلس عمل کی یہ شاندار کامیابی کہ اس نے قومی اسمبلی میں تیسرا بڑی سیاسی قوت کی پوزیشن حاصل کر لی ہے، عام طور پر اس کے دو بڑے سبب بیان کیے جا رہے ہیں:

1. ایک یہ کہ افغانستان پر امریکہ کے وحشیانہ حملہ اور طالبان کی مظلوم و مقصوم حکومت کی تباہی پر پاکستان کے عوام بالخصوص صوبہ سرحد و بلوچستان کے غیور مسلمانوں کو اپنے غصے کے اظہار کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے انہوں نے اس ایکشن میں طالبان کی سپورٹر جماعت کو ووٹ دے کر اس غصہ کا عملہ اظہار کیا ہے۔
2. اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مختلف مکاتب فکر کی دینی جماعتوں نے کسی اور سیاسی اتحاد میں شامل ہونے کے بجائے خود اپنا سیاسی اتحاد قائم کر کے جدا گانہ تشخیص کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا ہے جس کی پاکستان کے عوام کو خوشی ہوئی ہے اور انہوں نے دینی جماعتوں کو ووٹ دے کر اپنی اس خوشی کا برملا اظہار کیا ہے۔

یہ دونوں باتیں درست ہیں، متحده مجلس عمل کے حق میں اتنی بڑی تعداد میں ووٹ ڈال کر پاکستان کے عوام نے صرف غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ امریکہ اور اس کے حمایتوں کو یہ پیغام بھی دے دیا ہے کہ ڈیزی کمز زکی بارش، اقوام متحده کی

قراردادوں، عالمی برادری کے یک طرف موقف اور ولاد میڈیا کے مسلسل منقی پروپیگنڈے کے باوجود طالبان اور عرب جاہدین کے بارے میں ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ اب بھی رو سی استعمار کے خلاف افغان عوام کے جہاد آزادی کے مظائقِ نتائج کی عملی شکل طالبان ہی کی صورت میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی اور اس کی طرف سے اسرائیل کی پشت پناہی کو ناجائز اور سراسر نا انصافی اور ظلم تصور کرتے ہوئے اس کے خلاف اسمامہ بن لادن اور ان کے رفتاء کی جدوجہد کو جائز اور درست تصور کرتے ہیں۔

خداجانے مغرب کے اربابِ حمل و عقد کو یہ غلط فہمی کہاں سے ہو گئی ہے کہ جبر و تشدد اور یک طرف پروپیگنڈے کے زور سے قوموں کی رائے تبدیل کی جاسکتی ہے اور ان کے جذبات و احساسات کو فتن کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے غیور شہریوں اور خاص طور پر صوبہ سرحد و بلوچستان کے عوام نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا ہے کہ رائے کی تبدیلی کا تعلق طاقت، جبر اور تشدد سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اور صرف دلیل اور منطق کے ذریعے ہی تبدیل ہوتی ہے۔ عبادی دور خلافت میں قرآن کریم کے مخلوق ہونے کے غلط عقیدہ کو منوانے کیلئے جب حکومت کی طرف سے جبر سے کام لیا گیا اور حضرت امام احمد بن حنبل پر ان سے یہ منوانے کیلئے کوڑے بر سائے گئے کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر نہیں بلکہ مخلوق ہے، تو امام احمد بن حنبل نے برستے کوڑوں میں یہ جواب دیا کہ کوئی دلیل پیش کرو تو سننے کیلئے تیار ہوں لیکن کوڑوں کی ضرب اور جسم کے لہو لہاں ہونے کی وجہ سے اپنا عقیدہ اور رائے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں متحده مجلسِ عمل کو ووٹ دینے والے پاکستانی عوام نے بھی اپنے عمل کے ساتھ حضرت امام احمد بن حنبل کے اسی موقف کو ہرایا ہے کہ اقوام متحدة کی یک طرفہ قراردادوں، عالمی میڈیا کے معاندانہ پروپیگنڈا، طاقت کے استعمال کی دلکشی کے ذریعے قائم ہونے والے عالمی اتحاد کے فیصلوں، اور ڈیزی کٹریکی بارش سے ہزاروں انسانوں کے جسموں کے پرچے اڑاکر کسی کو دہشت گرد اور انہا پسند ثابت نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی باشمیر لوگ عقیدہ اور رائے کے بارے میں ان ”دلیلوں“ کو منانے کیلئے تیار ہیں۔

اس لیے متحده مجلسِ عمل کے قائدین مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا فضل الرحمن، مولانا سعیج الحق، قاضی حسین احمد، پروفیسر ساجد میر اور علامہ ساجد نقوی کو اس شاندار کامیابی پر مبارکباد دینے ہوئے میں متحده مجلسِ عمل کو ووٹ دینے والے غیور پاکستانیوں کو سلام عقیدت پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے طاقت اور جرم کی دلیل کا ایک بار پھر مسترد کر دیا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان کے عوام جبر و تشدد اور دباو کے حصہ میں بھی حق بات کہنے اور حق کی حمایت میں رائے دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ دینی جماعتوں کے متحد ہونے پر اور اپنا جد اگانہ سیاسی شخص قائم کرنے پر پاکستان کے عوام کو خوشی ہوئی تو اس میں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دینی جماعتوں نے موجودہ اتحاد قائم کرنے کے بعد پہلی کامیابی دو ٹریز فارم سے عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ حذف کرنے کے خلاف اپنے احتجاج کی پذیرائی کی صورت میں حاصل کی تھی۔ دوسری کامیابی مدارس دینیہ کے بارے میں حکومتی آڑ بیٹیں کی پسپائی کی شکل میں ان کے حصہ میں آئی، اور اب تیری کامیابی بھی انہوں نے دیکھ لی ہے جو صرف کامیابی نہیں بلکہ آئندہ کئی کامیابیوں کی کلید بھی بن سکتی ہے بشرطیکہ:

- متحده مجلس عمل اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھے،
- پارلیمنٹ کے اندر اور بارہ ٹیم ورک کام احوال پیدا کرے،
- اقتدار کی دوڑ میں شریک ہونے کے بجائے عوامی عذبات کی ترجیح اور عوام کے حقیقی سائل کی نشاندہی کے کردار کو ترجیح دے،
- اور اپنی پالیسیاں اور ترجیحات طے کرتے ہوئے ان مجاہدین اور شہداء کو بھی یاد رکھے جن کے مقدس خون کی برکت سے متحده مجلس عمل کو یہ مقام حاصل ہوا ہے۔

## متحده مجلسِ عمل کی کامیابی اور ذمہ داری

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۲ء

حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں کے مشترکہ محاذ "متحده مجلس عمل" نے خلاف توقع کامیابی حاصل کی ہے اور وہ قومی اسمبلی میں تیسری بڑی سیاسی قوت کی حیثیت مل جانے کے علاوہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اکثریت پارٹی کی پوزیشن سے بھی سہراہ ور ہو گئی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ متحده مجلس عمل کو یہ کامیابی افغانستان کے حوالے سے اس کے جرأتمندانہ موقف اور دینی جماعتوں کے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جانے کی وجہ سے ملی ہے۔

متحده مجلسِ عمل نے ملک کی روایتی سیاسی قوتوں سے الگ تحملگ رہتے ہوئے جدا گانہ سیاسی شخص کی بنیاد پر یہ مشترکہ محاذ قائم کیا ہے، اور افغانستان پر امریکی حملہ کی شدید مذمت کے ساتھ پاکستان کے داخلی امور میں امریکہ کی مسلسل اور بے جامد اختلال پر احتیاج کرتے ہوئے پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے تحفظ اور قومی خود مختاری کی بحالی کے عزم کا اظہار کیا ہے، اور اسی نعرہ پر دینی جماعتوں کے اس متحده محاذ کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے جنوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے عوام کے دلی جذبات و احساسات کیا ہیں اور وہ جنوبی ایشیا کے پارے میں امریکی عزم کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

- ہم اس کامیابی پر متحده مجلسِ عمل کے قائدین کو مبارکباد دیتے ہوئے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ کامیابی ان کیلئے ایک عظیم امتحان کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور ان پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے منشور اور انتخابی وعدوں کی تکمیل کیلئے سنجیدگی کے ساتھ محنت کریں،
- باہمی اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے اپنے عمل اور کردار کے ساتھ واضح کر دیں کہ دینی قیادت قوم کی سیاسی قیادت اور نظام حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتی ہے، اور اسلام کے عادل انسانی نظام کو آج کے دور میں اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی صلاحیت سے بہراہ ور ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت متحده مجلسِ عمل کی قیادت اور منتخب ارکان کو اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کی

تو فیض دیں، اور اپنے عمل و کردار کے ساتھ نفاذِ اسلام کی جدوجہد کو کامیابی کی طرف آگے بڑھانے کے موقع اور اسباب مہبیا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## عالیٰ اسلامی تحریکات کی متحده مجلسِ عمل سے وابستہ توقعات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۶ نومبر ۲۰۰۲ء

پاکستان میں حالیہ انتخابات کے نتائج پر دنیا بھر میں جیرت کا اظہار کیا جا رہا ہے وہاں مختلف ممالک کے دینی حلقوں اور اسلامی تحریکات میں توقعات اور امیدوں کی ایک نئی لہر بھی ابھری ہے۔ گذشتہ سال افغانستان پر امریکہ کے حملوں اور پاکستان میں طالبان کی حمایت کرنے والی دینی شخصیات اور کارکنوں کی وسیع پیمائے پر گرفتاریوں کے ساتھ ساتھ جہادی تحریکات کے خلاف کریک ڈاؤن سے مایوسی اور اضطراب کی جو صورت حال پیدا ہو گئی اس پس منظر میں متحده مجلسِ عمل کی انتخابی کامیابی سے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو حوصلہ ملا ہے، مجھے اس سلسلہ میں لندن میں جن شخصیات سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا ان کے تاثرات پیش خدمت ہیں۔

مولانا عقیق الرحمن سننجی کا شمار بھارت کے ممتاز علمی شخصیات میں ہوتا ہے، وہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے فرزند ہیں، ایک مدت سے ماہنامہ افرقان لکھنؤ کے ایڈیٹر ہیں، صاحب فکر و دانش ہیں کافی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں، ان سے ہر سال لندن میں حاضری پر ملاقات کا موقع ملتا ہے، اس دفعہ ملاقات ہوئی تو دریافت کیا کہ انہوں نے ”افرقان“ میں جو تفصیلی مضمون لکھا ہے وہ میری نظر سے گزر ہے یا نہیں؟ یہ مضمون ”افرقان“ کے اداریے کے طور پر وہ قسطوں میں چند ماہ قبل شائع ہوا تھا، میں نے اس کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن دیکھنیں پڑیا تھا، اس میں انہوں نے طالبان کی پالیسیوں اور سیاسی و فکری طرزِ عمل پر نقدانہ نظر ڈالی ہے اور اس حضرت کا اظہار کیا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی صورت میں ایک مثالی اسلامی ریاست و حکومت کا جو خواب دنیا بھر کے مسلمانوں نے دیکھا تھا وہ طالبان قیادت کے خلوص و دیانت اور سادگی و ایثار کے باوجود اس کی بعض مسائل میں غلط حکمت عملی کے باعث بکھر کر رہ گیا ہے۔ میں نے ان کے اس ارشاد کے بعد وہ مضمون دیکھا، مولانا سننجی کا خیال تھا کہ میں ان کے مضمون پر سخت رعد عمل کا اظہار کروں گا مگر میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کے موقف سے نہ صرف یہ کاصولی طور پر اتفاق ہے بلکہ میں ان کے مضمون کو ماہنامہ الشیعہ گو جرانوالہ میں شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔

مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہیں ہے جو طالبان قیادت کو ”معصومیت“ کے مقام پر فائز کر کے ان کی حکمتِ عملی اور پالیسیوں سے اختلاف کو گناہ قرار دیے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اہل علم و دانش کو طالبان حکومت کے پانچ سالہ دور کا پوری تفصیل اور گہرا ای کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے اور خالصتاً علمی اور فکری بنیادوں پر جہاں انہیں کوئی جھول اور غلطی

محسوس ہواں کی صاف طور پر شاندہی کرنی چاہئے، کیونکہ طالبان اگر افغانستان کے اختدار میں دوبارہ آنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کے ذہن میں مستقبل کا کوئی نقشہ ہے تو اصحاب علم و دانش کا یہ بحث و مباحثہ ان کے پیش نظر ہونا چاہئے اور اسے سامنے رکھ کر انہیں اپنی نئی حکمت عملی اور پالپیاس ترتیب دینی چاہئیں۔

البتہ مولانا سنجھی سے میں نے یہ گزارش کی کہ ان کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ ”خواب بکھر گیا ہے“ اور معاملہ ختم ہو گیا ہے کیونکہ ابھی بہت سے مراحل باقی ہیں، ابھی عشق کے اور بھی کئی امتحان انتظار میں ہیں، اور ستاروں سے آگے جہانوں کا سلسلہ ابھی بہت وسیع ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی طالبان نے ایک کروٹ لینی ہے اور جہاد افغانستان میں اسلام کی سر بلندی کے جذبہ کے ساتھ حصہ لینے والے مجاہدین کی نئی صفت بندی ہوئی ہے، اس لیے موجودہ صور تھال کوئی تصور نہ کیا جائے اور اسے محمود غزنوی<sup>۱</sup> کے سومنات پر کئے جانے والے ان سولہ حملوں میں سمجھ لیا جائے جنہیں بعض لوگ ناکام حملے قرار دیتے ہیں لیکن میں انہیں سترہوں اور کامیاب حملے کی تمہید سمجھتا ہوں۔

متحده مجلس عمل کی انتخابی کامیابی پر مولانا سنجھی بہت خوش ہیں البتہ ان کی رائے یہ ہے کہ متحده مجلس عمل کو اپنی تمام تر توجہ صوبہ سرحد کی حکومت پر مبذول رکھنی چاہئے اور وہاں حکومت کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیے جو ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کیلئے بھی کشش کا باعث بن سکے اور آئندہ انتخابات میں متحده مجلس عمل کی ملک گیر کامیابی کا ذریعہ ثابت ہو۔

ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ المسعری سعودی عرب کے ان دانشوروں میں سے ہیں جو امریکی فوجوں کی خلیج میں آمد کے موقع پر شاہ فہد کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کرنے کے جرم میں زیر عتاب ہیں، وہ ریاض یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، اس عرض داشت پر دستخط کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے، کسی طرح جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور یمن کے راستے لندن پہنچ کر سیاسی پناہ لیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے خود میری تلاش میں تھے ایک روز میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور مختلف مسائل پر ان سے تفصیلی بات چیت ہوئی، انہوں نے متحده مجلس عمل کی کامیابی کو اسلامی قوتوں کی ایک اہم پیشہ فرft قرار دیا اور کہا کہ متحده مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان میں امریکی مظالم کے رد عمل میں ملے ہیں اور پاکستان کے غیور مسلمانوں نے اپنے جذبات کا ابھجھے انداز میں اظہار کیا ہے، اب اس ووٹ بینک کو سنبھالنے اور اس میں اضافہ کیلئے ٹھوٹ حکمت عملی کی ضرورت ہے اور متحده مجلس عمل کو اپنے کام کا دائرہ پھیلانے کے بجائے سرحد اور بلوچستان کو سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہیے۔ اگر صوبہ سرحد کی حکومت کی صورت میں ملک کے عوام کو یہ نظر آگیا کہ یہ حکومت سالیقہ حکومتوں سے مختلف ہے اور حکمرانی کی بجائے عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے تو پنجاب اور سندھ کے لوگ بھی آئندہ سوچنے پر مجبور ہوں گے، لیکن اگر دوسرے صوبوں کی حکومتوں کی طرح صوبہ سرحد کی حکومت بھی روایتی ڈگر پر چلتی رہی اور لوگوں کو کوئی نمایاں عملی فرق دکھائی نہ دیا تو متحده مجلس عمل اپنے موجودہ ووٹ بینک کی حفاظت بھی نہیں کر سکے گی۔

ڈاکٹر المسعری نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ صوبہ سرحد میں متحده مجلس عمل کی حکومت کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور اس کیلئے کئی حربے اختیار کرے گی جس میں فنڈی فراہمی میں رکاوٹیں بھی شامل ہیں، اس پر

قابوپا نے کیلئے عوام کو ساتھ ملنا ہو گا اور امداد بآئی کو فروغ دے کر رفاقتی اور سماجی کاموں کا دائرة بڑھانا ہو گا۔ انہوں نے مثال دی کہ الجزاں میں اسلامک سالویشن فرنٹ نے پہلے مرحلہ میں بلدیاتی انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی اور لوکل حکومتیں بنائی تھیں، جنہیں ناکام بنانے کیلئے مرکزی حکومت نے ضروری فذر روک لیے، مگر اسلامک سالویشن فرنٹ نے اس کی پرواہ کئے بغیر عام لوگوں سے رضا کارانہ طور پر خدمات سرانجام دینے کی اپیل کی اور فرنٹ کی قیادت خود بھی خدمت گزاروں میں شامل ہو گئی، مقامی حکومتوں کے ذمہ دار حضرات عام لوگوں کے ساتھ مل کر گلیوں کی صفائی کرتے اور مختلف شعبوں میں رضا کارانہ خدمات سرانجام دیتے جس کے نتیجے میں انہیں مزید عوامی ہمدردی حاصل ہوئی اور قومی انتخابات میں بھی انہوں نے واضح اکثریت حاصل کر لی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک مرحلہ میں ان کی واضح کامیابی کے بعد انتخابات کا دوسرا مرحلہ مغربی ملکوں کے دباؤ پر منسوج کر دیا گیا اور پھر جرکے ذریعے نہ صرف ان کا راستہ روک دیا گی بلکہ الجزاں کو بھی خوناک خانہ جنگی میں دھکیل دیا گیا۔

صوبہ سرحد میں منتخبہ مجلس عمل کی شاندار کامیابی پر مولانا عقیق الرحمن سننجی اور ڈاکٹر محمد المسعودی جیسے ممتاز دانشوروں کے ان خیالات و تاثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے میں ایم ایم اے کی قیادت کو اس کامیابی پر مبارکہ پاپیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ معروف صیاست اور رواتی طریق کارکی رو میں بہنچ کی بجائے اسلامی نظام کے عملی تعارف اور عوامی ہمدردی کے حصول کیلئے اجتہادی اور انقلابی رو یہ اختیار کریں گے تاکہ ان کی یہ کامیابی پاکستان کی قومی صیاست میں دینی حقوق کی مزید پیشرفت کا ذریعہ بنے اور پاکستان کے عوام اسلامی نظام کے حوالے سے اپنے خوابوں کی عملی تعبیر دیکھیں، آمین۔

## متحده مجلس عمل سے ہماری توقعات

ماہنامہ یوٹھ کانسٹیکٹ گوجرانوالہ کے دسمبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک انٹریو یوسے منتخب سوالات

**سوال:** پاکستان کے حالیہ عام انتخابات میں منتخبہ مجلس عمل کی کامیابی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

**جواب:** منتخبہ مجلس عمل کو میرے خیال میں دو وجہ سے عوام میں پذیرائی ملی۔ ایک ان کے اتحاد کی وجہ سے کہ پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ گواہ ہے کہ دینی حلقوں اور مذہبی مکاتب فکر نے جب بھی منتخب ہو کر کسی ملی کا زکیلے قوم کو آواز دی ہے قوم نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ دوسرا وجہ یہ ہے کہ گذشتہ سال امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے اور اپنی کٹھپتلی حکومت مسلط کرنے کیلئے جو قیامت ڈھائی ہے اور بلوچستان کے عوام کو جس شرمناک طریقے سے درندگی اور دہشت گردی کا نشانہ بنایا ہے، پاکستان بالخصوص صوبہ سرحد اور

عاصر کے اس منفی پر اپنیٹلے کا عملی جواب بھی دیا جو اب تک یہ کہتے آرہے تھے کہ پاکستان میں دینی جماعتوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اس سے امریکہ اور اس کے سارے حواریوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے اور نوشتہ دیوار پڑھتے ہوئے اپنی پالیسوں اور طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

سوال: متحده مجلسِ عمل سے آپ قومی سیاست کے حوالے سے کیا توقعات رکھتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں متحده مجلسِ عمل کو مرکز میں اقتدار کی کشمکش میں شریک نہیں ہونا چاہئے تھا اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنی چاہئے تھی۔ اس وقت ملک میں حقیقی جمہوریت اور ۱۹۷۴ء کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ کیلئے سب سے نمایاں اور مضبوط آواز متحده مجلسِ عمل کی ہے، اس آواز کے ساتھ اقتدار اور وزارتوں کی خواہش کی آمیزش نہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ بہر حال پھر بھی غنیمت ہے کہ متحده مجلسِ عمل نے اصولوں پر کسی قسم کی سودے بازی نہ کرنے کا اعلان کیا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ متحده مجلسِ عمل کو اس اصولی موقف پر استقامت اور اس میں سرخوائی سے نوازیں۔ البتہ اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ:

1. وہ مرکز میں اقتدار کے کھیل سے کنارہ کش رہے اور اپوزیشن میں بیٹھ کر عوام کے جذبات کی ترجیحی کرے۔
2. صوبہ سرحد میں متحده مجلسِ عمل کی حکومت عوامی مسائل کے حل کے ساتھ اسلامی طرزِ حکومت کا ایسا نمونہ عملاً پیش کرے جو دوسرے صوبوں کیلئے مشعل راہ ہو، اور اگلے ایکشن میں دوسرے صوبوں کے عوام بھی متحده مجلسِ عمل کو موقع دینے پر مجبور ہو جائیں۔
3. متحده مجلسِ عمل کو یہ ووٹ افغانستان کے مظلوم عوام کے خون کی برکت سے ملے ہیں اور عالمی استعمار کی ڈٹ کر مخالفت کرنے کی وجہ سے ملے ہیں، اس حوالے سے مجلسِ عمل کے موقف اور عملی کردار میں کسی قسم کی کوئی چک نہیں ہوئی چاہئے۔

4. دینی مکاتب فکر کے اتحاد کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے، باہمی ایثار و اعتناد کے ساتھ اس کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی جائے، اور اس بات سے ہر وقت چوکنارہا جائے کہ مخالفین کی طرف سے سب سے زیادہ کوشش بھی ہو گی کہ اس وحدت اور باہمی اعتناد میں کسی نہ کسی طرح دراثیں ڈال دی جائیں۔

5. صوبہ سرحد میں متحده مجلسِ عمل کی حکومت ایک علی کمیشن قائم کرے جو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے ان میں سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی سفارشات کو الگ کرے اور ان کے عملی نفاذ کیلئے طریق کا تجویز کرے۔

6. متحده مجلسِ عمل کے وزراء پر ٹوکول اور پرستیج کے چکروں سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے سادگی، قناعت، اور کفایت شعاری کا نمونہ پیش کریں، اور اپنے عمل کے ساتھ واضح کریں کہ ایک اسلامی حکومت کے وزراء کس طرح کام کرتے ہیں۔

## حضرت عمر کا نظام حکومت اور جناب اسفندیار ولی

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۲ دسمبر ۲۰۰۲ء

آن لائن کی ایک رپورٹ کے مطابق عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ اسفندیار خان ولی نے عید الفطر کے موقع پر چار سدھ کی تاریخی مسجد غازی گل بابا میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہ متحده مجلس عمل کی حکومت نے اگر صوبہ سرحد میں سنیگی کے ساتھ شریعت نافذ کرنے کی طرف توجہ دی تو صوبائی اسمبلی میں اے این پی کے ۱۰ ارکان کی حمایت بھی اسے حاصل ہوگی، لیکن شریعت کے نفاذ سے ان کی مراد حضرت عمرؓ کی حکومت کا نظام ہے۔

حضرت عمرؓ کے نظام حکومت کو اپنانے میں پہلی بڑی رکاوٹ آج کامروج عالمی نظام اور ولڈ اسٹبلیشمنٹ ہے جس کیلئے سود اور استھصال سے پاک اور خالص مذہبی تعلیمات پر بنی نظام حکومت کو قبول کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے جب بھی اور جہاں بھی حضرت عمرؓ والا نظام حکومت نافذ ہونا شروع ہو گا اور اسفندیار ولی کے بقول اس میں سنیگی بھی ہو گی تو اس کے خلاف ولڈ سسٹم فوراً حرکت میں آئے گا۔ اس صورت میں حضرت عمرؓ والے نظام کی حمایت کرنے کا مطلب آج کے ولڈ سسٹم اور اس کے لیڈر امریکہ بہادر کی دشمنی مول لینا ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسفندیار خان ولی اور ان کے ۱۰ ارکان اسمبلی اس بات کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر لیں گے؟

حضرت عمرؓ والے نظام حکومت کے نفاذ میں دو سری بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ظاہری نقشہ توہی بنے گا جو افغانستان کی طالبان حکومت کا تھا کہ امیر المؤمنین کے ہاتھ میں کوڑا ہو گا جو نماز نہ پڑھنے والوں پر بھی بر سے گا اور پرده نہ کرنے والی خواتین بھی اس سے محفوظ نہیں ہوں گی۔ ایسا ہوا تو پھر بہت سے دوستوں کو اور خود اسفندیار خان ولی کو شکایت ہو گی کہ ڈنڈے کے زور پر اسلام نافذ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کا تعارف ان کے کوڑے کے بغیر اسی طرح ناکمل رہتا ہے جس طرح حضرت مولیٰ کا تعارف ان کے عصا کے بغیر ہے۔ ظاہریات ہے کہ حضرت عمرؓ ہوں گے تو کوڑا بھی ہو گا، اور کوڑا ہو گا تو بر سے گا بھی، اور اس کا برنسا بھی نہیں بلکہ سنیگی کے ساتھ ہو گا۔ اس لیے اسفندیار ولی اور اس کے ۱۰ ارکان اسمبلی حضرت عمرؓ والے اسلام کا مطالبہ کرنے سے قبل ان دو الجھنوں کا کوئی حل سوچ لیں کیونکہ یہ دونوں الجھنیں سب سے زیادہ اپنی کو پیش آئیں گے۔

متحده مجلس عمل نے تو نہ اس سے قبل ایسی الجھنوں کو اپنے ذہن میں زیادہ جگہ دی ہے اور نہ ہی اب اس قسم کی الجھنیں اور رکاوٹیں اس کے راستے میں رکاوٹ بن سکتیں گی۔ متحده مجلس عمل کی مرکزی قیادت اور صوبہ سرحد میں اکرم درانی اور ان کی ٹیم کے بارے میں ہماری توقعات توہی ہیں، باقی اندر کی بات خدا جانتا ہے۔ خدا کرے کہ اکرم درانی اور ان کے رفقاء اپنی پالیسیوں اور ترجیحات کا کوئی ایسا ”سیٹ اپ“ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ ۱۹۷۴ء کی طرح ۲۰۰۳ء میں بھی خان عبدالغفار خان مرحوم کے سیاسی پیروکار جمعیت علماء اسلام کی قیادت قبول کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہوئے تاریخ گواہیک بار پھر دہرا دیں، آمین یارب العالمین۔

## اسامہ بن لادن اور یاسر عرفات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۰۰۲ء دسمبر ۲۰۰۲ء

اے ایف پی کے مطابق فلسطینی لیڈر یاسر عرفات نے ”سٹے ٹائمز“ کو انٹرو یو ڈیتے ہوئے عرب مجاہد اسامہ بن لادن سے کہا ہے کہ وہ فلسطین کا نام استعمال نہ کریں۔ یاسر عرفات فلسطینی لیڈر ہیں اور اسامہ بن لادن کا تعلق سعودی عرب سے ہے، دونوں اپنے اپنے دعویٰ کے مطابق عرب کا زکیلے جدو جہد میں مصروف ہیں۔ یاسر عرفات کی جدو جہد کا بدف آزاد فلسطینی ریاست کا قیام ہے اور اسامہ بن لادن کا تاریخ یہ ہے کہ امریکی فوجیں خلیج عرب سے نکل جائیں تاکہ عرب ممالک کی خود مختاری بھال ہو۔

یاسر عرفات ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد عرب ممالک کی شکست کے رو عمل میں ایک قوم پرست فلسطینی لیڈر کے طور پر منظر عام پر آئے۔ اس جنگ میں اسرائیل نے مصر کے صحرائے سینا، شام کی گولان پہاڑیوں، اور اردن کے شہربیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا اور فلسطین کا بہت سا علاقہ اس کے تسلط میں آگیا تھا۔ عالمی برادری اور اقوام متحدہ نے ان علاقوں پر اسرائیل کے قبضہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس سے مقبوضہ علاقے خالی کرنے کا مطالبہ کر رکھا ہے جسے آج تک اسرائیل نے درخواست نہیں سمجھا۔ میرنے چند سال قبل ایک اور جنگ میں سویز اور سینا کے علاقے اسرائیل سے واپس لے لیے تھے جبکہ فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کو اپنا حق سمجھتے ہوئے انہیں خالی کرنے سے اسرائیل صاف انکاری ہے۔ اس ظلم و جبرا اور بربریت و درندگی کے جواب میں فلسطینی علاقوں کی آزادی کیلئے مختلف مذاہقی گروپ سامنے آئے جنہوں نے اسرائیلی قبضے کے خلاف مسلح جدو جہد کا اعلان کیا۔ ان میں یاسر عرفات کا گروپ بھی تھا۔ بعد ازاں یہ گروپ بیکجا ہوئے اور یاسر عرفات کو تمام فلسطینی گروپوں کا مشترکہ لیڈر چن لیا گیا۔

یاسر عرفات کا ذاتی شخص ایک قوم پرست فلسطینی لیڈر کا تھا اور عالمی سیاست میں وہ امریکی کمپ کے بجائے رو سی کمپ کے زیادہ قریب سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے عالمی کمکش اور سرد جنگ کے خواہی سے اہم مسائل میں اپنا وزن ہمیشہ رو سی پلٹے میں ڈالا، حتیٰ کہ مسئلہ کشمیر اور افغانستان پر رو سی جاریت کے معاملے میں بھی انہوں نے کشمیری عوام اور افغان مسلمانوں کے حق میں کلمہ خیر کہنے کی بجائے رو سی بھارت گلہ جوڑ کی حوصلہ افزائی اور حمایت کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔

یاسر عرفات ایک دور میں ہتھیار بکف عسکری لیڈر تھے، مسلح جدو جہد کے ذریعے اسرائیل پر دباؤ ڈالنا ان کی پالیسی تھی، اور پچھلے پار کارروائیوں، طیاروں کا اغوا اور بندوق کی نالی کے ذریعے بات کرنا ان کا طریقہ کار تھا۔ وہ امریکہ مخالف لیڈر تھے، امریکہ میں ان کا داخلہ بند تھا جہاں انہیں ایک دہشت گرد لیڈر کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ پھر انہوں نے کمپ تبدیل کیا اور امریکہ کے دوستوں میں شمار ہونے لگے۔ تب سے امریکہ ان کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کھیل میں یاسر عرفات کا کردار حسب مشانہ پاتے ہوئے اب امریکہ انہیں فلسطین کی قیادت سے الگ کر کے ان کی جگہ اپنی مرخصی کی قیادت مسلط کرنے کا پروگرام بنائے ہوئے ہے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ وہ آزاد فلسطینی ریاست

بنوائے کیلئے تیار ہے لیکن اس کا نقشہ وہ ہو گا جو امریکہ طے کرے گا، جس میں بیت المقدس فلسطین کا حصہ نہیں ہو گا کیونکہ وہ اسرائیل کے ساتھ وعدہ کر چکا ہے۔ اس لیے یا سر عرفات اور دیگر عرب لیڈروں کا یہ مطالبہ مانے کیلئے امریکہ کسی صورت آمادہ نہیں ہے کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ انہیں خالی کر کے اس جنگ سے پہلے پوزیشن پر واپس چلا جائے۔

گذشتہ سال سعودی عرب نے یہ فارمولہ پیش کیا تھا کہ اگر اسرائیل ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلا جائے تو عرب ممالک فلسطین کی تقسیم کو قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اس منصوبے کو عرب لیگ نے بھی تمام عرب ممالک کے مقتنعہ موقف کے طور پر قبول کر لیا تھا، جبکہ اس سے قبل سعودی عرب سمیت اکثر عرب ممالک فلسطین کی تقسیم کو مسترد کرتے ہوئے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کرتے چلے آرہے تھے، لیکن اپنے سابقہ موقف سے عرب ملکوں کی یہ پسپاٹی بھی کسی کام نہیں آئی اور نہ صرف یہ کہ اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا ہے بلکہ امریکہ نے بھی سرکاری دستاویزات میں بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دے کر اسرائیل کے موقف کی عملی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔

فلسطینی لیڈر یا سر عرفات کی رہی سہی امید یورپی یوپیں سے تھی کہ وہ شاید اپنے مفادات کیلئے امریکہ سے قدرے مختلف موقف اختیار کر لے۔ لیکن برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیزرنے شام کے صدر بشار الاسد کے دورہ لندن کے موقع پر یہ کہہ کر بات صاف کر دی ہے کہ فلسطینی ریاست کا وہ نقشہ جو امریکہ دے رہا ہے اس کو قبول کرنے سے ہی بات بننے کی، اس کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی ٹونی بلیزرنے اگلے ماہ لندن میں مشرق وسطیٰ کے حوالے سے ہیں اس الاقوامی امن کا نفرنس طلب کر لی ہے جس میں شرکت کی دعوت یا سر عرفات نے قبول کر لی ہے۔ چنانچہ بشار الاسد کا دورہ لندن اور یا سر عرفات کی طرف سے لندن کی مجوہہ کا نفرنس میں میں شرکت کا اعلان اس امریکی غمازی کرتے ہیں کہ امریکہ فلسطین کی اپنی مرضی کے مطالع تقسیم کے اجنبیوں کو ان دونوں لیڈروں سے قبول کرانے میں بھی بالآخر کامیاب ہو جائے گا۔

دوسری طرف اسامہ بن لادن کا تعلق سعودی عرب کی مตول بن لادن فیلی سے ہے۔ وہ افغانستان پر روس کی فوج کشی کے خلاف افغان عوام کی مسلسل مراجحتی جدوجہد کے دوران سامنے آئے۔ انہوں نے افغان جہاد میں عملی حصہ لیا، افغان مجاهدین کو مالی طور پر سپورٹ کیا اور ارشیع عبد اللہ عزّام کے ساتھ مل کر ہزا روں عرب نوجوانوں کو اس کام کیلئے تیار کیا کہ وہ افغانستان میں رو سی جارحیت کے خلاف جہاد میں شریک ہوں، اور اس کے ساتھ بھرپور عسکری ٹریننگ بھی حاصل کریں تاکہ وہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیلی جارحیت کے خلاف جہاد کو منظم کر سکیں۔ انہیں اس دوران روس کے خلاف مسلسل جنگ کیلئے امریکہ کی حمایت حاصل تھی اور ان کی تربیت و ٹریننگ میں سب سے زیادہ امریکی اداروں کا حصہ ہے۔ لیکن افغان جہاد کے بعد جب انہوں نے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی مسلسل جارحیت اور امریکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے فلسطینی عوام کی آزادی اور عرب ممالک کی خود مختاری کیلئے آواز بلند کی تو روس کے خلاف جہاد کرنے والائی مجاهد بکخت امریکی دوستوں کے کمپ سے نکل کر دہشت گردی کے الزام کا مستحق قرار پا گیا اور آج امریکہ اسے دنیا میں اپنا دشمن

نمبر ایک قرار دے رہا ہے۔

اسامد بن لادن کا قصور اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ صرف عرب عوام اور ملکوں کی بات نہیں کرتا بلکہ کشیر کی بات بھی کرتا ہے، جیچینا کا ذکر بھی اس کی زبان پر ہوتا ہے، وہ مسجد اقصیٰ کی آزادی کا نعرہ بھی لگاتا ہے، اور دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی مظلوم مسلمان خالموں کے خلاف نبرداز ہے وہ اس کی حمایت کرتا ہے۔

اس طرح یا سر عرفات اور اسامد بن لادن ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہٹھے ہیں۔ یا سر عرفات نے امریکہ دشمنی کا کیپ چھوڑ کر امریکی کیپ میں شمولیت اختیار کر رکھی ہے اور ہتھیار چھینک کر مذاکرات کا شکول گلے میں لٹکا لیا ہے۔ جبکہ اسامد بن لادن امریکی کیپ سے نکل کر اس کے مخالف کیپ کا لیڈر بن گیا ہے مگر یا سر عرفات کی طرح ہتھیار ڈالنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں یا سر عرفات کی طرف سے اسامد بن لادن کو فلسطین کا نام استعمال نہ کرنے کی تلقین کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ یا سر عرفات اور ان کے ہمنوا عرب لیڈر امریکہ کے ساتھ جو معاملات طے کرنے جا رہے ہیں، اسامد بن لادن اس میں کباب میں بڑی بن سکتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے فلسطین، فلسطینی عوام اور بیت المقدس کا حسب منشودا طے کرنے کی بات بقیٰ نظر نہیں آ رہی۔ یہ بات درست ہے کہ اسامد بن لادن یا سر عرفات اور دیگر عرب لیڈروں کے عزم کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، لیکن جناب یا سر عرفات کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جن جانباز اور سرفوش فلسطینی حریت پسندوں کی عسکری جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کی قیمت پر ان کی لیڈری ابھی تک قائم ہے اور جن مجاہدین کے خون کی برکت سے انہیں مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کا موقع مل رہا ہے، وہ مجاہدین اور ان کا جہاد حریت پسند اسامد بن لادن کی جدوجہد اور قربانیوں کا شمر ہے۔ فلسطینی حریت پسندوں کی موجودہ جدوجہد کے پس منظر سے شہید عبد اللہ عزائم اور اسامد بن لادن کا نام ہٹا دیا جائے تو اس کے دامن میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

## خلافتِ اسلامیہ کا احیا: روسی صدر ولادیمیر پیوٹن کا خوف

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۳ء

آن لائن کی ایک رپورٹ کے مطابق روس کے صدر ولادیمیر پیوٹن نے ایک قومی ٹیلیویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے اسلامی تحریکات کو ایک بار پھر بد فِ تقید بتایا ہے اور کہا ہے کہ وہ مختلف ممالک میں دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ صدر پیوٹن نے اپنے انٹرویو میں اس خدشہ کاظہ بھی کیا ہے کہ اسلامی شدت پسند دنیا میں اسلامی خلافت لانے کا منصوبہ بنارہے ہیں۔

ہمارے خیال میں اسلامی تحریکات کے خلاف روس، امریکہ اور ان کے دیگر اتحادیوں کے غیظ و غضب کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مغرب نے اب سے پون صدی قبل جس خلافت کو صدیوں کی مسلسل سازشوں کے بعد ختم کر دیا تھا، اور اپنے زعم میں یہ خیال کر لیا تھا کہ اب دنیا میں کہیں بھی کوئی ریاست اسلام کی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکے گی، ان کا یہ

اندازہ بلکہ پروگرام غلط ثابت ہوا ہے۔ اور صرف پون صدی کے بعد پورے عالمِ اسلام میں نہ صرف جہاد کے جذبات اور جدو جہد از سرنو منظم ہو گئی ہے بلکہ مختلف ممالک میں خلافتِ اسلامی کے دوبارہ احیائی تحریکات بھی فطری انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں۔

اس لیے صدر پیوٹن کا یہ خوف بجا ہے لیکن ہم ان سے گزارش کرنا چاہیں گے کہ اس پر اس قدر سچ پا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ

• اسلامی احکام کی رو سے خلافت کا نظام قائم کرنا مسلمانوں کے دینی فرائض میں شامل ہے، کیونکہ اگر دنیا کے کسی خطے میں خلافت کا نظام موجود نہیں ہے تو شرعی احکام کی رو سے تو دنیا بھر کے مسلمان ایک دینی فریضہ کے

تارک اور گنہگار قرار پاتے ہیں۔ امام ولی اللہ دہلویؒ اور دیگر فقہاء کرامؒ کی تصریحات کے مطابق خلافت کا قیام دینی فریضہ ہے اور اس کی حیثیت ملتِ اسلامیہ کیلئے فرضِ کفایہ کی ہے، کہ کسی خطے میں اسلامی خلافت کا نظام قائم ہو جائے تو دنیا بھر کے سب مسلمانوں کی طرف سے فرضِ ادا ہو جائے گا، لیکن اگر کہیں بھی اسلامی خلافت کا نظام موجود نہیں ہے تو دنیا بھر کے تمام مسلمان بلا امتیاز اس شرعی فریضہ کے تارک اور گنہگار ہیں۔

• پھر اسلامی تحریکات خلافت کا نظام رو س اور امریکہ کی سر زمین پر قائم کرنے کا نعرہ نہیں لگا رہیں اور ان کے دیگر ہمنوازوں کو واویلا کرنے کی ضرورت پیش آئے، بلکہ مسلمان صرف اپنے ملکوں میں نفاذِ اسلام کی بات کرتے ہیں، اور اس سر زمین پر نظامِ خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے پاس ہے اور جس میں وہ اکثریت کے ساتھ رہتے ہیں۔

اس طرح خلافت کا قیام مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا حق بھی ہے کہ وہ اپنی سر زمین اور اپنی سوسائٹی میں جس طرح کا نظام وہ چاہیں قائم کر سکتے ہیں۔ اس لیے رو سی صدر کا یہ کہنا کہ اسلامی تحریکات دنیا میں خلافت کا نظام لانا چاہتی ہیں، خلافِ واقعہ تو نہیں، لیکن مسلمانوں کے مذہبی فرائض اور ملی حقوق میں ناروا مداخلت کی حیثیت ضرور رکتا ہے، اور اسلام کے خلاف مغربی لیڈروں کی معاندانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

## مولانا مسعود اظہر کی دوبارہ گرفتاری

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۳ء

کالعدم جیشِ محمدؒ کے سربراہ مولانا مسعود اظہر کے خلاف حکومتِ عدالت عالیہ میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی اور لاہور ہائیکورٹ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا ہے لیکن امریکی دباؤ اور بھارت کا واویلا عدالت عالیہ کے فیصلے پر غالب آگیا اور حکومت نے انہیں رہا کرنے کی بجائے ان کی دوبارہ گرفتاری کے احکام جاری کر دیے ہیں۔ مولانا مسعود اظہر کو افغانستان پر امریکی حملے کے دوران پاکستان میں اس کے خلافِ عمل کی عوای تحریک میں سرگرم کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا اور اس وقت سے وہ مسلسل زیر حرastت ہیں۔ اس ”جرم“ میں ان کے علاوہ مولانا فضل الرحمن، قاضی حسین

احمر، مولانا اعظم طارق اور پروفسر حافظ محمد سعید بھی گرفتار ہوئے تھے لیکن وہ سب باری باری رہا ہو چکے ہیں مگر مولانا مسعود اظہر کی رہائی کیلئے حکومت خود کو ہنسی طور پر تیار نہیں پار ہی یا امریکہ اور بھارت کا دباؤ اس قدر زیاد ہے کہ اس کے سامنے عدالت عالیہ کے حکم کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔

بہر حال جو صورت بھی ہو مولانا مسعود اظہر کی دبارہ گرفتاری قابل ذمۃ ہے، حکومت سے ہماری گزارش ہے کہ وہ قومی خود مختاری، ملی حیثیت اور عوامی جذبات کے حوالے سے اپنے طرز عمل کا از سر نوجائز ہے اور امریکہ اور بھارت کی تابعداری میں اس حد تک آگے نہ جائے کہ ملی حیثیت اور قومی غیرت کا ہر دائرہ امریکی عزم اور بھارتی ڈیکمبوں کے ہاتھوں پماں ہوتا جلا جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ دیگر رہنماؤں کی طرح مولانا محمد مسعود اظہر کو بھی رہا کر دے اور بھارتی ڈیکمبوں کے آگے سیر انداز ہونے کی بجائے قومی حیثیت کا مظاہرہ کرے۔

## امریکی یلغار۔ سرحد اسمبلی کی قراردادیں

روزنامہ اسلام، لاہور۔ یکم جنوری ۲۰۰۳ء

سرحد اسمبلی کی دوسری قرارداد جنوبی وزیرستان پر مبنیہ امریکی بمباری کے بارے میں ہے اور اسے پاکستان کی خود مختاری کی غنین خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے وفاقی حکومت سے کہا گیا ہے کہ یہ ملک کی آزادی، سلامتی اور خود مختاری کا مسئلہ ہے اس پر امریکہ سے شدید احتجاج کیا جائے اور اس کی روک تھام کیلئے ٹھوس حکمت عملی اختیار کی جائے۔

اس کے جواب میں امریکی افواج کے اس حالیہ وضاحتی بیان سے صورتحال کی غنین میں اور اضافہ ہو گیا ہے کہ ہم اپنی کاروائی جاری رکھیں گے، ہمیں اس میں یہ آزادی حاصل ہے کہ ہم جس جگہ کو منتخب کریں وہاں کاروائی کریں اور یہ پاکستان کی حکومت کی مرضی سے ہو گا۔ وضاحتی بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ افغانستان سے ملحق پاکستانی صوبہ سرحد، جس میں امریکہ مختلف مسلمان جماعتوں کی حکومت ہے، اس نے واقعہ کوز برداشتی اچھالا ہے، جو چودہ ماہ قبل افغانستان میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکی جنگ کے منانی ہے۔

امریکی افواج کی اس وضاحت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ امریکہ کو پاکستان کی سالمیت، خود مختاری اور آزادی کی کوئی پرواہ نہیں، اس سلسلہ میں بین الاقوامی قوانین اور اصول و ضوابط کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں اور صوبہ سرحد کے عوام کی اکثریت نے امریکی طرز عمل اور اقدامات کے خلاف حالیہ ایکشن میں جس کھلی نفرت کا اظہار کیا ہے وہ اس سے کوئی سبق حاصل کرنے کیلئے تیار نہیں ہے، نیزاں وضاحتی بیان کے مندرجات کی رو سے اسے اس ساری صورتحال میں پاکستان کی وفاقی حکومت کی حمایت حاصل ہے۔

ایک قرارداد میں صوبہ سرحد کی اسمبلی نے وفاقی حکومت سے سفارش کی ہے کہ حالیہ افغان لڑائی میں پاکستان کے جتنے مجاہدین امریکہ کے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار کیے گئے ہیں انہیں جیلوں سے آزاد کیا جائے۔

ہم سرحد اسلامی کی مذکورہ بالاقرار دادوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور انہیں ملی حیثت اور قویٰ غیرت کے اظہار کی علامت قرار دیتے ہوئے متحده مجلس عمل کی قیادت اور صوبہ سرحد کی حکومت کے سربراہ جناب محمد اکرم خان درانی سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قرار دادوں کے ذریعے اپنے جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے منشور اور عوامی مینڈیٹ کے تقاضے پورے کرنے کیلئے سنجیدہ عملی اقدامات کی طرف بھی توجہ دیں گے۔

## متحده مجلسِ عمل کی خدمت میں!

فروری ۲۰۰۳ء کے آغاز میں مجلسِ فکر و نظر کے زیر انتظام بمدرد سنٹر، لشنا روڈ،  
لابور میں ایک اجتماع سے خطاب

آخر میں صوبہ سرحد میں متحده مجلسِ عمل کی حکومت کے حوالے سے بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ نہ صرف پاکستان کے عوام بلکہ دنیا بھر کی دینی تحریکات اور دینی کارکنوں کی نظریں ان پر الگی ہوئی ہیں اور افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے جبری خاتمه نے دنیا بھر کے دینی کارکنوں کے دلوں پر جوزخم لگائے ہیں، وہ صوبہ سرحد میں متحده مجلسِ عمل کی کامیابی کو اپنے زخوں پر مرہبم کی طرح محوس کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے موقع پر میں لندن میں تھا۔ انتخابات کے نتائج سامنے آئنے پر کم از کم چھ مختلف ملکوں کے مسلم دانشوروں نے مجھ سے رابط قائم کیا اور مبارک باد دیتے ہوئے اپنے جذبہ اور خلوص کے مطابق صوبہ سرحد میں متحده مجلسِ عمل کی موقع حکومت کو کامیاب بنانے کیلئے بہت سے مشورے دیے۔ انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ شاید متحده مجلسِ عمل میں مجھے بھی ایسی حیثیت حاصل ہے کہ میں اس کی قیادت کو پالیسی اور ترجیحات کے معاملہ میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں اور اسی وجہ سے وہ مجھے مفید مشوروں سے نواز رہے تھے جبکہ میں اس بات پر خوش تھا کہ متحده مجلسِ عمل کو صرف پاکستان کے دین دار عوام ہی نہیں بلکہ مختلف ملکوں کے مسلمان دانش ور بھی اپنی جماعت سمجھ رہے ہیں اور اس سے توقعات و ابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان سب دوستوں کے مشوروں کا خلاصہ یہ تھا کہ:

- متحده مجلسِ عمل کو صوبہ سرحد میں ایک مثالی عوامی اور اسلامی حکومت کا عملی نقشہ پیش کرنا چاہیے۔
- عوامی مسائل کے حل اور مشکلات کے خاتمہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔
- سماجی انصاف اور معاشرتی عدل کی فراہمی کو اولیت دینی چاہیے۔
- پروٹوکول، پرسنچ اور دی آئی پی کلپر کے عذاب سے لوگوں کو نجات دلانا چاہیے۔
- صوبائی وزراء کو قیامت، سادگی اور قانون کی کیساں عملداری کا اپنی ذاتی زندگی میں نمونہ بنانا چاہیے۔
- ناالنصافی، رشتہ، بد عنوانی اور سرخ فیتی کی لعنت کے خاتمہ کیلئے سنجیدہ اقدامات کرنے چاہیں۔

• عام لوگوں میں اپنی مدد آپ کے تحت سماجی کاموں کا شعور بیدار کرنا چاہیے اور ہر لحاظ سے دوسرے صوبوں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے وزرا سے متحده مجلس عمل کے وزراؤالگ اور ممتاز نظر آنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف اپنے صوبہ میں عوام کو عدل وال انصاف کا صحیح ماحول فراہم کر سکیں بلکہ ان کا کردار اور حکومتی طرز عمل ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام کیلئے بھی باعث کشش ہو اور پورے پاکستان کے عوام عملاً یہ محسوس کریں کہ ان کی فلاح و ہبہ دار بہتر مستقبل اسلامی نظام اور دینی قیادت ہی سے وابستہ ہے۔

ان مشوروں کے ساتھ میں اپنی طرف سے سرحد میں متحده مجلس عمل کی صوبائی حکومت کیلئے ایک مشورہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامائزیشن کا بہت سا کام اسلامی نظریاتی کو نسل کی سفارشات کی شکل میں موجود ہے۔ صرف آئین کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر صوبائی اختیارات کی حدود واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے بعد صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی اسلامی نظریاتی کو نسل کی سفارشات کو پچھانت لیجیے اور متعلقہ ماہرین کی مشاورت سے ترجیحات طے کر کے صوبائی اسٹبلی کے ذریعے ان کے بارے میں قانون سازی کا آغاز کر دیجیے کہ اس وقت آپ کے بس میں عملاً صرف بھی ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب اپنے بس اور اختیار کا کام آپ کر گزریں گے تو اگلی پیش رفت کی راہیں بھی اللہ تعالیٰ ضرور کھول دیں گے۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

## مسلم دنیا اور جرمی

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ فروری ۲۰۰۴ء

اس کے ساتھ ایک اور حقیقت کا اظہار بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ اپنے تاریخی پس منظر کے حوالے سے ہمارے نزدیک جرمی دوسرے یورپی ممالک سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ جرمی ان استعماری یورپی ممالک کی دوڑ میں شریک نہیں تھا جنہوں نے اکثر مسلم ممالک کو گذشتہ دو صدیوں کے درمیان نوازدی بنائے رکھا ہے۔ یورپ میں خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کی مہم میں بھی جرمی کا وہ حصہ نہیں ہے جو برطانیہ، فرانس اور اٹلی وغیرہ کا رہا ہے بلکہ پہلی جنگ عظیم میں خلافتِ عثمانیہ اور جرمی آپس میں حلیف تھے۔ جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور پروفیسر برکت اللہ بھوپالی جیسے رہنماؤں کو جرمی کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جس کی تفصیلات خود جرمی کی وزارتِ خارجہ کے ایک افسر پروفیسر اولف شمل کی کتاب ”اعلان برلن“ میں شائع ہو چکی ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ اور عالم اسلام کے دیگر کئی ممالک کی طرح جرمی بھی یورپی استعماری قوتوں کا کثشتہ تم رہا ہے اور ”جہاد افغانستان“ میں مسلم مجاهدین کی قربانیوں کے نتیجے میں جرمی کو اتحاد نصیب ہوا ہے۔ اس لیے اگر اسلام اور مغرب کے درمیان ڈائیاگ کی بات جرمی کی طرف سے آئی ہے تو ہم دینی کا کرکنوں کیلئے زیادہ خوشی کی بات ہے لیکن یہ مکالمہ صحیح رخ پر ہونا چاہیے اور صحیح لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

## افغان شہداء کے خون کا ثمرہ

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۶ فوری ۲۰۰۳ء

ہم سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں امریکی جارحیت اور دہشت گردی کے بعد عالمِ اسلام کی دینی تحریکات نے مصلحتوں کی کچھ زیادہ بھی چادر تان رکھی ہے، اس لیے ان کے اس سکوت و جمود سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی جارحیت و درندگی کے خلاف عالمی رائے عامہ کے جذبات کو منظم کرنے کا کام بائیس بازو نے سنبھال لیا ہے۔ اور جس طرح اسلامی تحریکات کے ساتھ ہمیشہ سے ہو رہا ہے کہ قربانیاں وہ دیتی ہیں لیکن ان کی قربانیوں کو کیش کرانے کیلئے کوئی اور سامنے آجاتا ہے، اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ہمارے قائدین اس کی جو توجیہ بھی کریں اور جو بہانہ بھی تراشیں مگر یہ واقعہ رونما ہو چکا ہے کہ دنیا میں امریکا مخالف جذبات کو منظم کرنے کا جو کام عالمِ اسلام کی دینی تحریکات کی اولین ذمہ داری تھی اسے دوسروں نے سنبھال لیا ہے۔ اولیٰ سی (مسلم سربراہ کانفرنس) کی جگہ غیر وابستہ تحریک سامنے آگئی ہے اور سڑیٹ پاور کی راہنمائی ان دانشوروں نے سنبھال لی ہے جو اس سے قبل بائیس بازو کے حوالے سے متحرک رہے ہیں اور اب پھر انی نظریات و افکار کا پرچم اٹھائے میدان میں آگئے ہیں۔

اگر ہماری اس گزارش کو جسارت و گستاخی پر محبوں نہ کیا جائے تو ہم یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ عالمِ اسلام کی دینی تحریکات موجودہ عالمی نگاش میں فٹ بال بن کر رہ گئی ہیں۔ ان دینی تحریکات نے سوویت یونیٹ کے خلاف جہاد میں سرگرم حصہ لیا اور لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر سوویت یونین کو نہ صرف افغانستان سے واپس جانے پر مجبور کیا بلکہ خود سوویت یونین بھی بکھر کر رہ گیا لیکن ان لاکھوں مجاهدین اور شہداء کے خود کو عالمی مارکیٹ میں کیش کس نے کرایا؟

1. اس خون کی قیمت امریکہ نے سرجنگ میں فتح اور دنیا کا واحد عالمی لیڈر بن جانے کی صورت میں وصول کی۔
2. مشتری یورپ کی ریاستوں نے اس خون کے صلے میں آزادی حاصل کی۔
3. اسی خون نے دیوار برلن توڑی اور جرمی متعدد ہوا۔
4. وسطی ایشیا کے مسلم ممالک اور بالٹک ریاستوں کو اس خون کے صدقے آزادی نصیب ہوئی۔
5. اور پاکستان کو اسی خون کے صلے میں مغربی سرحد کا استحکام حاصل ہوا۔

مگر جب انہی خون دینے والوں نے خود اپنے خون کو اپنی مریضی سے کیش کروانا چاہتا تو یہ سب کے سب محسن کش اور احسان فراموش ان کے خلاف اکٹھے ہو گئے اور ان پر ڈیزی کٹر بھوں کی بارش کر دی۔ اور آج وہی معاملہ دوسرے رخ سے درپیش ہے۔ آج امریکا کے خلاف مجاز ہے، خون دینے والے اور ہیں، قربانیوں کی بھینٹ اور لوگ چڑھ رہے ہیں، یعنے اور لوگوں چھلی ہو رہے ہیں، مگر ان کی نمائندگی اور سیاسی و اخلاقی سپورٹ کا پرچم دوسروں نے سنبھال لیا ہے۔ ہمیں یہ پرچم سنبھالنے والوں سے کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ ہمیں خوشی ہے کہ کوئی تو آگے آیا ہے، کسی نے تو ظلم و جبر اور دہشت گردی و درندگی کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور کسی کا خمیر توجاگا ہے۔ ہم ان مظاہروں کا خیر مقدم کرتے ہیں، غیر وابستہ

تحریک کی سربراہی کافرنس کے اعلانات کا خیر مقدم کرتے ہیں، بلکہ ہم تو یورپی یونین کی ان کوششوں پر بھی یورپی لیڈروں کے شکرگزار ہیں جو وہ عراق پر امریکہ کے حملے کرو کنے کیلئے کر رہے ہیں۔

ہماری شکایت ان سے نہیں بلکہ ہم اپنی اس نااہل، ناعاقبت اندیش اور مصلحت کوش سیاسی قیادت کا نوحہ پڑھ رہے ہیں جو اسلام کا نام لیتی ہے، اسلام کے نام پر ووٹ حاصل کرتی ہے، اسلام کے نعروہ پر اقتدار کے ایوانوں تک بھی پہنچ جاتی ہے، اسلام کے حوالے سے سیاسی عزت و قوت کے مقامات طے کرتی ہے، مجاهدین کی خدمات اور قربانیوں کے تذکرے کرتی ہے، اور مسلم امم کی رائے عامہ کی قیادت و رہنمائی کی بلا شرکت غیرے دعوے دار ہے، لیکن اقتدار یا اقتدار کے چانس کے لوئی پاپ نے اسے اپنی اصل ذمہ داریوں سے بے پرواکر دیا ہے۔ اور امریکہ کے خلاف عالمی رائے عامہ کی رہنمائی و قیادت یا کام از کام اس میں شرکت کا چانس بھی ضائع کر دینے کے بعد اب بہانے تراش رہی ہے کہ حج کا موقع تھا اس لیے ہم یہ کر سکے وہ نہ کر سکے اور اگر حج در میان میں نہ آ جاتا تو ہم یہ کر دیتے وہ کر دیتے۔

تاہم اس سنائی میں وہ لوگ غیمت ہیں جو لوگوں کو اس ظلم و درندگی کے خلاف ابھارنے اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کیلئے کسی نہ کسی سطح پر کھنہ کچھ کر رہے ہیں۔ گذشتہ روز مجھے بورے والا کے پریس گلب میں ایک سینیار میں شرکت کا موقع لاجس کا اہتمام مجلس احرار اسلام نے کیا تھا اور جس میں ”امریکی جاریت اور عالم اسلام“ کے عنوان پر احرار رہنماؤں پر فیصلہ خالد شبیر احمد، سید کفیل شاہ بخاری، عبد اللطیف خالد چیہہ اور مولانا عبدالغیث نعمانی، جبکہ ان کے علاوہ جناب سیف اللہ ایڈو وکیٹ اور چودھری مسعود احمد امیر جماعت اسلامی نے بھی خطاب کیا۔ سینیار کی صدر اس معروف عالم دین مولانا قاری طیب حقی نے کی اور مجھے بھی اس میں کچھ معرفات پیش کرنے کیلئے کہا گیا۔ مقرین نے امریکہ کے عزائم اور ڈمکیوں کی مذمت کرتے ہوئے اپنے جذبات پیش کیے، عراقی حکوم کے ساتھ ہم آہنگی اور یکجہتی کا اظہار کیا، مسلم حکمرانوں کی بے حصی اور بے لمسی کارو نارویا، اور اسلامی تحریکوں کی قیادتوں کی بے بصیرتی اور مصلحت کو شی کا ماتم کیا۔

یہ ایک چھوٹا سا پروگرام تھا مگر میرے نزدیک غیمت تھا اور مجھے وہ سٹھن پر منتظر ہوئے وہ چیزیاں آرہی تھیں جس کے پارے میں روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو ایک چڑیا اپنی چھوٹی سی چوچنگی میں پانی لا کر اس آگ پر ڈالتی تھی۔ وہ مسلسل اسی کام میں لگی رہی تو کسی نے پوچھا کہ کیا تمہارے اس عمل سے آگ بچھ جائے گی؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اس سے آگ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اس سے میرا فرض تواہ ہو جائے گا کہ جتنی چوچنگی مجھے میرے خدا نے دے رکھی ہے میں اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو ٹھہنڈا کرنے کیلئے استعمال کر رہی ہوں۔

سینیار سے فارغ ہوئے تو ایک احرار خاندان کے فرزند محمد حنف صوفی سے ملاقات ہوئی جو ہمارے معروف خطیب مولانا قاری عبدالحی عابد کے بادر نسبتی ہیں اور بیجا بی کے اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے ہنگام رخصت اپنے کلام سے نواز جس سے دل کو ڈھارس ہوئی کہ ابھی اس راکھ میں حرارت باقی ہے اور پیش محسوس ہوتی ہے، اس لیے اس راکھ کو ٹھولتے رہو کہیں نہ کہیں سے کوئی چینگاری نکل ہی آئے گی۔ ان کا پیغام قاریین کی خدمت میں بھی پیش ہے۔

کنوں بولیے منہ نوں سیتی پھرنے آں  
 اپنا آپ و کاؤ کیتی پھرنے آں  
 جام شہادت پینا سادا شیوه سی  
 اسی تے خورے کی شے پیتی پھرنے آں  
 اپنا قبلہ کعبہ چھڑ کے صوفی جی  
 اج فیر گوریاں تکھے نیتی پھرنے آں  
 آؤ ہاں اج یار بنا یے پتھر نوں  
 رل مل کے اج جو کاں لائے پتھر نوں  
 دل ورگی کوئی چیز نہیں اس کوں جد ووں  
 کاہنوں دل دا حال سنائے پتھر نوں  
 ایویں ناں تو بین کرا یے شیشے دی  
 پتھر جمی کوئی چیز و کھائے پتھر نوں

## افغانستان کے بعد عراق

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۰ مارچ ۲۰۰۳ء

خدا خدا کر کے اسلامی سربراہ کانفرنس تظمیم کا بھی اجلاس ہوا ہے اور قطر کے دارالحکومت میں اوآئی سی کے غیر معمولی اجلاس میں ۷۵ ملکوں کے نمائندوں نے مشترکہ اعلامیہ کے ذریعے عراق پر امریکی حملے اور طاقت کے زور پر عراق کی حکومت کی تبدیلی کے پروگرام کو مسترد کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی ممالک عراق یا کسی بھی اسلامی ملک کی جغرافیائی سرحدوں اور سلامتی پر حملے میں شرکت سے باز رہیں۔ صدام حکومت کی تبدیلی کیلئے امریکی کوششوں کو مسترد کرتے ہوئے اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ ایسی کوئی بھی کوشش اور تبدیلی اندر وہی معاملات میں مداخلت ہوگی جو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔ مشترکہ اعلامیہ میں عالمی برادری پر زور دیا گیا ہے کہ مشرق و سطی کے سرحد پر بھی توجہ دی جائے اور اسرائیل کے تباہ کن ہتھیاروں پر بھی غور کیا جائے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں عالمی برادری پر تمام میں الاقوامی تنازعات میں ایک جیسا معيار رکھنے پر زور دینا چاہیے۔

اسلامی سربراہ کانفرنس کے اجلاس کا ہمیں ایک مدت سے انتظار تھا اور پوری دنیا نے اسلام ایک عرصہ سے اپنے حکمرانوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ وہ کب مل بیٹھنے کی ضرورت محسوس کریں گے اور کب موجودہ عالمی حالات اور مسلمانوں کے خلاف بڑھتی ہوئی استعماری یلغار کے ماحول میں اپنے موقف اور پروگرام کے تعین کیلئے جمع ہوں گے؟ ہمیں تو اس

اجلاس کا انتظار اب سے ڈیڑھ سال قبل ٹھاچب یہی امریکہ ایک اسلامی ملک "امریتِ اسلامی افغانستان" پر چڑھ دوڑا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، میں کی حکومت کو عوام سے پوچھئے بغیر تبدیل کر دیا گیا تھا، افغانستان کی سالمیت، جغرافیائی سرحدوں اور اندروں معاملات کو پہاڑ کر دیا تھا، اور الزامات کی تحقیق و ثبوت کے تمام مسلمہ اصولوں اور معیار کو نظر انداز کرتے ہوئے ہیں الاقوامی تنازعات میں دوہرے معیار کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مسلم حکمران ایک اسلامی ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے احترام کے لیے، اس کی سالمیت کے تحفظ کیلئے اور اس کے اندروں معاملات کو بیرونی دخل اندازی سے بچانے کیلئے کوئی کردار ادا کریں گے یا کم از کم آواز ہی بلند کریں گے۔

افغان عوام بھی اسی امید پر امریکی جارحیت کے سامنے ڈٹ گئے تھے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں، ان کے بھائی دنیا میں موجود ہیں اور زندہ ہیں، وہ انہیں دشمن کے ہاتھوں مرتا نہیں دیکھیں گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹلم سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن مسلم حکمرانوں نے آنکھیں بند کر لیں جبکہ عرب حکمرانوں نے اپنی آنکھوں پر عرب قومیت کی سیاہ عینک چڑھا لی۔ بیشتر مسلم حکمران یہ کہہ کر امریکہ کے ساتھ اتحاد میں شریک ہو گئے کہ جن "دہشت گروں" کو خود امریکہ نے ٹریننگ دی تھی اور جنہیں خود ان مسلم ممالک نے اسلحہ اور امد اور فراہم کی تھی وہاب چونکہ روس سے منٹھنے کے بعد امریکہ سے بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے ہیں اور ایک اسلامی ملک کو روس کی فوجی مداخلت سے نجات دلانے کے بعد بہت سے اسلامی ملکوں کو امریکہ کی فوجی مداخلت سے نجات دلانے کی باتیں انہوں نے شروع کر دی ہیں اس لیے وہ گردن زدنی ہو گئے ہیں، ان کا دنیا میں زندہ رہنے کا جواز باقی نہیں رہا، وہ دنیا کی ہر گالی اور ہر الزام کے مستحق قرار پا گئے ہیں اور وہ ان بیانی انسانی حقوق کے استحقاق سے بھی محروم ہو گئے ہیں جو اقوام متحدہ کے منشور اور قراردادوں میں بیان کیے گئے ہیں، اس لیے امریکہ ان سے جو سلوک روارکے جائز ہے، جس طریقہ سے انہیں ذبح کرے اور جبر و تشدیکی جس سان پر انہیں چڑھا دے جائے۔

مسلم حکمرانوں نے طے کر لیا کہ ہم امریکہ کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے، اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کریں گے اور اس کے کسی پروگرام کی مزاحمت نہیں کریں گے بلکہ اس کیلئے ہمارے کنڈھے حاضر ہوں گے اور ہم اپنے لاجٹک و سائل اس کی خدمت میں پیش کرنے میں بھی کوئی حرخ نہیں سمجھیں گے۔ جبکہ عرب حکمرانوں نے صاف کہہ دیا کہ چونکہ یہ عرب سرزمین کا قصہ نہیں ہے، عجمیوں کی بات ہے، یہ افغان ہیں اور پشوتوفارسی بولنے والے ہیں اس لیے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے، ہمیں صرف اتنی ضمانت دے دی جائے کہ کسی عرب ملک پر حملہ نہیں ہو گا تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا بلکہ دل و جان سے ساتھ دینے کو تیار ہوں گے۔ افغانستان پر امریکی حملہ کے دوران مسلم اور عرب حکمرانوں نے یہ سب کچھ کر دھکایا اور پھر اس پر خوشیاں منایکیں کہ ہم نے "دہشت گردی" پر کاری ضرب لگادی ہے۔ ہماری زبانیں اب تک دہشت گردی کے خلاف امریکی مہم اور کھلم کھلا فوجی جارحیت کی تائید و محابیت میں مصروف ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں نے سمجھا کہ "سب سے پہلے پاکستان" کا نعروہ لگا کر ہم نے پاکستان کو بچالیا ہے اس لیے اب ہماری باری نہیں آئے گی، اور عرب حکمران مطمئن ہو گئے کہ ہم نے تو کسی عرب ملک پر حملہ نہ کرنے کی ضمانت پر دہشت گردی کے خلاف امریکی مہم کا ساتھ دیا تھا اس لیے اب عرب ممالک ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گئے ہیں، اب کسی عرب ملک کو امریکہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا اور

ہم نے افغان بھائیوں کی تربیتی دے کر عرب ممالک کو بیروفی جاریت اور مداخلت سے محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن ابھی صرف ایک سال گزرا ہے کہ نیا منظر سامنے ہے۔ کہتے ہیں کہ جنگلی درندے کو انسان کا خون پینے کو مل جائے تو پھر اسے کسی اور جانور کے خون میں مزہ نہیں آتا اور انسانی خون ہی کی تلاش میں رہتا ہے اور یہ تو مسلمان کا خون ہے۔ اس لیے اب عراق اس کے پیشوں کی زد میں ہے اور پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کے اندر وہ اپنے شکار کی تلاش میں بلا روک ٹوک گھوم رہا ہے، نہ پاکستان کے داخلی معاملات کا احترام باقی رہا اور نہ ہی کسی عرب ملک کے تحفظ کی کوئی صفائح موجود ہے۔ اور اب ہمارے حکمرانوں کو یاد آیا ہے کہ کسی ملک کی سالمیت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں، اس کی خود مختاری بھی کوئی مسئلہ ہے، اس کی حکومت کی تدبیلی کا بھی کوئی اصول ہونا چاہیے، میں الاقوامی تنازعات کا کوئی معیار بھی ہوتا ہے، کسی ملک پر دوسرے ملک کے حملہ سے کوئی میں الاقوامی ضابط اور قانون ٹوٹ بھی جایا کرتا ہے، اور کسی ملک کی سالمیت اور اندر وہی خود مختاری کے تحفظ میں میں الاقوامی برادری کا بھی کوئی کردار ہوتا ہے۔

ہمیں خوش ہے کہ مسلم حکمران بہت دیر سے ہی مگر کسی جگہ مل تو بیٹھے ہیں اور انہیں کچھ ضابطے اور اصول بھی یاد آگئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد کا خاص اکابردار ہے کہ وہ مغرب کے اس دوہرے معیار کے خلاف مسلسل آواز بلند کر رہے ہیں، اقوام و ممالک کی خود مختاری کے احترام کی طرف مسلسل توجہ دلار ہے ہیں اور ایک عرصہ سے مسلم حکمرانوں کو جنہیوں ہے ہیں کہ وہ متعدد ہو کر ایک موقف طے کریں اور اکیلے اکیلے مرنے کے بجائے مل جل کر عالمی استعمار کا پنجہ ڈھیلا کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے غیر وابستہ کافرنیس کا سربراہی اجلاس بلا یا اور اسلامی سربراہ کافرنیس کا ایک ہنگامی اجلاس بھی منعقد کر ڈالا جس کے فیصلے کے مطابق قطر میں مذکورہ اجلاس ہوا ہے اور مسلم حکمرانوں نے یک آواز ہو کر امریکی عزم اور پروگرام کے حوالے سے اپنے مشترکہ موقف کا کسی حد تک اظہار کر دیا ہے۔

ہم قطر کی اسلامی سربراہی کافرنیس کے فیصلوں اور موقف کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسے تمام تر تحفظات کے باوجود امید کی ایک کرن سمجھتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں نے مل بیٹھنے کی ضرورت تو محضوس کی اور کسی مشترکہ موقف کے تعین اور اظہار کا حوصلہ تو کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم مسلم حکمرانوں سے یہ گزارش ضروری سمجھتے ہیں کہ مغرب کو ملکوں کی سالمیت و خود مختاری کے احترام اور دوہرے معیار تک کرنے کا جائزہ مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ خود اپنے متفاہ موقف اور دوہرے معیار کا بھی جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور عراق کی خود مختاری، اندر وہی معاملات اور سالمیت کے حوالے سے خود ان کے ضابطے اور معیار کہیں الگ الگ تو نہیں ہیں؟

## اسامہ بن لادن اور امریکی تحریکِ آزادی کے جنگجو

روزنامہ پاکستان، لاپور ۲۱ مارچ ۲۰۰۳ء

ایک معاصر اخبار نے این ایں آئی کے حوالے سے یہ خبر شائع کی ہے کہ امریکی کانگریس کی ایک غالتوں رکن امریکی

لیپٹر Marcy Kaptur نے اسامہ بن لادن کو دہشت گرد قرار دینے کے موقف سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ اسامہ بن لادن مذہبی طور پر آزادی کی جنگ لڑنے والے انقلابی رہنماؤں کی طرح ہیں جیسا کہ امریکہ میں ۷۰٪ ائمہ و رہائش میلیشیا نے برطانوی سامراج کے خلاف اسی طرح کی جدوجہد کی تھی۔ مارکی لیپٹر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اواپیو ڈسٹرکٹ سے گیارہویں بار کانگریس کی رکن منتخب ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب اور اسلامی دنیا کی خالی حکومتوں کے خلاف بھی اسی طرح کی انقلابی تحریکیں شروع ہو چکی ہیں جس طرح کی تحریکیں برطانوی سامراج کے خلاف شروع ہوئی تھیں اور اس انقلاب کو دہشت گردی کا نام دینا قابل قبول نہیں ہے۔

ہم تو ابتداء سے ہی یہ عرض کر رہے ہیں کہ ”دہشت گردی“ کا عنوان صرف ان کارروائیوں کو جواز فراہم کرنے کیلئے اختیار کیا گیا ہے جو عالم اسلام میں عالمی استعمار کے آہنی شکنچ کو توڑنے اور مسلم ممالک و اقوام کی خود مختاری کی بجائی کیلئے اٹھنے والی تحریکوں کو کچلنے کیلئے کی جا رہی ہیں۔ اور جن کارروائیوں کا واحد مقصد عالم اسلام میں حریت فکر اور خود مختاری کے جنبات کو دبا کر عالمی استعمار کے شکنچ کو دوبارہ متحکم کرنا ہے تاکہ استعماری قوتیں کسی رکاوٹ اور احتجاج کا سامنا کیے بغیر مسلم دنیا کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھ سکیں اور مسلم ممالک کی سیاست و معیشت پر ان کا نثرول بدستور قائم رہے۔

اسامہ بن لادن کی جدوجہد اور اس کے عزائم و مطالبات پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ طریقہ کار سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود یہ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ یہ سب کچھ آخر کیوں کر رہا ہے اور اسے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ اسامہ بن لادن سعودی عرب کے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے جس کی ولادت و پرورش شہزادوں کی طرح ہوئی ہے۔ لیکن اس نے افغانستان پر روس کے مسلح حملہ کے خلاف افغان عوام کی جدوجہد کا ساتھ دیا اور جہاد کے دینی جذبہ کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ اس نے صرف خود جہاد میں عملاً حصہ لیا بلکہ ہزاروں مجاہدین کے اخراجات برداشت کیے اور مجاہدین کے مختلف گروپوں کی بے پناہ مالی امداد کی۔ اس سوویت یوین کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کی جماعت حاصل تھی، مغربی اور مسلم ممالک بھی اس جدوجہد میں تعاون کر رہے تھے، اور اس کا تذکرہ عالمی میڈیا میں ایک مجاہد اور حریت پسند کے طور پر ہوتا تھا۔ لیکن سوویت یوین کی افغانستان سے پسپائی کے بعد جب اسامہ بن لادن نے سعودی عرب واپس جا کر خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی بلا جواز موجودگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور سعودی عرب کے داخلی نظام میں اصلاحات کیلئے آواز اٹھائی تو وہ اچانک ”مجاہد آزادی“ کے تمغے سے محروم ہو کر ”دہشت گرد“ ہونے کے الزام کا ہدف قرار پا گیا۔

اسامہ بن لادن کے دو ہی مطالبے تھے اور ہیں:

- ایک یہ کہ امریکہ اور اس کے اتحادی خلیج عرب سے اپنی فوجیں واپس بلائیں۔
  - اور دوسری یہ کہ سعودی عرب کے داخلی نظام میں شریعت اسلامیہ کے مطابق اصلاحات کی جائیں۔
- دنیا کا کوئی باشمور اور انصاف پسند شخص ان دو مطالبوں کی معقولة سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ یہ بات پوری دنیا پر

واضح ہو چکی ہے کہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی افواج تبل کے چشمتوں پر قبضہ اور اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے براجمن ہیں۔ ان نوجوں کی خلیج عرب میں موجودگی اس خطہ کے بہت سے ملکوں کی خود منماری کو محروم کر رہی ہے اور عوام کی مریضی اور رائے کے خلاف شخصی آمریتوں کو تحفظ فراہم کرنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ خلیجی ممالک کے عوام کی اکثریت رائے کی آزادی، دوٹ کے حق، اور دیگر شہری و انسانی حقوق سے محروم ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی ہے۔

امریکہ نصف صدی قبل اقوام متحده کے قیام کے بعد سے دنیا بھر میں جن شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کا ڈھنڈورا پہنچ رہا ہے اور اقوام متحده کے بنیادی حقوق کے چار ٹکا علمبردار بنایا ہے، ان میں سے بیشتر حقوق خلیج عرب کے خطہ میں ایک سوالیہ نشان بننے ہوئے ہیں۔ اور یہ صور تھال صرف اور صرف امریکی پالیسیوں، ترجیحات، اور اس کی افواج کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے اسامہ بن لادن اگر خلیج عرب سے امریکی فوجیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ عرب عوام کے جائز حقوق کی بحالی کا مطالبہ ہے۔ لیکن امریکہ اور اس کے حواری اسامہ بن لادن کے اس جائز، اصولی اور منطقی مطالبے پر کان و ہر نے کی بجائے مطالبہ کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دے کر دنیا کی توجہ عرب عوام کے جائز حقوق سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سعودی عرب کے داخلی نظام میں شریعت اسلامیہ کے مطابق اصلاحات کا مطالبہ بھی ناروا اور غیر معقول نہیں ہے اس لیے کہ خود سعودی حکومت اس بات کو حکم کھلا تسلیم کرتی ہے کہ سعودی نظام کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ جبکہ سعودی حکومت کے سرکردہ علمائے کرام کو یہ شکایت ہے کہ تعلیم اور عدالت کے دائروں کے سوامک کے باقی قومی شعبوں میں گذشتہ ربع صدی کے دوران جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ قرآن و سنت کے احکام کے منافی ہیں۔ ان میں بہت سی اصلاحات و ترمیمات کی ضرورت ہے جنہیں سعودی عرب کے سابق چیف جنگیش اشیخ محمد بن ابراہیم سعودی حکمرانوں کے نام اپنے خطوط میں واضح کر کچے ہیں، یہ خطوط ان کے قاتوں میں مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ اور اب سے دس سال قبل سعودی عرب کے دوسوے زائد سرکردہ علمائے کرام اور دانشوار ایک ”عرض داشت“ کی صورت میں اس حوالے سے اپنے مطالبات تفصیل کے ساتھ سعودی فرمائزا کو پیش کر کچے ہیں۔ چنانچہ اسامہ بن لادن اگر وہی مطالبات دہرا کر سعودی عرب کے داخلی نظام میں شرعی اصلاحات کی پات کرتا ہے تو وہ کوئی ناجائز بات نہیں کرتا اور اس وجہ سے اسے گردن زندگی کا مستحق قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

البتہ اپنے مطالبات کیلئے اسامہ بن لادن کے طریق کار پر گفتگو کی گنجائش موجود ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا بھی ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اگر اپنے ملک میں بلکہ پورے خطے میں سیاسی عمل اور رائے عامہ کے حوالے سے جدوجہد منظم کرنے کا کوئی راستہ موجود ہوتا اور اسامہ بن لادن اس محفوظ اور پر امن راستے کو ترک کر کے تشدد کا راستہ اختیار کرتا تو شاید بھی اس کی جدوجہد کے طریق کار کو غلط قرار دینے والوں میں شامل ہوتے۔ کیونکہ ہم اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ دین یا سیاست میں کسی بھی حوالے سے اصلاح احوال کی جدوجہد کیلئے پر امن راستہ موجود ہو تو تشدد کا راستہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک تشدد ایک آخری حریج ہے جو مظلوم قومیں اور طبقات

اپنے وجود، شخص، اور خود مختاری کے تحفظ کیلئے امن کے سارے راستے مسدود ہو جانے پر مجبوڑا اختیار کیا کرتے ہیں۔ اور اسے تمام اقوام و ممالک کے ہاں یک طور پر ایک جائز حق کی صورت میں مسلمہ اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ امریکی حریت پسندوں نے بھی اسی وجہ سے تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا اور آزادی کے حصول کیلئے ہتھیار اٹھائے تھے۔ اور اس بات کے ثبوت کیلئے مارکی کمپنی کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے، خود امریکہ کی تحریک آزادی پر ایک نظر ڈال لجیجے۔ آپ کو ایسے سینکڑوں اسامہ بن لادن نظر آئیں گے جنہوں نے برطانوی سامراج کے تسلط کے خلاف ہتھیار اٹھائے، مسلسل جنگ کی، شب خون مارے، ہزاروں متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگوں کا خون بھایا، خود اپنی جانوں کی قربانی پیش کی، اور آگ و خون کا ایک طویل صحراء عبور کر کے امریکہ کو آزادی اور خود مختاری کی منزل سے ہمکنار کیا۔

ہمارے ہاں جنوبی ایشیا میں بھی برطانوی سامراج کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کیلئے میسیوں تحریکیں اٹھیں، شہدائے بالاکوٹ، مجاہدین ۱۸۵۷ء، علمائے صادق پور، سندھ کے حر مجاہدین، پنجاب کے سردار احمد خان کھڑل، صوبہ سرحد کے فتحراپتی، نواب صاحب ترکمانی، حاجی شریعت اللہ نیشنیز شہید، اور امیر المجاہدین حاجی امداد اللہ مہاجر کلی جیسے سینکڑوں مجاہدین آزادی کے کارنا مے ہماری ملی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں جن کا نام لے کر ہم سرفراز سے بلند کرنے کے قابل ٹھہر تے ہیں۔ یہ سب اپنے اپنے دور کے اسامہ بن لادن ہی تھے۔ ان کی جدوجہد کا طریقہ کار اور اہداف بھی وہی تھے جو آج اسامہ بن لادن کا ہدف اور طریقہ کار ہے۔ اس لیے جب اسامہ بن لادن کو دہشت گرد کہا جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے شہدائے بالاکوٹ سے لے کر فتحراپتی تک آزادی کے تمام مجاہدین کو دہشت گردوں کی لائن میں کھرا کر دیا گیا ہے۔ بلکہ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف امریکہ کی آزادی کیلئے سچ جنگ لڑنے والے وہ تمام حریت پسند بھی اسی صفت میں کھڑے دھکائی دیتے ہیں جن کا محترمہ مارکی کمپنی نے اپنے بیان میں تذکرہ کیا ہے۔

این این پی کی روپورٹ کے مطالب محدث مارکی کمپنی کے اس بیان پر امریکی حقوق میں خاصی لے دے ہو رہی ہے اور روپورٹ کے الفاظ میں امریکی حکومت میں محلی سی پچی ہوئی ہے، بہت سے ارکان اس پر غم و غصہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن ایوان کے اکثری لیڈر نے ارکان کو مشورہ دیا ہے کہ اس بیان کی مذمت نہ کی جائے اور اس معاملے کو احتیاط کے ساتھ دیکھا جائے کیونکہ یہ حساس معاملہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ نے اپنے سامراجی عزائم کو آگے بڑھانے کیلئے عالمی سطح پر یک طرفہ پروپگنڈا اور مسلم مجاہدین کی کردار کشی کی ہم کا جو تابانا تیار کر کھاتھا، وہ بکھر رہا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ دنیا بھر کے عوام نے معاملات کو ان کے اصل پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے، جیسا کہ گذشتہ ماہ دنیا کے سینکڑوں شہروں میں ہونے والے زبردست احتجاجی مظاہروں سے واضح ہو گیا ہے، بلکہ انصاف پسند امریکی راہنماؤں نے بھی امریکی حکومت کے موقف اور ڈکیشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن انسانی ضمیر اور عالمی رائے عامہ کی یہ صدائے احتجاج بھی عراق کے خلاف امریکہ کے جنگی جنون کے اظہار میں رکاوٹ نہیں بن سکی۔ اس نے عراق پر حملہ کر دیا ہے اور اس کی توپیں، میزائل، اور بمبار طیارے عراقی عوام پر آتش و آہن کی بارش کر رہے ہیں۔ اب دنیا یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ کیا خود امریکہ دہشت گردی کا مرکنک میں ہو رہا؟

## ملتِ اسلامیہ کے بھرائی اور ہماری دینی قیادت

۳۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو مجلسِ احرار اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاپور میں ۱۹۵۳ء

کی تحریکِ ختم نبوت کے شہداء کی یاد میں پیر جی سید عطاء المہین شاہ  
بخاری کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک تقریب سے خطاب

بعد الحمد للہ۔ آج ہم ان عظیم شہداء ختم نبوت کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے جن میں جنہوں نے ۱۹۵۳ء میں  
عقیدہ ختم نبوت اور ناموس رسالت کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی جانوں کا نذر انہ پیش کیا اور قادیانیت کے  
بڑھتے ہوئے قدموں کو بریک لگا دی۔ اس تحریک میں جس کی قیادت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حضرت مولانا  
سید ابوالحسنات قادری اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی جیسے عظیم بزرگوں کے ہاتھ میں تھی، دینی جماعتوں کے دو  
بڑے مطالبات تھے۔

1. ایک یہ کہ قادیانیوں کو ملک میں دستوری حوالے سے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے،

2. اور دوسری یہ کہ قادیانی لیڈر چودھری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے بر طرف کیا جائے۔

چودھری ظفر اللہ خان قیامِ پاکستان کے بعد سے ملک کے وزیر خارجہ چلے آرہے تھے اور ان کی وجہ سے نہ صرف  
ملک کے اندر سرکاری طور پر قادیانیوں کا اثر و سورخ بڑھ رہا تھا بلکہ بیرون ملک بھی پاکستان کے سفارتخانے قادیانیت کی  
تبیخ اور اژروں نفوذ کے اڈے بنتے جا رہے تھے۔ ملک کی دینی جماعتوں نے چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ کیا لیکن  
ان کا مطالبہ منظور کرنے کی بجائے تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں کو تنہد کا شانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد  
شہید ہوئے اور ہزاروں علماء کرام اور دینی کارکن جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیے گئے۔

میں اس حوالے سے ایک اور اہم پہلوکی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج جس خارجہ پالیسی نے پوری قوم کو بندگی  
میں دھکیل دیا اور امریکی غلامی کے ریموت کنٹرول شکل میں اس بڑی طرح جگہ رکھا ہے کہ ہم بے بسی کی تصویریں کر رہے گئے  
ہیں۔ یہ خارجہ پالیسی چودھری ظفر اللہ خان کی تشكیل کردہ ہے۔ اس قادیانی وزیر خارجہ نے پاکستان کو امریکہ نواز پالیسی کی  
پڑھی پڑھا ہیا اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۵۳ء تک پانچ چھ سال کے عرصہ میں ملک کو امریکی مفادات کے چنگل میں اس قدر پھنسا  
دیا کہ ہم آج تک اس میں مزید آگے کی طرف دھستے چلے جا رہے ہیں اور ہمیں پیچھے ہٹنے بلکہ دایکنیں دیکھنے کا بھی کوئی  
راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ سارا کرشمہ چودھری ظفر اللہ خان کا ہے اور اس کی بوئی ہوئی فصل آج پوری قوم کو کاشتی پڑھ رہی  
ہے۔ دینی حقوقوں نے تو پاکستان بننے کے بعد سے ہی اس پر واویلا مچانہ شروع کر دیا تھا لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہ دی اور  
آج اس کا خمیازہ پوری قوم بھگلت رہی ہے۔

ہمارا الیہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ قومی و ملی معاملات میں دینی قیادت کے موقف کو نظر انداز کیا ہے اور ہر بار اس کی سزا  
بھگتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے طرز عمل میں کوئی تبدیلی ابھی تک دیکھنے میں نہیں آ رہی۔ آج سے ایک صدی قبل  
جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کیلئے عرب ممالک میں عرب قومیت کے نام پر اور ترکی میں ترک نیشنلزم کے نام پر جذبات

کو ابھارا جا رہا تھا اور خلافت کو بے فائدہ قرار دے کر اسے ختم کرنے کی سازش کی جا رہی تھی، ہماری دینی قیادت نے اس وقت بھی شور مچایا تھا کہ خلافت کے خاتمہ کی یہ تحریک یہودیوں کی سازش ہے۔ بہت سے عرب علماء نے آوازِ اٹھائی اور ہمارے ہاں جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں زبردست عوامی تحریک خلافت پہاڑوںی۔ اس کا مقصد بھی تھا کہ خلافت کا تحفظ کیا جائے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی سیاسی مرکوزیت کے اس ادارے کو بچایا جائے لیکن نہ ترکوں نے بات سنی اور نہ ہی عربوں نے اس آواز پر توجہ دی۔ حتیٰ کہ شیخِ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کو تو شریف مکہ نے اسی جرم میں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کیا تھا کہ انہوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت کے جواز کے فتوے پر مستحب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس موقع پر جنوبی ایشیا کی دینی قیادت نے ایک اور آواز بھی اٹھائی کہ یہاں کے مسلمان برطانیہ کی فوج میں بھرتی نہ ہوں۔ متحدر ہندوستان کے سینکڑوں علماء کرام نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ برطانیہ کی فوج میں مسلمانوں کا بھرتی ہونا حرام ہے اس لیے کہ یہ فوجِ اسلام کے خلاف، مسلمانوں کے خلاف اور خلافت عثمانیہ کے خلاف استعمال ہوگی۔ مگر اس فتویٰ پر کسی نے کان نہ دھرے، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اُنگریزی فوج میں بھرتی ہوئے اور پھر یہی فوجی مشرق وسطیٰ لے جائے گئے اور انہیں کے ہاتھوں ترک فوجیوں کو شکست دلو اکر خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی راہ ہمواری کی گئی۔ آنچہ خلافت کا فورم موجود ہوتا، خواہ کتنی ہی کمزور اور ڈھیلی دھامی خلافت ہوتی، مگر عالمی سطح پر اپنی بات کہنے کا کوئی فورم تو ہوتا اور حالات یقیناً اس مقام تک نہ پہنچتے جن کا ہم اب سامنا کر رہے ہیں۔

ہم اسی دور سے کہہ رہے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہے لیکن آج اسرائیلی وزیر دفاع جزیر موقاذه نے کھلے بندوں یہ بات کہہ کر ہمارے موقف کی تصدیق کر دی ہے کہ ہمیں عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید دوم نے فلسطین میں آباد ہونے کیلئے جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا اس کے نتیجے میں ہم نے نہ صرف اس کی حکومت ختم کر دی بلکہ سرے سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔ جزیر موقاذه نے ایک بات اور بھی کہی ہے کہ عراق پر اب ہمارا قبضہ ہو گا اور اسرائیل کے عزائم میں جو بھی حشر ہو گا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسرائیل کے عزم کیا ہیں اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عراق پر امریکہ اور برطانیہ کا حملہ دراصل اسرائیل کی توسعہ اور ”عُظیم تر اسرائیل“ کے قیام کے منصوبے کا حصہ ہے جس میں عراق، مصر، شام، بیزان اور دیگر علاقوں کے علاوہ مدینہ منورہ سمیت سعودی عرب کا بھی ایک بڑا اعلاقہ شامل ہے۔

دینی قیادت نے اس وقت بھی واپسی کیا تھا جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر کے اپنا گورنمنٹ خدا یا تھا اور دنیا بھر کے یہودیوں کو یہ حق دے دیا تھا کہ وہ فلسطین میں آکر آباد ہو سکتے ہیں اور زمین خرید کر کا لو نیا بن سکتے ہیں۔ اس وقت سرکردہ علماء کرام نے فتویٰ دیا تھا کہ یہودی چونکہ فلسطین میں آباد ہو کر اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں اور بیت المقدس پر قبضہ بھی ان کے پروگرام میں شامل ہے اس لیے فلسطین میں یہودیوں کو زمین کا بچنا شرعاً جائز نہیں۔ یہ فتویٰ ہمارے بزرگوں نے بھی جاری کیا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی گفتایت اللہ دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتاویٰ موجود ہیں۔ اور حضرت تھانویؒ کا تفصیلی فتویٰ ان کی کتاب

”بودار انواور“ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن کسی نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور فلسطینی اپنی زمینوں کو ڈیڑھ گنا اور دو گنا قیمت کی لائچ میں بیوہ دیوں پر فروخت کرتے چلے گئے جس کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے کہ جن بیوہ دیوں کا آج سے ایک صدی قبل فلسطین کی آبادی میں قابل ذکر حصہ نہ تھا، آج وہ دہائی صرف قابض ہیں بلکہ پوری عرب دنیا کیلئے عذاب بننے ہوئے ہیں۔

حالیہ عالمی بحران کے آغاز میں بھی ہماری دینی قیادت نے امت کی بروقت رہنمائی کی کہ امریکی خواہشات اور عزائم کے سامنے گردن جھکانے اور ہاں میں ہاں ملاتے چلے جانے کی بجائے جرأت و حوصلہ کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہماری بات پر بروقت توجہ نہ دی گئی اور آج وہی بات سب حضرات کہہ رہے ہیں۔ میں اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی سربراہ کانفرنس تظمیم (او آئی سی) نے آج جو موقف اختیار کیا ہے کہ عراق کی سرحدوں، ملکی سالمیت اور قومی وحدت کا تحفظ ضروری ہے اور اس کے خلاف کسی اقدام کی حمایت نہیں کی جائے گی، یہ موقف آج سے ڈیڑھ سال قبل افغانستان پر امریکہ کے حملہ سے پہلے اختیار کرنے کی ضرورت تھی اور اس موقف کا صحیح وقت وہ تھا۔ کیونکہ افغانستان کی قومی وحدت اور سرحدوں کے قاضے بھی اس نوعیت کے تھے لیکن ہم نے اس وقت جائز موقف اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح ہمارے عرب بھائیوں نے اس وقت یہ سوال کھٹا کر دیا کہ کسی عرب ملک پر حملہ نہ کیا جائے لیکن صرف ایک سال کے بعد ایک عرب ملک پر نہ صرف حملہ ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ کئی عرب ممالک کی سرحدات اور قومی سلامتی بھی خطرات سے دوچار ہو گئی ہے۔ ہمارے خیال میں او آئی سی اور عرب لیگ نے آج جو موقف اختیار کیا ہے اور اس پر استینڈ لیا ہے اس کا صحیح وقت افغانستان پر امریکہ کی یلغار سے قبل تھا۔ اب بھی غنیمت ہے کہ ہمارے مسلم اور عرب حکمرانوں نے کسی جگہ کھٹا ہونے کی ضرورت محسوس کی، لیکن امر واقع یہ ہے کہ یہ موقف اگر افغانستان پر امریکی حملہ سے قبل اختیار کر لیا جاتا اور مسلم حکمران اس پر سنجیدگی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو نہ صرف افغانستان تباہی سے نجات ملتا تھا بلکہ عراق اور اس کے ساتھ دیگر کئی عرب ممالک کی تباہی کو بھی نالا جاستھا۔

بہر حال ان معروضات کا مقصد یہ ہے کہ ہماری دینی قیادت نے ہر در میں اور ہر اہم مسئلہ پر امت کو حالات کی گلنی سے خردار کیا اور صحیح موقف کی طرف را رہنمائی کی لیکن ہم نے قومی اور ملکی سطح پر کبھی اس کی بات پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور ہر پار اس کی سزا بھگتی ہے۔ آج بھی حالات کا تقاضا ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام کے حالیہ بحران اور ملکی مسائل کے حوالے سے دینی قیادت کی آواز کو سننا جائے اور اسے سنجیدہ توجہ دی جائے کیونکہ ملی حیثیت اور دینی غیرت کا تقاضا یہی ہے اور مشکلات و مصائب کی دلدل سے نکلنے کا راستہ بھی بھی بیہی ہے۔

## اسامہ انقلابی راہنما ہیں: امریکی کانگریس وومن مارکی کیپٹر

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اپریل ۲۰۰۳ء

روزنامہ اسلام کرچی نے الارجح ۲۰۰۳ء کو این ایسی کے خواں سے خبر دی ہے کہ امریکی کانگریس کی ایک خاتون رکن مسز مارکی کیپٹر Marcy Kaptur نے گذشتہ دونوں ایک اخبار کو اثر یو دیتے ہوئے یہ کہہ کر امریکی حلقوں میں ھکلبی چادی ہے کہ اسامہ بن لادن کو دہشت گرد قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ وہ ایک انقلابی راہنماییں جو اپنے ملک میں ظالم حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مسز مارکی کیپٹر کا کہنا ہے کہ اسامہ بن لادن ان امریکی انقلابیوں سے مماثلت رکھتے ہیں جنہوں نے ب्रطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ روپرٹ کے مطابق امریکی کانگریس کی خاتون رکن ڈسٹرکٹ اوہا یو سے گیارہویں دفعہ مسلسل کانگریس کی رکن منتخب ہوئی ہیں، اور ان کے اس بیان پر پارٹی کے حلقوں میں غم و غصہ پایا جاتا ہے، لیکن کانگریس کے اکثریٰ لیڈر نام ڈیلے نے یہ کہہ کر پارٹی ارکان کو مسز مارکی کیپٹر کی خدمت کرنے سے روک دیا ہے کہ یہ نازک معاملہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ امریکی کانگریس کی مذکورہ خاتون رکن نے اسامہ بن لادن اور دیگر مجاہدین اسلام کے خلاف امریکی راہنماؤں اور میڈیا کے یک طرفہ معاندانہ پروپیگنڈا کو مسترد کرتے ہوئے امریکی معاشرہ کو آئندہ دکھایا ہے کہ جس عمل کو امریکی لیڈر دہشت گردی کہہ رہے ہیں وہ خود ان کے بڑے بھی کرتے رہے ہیں، اور استعماری مظالم کا نشانہ بننے والی ہر قوم کو اس عمل سے مجبو را گزرنے پڑتا ہے۔

امریکہ میں ایک عرصہ تک ب्रطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف مسلح جنگ آزادی جاری رہی ہے، اور اگر اس دور کی تاریخ کو سامنے لایا جائے تو امریکی قوم میں بیسوں ایسے اسامہ بن لادن نظر آئیں گے جو ہتھیار بکف ہو کر بیروفی غاصبوں کے خلاف سالہا سال تک برسر جنگ رہے ہیں۔ اس لیے مسز مارکی کیپٹر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اگر ان امریکی چھاپ ماروں کو دہشت گرد قرار دینے کی بجائے ”فریڈم فائز“ کے طور پر قومی ہیر و سمجھا جاتا ہے تو اسامہ بن لادن کی جنگ بھی اسی طرح کی ہے، اس لیے اسے دہشت گرد قرار دینے کا ہمی کوئی جواز نہیں ہے۔

## امام ولی اللہ دہلوی اور امارتِ اسلامی افغانستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۰۰۳ء

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اب سے تین صدیاں قبل ایک بات کہہ دی تھی کہ اب آنکہ عالم اسلام میں اسلامی نظام کے احیا اور خلافت کے قیام کی بنیاد فک کل نظام پر ہو گی اور اس کیلئے ان کے افکار و فلسفہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گی۔ فک کل نظام کا مطلب یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے موجودہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں اصلاح و

تزمیم کی گنجائش نہیں ہے اور اس ڈھانچے سے مکمل نجات حاصل کر کے نئے نقشے پر ہی ملتِ اسلامیہ کی نئی اسلامی زندگی کا آغاز ہو سکے گا۔ موجودہ معاشرتی، سیاسی اور معاشری ڈھانچے نے ایک ہزار سال سے زیادہ وقت گزار لیا ہے، اس نے آزادی اور عز و احترام کا دور بھی دیکھا ہے اور غلامی اور زوال کے دور سے بھی ملتِ اسلامیہ اسی ڈھانچے کے ساتھ گزری ہے۔ اب اس بلڈنگ کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ اس میں مرمت اور جزوی اصلاح و تعمیر کے ساتھ صورتحال میں اصلاح کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور جیسا کہ دنیا کا عمومی رواج اور روایت ہے کہ نئی بلڈنگ تعمیر کرنے کیلئے پرانی بلڈنگ کو گرانا پڑتا ہے۔ اب اس بات کا وقت آگیا ہے کہ اس بوسیدہ عمارت سے بھی جان چھڑالی جائے اور از سر نو نقشہ ترتیب دے کر اس پر ملتِ اسلامیہ کی نشانہ ثانی کی عمارت کھڑی کی جائے۔

اس نئے نقشے کیلئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فکری بنیاد بھی فراہم کی ہے کہ ہمیں سب سے پہلے انسانی سوسائٹی اور عالمگیر معاشرت کیلئے اسلامی نظام و قوانین کی افادیت و ضرورت کو ثابت کرنا ہو گا اور دنیا کو عقل و منطق اور فہم و استدلال کے ساتھ بتانا ہو گا کہ انسانی سوسائٹی کو مقامی، علاقائی اور عالمی سطح پر جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل قرآن و سنت میں موجود ہے اور وہ حل سب سے بہتر ہے اس لیے دنیا کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ارشاد ہے کہ قرآن کریم کے مخزہ ہونے کی جو مختلف علمی صورتیں (وجہہ اعجاز) ہیں اور جن کے حوالے سے قرآن کریم نے دنیا بھر کو چیلنج کیا ہے کہ کوئی فرد یا قوم قرآن کریم کے مقابلہ کی کوئی کتاب لاسکتی ہو تو لا کر دکھائے۔ اس چیلنج کا ہر دور میں الگ الگ مفہوم رہا ہے۔ کسی زمانے میں جبکہ دنیا میں فصاحت و بلاعث کا عز و تھا اور قوموں کیلئے سب سے زیادہ باعث فخر ان کی زبان دانی اور فصاحت ہوا کرتی تھی، ان کیلئے قرآن کریم کا چیلنج اس پہلو سے تھا کہ کوئی فرد یا قوم فصاحت یا بلاعث میں قرآن کریم کا مقابلہ کر کے دکھائے اور اگر وہ پوری کتاب نہیں لاسکتے تو کم از کم ایک سورۃ کا مقابلہ ہر کروکھائیں۔ مغرب آنے والا دور پوکنہ سماجیات، سُسٹم، قانون اور عالمگیر معاشرت کا ہے اس لیے قرآن کریم کے اس چیلنج کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے کہ انسانی سوسائٹی کی تنظیم، معاشروں کی فلاخ و بہبود اور نسل انسانی کے مسائل کے حل کیلئے قرآن کریم نے جو قوانین و ضوابط پیش کیے ہیں، افادیت و ضرورت اور نتائج و ثمرات کے حوالے سے ان کے مقابل کا کوئی ایک قانون دنیا والے پیش کر دیں۔ لیکن جیسے دوسرے میدانوں میں قرآن کریم کا مقابلہ کسی قوم سے آج تک نہیں ہو سکا اس میدان میں بھی نہیں ہو سکے گا۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہمارے سامنے آچکی ہے اور ہم نے اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے، وہ یہ کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ابھی تک اس کو یاد کیا جا رہا ہے اور نہ صرف یہ افغانستان کے باشندے اس دور کے امن کا تذکرہ کر رہے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی دانشگاہوں میں یہ مسئلہ بحث اور مکالمہ کا موضوع بنا ہوا ہے کہ طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور میں اپنے کثروں کی حدود میں وہ امن کیسے قائم کر لیا تھا جو اب فوجوں اور وسائل کی فراوانی کے باوجود قائم نہیں ہو رہا؟ اور یہ کیا بات تھی کہ طالبان کے امیر کے ایک رسی حکم پر کسی لائق اور تنخویف کے بغیر ان کے زیر کنٹرول پورے علاقے میں پوست کی کاشت ختم ہو گئی تھی مگر اب لائق اور ڈر کے تمام حربوں کے باوجود اس کی کاشت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ بعض اخباری روپرتوں کے مطابق طالبان رہنماؤں سے اس سلسلہ

میں رابطہ بھی کیے گئے ہیں کہ وہ یہ بتائیں کہ انہوں نے امن کیسے قائم رکھا ہوا تھا لیکن اس میں کوئی راز کی بات نہیں ہے اور نہ ہی کسی لمبے چوڑے فلسفے کا مسئلہ ہے بلکہ سادہ سی بات ہے کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں اپنے زیر کنٹرول علاقے میں قرآن و سنت کے احکام کی عملداری کا اعلان کر کھا تھا اور وہ اس پر اپنی استطاعت کی حد تک عملدار میں بھی سنجیدہ تھے۔ یہ قانون افغان عوام کے عقیدہ اور معاشرت دونوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا اس لیے انہیں اس پر عملدار میں کوئی اجنیبت محسوس نہیں ہوئی، انہوں نے تجھا کہ وہ کسی مسلط ہونے والے گروہ کے احکام پر عمل نہیں کر رہے بلکہ اپنے پیدا کرنے والے خدا کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں جس کے ہر فصلے میں حکمت ہے اور کسی حکم میں اس کا پانی کوئی مناد وابستہ نہیں ہے، وہ ہمارے مسائل و مشکلات سے کما حقہ آگاہ ہے اور ان کو دور کرنے کی پوری قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمارا خیر خواہ اور مہربان بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قانون کو کسی بھی معاشرہ میں عقیدہ دلیقین کی یہ پشت پناہی میسر ہوگی اسے نفاذ کیلئے کسی لمبے چوڑے سٹم اور ڈھانچے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور ہر شہری کا ذہن اور ضمیر خود بخواہ سے قانون کی پابندی کیلئے تیار کر لے گا۔ جبکہ اس کے برکس جس قانون اور ضابطے کے بارے میں عام لوگوں کا یہ تاثر ہو کہ یہ مسلط لوگوں نے اپنے مفادات کیلئے نافذ کیا ہے اور اس میں عوام سے زیادہ نافذ کرنے والوں کا مناد وابستہ ہے، یعنی نافذ کرنے والوں کو نہ ان کی حقیقی مشکلات کا علم ہے اور نہ ہی وہ لوگوں کے اس درجہ کے خیر خواہ ہیں کہ ان کے فائدہ کیلئے خود اپنے مفادات کی قربانی دے سکیں تو ایسے قوانین اور ضوابط کو کسی بھی معاشرہ میں نفاذ اور اثر انداز ہونے کیلئے مصنوعی سہاروں اور دباؤ کی ضرورت ہر وقت رہے گی۔ وہ قانون اور ضابطہ اسی وقت تک نافذ اور متوثر ہے گا جب تک اسے دباؤ اور سہارے کی طاقت میسر ہو گی اور جو نہیں یہ دباؤ اور سہارا کمزور پڑے گا، قانون بھی فضایں تخلیل ہو کر رہ جائے گا۔

اسلام کے قانون کا امتیاز یہی ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان اور دلیقین کا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر معاشرتی نظام کا ڈھانچہ استوار کرتا ہے۔ یہ خصوصیت دنیا کے کسی اور نظام کو حاصل نہیں ہے بلکہ دنیا نے علاقائی قویتوں کے جو بہت انسانی عقیدت و محبت اور وفاداری و اطاعت کے جذبات کی تسلیک کیلئے تراش رکھے ہیں اور جن مصنوعی سہاروں پر مختلف نظام اب تک چل رہے ہیں وہ بہت بھی انحریف نہ لزム اور یہin الا قوامیت کے بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے خود کو ہٹھا رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پڑ رہے۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ارشاد کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کو عقیدہ اور دلیقین کی قوت سے ایک بار پھر روشناس کرایا جائے اور نسل انسانی کو یہ پیغام دیا جائے کہ انسانی نسل میں کسی نظام اور فلسفہ و فکر کے فروغ اور نفاذ کیلئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد عقیدہ پر ہو۔ اور کائنات کو پیدا کرنے والی ذات پر دلیقین ہی وہ واحد عقیدہ ہے جو انسانوں کو کسی ایک سٹم میں مربوط کر سکتا ہے۔ قرآن کریم اسی عقیدہ کا اعلان کرتا ہے، اسی کی طرف پوری نسل انسانی کو بلا تا ہے، اسی کو انسانی معاشرہ کی واحد فکری بنیاد قرار دیتا ہے اور اسی کو اپنا کر انسانی سوسائٹی ایک بہتر عالمی ماحول اور کامیاب گلوبل سٹم کی طرف پیش رفت کر سکتی ہے۔

## افغانستان میں ہیروئن کا کاروبار

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۲۰۰۳ء

روزنامہ اوصاف اسلام آباد نے میں ۲۰۰۳ء کو اپنے پیپر کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ کشم حکام نے چھاپ مار کر افغانستان سے پاکستان آنے والی ۵۸۰ ملین روپے مالیت کی ہیروئن پکڑی ہے، یہ ہیروئن کوئی میں پکڑی گئی ہے اور اسے پیپر کی رپورٹ کے مطابق یہ اب تک کسی بھی ایجنسی کی طرف سے پکڑی جانے والی ہیروئن کی سب سے بڑی مقدار ہے جو کشم حکام نے قابو کر لی ہے تاہم دونوں طرف سے بھاری فائزگ نگ کے دوران آئندگار فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

افغانستان سے مغربی ممالک کو ایک عرصہ سے یہ شکایت ہے کہ وہاں پوست کی بڑی مقدار کاشت ہوتی ہے جس سے ہیروئن بنتی ہے اور وہ پاکستان کے راستے دنیا بھر میں پھیل کر منشیات کی لعنت میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہے، اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مغربی حکومتیں افغانستان میں پوست کی کاشت کو ختم کرنے کیلئے تجویف اور تحریک کے تمام حرబے آئمہ ہی ہیں لیکن مغربی ممالک کے ہی وہ ادارے جو منشیات کے عامی آئندگار بیوپاری ہیں، پوست کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری و فروخت کیلئے افغانستان کے اس قسم کے لوگوں کی پشت پناہی اور سرپرستی کرتے ہیں۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت کے دوران عالمی سطح پر اس کا وسیع پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ افغانستان میں پوست کی بہت زیادہ کاشت ہوتی ہے اور وہاں سے ہیروئن کی بہت بڑی مقدار مغربی ممالک میں سمگل ہو کر جاتی ہے تو طالبان حکومت کے سربراہ ملا محمد عمر نے ایک حکم کے تحت افغانستان میں پوست کی کاشت پر پابندی لگادی تھی، اور دنیا نے یہ منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ پوست کی جس کاشت کو ختم کرنے کیلئے مغربی حکومتوں کے سالہا سال کے تمام حربے یکسرناکام ہو گئے تھے اسے اسلامی حکومت کے سربراہ کے ایک آرڈر نے مکمل طور پر ختم کر دیا، اور ہیں الاقوامی اداروں نے اس کا اعتراف کیا کہ اس کے بعد طالبان کے دور حکومت میں ان کے زیر کنٹرول علاقے میں ایک ایکڑز میں پر بھی پوست کی کاشت نہیں ہوئی۔ مگر اب مغربی ممالک کی مرضی کی حکومت افغانستان میں مسلط کیے جانے کے بعد افغانستان پھر سے پوست کی کاشت کا مرکز بن گیا ہے۔ اس ایک بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی مسلم معاشرہ میں نظریاتی اسلامی حکومت اور اسلامی قوانین کی برکات کیا ہوتی ہیں اور انہیں ان کے عقیدہ و دین کے خلاف کسی نظام پر چلانے کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟

## محترمہ بے نظیر بھٹو اور افغان طالبان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ جون ۲۰۰۳ء

سرحد ایمنی میں ”شریعت بل“ پیش کیے جانے کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے اس پر عمل کے اظہار کا سلسلہ

شرع ہو گیا تھا اور اس میں دن بدن شدت آئی ہے۔ ایک طرف وہ عملی اقدامات ہیں جو سرحد حکومت کو ناکام بنانے اور اسے نت نئے مسائل میں الجھانے کیلئے کیے جا رہے ہیں جن میں صوبائی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے تبادلوں کا فیصلہ اور ضلعی ناظموں کی طرف سے استغفار کا اعلان سر فہرست ہیں۔ اور دوسری طرف وفاقی حکومت کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے صوبہ سرحد میں متعدد مجلس عمل کی حکومت کے اس اقدام کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ جاری ہے حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بنے نظیر بھٹونے بھی اس معاملہ میں حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانا ضوری سمجھا ہے اور افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد یہ دوسرا منسلک ہے جس پر حکمران کیپ اور محترمہ بنے نظیر بھٹو کی آواز اور ہم آہنگ دکھائی دے رہے ہیں۔

محترمہ بنے نظیر بھٹو کو افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمه کیلئے مسلح امریکی مداخلت پر بھی اعتراض نہیں تھا بلکہ انہیں صرف یہ شکایت تھی کہ یہ کام ان کے ذریعے کیوں نہیں لیا جا رہا اور افغانستان میں روشنی جاریت کے خلاف جہاد کے نتیجے میں ابھرنے والے اسلامی رجحانات کو ختم کرنے کیلئے امریکہ، بھادرنے ان کی خدمات پر بھروسہ کرنے کی بجائے جرزل پرویز مشرف کی ٹیم کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اور اب بھی ان کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحدی اسلامی میں شریعت بل کی مظنوی جرزل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے ورنہ اگر وہ ان کی جگہ پاکستان میں بر سر اقتدار ہوتیں تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

محترمہ بنے نظیر بھٹونے سرحد اسلامی کے منظور کردہ شریعت بل کو ”طالبان بل“، قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طالبان طرز کے اسلام کو نافذ کرنے کی طرف پیشافت ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کو اچھی طرح تجویز ہیں کہ طالبان کے طرز حکومت اور صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے طرز عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

- طالبان افغانستان میں جہادی کمانڈروں کی باہمی تکمیل اور خانہ جنگی کی وجہ سے بذریعہ قوت افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جبکہ متعدد مجلس عمل نے انتخابی عمل کے ذریعے عوامی ووٹ حاصل کر کے صوبائی حکومت حاصل کی ہے۔
- طالبان کا نظام امارت کا نظام تھا جس میں امیر کے شخصی احکامات ہی قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت نے منتخب اسلامی میں بل پیش کر کے عوامی نمائندوں کے ذریعے اس کا نافذ کیا ہے۔
- طالبان نے افغانستان کے سابقہ نظام کو مکمل طور پر اکھڑا پھینکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنے کی طرف پیش رفت کی تھی۔ جبکہ سرحد حکومت نے ملک کے دستور اور مروجہ سسٹم کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کی طرف سے ملنے والے اختیارات اور حدود میں نفاذ شریعت کے اقدامات کیے ہیں۔
- طالبان نے اسلام کے نفاذ اور اس کی تعمیر و تشریف کیلئے اپنے امیر اور ان کی مجلس مشاورت کو فاصل اتحاری قرار دیا تھا۔ جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت نے اس سلسلہ میں دستور پاکستان کے تحت پہلے سے قائم اداروں اسلامی نظریاتی کو سل اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کو بنیاد بنا�ا ہے اور انہیں اتفاقی تسلیم کیا ہے۔

- طالبان کا نظام ہمہ گیر اور قوی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ جبکہ سرحد آسمانی کا منظور کردہ شریعت بل صاف طور پر اعلان کر رہا ہے کہ اس کا تعلق صرف ان معاملات سے ہے جن میں دستور کے تحت صوبائی حکومت کو قانون سازی اور نفاذ قانون کا حق حاصل ہے، اس کے علاوہ باقی معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں اس بات پر تو بحث کی گنجائش موجود ہے کہ نفاذِ اسلام کیلئے طالبان کا طرزِ عمل زیادہ مفید اور موثر تھا یا متحده مجلس عمل کا طرز کار زیادہ فائدہ مند ہے؟ مگر سرحد آسمانی کے منظور کردہ شریعت بل کو ”طالبان بل“ ترا در دینا اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہو گی، سراسر مخالف نوازی اور کچھ فہمی کی بات ہے جس کی محترمہ بے نظیر بھٹو عجیسی ذہین و فطیمن خاتون اور تجربہ کار سیاستدان سے قطعی طور پر توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور اس کے سوا اور کسی تبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ساری صور تھال کو اچھی طرح مجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر سرحد آسمانی کے شریعت بل کو عالمی حالات کے تناظر میں انتہائی خوفناک شکل میں پیش کرے اعلیٰ ترین قوتلوں کو یقین دلانا چاہرتی ہیں کہ اگر انہیں یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو کو نظر انداز کیا جاتا رہے گا تو حالات اسی رخ پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

----

## طالبان والے نظام کا ہوا

روزنامہ پاکستان، لاپور ۲۰ جون ۲۰۰۳ء

یہ طالبان والے نظام کا ”ہوا“ بھی خوب ہے، جس کا ڈر اودے کر بہت سے دانشور اپنی بصیرت و دانش کا سکے جانے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ یہ سب دوست کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ طالبان کی حکومت کو طاقت کے زور پر ختم کیے جانے کے بعد وہاں جو حکومت امریکہ کی حمایت اور پشت پناہی سے قائم ہوئی ہے، اس کی سپریم کورٹ نے بھی شرعی حدود، مثلاً حجم کرنا، ہاتھ کاٹنا، کوڑے مارنا، اور اس نوعیت کی دیگر اسلامی سزاویں کو بدستور نافذ رکھا ہوا ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے سے چند ماہ قبل کابل میں ویڈیو سنٹر زاویہ کیبل نیٹ ورک پولیس نے زبردستی بند کر دیا تھا، اور ابھی حال ہی میں کابل کی سپریم کورٹ کا ایک اور حکم سامنے آیا ہے جس میں افغانستان کی عورتوں کو بند کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر بر قعہ پہن کر نکلا کریں۔ گویا قوانین کے نفاذ اور اس کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے ملامع مرکے موقف اور حامد کرزی کی پالیسیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، لیکن جب یہ اقدامات طالبان حکومت اور ملا عمر کی طرف سے تھے تو پوری دنیا میں طوفان کھڑا ہو گیا تھا کہ تہذیب تباہ ہو گئی ہے، تمدن اور ثقاوت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اور انسانوں کی آزادی غصب کر لی گئی ہے، لیکن اب وہی اقدامات کر زمیں حکومت کی طرف سامنے آرہے ہیں تو اسلام آباد سے لے کر واشنگٹن تک کے ان اصحاب دانش کو اس طرح سانپ سوکھ گیا ہے جیسے وہ سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں رہے۔ اطف کی بات یہ ہے

کہ یہی قوینین اسی انداز میں اور اسی تعبیر و تشریع کے ساتھ سعودی عرب میں بھی نافذ ہیں اور گذشتہ پون صدی سے مسلسل نافذ چلے آرہے ہیں مگر وہاں ان قوینین کا نفاذ کیلئے تکلیف کا باعث نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ صورت حال بھی قبل توجہ ہے کہ صوبہ سرحد کا نفاذ شریعت ایکٹ کسی طرح بھی طالبان کے نظام اور طریق کار سے مطابقت نہیں رکھتا:

- طالبان نے طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کیا تھا، جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت عوام کی منتخب کردہ ہے۔
- طالبان نے کوئی دستور نافذ کیے بغیر امیر المومنین کے شخصی احکامات کے ذریعے نفاذِ اسلام کی طرف پیشافت کی تھی، جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت اور اسمبلی نے پہلے سے نافذ شدہ دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور اس کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت ”شریعت ایکٹ“ منظور کیا ہے۔
- اسی طرح طالبان کا ستم پورے ملک کے مروجہ نظام میں مکمل انقلاب کی علامت تھا، جبکہ سرحد اسمبلی کا ”شریعت ایکٹ“ چند جزوی اصلاحات و ترمیم کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکے گا۔
- نیز سرحد حکومت نے یہ بل منتخب صوبائی اسمبلی کے ذریعے نافذ کیا ہے، جبکہ طالبان کے ہاں منتخب اسمبلی کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔

اس واضح فرق کے باوجود سرحد حکومت کے نفاذِ شریعت کے اقدامات کو طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی کوشش قرار دے کر جو لوگ پوری دنیا کو اسلام اور پاکستان سے فترت دلانے کی ہم جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ نہ اسلام کے ساتھ کوئی خیر خواہی کر رہے ہیں اور نہ ہی ان کا طرزِ عمل پاکستان کے بارے میں ہمدردی اور خیر خواہی پر منیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔

## روایتی اسلام اور روشن خیال اسلام

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۳۰ جون ۲۰۰۳ء

طالبان کے اسلام کو انتہا پسندانہ قرار دیتے ہوئے صدر جزل پرویز مشرف نے متعدد موقع پر پاکستان کو جدید اور روشن خیال اسلامی ریاست بنانے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ جبکہ صوبہ سرحد میں شریعت ایکٹ کی منظوری کے بعد اس حوالے سے ان کے اس لمحے اور ارشاد میں شدت آگئی ہے کہ پاکستان میں انتہا پسندی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور پاکستان، حتیٰ کہ صوبہ سرحد کے عوام بھی طالبان والے اسلام کو قبول نہیں کریں گے۔

آن کی صحبت میں ہم اس امر کا جائزہ لینا چاہیں گے کہ طالبان کے اسلام اور صدر پرویز مشرف سمیت ہمارے بہت سے رہنماؤں کے ذہنوں میں جس روشن خیال اور ترقی پسندانہ اسلام کا تصور موجود ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ جہاں تک طالبان کے اسلام کا تعلق ہے تو اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اسلام کے حوالے سے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی، بلکہ جو اسلام انہوں نے کتابوں میں لکھا ہوا پایا اسے انہوں نے کسی رو رعايت کے بغایپے

- ملک میں نافذ کر دیا:
- انہوں نے اگر معاشرتی جرائم کی شرعی سزاوں مثلاً سنگسار کرنے، کوڑے مارنے، ہاتھ کاٹنے اور موت کی سزا دینے کے قوانین نافذ کیے تو ان میں کوئی قانون بھی ان کی ایجاد نہیں تھا بلکہ ان سب سزاوں کا ذکر قرآن کریم اور سنت رسول میں موجود ہے۔ یہ خلافتِ اسلامیہ کے دور میں کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیا میں نافذ رہی ہیں اور اب بھی سعودی عرب میں نافذ ہیں۔
  - طالبان نے اگر پردے کے احکام کا نفاذ کیا تو یہ بھی ان کی اخراجِ عنیں تھی بلکہ یہ احکام بھی قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کا صدیوں سے حصہ چلے آ رہے ہیں۔
  - انہوں نے اگر افغانستان میں غیر مسلم مشریقوں کو تبلیغ سے روکا ہے تو یہ بھی ان کا کوئی نیا اقدام نہیں تھا بلکہ فتنہ میں یہ احکام پہلے سے موجود ہیں۔
  - غرضیکہ طالبان حکومت کے جن اقدامات کو بھی انتہا پسندانہ اسلام قرار دے کر دلکشی جارہا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی قانون یا حکم ایسا نہیں ہے جو انہوں نے خود ایجاد کیا ہو، یا قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ذخیرے میں پہلے سے موجود نہ ہو، بلکہ یہ صدیوں تک ملتِ اسلامیہ میں نافذ اور راجح نہ رہ چکا ہو۔ بعض احکام کی تعبیر و تشریح کے جزوی پہلوؤں، یا نفاذ کے طریق کارکے حوالے سے تو طالبان حکومت کی پالیسی سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، اور متعدد امور میں ان کے دورِ حکومت میں ہم نے بھی حکمِ کھلانا سے اختلاف کیا ہے، لیکن ان کے نافذ کرده اسلام کے بارے میں یہ تاثر دینا کہ یہ ان کا کوئی الگ اور جدا گانہ اسلام تھا، قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد بات ہے، کیونکہ انہوں نے کسی بھی حوالے سے کوئی نئی بات نہیں کی، بلکہ جو کچھ کتابوں میں یا خلافتِ اسلامیہ کے اوپرِ حکومت کے تعامل میں انہوں نے دیکھا، اسے بلکم و کاست افغانستان میں نافذ کرنے کی کوشش کی۔ جس میں وہ صرف اس وجہ سے ناکام ہوئے کہ ”قدیمی اور رواجی اسلام“ دنیا کی بڑی طاقتیوں کے لیے قابل برداشت نہیں تھا، اس لیے انہوں نے طاقت کے زور پر طالبان کی حکومت کو ختم کر دیا۔
  - اس کے برعکس روشن خیال اور ترقی پسندانہ اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ سب کچھ نیا ہے۔ اور اسلام کی ترقی پسندانہ تعبیر و تشریح کا جو نقشہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ سب ایسا ہے کہ قرآن و سنت کے روایتی ذخیرے اور ماضی کی اسلامی حکومتوں اور خلافتوں کے نافذ کرده ظاموں میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مثلاً پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجئے کہ نفاذِ اسلام کے کون کون سے اقدامات اسلام کی قدیم اور جدید تعبیرات کے حوالے سے تنازع چلے آ رہے ہیں؟ اور کن احکام کو اب تک انتہا پسندانہ قرار دے کر ان کی نئی اور روشن خیالی پر منی تعبیر و تشریح کا تقاضا کیا جا رہا ہے؟
  - سب سے بڑا مسئلہ ملک کے دستور اور نظام پر قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کرنے کا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہماری تاریخ یہ ہے کہ ”قراردادِ مقاصد“ قرآن و سنت کی دستوری بالادستی کا اعلان کرتی ہے، لیکن سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دے کر اس کی نئی کردی ہے کہ قراردادِ مقاصد کو دستور کی دیگر دفعات پر کوئی ترجیح حاصل

- نہیں ہے۔ جبکہ قومی اسمبلی نے میاں نواز شریف کے دور میں جب قرآن کریم کو پریم لاءِ قرار دینے کا بدل منظور کیا تو اس کے ساتھ اس شرط کا اضافہ کر دیا کہ ”بشرطیکہ سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہ ہو۔“
- ہمارا دوسرا بڑا مسئلہ ملک کے معاشری نظام کو مغرب کے چنگل سے نجات دلانے اور سودی نظام کے خاتمے کا ہے، جس کے لیے سپریم کورٹ تک کافیصلہ آچکا ہے۔ لیکن ہماری روشن خیالی اور تجدُّد پسندی اس پر عملدرآمد کی راہ میں رکاوٹ ہے اور ہم نے سپریم کورٹ ہی سے دوبارہ اس رکاوٹ کو باقی رکھنے کے لیے ”این اوسی“ حاصل کر لیا ہے۔
  - شراب پر کئی بار پابندی لیکن ہمارے حکمرانوں کی روشن خیالی نے ہر بار ایسی صورتحال پیدا کر دی کہ کچھ ہی عرصہ بعد پھر سے اس پر پابندی کے اعلان سے صرف نظر کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔
  - ہمارے ہاں جب بھی نمازی کی پابندی اور سرکاری سطح پر اس کے اہتمام کی بات سامنے آئی، اسے ترقی پسندی اور روشن خیالی کے مناسبت سمجھا گیا۔ جیسا کہ حال ہی میں خود صدر پر ڈیزیز شرف بھی اسی قسم کے تاثرات کا اظہار کر چکے ہیں۔
  - بے چیائی، رقص و سرود اور بدکاری کے فروغ کے خلاف دینی حلقوں کی آواز کو ہمیشہ شخصی آزادیوں پر حملہ قرار دیا گیا، اور اس پر انتہا پسندانہ اسلام کی پھیلتی کس کر اسلام کی روشن خیالی تعییر کارخ منتعین کیا گیا۔ حتیٰ کہ بے حیائی اور بدکاری کے اذوں اور مرکوز کو تحفظ فرمائیں کرنے کی کوشش کی گئی۔
  - آج ہماری بیشتر روشن خیال اور ترقی پسند این، جی اوز کی قراردادوں، مطالبات اور تقید کا سب سے بڑا ہدف وہ چند اقدامات ہیں جن میں تو ہیں رسالت پر موت کی سزا، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے، جرائم کی قرآنی سزاوں کے نفاذ، اور ریاست کو قرآن و سنت کے احکامات کا پابند بنانے کے اصولی فیصلے شامل ہیں، اور یہ سب اقدامات انتہا پسندانہ قرار دیے جائے ہیں۔
  - اس کی روشنی میں قاریئن خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ روشن خیال اور ترقی پسندانہ اسلام کا آج کا تصور کیا ہے؟ ہم تو پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ میں یہی سمجھ سکے ہیں کہ اگر
  - اسلام کو ریاست کی ذمہ داریوں سے خارج قرار دے دیا جائے اور حکومت پر قرآن و سنت کے احکام کی پابندی اور نفاذ کی کوئی ذمہ داری نہ ڈالی جائے،
  - سود کو جائز قرار دے دیا جائے اور پاکستان کو مغرب کے استحصالی معاشری نظام کے ٹکنے سے نکلنے کی کوئی بات نہ کی جائے،
  - نماز، روزے اور دیگر شرعی احکام کی پابندی پر زور نہ دیا جائے،
  - رقص و سرود، عربیانی، بے چیائی بلکہ بدکاری تک کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے،
  - تہذیب و معاشرے میں اسلامی روایات کی بحالی اور تحفظ کی بجائے مغرب کی پیروی کو ترجیح دی جائے تو ہم روشن خیال اور ترقی پسند سمجھے جائیں گے، اور اسلام کی جدید اور عصر حاضر کی روح سے ہم آہنگ نئی تعبیر و

ترشیح کے علمبردار کھلائیں گے۔ لیکن اگر ہم ان باتوں کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اسلام کے حوالے سے انہی احکام و قوانین کے نفاذ پر زور دیں گے جو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ذخیرے میں گزشتہ چودہ سو برس سے تسلسل کے ساتھ موجود چلے آرہے ہیں، تو ہم نیاد پرست ہیں، انتہا پسند ہیں، دقیانوں کی ہیں، طالبان کے پیروکار ہیں، اسی وجہ سے ”گردن زدنی“ بھی ہیں۔ اس تناظر میں اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو

- ہمیں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر اور مصطفیٰ کمال اتنا ترک کی دو ہی مثالیں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے روایتی اسلام کے دائروں کو ختم کیا۔ دونوں نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف اعلان کیا کہ وہ ماضی کے اسلام سے دامن چھڑا رہے ہیں اور ایک یا فکر اور نظام پیش کر رہے ہیں۔

- مگر ہمارے روشن خیال اور ترقی پرندہ ہبھا اسلام کا یہیل بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اس کی ساری عملی باتوں سے ایک ایک کر کے پیچھا بھی چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس کی صرف ایک ہی مثال ماضی کی تاریخ میں نظر آتی ہے جس کا ذکر مولانا شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ نے ”سیرۃ النبیؐ“ کی دوسری جلد میں طائف کے قبیلہ ثقیفہ کے قبول اسلام کے حوالے سے کیا ہے۔

انہوں نے لکھا ہے کہ فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کیا جو کئی روز جاری رہا مگر طائف فتح نہ ہو سکا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کیا جو کئی روز بعد یا ایں کی قیادت میں مدینہ منورہ آیا اور طائف والوں کی طرف سے قبول اسلام کی خواہش کا اظہار کیا مگر اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی بیان کیں کہ ان شرائط کے ساتھ ہم اہل طائف اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ شرائط ”سیرۃ النبیؐ“ میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہیں:

1. زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرم درہتے ہیں۔

2. اس قوم کا تمام کاروبار اور ذریعہ معاش سود پر ہے اس لیے سود خوری جائز رکھی جائے۔

3. شراب سے نہ روکا جائے کیونکہ ہمارے شہر میں کثرت سے انگوپیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے۔ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تینوں شرطیں نامنظور کر دیں اور طائف والوں کو اپنی یہ شرائط واپس لینا پڑیں۔ اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنی ہونے کی بھی درخواست کی۔ نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے۔ لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے، اور جہاد فرض کفایہ ہے، ہر شخص پر واجب نہیں ہے، اور واجب بھی ہو تو اس کے خاص موقع ہیں، روز کا کام نہیں۔ اس بنا پر اس وقت ان دونوں باتوں پر ان کو مجبور نہیں کیا گیا، کیونکہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں گے تو فتنہ رفتہ ان میں صلاحیت آجائے گی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ جب یہ ایمان لا چکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور زنا، شراب، سود اور نماز کے احکام سے مستثنی قرار دیے جانے کی درخواست نامنظور ہو جانے کے بعد اہل طائف نے جب غیر مشروط طور پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو پھر ان کے اسلام میں اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ والوں

کے اسلام میں کوئی فرق نہیں تھا، اور وہ بھی خود کو اسلام کے ان تمام احکام کا پابند سمجھتے تھے جن کی پابندی باقی ملتِ اسلامیہ کے لیے ضروری تھی جاتی تھی۔

اس لیے ہم اپنے روشن خیال اور ترقی پسند دوستوں سے گزارش کریں گے کہ اگر وہ اسلام کا لیبل قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو اس کے لیے انہیں اسلامی احکام و قوانین کا وہی ڈھانچہ قبول کرنا ہو گا جو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ذخیرے میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ جن احکام و قوانین پر امت مسلمہ گذشتہ چودہ سو برس سے عمل کرتی چلی آرہی ہے اور جن احکام و قوانین پر آج بھی ملتِ اسلامیہ کی غالب اکثریت بے چک ایمان رکھتی ہے۔ اور اگر اسلامی احکام و قوانین کا یہ ڈھانچہ ان کے لیے قابل قبول نہیں تو پھر جلال الدین اکبر اور مصطفیٰ کمال اتاترک کی طرح جرأت و حوصلہ کے ساتھ اس سے کھلم کھلا دستبرداری کا اعلان کریں۔ طائف والوں کی طرح شرطیں پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا اس لیے کہ یہ شرطیں نہ توجہ بندی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کی تھیں اور نہ ہی آج ان کی امت ان شرائط کے ساتھ کسی نظام کو اسلام فرار دینے کے لیے تیار ہو گی۔

## کیوبا سے رہائی پانے والے ایک مجاہد کی داستان

روزنامہ اسلام، لاپور — ۲ جولائی ۲۰۰۳ء

محمد اللہ تعالیٰ گذشتہ چوتیس برس سے گو جرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک عام سی روایت بن گئی ہے کہ کچھ دوست ملاقات کرتے ہیں اور تھوڑی دیر میرے دفتر میں بیٹھتے ہیں، کسی نے کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا ہے، کوئی کسی معاملہ میں مشورہ کے خواہاں ہوتے ہیں اور کوئی ویسے ہی ملاقات اور گپٹ شپ کیلئے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسا عام طور پر مساجد میں دینی جلوسوں کے بعد بھی ہوتا ہے، خطاب اور دعا کے بعد کچھ حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ مصافح کریں ملاقات ہو اور تھوڑی بہت گفتگو بھی ہو جائے۔ حضرت مولانا مفتی محمود اسے ”جلی“ کہا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جلسے کے بعد جلسی سے پچنائی کہ اس میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور بسا اوقات اگلے پروگرام کا شیڈول بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وقت اور تھکاوٹ کا مسئلہ نہ ہو تو یہ جلسی یکسرے بے فائدہ نہیں ہوتی اور اس میں بہت سی مفید ملاقاتیں اور گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔

گذشتہ جمعہ کو نماز جمعہ سے فارغ ہو کر اپنی نشست گاہ کی طرف جا رہا تھا کہ مصافحہ کرنے والے حضرات میں ایک پشتوں بزرگ نے مصافحہ کرتے ہوئے کان میں کہا کہ میں پشاور سے آیا ہوں۔ دوسرا شہروں سے اپنے کسی کام کیلئے دوست آتے ہیں توجہ کی نماز کیلئے مرکزی جامع مسجد میں آجائتے ہیں اور مصافحہ و ملاقات میں شریک ہوتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ کوئی اسی قسم کے بزرگ ہوں گے چنانچہ وہ میرے کمرے میں اگر ملاقاتیوں کے حلے میں ایک طرف بیٹھ گئے تو میں نے کوئی خاص توجہ نہ کی کہ باقی دوستوں کی طرح یہ بھی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جائیں گے لیکن جب مجلس کے بہت سے دوستوں کے اٹھ جانے کے بعد بھی وہ بستور بیٹھ رہے تو میں نے اس خیال سے کہ شاید انہیں کوئی کام ہوان سے پوچھا کر

ہال خان صاحب فرمائیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ پشاور سے آہا ہوں، ابھی چند روز قبل کیوبوکی قید سے رہا ہو کر آیا ہوں اور آپ سے ملاقات کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سننے ہی پوری مجلس ان کی طرف متوجہ ہو گئی اور مجھے بھی شرمندگی سی ہوئی کہ یہ بات مجھے ان سے پہلے ہی پوچھ لینی چاہیے تھی۔ انہیں قریب بلا یا اور پھر مجلس کے اختتام تک مجلس کا محور ہوئی رہے۔ یہ مولوی محمد علی خان قادری تھے جو تحریک آزادی کے نامور رہنماء حاجی صاحب تنگ زئی کے مزار پر واقع غازی آباد کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب ہیں اور کیوباکے جزیرہ میں اٹھارہ ماہ تک امریکی قیدی کی حیثیت سے وقت گزار کر گذشتہ ماہ دیگر ۱۲۰۰ افراد کے ہمراہ رہا ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ اخبارات میں آپ کے مضمین پڑھتا رہتا ہوں اور اسی وجہ سے آپ سے ملاقات کیلئے آیا ہوں۔ میرے لیے حاجی صاحب تنگ زئی کا حوالہ ہی کافی تھا کہ وہ برطانوی استعمار کے خلاف اس خط کے مسلمانوں کے مسلح جہاد آزادی کے بڑے کمانڈروں میں سے تھے اور بیسوں صدی کی دوسری دہائی کے دوران ان کے جہادی معرکے اور آزادی وطن کیلئے ان کی مسلح کاروائیاں ہماری آزادی کی جدوجہد کا ایک روشن باب ہیں۔ ان کی جدوجہد کا ہدف برطانوی حکمران اور ان کے گماشیت قادیانی تھے۔ وہ گرفتار ہوئے اور لاکھوں روپے کی خمانت پر ان کی رہائی ہوئی، پھر دوبارہ گرفتاری کے آڑ ڈ آئے تو وہ چار سدھے کے علاقے سے بھرت کر کے آزاد قبائلی علاقے مہمندابجھنی چلے گئے جہاں انہوں نے آخر دم تک جہادی سرگرمیاں جاری رکھیں اور وہیں ان کی قبر ہے۔ اس علاقے کو غازی آباد کا نام دے دیا گیا اور مولوی محمد علی خان قادری موصوف اسی جگہ مرکزی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ مجھے تو وہ صرف اتنا ہی بتا دیتے تو میرا سر عقیدت سے خم ہونے کیلئے کافی تھا لیکن کیوباکے امریکی عقوبات خانے کا نام لے کر انہوں نے دھتی رگ کو چھیڑ دیا اور پھر انہوں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو دل کے زخموں کے کھرنہ ایک ایک کر کے چھٹے چلے گئے۔

میری یہ عادت ہے کہ مشکل سے مشکل حالات اور تاریک سے تاریک تر معاملہ میں بھی روشنی اور امید کا کوئی نہ کوئی ثابت پہلو تلاش کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہوں چنانچہ وہ اپنی داستان قیدیان کر رہے تھے اور میرا ذہن تاریخ کے مختلف مرامل کی کڑیاں ملانے میں مصروف تھا۔ اور یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث بن رہی تھی کہ حاجی صاحب تنگ زئی کی جدوجہد کا تسلسل قائم ہے۔ حاجی صاحب گئی وفات کو پون صدی کا عرصہ گزرا رہا ہے مگر ان کا مرکز ابھی تک جہاد کے عمل سے وابستہ ہے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں کوئی مجھے یہ تسلیاں دے رہا تھا کہ قربانیاں، شہادتیں، قید و بند، بھرت اور وقتی شکستوں کے مرامل تو زندہ قوموں کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں لیکن جن قوموں میں آزادی کا جذبہ باقی رہتا ہے اور اس کے تحفظ کیلئے جدوجہد کے عزم کا تسلسل نہیں ٹوٹتا وہ بالآخر آزادی کی منزل سے ہمکنار ہو جایا کرتی ہیں۔

مولوی محمد علی خان قادری نے بتایا کہ وہ افغانستان پر امریکی حملے کے موقع پر پہلے اپنے علاقے میں مجاہدین کی امداد کیلئے ہم چلاتے رہے پھر ہیں نومبر ۲۰۰۱ء کو مجاہدین کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ افغانستان میں داخل ہو گئے۔ وہاں انہوں نے جنگ میں حصہ لیا، ان کے ساتھی شہید ہوئے اور وہ متعدد افراد کے ہمراہ گرفتار ہو گئے۔ انہیں پہلے بھری یہڑے پر لے جایا گیا جہاں ۳۲ دن تک پوچھ چکھ ہوتی رہی، انہیں چھوٹے چھوٹے سیلوں میں بند کیا جاتا تھا، کئی کئی گھنٹے کھڑا رکھا جاتا تھا، سونے نہیں دیا جاتا تھا اور طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ ۳۲ دن کے بعد انہیں کیوباکے جزیرے میں

منقل کر دیا گیا تھاں وہ ۱۲ ماہ رہے۔ تپہلے ۱۲ ماہ اذیتوں کے تھے، تکالیف کے تھے اور جبر و تشدد کے تھے، مسلسل دن رات انہیں بھوکار کھا جاتا، چھوٹے چھوٹے پتھروں میں بند کر دیا جاتا، سخت سردی میں بدن کے سادہ کپڑوں کے سوا انہیں کوئی کمبل وغیرہ نہیں دیا جاتا تھا، پتھرے سے جب کسی وقت باہر نکالے تو پاؤں میں بیٹیاں ڈال کر اور ہاتھوں کو رسیوں سے جڑ کر رکھا جاتا تھا۔ ذہنی اذیتوں کا سلسلہ الگ تھا مرقدیوں کی اکثریت نے صبر و حوصلہ سے کام لیا اور بالآخر جبر کرنے والوں کے حوصلے جواب دینے لگے۔ بسا اوقات ڈیوٹی پر متعین افسر اور کارنڈے ان سے معدتر کرتے کہ ہم ان کے ساتھ یہ سلوک کرنے پر مجبور ہیں لیکن اس کے باوجود جبر و تشدد کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ہم ذرا سی حرکت کرتے تو وہ چونکا ہو جاتے، انہیں اس بات کا زیادہ ڈر رہتا تھا کہ یہ کہیں خود کش حملہ نہ کر دیں۔ ایک بار ہم نے نماز کی اجاتز مانگی تو اس کیفیت میں اجاتز دی گئی کہ پاؤں میں بیٹیاں اور ہاتھوں میں رسیاں تھیں، اس کیفیت میں ہم نے تکمیر تحریک کیلئے ہاتھ اٹھائے تو ار دگر دکھڑے امریکی سپاہیوں نے رانفلیں تان لیں، ہم نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اس طرح ہاتھ اٹھا کر تم ہم پر حملہ کرنے لگے ہو۔

مولوی محمد علی خان قادری کا کہنا ہے کہ ۱۲ ماہ کے اس تشدد کے بعد ہمارے لیے سہولتوں کا دور شروع ہوا اور مختلف لوگ اکر ہمیں سمجھا نے اور طرح طرح کے لائق ہوئے۔ لوگ آتے اور ہم سے پوچھتے کہ ہم تو تمہارے خیر خواہ ہیں تم پر پیسے خرچ کرتے ہیں تمہیں امداد دیتے ہیں پھر تم ہمارے خلاف کیوں لڑتے ہو؟ ہم یہ جواب دیتے کہ تم لوگ عالم اسلام کے خلاف جو شرمنی کارو یہ اختیار کیے ہوئے ہو اور فلسطین، کشمیر، عراق، چینپاہ اور افغانستان میں تمہاری وجہ سے جو بے گناہ مسلمانوں کا خون بسہ رہا ہے اس کے ہوتے ہوئے تم ہمارے خیر خواہ کیے ہو سکتے ہو؟ باقی رہی بات ڈالروں اور امداد کی تو وہ تم اپنے امجنٹوں کو دیتے ہو جو تمہارے ملازم ہیں اور تمہارے لیے کام کرتے ہیں، ان کی تختخوہ تو تم نے دیتی ہی ہے اس کا ہم پر کیا احسان ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے پاس پادری صاحبان بھی آتے اور ہمیں قرآن کریم کی وہ آیات سناتے جن میں امن اور صلح کی بات کی گئی ہے، وہ کہتے کہ اسلام تو امن کا مذہب ہے اور صلح و آشتی کا پیغام دیتا ہے۔ ہم ان سے کہتے کہ ہمارا ان آیات پر ایمان ہے لیکن وہ سیکنڈروں آیات بھی قرآن کریم ہی کی ہیں جن میں یہود و نصاری کو مسلمانوں کا دشمن بتایا گیا ہے اور ان سے دوستی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ ہمیں کہا گیا کہ ہمارے خلاف جنگ بند کر دو اور کارروائیاں نہ کرنے کا پیغام دلا و تو ہم تمہیں امداد دیں گے، مدارس کیلئے تعاون کریں گے، سکول اور ہسپتال یا کوئی اور کام بھی کوئے تو تمہیں رقوم فراہم کریں گے۔ ہم نے کہا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور اپنے اوپر دین اور ملت کے ساتھ غداری کا لیبل چپاں نہیں کر سکتے۔

مولوی محمد علی خان قادری کی باتیں اور داستان طویل ہے، یہ کالم ان کی تفصیلات کا متحمل نہیں، کسی اخباری روپوں کو ان کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنا چاہیے اور اٹھارہ ماہ کی قید کی تفصیلات ان کے سینے سے کرید کر قوم کے سامنے لانی چاہیں کہ قوم کا حق صرف کیمپ ڈیوٹی کے مذاکرات، بار گینگ اور منصوبوں کی تفصیلات سے باخبر ہونے کا ہی نہیں بلکہ ان منصوبوں کا ناشانہ بننے اور سازشوں کا شکار ہونے والے مظلومین کی داستان مظلومیت سے آگاہی بھی قوم کا حق ہے۔ بہر حال مولوی محمد علی خان قادری کے بقول اس کیفیت میں کیوبا کے جزیرے میں قید کے اٹھارہ ماہ گزارنے کے بعد انہیں

تقریباً ڈبیٹھ درجن افراد کے ہمراہ ۲۹ مئی کو رہا کر کے پاکستان روانہ کر دیا گیا اور اب وہ اپنے مدرسہ کے اس نصان کو پورا کرنے کی فکر میں ہیں جون ان کی ڈبیٹھ سالہ قید کے دوران ہوا ہے۔ خدا کرے کہ امریکی ڈارلوں کی پیشکش کو مبینہ طور پر ٹھکرانے والے اس مولوی محمد علی خان قادری کو اپنے دینی مدرسہ کا بجٹ پورا کرنے اور اس دوران مدرسہ کے ذمہ چڑھ جانے والے قرضہ کی ادائیگی کیلئے کچھ صاحب خیر دوستوں کی توجہ حاصل ہو جائے، آمین یا رب العالمین۔

## شدت پسندی: شاہ فہد اور مہاتیر محمد کا اختلافِ نظر

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۱۲ اگست ۲۰۰۳ء

دہشت گردی کے حوالے سے دنیا بھر میں بحث جاری ہے اور اس کی کوئی تعریف معین کیے بغیر عالمی اتحاد کے نام پر طاقتور تو میں اکتوبر ۲۰۰۱ء کے بعد سے اس کے خلاف لڑھ لیے پھر ہی ہیں۔ ولڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات کے بعد جب امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کیلئے عالمی اتحاد بنانے کا اعلان کیا اور افغانستان کو خوفناک بمباری کا نشانہ بنایا تو یہ سوال اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ”دہشت گردی“ کہتے کس کو پیس اور اس کی تعریف کیا ہے؟ کیونکہ دہشت گردی کی کوئی منق赫 تعریف طے کیے بغیر اگر ہر طاقتور کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ جسے چاہے دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑے تو مظلوم اور کمزور اقوام کی آزادی اور جیتنے کا حق سلب ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن امریکہ اور اس کے حواریوں کو اتنی جلدی تھی یا ان کی منشہ ہی یہ تھی کہ دہشت گردی کا لیبل اپنے مخالفین پر ہر صورت میں چسپا کر کے انہیں بلا تاخیر انتقامی کارروائی کا نشانہ بناؤ لاجائے۔

چنانچہ افغانستان اور عراق پر امریکہ کی فوج کشی کے بعد اب جب عالمی اقت پر دھن دھیرے دھیرے چھٹے لگی ہے تو خود مغرب کے اہل داش میں یہ سوال سراخہار ہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اس کارروائی کا اخلاقی اور اصولی جواز کیا ہے؟ بالخصوص عراق پر امریکہ کی فوج کشی نے تو نئے عالمی استعمال کے پھرے سے اخلاقیات اور بین الاقوامی اصولوں کے سارے نقاب ایک ایک کر کے اتار پھینکنے لیکن اس سے قطع نظر ہمارے مسلمان حکمرانوں میں اس حوالے سے ایک اور رخ پر گفتگو ہو رہی ہے اور اس سلسلہ میں سعودی عرب کے فرماز و شاہ فہد اور ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے حال ہی میں جو کچھ کہا ہے وہ توجہ اور غور و فکر کے لائق ہے:

- شاہ فہد نے سعودی کا مینہ کے ہفتہ وار اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے تمام علماء، دانشوروں اور تعلیم یافتہ طبقے سمیت نوجوان نسل پر زور دیا ہے کہ وہ ملک میں شدت پسندی کے خاتمه کیلئے فعال کردار ادا کریں، اسلام کی جدت پسندی اور رحمتی سے متعلق نوجوانوں میں شعور اجاگر کیا جائے اور انہیں ایسی تعلیم نہ دی جائے جس سے شدت پسندی کو فروغ ملے۔

- جبکہ دوسری طرف ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے کہا ہے کہ جب تک دنیا دہشت گردی کی بنیادی وجوہات

کو ختم نہیں کرتی دہشت گردی جاری رہے گی۔ آخر ہم اس کی پیش بندی میں اور کتنا وقت لیں گے؟ ہم دہشت گردی کے خاتمه میں ایک دن کی تاخیر کریں گے تو یہ دوبارہ وقوع پذیر ہوگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ دہشت گردی کو ختم کرنے کیلئے صحیح اقدامات نہیں کر رہا۔

علم اسلام کے ان دو مقندر رہنماؤں کے ارشادات کو دیکھا جائے تو دا لگ پہلو سامنے آتے ہیں۔ شاہ فہد کی گفتگو سے تاثر ملتا ہے کہ جسے وہ دہشت گردی کہر رہے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں انہی تعلیم دی جا رہی ہے جس سے شدت پسندی کا ذہن پیدا ہوتا ہے اور اس کی کوکھ سے دہشت گردی جنم لیتی ہے، اس لیے انہوں نے علمائے کرام اور دانشوروں کو یہ تلقین کرنا ضروری سمجھا ہے کہ نوجوانوں کو شدت پسندی کی تعلیم نہ دی جائے بلکہ جدت پسندی اور رحمتی کی تعلیمات سے انہیں آستہ کیا جائے تاکہ وہ شدت پسندی کی طرف مائل نہ ہوں۔ مگر مہاتیر محمد نے اس کے عکس دہشت گردی کے اسباب و عوامل کا جائزہ لینے اور انہیں ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور انہوں نے دہشت گردی کے خلاف امریکی کارروائیوں کو صحیح قرار نہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک دہشت گردی کے اصل اسباب کو ختم نہیں کیا جائے گا دہشت گردی کو ختم کرنا ممکن نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مہاتیر محمد کے موقف میں زیادہ وزن ہے کیونکہ اس وقت جن کارروائیوں کو بھی دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے، اس سے قطع نظر کہ ان پر دہشت گردی کی کسی قابل قبول تعریف کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں، انہیں کچھ دیر کیلئے دہشت گردی تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ان کارروائیوں کا تعلق تعلیم سے نہیں بلکہ رد عمل سے ہے۔ اور جن کارروائیوں کو شدت پسندی قرار دیا جا رہا ہے وہ اس لیے نہیں ہو رہیں کہ انہیں اس کی تعلیم دی گئی ہے بلکہ اس لیے ہو رہی ہیں کہ ایسا کرنے والوں کے سامنے مسلمانوں کے خلاف مغربی قوتوں کے معاندانہ طرز عمل، انتقامی کارروائیوں اور عالم اسلام کے وسائل اور اقتدار و سیاست پر مخالفانہ قبضہ و کنش روں کا ایک تسلسل ہے جس کے رد عمل میں وہ انتہا پسندی اور شدت پسندی کا شکار ہو رہے ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں کے دوران اسلام، ملت اسلامیہ اور مسلم ممالک کے خلاف مغربی ممالک نے جو کچھ کیا ہے اور جو وہ اب کر رہے ہیں اور جس طرح ”اجنبی اقوام“ اور پھر ”اقوام متحدة“ نے اس سب کچھ کو جواز کی سند مہیا کرنے کی ڈیوٹی سنبھالی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اگر مسلم ممالک کے نوجوان احتجاج کا اور کوئی راستہ نہ پاتے ہوئے شدت پسندی پر اترائے ہیں تو اسے غیر فطری قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ بالکل ان کی فطرت کا تقاضا ہے اور اس کی ذمہ داری مسلم نوجوانوں پر نہیں بلکہ اس عمل کو تسلسل فراہم کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے جس کے رد عمل میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

جہاں تک علمائے کرام اور دینی رہنماؤں کی بات ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس حوالے سے صرف تین باتوں کے ”قصور وار“ ہو سکتے ہیں:

- وہ عام مسلمان کو قرآن و سنت کی تعلیم دیتے ہیں، ان پر ایمان کی تلقین کرتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی گزارنے کا ذہن بناتے ہیں۔

- وہ قرآن کریم یا سنت نبویؐ کی تعلیم دیتے ہوئے اس بات کی تفریق نہیں کرتے کہ آج کے نوجوانوں کو قرآن و سنت کے کون سے حصوں کی تعلیم دینی ہے اور کون سے حصوں کو ان سے او جھل رکھنا ہے۔ بلکہ ہمارے ”مہربانوں“ کا تقاضا ہے کہ علمائے کرام اپنے تعلیمی پروگرام میں آج کی عالمی قوتوں اور اداروں کی خواہشات کے مطابق نئی ترجیحات قائم کریں اور قرآن و سنت کی صرف ان باتوں کی مسلمان نوجوانوں کو تعلیم دیں جن سے آج کی عالمی تہذیب اور مغربی قوتوں کو اختلاف نہ ہو۔ مگر علمائے کرام ابھی تک دنیا کے کسی حصے میں اس کیلئے تیار نہیں ہیں۔
- عالم اسلام کے دینی حلقوں اور علمائے کرام اس بات کیلئے بھی تیار نہیں ہیں کہ اسلام کی جن باتوں پر مغرب کو اعتراض ہے ان کی کوئی نئی تعبیر و تشریح کر کے مغرب کو مطمئن کریں۔ بلکہ وہ اسلامی احکام و قوانین کی اس تشریح پر قائم ہیں جو چودہ سو سال سے اجتماعی طور پر جلی آرہی ہے اور وہ اس سلسلہ میں مغرب کے اعتراضات کو درست سمجھنے کی بجائے اسلامی تعلیمات کو ہی درست اور جائز تصور کرتے ہیں۔
- اس پس منظر میں جب علمائے کرام نئی نسل کو قرآن و سنت کی تعلیم دیں گے تو ظاہر بات ہے کہ اسلامی تعلیمات میں ایسی صورتحال کے بارے میں بھی واضح بدایات موجود ہیں کہ جب مسلمانوں پر کافروں کا تسلط قائم ہو جائے، جب مسلمانوں کے علاقوں اور وسائل پر غیر مسلم قبضہ جمانے لگیں اور جب مسلمان حکمران اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی بجائے غیر مسلم قوتوں کے حاشیہ بردار بن جائیں تو پھر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور مسلمان نوجوانوں کو کس طرح اس صورتحال سے نمٹنا چاہیے۔ اب علمائے کرام یہ تو نہیں کر سکتے کہ مغرب کو راضی رکھنے اور اپنے مسلم حکمرانوں کی ناراضگی سے بچ کیلئے قرآن و سنت کی ان تعلیمات سے چشم پوشی کر لیں اور نوجوانوں سے یہ کہنا شروع کر دیں کہ دین کی باقی تعلیمات پر وہ عمل لیکن اس صورتحال کے بارے میں شریعت کی جو بدایات ہیں ان پر اس لیے عمل نہ کریں کہ ان سے مغرب ناراض ہوتا ہے اور اس سے ہمارے مسلم حکمرانوں کی پیشانیوں پر مبلل پڑ جاتے ہیں۔
- شاہ فہد سعودی عرب کے حکمران ہیں، سعودی عرب نے قرآن و سنت کو اپنے دستور و قانون کا سرچشمہ قرار دے رکھا ہے اور عالم اسلام کی عظیم مجاہد شخصیت شیخ الاسلام ابن تیمیہؓ نہ صرف سعودی حکمرانوں اور اہل علم کے ہاں آئیڈی میں شخصیت ہیں بلکہ ہمارے نزدیک بھی مسلمانوں پر کافروں کے تسلط اور جبر کے دور میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؓ علمائے کرام کیلئے آئیڈی میں شخصیت ہیں جنہوں نے تاتاریوں کی یلغاگار کے دور میں مسلمانوں کی مجاہدات رہنمائی کی اور جرأۃ واستقامت کا ایک نیا باب رقم کیا۔ اس لیے اگر آج کے دور میں علمائے کرام اور دیندار نوجوان شیخ الاسلام ابن تیمیہؓ کو اپنا رہنمای تصور کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلانا چاہیں تو کم از کم سعودی حکومت اور شاہ فہد کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

## کیا خلافت کا نظام ناقابل عمل ہے؟

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۳ء

صدر جزل پرویز مشرف نے گذشتہ دنوں ایک انش روپ میں کہا ہے کہ پاکستان میں کمال اتابرک جیسی اصلاحات نافذ نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی خلافت کا نظام قابل عمل ہے۔

جبکہ تک مصطفیٰ کمال اتابرک جیسی اصلاحات کے نفاذ کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا نفاذ کسی بھی مسلمان ملک میں ممکن نہیں رہا، اس لیے کہ وہ اصلاحات خود ترکی میں کامیابی کی منزل حاصل نہیں کر سکیں اور ترک عوام ان اصلاحات کا جواب مترک پنی گردن سے اتارتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کے اعلان کے بعد مصطفیٰ کمال اتابرک نے ترکی میں اسلامی قوانین کو منسوخ کرنے اور عربی زبان پر پابندی لگانے کے علاوہ مساجد، خانقاہوں اور دینی درسگاہوں کی بندش اور اسلامی اقدار و روایات پر قدغنا کی اصلاحات نافذ کی تھیں اور ترکی کو مکمل طور پر ایک ماڈل نیو یونین ملک بنانے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن ترک عوام اپنے عقیدہ اور دینیات پر ان پابندیوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے اور گذشتہ صدی کے چھٹے عشرہ میں منتخب وزیرِ عظم عدنان میندریس شہیدیگی قیادت میں ان میں سے بہت ہی اصلاحات کا جواگردن سے اتار پھینکا۔ جبکہ اس کے بعد بھی ترک مسلمان جناب نجم الدین اربکان اور طیب اردگان کی راہنمائی میں بتدربیّ ان اصلاحات سے پچھا چڑھانے میں مصروف ہیں۔

کمال اتابرک کی اصلاحات اسلام کے عقائد و عبادات اور معاشرتی نظام سے انحراف اور بغاوت کا اظہار تھا جس کا کسی مسلم معاشرہ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اسلام کا دم بھرتے ہوئے اس کے احکام کے عملی نفاذ سے مسلسل گریز کو مسلم ممالک کے حکمرانوں نے اپنا واطیرہ بنالیا ہے، مغربی دانشوروں کی پیروی کرتے ہوئے وہ عام مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ خلافت کا نظام آج کے دور میں قابل عمل نہیں ہے اور اسلامی نظام آج کی دنیا کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ لیکن افغانستان میں طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور میں اسلامی احکام و قوانین کے ذریعے جرائم پر قابو پا کر اور ایک منظم معاشرہ کی طرف پیشرفت کر کے اس پر اپیگنڈا کے غبارے سے ہوا کمال دی ہے اور دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ مسلسل جنگ سے تباہ شدہ معاشرہ میں بھی اسلامی قوانین کے ذریعے نہ صرف امن قائم کیا جاسکتا ہے بلکہ سوسائٹی کو ظلم و ضبط کا پابند بھی بنایا جاسکتا ہے۔ جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ امیر المؤمنین ملا محمد عمر کے صرف ایک حکم سے ان کے زیر حکومت پورے علاقے میں پوست کی کاشت کامل طور پر ختم ہو گئی تھی اور اب طالبان کی حکومت ختم ہونے کے بعد افغانستان میں پوست کی ریکارڈ کاشت کی خبریں بین الاقوامی اخبارات میں مسلسل منظر عالم پر آرہی ہیں۔ اس لیے جزل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مغربی دانشوروں اور اسلام دشمن لا بیوں کے پر اپیگنڈا سے مروع نہ ہوں بلکہ اسلامی نظام کو ناقابل عمل قرار دینے کی وجہے دستور پاکستان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اسلامی احکام و قوانین کے عملی نفاذ کی طرف پیشرفت کریں جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر کہلانے کے بعد ان کی سب سے بڑی ذمہ داری قرار پاتی ہے۔

## نوابزادہ نصراللہ خان مرحوم اور عالمی استعمار

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۲۰۰۳ء۔ ۲ اکتوبر

نوابزادہ نصراللہ خان مرحوم ہمارے دور کے سیاستدان نہ تھے۔ اس لیے ان کی بہت سی باتوں کو سمجھنا آج کی نسل کیلئے مشکل ہے۔ وہ اس ٹیم کے آخری اور باقی ماندہ فرد تھے جس نے آزادی کی جنگ لڑی اور آزادی کا پروانہ مل جانے کے بعد اس کے تحفظ اور بقا کیلئے زندگی بھر سرگرم عمل رہے۔ وہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ جباری کی ٹیم کے آدمی تھے۔ انہوں نے مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ تقدیم ہندے سے قبل وہ آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری جزول تھے اور برطانوی استعمار کے تسلط سے وطن عزیز کو آزاد کرنے کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ وہ معروف معنوں میں نواب اور نوابزادہ تھے اور زندگی بھرا سی لقب سے پکارے جاتے رہے۔ جبکہ مجلس احرار اسلام کی سیاست اس دور میں ”نوابِ دشمنی“ سے عبارت تھی۔ احرار کے سیاسی مزاج کے بارے میں اس دور میں یہ کہا جاتا تھا کہ کسی احراری کی جیب میں پانچ روپے ہوں تو وہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ کون سی ریاست کے نواب کے خلاف تحریک چلانی چاہیے۔ اس لیے ایک عرصہ تک میرے ذہن میں بھی یہ بھچ رہی کہ احرار جیسی ”نوابِ دشمن“ جماعت میں نصراللہ خان جیسے ”نواب زادہ“ کا سیکرٹری جزول کے منصب تک رسائی حاصل کر لینا آخر کیسے ممکن ہوا؟ مگر جب انہیں قریب سے دیکھا بلکہ بہت ہی قریب سے دیکھا تو بات سمجھ میں آگئی کہ ”نواب زادہ“ کے لقب کی چادر تو انہوں نے ویسے ہی تان رکھی ہے، اس کے اندر جھانک کر دیکھیں تو ایک ایسے فقیر منش، عوام دوست، اور درویش صفت سیاستدان سے ملاقات ہوتی ہے کہ فخر درویشی کو بھی اس ”نوابی“ پر رنگ ہونے لگے۔

وہ نہ صرف نمازوں کے پابند تھے اور حلال و حرام کا اہتمام کے ساتھ فرق کرنے والے تھے بلکہ میں ان کی شب زندہ داری اور تجدُّد گزاری کا بھی شاہد ہوں۔ انہوں نے دینی تحریکات کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور ختم نبوت کے تحفظ کی جدوجہد میں تو ان کا کردار ہمیشہ قائد ان رہا ہے۔ انہیں اگر کسی دینی تحریک کے کسی پہلو سے اختلاف بھی ہوا ہے تو اس کا اظہار انہوں نے درون خانہ کیا ہے۔ بر سر عالم ایسے کسی اختلاف کے اظہار سے وہ گریز کرتے تھے جس سے دینی تحریک کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔ وہ معروف معنوں میں خالصتاً ایک سیاسی رہنمای تھے۔ ان کا شمار دینی رہنماؤں میں نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے متعدد دینی تحریکات کے رہنماؤں کو اپنی جدوجہد کے حوالے سے ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے دیکھا ہے اور انہیں دینی رہنماؤں کو تحریکوں کے داؤنیچی سمجھاتے ہوئے پیا ہے۔

مجھ سے اگر کوئی نواب زادہ نصراللہ خان مرحوم کی تین بڑی خصوصیات بیان کرنے کیلئے کہے تو میری گزارش یہ ہوگی

کہ:

1. وہ اسلام اور پاکستان کے ساتھ اس قدر دو ٹوک اور واضح کلمہ منٹ رکھتے تھے کہ ان دو حوالوں سے کوئی ڈھیلی بات سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔

2. عوام کے حق حکمرانی اور جمہوری اقدار کی سر بلندی پر وہ اس درجہ کا یقین رکھتے تھے کہ ساری زندگی انہوں نے اسی کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے گزار دی۔

3. اور ان کی استعمار دشمنی کا یہ عالم تھا کہ سیاسی زندگی کا آغاز انہوں نے برطانوی استعمار کے تسلط سے آزادی کی جدوجہد سے کیا اور ان کی ۸۵ سالہ زندگی کا اختتام امریکی استعمار کے تسلط کے خلاف کلمہ حق بلند کرتے ہوئے ہوا۔ انہوں نے افغانستان اور عراق پر امریکی یلغار اور پاکستان کے معاملات میں امریکی مداخلت کے خلاف جس بلند آہنگی کے ساتھ آواز اٹھائی وہ پاکستان اور عالم اسلام کے دیگر سیاست دانوں کیلئے شعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اسلام، پاکستان، جمہوریت اور عالم اسلام کیلئے ہر قسم کی مصلحتوں سے بالآخر بوجایا کرتے تھے اور ان معاملات میں کسی کے ساتھ رعایت و دارکھنے کے قائل نہیں تھے۔

نوابزادہ نصراللہ خان مرحوم فرشته نہیں تھے، انسان تھے۔ ان سے یقیناً بہت سی غلطیاں ہوئی ہوں گی اور ان کی بہت سی باتوں سے لوگوں کو اختلاف رہا ہو گا۔ خود ہمیں بھی ان کی بعض باتوں سے اختلاف تھا لیکن اسلام اور پاکستان کے ساتھ ان کی محبت اور اسلامی و جمہوری اقدار کے ساتھ ان کی مکمل نسبت تھک و شبہ سے بالآخر تھی۔ اور اپنے مشن اور فکرو عقیدہ کیلئے جدوجہد میں ان کا حوصلہ و عزم اور استقلال و استقامت آنے والی نسلوں کیلئے یقیناً شعل راہ ثابت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، سینات سے در گزر کریں، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

## مولانا شاہ احمد نورانی اور افغان طالبان

روزنامہ پاکستان، لاپور --- ۱۲ دسمبر ۲۰۰۳ء

بدلہ سنجی اور خوش کلامی ان کا طراہ اتیاز تھی، ہلکے ہلکے جملوں کے ساتھ محل کارگنگ بدل دینے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ شرافت اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے خوبصورت چوٹ کرتے تھے اور جس پر فقرہ کستے تھے وہ بھی اگر باذوق ہوتا تو چیز بھی ہونے کی بجائے حظ اٹھاتا تھا۔ ایک دور میں ان کا زیادہ تر وقت ملک سے باہر گزرنے لگا حتیٰ کہ ان کے بارے میں یہ طفیلہ عام ہو گیا کہ جب وہ پاکستان کے کسی حصے میں ہوتے تو یہ کہا جاتا کہ مولانا نورانی پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل میری بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی کہ سال کے کئی مہینے ملک سے باہر گزرنے لگے۔

اس پس منظر میں کافی مدت کے بعد میری ان سے ملاقات اس موقع پر ہوئی جب وہ مولانا اسمیح الحق کی دعوت پر ”دفع افغانستان و پاکستان کو نسل“ کی تشکیل کے سلسلے میں اکوڑہ خنک تشریف لے گئے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو وہ مولانا اسمیح الحق کی رہائش گاہ میں علماء کے جھرمت میں بیٹھے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو اٹھ کھڑے ہوئے، بڑے تپاک

سے معافہ کیا اور میرے کان کے قریب منہ کر کے پوچھنے لگے ”مولانا آپ پاکستان کے دورے پر کب آئے ہیں؟“ میں نے جواب میں کہا کہ یہی بات میں آپ سے پوچھنے والا تھا اس پر ایک ہلکا سے قہقہہ لگا اور حال احوال پوچھنے لگے۔ میں نے ان کو پاکستان کی محافل میں بھی دیکھا اور لندن کی محافل میں بھی ان کے ساتھ شرکت کی اور جگہ ان کی بذله سنجی اور خوش طبعی کا لاطف اٹھایا ہے۔ وہ گفتگو اور ملاقات میں جس قدر نرم خوتھے، اپنے اصولوں کے معاملے میں اسی طرح بے چک اور سخت تھے۔ ایک دور میں کراچی اور حیدر آباد کی سیاست میں ان کی جمیعت علماء پاکستان اور جماعت اسلامی پاکستان کا غلبہ تھا اور جے یوپی ان دو شہروں سے اچھی خاصی پاریمانی نشستیں حاصل کیا کرتی تھی۔ پھر ارباب حل و عقد نے ان جماعتوں کا زور توڑنے کیلئے کراچی کو سلامی تفریق کی تذریز کر دیا اور مہاجر غیر مہاجر کے نام سے وہ اودھم چاکہ کراچی کا حالیہ بکر کر رہ گیا۔ مولانا نورانی مہاجر تھے، اگر وہ اس تقسیم کیلئے تھوڑی سی ذہنی پچک دکھادیتے تو بہت کچھ بچا سکتے تھے بلکہ بہت کچھ حاصل بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اصولوں کی خاطر اپنی جماعت کی پاریمانی قوت قربان کر دی اور مہاجر غیر مہاجر کی تفریق کے خلاف مسلسل کلمہ حق بلند کرتے رہے۔

انہوں نے جس بلند آنکھی کے ساتھ عالم اسلام کے بارے میں امریکی عنانم اور جاریت کے خلاف کلمہ حق بلند کیا، طالبان کی اسلامی حکومت کو سپورٹ کرنے کے ساتھ ساتھ افغانستان اور عراق میں امریکہ کی مسلسل مداخلت اور قبضے کے خلاف رائے عامہ کی رہنمائی کی، اور بڑھاپے اور عالمت کے باوجود مسلسل اور متحرک کردار ادا کیا، وہ علماء کی نئی نسل کیلئے مشعل راہ اور دینی و سیاسی رہنماؤں کیلئے لاائق رشک اور قابل تقلید ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، حسناۃ کو قبولیت سے نوازیں، سینمات سے در گزر کریں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور جملہ پسماندگان اور متولین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین!

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ دسمبر ۲۰۰۳ء

مولانا نورانی مسکاگابریلوی تھے اور ڈھیلے ڈھالے نہیں بلکہ متصلب اور پختہ کار بریلوی تھے۔ اور میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ جہاں بھی مسلک کی بات آئی ہے ان میں کوئی پچ دیکھنے میں نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود مشترکہ دینی معاملات میں انہوں نے مشترکہ جدوجہد اور رابطہ و معاونت سے کبھی گریز نہیں کیا۔ سیاسی معاملات ہوں یا دینی، ملک کی مختلف النیحیں جماعتوں اور حلقوں کے درمیان رابطہ و مفاہمت کے فروع اور اتحاد و اشتراک کے اہتمام میں ان کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔

لپنی زندگی کے آخری سالوں میں افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت، افغانستان کی قومی خود مختاری و آزادی کے تحفظ، امریکہ کی استعماری بیغار کی خلافت، اور پاکستان کے قومی اور داخلی معاملات میں امریکی مداخلت کی نہ ملت و مزاحمت میں انہوں نے جو شاندار کردار ادا کیا وہ ہماری قومی تاریخ کے ایک مستقل باب کے طور پر یاد کرھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی دینی قوتوں نے مجھے مجلس عمل کے نام سے سیاسی اتحاد قائم کیا تو اس کی سربراہی کیلئے سب سے نمایاں

اور حقدار شخصیت انہی کی سامنے آئی۔ اور وہ ملک میں جمہوری اقدار کی بحالی، قومی خود مختاری کے تحفظ، دستور کی بالادستی اور عالمی سطح پر امریکی استعمار کی اسلام دشمنی کے خلاف جدوجہد کی قیادت کرتے ہوئے اس شان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے کہ پوری قوم غم و اندوہ میں ڈوب گئی۔ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور دینی کارکن ان کی جدائی کی کمک اپنے دلوں میں محسوس کر رہے ہیں اور بلا امتیاز ہر طبقہ ان کی دینی و قومی خدمات پر خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور تمام پسمند گان کو صبر جیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## خود احتسابی اور ناقدانہ جائزہ

روزنامہ اسلام، لاپور ۲۶ جنوری ۲۰۰۳ء

دوسری بات جس کی طرف ائمہ اور علماء کی اس کافرنیس کے شرکاء کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے احتساب اور اپنی سرگرمیوں کے ناقدانہ جائزہ کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں اس بات کو نہ صرف غیر ضروری سمجھا جاتا ہے بلکہ معیوب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔ مثلاً بعض دوست جب یہ بات کرتے ہیں کہ طالبان ہمارے بھائی ہیں، بہت نیک ہیں، مغلص ہیں اور انہوں نے قربانی اور ایثار کی شاندار روایات زندہ کی ہیں، اس لیے ان کی غلطیاں نہیں کالانی چاہیں اور ان کے طرز عمل کا ناقدانہ جائزہ نہیں لینا پڑا ہے، تو مجھے توجہ ہوتا ہے اور میں عرض کرتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سب سے بہترین اور مقدس طبقہ صحابہ کرام کا گروہ ہے، لیکن جب انہیں غزوہ احمد میں وقتی طور پر ہزیبت کا سامنا کرنا پڑا اور حنین کی لڑائی میں تھوڑی دیر کیلئے ان کے قدم اکھڑے تو قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور ان کی ناکامی کا اعتراف کیا، اس کے اسباب بیان کیے اور ان وجوہ کی نشاندہی کی جن کی وجہ سے ان دونوں غزووں میں وقتی طور پر ہزیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے حضرات صحابہ کرام کے تقدس اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑا اور ان کے خلوص اور قربانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اس لیے قرآن کریم کا اسلوب اور ہدایت ہمارے لیے یہی ہے کہ اگر کسی مرحلہ میں ناکامی ہو تو اس کے اسباب کا جائزہ لواور و جوہات کی نشاندہی کرو تاکہ ان کے ازالہ کیلئے کوئی صورت نکال سکو۔

## تحریکات آزادی کا جہاد اور صدر جنرل پرویز مشرف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۳ء

صدر جنرل پرویز مشرف نے گذشتہ دونوں اسلام آباد میں ”علماء و مشائخ گنوشن“ سے خطاب کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی قابل توجہ باتیں کی ہیں وہاں مختلف مسلم حلقوں کی جہادی سرگرمیوں کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے اور کہا ہے کہ یہ

سرگرمیاں و ہشت گردی کے زمرہ میں آئی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں جہاد کا اعلان صرف حکومت کا حق ہے اور پرائیویٹ طور پر جہاد کے نام سے کوئی عمل ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں صدر محترم کا کہنا درست نہیں ہے اس لیے کہ کسی ملک کے خلاف جہاد کا اعلان بلاشبہ حکومت ہی کا حق ہے اور حکومت کے سوا کسی فرد یا طبقہ کو کسی بھی ملک یا قوم کے خلاف جہاد کے اعلان کا حق حاصل نہیں ہے لیکن مسلم معاشرہ پر مسلط ہونے والے کفر کار استہate رونما اور کفر و استعمار کے تسلط سے مسلم آزادی کی نجات کیلئے جدوجہد کرنا بھی حکومت کی اجازت پر موقوف نہیں رہا:

1. ہمارے ہاں فرگنی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کی جتنی جنگیں لڑی گئیں ہیں جہاد کے پرائیویٹ فتوؤں کی بنیاد پر لڑی گئی ہیں۔

2. افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف کسی حکومت نے جہاد کا اعلان نہیں کیا تھا، یہ اعلان علماء کی طرف سے ہوا تھا جس کا نہ صرف افغان قوم نے ساتھ دیا بلکہ عالم اسلام نے ان کی حمایت کی اور خود پاکستانی حکومت اور فوج نے اس میں حصہ لیا۔

3. اسی طرح فلسطین میں اسرائیلی جاریت اور تسلط کے خلاف آزادی کی جدوجہد کسی حکومتی اعلان کی بنیاد پر نہیں لڑی جا رہی بلکہ پرائیویٹ جماعتیں ہیں جو جان弗روشی کے جذبے کے ساتھ اسرائیلی درندگی کے سامنے ڈلی ہوئی ہیں۔

4. جبکہ آزاد کشمیر کا موجودہ خط پرائیویٹ جہاد کے ذریعے پاکستان کا حصہ بنائے اور کشمیری عوام کی مسلح جنگ آزادی جہاد ہی کے عنوان سے مسلط جاری ہے۔

اس لیے یہ کہنا کہ حکومت کے اعلان کے بغیر کوئی جہاد نہیں ہو سکتا ان تمام تحریکات آزادی اور جنگ ہائے حریت کی نفی ہے، جس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔

## مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہید

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۰۰۴ء

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۲ جون ۲۰۰۵ء

مفہتم نظام الدین شامزئی کا تعلق سوات سے تھا، انہوں نے دینی علوم کی تکمیل جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کا لوئی گرجی میں کر کے وہی تدریسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ مولانا مفتی نظام الدین شامزئی کا نام میں نے پہلی بار اس وقت سنا جب انہوں نے حضرت امام مہدی کے بارے میں کتاب لکھی۔ امام مہدی کے ظہور کے بارے میں جناب بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گویاں ہر دور میں گمراہی پھیلانے والے گروہوں کا نشانہ مشق رہی ہیں اور سینکڑوں افراد نے اب تک امام مہدی ہونے کا دعویٰ کر کے ان پیش گویوں کو خود پرفٹ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے رد عمل میں کچھ اہل علم نے سرے سے ان

پیش گوئیوں کی صحت کو ہی موضع بحث بنا لیا۔ ہمارے ایک دوست مولانا اختر کاشمیری جو ہمارے ساتھیوں میں سے ہیں، ہفت روزہ خدام الدین لاہور اور ہفت روزہ چنان لاہور کی ادارت کی خدمات سر انجام دیتے رہے ہیں، اچھا لکھنے اور بولنے والوں میں سے تھے، انہوں نے ایران کے متہی انقلاب کے بعد وہاں کا دورہ کر کے اپنا سفر نامہ ”آتش کہہ ایران“ کے نام سے لکھا جس نے خاصی شہرت حاصل کی، لیکن حضرت مہدی کے بارے میں ان کا قلم افراط و تفریط کا شکار ہو گیا اور انہوں نے اس سلسلے میں احادیث و روایات کو ایک مقالہ میں ہدف تقدیم کیا۔۔۔

مولانا مفتی نظام الدین<sup>شامزی</sup> نے جوان دنوں جامعہ فاروقیہ کراچی میں مدرس تھے، اس کا جواب لکھا اور معقول استدلال کے ساتھ اس سلسلے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کیوضاحت کرتے ہوئے ثابت کیا کہ حضرت مہدی کے بارے میں آنحضرت کی پیش گوئی والی احادیث صحیح ہیں اور انہیں ہدف تقدیم کننا درست نہیں ہے۔ مفتی صاحب<sup>ن</sup> نے امت کو اعتدال کا راستہ دکھایا اور واضح کیا کہ ان پیش گوئیوں کو غلط طور پر استعمال کرنے والے خود ساختہ مہدیوں کا موقف غلط اور گمراہی پر منی ہے، لیکن اس کے رد عمل میں سرے سے ان پیش گوئیوں اور احادیث کا انکار کرنا یا انہیں محروم ثابت کرنے کی کوشش کرنا درست طرز عمل نہیں ہے۔ امام مہدی اپنے وقت پر آئیں گے اور جناب رسول اللہ<sup>گی</sup> پیش گوئیوں کے مطابق ہی آئیں گے، اسی بات پر جمہور اہل سنت کا اتفاق ہے۔ مفتی نظام الدین<sup>شامزی</sup> کے ساتھ تھا میراپہلًا تعارف جو غایبانہ تھا، ان کی اس کتاب کے ذریعے ہوا اور ان کا مقالہ پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ علمی انداز میں انہوں نے اس مسئلے پر بحث کی ہے۔

اس کے بعد کراچی میں حاضری کے ایک موقع پر مفتی صاحب<sup>ن</sup> سے ملاقات ہوئی تو ان کی سادگی اور علمی ذوق دیکھ کر اور زیادہ متاثر ہوا کہ پرانے اسلاف اور بزرگوں کی روایات کو قائم رکھنے کا جذبہ نوجوان علماء میں موجود ہے اور یہ بات جہاں بھی دیکھتا ہوں، اطمینان اور حوصلے میں اضافہ کا باعث بتتی ہے۔ پھر ملاقوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور جمیعت علماء اسلام کے بہت سے امور میں وقایوں کا مشاورت ہوتی رہی۔ وہ افتاء اور تدریس کے ساتھ ساتھ سیاست کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے اور جمیعت علماء اسلام کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے۔

ایک موقع ایسا آیا کہ ایک بیرونی سفر میں چند روز کیلئے ان کے ساتھ رفاقت ہو گئی۔ جہاد افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین کے خاتمے اور وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کی آزادی کے بعد ان ریاستوں کے علماء کے ساتھ رابطوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پاکستان سے علماء کرام اور دینی رہنماؤں کے متعدد و فوڈنے و سطی ایشیا کی ریاستوں کا دورہ کیا۔ ایک وفد میں مجھے بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ میں معمول کے مطابق موسم گرم میں لندن جا رہا تھا اور میں نے ازبک ایر لائن کے ذریعے سفر کا ارادہ کیا، خیال تھا کہ راستے میں چند روز تاشقند میں رہنے کا موقع مل جائے گا۔ وہاں کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے مولانا مفتی محمد جبیل خان شہید<sup>ر</sup> سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ علماء کا ایک وفد ازبکستان جا رہا ہے، آپ بھی اس کے ساتھ ہی پروگرام بنالیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وفد میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، مولانا فداء الرحمن درخواستی اور مولانا مفتی نظام الدین<sup>شامزی</sup> بھی شامل تھے، جبکہ مفتی جبیل خان شہید وفد کے منتظم تھے۔ اس سفر میں تاشقند کے علاوہ سمر قند اور خرنگ بھی جانا ہوا۔ خرنگ میں حضرت امام بخاری رحمہ اللہ

کی قبر ہے۔ وہاں حاضری ہوئی اور فاتح خوانی اور دعا کے علاوہ ایک بات اور ہوئی کہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزی بخاری شریف ساتھ لے گئے تھے، انہوں نے حضرت امام بخاریؒ کی قبر کے ساتھ بیٹھ کر امام بخاریؒ تک اپنی سند کے ساتھ ایک روایت بلند آواز سے پڑھی اور بتایا کہ پرانے بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے کہ جب امام بخاریؒ کی قبر پر حاضری ہوتی تو ان تک اپنی سند کے ساتھ بخاری شریف کی ایک روایت پڑھتے۔ مفتی نظام الدین شامزی شہیدؒ نے بھی اس موقع پر یہ روایت پوری کی اور ہم سب ان کے ساتھ شریک تھے۔

اس سفر میں مفتی صاحبؒ ایک اور خصوصیت سامنے آئی کہ وہ دوران سفر اور شور و شغب میں بھی اپنا عمل شغل بخاری رکھ سکتے ہیں۔ میرا مزاج اس سے بالکل مختلف ہے کہ شور و شغب اور دیگر مصروفیات کے ماحول میں لکھنے پڑھنے کا کام میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے اس کام کیلئے خاموشی اور تہائی درکار ہوتی ہے مگر مفتی صاحب کو دیکھا کہ کتابوں کا بستہ ساتھ ہے، جہاں موقع ملکاکھوں کر بیٹھ گئے اور قلم کاغذ سنبھال لیا۔ باقی دوست گپ شپ میں مصروف ہیں اور مفتی صاحب اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ایک اور فاضل دوست مولانا سعید الرحمن علویؒ کا بھی یہی معمول تھا، وہ دوران مجلس لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے اور دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں بھی پوری طرح شریک ہوتے۔ مجھے یہ دیکھ کر یہ رٹک ہوتا کہ میں اس صلاحیت سے محروم ہوں۔ بعض حضرات کو دیکھتا ہوں کہ سفر کے دوران مطالعہ کر لیتے ہیں، ان پر بھی مجھے رٹک آتا ہے کہ وہ اپنا بستہ سا کام دوران سفر ہی نمائی لیتے ہیں، جبکہ مجھے سے ایسا نہیں ہو سکتا، بمشکل اخبار وغیرہ پڑھ پاتا ہوں۔ بہر حال ازبکستان کے سفر میں مولانا مفتی نظام الدین شامزی شہیدؒ کے ساتھ اچھی رفتار رہی اور اس سفر کی بہت سی یادیں ذہن میں وقایۃ فوقتا نازہ ہوتی رہتی ہیں۔

طبعیت میں سادگی اور زندہ دلی تھی، دوستوں کے ساتھ بے تکلف رہتے تھے اور ہنسی مزاح کا شغل چلتا رہتا تھا۔ پہلے میرے ذہن میں تھا کہ عمر میں شاید مجھ سے بڑے ہوں گے مگر ایک مرتبہ سن ولادت دریافت کی تو غالباً ۱۹۵۲ء بتائی۔ میں نے دل لگی سے کہا کہ مفتی صاحب! یہاں آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی، میں خواہ مخواہ اب تک آپ کے سامنے گھٹنے لیکر بیٹھتا رہا ہوں۔ آپ تو میرے چھوٹے بھائی مولانا عبد القدوس قارن سے بھی عمر میں چھوٹے ہیں۔ یہ سن کر بہت بہت لیکن یہ بہر حال دل لگی کی بات تھی۔ مفتی صاحب عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود علم و فضل اور دینی جدوجہد کے جذبہ و حوصلہ میں مجھ سے کہیں آگے تھے اور آخری عمر میں تو ان کی جدوجہد ہم سب کیلئے قابل رٹک تھی۔

قومی سطح پر مفتی نظام الدین شامزیؒ اس وقت ابھرے جب انہوں نے خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افواج کی موجودگی کے خلاف عرب علماء کی احتجاجی تحریک کی جماعت میں فتویٰ دیا اور ملک کے مخفف حصوں میں سیمینار منعقد کر کے اہل دانش کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ جو عرب علماء سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف احتجاج اور خلیج عرب سے غیر ملکی فوجوں کے انتخلاء کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان کا موقف درست ہے اور ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ اسماعیل بن لادن نے اس موقف کا پرچم بعد میں بلند کیا جبکہ ڈاٹر سفر الحاوالی، ارشاد مسلمان عودہ، ڈاکٹر سعد النقیہ اور ڈاکٹر محمد المسعودی جیسے ممتاز عرب علماء دانش و دانش پر ٹھہرے سے ہی اس کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ ایک موقع پر حریم شریفین کے امام مختارم اشتعل خلیل خلیل نے بھی مسجد نبوی میں جمعۃ المبارک کے خطبے کے

دورانِ اہل دین کے اس موقف کی ترجیحی کی تھی۔

خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی آمد اور اس کے خلاف سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کے علماء کی دینی جدوجہد کے آغاز کا مرحلہ بہت اضطراب اغیز تھا اور پاکستان میں اس کے بارے میں آواز بلند کرنے میں بظاہر بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اپنے دو تین کالموں کے ذریعے اس مسئلے کو چھپیا اور پاکستان کے دینی حلقوں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہا تو مجھے بعض دوستوں نے سمجھا نے کی کوشش کی کہ کس آگ میں ہاتھ ڈال رہے ہو؟ مگر میرے لیے بالکل خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ اسے میری کمزوری سمجھ لیں یا حکمت عملی کہ کوئی مسئلہ سامنے آئے تو اس کی نشان دہی، اس کے بارے میں دینی حلقوں کو توجہ دلانے اور متعلقہ حضرات کی ضروری بریفینگ تک اپنے کام کو محدود رکھتا ہوں۔ اس کے بعد میری خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا حلقة اس کام کو سنبھال لے جو اس کیلئے عملی جدوجہد کے تقاضے پورے کر سکتا ہو، کیونکہ بہت سے ایسے تقاضوں کو عملًا پورا کرنا میرے بس میں نہیں ہوتا اس لیے جب کوئی حلقة یا بزرگ اس کام کو سنبھال لیتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے اور میں حتیٰ اوس تعاون بھی کرتا ہوں۔

خلیج عرب میں امریکی افواج کی آمد اور سعودی عرب کے علماء حق کی احتاجاتی جدوجہد کے حوالے سے مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی اور سرسرت ہوئی کہ اسے مفتی عظوم حضرت مولانا مفتی شیداحمد لدھیانوی کے حلقة نے اور پھر حضرت مولانا مفتی نظام الدین شاہزادی شہیدی نے سنبھال لیا اور اس خوبی کے ساتھ سنبھالا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ جب ان بزرگوں نے خلیجی ممالک میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف علم احتجاج بلند کیا اور پاکستان کے دینی حلقوں کو بیدار کرنے کی مہم شروع کی تو مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مفتی نظام الدین شاہزادی نے مختلف سیمیناروں میں ملک کے سرکردارہ دانش دروں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا اور ان کے سامنے خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی اور ان سے عالم اسلام اور حرمین شریفین کو درپیش خطرات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ پورے ملک میں بیداری کی اہم پیدا کر دی اور جس مسئلے کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ عرصہ پہلے تک زبانیں رک رک جایا کر تی تھیں، وہ ملک کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی روزمرہ گفتگو کا موضوع بن گیا۔

اس موقع پر علماء کرام کی طرف سے ایک فتویٰ بھی سامنے آیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری وصیتوں میں تلقین فرمائی تھی کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے اسی وصیت پر عملِ دامد کرتے ہوئے اپنے دور خلافت میں خیر سے یہود کو اور مخران سے نصاریٰ کو جلاوطن کر دیا تھا، اس لیے جزیرہ عرب اور خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افواج کی موجودگی اور اس خطے کے ممالک میں امریکہ کا بڑھتا ہوا اثر و سونجنا بی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی اور وصیت کی خلاف ورزی ہے۔ اس فتویٰ اور موقف کیوضاحت اور قوی سطح پر اسے اجاگر کرنے میں مفتی نظام الدین شاہزادی شہیدی نے متحرک اور پھر پور کردار ادا کیا۔

مفتی شاہزادی شہیدی جہاد افغانستان اور طالبان کی اسلامی حکومت کے عملی سپرستوں میں سے تھے۔ انہوں نے طالبان حکومت کے دفاع اور پشت پناہی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی اور ہر ممکن ذریعے سے جہاد افغانستان کے مظائق نباخ کے تحفظ اور طالبان حکومت کی پشت پناہی میں مصروف رہے۔ افغانستان پر امریکی حملہ اور امریکی جاریت کے حوالے سے

حکومت پاکستان کا کردار عالم اسلام کے بڑے سماجات میں سے ہے جن پر دینی حلقوں نے ہمیشہ شدید غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ اس کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں مفتی نظام الدین شامزی کی آواز سب سے زیادہ بلند اور تو انہی ہی ہے۔ مفتی نظام الدین شامزی صرف روایتی عالم دین نہیں تھے بلکہ ملت اسلامیہ کے مصائب پر کڑھنے والے اور امت کی مشکلات کے حل کی تلاش میں مضطرب و بے چین رہنے والے حق گوراہنما بھی تھے، حتیٰ کہ اسی راہ میں انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، سینات سے در گزر کریں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے،  
آمین یا رب العالمین۔

روزنامہ اسلام، لاپور--- ۸ جون ۲۰۰۳ء

مولانا مفتی نظام الدین شامزی کی المناک شہادت اور ٹارگٹ کلنگ پر گذشتہ روز ملک بھر میں مجده مجلس عمل کی اپیل پر یوم احتجاج منیا گیا۔ مختلف شہروں میں ہڑتال ہوئی، احتجاجی مظاہرے ہوئے اور جماعت المبارک کے اجتماعات میں اس وحشیانہ قتل کی شدید نہاد کرتے ہوئے ان کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا۔

مفتی نظام الدین شامزی سوات سے تعلق رکھنے والے ایک بے باک اور حق گو عالم دین تھے، انہوں نے جامعہ فاروقیہ کراچی میں تعلیم پائی اور ویس تدریس و افقاء سے منسلک ہو گئے۔ سالہا سال تک مادر علی میں خدمات سرانجام دینے کے بعد جامعہ علوم اسلامیہ بنوی ٹاؤن سے وابستہ ہوئے اور آخر دم تک علامہ سید محمد یوسف بنوی کی قائم کردہ اس عظیم درس گاہ میں علمی و تدریسی فرائض سرانجام دیے۔ ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، باون بر س کی عمر میں عروس شہادت سے ہمکنار ہوئے۔ مگر اس مختصر عمر میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں اور علمی و دینی حلقوں میں جو مقام حاصل کیا وہ بلاشبہ قابل رثیک ہے۔ ان کی تیز رفتاری کی وجہ سے بھی میں آتی ہے کہ وقت تھوڑا اور کام زیادہ تھا اور جسے تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرنے کی ڈیوٹی سونپ دی جائے اس کی رفتار بھی ہوتی ہے۔

مفتی صاحب سے پہلی ملاقات مجھے یاد نہیں کہ کب ہوئی تھی مگر آخری ملاقات تبلیغ اجتماع کے رائے و نظر کے گذشتہ سال کے سالانہ اجتماع میں ہوئی جب والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدر، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، حضرت مولانا ناصریم اللہ خان، حضرت مولانا حسن جان، حضرت مولانا ذاکر عبد الرزاق سکندر اور حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزی پر مشتمل اکابر علماء کرام کے ایک وفد نے بھارت سے تشریف لانے والے تبلیغی جماعت کے بزرگوں حضرت مولانا سعد، حضرت مولانا زبیر، حضرت مولانا احمد لاث اور حضرت مولانا محمد ابراءیم آف گجرات سے بطور خاص ملاقات کی اور انہم امور پر ان بزرگوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ مفتی محمد جمیل خان، مولانا سعید احمد جلال پوری اور راقم الحروف بھی اس وفد میں شریک تھے۔ اس گفتگو میں زیر بحث آنے والے امور انتہائی اہم تھے مگر ان کا اظہار سردست ضروری نہیں ہے۔

اس کے بعد مولانا مفتی نظام الدین شامزی سے غالباً کوئی ملاقات نہیں ہوئی، البتہ ایک پرانی ملاقات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے جب سرکردہ علماء کرام کے ایک وفد نے ازبکستان کا دورہ کیا اور تاشقند، سرقدار خرٹگ کے مسلمانوں اور علماء سے ملاقاتیں کیں۔ اس و福德 میں مولانا ذاکر عبد الرزاق سکندر اور مولانا فداء الرحمن درخواستی بھی شامل تھے۔ چند روز رفاقت رہی اور اس دوران مفتی نظام الدین شامزی کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا علمی شغل تھا جو سفر کے دوران بھی جاری رہا۔ کسی موضوع پر علمی کام کر رہے تھے، ضروری کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان ساتھ رکھا ہوا تھا، جہاں موقع ملتا مطالعہ میں لگ جاتے اور جہاں گنجائش پاتے لکھنا شروع کر دیتے۔ مجھے یہ بات اچھی لگی اور بہت رشک آیا کہ میں کوشش اور خواہش کے باوجود اپنے مزاج کو اس رخ پر نہ ڈھال سکا۔ مجھے مطالعہ اور لکھنے کیلئے تہائی در کار ہوتی ہے، رواروی میں اس طرح نہیں لکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کئی روز تک نہیں لکھ پاتا اور اہم عنوانات ذہن میں ہونے کے باوجودہ جاتے ہیں۔

مفتی نظام الدین شامزی شہید کے نامہ اعمال میں بہت سی نیکیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس تھوڑی سی عمر میں انہیں بہت سے اعمال صالح سینئے کا موقع اور توفیق عطا فرمائی ہے۔ ان کی خدمات کی فہرست لکھنے کیلئے اگر مجھے کہا جائے تو میں سب سے پہلے ان کے اس جرأت مندانہ کردار کا تذکرہ کروں گا جو انہوں نے پاکستان کے دینی حلقوں میں خلیج عرب میں امریکی افواج کی موجودگی کے خلاف بیداری اور احتجاج کی فضایاں کرنے کیلئے ادا کیا۔ یہ وقت و تھا جب سعودی عرب کے اکابر علماء کرام نے شاہ فہد کے نام ایک عرض داشت میں خلیج میں یہود و نصاریٰ کی نوجوں کے اجتماع کے خلاف احتجاج کیا اور حریمین شریفین کے محترم امام الشاعلی حذفی مدظلہ نے مسجد نبوی میں خطبہ جمۃ المبارک کے دوران سابقہ روایت سے ہٹ کر مشرق و سلطی میں یہود و نصاریٰ کے معاذانہ کردار کو موضوع بحث بنایا۔ پاکستان میں اس وقت سعودی حکومت کے احراام کی وجہ سے دینی حلقوں میں اس مسئلہ پر خاموشی جیسی یقینیت طاری تھی، ابتداء میں بعض کالموں میں اس مسئلہ کو چھپنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی مگر حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی قدس اللہ سرہ العزیز اور حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزی نے اس مسئلہ کو جس جرأت و حوصلہ اور عزم و ولولہ کے ساتھ اٹھایا اس نے اگلی بچھلی ساری کسیں نکال دیں۔ بلکہ مفتی نظام الدین شامزی نے تو اسے زندگی کا مشن بنایا۔ اس حوالے سے جب پاکستان کے دینی حلقوں میں پائی جانے والی موجودہ بیداری کو دیکھنا ہوں اور سابقہ حالات سے اس کا موازنہ کرتا ہوں تو میرا سرفراط عقیدت سے ان دونوں بزرگوں کے سامنے جھک جاتا ہے اور دل بے ساختہ انہیں دعائیں دینے لگتا ہے۔

افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کی سرپرستی اور مسلسل پشت پناہی مفتی نظام الدین شامزی شہید کا دوراً بڑا کارنامہ ہے جس کا تذکرہ ان کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین میں کثرت کے ساتھ ہو رہا ہے، اس لیے میں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسرے بہت سے تجزیہ نگاروں کے ساتھ میں بھی اس بات سے متفق ہوں کہ مفتی نظام الدین شامزی کی شہادت اور ٹارگٹ کلنگ کا تعلق انہی دو مسائل سے ہے۔ اور ان کی شہادت سے پہلے اور بعد میں جس فرقہ وارانہ دہشت گردی کا کرپی میں اہتمام کیا گیا ہو اس رخ سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے ہے تاکہ مفتی نظام الدین شامزی کا یہ قتل بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کے دھندکوں میں گم ہو کر رہ جائے۔

راہِ حق میں مفتی نظام الدین شامزئی کا قتل پھلا قتل نہیں ہے، صرف کرچی کی حد تک اس سے قبل جامعہ انوار القرآن آدم ناؤن کے شیخ الحدیث مولانا انس الرحمن درخواستی شہید ہوئے، جامعہ فاروقیہ کے معزز اساتذہ نے جام شہادت نوش کیا، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ اس دہشت گردی کا ناشانہ بنے، حضرت مولانا ذاکر حبیب اللہ منجاؒ اور حضرت مولانا عبدالسمیعؒ اس درندگی کی زد میں آئے، اور اب مولانا مفتی نظام الدینؒ شامزئیؒ بھی اس شاہراہ شہادت پر چلتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے جاملے ہیں۔ ان کی شہادت پر ہونے والے ملک گیر احتجاج سے ہم متفق ہیں، ان کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کرتے رہنا ضروری ہے اور اس ٹارگٹ ٹلنگ کی پشت پر کار فرما صلقوتوں کو بے نقاب کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ مگر اس سب کچھ کا نتیجہ حسب سابق رہے گا اور موجودہ سُتم سے یہ توافق رکھنا عبشت ہو گا کہ وہ اس دھیانہ قتل کا سراغ لگانے اور اس قسم کی المذاکرات کو روک تھام لکیتے کوئی کردار ادا کر سکے گا۔

چنانچہ اصل ضرورت مفتی صاحب شہیدؒ کے مشن کو زندہ رکھنے اور ان کی روایات کے تسلیل کو رقرار رکھنے کی ہے۔ اسلام کی سر بلندی، دینی قوتوں کی بیداری، استعمالی قوتوں کو بے نقاب کرنا، یہود و نصاریٰ اور ہندوکی اسلام دشمن سرگرمیوں سے مسلمانوں کو بخبر رکھنا، ننی نسل کو مرعوبیت سے بچاتے ہوئے دشمن کے خلاف ڈھنی اور فکری طور پر تیار کرنا، اور کسی ملامت و خوف و تحریص کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہر محاذ پر حق کی آواز بلند کرتے رہنا ہر دور میں اہل حق کا شعار رہا ہے۔ مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ بھی اسی شعار کے نمائندہ تھے اور ان کے ساتھ محبت اور وفا کا تقاضا یہی ہے کہ اس شعار کا پرچم بلند رہے اور اس میں کوئی جھوٹ نہ آنے پائے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور بلند سے بلند تر درجات سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## امریکی صدر کا افغان صدر کو مشورہ

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۲۶ جون ۲۰۰۳ء

۱۹ جون کو لاہور سے پی آئی اے کے ذریعے نیویارک آتے ہوئے راستے میں جہاز دو گھنٹے کیلئے انچھری میں رکا تو روزنامہ جنگ لندن دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ افغانستان کے صدر حامد کرزی گذشتہ دنوں جب امریکہ کے صدر بیش سے ملے تو انہوں نے اس خواہش کا اٹھا کر کیا کہ وہ امریکہ میں رہنا چاہتے ہیں اور وہاں قیام کو پسند کرتے ہیں مگر صدر بیش نے انہیں بے ساختہ جواب دیا کہ وہ افغانستان جا کر اپنی ذمہ داریاں ادا کریں۔ اس سوال جواب کے پیچھے ماشی کی ایک پوری دنیا آباد ہے مگر اس سے قبل ہم اس حقیقت کا اعتراف ضروری سمجھتے ہیں کہ واقعی جو شخص امریکہ میں آتا ہے اس کا یہاں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا وی ذمہ داری کی ظاہری سہولتوں کی جس قدر فراوانی امریکہ میں ہے کسی دوسرے ملک بالخصوص تیسری دنیا اور مسلم دنیا کے کسی ملک میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سہولتیں اسباب وسائل کی فراہمی کے حوالے سے بھی ہیں اور قانون کی عملداری کے حوالے سے بھی ہیں۔

امریکہ کو سائنس و ٹکنالوجی اور سیاست و معیشت میں اس وقت دنیا پر بالادستی حاصل ہے اور پوری دنیا کے نظام اور

معاملات چلانے والے بین الاقوامی اداروں پر نہ صرف امریکہ کا نٹروول ہے بلکہ وہ عملاً اس کے سامنے بے بس ہو کر اس کی ہاں میں ہاں مانے اور اس کے ایجنسی کے بڑھانے پر مجبور ہیں۔ یہ ڈرامہ ساری دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ اقوام متحده اور دیگر بین الاقوامی ادارے امریکہ کی بعض پالیسیوں سے اختلاف بھی کرتے ہیں اور اس کے خلاف قرار داویں بھی پاس کر لیتے ہیں لیکن امریکہ جب کوئی کام کرنے پر آجاتا ہے تو وہ ایک طرف دبک کر خاموش تماشائی بن جاتے ہیں اور امریکہ کو وہ کام کرنے سے روکنے میں کوئی عملی کردار ادا نہیں کر پاتے۔ افغانستان اور عراق کے معاملات میں دنیا نے دیکھ لیا کہ افغانستان کے بارے میں تو اقوام متحده سے امریکہ نے کسی نہ کسی طرح آشیر یاد حاصل کر لیکن عراق کے مسئلہ میں اس نے اور برطانیہ نے اتنے تکلف کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور سب کچھ کر گزنا کے بعد اپنی کاروائیوں کو دو دم بخش کیلئے اقوام متحده کا سہارا لینے میں پھر سے کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اس وقت دنیا کی بالادست تہذیب کا مرکز ہے اور اگرچہ اس تہذیب کو اخلاقی قدروں اور عدل و انصاف کی محاذیت حاصل نہیں ہے مگر سیاست و معیشت، سائنس و تکنیکالوجی اور خوفناک عسکری قوت کی پشت پناہی اسے یقیناً میرہے اور اسی کے بل بوتے پر اس نے دنیا پر اپنے رعب و بدبارہ اور جاہ و جلال کی فضاظاً قائم کر کر گئی ہے۔

والد محترم حضرت مولانا سفرزاد خان صندر دامت برکاتہم نے ۱۹۸۲ء میں برطانیہ کا قیمن ہفتہ کا دورہ کیا تھا اور جمعیت علماء برطانیہ کی ”علمی توحید و سنت انگرنس“ میں شرکت کے علاوہ بہت سے علماء اور دانشوروں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ وہ ایک دانش ور سے اپنی گفتگو کا تقصیہ سناتے ہیں کہ اس نے سوال کیا کہ آپ نے برطانیہ کے دورے کے دوران کیا محسوس کیا ہے؟ حضرت شیخ مدظلہ نے جواب دیا کہ آپ لوگوں نے جسم کی سہولت اور آرام کیلئے بہت کچھ انتظام کر رکھا ہے لیکن روح کیلئے آپ کچھ نہیں کر رہے۔ اس انگریز دانش ورنے اس بات کی تائید کی اور کہا کہ آپ نے صورت حال کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مغرب نے مذہب سے دست بردار ہو کر اس دنیا کو ہی سب کچھ قرار دے لیا ہے اس لیے تمام وسائل و اسباب کو اسی زندگی کیلئے آسانیاں فراہم کرنے پر صرف کردیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں اور اس کی دیکھا دیکھی مشرق اور عالم اسلام میں بھی سہوتاں اور آسانیوں کا فروغ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر کام مشین کے ذریعے لینے کی کوشش ہو رہی ہے اور جسمانی مشقت کے امکانات کو کم سے کم کرنے کیلئے بے پناہ وسائل خرچ کیے جا رہے ہیں۔ گذشتہ شب واشگٹن میں پینٹاگون کے قریب ایک محلہ میں ایک پاکستانی دوست نے، جو صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے ریسٹورنٹ کے نئے شعبے کے افتتاح کے موقع پر اعزازی ڈرزر کا اہتمام کیا جس میں مولانا عبدالحمید اصغر اور رقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ یہاں پاکستانی ریسٹورنٹوں پر کھانا کھانے والوں کا خاصاً جھوم ہوتا ہے اور خاص طور پر امریکی باشندے جو پیکی کھانوں کے عادی ہیں چٹ پٹے پاکستانی کھانے شوق سے کھاتے ہیں۔ ایک دوست نے بتایا کہ ریسٹورنٹ صبح گیارہ بجے کھلتا ہے لیکن جب وہ اپنے کسی اور کام کیلئے ایک روز ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ریسٹورنٹ میں آئے تو دروازے پر سات آٹھ افرا دلان میں کھڑے تھے کہ جب ریسٹورنٹ کھلے گا تو وہ پہلے داخل ہوں گے۔ اس ریسٹورنٹ میں کھانا پکانے، آٹا گوند ہنے اور دیگر اشیاء خور دنوش تیار کرنے کا مشینی نظم دیکھا تو میں نے عرض کیا کہ اب تو صرف یہ کسر رہ گئی ہے کہ روٹی کا لقمه توڑنے اور منہ تک لے جانے کیلئے کوئی مشین ایجاد ہو اور انسان اس ”مشقت“ سے

بھی نجات پاجائے۔

اس سہولت پسندی اور راحت طلبی نے جہاں انسان کو آسانیاں فراہم کی ہیں وہاں بہت سے مسائل بھی کھڑے کر دیے ہیں۔ فطری مشقت سے محرومی کے بعد انسانی جسم تنی نئی بیماریوں کا شکار بن رہے ہیں اور جسم کو جو مشقت طبعی طور پر درکار ہے اس کیلئے مصنوعی طریقے ایجاد کیے جا رہے ہیں۔ مغرب کا پروگرام نرالا ہے کہ روح کے سکون اور قلب و ذہن کی طہانیت کے فطری طریقوں سے دست بردار ہو کر اسے سکون کیلئے مصنوعی طریقوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے، حتیٰ کہ مشیات کے فروع نے مغرب کی پریشانی کو انتہاء تک پہنچادیا ہے مگر وہ اس کے اسباب و عوامل اور محركات پر غور کرنے اور ذہن و قلب کے اطمینان کے فطری طریقوں کی طرف واپسی کیلئے تیار نہیں ہے۔ اسی طرح جسمانی مشقت سے نجات اور سہولت و راحت کے نتائج دیکھنے اور اس کیلئے مقابل صورتیں ایجاد کرنے پر مجبور ہونے کے باوجود وہ جسمانی تعیش کی دوڑ کی رفتار کم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ مشینی دور کا کرشمہ ہے کہ انسانی جسم کو مشقت سے بچانے کا کام بھی مشینیں کر رہی ہیں اور پھر اسے ضروری مشقت دلانے کا کام بھی مشینوں کے سپرد ہے۔

دولت اور سہولتوں کی بھی فراوانی ہے جس نے ایک دنیا کو مغربی معاشرت کا دلدادہ بنارکھا ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے لوگ کھنچ چلے آ رہے ہیں اور تیسری دنیا اور مسلم ممالک کے بہت سے لوگ ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طرح امریکہ، برطانیہ یا کسی مغربی ملک میں قیام کی اجازت مل جائے جہاں روز گار بھی ہے اور زندگی کی سہولتیں بھی ہیں، امن و امان بھی ہے اور ڈپلن بھی ہے۔ جبکہ تیسری دنیا اور عالم اسلام کے ممالک میں قدمتی سے ان میں سے کسی بات کا تحفظ اور حفاظت موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مغرب کی پالیسی اور حکمت عملی کا حصہ ہے کہ اس نے اس حوالے سے بھی دو ہر امعیار قائم رکھا ہوا ہے۔ ورنہ تیسری دنیا اور مسلم ممالک کے اکثر ویژت حکمران اور سرکاری مشینی کے کارندے مغرب ہی کے شاگرد ہیں جنہوں نے براہ راست مغرب سے یا نوآبادیاتی دور میں مغرب کے مسلط کرده نظام تعلیم سے تعلیم و تربیت پائی ہے۔ اور یہ مغرب کے دو ہرے نظام اور معیار کا رشمہ ہے کہ اس نے اپنے ملک کا نظام چلانے کیلئے جن لوگوں کو تربیت اور ٹریننگ دی ہے وہ آج کل صحیح طریقے سے ستم کو چلا رہے ہیں لیکن اسی مغرب نے بالواسطہ یا بالواسطہ طور پر تیسری دنیا اور مسلم ممالک کا نظام چلانے کیلئے جو کھیپ تیار کی ہے اس میں بد عنوانی، نا اہلی اور کرپشن کے سوا کچھ اور دلخواہی نہیں دیتا۔

یہ صرف حامد کرزی کی بات نہیں بلکہ جو بھی یہاں آتا ہے اس کا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ دس پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ لندن کے علاقے ساؤ تھال میں ایک سکھ دوست نے مجلس میں سوال کیا کہ کیا بات ہے جب ہم یہاں آگے کچھ دری رہتے ہیں تو پھر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا اور یہاں کے درود یا اپنے لگنے لگتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان درود یا ارکی بنیادوں میں ہمارا ہی خون ہے کیونکہ نوآبادیاتی دور میں ہمارے خون پسینے کی کمائی کا استھان کر کے مغرب نے ترقی اور خوشحالی کی راہیں ہموار کی ہیں اس لیے جہاں خون کا تعلق ہو اُس کا پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ اس پر وہ سکھ سردار کہنے لگا ”گیانی جی! تساں ٹھیک آکھیاے“ (صوفی جی! اپ نے صحیح کہا ہے)۔ امریکہ کو دیکھ لیجیے اس کی ترقی اور بلند و بالا عمارتوں کی بنیادوں میں ان لاکھوں غلاموں اور سیاہ فاموں کی ٹھیاں دفن ہیں جنہیں بھری جہازوں میں بھر بھر افریقہ سے

لایا جاتا تھا اور ان سے جانوروں کی طرح مشقت لی جاتی تھی۔ اگر ان لاکھوں سیاہ فام غلاموں کی محنت و مشقت کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو امریکہ کی ترقی و خوشحالی کی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو کر رہ جاتی ہے۔ آج بھی ولیٰ بن، آئی ایم ایف اور دیگر بین الاقوامی ادارے یہی کچھ کر رہے ہیں۔ سود کے استحصالی نظام نے پوری دنیا کی میشیت کو جکڑ رکھا ہے۔ مغرب نے دولت کے وسائل اور مرکز پر نہ صرف زبردستی قبضہ جا رکھا ہے بلکہ تجارت، صنعت اور بینکاری کا ایسا نظام دنیا پر مسلط کر دیا ہے جس میں دولت کے بہاؤ کے سارے راستے مغرب یا ان کے ہمنوا ممالک کی طرف جاتے ہیں۔ دنیا بھر کی دولت اور اساباب دولت پر چند ممالک کی اجارہ داری ہے جن کی کمان مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے جدھر دولت کا بہاؤ ہو گا دولت کے طلب گاروں کا رخ بھی ادھر ہی ہو گا، یہ فطری بات ہے جس سے مفرک کی کوئی صورت نہیں ہے۔ البتہ حامد کرزی کا معاملہ تھوڑا سا مختلف ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے امریکہ میں رہ رہے تھے، کاروبار بھی تھا اور اطمینان بھی تھا کہ اپنکے ان کے سرپر صدارت کا تاج رکھ دیا گیا اور انہیں ”ختت کابل“ پر روت افروز کر دیا گیا جہاں ایک طرف طالبان ہیں جو اقتدار سے محروم ہونے کے باوجود افغان عوام کے دول میں موجود ہیں، دوسری طرف قبائلی سردار ہیں جنہیں راضی رکھنا اور ان کی خواہشات کو پورا کرنا حامد کرزی کیلئے دشوار تر ہوتا تھا ہے، اور تیسرا طرف مغربی آفاؤں کا بیجدا ہے جس کی تکمیل کی طرف پیش رفت کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔ ایسے میں اگر حامد کرزی افغانستان کی صدارت کی جگئے امریکہ کے کسی شہر میں قیام کو ترجیح دے رہے ہیں تو ان کی بات ناقابل فہم نہیں، مگر یہ بات صدر بیش کو کون سمجھائے، انہیں بہر حال اپنے کام سے غرض ہے اور حامد کرزی یہ کام امریکہ کے باروں ق شہروں میں نہیں بلکہ کابل کے گھنڈرات میں رہ کر ہی کر سکتے ہیں۔

## بات ملا محمد عمریا مولوی فضل ہادی شنواری کی نہیں ...

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۳ء

ہفت روزہ ضرب مومن کریچی کی رپورٹ کے مطابق افغانستان کے صدارتی انتخاب میں ایک امیدوار کو نااہل قرار دینے پر سپریم کورٹ کے مولوی فضل ہادی شنواری صاحب کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی ہے اور افغانستان میں امریکی سفیر زلمے خلیل زادے ان کے اس فعلے کا سختی سے نوٹس لیا ہے۔

رپورٹ کے مطابق افغانستان کے صدارتی ایکشن میں حصہ لینے والے امیدواروں میں سے ایک صاحب نے گذشتہ دونوں کسی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے انسانی حقوق کے حوالے سے قرآن کریم کے بعض احکام پر تقدیم کی اور کہا کہ قرآن کریم کی یہ آیات ان حقوق کے عالمی تصور سے متصادم ہیں، اور وہ بر سر اقتدار آنے کی صورت میں ان آیات پر عمل کرنے کی جگئے انسانی حقوق کی پاسداری کا اہتمام کریں گے۔ افغانستان کی عدالت عظمی کے سربراہ مولوی فضل ہادی شنواری نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے اس امیدوار کو صدارتی ایکشن میں حصہ لینے سے روک دیا ہے اور نااہل قرار دیا ہے۔ جس پر امریکی سفیر نے سخت رد عمل اور غصہ کا اظہار کیا ہے اور کرزی حکومت سے کہا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے منصب پر فائز رکھنے کی پیشی پر نظر ثانی کی جائے۔ مولوی فضل ہادی موصوف اس سے پہلے بھی اُس موقع پر مغربی حکمرانوں کی تقید اور غصہ کا نشانہ بنے تھے جب انہوں نے کابل میں مغربی حکمرانوں اور ایں جی اوزکی طرف سے پھیلائے جانے والے ویڈیو سسٹم وں اور کیلیں نیٹ ورک کے مرکز کو خاشی اور بے حیائی کے فروغ کا باعث قرار دے کر بند کرنے کا حکم دیا تھا، اور اپنے حکم پر عملدرآمد کرتے ہوئے ان مرکزوں کو بند کرنے کا اہتمام بھی کیا تھا۔

مولوی فضل ہادی شناوری طالبان کے شدید مخالفین میں سے ہیں اور اس وجہ سے بھی کرزی حکومت میں انہیں یہ اعلیٰ منصب ملا ہے، لیکن بہر حال مولوی ہیں اور دینی تعلیمات سے بہرہ ور ہیں، اس لیے قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی نفی اور افغانستان میں فاختی، بے حیائی اور مغرب کی عیاں ثقافت کے فروغ گو برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اس کا عملًا اظہار کر دیا ہے جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اور اس کے ساتھ ہم ان کی استقامت کیلئے بھی دعا گو ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ایک اور بات بھی پھر سے واضح ہو گئی ہے کہ افغانستان میں امریکہ کا اصل ہدف طالبان یا ان کی حکومت نہیں تھی بلکہ اسلام اور اس کی اقدار ہیں۔ طالبان چونکہ اسلامی نظام اور اقدار کی نمائندگی کرتے تھے اس لیے وہ زد میں آگئے، ورنہ افغانستان میں جو بھی اسلام کی بات کرے گا یا قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے تحفظ کی طرف پیشرفت کرے گا، وہ کسی طبقہ اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو، امریکہ اور مغرب کے غیض و غضب کا شانہ ہو گا۔ بات ملا عمر کی یا مولوی فضل شناوری کی نہیں، اسلام کی ہے۔ اور عالم اسلام میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی موجودہ ہمہ گیر مہم کا اصل ہدف اسلام اور اس کی تہذیب و ثقافت ہے۔

## یاسر عرفات مرحوم

روزنامہ پاکستان، لاپور ۸ نومبر ۲۰۰۴ء

یاسر عرفات بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے، اناللہ وانا یل راجعون۔ انہیں رملہ میں ان کے ہیئت کو اڑ میں امانتاً سپرد خاک کیا گیا ہے اور فلسطینی قیادت کی طرف سے کہا گیا ہے کہ آزاد فلسطینی ریاست کے قیام اور بیت المقدس کی اس ریاست میں شمولیت کے بعد انہیں بیت المقدس میں دفن کیا جائے گا۔ یاسر عرفات کے جنازے پر فلسطینی عوام اور ان کے عقیدتمندوں کے بے پناہ ہجوم نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ زندگی کے آخری حصے میں متنازعہ ہو جانے کے باوجود فلسطینی عوام کے محبوب ترین رہنماء تھے اور انہیں اپنے وطن کے عوام کی ایک بڑی اکثریت کی محبت اور عقیدت حاصل تھی۔

یاسر عرفات کا نام میں نے پہلی بار ۱۹۷۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اس وقت سنجد وہ فلسطین اور بیت المقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے بعد فلسطین کی مراجحتی تحریک کے قائد کے طور پر منظر پر نمودار ہوئے۔ اس سے

قبل بھی وہ ایک فلسطینی مزاحمتی گروپ کی قیادت کر رہے تھے لیکن ۱۹۶۷ء کی جگہ میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر، شام اور اردن کی خوفناک شکست اور صحرائے سینا اور گولان پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ بہت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد جب فلسطینی کی آزادی کیلئے مسلح جدوجہد کرنے والے مختلف گروپوں نے کیجا ہو کر مشترک طور پر تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا اعلان کیا اور یا سر عرفات کو اس کا متفقہ لیڈر منتخب کیا گیا تو عرفات کا نام فلسطین اور فلسطینیوں کی تحریک آزادی کی علامت کی حیثیت اختیار کر گیا۔

وہ میرا طالب علمی کا دور تھا اور میں جمیعت علماء اسلام کی سرگرمیوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں مصر کے صدر جمال عبد الناصر مر حوم ہماری سیاسی عقیدت کا مرکزوں محو رکھتے ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ عالم اسلام میں وہی مضبوط اور قد آور شخصیت ہیں جو عالم اسلام اور عرب دنیا کے خلاف مغربی استعماری جاری رکھتے اور سازشوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے عرب دنیا اور فلسطین کے حوالے سے ہماری ذہنی و فکری ترجیحات صدر جمال عبد الناصر مر حوم کی پالیسیوں کے حوالے سے تنقیل پا تھیں۔ جمال عبد الناصر عرب قوم پرستی کے علمبردار تھے، وہ امریکی اور مغربی استعمار کے شدید ترین مخالف تھے اس لیے بائیں بازو اور وسی بلاک کی طرف ان کا میلان ہمارے نزدیک زیادہ قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ ہم یہ کہہ کر ان کا دفارع یا کرتے تھے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے، حالات کا جر ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یا سر عرفات کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ وہ بائیں بازو کی طرف رجحان رکھتے والے قوم پرست فلسطینی رہنماء سمجھتے جاتے تھے اور ایک لبرل مسلمان کے طور پر پہنچانے جاتے تھے۔ اس لیے انہیں مسلسل جمیعت علماء اسلام کے کارکنوں کی دلی ہمدردیاں حاصل رہیں۔

دائیں بازو اور بائیں بازو کی عالمی کشمکش میں پاکستان واضح طور پر امریکہ کا حلیف تھا اور اس کے ساتھ سیٹو اور سینٹو کے معاہدات میں شریک تھا۔ اس لیے پاکستان کے ساتھ فاصلے کو قائم رکھنا یا سر عرفات کی مجبوری تھی۔ پھر جب اردن میں فلسطینی حریت پسندوں کے بڑھتے ہوئے اشور سوچ کونٹرول کرنے کیلئے ان کے خلاف مسلح ریاستی کارروائی ضروری سمجھی گئی اور اس میں پاکستان کے فوجی دستوں نے ہم کردار ادا کیا تو یہ فاصلے مزید بڑھ گئے اور بہت سے پاکستانی حقوقوں کو یہ شکایت ہونے لگی کہ پاکستان تو فلسطینی عوام کی حریت و آزادی کی غیر مشروط حمایت کر رہا ہے اور اسرائیل دشمنی میں پیش پیش ہے مگر فلسطینی قیادت اور یا سر عرفات کی جانب سے پاکستان کو مسئلہ کشمیر سمیت اہم معاملات میں وہ حمایت میسر نہیں ہے جس کی پاکستانی عوام کو ان سے توقع رہتی ہے۔

پھر افغانستان میں روس کی مسلح افواج کی آمد نے حالات کا سارا نقشہ تبدیل کر دیا۔ پاکستان کے وہ دنیٰ حلقوں جو امریکہ اور روس کی عالمی کشمکش میں کسی حد تک بائیں بازو کیلئے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، اپنے افغان بھائیوں کی حمایت میں روس کے مقابل جا گھڑے ہوئے جس کا فائدہ ظاہر ہے کہ عالمی سیاست میں امریکہ کو ہونا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا اور افغان عوام کی رو سی جاریت کے خلاف مسلح جدوجہد کی پشت پناہی کر کے امریکہ نے اس مسلح مراجحت اور اس کی پاکستانی حمایت دونوں کو اپنے پلڑے میں ڈال لیا۔ جس کے ثابت اور منفی نتائج اب تک سامنے آرہے ہیں اور خدا جانے کب تک ان کا ظہور ہوتا رہے گا۔

ادھر یا سر عرفات کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسرائیل کی تیزی سے بڑھتی ہوئی عسکری قوت، امریکہ کی طرف سے اس کی مکمل اور غیر مشروط پشت پناہی اور افغانستان کی جنگ میں الجھ کرو سی بلاک کے بکھرنے کے عمل نے یا سر عرفات کو یہ سونپنے پر مجبور کر دیا کہ اب فلسطین میں جو کچھ بھی ہو گا امریکہ کی مرضی سے ہو گا اور فلسطینی عوام کو اگر کچھ ملتا ہے تو اسی سے ملتا ہے۔ اس لیے انہوں نے معروفیتی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے کم سے کم پر قیامت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی حدود طے کرتے ہوئے امریکہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ دوستی کا یہا تھا کیطرفرہ تھا جس کے ذریعے یا سر عرفات نے فلسطین مسئلے کے حل کو مکمل طور پر امریکہ کے رحم و کرم پر چوڑ دیا۔ ہمارے نزدیک یہ ان کی "اجتہادی، غلطی تھی الہذا نظری اور اصولی طور پر ہم نے بر ملا اس سے اختلاف کیا لیکن اسی بات یہ ہے کہ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا اور کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا جسے وہ کھٹکھاتا تھا۔ اس لیے کہ سوویت یوینین بکھر چکا تھا اور اسلامی سربراہ کانفرنس نظم (اوائی سی) کی کوئی حیثیت نہیں تھی چنانچہ ان کے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ اسرائیل اور امریکہ کے مشترکہ غیظ و غضب کا نشانہ بن کر منظر سے بالکل ہی غائب ہو جائیں یا خود کو امریکی ایجمنٹ کے ساتھ تھی کر کے جو کچھ بھی حاصل ہو سکتا ہے کر لیں، اور جو کچھ بھی بچایا جاسکتا ہو بچالیں۔ یا سر عرفات نے دو سراستہ اختیار کیا اور پھر اپنی تمام تر تگ و دو کو اسی نکتے پر مرکوز کر لیا۔

یا سر عرفات کی اس رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور ہمیں بھی اس سے اختلاف ہے۔ لیکن یہ بات بھی کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ انہوں نے مسلح جدو جہد ترک کرنے کے بعد "مذکورات کے ذریعے امن" کے امریکی ایجمنٹ کو قبول کر کے فلسطینی عوام کیلئے زیادہ سے زیادہ مراغات حاصل کرنے کی جو جدو جہد کی اس میں انہیں مسلح جدو جہد سے زیادہ قربانیاں دینا پڑیں اور اس سے کہیں زیادہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنے دل پر پھر رکھ کر پورے فلسطین کی آزادی کی بجائے صرف بائیس فیصد علاقے پر آزاد فلسطین ریاست کے فارمولے کو قبول کیا۔ انہوں نے امریکہ کو خوش رکھنے کیلئے ایک ایسی "فلسطینی اتحادی" کی صدارت کا تحقیق آمیز تنخوا اپنے سینے پر سجالیا جس کا زمین پر کوئی وجود نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی کے آخری دو سال اپنے ہیڈ کوارٹر میں محصوری کے عالم میں بسر کیے۔ یہ سب کچھ کس لیے تھا، صرف اس لیے کہ امریکہ نے فلسطینی عوام سے ان کے وطن عزیز کے ایک چوڑھائی سے بھی کم رقبے پر "آزاد فلسطین ریاست" کے قیام کا جو وعدہ کر رکھا ہے وہاں پر قائم رہے اور اسے اس سے مخفف ہونے کا کوئی جواز فراہم نہ ہو۔

مگر یا سر عرفات کی ان قربانیوں کا حصہ امریکہ نے کیا دیا؟ یہی کہ آخر میں یا سر عرفات کو فلسطینیوں کا جائز نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے ساتھ فلسطین کے مسئلے پر گفتگو کا دروازہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ یا سر عرفات ہے فلسطینی عوام کی اکثریت نے اپنالیڈر چنا تھا اور جس کی موت پر فلسطینی عوام نے دیوانہ وار جمع ہو کر دنیا کو ایک بار پھر بتا دیا کہ ان کی نمائندگی کا حق صرف اسے ہی حاصل تھا، مگر امریکہ اس کے ساتھ مذکورات سے انکاری تھا اور اسے اس بات پر اصرار تھا کہ وہ یا سر عرفات سے گفتگو نہیں کرے گا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس نے امریکہ کی سرپرستی میں اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابین کے ساتھ فلسطینیوں کیلئے جس کم از کم حد کا تعین کر لیا تھا اور جس پر امریکہ نے خود صادر کر لیا تھا، وہ اس کم از کم سے پچھے ہٹنے کیلئے تیار نہیں تھا اور اسرائیل کو مزید کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھا۔

یا سر عرفات ایک متحرک اور صبر آزانندگی گزار کر اپنے مالکِ خالق کے حضور پیش ہو چکے، ان کی جدوجہد اور تنگ و تاز تاریخ کا حصہ بن چکی، اور اب تحریک کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ان کے جانشینوں پر آپری ہے۔ اس مرحلہ پر وہ ہماری دعاویٰ کے متعلق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حنات کو قبول فرمائیں، سینمات سے در گزر کریں، جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کے جانشینوں کو فلسطینی عوام کے بہتر مستقبل کیلئے صحیح سمت میں پیش رفت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔ البتہ اس کے ساتھ ہم یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی خوشنودی کیلئے اپنے اپنے کچھ نجاح کر دینے والوں کو یا سر عرفات کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اس لیے کہ خود کو مکمل طور پر جبرا کے سپرد کر دینا اور طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا زندگی سے دستبرداری کی علامت ہو اکرتا ہے۔ زندگی ہر حال میں ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کا نام ہے اور اکثر اتھ پاؤں مارتے رہنے والوں کو زندگی مل بھی جایا کرتی ہے۔

## خارج ڈبلیو بش کی کامیابی اور عالمِ اسلام

روزنامہ پاکستان، لاپور --- ۱۰ نومبر ۲۰۰۳ء

خارج ڈبلیو بش George Walker Bush دوسری مدت کیلئے امریکہ کے صدر منتخب ہو چکے ہیں اور ان کے حریف جان کیری نے اپنی نشست تسلیم کرتے ہوئے انہیں مبارکباد دی ہے۔ اس پر حسب توقع دنیا بھر میں تہذیبوں کا سلسہ جاری ہے، تھی کے اسباب کا ذکر ہو رہا ہے اور مستقبل کے نقشے کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ امریکہ کی صدارتی ایکشن مہم کے دوران رقم الحروف نے آٹھ دس دن واشگٹن ڈی سی کے علاقے میں گزارے اور اس ایکشن کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات اور کوششوں کا تذکرہ اپنے ایک کالم میں کرچکا ہوں۔ یہ درست ہے کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کی بڑی اکثریت صدر بش کے خلاف تھی اور صرف اسی وجہ سے جان کیری کونہ صرف ووٹ دیے گئے بلکہ ان کی حمایت میں بعض مسلمان حقوق کی طرف سے مہم بھی چلا گئی۔ لیکن اس کے باوجود حالات پر نظر رکھنے والے متعدد مسلم رہنماؤں کی رائے یہ تھی کہ اس ایکشن میں جارج واکر بش ہی کامیاب ہوں گے۔ ان کا خیال تھا کہ جان کیری ذاتی طور پر خود کو ایک مضبوط اور باعثِ کشش امیدوار کے طور پر پیش نہیں کر سکے اس لیے وہ صرف ڈیکوکریٹ پارٹی کے محفوظ ووٹ ہی حاصل کر پائیں گے، یا انہیں صدر بش سے ناراضگی کا اظہار کرنے والوں کے ووٹ ملیں گے۔

جبکہ دوسری طرف صدر بش امریکی رائے عامہ کو متعدد حوالوں سے اپنی ضرورت کا احساس دلانے میں کامیاب رہے ہیں۔ جن میں مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ان کا بے ٹکک موقف اور کردار سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے امریکی عوام کو یہ باور کر دیا ہے کہ جن عناصر کو دہشت گرد قرار دے کر وہ جنگ لڑ رہے ہیں وہ فی الواقع ایسے دہشت گرد ہیں جن سے عالمی امن کے ساتھ ساتھ امریکی سلامتی کو بھی خطرہ ہے، اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ جنگ چیزیں یا امریکی سلامتی کے تحفظ کیلئے ناجائز ہے۔

اس عمومی تاثر کے بعد امریکی عوام سے یہ توقع رکھنا عبث تھا کہ وہ صدر بیش کے علاوہ اس موقع پر امریکہ کی قیادت کیلئے کسی اور کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے بہت سے مسلم راہنماؤں نے مجھ سے کہا کہ اگرچہ ہمارے حقوق میں افغانستان، عراق اور فلسطین کے حوالے سے صدر بیش کی پالیسیوں کے خلاف ناراضگی کے انہمار کے طور پر جان کیری کو ووٹ دینے کا راجحان غالب ہے، لیکن کامیابی کا منکان صدر بیش کا ہی زیادہ ہے۔

جبکہ تک مسلمانوں کے جذبات کی بات ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مجھے ایک مسلمان ٹیکسی ڈرائیور نے، جو واشنگٹن ڈی سی کے علاقے میں ٹیکسی چلاتا ہے، بتایا کہ ہم پانچ سو مسلمان ڈرائیوروں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے کہ ہم ایکشن والے دن کام نہیں کریں گے۔ اور جو مسلمان فیملی اس روز جان کیری کو ووٹ دینے کی غرض سے پولنگ اسٹیشن تک جانے کیلئے ہماری ضرورت محوس کرے گی، اسے مفت ٹیکسی سروس فراہم کریں گے۔

مسلمانوں کی طرح یہودیوں کی اکثریت نے بھی صدر بیش کے خلاف ووٹ دیا ہے۔ اخبارات میں شائع ہونے والی ایک سروے روپرٹ کے مطابق جان کیری کو ۸۷ فیصد یہودیوں کے ووٹ ملے ہیں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود ایکشن میں کامیابی جاری و اکبر بیش کے حصے میں آئی ہے، انہوں نے اسے اپنی پالیسیوں پر امریکی عوام کی طرف سے اعتماد کا انہمار قرار دیتے ہوئے ان پالیسیوں کو جاری رکھنے کا اعلان کر دیا ہے۔

صدر بیش کی اس کامیابی کے عوامل میں ایک بڑی بات مذہبی اقدار کے ساتھ ان کی دلچسپی اور خاندانی نظام کے تحفظ کے بارے میں ان کے جذبات بھی ہیں، جن کا اظہار انہوں نے ایکشن ہم کے دوران کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ جارج بیش اپنے چار سالہ دورِ صدارت، پھر ایکشن ہم کے دوران یہ تاثر دینے میں کامیاب رہے ہیں کہ وہ مذہب اور مذہبی اقدار کے ساتھ دلی وال بُنگی رکھتے ہیں، اور سوسائٹی میں مذہبی اقدار کی بجالی و فروع کیلئے کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے جس دو ٹوک انداز میں ہم جنس پرستی کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ شادی صرف مرد اور عورت کے درمیان ہی ہو سکتی ہے، بلکہ اس مقصد کیلئے انہوں نے امریکی دستور میں ترمیم کی ضرورت کا بھی بعض موقع پر ذکر کیا، ان کے اس موقف نے امریکے کے مذہبی حقوق میں ان کیلئے کوشش پیدا کی ہے۔

واشنگٹن (ڈی سی) میں بھی ایک دوست نے مجھے بتایا کہ امریکہ کے بہت سے چرچ اور مذہبی رہنماء صدارتی ایکشن میں صدر بیش کی کامیابی کیلئے متحکم ہیں۔ ہمارے خیال میں صدر بیش اور جان کیری کے درمیان انتہائی ہم کے دوران اگرچہ بہت سے دوسرے مسائل سرفہرست رہے ہیں، لیکن پہلے پورہ سب سے بڑا محکم یہی فرق سمجھ آ رہا ہے کہ صدر بیش کی مذہبی اقدار و خاندانی نظام کے تحفظ کے بارے میں دلچسپی، جبکہ جان کیری کا ان معاملات میں لبرل انداز، امریکی دوڑوں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ایکشن کے بعد جان کیری نے اپنے تبصرے میں امریکی قوم کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے جس خدشے کا انہمار کیا ہے، اس کا پس منظر بھی ہمارے نزدیک یہی ہو سکتا ہے۔

امریکی معاشرے کو قریب سے دیکھنے والے حضرات اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ دنیا کے اس سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور ملک کے عوام میں ایک خاموش شکنش بدستور جاری ہے۔ جس میں وہ جو "قدامت پسند" کہلاتے ہیں اور سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں، مکمل طور پر نہ ہی، مگر کسی نہ کسی حد تک مذہبی اقدار کی بجالی کے حق میں ہیں، وہ خاندانی

سُم پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے منافی اقدار کے مسلسل فروع سے ناخوش ہیں۔ واقفان حال کا کہنا ہے کہ اس ایش میں انہوں نے زیادہ منظم انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو ظاہر ہے کہ صدر جارج بش کے حق میں تھی، غالباً اسی کو دیکھتے ہوئے امریکی قوم کے تقسیم ہو جانے کا خدشہ شکست خوردہ صدارتی امیدوار جان کی کی زبان پر آیا ہے۔

صدر بش کامیابی کے بعد اپنے اگلے چار سالہ دور کیلئے خوب صفت بندی میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے ایجادے اور مشن کو اس مدت میں بہر حال پورا کرنے کیلئے تازہ دم ٹیم کو میدان میں اتارنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ایش میں واضح کامیابی نے انہیں اپنے پروگرام اور عزادم کے حوالے سے نیا اعتماد اور حوصلہ بخشتا ہے۔ سینٹ اور الیان نمائندگان میں ری پیک پارٹی کی برتری نے ان کی قوت میں اضافہ کیا ہے، اس لیے اب اس بات میں کسی شک و شبکی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ علمی سطح پر وہ مسائل کو جس طرح ڈیل کر رہے ہیں اور جس حس مجاز پر پیشافت کر رہے ہیں اس کا تسلسل اگلے چار سال تک نہ صرف باقی رہے گا بلکہ اس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گا۔

جبکہ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں امریکہ اور اس کے ہمزاں کے خلاف مسلح مذاہقہ تحریکوں کا تعلق ہے، وہ القاعدہ ہو یا اس طرز کے دوسرا گروپ، وہ اپنی پالیسی اور طریق کار میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے، یا یوں سمجھ لیجئے کہ اس کی گنجائش نہیں پار رہے، کیونکہ انہیں ایسی کسی تبدیلی کے بارے میں سوچنے کا موقع یہ نہیں دیا جا رہا، اور ان کے مکمل خاتمے کو ہی اصل اور آخری ہدف قرار دے دیا گیا ہے۔ لہذا اس مجاز کے حوالے سے ”دیکھتے اور نتناج کا انتظار کیجئے“ کے سوا سر دست کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

باقی رہی بات مسلم حکومتوں کی، تو ان کی بے بی اور لاچاری میں امریکہ کے صدارتی انتخابات کے نتائج نے مزید اضافہ کر دیا ہے اور وہ ”نکٹ دیم، دم نہ کشیدم“ کی عملی تصویر بن کر رہ گئی ہیں۔ اگرچہ عالمی سطح پر ان کی تقطیم (اوائی سی) موجود ہے، مسلم سرباہوں کی کافرنیسی بھی وقٹا وقٹا ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان کافرنیسوں کی عملی حیثیت گپ شپ کے فورم اور رسمی قراردادوں کے اعلان سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا عبث ہو گا کہ وہ موجودہ صورتحال میں حالات کے مزید بگاڑنے کو رکنے کیلئے کوئی کردار ادا کر سکیں گے۔

اس صورتحال پر آزادانہ سوچ بچار اور معروضی حقائق کے ادراک کے ساتھ مسلم اممد کی صحیح سمت رہنمائی کیلئے ایک ہی فورم باقی رہ جاتا ہے، جس سے کسی درجے میں کوئی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور وہ عالم اسلام کے ارباب فہم و دانش ہیں جو تذہب، حریت فکر میں حمیت اور اعتماد و حوصلے سے بہرہ ور ہیں اور ملت کی بہتری کیلئے کچھ کرنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی حصے کا مسلم معاشرہ ایسے اصحاب فکر اور ارباب دانش سے خالی نہیں ہے۔ جبکہ عالم اسلام کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت بھی یہی ہے کہ ان کی فکری رہنمائی کیلئے ایسے بے لوث حضرات سامنے آئیں جو حکومتوں اور لا یوں کے اثرات سے آزاد رہتے ہوئے معروضی حقائق کا جائزہ لیں اور کسی رورعایت کے بغیر غلطیوں اور کوتا ہیوں کی نشاندہی کریں، مسلم رائے عامہ کے سامنے معروضی حالات کا صحیح نقشہ پیش کریں، آنے والے حالات اور خدشات و خطرات سے آگاہ کریں، اور اس دلدل سے نکلنے کیلئے امت مسلمہ کی قابل عمل راستوں کی طرف رہنمائی کریں۔

ہم یہ تو نہیں کہ سکتے کہ اس سے حالات کا رخ تبدیل ہو جائے گا لیکن اتنا ضرور بحثتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی اجتماعی فورم

سامنے آجائے تو امتِ مسلمہ کے بہتر مُستقبل کیلئے اس کی نئی نسل کو کوئی صحیح اور قابلِ عمل راستہ یقیناً دکھایا جاسکتا ہے۔

## سانحہ گیارہ ستمبر اور امریکی دھونس

مابنامہ آبِ حیات، لاہور --- جنوری ۲۰۰۵ء

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- فوری ۲۰۰۵ء

سوال: نائن الیون کے حادثے کے بعد پاکستان نے جو اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر یوٹرن لیا ہے اور پروزیر مشرف نے جو دینی و مذہبی جماعتوں اور اداروں کے متعلق سخت رویہ اپنایا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: نائن الیون کے حادثے کے بعد جزل پروزیر مشرف نے خارجہ پالیسی میں جو یوٹرن لیا ہے اور داخلی طور پر دینی کا قوتون کو دبانے اور کرش کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے، وہ ایک طویل پروگرام کا حصہ ہے۔ اس میں کم کی یازدی کا سردست کوئی امکان نظر نہیں آ رہا، بلکہ اس ایجنسٹے کے مخفف نئے تقاضے سراہٹے جا رہے ہیں۔ دینی حلقوں کو اس امتحان سے سہر حال گزرننا ہو گا اور صبر و حوصلہ کے ساتھ آنے والے حالات کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور اکابر نے دین اور ملت کے حوالے سے جو درش ہم تک پہنچایا ہے، ہم اسے کسی نقصان کے بغیر اگلی نسلوں تک منتقل کر دیں اور اسے اس کی اہمیت اور نزاکتوں کا صحیح طور پر احساس دلادیں۔ اگر ہم ایسا کر پائے تو یہ اس مشن میں ہماری کامیابی اور سرخ روئی متصور ہو گی۔ اس سے زیادہ ہمیں کسی خوش نعمتی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: اس وقت دنیا بھر میں دہشت گردی کی وجہ اور محکمات کیا ہیں؟

جواب: اس وقت جس عمل کو دنیا میں دہشت گردی کہا جا رہا ہے، وہ خود امریکا کا پیدا کر دیا ہے۔ امریکہ نے افغانستان میں روس کے خلاف جنگ کیلئے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اسلحہ کی ٹریننگ دی اور رو سی جارحیت کے خلاف افغان عوام کی مزاحمتی جنگ کو جہاد تسلیم کرتے ہوئے اس کی سیاسی و عسکری سرپرستی کی۔ اب وہی لوگ مختلف علاقوں میں امریکی بالادستی کے خلاف بر سر پیکار ہیں تو انہیں دہشت گرد کہا جا رہا ہے۔ ایک امریکی داشت ورنے مجھ سے کہا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ میں نے گزارش کی کہ بالکل درست بات ہے کہ ہمارے ہاں جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم ہم نے دی ہے مگر عملی ٹریننگ تم نے دی ہے اور اسے عملی عسکریت کا رخ تم لوگوں نے دکھایا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں جہاں بھی جہاد کی کارروائیاں ہو رہی ہیں، جنہیں دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو اس کی عملی ٹریننگ کا نسب نامہ امریکہ سے جاتا ہے۔ اسلحہ اور اس کی ٹریننگ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے مگر امریکہ اس بات کو قول کرنے کی اخلاقی جرأت سے محروم ہے اور اس کی ذمہ داری بھی دینی مدارس کے کھاتے میں ڈال کر دنیا کے سامنے سرخ رو ہونا چاہتا ہے۔

## گوانتماموبے اور افغان قیدیوں کیلئے ذہنی اذیت

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۲۰۰۵ء

گوانتماموبے میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قرآن کریم کی بے حرمتی کے شرمناک واقعات کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل رہا ہے اور عوام کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کی حکومیں بھی اس احتجاج میں شریک ہیں۔ قرآن کریم کی بے حرمتی کا یہ واقعہ منظر عام پر آنے کے بعد بہت سے دیگر واقعات بھی سامنے آ رہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ افغانستان اور گوانتماموبے میں مسلم قیدیوں کے سامنے اسلامی شعائر کا مذاق اٹا نے اور قرآن مقدس کی بے حرمتی کے واقعات امریکی فوجیوں کا معمول بن گئے ہیں۔ امریکہ دنیا میں رواداری، نہ بھی احترام، ان کے حقوق اور تنگ کا سب سے بڑا علمبردار بنا ہوا ہے اور ساری دنیا کو اس کی تلقین کرتا رہتا ہے لیکن خود امریکہ کے فوجیوں نے افغانستان، عراق، گوانتماموبے اور دیگر اذیت خانوں میں مسلمان قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روارکھا ہوا ہے اور ان مظلوموں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کی جو تفصیل و قیاقوتاً خبرات میں شائع ہوتی رہتی ہے ان سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ امریکہ تہذیب و تمدن اور آزادی اور انسانی احترام کے نام پر اپنا فلسفہ اور کلچر دنیا ہر یہ مسلط کرنے کے درپے ہے اور دنیا پر قبضہ جمانے کیلئے وہ تمام حربے استعمال کر رہا ہے جو کسی زمانے میں چنگیز خان اور ہلاکو خان جیسے درندہ صفت حکمرانوں کے ساتھ مخصوص تھے جاتے تھے۔

قرآن کریم کی بے حرمتی دنیا کے کسی بھی مسلمان کیلئے قابل برداشت نہیں ہے اور اس پر مسلمانوں کا غصہ میں آنا اور اپنے جذبات کا اظہار کرنا ایک فطری رد عمل ہے جو ان کے ایمان اور قرآن کریم کے ساتھ ان کی وابستگی کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس احتجاج میں کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان پیچھے نہیں ہیں، اس احتجاج اور اخطراب کا دائرة انڈونیشیا سے مرکش تک پھیلا ہوا ہے بلکہ مغربی ملکوں میں رہنے والے مسلمان بھی قرآن کریم کی حرمت و تقدس کے بارے میں جذبات کے اظہار میں عالم اسلام کے ساتھ شریک ہیں۔ اس پس منظر میں بعض دینی رہنماؤں کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کو قرآن کریم کی بے حرمتی کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجیحی کرتے ہوئے امریکہ سے باخاطط طور پر احتجاج کرنا چاہیے اور اس کا باقاعدہ سربراہی اجلاس بلا کر اس مسلم پر دلوںکا موقف اختیار کرنا چاہیے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس پر مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد ہے، مغربی طاقتیں ایک عرصہ سے اس کو شمش میں ہیں کہ مسلمانوں کی عملی زندگی کا قرآن کریم کے ساتھ تعلق قائم نہ رہے اور مسلمان قرآن کریم کو اسی طرح نظر انداز کر دیں جس طرح دنیا کی مسیحی اکثریت نے باہل کو اپنی عملی زندگی سے لاتعلق کر رکھا ہے لیکن ماہی کی طرح آج بھی مغربی دنیا کو اس میں ناکامی کا سامنا ہے اور قرآن کریم کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور بے چک کمٹنٹ آج بھی نہ صرف قائم ہے بلکہ بجد اللہ تعالیٰ بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ اور مغرب کی دیگر اقوام کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ مسلمان عملی طور پر کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں، فکر و عقیدہ کے حوالے سے ان کی وابستگی، جناب نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور قرآن کریم کے ساتھ آج بھی قائم ہے اور اسے ختم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

## جائے سانحہ گیارہ ستمبر پر چند لمحے

روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۶ ستمبر ۲۰۰۵ء

اکتوبر کو میں نیویارک میں تھا، اس دن میں نے اپنے میزبان دوستوں مولانا حافظ محمد ابیاز، بھائی برکت اللہ اور بھائی یامین کے ساتھ میں ہٹن کے اس علاقے کا چکر لگایا جہاں آج سے چار برس پہلے تک ورلڈ ٹریڈ سٹر کی دو بلند و بالا عمارتیں پورے کروفر کے ساتھ کھڑی تھیں۔ وہاں ہم نے بے شمار ٹولیوں کو گھومتے اور ان مرنے والوں کی یاد مناتے دیکھا جو چار سال قبل آج کے دن دہشت گردی کا شکار ہو گئے تھے۔ مذکورہ تینوں دوست کوئیز کے علاقے میں واقع دنیٰ درسگاہ دارالعلوم نیویارک سے وابستہ ہیں، انہوں نے ہی مجھے ایز پورٹ سے وصول کیا اور میرا قیام انہی کے پاس دارالعلوم میں ہے۔

میں نے یہ جگہ کئی بار دیکھی ہے، اسے آباد حالت میں دیکھا ہے اور ویرانی کے بعد کے منظر کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ کوئی سترہ برس پہلے کی بات ہے جب میں نے اس ایک سو دس منزلہ عمارت کی ایک سو ساتوں منزل پر واقع سیر گاہ سے نیویارک کے منظر کا اس طرح مشاہدہ کیا کہ بادل اس سے یونچ تھے اور بادلوں کی وجہ سے شہر کی کوئی عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ساتھ کچھ اور دوست بھی تھے اور ہم نے عصر کی نمازوں سیر گاہ میں باجماعت ادا کی تھی جسے دیکھنے کیلئے چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

پھر یہ بلند و بالا عمارت دہشت گردی کا شکار ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گئی۔ میں اس وقت پاکستان میں تھا اور میرے بیٹے نے کمپیوٹر کے ذریعے مجھے یہ منظر دکھایا تھا۔ مگر میرے میزان بھائی یامین اور بھائی برکت اللہ، جن کا تعلق بیگلہ دیش سے ہے، بر صغیر کے کسی بھی حصے سے کوئی عالم دین امر نہ کیا آجائے تو اس کی خدمت اور میزانی کر کے خوش ہوتے ہیں، انہوں نے بتایا کہ یہ منظر خود انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ دونوں کوئیز کے علاقے سے میں ہٹن کی طرف آرہے تھے۔ بھائی یامین کہتے ہیں کہ ایک پل سے گزرتے ہوئے میں نے ورلڈ ٹریڈ سٹر پر سورج کی روشنی پڑتے دیکھی تو میں نے بے ساختہ کہا کہ آج تو یہ بہت چک رہا ہے، اس کے بعد میں اوگنے لگا تو ہمارے ساتھ گاڑی میں موجود ایک طالب علم نے توجہ دلائی کہ وہ دیکھو ورلڈ ٹریڈ سٹر کو آگ لگ کری ہے۔ ہم نے پہلا جہاز نکراتے ہیں دیکھا، اس کے نتیجے میں بھڑکنے والی آگ دیکھی، ہم بھی یہ خوفناک منظر دیکھ رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ جدید ترین ٹیکنالوژی رکھنے والے اس ملک میں اس حادثے سے نہیں کیلئے کیا صورت اختیار کی جاتی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ آگ بلڈنگ کے اندر کسی حادثے کی وجہ سے لگی ہے۔ اتنے میں دوسرا جہاز آیا تو ہمیں خیال ہوا کہ یہ جہاز آگ بجھانے کیلئے آیا ہے، مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلڈنگ کے دوسرے حصے سے ٹکرایا اور تھوڑی دیر میں دونوں بلڈنگیں بھڑکتے شعلوں میں زمین بوس ہو گئیں۔

یہ حضرات اپنے مشاہدات بیان کر رہے تھے اور میراذہ ان اس بلڈنگ کے حوالے سے پرانی یادیں تازہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سانحہ کے ایک سال بعد واشنگٹن سے نیویارک آتے ہوئے شہر میں داخل ہوتے وقت ایک بلند پالاپل سے مین ہمین کے اس علاقے پر نظر ڈالی جہاں بہت سی بلند عمارتوں کے جلویں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی یہ بلند ترین عمارتیں ہوا کرتی تھیں، اور اس پل سے شہر میں داخل ہونے والوں کی پہلی نظر ان عمارتوں پر پڑتی تھی، مگر سچی بات ہے کہ مین ہمین کی بہت سی عمارتوں کے درمیان ان بلڈنگوں کی جگہ خالی دیکھ کر دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی اور سوگواری کے جذبات نے خاصی دیر تک دل و دماغ کو گھیرے رکھا تھا۔

اس بار امریکہ آنے کا پروگرام بناؤ خیال ہوا کہ میرے اس پانچ سالہ ویزے میں، جو میں نے نائیں ایلوں کے سانحہ سے پہلے لے رکھا تھا، اسی سفر کی گنجائش ہے کیونکہ ۲۸ تتمبر کو ختم ہو رہا ہے۔ اور اگلے سال معلوم نہیں اسلام آباد کا امریکی سفارت خانہ مجھے ویزادے گایا نہیں، کیونکہ جب علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کو امریکہ کے ویزے سے انکار ہو سکتا ہے تو میرے لیے خوش نہیں اور توقعات کی کون سی ہٹکی کھلی رہ گئی ہو گی۔ اس خیال سے پروگرام میں یہ بات شامل کر لی کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے مقام پر، جسے اب گراونڈزیرو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ضرور جانا ہے اور اتمبر کو ہی جانا ہے، تاکہ اس سانحہ میں جاں بحق ہونے والوں کی یاد منانے والوں اور ان کیلئے غم و رنج کا اظہار کرنے والوں میں میرا نام بھی شامل ہو جائے۔ اگرچہ اس بار یہاں تک پہنچنے میں مجھے بہت سے صبر آزماء حل سے گزرنا پڑا اور سفر کا دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا، مگر بہر حال ۱۰ تتمبر کو مین ہمین کی گراونڈزیرو تک پہنچنے اور چار سال قبل مرنے والوں کی یاد منانے والوں میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

۵ تتمبر کورات کریجی پہنچا، ۶ تتمبر کو وہاں سے روانہ ہوا اور تیرہ گھنٹے دوہی ایئرپورٹ پر گزارنے کے بعد افغانی فلاٹیٹ میں جس نے ۷ تتمبر کو صحیح سائز ہے سات بجے لندن کے گیٹ وک ایئرپورٹ پر اتنا دیا۔ اس طرح وہ سفر جو میں نے گھر سے ۳۰ اگست کی صبح کو لندن کیلئے شروع کیا تھا اور مجھے اسی روز دو بجے لندن کے ہیதھرو ایئرپورٹ پر پہنچا تھا، ۷ تتمبر کی صبح کو گیٹ وک ایئرپورٹ پر مکمل ہوا، اور میں برطانیہ کے مختلف شہروں کے دوستوں کے شدید تقاضوں کے باوجود وہاں دور روز سے زیادہ وقت نہ دے سکا اور ۱۰ تتمبر کو نیویارک کیلئے روانہ ہو گیا، جہاں مجھے رات کو سائز ہے آٹھ بجے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔

میرے ذہن میں خدشہ تھا کہ نائیں ایلوں شروع ہونے سے تین چار گھنٹے قبل نیویارک کے ایئرپورٹ پر پوری ڈاڑھی اور خالص مولویانہ لباس میں اترنے پر کوئی لمحن پیش آسکتی ہے، یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ مجھے ایئرپورٹ پر روک لیا گیا اور تقیش کے کرے میں لے جا کر تین افسروں نے، جن میں ایک خاتون بھی تھی، سوال و جواب اور سماں کی تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چونکہ ذہن میں خدشہ پہلے سے موجود تھا اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، اور یہ بھی اطمینان تھا کہ الحمد للہ کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوں اس لیے بالآخر چھٹی مل ہی جائے گی۔ میں نے تقریباً دو گھنٹے اس تقیشی کرے میں گزارے، بہت سے سوالات ہوئے، سامان اور کاغذات کی اچھی طرح چیکنگ ہوئی، ٹیکلی فون پر بار بار میرے کو اکف اور

سوالات و جوابات سے افران بالا کو بھی آگاہ کیا جاتا رہا، اور آخر کار پونے گیرہ بجے کے لگ بھگ چھ ماہ کی انٹری کی مہر کے ساتھ مجھے ایئرپورٹ سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

ان مرافق سے گزر کر میں انتہر کو گراہنڈز توک پہنچ پایا ہوں۔ مجھے ان ہزاروں افراد کی موت کاغم ہے جو چار سال قبل اس مقام پر بے گناہ مارے گئے۔ اگرچہ اس بارے میں بحث ابھی تک جاری ہے کہ اس دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والے کون ہیں؟ اور خود مغربی دانشوروں میں اس نتیجے تک پہنچنے والوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ یہ واردات جن کی طرف منسوب کی جا رہی ہے، اس نوعیت کی منصوبہ بندی ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اس دہشت گردی کی منصوبہ بندی کے ڈائٹ کہیں اور ملتے ہیں۔ مگر مرنے والے تو مر گئے، ان کے گھر تو دیران ہو گئے، ان کا غم تو سب لوگوں کا مشترکہ غم ہے، لیکن اس دہشت گردی کے رد عمل میں یا اس کے بھانے افغانستان اور عراق میں جواہروں افراد مارے گئے اور جنہیں اسی طرح کی دہشت گردی میں بارود اور آگ میں بھسم کر دیا گیا، وہ بھی تو آخر اسی طرح کے گوشت پوست کے انسان تھے، ان کی یاد کون منائے گا؟

## دنیا کے اسلام میں امریکہ کا تشخص

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — جنوری ۲۰۰۶ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۳ دسمبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی ہے کہ امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے تسلیم کیا ہے کہ امریکہ کو اس وقت مسلم دنیا میں اپنے تشخص کا مسئلہ درپیش ہے جسے بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہوں نے یہ بات فلاذیلفیا میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی، انہوں نے کہا کہ عرب ٹوی متنقل طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اسلام کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ امریکہ مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اور وہ ہماری دہشت گردی کے خلاف جنگ کو اسلام کے خلاف جنگ قرار دے رہے ہیں، تاہم میں مسلمانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ امریکی قوم اسلام مخالف نہیں ہے، امریکی قوم تمام لوگوں کے عقائد کا احترام کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ نے ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے مسلمانوں میں اس کا تشخص بہتر ہوا ہے، اس سلسلہ میں سونامی اور پاکستان میں زلزلے کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

مغرب کے حکمرانوں کا لیہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو اپنی مخصوص عینک کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے مسائل و مشکلات کا حل اپنے ہی انداز سے تجویز کر دیتے ہیں۔ صدر جارج ڈبلیو بش کا یہ کہنا درست ہے کہ مسلم دنیا میں امریکہ کا تشخص و تعارف ثابت نہیں ہے اور دنیا کے اسلام میں امریکہ کے خلاف و سعی پیانے پر نفرت اور غیظ و غضب کے جذبات پائے جاتے ہیں لیکن اس کی وجہ عرب ٹوی نہیں ہیں بلکہ اس کے اسباب ان عرب ٹوی چینلوں کے وجود میں آنے سے بہت پہلے موجود تھے جن کی طرف امریکی صدر نے اشارہ کیا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑا سب اسرائیل کی مسلسل نارواپشت پناہی اور عرب ممالک کے تیل کے چشمیں پروفیگی تسلط ہے جس کے

باعث نہ صرف یہ کہ تیل کے وسائل عرب دنیا کے اپنے کشور میں نہیں رہے بلکہ عرب عوام کے شہری حقوق اور متعدد عرب ممالک کی خود مختاری سوالیہ نشان بندی ہوئی ہے، جبکہ امریکہ نے افغانستان اور عراق کے خلاف فوج کشی کر کے اور مسلح افون کے وہاں ڈیرے لگو اکار پہنچنے خلاف نفرت کے اسباب میں خود اضافہ کر لیا ہے، اس لیے جب تک ان اسباب کا ازالہ نہیں ہو گا نفرت میں کمی کی بھی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

صدر بیش کو غلط فہمی ہے کہ سونامی اور زلزلہ کے متاثرین کی امداد کر کے وہ عالم اسلام کو ان اسباب و عوامل سے غافل کر سکتے ہیں جو امریکہ کے خلاف دنیا کے اسلام میں نفرت کا باعث بنے ہوئے ہیں، یہ اسباب و عوامل زندہ اور معروضی حقیقت کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہیں اور ان کی عینی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے اگر امریکہ دنیا کے اسلام میں اپنا شخص بہتر بنانا چاہتا ہے تو اسے مشرق و سطحی اور افغانستان کے حوالے سے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا ہو گی اور مسلم دنیا پر مسلط کیے گئے اپنی مرضی کے حکمرانوں کی جگہ عالم اسلام کی حقیقی رائے عامة اور مسلم امہ کی اکثریت کے جذبات کا احترام کرنا ہو گا، اس کے بغیر دنیا کے اسلام میں امریکہ کے خلاف نفرت کے کم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

## برطانوی وزیر جیری اسٹکلف کے خیالات

بیفت روزہ ضرب مومن، کراچی --- جنوری ۲۰۰۶ء

روزنامہ جنگ لندن کے مطابق بریڈ فورڈ میں برٹش مسلم یوتھ فورم کے زیر اہتمام عالمی دہشت گردی کے حوالے سے منعقد ہونے والی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی وزیر جیری اسٹکلف نے کہا ہے کہ برطانوی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں تک اسلام کا صحیح آفاقی پیغام پہنچائیں۔ اسلام، جہاد اور دہشت گردی میں واضح فرق کرتا ہے لیکن اس فرق کو واضح کرنے کیلئے اسلام کا صحیح معنوں میں علم رکھنے والے لوگ آگے بڑھیں۔ انہوں نے برطانیہ کے تمام شہروں میں ایسی تقریبات کے ذریعے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور غلط فہمیاں دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کشمیریوں کو اقوام متحده کی قراردادوں کے مطابق حق خود ارادت مانا چاہیے۔

## اسلام کی دعوت اور پیغام

جہاں تک غیر مسلموں تک اسلام کا صحیح آفاقی پیغام پہنچانے کا تعلق ہے اس میں کوئی مشکل نہیں کہ صرف برطانوی مسلمان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے تمام مسلمان مجموعی طور پر اس سلسلہ میں کوتاہی اور غفلت کے مرکلب ہیں۔ اور دنیا کے بعض خطوط میں کچھ مسلمان افراد یا علاقاً اداروں کی محدود سرگرمیوں کے علاوہ نسل انسانی تک اسلام کی دعوت اور پیغام پہنچانے کا کوئی نظم اور اہتمام موجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بحیثیت امت دنیا کے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ

دنیا کے ہر خطے میں نسل انسانی کے ہر گروہ اور طبقے تک اسلام کی دعوت اور پیغام کو پہنچانے کا اہتمام کریں۔ دنیا میں اس وقت انسانی آبادی چھ ارب کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے جس میں مسلمانوں کا تناسب ایک چوتھائی یا کم از کم ہیں فیصل بقیا ہے۔ اور اسلام کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یہ عالمی مذہب ہے جو پوری نسل انسانی کیلئے اور قیامت تک کیلئے ہے۔ اس کے ساتھ ہی واضح طور پر یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی نیابی نہیں آئے گا اور نسل انسانی نے جب تک کہ ارض پر رہنا ہے اسے حضرت محمدؐ کی تعلیمات کی روشنی میں ہی نجات و فلاح کا راستہ مل سکتا ہے۔

ان دو وضاحتوں کے بعد یہ ذمہ داری خود بخود پوری امت مسلمہ کو منتقل ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کو صرف اپنے دائرہ تک محدود نہ رکھے بلکہ اسلام کی دعوت، پیغام اور تعلیمات کو نسل انسانی کے ان تمام افراد تک پہنچانے کا اہتمام کرے جو اسلام کے دامن سے والیتہ نہیں ہیں اور جن تک تاحال اسلام کی دعوت اور پیغام نہیں پہنچا۔ بلکہ اس سے یہ مطلب اور نتیجہ اخذ کرنے کیلئے بھی کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی غفلت، کوتاہی اور بے پرواہی کی وجہ سے جن لوگوں تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچ سکی وہ دنیا میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بھی اسلام سے بے خبر ہیں اور اگر وہ اس حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو ان کے کفر اور گمراہی کی ذمہ داری مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اسلام کا پیغام پہنچانے کے دو طریقے ہیں:

- ایک یہ کہ زبان، قلم اور میڈیا کے ذریعے سے لوگوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے متعارف کرایا جائے،
- دوسرا یہ کہ اسلامی معاشرت کا ایسا عملی ماحول اور نمونہ پیش کیا جائے جسے دیکھ کر لوگ اسلام سے متاثر ہوں اور اس کے حلقوں بگوش ہو جائیں۔

یہ دونوں طریقے آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور ماضی میں اسلام کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں انہی ذرائع سے عام ہوئی۔ بلکہ حضرات صوفیائے کرام اور مشرق بعید کا سفر کرنے والے مسلمان تاجر و مسافر کی محنت و ریاست کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو اسلام سے متعارف کرنے میں یہ دوسرا طریقہ یعنی اسلامی معاشرت کا عملی ماحول اور نمونہ پیش کرنا ہر دور میں زیادہ موثر اور نتیجہ خیر ہے۔ مگر قسمی سے آج دنیا میں یہ دونوں طریقے عملی طور پر موجود نہیں ہیں اور چند مستثنیات کے ساتھ غیر مسلموں کو زبان و قلم اور میڈیا کے ذریعے اسلام کی دعوت دینے، یا اسلام کے عملی ماحول کے ذریعے اسلام کی طرف مائل کرنے اور توجہ دلانے کی کوئی تحریک نظر نہیں آ رہی۔ تبلیغی جماعت کے بہت سے دوستوں کا کہنا ہے کہ ان کی تگ و تاز اور جدوجہد کا اصل مقصد مسلمانوں کو دین کے بنیادی اعمال و اخلاق کی طرف واپس لا کر ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جو دنیا میں اسلام کی عمومی دعوت و تبلیغ کی بنیاد بن سکے۔ ہمارے خیال میں حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ کا مقصد اور ہدف یہی تھا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اس کام میں دو تبدیلیاں محسوس ہونے لگی ہیں۔ ایک یہ کہ ذریعہ ہی اصل مقصد اور ہدف کی شکل اختیار کر گیا ہے، دوسرا یہ کہ اهداف و مقاصد کے وسیع افق کی بجائے طریق کارکی محدودیت تک نگاہیں محصور ہو کر رہ گئی ہیں۔ چنانچہ اپنے عملی دائرہ میں ضرورت و افادیت اور نتائج و ثمرات کے باوجود اصل اهداف و مقاصد کی طرف اس تحریک کی پیش رفت کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

## جہاد اور دہشت گردی میں فرق

باقی رہی بات جہاد اور دہشت گردی میں فرق کی توبہ طالوی وزیر جیری اسٹکلف نے جس پس منظر میں یہ بات کہی ہے اسے سامنے رکھنا ان کے مقصد کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ اسلام نے انسانی سوسائٹی میں اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ اور انسانیت کے منافی اقدار کے خاتمے کیلئے جنگ کو جہاد قرار دیا ہے۔ یہ جنگ زبان، قلم، میڈیا اور دیگر ذرائع کے ساتھ ساتھ بوقت ضرورت ہتھیاروں کے ساتھ بھی لڑی جاتی ہے۔ اور جہاں انسانیت کے منافی اقدار کی روک قائم کیلئے دیگر ذرائع موثر ثابت نہ ہوں وہاں اسلحہ اور ہتھیاروں کا استعمال اسلام کے نزدیک ضروری ہو جاتا ہے۔ کائنات کو پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، اور پیغمبروں کے ذریعے پھیجنی گئی اس کی تعلیمات وہدیات کی پابندی کرنا اسلام کے نزدیک انسانیت کی فطری اور اعلیٰ ترین اقدار ہیں اور انہی پر انسانی سوسائٹی کی نجات کا مدار ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ رکھنا یا اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا اور پیغمبروں کے ذریعے اس کی پھیجنی ہوئی تعلیمات وہدیات و بدایات سے بے پرواہ ہو کر اپنی خواہشات اور محدود و متغیر عقل کے مطابق زندگی بسر کرنا اسلام کے نزدیک انسانیت کے منافی اقدار و اعمال ہیں۔

یہ اسی طرح ہے جیسے آج مغرب کے فاسدہ و فکر کے مطابق انسانی سوسائٹی کی اجتماعی یا اکثری عقول و خواہش کو ہر معاملہ میں آخری اختہاری تسلیم کرنا، اور اس کے مقابلہ میں آسمانی تعلیمات سمیت ہر بات کو مسترد اور نظر انداز کرنا انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار اور روایات کا درج رکھتا ہے۔ اس فکر و فلسفہ کے فروغ اور بقاوی سچکام کیلئے زبان، قلم، میڈیا، لابگ، معافی و سیاسی دباؤ، اور دیگر حربوں کے ساتھ ساتھ عسکری طاقت اور تباہ کن فوجی قوت کے استعمال کو بھی مغرب کے نزدیک ایک ناگزیر ذریعہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اسے ترقی یافتہ تہذیب و تمدن اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ و تحفظ کیلئے طاقت کے استعمال کا نام دیا جا رہا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اعلیٰ انسانی اقدار کو رنج کرنے کیلئے طاقت کے استعمال کی ضرورت اور جواہز پر اسلام اور مغرب کے درمیان کوئی جو ہری اختلاف نہیں ہے۔ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ جو اقدار اور روایات انسانی سوسائٹی کیلئے مفید ہوں اور اسے فلاں و نجات کی طرف لے جاتی ہوں ان کیلئے طاقت کا استعمال نہ صرف جائز ہے بلکہ حسب موقع ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ اعلیٰ انسانی اقدار کے تعین میں اختلاف ہے۔ اسلام کے نزدیک اعلیٰ انسانی اقدار کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے، جبکہ مغربی فاسدہ و فکر کے نزدیک انسانی سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر اعلیٰ انسانی اقدار تشکیل پائی ہیں، اور ان کیلئے آسمانی تعلیمات سے اخراج یا کم از کم لائقی ضروری ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات کی روشنی میں جو جنگ آسمانی تعلیمات کی بالادستی اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کیلئے لڑی جائے وہ جہاد ہے۔ اور جس جنگ کا مقصد نسل، رنگ، علاقہ، یا قومیت کے حوالے سے ایک انسانی گروہ پر دوسرے گروہ کی بالادستی ہو وہ جاہلیت اور فساد ہے۔

دہشت گردی اور جہاد کے درمیان فرق کا ایک پس منظر تو یہ ہے جو اصولی اور نظری ہے اور اسلامی تعلیمات کی

- روشنی میں ہے۔ لیکن اس کا ایک پس منظر معروف نہیں اور واقعیت بھی ہے جس کا مشابہہ ہم گذشتہ ڈیڑھ صدی سے کر رہے ہیں کہ مغرب آسمانی تعلیمات اور مذہب کیلئے ہتھیار کے استعمال کو مسلسل دہشت گردی قرار دے رہا ہے مگر اپنے فلسفہ و تہذیب کیلئے ہتھیار کا استعمال اس کے نزدیک جائز نہیں۔ مگر زیر صورت ہے۔ مثلاً
- افغانستان میں روئی فوجوں کی موجودگی کے خلاف مسلح جنگ مغرب کے نزدیک جہاد تھی مگر خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف ناراضگی کا سلح اظہار دہشت گردی ہے۔
  - کوبیت پر عراق کی فوج کشی اور قبضہ مغرب کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا اور جب تک مسلح طاقت کے ذریعے یہ قبضہ ختم نہیں کرالیا گیا مغرب نے جیں کا سانس نہیں لیا، مگر بیت المقدس پر اسرائیل کی فوج کشی اور ۱۹۷۴ء میں اس پر جارحانہ قبضہ مغرب کے نزدیک کوئی جرم نہیں، اور اس قبضہ کو جائز تسلیم کرانے کیلئے مغرب اپنے تمام ذرائع استعمال کر رہا ہے۔
  - مشرقی یورپ کی اکثریت کو حق خود ارادیت کے ذریعے آزادی دلوانے میں اقوام متعددہ کا کردار ایک متحرک اور فعال ادارے کا کردار ثابت ہوا۔ مگر مقبولہ کشمیر کی مسلم اکثریت کا حق خود ارادیت جزوں آسٹبلی کی قراردادوں سمیت اقوام متعددہ کے فریزیر میں نصف صدی سے مجھ پڑا ہے۔
  - مسٹر جیری اسٹکلف سے گزارش ہے کہ جہاد اور دہشت گردی کے درمیان واضح فرق یقیناً موجود ہے اور وہ مسلمانوں کے علم میں بھی ہے مگر اسے گذشتہ ڈیڑھ صدی سے مغرب کے دہرے اور متصاد کردار نے لڑکر کھا ہے۔ اور اگر اس سلسلہ میں کوئی تکفیر ہو جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری زیادہ تر مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ کیا مسٹر جیری اسٹکلف مغرب کی قیادت کو اس اتضاد اور دہرے میں معیار پر نظر ثانی کا مشورہ دینے کی زحمت فرمائیں گے؟

## امریکی مفادات اور اسلام آباد کی کمٹمنٹ

روزنامہ پاکستان، لاہور—۲۸ فروری ۲۰۰۶ء

”آن لائن“ کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس نے اپنی حالیہ رپورٹ میں امریکی مفادات کے حوالے سے اسلام آباد کی کمٹمنٹ کو بعض معاملات میں مشکوک قرار دیا اور اس پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ نائیں الیون کے بعد انساد دہشت گردی کی کوششوں میں پاکستان امریکہ کا انہم اتحادی بنا تاہم بعض اہم امریکی مفادات کے بارے میں اسلام آباد کی کمٹمنٹ میں کچھ مشکوک موجود ہیں۔ رپورٹ میں متحکم پاکستان کو براعظم ایشیا میں امریکہ کے مفاد میں بتایا گیا ہے مگر دہشت گردی، افغان تعلقات، ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مسئلہ کشمیر، پاک بھارت کشیدگی، انسانی حقوق کا تحفظ اور اقتصادی ترقی پر رپورٹ میں تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ امریکی ریسرچ سروس کا کہنا ہے کہ پاکستان میں کافی تعداد میں امریکہ کا مخالف جذبات موجود ہیں جو صرف اسلامی گروپوں تک محدود نہیں ہیں۔ رپورٹ میں پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بن نظیر بھٹکی ۲۲ جون ۲۰۰۶ء کی پریس کانفرنس کا حوالا

بھی دیا گیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فوجی حکومت ملک میں سیکولر جمہوری قوتوں کو سائیڈ لائن کر رہی ہے اور اس اقدام سے پیدا ہونے والے خلاء کو انتہا پسند پر کر رہے ہیں۔

امریکی کارکنیس کی ریسرچ سروس کی روپورٹ کے اس خلاصے کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ نائنیوں کے بعد پاکستان میں جزل پرویز مشرف کی حکومت نے اپنی پالیسیوں کے حوالے سے جو یوڑن لیا تھا اس سے امریکی حکمران مطمئن نہیں ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان کو اپنا تحدی قرار دیتے وقت ان کے ذہنوں میں جو ایجنس اتحاد وہ پوری طرح آگے نہیں بڑھا اور بعض معاملات میں امریکی مفادات کے ساتھ کمٹنٹ کے حوالے سے شکو و شبہات کی فضائی تک موجود ہے۔

سب سے پہلے تو امریکی مفادات کے ساتھ اسلام آباد کی کمٹنٹ کا تصور ہی توجہ طلب ہے کہ اسلام آباد بہر حال ایک آزاد اور خود مختار ملک کا دارالحکومت ہے جو عالمی اور علاقائی سطح پر اپنے مسائل اور اپنی ترجیحات رکھتا ہے، اس کا ایک نظریاتی اور تہذیبی شخص ہے اور یہن الاقوای تعلقات و معاملات میں خود اس کے اپنے مفادات کی ایک نہرست موجود ہے۔ ظاہر ہات ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کا دارالحکومت ہونے کے ناطے اسلام آباد کی کمٹنٹ اپنے ملک کے نظریے، تہذیب، مفادات و خود مختاری اور ترقی و استکام کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کمٹنٹ کے درجہ کا تعلق ایک آزاد ملک کے دارالحکومت کا کسی اور ملک کے ساتھ عجیب سالگتر ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بدلتے ہیں اور نوآبادی کی جگہ "اتحادی" اور غلائی اور وفاداری کی جگہ "کمٹنٹ" نہ لے لی ہے۔

امریکہ نے نائنیوں کے بعد بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سوویت یونین کے بکھر نے پر واحد عالمی طاقت کے دعوے کے ساتھ جس نیو ولڈ آرڈر کا اعلان کیا تھا اس کا اصل مقصد "واحد عالمی حکومت" تھا۔ امریکہ تب سے عالمی طاقت کے طور پر نہیں بلکہ عالمی حکومت کے طور پر اپنے کردار کو آگے بڑھا رہا ہے اور اسی وجہ سے اسے مختلف دارالحکومتوں سے یہ شکایات پیدا ہو رہی ہیں کہ وہ اس کے مفادات کا پوری طرح تحفظ نہیں کر رہیں اور بعض معاملات میں ان کی کمٹنٹ مشکوک ہوتی جا رہی ہے۔ بات صرف اسلام آباد تک محدود نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے دوسرے دارالحکومت بھی شکو و شبہات کی اسی دھنڈ کا شکار ہیں۔

اسلام آباد کی حالت اس حوالے سے سب سے زیادہ قابل رحم ہے کہ "اسلام" اس کے نام کا حصہ ہے اور وہ جس ملک کا دارالحکومت ہے اس کے نام کا آغاز بھی "اسلامی" سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کیلئے امریکہ کو اپنی وفاداری کا اعتماد دلانا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ پھر اس نے ایسی ہونے کا روگ بھی پال رکھا ہے جو آج کی عالمی حکومت اور دیگر عالمی قوتوں کے نزدیک ان کے علاوہ کسی اور کیلئے ایک روگ ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جب ایم بیم کے ساتھ اسلام کا لفظ بھی شامل ہو جائے تو اسلام آباد کا ایم بیم بہت سے لوگوں کے پیٹوں میں مرور کا باعث بن جاتا ہے۔

اسلام آباد کی حالت اس پہلو سے بھی قابل رحم ہے کہ ایک طرف اس ملک کے عوام، سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کا کہنا ہے کہ اسلام آباد نے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے اپنے کچھ داد پر لگا دیا ہے۔ ملک کے عوام کو اسلام آباد سے شکوہ ہے کہ

- اس نے اپنے ملک کے عوام کے جذبات و احساسات اور ملک کے دستوری اور نظریاتی شخص کی قربانی دیتے ہوئے افغانستان پر امریکی حملہ کیلئے لاجٹنگ سپورٹ مہیا کی جسے بعض زندہ دل بندوق چلانے کیلئے اپنا کندھا فراہم کرنے سے تعمیر کرتے ہیں۔
- اسلام آباد نے افغانستان کے بعد کشمیر کے مسئلے پر بھی یوڑن لے لیا ہے اور اس کی نئی پالیسیوں کے باعث کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی سبوتاش ہوتی نظر آ رہی ہے۔
- اسلام آباد نے ملک میں اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کیلئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بجائے ملک کی تہذیبی پیش رفت اور ثقافتی پیش قدی کارخ مغرب کی طرف موڑتے ہوئے ملک و قوم کے تمام ذرائع و سماں کیلئے وقف کر دیے ہیں۔
- ملک کے دینی حلقة شکایت کر رہے ہیں کہ ان کی بہترین نوجوان قوت کو سوویت یونین کے خلاف امریکہ کے مفاد میں استعمال کر لینے کے بعد اسلام آباد اس قوت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کیلئے امریکہ کے دست و بازو کا کردار ادا کر رہا ہے۔
- مگر دوسری طرف امریکہ بھی اسلام آباد سے خوش نہیں ہے اور اسے یہ مشکوہ ہے کہ اس نے پاکستان کو "اتحادی" ہونے کے صلے میں جو خدمات سونپی تھیں اور جو ایجنس اسلام آباد کے سپرد کیا تھا وہ پورا نہیں ہو رہا۔ اسے جن باتوں پر تشویش ہے ان میں دہشت گردی، پاک افغان تعلقات، ہتھیاروں کا پھیلاو، مسئلہ کشمیر، پاک بھارت کشیدگی، انسانی حقوق اور اقتصادی ترقی جیسے مسائل شامل ہیں۔
- دہشت گردی کے خاتمے میں امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعاون کی قوی خود مختاری اور بین الاقوامی سرحدوں کے احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے امریکی فضائیہ پاکستان کی سر زمین پر بمباری کرتی ہے اور اسلام آباد پوری قوم کے سر اپا احتجاج ہونے کے باوجود نیازمندی کے ساتھ واشنگٹن کے آگے سر جھکائے کھڑا ہے۔
- پاک افغان تعلقات کی صور تھاں یہ ہے کہ افغانستان میں پاکستان کی حمایت اور نیازمند طالبان حکومت کے خاتمے میں اسلام آباد برابر کا شریک تھا۔ اس کے بعد سے کابل کے اسلام آباد اور دہلی کے درمیان معاملات میں جھکاؤ کارخ ساری دنیا پر واضح ہے۔ مغربی سرحدوں پر پاک فوج کا ہبھلے جیسا اطمینان اور بے فکری بھی باقی نہیں رہی۔ اسلام آباد کی اتنی بڑی قربانی کے باوجود امریکہ کو پاک افغان تعلقات کے حوالے سے تشویش ہے اور اسے شک کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔
- ہتھیاروں کے پھیلاو کو روکنے اور اس معاملے میں مغرب کو مطمئن رکھنے کیلئے اسلام آباد نے پاکستان کے قوی ہیر و ڈاکٹر عبد القدر یہ کو نظر بندی کی اذیت سے دوچار کر کھا ہے اور پوری قوم اپنے ہیر و کی اس تذمیل پر

بے چین اور مضطرب ہے۔ مگر امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کو شہبہ ہے کہ اسلام آباد اس بارے میں بھی واشنگٹن کے ساتھ مغلظ نہیں ہے۔

• مسئلہ کشمیر اور پاک بھارت کشیدگی کے مسئلے پر اسلام آباد ہاں تک آگے جا رہا ہے جہاں کوئی پاکستانی حکومت اب تک سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آزادی کشمیر کی خاطر لڑنے والوں کی بے قیمتی اور بھارت کے ساتھ اعتدال سازی کے یکطرفہ اقدامات پر پوری پاکستانی قوم سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے۔ مگر واشنگٹن ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔

• انسانی حقوق کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ جب تک ملک میں اسلامی اقدار کا نام لیا جاتا ہے، قرآن و سنت کے احکام کی بات کی جاتی ہے، پر وہ حیا اور شرم کی حدود کا ذکر ہوتا ہے اور مغربی ثقافت کی کسی بھی بات کو اسلامی اقدار کے منافی قرار دینے کی بات ہوتی ہے، واشنگٹن کا انسانی حقوق کا بندوق پاکستان میں پورا نہیں کیا جاسکتا۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کو اس بات کا اعتراف ہے کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر امریکہ کے خلاف جذبات پائے جاتے ہیں اور یہ جذبات صرف اسلامی گروپوں تک محدود نہیں ہیں۔ اس کے باوجود امریکہ کو اصرار ہے کہ اسلام آباد اپنے ملک کے عوام کے جذبات کا احترام کرنے کی وجہے صرف امریکہ کے مفادات کیلئے کام کرے۔ اور پاکستان کے عوام کچھ بھی رائے رکھتے ہوں، اسلام آباد امریکہ کے ساتھ اپنی کمکثٹ پکی رکھے۔ امریکہ کے نزدیک اسی کا نام جبہوریت ہے اور یہی اس کا انسانی حقوق کا معیار ہے۔

باقی رہی بات محترمہ بے نظیر بھٹو کی توانیں بہت دیر سے یاد آیا ہے کہ وہ سیکولر جبہوری قوت کی نمائندگی کر رہی ہیں اور انہیں صرف اس وجہ سے سائیل لائیں کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ بات بھول گئی ہیں کہ اس ملک کو اسلامی جبہوریہ پاکستان قرار دینے، اسلام کو ملک کے سرکاری دین کا درج دینے، دستوری طور پر ملک میں اسلامی توانیں کے نفاذ کی ضمانت دینے، اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا سہرا اب تک ان کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو مر حوم کے سرپاندھا جاتا رہا ہے۔ ہمیں ان کے اس اعزاز سے اسکار نہیں ہے بلکہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تدوین میں دستور ساز اسمبلی کی قیادت کرنے کے حوالے سے ہم نہ صرف بھٹو مر حوم کے اس اعزاز کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی اعتراف ہے کہ بھٹو مر حوم نے جمعہ کی سرکاری تعطیل کا اعلان کیا تھا اور شراب اور جوئے پر پابندی کا حکم صادر کیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اسی دستور کے تحت دوبار ملک کی وزیر اعظم رہ چکی ہیں۔ مگر اب نائن الیون کے بعد ان کی یادداشت نے کام کرنا شروع کیا ہے اور انہیں یاد آیا ہے کہ وہ کسی سیکولر جبہوری قوت کی نمائندہ ہیں۔ ہم اس موقع پر محترمہ بے نظیر بھٹو سے صرف یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ پاکستان کو امریکی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس حد تک آگے نہیں جا سکتیں جہاں تک موجودہ حکومت جا پکی ہے، اس کے باوجود امریکہ اسلام آباد سے مطمئن نہیں۔

## ڈاکٹر عبد القدیر خان اور مولانا فضل الرحمن خلیل

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۳ اپریل ۲۰۰۶ء

دو خبریں بظاہر الگ الگ ہیں مگر خدا جانے مجھے الگ الگ کیوں نظر نہیں آرہیں۔ ایک خبیر یہ ہے کہ پاکستان میں امریکہ کے سفیر ریان سی کرو کرنے ایک نجی ٹی وی چینل کے پروگرام کیمیٹل ٹاک میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر خان کا نیٹ ورک ختم ہو چکا ہے اور آئندہ پاکستان میں کوئی ڈاکٹر قدر پیدا نہیں ہو گا۔ جبکہ دوسری خبر میں بتایا گیا ہے کہ معروف جہادی رہنما مولانا فضل الرحمن خلیل کو گذشتہ روز مسلح افراد نے ان کے ڈرائیور سمیت ان پر شدید تشدد کیا اور پھر رات کی تاریکی میں انہیں رسیوں سے جکڑ کر نیم مردہ حالت میں پنڈی گھسپ روڈ (راولپنڈی) پر پھینک دیا جنہیں اردو گرد کے لوگوں نے سول ہسپتاں پہنچا اور وہ وہاں زیر علاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ و عاجله سے نوازیں، آمین۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان اور مولانا فضل الرحمن خلیل کے نیٹ ورک الگ الگ ہیں اور دونوں میں بظاہر کوئی ربط دھائی نہیں دے رہا یک انپنے پس منظر کے حوالے سے وہ ضرور مماثلت رکھتے ہیں اور یہی مماثلت میرے ذہن کو توجہ دلا رہی ہے کہ کہیں یہ دونوں خبریں کسی ایک ہی معاملہ کے دو مختلف پہلو تو نہیں ہیں؟ ڈاکٹر عبد القدیر خان کے نیٹ ورک کا پس منظر تو یہ ہے کہ وہ ایک ایئٹی سائنس دان ہیں اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں، اسلام سے وابستگی میں پختہ ہیں اور ملتِ اسلامیہ کی زیوں حالی پر ان کا دل کڑھتا ہے، انہیں یہ وہ ملک اپنے شعبہ میں تعلیم اور تحقیقی پیشہ رفت کا موقع ملا تو ان کے دل میں خیال آیا کہ ایئٹی توانائی اور اس کی عسکری افادیت سے ان کے اپنے ملک کو محروم نہیں رہنا چاہیے۔ انہوں نے اس خیال کو عملی جامد پہنانے کا سوچا تو معلوم ہوا کہ ان کا ملک اور اس جیسے اور بہت سے ممالک جن کے نام کے ساتھ اسلام یا مسلمان کا کوئی سابقہ یا لاحقة موجود ہے ان کیلئے ایئٹی توانائی اور اس کی عسکری افادیت شرمند کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کے چند بڑوں نے اپنے سوا دوسروں کیلئے اس کے بارے میں سوچنا تک حرام قرار دے رکھا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے کسی ملک کیلئے اس کا خواب دیکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان نے دیکھا کہ یہ گھنی سیدھی انگلی سے نہیں نکل سکتا تو انہوں نے انگلیوں کو تھوڑا سا سڑھا کر لیا جو کہ اکثر لوگ کر لیا کرتے ہیں اور وہ اپنے ملک کیلئے تھوڑا سا گھنی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں اس میں اپنے ملک کے حکمرانوں ذوالفقار علی بھٹو، جنل محمد غیاء الحق، غلام اسحاق خان اور میاں محمد نواز شریف کی سرپرستی حاصل رہی اور ان سب کی کوششوں سے پاکستان ایئٹی تجربہ کرنے میں کامیاب ہو گیا جو ایئٹی توانائی کے اجراء داروں کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پر پاکستان مسلسل سزا اور مواغذہ کے مرحلہ سے گزر رہا ہے۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان کا یہ جرم ہی ان عالمی اجراء داروں کے نزدیک خوفناک تھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک اور الزام آگیا

کہ ڈاکٹر عبدالقدیر دنیا کے دیگر ممالک کو بھی یہ گھی حاصل کرنے کیلئے انگلیاں ٹیڑھی کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہیں اور ایسی تو انی کی عسکری افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ الزام فی الواقع درست ہے یا نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن اس چارچ شیٹ کے ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر کو جس صورتحال سے دوچار کر دیا گیا ہے اس کی ایک جملہ امریکی سفیر کے مذکورہ بیان میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے جس کا الجہ ان کے بیان کے بین السطور کیوضاحت کر رہا ہے کہ ان کے خیال میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس حد تک نشان عبرت بنادیا گیا ہے کہ اب کوئی پاکستانی ڈاکٹر عبدالقدیر نئے کا حوصلہ نہیں کرپائے گا۔

اب ذرا ایک نظر مولانا فضل الرحمن خلیل اور ان کے نیٹ ورک کے پس منظر پر بھی ڈال لیجھے۔ ابھی افغانستان کا جہاد شروع نہیں ہوا تھا اور اس کے آثار بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے کہ فیصل آباد کے ایک نوجوان نے، جو بعد میں مولانا ارشاد شہید کے نام سے تاریخ کا حصہ بننے، مختلف علماء کرام سے ملاقاتوں میں انہیں اس طرف توجہ دلانا شروع کی کہ ہمارے ہاں جہاد پڑھایا تو جاتا ہے مگر اس کی عملی تربیت نہیں دی جاتی تجھکے ہتھیار مسلمان کا زیور ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے اور جہاد کی عملی تربیت مسلمانوں کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ وہ اس وقت مجھے بھی ملتے تھے اور بڑے درد دل کے ساتھ اس طرف توجہ دلاتے تھے کہ ہمیں اس بارے میں غفلت نہیں برتنی چاہیے اور ملی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں کوئی عملی راستہ ضرور نکالنا چاہیے۔ مجھے ان سے ہمدردی تھی، ان کے جذبات کی دل میں قدر تھی اور ان کے اس خیال سے اتفاق بھی تھا۔ مگر ایک تو میں خود کو اس عملی میدان کیلئے موزوں نہیں سمجھتا تھا کہ میری سرگرمیوں کا اصل میدان علمی اور فکری چلا آرہا ہے، اور دوسرا اس وقت کوئی عملی ہدف بھی سامنے نہیں تھا اس لیے فکری مشاورت سے آگے نہ بڑھ سکا اور ہر ملاقات میں ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ مناسب وقت اور مناسب میدان کے انتظار کا کہتا رہا۔

اس کے چند برس بعد جہاد افغانستان کا آغاز ہوا تو مولانا ارشاد احمد کو ایک موزوں میدان بھی مل گیا مگر اب ان کے ساتھ دو تین نوجوان اور بھی شریک سفر تھے۔ ان میں سے ایک مولانا فضل الرحمن خلیل، دوسرے مولانا قاری سیف اللہ اختر اور تیسرے مولانا مسعود کشمیری شہید تھے۔ ان نوجوانوں نے جہاد افغانستان کیلئے اپنے ملک کے نوجوانوں کو تیار کرنے کیلئے جس جانشناںی اور جوأت و استقلال کے ساتھ کام کیا، ہزاروں نوجوانوں کو جہاد کی تربیت دلوائی اور میدان جنگ میں روئی استعمال کے خلاف لے جا کر کھڑا کر دیا۔ میں اس کو ایسی تو انی کے شعبہ میں ڈاکٹر عبدالقدیر اور ان کے رفقاء کی جدو جہد سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا۔ انہیں اس معاملہ میں اپنے بزرگوں کی سرپرستی حاصل تھی کہ جہاد افغانستان کی عملی سرپرستی کرنے والوں میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، حضرت مولانا عبد الحمید، حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی جیسے اکابر شامل تھے۔ اس دور میں میرا ان کے ساتھ رابطہ رہا اور اپنے مذکورہ بالا بزرگوں کی پیروی میں اپنے دائرة کارکی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے فکر و مشاورت میں ان کے ساتھ اشتراک و ربط میں نے قائم رکھا مگر عملاً میں ان کا ساتھی نہ بن سکا جسے میں اس فارسی شعر کی صورت میں تعبیر کرتا ہوں:

ما و جنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق

### او بصر ارفت و مادر کوچہ ہار سوا شدیم

اس کے بعد اور بھی بہت سے باہم نوجوان آگے بڑھے اور اس میدان میں قیادت اور پیشہ رفت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا لیکن میری معلومات کی حد تک اس میدان کے "السابقون الاولون" یہی چار پانچ حضرات تھے اور آج پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں جہاد کے عنوان سے جو سرگرمیاں جاری ہیں ان کے "ڈاکٹر عبد القدیر" یہی لوگ ہیں۔ یہ نوجوان آج کے دور کے نوجوان تھے، ان سے یقیناً غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی، ان کے طریق کار کے بعض پہلوؤں سے مجھ سمتیت بہت سے لوگوں کو اختلاف ہو گا، ان کے طرز عمل اور دائرہ کار کے بارے میں تحفظات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا خلوص اور اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے بہتر تقبل اور مفاد کے ساتھ ان کی وفاداری ہمیشہ شکوہ و شہادت سے بالاتر ہی ہے۔ اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی دینی جدوجہد کے جموعی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ عالمی صور تحال پر ایک نظر ڈالی جائے تو اپنے نتائج اور ثمرات کے حوالے سے ڈاکٹر عبد القدیر کے نیٹ ورک اور مولانا ارشاد احمد شہید کے نیٹ ورک میں مماثلت تلاش کرنا بھی کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

اسی لیے یہ دونوں نشانے پر ہیں اور "جہاد" کے لفظ سے بدکنے والوں کے نزدیک ان دونوں کو کسی نہ کسی صورت ختم کرنا ضروری ہو گیا ہے جس کیلئے مسئلہ کام ہو رہا ہے۔ اس لیے چاند مری کرنے والے تو اپنا کام جاری رکھیں گے مگر ملک بھر کے عام مسلمانوں اور دیندار عوام سے میں یہ گزارش کروں گا کہ وہ ڈاکٹر عبد القدیر خان اور مولانا فضل الرحمن خلیل کو اپنی دعاویں میں ضرور یاد رکھیں کہ یہ بھی ایک ہتھیار ہے اور جب کوئی اور ہتھیار کار گر نہیں ہوتا تو صرف یہی ہتھیار مومن کے کام آتا ہے۔

## مولوی محمد یونس خالص

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۸ جولائی ۲۰۰۶ء

مولوی محمد یونس خالصؒ کی وفات کی خبر قومی اخبارات میں نظر سے گزری، ائمۃ و ائمیہ راجعون۔ یہ حالات کے اتار چڑھاؤ کا کرشمہ ہے کہ ان کی وفات کی یہ خبر پاکستان کے بہت سے قومی اخبارات کے ایک کونے میں جگہ پاگئی۔ ورنہ اگر زمانہ ناقدری کا خونگرنہ ہوتا اور لوگوں میں محسن کشی اور احسان ناشاہی اس تدریغی نہ پاچکی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کے قومی اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ میں مولوی محمد یونس خالص کا تذکرہ پاکستان کے ایک محسن کے طور پر کیا جاتا بلکہ امریکہ اور مغرب کامیابی بھی ان کا تذکرہ اس طور پر کرتا کہ افغانستان کا وہ عظیم رہنمادیا سے رخصت ہو گیا ہے جس نے سویت یونین کو شکست دینے اور سرد جنگ میں مغرب کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں ہر اول دستے کا کردار ادا کیا تھا، لیکن احسان ناشاہی بلکہ محسن کشی کے اس دور میں اس انصاف کی توقع کس سے کی جاسکتی ہے!

مولوی محمد یونس خالص شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ کے متاز شاگردوں میں سے تھے بلکہ اکوڑہ خنک میں جب شیخ الحدیث نے دارالعلوم حقانیہ کا آغاز کیا تو ان کے ابتدائی رفقاء میں مولوی محمد یونس خالص بھی شامل تھے۔ وہ اپنائی حوصلہ

مند اور جری علما میں سے تھے، جب افغانستان میں سوویت یونین نے اپنا قبضہ مستحکم کرنے کیلئے فوجیں اتاریں اور افغانستان کو کمیونٹ ممالک کے کمپ میں شامل کرنے کی غرض سے طاقت اور جر کار استہ اختیار کیا تو جن حریت پسندوں نے رو سی استعمار کی اس عسکری جاریت کے خلاف مراجحت کا راستہ اختیار کیا ان میں مولوی محمد یونس خالص بھی تھے۔ انہوں نے دیگر علماء کرام کے ساتھ مل کر رو سی فوجی جاریت اور نظریاتی یقیناً کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور عملی طور پر جہاد کا آغاز کیا۔

جہاد افغانستان کے ابتدائی سالوں میں جب کسی کو اس جہاد کی کامیابی بلکہ پیش رفت کا یقین نہیں تھا اسے مولویوں کا جنون کہہ کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ جہادی رہنماء پنی حمایت و معاونت کا سب سے بڑا سرچشمہ عالم اس باب میں پاکستان کے دینی حلقوں اور غیر عوام کو تصور کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر مجاہدین کے کنڑوں تک امریکہ سمیت مغربی ممالک یہ سوچنے کیلئے بھی تیار نہیں تھے کہ یہ جنگ اڑی جاسکتی ہے اور اسے جیتا بھی جا سکتا ہے۔ اس دور کی بات ہے کہ مولوی محمد یونس خالص پاکستان کے مختلف شہروں میں آئے اور ہم نے شیر انوالہ لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، فیصل آباد اور دیگر شہروں میں ان کیلئے علماء کرام کے اجتماعات کا اہتمام کیا تاکہ وہ انہیں جہاد افغانستان کی اہمیت سے آگاہ کر سکیں اور اپنا موقف سمجھا سکیں۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں ہوئیں اور کئی محافل میں شرکت ہوئی۔ میں نے مولوی محمد یونس خالص مرحوم کو آخری بار قندھار میں اس دور میں دیکھا جب طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی لیکن انہی کا بدل ان کے کنڑوں میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایک مصالحتی میشن کے سلسلہ میں قندھار آئے ہوئے تھے اور ”حرکت انقلاب اسلامی افغانستان“ کے سربراہ مولوی محمد بنی بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس کے بعد میں ان دونوں بزرگوں کو نہیں دیکھ سکا البتہ اخبارات میں مختلف حوالوں سے ان کی خبریں وقتی فوتی نظر سے گزرتی رہیں۔

گذشتہ دنوں اخبارات میں مولوی محمد یونس خالص گی وفات کی خبر پڑی توہہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہونے لگیں اور افغانستان کے علماء کرام اور مجاہدین کے ایک حوصلہ مند قائد کی تگ و تاز کے مناظر نگاہوں کے سامنے گھونمنے لگے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جو ایر رحمت میں جگہ دیں، ان کی لغزشوں اور کوتایوں سے در گز فرمائیں، ان کی حنات کو قبولیت سے نوازیں اور ان کی ان تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے اسباب مہیا کریں جن کو سامنے رکھ کر مولوی محمد یونس خالص اور دیگر جہادی رہنماؤں نے جہاد افغانستان کی طرف عملی قدم بڑھایا تھا، آمین یارب العالمین۔

## سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے خیالات

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۱۶ ستمبر ۲۰۰۶ء

جنی کارٹر امریکہ کے سابق صدر ہیں اور صدارت کے منصب سے سبد و ش ہونے کے بعد بھی امریکہ کیلئے مسلسل کام کر رہے ہیں۔ امریکہ کے شہر اٹلانٹا (جارجیا) میں ”دی کارٹر سینٹر“ کے نام سے ایک مرکز ہے جس کے ذریعے وہ اور ان کی اہلیہ روزانہ امریکی قوم کی علمی و فکری راہنمائی کیلئے مختلف موضوعات پر تحقیقی و مطالعاتی سرگرمیوں میں مصروف

رہتے ہیں۔ امریکہ میں سابق صدور وائٹ ہاؤس سے تور پیارہ ہوتے ہیں لیکن عملی زندگی میں بقیہ زمانہ ”شوپین“ کے طور پر نہیں گزارتے بلکہ علمی اور فکری مجاز پر متحرک ہو جاتے ہیں اور قوم کو راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ رچرڈ نکسن، رونالڈ ریگن، جی کارٹر اور بل کلشنن کی دور صدارت کے بعد کی سرگرمیوں اور تنگ دو کو دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ امریکی صدور امریکہ اور امریکی قوم کیلئے دور صدارت سے زیادہ مصروف عمل ہوتے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ رسیرچ سینٹر قائم کیے ہیں، وہ اپنی حکومتوں کو مشورے دیتے ہیں، ان کی غلطیوں پر ٹوکتے ہیں، خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور قوم کی بھرپور راہنمائی کرنے کے ساتھ عالمی فورم پر امریکی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہیں اور انہوں نے یہاں الاقوامی تعلیمی اداروں میں اس حوالے سے برینگ کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔

یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ سوویت یوینین کے خلاف افغان مجاہدین کی جدو جہد کو کامیابی کا ر斧 اختیار کرتے دیکھ کر جہاد افغانستان کی کامیابی کی صورت میں ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کے ”خطرے“ کو سب سے پہلے امریکہ کے سابق صدر نکسن نے محسوس کیا، جنہیں واٹر گیٹ اسکینڈل کے نتیجے میں امریکی صدارت سے دستبردار ہونا پڑا تھا اور وہ اپنی مدت صدارت پوری نہیں کر سکے تھے، لیکن ان کا قائم کردہ سینٹر آج بھی امریکہ کے اہم فکری، تحقیقی اور مطالعی مرکز میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے جب محسوس کیا کہ جہاد افغانستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے تو وہ امریکہ اور روس کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے کیلئے متحرک ہو گئے۔ یہ تصور سب سے پہلے انہوں نے ہی اجاگر کیا کہ مسلم ممالک میں جہاد کے جذبے سے سرشار مسلمان امریکہ اور روس دونوں کیلئے خطرہ ہیں اور اس خطرہ سے منٹھنے کیلئے انہوں نے روپی دانشوروں سے براہ راست روابط استوار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اور پھر یہ انہی کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ امریکہ اور سوویت یوینین نے جہاد افغانستان کے منطقی نتیجے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک خود ساختہ نتیجہ نکال لیا اور اسی نتیجے سے فصلے کیے کہ افغان مجاہدین کو افغانستان سے روپی فوجوں کی واپسی کے باوجود اپنی گیارہ سالہ جدو جہد اور قربانیوں کے منطقی ثمرات حاصل نہ ہو سکے۔ اس سارے عمل کے پیچھے سوچ اور فکر رچرڈ نکسن کی کارفرما تھی جو وائٹ ہاؤس سے ایک اسکینڈل کے ذریعے نکالے جانے کے باوجود اپنے ملک اور قوم کے ساتھ مخلص رہے اور تو نی مفادات کیلئے آخر دم تک متحرک اور فعال رہے۔

سابق صدور ہمارے ہاں بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ ہماری بقیتی ہے کہ وہ خود کو گروہی سیاست اور طبقائی شکوش سے بالاتر نہیں کر سکتے اور ملک کے اعلیٰ تین منصب پر فائز رہنے کے بعد بھی ان کی سوچ اور تنگ دو کا محور اقتدار میں کسی نہ کسی درجے میں دوبارہ شرکت ہی نظر آتا ہے۔ جبکہ ہمارے ایک سابق صدر تو ایسے نظروں سے غائب ہوئے ہیں کہ جیسے صدارت سے علیحدگی پر سکتے کی کیفیت نے ہمیشہ کیلئے ان کے دل و دماغ کا حصار کر لیا ہو۔

گذشتہ سال ستمبر کے دوران مجھے اٹلانٹا میں ”دی کارٹر سینٹر“ دیکھنے کا موقع ملا تھا لیکن صرف دیکھنے اور کچھ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ انگریزی زبان پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت سے محرومی نے باقی تمام امکانات کا راستہ روک لیا اور کئی روز تک دل و دماغ پر یہ حرست جھائی رہی کہ اگر میں انگریزی پڑھ سکتا اور بول سکتا تو ”دی کارٹر سینٹر“ کے تحقیقی ذخیرے اور دستاویزات سے استفادہ کرتا اور اپنی قوم کو یہ بتلاتا کہ زندہ قوموں کے حکمران کس طرح

اقتدار سے محروم کے بعد بھی اپنے ملک اور قوم کیلئے سرگرم رہتے ہیں اور اقتدار سے علیحدگی کس طرح ان کے قومی جذبات کے نئے کو دوآتشہ کر دیتی ہے۔

جمی کارٹر نے امریکہ اور امریکی قوم کے مسائل پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ قومی مسائل پر وقتانہ فوچتا ہم افراد اور ماہرین کی مشاورت کا اہتمام کرتے رہتے ہیں اور اخبارات میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جب کارٹر اپ سے ربع صدی قبل امریکہ کے صدر تھے اور اب کم و بیش اسی برس کی عمر میں بھی اپنے مشن کیلئے پوری طرح چاق و چوبند ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ سابق امریکی صدور کو اپنی قوم اور ملک کیلئے اس طرح کام کرتے دیکھ کر مجھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعایاد آجاتی ہے جو انہوں نے مکہ مکرمہ میں ابو جہل اور عمر بن الخطاب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پورے جوش و جذبہ اور حوصلہ و جرأت کے ساتھ کام کرتے دیکھ کر بارگاہِ ایزدی میں اس طرح کی تھی کہ ”یا اللہ! ان میں سے ایک تو مجھے دے دے۔“ میرے دل میں بھی یہ تمباکہ حسرت رہتی ہے کہ اے کاش! کوئی نکسن، کوئی کارٹر، کوئی ریگن اور کوئی کانٹن ہمارے یہاں بھی ہو۔ مہاتر محمد کو ملائیشیا کی وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد اس رخ پر چلتے دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی مگر اقتدار کی سیاست ابھی تک ان کا بیچھا نہیں چھوڑ رہی اور موجودہ وزیر اعظم ڈاکٹر احمد عبد اللہ بداؤی کے ساتھ ان کی ”پادر پالیٹکس“ کی کشکش کی خبروں نے اس خوش کرن امید کو دھنلاندا شروع کر دیا ہے۔

بات بہت دور نکل گئی ہے اور خلافِ معمول جذبات کی رو میں بہ کر میں وہ بات ابھی تک شروع نہیں کر سکا جس کیلئے میں نے جبی کارٹر کا تذکرہ کیا ہے۔ دراصل جبی کارٹر کی ایک کتاب اس وقت میرے زیر مطالعہ ہے جس کا انگریزی نام America's Moral Crisis ہے اور جناب محمد احسن بٹ نے ”امریکہ کا اخلاقی بحران“ کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ پونے دو سو سے زائد صفحات کی یہ مجلہ کتاب ”دارالشور، ۲۲ مزگ روڈ، بک اسٹریٹ، لاہور“ نے شائع کی ہے۔ اور میرے نزدیک یہ کتاب جہاں باشمور امریکیوں کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتی ہے وہاں اسے بش سینٹر اور بش جونیز کے دورِ صدارت میں امریکی پالیسیوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے خلاف چارچوں شیٹ اور فرد جرم کا درجہ بھی حاصل ہے۔ جبی کارٹر موجودہ امریکہ کو قومی پالیسیوں اور حکومتی اقدامات کے حوالے سے ماضی کے امریکہ سے مختلف قرار دیتے ہیں اور کسی تامل کے بغیر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ امریکہ اقوامِ عالم کی برادری میں اپنے انتیزا و اختصاص اور مقام و کردار سے محروم ہوتا چاہ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جبی کارٹر کی عائد کردہ اس ”فرد جرم“ کی اہم پتوں سے اپنے قارئین کو بھی آگاہ کروں مگر اس کی تمہید طوبیل ہو گئی۔ لیکچ! آپ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ صدر بیش کی پالیسیوں اور کارروائیوں کے بارے میں امریکہ کے سابق صدر جبی کارٹر کیا کہتے ہیں:

”انتہائی شگنگ نظری پر بنی مذہبی عقائد کو سیاسی پارٹیوں کا بے پک ایجادنا بنا لیا گیا ہے۔ حکومت کے اندر اور باہر موجود لابلی کاروں Lobbyists نے آزاد سوچ اور عمل کے قابل تحسین امریکی ایقان Belief کو انتہائی دوستمند شہریوں کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے اور ساری کی ساری دولت صرف اپنے دارثوں کو ہی منتقل کرنے کے حق میں بدل دیا ہے۔“ (ص ۱۹)

”ہمارا ملک بین الاقوامی تنظیموں کی حدود سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکا ہے۔ نیز بہت سے پرانے عالمی معاهدوں کی خلاف ورزی کر چکا ہے، جن میں عدالتی فصلی، ایٹھی اسلحہ کے حوالے سے کیے گئے معاهدے، حیاتیاتی Biological تھیاروں پر کنٹرول کے معابدے، ماحول کے تحفظ کے معابدے، انصاف کا بین الاقوامی نظام، اور قیدیوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنے کے معابدات شامل ہیں۔“ (ص ۱۹)

”آج کل واشنگٹن کا منظر مکمل طور پر تبدیل ہو چکا ہے، اور تقریباً ہر معاملے پر سخت جانبدارانہ نبیادوں پر فصلے کیے جا رہے ہیں۔ کلیدی نوعیت کے قانون سازی کے فیصلوں پر عوامی مباحثہ کرنا اب قصہ ماضی ہے۔ نبیادی معابدے لالی کاروں اور قانون ساز لیڈروں کے مابین ہوتے ہیں، جن میں اکثر پارٹی کے بند کمروں کے اجلasoں میں ہوتے ہیں کہ جہاں سخت پارٹی نظم حاوی ہوتا ہے۔“ (ص ۲۳)

”جب امریکیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ ذاتی طور پر یہ لیقین رکھتے ہیں کہ ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں کا اپنی ہی صنف کے افراد کے ساتھ جنسی عمل کرنا قابل قول ہے؟ تو ان کی آکثریت اثبات میں جواب دیتی ہے۔ اب سے میں برس پہلے لوگوں کی رائے اس سے بہت مختلف ہو اکرتی تھی۔“ (ص ۳۰)

”میرا عقیدہ ہے کہ یہ یوں مسح نجات دہنہ اور خداوند کے میئے ہیں۔ پروٹسٹنٹ، رومان کیتھولک، مشرقی آرٹھوڈوکس، کوپٹ، سیونیتھ ڈے ایڈومنٹسٹ، اور بہت سے دوسراے مذہبی لوگ بھی بغیر کوئی سنجیدہ سوال اٹھائے ان عقائد کو مانتے ہیں۔ ہم نے اپنے بیٹھنٹ فرقے کی کچھ خاص باتوں کو بھی دل و ذہن میں جذب کر لیا ہے۔ ہمارے نزدیک پیغمبر صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو اتنے پختہ اور بالغ نظر ہوں کہ یہ یوں مسح پر شخصی ایمان لاسکتے ہوں۔ پانی میں غوطہ دینا ہمارے نجات دہنہ کی موت، تدفین اور حیاتِ نوکی علامت ہے۔ ہم کتاب مقدس کو مکمل طور پر خداوند کا ارادہ مانتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہ یوں مسح کے الفاظ و اعمال ہی کے مطابق انجیل مقدس کی تعبیر و تشریح کی جانی چاہیے۔ چنانچہ کتاب مقدس کی اکشوویٹریزم دگار ثابت ہونے والی انسانی تشریحات کو منزہ عن الخطاء، یا مصدقہ مذہبی ضوابط کا مجموعہ، یا ایمانی اختیاب کے ذرائع نہیں مانا جاتا۔“ (ص ۳۲)

”ایوا نجیلیکل کی حیثیت سے ہمارا عالمی مشن یہ ہے کہ بغیر کسی تعصب اور امتیاز کے اپنا عیسائی عقیدہ دوسروں تک پہنچائیں۔ ہم یہ یوں مسح کی اس بدایت پر اپنی ذاتی شہادت Witnessing کے ذریعے یادوں کیلئے باقاعدگی کے ساتھ مالی قربانی دے کر عمل کرتے ہیں۔ میری زندگی کے بیشتر حصے میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ہمارے بیٹھنٹ چرچ جنوبی بیٹھنٹ کوئی کوشش کے رکن ہوں گے جس کا بینا دی اور دنیا بھر میں ہمارے مشتری کام میں تعاون دینا تھا۔“ (ص ۳۲)

”ہمارا ایک اور پختہ عقیدہ چرچ اور ریاست کی کمبل علیحدگی ہے۔ یہ بہت اہم معاملہ تھا اور ہم نے ایسے عیسائی شہیدوں Martyrs کے بارے میں پڑھا تھا جنہوں نے اپنی جان کی قربانی دے دی لیکن کسی غیر مذہبی رہنمा (سیکولر لیڈر) کو مذہبی آزادی میں دخل اندازی نہیں کرنے دی، اگرچہ کچھ عیسائی افراد کو (بشویل میرے والد کے) عوامی معاملات میں حصہ لینے کی آزادی دی گئی تھی۔ تاہم جانبدارانہ سیاسی دنیا میں چرچ کے داخلے کا تصور ہمیں بہت بر الگ تھا۔ ہم مذہبی

آزادی، عیسائی عقیدہ سر کھنے والوں کیلئے ہمدردی اور خداوند کے سامنے برادری کے حامل تمام انسانوں کے احترام پر ایمان رکھتے ہیں۔“ (ص ۳۲)

”جب میں باہل کلاسوں کو پڑھاتا ہوں تو اپنے عقیدے کے جو ہر کی تشریف ہی کو کوشش کرتا ہوں، میں اپنے سامعین کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ عیسائیت کو اپنی روزمرہ زندگی سے جوڑنے پر آمادہ ہوں۔ اگرچہ جدید عیسائی کمیونٹی میں اختلافی مباحثہ زوروں پر ہیں تاہم میں عموماً ایسے بیانات چنتا ہوں جو ان اختلافی مباحثہ سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتے۔ ایک اتوار میری کلاس کے شرکاء کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں بیشتر مہمان تھے۔ میں نے ان سے ان کے مختلف فرقوں میں زیادہ زیر بحث موضوعات کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فوراً بتایا، اسکلوں میں لازمی عبادت، مذہبی تعلیم کیلئے سرکاری فنڈز کا استعمال، لیڈروں کی حیثیت سے عورتوں کی سروس (عبادت)، نظریہ ارتقا، احکام عشرہ کی عوای نمائش، مقامی چرچوں کی خود منخاری، عقیدے کی جبری قبولیت، پاسٹروں کی برتری، چرچ اور یاست کے درمیان سرحدوں کا ختم ہو جانا۔“ (ص ۵۳)

”جہاں مذہبی کمیونٹی میں فرقہ واریت، غلبہ و تسلط اور غصہ و نفرت پائی جاتی ہے، وہاں سیکولر، اور حد تو یہ ہے کہ حکومتی گروپوں میں بھی یہی رجحانات موجود ہیں۔ سیکولر ادارے اور افراد بھی ذاتی تعصبات رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب عورتوں کے خلاف کھلمن کھلا اور عموماً امتیاز بر تاجراہے جو کہ نہایت اشتعال انگیز عمل ہے۔ اس قسم کے مذہبی فیصلوں کی اساس غالباً سفید فام مردوں کی طرف سے کتاب مقدس کی منتخب عبارتیں ہیں، نیز یہ نوع مسح اور اولین عیسائی چرچ کے لیڈروں کی تعلیمات اور اعمال کو فراموش کر دیتا ہے۔“ (ص ۵۴)

”گذشتہ بیس برسوں کے دوران عیسائی بنیاد پرستوں نے یہ نوع مسح کے اس فرمان کو کھلمن کھلا چلنج اور رد کیا کہ ”قیصر کا کام قیصر پر چھوڑ اور خداوند کے کام کو خداوند پر۔“ بیشتر امریکی اس بات کو درست سمجھتے ہیں کہ عوام سرکاری پالیسی پر اثر انداز ہوں، تاہم وہ اس امر کو درست نہیں سمجھتے کہ کوئی مذہبی گروہ کسی جمہوری حکومت کے کاموں پر کثروں پالے، یا سرکاری اہل کار مذہبی معاملات میں دخل انداز ہوں، یا کچھ خاص مذہبی اداروں کے حق میں قوانین یا لیکن یا لین محاصل کو استعمال کریں۔“ (ص ۶۲)

”میں نے پوچھ کی دوسرے عیسائیوں کے علاوہ ہبودیوں اور مسلمانوں میں تبلیغ کی کوششوں کو سراہا، اور چرچ کو عالمی اہمیت دلانے کی ان کی جدوجہد کی تحسین کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آزادانہ تبادلہ خیال کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے عورتوں کو مکمل تصحیح اور انہیں پادری نہ بنانے کے ان کے فعلیے سے اختلاف کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ اولین عیسائی چرچ کیلئے ان کے کردار کی توجیہ ہے۔“ (ص ۶۳)

”مجھ سے پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا کبھی میرے عیسائی عقائد اور صدر کی حیثیت سے میرے دنیاوی (سیکولر) فرائض کے درمیان تصادم پیدا ہوا تھا؟ کچھ معاملات میں ایسا ہوا تھا تاہم میں نے ہمیشہ اپنے اس حلف کا احترام کیا کہ میں ”ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین کا حفظ اور دفاع کروں گا۔“ مثال کے طور پر میرا ایمان ہے کہ یہ نوع مسح اس قاطع حمل یا سزاۓ موت کو بھی قبول نہ کرتے، تاہم میں نے اپنی بہترین اہلیت کے مطابق سپریم کورٹ کے اس نوع کے فیصلوں کی

تعمیل کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے خیال کے مطابق ان کے منفی اثرات کو کم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔” (ص ۲۵)

۲۰۰۰ء میں جنوبی بیٹھٹ کونسلن کے لیڈروں نے اپنے اصولوں میں سے اس اصول کو نکال دیا کہ ”ریاست مذہب کی کسی بھی صورت Form کی مدد کیلئے ٹیکس عائد کرنے کا حق نہیں رکھتی۔“ اس کے بعد انہوں نے پرائیوریٹ اسکولوں کیلئے واچر چربنائے اور پیک اسکولوں میں عبادت کو لازمی قرار دینے کیلئے آئین میں تنیم کا مطالبہ کیا اور چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو حکم کھلا چینچ کرنے لگے۔” (ص ۲۸)

”جولائی ۲۰۰۵ء میں سپریم کورٹ کی جسٹس سانڈڑاڑے اکونزرنے اپنی ریٹائرمنٹ کے اعلان کے فوری بعد کہا تھا میں نے اپنی ساری زندگی میں کامگری میں کامگری میں کامگری میں کامگری میں کامگری میں کامگری میں دیکھا جتنا کہ اب ہیں۔۔۔۔ اور میں یہ کیچ کر بہت دل گرفتہ ہوں۔ موجودہ فضائی ہے کہ میں وفاتی عدیلیہ کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوں۔“ (ص ۲۷)

”۲۰۰۴ء کے صدارتی انتخاب کی ہم کے دوران صدارت کے دونوں امیدواروں نے ہم جنس پرستوں کی شادی کی مخالفت کی تھی۔ تاہم قانونی طور پر تسلیم شدہ یوینیوں کے ذریعے مرد اور عورت ہم جنس پرست جوڑوں کو مساویانہ شہری حقوق دینے کی مظوری دی تھی۔“ (ص ۲۸)

”ہم سب خاندانی اقدار اور شادی کی روایت کے استحکام کو انہائی اہم تصور کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کالج پیپنچنے سے پہلے تک میں کسی طلاق یافتہ شخص سے واقف نہیں تھا۔ تاہم اب طلاق خطرناک حد تک عام ہو چکی ہے۔ تمام امریکی بالفوں میں سے ۲۵ فیصد کو کم از کم ایک مرتبہ طلاق ہو چکی ہے۔ طلاق کی تعداد میں کمی بیشی مذہبی و ایتھری اور عمر کی مناسبت سے مختلف ہے۔ بڑے عیسائی گروپوں میں سے بیٹھٹ سب سے اوپر ہیں ۲۹ فیصد، جبکہ کیتوکل اور لو ٹھرن طلاق یافتگان ۲۱ فیصد ہیں۔ ایشیوں کے استثناء کے ساتھ صرف ۹ فیصد، پروٹیسٹنٹوں کے سینٹر پیپر سب سے کم طلاق یافتہ گروپ تھا ۵ فیصد۔ بے بی یورپز ۳۳ فیصد کو پیچ کچھ چکے ہیں۔ ۵۳ سال سے ۷۲ سال کی عمر کے درمیان کی عمر والے افراد ۷۳ فیصد، جبکہ بڑے افراد میں صرف ۱۸ فیصد طلاق یافتہ ہیں۔ شادی کے تقدس کو لاحق اس خطرے کی وجہ بہت سی ہیں لیکن بعض لوگ ہم جنس پرستی کو شادیوں کی ناکامی میں بہت زیادہ اضافے کا ایک اہم سبب تصور کرتے ہیں۔“ (ص ۲۹)

”نیویارک نائیز میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اکٹھاف کیا گیا ہے کہ کینیڈ اور یورپ کے بیچ بھی جنسی اعتبار سے امریکی بچوں ہی کی طرح فعال ہیں۔ تاہم مناسب سیکس ایجو کیشن سے محروم امریکی لڑکیاں فرنٹسی لڑکیوں کی نسبت پانچ گنازیاہ تعداد میں ایک بیچ کی ماں ہوتی ہیں، سات گنازیاہ امریکی لڑکیاں ایک مرتبہ استقطاب حمل کرو چکی ہوتی ہیں۔ اور نیدر لینڈ کی لڑکیوں کے مقابلے میں ۷۷ گنازیاہ امریکی لڑکیاں سوزاک کاشکار ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جرمی کے ٹین ایجروں کے مقابلے میں ۵ گنازیاہ امریکی ٹین ایجروں کے مقابلے میں ایج ای ایڈر“ کما شکار ہوتے ہیں۔ (ص ۸۰)

”اگرچہ امریکہ کی خارج پالیسی پر بہت سے دوسرے پیچیدہ سیاسی عناصر نے منفی اثر ڈالا ہے، تاہم بنیاد پرستوں نے جذباتی معاملات پر شعلہ بیانی کر کے اور مخالفوں سے مذاکرات سے گریز کر کے امریکی خارجہ پالیسی کی صورت بگاڑ دی

ہے۔ ایک اہم مثال یہ ہے کہ چند امریکی سیاسی لیڈروں نے فیصل کا سترو کو ایک ولن کے طور پر قبول کر رکھا ہے اور انہوں نے کیوبائیسے چھوٹے سے، عسکری اعتبار سے بانجھ ملک کو ہمارے ملک کی سلامتی اور ثقافت کو درپیش سب سے بڑا خطرہ بنا دیا ہے۔“ (ص ۱۰۳)

”ذہب اور حکومت کا ایک انتہائی عجیب امتحان، امریکہ کی مشرق و سلطی میں پالیسی پر کچھ عیسائی بنیاد پرستوں کا بھرپور اثر ہے۔ امریکہ میں تقریباً ہر شخص بارہ تباول پر مشتمل Left Behind سیریز سے واقف ہے جس کے مصنف ٹم لاس ہے اور جیری بی جینکنس ہیں۔ ان تباولوں نے فروخت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ انہوں نے یہ کتابیں باہل کی اختیاط سے منتخب کردہ عبارتوں خصوصاً ”بک آف رویلیشن“ سے لی گئی عبارتوں کی اساس پر لکھی ہیں اور ان میں دنیا کے ختم ہونے کی منظرشی کی گئی ہے۔ جب مسح و اپس آئے گا تو پچھے ایمان والوں کو آسمان پر اٹھالیا جائے گا، جہاں وہ خداوند کے ساتھ ہونے کی پڑھانے والے بیشتر انسانوں کی اذیتوں کا نظارہ کریں گے۔ یہ واقعہ لمحاتی ہو گا اور اس کا وقت پہلے نہیں بتایا جا سکتا۔ میرے لاکھوں ساتھی بیٹھیں اور دوسرا لوگ ایسے ہیں جو اس نظریے پر لفظی یقین رکھتے ہیں اور خود کو چند منتخب لوگوں میں شامل سمجھتے ہیں، اور ”دہشت و اذیت کے دور“ میں نجات کیلئے منتخب نہ کیے جانے والے اپنے افراد خانہ، دوستوں اور ہمسایوں کو چھوڑنے اور ان کی مدد پر تیار ہیں۔

امریکی حکومت کی پالیسیوں میں ایسے نظریات کا سموجاانا تشیش کا سبب ہے۔ ان ایمان والوں کو یقین ہے کہ اس Rapture کی جلد آمد اُن کی شخصی ذمہ داری ہے تاکہ باہل کی پیشگوئی پوری ہو۔ ان کے ایجادنے میں مشرق و سلطی میں اسلام کے خلاف جنگ کرنا اور یہودیوں کا ساری ارض مقدس کو چھین لینا شامل ہے۔ ساتھ ہی سارے عیسائیوں اور غیر یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ اس کے بعد کافر (انیتی کرائست) اس علاقے کو فتح کر لیں گے اور مسح فتح پائے گا۔

Rapture کے زمانے میں سارے یہودی یا تو عیسائیت قبول کر لیں گے یا انہیں جلا دیا جائے گا۔ انہی نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے چند عیسائی لیڈر عراقی جنگ کو بڑھانے میں پیش پیش رہے ہیں اور بار بار اسرائیل کے دورے کرتے رہے ہیں۔ وہ اس کی مدد کیلئے اسے چند بھی دیتے رہے ہیں اور فلسطین علاقے کو نوآبادی بنانے کیلئے واشنگٹن میں لائگ کرتے رہے ہیں۔ یہ دلیل بازو کا مذہبی دباؤ تھا کہ امریکہ نے اسرائیلی بستیاں اور مغربی کنارے کے فلسطینی علاقے میں ہائی ویز کو قبول کر لیا۔ چند اسرائیلی لیڈروں نے یہودیوں کی آخری مصیبت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس امداد کو قبول کر لیا۔“ (ص ۱۱۲)

”گھر میں شہری حقوق کی اس فتح کے باوجود امریکے نے مشرق و سلطی اور دوسرے خطوں کی انتہائی خالماں حکومتوں کو قبول کیے رکھا اور ان کی مدد بھی کرتا رہا۔ حالانکہ حکومتیں اپنے شہریوں کے انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہی تھیں۔“ (ص ۱۱۵)

”گذشتہ چار سو رسوں میں ان حقوق کے تحفظ کیلئے ہمارے ملک کی پالیسیوں میں ڈرامائی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہمارے بیشتر شہریوں نے دہشت گردانہ حملوں کے خوف سے ان عدم انتیز پالیسیوں کو قبول کر لیا ہے۔ تاہم امریکی سماکھ کو ناقابل ملائفی نقصان پہنچا ہے۔ امریکہ، جسے پہلے انسانی حقوق کے ممتاز ترین چیزپہن کی حیثیت سے تقریباً آفاقی طور پر سراہا جاتا

تھا، اب جمہوری زندگی کے ان بنیادی اصولوں سے متعلق بین الاقوامی تنظیموں کی تنقید کا سب سے بڑا ہدف بن چکا ہے۔ نائن الیون کے حملے کے بعد امریکی حکومت نے غیر ضروری رد عمل ظاہر کرتے ہوئے پورے امریکہ میں ۱۲۰۰ سے زیادہ بے گناہ افراد کو گرفتار کروالیا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی پہلے کسی دہشت گردی سے مربوط جرم میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ ان کی شناخت راز میں رکھی گئی اور انہیں اپنے خلاف الزامات سننے یا قانونی مشاورت حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ گرفتار ہونے والے تقریباً سارے افراد عرب یا مسلمان تھے اور پیشتر کو امریکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ شہری آزادیوں کی ایسی پالیسیوں کو قانونی روپ دینے کیلئے ”پیٹریاٹ ایکٹ“ بہت جلدی میں منظور کیا گیا۔ (ص ۱۱۵)

”افغانستان اور عراق میں جنگلوں کے دوران بانج مردوں کے علاوہ بہت سے کم عمر افراد کو گرفتار کر کے گواستانا موبے (کیوبا) میں واقع ایک امریکی قید خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس قید خانے میں ۳۰۰ ملکوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۵۲۰ افراد کو قید میں رکھا گیا ہے۔ انہیں اس قید خانے میں تین سال کا عرصہ گزرا گیا ہے جبکہ نہ تو ان پر باقاعدہ کوئی الزام عائد کیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں قانونی مشاورت حاصل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ کئی امریکی اہلکاروں نے تصدیق کی ہے کہ ان قیدیوں پر جسمانی تشدد کیا جا رہا ہے۔“ (ص ۱۱۶)

”عراقی یہ چیز عیید حادم مہوش نے اپنے بیٹوں کو ڈھونڈنے کی کوشش میں بغداد میں امریکی افسروں کو رضا کارانہ طور پر گرفتاری دی، اسے گرفتار کر کے اس پر تشدد کیا گیا اور اسے ایک سبز سلیپنگ بیگ میں بند کر دیا گیا جس میں دم گھنے سے ۲۶ نومبر ۲۰۰۳ء کو مر گیا۔“ (ص ۱۹۹)

”اتی ہی پریشان کن وہ رپورٹیں ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ امریکی حکومت بعض دوسرے ملکوں کی حکومتوں کو دہشت گردی کو روکنے کیلئے جارحانہ پالیسیاں اپنانے پر اکسار ہی ہے۔ جس کے نتیجے میں جمہوری اصول اور قانون کی حکمرانی نظرے میں پڑ گئے ہیں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی بڑھ گئی ہے۔ امریکی پشت پناہی سے جابرانہ اقدامات کرنے والی حکومتوں کی کاروائیاں پیٹریاٹ ایکٹ کے تحت ہونے والی کاروائیوں سے بھی بڑھ گئی ہیں۔“ (ص ۱۲۰)

”جو کچھ ہو رہا ہے امریکی حکام کو اس کا علم تھا۔ ملکہ خارجہ شام میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے پہلے ہی بتاچا ہے کہ سابقہ قیدیوں اور حرast میں رکھے جانے والے افراد نے بتایا کہ قیدیوں پر تشدد کے طریقوں میں شامل ہے: بچل کے جھٹک لگانا، ناخن کھینچنا، مارنا بیٹنا، چھت سے لٹکانا، ریڑھ کی ہڈی کو بہت زیادہ کھینچنا، کرسی پر بٹھا کر پیچھے جھکانا جس سے قیدی کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے سرک جاتے ہیں۔“ (ص ۱۲۳)

”اس وقت دنیا بھر میں تقریباً 30,000 (تیس ہزار) ایٹھم بم امریکہ کے پاس ہیں۔ روس کے پاس سول ہزار، جیتن کے پاس چار سو، فرانس کے پاس ساڑھے تین سو، اسٹریلیا کے پاس دو سو، برطانیہ کے پاس ایک سو بیچا سی، اور ہندوستان اور پاکستان کے پاس چالیس چالیس ایٹھم بم ہیں۔ اس امر کا یقین کیا جاتا ہے کہ شمالی کوریا کے پاس اتنا یوکلیکٹر بیڈھن ہے جس سے نصف درجن ایٹھم بم بنائے جاسکتے ہیں۔“ (ص ۱۲۹)

”گذشتہ پچاس برسوں کے دوران ایٹھی اسلحہ پر کنٹرول کیلئے جتنے معابدوں پر مذاکرات کیے گئے ہیں امریکہ ان میں سے تقریباً تمام معابدوں کی خلاف ورزی کر چکا ہے، اور ایٹھی اسلحہ کے عالمگیر پھیلاو کا سب سے بڑا مجرم Prime

Culprit بن چکا ہے۔ سابق وزیر دفاع میکنامارے میں، جون ۲۰۰۵ء کے فارم افیئرز میں اپنے خدشات کا یوں افہماں کیا تھا کہ میں امریکہ کی موجودہ ایٹھی اسلحہ پالیسی کو غیر اخلاقی، غیر قانونی، فوجی اعتبار سے غیر ضروری اور ہولناک حد تک خطرناک سمجھتا ہوں۔“ (ص ۱۲۹)

”ایک اور تاریخی و بین الاقوامی عہد کو توڑ دیا گیا ہے۔ اور وہ عہد یہ تھا کہ موجودہ ایٹھی ہتھیاروں کی آزمائشیں نہ کی جائیں اور نئے ایٹھی ہتھیار نہ بنائے جائیں۔“ (ص ۱۳۵)

”اسرائیل کے ایٹھی ہتھیاروں کے کسی کنٹرول میں اور زیر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پڑوسی ملکوں ایران، شام، مصر اور دوسرے عرب ملکوں کے لیڈر ایٹھی ہتھیاروں کی مالک برادری میں شامل ہونے کا سوچ رہے ہیں۔“ (ص ۱۳۷)

”موجودہ امریکی پالیسی ان بین الاقوامی معابدوں کے مؤثر ہونے کیلئے خطرہ بن رہی ہے جن کیلئے تقریباً تمام سابق صدور نے جانشینی سے مذاکرات کیے تھے۔ عالمی اسٹھکام کو درپیش اس سے بھی ہر اخظرہ پیش بندی کیلئے کی جانے والی جنگ کی پالیسی ہے جس کی پہلی بھی مثال نہیں ملتی۔ یہ حالیہ فیصلہ نہ صرف امریکہ کی تاریخی پالیسیوں سے انحراف ہے بلکہ ان بین الاقوامی معابدوں کی خلاف ورزی بھی ہے جن کے احرام کا ہم وعدہ کر رکھے ہیں۔

”اقوام متحدہ کا دستور خود مختار قوموں کو اپنے افرادی اور اجتماعی دفاع کا حق دیتا ہے، لیکن صرف مسلح جملے کی صورت میں۔ ہمارے صدر نے ہمارے قریب تین اتحادیوں کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ امریکہ جنگ کو ”آخری چارہ کار“ کے طور پر درکرتے ہوئے فوجی حملوں میں پہلے کرے گا۔“ (ص ۱۳۰)

”دوسرے ملکوں کو ”بدی کا محور“ تصور دیتے ہوئے انہیں امکانی ہدف قرار دے دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی سفارتکاری کے ذریعے ان کے ساتھ اختلافات کو سلجھانے کے عمومی دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ۲۰۰۱ء کے دہشت گردانہ حملوں کے بعد ہمارے لیے ہر ملک نے جو تقریباً یک زبان ہو کر ہمدردی کا اظہار اور حمایت و امداد کا وعدہ کیا تھا، وہ ہماری اس پالیسی کے اپنانے سے ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم دہشت گردی کے خطرے کو مدد و اور کم کرنے کی اپنی طوبیل اور اہم ترین کوشش میں نسبتاً اکلیلے ہو گئے ہیں۔“ (ص ۱۳۱)

”ایک عیسائی اور بین الاقوامی بحران سے حد درجہ متاثر ہے جانے والے صدر کی حیثیت سے میں ایک منصفانہ جنگ کے اصولوں سے پوری طرح واقف ہوں۔ اور یہ بات واضح ہے کہ عراق پر یک طرفہ حملہ ان معیارات پر پورا نہیں اترتا۔“ (ص ۱۳۳)

”ہم اور ہمارے اتحادی برطانوی فیصلہ کر رکھے ہیں کہ سویلین ہلاکتوں کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ حقیقی اور مطبوعہ اعداد و شمار میں بہت فرق ہے۔ برطانیہ کے ایک مؤقر جریدے لینسٹ Lancet نے روپرٹ دی ہے کہ اتحادی فوجیوں (خصوصاً ایئر فورس) نے ایک لاکھ غیر فوجی عراقوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ امریکی سرکاری ذرائع نے صرف چوبیں ہزار کا تخمینہ لگایا ہے۔ لیجنی صرف انہی ہلاکتوں تک محدود رکھا ہے جن کی خبریں مغربی ذرائع ابلاغ دے رکھے ہیں، اصل تعداد ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔“ (ص ۱۳۷)

”ہماری حکومت کا ایک سب سے زیادہ عجیب فیصلہ امریکیوں کے جانی نقصان سے عوام کو لا علم رکھنا ہے۔ ہمارے لیڈر شاہزادی زخمیوں کا ذکر کرتے یا ان کی عیادت کرنے جاتے ہیں۔ اور ڈوور ایئر فورس میں ڈیلویئر کے مضافاتی قبرستان میں پہنچائے جانے والے تابوتوں کے بارے میں عوام کو خبر نہ ملنے دینے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ہلاک ہونے والے فوجی جوانوں کی ماوں اور بیویوں کی جانب سے مقدمات دائر کیے جا چکے ہیں جنہیں ڈوور یا دوسرا فوجی اڈوں پر اپنے پیاروں کی لاشیں دیکھنے نہیں دی گئیں۔“ (ص ۱۳۶)

”جب امریکہ نے ۲۰۰۵ء کے شروع میں عراق میں جمہوریت کی طرف پہلا قدم اٹھایا تو شیعہ اور کردوں نے سنی منحرفین اور دہشت گرد گروپوں کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود جرأت اور آزادی کے ساتھ وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی تعداد میں ووٹ ڈالے۔ اگلے مراحل یعنی آئین کو تحریر کرنے اور پھر ایک نمائندہ حکومت تشکیل دینے کے حوالے سے میں اس وقت یہ کتاب لکھتے ہوئے تو کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتا، تاہم اس حوالے سے بہت زیادہ تشویش پائی جاتی ہے کہ سنی تعاون کریں گے یا نہیں، اور یہ کہ سنی قوانین کتنے غالب ہوں گے؟“

حکمران شیعہ جماعتیں مطالہ کر رہی ہیں کہ شادی، طلاق اور وراثت کے معاملات میں شریعت کو اعلیٰ احتارثی ہونا چاہیے۔ اگر عورتوں کے حقوق، جو کہ صدر صدام حسین کے دور میں محفوظ تھے، امریکہ کی سرپرستی اور حفاظت میں قائم ہونے والی نئی جمہوری حکومت کے دور میں ختم ہو جائیں گے تو یہ ستم طریقی ہوگی۔“ (ص ۱۳۹)

”ایک بنیادی سوال جو آخری حاصل Final outcome کا تعین کرے گا، یہ ہے کہ کیا امریکی لیڈر عراق میں مستقل فوجی اڈوں کے قیام اور میഷٹ پر غلبہ پانے پر اصرار کریں گے، یا یہ واضح کریں گے کہ ہم نے اپنے فائدے کیلئے مستقل موجودگی کو برقرار رکھنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہوا؟ ہماری قوم ہمیں درپیش یہیں ایں الاقوامی چیلنجوں کا بنیادی جواب دینے کے معاملے پر واضح طور پر تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ بات تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ امریکی سر زمین کبھی مکمل طور پر محفوظ نہیں ہوگی۔ امریکہ کو ایسی نسبتاً کمزور تنظیموں کی طرف سے دہشت گردی کا خطرا رہے گا جو امریکہ کی بے پناہ فوجی قوت کے کسی بھی پہلوکو چیخ کرنے کی امید نہیں کر سکتیں۔ ہمارا بہترین جواب کیا ہے؟ کیا انسانی حقوق کے تاریخی چینیپن کا کردار ادا کرنا ہمارے لیے بہتر ہے، یا خطروں کا جواب دینے کیلئے اپنے اعلیٰ ملکی اور یہیں الاقوامی معیارات کو ترک کر دینا؟“ (ص ۱۵۱)

”اس وقت امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ ماحولیاتی آلودگی پھیلانے والا ملک ہے۔ ہماری حکومت کی طرف سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے انکار عالمی ماحول کے تحفظ کے دو جماعتی تاریخی وعدوں سے انحراف کے سلسلے کی محض ایک اور المناک کڑی ہے۔ خداوند کی دنیا کا تحفظ ہماری ایک ذاتی، سیاسی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔“ (ص ۱۲۷)

”یہ بات فخر کیے جانے کے قابل ہے کہ امریکہ میں اوسط خاندان کی سالانہ آمدنی پچھن ہزار ڈالر ہے، لیکن ہمیں ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے آدھے سے زیادہ لوگ ڈالر روزانہ سے بھی کم پر زندہ ہیں، جبکہ ایک ارب بیس کروڑ لوگوں کو صرف ایک ڈالر روزانہ پر گزار کرنا پڑتا ہے۔ صرف لمحہ بھر کیلئے تصور کریں کہ ہمیں ایک ڈالر روزانہ پر گزار کرنا ہو تو کیا ہو گا؟ صرف ایک ڈالر کھانے کے لیے، رہائش کیلئے اور لباس کے لیے۔ واضح بات ہے کہ حفاظان صحت اور تعلیم کیلئے

کچھ نہیں بچے گا اور ہماری عزت نفس اور روشن مستقبل کی امید کا باقی رکھنا تو مشکل ہو گا۔” (ص ۱۷۷)

”ہمارا پورا معاشرہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تقسیم کالے، گورے یا ہسپانوی کے درمیان ہو، بلکہ یہ تقسیم امیر اور غریب کے درمیان ہے۔ ہم میں سے بے شمار لوگوں کو تو کسی ایک غریب سے بھی واقفیت نہیں ہے۔“ (ص ۱۷۰)

یہ سابق امریکی صدر ججی کارٹر کی کتاب ”امریکہ کا اخلاقی بحران“ کے چند اقتباسات ہیں۔ جونہ صرف گذشتہ ربع صدی کے دوران امریکی پالیسیوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں، بلکہ امریکی قوم کی اجتماعی نسبیات کا بھی اس سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور عالم اسلام اور مغرب کے درمیان اس وقت جو کشمکش جاری ہے اس کا ایک مجموعی منظر بھی رنگا ہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکی قوم نے چرچ اور ریاست کی علیحدگی اور آسمانی تعلیمات سے لاطلاق جمہوریت اور سیکولر ایڈم کے فلسفے کے ساتھ جس قومی سفر کا باب سے کم و بیش اڑھائی سو برس قبل آغاز کیا تھا، اسے نہ صرف بریک لگ چکی ہے بلکہ ”ریورس گیر“ کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ بات ہمارے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے والوں کیلئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خدا کرے کہ ہم تاریخ کے اس نئے موڑ کا بروقت اور صحیح اور اک کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

## حدود آرڈیننس کا قضیہ

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۶ء

حدود شرعیہ کا نفاذ ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور مسلم معاشرہ میں جرائم کا تعین اور روک تھام انہی حدود کے حوالے سے ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے دینی حلقوں کا یہ مطالبہ چلا آ رہا تھا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلامی قوانین و احکام کے نفاذ کے ساتھ ساتھ معاشرتی جرائم کی روک تھام کیلئے ان شرعی حدود کا نفاذ بھی عمل میں لایا جائے جو قرآن و سنت میں بعض علیین جرائم کیلئے معین صورت میں بیان کی گئی ہیں، مگر اس کی نوبت اس وقت آئی جب ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں عوام کی بے پناہ قربانیوں کے بعد جنگل محمد ضیاء الحق مرحوم کی حکومت نے اس سمت میں پیش رفت کی اور پاکستان قومی اتحاد کی معاونت سے دیگر چند شرعی آئینی اقدامات کے علاوہ حدود آرڈیننس کے عنوان سے شرعی سزاوں اور حدود کے نفاذ کا بھی اعلان کیا گیا۔

حدود آرڈیننس کے نفاذ کو بع صدی سے زیادہ عرصہ گز چکا ہے، مگر ان پر عمل درآمد کی کوئی ایسی خوشنگوار صورت حال اب تک سامنے نہیں آئی ہے حدود شرعیہ کے مؤثر نفاذ سے تعبیر کیا جاستا ہوا اور نہ ہی معاشرہ میں جرائم کی اور ان پر کنٹرول کا مقصد حاصل ہو سکا ہے، حالانکہ بھی حدود شرعیہ سعودی عرب میں نافذ ہیں اور جرائم پر مؤثر نشرون کا ذریعہ ثابت ہوئی ہیں اور انہی حدود شرعیہ کے ذریعے سے افغانستان میں طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں اپنی حدود کا ریاست ہوئی ہیں اور انہی حدود شرعیہ کے ذریعے سے افغانستان میں طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں اپنی حدود کا ریاست ہوئی ہیں اور ایسا نقشہ پیش کیا تھا جس کا طالبان کے شدید ترین مخالف بھی اعتراض کرتے ہیں اور متعدد ہیں

الاقوای اداروں کی روپروٹوں میں اسے تسلیم کیا گیا ہے، لیکن پاکستان میں حدود شرعیہ کا قانونی نفاذ ان مقاصد و نتائج کا ذریعہ انہی تک نہیں بن سکا جو مقاصد و اہداف اسی دور میں افغانستان اور سعودی عرب میں عملًا حاصل ہو چکے ہیں، جبکہ اس کے برعکس حدود آرڈیننس کے خلاف بین الاقوای اور ملکی سطح پر بایگنڈ اور لائینگ کی ہم ایک عرصہ سے جاری ہے اور حکومت پاکستان پر مختلف اطراف سے دباؤ والا جارہا ہے کہ ان قوانین کو سرے سے ختم کر دیا جائے یا کم از کم ان میں ایسی ترمیم کر دی جائیں جن سے اس کی برائے نام بھی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔

----

## غلامی آج کے دور میں

مابنا مame الشریعہ، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۶ء

اس طرح کے بیسیوں واقعات اور روایات پیش کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان غلاموں اور لوڈیوں کو اس طرح زندگی کی سہولتوں سے بہرہ ور کیا، ان کیلئے علم کے دروازے کھولے اور انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھنے کے موقع فراہم کیے، حتیٰ کہ خاندانِ غلاموں کے حکمرانوں کی ایک پوری تاریخ ہے اور علم و فضل اور حکمت و انش کے ساتھ ساتھ دولت و اقتدار میں وافر حصہ لینے والے مسلم مشاہیر کی تاریخ مرتب کی جائے تو ایسے غلاموں کی ایک بڑی فہرست سامنے آئے گی جن کیلئے یہ غلامی ہی ان سعادتوں کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود جتنی قیدیوں کو غلام بنا نے کی یہ بات بہ طور حکم کے نہیں بلکہ مختلف آپشوں میں سے ایک آپشن کے طور پر تھی اور میری طالب علمانہ رائے کے مطابق اسے برقرار رکھنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں باقاعدہ قید خانے اس انداز سے نہیں ہوتے تھے کہ ان میں ہزاروں افراد کو منظم طور پر سالہ سال تک قیدی میں رکھا جائیتا، اس لیے جن قیدیوں کو قید میں رکھنا ضروری ہوتا تھا، ان کیلئے عملی صورت یہی ممکن تھی کہ انہیں تقسیم کر دیا جائے اور وہ ریاست کے قیدی بننے کے بجائے افراد اور خاندانوں کے قیدی رہیں۔

جن لوگوں نے زندگی بھر قید میں رہنا ہے، خود ان کیلئے بھی بہتر صورت یہ تھی کہ انہیں قید خانوں میں ڈالنے کے بجائے افراد اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہ قیدی ہونے کے باوجود زندگی کی مناسب سہولتوں اور حقوق سے کسی حد تک بہرہ ور ہو سکیں۔ اس کی عملی شکل آج کے دور میں دیکھنی ہو تو جیل خانوں میں بند قیدیوں اور اچھا کردار رکھنے والے قیدیوں کو بیرون پر مختلف خاندانوں میں نیم قیدیوں کی صورت میں تقسیم کیے جانے والے قیدیوں کا موازنہ کر لیا جائے، یہ بات واضح ہو جائے گی کہ خود ان قیدیوں کیلئے بہتر صورت کون ہی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ اعتراض قیدی خواتین کے ساتھ جنسی تعلق کو روا قرار دیے جانے پر کیا جاتا ہے، لیکن اس حوالے سے دیکھا جائے کہ ایک ایسی خاتون جس کی واپسی کے اس دور میں تمام راستے مسدود تھے اور اس نے عمر بھر

قیدی ہی رہنا تھا، اس کیلئے ایک عورت کے طور پر کیا صورت مناسب اور بہتر نہیں۔ اسلام نے اس زمانے کے عالمی عرف کے مطابق اس کو ایک آپشن کے طور پر قبول کیا، لیکن اس کے ساتھ حقوق و مفادات کا ایک ایسا نظام بھی قانونی طور پر قائم کر دیا کہ اس جنسی تعلق اور اولاد کی صورت میں وہ عورت آزادی اور دیگر حقوق کی سختی بھی قرار پاتی ہے۔

چنانچہ میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ اسلام نے غلام اور لوڈنی بنا نے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس دور کے عالمی عرف کے مطابق اسے جتنی قیدیوں کیلئے ایک آپشن کے طور پر قرار رکھتے ہوئے اس کی اصلاح اور بہتری کیلئے احکام و قوانین کا ایک پورا نظام فراہم کر دیا جیسا کہ آج کے عالمی عرف کے مطابق جتنی قیدیوں کے بارے میں جنیو انونشن کو عالم اسلام نے بھی قبول کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان و فلسطین سمیت جن مقامات پر جہاد کے عنوان سے جنگیں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں، وہاں مجاہدین نے کسی قیدی کو غلام یا لوڈنی کا درج نہیں دیا اور انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دیے جانے والے مجاہدین نے بھی جتنی قیدیوں کے بارے میں عالمی عرف اور قوانین کا عملًا احترام کیا ہے۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر کسی دور میں یہ عالمی عرف بھی تبدیل ہو گیا اور پہلے کی طرح کے حالات دوبارہ پیدا ہو گئے تو اسلام کا یہ آپشن بطور آپشن کے باقی رہے گا اور اس سلسلے میں قرآن و سنت اور فقة اسلامی کے احکام دوبارہ نافذ العمل ہو جائیں گے۔

اس لیے محترم آصف محمود ایڈوکیٹ اور دیگر دوستوں سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ اسلام کے کسی حکم یا قانون کے بارے میں مغربی پر ایگینٹ دے متاثر ہو کر استہزا اور نظر کا لجہ اختیار کرنے کے بجائے اس کے پس منظر سے واقفیت حاصل کریں اور اسلامی احکام کو مغربی فلسفہ و ثقافت اور مغربی معاشرہ کے معروفی تناظر پر پر کھنے کے بجائے ان کے حقیقی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ولیثرن سوسائٹی کو تہذیب و ثقافت اور سولائزیشن کا حقیقی معیار تصور نہ کیا جائے اور اسلامی قوانین و احکام کو انسانی سوسائٹی کے حقیقی مسائل اور ضروریات کے حوالے سے دیکھا جائے تو قرآن و سنت کا کوئی بھی حکم ناقابل فہم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا صحیح شعور عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

## حدود آرڈیننس: ایک اعتراض کا ازالہ

۶ دسمبر ۲۰۰۶ء کو بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے عمر بن الخطاب بال میں جمیعت طلباء اسلام کے زیر ابتمام ایک نشست سے خطاب کا کچھ حصہ

ایک اعتراض یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے وقت یہ کہا جا رہا تھا کہ اس سے جرائم کثروں ہوں گے اور معاشرہ میں امن قائم ہو گا لیکن عملًا ایسا نہیں ہوا بلکہ حدود کے نفاذ کے بعد جرائم میں اضافہ ہوا ہے اور قانون شکنی کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے۔ اس معروفی حقیقت سے انکار ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی کسی باشور شخص کو معروفی حقائق سے انکار کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ہمارے معاشرے میں جرائم کثروں نہیں ہوئے بلکہ ان میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے اسباب کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔

اس لیے کہ آج کے دور میں ہمارے سامنے یہی قوانین سعودی عرب جرائم میں کثروں کرنے کا ذریعہ بنے ہیں اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے۔ جو حضرات اب سے پون صدی قبل کے سعودی معاشرہ کی صورت حال سے آگاہ ہیں، وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ سعودی عرب کے قیام سے قبل حجاز مقدس میں چوری، قتل، ڈاک اور دوسرا جرائم اس قدر عام تھے کہ حج بیت اللہ کیلئے جانے والے لوگ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے بلکہ اس کا ناشانہ زیادہ تر وہی بتتے تھے، لیکن شاہ عبدالعزیز آل سعود مرحوم نے سعودی عرب کے قیام کے بعد اس کا اقتدار سنجا لئے ہی شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا اور ان پر مؤثر عملدرآمد کا اہتمام کیا تو ہاں جرائم پر نہ صرف یہ کثروں حاصل ہوا بلکہ جرائم کی شرح کے حوالے سے سعودی عرب کو آج بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی آج کے دور کی ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ ہمارے پڑو سی افغانستان میں جب طالبان نے زام اقتدار سنجا لی اور شرعی قوانین کے نفاذ کا اہتمام کیا تو ان کے پائیں سالہ دور میں ان کے دائرہ اختیار میں جرائم کثروں ہوئے جنے بین الاقوامی حلقوں میں تسلیم کیا گیا، حتیٰ کہ ”لارڈ زوار“ کے خاتمه اور پوست کی کاشت پر پابندی کے حوالے سے طالبان حکومت کی کامیابی کا عالمی اداروں کی باقاعدہ رپورٹوں میں کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ قوانین اگر سعودی عرب میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور افغانستان میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو پاکستان میں ان کے غیر مؤثر ہونے کی وجہ کہیں اور تلاش کرنی پڑے گی، اس لیے کہ ایک بیج اگر ایک زمین میں پھل دیتا ہے، دوسری زمین میں بھی پھل دیتا ہے لیکن تیسرا زمین میں پھل نہیں دیتا تو قصور بیج کا نہیں گنا جائے گا بلکہ یہ کھا جائے گا کہ یا تو زمین درست نہیں ہے یا اس میں بیج ڈال کر پانی، کھاد اور گودی کا اہتمام کرنے والوں کے عمل میں کوتاہی ہے۔

ہمارے خیال میں فرق کا حاصل نکلتا یہ ہے کہ سعودی عرب نے حدود شرعیہ نافذ کر کے ان پر عملدرآمد کیلئے قضا کا شرعی نظام فراہم کیا، اس لیے یہ قوانین کامیاب ہوئے۔ طالبان نے بھی افغانستان میں صرف حدود شرعیہ کے نفاذ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان قوانین پر مؤثر عملدرآمد کیلئے قضاۓ شرعی کا مدارتی نظام بھی قائم کیا جس کی وجہ سے وہ ان قوانین کے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر ہم نے یہ کیا کہ قوانین تو شریعت اسلامیہ کے نافذ کیے، مگر عدالتی سسٹم وہی پر ان برطانوی نوآبادیاتی دور کا باقی رکھا اور حدود قوانین کو اس سسٹم کے حوالہ کر دیا، جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ میں اس کی مثال یوں دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ہندو اکار کے انجھی میں سوزوکی کا گیر بکس فٹ کر دیا جائے یا چاول چھڑنے والی مشین سے گندم پینتے کا کام لیا جائے۔ ہمارے ہاں اگر حدود قوانین مؤثر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ قوانین نہیں بلکہ عدالتی سسٹم ہے جسے تبدیل کیے بغیر کسی بھی اسلامی قانون کے مؤثر نفاذ کا مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

## صدر پرویز مشرف کے دس سوالات کا جائزہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- جنوری ۲۰۰۷ء

اس کے بعد صدر محترم کے خطاب کے حوالے سے پہلے مرحلہ میں ان کے ان دس سوالات پر ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے خطاب کے دوران "انہیا پسندوں" سے کیے ہیں اور ایک قومی روزنامہ نے انہیں "صدر پرویز کے انہیا پسندوں سے دس سوالات" کے عنوان سے ترتیب وار شائع کیا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ "ہزاروں پاکستانیوں کو گراہ کر کے افغانستان میں مروانے کا ذمہ دار کون ہے؟"

ہمیں صدر محترم کی اس بات سے اتفاق ہے کہ افغانستان کی سر زمین پر ہزاروں پاکستانی جاں بحق ہوئے ہیں البتہ اس عمل کا دورانیہ ہمارے نزدیک گذشتہ پندرہ سال پر محيط ہے۔ پاکستانیوں کو صدر پرویز مشرف کے بقول "گراہ کر کے" افغانستان لے جانے اور وہاں مرادی نے عمل گذشتہ پندرہ سال سے جاری ہے۔ یہ عمل اس وقت شروع ہوا تھا جب افغانستان میں سوویت یونین نے فوجیں اتاری تھیں اور افغان علماء اور عوام نے روی افواج کی آمد کو اپنے ملک کی آزادی اور قومی خود مختاری کے خلاف جملہ تصور کرتے ہوئے مراجحت شروع کی تھی اور جہاد کا فتنی دے کر گوریلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا، اس وقت پاکستان کے دینی حلقوں نے اس جدوجہد میں افغان عوام کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور ہزاروں پاکستانی وہاں جا کر اس عسکری مراجحت میں شریک ہوتے تھے جن میں میکٹروں بلکہ ہزاروں نے جام شہادت بھی نوش کیا تھا۔ اس وقت پاکستان کی حکومت، فوج اور امریکہ سمیت تمام مغربی ممالک پاکستانیوں کے افغانستان جا کر روس کے خلاف لڑنے کو "گراہ کر کے افغانستان میں مروانے" کا عمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے "جہاد" کہا جاتا تھا۔ امریکہ اسے سپورٹ کر رہا تھا، دنیا بھر کی مسلمان حکومیں اس کی حمایت کرتیں تھیں، پاک فوج اور آئی ایس آئی اس جہاد کی پشت پر تھیں اور روی فوجوں کے خلاف افغان عوام کی اس عسکری جدوجہد میں "دہشت گردی" کے جراہم کا کوئی سرانجام نہیں پایا جاتا تھا۔

اس لیے جو لوگ پاکستانیوں کو افغانستان لے جا کر روس کے خلاف مرواتے تھے وہ امریکہ کے خلاف جنگ میں پاکستانیوں کو وہاں لے جانے کو بھی جہاد سمجھتے رہے، انہیں استعمالی مقاصد کے حوالے سے روس اور امریکہ میں کوئی فرق دلکھائی نہیں دیا اور وہ اپنی اسی پالیسی کے تسلسل پر قائم رہے۔ وہ دراصل یہ فرق نہیں سمجھ پائے کہ روس کے خلاف لڑنا "جہاد" اور اس میں مرنا "شہادت" ہے جبکہ امریکہ کے خلاف لڑنا "دہشت گردی" اور اس میں جان دینا "مردادیا" ہوتا ہے۔ اس لیے صدر کو اس سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے ان عوامل کو تلاش کرنا چاہیے جو پاکستان کے دینی حلقوں کا صدر پرویز مشرف کے بقول انہیا پسندوں کیلئے اس جہاد اور دہشت گردی کے درمیان فرق کا صحیح دراک کرنے میں رکاوٹ بننے ہیں۔

جزل پرویز مشرف کا دوسرا سوال ہے کہ "کیا پاکستان کو نظریاتی اسٹیٹ بنانا چاہیے؟"

صدر محترم سے گزارش ہے کہ ”بنا ناچا ہیے“ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور اس کا مطلب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید صدر پرویز مشرف پاکستان کے بارے میں ازسرنوفیصلہ کرنے جا رہے ہیں کہ اسے نظریاتی ریاست ہونا چاہیے یا سیکولر اسٹیٹ بنانیا چاہیے؟ حالانکہ یہ فیصلہ پاکستان بننے سے پہلے ہو چکا تھا اور فیصلہ کرنے والے خود قائد عظم محمد علی جناح تھے جنہوں نے اس خطہ کے کروڑوں مسلمانوں کی حمایت سے اعلان کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گا اور اس کا دستور قرآن و سنت کے مطابق ہو گا۔ پھر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے ”قرارداد مقاصد“ کی صورت میں پاکستان کی نظریاتی حیثیت کا واضح طور پر تعین کر دیا تھا، اس کے بعد اس مسئلہ کو ”ری اوپن“ کرنا پاکستان کے قیام کے نظریاتی اور اخلاقی جواز کو چلتھ کرنا ہے اور قیام پاکستان کو جائز، اصولی اور منطقی سمجھنے والے کسی شخص سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتے۔

جزل پرویز مشرف نے تیرساوال یہ کیا ہے کہ ”کیا مذہبی تعلیم حکومت چلانے کیلئے کافی ہے؟“

جناب صدر کی خدمت میں عرض ہے کہ اس بات کا احتجاج کسی نے بھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی عقل و دانش سے بہر و شخص ایسا کر سکتا ہے، اس سلسلہ میں صدر صاحب نے دینی مدارس سے جو شکایات کی ہیں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں اور بے محل ہیں کیونکہ دینی مدارس تو صرف مساجد و مدارس کیلئے امام، قاری اور استاذ مہمیا کرنے کی ذمہ داری نجماہ رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ وہ اس شعبہ میں رجال کار فراہم کرنے کا کام صحیح طریقہ سے جاری رکھ سکیں۔ مگر صدر صاحب کا اصرار ہے کہ ایک مسجد میں امام بخشنے کیلئے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ امام مسجد کو سانس دان اور انحصار بھی ہونا چاہیے اور کسی مدرسہ میں قرآن پاک پڑھانے والے کو قاری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی بنانا چاہیے۔ ورنہ اگر اسی سوال کو اصل تناظر میں دیکھا جائے تو وہ اس طرح بتاتے ہے کہ جو کچھ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جا رہا ہے کیا یہ تعلیم ایک اسلامی فلاحی ریاست کا نظام چلانے کیلئے کافی ہے؟

صدر محترم کا چوتھا سوال ہے کہ ”کیا آپ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک و یلفیزی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں؟“

جناب صدر! ہم بلاشبہ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک و یلفیزی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کیلئے پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان در لذیذیک، آئی ایف اور مغربی حکومتوں کی پالیسیوں کی تابعداری کر کے کبھی ترقی پسند اسلامک و یلفیزی اسٹیٹ نہیں بن سکتا، اس کیلئے خلفاء راشدین کے طرز حکومت اور نظام حکومت کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اور صدر پرویز مشرف اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں جس روز انہوں نے حضرت ابوکبر اور حضرت عمرؓ کے نظام حکومت اور ریاتی ڈھانچے کو پاکستان میں عملی طور پر اپنانے کا فیصلہ کیا امریکی بمبار طیاروں کا رخ ان کی طرف بھی اسی طرح ہو جائے گا جس طرح اسی ”جرم“ میں ملا محمد عمر کو امریکی بمباری کا شانہ بننا پڑا ہے۔

صدر محترم کا پانچواں اور چھٹا سوال یہ ہے کہ ”کیا مذہبی انتہا پسندوں نے افغانستان کی بھلائی کا سوچا ہے؟ کیا پیسے جمع کر کے افغانستان کی تعمیر نو کا سوچا ہے؟“

میرے خیال میں صدر محترم کو حقائق سے اس حد تک چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے ورنہ دیگر سینکڑوں اداروں اور ہزاروں اصحاب خیر کے علاوہ ”امہ تعمیر نو“ اور ”الرشید ٹرست“ نے افغانستان کے مفاکوں الحال عوام کی امداد اور افغانستان کی تعمیر نو کیلئے جو مسلسل خدمات سر انجام دی ہیں ان سے صدر پرویز یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے، لیکن چونکہ

امریکہ بہادر نے ان رفاقتی اور تعمیری اداروں کو بھی دہشت گرد قرار دے دیا ہے اس لیے ہمارے صدر محترم کو ان کی خدمات ہی سرے سے دکھائی نہیں دے رہیں۔

صدر محترم کا ساتواں سوال ہے کہ ”کیا اسلام توڑ پھوڑ، نفرتیں بچیلانے کا کام سکھاتا ہے؟“

یقیناً اسلام توڑ پھوڑ اور نفرتوں کا سبق نہیں دیتا اور اگر کہیں اسلام کے حوالے سے ایسا ہو رہا ہے تو وہ بلاشبہ غلط ہے، لیکن پاکستان میں تو میتوں اور زبانوں کے عنوان سے جو نفرتیں موجود ہیں اور ان کیلئے جو قتل و قتال سالہا سال سے جاری ہے انہیں صدر پرویز مشرف کس کھاتے میں ڈالیں گے اور ان کے بارے میں کچھ کہنا انہوں نے کیوں ضروری نہیں سمجھا؟ صدر محترم کا آٹھواں اور نوٹھواں سوال یہ ہے کہ ”کیا ہم حضورؐ کی مثال بھول گئے ہیں انہوں نے اپنی مثال سے اسلام پھیلایا تھا؟“

بالکل درست ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین نے دین پھیلانے اور اسلام کی دعوت دینے میں بھی جرسے کام نہیں لیا اور نہ اس کی اجازت دی ہے، بلکہ اخلاق برتری اور اصلاحی عمل کے ذریعے اسلام کی دعوت کو عام کیا ہے، لیکن اگر کسی مقام پر کفر و ظلم کے کسی گروہ نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہاں جناب نبی اکرم صرف اخلاق کے ساتھ کافروں کے سامنے نہیں آئے بلکہ توارہ تھیں میں لے کر ان کا مقابلہ کیا ہے اور کافر دشمن کے ساتھ رسول اللہ اور بزرگان دین نے کبھی نرمی کا معاملہ نہیں فرمایا۔

صدر محترم کا آخری اور دسوال یہ ہے کہ ”کیا جہالت، پسمندگی اور بھوک کے خلاف جہاد کا سوچا ہے؟“

صدر جزل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دینی مدارس کسی قسم کی سرکاری امداد کے بغیر لاکھوں نادار بچوں کو خوراک اور ہائیل کی بلا معاوضہ سہولتیں فراہم کر رہے رہیں اور انہیں مفت تعلیم بھی دے رہے ہیں، اور خود صدر کے قبول یہ کام کوئی بڑی سے بڑی این جی اوز بھی نہیں کر سکتی، تو محمد و دترین وسائل رکھنے والے دینی مدارس سے وہ بھوک اور جہالت کے خلاف اس کے علاوہ اور کون سے جہاد کی توقع کر رہے ہیں؟

## مذہبی انتہا پسندی کے اسباب اور اس کا علاج

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۰ جنوری ۲۰۰۴ء

ابراهیم کیونٹی کالج لندن نے میری پاکستان واپسی سے ایک روز قبل لندن کے علماء کرام اور طلبہ کیلئے ”حقوق نسوان اور اسلامی تعلیمات“ کے عنوان پر ایک فکری نشست کا منگل کی شب اہتمام کر رکھا ہے، جبکہ صدر مرزا صاحب نے ٹوپنگ پولیس کے سٹی چیف مارکس بیل کے ساتھ میری تفصیلی ملاقات کا پروگرام بنالیا۔ موصوف میری قیام گاہ جامعۃ الہدی ٹوپنگ میں تشریف لائے اور مختلف مسائل پر ہمارے درمیان کم و بیش اڑھائی گھنٹے تک گفتگو ہوئی جس میں صدر مرزا اور جامعۃ الہدی ٹوپنگ کے پرنسپل مولانا رضا العلیح سیاکھوی بھی شریک تھے۔ ساری گفتگو کا احاطہ تو اس کا لمب ممکن

نہیں ہے، البتہ دو تین زیادہ اہم امور کا تنگرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

برطانیہ کی انتظامیہ کا مسلمانوں کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ یہاں کے مسلم نوجوانوں کے جنبات اور مبینہ طور پر ان کی انتہا پسندی کو نظر والیں میں رکھنا ہے، تاکہ انتظامی مسائل پیدا نہ ہوں اور اس سلسلے میں مشکلات کم ہوں۔ آج جبکہ میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، میرے سامنے لندن میں شائع ہونے والا ایک اردو اخبار پڑا ہے جس کی اہم خبر یہ ہے کہ برطانوی حکومت لوکل اتحار ٹیز کو پانچ ملین پونڈ اس مقصد کیلئے دے رہی ہے کہ وہ نوجوان مسلمانوں کو انتہا پسندی کی طرف جانے سے روکیں۔ یہ رقم انتہا پسند مسلمان گروپوں کی نشاندہی کر کے ان پر خرچ کی جائے گی، جبکہ لوگن گورنمنٹ کے عملے سے کہا جائے گا کہ وہ دہشت گردی کے خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے پولیس کو معلومات فراہم کریں۔ خبر کے مطابق کمیونیٹیز معاملات کے وزیر و تھکنیل نے کہا ہے کہ لوکل اتحار ٹیز کو اس پیشگوئی کا مقابلہ کرنے کیلئے سامنے آنا ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ لوکل کمیونیٹیز کا دلوں اور دماغوں کی جنگ جتنے میں اہم کردار ہے اور فنڈ سے ان کی مقامی سطح کی مہارت کو فروغ دلے گا۔

تو گھم سٹی پولیس کے چیف کی گفتگو کا سب سے اہم نکتہ بھی یہی تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو انتہا پسندی کی طرف جانے سے کیسے روکا جاسکتا ہے اور ہم اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جس چیز کو انتہا پسندی قرار دیا جا رہا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اشتعال کا سبب بنتی ہے اور اس سے معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، ہمیں اس کے اسباب کا جائزہ لینا ہو گا۔ یہ مبینہ انتہا پسندی دو وجہ سے پیدا ہوتی ہے:

1. ایک یہ کہ دنیا میں کسی جگہ بھی مغربی ممالک کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا تاثر پیدا ہوتا ہے تو اس کا رد عمل ایک فطری عمل ہے جسے سب دور کیے بغیر روکنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس وقت حالیہ تناظر میں عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرز عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانبدار م'Brien کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس لیے مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا رد عمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔

2. دوسری وجہ آج کا میڈیا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی واقعہ رومنا ہوتا ہے تو اس کی خبر آناؤپری دنیا میں پھیل جاتی ہے، اور صرف خبر ہی نہیں، بلکہ اس پر ثابت اور منقی دونوں قسم کے تبصرے اور تجزیے بھی خبر کے ساتھ ہی ذہنوں میں منتقل ہو جاتے ہیں جس سے رد عمل میں بھی ”فوری پن“ آ جاتا ہے اور اس کے اظہار میں رکاوٹ پیدا کرنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔

اس پس منظر میں آج کے ولڈ میڈیا کی کھلی فضائیں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں رد عمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جاسکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی تذمیر لگائی جا سکتی ہے۔ البتہ اس رد عمل کے اظہار کو مناسب حدود کا پابند ضروری کیا جاسکتا

ہے۔ مثلاً برطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشمیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر رد عمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے رد عمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریحًا زیادتی اور نا انصافی کی بات ہو گی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جذبات اور رد عمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاسداری کریں اور اپنی حکومت اور مسلمان بھائیوں کیلئے مشکلات پیدا نہ کریں۔ لوگوں کے پولیس چیف سے میں نے کہا کہ یہودی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر وہ فلسطین میں یہودیوں کے ساتھ ہونے والے کسی معاملے کو نا انصافی اور زیادتی تصور کرتے ہیں تو اس پر امریکہ اور برطانیہ سمیت مختلف ملکوں میں اپنے جذبات اور رد عمل کا اظہار کرتے ہیں، البتہ ان ممالک کے قانون اور حالات کو بھی پیش نظر کھتے ہیں۔ ہم اپنے مسلمان نوجوانوں سے یہی بات کہتے ہیں اور اسی کو درست سمجھتے ہیں۔

پولیس چیف نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مسلمان نوجوانوں میں جذباتی رد عمل کی سب سے بڑی وجہ مغربی ممالک کی ”فارن پالیسی“ کو قرار دیا جاتا ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس کا ایک بڑا سبب میدیا بھی ہے، اس لیے کہ میدیا کو کمیونٹی یا حکومت کی مشکلات سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کی ترجیحات میں سب سے پہلا نمبر خبریت اور تجسس کو حاصل ہے، لیکن یہ دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ ہمارا کام تو امن و امان قائم رکھنا اور سوسائٹی میں کسی قسم کی کشیدگی کو جنم لینے سے روکنا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ زمینی حقوق کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم کمیونٹی کے رہنماؤں اور مذہبی اداروں سے اس سلسلے میں تعاون چاہیں گے تو آپ کو مطلوبہ تعاون ضرور ملے گا اور ہم بھی آپ سے بھروسہ تعاون کریں گے۔

مارکس بیل کا دوسرا ہم سوال منشیات کے بارے میں تھا کہ معاشرے میں ہیر و کن اور دیگر منشیات کو نظرول کرنے کیلئے کیا صورت اختیار کی جائے؟ میں نے گزارش کی کہ ہمارے ہاں منشیات کا دائرہ زیادہ وسیع ہے کہ ہم شراب کو بھی اسی منوعہ نئے کاذبیع شمار کرتے ہیں جس کو رونکنے کیلئے آپ لوگ ہیر و کن و غیرہ کی روک تھام کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں ہر نشہ آور چیز، خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو، حرام ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ مسئلہ زیادہ اہم ہے اور ہم اس کیلئے مذہبی تعلیمات کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس کے ساتھ عقیدے کی قوت اور خوف خدا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر کسی کو قانون کا پوری طرح پابند نہیں بنایا جاسکتا۔

پولیس چیف نے بتایا کہ انہوں نے اس بات کا تجربہ کیا ہے، مذہبی رہنماؤں اور چرچوں کے تعاون سے نوجوانوں میں قانون ٹھنکی اور نشر آور اشیا کے استعمال کے خلاف ہم چلائی ہے جس کے بہت مفید نتائج سامنے آئے ہیں۔ میں نے مارکس بیل کو بتایا کہ چند سال قبل آپ ہی کے شہر لوگوں میں مولانا رضا اللحق سیاکھوی، مولانا محمد عیسیٰ منصوري اور ایک آرٹش ہوسلم بزرگ حاجی عبدالرحمن کے ہمراہ میں نے اس شہر کے ایک بڑے پادری صاحب سے ملاقات کی تھی اور ان سے اس مسئلے پر بات کی تھی کہ سوسائٹی میں منشیات کے استعمال، بدکاری، ہم جنس پرستی اور بے حیائی کے خلاف ہم مشترکہ طور پر ان کے ساتھ مل کر محنت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ان مسائل کا حل آسانی تباہوں اور

مذہبی اخلاقیات کی طرف واپسی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے میری اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ سوسائٹی میں بے حیالی، بدکاری، ہم جنس پرستی اور منشیات وغیرہ کی روک تھام کیلئے آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی ضروری ہے اور ہم اس سلسلے میں میسیحیت کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے تیار ہیں۔

توہنگم کے پولیس چیف نے اس سے اتفاق کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مسکی مذہبی رہنماؤں اور مسلمان مذہبی رہنماؤں کے درمیان اس مقصد کیلئے رابطہ کا اہتمام کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے مفید تصور کرتے ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ برطانیہ میں آئندہ حاضری کے دوران، میں بھی ان کوششوں میں شریک ہوں گا اور اس میں دلی خوشی محسوس کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مولانا رضا الحق سیاہکوہ نے بھی اس ملاقات میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آج کی گلوبل دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم توہنگم کے مسائل کو صرف یہاں کے حالات کے دائرے میں رہتے ہوئے حل کر سکیں اور عالمی حالات کو نظر انداز کر دیں، کیونکہ عالمی حالات پر پڑتا ہے اور لوکل مسائل کو عالمی تناظر سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کیلئے مذہبی رہنماؤں، کمیونٹی لیڈرز اور انتظامیہ کے ساتھ ساتھ عوامی نمائندوں اور سیاسی قیادت کو بھی شریک کرنا ضروری ہے تاکہ سب مل کر جذبات اور عمل کو قابو میں رکھنے اور انہیں درست رخ پر رکھنے کیلئے کردار ادا کر سکیں۔

انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں اظہار رائے پر پابندی لگانے اور جذبات کو دبانے کی پالیسی درست نہیں ہوگی، جیسا کہ سننے میں آرہا ہے کہ برطانوی حکومت اس قسم کی پابندیوں کے بارے میں سوچ رہی ہے، کیونکہ کسی مسئلے پر فطری طور پر پیدا ہونے والے جذبات اور عمل کو اگر بزور رکاواجائے گا تو وہ غلط راستہ اختیار کریں گے اور اس سے مسائل پیدا ہوں گے، اس لیے افہام و تفہیم کے ساتھ ہی ان مسائل کے حل کا راستہ نکالا جاسکتا ہے۔

## جامعہ حفصہ اور لال مسجد کا سانحہ

مابنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۰۴ء

جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد کے خلاف سرکاری فورسز کے مسلح آپریشن نے پورے ملک کو دہلا کر کھدیا ہے۔ ایک عرصہ سے مختلف حلقوں کی طرف سے یہ کوشش جاری تھی کہ کسی طرح یہ تصادم رک جائے اور خوزیری کا وہ المناک منظر قوم کو نہ دیکھنا پڑے جس نے ملک کے ہر فرد کو رنج و صدمہ کی تصوری بنادیا ہے، لیکن جو ہوتا تھا وہ ہوا، بہت برا ہوا اور بہت بڑے طریقے سے ہوا۔ اس سے کچھ لوگوں کو ضرور تسلیکیں حاصل ہوئی ہوگی جو حکومت کی رٹ بحال کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت اور رعب و دہدبہ مسلط کرنا بھی ضروری سمجھ بنتھے تھے اور ان کا خیال تھا کہ طاقت اور اسلحہ کا بے دریغ استعمال کیے بغیر اور آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر شاید حکومت کی رٹ کا وقار قائم نہیں رہے گا۔ چند افراد ضرور ایسے ہوں گے لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم غم زدہ ہے، افسرده ہے، مضطرب اور بے چین ہے کہ بہت سے بے گناہوں

کے لائے ترپے ہیں، بچوں اور عورتوں کا خون بہا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے گھر میں ہوا ہے اور ایک دنی درس گاہ میں ہوا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ایک سرکاری چلڈرن لائسری ی پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ کے ساتھ جب اس تنازع کا آغاز ہوا تھا اور اس کے بعد ایک مبینہ قبہ خانہ اور پھر مساج پار لر کے خلاف کارروائی نے اس معاملہ کو آگے بڑھایا تھا تو ہم نے اسی وقت یہ عرض کر دیا تھا کہ ایک مسلمان ملک کے اندر حکومت وقت کے خلاف اس قسم کے تصادم کے ماحول اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی حمایت نہیں کی جاسکتی اور مقاصد کتنے ہی نیک اور اپنی کیوں نہ ہوں، ان کیلئے اس طرز کی جدوجہد کو سنید جواز فراہم نہیں کی جاسکتی۔ اس پر ملک بھر کے جمہور علمائے کرام کام و بیش اجماع منعقد ہو گیا تھا، مگر اس کی پرواکیے بغیر معاملات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسری طرف ملک کی سنجیدہ دینی قیادت نے حکومت پر مسلسل زور دیا کہ وہ طاقت کے استعمال سے گریز کرے، جائز مطالبات منظور کرنے کی طرف توجہ دے، ان اسباب و عوامل کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کے روی میں شدت کی یہ صورت سامنے آئی ہے اور مذکورات کے ذریعے سے منسلک کو حل کرنے کا راستہ نکالے۔ لیکن حکومت نے بھی اس کیلئے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی غیر سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ان جائز مطالبات میں سے کسی ایک کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ شدت کی اس انتہائیک جا پہنچی تھی۔

ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر حکومت اسلامی نظام کے نفاذ، اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعییر کرنے، حدود شرعیہ میں کی گئی ترمیم پر نظر ثانی اور فاشی کے مبینہ مرائز کو بند کرنے میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہو جاتی تو اس سلسلے میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے رویے میں پائی جانے والی شدت کو کم کیا جاسکتا تھا۔ اور ہم لال مسجد کے خطیب مولانا عبد العزیز کی اس بات سے بھی متفق ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے طریق کار سے اختلاف کرنے والے ان جائز مطالبات کیلئے صحیح طریق کار سے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ مولانا عبد العزیز اور غازی عبد الرشید شہید کے طریق کار سے ہم نے بھی اختلاف کیا تھا اور اب بھی ہم اسے غلط ہی سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا اور مسلسل تصادم کا ماحول پیدا کرنا ہمارے نزدیک شرعاً اور اخلاقاً کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے، لیکن مولانا عبد العزیز کے اس سوال کا آخر کیا جواب ہے کہ ان کے طریق کار سے اختلاف کرنے والوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور فاشی و مشرکات کے سد باب کیلئے صحیح طریق کا پر بنی کون سی جدوجہد کا اہتمام کیا ہے؟ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ معاملات کو اس رخ تک پہنچانے میں جہاں اسلامی نظام کے معاملے میں حکومت کی سردمہری کار فرمائے، وہاں اسلامی نظام کیلئے جدوجہد کی داعی دینی سیاسی جماعتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں کہ ان کی بے عملی اور تغافل نے وہ خوفناک خلاپیدا کر دیا ہے جس کو پر کرنے کیلئے تشدد اور بغاوت کی تحریکات آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ قانون فطرت ہے کہ خلاجس تدرگہرا ہو، اس کی جگہ لینے والی قوتیں اسی قدر شدت اور تیزی کے ساتھ کپتی ہیں اور بسا اوقات آندھی اور طوفان کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔

جہاد افغانستان کے بعد یہ بات حکومت اور دینی سیاسی جماعتوں، دونوں سے توجہ کی طالب تھی کہ جن ہزاروں افراد

نے پاکستان سے جا کر افغانستان میں رو سی استعمار کے خلاف عملی جنگ لڑی ہے، وہ صرف اسلحہ چلانے کا ہی عملی تجربہ نہیں رکھتے بلکہ اسلام کی بالادستی اور نفاذ اسلام کے مخالصانہ جذبے سے بھی سرشار ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور وہ ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ انہیں ملک و قوم کا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہوئے نہ حکومت نے ان کے جذبات و رجحانات کو اسلام اور پاکستان کیلئے ثبت رخ پر قائم رکھنے کی کوئی پالیسی اپنائی اور نہ ہی دینی سیاسی جماعتوں نے انہیں اپنا نے اور اپنی جدوجہد میں شریک کرنے کی طرف توجہ دی بلکہ انہیں اپنا حاریف اور اپنے لیے خطرہ تصور کیا گیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کیلئے جو نیما حول کھڑا کیا وہ ان کی کردار کشی، تو بین، طنز و استہزا، اور تحیر و حوصلہ ٹکنی سے عبارت تھا۔ پھر اس فضائیں ان کے سامنے افغانستان میں امریکی فوجیں اتریں، طالبان کی حکومت کو وقت کے ساتھ تہس نہس کر دیا گیا، اور پاکستان میں دینی شعائر اور اسلامی روایات و اقدار کو پاپاں کرنے کی پالیسیاں آگے بڑھنے لگیں تو ان کا غصہ اور نفرت اپنی انتباہ کو پہنچ گئے، اور وہی غصہ و نفرت مجتمع ہو کر لاں مسجد اور جامعہ حفصہ میں حکمرانوں کے خلاف صفائحہ ہو گئے۔ ہم نے حکومت وقت کے ساتھ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبد الرشید کے اصادم اور محاذ آرائی کے طرز عمل کو غلط قرار دیا ہے اور فی الواقع اسے غلط سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی شدید دکھ ہے کہ ان بھائیوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ خود اپنی دینی و علمی قیادت سے بھی بغاوت کی اور ان کی مشاورت و بدایات کو قبول نہ کیا۔ لیکن اس کا یہ پس منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسلامی نظام اور دینی شعائر و اقدار کے بارے میں حکومتی حلقوں اور اداروں کی منافقانہ پالیسی کا آخری جذبائی ردعمل یہی ہو سکتا تھا اور غازی برادران کے دل میں یہ بات یقین کے درجے میں بیٹھ چکی تھی کہ دینی سیاسی جماعتوں نے اپنے لیے معروضی سیاست اور اقتدار کی اکھاڑ پچھاڑ کو ہی آخری منزل سمجھ لیا ہے اور ان سے نفاذ اسلام کیلئے کسی مؤثر جدوجہد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ہمارے نزدیک یہ دو عوامل ہیں جنہوں نے لاں مسجد اور جامعہ حفصہ کو حکومت کے خلاف ایک مسلح مورچہ بنادیا اور بات لاں مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری آپریشن پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ملک بھر میں ہونے والے ہنگاموں اور خودکش حملوں نے لاں مسجد کی اس بغاوت کا دائرہ دور دور تک وسیع کر دیا ہے۔ صورتحال کی یعنی کاندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے کہ ۱۳ جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سرگودھا میں ایک نوجوان نے بینک ڈیکٹی کے دوران میں زخمی حالت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس نے بینک پر ڈاکہ اس لیے ڈالا ہے تاکہ رقم حاصل کر کے لاں مسجد کا بدلہ لینے اور ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد منظم کرنے کیلئے کام کر سکے، یعنی اس نے ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کیلئے بینک ڈیکٹی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ ایک الیہ ہے، بہت بڑا الیہ ہے اور اس قسم کے الیہ مایوسیوں سے جنم لایا کرتے ہیں۔ جب لوگوں کو ان کے جائز مطالبات اور جذبات کا صحیح جگد سے جواب نہیں ملتا تو وہ اس کی تسلیم کیلئے تباہل ذراع احتیار کرتے ہیں، اور یہ تباہل ذراع ضروری نہیں کہ صحیح بھی ہوں۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جس کا وجود اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اس کے دستور میں اسلامی نظام کی عملداری اور اسلامی معاشرے کے قیام کی حمانت دی گئی تھی۔ جب ایک مسلم نوجوان اس سلسلے میں حکومت کی سردمہری اور حکومتی اداروں کا منفی طرز عمل دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں بے ساختہ دینی جماعتوں کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں

اور حکومتی طرز عمل کارخ تبدیل کرنے کیلئے کس سنجیدگی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اگر اسے دینی سیاسی جماعتیں کی چدو چہد اور تحریک میں اپنے جذبات کی تسلیم کا سامان مل جائے تو وہ وہاں رک جائے گا اور خود کو ان کے حوالے کر دے گا، لیکن اگر اسے وہاں بھی امید کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے اور ہر طرف وقیٰ مفادات اور مصلحتوں کا ہی ماحول ملے تو پھر اس کیلئے وہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے اور اسلام کی بالادستی اور فاشی و بے حیائی سے معاشرہ کو پاک کرنے کا حیال اپنے ذہن سے نکال دے، اور یا پھر اس کیلئے اپنا راستہ خود نکالے اور جو کچھ وہ اس کیلئے کر سکتا ہے، اس کی منصوبہ بندی کرے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے ہزاروں نوجوان جو نفاذ اسلام کے مخاصانہ جذبہ سے بہرہ دو رہیں اور اسلحہ کی ٹریننگ بھی رکھتے ہیں، گذشتہ ایک عشرے کے دوران میں اسی تجربے سے گزرے ہیں اور اب وہ اس تجربے کے آخری مرحلے میں ہیں جس کی ایک جھلک لال مسجد میں پوری قوم نے دیکھ لی ہے۔ اور اگر حکومت اور دینی جماعتیں نے اب بھی اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لیا اور ان مختص اور پر جوش نوجوانوں کے جذبات کو ثابت رکھ دیئے کی کوئی معقول کوشش نہ کی تو الٰ مسجد اس قضیہ کی انتہا نہیں ہو گی بلکہ خدا نخواستہ ابتداء ثابت ہو سکتی ہے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تمازج میں اپنی جانوں کا نذر ان دینے والے شہداء کیلئے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں۔ ہمیں سرکاری فور سز کے ان نوجوانوں سے بھی گہری ہمدردی ہے جنہوں نے اپنی جانب پیش کیں، وہ ڈیوٹی پر تھے اور فراپن صریح انجام دے رہے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام شہداء کو جوار رحمت میں جگہ دیں، زخمیوں کو صحت عطا فرمائیں، پسمند گان کو صبر جیل سے نوازیں، اور ہم سب کو بحیثیت قوم اس سانحہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ملک و قوم کے مستقبل کی بہتر صورت گری کی توفیق دیں، آمین۔

## آج کے فریڈم فائٹرز، دہشت گرد کیوں؟

روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۶ ستمبر ۲۰۰۴ء

مجیب بھائی نے ہمیں بتایا کہ بوسٹن سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک پرانے گاؤں کو پرانے طرز زندگی کی نشانی کے طور پر محفوظ رکھا گیا ہے جو دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ ہمیں وہاں لے گئے۔ میرے ساتھ مفتی اکرام الحق جو ہری اور حافظ شہباز احمد بھی تھے۔ ”سٹوربرن“ نام کے اس پرانے گاؤں کو اصلی حالت میں محفوظ رکھ کر اسے میوزیم بنادیا گیا ہے۔ ہمیں ڈالر فیس داغلہ فیس ہے۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ وہاں گزارا۔ گھوڑوں کا صبلل، لوہار کی دکان، کھیتی باڑی کے پرانے آلات، مرغیوں کا ڈرہ، پرانی گھوڑا گاڑی، دستی نکا، ایک زمیندار کا مکان، اور چند دوسرے مناظر دیکھے۔ چند عورتیں پرانے لباس میں کام کا ج میں مصروف تھیں، پورا جسم لباس میں ڈھکا ہوا اور سر پر بھی بڑا سا ہیئت پہن رکھا تھا۔ ایک جگہ چند عورتیں سوت رنگ رہی تھیں۔ ایک صاحب لوہے کے چھوٹے ڈبے بنا رہے تھے۔ غرضیکہ صرف پرانی اشیا کو ہی محفوظ

نہیں کیا گیا بلکہ پرانے لباس اور انداز کے ساتھ کام کرنے کا ماحول بھی بنایا ہوا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ ماحول ایک صدی قبل کا تھا، اس دور کا ایک پرنسپنگ پریس بھی اپنی بلڈنگ اور متعلقہ سامان کے ساتھ موجود ہے، اور سڑکیں اور راستے بھی اسی کیفیت میں ہیں۔

روڈ آئی لینڈ اور میساچیوٹس کی ان ریاستوں میں دو دن کا قیام خاصاً صفتی رہا اور بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ مگر میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ بوشن کو برطانوی استعمار کے خلاف امریکہ کی جنگِ آزادی کا نقطہ آغاز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ چائے کے کاروبار کا مرکز تھا، اس بندرگاہ پر چائے آتی تھی اور چائے کے کاروبار پر ٹکیں لگائے جانے پر احتجاج شروع ہوا تھا جس نے آگے چل کر تحریکِ آزادی کی شکل اختیار کر لی۔ اس حوالے سے یہاں ”بوشن ٹی پارٹی“ کا نام لیا جاتا ہے جس نے اس تحریک کو منظم کیا اور اسے آزادی کی جدوجہد بنادیا۔

مجھے بسا اوقات بہت تجھب ہوتا ہے کہ دنیا کی بہت سی مسلح تحریکاتِ آزادی کو دہشت گردی قرار دینے والے امریکی رہنماؤں کو برطانوی استعمار کے خلاف امریکہ کی مسلح جنگِ آزادی کے وہ مرالی آخر کیسے بھول جاتے ہیں جن میں امریکہ کے فریڈم فائزز وہی کچھ کرتے رہے جو ان کے بقول آج کے دہشت گرد کر رہے ہیں۔ اگر اس زمانے میں ”دہشت گردی“ کے خلاف کوئی جنگ عالمی سطح پر ہوتی تو اس کا سب سے بڑا بدف وہی قرار پاتے۔

## افغانستان کیلئے دستوری طرز حکومت کی تجویز

۲۹ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر ایتمام ایک سیمینار سے خطاب کا کچھ حصہ

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں حکومتی ڈھانچے اور دستوری نظام کی تشكیل اور قادیانیوں کی حیثیت طے کرنے کے پارے میں ملک کے تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر جو فیصلے کیے، وہ اسی رخن پر ہوئے ہیں جن کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا، بلکہ ہم نے تو افغانستان میں طالبان کی امارت اسلامیہ قائم ہونے کے بعد وہاں بھی اس بات کیلئے کوشش کی ہے کہ کسی طرح وہاں دستوری حکومت کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں خود ایک دور میں قندھار گیا ہوں، امیر المومنین ملا محمد عمر سے ان کے دور اقتدار میں ملاقات کی ہے اور اگرچہ ان سے برادر است اس مستلمہ پر بات نہیں ہو سکی، لیکن ان کی شوری کے ذمہ دار حضرات سے میں نے بات کی۔ میں اپنے ساتھ قرارداد مقاصد، علماء کے ۲۲ دستوری نکات اور جمیعت علمائے اسلام پاکستان کا ۱۹۷۳ء کا انتخابی منشور لے کر گیا تھا اور میں نے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ علمائے پاکستان کی طرح قرآن و سنت کی بالادستی کی شرط کے ساتھ عوامی نمائندگی اور دستوری حکومت کا اہتمام کریں، کیونکہ آج کے دور میں کسی حکومت کے جواز کو عالمی سطح پر تسلیم کرانے کیلئے یہ ناگزیر تقاضے ہیں۔ اور چونکہ اس کا تعلق اجتہادی امور سے ہے اور حالات کے مطابق ایسے معاملات میں کوئی بھی مناسب فیصلہ کرنے کی گنجائش

موجود ہوتی ہے، اس لیے انہیں اس مشورہ پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ مگر یہ ہماری قسم تھی یا حالات کا جو تھا کہ معاملات کو اس رخ پر لانے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے برکس ہمارے ایک اور پڑوسی ملک ایران میں جب مذہبی قیادت بر سر اقتدار آئی اور ابھی تک بر سر اقتدار ہے، اس نے اپنے روایتی موقف کو جدید سیاسی تقاضوں کے ساتھ میں ڈھالا، دستوری حکومت اور عوامی نمائندگی کا اہتمام کیا اور باوجود یہ کہ اہل تشیع کا امامت کا ستم الٰہی سنت کے خلاف کے ستم کی بہ نسبت زیادہ سخت اور تھیا کریں کے زیادہ قریب ہے، انہوں نے اسے بھی ”ولایت فقیہ“ کے عنوان سے دستوری نظام کا حصہ بنایا، اس لیے وہ کامیابی کے ساتھ آگے گئے بڑھ رہے ہیں۔

دستوری حکومت کے بارے میں الٰہی سنت کے نقطہ نظر اور اہل تشیع کے نقطہ نظر کا فرق جدید دستوری زبان اور آج کی اسلامی اصطلاحات میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ایران میں چونکہ حکومتی طبقات اور حکومتی نظام چلانے والے افراد اس کے مطابق تعلیم و تربیت بھی رکھتے ہیں، اس لیے انہیں اس کے مطابق ملک کا نظام چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی، مگر ہمارے ہاں مقتدر طبقات اور سیبیلہ مشنٹ پاکستان اور اس کے دستوری نظریاتی بنداد کے حوالے سے ابھی تک تنذیب اور گاؤں کا شکار ہیں، بلکہ عوامی دباؤ کے تحت قبول کیے جانے والے اس دستور اور اس کی اسلامی دفعات سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، اس لیے پاکستان کا دستور اور اس کی اسلامی دفعات قومی زندگی میں عملی پیشافت کے موقع سے ابھی تک محروم ہیں۔

----

## ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کا انثرو یو

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاپور دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہونے والے انثرو یو کے  
منتخب حصے

----

سوال: یہ جو ہمارے ملک میں اسلام اور سویٹزرم کی لڑائی کا دور رہا، آج اسے آپ کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

جواب: اس لڑائی کا اصل پس منظر یہ ہے کہ ہمارے مغرب اور شمال کی طرف سوویت یونین ایک بڑی طاقت کے طور پر موجود تھا۔ کیونکہ جیسیں بھی ہم سائے میں تھا لیکن اس کے عزم توسعہ پسندانہ نہیں تھے۔ جبکہ سوویت یونین نے پہلے مشرقی یورپ میں اور پھر ادھر افغانستان کی طرف پھیلاوکی پالیسی اختیار کی۔ اس کے مقابلے میں مغرب کا ایجاد یا تھا کہ یہاں سے کوئی ملک مذہب کی بنداد پر سوویت یونین کے پھیلاوکی مراحت کرے۔

سوال: کیا مغرب والوں نے یہاں مذہب کے گھرے اثرات دیکھ کر کیونکم کو روکنے کیلئے یہ پالیسی اپنانی؟

جواب: مغرب والوں کی یہ سوچ تھی کہ اگر ایشیا میں کمیونزم کو کوئی روک سکتا ہے تو یہ منہب ہی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ادبی حلقوں کے ذریعے سے وہ کمیونٹ نظریات کے پھیلاؤ کے خلاف ہم اٹھائے ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آزادی سے پہلے یہاں ترقی پسند تحریک منظم ہوئی تھی اور وہ اشتراکی نظریات پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ اہل مغرب کی اگریہ اپروج تھی کہ کمیونزم کو منہب کے حوالے سے روکا جاسکتا ہے تو یہ ان کا ایجاد تھا، لیکن خود یہ ہماری بھی مجبوری تھی۔ اس لیے کہ روس نے وسط ایشیائی ریاستوں پر قبضہ کر کھاتھا اور اب وہ افغانستان میں پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ روس نے جو کچھ وہاں کے مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ کیا تھا، وہ ہم یہاں برپا ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سے گویا سو شریم کی مخالفت میں ہم ایک ہو گئے تھے۔ مغرب کا اپنا مفاد تھا، ہمارا اپنا مفاد تھا۔ ہم اس صورت سے دوچار نہیں ہونا چاہتے تھے جو صورت وسط ایشیائی ریاستوں پر روس کے غلبے کے بعد ہی تھی۔ یہ فکری مجاز ابتداء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی<sup>7</sup> نے سنھلا تھا۔ ہم جمیعت علماء اسلام والے اسلام والے غیر جانبدار تھے۔

جماعت ۱۹۵۴ء میں ”جماعت علماء اسلام پاکستان“ کے نام سے دوبارہ باقاعدہ طور پر منظم ہوئی تھی۔ یہ دراصل جمیعت علماء اسلام ہندکی ہی ایک نئی شکل تھی۔ آزادی سے پہلے ہم نے، جنہیں نیشنلٹ علماء کہا جاتا تھا، برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ہم نے دیکھا کہ اب یہاں امریکہ پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا ہے تو ہماری ترجیحات کچھ اس طرح تھیں کہ امریکہ کو کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

سوال: آپ نے امریکہ کو زیادہ خطرناک کیوں سمجھا؟

جواب: ہم امریکہ کو اس خطے میں برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ ہم نے برطانیہ کے خلاف ڈیڑھ سو سال تک جنگ لڑی تھی، باقاعدہ مسلح جنگیں بھی لڑیں، قربانیاں دیں، گرفتاریاں دیں، تحریکیں برپا کیں۔ اور مصر کے جمال عبد الناصر سے ہماری قربت بھی اسی وجہ سے تھی کہ ہم عالمی سطح پر امریکہ کو برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ تب وہ ہی امکانات تھے کہ امریکہ کی مدد سے روس کے ساتھ لڑائی لڑی جائے، یا پھر روس کی مدد سے امریکہ کے ساتھ لڑائی لڑی جائے۔ لیکن میں اس حوالے سے مولانا مودودی<sup>8</sup> کو کریٹ کریٹ دیتا ہوں کہ انہوں نے کمیونزم کے خلاف ایک بھرپور فکری جنگ لڑی ہے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں تھے جس پر ہمیں سو شلیٹ علماء بھی کہا گیا۔ ہم ان کے مقابلہ میں اس وقت بائیں بازو کی تائید کرتے تھے۔ بھٹو کے خلاف جب ۱۳۱۳ء علماء کا فوجی آیا۔ مولانا مفتی محمد حسین غوث ہزاروی<sup>9</sup> نے کہا ہم نہیں مانتے ایسے فتوؤں کو۔ جمیعت علماء اسلام نے اس فتوے کو مسترد کر دیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جمال عبد الناصر نیشنلزم کے قائل تھے اور یہ نیشنلزم مغربی استعمار کے مقابلے میں تھا۔ نیشنلزم کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ترکی میں نیشنلزم بمقابلہ اسلام تھا، ہم اس کی بات نہیں کرتے تھے۔ عرب نیشنلزم بمقابلہ برطانوی استعمار تھا، ہم اس کی حمایت کرتے تھے۔

سوال: جماعت اسلامی جمال عبد الناصر کے نیشنلزم کی مخالف تھی؟

جواب: ایک ہے اصولی موقف کہ ہم نے نیشنل ازم کو بطور اصول اور نظریے کے نہیں بلکہ بطور حکمت عملی کے لیا۔ متحده ہندوستان میں بھی ہم نے نیشنلزم کے تحت آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اگر مسلمان اور ہندو اکٹھے نہ ہوتے تو وہ یہ جنگ

نہ بیت سکتے تھے۔ اگر پہلے ہی باہم اڑپڑتے تو آزادی کی تحریک آگے بڑھی نہ سکتی۔ ہم نے مذہب کے مقابلے میں نیشنلزم کو کبھی سپورٹ نہیں کیا۔ لیکن نیشنلزم کے نام پر جب استعمار کے خلاف جنگ لڑی گئی ہے تو ہم اس کے سپورٹ رہے ہیں۔ اور یہ تب تک لڑی گئی جب تک افغانستان میں روں نہیں آیا۔ جب تک روں افغانستان کی سرحدوں سے باہر رہا ہماری پوزیشن وہ رہی۔ جبکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جب روں افغانستان میں اکبر بیٹھا تو پھر ہم بھی اسی کیپ میں چلے گئے۔

**سوال:** روں افغانستان میں آیا تو آپ کو اس کیپ میں آنا پڑا جس میں مولانا مودودی تھے؟

**جواب:** جہاد افغانستان کو ان سے زیادہ ہم نے سپورٹ کیا ہے۔ مجھے وہ مکالمہ یاد ہے جو ولی خان اور مولانا مفتی محمود کے درمیان ہوا تھا۔ جب افغانستان میں روں کے آنے کے بعد فتویٰ جاری ہوا کہ روں کے خلاف لڑنا جہاد ہے تو ان دونوں مولانا عبداللہ درخواستی نے سرحد کاظوفانی دورہ کیا تھا۔ ساری قبائلی پٹی میں مولانا کے معقدین کا ایک وسیع حلقة تھا۔ مولانا مفتی محمود نے جگہ جگہ تقریریں کیں۔ جناب ولی خان نے اعتراض کیا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، جو کچھ کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں کہ یہ تو امریکہ کی جگہ ہے۔ جواب میں مولانا مفتی محمود نے دو باتیں کہیں، یہ غالباً مردان کے جلسے کی بات ہے۔ مفتی صاحب نے ایک بات یہ کہی کہ یہ جنگ افغانستان کی نہیں بلکہ ہم پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ روں اس سے آگے پاکستان آنا چاہتا ہے کہ اسے گرم پانیوں تک رسائی درکار ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب ہم پر برطانوی استعمار نے قبضہ کیا اور ہم نے یہاں سے بھرت کی تو افغانستان ہمارا ہیں کیپ بننا تھا، افغانستان والوں نے ہمیں دھکے نہیں دیے تھے۔ آج ان پر پہنچ آئی ہے اور وہ ہمارے پاس آئے ہیں تو ہم ان سے بے وفائی نہیں کریں گے۔ مفتی صاحب نے جناب ولی خان سے کہا کہ تم پڑھان ہو، پڑھانی روایات کو تو قائم رکھو۔ بحیثیت مسلمان ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یوں ہم بھی اس کیپ میں چلے گئے۔

**سوال:** اس زمانے میں بایس بازو کا کہنا یہ تھا کہ روں سے اصل خطرہ ہمارے جاگیرداروں، سرمایہ

داروں، اور اسٹیبلشمنٹ کو ہے۔

**جواب:** خطرے ان کی طرف بھی تھے لیکن ہمیں توازنکستان کی ویران مسجدیں نظر آ رہی تھیں کہ مسجدوں کو تالے لگے ہوئے تھے، وہ منظر بھی ہمارے سامنے ہی تھا۔ ہم بھی پہلے یہ باتیں نہیں مانکرتے تھے، اب جو یہ پردہ اٹھا ہے تو بہت کچھ سامنے آیا ہے۔ میں نے ۹۰ کے عشرے میں خود تاشقند گیا ہوں اور وہاں جو ماحول میں نے دیکھا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے۔ میں نے سرقت، تاشقند کے شہر خود دیکھے ہیں۔ میں وہاں وند کے ساتھ گیا تھا۔ تاشقند کے جس مدرسے میں ہم ٹھہرے وہ چالیس سال تک سینٹ کا گودام بنارہا۔ سرقت کی مرکزی جامع مسجد جہاں ہم ایک رات رہے وہ پچاس سال تک سینما ہال بنی رہی۔ ہم جانتے تھے کہ افغانستان میں روں کے آجانے سے خطرات تاجروں کو بھی ہیں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو بھی ہیں، لیکن ہم نے روئی قبضے میں جانے والے مدرسوں اور مسجدوں کا جو عالی دیکھا تھا اسے بھی ہم بھلا تو نہیں سکتے تھے۔ خطرات سب کیلئے تھے کہ روں اگر یہاں آیا تو کیا ہو گا؟

سوال: آپ نے ان ریاستوں کے جو مسلمان دیکھے وہ کس طرح کے تھے؟

جواب: اصل بات یہ ہے کہ وسط ایشیا میں روس کے آنے سے دیندار مسلمان زیریز میں چلے گئے تھے۔ میں تاشقند اور سمرقند دونوں جگہ گیا۔ میرے ساتھ مجتبی محمد جمیل شہید، مولانا فداء الرحمن درخواستی، اور مفتی نظام الدین شامزی شہید بھی تھے۔ وہاں ایک مدرسہ میں ہم استادزادگر جان سے ملے، بہت فصیح عربی بولتے تھے۔ مجھے تعجب ہوا، میں نے سوچا کہ ایک زمانے میں ان کے تعلقات جمال عبد الناصر سے رہے ہیں ممکن ہے وہاں جا کر پڑھتے رہے ہوں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ مدرسون کا قائم غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ ہمیں اپنے مکان کے پچھلے حصے میں لے گئے تھے۔ پوچھا تو کہنے لگے کہ مدرسون کا قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ ہمیں اپنے مکان کے پچھلے حصے میں لے گئے تھے۔ میں نے باغیچہ تھا۔ اس باغیچے میں ہمیں پچھلی فٹ زیریز میں ایک غار نما کمرے میں لے گئے اور بتایا کہ ہم یہاں رات کو بارہ سے دو بج تک قرآن مجید پڑھتے تھے۔ ہم نے ہمیں درس نظامی کا کورس پڑھا تھا۔ اس قسم کے زیریز میں مدرسے آپ کو تاشقند میں بہت ملیں گے۔ داڑھیاں غائب ہو گئی تھیں۔ ہمارا ایک اندازہ تھا کہ وسط ایشیا کی یہ ریاستیں آزاد ہوئی ہیں تو ان کا سب سے بڑا تقاضا کیا ہو گا۔ ہم اس لیے گئے تھے کہ وہ لوگ ہم سے مسجدوں کیلئے امام اور حافظ وغیرہ مالگین گے۔ لیکن کہیں سے بھی یہ مطالبہ سامنے نہیں آیا۔ ان کے پاس امام بھی تھے، خطیب بھی تھے۔ البتہ ان کا مطالبہ تھا کہ ہمیں قرآن مجید بھیج کر کہاں قانونی طور پر جرم رہا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب اور مصر کے علاوہ ہماری تنظیم مجلس تحفظ ختم نبوت نے بھی بہت بڑی تعداد میں وہاں قرآن مجید بھجوائے اور میں انہی کے وفد میں وہاں گیا تھا۔

ایک واقع سے آپ جیران ہوں گے کہ امام بخاری کا مزار برلنگ میں ہے جو کہ سمرقند سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم وہاں فاتحہ پڑھ کر پلٹ رہے تھے، ہمارے پاس ایک بڑی ولگن تھی۔ اچانک ایک بڑھیا ہماری ولگن کے سامنے آگر کھڑی ہو گئی۔ وہ کاپ رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ”مصحف شریف، مصحف شریف“۔ ہم نے ترجمان سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے بتایا کہ اسے کہیں سے خبر ملی ہے کہ آپ لوگ قرآن مجید بانٹ رہے ہیں۔ ہم متذبذب تھے کہ ہمارے پاس قرآن کریم مدد و تعداد میں تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ فلاں فلاں مدرسے میں قرآن مجید دینے ہیں۔ ہم نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ ب Lund تھی۔ آخر ہم نے ایک نسخہ دیا تو وہ اسے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ کہنے لگی کہ ستر سال بعد قرآن مجید کی زیارت نصیب ہوئی ہے، پھر میں نانی کے ہاتھ میں دیکھا کرتی تھی، حسرت سے سوچا کرتی تھی کہ دوبارہ کبھی زیارت ہو گی یا نہیں۔

پہلی بھی روس کے خلاف مراجحت کرنا چاہتا تھا، لیکن ہمارے اپنے مقاصد تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نتائج امریکہ سمیٹ کر لے گیا کہ وہ طاقتور تھا اور ہم کمزور تھے۔ ہمارے مقامی اونچے طبقوں نے بھی مفادات حاصل کیے۔ رہے ہم، تو ہم اسی کیفیت میں ہیں۔ افغانی بے چارے کل رو سی فوجوں سے لڑتے رہے، آج امریکیوں سے نبرد آزمائیں۔ فرق پچھلے نہیں پڑا۔

سوال: یہ بتائیں کہ مشرف حکومت ہاتھ دھوکر دینی مدرسون کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟

جواب: جہاد افغانستان کے بارے میں مغرب کو ایک بڑی غلط فہمی تھی، ان کا خیال تھا کہ یہ مجاہدین ہماری وجہ سے لڑ

رہے ہیں، جنگ ختم ہو گئی تو ہم انہیں فارغ کر دیں گے۔ مغرب کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ ہمارے لیے کام کر رہے ہیں جب ہم پیچھے ہٹ جائیں گے تو یہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مغرب اپنی جنگ لڑ رہا تھا، یہ اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ افغانستان سے روس نکل گیا تو امریکہ نے مٹل ایسٹ میں مجاز کھول لیا۔ سوال یہ تھا کہ کل افغانستان میں روس کا آنا غلط تھا تو آج امریکہ کا عراق پر قبضہ کرنے کا کیا جواز ہے؟ یہ لوگ اکٹھ گئے کہ ٹھیک ہے ہماری تربیت امریکہ نے کی ہے، اسماء بن لادن امریکہ کے ساتھ مل کر لڑ رہا تھا، لیکن امریکہ کیلئے نہیں لڑ رہا تھا بلکہ یہ اس کی اپنی جنگ تھی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جب روس ہٹا تو انہوں نے امریکہ سے کہا کہ تم بھی ہٹو، اس پر امریکہ سے تصادم ہو گیا۔ اس کے بعد امریکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ تو اپنی جنگ لڑ رہے ہیں اور اس پر ڈٹے ہوئے بھی ہیں۔ طالبان بھی کھڑے ہیں، اسماء بھی کھڑا ہے اور یہ ہمارے مقابلے میں۔

افغانستان کے جہاد سے پہلے اور بعد کی صورت حال آپ دیکھ لیں۔ دنیا بھر میں مسلمان جہاں کہیں بھی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے انہیں جہاد افغانستان سے حوصلہ ملا، تقویت لی۔ مثلاً شیر میں مسلمان لڑ رہا تھا، الجرائز میں بھی نبرد آرہا تھا، فلسطین میں بھی جنگ جاری تھی، اریٰ ٹیریا میں بھی بر سر پیکار تھا۔ یونیسا میں آخر کون لڑا ہے؟ چنانچہ افغانستان کی جنگ کا ایک نتیجہ تو یہ تکا کہ جہاد پھیل گیا اور چیجنیا و فلائیں تک بھی اس کے اثرات پہنچ گئے۔ جب مغرب نے دیکھا کہ یہ جنگ ساری دنیا میں پھیل رہی ہے تو اس پر مغرب نے تجزیہ کیا کہ اس کا یہی کیمپ کہاں ہے؟ مغرب اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس ساری ہمیں جوئی کی بنیاد دینی مدرسہ ہے اور یہ اس کی فکری تربیت ہے جس نے جہاد کے نظریے کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ برطانیہ سے شائع ہونے والے ”دی انڈی پینڈنٹ“ اخبار میں کوئی دس سال قبل ایک تفصیلی روپرٹ چھپی تھی جس کے لکھنے والے نے لکھا کہ شر کے اصل مرکز جنوبی ایشیا کے دینی مدارس ہیں، اور ان میں بھی خاص طور پر دیوبندی مدارس۔ اس روپرٹ پر دو تصویریں شائع کی گئی تھیں۔ ایک دارالعلوم دیوبندی کی اور دوسری بقی نظام الدین دبیلی کے تبلیغی مرکز کی۔ ان دونوں مساجد میں ختم نبوت کی سالانہ کافرنس ہو رہی تھی، خاصاً براجماتع تھا، لوگ پریشان تھے کہ ہمارے خلاف بہت خطرناک روپرٹ چھپی ہے۔ میں نے وہاں یہ کہا تھا کہ آپ لوگ اسے چارچ شیٹ سمجھ کر پریشان ہو رہے ہیں جبکہ میں اسے کریڈٹ سمجھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں اور دی انڈی پینڈنٹ کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ یہ تو تاریخ کا اعتراض ہے، مغرب کو محسوس ہو گیا ہے کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔

مغرب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس ساری فکری لہر کا منبع مدرسہ ہے، لیکن وہ اس مسئلہ پر ایک ڈنڈی مار رہے ہیں۔ وہاں اس مسئلہ پر ایک مذکورہ ہوا، میں نے اس میں کہا کہ مغرب یہ کہتا ہے کہ یہ مدارس جہاد پڑھاتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم بخاری کی کتاب الجہاد بھی پڑھاتے ہیں، ترمذی کی بھی کتاب الجہاد پڑھاتے ہیں، مغازی بھی پڑھاتے ہیں، اور قرآن کریم کی جہاد والی آیات بھی پڑھاتے ہیں۔ لیکن مغرب یہ نہیں بتاتا کہ جہاد پڑھاتے تو یہ مدارس ہیں مگر سکھایا امریکہ نے ہے۔ وہ اپنے روں کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ ہمیں بالکل انکار نہیں کہ ہم جہاد پڑھاتے ہیں، ہم تو یہ پڑھاتے رہے ہیں اور پڑھاتے رہیں گے۔ لیکن اپنے مقاصد کے حصول کیلئے جدید اسلحے کی ٹریننگ امریکہ نے دی ہے۔ اسماء بن لادن کو کمانڈو ٹریننگ کس نے دی اور مجاہدین کو کس نے تربیت دی؟ دنیا بھر میں جہاد کے نام سے جو لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں، یہ اگر

مدارس نے پڑھائی ہیں تو سکھائی امریکہ نے ہیں۔ اگر یہ جرم ہے تو پھر ہم برادر کے شریک ہیں۔ اگر امریکہ کے نزدیک افغانستان پر روس کا قبضہ ناجائز تھا تو اسے یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے مسلم ممالک سے نکل جانا چاہیے، اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

## افغانستان میں افیون کی کاشت کا مسئلہ

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۴ء

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۵ نومبر ۲۰۰۴ء کی ایک خبر کے مطابق پاکستان میں مشیات کے استعمال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس پر قابو پانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ افغانستان میں افیون کا شست میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے اور اس سال ۲۰۰۳ء میٹر کٹ ٹن پیداوار ریکارڈ کی گئی ہے۔ یہ افیون ہیر و ٹن کی شکل میں قبائلی سرداروں اور پیشہ ور آمگلوں کے ذریعے پاکستان میں سپلائی ہوتی ہے اور پھر دنیا کے مختلف ممالک میں سپلائی ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی مشیات کے استعمال میں مسلسل اضافہ کا باعث بن رہی ہے۔ خر میں کہا گیا ہے اختنی تاریخ کو ٹکس فورس نے گذشتہ دونوں ایک خاتون اور اس کے ساتھی کو گرفتار کر کے اس سے چار کروڑ روپے کی ہیر و ٹن برآمد کی ہے۔

افغانستان میں افیون کی کاشت، اس سے ہیر و ٹن کی تیاری اور پھر پاکستان میں اور اس کے استعمال دنیا ہر میں اس کی سپلائی عالمی سطح پر پریشان کرنے مسئلہ بنا ہوا ہے، اس پر قابو پانے کی کوئی تدبیر نہیں ہو رہی بلکہ اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ماضی قریب میں طالبان کے دور حکومت میں یہ مسئلہ وقق طور پر اس طرح حل ہو گیا تھا کہ امیر المومنین محمد عمر نے پوست کی کاشت پر پابندی لگادی تھی جس پر میں الاقوامی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق افغانستان میں پوست کی کاشت مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ مگر طالبان کی اسلامی حکومت کو طاقت کے زور پر زبردستی ختم کیے جانے کے بعد پھر پرانی صور تھاں بحال ہو گئی ہے اور عالمی اداروں کو اسے ختم کرنے میں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ہمارے خیال میں آج بھی اس کا حل وہی ہے جو طالبان نے کیا تھا، افغان قوم کا مزاج ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کی بالادستی اور حکم و قانون کو قبول نہیں کرتے البتہ شریعت کے حکم پر وہ سب کچھ ترک کر دینے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، اگر انہیں ان کی شریعت واپس کر دی جائے اور ایک اسلامی حکومت کو آزادی کے ساتھ وہاں کام کرنے کا موقع دیا جائے تو نہ صرف پوست کی کاشت بلکہ سرداروں کی جنگ یعنی "لارڈ زوار" پر بھی دوبارہ قابو پایا جا سکتا ہے۔

## طالبان اور القاعدہ پروکالت کی مخالفت کا الزام

روزنامہ پاکستان، لاپور --- ۲۶ جنوری ۲۰۰۸ء

روزنامہ پاکستان میں ۷ اجنوری ۲۰۰۸ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق پشاور ہائی کورٹ کے صدر جناب

لطیف آفریدی اور بعض دیگر سر کردہ وکلاء کو مسینہ طور پر القاعدہ اور طالبان کی طرف سے ڈھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ”وکالت یہودیوں کا پیشہ ہے، چھوڑ دو رہنماء دیں گے۔“ اس پر دعویٰ کے اظہار کے طور پر خبر میں بتایا گیا ہے کہ وکالت کا پیشہ یہودیوں کی میراث نہیں ہے اور اسلام میں وکالت کا پیشہ جائز ہے۔

یہ خبر یا خط عین اس وقت منظرعام پر آیا ہے جب ملک بھر کے وکلاء دستور کی بالادستی اور اعلیٰ عدالتون کے معزول کیے جانے والے جوں کی بحالی کیلئے تحریک کو منظم کر رہے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ۱۸ افروری کو ملک میں عام انتخابات منعقد ہونے یا خدا خواستہ نہ ہونے کے بعد دونوں صورتوں میں وکلاء کی یہ تحریک ملک کے سیاسی مستقبل کی راہیں تعین کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی، اور قوم کو اب دستور و قانون کی بالادستی یا شخصی اور طبقاتی حکمرانی میں سے ایک کا بہر حال انتخاب کرنا ہو گا۔ اس لیے موقع پر وکلاء کو اس انداز میں دھمکیاں دینا اور وکالت کے شرعی جواز اور عدم جواز کی بحث کا ماحول پیدا کرنا ہمارے خیال میں ایسے عناصر ہی کی کارروائی ہو سکتی ہے جو وکلاء کی اس تحریک کو سبوتاً ٹکرانے اور اس کا رخ حکمرانوں کی بجائے دینی عناصر کی طرف پھیر دینے کے خواہ شتمدیں۔ اور شاید ان کا خیال ہے کہ ایسا کر کے وہ نہ صرف یہ کہ وکلاء کی تحریک کی پیش رفت میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر لیں گے بلکہ دینی حلقوں کی طرف سے اس تحریک کی مตوقع حمایت کا راستہ بھی روک سکیں گے۔

جہاں تک بات القاعدہ یا طالبان کی ہے، ہمارے ہاں یہ نام مختلف مقاصد کیلئے اس کثرت کے ساتھ استعمال ہونے لگے ہیں کہ ان کی طرف سے کوئی بات آنے پر یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ بات ان میں سے کسی نے کہی ہے یا ان کی آڑ میں کوئی اور گروہ اپنے مقاصد کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ باقی رہی بات ”وکالت“ کی تو یہ کہنا اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اسلام میں وکالت کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ حدیث و فقہ کی کتابوں میں وکالت کے عنوان سے مستقل ابواب موجود ہیں جن میں وکالت کی شرعی حدود اور اس سے متعلقہ احکام تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

حدیث نبویؐ کی سب سے مستند کتاب بخاری شریف میں وکالت کے بارے میں ایک مستقل باب موجود ہے جس میں امام بخاریؐ نے وکالت کے مختلف پہلوؤں پر پندرہ سے زائد احادیث نبویؐ پیش فرمائی ہیں۔ البتہ ان میں وکالت کا وضیع تر مفہوم میں ذکر کیا گیا ہے، تجارت میں نمائندہ مقرر کرنے کو بھی وکالت کہا گیا ہے، معاملات کے دیگر شعبوں میں نمائندگی کو بھی وکالت سے تعبیر کیا گیا ہے اور نکاح وغیرہ میں نمائندگی کو بھی وکالت قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے چند روایات درج کی جا رہی ہیں۔

- جبتوالوادع میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے قربانی کے جانور ذبح کرنے کیلئے حضرت علیؓ کو مکمل بنایا اور ہدایت فرمائی کہ قربانی کے جانوروں کو ذبح کر کے ان کے چڑوں وغیرہ کو صدقہ کر دیں۔
- حضرت بلاّ جناب نبی کریمؐ کے گھر کے معاملات یعنی اخراجات وغیرہ کے نگران اور آپؐ کی طرف سے وکیل تھے۔ انہوں نے ایک بار انحضرتؐ کی خدمت میں عمدہ کھجوریں پیش کیں، آپؐ نے پوچھا یہ کہاں سے

- آلی ہیں؟ حضرت بالاً نے جواب دیا کہ میرے پاس عام کھجوریں تھیں میں نے وہ دو صاع دے کر ان کے بد لے میں ایک صاع عمدہ کھجوریں لی ہیں تاکہ آپ کو اچھی کھجوریں کھلا سکوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تو تم نے سودا کا سودا کیا ہے۔ ایسی سودی تجارت نہ کیا کرو، اگر ایسا تبادلہ ضروری ہو تو نظری کے عوض پیچ کراس کے عوض دوسری چیز لے لیا کرو۔
- نبی کریمؐ کی خدمت میں زنا کا ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں مرد نے اعتراف کر لیا جبکہ عورت سے دریافت کرنے کیلئے آپ نے اس کے قبیلے کے سردار حضرت انبیاءؐ کو نمائندہ بنایا کہ اس سے جا کر پوچھو، اگر وہ جرم کا اعتراف کر لے تو میری طرف سے اسے سنگسار کر دو۔
  - حضرت عمرؓ نے اپنی طرف سے صدقات کی تقسیم کیلئے جن لوگوں کو اپناوکیل مقرر کر رکھا تھا، ان میں ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی تھے۔
  - منداحمدؓ میں حضرت عروۃ البارقیؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے انہیں قربانی کیلئے بکری خریدنے کی غرض سے ایک دینار دے کر بھیجا۔ انہوں نے ایک دینار میں دو بکریاں خریپیں، ایک بکری پھر ایک دینار میں پیچ دی۔ اور پھر بکری اور دینار لا کر آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ آنحضرتؐ نے بکری کو ذبح کرنے اور دینار کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔
  - نبی کریمؐ نے ام المؤمنین حضرت ام حبیبؓ کے ساتھ نکاح کیلئے عمر بن امية کو اپناوکیل مقرر کیا، ابو داؤد شریف کی روایت کے مطابق یہ نکاح ان کی وکالت سے ہوا۔ حضرت میمونؓ سے نکاح کیلئے حضورؐ نے ابوراغحؓ کو وکیل بنایا، جبکہ حضرت ام سلمہؓ کے ساتھ آپؐ کے نکاح میں ام المؤمنین ام سلمہؓ کی وکالت ان کے فرزند عمر بن ابی سلمہؓ نے فرمائی۔
  - چنانچہ اسلامی تعلیمات میں وکالت کا لفظ و سیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں نکاح، تجارت اور دیگر معاملات میں نمائندگی کو بھی وکالت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں کسی کی نمائندگی کے دیگر بہت سے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مختار عام یا مختار خاص کی جو صورتیں ہمارے مروجہ قانونی نظام میں پائی جاتی ہیں، اسلام نے انہیں بھی وکالت ہی کے ضمن میں شمار کیا ہے۔
  - وکالت کی جو صورت ایک باقاعدہ بیٹھیے کے طور پر ہمارے ہاں مروج ہے اور ہمارے عدالتی نظام کا حصہ ہے، اسے فقه اسلامی کی اصطلاح میں ”وکیلِ خصوصت“ کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی تنازع یا مقدمہ میں کسی فریق کی نمائندگی کر کے اس کے موقف کو بہتر انداز میں پیش کرنا، فقہ کی کم و بیش تمام بڑی کتابوں میں وکالت کی اس شکل کے جواز کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی مختلف صورتوں کے احکام و ضوابط بیان کیے گئے ہیں اور اس وکالت پر اجرت لینے کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ وکالت کے اس قسم کے جواز کیلئے بہت سے فقہائے کرام نے بخاری شریف کی یہ روایت پیش کی ہے کہ جب نبوت کا

جو ٹاد عوے دار مسیلمہ کذاب اپنے قبیلے کا ایک وفد لے کر مدینہ منورہ آیا اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی کہ اگر وہ اپنے بعد اسے اپنا جانشین نامزد کر دیں تو وہ یعنی مسیلمہ جناب بنی کریم کی اطاعت قبول کرنے کیلئے تیار ہے۔ جناب بنی کریم اپنی قیام گاہ تشریف لائے اور کھڑے کھڑے یہ فرمایا کہ وہ اگر ان سے کھجور کی ایک ٹہنی کا مطالباً کرے گا تو میں اسے وہ بھی دینے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ یہ فرمائے اپنے حضرت ثابت بن قیس انصاریؓ کو، جو خطیب رسول اللہؐ ہلاتے تھے، فرمایا کہ مسیلمہ کے ساتھ باقی گفتگو میری طرف سے یہ کریں گے۔ گویا انحضرتؓ نے مسیلمہ کے سامنے اپنے موقف کیوضاحت کیلئے حضرت ثابت بن قیسؓ کو پہنانما نہ کر دیا اور وکیل بنایا۔

امام یہقیؓ نے السنن الکبریؓ میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ مختلف ترازات میں اپنی طرف سے وکالت کیلئے اپنے بھائی حضرت عقیلؓ کو بھیجا کرتے تھے۔ اور جب وہ زیادہ بوڑھے ہو گئے تو پھر حضرت علیؑ نے ان کی جگہ اپنے ایک صحیح عبد اللہ بن جعفرؓ کو پہنانما وکیل مقرر کر دیا۔

اس قسم کی روایات کی بنیاد پر فقہائے کرام نے ”وکیل خصوصت“ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور اس کیلئے اجرت لینے کو بھی درست قرار دیا ہے۔ البتہ جس طرح دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں اسلام کی اخلاقیات کا ایک امتیازی دائرہ ہے اور حلال و حرام کے اصول و ضوابط ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر کسی بھی شبیہ کی مروجہ صورتوں کو مکمل طور پر اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح وکالت کے باب میں بھی اسلامی اخلاقیات کا دائرہ دوسرے نظاموں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ اس شبیہ کو مکمل طور پر اسلامی شکل دینے کیلئے ان اخلاقیات کی پابندی کا اہتمام بہر حال ضروری قرار پائے گا۔ مثال کے طور پر ایک پہلو کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ کسی مقدمے میں ایک وکیل کسی بھی فرقی کی طرف سے اس کے موقف کیوضاحت کیلئے پیش ہو سکتا ہے اور اسے اس پر معروف طریقے سے فیس لینے کا بھی حق حاصل ہے۔ لیکن جس شخص یا فرقی کے پارے میں وکیل کو خود یقین ہو جائے کہ اس نے الواقع جرم کیا ہے تو کیا اسے اس جرم کی سزا سے بچانے کیلئے اس کا نمانہ بننا اور اسے سزا سے بچنے کیلئے از خود مختلف حیلے اور طریقے سکھانا جرم میں معاونت نہیں ہے؟ قرآن کریم نے سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۲ میں ہدایت کی ہے کہ برو تقوی (نکی اور پرہیز گاری) میں ایک دوسرے کی معاونت کرو لیکن اثر و عداوائی (گناہ اور ظلم) میں ایک دوسرے کے معاون نہ بنو۔ اس لیے ایک شخص کے مجرم ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد اسے بچانے کی کوشش کیا جرم میں اس کے ساتھ تعاون نہیں ہے اور کیا یہ طرز عمل سوسائٹی میں جرائم میں اضافے کا سبب نہیں ہے؟

اس ایک پہلو پر اپنے تحفظات کے واضح اظہار کے ساتھ ہم اصولی طور پر وکالت کے پیشے کو اسلامی نقطہ نظر سے ایک جائز پیشہ سمجھتے ہیں اور اگر القاعدہ اور طالبان کے نام پر کسی نے اسے غیر اسلامی قرار دیا ہے تو اس کی حمایت کیلئے ہم تیار نہیں ہیں۔

## غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری

مابنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۰۸ء

سوال ۳: سماج میں امن قائم رکھنے کیلئے قانون کی اہمیت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ (سیاسی فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے قانون کی پابندی کرنے کی کیا اہمیت ہے؟)

جواب: اسلام سوسائٹی میں امن کو برقرار رکھنے اور اس کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے اور راجح وقت قانون کی پابندی کا حکم دیتا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”حاکم وقت اگر تمہاری حق تلفی بھی کر رہا ہو تو اس کی اطاعت کرو۔“ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ ان دونوں ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کرنا، اپیل کرنا اور آواز اٹھانا تو مظلوم کا حق ہے، لیکن قانون سے انحراف اور فیصلوں سے بغاوت کا اسے حق نہیں ہے۔ البتہ مسلم اقتدار کی صورت میں مسلمان حکمران کی طرف سے صرتھ کفر (کفر بواح) کے ارتکاب پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام مسلمانوں کو بغاوت کی اجازت دیتے ہیں جس کیلئے فقہائے کرام نے شرط لکھی ہے کہ اگر ”کفر بواح“ یعنی صرتھ کفر کے مرتب مسلم حکمران کو عوایی بغاوت کے ذریعے تبدیل کر دینے کا غالب امکان نظر آ رہا ہو تو ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ خواہ تجوہ عام لوگوں کو بدآمنی کا شکار بنانا اور ان کی جان و مال کو خطرے میں ڈال دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم اسلامی ریاست کیلئے ہے۔ غیر مسلم ریاست کیلئے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ایسی صورت میں مسلمان یا ملک چھوڑ دیں اور یا اپنا احتجاج ریکارڈ کر اتے ہوئے وہاں رہیں، لیکن قانون کی پابندی اکنہ کیلئے ضروری ہوگی۔

اس وقت عالمی تناظر میں عراق، فلسطین، کشیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرز عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانبدار مبصرین کا ہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس لیے مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا رد عمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔ اس لیے آج کے دریڈ میڈیا کی محلی فضایں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں رد عمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جاسکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی ہے، البتہ اس رد عمل کے اظہار کو مناسب حدود کا پابند ضرور کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بريطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر رد عمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے رد عمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریح زیادتی اور نا انصافی کی بات ہوگی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہاں بنے جذبات اور رد عمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاس داری کریں اور اپنی حکومت، مسلمان بھائیوں اور دیگر برادران وطن کیلئے مشکلات پیدا نہ کریں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عبیسہ کو قبول اسلام کے بعد اپنے قبیلے میں جا کر خاموشی کے ساتھ وقت گزارنے اور غلبہ اسلام کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجائے کی بدایت کی تھی (صحیح مسلم)۔ آپ نے حضرت ابوذر غفاری کو بھی قبول اسلام کے بعد اسی قسم کی بدایت کی تھی (صحیح بخاری)۔ جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن الیمان اور ان کے والد محترم دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ رہے تھے کہ راستے میں کافروں نے پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ آپ دونوں ہمارے خلاف جنگ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ کفار کی قید سے رہا ہو کر دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے روک دیا کہ چونکہ آپ دونوں نے کفار کی یہ شرط منظور کر لی تھی، اس لیے آپ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹا موجود ہوتے ہوئے بھی غزوہ بدر میں شامل نہ ہو سکے۔ ان واقعات سے اس سلسلے میں اصولی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

----

## افغانستان کا مسئلہ: پارلیمنٹ کے اجلاس سے توقعات

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۰۰۸ء

- افغانستان میں برطانوی افواج کے کمانڈر بریگیڈیسریز مارک اسمٹھ نے سنڈے ناگز کو انترویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ افغانستان میں جنگ جیتنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اس لیے طالبان کے ساتھ سیاسی مذاکرات کی کوئی صورت اختیار کرنا ہوگی۔

- ادھر عراق میں امریکی افواج کے کمانڈر جزل پیٹریوس نے بغداد میں غیر ملکی میڈیا سے بات چیت کے دوران کہا ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں دہشت گردوں سے نمٹنے اور بہتر نتائج حاصل کرنے کیلئے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور پاکستان کے بعض علاقوں میں طالبان کا کنٹرول ختم کرنا انتہائی مشکل ہے، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ عراق میں حاصل ہونے والے تجربہ کو افغانستان میں استعمال کرنا چاہیے لیکن ہر جگہ صور تھال مختلف ہوتی ہے۔

- جبکہ پاکستان میں امریکہ کی سفیر محترمہ این ڈبلیو پیٹریسن نے لاہور میں ایوان صنعت و تجارت کے وفد سے بات چیت کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ ہم افغانستان اور قبائلی علاقوں میں تعلقات عامہ کی جنگ ہار کچکے ہیں اور امریکی پیغام نہیں پہنچا سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ سے متاثرہ علاقوں کیلئے ایک ارب ستر کروڑ ڈالر سالانہ دے رہا ہے لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پیسہ وہاں خرچ ہونے کی

بجائےِ درآمدی بل کی ادائیگی میں خرچ ہو رہا ہے۔

اس فضائیں ۸ آکتوبر کو پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاسِ اسلام آباد میں طلب کر لیا گیا ہے جس میں قانون کا نفاذ کرنے والے اور حساس اداروں کے سربراہ پاکستانی عوام کے منتخب نمائندوں کو ملک میں امن و امان کی صورتحال کے بارے میں بریفنگ دیں گے۔ ملک کی عمومی صورتحال، امن عامہ کے بگڑتے ہوئے حالات اور قومی خود مختاری کے حوالے سے پارلیمنٹ کا یہ مشترکہ اجلاس اس حوالے سے انتہائی خوش آئند ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور پارلیمنٹ کو یہ موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ نازک اور حساس ملکی صورتحال کے بارے میں برہ راست آگاہی حاصل کر کے اس کو بہتر بنانے کیلئے اپنی رائے دے سکے۔ لیکن ان اس کے ساتھ ہی سابق وزیر خارجہ جناب خورشید محمود قصوری کے اس بیان نے پارلیمنٹ کے اس اجلاس کی افادیت پر سوالیہ نشان لگادیا ہے کہ قومی پالیسی میں تبدیلی کی کوئی توقع نہیں کی جانی چاہیے اس لیے کہ اگر آج میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم ہوتے تو انہیں بھی اسی پالیسی پر عمل کرنا پڑتا۔

ویسے تو جناب خورشید احمد قصوری کے اس بیان سے پہلے بھی ملک کے ہر عام آدمی کا تاثر ہی ہے کہ ہماری پالیسیاں نہ پارلیمنٹ طے کرتی ہے اور نہ ہی ملک کے اندر تنقیل پاتی ہیں لیکن سابق وزیر خارجہ کے بیان نے اس عمومی تاثر پر مہر تصدیق ضرور ثابت کر دی ہے اور ملک کے عام شہری یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ جب قومی پالیسیاں طے شدہ ہیں اور ان میں تبدیلی کسی کے بس میں نہیں ہے تو پھر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس اور اس میں عوام کے منتخب نمائندوں کو بریفنگ کے اس اہتمام کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کے باوجود ہم ۸ آکتوبر کو منعقد ہونے والے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے ناامید نہیں ہیں اور اسے بہر حال بہتری کی طرف ایک قد سمجھتے ہوئے اس موقع پر عوام کے منتخب نمائندوں کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

- دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے عمومی تناظر میں یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ جنگ ”دہشت گردی“ کی کوئی تعریف اور اس کا مصدقاق طے کیے بغیر لڑی جا رہی ہے جس میں کسی گروہ یا ملک کو دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑنے کا اختیار صرف امریکہ کے پاس ہے اور اس کے فیصلے کے خلاف اپیل کا کوئی غیر جانبدار فورم عالمی سطح پر موجود نہیں ہے۔

- اس جنگ میں طالبان اور القاعدہ کے اس موقف کو نظر انداز کر دینا لیل اور داشت کی دنیا میں ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک میں غیر ملکی مداخلت اور فوج کشی کے خلاف آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ دنیا کا کوئی فورم غیر جانبدار ارہ ماحول میں ان کی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہے اس لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور آپشن موجود نہیں ہے کہ وہ ہتھیار اٹھانے رکھیں اور اپنی جانوں پر کھلیں کر اپنی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ کریں۔

- پاکستان کے اندر خود کش حملوں اور حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے بارے میں ہم بار بار واضح طور پر یہ

کہہ چکے ہیں کہ ہم ان کو جائز نہیں سمجھتے اور ملک کے بے گناہ شہریوں اور نہتے لوگوں کے قتل عام کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن ہم اس کے اسباب و عوامل سے آعصیں بند کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں اس لیے کہ جب تک اسباب کو دور نہ کیا جائے ان کے نتائج اور عمل کو روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً سوات کے لوگوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں وہی شرعی نظام دیا جائے جو پاکستان کے ساتھ ریاست سوات کے باقاعدہ الحال سے قبل ان کے ہاں عدالتوں میں موجود تھا مگر پاکستان میں شامل ہونے کا انہیں یہ صلہ ملا کہ انہیں عدالتی شرعی نظام سے محروم کر دیا گیا۔ حکومت اس بات کو تسلیم بھی کرتی ہے چنانچہ ۲۰۰۸ء کا توپر کوز نامہ پاکستان لاہور میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق صوبہ سرحد کے سینٹر وزیر بشیر احمد بلور نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ دو ماہ کے اندر مالاکنڈ کے اضلاع میں شرعی نظام عدل ریکویشن ۲۰۰۸ء نافذ کر دیا جائے گا جس کے تحت تمام فوجداری مقدمات کو چار ماہ میں اور دیوانی مقدمات کو چھ ماہ میں نمائانا لازمی قرار دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس ریکویشن کا مقصد مالاکنڈ کے سات اضلاع کے عوام کو فوری اور سستے انصاف کی فراہمی ہے۔

یہاں خمنا جناب بشیر احمد بلور کی خدمت میں یہ سوال پیش کیا جا رہا ہے کہ کیا فوری اور سستے انصاف صرف مالاکنڈ کے سات اضلاع کی ضرورت ہے اور صوبہ سرحد اور ملک بھر کے دیگر شہریوں کو اس سے محروم رکھنے کا آخر کیا جواز ہے؟ لیکن اس سے ہٹ کر ہم دہشت گردی کے خلاف مبینہ جنگ کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جب سوات کے عوام کے اس مطالبہ کو حکومت درست تسلیم کرتی ہے تو پھر جنگ کو طول دینے اور فوجی آپریشن کے ذریعے سوات کے عوام پر جنگ مسلط رکھنے کا کیا جواز ہے اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟

یہ ایک بات ہم نے مثال کے طور پر عرض کی ہے اور ہماری اصولی گزارش یہ ہے کہ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کے مسائل اور مجبوریاں بھی دیکھی جائیں کیونکہ پاکستان کی پارلیمنٹ ان لوگوں کی بھی نمائندہ ہے اور یہ بات اس کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ کچھ لوگوں نے اگر غلط طرز عمل اختیار کر لیا ہے اور ان کی حرکات سے ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے تو وہ دیکھے کہ اس کے اسباب کیا ہیں اور انہیں کس طرح اس سے باز رکھا جاسکتا ہے؟ صرف آپریشن اور فوج کشی کر کے پورے علاقے کو تباہہ والا کر دینا یہی مسئلہ کا حل نہیں ہے اس لیے ہم عوام کے منتخب نمائندوں سے گزارش کریں گے کہ وہ پوری صورتحال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیں اور محض بیرونی طاقتلوں کی خواہشات کی تکمیل کی بجائے اپنے ملک کے مفاد اور قومی وقار کی پاسداری کا راستہ اختیار کریں۔

- اس کے ساتھ ہم ایک اور زمینی حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے کہ مغربی اقوام تو صرف اور صرف ”بُرنس میں“ ہیں، عقیدہ اور ایمان کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے وہ اس مسئلہ کو بھی بُرنس اور

پیے کے ذریعے حل کرنا چاہتی ہیں اور روپے پیے کے سوا نہیں کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ جبکہ پاکستان اور افغانستان کے عوام ایمان اور عقیدہ سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں، روپیہ پیسہ ان کے نزدیک ہر حال میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے جبکہ اس جنگ میں عقیدہ سے کمٹشت جس درجہ میں کارفرما ہے اس سے کوئی باشمور شخص بے خبر نہیں ہے۔ ایک طرف ڈالرا اور اسلحہ ہے جبکہ دوسری طرف عقیدہ و ایمان اور قوی غیرت ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر کے اس مسئلہ کا جو حل بھی نکالنے کی کوشش کی جائے گی وہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ نہیں دے گی اور عوام کے منتخب نمائندے یقیناً اس بڑی حقیقت کو نظر انداز نہیں کریں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ۱۸ اکتوبر کو اسلام آباد کے پارلینمنٹ ہاؤس میں جمع ہونے والے پاکستانی عوام کے منتخب نمائندوں کے سامنے اس وقت دوسرا سے بڑے چیلنج ہیں:

1. ملک کی سرحدوں کے اندر غیر ملکی حملوں کی روک تھام کر کے قومی خود مختاری کا تحفظ کیسے کیا جائے؟
  2. اور ملک اندر خودکش حملوں کے ذریعے بے گناہ عوام کے قتل عام کو کیسے روکا جائے؟
- ہم دعا گو ہیں کہ ہمارے منتخب نمائندے ان دو سنگین مسئللوں کا کوئی باوقار حل نکالنے میں کامیاب ہوں لیکن یہ گزارش ضرور کریں گے کہ برینٹک رپورٹوں کے ساتھ ساتھ معروضی حالات اور زمینی حقائق بھی پیش نظر رکھیں کیونکہ مسئلہ کا صحیح حل تلاش کرنے کیلئے یہ بھی انتہائی ضروری ہے۔

## دہشت گردی کے خلاف جنگ پر بrifeng

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۰۔۱۰۔۲۰۰۸ء

صدر مملکت نے وزیراعظم کی ایڈواکس پر پارلینمنٹ کا مشترکہ اجلاس ۱۸ اکتوبر کو طلب کر لیا ہے جس میں حساس و قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سربراہان پارلینمنٹ کے ارکان کو بریفنگ دیں گے، اجلاس میں امن و امان کی صورتحال پر تفصیلی بحث کی جائے گی اور حکمت عملی وضع کی جائے گی۔ صدر اور وزیراعظم کا یہ اقدام موجودہ حالات میں یقیناً خوب آئندہ ہے، اس سے جہاں عوام کے منتخب نمائندوں کو حکومتی اقدامات اور پالیسیوں کے بارے میں تفصیلات جاننے کا موقع ملے گا وہاں حکومت کے ذمہ دار حضرات بھی عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے عوام کے جذبات اور تاثرات سے مزید آگاہی حاصل کریں گے۔

ملک میں امن و امان کی صورتحال کے حوالے سے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ کے عنوان سے سرفہرست ہے۔ اور اس جنگ کا پھیلاو جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے عوام کے اضطراب میں اضافے کے ساتھ ساتھ قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کے بارے میں سوالات میں بھی شدت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ ”دہشت گردی“ کیا ہے اور اس کے خلاف جنگ کے اهداف و مقاصد کیا ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے گذشتہ

چند روز کے دوران قومی اخبارات کے ذریعے سامنے آئے والی بعض روپرٹوں اور خبروں پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

- ۳۰ اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ برطانوی نشیانی ادارے بی بی سی کی طرف سے کرائے جانے والے ایک عالمی سروے کے مطابق دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ اپنے سب سے بڑے ہدف ”القاعدہ“ کو کمزور کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ ۳۰ میں سے ۲۲ ممالک کے افراد کے مطابق اوس طرح صدر رائے دہندگان کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کی وجہ سے القاعدہ تنظیم کمزور ہوئی ہے جبکہ سروے میں شریک ۵ سے ۳ رائے دہندگان کہتے ہیں کہ اس جنگ کا القاعدہ پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ القاعدہ اس جنگ سے مضبوط ہوئی ہے۔
- ۳۰ اکتوبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں امریکہ کی سفارتیں ڈبلیو پیٹر سن نے لاہور کے ایوان صنعت و تجارت کے کاروباری افراد سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم افغانستان اور قبائلی علاقوں میں تعلقات عامہ کی جنگ ہار چکے ہیں اور وہاں امریکہ کا پیغام نہیں پہنچا سکے۔ امریکہ پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ کے متاثرہ علاقوں کیلئے ایک ارب ستر کروڑ ڈال رسالہ دے رہا ہے لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پیسہ وہاں خرچ ہونے کی وجہ سے دارالحکومتی بلوں کی ادائیگی میں خرچ ہو رہا ہے۔
- ۵ اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق عالمی امدادی ادارے ریڈ کراس کے ترجمان مارکوسی نے اسلام آباد میں ایک اخبار کو انٹرو یوڈیتے ہوئے پاکستان کو دنیا کا نیا ”وارزون“ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قبائلی علاقے مکمل میدانِ جنگ بن چکے ہیں، پاکستانی فوج طالبان کے خلاف بر سر پیکار ہے، بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں، فور سزی کی بمباری اور جنگجووں کے خوف سے اڑھائی لاکھ افراد نقل مکانی کر گئے ہیں اور کئی ہزار افغانستان میں داخل ہونے کے منتظر ہیں، ہزاروں افراد پناہ گزین کیپروں میں پڑے ہیں اور وادی سوات جہنم میں تبدیل ہو چکی ہے۔
- ۵ اکتوبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر کے مطابق عراق میں امریکی فوج کے کمانڈر جزل پیٹریویسی نے کہا ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں دہشت گروں سے منٹھنے اور بہتر شائع حاصل کرنے کیلئے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بغداد میں غیر ملکی میدیا سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں طالبان کا کنٹرول ختم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عراق میں حاصل ہونے والے تحریک کو افغانستان میں استعمال کرنا چاہیے تاہمیکن ہر جگہ صورتحال مختلف ہوتی ہے۔
- کمیں اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق افغانستان کیلئے یورپی یونین کے سابق اعلیٰ سفارتکار فرانس

- فشاں نے عالمی برادری پر زور دیا ہے کہ وہ افغانستان میں تباہی و بر بادی سے بچنے کیلئے حکمت عملی پر نظر ثانی کرے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان کو مزید تباہی و بر بادی سے بچانا وقت کی اہم ضرورت ہے اس لیے ضروری ہے کہ عالمی برادری افغانستان میں اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اپنی سرگرمیوں اور حکمتِ عملی میں تبدیلی لائے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں اتحادی افواج کی کارروائیوں کے دوران شہریوں کی ہلاکت کے باعث عوایم و غصہ میں اضافہ ہوا ہے جس کے انتہائی منقص اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔
- ۲۳ اکتوبر کو روز نامہ پاکستان میں شائع ہونے والی ایک روپورٹ کے مطابق مغربی ملکوں کے تمام ائمیں جس اداروں کے اہل کار کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک اگلے برسوں میں بھی افغانستان کو زیر نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ القاعدہ اور اس سے وابستہ لوگ اب بھی اتنے ہی مضبوط ہیں جتنے نائن الیون پر حملہ کے وقت تھے۔
  - ۲۴ اکتوبر کو روز نامہ پاکستان نے یہ خبر شائع کی ہے کہ افغانستان میں برطانوی کمانڈر بریگیڈیئر مازک اسمخٹ نے اعتراف کیا ہے کہ افغانستان میں فیصلہ کرنے کیلئے اس لیے برطانیہ کو طالبان کے ساتھ مکملہ ڈیل کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ برطانوی اخبار سنڈے ٹائمز کو دیے گئے انٹرویو میں کمانڈر مازک اسمخٹ نے کہا ہے کہ افغانستان میں برطانیہ کا جنگ جیتنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس بارے میں عوام کو اپنی توقعات میں کمی کرنا ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں عسکریت پسندی کی سطح کو کم کرنے کیلئے اتمامات کرنا ہوں گے، یہ کام افغان فوج کے ذریعے کیا جاسکتا ہے اور طالبان سے مذاکرات کر کے مسئلہ کا سیاسی حل نکالا جاسکتا ہے۔
  - گذشتہ ایک ہفتے کے دوران شائع ہونے والی میسیوں خبروں اور روپورٹوں میں سے ان چند خبروں کا ہم نے بطور مثال حوالہ دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں امریکہ اور اتحادیوں نے گذشتہ برس میں کیا کچھ حاصل کیا ہے اور مستقبل قریب میں مزید کیا کچھ حاصل ہونے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس جنگ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ برآمد ہونے والا نہیں تھا اور ہم جنگ کے آغاز میں ہی اس خیال کا اظہار اس کالم میں کر چکے ہیں، اس لیے کہ اس جنگ کی بنیاد ہی مخالفین اور فریب کاری پر تھی۔ مخالفین اور فریب کاری کی اساس پر لڑی جانے والی جنگوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔
  - دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ دہشت گردی کا کوئی واضح مفہوم اور مصدق طے کیے بغیر لڑی جا رہی ہے۔ کسی گروہ یا ملک کو دہشت گرد قرار دینے اور اس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے کیلئے کوئی اصول اور ضابطہ موجود نہیں، بلکہ یہ اختیار اتحادی افواج اور ان کے قائد امریکہ کے پاس ہے کہ وہ جس کو چاہیں دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف عسکری یلغار کر دیں۔ اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادی کہتے ہیں کہ طالبان اور القاعدہ دہشت گرد ہیں اس لیے ان کے خلاف جنگ ضروری ہے جبکہ طالبان اور القاعدہ کا کہنا

ہے کہ وہ افغانستان اور مذل ایسٹ میں غیر ملکی افواج کی موجودگی کے خلاف اپنی آزادی اور خود مختاری کی جتنگ لڑ رہے ہیں۔ قسمتی سے ان دونوں کا موقف سن کر غیر جانبداری کے ساتھ فیصلہ کرنے والا کوئی ایسا فرم دنیا میں موجود نہیں جس پر دونوں فریق اعتماد کرتے ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ جنگ ہتھیاروں سے ہی لڑی جائے گی اور وہی غالب ہو گا جو طاقت اور ہتھیاروں سے دوسرے کو شکست دے گا۔

• امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا ہے اور دنیا کو بھی مسلسل وہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ القاعدہ اور طالبان صرف دو طبقے ہیں جن کو زیر کرنے سے معاملہ حل ہو جائے گا۔ جبکہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ یہ صرف دو طبقے نہیں بلکہ افغان اور عرب عوام کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں جس کا اظہار وقایٰ فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی قوم کو زیر کرنے میں آج تک کسی کو کامیاب نہیں ہوئی اور نہ ہی آئندہ کبھی اس کا مکان موجود ہے۔

• امریکہ اور اس کے اتحادی دنیا کو غلط طور پر یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ دہشت گردی محض غربت اور جہالت کی وجہ سے ہے اس لیے اگر مغربی تعلیم سے لوگوں کو بہرہ ور کر دیا جائے اور چار پیسے دے دیے جائیں تو فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ جبکہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ جسے دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے وہ دراصل امریکہ اور مغربی اقوام کی ان مسلسل زیادتیوں، نا انصافیوں اور مظالم کا رد عمل ہے جو وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ بالعموم اور فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر کے مسلمانوں کے خلاف بالخصوص طویل عرصے سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جب تک ان زیادتیوں اور نا انصافیوں کا خاتمه نہیں ہو گا ان کے رد عمل کو کتنا بھی ممکن نہیں ہو گا۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت اسماء بن لادن کو بتایا جاتا ہے جبکہ وہ اور ان کے گروپ کے افراد نہ غریب ہیں اور نہ ہی ان پڑھ ہیں۔

اس پس منظر میں ۸ اکتوبر کو عوام کے منتخب نمائندے اسلام آباد میں صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے جمع ہو رہے ہیں تو ہم اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ بالآخر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس کا موقع مل گیا ہے کہ وہ اس اہم ترین قومی مسئلہ پر باہمی تبادلہ خیالات کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ گزارش بھی کرنا چاہیں گے کہ بلاشبہ پاکستان میں امن و امان کے حوالے سے ہمارے لیے دو بڑے چیزیں ہیں:

1. ایک یہ کہ وطن عزیز کی سرحدوں میں بیرونی مداخلت و حملوں کو روکنے اور قومی خود مختاری کے تحفظ کیلئے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

2. اور دوسرا یہ کہ ملک کے اندر خودکش حملوں میں مسلسل اضافہ اور ان میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کی ہلاکتوں کا کیسے سد باب کیا جاسکتا ہے؟

ہم پاکستان کی سرحدوں کے اندر یا روئی حملوں اور انہروں ملک خود کش حملوں کی بیان نہ ملت کرتے ہوئے آپ کے ساتھ ہیں۔ البتہ یہ درخواست ہم ضرور کریں گے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے عمومی اور عالمی تناظر کو بھی سامنے رکھیں اور صورت حال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے ملک میں امن و امان کی بجائی، قومی خود منیری کے تحفظ اور ملکی و قارکیلے کوئی ٹھوس حکمتِ عملی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا عالی و ناصر ہو، آمین یا رب العالمین۔

## "دہشت گردی" کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد

مایباہمہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۸ء

صدر مملکت نے وزیر اعظم کی ایڈواکس پر پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ۸ اکتوبر کو طلب کر لیا ہے جس میں حساس اداروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سربراہان پارلیمنٹ کے ارکان کو برینگ دیں گے۔ اجلاس میں امن و امان کی صورت حال پر تفصیلی بحث کی جائے گی اور حکمت عملی وضع کی جائے گی۔ صدر اور وزیر اعظم کا یہ اقدام موجودہ حالات میں یقیناً خوش آئند ہے اور اس سے جہاں عوام کے منتخب نمائندوں کو حکومتی اقدامات اور پالیسیوں کے بارے میں تفصیلات جاننے کا موقع ملے گا، وہاں حکومت کے ذمہ دار حضرات بھی عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے عوام کے جذبات اور تاثرات سے مزید آگاہی حاصل کریں گے۔

ملک میں امن و امان کی صورت حال کے حوالے سے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ "دہشت گردی" اور اس کے خلاف جنگ" کے عنوان سے سرفہرست ہے اور اس جنگ کا پھیلاؤ جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے، عوام کے اضطراب میں اضافے کے ساتھ قوی خود منیری اور ملکی سالمیت کے بارے میں سوالات میں بھی شدت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ دہشت گردی کیا ہے اور اس کے خلاف جنگ کے اهداف و مقاصد کیا ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے گذشتہ چند روز میں قومی اخبارات کے ذریعے سامنے آئے والی بعض رپورٹوں اور خروں پر ایک نظر ڈالینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

- ۳۰ ستمبر کو شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی کی طرف سے کرائے جانے والے ایک عالمی سروے کے مطابق دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ اپنے سب سے بڑے ہدف "القاعدہ" کو کمزور کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ تیس میں سے ہائیں ممالک کے افراد کے مطابق اوس طبقاً ہائیں فی صدر رائے دہندگان کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کی وجہ سے القاعدہ تنظیم کمزور ہوئی ہے، جبکہ سروے میں شریک ہر پانچ میں سے تین رائے دہندگان

- کہتے ہیں کہ اس جنگ کا القاعدہ پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ القاعدہ اس جنگ سے مضبوط ہوئی ہے۔
- ۰۳ اکتوبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں امریکہ کی سفیر محمد این ڈبلیو پیٹریشن نے لاہور کے ایوان صفت و تجارت کے کاروباری افراد سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم افغانستان اور قبائلی علاقوں میں تعلقات عامہ کی جنگ ہار چکے ہیں اور امریکی پیغام نہیں پہنچا سکے۔ امریکہ پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ کے متاثر علاقوں کیلئے ایک ارب ستر کروڑ ڈالر سالانہ دے رہا ہے، لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پیسہ وہاں خرچ ہونے کی وجہے دارمدی بل کی ادائیگی میں خرچ ہو رہا ہے۔
- ۰۴ اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق عالمی ادارے ”ریڈ کراس“ کے ترجمان مارکوس نے اسلام آباد میں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کو دنیا کا نیا ”وارزون“ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قبائلی علاقے کامل میدان جنگ بن چکے ہیں، پاکستانی فوج طالبان کے خلاف بر سر پیکار ہے، بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں، فور سزکی بمباری اور جنگجوؤں کے خوف سے اڑھائی لاکھ افراد نقل مکانی کر گئے ہیں، اور کئی ہزار افغانستان میں داخل ہونے کے منتظر ہیں، ہزاروں افراد پناہ گزین کیمپوں میں پڑے ہیں اور وادی سوات جہنم میں تبدیل ہو چکی ہے۔
- ۰۵ اکتوبر کو ہی شائع ہونے والی ایک اور خبر کے مطابق عراق میں امریکی فوج کے کمانڈر جنرل پیٹریوس نے کہا ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں دہشت گروں سے نہیں اور بہتر تنائی حاصل کرنے کیلئے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بغداد میں غیر ملکی میدیا سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں طالبان کا کنشروں ختم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عراق میں حاصل ہونے والے تجربہ کو افغانستان میں استعمال کرنا چاہیے تھا، لیکن ہر جگہ صورت حال مختلف ہوتی ہے۔
- ۰۶ کیم اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق افغانستان کیلئے یورپی یونین کے سابق اعلیٰ سفارت کار فرانس منشال نے عالمی برادری پر زور دیا ہے کہ وہ افغانستان میں تباہی و بربادی سے بچنے کیلئے حکمت عملی پر نظر ثانی کرے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان کو مزید تباہی و بربادی سے بچانا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس لیے ضروری ہے کہ عالمی برادری افغانستان میں اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اپنی سرگرمیوں اور حکمت عملی میں تبدیلی لائے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں اتحادی افواج کی کارروائیوں کے دوران شہریوں کی ہلاکت کے باعث عوامی غم و غصہ میں اضافہ ہوا ہے جس کے انتہائی منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

- ۲۷ اکتوبر میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق مغربی ملکوں کے تمام ائمیں جنس اداروں کے اہل کار کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک اگلے سات برسوں میں بھی افغانستان کو زیر نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ القاعدہ اور اس سے وابستہ لوگ اب بھی اتنے ہی مضبوط ہیں جتنے نائیں المیون کے حملوں کے وقت تھے۔
- ۲۸ اکتوبر کو روزنامہ پاکستان نے یہ خبر شائع کی ہے کہ افغانستان میں برطانوی کمانڈر بریگیڈیئر مازک اسمٹھ نے اعتراف کیا ہے کہ افغانستان میں فیصلہ کن فتح ممکن نہیں ہے، اس لیے برطانیہ کو طالبان کے ساتھ مکنہ ڈیل کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ برطانوی اخبار ”سٹھرے ٹائمز“ کو دیے گئے انٹرویو میں کمانڈر مازک اسمٹھ نے کہا ہے کہ افغانستان میں برطانیہ کا جنگ جیتنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس بارے میں عوام کو اپنی توقعات میں کمی کرنی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں عسکریت پسندی کی سطح کو کم کرنے کیلئے اقدامات کرنا ہوں گے۔ یہ کام افغان فوج کے ذریعے کیا جاسکتا ہے اور طالبان سے مذکرات کر کے منسلکے کا سیاسی حل نکالا جاسکتا ہے۔
- گذشتہ ایک ہفتے کے دوران شائع ہونے والی بیسیوں خبروں اور رپورٹوں میں سے ان چند خبروں کا ہم نے بطور مثال حوالہ دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے گذشتہ سات برس میں کیا کچھ حاصل کیا ہے اور مستقبل قریب میں مزید کیا کچھ حاصل ہونے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس جنگ کا تیجہ اس کے سوا کچھ برآمد ہونے والا نہیں تھا اور ہم جنگ کے آغاز میں ہی اس خیال کا اظہار کرچکے ہیں، اس لیے کہ اس جنگ کی بنیاد ہی مغالطوں اور فریب کاری پر تھی اور مغالطوں اور فریب کاری کی اساس پر لڑی جانے والی جنگوں کا تیجہ بھی ہوا کرتا ہے۔
- دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ دہشت گردی کا کوئی واضح مفہوم اور مصدق طے کیے بغیر لڑی جا رہی ہے، کسی گروہ یا ملک کو دہشت گرد قرار دینے اور اس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے کیلئے کوئی اصول اور ضابطہ موجود نہیں ہے اور یہ اختیار اتحادی افواج اور ان کے قائد امریکہ کے پاس ہے کہ وہ جس کو چاہیں، دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف عسکری یا لیگار کر دیں۔ اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادی کہتے ہیں کہ طالبان اور القاعدہ دہشت گرد ہیں، اس لیے ان کے خلاف جنگ ضروری ہے جبکہ طالبان اور القاعدہ کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان اور ملک ایسٹ میں غیر ملکی مداخلت اور غیر ملکی افواج کی موجودگی کے خلاف اپنی آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ بدقتی سے ان دونوں کے موقف سن کر غیر جانبداری کے ساتھ فیصلہ کرنے والا کوئی ایسا فورم دنیا میں موجود نہیں ہے جس پر دونوں فریق اعتماد کرتے ہوں، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ جنگ ہتھیاروں سے ہی لڑی جائے گی اور وہی غالب ہو گا جو طاقت اور ہتھیار سے دوسرے کو شکست دے گا۔

- امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا ہے اور دنیا کو بھی مسلسل یہ باور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ القاعدہ اور طالبان صرف دو طبقے یا گروہ ہیں جن کو زیر کرنے سے معاملہ حل ہو جائے گا، جب کہ زمینی حقوق یہ ہیں کہ یہ صرف دو طبقے نہیں بلکہ افغان اور عرب عوام کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں جس کا اظہار وقت فوتوٹا ہوتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی قوم کو زیر کرنے میں آج تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی اور نہ ہی آئندہ کبھی اس کا مکان موجود ہے۔
- امریکہ اور اس کے اتحادی دنیا کو غلط طور پر یہ باور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ دہشت گردی غربت اور چالات کی وجہ سے ہے، اس لیے اگر مغربی تعلیم سے لوگوں کو بہرہ درکر دیا جائے اور چارپیے دے دیے جائیں تو فتح حاصل ہو سکتی ہے، جب کہ زمینی حقوق یہ ہیں کہ جسے دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے، وہ دراصل امریکہ اور مغربی اقوام کی ان مسلسل زیادتیوں، نا انصافیوں اور مظلوم کا رد عمل ہے جو وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ بالعموم اور فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر کے مسلمانوں کے خلاف بالخصوص طویل عرصہ سے چاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جب تک ان زیادتیوں اور نا انصافیوں کا خاتمہ نہیں ہو گا، ان کے رد عمل کو روکنا بھی ممکن نہیں ہو گا۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت اسماء بن لادن کو بتایا جاتا ہے اور وہ اور اس کے گروپ کے افراد نہ غریب ہیں اور نہ ہی ان پڑھ ہیں۔
- اس پس منظر میں ۱۸ اکتوبر کو عوام کے منتخب نمائندے اسلام آباد میں صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے جمع ہو رہے ہیں تو ہم اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ بالآخر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس کا موقع مل گیا ہے کہ وہ اس اہم ترین قوی مسئلہ پر بامکنی تباہ لئے خیالات کریں، لیکن اس کے ساتھ ہم یہ گزارش بھی کرنا چاہیں گے کہ بلاشبہ پاکستان میں امن و امان کے حوالے سے ہمارے لیے دو بڑے چیزیں ہیں: ایک یہ کہ طعن عزیز کی سرحدوں میں بیرونی مداخلت اور حملوں کو روکنے اور قوی خود مختاری کے تحفظ کیلئے ہم کیا کر سکتے ہیں اور دوسرا یہ کہ ملک کے اندر خود کوش حملوں میں اضافہ اور ان میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کی ہلاکت کا کیسے سد باب کیا جاسکتا ہے؟ ہم پاکستان کی سرحدوں کے اندر بیرونی حملوں اور اندر وون ملک خود کوش حملوں کی کیسا نہ مت کرتے ہوئے آپ کے ساتھ ہیں، البتہ یہ درخواست ہم ضرور کریں گے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کے عمومی اور عامی تناظر کو بھی سامنے رکھیں اور صورتحال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے ملک میں امن و امان کی بجائی، قوی خود مختاری کے تحفظ اور ملکی وقار کیلئے کوئی ٹھوس حکمت عملی اختیار کریں۔  
اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین یا رب العالمین۔

مذکورہ گزارشات راقم الحروف نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے قبل روز نامہ پاکستان میں اپنے کالم کے ذریعے پیش کیں جو ۷ اکتوبر کو شائع ہوئیں، جبکہ اس کے بعد اجلاس کے دوران جیوئی دنی کے معروف پروگرام ”کیپٹل ٹاک“ کی

و نشستوں میں مجھ پر و فیسر عبد الجبار شاکر، مولانا داڑھ محمد سرفراز نعیمی اور مولانا امین شہیدی کے ساتھ مد عکیا گیا۔ ان نشستوں میں راقم الحروف نے مختلف سوالات کے جواب میں جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔

سوال: خود کش حملوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: خود کش حملہ ایک جنگی ہتھیار ہے جو مظلوم قومیں ہمیشہ سے استعمال کرتی آ رہی ہیں۔ یہ ہتھیار جانپنیوں نے بھی استعمال کیا تھا، جنگ عظیم میں برطانیہ نے بھی استعمال کیا تھا اور ۱۹۴۵ء کی جنگ میں پاک فوج نے بھی چونڈہ کے مجاز پر استعمال کیا تھا۔ دوسرے جنگی ہتھیاروں کی طرح یہ بھی میدان جنگ میں استعمال ہو تو جائز ہے، لیکن پر امن ماحول میں اس کا استعمال ناجائز ہو گا۔

سوال: پاکستان میں خود کش حملوں کے بارے میں علماء کا فوتویٰ شائع ہوا ہے کہ یہ حرام ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: پاکستان میں خود کش حملوں کو ناجائز کہنے والوں میں خود میں بھی شامل ہوں، اس لیے کہ پاکستان اس حوالے سے نظریاتی طور پر ایک اسلامی ریاست ہے کہ پاکستان کا دستور قرارداد مقاصد کو اپنی بنیاد قرار دیتا ہے، قرآن و سنت کی پالادستی کو تسلیم کرتا ہے، اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کرتا ہے، قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی سے پارلیمنٹ کو روکتا ہے اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ کا وعدہ کرتا ہے، اس لیے جب تک یہ دستوری پوزیشن موجود ہے، پاکستان عملی طور پر کچھ بھی ہو، مگر نظریاتی طور پر بہر حال ایک اسلامی ریاست ہے اور اسلامی ریاست میں حکومت کے خلاف کسی بھی مطالبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے۔

سوال: قبائلی علاقہ میں جو فوتویٰ آپریشن اور خود کش حملے ہو رہے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: اس وقت پاکستان کی مغربی سرحد پر جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ہمارے خیال میں تین قسم کے عناصر ملوث ہیں: وہ انتہا پسند اور جذباتی مسلمان بھی ان میں شامل ہیں جو نفاذ شریعت کے سلسلے میں حکومت کے مسلسل منفی طرز عمل کے باعث رد عمل کا شکار ہو کر ایسا کر رہے ہیں۔ ان کے طریق کار سے ہمیں اختلاف ہے، لیکن ان کا یہ موقف بہر حال درست ہے کہ ملک بھر میں اور خاص طور پر قبائلی علاقوں میں شرعی نظام نافذ کیا جائے۔ دوسرے نمبر پر ان واقعات میں بین الاقوامی محکمات کارفرائیں اور مختلف قوتوں اس میں ملوث ہو کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان میں امریکہ، اسرائیل اور بھارت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور تیسرا نمبر پر بہت سے جرائم پیشہ لوگ بھی اس فضائی آری میں اپنے مذہب موم مقاصد پورا کرنے کیلئے اس میں شامل ہو گئے ہیں جیسا کہ ایسے موقع پر اس طرح ہوتا ہے، اس لیے اس میں دہشت گردی پر قابو پانے کیلئے ان تمام عناصر کو سامنے رکھ کر صورتحال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ہو گا، ورنہ حالات کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہو گا۔

سوال: علمائے کرام اور آپ حضرات اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: ہم اس صورتحال میں ان ناراض حضرات سے بات کرنے کیلئے تیار ہیں جو نفاذ شریعت کیلئے ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی منت کریں گے اور ان کو پوری طرح سمجھانے کی کوشش کریں گے، لیکن اس کیلئے مشتملی طور پر ضروری

ہے کہ حکومت بھی اس سلسلے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرے اور اس کا ثبوت دے اور میرے نزدیک اس سنجیدگی کا ثبوت دے صورتوں میں ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ پارلیمنٹ کی سطح پر فیصلہ کیا جائے کہ قبائلی علاقوں کا مسئلہ فوجی آپریشن کی وجائے مذکورات کے ذریعے حل کیا جائے گا، اور دوسرا یہ کہ سوات اور مالاکند ڈویژن کیلئے جس "شرعی نظام عدل ریکویشن" کے نفاذ کا حکومت اس علاقے کے لوگوں سے بار بار وعدہ کر رہی ہے اور اس کا کئی بار اعلان ہو چکا ہے، حکومت علامت کے طور پر وہاں کے لوگوں کو اعتماد میں لے کر وہ شرعی نظام عدل ریکویشن نافذ کر دے۔ جب حکومت یہ دو کام پیشگی کر لے گی تو باقی ماندہ امور کیلئے ہم وہاں جانے اور کردار ادا کرنے کیلئے تیار ہوں گے۔

اس پس منظر میں پارلیمنٹ نے "دہشت گردی کے خلاف جنگ" کے سلسلے میں مختلف اداروں کی طرف سے دی جانے والی برینگ اور اس پر کئی روز کے بحث و مباحثہ کے بعد جو قرارداد متفقہ طور پر منظور کی ہے، وہ کئی حوالوں سے ہمارے لیے اطمینان بخش ہے۔ مثلاً یہ کہ:

- قوم کے منتخب نمائندوں کو اعتماد میں لیا گیا ہے اور انہیں پالیسی سازی میں اصولی طور پر شریک کیا گیا ہے۔
  - پارلیمنٹ نے قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کے تحفظ کو اولین ترجیح قرار دیتے ہوئے دہشت گردی کے خلاف جنگ کی حکومت عملی اور سڑڑیجی پر نظر ثانی اور اس کی از سر نو تشكیل کو ضروری قرار دیا ہے۔
  - ملٹری آپریشن پر مذکورات کو ترجیح دیتے ہوئے متعلقہ فریقوں سے مذکورات کیلئے کہا گیا ہے۔
- ہماری معلومات کے مطابق پارلیمنٹ کے ارکان کی برینگ اور متفقہ قرارداد کو متوازن بنانے کیلئے پاکستان مسلم ایگ (ن) کے راہ نمازوں ارجمند علمائے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن نے موئٹر کردار ادا کیا ہے جس کیلئے وہ پوری پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر بھی تنشکر و تبریک کے محتق بیں اور ہم اس متفقہ قرارداد پر پارلیمنٹ کی تمام جماعتوں کو مبارک بار پیش کرتے ہیں۔

ہمارے خیال میں پارلیمنٹ کی اس متفقہ قرارداد سے "دہشت گردی کے خلاف جنگ" کے حوالے سے پوری قوم کے جنبات و احاسات کی عکاسی ہوئی ہے اور مجموعی طور پر قوم کا موقف دنیا کے سامنے آگیا ہے، لیکن یہ بہر حال قرارداد ہے جس کو عمل کے دائرے میں لانے کیلئے حکومتی کیپ اور حکومت کی ترجیحات اور رمحانات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں اور پوری قوم کی نظریں اب حکومت پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کی قرارداد پر عملدرآمد کیلئے کیا اقدامات کرتی ہے اور عوام کے منتخب نمائندوں کا یہ موقف پاکستان کی خود مختاری، سرحدوں کے لقدس، مکمل سالمیت اور امن و امان کے حوالے سے صورتحال کو بہتری کی طرف لے جانے میں کس قدر موثر ثابت ہوتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ پاکستان کے حکمران اس نازک مرحلے میں ملک و قوم کی بہتری اور وقار و استحکام کیلئے موئٹر کردار ادا کریں اور وطن عزیز کو اس دلدل سے باعزت طور پر باہر نکالنے میں کامیاب ہوں۔ آمین یارب العالمین۔

## دہشت گردی کے خلاف جنگ اور پارلیمنٹ کا فیصلہ

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۸ء

پارلیمنٹ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے متعلقہ اداروں کی طرف سے دی جانے والی بریفنگ اور اس پر بحث و مباحثہ کے بعد جو قرارداد متفقہ طور پر منظور کی ہے اس میں جمیعت علماء اسلام پاکستان اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کی طرف سے پیش کی جانے والی یہ ترمیم بھی شامل کر لی گئی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف پالیسی کا از سر نوجائزہ لے کر قومی سلامتی کیلئے مشترکہ حکمت عملی اختیار کی جائے گی، نیز عسکریت اور انتہا پسندی سے منٹنے کیلئے مذکورات پہلی ترجیح ہوں گے۔

دہشت گروں کے خلاف جنگ کے عنوان سے اب تک جو کارروائیاں ہو رہی ہیں ان پر اس حوالے سے ملک بھر میں پریشانی اور اضطراب بڑھتا جا رہا ہے کہ:

- ان کارروائیوں پر بیرونی ایکنڈا احادیث ہے،

- اس میں ملک و قوم کے مفادات، قومی رائے عامہ اور عوام کے جذبات و احساسات کا لحاظ نہیں رکھا جا رہا،

- اور ملک بین الاقوامی طاقتوں کے مفادات کی اس دلدل میں مزید دھنستا چلا جا رہا ہے۔

اس لیے ملک کے دینی و سیاسی حلقوں کا مسلسل یہ مطالبہ چلا آرہا ہے کہ اس پالیسی کا قومی مفادات اور عوامی جذبات کے پیش نظر از سر نوجائزہ لیا جائے۔ ہمیں اطمینان ہے کہ پارلیمنٹ نے اس سے اتفاق کر لیا ہے اور دہشت گردی کے خلاف اٹھی جانے والی جنگ کا از سر نوجائزہ لینے کا فیصلہ کیا ہے، ہم اس پر پارلیمنٹ کے تمام ارکان، حکومتی اتحاد اور خاص طور پر جمیعت علماء اسلام اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے قائدین کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کے مطابق ”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ کا نئے سرے سے جائزہ لے کر قومی مفادات اور عوامی جذبات کے مطابق مضبوط، دو ٹوک اور باد قار پالیسی اختیار کی جائے گی۔

پارلیمنٹ کے اجلاس کے موقع پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدر، حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا مشتی محمد رفع عثمانی اور حضرت مولانا ذاکر عبد الرزاق سکندر سمیت مختلف مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی طرف سے ایک اعلامیہ ارکان پارلیمنٹ کو پہنچوایا گیا تھا۔ جبکہ پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی نے بھی ایک عرض داشت ارکان پارلیمنٹ کی خدمت میں پیش کی تھی جو اسی شمارے میں شامل اشاعت ہے۔ یہ تحریر اس مسئلہ پر قومی اور دینی حلقوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہے اس لیے ہم اسے اس تمہید کے ساتھ ”حالات و واقعات“ کے طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

## علماء کرام کی ارکانِ پارلیمنٹ سے دردمندانہ اپیل

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على سيدنا وشفيينا ومولانا محمد والله واصحابه  
اجمعين، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين، اما بعد۔  
معززار کان پارلیمنٹ اسلامی جمہوریہ پاکستان!  
السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

اس وقت اسلامی جمہوریہ پاکستان جس نازک صورتحال سے دوچار ہے اور پوری قوم جس تشویش، بے چینی اور فکر میں مبتلا ہے، وہ اہل نظر پر پوشیدہ نہیں۔ بحمد اللہ قویٰ آسمبلی سینیٹ کے منتخب ممبر ان اور حکومت کے سرکردہ افراد پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اس نازک صورتحال پر غور کرنے کیلئے جمع ہیں، اس اہم موقع پر ہم اپنی قویٰ اور شرعی ذمہ داری صحیح ہوئے آپ کی خدمت میں کچھ گزار شatas پیش کر رہے ہیں تاکہ امن و امان کی شگین صورتحال اور ملک کے موجودہ بحران کے حقیقی اسباب اور حکومتی اقدامات اور خارجی و قویٰ پالیسیوں کا تقيیدی جائزہ لے کر پارلیمنٹ ملک کو موجودہ بھنوڑ سے نکلنے کیلئے صحیح اور ٹھوس فیصلے کر سکے۔ ہمارے خیال میں اگر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ صوبہ سرحد قبائلی علاقوں اور سوات وغیرہ کے بگٹھے ہوئے حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دہاں کے عوام و خواص درج ذیل طبقات میں مقسم نظر آتے ہیں:

- (الف) مسلمانوں کی بھاری اکثریت جو ہمیشہ پر امن رہی ہے اور اب بھی پر امن اور وطن کی محبت سے سرشار ہے، یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی محافظ ہے اور دشمن کیلئے ہمیشہ نا قبل تباہی ہے اور علاقے کے علمائے کرام ان میں سرہنہست ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قبائل اپنی قدیم روایات کے تحفظ کو بھی اپنی قویٰ غیرت و حمیت کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کی بنت نماز، روزہ اور سترو جاب وغیرہ دینی معاملات کے زیادہ پاندہ اور ان کے بارے میں زیادہ حساس ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی حکومت دین یا اہل دین کا مذاق اٹائے، یادیں اور اہل دین کو رسوا کرنے یا ان کی قدیم روایات کو پالا کر کے ان پر غیر ملکی حکمرانوں، یا غیر ملکی نظریات کو مسلط کرنے کی کوشش کرے تو وہ پر آمن ہونے کے باوجود اس سے سخت نفرت کرتے ہیں اور غیر ملکی افواج یا غیر اسلامی نظریات کا تسلط ان کیلئے کسی حالت میں قابل برداشت نہیں۔ اس وقت دہاں جو بہاری ہو رہی ہے، یا تشدید کروکنے کیلئے جو فوجی آپریشن جاری ہے، اس کا زیادہ تر نقصان اسی مظلوم اور پر امن اکثریت کو پہنچ رہا ہے، جس میں بے گناہ جوان، بوڑھے، عورتیں اور معمصوں بچے لقمه اجلیں بن رہے ہیں۔

- (ب) محب وطن مسلمانوں کی اس بھاری اکثریت میں بہت سے مخلص مُرشتعن نوجوان ایسے بھی ہیں جو جامعہ حفظہ اور اپنے علاقوں میں مظلوم مسلمانوں کی شہادت پر اور حکومت کی خلاف اسلام اور نامعقول

افغان پاکیسٹانی پر غم و غصے اور انتقام کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے علماء کرام کے منع کرنے کے باوجود اپنے دینی اخلاقی اور علاقوائی غیرت کی بنابری اپنے پیارے عزیزوں کی لاشیں دیکھ کر ہتھیار اٹھالیے ہیں اور خود کش حملوں کا پاکستان کے اندر ہی وہ راستہ اختیار کر لیا ہے جو حد درج خطرناک ہے، حالانکہ علمائے کرام ایسے حملوں کو وجہلے ہی حرام قرار دے چکے ہیں جن کا بے گناہ لوگ نشانہ بن جائیں، لیکن مذکورہ بالا اشتعال انگیز اسباب کی بنابری یہ پھرے ہوئے نوجوان انتقام کی پیاس کو ایک دوسرے کے خون سے بچا رہے ہیں۔

(ج) جب کسی علاقے میں افراتفری، بمباری اور خانہ جنگی کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے تو سماج و شمن عناصر مثلًا چوروں، ڈاکوؤں کی بن آتی ہے، کبھی وہ اپنے مذموم عزائم کی خاطر غیر ملکی افواج سے مل جاتے ہیں، کبھی ملکی افواج سے اور کبھی ان نوجوانوں کے ساتھ اگر شریک ہو جاتے ہیں جن کو حالات نے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ ملکی حالات کی خرابی میں وہاں کے باخبر علمائے کرام اور بااثر حضرات کے بیان کے مطابق ایسے عناصر کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔

(د) امریکی افواج اپنی معاون نیٹو افواج نیز بھارتی ایجننسیوں کے ساتھ گذشتہ سات سال سے افغانستان پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، اب ان کے اپنے کمانڈروں اور سفارت کاروں نے ان کوششوں کی ناکامی کا مختلف بیانات کے ذریعے اقرار کر لیا ہے۔ ان غیر ملکی افواج نے کھلی آنکھوں نظر آنے والی شرمناک شکست کو فتح یا باعزت پسپائی میں بدلنے کیلئے آخری کوشش یہ کی ہے کہ انہوں نے اپنے ایجننسیوں کو اسلحہ، ڈار اور افغانی اور پاکستانی کرنی دے کر ہمارے قبائلی علاقوں میں گھسادیا ہے اور یہ مصدقہ اطلاعات ہیں کہ جب کچھ ایجنسٹ پکڑے گئے یا ان کی لاشیں ملیں تو ان میں سے کئی غیر پختون تھے جو ان کے غیر مسلم ہونے کی واضح علامت ہے۔ یہ لوگ طالبان کے بھیس میں پاکستانی افواج سے لڑ رہے ہیں اور ان علاقوں میں افراتفری پیدا کرنے کیلئے داخل ہوئے ہیں۔ ایسے ایجننسیوں کی تعداد اب روز بروز بڑھ رہی ہے حتیٰ کہ بعض قبائلی علاقوں کے علماء نے یہ بتایا ہے کہ اب ہمیں اپنے علاقوں میں وہ پھرے کہشت نظر آ رہے ہیں جنہیں ہم نے ساری زندگی کبھی نہیں دیکھا۔ یہ امریکی و بھارتی ایجنسٹ اصل طالبان کو بدنام کرنے کیلئے طالبان کے روپ میں علاقے اور پاکستان کے شہروں میں بھی بہم دھماکوں سے بربادی پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔

اگر مذکورہ ساری صورتحال سامنے رکھی جائے تو صاف واضح ہو گا کہ آزاد قبائل کے محب وطن اور پر امن مسلمانوں کی بھاری اکثریت اس وقت سب سے زیادہ متاثر ہے۔ غیر ملکی افواج کی طرف سے بغیر پالٹ طیاروں کی بمباری ہو، ان کے میزائلوں کی بارش ہو، یا پاکستانی مسلح فورسز کی کارروائیاں ہوں، ان کا زیادہ تر نشانہ بے گناہ مسلمان بن رہے ہیں۔ حالات سے دل برداشتہ ہو کر تشدید کارستہ اختیار کرنے والے نوجوان جو کم تعداد میں ہیں وہ تو ویسے ہی اپنا خون دینے کیلئے

تیار ہیں، جبکہ جرائم پیشہ طبقات اور غیر ملکی ایجنسٹ اپنے اثر و سوخ، سازشوں اور غیر ملکی پشت پناہی کی وجہ سے محفوظ رہتے ہیں اور سارا نزلہ عام مسلمان پر گرفتار ہا ہے۔ اس پیچیدہ صورت حال کا ہمارے نزدیک اس کے سوا کوئی علاج نہیں ہے کہ:

1. بمبداری، میزانلوں کی بارش اور اندر حادھنڈ فوجی کارروائیاں فوری طور پر بند کی جائیں۔
  2. ہر علاقے کے مقامی علماء، دین دار حضرات اور محب وطن عماں دین کو ساتھ ملا کر جرائم پیشہ اور ملک و شمن عناصر اور غیر ملکی ایجنسٹوں کو کپڑا جائے اور ان کو سرعام عبرتاک سزا یں دی جائیں۔
  3. محب وطن اور پرآمن باشندگان ملک اور ہتھیار اٹھانے والے نوجوانوں کے جو جائز مطالبات ہیں انہیں فوری طور پر خلوص دل سے اس طرح پورا کیا جائے کہ لوگوں کو یہ اطمینان ہو کہ حکومت یہ کام حاضر وقت گزاری کیلئے نہیں کر رہی بلکہ پوری سنجیدگی سے یہاں انصاف مہیا کر کے امن و امان قائم کرنے میں مخلص ہے۔
  4. ان درون ملک ہر طرح کی خلافِ اسلام پالیسیوں اور اقدامات کا سلسلہ بند کیا جائے۔
  5. غیر ملکی طاقتوں کی اطاعت و فرمانبرداری کا رو یہ ختم کر کے محب وطن عوام کو ساتھ ملایا جائے اور ان کے تمام جائز مطالبات کو امکانی حد تک پورا کیا جائے۔
  6. موجودہ خارجہ پالیسی اور خصوصاً امریکا کے ساتھ کیے جانے والے ”تعاون برخلاف دہشت گردی“ کے پر فریب اور شرمناک معاهدے سے جان چھڑانے کا محتاط راستہ جلد نکالا جائے، جو در حقیقت اپنی ہی سلامتی کا راستہ ہے۔
  7. عدالیہ کو آزاد اور بحال کیا جائے کیونکہ فوری انصاف کی فراہی اور آزاد عدالیہ کے بغیر امن و امان کا قیام ممکن نہیں۔
- آخر میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے کہ برصغیر ہوئی مہنگائی اور معاشی بدحالی کے موجودہ طوفان کے مختلف اسباب ہیں، لیکن چار بڑے سبب یہ ہیں:
- بدآمنی  
جسے ختم کیے بغیر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے معاشی استحکام کا تصور نہیں کیا جاسکتا، بدآمنی کے سلسلے میں اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔
- کرپشن**
- کرپشن کی یہ دیک اس وقت ملک کے بالائی طبقات سے لے کر نچلے طبقات تک سراست کرچکی ہے۔ امانت و دیانت اور سچائی کے ساتھ سیاسی عمل اور کسب حلال کا تصور کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ ان اسلامی اخلاق و اوصاف کا احیا ہر

سٹھ پر ضروری ہے تاکہ کرپشن کا خاتمہ کیا جائے اس کیلئے ہر سٹھ پر قانون کی عملداری، دیانتدار انتظامیہ اور آزاد عدالیہ کے ذریعے ہی ناگزیر ہے۔

### عیاشانہ طرز زندگی

پاکستان کے بالائی طبقات جس فضول خبی اور پر تیغش زندگی کے عادی ہو گئے ہیں اس کے واقعات عوام کی زبانوں پر ہیں۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ مہلک طرز زندگی ختم کر کے ہر سٹھ پر سادگی کو فروغ دیا جائے اور ملک و قوم کیلئے جو بیسہ بچایا جاسکتا ہے اسے ہر قیمت پر بچایا جائے۔

### فحاشی اور عربیانی

پاکستان جو اسلامی اقدار و تعلیمات کے تحفظ و فروغ کیلئے قائم کیا گیا تھا، اب یہاں کے معاشرے پر مغرب کی فاشی اور بے جا بیلااب کی طرح حاوی ہوتی جا رہی ہے اور اس کی ظلمت و نخوست سے بھی ہماری معاشری بدحالی کا گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو پال کر کے مسلمان پنپ نہیں سکتے، اس لیے اس کا مؤثر تذارک ضروری ہے۔ مغربی دنیا کو سائنسی اور معاشرتی ترقی رقص و سرود اور فاشی سے نہیں ملی بلکہ محنت اور ہمندی سے حاصل ہوئی ہے۔

تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے یہ تجاویز دل سوزی اور اخلاص کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں، ان کا کوئی سیاسی مقصد نہیں۔ امید ہے کہ معزز ارکان پارلیمنٹ کی حیثیت سے آپ حضرات اپنا فرض منصب سمجھتے ہوئے اپنی ذاتی، گروہی اور سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ان پر غور فرمائیں گے۔ اللہ جل شانہ ہمیں اپنے محబ وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی توفیق نصیب کرے، آمین و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

## امریکہ سے پاکستانیوں کی نفرت کے اسباب

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۸ء

روزنامہ امت کرپچی ۵ نومبر ۲۰۰۸ء کی خبر کے مطابق لاہور میں امریکی تونصیلیٹ کے پرنسپل آفیسر جناب برائے ڈہنست نے رحیم یار خان میں مسلم لیگی راہنمہ چوبہ دری جعفر اقبال سے بات چیت کرتے ہوئے کہ امریکی انتظامیہ بھارت کی نسبت پاکستان کو عوامی فلاج اور تعمیر و ترقی کیلئے منصوبوں کیلئے کئی لگنازیاہ امداد دیتی ہے لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ پاکستانی امریکہ سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ پاکستانی عوام کی تعمیر و ترقی اور فلاجی منصوبوں کیلئے ایک ارب میں کروڑ ڈالر کی امداد دیتا ہے جبکہ بھارت کو اس مدد میں صرف دس میلیون ڈالر دیے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی امریکہ کی بعض مقدار شخصیات کا یہ شکوہ مختلف موقع پر سامنے آچکا ہے کہ ہم پاکستانیوں پر اتنی رقم خرچ کرتے ہیں اس کے باوجود پاکستانی عوام ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ جب سے یورپ اور

امریکہ نے آسمانی تعلیمات اور مذہبی اخلاقیات سے انحراف کر کے مادہ پرستی کو اپنا مطیع نظر پنار کھا ہے اُبیں ہر معاملہ کو روپے پیسے کے پیانا نے میں تو لئے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اور تاجر انہ ماحول کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ اگر اس ماحول کے کسی بیمار شخص سے بیمار پرنسی کے طور پر اس کا حال بچھا جائے تو وہ جواب اسی زبان میں دیتا ہے کہ ”بیس پیسے فرق ہے یا تیس پیسے بیماری باقی رہ گئی ہے۔“ اسی لیے مغرب کی خالص مادہ پرستی اور تاجر انہ ذہنیت کو یہ بات سمجھ نہیں آرہی کہ اتنی رقوم خرچ کرنے کے باوجود عالم اسلام اور خاص طور پر پاکستان میں اُبیں پذیر ای کیوں حاصل نہیں ہو رہی اور عوام ان سے نفرت کیوں کرتے ہیں، ورنہ اگر تاجر انہ اور مفاد پرستانہ ذہن سے ہٹ کر امریکی راہنماء معروضی حالات اور زمینی حقوق کے حوالے سے سمجھنا چاہیں تو یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ امریکی راہنماءوں کو یہ زمینی حقیقت باور کر لینی چاہیے کہ:

1. پاکستانی عوام صرف ڈالر اور پاؤند کے طلبگار نہیں ہیں بلکہ وہ ایک عقیدہ رکھتے ہیں اور ایک زندہ مذہب کے

پیروکار ہیں،

2. وہ خود کو ایک آزاد اور خود مختار وطن کے باشندے سمجھتے ہیں اور آزادی اور خود مختاری کے تقاضوں سے باخبر بھی ہیں،

3. وہ اپنے عقیدہ اور ثقافت کے حوالے سے دنیا بھر میں ایک وسیع برادری رکھتے ہیں اور اس کی خوشی اور عنی میں شرکیک بھی ہوتے ہیں،

4. وہ قوی و قار اور عزت نفس کا اداکار رکھتے ہیں اور اس کے مجروح ہونے پر انہیں ذہنی اذیت اور دلی دلکھ ہوتا ہے۔

اس لیے جب وہ کھلی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ:

- ان کے عقیدہ و دین کو مغرب کی طرف سے طعن و تشنج اور تحقیر و استہزا مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے،
- دنیا بھر میں عقیدہ و دین کی بات کرنے والے مسلمانوں کو آزادی بلکہ زندگی کے حق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے،

- پاکستان کی سالمیت، وحدت، قومی خود مختاری اور اس کی سرحدات کا تقدس امریکی اور مغربی مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا ہے،

- امریکہ اور اس کے اتحادی اسرائیل کی ناجائز پشت پناہی کر کے عربوں اور فلسطینیوں کے جائز اور مسلم حقوق پامال کر رہے ہیں اور بیت المقدس پر یہودیوں کے غاصبانہ تسلط کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے،
- عراق اور افغانستان میں امریکی اتحادیوں کی لشکر کشی نے لاکھوں بے گناہ شہریوں کا قتل عام کر کے چنگیز خان کی یاد تازہ کر دی ہے،

- جبکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکی اتحادیوں کے مسلح حملوں نے تمام بین الاقوامی اصولوں اور اخلاقیات

کو پامال کر دیا ہے۔

تو انہیں امریکہ بھاڑکی طرف سے مسلمان حکومتوں کو دیے جانے والے یہ چند سکے اپنے عقیدہ، آزادی، خود مختاری اور عزت نفس کی قیمت دکھائی دیتے ہیں، جس سے ان کی نفرت میں کمی ہونے کی وجہے مزید اضافہ ہونے لگتا ہے۔ امریکی راہنماؤں کو یہ بات بہت پہلے اس وقت سمجھ لینی چاہیے تھی کہ پاکستان کے ایک سابق صدر فیلڈ مارشل صدر ایوب خان مرحوم نے ”فرینڈز نٹ ماسٹرز“ (آف انہیں دوست) کے نام سے اپنی سوانح عمری اور یادداشتیں قلمبند کر کے امریکہ کو پاکستانی عوام کی طرف سے یہ واضح پیغام دے دیا تھا کہ پاکستانی عوام امریکہ کو ایک دوست کے طور پر قبول کر سکتے ہیں لیکن اسے آقا کا درجہ دینے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ مگر امریکی حکمران اس واضح حقیقت سے مسلسل آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور پاکستانی عوام کو ڈالر (اور اب میزائل حملوں) کے ذریعے سے دوست بنانے کے چکر میں ہیں، اس لیے انہیں اب بھی امریکہ سے پاکستانی عوام کی بڑھتی ہوئی نفرت کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اس صورتحال میں امریکی راہنماؤں کو کسی ماہر نفیتی معاملے سے اپنا معائنہ کرانے کے سوا اور کیا مشورہ دیا جاسکتا ہے؟

## صدر بارک اوباما کو امریکی سینیٹر کا حقیقت پسندانہ مشورہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۹ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۹ دسمبر ۲۰۰۸ء کی ایک خبر کے مطابق امریکی سینیٹر جان کیری نے کہا ہے کہ مزید فون جنینجن سے افغانستان کا مسئلہ حل نہیں ہو گا بلکہ سیکیورٹی کیلئے افغان قوم کے دل و دماغ توجیہتalaازی ہے۔ بوشن میں ایک خبر ساں ادارے سے بات چیت کے دوران سینیٹر جان کیری نے کہا کہ وہ نو منتخب صدر بارک اوباما کی انتظامیہ کو یہ تجویز دیں گے کہ افغان پولیس کو جدید اسلحہ سے لیں کر کے تربیت دی جائے کیونکہ یہی مسئلہ کا حل ہے۔

امریکہ کے نو منتخب صدر بارک اوباما کے حوالے سے تسلسل کے ساتھ یہ خبریں آ رہی ہیں کہ وہ مند صدارت سنبھالنے کے بعد افغانستان کو اپنی توجہات کام کر رہا ہیں گے اور افغانستان میں مزید فوجیں بھیج کر بزرعم خویش اس جنگ کو جیتنے کیلئے زور لگائیں گے۔ جبکہ اس جنگ میں بین الاقوامی اداروں کی روپرٹوں کے مطابق امریکی اتحاد کو نہ صرف یہ کہ ابھی تک کوئی کامیاب حاصل نہیں ہوئی بلکہ افغانستان میں طالبان کا اثرور سوچ بڑھتا جا رہا ہے اور خود امریکی ماہرین کے خیال میں افغانستان کے ۷۲ فیصد حصے پر طالبان کو بالادستی حاصل ہے، جس کا حل امریکی حکمرانوں کے نزدیک یہ ہے کہ افغانستان میں مزید امریکی فوجیں بھیجیں اور طاقت کے استعمال میں اضافہ کر کے افغان عوام کو زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔

امریکی سینیٹ کے رکن مسٹر جان کیری نے اس پس منظر میں یہ بیان دے کر امریکی انتظامیہ کو روقت انتباہ کیا ہے اور

حقیقت پسندانہ مشورہ دیا ہے کہ انہاد حنفی طاقت کے استعمال میں اضافہ کرنے کی بجائے افغان عوام کے دل و دماغ کو جیتنے کی کوشش کی جائے، اس لیے امریکی حکومت کو اپنے ایک معزز سینیٹر کے اس حقیقت پسندانہ مشورہ پر ضرور توجہ دینی چاہیے۔

باقی رہی افغان عوام کے دل و دماغ کو جیتنے کی بات تو ظاہر ہے یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ان کے عقیدہ و ثقافت اور آزادی و خود منماری کا احترام کرتے ہوئے انہیں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنے اور اپنے فحیلے خود کرنے کا موقع دیا جائے، اس کے بغیر غیور افغانوں کے دلوں تک رسائی آخر کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔

## دہشت گردی کے خلاف جنگ اور غلط مغربی مفروضے

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۰ جنوری ۲۰۰۹ء

انسٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے، جو محترم پروفیسر خورشید احمد کا ادارہ ہے، ۳۰ دسمبر ۲۰۰۸ء کو قائدِ اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے طلبہ اور طالبات کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا، محترم پروفیسر شبانہ فیاض کی نگرانی میں طلبہ اور طالبات کا ایک بھرپور گروپ شریک مغلبل تھا۔ انسٹیوٹ کے ڈائریکٹر جزل جناب خالد رحمان اس نشست کو کنڈکٹ کر رہے تھے جبکہ مردان سے قوی اسمبلی کے سابق رکن مولانا ذاکر عطاء الرحمن جو رابطہ المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جزل ہیں، اور راقم الحروف نے طلبہ و طالبات سے دینی مدارس کے حوالے سے گفتگو کرنا تھی اور ان کے سوالات کا سامنا کرنا تھا۔ ذاکر عطاء الرحمن نے ”درسہ اصلاحات“ کے حوالے سے اب تک ہونے والی پیش رفت، اس سلسلہ میں دینی مدارس کے موقف اور پروگرام کی وضاحت کی اور متعلقہ سوالات کے جواب دیے۔ جبکہ میں نے ”درسہ اور دہشت گردی“ کے عنوان سے دہشت گردی کے خلاف موجودہ جنگ کے بارے میں درسہ کے موقف اور تاثرات پر معمروضات پیش کیں جن کا خلاصہ ذہنِ قارئین ہے۔

میر اعلق دینی مدارس سے ہے، میں نے اپنی ساری تعلیم بارہ تیرہ برس تک دینی مدارس میں حاصل کی ہے، اس کے بعد کم و بیش چالیس برس سے دینی مدارس میں ہی تدریس کی خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کے سب سے بڑے وفاق ”وفاق المدارس العربیہ پاکستان“ کی مجلس عاملہ کارکن ہوں، اس حیثیت سے دہشت گردی کے خلاف موجودہ عالمی جنگ کے بارے میں اپنے جذبات، موقف اور تاثرات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس سلسلہ میں میری پہلی گزارش یہ ہے کہ یہ جنگ دہشت گردی کی کوئی تعریف طے کیے بغیر لڑی جا رہی ہے۔ اقوام متحده کی ذمہ داری تھی اور اس سے تقاضا بھی کیا گیا کہ اس عالمی فورم پر دہشت گردی کی کوئی واضح تعریف متعین کر دی جائے تاکہ دہشت گردی اور آزادی کی جنگ میں فرق کیا جاسکے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس طرح کسی قوم، ملک، گروہ یا فرد کو دہشت گرد قرار دینے اور اس پر چڑھ دوڑنے کا اختیار صرف حملہ اور قتوں کے پاس ہے۔ اس جنگ کے ایک فریق کو یہ

اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں جسے چاہے دہشت گرد قرار دے اور اس کے خلاف مسلح کارروائی کر ڈالے۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک اقوامِ متحده کے فورم پر دہشت گردی کی کوئی تعریف طے نہیں کی جاتی، یہ جنگ یکطرفہ ہے اور انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ میں یہ بات اب تک نہیں سمجھ پایا کہ روس کے خلاف افغان عوام کی جنگ کو "جہاد آزادی" تسلیم کیا گیا اور ساری دنیا نے اسے سپورٹ کیا، خود میں بھی اس کے حامیوں میں تھا اور روس کے خلاف افغانستان کے جہاد آزادی کے دوران خود مورچوں میں بھی گیا ہوں، اب بھی اسے افغان عوام کا جہاد آزادی سمجھتا ہوں، اس کی بنیاد یہ تھی کہ سوویت یونین نے افغانستان میں مسلح افواج اتنا کر افغان قوم کی آزادی اور خود مختاری کو سلب کر لیا تھا حالانکہ وہ اس وقت افغانستان کی ایک تسلیم شدہ حکومت کی دعوت پر آیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر افغانستان میں روای افواج کی آمد کے خلاف افغان عوام کو مسلح مراجحت کا حق حاصل تھا اور اس حق کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے تو مول ایسٹ، عراق اور افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مسلح افواج کی آمد اور سلطکے خلاف ان ملکوں کے عوام کو مسلح مراجحت کا حق کیوں نہیں ہے اور اسے دہشت گردی کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ میں افغانستان میں روای فوجوں کی آمد، اور مشرقی سطھ اور افغانستان میں امریکی فوجوں کی آمد کے درمیان فرق نہیں سمجھ سکا۔ اور اس سوال کے جواب کی تباش میں ہوں کہ اگر روای فوجوں کے خلاف مسلح مراجحت جہاد آزادی تھا تو امریکی فوجوں کے خلاف مسلح مراجحت مراجحت جہاد آزادی کیوں نہیں ہے؟

تیسرا گزارش یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں دینی مدرسہ کو دہشت گردی کا سرچشمہ قرار دیا جا رہا ہے جو معروضی حقائق کے منافی ہے، صرف اس لیے کہ جن کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کی ایک بڑی تعداد نے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے؟ اس جنگ کے میڈیا پیش میں "دینی مدرسہ" کو ہدف بنالیا گیا ہے حالانکہ مبینہ دہشت گردی کے گروپوں میں ایک بڑی تعداد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ دہشت گرد ہیں یا نہیں، جن کو بھی دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے ان گروپوں میں تابع دیکھ لیا جائے کہ دینی مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں کا تابع کیا ہے۔ عالمی سطھ پر اسلام بن لادن کو مبینہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت تصور کیا جاتا ہے جبکہ اسلام بن لادن اور ان کے پورے نبیت ورک میں شاید ایک بھی شخص ایسا نہ ملے جو کسی روایتی دینی مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو۔ میرے خیال میں اصل بات اور ہے۔ دینی مدارس کے خلاف مغرب کا حمل غصہ کی اور حوالے سے ہے جسے دہشت گردی کے ساتھ تھی کہ مغرب دینی مدارس کو ان کے کو دار سے محروم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دینی مدارس مغرب کے خلاف ایک مورچہ ضرور ہیں لیکن یہ علمی، فکری اور تہذیبی مورچہ ہے جسے مغرب اپنی تمام ترقوت اور قہر سامانیوں کے باوجود سر نہیں کر سکا۔ مغرب نے پوری دنیا میں مذہب کا ساتھ رشتہ نہیں کر دیا ہے، مغرب کا سیکولر فلسفہ دنیا میں ہر طرف اپنے سلطک اور بالادستی کا جادو جگار رہا ہے لیکن دنیا نے اسلام بالخصوص جنوبی ایشیا کا مسلمان سوسائٹی اور اجتماعیت کے ساتھ اسلام کے تعلق ہونقطع کرنے کیلئے تیار نہیں، اور اسلام ہی کو اپنی قومی و معاشرتی زندگی کی اساس قرار دینے پر مصر ہے، جس کی ایک بڑی وجہ دینی مدارس ہیں۔ مغرب بجا طور پر یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے

مسلمانوں سے اپنا نہ ہب بیزار سیکور فلسفہ تسلیم کرنے میں جو ناکام ہوئی ہے اس کا باعث دینی مدرسہ ہے اس لیے وہ دینی مدرسے کو اس کے کردار سے الگ کرنا چاہتا ہے اور اس کیلئے اس پر دہشت گردی کا لیبل چھپا کر کے اپنا کام آسان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

چوتھی گزارش یہ ہے کہ مغرب یہ جنگ دو مفروضوں کی بنیاد پر لڑ رہا ہے اور اس سلسلہ میں وہ زمینی حقیقوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ مغرب کاہنا ہے کہ اس کے بقول جو لوگ دہشت گردی کر رہے ہیں وہ جہالت کی وجہ سے کر رہے ہیں، اگر ان کے علاقوں میں تعلیم کو عام کر دیا جائے تو دہشت گردی کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مغرب کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ یہ دہشت گردی غربت کی وجہ ہے اور ان غریب لوگوں میں چند ڈال تقسیم کر کے انہیں دہشت گردی سے روکا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں خود ساختہ مفروضے ہیں اس لیے کہ مبینہ دہشت گردی کا عالمی نیٹ ورک اسلامہ بن لادن کا ہے اور اس نیٹ ورک میں شریک لوگ نہ توجاہیں بیں اور نہ ہی غریب ہیں۔ وہ یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سطح کے تعلیم یانہ ہیں اور ان کے پاس دولت کی بھی کمی نہیں ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مغرب دو معروضی حقیقوں کو نظر انداز کیے ہوئے ہے:

- ایک یہ کہ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے وہ ایک عقیدہ رکھتے ہیں، ایک تہذیب سے وابستہ ہیں اور اپنے عقیدے و ثقافت کے ساتھ واضح کلمٹ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے و ثقافت کو خطرے میں دیکھ کر اس کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کی جنگ کا طریق کار درست ہے یا نہیں، یہ الگ بحث ہے۔ لیکن اس میں شک کی کوئی گھائش نہیں کہ ان کی جنگ ایک عقیدے کیلئے ہے، تہذیب و ثقافت کیلئے ہے اور اس کے ساتھ اپنی کلمٹ رکھتے ہیں۔

- دوسری حقیقت جسے مغرب جان بوجھ کر سامنے نہیں آنے دے رہا یہ ہے کہ مبینہ دہشت گروں کی ساری جنگ ر عمل ہے۔ اور یہ ری ایکشن عالم اسلام کے بارے میں مغرب کی اس معاندانہ روشن کا نتیجہ ہے جو وہ گذشتہ دو صدیوں سے مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔ مغرب نے خلاف عثمانیہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اور اس کے بعد فلسطین، عراق اور افغانستان میں جو کچھ کر رہا ہے اس کا رد عمل اور ری ایکشن آخر کسی نہ کسی صورت میں تو سامنے آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ فلسطین میں گذشتہ پون صدی سے ہو رہا ہے یہ اگر کسی مغربی قوم کے ساتھ ہو تو اس کا رد عمل بھی اس سے مختلف نہیں ہو گا۔

- اس لیے جب تک ان زمینی حقائق کو تسلیم نہیں کیا جاتا، جنہیں دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کے عقیدہ و ثقافت کا احترام نہیں کیا جاتا، اور جب تک مغرب عالم اسلام کے خلاف اپنے منفی طرز عمل اور معاندانہ روشن سے باز نہیں آتا، محض مفروضوں کی بنیاد پر اس مبینہ دہشت گردی کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

پانچویں گزارش یہ ہے کہ افغانستان سے جب روئی فوجیں واپس گئیں اور افغانستان میں مجاہدین کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت پاکستان میں میرے اندازے کے مطابق پچاس ہزار کے لگ بھگ ایسے مجاہدین موجود تھے جنہوں نے

افغانستان کے جہاد میں حصہ لیا تھا۔ وہ جذبہِ جہاد سے سرشار تھے، جنگ کی عملی تربیت حاصل کرچکے تھے اور ہر قسم کے ہتھیار چلانا جاتے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ جب روس کے خلاف جنگ ختم ہو گئی اور یہ ہزاروں مجاہدین پاکستان اپنے گھروں میں واپس آگئے تو قومی سطح پر ان کیلئے کیا پالیسی طے کی گئی؟ میں نے اس وقت دو تین اہم قوی لیڈروں کو اس جانب توجہ دلائی تھی کہ ان مجاہدین کے بارے میں کوئی قوی پالیسی طے کرنی جائے اور انہیں کسی کام پر لگا دیا جائے ورنہ ان کے مختلف گروپ اپنا اپنا کام اور اپنا اپنا راستہ خود طے کریں گے اور اس سے مسائل پیدا ہوں گے۔ میرے نزدیک یہ اس وقت حکومت کا اور قومی سطح کی قیادت کا فریضہ تھا جس سے غفلت کی گئی اور اس کا تیجہ ہم سب کو بھگنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل اس سلسلہ میں ہمارے سامنے مثال موجود ہے، قیامِ پاکستان سے قبل سندھ میں حروف کی مسلح فرس موجود تھی، یہ مجاہدین آزادی تھے جو برطانوی استعمار کے خلاف بر سر یکار تھے اور مسلح طور پر چھاپہ مار کارروائیں کیا کرتے تھے۔ ان کی قیادت موجوہہ پیر صاحب آف پاگڑا شریف کے والد محترم حضرت پیر سید صغیر اللہ شہید پیر آف پاگڑا کر رہے تھے۔ یہ مسلح اور چھاپہ مار تحریک تھی۔ حضرت پیر صغیر اللہ راشدیؒ کو اسی جرم میں باغی قرار دے کر ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا گیا تھا اور انہیں پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔ اسی لیے سندھ کی قوی تاریخ میں انہیں ”آزادی کا ہیرہ“، ”قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جب پاکستان قائم ہوا تو حروف کے ان مسلح دستوں کو پاک فوج کا حصہ بنانے کا سنبھال لیا گیا اور ان کی صلاحیتوں کے استعمال کا رخ متعین کر دیا گیا۔ اسی طرح اگر افغانستان سے روئی فوجوں کی واپسی کے بعد پاکستان کے ان مجاہدین کے بارے میں، جنہوں نے جہادِ افغانستان میں حصہ لیا تھا، قومی سطح پر کوئی پالیسی طے کرنی جاتی اور ان کے جذبات اور صلاحیتوں کا کوئی رخ متعین کر دیا جاتا تو یقیناً وہ حالات پیدا نہ ہوتے جو آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس سلسلہ میں چھٹی اور آخری گزارش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے تناظر میں سب سے بڑا سوال خودکش حملوں کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ہمارا موقف بالکل واضح اور دو ٹوک ہے کہ خودکش حملہ ایک جتنی ہتھیار ہے جو حالت جنگ میں آخری حرربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہتھیارِ عالمی جنگ میں جاپان نے استعمال کیا ہے، برطانیہ کے پوش پانکلوں نے استعمال کیا ہے، اور ۱۹۴۵ء کی جنگ میں چونہ کے مجاز پر پاک فوج نے بھی استعمال کیا ہے۔ اس لیے ایک جتنی ہتھیار کے طور پر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن پر امن علاقوں میں اور میدان جنگ سے ہٹ کر اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ جس طرح وہ سرے جنگی ہتھیار ہیں کہ میدان جنگ میں ان کا استعمال درست ہے اور اس سے ہٹ کر اس کا استعمال درست نہیں ہے، یہی مسئلہ خودکش حملے کا بھی ہے۔

اسی طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان دستوری حوالے سے ایک اسلامی ریاست ہے۔ عملی طور پر کچھ بھی ہو لیکن اس کے دستور میں اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہے اور پارلیمنٹ پابند ہے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی نہیں کر سکتی اور ملک کے مروجہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنائے گی۔ اس لیے پاکستان میں نفاذِ اسلام یا کسی اور مطالبے کیلئے ہتھیارِ اٹھانا جائز نہیں ہے۔ البتہ اس حوالے سے ایک بات عرض کرنا ضروری ہے کہ سوات اور قبائلی علاقوں کے جو لوگ شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا مطالبہ درست ہے بلکہ پورے پاکستان کا یہ حق ہے کہ حکومت ملک میں شرعی قوانین نافذ کرے اور اسلامی نظام کو عملاً بروئے کار لائے۔ نیز اس بات کو ضرور پیش نظر رکھا جائے کہ خاص

طور پر سوات کے لوگوں سے اس حوالے سے بار بار وعدہ خلافی کی گئی ہے بلکہ چند سال قبل نفاذ شریعت ریگولیشن کی صورت میں موجودہ عدالتی نظام پر ہی شرعی عدالتون کا لیل چپاں کر کے ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر وہ اس وعدہ خلافی اور دھوکہ دہی کے خلاف عمل کے طور پر انہا پسندی پر آگئے ہیں تو ان کا طریقہ کار غلط ہونے کے باوجود ان کی مجبوری کو سمجھنا چاہیے اور ان اسباب کو دور کرنا چاہیے جو حالات کو اس رخ پر لے آئے ہیں۔

## "مشرق وسطیٰ سے جنوبی ایشیا تک، تلاشِ امن"

روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۶ فوری ۲۰۰۹ء

گذشتہ ماہ کے آخری روز وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی دستور کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کیلئے دارالعلوم حقانیہ کوڑہ مختلف جانے کا پروگرام بنارہ تھا کہ وفاق کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنف جالندھری نے فون پر کہا کہ آپ کو اسی روز اربعجے اسلام آباد میں ایک اہم سینیما نار میں شریک ہونا ہے اور سینیما کی نوعیت کے حوالے سے آپ کی شرکت بے حد ضروری ہے۔ وفاق المدارس کی دستور کمیٹی کاظمہ کے بعد اجلاس طے تھا جس میں مولانا انوار الحق حقانی (اکوڑہ)، مولانا مفتی کفایت اللہ ایم پی اے (مانسہرہ) اور مولانا عطاء اللہ شہاب (ملگت) شامل ہیں۔ مجھے اس کمیٹی کی مسؤولیت سونپی گئی ہے چنانچہ ہم نے فون پر بہی مشورہ کر کے اجلاس کو مغرب کے بعد تک کیلئے مؤخر کیا اور میں اربعجے اسلام آباد پہنچ گیا۔ اسلام آباد پہنچ کر معلوم ہوا کہ سینیما نار اسلام آباد ہوٹل میں "مشرق وسطیٰ سے جنوبی ایشیا تک۔۔۔ تلاشِ امن" کے عنوان سے منعقد ہو رہا ہے جس کا اہتمام جوہر ٹاؤن لاہور کے ائمڑیشنل اسلامک سنٹر نے ائمڑیشنل اسلامک میڈیا فورم کے تعاون سے کیا ہے۔ "ائمڑیشنل اسلامک سنٹر لاہور" ملتان کے جامعہ خیر المدارس کی شان ہے، اس کے سربراہ مولانا قاری محمد حنف جالندھری ہیں۔ جبکہ "ائمڑیشنل اسلامک میڈیا فورم" میڈیا سے تعلق یاد چکی رکھنے والے چند نظریاتی دینی کارکنوں کا ایک نو تکمیل یافتہ فورم ہے جس کا قیام چند ماہ قبل لاہور میں عمل میں لایا گیا، اس کے اساسی اجلاس میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا ہے، اس کے اصل محرك جمیعت علماء اسلام کے ایک سرگرم رہنماء مولانا قاری عبید اللہ قریشی ہیں جن کا تعلق مانسہرہ سے ہے، وہ ایک عرصہ سے متعدد عرب امارات کی ریاست شارجہ میں تدریس القرآن کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ فورم کی سربراہی مولانا مفتی عبدالرحمن کر رہے ہیں جو راولپنڈی کے سرگرم علماء میں شمار ہوتے ہیں، جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے حوالے سے اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام نے جو رابطہ کمیٹی قائم کر کر گئی ہے، اس کے ترجمان ہیں۔

سینیما نار میں شرکت کیلئے پاکستان شریعت کو نسل کے رہنماء جناب صلاح الدین فاروقی آف ٹیکسلا کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا تو مولانا قاری محمد حنف جالندھری گیٹ پر آنے والے مہماں کا خیر مقدم کر رہے تھے، ان سے مل کر آگے بڑھا تو پہلی ملاقات انسٹیٹیوٹ آف پالیسی استڈیز اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل جناب خالد رحمان سے ہوئی، اسٹیٹ کی طرف نظر اٹھی تو جناب خورشید احمد ندیم دکھائی دیے اور کچھ کچھ اندازہ ہو گیا کہ سینیما کی نوعیت اور سطح کیا ہے۔ تھوڑی دری بعد

سینیٹر سید مشاہد حسین اور جناب احسان اقبال تشریف لے آئے۔ صوبہ سرحد کے سابق وزیر قاری روح اللہ مدنی، پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر قبلہ ایاز، دعوہ اکیڈمی اسلام آباد کے جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر، جمیعت علماء اسلام کے رہنمای سینیٹر ڈاکٹر خالد محمود سومرو اور لال مسجد اسلام آباد کے خطیب مولانا عبد الغفار بھی تھوڑے تھوڑے سے واقعے کے ساتھ تشریف لا کر اپنی اپنی سیٹوں پر رونق افرزو ہو گئے۔ وفاقی وزیر ائمہ امور جناب ڈاکٹر ابراهیم علوان سب سے آخر میں تشریف لائے، اس کے ساتھ یہ سینیٹر کم و بیش اکثر اہم سیاسی و دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے مشترکہ فرم کی حیثیت اختیار کر گیا۔

سینیٹر کے عنوان سے ظاہر تھا کہ اس میں زیادہ تر گفتگو غزہ کے الیہ اور ممبئی بم دھماکوں کے حوالے سے ہو گی۔ چنانچہ سینیٹر کے داعی اور میزبان مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اپنی ابتدائی اور تعارفی گفتگو میں یہ بات واضح کر دی کہ اس بحث و مباحثہ کا دائرہ غزہ سے ممبئی تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں شرکت کیلئے مختلف مکاتب فکر اور علمی حلقوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کو اس لیے زحمت دی گئی ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات کو سنا جائے، ان پر غور کیا جائے اور مختلف نقطہ بارے نظر کو سامنے رکھ کر امت مسلمہ کی فکری رہنمائی کے مشترکہ نکات تلاش کیے جائیں۔

- مقررین نے غزہ کی صورتحال کا تفصیل سے ذکر کیا، اسرائیلی جاریت کی مذمت کی گئی، مسلم ممالک کی حکومتوں خاص طور پر عرب حکمرانوں کی سردمہری کا ماتم ہوا، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی اسرائیل نوازی اور عالمی معاملات میں ان کے دہرے معيار کا شکوہ کیا گیا۔

- ممبئی بم دھماکوں کے مضرات اور اثرات کا جائزہ لیا گیا اور بھارت کی طرف سے دی جانے والی ڈھنکیوں پر رد عمل کا اظہار ہوا۔

- سوات، مالاکند اور وزیرستان کی صورتحال کا تذکرہ ہوا اور وہاں فوجی آپریشن کے نتائج پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔

- عالم اسلام کی موجودہ معروضی صورت حال کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لائچے عمل پر بھی گفتگو ہوئی اور متنوع سوچوں کے حامل دانشوروں نے نکل کر اپنے موقف کی وضاحت کی۔

الغرض بدآسمی اور تلاشِ امن سے متعلقہ تمام پہلوؤں پر گفتگو ہوئی، سب سے بڑھ یہ کہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو تخلی کے ساتھ سنا گیا اور ایک مشترکہ سوچ کی طرف آگے بڑھنے کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا۔ جناب خورشید احمد ندیم نے اپنایہ موقف درد دل اور مطہر و انتدال کے ساتھ پیش کیا کہ موجودہ عالمی حالات میں بالادست قوتوں کے ساتھ مزاحمت حکمت و دانش کے خلاف ہے کیونکہ ان کے خیال میں کسی جگہ بھی مزاحمت کامیاب نہیں ہو رہی، عراق و افغانستان سمیت ہر جگہ مزاحمت کرنے والوں کو پسپائی کامیاب نہیں کرنا پڑ رہا ہے اس لیے سری دست مزاحمت کا راستہ ترک کر کے صلح حدیبیہ جیسی صورت اختیار کی جائے اور ایک ایسا وقفہ امن حاصل کیا جائے جس میں مسلم امام مقابلے کی پوری تیاری کر سکے، نیز طاقت کا وہ توازن حاصل کیا جائے جس کے ساتھ ان قوتوں کا مقابلہ کرنا ممکن ہو جائے۔

خورشید احمد ندیم صاحب کے اس موقف کا جائزہ لیتے ہوئے رقم الحروف نے یہ سوال اٹھایا کہ مزاجتی گروہوں کو مزاجت ترک کرنے کا مشورہ دینے سے پہلے اس امر کا جائزہ لے لیا جائے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس لیے کہ جنوبی ایشیا میں ہمارے ارد گرد کامنظر یہ ہے کہ کشمیری عوام گذشتہ ساتھ بر سر سے مزاجت جاری رکھے ہوئے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں اس لیے ان کا مسئلہ عالمی سطح پر زندہ ہے اور اس پر ہر فورم پر بات ہو رہی ہے۔ جبکہ اسی خطے میں میانمار (بما) کے صوبے اراکان کی مسلم اکثریت کو بھی کشمیریوں جیسی صورتحال کا سامنا ہے، ان کی اکثریت کو قلیت میں تبدیل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، ان کی نسل کشی کی جارہی ہے، ہزاروں خاندان جلاوطن ہو کر بغلہ دیش کے کیمپوں اور دنیا کے مختلف ممالک میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، اراکان کی مسلم اکثریت کو اپنے مذہبی شعائر پر عمل کرنے کی آزادی نہیں، ان کی جان و مال اور آبرو کو تحفظ حاصل نہیں اور وہ مسلسل ریاتی جبراں کا ہیں۔ لیکن ان کا مسئلہ دنیا کے کسی فورم پر موجود نہیں، کوئی ادارہ ان کے حق میں آواز اٹھانے کو تیار نہیں ہے، کیا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کشمیری عوام ریاتی جبرا کے خلاف مزاجت کر رہے ہیں جبکہ میانمار اور براکے مسلمان مزاجت نہ کر سکنے کی وجہ سے دنیا کی رسمی حمایت سے بھی محروم ہیں؟ میری اس گزارش کے جواب میں سینیٹر سید مشاہد حسین نے فرمایا کہ کشمیر کا مسئلہ اس لیے زندہ ہے کہ ان کے حق میں پاکستان آواز اٹھا رہا ہے۔ مجھے ان کے بعد گفتگو کا موقع نہ مل سکا اور نہ میں یہ عرض کرتا کہ پاکستان بھی کشمیری عوام کے حق میں اس لیے آواز اٹھا رہا ہے کہ کشمیریوں کا جذبہ حریت زندہ ہے اور وہ اس کیلئے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں، ورنہ اگر وہ بھی سپر اندازی اختیار کر لیتے تو ان کا انجم حیدر آباد اور جونا گڑھ سے مختلف نہ ہوتا۔ سید مشاہد حسین نے جناب خورشید احمد ندیم کی گفتگو کے اس پہلو کا جائزہ لیا کہ افغانستان اور عراق سمیت ہر جگہ مزاجتی گروپوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑ رہی ہے، انہوں نے کہا کہ عراق اور افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی بلکہ روز بروز حالات زیادہ خراب ہوتے جا رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا بھی قبل از وقت ہو گا کہ مزاجتی گروپوں کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔

رقم الحروف نے اپنی گفتگو میں ایک سوال اور اٹھایا کہ ہم تلاشِ امن میں بیہاں ٹھیٹے ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ امن کا مفہوم کیا ہے؟ کیونکہ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں ریاتی جبرا اور برفی جاریت کے خلاف مزاجت ہو رہی ہے صرف وہیں امن کی ضرورت کی بات کی جا رہی ہے۔ اور جہاں لوگ ظلم و جبرا کے خلاف مزاجت نہیں کر رہے وہاں امن کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا۔ اس طرح آج کی بالادست قتوں کے نزدیک امن کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کے خلاف مزاجت بدآئی ہے، اور ان کے جبرا و ظلم کو خاموشی کے ساتھ قبول کر لینے کا نام امن ہے۔ یہ ہمارے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ کیا ہم بھی اسی امن کی تلاش میں ہیں اور امن کے اسی مفہوم کو سپورٹ کر رہے ہیں؟

بہر حال یہ سینیٹر مختلف حوالوں سے بہت خوب رہا، اس کے اہتمام پر سب شرکاء نے قاری محمد حنیف جالندھری اور ان کے رفقاء کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ اس سے باہمی مفاہمت اور ہم آہنگی کو فروع حاصل ہو گا۔

## عالمِ اسلام کے خیالات اور امریکہ

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۰۹ء

روزنامہ پاکستان لاہور میں ۱۹ فروری ۲۰۰۹ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق امریکہ کی وزیر خارجہ محترمہ ہیلری کلنٹن گذشتہ روز جب انڈونیشیا کے دورے پر پہنچیں تو انڈونیشیا کے کئی شہروں میں امریکہ کے خلاف احتجاجی مظاہروں کی صورت میں عوام نے امریکہ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا، بلکہ انڈونیشیا کی ایک بڑی مسلمان تنظیم محمدیہ کے سر برہا جناب شمس الدین نے امریکی وزیر خارجہ کے ساتھ دعوت میں شرکت کی دعوت مسترد کر کے امریکہ کو انڈونیشیا عوام کے جذبات سے باخبر کیا۔

اس موقع پر امریکی وزیر خارجہ نے ایک دلچسپ بات یہ کہی کہ ”امریکی حکومت عالم اسلام کے خیالات سے آگاہی حاصل کرے گی۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی حکومت اپنے بارے میں اور امریکی پالیسیوں کے حوالے سے عالم اسلام کے خیالات سے آگاہ نہیں ہے اور اسے یہ آگاہی حاصل کرنے کیلئے از سرنوکی کوشش کا آغاز کرنا پڑے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی وزیر خارجہ یہ بات کہہ کر عالم اسلام کو بے وقف بنانے یا خود کو فریب کے ماحول میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں، اس لیے کہ اگر عالم اسلام کے خیالات اور جذبات سے امریکہ واقف نہیں ہے تو اور کون واقف ہے؟ محترمہ ہیلری کلنٹن صرف امریکہ کی وزیر خارجہ نہیں ہیں بلکہ سابق صدر مسٹر کلنٹن کی الیکی کی حیثیت سے خاتون اول بھی رہ چکی ہیں، انہوں نے اس دور میں بھی دنیا بھر کے دورے کیے ہیں اور عالم اسلام کے رہنماؤں کے ساتھ متعدد ملاقاتوں میں وہ شریک رہی ہیں، پھر وہ امریکہ کی دانشور اور باخبر خواتین میں شمار ہوتی ہیں اور ایک عرصہ سے امریکہ کی قومی سیاست میں ان کا کردار چلا آتا ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ یہ فرماتی ہے کہ امریکی حکومت کو ابھی عالم اسلام کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے تو اسے ایک افسوسناک سیاسی لطینی کے علاوہ اور کیا عنوان دیا جا سکتا ہے؟

• کیا امریکی حکومت کو یہ معلوم نہیں ہے کہ افغانستان، عراق اور پاکستان کے شمالی علاقوں میں خود امریکی فوجوں اور اسلحہ نے کیا قیمت ڈھار کھی ہے؟

• اور کیا یہ بات بھی اسے ابھی معلوم کرنی ہے کہ فلسطین میں امریکہ کی پشت پناہی اور اسلحہ کے ساتھ اور اس کی ویٹو پاور کے ساتھ میں اسرائیل نے فلسطینی عوام پر جرود تشدد اور وحشت و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں؟

• کیا امریکہ یہ نہیں جانتا کہ عالم اسلام کی رائے عامہ اس سے کس قدر شدید نفرت کرتی ہے اور کس وجہ سے کرتی ہے؟

اگر اب بھی امریکہ عالم اسلام کو اس طرح کی پفریب باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے کہ ہم آپ کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ نبی امریکی حکومت نے بھی حالات سے

کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور وہ اس ڈگر پر چلتے رہنا چاہتی ہے جس کے نتائج کسی اور کیلئے خواہ کیسے ہوں خود امریکہ کے مستقبل کیلئے بہرحال بہتر نظر نہیں آرہے۔

## قاہرہ میں صدر اوباما کا خطاب

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۲۰۰۹ء

امریکہ کے صدر جناب باراک حسین اوباما نے ۳ جون کو قاہرہ یونیورسٹی میں مسلمانوں سے خصوصی خطاب کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ امریکہ اسلام اور مسلمانوں کا شمن نہیں ہے اور وہ مسلمانوں اور امریکہ کے درمیان غلط فہمیاں دور کر کے منافرت کی وہ فضایمت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو مسلم دنیا میں امریکہ کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ صدر اوباما نے اس سے قبل استبول میں بھی اسی نویعت کا خطاب کیا تھا اور عالم اسلام کو یہ بادر کرنے کیلئے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کی تھیں کہ امریکہ مسلمانوں سے ڈینی اور اسلام سے عناد نہیں رکھتا اور مسلمانوں کو ہر ممکن مدد فراہم کرنے کیلئے تیار ہے۔

جناب باراک حسین اوباما کے اسلامی خاندان اپنے منتظر اور امریکہ کا پہلا سیاہ فام صدر ہونے کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کے بطور صدر انتخاب سے قبل ہی ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں اور ان کے صدر بن جانے کے بعد بھی دنیا کے بہت سے مسلمان انہی توقعات اور امیدوں کے ماحول میں جو رہے ہیں۔ جبکہ یہ بات اہل داش پر ڈینی نہیں ہے کہ امریکہ کا صدر اپنے وقت میں دنیا کا سب سے زیادہ با اختیار اور طاقتور شخص کہلانے کے باوجود امریکہ کے یہ نوعی نظام کا صرف ایک حصہ ہوتا ہے اور وہ اگر کوئی نیندی تبدیلی دل سے چاہے بھی تو اس سسٹم کے اندر رہتے ہوئے اس کیلئے ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ امریکہ کے سیاسی اور معاشری سسٹم میں ”پنجی یہود“ کی کار فرمائی روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس لیے صدر باراک حسین اوباما اگر امریکہ اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے اور عالم اسلام میں امریکہ کے بارے میں پائے جانے والے منفی جذبات کو صحیح و اعتماد میں تبدیل کرنے کے عزم میں مختص ہوں تو بھی موجودہ صور تحال میں اس کے دور در تک کوئی آثار دھائی نہیں دیتے۔ اور اس وقت تک امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان اعتماد کی بحالی کا کوئی امکان موجود نہیں ہے جب تک:

- مشرق وسطی میں یہودیوں کی خود ساختہ چودھراہٹ، اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور اس کے ہاتھوں عربوں بالخصوص فلسطینیوں کے حقوق کی پامالی کی فضا قائم ہے،
- اور امریکہ کے سیاسی و معاشری نظام پر یہودیوں کی اجراء داری موجود ہے۔

ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ صدر باراک حسین اوباما عالم اسلام کے بارے میں ثابت جذبات رکھتے ہوں گے اور وہ امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان اعتماد کی بحالی کی کوشش میں بھی یقیناً مختص ہوں گے لیکن اس کیلئے انہیں موجودہ امریکی سسٹم کے پیدا کردہ ماحول اور تناظر سے ہٹ کر زمینی حقوق کی بنیاد پر صورتحال کا جائزہ لینا ہو گا اور عالم اسلام

کی شکایات اور مسائل کو خود عالم اسلام کے جذبات و خیالات کے تناظر میں دیکھنا ہو گا۔ کیونکہ اب تک کی صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام کے مسائل اور مشکلات کی فہرست بھی امریکہ خود طے کرتا ہے اور ان مسائل و مشکلات پر عالم اسلام کی جانب سے امریکہ کے ساتھ معاملات طے کرنے کیلئے مسلم دنیا کے نمائندوں کا انتخاب بھی امریکہ ہی کی صوابید پر ہوتا ہے۔ مثلاً صدر اوباما نے مسلم دنیا کے حوالے سے اپنے ایجنسی کے کاذک کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

”اگرچہ ماضی میں امریکہ نے اس خطے میں تیل اور گیس ہی پر توجہ مرکوز کی ہے، اب ہم وسیع تر تعلقات چاہتے ہیں، تعلیم کے میدان میں ہم دو طرف اشتراک کے پروگراموں کو وسعت دیں گے اور وظائف میں اضافہ کریں گے، ایسے ہی ایک وظیفہ کی بدولت میرے والد امریکہ آئے تھے۔ اور ساتھ ہی امریکی طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں گے کہ وہ مسلم ممالک میں تعلیم حاصل کریں، اس کے بعد لے ہم ہونہار مسلم طلبہ کو امریکہ اثر ان شپ دیں گے، دنیا بھر کے استاذوں اور بچوں کو آن لائن تعلیم اور تربیت کو فروغ دیں گے اور نئے نیٹ ورک قائم کریں گے تاکہ کنساس بیٹھا ہوا ایک بچہ قاہرہ میں بیٹھے ہوئے بچے سے فوری تبادلہ خیالات کر سکے۔ اقتصادی ترقی کے شعبے میں ہم بڑنس کے رضاکاروں کی ایک جماعت تیار کریں گے جو مسلم اکثریتی ممالک میں موجود رضاکاروں کے ساتھ مل کر کام کر سکیں اور میں اس سال اخیر پرینیور شپ کے ایک سربراہی اجلاس کی میزبانی کروں گا جس میں یہ جانش کی کوشش کی جائے گی کہ تجارتی راہنماؤں، اداروں اور دنیا بھر کی مسلم برادریوں کے ساتھ تعلقات روایط کیسے مضبوط بنائے جائیں۔ سائنس اور ٹکنالوژی میں ہم مسلم اکثریتی ممالک میں ٹکنالوژی ترقی کی امداد کیلئے اور نظریات کے منڈیوں تک منتقلی کے فروغ کیلئے ایک نیافذ قائم کریں گے تاکہ روزگار کے نئے موقع پیدا ہو سکیں۔ ہم افریقہ، مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں نئے سائنسی مرکز قائم کریں گے اور توانائی کے نئے ذرائع، ماہول کے روزگار ڈیکھیل ریکارڈ، صاف پانی اور نئی فصلیں اگانے کے پروگراموں میں تعارف کیلئے سائنسی اپنچی تبعینات کریں گے۔ اور آج میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے ساتھ مل کر پولیو کے خاتمه کیلئے ایک نئی عالمی کوشش کا اعلان کر رہا ہوں اور ہم زچ بچ کی صحت کے فروع کیلئے بھی مسلم برادریوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے تیار ہیں، لیکن یہ تمام چیزیں تعارف اور اشتراک کے ساتھ ہی کی جاسکتی ہیں۔“

صدر اوباما کی تقریر کا یہ طویل اقتباس ہم نے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ امریکہ کے نزدیک عالم اسلام کے مسائل کیا ہیں اور انہیں حل کرنے کیلئے وہ کیا کر سکتا ہے؟ لیکن ہم امریکہ کے صدر محترم کی خدمت میں بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ عالم اسلام کے مسائل ضرور ہیں لیکن امریکہ اور عالم اسلام کے تعلقات کے تناظر میں مسلمانوں کے اصل مسائل یہ نہیں ہیں اور جب تک امریکہ اور مغرب عالم اسلام کے اصل مسائل کی طرف توجہ نہیں دیں گے محض جزوی معاملات میں وقت، رقم اور صلاحیتوں کا کسی بھی سطح پر استعمال اعتماد کی وہ فضاقائم کرنے میں

- معاون ثابت نہیں ہو گا جس کی صدر اوباما تو قرر ہے ہیں۔
- امریکہ اور عالم اسلام کے درمیان کشمکش کے اصل مسائل سیاسی اور ثقافتی ہیں کہ:
1. امریکہ اور مغرب انسانی سوسائٹی میں اسلام کے معاشرتی کردار کی نظر تھے ہوئے مسلمانوں کو اجتماعی زندگی میں اسلام سے دور کرنے کیلئے ہر ممکن جتن کر رہے ہیں، جبکہ دنیا بھر کے مسلمان اسلام کے معاشرتی کردار اور اجتماعی زندگی کے بارے میں قرآن و سنت کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں۔
  2. امریکہ اور مغرب عالم اسلام سے معاملات طے کرنے کیلئے مسلم رائے عامہ کے حقیقی نمائندوں سے بات کرنے کی بجائے مسلم دنیا پر اپنی مرضی کی لیدر شپ مسلط کر کے ان کے ذریعے عالم اسلام کو اپنے ڈھب پر لانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔
  3. امریکہ اور مغرب فلسطین اور کشمیر کے مسائل کے حوالے سے عالمی رائے عامہ اور ہین الاقوامی فیصلوں کو مسلسل پاپاں کرتے ہوئے ظلم و بربریت کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔
  4. امریکہ اور مغرب طشدہ پالیسی کے تحت مسلم دنیا کو نہ تو اقوام متحده کے فیصلہ سازی کے عمل میں شریک کرنے کیلئے تیار ہیں اور نہ ہی عسکری طاقت اور ٹیکنالوجی میں عالم اسلام کو توازن کی پوزیشن میں آنے کا راستہ دے رہے ہیں۔
  5. حتیٰ کہ امریکہ اور مغرب نے انسانی حقوق، جمہوریت اور اقوام کی خود مختاری کے احترام کے ان اصولوں کے حوالے سے بھی عالم اسلام کے بارے میں الگ معیار قائم کر رکھا ہے جو خود امریکہ اور مغرب کے نزدیک مغربی فلسفہ کی بنیاد ہیں۔
  6. نیز عراق اور افغانستان میں امریکی اتحاد نے جو کچھ کیا ہے اور اب پاکستان کی داخلی حدود میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس نے ملتِ اسلامیہ کے جسم کو خموں سے چور چور کر دیا ہے اور اس کے تسلسل میں ابھی تک کی کے کوئی امکانات نظر نہیں آرہے ہیں، غیر ذلک۔
- صدر اوباما نے اس خطاب میں اسرائیل کی حمایت کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:
- ”اسرائیل کے ساتھ امریکہ کے مضبوط رشتہوں کے بارے میں سب جانتے ہیں، یہ رشتہ ناقابل تفہیم ہے، اس کی بنیاد ثقافتی اور تاریخی بندھوں پر اور اس احساس پر ہے کہ یہودیوں کی ایک وطن کی آرزو کی بنیاد ایک المناک تاریخ پر ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا بھر میں یہودی عوام پر صدیوں تک ظلم کیے جاتے رہے اور یورپ میں یہود دشمن کا انجام نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کی صورت میں نکلا جسے ہولو کاست کا نام دیا گیا ہے۔ کل میں Buchenwald جاؤں گا، جو ان کمپنیوں کے نیٹ ورک کا حصہ تھا جہاں یہودیوں کو غلام بنایا جاتا تھا، انہیں اذتیں دی جاتی تھیں، انہیں گولی ماری جاتی تھی اور

زہریلی گیس سے موت کی نیند سلاڈیا جاتا تھا، ساٹھ لاکھ بیہودیوں کو ہلاک کیا گیا، یہ تعداد آج کے اسرائیل کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔“

ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ہولو کاست کی تاریخی حیثیت کیا ہے البتہ صدر اور بام محترم سے یہ دریافت کرنے کی جسارت ضرور کریں گے کہ بیہودیوں کی وطن کی آزو پوری کرنے کیلئے فلسطینیوں کو ان کے وطن سے محروم کردیئے کا آخر کیا جواز ہے؟ ہمارے ہاں یہ کام قبضہ گروپ کیا کرتے ہیں جو کسی من پسند خاندان کو مکان کا قبضہ دلانے کیلئے وہاں پہلے سے مکین خاندان کا سامان زبردستی اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں اور جو اگر خالی کرالیتے ہیں۔ پھر میں نہ ہولو کاست میں ساٹھ لاکھ بیہودیوں کے قتل عام کا ذکر تو کیا جاتا ہے لیکن کیا صدر اور باما اس بات کیلئے تیار ہیں کہ

- جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے ہاتھوں
- وسطی ایشیا میں روسی استعمار کے ہاتھوں

#### • اور عراق و افغانستان سمیت دنیا بھر میں امریکی استعمار کے ہاتھوں

قتل عام کا شکار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کرنے کیلئے عالمی سطح پر ایک کمیشن قائم کیا جائے، اور گوانٹانامو بے طرز کے ان بیسیوں کیپوں کے مناظر کو بھی منظر عام پر لایا جائے جن میں گذشتہ دو صدیوں کے دوران مسلمانوں کو دہشت و بربریت کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔

صدر امریکہ نے اپنے خطاب میں بہت سی باتیں فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک پربات ہو سکتی ہے مگر ہم نے بطور شعونہ ان میں صرف دو حوالوں سے مختصر گزار شات پیش کی ہیں، اس طرف توجہ دلانے کیلئے کہ امریکہ اور عالم اسلام میں اعتناد کی بحالی کیلئے اصل ضرورت مصنوعی ماحول سے نکلنے اور زینی حقائق کی بنیاد پر صورتحال کا جائزہ لینے کی ہے، اس کے بغیر اس حوالے سے کیا جانے والا کوئی کام بھی حالات کا رخ تبدیل نہیں کر سکے گا۔

## افغانستان کی صورتحال اور "ہفتہ نامہ امید"

روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۶ اگست ۲۰۰۹ء

گذشتہ روز مغرب کی نماز کے بعد دارالہدی (اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ) میں مختصر درسِ حدیث دینے کے بعد سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک دوست کے ہاں کھانا لھانے کیلئے جا رہا تھا کہ میزبان نے ایک افغان سٹور کے پاس گاڑی روک لی اور کہا کہ روٹیاں بیباں سے لیتے ہیں ان کی روٹی بہت اچھی ہوتی ہے۔ مجھے اپنے ہاں کے افغانی تندور یاد آگئے کہ ہمارے ہاں بھی افغانیوں کی روٹی زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ میں بھی ساتھ اتر گیا کہ افغان سٹور دیکھ لوں۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک طرف ریک پر اخبار پڑا اٹر آگیا اور میری نظر وہیں رک گئی۔

بیباں اس طرح کے اخبار سٹوروں پر مفت تقسیم کیلئے رکھے ہوتے ہیں جن میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے لیکن بعض کام کی خبریں اور رپورٹیں بھی مل جاتی ہیں۔ اردو کے درجنوں اخبارات امریکہ کے خلاف شہروں سے شائع ہوتے

بیں اور ان سٹوروں کے علاوہ مساجد میں جمود کی نماز کے بعد تقدیم ہوتے ہیں۔ میں عام طور پر ان اخبارات کو ایک نظر ڈالنے کیلئے اٹھایتا ہوں اور اپنے مطلب کی خبریں اور مضامین الگ کر کے محفوظ کر لیتا ہوں۔

یہ ہفت روزہ اخبار فارسی زبان میں ہے جو ”ہفتہ نامہ امید“ کے نام سے وائیچن کے الیزینڈریا (ورجنیا) سے شائع ہوتا ہے۔ محمد قوی کوشان اس کے مدیر مسئول اور ناشر ہیں۔ ہمارے ہاں کے ہفتہ وار میگزین کے سائز کے بارہ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ ۲۰۰۹ء کا ہے اور اس کا شمارہ نمبر ۸۵ ہے۔ بارہ صفحات میں سے کم و بیش ساڑھے چار صفحات اشتہارات پر مشتمل ہیں، باقی صفحات میں افغانستان کی خبریں اور وہاں کے حالات کے جائزہ پر مشتمل مضامین اور رپورٹیں اچھی ترتیب کے ساتھ پیش کی گئی ہیں جن سے افغانستان کی عمومی صور تحوال ایک حد تک قاری کے سامنے آجائی ہے۔ پورے اخبار میں پاکستان کی ایک ہی خبر ہے جو مولانا صوفی محمد گرفتاری کے بارے میں ہے، باقی تمام خبریں اور مضامین افغانستان سے متعلق ہیں۔ اپنے مواد اور ترتیب کے حوالے سے مجھے یہ ایک کمل اخبار محسوس ہوا اور بہت اچھا لگا، اس لیے اپنے اس تاثرا اور استفادہ میں قارئین کو شریک کرنا بھی میں نے مناسب خیال کیا ہے۔

”ہفتہ نامہ امید“ کے صفحہ چہارم پر افغانستان میں والی بال کے کھیل کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور صفحہ اول پر افغانستان کی ایک قوی والی بال ٹیم کا گروپ فوٹو شائع کیا گیا ہے جس نے ۱۹۵۳ء کے دوران بھارت کے شہر ملکانہ میں ہونے والے والی بال مقابلوں میں حصہ لیا تھا۔ صفحہ اول پر ہمی افغانستان کے صدارتی انتخابات کے ایک امیدوار ڈاکٹر عبد اللہ کی حمایت میں چاریکار میں جمع ہونے والے ہزاروں افراد کے ہجوم کی فوٹو شائع کی گئی ہے جو ڈاکٹر عبد اللہ کی پیگڑی والی تصویر اٹھائے ان کے حق میں مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اخبار میں جناب سرور کائنات کے واقعہ معراج کے بارے میں دو فارسی نظمیں شائع ہوئی ہیں، ایک محمد ط کوشان کی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

شب کہ صاحب دل ہا بدادر مہمانی  
برآں بلندی بارگاہ عرش رحمانی  
جبکہ دوسری نظم عبدالحی آرین پور کی ہے جو نعت نبویؐ کے معروف و مشہور شعر:  
حسن یوسف دم عیسیٰ یہ بیضا داری  
آنچہ خوبیاں ہمہ دارند تو تہا داری  
کی تضمین لگتی ہے اور اس کے چند اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کو تھی چاہتا ہے۔  
خلق خوش، دست کرم، صلمہ رحم و ارفاق  
ہمہ اسباب بزرگی تو مہیا داری  
اے بہ آل تو و اصحاب درود و سلام  
امتاں را بہ دل و دیدہ تو مادی داری  
یار غارہ و عمر و عنان و علی یار نت

بہترین ہمہ و افضل آنہا داری  
 دوست داران حضورت ہے شفاعت بنواز  
 تو کہ با دشمن خود حلم و مدارا داری  
 اس شمارہ میں جناب عبدالقدیر خالق ہروی کے شعری مجموعہ کلام "در دل" پر پروفیسر ڈاکٹر طیفی کا خوبصورت تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے جس کا آغاز ان دو شعروں سے کیا گیا ہے:

تخييل رقيبا را در كويه تو مي بيغم  
 در ديه خلد هر دم صدخار مغيلان  
 در رهگزرت جاناں يعقوب صفت فاق  
 بيت الحرفني دارو اي يوسف كنعام

افغانستان کیلئے صدر امریکہ باراک اوباما کے خصوصی نمائندہ ہالبروک کی افغان علماء کرام کی مجلس شوریٰ کے سربراہ مولوی فضل ہادی شعواری کے ساتھ ملاقات کی رپورٹ شائع ہوئی ہے، جس میں ملا شعواری نے امریکی رہنماء سے شکوہ کیا ہے کہ افغان صدر حامد کرزی نے سات سال قبل مخالف افغان گروپوں کے ساتھ مصالحت کیلئے جس سلسلہ جنبانی کا آغاز کیا تھا امریکہ نے اس کی حمایت نہیں کی تھی اور اس کو سپورٹ نہیں کیا تھا، جبکہ افغانستان کے منسلکے حل کیلئے یہ ضروری ہے۔ اس لیے افغانستان کے انتخابات کے بعد نئی حکومت کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ مخالف گروپوں کے ساتھ صلح کیلئے مذاکرات کر سکے، امریکہ کو ان مذاکرات کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس کے جواب میں ہالبروک نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انتخابات کے بعد مخالف گروپوں کے ساتھ مصالحت کیلئے گفتگو کا آغاز کیا جائے گا۔ ہالبروک نے یہ بھی کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مذاکرات افغانوں کے اپنے طریقے کے مطابق ہوں اور یہ ورنی قوتیں ان میں صرف معاون کا کردار ادا کریں۔  
 ہفتہ نامہ میں کیلی فوریا میں مقیم ایک افغان دانشور عبدالودود ظفری کا ڈچپ تجربیاتی مضمون "افغانستان، ویتنام، اوبما" کے عنوان سے قسط وار شائع ہو رہا ہے جس کی ایک قسط اس شمارے میں موجود ہے، اس میں افغانستان کی موجودہ صورتحال کا ویتنام کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے:

- مضمون نگار کا کہنا ہے کہ نتائج بھی اس سے مختلف نہیں ہوں گے۔

- عبدالودود ظفری لکھتے ہیں کہ افغانستان کے عوام ویتنام کے عوام کی طرح ہی ہیں کہ جس طرح وہ اپنی حکومت کو ایک طرح کی استبدادی حکومت سمجھتے ہوئے اس سے خوف کھاتے تھے، انہیں اس سے وحشت تھی، اسے اپنی خیر خواہ حکومت تصور نہیں کرتے تھے۔ ویتنام کے عوام بھی اپنے اصحاب اقتدار کے طرز حکومت کے باعث ہر اس میں مبتلا تھے اور وہ اسے دشمن کی حکومت یا دشمن کی خیر خواہ حکومت سمجھتے ہوئے امریکی طاقت کے سامنے دبے ہوئے تھے۔ اسی طرح کا خوف اور نامیدی اس وقت افغانستان میں موجود ہے۔ جس وقت نائن الیون کے والوں کے بعد طالبان تیزی سے پہا ہو گئے تھے افغان عوام نے اس نامید پر امریکہ کو

- خوش آمدید کہا تھا کہ وہ ان کے شہروں کی آبادی واپس لائے گا، دفتری نظام کو بحال کرے گا اور ان کی معیشت و اقتصاد کو از سر نواستوار کرے گا۔ لیکن یہ امید اور خوش نیمی اب نامیدی بلکہ پریشانی کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ افغانستان میں روس کے سفير جناب ضمیر کا بلوف نے یہ سوال کیا ہے کہ افغان عوام کو اتحادی افغان حکومت کیا حاصل ہوا ہے؟ لوگ جس طرح پہلے فقر و تنگستی کا شکار تھے اب بھی اسی طرح نادار و فقیر ہیں اور اس کے ساتھ بمباری کا انشانہ بھی بن رہے ہیں۔
- مضمون میں بتایا گیا ہے کہ افغانستان کے ۲۷ فیصد علاقوں میں طالبان مستقل طور پر موجود ہیں جبکہ یہ تناسب صرف ایک سال قبل ۵۸ فیصد تھا۔ نیز طالبان اب کابل کی طرف پیش قدمی کی پوزیشن میں بھی ہیں جبکہ کابل کی طرف جانے والی بڑی شاہراہوں میں سے تین اس وقت طالبان کے زیر اثر ہیں، صرف ایک بڑی شاہراہ ان کے اشو نفوذ سے خالی ہے۔
  - عبد الوود ظفری کا کہنا ہے کہ طالبان اور ویتنام میں البتہ یہ فرق ضرور نظر آتا ہے کہ ویٹ نام نے امریکی فوجوں کے خلاف جنگ قوم کے عنوان سے لڑی ہے مگر طالبان نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن ویتنام کی چہ نسبت طالبان کو ایک سہولت ایسی حاصل ہے جو ویتنام کو میرنسیں تھی کہ افغانستان میں پوست کی کاشت جو دنیا میں پوست کی مجموعی پیداوار کا ۹۳ فیصد ہے، وہ بڑھ رہی ہے بلکہ اب دو گناہوگی ہے۔ جبکہ پوست کے کاشتکار جب تک اس بات کا اطمینان حاصل نہ کر لیں کہ طالبان اب دوبارہ نہیں آئیں گے، پوست کی کاشت سے باز آنے والے نہیں ہیں اور یہ بات طالبان کے حق میں جا رہی ہے۔
  - مضمون میں ”نیزویک“ کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ امریکی رائے عامہ افغان جنگ کو مزید بڑھانے کے حق میں نہیں ہے۔ ایک سروے کے مطابق اے فیصد امریکی عوام کی رائے یہ ہے کہ صدر اوباما کو امریکی معیشت کی بحالی کی طرف توجہ دینی چاہیے، جبکہ ۲۸ فیصد امریکی افغان جنگ میں مزید پیش رفت کی حمایت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف افغان رائے عامہ کا حال یہ ہے کہ عام انتخابات میں حصہ لینے والے بیشتر امیدوار اس جنگ کو ”جنگ اوباما“ قرار دے کر اس کی مدد کر رہے ہیں۔
  - مضمون نگارنے اپنے اس تجربے میں یہ سوال اندازیا ہے کہ کیا امریکہ کے افغانستان سے نکل جانے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ یہ بات آسان نہیں ہے، امریکہ کے نکل جانے سے افغانستان کی کمزور حکومت ختم ہو جائے گی اور وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی جو ۱۹۸۶ء میں سویت افغان کی واپسی کے بعد رونما ہوئی تھی کہ افغانستان داخلی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا تھا۔ پھر جنوبی افغانستان کے پشتوں، شمال کے تاجکوں کو، جو موجودہ حکومت میں مضبوط حیثیت رکھتے ہیں، اپنادمن تصور کریں گے۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ پاکستان کی پشتیبانی سے وہ آگے آجائیں گے جو ظاہر ہے کہ طالبان ہی ہو سکتے ہیں۔

یہ ہے افغانستان کی صورت حال کے بارے میں ہفتہ نامہ امید کا پیش کردہ ایک ہلاکسٹ اخواک، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

## صدر قذافی کا جنرل اسمبلی سے خطاب

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۰۹ء

لیبیا کے صدر معمر القذافی نے گذشتہ روز اقوام متحده کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا جو ان کے چالیس سالہ دور اقتدار میں اس عالمی فورم پر ان کا پہلا خطاب تھا۔ انہوں نے مغربی ملکوں کی پالیسیوں اور اقوام متحدہ کے کردار پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسرائیل کی طرفداری کر رہے ہیں اور انہوں نے عراق اور افغانستان پر ناجائز فوج کشی کی ہے، انہوں نے سوال کیا کہ اگر وہیکن میں مذہبی ریاست ہو سکتی ہے تو طالبان کی مذہبی حکومت کو کبھی برداشت نہیں کیا جا رہا۔ انہوں نے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چار ٹرکاشن وار جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ خود اقوام متحدہ اور مغربی ممالک اس منشور کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، یہ کہہ کر انہوں نے اقوام متحدہ کا منشور خطاب کے دوران پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ انہوں نے اقوام متحدہ کو بے عمل ادارہ قرار دیتے ہوئے اس کی جنرل اسمبلی کو لندن کے ہائی پارک کارنز سے تشبیہ دی جہاں صرف تقریبیں کی جاتی ہیں اور لوگ آگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

صدر معمر القذافی نے جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے جن خیالات کا جرأتمدنانہ اظہار کیا ہے، ان کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کے باوجود ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انہوں نے عالم اسلام کی رائے عامہ کی ترجیحی کی ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو اس عالمی فورم کے ذریعے بین الاقوای حقوق تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ خطاب بھی عملًا "ہائی پارک کارنز" ہی کی ایک تقریب ہے جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم صدر قذافی کے اس جرأتمدنانہ خطاب کو سراحتہ ہوئے ان سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان باтолی کی اصل جگہ اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم (اوآئی سی) کا سربراہی اجلاس اور اقوام متحدہ کی سلامتی کو نسل ہے، کیا ہم ان پالیسی ساز فور موں میں اس طرح کا جرأتمدنانہ موقف پہنچانے کی کوئی صورت نہیں نکال سکتے؟

## دینی مدارس پر دبشت گردی کا الزام

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۹ء

بلستان کے دورے کے کچھ تاثرات ابھی باقی ہیں لیکن اس سے قبل ۷۱ اکتوبر کو لاہور کے ایک ہوٹل میں "دینی تعلیم اور عصری تقاضے" کے زیر عنوان منعقد ہونے والے سینیٹار کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سینیٹار کا اہتمام تحریک اصلاح تعلیم اور صفا اسلامک سنٹر کے سربراہ ڈاکٹر محمد امین نے ایک قوی اخبار کے مذہبی ونگ کے

تعاون سے کیا، اور اس میں ڈاکٹر صاحبِ موصوف کے علاوہ صوبائی وزیر قانون رانا شاء اللہ خان، صوبائی وزیر جمل خانہ جات چودھری عبد الغفور، جسٹس (ر) منیر احمد مغل، معروف صحافی جناب عطاء الرحمن، ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ، سید افتخار حسین شاہ اور دیگر مقترین کے علاوہ رام الحروف نے بھی گزارشات پیش کیں۔

سمینار کے مہمان خصوصی صوبائی وزیر قانون رانا شاء اللہ خان تھے، انہوں نے اپنی گفتگو میں دینی مدارس کے موجودہ کردار اور ان کے بارے میں مختلف اطراف سے کیے جانے والے مفہی پر اپنیہدا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا، ان کی اس فکر انگیز گفتگو کے کچھ حصے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

رانا صاحب نے کہا کہ دینی مدارس کے بارے میں عمومی طور پر یہ تاثر پھیلتا جا رہا ہے کہ وہ دہشت گرد تیار کر رہے ہیں اور دہشت گردی کی جو روایت وقت موجود ہے وہ ان کی وجہ سے ہے۔

درactual یہ بات سب سے پہلے امریکہ کی طرف سے کہی گئی تھی جسے لاشموری طور پر ہمارے ہاں بھی قول کر لیا گیا ہے، پھر ہمارے میڈیا اور داش وروں نے بھی وہی کچھ کہنا شروع کر دیا ہے۔ جبکہ یہ بات غلط ہے اس لیے کہ ان دینی مدارس کی تاریخ تو صدیوں پرانی ہے جبکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ابھی ایک عشرے کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ کے موجودہ ماحول سے پہلے ان مدارس میں دہشت گردی کیوں پیدا نہیں ہو رہے تھے اور اس وقت ان پر یہ الزام کیوں نہیں تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ میں امریکہ کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو مذہبی جذبہ کے ساتھ یہ جنگ لڑ سکیں، ایسے افراد ظاہر ہے کہ دینی مدارس سے ہی مل سکتے تھے۔ جبکہ اس وقت پاکستان کے فوجی حکمران کو بھی امریکہ کے ساتھ تعاون کیلئے اس کی ضرورت تھی۔ چنانچہ دینی مدارس سے ایسے افراد کو تلاش کیا گیا اور انہیں تیار کر کے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف صاف آراء کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے پورے خلوص اور جذبہ جہاد کے ساتھ یہ جنگ لڑی اور سوویت یونین کو شکست دی۔ ان لوگوں کے خلوص اور جذبہ ایمانی میں کوئی شےर نہیں لیکن ان کے پیچھے جو ماسٹر مانڈ تھے ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ انہوں نے سوویت یونین کی شکست کے بعد ان مجاہدین کو تھا چپوڑا اور کہہ دیا کہ اب تمہاری ضروری نہیں رہی، اپنی زندگی کا راستہ اور ذرائع خود تلاش کرو۔ انہیں اگر اس وقت فوج میں بھرتی کر لیا جاتا یا تو فی پالیسی کے تحت کسی کام پر لگادیا جاتا تو یہ صورت حال جو آج پیدا ہوئی ہے نہ ہوتی۔ لیکن امریکہ نے انہیں تھا چپوڑا اور جن پاکستانی اداروں نے جہاد افغانستان میں ان کی پشت پناہی کی تھی وہ پیچھے ہٹ گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جس شخص نے جدید ترین اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کر کر گھی ہے اور سالہا سال تک اس کے استعمال کا تجربہ بھی کیا ہے، وہ زندگی گزارنے کیلئے اس کے سوا اور کون سارا ستمہ تلاش کرے گا؟ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس لیے ان مجاہدین کو دہشت گردی کی طرف لے جانے کی ذمہ داری دینی مدارس پر نہیں ہے اور نہ ہی وہ انہیں اس مقصد کیلئے تیار کرتے ہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ان قوتوں پر ہے جنہوں نے انہیں سوویت یونین کے خلاف جہاد کیلئے استعمال کیا، پھر انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے آزاد اور تھا چپوڑا۔

## جہاد افغانستان اور افغان طالبان کا پس منظر

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

پاکستان کی موجودہ کشکش کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے اس فکری اور نظریاتی پس منظر کو سامنے رکھا جائے جس میں یہ کشکش اس مقام تک پہنچ ہے۔ یہ فکری اور نظریاتی کشکش قیام پاکستان کے بعد فوراً ہی شروع ہو گئی تھی کہ پاکستان کے معاشرتی ڈھانچے اور دستوری و قانونی نظام کی بنیاد کیا ہوگی؟

وہ عناصر جنہوں نے بر صیری میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے داخلے کے وقت سے ہی اس خطے پر بروطانوی راج کی مزاحمت کا آغاز کر دیا تھا اور مختلف اوقات، مراحل اور علاقوں میں سراج الدولہ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمد حسنؒ کی تحریک ریشی روہاں تک مسلسل مزاحمت، اور اس کے بعد سے ۱۹۷۲ء تک عدم تشدد پر بنی جدو جہد کے ذریعے بروطانوی تسلط سے وطن عزیز کی آزادی کیلئے متحرک کردار ادا کیا تھا، ان کا مقصد اور ایجنڈا یہ تھا کہ مسلمانوں کیلئے اور اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس نئی ریاست میں معاشرتی ڈھانچے کی تشكیل اسلامی شریعت اور احکام و قوانین کی بنیاد پر ہو، اور پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ملک کے طور پر دنیا میں اپنا کردار ادا کرے۔ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید، حاجی شریعت اللہ، سردار احمد خان کھرل، ٹیموری، فقیر اپتی، حاجی صاحب تر گنری، اور ۱۸۵۷ء کے ہزا روں مجہدین سمیت ان گروہوں میں سے جس گروہ کو جہاں موقع ملا، اس نے اپنے زیر تسلط علاقے میں اسلامی شریعت کا اجر اور فناذ کر کے آزادی کی جدو جہد میں حصہ لینے کے مقصد کو واضح کیا۔ حتیٰ کہ بر صیری کے بڑے علاقوں میں مسلسل جدو جہد ترک کر کے جب پُرانے اور عدم تشدد پر بنی تحریک آزادی کو آگے بڑھایا گیا تو بھی مقصد آزادی یہی قرار پایا کہ بروطانوی تسلط سے نجات پانے کے بعد مسلم معاشرہ میں اسلامی شریعت کے اجر اور فناذ کا اهتمام کیا جائے گا۔ چنانچہ مسلم لیگ کا دوقوئی نظریہ، مولانا محمد علی جوہرؒ کی تحریک خلافت اور مجلس احرار اسلام کی حکومت الہیہ اسی جذبہ اور نظریہ کی ترجیح اور عکاس تھی۔

دوسری طرف وہ عناصر اور طبقات جنہوں نے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوسائٹی، اور باقاعدہ بروطانوی راج کے نوے سالہ دور میں، ایک نوابادیاتی نظام کے کل پرزوں کا کردار ادا کیا تھا، اور اپنے فکر و مزاج کو اسی کے مطابق ڈال کر اپنا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا، پاکستان کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے میں کوئی نظریاتی اور تہذیبی انقلاب ان کے مزاج اور مفادات کے خلاف تھا۔ اس لیے انہوں نے نوابادیاتی نظام کو برقرار رکھنے اور اپنا تہذیب و زن اس کے پلڑے میں ڈالنے کا فیصلہ کیا اور اب تک وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ ان عناصر و طبقات کو تین معاملات میں برتری حاصل رہی ہے:

- بروطانوی دور میں سیاسی، انتظامی اور معاشری نظم و ننقش ان کے ہاتھ میں تھا جو آزادی اور قیام پاکستان کے بعد بھی انہی کے ہاتھ میں رہا۔

بین الاقوامی رجحانات بالخصوص نئی عالمی استعماری قتوں کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل چلی آ رہی ہے، اس لیے کہ جن قتوں نے خلافتِ عنایتیہ کو ختم کر کے اس کے مرکوز ترکی کو سیکولر جمہوریہ بنانے میں کامیابی حاصل

کری تھی، انہیں اسلام کے نام پر ایک نئے ملک کا قیام اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کسی طرح گوارہ نہیں تھی۔ جبکہ سرمایہ دارانہ بلاک اور سو شلسٹ بلاک کے درمیان جاری عالمی سرد جنگ میں سرمایہ دارانہ بلاک کی ضرورت یہ تھی کہ سودیت یونین کے خلاف مسلمانوں کے مذہبی رجحانات بالخصوص ان کے جذبہ جہاد سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس لیے مغربی بلاک نے یہ حکمتِ عملی طے کی مسلمانوں کے مذہبی کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ سرمایہ دارانہ بلاک کی یہ حکمتِ عملی پاکستان کے ان داخلی عناصر و طبقات کی پشت پناہ بن گئی جو اس ملک میں نوآبادیاتی نظام کے تسلسل کو باقی رکھنے میں اپنی عافیت محسوس کر رہے ہیں۔

- ملک کے تعلیمی نظام پر بھی انہی کا کنش روشن تھا، اس لیے اس بات کا بطور خاص اہتمام کیا گیا کہ ریاتی تعلیمی اداروں میں ایسے رجالِ کار اور رفراہ تیار نہ ہونے پائیں جو نوآبادیاتی نظام میں کسی قسم کی تبدیلی اور اسلامی شریعت کے احکام و قوانین کے نفاذ و اجر اکاذب یعنی بن سکیں۔

اس تناظر میں وہ عناصر و طبقات جو برطانوی تسلط سے آزادی کا اصل مقصد نوآبادیاتی نظام کے خاتمه اور اسلامی احکام و قوانین کے اجراؤ نفاذ کو قرار دیے ہوئے تھے، انہوں نے پُر آمن سیاسی، جمہوری اور دستوری جدوجہد کے ذریعے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی منتظری سے لے کر، ۱۹۷۳ء کے دستور میں ملک کو اسلامی ریاست قرار دلانے، اور ملک کے تمام قوانین کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی ضمانت حاصل کرنے تک، تمام مراحل پُر آمن سیاسی اور دستوری جدوجہد کے ذریعے طے کیے۔ انہیں دوسرا سالہ تحریکِ آزادی کے شاندار پیش منظر کے ساتھ ساتھ پاکستانی عوام کی اسلام کے ساتھ جذبائی و ابتنگی اور نفاذِ اسلام کیلئے دینی قوتوں کے متحرك کردار کی پشت پناہی حاصل تھی اور ملک کی رائے عامہ ان کے ساتھ تھی، اس لیے وہ تمام تر کارکوڈوں کے باوجود مسلسل پیش رفت کرتے رہے۔

اس دوران ایک اور اہم واقعہ نے نفاذِ شریعت کے حوالے سے حکمران طبقات سے عوام کی مایوسی میں اضافہ کیا۔ وہ یہ کہ بہاولبور، سوات، قلات، خیبر پور اور دیگر ایسی ریاستوں میں جہاں برطانوی استعمار کے تسلط کے دوران عدالتی سطح پر شرعی قوانین کی عملداری موجود تھی، پاکستان کے ساتھ ان کے الحاق کے ساتھ ہی ان میں شرعی قوانین کا نظام ختم کر دیا گیا۔ جس نے عوام اور دینی حقوق میں اس سوچ کو بختم کر دیا کہ آزادی کے مقصد کے حصول، نوآبادیاتی نظام کے خاتمه، اور اسلامی شریعت کی عملداری کیلئے جو کچھ کرنا ہے خود انہی کو کرنا ہے، اور ملک کی رو نگ کلاس سے اس کیلئے کسی حمایت یا سہولت کی توقع عبث ہے۔

اس پیش منظر میں جب افغانستان میں سودیت یونین کی باقاعدہ افواج کی آمد کے بعد وہاں جہاد کے عوام سے قوی خود مختاری اور آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو پاکستان کے دینی حقوق اور عوام کا اس طرف متوجہ ہونا ایک فطری امر تھا۔ جہاد افغانستان میں افغان عوام کا اجنبیاً یہ تھا کہ وہ سودیت یونین کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے، جبکہ پاکستان

کے دین کے ساتھ جذباتی والائی رکھنے والوں کا ایجمنڈ ایہ تھا کہ وہ اپنے افغان بھائیوں کی مدد کے ساتھ ساتھ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد جب افغانستان میں اسلامی شریعت کی عملداری قائم ہوگی تو اس سے پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کرنے والوں کو بھی تقدیت ملے گی اور ان کیلئے اپنے مقصد اور منزل کی طرف پیشافت آسان ہو جائے گی۔ سوویت یونین کی شکست اور عالمی سرد جنگ میں سرمایہ دارانہ بلاک کی کامیابی کی حد تک یہ ایجمنڈ اعلیٰ اسلام کے پیشہ ممالک اور مغربی استعماری قوتوں کے مقابلہ میں تھا، اس لیے انہوں نے افغان جہاد کو مکمل طور پر سپورٹ کیا، لیکن یہ طے کر کے کیا کہ سوویت یونین کے خلاف مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے توپری طرح فائدہ اٹھایا جائے مگر اس کے نتیجے میں شریعت کے نفاذ کے ایجمنڈ کو افغانستان میں پوری قوت کے ساتھ روک دیا جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، جو نبی چہادِ افغانستان نے روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی اور عالمی سطح پر سوویت بلاک کے بکھر جانے کا ہدف حاصل کر لیا، مجاہدین کے بارے میں سرمایہ دارانہ بلاک کا طرز عمل تبدیل ہو گیا۔ افغانستان میں مجاہدین کی متحکم حکومت بنوئے کی وجہے ان کے مختلف گروپوں کو باہمی خانہ جنگی کیلئے کھلا چھوڑ دیا گیا بلکہ اس خانہ جنگی کی حوصلہ افزائی کر کے مجاہدین کو بذریعہ کمزور کرتے چلے جانے کی حکمتِ عملی طے کر لی گئی۔ جس کے نتیجے میں تاریخِ انسانی کا یہ اندوہناک المیہ سامنے آیا کہ جن ممالک اور قوتوں نے چہادِ افغانستان کے ثمرات دونوں ہاتھوں سے سیئیہ، انہوں نے جنگ لڑنے اور قربانیاں دینے والے مجاہدین کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چہادِ افغانستان کے نتیجے میں:

- عالمی سطح پر سوویت یونین کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ بلاک کو فتح حاصل ہوئی،
- مشرقی یورپ کی ریاستیں آزاد ہوئیں،
- بالٹیک ریاستوں نے کسی جدوجہد کے بغیر آزادی کی منزل حاصل کر لی،
- وسطی ایشیائی ریاستوں نے خود مختاری حاصل کی،
- دیوار برلن ٹوٹی اور جرمنی ایک بار پھر متعدد ہو گیا،
- پاکستان نے بلوچستان کے ساحلوں تک سوویت یونین کی رسائی کے خوف سے نجات پائی،

مگر ان سب نے چہادِ افغانستان کے ثمرات سے اپنی اپنی جھولیاں بھرنے کے بعد مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا۔ چہادِ افغانستان سے بیرونی قوتوں نے اپنے اپنے مقاصد حاصل کر لیکن جنگ لڑنے اور اس میں لاکھوں جانوں کی قربانی دینے والوں کا اپنا مقصد، کہ افغانستان ایک اسلامی ریاست بنے اور اس میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو، ادھورا رہ گیا۔ مجاہدین کے مختلف گروپوں کو کاشہا بھانا، ان کا کوئی مشترکہ ایجمنڈ طے کرنا اور ان کے مستقبل کی حدود اور دائرہ کارکما تھیں کہنا چہادِ افغانستان میں ان کو سپورٹ کرنے والوں اور ان کو قربانیوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی ذمہ داری تھی۔ لیکن جب سب نے اپنا اپنا حصہ وصول کر کے گھروں کی راہ لی اور مجاہدین کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تو ظاہر ہے کہ اب مجاہدین کے مختلف گروپوں نے اپنا اپنا ایجمنڈ اخود ہی طے کرنا تھا جو انہوں نے کیا اور اسی کے تلخ تناج نہ صرف جنوبی ایشیا کے پورے خطے کو بلکہ مجاہدین سے لائقی اختیار کرنے والوں کو بھی بھگتا پڑ رہے ہیں۔

طالبان کے مختلف گروہوں نے اسی صورتحال کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس پس منظر سے آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کے کردار اور نفیتیں کو سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ جہادِ افغانستان میں حصہ لینے والے مجاہدین کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کے کردار کا الگ الگ تجیری کرنا بھی موجودہ صورتحال کے صحیح اور اک سلیمانی ضروری ہے۔

1. جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کا ایک بڑا حصہ افغانستان کے ان باشندوں پر مشتمل ہے جنہوں نے سوویت یونین کے فوجی تسلط سے آزادی اور اپنے ملک کے اسلامی نظریاتی تشخص کی بحالی کیلئے جنگ لڑی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جہادِ افغانستان کے تیجے میں سوویت فوجوں کی واپسی اور مجاہدین کی حکومت قائم ہو جانے کے باوجود جہاد کے اصل مقصد یعنی نفاذِ شریعت کی طرف کوئی مؤثر پیشرفت نہیں ہو رہی بلکہ بدامنی، افراتفری، لا قانونیت اور خانہ جنگی بڑھتی جا رہی ہے، تو وہ اس کے رد عمل میں طالبان کی صورت میں سامنے آئے اور ملک کے ایک بڑے حصے میں پانچ سال تک حکومت قائم کر کے جہادِ افغانستان کے منطقی ہدف کو دنیا کے سامنے واضح کر دیا۔ اور اب وہ امریکی اتحادی فوجوں کے خلاف اسی طرح جنگ لڑ رہے ہیں جیسے انہوں نے سوویت یونین کی فوجوں کے خلاف لڑی تھی اور وہ اسے بھی آزادی اور خود مختاری کی جنگ سمجھتے ہیں۔

2. جہادِ افغانستان میں شامل مجاہدین کا دوسرا بڑا حصہ ان ہزاروں پاکستانی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد وطن واپس آئے۔ ان کے مستقبل کے بارے میں ان کی راہنمائی اور ان کے جذبات و تجربات کو صحیح رخ پر لگانے کیلئے منصوبہ بندی پاکستان کے قوی حلقوں کی ذمہ داری تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید کچھ ذمہ دار حلقوں نے انہیں اس لیے کھلا چھوڑ دیا ہو کہ ان سے کشمیر میں اسی طرح فائدہ اٹھایا جاسکے گا جس طرح افغانستان میں ان سے فائدہ اٹھایا گیا تھا، مگر غالباً عامی تقوتوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ جس کے تیجے میں مجاہدین کے ان گروپوں نے بھی اپنا پناہی بینڈا خود طے کیا اور اپنے اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق میدان کار منتخب کر لیا۔ بہت سے افراد کی صلاحیتیں فرقہ وارانہ کمکش کو بڑھانے میں استعمال ہوئیں جبکہ بہت سے گروہوں نے پاکستان کو افغانستان پر قیاس کرتے ہوئے نفاذِ شریعت کیلئے مسلح جدو جہد کا راستہ اختیار کر لیا اور ملک کی رولنگ کلاس کا طرزِ عمل اس مسلح جدو جہد کیلئے بتدریج راستہ ہموار کرتا چلا گیا۔ مثلاً سوات میں نفاذِ شریعت کیلئے جب جدو جہد کیلئے بتدریج راستہ ہموار کرتا چلا گیا۔ مثلاً سوات میں نفاذِ صرف اتنا تھا کہ سوات کے عوام مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں ان کے ریاتی دور کا وہ عدالتی نظام و اپس کر دیا جائے جو نہ صرف برطانوی دور میں بلکہ ۱۹۷۹ء تک پاکستان کے دور میں بھی رانج رہا ہے۔ ان کے خیال میں شرعی قوانین پر بنی وہ عدالتی نظام انہیں ستا اور فوری انصاف مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدہ و مذہب سے بھی مطابقت رکھتا ہے، اس لیے وہی ان کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ ان کا یہ موقف قول کر لیا گیا اور ایک آڑپنہ کے ذریعے انہیں یہ نظام مہیا کرنے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن وہ آڑپنہ مخصوص الفاظ کا ہے، پھر

تحاجب کی حقیقت واضح ہونے کے بعد عوام کے جذبات میں شدت پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ موجودہ حالات تک بات جا پہنچی۔ اس قسم کے ماحول میں جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے پاکستانی مجاہدین کے بعض گروہوں نے نفاذِ اسلام کیلئے شدت پسندی کا راستہ اختیار کیا جس کی ملک کے سببیدہ دینی حلقوں نے کبھی حمایت نہیں کی اور خود ہم بھی اس طریق کارکوکھلے بندوں غلط قرار دینے والوں میں شامل ہیں، لیکن اس کے پس منظر اور اسباب و عوامل کو نظر انداز کر دینا ہمارے ہس کی بات نہیں ہے۔

3. جہاد افغانستان میں شامل مجاہدین کا تیرسا حصہ دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے ان ہزاروں افراد پر مشتمل تھا جنہوں نے سوویت افواج کے خلاف جنگ میں عملاً حصہ لیا، مگر اس جنگ کے خاتمه کے بعد اپنے اپنے ملک میں واپس جانے میں ان کے تحفظات تھے اور انہیں خدشہ تھا کہ وطن واپسی کی صورت میں ان کی جان اور آزادی کو خطرات لا حق ہو سکتے ہیں۔ ان کیلئے پاکستان ہی پناہ گاہ ہو سکتا تھا جنچہ انہوں نے یہاں رہ جانے کو ترجیح دی اور پاکستان میں آباد ہونے کیلئے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ان کا بڑا حصہ پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں آباد ہوا۔ ان کے بارے میں ایک مجموعی پالیسی طے کرنا اور انہیں منظم طریقے سے پاکستانی معاشرے میں ایڈیجسٹ کرنا حکومت پاکستان کی ذمہ داری تھی جس کی طرف پوری توجہ نہیں دی گئی اور انہیں بھی اپنے اپنے جذبات اور صلاحیتوں کے اظہار کیلئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ مجاہدین کے اسی حصے میں سے القاعدہ وجود میں آئی جس نے مشرق و سطی میں امریکی فوجوں کی موجودگی کو بھی اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ افغانستان میں سوویت یونین کی موجودگی کو دیکھتے تھے۔ اور ان کیلئے اس صورت حال کو قبول کرنا مشکل تھا کہ اگر افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح افواج کی موجودگی افغانستان کی قومی خود مختاری اور آزادی کے منافی تھی تو مشرق و سطی میں امریکی افواج کی موجودگی ان ممالک کی قومی خود مختاری کیلئے خطره کیوں نہیں ہے؟ اور اگر افغانستان سے سوویت فوجوں کی واپسی کی جنگ، آزادی کی جنگ اور جہاد تھی تو مشرق و سطی سے امریکی اتحاد کی فوجوں کی واپسی کی جنگ اور جہاد کیوں نہیں ہے؟

ہمارے نزدیک افغانستان میں طالبان کا منظر عام پر آنا، پاکستان میں نفاذِ شریعت کیلئے مسلح گروپوں کا تحرک ہونا، اور مشرق و سطی میں القاعدہ کا وجود اور قوت حاصل کرنا جہاد افغانستان کی سپورٹر قتوں کی اس غفلت، بے پرواہی اور لا تعلقی کا منطقی نتیجہ تھا جو انہوں نے سوویت افواج کی افغانستان سے واپسی کے بعد جان بوجھ کر اختیار کر لی تھی، اس لیے اس صورت حال کا صرف مسلح گروپوں کا تہذیب مدار قرار دینا زمینی حقائق اور انصاف کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ صورت حال نائن الیون کے المناک سانحہ کے بعد نمودار ہوئی ہے، مگر یہ بات درست نہیں ہے بلکہ خون نائن الیون کا حادثہ بھی انہی اسباب و عوامل کے باعث پیش آیا ہے۔ البتہ نائن الیون کے المناک سانحہ نے ان اسباب و عوامل کو مہیز دی ہے اور ان کی قوت کار میں اضافہ کیا ہے جس کے بعد صورت حال تیزی کے ساتھ مزید

بہتی چلی گئی ہے۔ نائن الیون کے بعد افغانستان میں امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں اور طالبان کی حکومت ختم ہوئی تو مجاہدین کے مختلف گروپوں میں اشتغال کا بڑھنا اور ان میں باہمی تعاون اور ہم آہنگی کا فروع بھی ایک فطری امر تھا جس کا سب سے زیادہ اش پاکستان کی داخلی صورت حال پر پڑتا۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عالمی قوتوں اور پاکستان کی روائی کلاس نے مشترکہ طور پر اس مرحلے میں یہ حکمتِ عملی طے کر لی کہ مجاہدین کے مختلف گروپوں کی شدت اور اشتغال کو کم کرنے کی کوششوں کی بجائے علاج بالمش کے طور پر اسے مزید بڑھانے کا ماحول پیدا کیا جائے اور وقہ و قہ سے مختلف علاقوں میں انہیں اشتغال دلائے سامنے لایا جائے اور پھر اجتماعی کارروائی کے ساتھ انہیں پکل دیا جائے۔ سوات اور وزیرستان میں یہی کچھ ہوا ہے اور اب جنوبی بخوبی میں اسی قسم کی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمارے خیال میں پاکستان میں شدت پسندی اور اس کے ذریعے مختلف طبقات کے درمیان تکشک کا یہ ماحول اس پس منظر سے ہٹ کر بھی بعض عالمی اور علاقائی قوتوں کی ضرورت ہے جس کیلئے وقت فوچا کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ مسلح شدت پسندی اور دہشت گردی کریپی میں قومیت اور زبان کے خواല سے اپنا کام کھاچکی ہے، بلوچستان میں یہی ایجادنا قومیت کے نام سے پیشرفت کر رہا ہے، سوات اور وزیرستان میں اس نے شریعت کے نفاذ کا عنوان اختیار کیا ہے، سنی اور شیعہ مسلح تصادم کے پیچھے یہی بیرونی مغادرات کا فرمایا ہے، اور اب دیوبندی بریلوی کشکش کو فروع دے کر بیجا ب میں یہ صورت حال پیدا کرنے کی کوشش میں بھی یہی عوامل متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

## دینی مدارس پر دہشت گردی کا الزام

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

انتہا پسندانہ جماعتوں کی تنظیم سازی اور ٹریننگ میں دینی مدارس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ مدارس قرآن و سنت کی تعلیم دیتے ہیں اور اسلامی عقائد کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت کے فروع اور مسلم معاشرہ میں اسلامی احکام و قوینین کے نفاذ کی تعلیم و ترغیب دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ مسلح تحریکیں اپنا مقصد اور ایجادنا اسی کو بتاتی ہیں اس لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تنظیمیں مدارس کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔ مذکورہ بالمقاصد کیلئے ملک میں جو جماعتیں اور افراد پر آمن طور پر اور سیاسی و جمہوری جدوجہد کے ذریعے کام کر رہی ہیں، وہ بھی انہی دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، اور جو لاکھوں علماء کرام، مدرسین اور خطباء و ائمہ ملک بھر میں انتہائی امن و سکون کے ساتھ اور پورے امن و سلامتی کے ماحول میں دینی خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہیں، انہوں نے بھی انہی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔

دینی مدارس سے تعلیم پانے والے وہ حضرات جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں پر آمن طور پر تعلیمی اور دعویٰ خدمات بجا لارہے ہیں، اور وہ حضرات جو مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کے درمیان تناسب آئٹی اور نمک کا بھی نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ انتہا پسندانہ تنظیموں کے قیام میں دینی مدارس کا کوئی کردار ہے، قطعی طور پر درست

بات نہیں ہے۔ بالخصوص مجاہدین کے گروپوں کی تنظیم سازی تو جہاد افغانستان کے دور میں آئی ایس آئی کے زیر سایہ ہوئی ہے اور اسی کا سلسلہ اب بھی چلا آ رہا ہے۔ پھر مجاہدین کی ٹریننگ بھی مدارس کے ماحول میں نہیں ہوئی بلکہ ان کی تنظیم سازی اور لانچنگ کی راہ ہموار کرنے والوں نے ہی ان کی ٹریننگ کے سارے مراحل طے کرائے ہیں۔

پھر ایک اور پہلو پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ عالمی سطح پر القاعدہ کے جس نیٹ ورک کو مبینہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت قرار دیا جاتا ہے، اس کے پیشتر رکان یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں، لیکن ان کی وجہ سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو انتہا پسندی کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح اگر دینی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کی کچھ تعداد اس عمل میں شریک ہے تو اس کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈال دینا بھی انصاف کی بات نہیں ہے۔

برصغیر میں دینی مدارس کے موجودہ آزادانہ نظام کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہوا تھا اور ان کی تاریخ گم و یقیناً ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے، جبکہ موجودہ شدت پسندی کی تنظیموں کی عمر بیچھے کے لگ بھگ ہے، اس لیے بھی مدارس کے ڈیڑھ سو سالہ پر آئی کردار کو نظر انداز کر کے انہیں شدت پسندی اور انتہا پسندی کے موجودہ گروپوں کی تنظیم و تلقیل کا ذمہ دار قرار دینا درست نہیں ہے۔

----

## افغان طالبان اور پاکستانی طالبان

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

-----  
طالبان کو ہم دو الگ الگ حصوں میں سمجھتے ہیں:

1. افغانستان کے طالبان کے بارے میں ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ وہ جہاد افغانستان کے دوران سوویت افواج کی واپسی کے بعد افغانستان میں پیدائی گئی افرانفری، خان جنگی اور جہاد کے نظریاتی اہداف کو نظر انداز کیے جانے کے تیجے میں سامنے آئے تھے، اور افغانستان کے ایک بڑے حصے میں منظم حکومت قائم کر کے انہوں نے شرعی نظام نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زیر حکومت علاقے میں امن بھی قائم کیا تھا۔ جب کہ افغانستان میں امریکی افواج کی آمد کے بعد ان کا خیال ہے کہ وہ اسی طرح قومی آزادی اور اسلامی شخص کی بجائی کی جنگ لڑ رہے ہیں جیسے انہوں نے رو سی افواج کی موجودگی کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ وہ افغانستان کے مخصوص حالات اور کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہاں کے حالات و ضروریات کو بہتر طور پر سمجھتے ہوئے ان سے منہنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

البتہ جب ان کی حکومت قائم تھی، اس دوران ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ ملک میں دستوری حکومت قائم کریں اور دستور سازی اور قانون سازی کے حوالے سے پاکستان کے علماء کرام کی پاریمانی جدوجہد کو سامنے

رکھ کر اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے دستور و قانون کی تشكیل کے مراحل طے کریں۔ اس وقت ہم نے انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ بین الاقوامی معاملات اور ملک کے معاشری و اقتصادی ڈھانچے کی تشكیل میں ان بین الاقوامی ماہرین سے مشاورت کا اہتمام کریں جو اسلامی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی ترویج و تنفس میں کردار ادا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ایسے ماہرین نہ صرف مسلم ممالک میں موجود ہیں بلکہ مغربی دنیا اور بین الاقوامی اداروں میں بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اب اگر افغانستان میں ان کی دوبارہ حکومت قائم ہوتی ہے جس کے امکانات کا عالمی پریس میں مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے تو ہمارا انہیں یہی مشورہ ہو گا کہ:

- دستوری حکومت تشكیل دیں،
- پاکستان کے دینی حلقوں کی پارلیمنٹی جدوجہد سے راہنمائی حاصل کریں، اور
- مختلف شعبوں میں ان مسلم ماہرین سے مشاورت کا اہتمام کریں جو نفاذِ اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور اس میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

2. مگر پاکستان میں طالبان کے نام سے کام کرنے والے گروہوں کے بارے میں ہماری رائے یہ نہیں ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ گروہ اگرچہ نفاذِ شریعت کے بارے میں پاکستان کی رو لگ کلاس کے مسلسل مناقشہ رویے کے بعد میں نمودار ہوئے ہیں، لیکن ایک توان کا طریق کار درست نہیں ہے۔ اور دوسرا ان کی جدوجہد کا فائدہ ان قوتوں کو مل رہا ہے جو پاکستان میں افرانفری اور خانہ جنگی کا ماحول قائم کرنا چاہتی ہیں اور جن کی خواہش ہے کہ نفاذِ شریعت کے نام پر ایسی اٹی سیہی حرکتیں وقتی فوتی ہوتی رہیں جو رائے عامہ کو نفاذِ شریعت کے عمل اور جدوجہد سے تنفس کرنے کا باعث بنیں۔ پاکستان میں طالبان کے گروہوں نے متعدد ایسی حرکات کی ہیں جو اس ضمن میں آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے بہت سے طالبان غیر شوری طور پر اس سازش کا حصہ بنے ہوں، لیکن شوری طور پر اس مقصد کیلئے استعمال ہونے والوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس بنا پر ہماری رائے یہ ہے کہ پاکستانی طالبان شوری یا غیر شوری طور پر ان قوتوں کے حق اور فائدے میں استعمال ہو رہے ہیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے اور ان کی سرگرمیوں سے ملک اور اسلام دونوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں نفاذِ اسلام کیلئے قراردادِ مقاصد، علماءِ کرام کے ۲۲ دستوری نکات، اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کی بنیاد پر سیاسی اور دستوری جدوجہد ہی صحیح راستہ ہے۔ اور طالبان یا اس طرز پر کام کرنے والے تمام گروہوں کو ملک کے جمہور علماء کے موقف اور پالپسی پرواپس آجانا چاہیے۔

## جہاد افغانستان اور پاکستان کے مذہبی حلقات

مابینامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

افغانستان میں رو سی افواج کی آمد کے بعد جہاد کا اعلان افغانستان کے علماء کرام نے کیا تھا اور پاکستان کی متعدد دینی جماعتوں اور مدارس کے طلبہ و اساتذہ نے اس کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس میں عملی طور پر شرکت بھی کی تھی۔ یہ حمایت اور تعاون اس بنیاد پر تھا کہ اپنے وطن کی آزادی اور قومی خود منماری کی بجائی کیلئے افغان عوام کی جنگ نہ صرف ان کا قومی حق ہے بلکہ یہ شرعی فریضہ اور جہاد بھی ہے، اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اس جہاد آزادی میں ان سے تعاون اور ان کی امداد دنیا بھر کے مسلمانوں بالخصوص پڑو سی مسلمانوں پر شرعاً واجب ہے۔ وہ جہاد کی فضیلت و اہمیت اور اس کے احکام و مسائل قرآن و سنت اور فقہ میں مسلسل پڑھتے چلے آرہے تھے جن پر عملدرآمد کا انہیں موقع سامنے نظر آ رہا تھا۔ نیز مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے تسلط اور عالم اسلام کے وسائل اور متعدد مقامات پر غیر مسلم طاقتوں کے قبضہ اور وہاں کی آشیانی مسلم آبادی کو آزادی اور اسلامی شخص سے محروم کر دینے کے ناظر نے انہیں مسلط قوتوں کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبے سے بھی سرشار کر کھا تھا، چنانچہ انہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔

ابتداء میں افغان علماء کے اس اعلان جہاد اور پاکستان کے دینی حلقوں کی طرف سے ان کی حمایت و تعاون کو دیوانے کا خواب سمجھا گیا اور حکلم کھلا یہ کہا گیا کہ یہ چند مہینے دیوانے اور بے وقف ہیں جو ایک عالمی طاقت کے ساتھ ٹکر کر اپنا سر پھوڑنے جا رہے ہیں۔ مگر ان دیوانوں کی یہ دیوائگی جاری رہی، کم و بیش تین سال تک کیفیت یہ تھی کہ ان مجاہدین نے عام طور پر میسر معمولی ہتھیاروں کے ساتھ فقر و فاقہ کے ماحول میں گوریا یا جنگ لڑی۔ انہیں پاکستانی حکومت اور اس کے بعد پاکستانی عوام کی تھوڑی بہت حمایت حاصل تھی۔ اس زمانے میں یہ مجاہدین شیشے کی بوتوں میں پڑوں اور صابن کا محلوں بھر کر مصنوعی بم بنایا کرتے تھے اور انہیں ٹینک شکن ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان تین چار برسوں میں ان مجاہدین کے استعمال میں آنے والے ہتھیار اگر کسی جگہ یاد گار کے طور پر محفوظ کیے گئے ہوں تو انہیں دیکھ کر اس دور کی جنگ کے ماحول کا آن بھی بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس بے سرو سامانی کی جنگ کے نتیجے میں جب افغانستان کے ایک بڑے حصے میں مجاہدین کے مختلف گروپوں نے اپنے زیر اثر علاقے قائم کر لیے اور یہ نظر آنے لگا کہ جنگ جاری رہ سکتی ہے تو امریکہ اور دیگر بہت سے ممالک نے اس جنگ میں سوویت یوینین کی ہزیرت کے امکانات دیکھ کر اس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا اور پھر افغان مجاہدین کے پاس جدید ہتھیاروں اور وسائل کی رسم پیل ہو گئی۔

ہمارے خیال میں اس مرحلے میں افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کی قیادت سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے یہ ورنی ادا و سرمایہ دار نہ بلکہ کی معافونت اور حمایت کی حدود طے کرنے کی بجائے انہیں جنگ میں ایک شریک کار کے طور پر قبول کر لیا۔ مجاہدین کے آٹھ مختلف گروپوں کو ملا کر ایک اتحاد قائم کیا گیا اور سرمایہ دار نہ بلکہ نے اس جنگ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اگر افغان مجاہدین کی قیادت کچھ مزید صبر سے کام لے کر جو وہ امداد و تعاون کو انتہائی

ضرورت کی حد تک محدود رکھتے ہوئے پالیسی سازی کے معاملات پر اپنی گرفت قائم رکھتی تو نتاں بھی بہت مختلف ہوتے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جب کہ ہماری معلومات کے مطابق اس موقع پر افغان مجاهدین کے آٹھ مختلف گروپوں کے متحده مجازی کی قیادت میں اس مسئلے پر اختلاف رائے بھی ہوا اور متحده مجاز کے سیکرٹری جزل مولانا نصر اللہ منصور شہید نے سرمایہ دارانہ بلاک کے سامنے افغان مجاهدین کی قیادت کی خود سپردگی کے اس رویے سے اختلاف کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کری تھی۔ مولانا نصر اللہ منصور شہید کا موقف یہ تھا کہ بیرونی قتوں سے امدادی جائے لیکن پالیسی سازی پر اپنا کنٹرول قائم رکھا جائے، مگر وہ اپنے موقف کو منوانہ سکے اور اتحاد سے الگ ہو گئے۔

اس کے بعد صورت حال یہ بن گئی کہ افغان مجاهدین اپنے وطن کی آزادی، افغانستان کی قومی خود مختاری، اور ایک شرعی اسلامی حکومت کے قیام کیلئے لڑ رہے تھے۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک سے آنے والے ہزاروں نوجوان اپنے افغان بھائیوں کی امداد اور جہاد میں عملی شرکت کے جذبے سے لڑ رہے تھے۔ لیکن عالمی قوتوں بالخصوص سرمایہ دارانہ بلاک اس جنگ کے ذریعے سوویت یوینہ کو شکست دینے کے مقصد کے تحت اس جنگ کو سپورٹ کر رہا تھا اور اسی وجہ سے ایسا ہوا کہ سوویت افغان کی واپسی کے بعد سرمایہ دارانہ بلاک نے اپنا بدف حاصل کر کے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پہلے دونوں گروہ جہاد افغانستان کے نظریاتی اهداف کے حصوں کیلئے سرگردیں ہو گئے۔

یہی وہ موقع ہے جب پاکستان میں، جو چہار افغانستان کا سب سے براپشت پناہ اور مجاهدین کا ہیں کیپ تھا، حکومتی سطح پر اختلافات پیدا ہوئے۔ جزل محمد ضیاء الحق مرحوم اس جنگ کو اس کے مطلقی نتاں تک پہنچانے اور افغان مجاهدین کی حکومت کے قیام اور استحکام تک اس میں عملًا شامل رہنے کا عزم رکھتے تھے، جب کہ وزیر اعظم محمد خان جو نیجو مرحوم اس جنگ کو اسی مرحلہ پر مکمل صحیح ہوئے اس سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اسی کشمکش کی فضایں جنیوں اور اس نے افغانستان میں ایک مستحکم حکومت و نظام کے قیام کی جائے خانہ جنگی اور خلفشار کانیا حول پیدا کیا۔

اسی خلفشار اور خانہ جنگی سے طالبان نے جنم لیا جنہوں نے افغانستان کے ایک بڑے حصے کو کچھ عرصے کیلئے بدآمنی اور لا قانونیت سے توبجات دلا دی لیکن وہ اپنی حکومتی ترجیحات میں ایسی ترتیب قائم نہ کر سکے کہ اپنے اصل اهداف کی طرف موثر پیشرفت جاری رکھ سکتے۔ ظاہر بات ہے کہ طالبان کی حکومت کا وجود میں آنامقائی حالات کا نتیجہ تھا جو عالمی قتوں کے ایجادے اور مفادات سے مطابت نہیں رکھتا تھا، چنانچہ کچھ عرصہ تک تو ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی اور انہیں عالمی ایجادے میں فٹ کرنے کیلئے اپنے ذہب پر لانے کی کوشش ہوئی، لیکن جب یہ بات طے ہو گئی کہ انہیں عالمی ایجادے اور پروگرام میں ایڈ جسٹ کرنا اسی طرح بھی ممکن نہیں ہے تو ان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ مرحلہ وہ تھا جب افغانستان کے جہاد میں شریک ہونے والے عرب مجاهدین نے مشرق وسطی میں اسرائیل، بیت المقدس، تیل کی دولت کے استحصال، اور امریکی افغان کی موجودگی کے تناظر میں اپنا ایجادہ اٹے کیا اور اس کی طرف پیشرفت کا پروگرام بنایا، اور ظاہر بات ہے کہ یہ بھی عالمی قتوں کے مفاد اور ایجادے سے مقصاد مبات تھی۔

افغان طالبان اور عرب مجاهدین کا دائرہ کار الگ الگ تھا، لیکن نظریاتی اهداف مشترک تھے، اس لیے ایک دوسرے

کے ساتھ ہمدردی، ہم آئنگی اور تعاون کی فضای موجود تھی۔ وہ سری طرف یہ دونوں گروہ عالمی استعمار کے پروگرام اور ایجنسی کیلئے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ مشرق و سطحی میں اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنا اور افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت کا راستہ و کتابخانی استعمار کی اولین ترجیحات جلی آرہی ہیں، چنانچہ وہ جنگ جو اس سے پہلے افغان مجاهدین اور سوویت افواج کے درمیان تھی، اب وہی معمر کہ افغان مجاهدین، عرب مجاهدین اور امریکی استعمار کے درمیان معزکہ آرائی میں تبدیل ہو گیا۔

ہمارے خیال میں اس مرحلے میں مجاهدین کی قیادت کو اپنی ترجیحات کے تعین میں حقیقت پسندانہ طور پر معروضی حالات کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا جو نہیں رکھا جاسکا اور بازی الٹ گئی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر دونوں جنگیں یہک وقت لڑنے کی وجہے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو محکم کرنے کو ترجیح دی جاتی جس کیلئے ایک دستوری حکومت کا قائم، عالمی سطح پر حکمتِ عملی کے ساتھ رائے عامہ کی حمایت کا حصول، اور عالم اسلام کی دینی قوتون کو نظریاتی اور ملی اہداف کیلئے جمعت کرنا سب سے زیادہ ضروری امور تھے۔ مشرق و سطحی کی جنگ کو اس وقت تک تھوڑا متوجہ کر لیا جاتا تو یہ ایک بہتر حکمتِ عملی ہوتی، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کرتے کہ ایسا نہ ہو سکنے کے پیچے ان دونوں گروہوں کے مجاهدین کے انتہائی خلوص کے باوجود ان دیکھنے پا تھے حرکت میں رہے ہوں گے۔

نائن ایوں کے المناک ساختنے اس صورتحال میں ڈرامائی تبدیلی پیدا کر دی اور وہ کام جو ابھی کئی سالوں میں ہونے تھے، اس کیلئے مہینے اور ہفتے بھی طویل دکھائی دینے لگے۔ اس مرحلے میں افغان طالبان اور عرب مجاهدین میں سے کسی ایک کو دوسرے کیلئے قربانی دینا تھی اور ہمارے خیال میں اگر یہ قربانی عرب مجاهدین دے دیتے تو افغان طالبان کو سنبھلنے اور عالم اسلام میں اپنے بھی خواہوں سے رابطہ و مشاورت کے ساتھ کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کا تھوڑا سا موقع مل جاتا۔ لیکن یہ بھی نہ ہوا اور اپنے عرب مجاهد بھائیوں کی غاطر افغان طالبان نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی حکومت کی قربانی دے دی۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عرب مجاهدین افغان طالبان کیلئے قربانی دیتے تب بھی بالآخر تیجہ بھی ہونا تھا اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ہونا طے پاچکا تھا۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے لیکن ہمارا وجہ ان یہ کہتا ہے کہ اگر طالبان حکومت اور عالم اسلام میں ان کے بھی خواہوں کو باہمی مشاورت و رابطہ اور کوئی راستہ نکالنے کیلئے سنبھلنے کا تھوڑا سا وقت مل جاتا تو تباہ کی شدت کو کم کرنے کے امکانات بہر حال موجود تھے۔ بہر حال اب جو ہونا تھا ہو چکا اور اس کے بعد کے مراحل بندرنگ طے ہو رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ افغان قوم کے موجودہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہیں گے اور ان میں نئی کروٹ کے آثار اب افغان پر واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس لیے افغان طالبان کو ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کرتے ہوئے مستقبل کی نئی منصوبہ بندی اور صفت بندی کرنا ہو گی اور دوست دشمن کی پہچان بلکہ نادان اور دانا دوستوں کے درمیان فرق کیلئے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کرنا ہو گا۔

جہاں تک پاکستان کے ان دینی حلقوں کا تعلق ہے جنہوں نے جہاد افغانستان میں اپنے افغان بھائیوں کی مدد کی اور ان کے ساتھ شریک کار ہوئے، مختلف مراحل کی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان کا یہ فیصلہ اور کردار ہمارے خیال میں بالکل درست تھا اور اس پر کسی قسم کی نہامت کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ان

کی قربانیوں سے عالمی سطح پر مختارب دو قتوں میں سے ایک نے فائدہ اٹھایا اور اپنے مقاصد حاصل کیے، لیکن اگر وہ اس جنگ میں شریک نہ ہوتے اور خاموشی اختیار کر لیتے تو یہی فوائد و سری عالمی قوت کے پڑے میں چلے جاتے۔ مجاہدین کے عمل اور قربانیوں سے کسی ایک قوت کو توفیق نہ پہنچتا ہے اور کسی کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اگر قومیں اپنے فیصلے اس بنیاد پر کرنے لگیں تو شاید ہی کوئی قوم یا طبقہ کسی معرکہ میں کوئی کردار ادا کر سکے۔ فیصلوں کی بنیاد اپنے اهداف پر ہوتی ہے، اس لیے افغان مجاہدین اور ان کے پاکستانی مددگاروں نے جو فیصلہ کیا تھا، عالمی سطح پر اس کا ایک نتیجہ منقی ہے کہ طاقت کا توازن نہیں رہا اور دو قتوں کے آمنے سامنے رہنے سے کمزور قتوں کو جو سہارا مل جاتا تھا وہ نہیں رہا اور اب ساری دنیا ایک ہی عالمی طاقت کے رحم و کرم پر ہے، لیکن اس کے فوائد بھی ہوئے ہیں جن کا تذکرہ ہم ابتداء میں کرچکے ہیں کہ اس سے نہ صرف مشرقی یورپ، وسطیٰ ایشیا اور بالائیک ریاستوں کو خود منماری ملی بلکہ جرمنی کو بھی اتحاد نصیب ہوا ہے۔

باقی رہی بات جہاد افغانستان کے نظریاتی اهداف کی کہ افغانستان کی قومی خود منماری بحال ہوا اور وہاں ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہو تو تمام تر خرابیوں اور وقتنکا میوں کے باوجود اس کے امکانات کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اور شاید افغان مجاہدین اپنے ہی مااضی کی ایک روایت دہرانے جا رہے ہیں، محمود غزنویؑ کو سومنات تک پہنچنے کیلئے ستر ہوئیں کامیاب حملے سے پہلے سولہ ناکام حملوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن کیاسو منات محمود غزنویؑ کی قدم بوئی سے انکار پر زیادہ دیر قائم رہ سکتا تھا؟

## دینی مدارس پر چھاپوں کا نیا راؤنڈ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

جامعہ محمدیہ اسلام آباد اور دیگر متعدد مدارس پر چھاپوں کے خلاف کارروائی کا ایک نیا اونڈہ شروع ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ مدارس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں طلبہ کو مبینہ دہشت گردی کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور حکمرانوں کے بقول دہشت گردان مدارس کو نہاگا ہوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چند ماہ قبل جنوبی پنجاب کے بہت سے مدارس پر چھاپے مارے گئے تھے لیکن ان چھاپوں سے کچھ حاصل نہ ہوا اور استاذہ و طلبہ کی تفصیلی تلاشیوں کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ ان غربیوں کے پاس کتابوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور شب و روز ان کا مشغله صرف پڑھنا اور پڑھانا ہے۔ اب اسلام آباد کے مدارس پر چھاپوں کا نتیجہ بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں تک لیکن اس سب کچھ کے باوجود دینی مدارس کے خلاف استعماری قتوں اور ان کے گماشتوں کا غصہ ٹھٹھا نہیں ہوا اور وہ کسی نہ کسی عنوان سے دینی مدارس کو بدنام کرنے اور ان کے استاذہ، طلبہ اور منتظمین کو ہراساں کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالتے رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو اواری ہوٹل لاہور میں صفائہ اسلامک منٹر کے زیر انتظام ”دینی تعلیم اور عصری تفاضل“ کے عنوان سے منعقد ہونے والے ایک سمینار میں راقم الحروف کو شرکت کا موقع ملا جس میں عنوان کے مختلف

پہلووں پر متعدد ارباب داش نے خطاب کیا اور راقم الحروف نے بھی گزارشات پیش کیں، اس موقع پر صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ خان نے بہت فکر آنگیز گفتگو کی جس کا ایک پہلو قاریین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات سب سے پہلے امریکہ کی طرف سے کہی گئی تھی کہ ہمارے دینی مدارس میں دہشت گرد تیار ہوتے ہیں اور اب ہمارے ہاں بھی قومی سطح پر لاشعوری طور پر اس سوچ کو قول کر لیا گیا اور عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس دہشت گرد تیار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے، دینی مدارس دینی تعلیم کیلئے قبل قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں اور ہم ان کی قدر کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ سوویت یونین کے خلاف افغانستان کے جہاد میں لڑنے کیلئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو دینی جذبہ کے ساتھ لڑ سکیں اس کیلئے پاکستانی حکمرانوں اور اداروں نے دینی مدارس کے طلبہ میں سے افراد کو تیار کرنا شروع کیا، اس لیے کہ دینی جذبہ کے ساتھ وہی لوگ لڑ کتے تھے جنہوں نے دین کی تعلیم حاصل کی ہے، ان طلبہ نے سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑی اور اسے شکست دی، ان مجاہدین کے خلوص اور جذبہ جہاد میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ جہاد کیا۔ لیکن انہیں سپورٹ اور تیار کرنے والوں کے مقاصد میں صرف سوویت یونین کو شکست دینا تھا اس لیے وہ اپنا مقصد حاصل ہو جانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے اور مجاہدین کو تھما چھوڑ دیا۔ ان مجاہدین سے کہا گیا کہ اب تم اپنے مستقبل کا فصل خود کرو، اگر اس وقت انہیں باقاعدہ فونج میں شامل کر لیا جاتا یا ان کیلئے قومی سطح پر پالیسی طے کر کے ان کا کوئی پروگرام طے کر لیا جاتا تو صورتحال یہ نہ ہوتی، لیکن انہیں تیار کرنے والے پیچھے ہٹ گئے اور انہیں اپنے مستقبل کا پروگرام طے کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اب جس شخص نے جدید ترین اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کی ہے، سالہا سال تک اسے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اس نے اس کے سوا کوئی اور کام بھی نہیں سیکھا وہ اپنے مستقبل کا ایجمنڈ اس کے سوا کس حوالے سے طے کرے گا؟ اس لیے دہشت گردی کی موجودہ صورتحال کی ذمہ داری دینی مدارس پر نہیں بلکہ جہاد افغانستان کے دوران ان مجاہدین کو تیار کرنے والوں پر اور اس کے بعد انہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ جانے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

یہ اس گفتگو کا خلاصہ ہے جو مذکورہ سینئار میں صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ خان نے اس حوالے سے کی ہے۔ ہمیں ان کی اس بات سے مجموعی طور پر اتفاق ہے لیکن ہم ان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ اپنے اس تحقیقت پسندانہ تجزیے کو کسی ہوٹل کے بند کمرے تک محدود رکھنے کی بجائے ملک کے پالیسی سازوں تک پہنچانے کی کوشش کریں اور دینی مدارس کو بند نام کرنے والوں اور ان کے اساتذہ و طلبہ کو ہر اسماں کرنے والوں کو بھی یہ بات سمجھائیں کہ وہ مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب و عوامل کا جائزہ لیں اور غریب مدارس پر بلا وجہ غصہ نکالتے رہنے کی بجائے مبینہ دہشت گردی کے اصل حرکات و عوامل کو روکنے کی کوئی صورت نہ کالیں۔

## مولانا حمید الرحمن عباسی

روزنامہ اسلام، لاپور--- ۱۱ نومبر ۲۰۰۹ء

مولانا حمید الرحمن عباسی کا تعلق ہزارہ کے علاقہ گرہی جبیب اللہ سے تھا اور ان کی زندگی کا پیشتر حصہ مدرسہ قاسم العلوم شیراںوالہ گیٹ لاہور میں تدریسی خدمات سراجِ جام دیتے ہوئے تھے لہر ہوا۔ اپنے اساندہ میں ضلع اٹک کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا نور محمد آف ملہوای کا نام کثرت سے لیا کرتے تھے، انہی سے حضرت مولانا نور محمد کا نام بار بار سن کر میرے دل میں ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اس مقصد کیلئے بطور خاص سفر کر کے ایک رات ملہوای میں ان کی خدمت میں حاضری دی۔ وہ بلاشبہ ہمارے دور میں پرانے بزرگوں کے علم و فضل، ورع و تقویٰ، سادگی و قیامت اور عمل و اخلاص کی علامت تھے اور ان حضرات میں سے تھے جنہیں دیکھ کر خدا کی یاد تازہ ہوتی ہے اور جن کی مجلس میں بیٹھ کر ایمان و اخلاص کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔

مولانا حمید الرحمن عباسی شیراںوالہ کے معروف سالانہ دورہ تفسیر میں ہمارے شیخ حضرت مولانا عبد اللہ انور کے معاون ہوتے تھے۔ شعبان و رمضان کے دوران مدرسہ قاسم العلوم میں ہونے والے دورہ تفسیر میں قرآن کریم کے تزجیب و تفسیر کا بڑا حصہ حضرت مولانا عبد اللہ انور پڑھاتے تھے اور ان کی علالت و مصروفیات کی وجہ سے ایک حصہ کی تدریس مولانا حمید الرحمن عباسی کے سپرد ہوتی تھی۔ حضرت مولانا عبد اللہ انور کی وفات کے بعد بھی جب تک مولانا عباسی کی صحت نے اجازت دی وہ یہ خدمت مسلسل سراجِ جام دیتے رہے۔ اس ذوق کے حوالے سے مولانا عباسی کا ایک بڑا کارنامہ ”خلاصہ تفسیر القرآن“ کے عنوان سے ان کا وہ تفسیری سلسلہ ہے جس میں انہوں نے مضامین اور احکام کے حوالے سے قرآن کریم، احادیث نبویٰ اور مفسرین کے ارشادات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے اور وہ کئی فتحیں جلدیں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ذخیرہ ”احکام القرآن“ کے حوالے سے فہم قرآن کا ذوق رکھنے والے علماء کرام اور طلبہ کیلئے ایک قیمتی تخفیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا حمید الرحمن عباسی یا جہاد افغانستان کے اس دور کے عملی سرپرستوں میں سے ہیں جب میدان میں صرف افغانستان کے علماء و طبلہ تھے اور وہ اپنی پرانی رائفلوں کے ساتھ یہ جنگ لڑ رہے تھے۔ ہمارے مشاہدہ کے مطابق جہاد افغانستان کے آغاز کے بعد کم و بیش تین سال تک یہ کیفیت رہی ہے کہ ان مجاہدین کا کوئی پرسان حال نہیں تھا اور اس بے سروسامانی کے دور میں انہوں نے افغانستان کے کم و بیش ستوف صدق علاقے کا نکشوں حاصل کر لیا تو عالمی قوتوں اس جنگ کو سنجیدہ سمجھتے ہوئے اس طرف متوجہ ہوئے۔ اس بے سروسامانی کے دور میں یہ مجاہدین شیشے کی بوتلوں میں صابن اور پٹرول بھر کر بم بنایا کرتے تھے اور ٹینکوں کو ناکارہ کرنے کیلئے استعمال کیا کرتے تھے۔ افغانستان کے شہر خوست میں کسی زمانے میں اس دور کے مصنوعی اور دیسی ہتھیاروں کی ایک باقاعدہ نمائش گاہ موجود تھی، اگر وہ اب بھی موجود ہے تو اس سے اس دور کی جنگ یا جہاد افغانستان کے ابتدائی تین چار سالوں کے ماحول کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

مولانا حمید الرحمن عباسی اس دور میں ان مجاہدین کیلئے آٹا، چینی، گھنی اور دیگر خوردنی اشیاء جمع کر کے وقت فوچہ بھجوایا

کرتے تھے اور مجاہدین کی امداد کیلئے اصحابِ خیر کو توجہ دلایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں خوست کی جنگ میں شریک ہونے والوں میں سے ایک نوجوان نے مجھے بتایا کہ ہماری سب سے بڑی ضرورت خوراک ہے، ہمیں دو دن تک کھانے کو روٹی نہیں ملتی اور بھوکے پیاسے لڑنا پڑتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا عباسی<sup>ؒ</sup> نے اس دور میں وقتے وقتے سے اشیاء خوردنی کے درجنوں ٹرک وہاں بھجوائے اور مجاہدین کی مسلسل سرپرستی کی۔

مولانا حمید الرحمن عباسی ایک عرصہ تک جمعیت علماء اسلام ضلع لاہور کے امیر رہے، شیر انوالہ میں ان کا کمرہ ہماری جماعتی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا، میرا تحرک جماعتی زندگی کا دور بھی وہی تھا۔ علماء کرام سے رابطہ کرنا، انہیں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کیلئے تیار کرنا، کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرنا، ان کی مالی سرپرستی کرنا اور جماعتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ان کا خاص دوق تھا۔ اب یہ ذوق کم ہوتے ہوتے نایاب ہوتا جا رہا ہے، حتیٰ کہ آج کے دنی کارکنوں کو مولانا حمید الرحمن عباسی<sup>ؒ</sup> جیسے بزرگوں اور کارکنوں کے اخلاص، سادگی، قناعت اور جہد مسلسل سے بسا اوقات روشناس کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

مولانا عباسی<sup>ؒ</sup> گو حضرت مولانا احمد علی لاہوری<sup>ؒ</sup> کے حلقوہ اور ان کے درس قرآن کریم کے سلسلہ سے گہرا شغف تھا اور انہوں نے اسے ہی زندگی بھرا پنا اور ہنپھو بنائے رکھا۔ دفتر خدام الدین کے ساتھ شیر انوالہ میں ایک کمرہ ان کے تصرف میں تھا، وہی ان کی رہائش گاہ تھی اور وہی ان کا دفتر اور تحریکی و جماعتی مرکز بھی تھا۔ شیر انوالہ کے ساتھ ان کی واپسی اور وفاداری قابل رشک تھی۔ بعض دوستوں نے کوشش کی بلکہ خود میں نے بھی ایک دوبار پیشکش کی کہ وہ وہاں سے منتقل ہو کر کسی اور علمی مرکز میں زیادہ بہتر انداز تعليمی خدمات سر انجام دیں لیکن انہوں نے ہر بار سنی ان سنی کردی اور شیر انوالہ میں ہی آخر دم تک دین و علم کی خدمت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پسمند گان کو صبر جیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## دیوبندی جماعتوں کی خصوصی توجہ کے لیے

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۹ء

۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو لاہور میں جمعیت علماء اسلام (س) پنجاب کے سیکرٹری جنگ مولانا عبد الرؤوف فاروقی کی دعوت پر دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی ایک درجن سے زائد جماعتوں کی صوبائی قیادتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں رقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اجلاس کا مقصد موجودہ مکمل صور تحال اور اس کے تناظر میں علماء دیوبند کے خلاف پروپیگنڈے میں مسلسل اضافے کا جائزہ لینا اور کوئی مشترکہ لائچے عمل طے کرنا تھا۔ اجلاس میں طے پایا کہ صوبائی سطح پر ایک مجلس مشاورت قائم کی جائے جو باہمی مشاورت اور اشتراک عمل میں اضافہ کیلئے محنت کرے اور جماعتوں کی مرکزی قیادتوں سے رابطہ کر کے انہیں مرکزی سطح پر مشترکہ موقف اور لائچے عمل پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔

رقم الحروف نے اس موقع پر اپنی گفتگو میں گزارش کی کہ مسلکی دائرے میں اس وقت بہت

سی باتیں سوچنے کی ہیں، اور ان پر باہمی تبادلہ مخالفات کی کوئی صورت ضرور نکلنی چاہیے، ان میں سے فوری نویجت کی دو تین باتوں کی طرف اس وقت توجہ دلانا چاہوں گا جو فوری توجہ اور سنجیدہ بحث و تحقیص کی متھانی ہیں:

1. پہلی بات یہ ہے کہ اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ قیام پاکستان سے قبل متحده ہندوستان میں اور تقسیم ملک

کے بعد پاکستان میں شروع سے یہ صورت حال چلی آ رہی ہے کہ دینی و قومی تحریکوں میں ہمارا ہمیشہ مرکزی کردار

رہا ہے۔ ہم نے ہمیشہ ان تحریکوں میں ہر اول دستہ کاروں ادا کیا ہے اور ایک عرصہ تک یہ کیفیت رہی ہے کہ

کوئی دینی یا قومی مسئلہ پیدا ہونے پر لوگ ہماری طرف دیکھتے تھے اور ہمارے فیصلے اور موقف کا انتظار کرتے

تھے، لیکن آج یہ صورت حال نہیں ہے اور ہم بتدریج اس کردار سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں

پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کا جائزہ لینا چاہیے اس کے اسباب و عوامل پر غور کرنا چاہیے، اپنی کوتا ہیوں کی

نشاندہی کرنی چاہیے اور قومی سطح پر اپنے اس تاریخی کردار کی حوالی کا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے ماحول میں دینی مدارس پر دباو بڑھ رہا ہے اور

نشانے پر صرف دیوبندی مدارس ہیں، ڈرون بمبوں کے حملہ بھی ان پر ہو رہے ہیں، چھاپے بھی انہی پر پڑ

رہے ہیں اور منفی پروپگنڈے کا ہدف بھی وہی ہیں۔ اس صورت حال کا تجزیہ کرنا ضروری ہے اور ٹھنڈے دل و

دماغ کے ساتھ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اس میں کہیں ہماری کسی

کمزوری اور کوتا ہی کا دخل تو نہیں ہے؟ جن امور کو ان مدارس کے خلاف کارروائی کا بہانہ بنایا جا رہا ہے ان

امور کا کھلے طور پر جائزہ لیا جانا چاہیے اور حقیقت پسندانہ بنیادوں پر تجزیہ و تقیح کر کے اس بہانے کے ہتھیار

کو بیکار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کیلئے دو ٹوک موقف اختیار کرنا ہو گا اور تنذیب کے ماحول سے باہر

نکلنا ہو گا۔

مثلاً میں اپنا ذاتی موقف عرض کرتا ہوں کہ میرے نزدیک افغانستان اور عراق وغیرہ میں جو لوگ امریکی

فوجوں کی موجودگی اور سلطان کے خلاف لڑ رہے ہیں وہ مجاہد ہیں، آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں اور

ان کی جنگ شرعی جہاد ہے جس کی حمایت اور ان کی ہر ممکن امداد ہماری دینی ذمہ داری ہے، لیکن پاکستان کی

حدود کے اندر کسی دینی یا سیاسی مطالبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا درست طرز عمل نہیں ہے اور اس طرز عمل کی حمایت

نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں یہ بات واضح طور پر کہنا ہو گی اور اس حقیقت کو بھی دو ٹوک انداز میں واضح کرنا ہو گا کہ

بھارت، اسرائیل اور افغانستان کی ایجنسیاں پاکستان کے اندر اس قسم کی کارروائیوں کا جال بچھائے ہوئے ہیں

جن کا مقصد پاکستان کو کمزور کرنا اور دینی مدارس اور دینی قوتوں کو بناما کرنا ہے، اور اس سب کچھ کافائدہ عالیٰ

استعمال کو ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر جماعتی طور پر اس سلسلہ میں دو ٹوک موقف کا اٹھا رہا اور دیوبندی

جماعتوں کی قیادتیں مجتمع ہو کر اپنے اجتماعی نقطہ نظر کا اٹھا کریں تو دینی مدارس کے خلاف کارروائیوں کا اہتمام

کرنے والوں کو اس بہانے اور جواز سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

3. تیسری بات یہ ہے کہ عالمی سطح پر یہ کہا جا رہا ہے کہ اس وقت دیوبندی ہی عالمی استعمار کے خلاف صاف آرائیں اور اسی بنیاد پر دیوبندیوں کو انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ کہہ کر عالمی استعمار اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے ایجادنے کی تکمیل میں رکاوٹ صرف دیوبندی ہیں۔ میرے نزدیک یہ الزام فرد حرم نہیں بلکہ کریٹ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس طرح برطانوی استعمار اپنے عزائم کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمیں سمجھتا تھا اور جس طرح امریکی استعمار بھی اپنے رہا کا سب سے بڑا روڑا ہمیں ہی قرار دے رہا ہے۔ یہ تو تاریخی تسلسل ہے اور ہمیں اس الزام پر ناراض ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیے کہ ہم استعمار دشمنی میں اپنے اکابر کے راستے پر چل رہے ہیں۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ منفی پروپیگنڈے کے ذریعے خود ہماری رائے عامہ کو ہمارے خلاف کیا جا رہا ہے اور کردارکشی کی یک طرفہ ہم کے ذریعے مسلم رائے عامہ کو ہم سے تنفس کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں بے پرواہی سے کام نہیں لینا چاہیے اور رائے عامہ کو اپنے بارے میں مطمئن رکھنے کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اس کیلئے تمام ضروری اقدامات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

4. اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ دیوبندیت کے خلاف اس منفی پروپیگنڈے اور کردارکشی کی اس ہم میں کہیں ہماری اپنی کمزوریاں اور نادان دوستوں کی بے وقوفیاں تو شمن کا ہتھیار نہیں بن رہیں؟ اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اور ایسی ہربات سے براءت کا اظہار کرنا ضروری ہے جو کسی بھی درجے میں دشمن کو جواز فراہم کرتی ہویا اس کے ہاتھ میں بہانے کا ہتھیار بن سکتی ہو۔

بہر حال یہ چند امور ہیں جن کے بارے میں باہمی مشاورت اور تبادلہ خیالات کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچنا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس لیے یہ مناسب ہو گا کہ حالات پر نظر رکھنے والے کچھ اہل دانش مل بیٹھیں اور معروضی خالات کا سنجیدگی اور گہرا ای کے ساتھ تجربیہ کر کے ایک برینگ رپورٹ مرتب کریں تاکہ یہ بات سامنے آئے کہ کیا ہو رہا ہے؟ کون کیا کر رہا ہے؟ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں؟ اور تھہ منظر کے حقائق کیا ہیں؟ جبکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دیوبندی جماعتوں کی مرکزی قیادتیں باہم مل بیٹھنے کا اہتمام کریں اور مشترکہ موقف اور لامتحب عمل کا تعین کر کے اسے رائے عامہ کے سامنے لا یائیں خدا کرے کہ ہم ایسا کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

## فوجوں کے ذریعے دل جیتنے کا فارمولہ

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۰۹ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۲ نومبر ۲۰۰۹ء کی خبر کے مطابق افغانستان میں برطانیہ کے سینٹر کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل نک پاکرنے، جو افغانستان میں نیٹو افواج کے ڈپٹی کمانڈر بھی ہیں، ایک اخباری اٹھرو یو میں کہا ہے کہ افغانستان میں طالبان کو شکست دینے کیلئے بہتر جنگی ساز و سامان کی نہیں بلکہ لوگوں کے دل اور ذہن کو جیتنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا افغانستان میں جنگ جیتنے کیلئے مزید اور جدید تھیاروں کی ضرورت نہیں بلکہ نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے جس سے لوگوں کا اعتماد حاصل کیا جائے اور انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ اتحادی افواج ان کی بہتری کیلئے اقدامات کر رہی ہے۔ برطانوی کمانڈر کا یہ کہنا کہ افغان عوام کا دل اور ذہن جیتنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی ضرورت ہے، جہاں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اتحادی افواج اپنی تمام ترقیات سامانیوں کے باوجود افغان عوام کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں، وہاں اس معروضی حقیقت کیلئے بھی مستند شہادت کا درجہ رکھتی ہے کہ طالبان کے مقابلہ میں اتحادی افواج کو پہلی اپنی کامانٹا پر رہا ہے اور عسکری جنگ میں انہیں اپنے جیتنے کے امکانات محدود ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اتحادی ممالک کو افغان عوام کے دل و ذہن جیتنے اور انہیں اعتماد میں لینے کی کوئی نئی حکمت عملی طے کرنے سے پہلے اپنی اس پہلی کے اسباب کا جائزہ لیتا چاہیے اور یہ دیکھتا چاہیے کہ ان کی کون سی غلط پالیسیوں نے انہیں یہ دن دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک امریکی اتحاد کی سب سے پہلی غلطی یہ تھی کہ سوویت یوینین کے خلاف جہاد افغانستان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد امریکہ نے یہ سمجھ لیا کہ شاید افغان مجاهدین بھی صرف اسی لیے لڑ رہے تھے کہ عالمی سرحد جنگ میں امریکہ کو کامیابی حاصل ہو اور سوویت یوینین اس کے مقابلہ میں پسپا ہو جائے۔ حالانکہ افغان مجاهدین کے جہاد اور قربانیوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان کے ملک کی خود مختاری بحال ہو اور افغانستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست بنے۔ امریکہ اور دوسرے ممالک نے جہاد افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کر لیے مگر افغان مجاهدین کے اصل مقصد کوئہ صرف نظر انداز کر دیا بلکہ اس میں روٹے اٹکنے شروع کر دیے۔ اب بھی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ نے افغانستان کی خود مختاری کو اسی طرح یہ غمال بنا رکھا ہے جس طرح دو عشرے قبل سوویت یوینین نے یہ غمال بنایا ہوا تھا اور افغانستان میں شرعی نظام کے نفاذ میں امریکہ اسی طرح رکاوٹ بنایا ہے جس طرح سوویت یوینین ایک عرصے تک رکاوٹ بنارہا۔ چنانچہ افغان مجاهدین کیلئے جن کی قیادت اس وقت طالبان کر رہے ہیں صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ جو جنگ سوویت یوینین کے خلاف لڑ رہے تھے اسی جنگ کا انہیں اب امریکی اتحاد سے سامنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ طالبان صرف ایک طبقے کا نام ہے جسے فوبی قوت کے ذریعے شکست دی جاسکتی ہے، وقت نے جلد ہی ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی ہے اور ان پر واضح کردیا ہے کہ اتحادی فوجوں کا مقابلہ کی ایک طبقے سے نہیں بلکہ افغان قوم سے ہے، اور ایک عشرے کے پیشہ حصے پر محیط جنگ

کے بعد اب انہیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ افغان عوام کو اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے اور ان کے دل و ذہن کو جیتنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم جزل نک پار کر سے یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ اگر وہ اپنی قیادت کو یہ مشورہ دینے میں سمجھدے ہیں کہ افغان عوام کو اعتماد میں لیا جائے اور ان کے دل و ذہن جیتنے کی کوشش کی جائے تو وہ اس کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیں کہ افغان عوام کی عزت نفس، آزادی اور افغانستان کی خود مختاری کا احترام کیا جائے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں مزید تاخیر نہ کی جائے کہ افغان قوم ہمیشہ آزاد رہی ہے اور اس کا سب برا تو قوی مقصد اسلامی شریعت کا نفاذ اور اس کے ساتھ بے چک و بُشکی رہا ہے۔

جزل نک پار کر کا کہنا ہے کہ دل و دماغ جیتنے کیلئے مزید فوجی ساز و سامان کی ضرورت نہیں اور ہم بھی ان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ دل و دماغ فوجوں کے ذریعے نہیں جیتے جاتے، امریکی فوجوں نے دنیا کے جس ملک میں وہاں کے عوام کے دل و دماغ جیتنے کیلئے ڈیرے ڈالے ہیں وہاں سے انہیں نفرت کے سوا کچھ نہیں ملا، تو فوجوں کے ذریعے غیور اور حریت پسند افغان عوام کا اعتماد آخر کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

## موجودہ حالات اور جزل حمید گل

روزنامہ اسلام، لاپور—۱۰ دسمبر ۲۰۰۹ء

دورہ قبل جزل (ر) حمید گل صاحب نے فون پر مجھے کہا کہ ۸ دسمبر کو راولپنڈی میں کچھ حضرات کو ملک کی موجودہ صورتحال کے حوالے سے جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں آپ کی آمد بھی ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی محمد وسط کا مشاورتی اجلاس ہو گا لیکن میں جب سنبھجے کے لگ بھگ راولپنڈی صدر کے فلیٹ میں ہوٹل کے میں ہاں میں داخل ہوا تو وہاں ایک ایچھے خاصے قومی سیمینار کا سماں تھا۔ مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ ریاضرڈ فوجی افسران، سابق سفارتکار اور دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والے متاز حضرات راؤ نڈیل کانفرنس کی صورت میں کرسیوں پر تشریف فرماتے۔ اسلام آباد کے مولانا عبدالخالق صاحب علماء کرام کا خیر مقدم کرنے اور انہیں مناسب مقامات پر بٹھانے میں مصروف تھے۔ مجھے انہوں نے ایک طرف کرسیوں کی پہلی رو میں علامہ احمد علی قصوری، علامہ علی غضفر کراروی، آغا مرتضیٰ پویا اور خاکسار رہنمای جناب حمید الدین المشرقی کے ساتھ بٹھا دیا۔ سامنے کی رو میں دیگر حضرات کے ساتھ ثیں الحدیث حضرت مولانا ذاکر شیعی شاہ اور مولانا انوار الحق حقیقی تشریف فرماتے۔

تقریب کا آغاز جزل حمید گل کے نام پر شروع کی جانے والی ایشٹنیٹ ویب سائیٹ کے باقاعدہ افتتاح سے کیا گیا جس کے بارے میں ان کی صاحبزادی محترمہ عظیمی گل نے بتایا کہ یہ ویب سائیٹ انہوں نے اپنے والد محترم کو ان کی سالگرہ پر تحفے کے طور پر پیش کرنے کیلئے بنائی ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں افغانستان، کشمیر، جہاد اور اسلامی نظام کے بارے میں جزل حمید گل کے مضامین کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جزل حمید گل مائیک پر آئے اور موجودہ علاقائی صورتحال پر شرکاء کو مختصر بریفنگ دی۔ انہوں نے بتایا کہ جو صورتحال اس وقت ملک کو درپیش ہے یہ اس وقت

بھی ہمیں درپیش تھی جب ۱۹۸۷ء میں سوویت یونین نے افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی نہ صرف یہ کہ افغانستان میں فوجوں کی تعداد بڑھادی تھی بلکہ پاکستان میں بھی بم دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کے پیچھے روس، افغانستان اور انڈیا کی خفیہ ایجنسیاں تھیں اور ان میں پاکستان کے ہزاروں شہری جاں بحق ہو گئے تھے۔ امریکہ بھی انہی لاسٹوں پر چل رہا ہے اور افغانستان سے ۱۸ ماہ کے بعد فوجوں کی واپسی شروع کرنے کے اعلان کے بعد اس نے فوجوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے اور ادھر پاکستان میں خودکش بم دھماکوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔

جزل حمید گل نے کہا کہ امریکہ نے افغانستان سے بہر حال جانا ہے، اس سے یہاں کی علاقائی صورتحال میں جو تبدیلیاں آئیں گی ان پر غور کرنا اور ان کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا تعین ہماری ذمہ داری ہے اور اسی مقصد کیلئے آپ حضرات کو زحمت دی گئی ہے۔ انہوں نے ملک کے اندر کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے خودکش بم دھماکوں اور ان میں بے گناہ شہریوں کی قیمتی جانوں کے ضایع کو افسوسناک قرار دیا اور کہا کہ اس سلسلہ میں بروئی عوامل بالخصوص بھارت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جائے کہا اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصل عوامل کو بے نقاب کرے۔ اسی طرح ان عناصر کو بھی اس بات پر غور کرنا چاہیے جو انقام اور بد لے کیلئے فوجی مرکزوں اور مساجد پر حملہ کر رہے ہیں کہ ان کی ایسی کارروائیوں سے پاکستان کمزور ہو رہا ہے، شمن کو تقویت مل رہی ہے اور دنیٰ حلقتہ بننام ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے وزیر داخلہ علماء کرام سے فتویٰ جاری کرنے کیلئے کہہ رہے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ علماء کرام کوئی فتویٰ قرآن و سنت کی روشنی میں ہی دے سکتے ہیں اور انہیں پھر پرویز شرف کے غیر شرعی اقدامات پر بھی فتویٰ جاری کرنا پڑے گا اور دیگر غیر اسلامی پالیسیاں بھی فتوؤں کا عنوان نہیں گی۔

جزل صاحب نے موجودہ صورتحال کی اصلاح کیلئے ہاؤس کے سامنے چند تباویز پیش کیں جنہیں ہاؤس نے کافرنس کی طرف سے متفقہ موقف کے طور پر منظور کر لیا۔

1. قبائلی علاقے میں جاری آپریشن اور عسکری گروپوں کی طرف سے جنگ میں دونوں طرف سے فوری طور پر سیزفارٹ ضروری ہے اور ہم دونوں طرف کے ذمہ دار حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ فوری طور پر سیزفارٹ کی یہ اپیل منظور کرتے ہوئے جنگ بند کر دیں۔

2. فرقیین میں مذکرات اور مصالحت کیلئے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام اور مختلف طبقات کے ممتاز حضرات پر مشتمل وفد تشكیل دیا جائے جو قبائلی علاقوں میں جا کر اس مصالحت کیلئے راہ ہموار کرے۔ اگر حکومت اور فرقیت ثانی اس تجویز کو منظور کر لیں تو ہم یہ وفد تشكیل دینے اور جانوں پر کھیل کر بہاں جانے کیلئے تیار ہیں۔

3. امریکہ کے ساتھ تعاون و اشتراک پر نظر ثانی کی جائے اور اسے محدود اور مشروط کیا جائے اور تعاون کی شرط کے طور پر امریکہ سے مطالہ کیا جائے کہ:

■ ایٹھی قوت کے طور پر پاکستان کو بھارت کے برابر درجہ دیا جائے۔

■ کشمیر کے معاملات میں بھارت کی مسلسل مداخلت کا نوٹس لیا جائے۔

4. بلوجستان میں عوام کے مشتعل جذبات کو کم کرنے کیلئے پرویز مشرف کے خلاف فوری طور پر ٹرائل شروع کیا جائے۔

5. جن خفیہ معاهدات کے نتیجے میں پاکستان کی حدود میں ڈرون حملے ہو رہے ہیں، بلکہ واٹر کے الکار باروک ٹوک ملک میں مسلح طور پر پھر رہے ہیں اور دیگر اس طرح کی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان معاهدات کو منظر عالم پر لا جائے اور قوم کو بتایا جائے کہ یہ معاهدات کیا ہیں؟

جزل حمید گل کا کہنا ہے کہ امریکہ جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہے جو ان کے خیال میں یہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی جوہری قوت کو ختم کر دیا جائے یا کم از کم مشرکہ مغربی میں دے دیا جائے اور بھارت کی سرحد سے پاکستانی فوجوں کو مغربی سرحد پر منتقل کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ قائدِ اعظم نے پاکستان بننے کے بعد مغربی چھاؤنیوں کو خالی کرنے کا حکم دیا تھا اور ساری فوجیں مشرقی سرحد پر بھارت کے ساتھ لگادی تھیں لیکن اب اس پالیسی کو تبدیل کرانے کیلئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے جس سے مشرقی سرحد پر پاکستان کی پوزیشن کمزور ہو گی اور بھارت کی بالادستی کی راہ ہموار ہو گی۔ اس صورتحال پر نظر رکھی جائے اور اسی طرح ہمارا طالبہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کے مطابق امریکہ کے ڈرون حملے بند کرائے جائیں اور قومی خود منصاری کے تحفظ کیلئے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔

جزل صاحب کا کہنا ہے کہ افغانستان سے امریکہ کی واپسی کی صورت میں ہمارے مقتدر حلقوں کی طرف سے اس خوف کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ اس سے خطے پر طالبان کا تسلط قائم ہو گا اور پاکستان میں بھی طالبانائزیشن کو فروغ حاصل ہو گا۔ ہمارے پاس اس کا واضح حل موجود ہے کہ ہمارے طالبانائزیشن کو روکنے کیلئے پاکستان میں دستور کے مطابق نفاذ اسلامی کی طرف پیش رفت کریں اور سیاسی و جمہوری طریقے سے نفاذ شریعت کر کے طالبان کے ہاتھ سے یہ ہٹھیار چھین لیں۔ کیونکہ افغانستان کے انتدار میں واپسی کے بعد طالبان کے پاس پاکستان کے معاملات میں دلچسپی اور مداخلت کا یہی بہانہ ہو گا جسے ہم اپنے دستور پر سنجیدہ عمل درآمد کے ذریعے ختم کر سکتے ہیں اور اب ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی آپشن باقی نہیں رہا۔ جزل صاحب نے کہا کہ پاکستان میں نفاذ اسلام ہمارے دستور کا تقاضا ہے لیکن یہ نفاذ شریعت قرارداد مقاصد کے مطابق ہو گا، دستور کی اسلامی دفعات کے مطابق ہو گا اور جمہوری و سیاسی عمل کے ذریعے ہو گا، اور ہمارے حکمران طبقے اگر طالبانائزیشن کا راستہ روکنے میں سنجیدہ اور مغلص ہیں تو انہیں یہ کرنا ہی ہو گا۔

جزل حمید گل نے ہاؤس سے اپنی ایک تجویزی ممنظوری بھی لی کہ ہمارے مطالبات اور تجاویز پر اگر حکومت کوئی شبت طرز عمل اختیار نہیں کرتی، بالخصوص امریکہ کے ساتھ تعاون پر نظر ثانی اور ڈرون حملے بند کرانے میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھاتی تو ہمیں قومی سٹریٹ پر ایک تحریک منظم کرنا ہو گی جو غیر سیاسی بنیادوں پر ہو گی اور تمام طبقات مل کر امریکی مداخلت کا راستہ روکنے کیلئے سڑکوں پر آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ابھی تحریک کے وقت اور پروگرام کا اعلان نہیں کر رہے، صرف یہ بتا رہے ہیں کہ اگر حکومت نے کچھ نہ کیا تو ہم خود کریں گے اور اگر فی الواقع حکومت نے کچھ نہ کیا تو ہم سرکردا

حضرات اور راہنماؤں سے مشاورت کے ساتھ قومی تحریک کا پروگرام مرتب کریں گے، اس کیلئے مشترکہ فورم تشکیل دیں گے اور اس کے وقت اور طریق کار کا اعلان کریں گے۔

یہ مختصر سی رواداد ہے جوں حمید گل کے طلب کردہ مشترکہ اجتماع کی، اس کی دیگر تفصیلات و جزئیات کے حوالے سے پھر کسی موقع پر گزارشات قاریین کی خدمت میں پیش کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## افغانستان کی صورتحال: سابق روسری صدر میخائل گوریاچوف کا تجزیہ

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۰ء

افغانستان کی صورتحال کے بارے میں لندن کافرنیس کے موقع پر طالبان سے مذاکرات پر زور دینے کے بعد افغانستان میں اتحادی فوجوں نے دباؤ بڑھا دیا ہے اور طالبان راہنماؤں کی گرفتاریوں کی مہم بھی تیز کر دی گئی ہے۔ لندن کافرنیس کا مقصود خود برطانوی حکومت کے نمائندے نے یہ بتایا ہے کہ افغانستان میں مذاکرات کا فصلہ طالبان کی قوت کو تقسیم کرنے کیلئے کیا گیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں طالبان کی ۸۰ فیصد اکثریت جنگ کی حامی نہیں ہے اور انہیں الگ کرنے کیلئے مذاکرات کا جال بچھایا جا رہا ہے۔ لیکن یعنی الا تو ای ماہرین اور خطہ کے حالات سے واقفیت رکھنے والے علمی دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ افغانستان میں نیٹو افواج کی ہزیبت پر پرداہ ڈالنے کیلئے کیا جا رہا ہے اور اوباما انتظامیہ افغانستان سے نکلنے سے پہلے آخری زور لگا کر اپنی پسپائی کے تاشرکوں کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اس سلسلہ میں سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گوریاچوف نے ایک حالیہ مضمون میں صورتحال کا جائزہ پیش کیا ہے اور روز نامہ پاکستان لاہور میں افروری ۲۰۱۰ء کو شائع ہونے والے ان کے اس مضمون کے چند اقتباسات ابتور خاص قابل توجہ ہیں:

- ۱۹۷۹ء میں سوویت قیادت نے افغانستان میں فوجیں اتارنے کے جواز میں کہا تھا کہ وہ وہاں اپنے دوستوں کی مدد کرنے اور انتشار کے شکار ملک میں استحکام پیدا کرنے کیلئے آئے ہیں۔ ہم سے افغانستان جیسے ملک کی پچیدہ صورتحال کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی اسی لیے ہم جو چاہتے تھے تباہ اس کے بالکل بر عکس برآمد ہوئے۔ عدم استحکام میں اضافہ ہوا اور ایک ایسی جنگ ملک پر گئی جس کا نہ صرف ہزاروں افراد شکار ہوئے بلکہ خود ہمارے اپنے ملک کو مہلک تباہ جھگٹنا پڑے۔

- انجمن مغربی قائدین کے خواب غفلت سے بڑرا کر بیدار ہونے کا ہونا ک لمحہ تھابت بھی مغرب کے فیصلہ سازوں نے جو فیصلے کیے وہ گہری سوچ چمار سے عاری تھے اور جو بعد ازاں غلط ثابت ہوئے۔

- افغانستان میں فوج کی گرفت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے، یہ ایک کھلا راز ہے جس کا خود امریکی سفیر حال ہی

میں ایک ٹھیلی ویژن اٹرو یو میں اعتراف کرچکے ہیں۔ میں نے بھی گذشتہ چند ماہ میں بار بار پوچھتے جانے والے سوالوں کے جواب میں ایک ہی بات دھرائی ہے اور وہی میں صدر اوباما سے کہنا چاہوں گا کہ جنہیں یہ مصیبت ان کے پیش رو سے درثے میں ملی ہے اور وہ یہ کہ اس مصیبت کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے سیاسی حل اور افغانستان سے بیرونی افواج کا مکمل انخلا جو قوی مفاہمت کا مقاضی ہے۔

- افغانستان میں اقوامِ متعدد کے مندوب نے بھی حال ہی میں دیے گئے اٹرو یو میں اسی چیز پر زور دیا ہے کہ ”پورے افغانستان سے بیرونی فوجوں کا مکمل انخلا“ کتنے شرم کی بات ہے کہ ایسا پہلے کہا اور کیا کیوں نہیں گیا؟

یہ تجربیہ سوویت یونین کے آخری صدر میخائیل گورباجوف کا ہے جنہوں نے افغانستان سے جہاد افغانستان کے بعد رو سی فوجوں کے انخلا کا فیصلہ کیا تھا اور جن کے دور میں سوویت یونین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ جب افغانستان میں سوویت یونین کی فوجیں افغان عوام کے ساتھ برسر پیدا کر تھیں تب اس وقت کی برطانوی وزیرِعظم مسز مارگریٹ تھیجر نے روس کا دورہ کر کے ماسکو میں رو سی لیڈروں کو یہ نصیحت کی تھی کہ وہ برطانیہ کے تجربہ سے سبق حاصل کریں جسے افغانستان پر فوج کشی میں عبرناک ہزیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور اب سوویت یونین کے آخری صدر امریکی صدر کو مشورہ دے رہے ہیں کہ افغانستان سے غیر ملکی فوجوں کے مکمل انخلا کے بغیر اس مصیبت سے ان کی جان نہیں چھوٹے گی۔

درactual امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے نائن الیون کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ طالبان شاید صرف ایک گروہ کا نام ہے جسے طاقت کے ذریعے شکست دی جاسکتی ہے، لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ سوویت یونین کی طرح امریکی اتحاد کی جنگ بھی پوری قوم کے خلاف ہے اور یہ مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ قوموں کو کبھی شکست نہیں دی جاسکتی۔

## جہاد، دہشت گردی، جدوجہد آزادی

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۱۴ء

میں نے عرض کیا کہ یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ جہاں تک پاکستان یا کسی بھی مسلم ملک میں نفاذ شریعت کیلئے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی بات ہے ہم نے ہر موقع پر یہ کہا ہے کہ اسے ہم درست نہیں سمجھتے اور اس کی حمایت نہیں کرتے۔ لیکن دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بغل جانے والوں نے دہشت گردی کی کوئی تعریف عامی سطح پر طے کیے بغیر یہ اختیار اپنے پاس رکھ لیا ہے کہ وہ جسے چاہیں دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوؤں۔ یہ طرز عمل درست نہیں ہے کہ اس نے جہاد، دہشت گردی اور قومی آزادی کی جنگ کو گلڈ مارک کے رکھ دیا ہے اور ایک ایسا کنفیوژن دنیا پھر میں پیدا کر دیا ہے کہ دہشت گردی کی متفقہ تعریف طے کیے بغیر اسے دور کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے جب ہم سے

دہشت گردی کے خلاف کی طرف بات کرنے اور غیر مشروط فتویٰ جاری کرنے کا تقاضہ کیا جاتا ہے تو ہمارے تحفظات ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم، جہاد افغانستان، جہاد فلسطین اور جہاد کشمیر کو دہشت گردی کے زمرے میں شامل کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جس کی نذر میں جہاد اور قومی آزادی کی تحریکات بھی آتی ہوں۔

میں نے وکلاء سے عرض کیا کہ اس سلسلہ میں علماء کرام اور وکلاء دونوں کو کام کرنا چاہیے کہ وہ جہاد، دہشت گردی اور ہر سطح پر علمی اور فکری طور پر محنت کریں۔ جبکہ میرے خیال میں آزاد کشمیر کے علماء کرام اور وکلاء کی ذمہ داری اس سلسلہ میں زیادہ ہے کہ جہاد، دہشت گردی اور آزادی کی جنگ کو گلڈ کر کے استعماری قوتوں نے جواہجہاً اور کنفیوژن پیدا کر رکھا ہے اور جسے وہ اپنے مذموم مقاصد کیلئے مسلسل بڑھاتی اور پھیلاتی جا رہی ہیں، کشمیری عوام کی آزادی کی جدوجہد اس سے برداشت متأثر ہو رہی ہے اور کشمیر کا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس لیے آزادی کشمیر کی جدوجہد کو اس کنفیوژن سے نکالنے کیلئے بھی ضروری ہے کہ آزاد کشمیر کے علماء کرام اور وکلاء اس سلسلہ میں کردار ادا کریں اور علمی و فکری دائرے میں جدوجہد کر کے دنیا کو بتائیں کہ جہاد اور آزادی کی جنگ کا دائرہ اور ہے اور دہشت گردی کا دائرہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔

میں نے گزارش کی کہ علماء کرام اور وکلاء کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ باہمی میل جوں کا ماحول پیدا کریں اور سوسائٹی میں قانون کی بالادستی، اسلامی قوانین کے نفاذ اور دیگر ملی مقاصد کیلئے طبقاتی معاصرت کے ماحول سے نکل کر مشترک جدوجہد کا اہتمام کریں۔

## حضرت مولانا نور محمد شہید

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اکتوبر ۲۰۱۰ء

حضرت مولانا نور محمد شہید سے عام طور پر بہت کم لوگ واقف ہیں، میں نے پہلی مرتبہ انہیں ۱۹۷۶ء میں دیکھا جب میں ایک طالب علم تھا۔ اس وقت اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کیا ہوا تھا، مفتی محمود صاحب نے ایک جلسے میں فرمایا کہ اگر حکومت ہمیں اجازت دے تو ہم اپنے خرچے پر وہاں جہاد کیلئے جائیں گے۔ مفتی صاحب کے بعد ایک نوجوان کھڑا ہوا اور بڑے جوشیلے انداز میں اس نے اس بات کا اعلان کیا کہ اگر حکومت اجازت دیتی ہے تو میں قبائل کی طرف سے دس ہزار کا لشکر فراہم کروں گا۔ میں نے بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بعد میں مفتی صاحب سے میں نے پوچھا کہ حضرت یہ نوجوان کون ہیں اور اتنا بڑا عویٰ کیسے کر رہے ہیں؟ مفتی صاحب نے فرمایا، یہ دے دے گا، یہ وزیروں کا لیڈر ہے۔

مولانا نور محمد نے ونا میں جمعیت کی بنیاد رکھی۔ قبائل کا علاقہ دینی علاقہ ہے، بھٹو صاحب مرحوم نے اپنے دور اقتدار میں ایک مرتبہ قبائل کا دورہ کیا۔ وہاں کے پولیسیکل اجیٹ نے مولانا نامرحوم سے ملاقات کی کہ بھٹو صاحب کا استقبال کیسے کیا جائے، انہوں نے فرمایا کہ میں بے مثال استقبال کروں گا لیکن کروں گا جمعیت کے پلیٹ فارم سے۔ جبکہ وہ لوگ

چاہتے تھے کہ پیغمبر پارٹی کے جنڈے تسلیم کے استقبال ہو۔ جب بھٹو صاحب ائمہ پورٹ پر اترے تو ہر طرف جمعیت کے ہزاروں پر چم لہر اڑے تھے۔ اس کی مولانا کو پھر سزا بھی دی گئی، انہیں ایک مقدمے میں الجھایا گیا، وانا بازار کو بلڈوز کر دیا گیا اور مولانا سات آٹھ سال تک جیل میں رہے۔

مولانا نور محمد مرحوم نے جہاد افغانستان میں بہت سرگرم کردار ادا کیا اور سب سے پہلے جو کتاب جہاد افغانستان کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کیلئے لکھی گئی وہ مولانا نے ہی لکھی تھی۔ میں بھی اس وقت اسی کتاب کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ہمارا جب بھی ان علاقوں کا سفر ہوتا تو ہم مولانا کے پاس ٹھہر تے اور ان سے استفادہ کرتے۔ ایک مرتبہ میں افغانستان جا رہا تھا تو اسے مولانا کے پاس ٹھہرا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے جہاد افغانستان پر ایک کتاب لکھی ہے جو چھپنے کے قریب ہے، انہوں نے اس کا مسودہ مجھے بھی دکھایا۔ کتاب میں نے اسی رات ساری دیکھی اور من جان سے عرض کی کہ میں نے ساری کتاب دیکھ لی ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کتاب صرف پہلوانوں کیلئے لکھی ہے یا سب کے لیے؟ انہوں نے کہا کہ سب کیلئے ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی زبان تو صرف پہلوانوں والی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتی ہے وغیرہ، اس کی زبان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ فرمائے گے کہ نظر ثانی کون کرے گا؟ میں نے کہا کہ میں کروں گا۔ میں وہ کتاب ساتھ لے آیا اور اس کی زبان کی اصلاح کی اور پھر وہ کتاب چھپی۔ اس طرح ان کی برکت سے مجھے یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ جہاد افغانستان پر لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب پر نظر ثانی کاموں قلع ملا، اس کتاب پر مقدمہ بھی میں نے ہی لکھا تھا۔ مولانا کے پاس علم بھی تھا، وجاہت بھی تھی اور مقام و مرتبہ بھی تھا۔ آپ قبائل کے لیڈر تھے، اگر کسی ایک شخصیت کا نام پوچھا جائے کہ جس پر تمام وزیر قبائل کو اکٹھا جائیسا کتنا تھا تو وہ نام مولانا نور محمد ہی کا تھا۔ گذشتہ دونوں وہ ایک خود کش حملہ میں شہید کر دیے گئے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مسجد سے باہر تشریف لائے تو ایک نوجوان ان سے آکر گلے ملا اور گلے ملتے ہی اس نے اپنے آپ کو بم سے اڑا دیا اور مولانا سمیت ۲۳۴ افراد شہید ہو گئے۔ ان کی موت سے دیگر نقصانات تو ایک طرف، ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اب شاید کوئی ایسی شخصیت نہ ملے جس پر سب قبائل کو جمع کیا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں ارفع و اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمين یا رب العالمین۔

## طالبان کا وجود اور ان کے ساتھ مذاکرات

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۱۰ء

روزنامہ جنگ راولپنڈی میں ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق:

”سابق صدر جزل (ر) پر ویز مشرف نے کہا ہے کہ اگر امریکہ طالبان حکومت کو تسلیم کر لیتا تو اسے اسماء بن لاون کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ہوشن کی ایشیا سائی ٹکس سٹریٹ میں خطاب کے دوران سابق صدر پر ویز مشرف نے کہا کہ عالمی برادری کو طالبان کے حوالے سے حکمت عملی تبدیل کرنے

کی ضرورت ہے، طالبان کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لینا چاہیے۔ پرویز مشرف نے کہا ان پر ذبل گیم کا الزام لگتا رہا ہے حالانکہ وہ طالبان کو مذکورات کی میز پر لانے کے حامی تھے، انہوں نے کہا کہ دنیا نے طالبان کو تسلیم نہیں کیا جبکہ پاکستان کو انہیں تسلیم کرنے پر تعمید کا نشانہ بنایا گیا، انہوں نے کہا کہ ہمیں طالبان کو تسلیم کر کے ان میں تبدیلی لانی چاہیے، انہوں نے کہا کہ وہ پہلے بھی طالبان کے ساتھ مذکورات کے حامی تھے لیکن آج طالبان سے مذکورات کیلئے اٹھایا جانے والا قدم کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔“

جزل (ر) پرویز مشرف نے اپنے دور حکومت میں افغانستان اور طالبان کے والے سے جو کچھ کیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے اور انہوں نے طالبان کے وجود اور ان کی حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد ”یو ٹرین“ لے کر امریکی عزادم کی میکل کیلئے پاکستان کو جس طرح تختہ مشق بنایا اس کے تلخ اثرات پوری قوم بھگت رہی ہے اور خدا جانے کب تک اسے یہ تلخ نیانج بھگتنا پڑیں گے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود جزل (ر) مشرف نے امریکہ کے شہر ہیومن میں کیے جانے والے اپنے اس خطاب میں جس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کی فوری اور سنجیدہ توجہ کی مُستحق ہے۔

ہم شروع سے یہ کہتے آ رہے ہیں کہ افغان قوم اور ان کی دینی و قومی روایات کا پرچم اٹھانے والے طالبان کو طاقت کے زور سے ختم کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لشکر کشی اور حشیانہ استعمال افراد اور گروہوں کے خلاف تو کامیاب ہو جایا کرتا ہے مگر قوموں کے خلاف کوئی لشکر کشی کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ طالبان صرف ایک گروہ نہیں بلکہ افغان قوم کے دینی و قومی جذبہ حریت کی علامت ہیں اور وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ افغان قوم آج بھی طالبان کی پشت پر ہے۔ اس لیے عالمی قوتوں کو چاہیے کہ وہ طالبان کے وجود کو تسلیم کریں اور افغانستان کی قومی خود مختاری کے ساتھ ساتھ افغان قوم کے اسلامی تشکیص اور روایات و اقدار کا احترام کرتے ہوئے کسی قسم کی بیرونی مداخلت کے بغیر انہیں اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے دیں کہ اس مسئلہ کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے۔

## کرمل امیر سلطان تارڑ شہید

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء

کرمل امام کی شہادت اور حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کے عرس کے موقع پر خود کش حملہ بظاہر دو الگ الگ واقعات ہیں جن میں کوئی جوڑ اور تعلق دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتا لیکن حالات میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلوں اور ان کے پس منظر پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات او جھل نہیں ہو سکتی کہ کربلی میں ہونے والے خود کش حملے سمیت ان تینوں واقعات کے پس منظر کو ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں۔

کرمل امام نے، جن کا اصل نام کرمل امیر سلطان تارڑ تھا، جہاد افغانستان میں مجاہدین کو ٹریننگ دینے اور جنگی حکمت عملی سکھانے میں اہم کردار ادا کیا اور افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین کم و بیش سب کے

سب ان کی خدمات، قربانیوں اور جدوں ہمکے معرفت چلے آرہے ہیں۔ سوویت یونین کی افغانستان سے واپسی کے بعد جب مجاہدین کے مخفف گروپوں کو باہمی خانہ جنگی کی طرف دھکلنے کی مکروہ سازش کا تانا بانا بنا گیا تو اس غلشنار سے نگ آگر طالبان کی شکل میں سامنے آئے والے مجاہدین کو منظم کرنے میں بھی کرنسی امام شہید متحرک رہے۔ اس پس منظر کے باعث کرنسی امام کو سنبھیہ حلقوں میں اس نظر سے دیکھا جا رہا تھا کہ جب اس خطے میں استعماری قتوں کی واپسی کیلئے کسی محفوظ راستے کی تلاش ہوگی تو جو لوگ خطے میں امن کی واپسی کیلئے ہم روں ادا کر سکیں گے ان میں کرنسی امام سرفہرست ہوں گے۔ وہ افغان قوم کے مزاج و نفیہات سے بھی واقف تھے اور پاکستان کی ضروریات و مفادات کو بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ اس خطے میں بیردنی قتوں کی دراندازی، بالخصوص بھارت کے مسلسل کردار پر بھی ان کی نظر تھی اور پاکستان اور افغانستان دونوں ملکوں کے ذمہ دار حلقوں میں انہیں قابل اعتماد تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان انتہا پسند قتوں اور عالمی سازشوں کے منصوبہ کاروں کے لیے، جو مصالحت و مفاہمت کا ہر راستہ بند کر دینا چاہتے ہیں اور جنہیں اعتماد و توازن کی بات کرنے والے اور امن کی واپسی کیلئے کام کرنے والے ایک آنکھ نہیں بھاتے، کرنسی امام اپنی تمام ترجیحاتی خدمات کے باوجود ان کی انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھنے لگے ہیں۔

میرے نزدیک کرنسی امام کی شہادت مولانا محمد حسن جان شہید، حضرت مولانا نور محمد شہید آف وانا، اور ڈاکٹر محمد فاروق شہیدگی شہادت کا تسلسل ہے۔ یہ لوگ تھے جو درمیان کے آدمی سمجھے جاتے تھے اور جن سے صرف امن کی واپسی کیلئے مؤثر کردار کی توقع تھی بلکہ یہ لوگ جہور علمائے اسلام کی تعمیر اور طریق کار کے مطابق نماز شریعت کیلئے بھی مخلص تھے اور عملًا کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کرنسی امام شہید نے بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جام شہادت نوش کیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کرنسی امام کو اغوا کرنے والوں نے تاداں نہ ملنے پر شہید کیا ہے یا وہ دوران حرast حركت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے ہیں، شہید تو وہ دونوں صورتوں میں ہیں۔ اور مجھے جزل(ر) حمید گل کی اس بات سے اتفاق ہے کہ کرنسی امام ”شہید پاکستان“ ہیں، جبکہ ان کے بقول ان کی شہادت کے پیچھے اصل ہاتھ بھارت کا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلینٹن نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ ہم سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد اس خطے کے مجاہدین کو تنباچ چوڑ دیا جس کا خیاہ ہم بھگت رہے ہیں۔ میں بات اگرین الاقوای تناظر سے زرانچے اڑکر قومی سطح پر دیکھ لی جائے تو صور تھال کچھ مختلف نہیں۔ راقم الحروف کئی بار یہ بات مختلف فور موں اور مختلف کالموں میں عرض کر چکا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل سندھ میں ”خُروں“ کی سرگرمیاں اسی نوعیت کی تھیں، وہ برطانوی تسلط کے خلاف مسلح کارروائیوں میں مصروف تھے اور اگر آج کی اصطلاح استعمال کی جائے تو وہ بہشت گرد، جبکہ ہماری قومی تاریخ کے مطابق وہ مجاہدین آزادی تھے اور ہر محب وطن انہیں مجاہدین آزادی کے طور پر ہی خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے جنہیں قیام پاکستان کے بعد پاک فوج میں ایڈ جسٹ کر لیا گیا تھا۔ مگر افغانستان میں سوویت یونین کی واپسی کے بعد پاکستان سے تعلق رکھنے والے ہزاروں مجاہدین کے بارے میں یہ حکمت عملی اختیار نہیں کی گئی۔ انہیں حکومت پاکستان نے بھی تھا چھوڑ دیا پاک فوج نے بھی انہیں کسی عسکری حکمت عملی کا حصہ بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور پاکستان کی وہ دینی

جماعتیں جو انہی مجاہدین کے ذریعے چہڑا افغانستان میں پیش پیش نظر آتی تھیں انہوں نے بھی انہیں نظر انداز کر دیا۔ اس کا تیجہ یہ تلاکہ ان میں سے ہرگروہ اپنا مستقبل، اپنا تاریخ اور اپنا طریق کارٹے کرنے میں آزاد ہو گیا۔ اس سے عالمی قوتوں اور بیرونی مداخلت کاروں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور جس طرح ہمیری کشمکش کے بقول عالمی قوتیں اپنی سطح پر اس کا خمیازہ بھگت رہیں اسی طرح قومی سطح پر ہم سب اس قومی غفلت کے تخت نشان کا سامنا کر رہے ہیں۔

آج کی صورتحال اسی قومی اور جماعتی غفلت کا منطقی نتیجہ ہے اور اس منحصرے سے نکلنے کیلئے سوچا جانے والا کوئی بھی حل اس پس منظر کو نظر انداز کر کے کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ہم ان گروپوں کے ماضی کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، ان کی شدت پسندی کے اسباب کو دور کرنے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہم انہیں ہیں الاقوامی سازشوں کے جال سے نکلنے میں سنجیدہ نہیں ہیں، اور انہیں ہر حالت میں دشمن قرار دے کر دشمنوں ہی کے حوالے کیے رکھنے کا ہم نے تھی کہ لیا ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ تخت نشان کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ حالات میں تبدیلی محض خواہشات اور اپیلوں یا فتوؤں سے نہیں آیا کرتی، اس کیلئے عملاء کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس میں ”پچھ کرنے“ کے نالگزیر تقاضوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

بات ڈرا درونکل گئی ہے لیکن غیر متعلقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ کرمل امامؑ کی شہادت کو اس پس منظر سے الگ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اسی صورتحال میں اصلاح، توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے پر اس رویے کو پسندنہ کرنے والوں کی امہما پسندی کا شکار ہوئے ہیں۔ دوسری طرف داتاچنج بخش کے عرس کے موقع پر خودکش حملے کے المناک واقعہ کو یکچھ لیجھے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار پر اس سے قبل بھی خودکش حملہ کئی بے گناہ لوگوں کی جان لے چکا ہے اور اب اگرچہ پولیس کی مستعدی اور حفاظتی نظام کے باعث دربار کے اندر تک خودکش حملہ آور کی رسائی نہیں ہو سکی مگر وہ اپنے مقصد میں بہر حال کامیاب ہوا ہے کہ اس نے حضرت سید علی ہجویریؒ کے عرس کے زائرین کو وشاہانہ بنایا ہے اور بہت سے لوگوں کی قیمتی جانیں لے لی ہیں۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اور حضرت سید عبد اللہ شاہ غازیؒ کے مزارات پر ہونے والے خودکش حملوں کے بعد سے فرقہ وارانہ رنگ دے کر ملک میں بریلوی دیوبندی کشمکش کو ہوادیے کی جو ہم چلانی گئی تھی اس کا غبار ابھی زمین پر نہیں بیٹھنے پایا تھا کہ لاہور اور کراچی کے ان تازہ دھمکوں نے ملک بھر کے عوام کو دل گرفتہ کر دیا ہے۔

بھلا ہو تو ہمیں رسالت کے قانون کا کہ ناموس رسالتؐ نے ایک بار پھر پوری قوم کو متوجہ کر دیا ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو خانہ جنگی میں بدلنے کی کوششیں دم توڑ گئی ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ تو ہمیں رسالتؐ کے قانون کے حوالے سے رونما ہونے والی صورتحال نے عالمی قوتوں کے بہت سے مخالفوں کو دور کر دیا ہے۔ مثلاً

- دین کے ساتھ بے چک وابستگی اور ناموس رسالتؐ پر کٹ مرنے کا جذبہ ان کے نزدیک شدت پسندی اور انتہا پسندی ہے جسے انہوں نے دیوبندیوں کے کھاتے میں ڈال رکھا تھا اور انہیں کارنر کرنے کیلئے فرقہ وارانہ کشمکش کے فروع کو عالمی استعمار نے اپنا ہدف بنالیا تھا۔ مگر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اگر ناموس رسالتؐ پر کٹ مرنے اور دین کے ساتھ بے چک وابستگی کا نام انتہا پسندی اور شدت پسندی ہے تو اس شدت پسندی میں

- پاکستان کا کوئی مسلمان اور کوئی مذہبی فرقہ دوسرے سے کم نہیں ہے۔
- ”صوفی اسلام“ اور ”مولوی اسلام“ میں تفریق کر کے صوفی اسلام کو قابل قول سمجھا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ جzel (ر) پر دیز مشرف کی سرپرستی میں صوفی اسلام کے فروع کیلئے اعلیٰ سطحی کونسل بھی قائم کر دی گئی تھی مگر حالیہ واقعات نے بتادیا ہے کہ صوفی اسلام اور مولوی اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس خود ساختہ فرق کا سہارا لینے کی مغربی کوششیں خود کو فریب دینے کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتیں۔
  - دینی حمیت و غیرت کو مولوی کے ساتھ مخصوص قرار دے دیا گیا تھا مگر وکلاء، سیاست دانوں اور تاجروں نے ناموس رسالت کے حوالے سے جس حوصلہ و حراثت اور محبت و عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے اس نے بہت سے لوگوں کی یہ غلط فہمی بھی دور کر دی ہے کہ مولوی کے علاوہ باقی طبقات کی دین کے ساتھ کشمکش کو توڑا جاسکتا ہے اور مولوی کے خلاف نفرت پھیلا کر اس معاشرے میں دین کے کردار کو کمزور کیا جاسکتا ہے۔
  - ہمارے خیال میں جس طرح جنوبی ایشیا کے بارے میں عالمی منصوبوں کے ”ماسٹر مائند“ کیلئے ایسے لوگ گوارنیں ہیں جو افغانستان اور پاکستان کے درمیان پل بن سکتے ہیں اور ملک کے اندر بھی مصالحت و مفاہمت کا کردار ادا کر سکتے ہیں، اسی طرح دینی قوتوں کا کسی عنوان پر اتحاد بھی ان کیلئے قابل برداشت نہیں ہے۔ جو قوتیں دینی حلقوں کے اتحاد کو اپنے ایجنسی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں اور اعتدال و توازن اور صلح و مفاہمت کی بات کرنے والی شخصیات کو ”کباب میں ہڈی“ تصور کرتی ہیں وہی قوتیں کرتل امام کی شہادت اور حضرت سید علی ہجویریؑ کے عرس پر خود کش حملے کی ذمہ دار ہیں۔ استعمال ہونے والے کوئی بھی ہوں، ان کا آپس میں تعارف و رابطہ بھی نہ ہو، اور خواہ انہیں اپنے استعمال ہونے کا شعور بھی نہ ہو، مگر استعمال کرنے والا ماسٹر مائند تو ایک ہی ہے جو دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والوں کو صاف نظر آ رہا ہے۔
- بہر رنگ کہ خواہی جامد می پوش  
من اندازِ قدت را می شناسم

## مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۱ء

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۳ فروری ۲۰۱۱ء کی خبر کے مطابق صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری نے جاپان کے تین روزہ سرکاری دورے کے موقع پر جاپانی سرمایہ کاروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”پاکستان میں کی جانے والی سرمایہ کاری سے دہشت گردی کے خاتمه میں مدد ملے گی اور عالمی امن کو تقویت حاصل ہوگی۔“

جبکہ تک پاکستان میں سرمایہ کاری کیلئے یہ ورنی سرمایہ کاروں کو توجہ دلانے کا مسئلہ ہے یہ ملکی معیشت کی ایک اہم

ضرورت ہے اور اس کیلئے حکمرانوں کی کوششوں کو ہم سراہتے ہیں لیکن سرمایہ کاری کو دہشت گردی کے ساتھ نہی کرنے کی بات ہمارے لیے ہمیشہ ناقابل فہم رہی ہے۔ دراصل عالمی قوتوں کو یہ مغالطہ ہے کہ جسے وہ دہشت گردی قرار دیتے ہیں اور اس کے خلاف جنگ کا بغل بجا کر انہوں نے اپنے سارے وسائل میدان جنگ میں جھوٹ دیے ہیں، اس کی اصل وجہ غربت ہے اور یہ فقر و فاقہ کے مارے ہوئے لوگ ہیں جو دولت کی تلاش میں دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہیں، اس لیے اگر پاکستان میں سرمایہ کاری کے ذریعے روزگار کی فراہمی کی صورت عام ہو جائے اور لوگوں میں خوشحالی کا ماحول پیدا کیا جاسکے تو اس مبینہ دہشت گردی کا زور کم کیا جاسکتا ہے اور لوگوں کو دہشت گردی اختیار کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔

ہم نے متعدد بار یہ عرض کیا ہے کہ یہ بات خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ مبینہ دہشت گردی کے اسباب میں غربت کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں ہے بلکہ جس عمل کو دہشت گردی قرار دے کر اس کے خاتمہ کیلئے عالمی قوتیں کو شاہ ہیں اس کی وجہ عقیدہ و ثقافت ہے اور عالمی قوتوں کی وعدہ خلافیاں اور فریب کاریاں اس کا اصل سبب ہیں۔ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی معاشرتی زندگی کو اپنے عقیدہ و ثقافت کے مطابق استوار کرنا چاہتے ہیں اور ریاتی و معاشرتی معاملات سے مذہب کی بے دخلی کے مغربی فلسفہ کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، جبکہ ان کے ساتھ تاریخی یہ سب سے بڑی دھاندی ہوئی ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف ان کی قوت سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد جب چہار افغانستان کے اصل ایکٹنے لیجن ملک میں نفاذ شریعت کو بروئے کار لانے کا مرحلہ آیا تو مغربی قوتوں نے نہ صرف انہیں یہ حق دینے سے انکار کر دیا بلکہ مغربی ممالک پوری قوت کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑے۔ اس شرمناک دھاندی کے رد عمل میں افغانستان کے لوگ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں جبکہ اردو گرد کے بہت سے گروہوں نے غصے اور نفرت سے بھرپور اسی رد عمل میں ہتھیار اٹھا لیے ہیں جسے دہشت گردی قرار دے کر ان کے خلاف عالمی سلطھ پر جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ان کے طریق کار سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس کیلئے اس صورتحال کے اصل اسباب و عوامل پر پر ڈال کر ہتھیار اٹھانے والے گروہوں کے جذبات کو معاشری اسباب کے ساتھ نہی کرنا اور ان کے عقیدہ و ثقافت کو نظر انداز کر دینا سراسر انصافی اور ظلم کی بات ہے اور ہمارے خیال میں مغربی ملکوں کو مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اب تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہونے کی ایک وجہ اصل حقائق اور اسباب کو ڈھنائی کے ساتھ نظر انداز کر دینا بھی ہے۔

صدر پاکستان سے ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ مبینہ دہشت گردی کو غربت کے ساتھ نہی کر کے معاشری سہولتوں کی فراہمی کو اس مسئلہ کا حل بتانا مغرب کی خود فریبی اور مغالطہ کاری ہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حکمرانوں کو توکم از کم اس فریب کاری کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں سردے کر معروضی حقائق سے منہ نہیں پھیرنا چاہیے۔ پاکستان کے حکمرانوں سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہے کہ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، ان کا اصل مسئلہ غربت اور افلas نہیں بلکہ عقیدہ و ثقافت ہے اور ان کے عقیدہ و ثقافت کو تحفظ و احترام فراہم کیے بغیر مبینہ دہشت گردی کے کمزور پڑنے کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہے، اس حقیقت کو عالمی طائفیں اور ان کے ہمنواجتنی جلدی سمجھ لیں خود ان کیلئے بہتر ہو گا۔

## الشيخ اسامہ بن لادن شہید

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۶ مئی ۲۰۱۱ء

اشخ اسامہ بن لادن شہید کا نام پہلی بار افغانستان کی پہاڑیوں میں جہاد افغانستان کے دوران سنا جب افغانستان میں روسی افواج کی آمد اور سو شلاست نظریات کے تسلط کے خلاف افغانستان کے مختلف حصوں میں علماء کرام اور مجاهدین آزادی نے علم جہاد بلند کیا اور افغانستان کی آزادی کی بھائی اور اسلامی شخص کے تحفظ کیلئے میدانِ کارزار میں سرگرم ہو گئے۔ ابتداء میں یہ مجاهدین کسی پرسی کے عالم میں لڑتے رہے حتیٰ کہ پرانی بندوقوں اور یوسیدہ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ یوتلوں میں صابن اور پٹرول بھر کر ان دستی بمبوں کے ساتھ روی ٹیکلوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ دنیا انہیں دیکھ کر مجنون سمجھتی رہی، چنان کے ساتھ سر نکرانے اور خودش کرنے کے طعنے دیتی رہی مگر ان خدا مست لوگوں نے کسی طعنے اور الزام کی پر او کیے بغیر سر نکرانے کا یہ عمل جاری رکھا۔ مجھے وہ دور اچھی طرح یاد ہے جب شیر افوالہ لاہور کے ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا حمید الرحمن عباسی شب وروز محنت کر کے آتا، چینی اور دیگر ضروریات جمع کرتے اور جب ٹرک کے برابر سامان ہو جاتا تو اسے افغانستان پہنچانے کا بندوبست کرتے۔

پھر جب دنیا کو یہ نظر آئے لگا کہ یہ چٹان سے سر نکرانے والے آسمانی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اور چٹان کے اپنی جگہ سے سر کنے کا امکان پیدا ہوتا جا رہا ہے تو پوری دنیا اس طرف متوجہ ہو گئی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو سرد جنگ میں سوویت یوینین کو شکست دینے کے خواہاں تھے، وہ لوگ بھی تھے جو گرم پانیوں اور خلیج عرب تک سوویت یوینین کی رسانی کو روکنا چاہتے تھے، اور وہ لوگ بھی بڑی تعداد میں تھے جنہوں نے قرآن و حدیث میں جہاد کی اہمیت و فضیلت کا سبق پڑھ کرھا تھا اور تاریخ میں مجاهدین کے کارناتاکے پڑھ پڑھ کر ان کے دل جہاد میں حصہ لینے کیلئے پختے تھے مگر کوئی عملی میدانِ دھکائی نہیں دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان میں الاقوای کشمکش کا بہت بڑا میدانِ بن گیا اور مختلف ملکوں اور طبقات کے لوگ جہاد کے اس عمل میں مشغول پائے جانے لگے۔ افغان مجاهدین کی خلاف جماعتیں وجود میں آئیں، ان کے اتحاد تشکیل پائے، بیرونی قوتوں سے ان کے رابطے ہوئے، ہتھیاروں اور رقوم کی ریل پیل ہوئی اور افغانستان مجاهدین کی بھرتی اور ٹریننگ کا عالمی مرکز بن گیا۔

اس دوران میرا بھی افغانستان آنا جانا رہتا تھا، بہت سے مورچوں میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ لڑنا تو میں سرے سے نہیں جانتا اور نہ ہی کسی ہتھیار کی ٹریننگ حاصل کر سکا۔ ایک بار کسی انٹرویو میں مجھ سے سوال ہوا کہ کیا آپ ہتھیار چلانا جانتے ہیں؟ میں نے قلم ہاتھ میں کپڑ کر کہا کہ یہ میرا ہتھیار ہے اور اس کو چلانا بحمد اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرا مورچوں میں جانا و مقاصد کیلئے ہوتا تھا۔ ایک یہ کہ اس سے مجاهدین کی حوصلہ افزائی ہوتی اور دوسرا اس لیے کہ وہاں سے تازہ معلومات حاصل کر کے قلم کے ذریعے اپنے قاریئن کو ان سے آگاہ کرتا تھا۔ ان دونوں میں جمعیت علماء کے اگر گن ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور کا چیف ایڈیٹر تھا اور ایسے مقامات پر آنے جانے کیلئے میرا بڑا انتہا ہی ہوا تھا۔ میں وقتانوفتا کسی مورچے میں جاتا، ایک دو دن رہتا اور واپسی پر اپنے مضامین کے ذریعے تاثرات و معلومات قاریئن

کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس دور میں میرے بیویوں مضامین، ہفت روزہ ترجمانِ اسلام اور ملک کے دیگر اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔

جہادِ افغانستان میں عربِ ممالک سے ہزاروں نوجوان شریک ہوئے، ان کے اپنے کمپ تھے، ان میں بھی جانے کا موقع ملتا تھا۔ اس دوران وہی سنکہ سعودی عرب کے ایک انتہائی متمول اور مقتندر خاندان کا ایک نوجوان جہاد میں عملًا شریک ہے اور جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے دونوں محاذوں پر دادِ شجاعت دے رہا ہے۔ اس نوجوان کا نام اسماء بن لادن ہے اور وہ شہزادگی کی زندگی ترک کر کے خاکساری کے ذوق کے ساتھ شب و روز کے اعمال میں مصروف ہے۔ یہاں نہیں کہ اس دوران اسے دیکھایا ہیں لیکن اس کی شجاعت اور ستاوتوں کے واقعات مسلسل سننے میں آتے رہے تا آنکہ عالمی میڈیا یا کبھی اسے ایک عظیم مجاهد اور فریڈم فائز کے انداز میں جہادِ افغانستان کے ہیر و کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

افغانستان سے سوویت یونین کی افواج کی واپسی، جہادِ افغانستان کے اس دور کا اختتام، سوویت یونین کے ہکمرنے کا تاریخی عمل، اور جہادِ افغانستان کے منطقی نتیجے کو سبوتوڑ کرنے کی سازشیں ایک مستقل موضوع بحث ہیں جس کا صرف ایک پہلو یہ ہے کہ افغان مجابدین اور ان کے ساتھ جہاد میں شریک دنیا بھر کے مجابدین کے بارے میں عالمی پر ایکٹے کارخانہ طرح موڑ دیا گیا کہ انہوں نے دراصل امریکہ کی جنگِ لڑی ہے اور سرد جنگ میں سوویت یونین کو نکست دینے میں امریکہ کے ہاتھوں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی دور کی بات ہے ابھی افغانستان میں مجابدین کی حکومت کی تشکیل کے مختلف فارموں لے آزمائے جا رہے تھے اور طالبان اور القاعدہ کا دور تک کوئی وجود بلکہ آثار تک نہیں تھے، اسلام آباد میں ہائی پاسو کے چند انشوروں کے ساتھ ایک مجلس میں میری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ افغان مجابدین کو امریکہ نے تیار کیا تھا، اس نے انہیں اپنے مقصود کیلئے استعمال کر کے چھوڑ دیا ہے اور افغان مجابدین نے امریکہ کی جنگِ لڑی ہے۔ جبکہ میرا موقف یہ تھا کہ جہادِ افغانستان کا آغاز افغان علماء اور مجابدین نے اپنے ملک کی خود مختاری اور نظریاتی شخص کیلئے کیا تھا اور کم و بیش تین برس تک وہ دیسی ہتھیاروں کے ساتھ فاقہِ سمتی کے عالم میں لڑتے رہے۔ جبکہ امریکہ اپنا مفاد دیکھ کر اس میں شریک ہوا اور پھر ساری دنیا اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس لیے اس جنگ میں مجابدین کے اهداف مختلف تھے اور امریکہ کے اہداف الگ تھے۔ ان کے درمیان اشتراکِ عمل تو ہوا جس میں امریکی کمپ نے اپنا تھوڑا کھاد دیا کہ اپنے مقاصد حاصل کر لیے مگر مجابدین کے مقاصد و اہداف کو سبوتوڑ کرنے میں مصروف ہے۔

جب گفتگو کچھ آگے بڑھی تو میں نے ان دوستوں سے کہا کہ اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیں۔ اگرستقبل کے پروگرام میں یہ مجابدین امریکی ایجنسی کا حصہ بن گئے تو میں تسلیم کرلوں گا کہ انہوں نے امریکہ کی جنگِ لڑی ہے۔ لیکن اگر آنے والے دور کا نقشہ اس سے مختلف ہو اور مجابدین نے امریکی ایجنسی کے میں فٹ ہونے سے انکار کر دیا تو آپ دوستوں کو میری بات ماننا ہوگی کہ اس جنگ میں مجابدین کے اپنے اہداف و مقاصد تھے اور وہ امریکہ کی جنگِ لڑنے کی بجائے اپنی جنگِ لڑ رہے تھے۔ البتہ جنگ کی ترجیحات کے تعین میں وہ امریکہ سے بازی ابھی تک نہیں جیت پائے کہ امریکہ نے اپنی طاقت، الابنگ، ڈپلومی اور میڈیا کے ذریعے انہیں سرِ دست کا رنگ کر دیا ہے۔

اس کے بعد القاعدہ سامنے آئی اور طالبان کا دور دنیا نے دیکھا۔ وہی مجاہدین جو سوویت یونین کے خلاف جہاد میں بظاہر امریکہ کے شانہ بثانہ تھے اب امریکہ کے سامنے کھڑے تھے اور تمام تر جاہ و جلال اور شان و شوکت کے باوجود امریکہ کا سانس پھولتا سب کو دکھائی دے رہا تھا۔ اشخ اسامہ بن لادن شہیدِ جن دنوں جلال آباد افغانستان میں مقیم تھے میری ان سے ملاقات ہوئی، میں نے ایک رات ان کے کیمپ میں گزاری، ان سے انٹرو یو یا جو قومی اخبارات میں انہی دنوں شائع ہوا۔ خفیہ ادارے کافی عرصہ تک میرا پیچھا کرتے رہے کہ آپ وہاں تک کیسے پہنچے؟ مگر میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میں جنسٹ ہوں میرے اس سفر کی ساری روپورٹ اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اور میں نے کوئی خفیہ کام نہیں کیا۔ البتہ اپنے سفر کے ذریعہ بتانے کا پابند نہیں ہوں اور نہ ہی بتاؤں گا۔

اس دوران جب ”القاعدہ“ تسلیکیل پائی تو مجھ سے بھی رابطہ کیا گیا میرے کچھ تحقیقات تھے۔ میں جہادِ افغانستان کے منطقی شائع کی تکمیل اور افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے قیام و استحکام سے پہلے عالمِ اسلام میں کسی بھی اور جنگ کو قبل از وقت سمجھتا تھا اور اپنی اس رائے پر اب بھی قائم و مطمئن ہوں۔ اس لیے میں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی البتہ دنیا کے کسی بھی حصے میں جو مجاہدین خلوص کے ساتھ دین کی سربنندی اور اپنے اپنے ملک کی آزادی و خود مختاری کیلئے میدانِ عمل میں ہیں، میری دعائیں اور نیک تمنائیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔

اشخ اسامہ بن لادن شہیدِ عالم بالخصوص عالمِ عرب میں غالباً استعماری ایجاد کے خلاف مراجحت کی علامت تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اس کیلئے پوری قوت کے ساتھ جنگ لڑی۔ ان کے طریق کار اور تزییفات سے اختلاف ہو سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ مجھے بھی تھا لیکن ان کے خلوص، ایثار، جدوجہد حبِ دینی، استقامت، عزم و حوصلے اور مسلسل قربانیوں سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس پر وہ ہر نیک دل مسلمان کے سلامِ محبت و عقیدت کے حقدار ہیں۔ جہاد کے اس مقدس عمل میں کون کون لوگ کہاں سے شریک ہوئے، ان کی قربانیوں اور جہاد و ایثار کو بکھیں تو بلاشبہ یہ اس دور میں اسلام کے اعجاز اور جہاد کی کشش کا خوبصورت اظہار ہے۔ میں اس نوجوان کو بھی نہیں بھول سکتا جو ایک بار مجھے افغانستان کے ایک مورچے سے واپس پاکستان چھوڑنے آ رہا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا، عمر زیادہ سے زیادہ سولہ ستر سال ہو گی، میں نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو؟ بتایا کہ مدینہ منورہ کا باشندہ ہوں۔ دریافت کیا کہ کب سے بیہاں ہو؟ جواب دیا کہ دوسال سے ہوں۔ پوچھا کہ کب واپسی کا ارادہ ہے؟ کہا کہ جہاد میں کامیابی کے بعد ہی واپس جاؤں گا یا نہیں شہید ہو جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ مدینہ منورہ چھوڑ کر بیہاں کیوں آگئے ہو؟ اس نے کہا اس لیے کہ جہاد بہاں ہو رہا ہے، اس کے بعد مجھے اس سے کوئی اور سوال کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

یہ نوجوان اسامہ بن لادن نہیں تھا لیکن اپنے جذبے اور قربانی کے حوالے سے وہ بھی ایک اسامہ ہی تھا، اس جیسے اسامہ بن لادن سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین کی صفوں میں موجود ہیں۔ اس لیے اسامہ شہید تو ہوا لیکن مر انہیں، کیونکہ وہ اب گوشت پوست کے کسی انسان کا نام نہیں رہا بلکہ حریت، جہاد اور استقامت کی علامت بن چکا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اسے جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور خلوص و ایثار کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو ہر جگہ کامیابی سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## اصل دہشت گرد کون؟

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۲ مئی ۲۰۱۱ء

میں کے پہلے ہفتے میں عام طور پر دو حربیت پسندوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ ایک سلطان ٹیپو شہید حس نے مشرقی ہند پر انگریزوں کی یلغار کا مسلسل مقابلہ کیا، بالآخر ۲۷ مئی ۹۹ء کو سر نگاہ پنجم کے محاصرے کے دوران جام شہادت نوش کیا اور اس کی شہادت کے بعد اس کی لاش پر کھڑے ہو کر انگریزی فوجوں کے کمانڈرنے کہا تھا کہ ”آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔“ دوسرا ذکرہ میں کے پہلے ہفتے کے حوالے سے تاریخ میں شہادتے بالا کوٹ کا کیا جاتا ہے کہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید جب اپنے جہادی مرکز کو شہیر منتقل کرنے کے ارادے سے ہزارہ کے راستے شہیر کی طرف سفر کر رہے تھے تو ۲۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالا کوٹ کے مقام پر انہوں نے سکھ فوجوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ جبکہ اب ایک تیسرا حربیت پسند اسامہ بن لادن شہید ہی ۲۰ مئی ۲۰۱۱ء کو مبینہ طور پر ایک آباد میں امریکی چھاپہ ماروں کے ہاتھوں شہید ہو کر میں کے شہداء کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔

اسامہ بن لادن سعودی عرب کے ایک متول خاندان بن لادن فیصلی کا چشم و بصر غیر تھا۔ یہ خاندان سعودی عرب میں آل سعود کے شاہی خاندان کے بعد سب سے زیادہ متول اور با انتہی بحاجتی اور اس خاندان کی تجارتی چیل پہل آج بھی وہاں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ افغانستان میں سوویت یونین کی فوجوں کے تسلط کے خلاف جب وہاں کے علماء کرام اور عوام نے علم بغاوت بلند کیا تو انہیں ایک مسلمان ملک کی خود مختاری اور نظریاتی شخص کی بجائی کے ساتھ ساتھ جہاد کے عمل کے احیا کے حوالے سے بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ یہ وہ دور تھا جب افغانستان میں مختلف گروپ سوویت افونج کی مداخلت کے خلاف جہاد کے عنوان سے جنگ کا آغاز کرچکے تھے اور پاکستان کے سرکردہ علماء کرام بالخصوص حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی، حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا عبدالحق آف کوڑہ منتک پوری بلند آنگلی کے ساتھ ان کی اس جنگ کو شرعی جہاد قرار دے کر ان کے حق میں مسلسل آواز بلند کر رہے تھے۔

مولانا محمد عبداللہ درخواستی نے، جو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں شاگردوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقة رکھتے تھے، پورے قبائلی علاقوں کا تقاضیلی دورہ کر کے لوگوں کو جہاد افغانستان کی پشت پناہی اور اس میں شریک ہونے کیلئے تیار کیا۔ جبکہ مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرحد (اب خیر پختون خوا) کے بڑے شہروں میں پیلک جلے منعقد کر کے کھلم کھلا اس موقف کا اظہار کیا کہ افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی آزادی کی نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں، اس لیے کہ سوویت یونین کی الگی منزل پاکستان اور بلوچستان کا ساحل سمندر ہے۔ مولانا مفتی محمود نے اس نظرے کے ساتھ جہاد افغانستان کیلئے پاکستان بھر میں ایک مستقل مجاز گرم کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم سوویت یونین کی یلغار سے بچتے بچتے امریکی یلغار کی زد میں آگئے ہیں اور اپنے اردو گرد مغربی استعمار کے بنائے ہوئے حصาร سے نکلنے کا کوئی راستہ سرداشت ہمیں دکھائی نہیں دے رہا۔

اسی دوران بہت سے عرب علماء بھی جہاد افغانستان کی حمایت میں سامنے آئے اور ان کی ترغیب پر ہزاروں عرب

نوجوانوں نے افغان مجاهدین کے ساتھ شریک جہاد ہونے کا راستہ اختیار کیا۔ انہی میں ایک نوجوان اسمامہ بن لادن شہید ہو چکے جو شہزادگی کی زندگی سے دستبردار ہو کر خاک نشینی کے ماحول میں آئے اور افغانستان کی پہاڑیوں میں جہاد کیلئے اپنی جان کے ساتھ ساتھ مال بھی وقف کر دیا۔ ان کے ساتھ سیکٹروں ملکہ بڑا روں نوجوان آئے اور عرب مجاهدین کے نام سے مجاهدین کا ایک مستقل شخص سامنے آیا جس میں سعودی عرب کے علاوہ دیگر عرب ممالک کے لوگ بھی شامل تھے اور افغان مجاهدین کے ساتھ ساتھ پاکستانی مجاهدین اور عرب مجاهدین کی سرگرمیاں جہاد افغانستان کا مستقل حصہ بن گئیں۔

افغانستان سے سوویت یونین کی فوجوں کے انخلا تک امریکہ ان مجاهدین کی پشت پر تھا، پاکستان بھی ساتھ تھا، عرب ممالک بھی پشت پناہ تھے اور دنیا بھر کے ممالک کی حمایت انہیں حاصل تھی۔ مگر سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے ساتھ ہی یہ مجاهدین خود اپنے جمایتوں اور پشت پناہوں کی نظر میں معوق ہو گئے اور ان سے جان چھڑانے کیلئے انہیں نظر انداز کر دینے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ انہیں عالمی سطح پر مجاهدین اور حریت پندوں کا جو اعزاز حاصل تھا وہ ان سے واپس لے کر ان کیلئے دہشت گردی کا تمغہ جو یورپ کیا اور ان کے مستقبل کا کوئی ایجادنا طے کرنے کیلئے ان کی سرپرستی اور رہنمائی کرنے کی بجائے انہیں تباہ اور آزاد چھوڑ دیا گیا۔ ہماری سوچی بھی رائے ہے کہ اگر جہاد افغانستان کے حمایتی ممالک اور قویں باخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان مجاهدین کے مختلف گروپوں کو تباہ چھوڑ دینے کی بجائے ان کے قائدین کو آج ہی صورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ لیکن شاید بعض قویں یہی کچھ چاہ رہی تھیں جبکہ پوری دنیا کو اس کے تاثرات بھکٹنا پڑ رہے ہیں۔

عرب مجاهدین نے اپنے لیے ایک راستہ منتخب کر لیا کہ وہ عرب ممالک میں مغربی ممالک کی افواج کی موجودگی اور اس کے نتائج و عاقب کا سامنا کریں گے اور جیسے افغانستان میں سوویت یونین کے تسلط کے خاتمہ اور افواج کی واپسی کیلئے انہوں نے جہاد کیا ہے اسی طرح عرب ممالک میں مغربی ممالک کی فوجوں کی موجودگی اور مغربی بلاک کی پالیسیوں کی بالادستی کے خلاف جہاد کریں گے۔ اس جذبہ اور عزم کو انہوں نے ”القاعدہ“ کا نام دیا اور اس کی قیادت کیلئے شیخ اسمامہ بن لادن شہید گو منتخب کر لیا گیا۔ شیخ اسمامہ نے اس مقصد کیلئے خود کو اپنے تمام ترسوں میں سمیت وقف کر دیا اور زندگی بھراں کیلئے سرگرم عمل رہے۔ انہیں اس مشن کیلئے ٹیم اور رفقہ بھی مل گئے۔ ان کی ترجیحات اور طریق کار سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں خود میرے تحفظات بھی تھے اور یہی کہ افغانستان میں مجاهدین کی حکومت کے قیام اور اس کے استحکام تک کم از کم دس سال تک افغانستان میں ایک اسلامی حکومت کے قیام اور اس کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے تک سب ہی خواہوں کو اپنی توجہ اسی لکنے پر مرکوز رکھنی چاہیئے تھی مگر ایسا نہ ہو سکا۔

اسمامہ بن لادن شہید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد تھا جبکہ آج تک عالمی سطح پر دہشت گردی کی کوئی تعریف طے نہیں کی گئی اور مغربی قوتوں کے موجودہ طرز عمل نے دہشت گردی، تحریک آزادی اور حریت پسندی کو گذشتہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس فضائی ہر شخص آزاد ہے کہ جس کوچا ہے دہشت گرد قرار دے دے۔ اس افتراقی میں اسمامہ بن لادن کو دہشت گرد قرار دینے کی کوئی اصولی اور اخلاقی حیثیت نہیں، جو کچھ اس نے کیا ہے، وہ سب لوگ کر رہے ہیں، بلکہ اقوام متحده کا پرچم تھا میں مغربی ملکوں کی فوجیں بھی وہ سب کچھ کر رہی ہیں جس کا الزام اسمامہ بن

لادن شہید پر لگای جا رہا ہے۔

آج اگر کوئی بین الاقوامی کمیشن آزادی اور انصاف کے ساتھ تقابلی جائزہ لے سکے تو اس کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ بڑا ہشت گرد کون ہے اور موجودہ دور میں دہشت گردی کے اسباب و عوامل اور محکمات فراہم کرنے میں سب سے زیادہ کس کا ہاتھ ہے۔ اسامہ بن لادن کو جس ماحول میں شہید کیا گیا ہے اس سے متعلقہ سوالات روز بروز سنگین تر ہوتے جارہے ہیں مگر امن، سلامت، انسانیت اور اخلاقیات کے علمبرداروں کا یہ کردار تاریخ کے دامن سے کبھی مونہیں ہو سکے گا کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کی خود مختاری کو کھلے بندوں پامال کیا گیا اور شہید کیے جانے والے کی لاش کو اس کے ورثا کے حوالے کرنے کا عام سماں نہیں تھا پورا کرنے کا حوصلہ بھی شہید کرنے والوں میں نہیں پایا گیا۔ اللہ تعالیٰ جنت افراد میں شہید کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## ملی مجلس شرعی کی قراردادیں

روزنامہ پاکستان، لاہور ۵ جون ۲۰۱۱ء

اجلاس میں مندرجہ ذیل وو قراردادیں بھی منظور کی گئیں:

- افغانستان میں امریکہ اور اس کے چیفون کا ساتھ دینا، انہیں خفیہ معلومات مہیا کرنا، انہیں سامان رسد پہنچانا، اپنے ہوائی اڈے ان کے سپرد کرنا، ڈرون حملوں پر خاموش رہنا، ذلت آمیز شرائط پر مالی امداد قبول کرنا اور انہیں بلا قید و ایسا و بیزے جاری کرنا، یہ سب جزل (R) پرویز مشرف اور اس کے بعد موجودہ حکومت کے وہ اقدامات ہیں جنہوں نے پاکستان کی خود مختاری کا خاتمہ کر کے اسے امریکی کالونی بنانے کی راہ ہموار کی ہے۔ جبکہ سانحہ ایبٹ آباد نے تو کسی خوش فہمی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی اور پاکستان کی خود مختاری پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ عوام و خواص چنچ اٹھے ہیں۔ ہم ملی مجلس شرعی کے علماء کرام اس صورتحال کی پر زور مذمت کرتے ہیں اور موجودہ سیاسی و عسکری قیادت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ سے فی الفور دستبردار ہو جائیں جو در حقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ ہی کی ایک شکل ہے۔ اس سلسلہ میں امریکہ سے ہر قسم کا تعاون ختم کر دیں اور اپنے داخلی معاملات درست کرنے کی طرف توجہ دیں۔ ہمارے نزدیک آئندہ کسی ایسے سانحہ سے بچنے کی واحد موثر صورت یہ ہے کہ عوام امریکہ نواز قیادت کا بوجھ سر سے اتنا چھینگیں اور امریکی غلامی سے نجات کیلئے قومی خود مختاری کی بحالی کے ایک نکاتی ایجنٹے پر جمع ہو جائیں۔
- ملی مجلس شرعی کے سبھی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام کا یہ نمائندہ اجلاس بعض امریکی پادریوں کی

طرف سے علی الاعلان قرآن کریم جلانے، امریکی حکومت کے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے اور اس کے خلاف ایکشن نہ لینے کی بھروسہ مت کرتا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انتہا پسند اہل مغرب اور ان کے حکمران اسلام و مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں اور ان کے مقدسات کی بے حرمتی کر کے انہیں مشتعل کرتے ہیں تاکہ اگر وہ عمل ظاہر کریں تو ان کے خلاف انتہا پسندی اور دہشت گردی کا جھوٹا پروپگنڈا اکیا جاسکے۔ حالانکہ ان کا یہ طرز عمل خود گواہی دے رہا ہے کہ ان میں قوت برداشت موجود نہیں ہے اور وہ خود انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں۔ ہم مسلم نمائدوں کی حیثیت سے امریکہ کے متعصب اور جنونی پادریوں کی بھروسہ مت کرتے ہیں اور حکومت پاکستان سے پر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ آئی سی اور کے سربراہان اور اقوامِ متعدد کی جزوں اسلامی و سلامتی کو نسل کے ذریعے ایسے اقدامات کے سد باب کیلئے مؤثر قانون سازی اور ان پر فوری عمل درآمد کو تعمیق بنائے۔ اخلاص امریکی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مذکورہ دریدہ وہن پادریوں کو سخت سزا دے تاکہ آئندہ کسی کو مسلمانوں کی دل آزاری کی جرأت نہ ہو۔

----

## انتہا پسندی اور اس کی خود ساختہ تعریف

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۲ جولائی ۲۰۱۱ء

نیویارک سے شائع ہونے والے اردو اخبار ہفت روزہ ”پاکستان پوسٹ“ کا جو ان کا آخری شمارہ اس وقت میرے سامنے ہے اور اس میں انتہا پسندی کے حوالے سے شائع ہونے والی دو خبریں توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ امریکی کانگریس کی ”ہوم لینڈ سیورٹی گمینی“ نے گذشتہ دونوں اس مسئلہ پر انکو ایری کا اہتمام کیا کہ امریکہ کی چیلوں میں محبوس مسلمان قیدیوں میں انتہا پسندی کے رجحانات بڑھ رہے ہیں ان پر کیسے قابو پایا جائے؟ اس سلسلہ میں ٹیکس سے کانگریس کی ڈیموکریٹک خاتون ممبر شیلا جیکسن اور نیویارک ڈپارٹمنٹ آف کمیونیکیشن سرو سز کے سابق اسپکٹر برائے کریمینل ایلی جنس یونٹ مسٹر پیٹر ڈینلوے کا ایک مکالمہ بھی اس روپورٹ کا حصہ ہے جس میں مزز شیلا جیکسن کا کہنا ہے کہ مسیحی نوجوانوں میں بنیاد پرستی اور انتہا پسندی پر بھی نظر رکھی جا ہے کیونکہ وہ بھی امریکہ کی بدنای کا باعث بن سکتے ہیں۔ شیلا جیکسن نے ایک مسیحی نوجوان کا ذکر کیا جو استقطاب حمل کے مکنک کو اڑانا چاہتا تھا اور اس کا یہ اقدام اس امریکی قانون کے خلاف تھا جس کے تحت خواتین کو استقطاب حمل کا حق دیا جاتا ہے۔ شیلا جیکسن نے کہا کہ ہمیں وسیع ترقیات نظر سے سوچنا چاہیے اور تجزیہ بھی کرنا چاہیے کیونکہ عیسائی انتہا پسند بھی امریکہ کے نام کو خراب کر سکتے ہیں اور مسائل کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس پر مسٹر پیٹر ڈینلوے نے کہا کہ ان کے علم میں یہ بات قطعاً نہیں ہے کہ عیسائی انتہا پسندوں کو

غیر ملکی حکومتوں کی حمایت حاصل ہے یا انہیں بیرونی مالک سے نہیں ملتے ہیں۔ جبکہ شیلا جیکس نے کہا کہ فیصلہ طلب بات یہ ہے کہ ان کا منصوبہ امریکی قوانین کو سبوتاؤ کرنے کا ہے یا نہیں۔

جہاں تک امریکی جیلوں میں قول اسلام کے واقعات اور مجرموں کے اسلامی تعلیمات کے ذریعے جرم سے اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی بات ہے اس کار بحاجان بہت پرانا ہے جو روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ سیاہ فام امریکی مسلموں کے معروف لیڈر مالکم شہباز شہید نے بھی جیل میں اسلام قبول کیا تھا۔ یہ نصف صدی پہلے کا قصہ ہے جب وہ مالکم لٹل کے نام سے چوروں کی ایک ٹولی کے طور پر جیل میں تھے اور عالیجہ محمد سے ملاقات کے دوران ان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا، پھر مالکم شہباز کے نام سے ایک مبلغ اور داعی اسلام کے طور پر ان کے ساتھ شریک کار ہو گئے تھے۔ عالیجہ محمد خود بھی مسلم تھے اور اس بات کے داعی تھے کہ امریکہ میں افریقہ سے لاکر آباد کیے جانے والے سیاہ فاموں کی آشیت مسلمان تھی اور انہیں زبردستی سمجھی بنایا گیا تھا اس لیے انہیں اسلام کی طرف واپس لوٹ جانا چاہیے جو ان کا حاصل نہ ہب ہے۔ مگر عالیجہ نے اس کیلئے نبوت کا دعویٰ ضروری سمجھا اور بعض من گھڑت عقائد بھی اسلام میں شامل کر دیے جس سے مذہب کا حلیہ بگڑ کر رہا گیا۔

مالکم شہباز شہید نے کچھ عرصہ عالیجہ محمد کے ساتھ ان کے دست راست کے طور پر کام کیا مگر حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے دوران انہیں اصل اسلامی عقائد سے آگاہی حاصل ہوئی تو انہوں نے عالیجہ محمد کے من گھڑت اسلام سے توبہ کر کے ۱۹۶۳ء میں اصل اسلامی عقائد اختیار کر لیے۔ مگر اس کے صرف ایک سال بعد ۱۹۶۵ء میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ نیویارک کے علاقے میں پھیل میں ”مالکم شہباز شہید مسجد“ کے نام سے ان کا مرکز آج بھی کام کر رہا ہے جہاں مجھے ایک پار حاضری کا موقع مل چکا ہے۔

آج مالکم شہباز شہید کے ہزاروں بلکہ لاکھوں پیر و کار امریکہ کے مختلف حصوں میں موجود ہیں اور اسلامی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہیں اور اس سب کچھ کی بنیاد جیل پر ہے کہ انہوں نے جیل میں اسلام قبول کیا اور ان کا رخ جرم سے اصلاح کی طرف تبدیل ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ سے امریکی جیلوں میں یہ بحاجان بڑھتا جا رہا ہے کہ مسلمان قیدی دینی تعلیمات پر عملدرآمد کی طرف رجوع کر رہے ہیں، ان میں نمازوں سے کی پابندی فروغ پار رہی ہے اور حلال و حرام کے فرق کا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں میں قول اسلام کے واقعات بھی بڑھ رہے ہیں جسے امریکی حکام مسلم بنیاد پرستی کے فروغ کا عنوان دے کر اس پر پریشانی کا انہصار کر رہے ہیں اور اس کی روک تھام کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ مگر تیکساں سے امریکی کانگریس کی خاتون رکن شیلا جیکس نے بجا طور پر توجہ دلائی ہے کہ مذہب کی طرف واپسی اور مذہبی تعلیمات کے ساتھ کثمنٹ صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ مسیحیوں میں بھی فروغ پار رہی ہے اور ان میں بھی ایسے انتہا پسند پیدا ہو رہے ہیں جو شدت پسندانہ جذبات رکھتے ہیں اور ان کے اظہار کیلئے راستہ تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

دوسری روپ و سط ایشیا کے مسلمان ملک تاجکستان کے بارے میں ہے جہاں کی حکومت نے ۱۸ سال سے کم عمر نوجوانوں پر مساجد اور دیگر مذہبی عبادات گاہوں میں جانے پر پابندی لگادی ہے کیونکہ اس کے خیال میں اس سے مذہبی

انہا پسندی کے رجحانات کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ تاجکستان و سطی ایشیا کی ان مسلم ریاستوں میں سے ہے جو کم و بیش پون صدی تک کیونٹ سوویت یوینین کے زیر تسلط رہنے کے بعد جہاد افغانستان کے نتیجے میں آزاد ہوئی ہیں۔ اس ریاست میں مسلمان آبادی نوے فیصد ہے مگر دستوری طور پر یہ سیکولر ریاست ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ تقریباً پون صدی کا عرصہ اور کم از کم تین نسلیں جبڑی لامد ہبیت کا شکار رہنے کے بعد چوتھی نسل میں مذہب کے "جراثیم" بالکل ختم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بات کسی اور مذہب کے بارے میں تو چھوٹی ہے بلکہ مشاہدے میں بھی آجھی ہے مگر اسلام کے حوالے سے یہ سوچنا اسلام کے مزاج اور خاصیت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، جو جبڑی لامد ہبیت کا سائبان سر سے ہٹتے ہی پورے وسط ایشیا میں آشکارا ہو گیا ہے اور ساری دنیا نے یہ منظر دیکھا ہے کہ ریاتی جرودشہد کے ذریعے زیر زمین چلا جانے والا مذہب پھر سے زمین کے اوپر آگیا ہے اور سیکولر حکومتوں کو اس کا راستہ رکون کیلئے نوجوانوں کے مسجد میں جانے پر پابندی لگانا پڑ رہی ہے حتیٰ کہ تاجکستان کی حکومت نے قانون نافذ کر دیا ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کا کوئی نوجوان مسجد، چرچ یا کسی بھی دوسری مذہبی عبادات گاہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

مسئلہ امریکہ میں ہو یا تاجکستان میں یا پھر دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں ہو، یہ سوال سب جگہ مشترک ہے کہ جس چیز کو آج کی دنیا نے مذہبی انہا پسندی کا کاشٹل دے رکھا ہے اسے کیسے روکا جاسکتا ہے؟ اور یہ بات بھی سب میں مشترک ہے کہ ہر جگہ اس مقصد میں ناکامی ہو رہی ہے اور تمام تر کاؤنٹوں اور دفاعی اقدامات کے باوجود انسانی سوسائٹی میں مذہب کی طرف واپسی بتدریج چڑھتی جا رہی ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ آج کی دنیا مذہبی انہا پسندی اور دہشت گردی کی خود ساختہ تعریف طے کر کے اس کے پیچھے لٹھ اٹھائے پھر رہی ہے۔ مذہب اور مذہبی تعلیمات کی طرف واپسی کو بنیاد پرستی اور انہا پسندی، جبکہ استعماری قتوں کے جبر و استبداد کے خلاف رد عمل کو دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے حالانکہ یہ دونوں فطری چیزیں ہیں۔ مذہب انسان کی فطری، روحانی اور نفسیاتی ضرورت ہے جس سے انسانی سوسائٹی کو کسی صورت میں دور نہیں رکھا جاسکتا۔ اور جبر و استبداد کے خلاف رد عمل بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے اور اس بات پر کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ جبر کو روکے بغیر اس کے رد عمل کو روکنے کا عمل فطرت کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہوتا ہے۔

جن قتوں نے جبر، دباء، لائنگ اور پر اپیگنڈا کے زور پر دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنے کا منظر قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن آخر کب تک؟ اگر کیونٹ سوویت یوینین میں ایک گورباچوف موجود تھا جس نے فطری اور زمینی حلقات پر مصنوعی طور پر ڈالے گئے پر دوں کو چاک کر کے اصل منظر کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا تو کیا سرمایہ دارانہ مغرب کی کوکہ بانجھ ہو چکی ہے کہ اس میں ایک گورباچوف کو جنم دینے کی صلاحیت بھی نہیں رہی؟

## امریکی دھمکیاں اور قومی خود مختاری

روزنامہ پاکستان، لاپور --- ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء

وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس میں ملک کی سیاسی، مذہبی اور عسکری قیادت نے امریکی اذیمات کو بیک آواز مسٹر کرتے ہوئے امریکہ کی طرف سے ڈومور کے مطالبے کو قبول نہ کرنے کا اعلان کیا ہے جو ملک بھر کے عوام کے دلوں کی آواز ہے۔ اس طرح رائے عامہ کے رجحانات و جذبات نے ایک متفقہ قوی موقف کی حیثیت اختیار کر لی ہے جس پر آل پارٹیز کانفرنس طلب کرنے والے وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی اور کانفرنس کے تمام شرکاء مبارکباد کے سخت ہیں۔ کانفرنس میں ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی اور اس پر عملدرآمد کیلئے کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ بھی سامنے آیا ہے جو ایک اچھی پیش رفت ہے۔ لیکن اس سے قبل اسی مسئلے پر پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد اور اس پر عملدرآمد کیلئے قائم کی جانے والی پارلیمانی کمیٹی کا کارکردگی دیکھتے ہوئے ڈرسالگ رہا ہے کہ کہیں آل پارٹیز کانفرنس کی متفقہ قرارداد بھی پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کی طرح نادیدہ قوتوں کی مصلحتوں اور ترجیحات کی نذر نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اس عزم اور فیصلہ پر استقامت سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

جبکہ تک مذہبی قیادت کا تعلق ہے، ملک کے سرکردہ مذہبی قائدین اب سے ایک ہفتہ قبل لاہور میں جمع ہو کر اس موقف کا اظہار کر چکے ہیں۔ آج کی محل میں اس کی کچھ تفصیلات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ”ملی مجلس شرعی“ تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام پر مشتمل ایک مشترکہ علمی و فکری فورم ہے جو سالہاں سال سے مذہبی مکاتب فکر کے درمیان مشترکات کو اجاگر کرنے کیلئے کام کر رہا ہے۔ اس فورم کے تحت ۲۲ ستمبر کو لاہور میں ”اتصال امت کانفرنس“ کا اہتمام کیا گیا جو ملی مجلس شرعی کے سربراہ مولانا مفتی محمد خان قادری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جبکہ مجلس کے سیکرٹری جنرل پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے کانفرنس کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔

کانفرنس کے شرکاء میں جناب سید منور حسن، مولانا عبد الرؤوف فاروقی، مولانا احمد علی قصوری، مولانا عبد المالک خان، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، پروفیسر ساجد میر، صاحبزادہ محب اللہ نوری، مولانا محمد امجد خان، مولانا صاحبزادہ فضل الرحمن اشرفی، مولانا خان محمد قادری، مولانا محمد عینف جاندھری، پروفیسر حافظ محمد سعید، مولانا امیر حمزہ، مولانا قاری محمد یعقوب شیخ، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، مولانا قاری جیل الرحمن اختر، مولانا ڈاکٹر حسین اکبر، سید اخخار حسین نقوی، مولانا عبد اللہ عفیف، ڈاکٹر فرید احمد پراجچ، مولانا مفتی محمد طیب، مولانا اللہ وسایا اور مفتی طاہر مسعود کے علاوہ بھرچونڈی شریف کے سجادہ نشین بزرگ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

شرکا کے اسامی گرامی سے ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس تمام مذہبی مکاتب فکر کے سرکردہ رہنماؤں پر مشتمل تھی اور ملک کی مذہبی رائے عامہ کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی۔ لیکن ملک کے میڈیا نے اس اعلیٰ طبقی نمائندہ کانفرنس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ میں بھی اس کانفرنس میں شریک تھا بلکہ ملی مجلس شرعی کے سینئر نائب صدر کی حیثیت سے کانفرنس کے متنظیمین میں سے تھا مگر کانفرنس سے اگلے روز کم و بیش نصف درجن قوی اخبارات دیکھنے کے باوجود مجھے کسی

معروف تویی اخبار میں اس کانفرنس کی خبر پڑھنے کو نہیں ملی، ممکن ہے کہ لوکل ایڈیشنز میں خبر شائع ہوئی ہو جنہیں میں نہیں دیکھ سکا۔ امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کے خاتمه کے بعد ”نیورالڈ آرڈر“ جاری کیا تھا، اس کی ایک باقاعدہ شق یہ تھی کہ عالم اسلام میں مذہبی قیادت اور مذہبی موقف کو کسی جگہ بھی قومی مظہر پر سامنے نہ آئے دیا جائے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے میڈیا کا یہ روایت اسی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد تمام مکاتب فکر کے سر کردہ مذہبی رہنماؤں کی اس قومی کانفرنس کے فیصلوں اور مختصر کارروائی کو اس کالم کے ذریعے قارئین کی خدمت

میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کانفرنس میں امریکی دمکتوں اور قومی خود مختاری کے بارے میں درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:

”ہم پاکستان کے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اس امر پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت بجرائی کیفیت میں ہے۔ عوام الناس قتل و غارت گری، دہشت گردی اور مصائب و مشکلات کا شکار ہیں۔ پاکستان کی قومی سلامتی خطرے میں ہے جس کا سب سے بڑا سب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افغانستان میں مسلح مداخلت ہے اور اب افغانستان میں وہ اپنی ہماری ہوئی جنگ پاکستان پر مسلط کرنا چاہ رہا ہے جس نے صور تحال کو مزید گھبیہ بنادیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حکمران بھی اس صور تحال کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار اور مفادات کیلئے امریکی آلہ کار بننا قبول کر لیا اور اب رفتہ رفتہ پوری قوم کو امریکی مفادات اور ان کے کروہ مزاممک بھیٹ چڑھانے کے درپے ہیں۔ چنانچہ آن کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے پالیسی یکسر ختم کر دی جائے، ڈرون حملے فوری طور پر بند کرائے جائیں، بیک و اٹر اور صیہونی و بھارتی ایجنسیوں کی دہشت گردانہ کارروائیوں کا نیٹ ورک توڑ دیا جائے، فوجی تربیت اور خییہ معلومات کے تبادلے کی آڑ میں بلاۓ گئے امریکی فوجیوں کو واپس بھجوایا جائے، پاکستان سے نیٹ فور سرکی سپلائی بند کی جائے، امریکہ کو دیے گئے فضائی اڈے عملاً خالی کرائے جائیں اور میڈیا کو ان تک رسائی دی جائے۔ نیز پاکستان دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد امریکی جنگ سے فی الفور الگ ہو جائے اور ان درون ملک کے ناراض عناصر سے باہمی مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے۔“

اتحادیین العلماء کے حوالے سے درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:

”ہم پاکستان کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء اس اعلان و اظہار کرتے ہیں کہ ہم سب ایک امت ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ ہم ایسے تمام اقدامات کی تائید کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں اتحاد و تفاق بڑھے، اور ایسے سب عوامل اور اقدامات سے لاحقی کا اظہار کرتے ہیں جن سے امت اور علماء میں انتشار و تنشیت پیدا ہو اور خلفشار بڑھے۔ بلاشبہ ہمارے درمیان فقہی و کلامی اختلافات

موجود ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے درمیان مشترکات بہت زیادہ ہیں جبکہ اختلافات کم ہیں۔ اور جو اختلافات ہیں انہیں گفت و شنید اور سنجیدہ و پروقار علمی ماحول میں زیر بحث لا یا جاسکتا ہے اور انہیں قاطع اخوت اور موجبِ فساد نہیں بننا چاہیے۔ ہم اتحاد یعنی العلماء کی پر زور حمایت کرتے ہیں تاکہ اس اتحاد کے ثابت اثرات عوامِ الناس تک پہنچیں۔ الہذا آج ہم سب اعلان کرتے ہیں کہ ہم بحیثیت مسلمان متعدد ہیں، آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی خاص فقہی یا کلامی مسئلہ سے ہماری وابستگی اسلامی اخوت اور بھائی چارہ کی نفی نہیں کرتی۔ ہم کسی فقہ کی فرقہ واریت اور عصیت کی حمایت نہیں کرتے اور باہم مل کر دین حنفی کی عظمت و سر بلندی، پاکستان میں نفاذ شریعت اور مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں احکام شریعت پر عمل کیلئے کوشش رہیں گے، اور علماء میں انتشار پیدا کرنے والوں کی کوششوں کو باہم مل کر اخلاص اور فراست سے ناکام بنائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کریں گے، اشتغال انگیز اور توہین آمیز تقریر و تحریر سے احتساب کریں گے اور ایسے اقدامات سے گریز کریں گے جن سے ہمارا اتحاد و اتفاق کو ٹھیک پہنچ۔ اور اپنی تمام علمی و فکری صلاحیتیں اصلاح معاشرہ، اعلاء کلمۃ اللہ اور اتحادِ امت کیلئے صرف کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس عزم و ارادے میں کامیاب فرمائے اور اپنے اس فرمان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔“

ملی مجلس شرعی نے مسلسل دو تین سال کی محنت سے ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتب فکر کے ۳۲۱ سرکرده علماء کرام کی جانب سے مرتب کردہ ۲۲ دستوری نکات کی موجودہ دور کے تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام سے دوبارہ توہین کرانے کے علاوہ موجودہ حالات کی روشنی میں ان میں ان ۱۵ کے لگ بھگ مزید متفقہ نکات کا اضافہ بھی کیا ہے، جو اسلام اپریل ۱۹۶۷ء کی جدوجہد میں ایک اہم علمی پیش رفت ہے۔ یہ نکات اگلے کالم میں پیش کیے جائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## افغان طالبان کا مختصر پیسِ منظر

روزنامہ پاکستان، لاپور ۳۱ جنوری ۲۰۱۲ء

طویل عرصہ سے اس خبر کا انتظار تھا جو آج پڑھنے کو ملی کہ امریکہ کے ساتھ مذاکرات کیلئے افغان طالبان قطر میں اپنا سیاسی دفتر قائم کر رہے ہیں اور اس مقصد کیلئے ان کے نمائندے قطر پہنچ چکے ہیں۔ امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ افغانستان پر فونکشی کے بعد جب طالبان حکومت کا جرکے ذریعے خاتمه کر دیا تھا آئولندن سے ہمارے ایک خود و مختتم بزرگ حضرت مولانا عتیق الرحمن سنجلی نے اپنے در بھرے مضمون میں دکھ کا اظہار فرمایا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ہم نے ایک مضمون میں ان سے گزارش کی تھی کہ ”سب کچھ ختم ہو گیا“ کا تاثر درست نہیں ہے بلکہ ہمارے خیال میں توکھیل

اب شروع ہوا ہے جس کے آخری تیجے کیلئے آپ بزرگوں کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔ ہم نے اس عرصہ کے بارے میں بھی اپنے اندازے کا ذکر کیا تھا کہ کم از کم سات آٹھ سال کا عرصہ اس کھیل کیلئے درکار ہو گا اس کے بعد آپ اگر یہ بات کہہ سکیں کہ ”سب کچھ ختم ہو گیا“ تو شاید ہم بھی آپ کی بات سننے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ ہمارے اندازے سے بات کچھ لمبی ہو گئی ہے جس کی وجہ شایدی یہ ہے کہ ”پاکستانی طالبان“ نے جذباتیت اور جلدی بازی کا مظاہرہ کر کے نہ صرف ”افغان طالبان“ کیلئے مشکلات پیدا کیں بلکہ اپنی جدوجہد کو بھی کنیفون ہن اور الجھنوں کی نذر کر دیا۔ ورنہ الگ الگ مجاز کھڑے کرنے کی وجہ ساری قوت افغان طالبان کی سپورٹ میں حکمت عملی اور تدریک ساتھ صرف ہوتی تو ہمارا پہلا اندازہ شاید غلط ثابت نہ ہوتا اور ”سیاسی مذاکرات“ کی خبر ہمیں چار پانچ سال پہلے ہی پڑھنے کو مل جاتی۔

میں نے اپنی زندگی کا پہلا سیاسی جلسہ ۱۹۶۱ء میں صدر ایوب خان مر حوم کی طرف سے سیاسی سرگرمیاں بحال ہونے کے بعد گوراؤالہ میں ساتھا۔ میر اطالب علی کا دور تھا اور یہ جلسہ میاں افتخار الدین مر حوم کی یاد میں تقریتی جلسے کے طور پر ہوا تھا، مولانا محمد اسماعیل سلفی نے اس کی صدارت کی تھی اور اس کے مقررین میں شیخ حسام الدین مر حوم اور آغا شورش کاشمیری مر حوم شامل تھے۔ آغا شورش کاشمیری جلسے کے آخری مقرر تھے اور انہوں نے صدر ایوب خان مر حوم کے مارش لاء کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خطاب کا آغاز اس جلسے سے کیا تھا کہ ”وہ اتنا عرصہ صدر ایوب بنے بنتھے رہے اور ہم صبر ایوب بنے بنتھے رہے۔“ آغا شورش کاشمیری مر حوم کا یہ خطاب نہ جملہ ایک ایسی تک کا انہوں میں گونج رہا ہے اور نائن المیون کے بعد افغانستان کے بعد امریکی اتحادی یا خار کے بعد سے ہماری کیفیت بھی کم و بیش یہی چلی آرہی ہے کہ ”ہم صبر ایوب بنے بنتھے رہے۔“

ہمیں یہ تو بہر حال یقین تھا کہ افغانستان پر یہ فون کشی بھی کامیاب نہیں ہو گی اس لیے کہ افراد اور گروہوں کو طاقت کے زور پر شکست دی جاسکتی ہے مگر قوموں کو شکست دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اور افغانستان میں طالبان کے بارے میں دنیا کو بھی مخالف طریقہ رہا ہے کہ یہ کوئی گروہ ہے جو اپنی بات پر اڑا گیا ہے اور اسے سزادے کراپنی بات منوائی جاسکتی ہے۔ مگر بڑی طاقتیں کویہ بات بنتھے میں ایک عشرہ صرف کرنا پڑا کہ طالبان کسی گروہ کا نام نہیں بلکہ افغان قوم کی ملی نیزت و محیت اور اسلام و شریعت کے ساتھ افغانوں کی والہانہ وابستگی نے طالبان کا عنوان اختیار کر رکھا ہے۔ بہر حال ”دیر آید درست آید“ کے مصدق قطر میں طالبان کے ساتھ سیاسی مذاکرات کی ابتدا ہو رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ (افغان) طالبان کا وجود عالمی سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے ان کے کردار کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔

افغان طالبان کے پس منظر کے بارے میں جو حضرات زیادہ واقف نہیں ان کیلئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کی آمد کے بعد مجہدین کے مختلف گروپوں نے اپنے وطن کی آزادی اور اپنے دینی نظریاتی تشخص کے تحفظ کیلئے جہاد کا علم بلند کیا تھا اور انہیں اس میں سوویت یونین کے خلاف سرجنگ لڑنے والی عالمی قتوں کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ اس جہاد میں افغانستان کے علاوہ پاکستان اور دوسرے ممالک سے بھی ہزاروں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اس جہاد کے تیجے میں روکی افواج نے افغانستان چھوڑ دیا لیکن ان کے جانے کے بعد اس جہاد کے فوائد

مغربی قوتوں نے اپنے دامن میں ڈال کر مجاہدین کے مختلف گروپوں کو آپس میں اڑنے کیلئے تھا چھوڑ دیا اور افغانستان احمد شاہ مسعود مرحوم، انحصاری حکمت یار اور دوسرا گروہوں کے درمیان خانہ جنگی کا میدان بن گیا۔ اس خانہ جنگی میں افغانستان کی تباہی اور جہاد افغانستان کے منطقی تباہی کو ڈوبتا کچھ کر مختلف جہادی گروپوں کے مغلض نوجوان قدمدار کے ملا محمد عمر کی قیادت میں میدان میں آئے اور انہوں نے افغانستان کو امن فراہم کرنے اور اسلامی شریعت کے نفاذ کو پاناشن قرار دے کر اپنی فوج منظم کر کے رفتہ رفتہ افغانستان کے بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ”امارتِ اسلامی افغانستان“ کے نام سے اپنی حکومت قائم کر لی۔

اس کے ساتھ ہی جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے عرب مجاہدین نے اشیع اسامہ بن لادن شہیدی کی قیادت میں مشرق و سطی میں امریکی فوجوں اور مغربی ممالک کی اسرائیل نواز پالیسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور افغانستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ اس پر مغربی ملکوں کو اعتراض ہوا اور طالبان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عرب مجاہدین کی سرگرمیوں سے لائقی کا اعلان کریں اور اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں۔ اسی دوران نائیں یوں کافوسناک ساخن رونما ہوا جس کی ذمہ داری عرب مجاہدین پر ڈال دی گئی اور اسامہ بن لادن کی حوالگی کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ طالبان حکومت نے اس کی طرفہ مطالبہ کو منسخہ سے انکار کر دیا اور کہا کہ عالمی سطح پر غیر جانبدارانہ تحقیقات کا اہتمام کیا جائے، اس کے بغیر وہ اسامہ بن لادن کو کسی کے حوالے نہیں کریں گے۔ اس کے بعد اقامہ متعدد سے رجوع کر کے دہشت گردی کی کوئی تعریف اور مصدق طے کیے بغیر مبینہ دہشت گردی کے خلاف متعدد محاذ قائم کر کے افغانستان پر فوج کشی کر دی گئی اور طالبان قذھار کا اقتدار چھوڑ کر محاذ جنگ پر چلے گئے۔

تب سے افغانستان میں جنگ جاری ہے اور ایک عشرہ گزر جانے کے بعد بھی طالبان کونہ تو شکست دی جاسکی ہے اور نہ ہی ان کے ایجادے اور عزم میں کوئی تبدیلی لائی جاسکی ہے۔ ابھی چند روز قبل کسی امریکی تھنک ٹینک کے حوالے سے ایک رپورٹ روزنامہ پاکستان میں شائع ہوئی ہے کہ افغان طالبان کو اس بات پر آرادہ نہیں کیا جاسکا کہ وہ افغانستان میں دوبارہ اقتدار میں آنے کیلئے ”سخت قوانین“ کے نفاذ کا ارادہ ترک کر دیں اور اس بات کو بعض امریکی دانشوروں کے ہاں افغانستان میں امریکی افواج کی جنگ کی ناکامی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

بہر حال یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی اور جوں جوں مذکورات آگے بڑھیں گے بہت سے مجھے اور پرانے پہلوے نقاب ہوتے رہیں گے۔ ہم سر دست طویل انتظار کے بعد سامنے آنے والی اس خبر پر اطمینان اور مسرت کا اغہار کرتے ہیں اور اس پر طالبان کے ساتھ ساتھ امریکہ کے اس فیصلے کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس نے بالآخر میں حقائق کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مذکورات جلد شروع ہوں اور کامیابی سے ہمکنار ہو کر افغانستان پوری دنیا کیلئے امن کی نوبت ثابت ہو، آمین یا رب العالمین۔

## افغان طالبان کی استقامت کو سلام

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۱۲ء

روزنامہ پاکستان لاہور میں ۱۳ جنوری ۲۰۱۲ء کو شائع ہونے والی ایک روپورٹ کے مطابق امریکی ائمیں جنس کے ایک ٹاپ سیکرٹ جائزے میں خبر دار کیا گیا ہے کہ طالبان نے اقتدار حاصل کرنے اور دوبارہ سخت مذہبی قوانین نافذ کرنے کے مقصد کو ترک نہیں کیا۔ اس جائزے نے اوبامہ انتظامیہ کی طرف سے کابل اور شورش پسندوں کے درمیان امن معابدہ کرنے کیلئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، ان کی کامیابی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کردی ہیں، صدر بارک اوباما کو گذشتہ ماہ پیش کی جانے والی اس

National intelligence estimate

میں یہ نتیجہ بھی نکالا گیا ہے کہ گذشتہ برس تیس ہزار امریکی فوجوں نے سیکورٹی کے معاملے میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ شاید دیر پاثابت نہ ہوں۔

امریکہ نے دس برس قبل افغانستان پر جو جنگ مسلط کی تھی اور مسینہ وہشت گردی کے خلاف جنگ کے عنوان سے جو متعدد محاڈ بنادیا تھا وہ اپنے مقاصد میں ناکام ہو گیا ہے اور اتحادی فوجیں افغانستان سے ”باعزت“ واپسی کی راہیں تلاش کر رہی ہیں۔ جس کیلئے شورش پسندوں (طالبان) اور کابل حکومت (کرزی ٹول) کے درمیان امن معابدہ کا نیا عنوآن اختیار کیا گیا ہے اور اس کیلئے اوبامہ انتظامیہ اپنا پورا زور صرف کرتی نظر آ رہی ہیں۔ لیکن طالبان نے اسے مسترد کر کے امریکہ سے براہ راست گفتگو کا راستہ اپنایا ہے جو ہبین الاقوامی روپر ٹوں کے مطابق مختلف مراحل سے گزر چکی ہیں اور ان مذکورات کو آگے بڑھانے کیلئے قطر میں طالبان کے باقاعدہ دفتر کے قیام کی خبریں بھی آچکی ہیں۔

امریکہ اور اس کے اتحادی چاہ رہے ہیں کہ طالبان افغانستان میں دوبارہ برسر اقتدار آنے کی صورت میں شریعت اسلامیہ (سخت مذہبی قوانین) نافذ نہ کرنے کی لیکن دہائی کرداریں جس کیلئے مذکورہ روپورٹ کے مطابق طالبان قیادت تیار نہیں ہے اور افغانستان میں دوبارہ شرعی قوانین نافذ نہ کرنے کی لیکن دہائی حاصل نہ ہونے پر امریکی ائمیں جنس امریکی فوجوں کی (اس کے بقول) اب تک حاصل ہونے والی کامیابیوں کو مشکوک قرار دے رہی ہے۔

افغانستان کے طالبان، ملا محمد عمر حفظہ اللہ تعالیٰ کی قیادت میں افغانستان کی آزادی و خود مختاری اور امارت اسلامی افغانستان میں نظام شریعت اسلامیہ کے مکمل نفاذ کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں جو بھگر اللہ تعالیٰ اپنی منزل کے قریب پہنچتی نظر آ رہی ہے۔ یہ طالبان قیادت کے حوصلہ اور تدریجی اور عزیمت و استقامت کے ساتھ ساتھ افغان عوام کی حریت پسندی اور اسلامیت کی آئینہ دار بھی ہے۔ ہم افغان طالبان، ان کی قیادت اور ان کے تمام ہمنواوں کو اس عزیمت و استقامت پر سلام عقیدت پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد اپنی منزل سے ہمکنار کریں، آمین یا رب العالمین۔

## قرآن کریم کی حرمت کے تقاضے

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۹ مارچ ۲۰۱۲ء

آج (۷ مارچ) کاروzenامہ اسلام میرے سامنے ہے اور قرآن کریم کے حوالے سے دو اہم خبریں توجہ کو اپنی طرف مبذول کر رہی ہیں۔

ایک خبر یہ ہے کہ سینٹ آف پاکستان نے افغانستان میں قرآن کریم کی توہین کے مرتکب امریکی فوجیوں کو سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ قائدین ایوان نیز حسین بخاری کی پیش کردہ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ایوان بالا اس واقعہ کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتا ہے، یہ انہائی کمزورہ فعل تھا جو کہ نیٹو افواج کے سپاہیوں نے کیا ہے، اس واقعہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجموع ہوئے ہیں، امریکہ اور نیٹو ممالک اس واقعہ کی تحقیقات کرائیں اور اس میں ملوث فوجیوں کو سخت سخت سزا دی جائے۔

افغانستان میں نیٹو فوجیوں کی طرف سے قرآن کریم کی توہین کے سانحہ کے بعد افغانستان میں احتجاج و اضطراب کی جو ہر چل رہی ہے وہ اس بات کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ افغانوں کی دینی حیمت اور ملی عورت ابھی نہ صرف باقی ہے بلکہ جب، لالج اور پروپیگنڈا کے تمام تر تھیمار استعمال کرنے کے باوجود اس کے درجہ حرارت میں کوئی کمی نہیں کی جاسکی۔ گذشتہ دنوں ایک امریکی تھنک ٹینک نے اس صورتحال کو انہائی تشییشاں کے درجہ حرارت میں کوئی کمی نہیں کی جاسکی۔ اقتدار میں واپسی کے امکانات دوبارہ دکھائی دینے لگے ہیں مگر تمام تر کوششوں کے بعد بھی اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا کہ وہ دوبارہ حکومت میں آ کر سخت قوانین (شریعت اسلامیہ) نافذ نہیں کریں گے اور اس صورتحال کو افغانستان میں اتحادی فوجیوں کی اپنے اہداف کے حوالے سے ناکامی پر محمل کیا جا رہا ہے۔

ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا کہ اتحادی فوجوں کی لشکر کشی اور جر و تشدد افغانوں کے دینی جذبہ اور قومی غیرت میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکے گا مگر اب دنیا نے بھی ایک بار پھر دیکھ لیا ہے کہ افغان قوم آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں وہ برطانوی فوجوں کی یلغار کے وقت تھی اور جہاں وہ رو سی استعمار کی لشکر کشی کے وقت کھڑی تھی۔ اب تیرے راؤ نڈی لیعنی امریکی استعمار اور اس کے اتحادیوں کی دس سالہ یلغار کے اختتامی مرحل میں بھی افغان قوم کے پائے استقلال میں کوئی لغزش دکھائی نہیں دے رہی اور اس استقامت و عزیمت پر افغان قوم کو سلام عقیدت پیش کرنے کو تھی چاہتا ہے۔

جبکہ تک سینٹ آف پاکستان کی مدتی قرارداد کا تعلق ہے، یہ خوش آئندہ ہے مگر کافی نہیں ہے اس لیے کہ اصل مسئلہ مذمت کا نہیں بلکہ عالمی سطح پر حرمت قرآن کریم، حرمت نبی اکرم اور حرمت انبیاء کرام کے مسئلہ کو اٹھانے کا ہے۔ اور عالمی اداروں کو اس بات کیلئے آمادہ کرنے کا ہے کہ وہ جو الٰہی، آسمانی ستالبوں اور انبیاء کرام کے احترام کو مذہب اہب کے پیروکاروں کا حق تسلیم کریں اور اس کیلئے عالمی سطح پر قانون سازی کریں۔ مسلم حکومتوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے اور جب تک وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی طرف عملی پیشرفت نہیں کریں گے اس وقت تک اس قسم کے افسوسناک حادثات پیش آتے رہیں گے جبکہ اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اس ہمیں میں پیش پیش ہونا

چاہیے۔

دوسری خوبی قرآن کریم کے حوالے سے ہے اور وہ یہ کہ پنجاب اسمبلی نے قرآن کریم کو نصاب تعلیم میں باضابطہ طور پر شامل کرنے کی سفارش کی ہے اور یہ سفارش ایک قرارداد کی متفقہ منظوری کی صورت میں کی گئی ہے جو فناشل ایگ کی رکن اسمبلی محترمہ عاصمہ مددوٹ نے پیش کی اور کسی اختلاف کے بغیر ایوان نے اسے منظور کر لیا۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ:

”قرآنی تعلیمات کے فروع اور موجودہ نسل کی قرآن کریم سے آشنا کیلئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو بطور نصانی کتاب تعلیمی نصاب کا حصہ بنانا کہ اسے باقاعدہ ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جائے۔ نیز تریس قرآن و حدیث کیلئے جامع پروگرام تشكیل دیا جائے اور اس کیلئے تمام وسائل فراہم کیے جائیں۔“

قرآن و سنت کی تعلیم و تدریس اور اپنے شہریوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنا ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے ریاتی ذمہ داریوں اور حکومتی فرائض میں شامل ہے اور ایسا قیام پاکستان کے بعد سے ہی ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس سے مسلسل گریز کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ریاتی نظام تعلیم میں قرآن و حدیث کی تعلیمات جزوی طور پر تو کچھ نہ کچھ شامل ہوتی آرہی ہیں لیکن حکومتوں کی پالیسیوں کے تحت ان میں کمی پیشی بھی ہوتی رہی ہے، اور یہ المیہ ہمارے ساتھ شروع سے چلا آ رہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو ریاتی ذمہ داریوں میں شامل سمجھنے کی وجہے حکومتی پالیسیوں کے تابع رکھا گیا ہے اور حکومتوں کے رحمانات کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کا دارہ بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

مسلم شریف (کے باب) کتاب المساجد کی ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے آخری عمر میں ایک خطبہ جمعہ کے دوران ارشاد فرمایا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مرغ نے ان کے سر پر تین ٹھونکے لگائے ہیں جس سے وہ یہ سمجھے ہیں کہ ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا ہے۔ پھر اس حوالے سے انہوں نے کچھ خصوصی ہدایات ارشاد فرمائیں اور ان میں ”امراء مصار“ یعنی مختلف علاقوں کے مسلم حکام کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ان علاقائی حکام کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ (۱) شہریوں کو عدل و انصاف فرمائیں (۲) قرآن و سنت کی تعلیم دیں (۳) اور قومی خزانے سے ان کے حصہ کی صحیح تفہیم کار کا اہتمام کریں۔ یعنی حضرت عمرؓ نے قرآن و سنت کی تعلیم کو مسلم حکمرانوں کی بنیادی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں محترمہ عاصمہ مددوٹ کی پیش کردہ یہ قرارداد حکومت پاکستان کو اسی ذمہ داری کی طرف توجہ دلانے کی کوشش ہے جس کی متفقہ منظوری پر پنجاب اسمبلی کے تمام ارکان مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ اور خاص طور پر قرارداد کے دو جملے بہت اہم ہیں جن کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کو باقاعدہ نصانی کتاب کے طور پر ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جائے اور دوسرا یہ کہ اس کیلئے تمام وسائل فراہم کیے جائیں۔ یہیں یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل وفاتی مختصہ اعلیٰ نے ایک حکم جاری کیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اسکو لوں میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مٹل تک طلبہ اور طالبات کو ناظرہ قرآن کریم پڑھایا جائے۔ لیکن اس حکم پر یہ کہہ کر عملدرآمد سے گریز کیا گیا تھا کہ اس

کیلئے اسکولوں کے پاس وسائل نہیں ہیں اور تعلیم کیلئے سرکاری طور پر مختص کیے جانے والے بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس دور میں وفاقی وزارت تعلیم کے ایک ذمہ دار افسر سے اس مسئلہ پر ہماری بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ملک بھر کے تمام مڈل اسکولوں میں ایک ایک قاری بھی تعینات کیا جائے تو ہزاروں قاریوں کی ضرورت ہو گی اور ان کی تجویز ہیں اور مراحت بھی اسی حساب سے درکار ہوں گی جبکہ تعلیمی بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ اس کیلئے دینی مدارس کا شکریہ ادا کیجئے کہ وہ کسی قسم کے سرکاری بجٹ کے بغیر باہمی تعاون کی بنیاد پر ملک بھر کی لامکوں مساجد کو نہ صرف حافظہ و قاری بلکہ عربی درس نظامی کے مدرس و معلم اور مفتی و خطیب بھی فراہم کر رہے ہیں اور اندر وون ملک کے ساتھ ساتھ یہ ونی ممالک میں بھی وسیع پیمانے پر اپنی اس پیداوار کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔

بہر حال ہم پنجاب آسٹبلی کی اس متفقہ قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن اس کیلئے صرف قرارداد اور سفارش کافی نہیں بلکہ ایک باقاعدہ بل لانے اور اسے اسی طرح متفقہ طور پر پاس کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ارکان آسٹبلی کی اس اچھی خواہش کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

## حضرت شیخ الہند مولانا محمد حسن اور نظریہ عدم تشدد

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۱ مارچ ۲۰۱۲ء

مولانا فضل الرحمن پشاور میں بھرپور ”اسلام زندہ باد کانفرنس“ کے انعقاد کے بعد اب اسلامی رجیوں کو نوشن سنٹر اسلام آباد میں شیخ الہند سینیار کے عنوان سے مورچہ زن ہو رہے ہیں جبکہ مولانا سمیع الحق ”دفاع پاکستان کوسل“ کے محاذ کو مسلسل گرم رکھے ہوئے ہیں اور گذشتہ روز پارلیمنٹ کے سامنے دفاع پاکستان کوسل نے نیوپاکی کی مملکتہ محلی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کر کے ارکان پارلیمنٹ کو عوامی جذبات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

گذشتہ دنوں لاہور میں علمائے کرام کی ایک محفل میں راقم الحروف نے عرض کیا کہ دینی جماعتیں غاص طور پر مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق کی ان عوامی سرگرمیوں سے مغرب کو ایک ایسا پیغام برداشت مل رہا ہے جس کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ پاکستان کے عوام افغانستان اور پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں مغربی قوتوں کے تمام تر عسکری دباؤ کے باوجود اسلام اور پاکستان کے ساتھ اپنی کشمکش پر قائم ہیں اور ملک کے اندر بر سر اقتدار قوتوں کی منافقت کی پرواہ کیے بغیر وہ اسلام اور پاکستان کے حوالے سے اسی مقام پر گھڑے ہیں جہاں اس خط میں مغرب کی عسکری یخار میں پہلے تھے اور اس بات نے مغرب کے دانشوروں کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمد حسن دیوبندی کی یاد میں ملک کے مختلف علاقوں میں اجتماعات کا انعقاد فکری بیداری کی علامت ہے اور جنوبی ایشیا میں شیخ الہند نے جس فکر اور شور کی آبیاری کی تھی اس کی طرف دیوبند کے فرزندوں کا رجوع اطمینان دلا رہا ہے کہ حالات کے انتار چیڑھا اور معروضی سیاست کے تقاضوں کی وہند شاید چھٹنے لگی ہے اور نئی نسل کو دیوبند کے اصل فکر اور میشن سے روشناس کرنے کا ذوق دھیرے دھیرے بیدار ہو رہا ہے۔ اس موقع پر حضرت شیخ الہند

کی خدمات و افکار کے حوالے سے ایک تاریخی سوال کا جائزہ لینا مناسب سمجھ رہا ہوں کہ کیا مالٹا کی اسارت سے واپسی پر حضرت شیخ الہند نے آزادی کی جگہ سے دستبرداری اختیار کری تھی؟ بہت سے دوست جب یہ دیکھتے ہیں کہ چار سال قبل جب حضرت شیخ الہند نے ہندوستان سے چاڑ مقدس کی طرف سفر کیا تھا تو وہ برطانوی سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے مطابق ان ”بنورِ ربانی“ کے کمانڈر اچھیف تھے جو پورے بر صیری میں انگریزی اقتدار کے خلاف مسلح بغاوت کیلئے منظم کیے گئے تھے، وہ اس مسلح بغاوت کے منصوبے میں عالمی قوتوں کا تعاون حاصل کرنے کے مشن میں خلاف عثمانیہ کے عہدیداروں سے بات چیت لیلے چاڑ مقدس گئے تھے اور انہوں نے ترک حکمرانوں سے بات چیت بھی کری تھی لیکن شریف مکہ کی طرف سے خلاف عثمانیہ کے خلاف بغاوت نے ساری صور تحال کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ حضرت شیخ الہند گورنمنٹ کے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل اور دیگر رفقاء کے ہمراہ مالٹا کے جزیرہ میں ساڑھے تین سال کے لگ بھگ عرصہ نظر بندی کی حالت میں گزارا۔ لیکن جب وہاں سے واپس ہندوستان آئے تو عدم تشدد کے علمبردار کے طور پر متعارف ہوئے اور انہوں نے آزادی وطن کیلئے کام کرنے والوں کو پر امن اور عدم تشدد پر بنی جدو جہد کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔ جبکہ حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد ان کی سیاسی جدو جہد کے جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی قیادت میں شیخ الہند کے کم و بیش سب ہی شارگروں نے آزادی کی تحریک کو عدم تشدد کے دائرے میں آگے بڑھایا بلکہ تشدد کو اپنی تحریک کیلئے سب سے زیادہ نقصان دہ قرار دیا۔

یہ صور تحال دیکھ کر ایک عام اور سطحی ذہن کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا کیا تبدیلی جنگ آزادی سے دستبرداری تھی اور کیا حضرت شیخ الہند نے عسکری جدو جہد کو ترک کر کے برطانوی اقتدار کو عملًا قبول کر لیا تھا؟ ہمارے اس خطے کو آج جس صور تحال کا سامنا ہے اس کے پیش نظر اس سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا اور اس کا جواب تلاش کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میر افظعہ نظر یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند کی جانب سے عسکری طریق جدو جہد کو ترک کرنا جنگ آزادی سے دستبرداری نہیں تھی بلکہ صرف مورچے اور طریق کارکی تبدیلی تھی اور انقلاب کیلئے وقت کے سب سے موثر ہتھیار کو اختیار کرنا تھا۔ کیونکہ عدم تشدد کا پر امن راستہ اختیار کرنے کے بعد برطانوی حکمرانوں کے ساتھ عدم تعاون، ترک موالات اور رسول نافرمانی کی جو تحریکیں حضرت شیخ الہند کے حلقة نے اس خطے میں منظم کیں وہ اس بات کی گواہ ہیں کہ فرگی اقتدار کو قبول نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس کے سلطان کے سامنے سرمنڈر ہونے کی بات کی گئی بلکہ فرگی سلطان اور اقتدار سے گلوخالصی کیلئے عدم تعاون، عدم تشدد اور رائے عامہ کو منظم و بیدار کر کے اسٹریٹ پاؤر کو حکمرانوں کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے انہیں پسائی پر مجبور کیا گیا۔

یہ بات ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن تاریخی حقیقت ہے کہ انقلاب فرانس کے بعد کبھی بھی بالادست قوت کو صرف عسکری جدو جہد کے ذریعے میدان سے ہٹانے کا طریق کار اس سے پہلے کے دور کی طرح موثر نہیں رہا، حتیٰ کہ آزادی کی جنگوں میں بھی عسکری مزاحمت کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کی قوت اور اسٹریٹ پاؤر ایک موثر ہتھیار کے طور پر سامنے آئی ہے بلکہ عسکری مزاحمت کے ذریعے کی جانے والی تحریکات نے بالآخر نیا نجح وصول کرنے کیلئے سیاسی مذاکرات ہی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ جس طرح ویت نام میں امریکی سلطان کے خلاف عسکری مزاحمت کرنے والے حریت پسندوں ویت

کالگ نے ایک حد تک عسکری جدوجہد کے بعد مقاصد کے حصول میں کامیابی تک سیاسی مذاکرات اور رائے عامہ کی قوت کے ذریعے ہی رسائی پائی۔

حضرت شیخ الہند نے عدم تشدد کو ولپنا ہتھیار قرار دے کر سیاسی جدوجہد کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس راستے سے نہ صرف بر صیر پاک و ہند نے برطانوی استعمار کے تسلط سے نجات حاصل کی بلکہ میں عصر حاضر کی دو اور تحریکیوں کا حوالہ بھی دینا چاہوں گا جنہوں نے عدم تشدد اور اسٹریٹ پاور کی پر امن جدوجہد کے ذریعے عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ امریکہ میں سیاہ فام آبادی صدیوں سے گوروں کے مظالم کا شکار چلی آ رہی تھی کہ اب سے صرف نصف صدی قبل تک سیاہ فاموں کو گوروں کے برابر سیاسی اور معاشرتی حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ ووٹ کے حق سے محروم تھے، ہو ٹلوں، اسکولوں، ہسپتاں اور پیلک بسوں میں قانونی طور پر انہیں مخصوص جگہوں پر بیٹھنا پڑتا تھا اور وہ گوروں کے ساتھ بیٹھنے کے مجاز نہیں تھے۔ اس صورت حال کے خلاف بغاوت کا پرچم ایک میگی مذہبی رہنماء مرثیں لو تحریر کنگ نے بلند کیا اور تحریر کی کانقطہ آغاز بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ثابت ہوا کہ ایک سیاہ فام لڑکی بس پر سوراہ ہوئی اور سیاہ فاموں کی سیٹوں میں جگہ نہ پا کر سفید فاموں کیلئے مخصوص حصے میں ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئی، اسے وہاں سے بہنے کیلئے کہا گایا تو اس نے انکار کر دیا، اس پر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا جس کے خلاف احتجاج کی تحریک مارٹن لو تحریر کنگ کی قیادت میں اس قدر آگے بڑھی کہ سیاہ فاموں نے واشنگٹن ڈی سی میں ملین مارچ کا اہتمام کر کے ۱۹۶۸ء کے دوران امریکی صدر جان لینف کینزیڈی کو مجبور کر دیا کہ وہ مارٹن لو تحریر کنگ کے ساتھ مذاکرات کریں اور سیاہ فاموں کو گوروں کے برابر شہری حقوق دینے کا اعلان کریں۔

دوسرے واقعہ بھی ہمارے سامنے کا ہے کہ ایران میں بادشاہت کے خلاف مذہبی طبقے نے بغاوت کی اور عسکری مزاحمت کی بجائے عدم تشدد اور عدم تعاوون کے پر امن ہتھیاروں کے ساتھ کم و بیش سترہ سال جدوجہد کر کے ایرانی بادشاہت کو اسٹریٹ پاور کے ذریعے بوریا مسٹر گلو کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایرانی انقلاب کی مذہبی حیثیت سے قطع نظر طریق انقلاب کے حوالے سے ایرانی علماء کی جدوجہد کا تحریکیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے تعلیمی اداروں پر توجہ دی، اس کے بعد رائے عامہ کو اپنے حق میں کر کے ہر شہر میں لاکھوں عوام کو بادشاہت کے جرس و ستم کے سامنے لاکھڑا کر دیا اور انقلاب پاکرنے میں کامیابی حاصل کی۔

یہ سیم دراصل حضرت شیخ الہند کا تھا کہ انہوں نے مثال سے واپسی پر علی گڑھ پیونور سٹی کا رنج کیا اور وہاں کے تعلیمی و نظریاتی ماحول کو تبدیل کرنے کی محنت کی جس کے نتیجے میں تحریک آزادی کو مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عبد اللہ سنہری، مفتی کفایت اللہ دہلوی، اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی جیسے جید علمائے کرام کے ساتھ حکیم اجمل خان مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور چودھری افضل حق مرحوم جیسے بیدار مغزراہنما میسر آئے اور دونوں طبقوں کی مشترک جدوجہد نے آزادی کی راہ ہموار کی۔

حضرت شیخ الہند نے اپنے دور میں عسکری مزاحمت کا راستہ بھی اختیار کیا جس کی جھلک ہم افغانستان کے جہاد آزادی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں کہ افغان مجاہدین نے برطانوی وروپی استعمار کو شکست دینے کے بعد امریکی استعمار کو بھی واپسی کا راستہ تلاش کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے ثمرات ہیں لیکن یہ بات بھی

تحمیک شیخ الہند<sup>ؒ</sup> کے قائدین کے پیش نظر تھی کہ جنوبی ایشیا کے دیگر خطوں کے عوام سے وہ موقع رکھنا عجیب ہے جو افغانستان میں ہر دور میں پوری ہوئی ہے۔ اس لیے انہوں نے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے بر صیری پاک و ہند میں آزادی اور نفاذِ شریعت کیلئے عدم تشدد کی پر امن تحریک کا راستہ اختیار کیا اور اسی راستہ پر یہ جدوجہد اپنے تک آگے بڑھ رہی ہے۔ شیخ الہند کی پر امن جدوجہد کا مطلب حالات کو قبول کر لینا اور اس کے ساتھ ایڈ جسٹ ہو جانا نہیں بلکہ مزاحمت کے جذبے کو برقرار رکھتے ہوئے تدبی کی پر امن سیاسی محنت کرنا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس مزاحمت کیلئے عسکریت کا مظاہرہ ضروری نہیں بلکہ اس معاملے میں عدم تشدد اور رائے عامہ کی قوت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

## امن ضروری ہے اور امن کیلئے انصاف ضروری ہے

اپریل ۲۰۱۲ء کے آغاز میں جمعیت علماء اسلام (س) لاہور کے زیر اہتمام ایک  
سیمینار سے خطاب

بعد الحمد لله والصلوة۔ کافرنس کا عنوان ”سیرۃ النبی اور امنِ عالم“ ہے جس کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کیلئے کھڑا ہوں گے لیکن اس سے پہلے آج کی کافرنس کے مہمان خصوصی مولانا اسمعیل الحق کے بارے میں کچھ عرض کرنا آج کے حالات کے تناظر میں ضروری سمجھتا ہوں۔ نیوپالائی کی بحالی کو روکنے کیلئے ”دفاع پاکستان کونسل“ کے عنوان سے مولانا اسمعیل الحق اور ان کے رفقاء جو جدوجہد کر رہے ہیں اور اس بڑھاپے میں مولانا اسمعیل الحق جس جوش وجذبے کے ساتھ قافلہ کی قیادت میں مصروف ہیں وہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور اس پر مولانا اسمعیل الحق کی جرأت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ دارالعلوم حقانیہ کوڑہ منٹک اور شیخ المدیث حضرت مولانا عبدالحق بیمیشہ جہاد افغانستان کے پشتیبان رہے ہیں اور آج بھی مولانا اسمعیل الحق اس روایت کو پورے حوصلہ کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہیں، اس تناظر میں دو باتیں عرض کر کے اپنے موضوع کی طرف بڑھوں گا۔

مولانا اسمعیل الحق کو یاد ہو گا کہ جب انہوں نے افغانستان پر امریکی اتحاد کی یلغار سے قبل قوم کو بیدار کرنے کیلئے اکوڑہ منٹک اور اسلام آباد میں مختلف دینی و سیاسی جماعتوں کے مشترکہ اجتماعات کا اہتمام کیا تھا اور امریکی افواج کی آمد آدم کا غفلہ ہر طرف پاٹھا تو اسلام آباد میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز کافرنس میں ایک قبائلی لیڈر نے جھولے بھالے لبھے میں یہ بات کہی تھی کہ ”امریکہ اس علاقہ میں آئے گا تو ہمیں مگر جائے گا کہہ سے؟“ اس قبائلی لیڈر کی اس بات پر کافرنس میں قعقہ بلند ہوئے تھے اور بات بہت اچھی لگنے کے باوجود میری سمجھ میں اس کا مطلب نہیں آ رہا تھا۔ مگر ابھی چند روز قبل ایک امریکی لیڈر کا یہ بیان پڑھ کر اس قبائلی لیڈر کی بات میری سمجھ میں آئی کہ اگر نیوپالائی اسی طرح بندر ہی تو امریکی افواج کی واپسی کیسے ہوگی؟

دوسری بات جس کا اس تناظر میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جب امریکی اتحاد کی فوجوں نے افغانستان پر یلغار کی اور

قدھار میں طالبان کی اسلامی حکومت کو جبر و قوت کے ساتھ ختم کر دیا گیا تو ہمارے ایک انتہائی محترم بزرگ نے، جو جنوبی ایشیائی سطح کی علمی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، ایک مضمون میں بڑی حضرت اور یا اس کے ساتھ یہ لکھا کہ ”سارا کھل ختم ہو گیا ہے“ میں نے اس پر ان محترم بزرگ کی خدمت میں زبانی بھی عرض کیا اور اپنے ایک تفصیلی مضمون میں بھی لکھا کہ ”حضرت! اکھیل ختم نہیں ہوا بلکہ میرے خیال میں تو اصل کھلیل اب شروع ہوا ہے۔“ میں نے ان سے گزارش کی کہ صرف سات آٹھ سال انتظار کریں اور اس کے بعد فیصلہ کر لیں کہ کھلیل ختم ہوا ہے یا جاری ہے۔ میرے خیال میں اتحادی افواج سے نہیں کیلئے افغان طالبان کو صرف سات آٹھ سال کا عرصہ درکار تھا جس کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا تھا مگر اندازے سے بات کچھ لمبی ہو گئی ہے اور دس گیارہ سال کا عرصہ اس تیجے تک پہنچنے کیلئے گزر گیا ہے۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ جلد بازی کر کے بہت سے غیر ضروری محاذ طالبان کے ارد گرد کھول دیے گئے جس کی وجہ سے افغان طالبان کا سفر کچھ لمبا ہو گیا ہے ورنہ اگر نئے نئے محاذ کھولنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا جاتا تو یہ حالات جو آج نظر آہے بیس تین چار سال پہلے ہم اس دور میں داخل ہو چکے ہوتے۔ بہر حال دیر آید درست آید کہ ہوتا تو بالآخر یہی تھا کہ افراد، گروہوں اور طبقات کو تودیا جاسکتا ہے مگر قوموں کو شکست نہیں دی جاسکتی اور دنیا نے ایک بار پھر دیکھ لیا ہے کہ افغان قوم کو شکست نہیں دی جاسکی۔

اس کے بعد میں کافرنز کے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ آج کے عالمی تناظر میں امن عالم کیلئے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے اور آج کی دنیا کو امن سے روشناس کرنے کیلئے ہم انحضرت کے اسوہ حسنے سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں؟ آج دنیا میں ہر طرف یہ بات کہی جا رہی ہے کہ ترقی کیلئے امن ضروری ہے، خوشحالی کیلئے امن ضروری ہے، ملکی استحکام کیلئے امن ضروری ہے، قوی و قارکیلئے امن ضروری ہے اور امن کے بغیر ان میں سے کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ ساری باتیں درست ہیں اور ہم جانئے ہیں کہ امن کے بغیر نہ ترقی ممکن ہے، نہ استحکام حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی قوی و قار قائم ہو سکتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب کاموں کیلئے تو امن ضروری ہے مگر امن کیلئے کیا چیز ضروری ہے؟ میں اصحاب فکر و انش کو دعوت دیتا چاہتا ہوں کہ وہ اس بات پر سمجھی گی سے غور کریں کہ امن کیلئے قائم ہو سکتا ہے اور امن کیلئے کیا ضروری ہے؟ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ امن کیلئے انصاف ضروری ہے اس لیے کہ انصاف کے بغیر کسی بھی سطح پر امن کا قائم نہیں ہو سکتا، انصاف ہو گا تو امن ہو گا اور اگر انصاف نہیں ہو گا تو امن کی قیمت پر قائم نہیں ہو سکے گا۔ کسی شہر کی بات ہو یا ملک و قوم کا معاملہ ہو، اقوام عالم کے باہمی روابط ہوں یا امن عالم کی بات ہو، ہر دارہ میں اور ہر سطح پر اصول یہی ہے کہ انصاف ہو گا تو امن ہو گا ورنہ امن کا خوب پورا نہیں ہو سکے گا۔

انصاف کے تقاضوں میں سے ایک بڑا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ قانون سب کیلئے کیسا ہو اور قانون کے نفاذ میں کسی فردیا طبیعہ کو تحفظ اور اشتھانا حاصل نہ ہو اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف بطور خاص توجہ دلائی ہے۔ فاطمہ مخزومیہ کا واقعہ مشہور ہے کہ بنو مخزوم کی خاتون فاطمہ نے چوری کی، جرم ثابت ہو گیا اور آنحضرت نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمادیا۔ اس پر خاندان والوں کو تشویش ہوئی کہ اس سے پورے خاندان کی بے عزتی ہو گی، فاطمہ کا ہاتھ کٹا تو بنو مخزوم جیسے خاندان کی ناک کٹ جائے گی، اس لیے جناب نبی کریمؐ سے سفارش کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور سفارش کیلئے

حضرت اسامہ بن زید کا انتخاب کیا گیا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کان حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نبی اکرمؐ کے چہیتے نوجوان تھے، منہ بولے بیٹھ کے بیٹھے تھے، حضورؐ کی گود میں پرورش پائی تھی اور آپؐ کی خصوصی شفقتیں سینٹے والوں میں سے تھے۔ حضرت اسامہؓ نے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں سفارش کی تو آپؐ نے سخت غصہ اور ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ڈانت دیا کہ اتفاقع فی حد من حدود اللہ؟ کیا اللہ تعالیٰ کی حدود کے بارے میں سفارش کر رہے ہو؟ اس موقع پر آنحضرتؐ نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسامہ بن زیدؐ کو ڈانتے پر اکتنا نہیں کیا بلکہ مسجد نبویؐ میں اس مسئلہ پر عمومی خطاب بھی فرمایا اور اس خطاب میں لوگوں کو خبردار کیا کہ تم سے پہلے تو میں اس وجہ سے برباد ہوئی رہی ہیں کہ کوئی عام اور غریب شخص جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دی جائی تھی لیکن اگر کوئی وی آئی پی اور بڑا شخص جرم کا مرتكب ہوتا تو وہ سزا سے بچ جایا کرتا تھا۔ قانون کے نفاذ میں یہ فرق اور تقاضت قوموں کی تباہی کے اسباب میں سے ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے اپنی امت کو اس سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا کہ جب بھی کسی قوم اور معاشرے میں قانون کے کیساں نفاذ کا ماحول نہیں رہے گا وہاں فساد پھیلے گا اور قوم تباہی سے دوچار ہو جائے گی۔

## خود ہی مدعی، خود ہی گواہ، خود ہی جج

روزنامہ پاکستان، لاپور---، اپریل ۲۰۱۳ء

پروفیسر حافظ محمد سعید اور مولانا عبد الرحمنؐ کی کے سروں کی قیمت مقرر کر کے امریکہ اور بھارت نے اپنے تیسیں یہ سمجھ لیا ہوا گا کہ انہوں نے مبینہ وہشت گردی کے خلاف نہاد جنگ میں کوئی پیشرفت کی ہے اور اس سے انہیں اس جنگ میں کوئی فائدہ مل سکتا ہے۔ لیکن اس کے مضرات اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت نہ اس کا فیصلہ کرنے والے امریکی دانشوروں نے گوارا کی ہے اور نہ ہی اس کا خیر مقدم کرنے والے بھارتی دانشوروں کو اس کی توفیق ہوئی ہے۔ ورنہ عمومی تاثیر یہ ہے کہ اسے امریکی حکومت کی طرف سے بولکلاہٹ کے اظہار کے سوا کوئی اور عنوان دینا مشکل ہے، اس لیے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید اور مولانا عبد الرحمنؐ کا نہ تو ہتھیار بکف لڑا کے ہیں کہ ان کی مار دھاڑکی روپری ہی روز بروز سامنے آ رہی ہوں اور نہ ہی روپوش ہو جانے والے لوگ ہیں کہ وہ لوگوں کو نظر نہ آتے ہوں اور ان کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ نہ ہو۔ وہ کھل بندوں پہلک جلوسوں سے خطاب کرتے ہیں، پریس سے باتیں کرتے ہیں، سیاسی پارٹیوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں اور جمعی کی نمازوں کی امامت کرتے ہیں۔ گذشتہ جماعت کو حافظ محمد سعید نے گوجرانوالہ میں جی ٹی روڈ پر نہر کے پاس جماعت الدعوۃ کے نئے مرکز کا افتتاح کیا جسے ”مرکزاً قائمی“ کا نام دیا گیا ہے اور جمعہ کا خطبہ دینے کے علاوہ ہزاروں لوگوں کی امامت کی۔ پروفیسر عبد الرحمنؐ کی بھی اسی طرح ایک عرصہ سے عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے آ رہے ہیں اور اب بھی مختلف جلوسوں میں ان کے خطابات کا سلسہ جاری ہے۔

اس صورتحال میں حافظ محمد سعید اور عبدالرحمن بکی کے سروں کی قیمت مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ ان دونوں تک نارمل ذرائع کے ساتھ رسانی میں ناکام ہو گیا ہے اور وہ از خود ہی یکطرنہ طور پر مجرم قرار دے کر ان کی سزا مقرر کر رہا ہے جسے نافذ کرنے کیلئے وہ لاکھوں ڈالروں کا سہارا لینے پر بجور ہے۔ یہ مفعکہ خیز صورتحال ایک عام شخص کے نزدیک امریکہ کی طرف سے اپنی ناکامی کے کھلے اعتراض کے مترادف ہے جسے بولکا ہٹ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ جب سے امریکہ نے ”خود ہی مدعی، خود ہی گواہ اور خود ہی نجّ“ بن کر سارے فیصلے خود ہی صادر کرنے کی روشن اپنارکھی ہے اس کی طرف سے اس قسم کے فیصلے مسلسل سامنے آ رہے ہیں۔

اج سے دس سال قبل جب امریکی اتحاد نے افغانستان پر لشکر کشی کی تھی تو میں ان دونوں برطانیہ میں تھا۔ ایک ٹی وی چینل نے اس سلسلہ میں ہونے والی ایک گفتگو میں مجھے بھی بلوایا اور سوال کیا کہ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ میں پہلے اس بات کی وضاحت چاہوں گا کہ امریکہ اس کیس میں مدعی ہے یا نجّ؟ جب امراتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت بین الاقوامی سٹھ پر ثناشی کیلئے تیار ہے اور طالبان کی طرف سے پیشش موجود ہے کہ وہ فریقین کیلئے قابل قبول بین الاقوامی شانشی فورم کے سامنے اپنا مقدمہ لے جانے اور الزامات کا جواب دینے کیلئے تیار ہیں تو پھر یکطرنہ طور پر ان پر فیصلہ مسلط کرنے میں اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے اس وقت اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا اور اس ناکام لشکر کشی کے بعد بھی اس سوال کا جواب کسی جانب سے سامنے نہیں آ رہا۔

حافظ محمد سعید کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ ان کے خلاف امریکی اور بھارتی الزامات کی ایک چارچ ٹیٹ ہے جس کا کسی عدالت کے رو برو سامنا کرنے سے انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا، بلکہ پاکستان کی عدالتوں میں ان الزامات کا سامنا کر چکے ہیں جہاں ان الزامات کو ثابت نہیں کیا جا سکا۔ مگر امریکہ اور بھارت ان عدالتی فیصلوں کو قبول کرنے سے مسلسل گریزیاں ہیں۔ یہ عجیب سی دھاندنی ہے کہ مظلوم ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے کیس میں امریکہ کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ ہماری عدالت کا فیصلہ ہے اور ہم عدالتی فیصلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن حافظ محمد سعید کے بارے میں پاکستانی عدالتوں کے فیصلے ان کے نزدیک ”عدالتی فیصلے“ نہیں ہیں اور وہ انہیں تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اگر ڈاکٹر عافیہ کے بارے میں ایک امریکی عدالت کے فیصلے سے ہٹ کر امریکی حکومت خود کو کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں سمجھتی تو حکومت پاکستان پر یہ دباؤ کس لیے ہے کہ وہ پاکستانی عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے امریکی احکامات کی تعییں کرے، اور وہ جس شخصیت یا جماعت کو دہشت گرد قرار دینے کا اعلان کرے اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر امریکہ کے سامنے پھینک دیا جائے۔

پھر یہ دہشت گرد قرار دینے کی بات بھی خوب ہے کہ ابھی تک عالمی سٹھ پر دہشت گردی کی کوئی متفقہ تعریف طے نہیں کی جا سکی، حتیٰ کہ اقوام متحدہ نے بھی مطالبے کے باوجود اس سوال کو ابھی تک گول کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوکیا ہے کہ مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے والوں کو اس بات کا بھی کامل اختیار حاصل ہے کہ وہ دنیا کے کسی حصے میں جسے چاہیں دہشت گرد قرار دے کر اس پر چڑھ دوڑیں۔ اسرائیل فلسطینیوں کے خلاف جو اس کی مرضی ہو کرتا پھرے، انسانی ہمدردی کی بنیاد پر محاصرے میں گھرے ہوئے لوگوں کی امداد کیلئے آنے والے جہازوں کو روک لے، ایران

کے ایسی مراکز پر حملے کی کھلم کھلا دھمکیاں دیتا پھرے اور دھشت و درندگی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے، اس کے باوجود وہ دھشت گرد نہیں ہے، لیکن جن مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کو ان کے ملکوں کی مجاز عدالتیں اس قسم کے الزام سے بری الذمہ قرار دے چکی ہوں انہیں دھشت گرد قرار دے کر ان کے سروں کی قیمتیں مقرر کر دی جائیں۔ اگر اس کا نام انصاف ہے اور اس کے ذریعے دنیا میں امن قائم کرنا مقصود ہے تو یہ امن کچھی قائم نہیں ہو گا۔

دنیا میں ہر سطح پر امن کی ضرورت ہے اور یہ ہر قوم اور ملک کی ضرورت ہے، لیکن امن کیلئے انصاف ضروری ہے۔ انصاف ہو گا تو امن ہو گا اور انصاف نہیں ہو گا تو امن محض ایک خواب ہی رہے گا۔ اور انصاف کا مطلب بالادست قتوں کی اجارہ داری اور من مانی نہیں ہے بلکہ اس کے ہمیشہ سے چلے آنے والے کچھ مسلمہ اصول اور اس کے اپنے دائرے ہیں۔ امریکہ بہادر جب تک اپنی اجارہ داری اور من مانی کوتک کر کے انصاف کے مسلمہ اصولوں کی طرف واپس نہیں آتا اس قسم کی کاروائیوں سے امن تو کیا بحال ہو گا، خود اس کے اپنے جائز مفادات بھی ہمیشہ خطرات کے بھنور میں چکر کاٹنے رہیں گے۔

## حضرت مولانا عبد الحق

روزنامہ اسلام، لاپور --- مئی ۲۰۱۳ء

حضرت مولانا عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کا شمار پاکستان ہی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ سطحی ایشیا میں علوم دینیہ کی ترویج و انشاعت اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ و فروع کا ذریعہ بنیں۔ تعلیمی اور تہذیبی حوالے سے مولانا عبد الحقی دینی، علمی، مدرسی اور گلری خدمات جنوبی ایشیا اور اس کے ساتھ ساتھ سطحی ایشیا میں دینی جدوجہد کی اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جہاد افغانستان کو دیکھا جائے تو اس کی پشت پر مولانا عبد الحقی کی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی دکھانی دیتی ہے جو بیظاہر ایک منحی سماو جو درکھت تھے، لیکن علم و فضل اور عزم و ہمت کے اس کوہ گراں کے ساتھ کیونزم کے فاسدہ و نظام نے سر قبضہ کر پائیا حالیہ بگاڑ لیا اور آج کا مورخ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جہاد افغانستان کی علمی، فکری اور دینی اساس مولانا عبد الحقی کی شخصیت اور ان کی گلرانی میں کام کرنے والا تعلیمی ادارہ دار اعلوم حقانیہ ہے جس کے اثرات افغانستان اور سطحی ایشیا کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔

جہاد افغانستان کی علمی و فکری آبیاری میں ہمارے بہت سے بزرگوں کا حصہ ہے، مگر میں تاریخ کے ایک طالب علم اور اس جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر تین شخصیات کو ان سب کا سرخیل سمجھتا ہوں۔ ان میں سے سب سے پہلا نام حضرت مولانا عبد الحقی کا ہے اور ان کے بعد جہاد افغانستان کے علمی و فکری سرپرستوں میں میرے خیال میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور حضرت مولانا مفتی محمود کانام آتا ہے جنہوں نے صرف پاکستان کے علماء و طالبہ کو جہاد افغانستان کیلئے ذہنی طور پر تیار کیا اور افغان مجاهدین کی سیاسی و اخلاقی پشت پیمانہ ہی کی بلکہ جہاد افغانستان کے خلاف مختلف اطراف سے اٹھائے جانے والے شکوک و اعتراضات کا جواب دیا اور جہاد افغانستان کی ہر لحاظ سے پشتیبانی کی۔

حضرت مولانا عبد الحمیں کی خدمات کو میں ایک اور حوالے سے بھی تاریخ کا انہم حصہ شمار کرتا ہوں، اور وہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی دستوری جدوجہد کا باب ہے۔ پاکستان کی دستور ساز آئینیوں میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جس شخصیت نے دستور سازی میں سب سے زیادہ سنجیدہ کردار ادا کیا ہے اور دستور سازی کے تمام مراحل میں پوری توجہ اور تیاری کے ساتھ محنت کی ہے، وہ حضرت مولانا عبد الحمیں ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کے مرحلہ میں حضرت مولانا مفتی محمود قائد حزب اختلاف تھے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی<sup>ؒ</sup>، مولانا صدر الشہبی<sup>ؒ</sup>، مولانا نعمت اللہ<sup>ؒ</sup>، مولانا عبدالحکیم<sup>ؒ</sup>، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا محمد ذاکر<sup>ؒ</sup>، مولانا ظفر احمد انصاری<sup>ؒ</sup> اور بہت سے دیگر بزرگوں نے اس دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کیلئے محنت کی۔ مگر دستور ساز آئینی کی کارروائی کا مطالعہ کیا جائے اور دستور سازی کے مختلف مراحل پر نظر ڈالی جائے تو حضرت مولانا عبد الحمیں کے جدا گانہ اور امتیازی کردار کا تذکرہ بہر حال ضروری ہو جاتا ہے۔

## مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق

روزنامہ اسلام، لاپور--- > مئی ۲۰۱۲ء

مولانا سمیع الحق صاحب باہمتو اور صاحبِ عزیمت بزرگ ہیں کہ اس بڑھاپے میں مختلف امراض و عوارض کے باوجود پوچھی جگگ لڑ رہے ہیں اور مختلف شعبوں میں اس انداز سے دینی و قومی خدمات میں مصروف ہیں کہ کسی شعبہ میں بھی انہیں صرف اول میں جگہ نہ دینا نا انصافی ہوگی۔ دارالعلوم حقانیہ کے اہتمام و تدریس کے ساتھ ساتھ امریکی ڈرون حملوں اور نیوپاکی کی مکملہ بھائی کے خلاف عوامی مجازی عملی قیادت کر رہے ہیں جس میں انہیں ملک کے طول و عرض میں مسلسل عوامی جلسوں اور دوروں کا سامنا ہے، جبکہ قائمی مجاز پر رائے عامہ کی راہ نمائی اور دینی جدوجہد کی تاریخ گونی نسل کیلئے محفوظ کرنے میں بھی وہ اسی درج میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحمیں اور خود اپنے نام مشاہیر کے خطوط کو آٹھ فتحیم جلدیوں میں جمع کر کے جو عظیم کارنامہ سراج نام دیا ہے، اسے دیکھ کر میں خود تحریر و تجبب کے ساتھ خوشیوں کے سمندر کی گہرائی میں ڈبلیاں کھارہا ہوں۔ محمد اللہ تعالیٰ میر اشمار بھی بے ہمت لوگوں میں نہیں ہوتا، مگر مولانا سمیع الحق کی ہمت کی بلندی پر نظر ڈالنے کیلئے بار بار ٹوپی سنبھالنا پڑ رہی ہے۔

گذشتہ روز میں نے جب اس کتاب پر ملکہ کتابوں کے اس مجموعہ پر نظر ڈالی تو میرا پہلا تاثریہ تھا کہ سارے کام کا جچھوڑ کر اسی کے سامنے دوڑا نوبیٹھ جانا چاہیے۔ تاریخ میرے مطالعے کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس میں سے اہل حق کی جدوجہد اور خدمات کی تاریخ کے دائرے میں کچھ نہ کچھ کارروائی میں بھی وقتی نوقتناً تاریخ ہتا ہوں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحمیں اور ان کے فرزند دل بند مولانا سمیع الحق کے نام وقت کے مشاہیر کے خطوط جن میں سیاست دان، حکمران، علمائے کرام، مشائخ عظام، ارباب فکر و انش، مفکرین و مدرسین، وکلاء، صحافی اور دیگر طبقات کی سر کردہ شخصیات شامل ہیں، تاریخ کا ذوق رکھنے والے اسکارلوں اور میرے جیسے طلبہ کیلئے اتنا قبیلی انشاہ ہیں کہ اس کی قدر ویقت کو الفاظ میں بیان

نہیں کیا جاسکتا۔

خداجانے اس کے تفصیلی مطالعہ کا وقت کب ملتا ہے، جو بظاہر شوال المکرم کی تعطیلات سے پہلے بہت مشکل دکھائی دے رہا ہے، مگر اس کے سرسری تعارف کیلئے میں نے سردوست اس کی پہلی جلد کا انتخاب کیا ہے جو شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کے نام ان کے معاصر مشاہیر کے خطوط پر مشتمل ہے اور دینی جدوجہد کے ایک پورے دور کا احاطہ کرتی ہے۔ ”مشاہیر“ کے عنوان سے آٹھ خیم جملوں پر مشتمل اس کتاب کی عمومی ترتیب یہ ہے کہ پہلی جلد شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کے نام خطوط کیلئے مخصوص ہے، جلد دوم سے جلد پنجم تک حروف تجھی کے لحاظ سے مشاہیر کے مولانا سمیع الحق کے نام خطوط کی چار جملوں ہیں، جلد ہشتم افغانستان کے جہاد کے دوران کی اہم روپرتوں اور جہادی راہ نماوں کے خطوط اور سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے، جلد ہفتہم میں یہودی ملکوں کے مشاہیر کے خطوط شامل کیے گئے ہیں، جبکہ جلد ہشتم ضمیمه جات، اضافات اور توضیحات کو سمیٹے ہوئے ہے۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ کے نام مشاہیر کے خطوط کیلئے مخصوص پہلی جلد پونے سات سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان مشاہیر کی فہرست پر میں نے اس خیال سے نظر ڈالی کہ اس کالم میں تذکرہ کیلئے ان میں سے چند زیادہ اہم بزرگوں کے ناموں کا انتخاب کر سکوں، مگر مجھے اس میں کامیاب نہیں ہوئی کہ کوئی نام بھی ایسا نہیں ہے جسے اہمیت کے خانہ نمبر دو میں رکھا جاسکے، البتہ اس حوالے سے مولانا سمیع الحق کا بے حد شکر گزار ہوں کہ حضرت شیخ الحدیث کے نام رقم الاحروف کے تین خطوط شامل کر کے ان کے اس نیازمند و عقیدت مند کو بھی ”خریداران یوسف“ کی اس فہرست میں شریک کر لیا ہے جو میرے لیے اعزاز و فخار کی بات ہے۔

حضرت مولانا عبد الحقؒ کا شمار پاکستان ہی نہیں، بلکہ جنوبی ایشیا کی ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ وسطی ایشیا میں علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ و فروغ کا ذریعہ بنیں۔ تعلیمی اور تہذیبی حوالے سے مولانا عبد الحقؒ کی دینی، علمی، تدریسی اور فکری خدمات جنوبی ایشیا اور اس کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا میں دینی جدوجہد کی اس کی حیثیت رکھتی ہیں اور افغانستان کو بھیجا جائے تو اس کی پشت پر مولانا عبد الحقؒ کی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی ہے جو بظاہر ایک مختنی ساوہ جو درکھت تھے، لیکن علم و فضل اور عزم و ہمت کے اس کوہ گرال کے ساتھ کیونزم کے فلسفہ و نظام نے سرچنہ پر گرفتار ہی بکار لیا اور آج کامورخ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جہاد افغانستان کی علمی، فکری اور دینی اساس مولانا عبد الحق کی شخصیت اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والا تعلیمی ادارہ دارالعلوم حقانی ہے جس کے اثرات افغانستان اور وسطی ایشیا کا پانے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔

”جہاد افغانستان“ کی علمی و فکری آبیاری میں ہمارے بہت سے بزرگوں کا حصہ ہے، مگر میں تاریخ کے ایک طالب علم اور اس جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر تین شخصیات کو ان سب کا سرخیل سمجھتا ہوں، ان میں سے سب سے پہلا نام حضرت مولانا عبد الحقؒ کا ہے اور ان کے بعد جہاد افغانستان کے علمی و فکری سپرستوں میں میرے خیال میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی اور مولانا مفتی محمود کا نام آتا ہے جنہوں نے نہ صرف پاکستان کے علماء و طلباء کو جہاد افغانستان کیلئے ذہنی طور پر تیار کیا، افغان مجاہدین کی سیاسی و اخلاقی پشت پناہی کی، جہاد افغانستان کے خلاف مختلف اطراف

سے اٹھائے جانے والے شکوک و اعتراضات کا جواب دیا اور جہاد افغانستان کی ہر لحاظ سے پشتیبانی کی۔ حضرت مولانا عبدالحق میں خدمات کو میں ایک اور حوالے سے بھی تاریخ کا انہم حصہ شمار کرتا ہوں، وہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی دستوری جدوجہد کا باب ہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلیوں میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شیعہ احمد عثمنی کے بعد جس شخصیت نے دستور سازی میں سب سے زیادہ سنبھیہ کردار ادا کیا ہے اور دستور سازی کے تمام مرحلے میں پوری توجہ اور تیاری کے ساتھ محنت کی ہے، وہ حضرت مولانا عبدالحق ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کے مرحلے میں حضرت مولانا مفتی محمود قائد حزب اختلاف تھے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا صدر الشہیدؒ، مولانا عبد القائمؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور بہت سے دیگر بزرگوں نے اس دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کیلئے محنت کی، مگر دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کا مطالعہ کیا جائے اور دستور سازی کے مختلف مرحلے پر نظر ڈالی جائے تو حضرت مولانا عبدالحقؒ کے جدا گانہ اور امتیازی کردار کا تذکرہ بہر حال ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا عبدالحقؒ ہمارے ملی اور تو قومی محسین میں سے ہیں اور ان کے نام ان کے معاصر مشاہیر کے یہ خطوط ان کی جدوجہد اور خدمات کے مختلف بہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میں ان خطوط کی اشاعت پر مولانا سمیع الحق کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ دینی جدوجہد اور تاریخ کا ذوق رکھنے والے حضرات اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

## علماء کرام کی شہادتوں کا سلسلہ

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۱۸ مئی ۲۰۱۲ء

- گذشتہ دو روز سے مولانا محمد شیخوپوری کی المناک شہادت پر تعزیت پروگراموں کا سلسلہ جاری ہے:
- جامعہ نصرۃ العلوم میں طلبہ کے اجتماع میں راقم الحروف نے مولانا شہیدؒ کی دینی و علمی خدمات کا مختصر تذکرہ کیا، انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا، ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی ہوئی اور ان کیلئے دعائے مغفرت کی گئی۔
- ۱۵ مئی کو دارالعلوم گجرات میں جمعیت علماء اہل السنۃ کے زیر اہتمام ایک تعزیت نشست ہوئی جس میں علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔
- دارالعلوم جی ٹی روڈ گجرات کے فیکٹری ایبیا میں پاک فین کے عقب میں اسی سال شروع ہوا ہے اور مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے ہی شوال المکرم میں اس کا افتتاح کیا تھا۔ پروفیسر مولانا محمد اشفاق اور ان کے فرزند مولانا صہیب اشفاق اس کے منتظم ہیں اور دونوں بap بینا جامعہ نصرۃ العلوم کے فضلاء میں سے ہیں۔ اس تعزیت نشست میں مولانا شیخوپوری کے حالات زندگی اور خدمات کے تذکرہ کی سعادت حاصل ہوئی اور مختلف علماء کرام نے ان کی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا۔ ہمارے عزیز شاگرد مولانا حافظ محمد عمر عثمانی اس نشست کے اہتمام میں پیش پیش تھے۔

۹۔ ظہر کے بعد مرکزی جامع مسجد گورنالہ میں جمیعت اہل السنۃ ضلع گورنالہ کی مجلس شوریٰ کا اجلاس تھا جس میں مولانا محمد اسلم شیخوپوری<sup>ؒ</sup>، مولانا سید محسن شاہ، مولانا نصیب خان<sup>ؒ</sup> اور دیگر شہداء کیلئے دعائے مغفرت کی گئی اور ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے المناک قتل کی شدید مدت کی گئی اور حکومت سے مطالہ کیا گیا کہ علماء کرام کے قتل عام کے سلسلہ کروکنے کیلئے سنبھیجہ اقدامات کیے جائیں اور قاتلوں کو جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ اجلاس جمیعت اہل السنۃ کا اختتامی اجلاس تھا جس کی صدارت مولانا محمد ایوب صدر نے کی اور اس میں حاجی عثمان عمرہاشی کو جمیعت اہل السنۃ کا ضلعی صدر اور بابر رضوان باجوہ کو سیکرٹری جعل منتخب کیا گیا۔

۱۰۔ اسی روز عصر کے بعد الشریعہ اکادمی میں تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مولانا سید غلام کبریا شاہ نے کی اور اس سے مولانا جبیل احمد گیل، بابر رضوان باجوہ، مولانا حافظ محمد یوسف، حافظ عبد الرشید اور راقم الحروف نے خطاب کیا۔ میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ مولانا نصیب خان<sup>ؒ</sup>، مولانا سید محمد محسن شاہ<sup>ؒ</sup> اور مولانا محمد اسلم شیخوپوری<sup>ؒ</sup> سب ہمارے محترم تھے اور سب کی شہادت اور جدائی پر ہم غمزدہ ہیں لیکن مولانا محمد اسلم شیخوپوری<sup>ؒ</sup> کی شہادت پر ہمارا صدمہ دوہرا ہے اس لیے کہ وہ ہمارے ساتھی تھے اور انہوں نے طالب علمی کا ایک دور ہمارے در میان گزارا ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوری<sup>ؒ</sup> نے دینی تعلیم کا آغاز باغبانی پورہ لاہور میں ہمارے مخدوم حضرت مولانا محمد اسحاق قادری<sup>ؒ</sup> کے ہاں کیا تھا جو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری<sup>ؒ</sup> کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا شیخوپوری<sup>ؒ</sup> نے صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی اور ان کے بچوں کے ساتھ کچھ عرصہ ان کے گھر میں رہے، حضرت مولانا محمد اسحاق قادری<sup>ؒ</sup> کی الہیہ محترمہ ان سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں اور وہ بھی ان سے بہت منوس تھے۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوری<sup>ؒ</sup> نے درس نظامی کی تکمیل جامعہ نصرۃ العلوم گورنالہ میں کی اور وہیں دورہ حدیث کر کے فراغت حاصل کی۔ بعد میں وہ کربلی تشریف لے گئے اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوی ٹاؤن کے دورہ حدیث میں بھی شریک ہوئے۔

قرآن کریم کے درس کا ذوق انہوں نے اپنے دو بزرگ اساتذہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدر<sup>ؒ</sup> اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی<sup>ؒ</sup> سے پایا اور وہ اس کا مختلف موقع پر ترقہ بھی کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدر اپنے شاگردوں کو بطور خاص اس کی تلقین کیا کرتے تھے کہ جہاں بھی جاؤ درس قرآن کریم کا سلسلہ ضرور قائم کرو، وہ نوجوانوں کیلئے ترجمہ قرآن کریم اور ملکی پھیلکی عربی گرامر کی تعلیم پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ جبکہ مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہید اُج کے دور میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی<sup>ؒ</sup> کی اس تعلیمی و فکری جدوجہد کا اہم کردار تھے جو حضرت شیخ الہند نے مانگا کی قید سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس پہنچنے پر شروع کی تھی کہ مسلمانوں میں اجتماعیت کے فروع کی مختت کی جائے اور قرآنی تعلیمات عام مسلمانوں تک پہنچانے کی جدوجہد کی جائے۔ مولانا شیخوپوری<sup>ؒ</sup> نے قرآن کریم کے درس کیلئے جو اسلوب اختیار کیا وہ آج کے نوجوان علماء کرام کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

علماء کرام کے اس المناک اور مسلسل قتل عام کے سلسلہ میں راقم الحروف نے عرض کیا کہ افغانستان میں روس کی شکست اور روی افواج کی واپسی کے بعد جو نیو ولڈ آرڈر امریکہ کی طرف سے جاری ہوا تھا اس کی ایک باقاعدہ شق تھی کہ مسلم سوسائٹی میں جو علماء کرام اور دانشور عوام تک رسائی رکھتے ہیں اور جن کی باتیں رائے عامہ پر اثر انداز ہوتی ہیں انہیں عام مسلمانوں سے دور کھا جائے۔ اس مقصد کیلئے ہی دینی مدارس کے خلاف نفرت انگیز مضمون چالائی گئی تھی جو آب بھی جاری ہے اور اس کا ہدف یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو دینی تعلیم اور دینی مدارس سے دور کیا جائے۔ لیکن یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ مہم الٹ پڑھنی، جوں جوں دینی مدارس کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈا برپتا گیا اور کردار کشی کی مہم زور پکڑنی گئی اس کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور طلباء و طالبات کی تعداد بھی مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ دینی قیادت اور دینی مدارس کی کردار کشی کی اس مہم میں علمی استعمار کو ناکامی کا سامنا کرنے پڑا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ علماء کرام کا یہ قتل عام اسی مہم کا ایک اور رخ ہے، بالخصوص کربلی کے بارے میں گذشتہ دو عشروں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ دینی حوالے سے جو شخصیت بھی عوام میں مقبولیت حاصل کرتی ہے اور جس کے گرد عوام کا جمجم جمع ہونا شروع ہوتا ہے اسے شہید کر دیا جاتا ہے۔

مولانا نبیس الرحمن درخواستگی شہادت سے لے کر مولانا محمد اسلم شینپوری گی شہادت تک ہمارے جتنے بزرگ اور ساتھی شہید ہوئے ہیں ان سب میں مشترک بات یہ تھی کہ وہ دین کیلئے ہمہ وقت متحرک تھے اور ان کے گرد علماء کرام کے ساتھ ساتھ عوام بھی جمع ہو رہے تھے۔ یہ آج کے علمی استعمار کے ایجنسی کے ساتھ سے اہم ہدف ہے کہ علماء کرام اور خاص طور پر وہ علماء کرام جو دینی و فکری بیداری کا ذریعہ بنتے ہیں اور آج کے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر عوام کی راہنمائی کرتے ہیں انہیں عوام سے دور کھا جائے۔ لیکن مجھے لیکن ہے کہ استعمار کی یہ مہم بھی ناکامی سے دوچار ہو گی، علماء کرام کی شہادتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن علماء اور عوام کا راستہ توڑنے کی مذموم کوشش ان شاء اللہ تعالیٰ بالآخر دم توڑ جائے گی بلکہ علماء کرام کی شہادتوں اور ان کے مقدس خون کی برکت سے یہ رشتہ اور مضبوط ہو گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہم غمزہ ضرور ہیں مگر ما یوس قطعاً نہیں ہیں اور نہ ہی شہادتوں کا یہ سلسلہ ہمارے حوصلوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی جدوجہد ہے جو اپنی روایات کے مطابق آگے بڑھتی رہے گی، اللہ تعالیٰ تمام شہداء کو جنت الفردوس میں جگ دے اور ہم سب کو ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق سے نوازے، آمین یا رب العالمین۔

## طالبان کیلئے امریکی امداد

روزنامہ پاکستان، لاپور--- یکم اگست ۲۰۱۲ء

”اردو نیوز“ نے نیٹو کے ایئریگریشن میں کے ڈائریکٹر میجر جzel ڈیوڈ ہوک کا یہ بیان شائع کیا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی وفاداریاں خریدنے کے حوالے سے نیٹو حکمت عملی بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت

صرف ۵ ہزار طالبان جنگجو ہتھیاروں سے دستبردار ہوئے، اس منصوبے کے اثرات ملک میں بہت معمولی رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں امریکی قیادت میں ایک پروگرام تشكیل دیا گیا تھا جس کے تحت افغانستان میں ہتھیار ڈالنے والے طالبان کیلئے تین ماہ کے اندر ۳۶۰ لارہ ایک جنگجو کو دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسی صفحہ پر شائع ہونے والی دوسری خبر یہ ہے کہ امریکہ کے سیاسی امور کے معروف ماہر اور کیلیغور نیا اسٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر پال شیلڈن نونے کہا ہے کہ امریکہ افغانستان میں فوجی ہم جوئی اور قبضہ برقرار رکھنے کیلئے ٹکس دہندا گاں سے حاصل شدہ رقم افغان جنگ کی آگ میں جھوٹک رہا ہے۔ ایرانی ڈی سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ویتنام کی جنگ کی طرح امریکہ افغانستان کی جنگ پر بھی بے پناہ بیسہ ضائع کر رہا ہے۔

امریکہ کی قیادت میں نیٹو افواج نے آج سے دس سال قبل جب افغانستان پر فون کشی کی تھی تب سے ہم یہ کہتے آ رہے ہیں کہ یہ جنگ کبھی کامیاب نہیں ہو گی اس لیے کہ ”طالبان“ کسی گروہ یا طبقے کا نام نہیں ہے بلکہ افغان قوم کی اسلامی حمیت، قومی غیرت اور خود مختاری کی محکم روایت نے طالبان کا عنوان اختیار کر لیا ہے۔ اس لیے یہ جنگ کسی گروہ کے خلاف نہیں بلکہ افغان قوم کے خلاف ہے اور قوموں کو بھی میدان جنگ میں شکست نہیں دی جاسکتی۔ آج بھی اس مسئلہ کا حل جنگ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک افغان قوم کے جذبہ حریت کا احترام کریں، طالبان کا وجود تسلیم کریں، افغانستان کی خود مختاری کو قبول کریں اور زمینی حقوق کی بنیاد پر جنگ بندی کا راستہ اختیار کر کے طالبان کے ساتھ سیاسی مذاکرات کے ذریعے افغان قوم کو پوری آزادی کے ساتھ اور کسی قسم کے دباؤ کے بغیر افغانستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا آزادانہ موقع فراہم کریں۔

اس خبر سے ایک اور فائدہ بھی ہوا، ہمیں کافی عرصہ سے افغانستان میں امریکی اتحاد کے خلاف نبرد آزما جنگجو طالبان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانے میں مشکل پیش آرہی تھی، میجر جزل ڈیوڈ ہوک نے یہ بتا کر ہماری مشکل کسی حد تک آسان کر دی ہے کہ پانچ ہزار جنگجو طالبان کا ان کے بقول ہتھیار ڈالنا آگر ”صرف“ اور ”بہت معمولی“ ہے اور اسے طالبان کی وفاداریاں خریدنے کی پائیں کی ”بری طرح ناکامی“ سے تعبیر کرنا پڑ رہا ہے تو افغانستان میں جنگ لڑنے والے طالبان کی اصل تعداد کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔

----

## حقانی نیٹ ورک اور دفاع پاکستان کونسل

روزنامہ وزارت لاپور میں ۱۳ ستمبر ۲۰۱۲ء کو شائع ہونے والے انٹرویو سے انتخاب

وزارت: حقانی نیٹ ورک پر لگنے والے امریکی الزم کے بعد طالبان کا رد عمل کیا ہو گا؟

جواب: یہ حرہ طالبان پر مذاکرات کے حوالے سے دباؤ ڈالنے کیلئے اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو امریکہ مختلف حوالوں سے طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہا ہے اور افغانستان کے مستقبل کے نقشہ میں طالبان کے کردار پر گفتگو چل

رہی ہے، جبکہ دوسری طرف طالبان ہی کے ایک حصہ حقانی نیٹ ورک کو ہشت گرد فرار دے دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں حالیہ امریکی اقدامات کا مقصد اس کے سوا اور کیا بھا جا سکتا ہے کہ امریکہ مذکورات کے دوران طالبان کو دباؤ میں رکھنا چاہتا ہے تاکہ مستقبل میں ان کے کردار کو محدود سے محدود تر کیا جاسکے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بے فائدہ بات ہے اس لیے کہ طالبان نے گذشتہ ۱۰ ابرسون کی جنگ میں اپنی پوزیشن دنیا سے تسلیم کروالی ہے، لہذا فیصلے تو اسی تناظر میں ہوں گے۔

وزارتِ دفاع پاکستان کو نسل کا مستقبل کیا ہے؟

”دفاع پاکستان کو نسل“ ایک اچھے مقصد کے تحت عوامی دباؤ کو منظم کرنے کیلئے قائم ہوئی تھی اور اس کا خاطر خواہ فائدہ بھی حاصل ہوا ہے۔ اس کا بنیادی ہدف امریکہ کی مخالفت ہے جو کہ حکومت کے بھی مفاد میں ہے کہ وہ امریکہ کے ساتھ زیادہ اعتماد کے ساتھ بات چیت کر سکے۔ یہ عوامی دباؤ ہماری تو می ضرورت ہے، میرے خیال میں دفاع پاکستان کو نسل کو نہ صرف اپنا یہ کردار مسلسل جاری رکھنا چاہیے بلکہ خود کو اسی مقصد کیلئے محدود رکھنا چاہیے۔

## افغانستان کی صورتحال اور قاضی حسین احمد

روزنامہ اسلام، لاپور ۱۳ جنوری ۲۰۱۳ء

قاضی حسین احمد ملک میں نفاذ اسلام اور دیگر دینی و قومی تحریکات کیلئے دینی جماعتوں اور مختلف مکاتب فکر کے درمیان مشترکہ جدوجہد کی راہ ہموار کرنے میں ہمیشہ متحرک رہتے تھے، ان میں بات سننے کا حوصلہ تھا، اس لیے ہم ان سے بعض نازک معاملات پر بھی بے تکلفی سے بات کر لیا کرتے تھے۔ جن دونوں قاضی صاحب کا لندن میں دل کا بائی پاس آپر لیشن ہوا، میں لندن میں تھا، ان کی بیمار پر سی کیلئے حاضر ہوا تو وہاں مجلس میں افغانستان کی خانہ جنگی زیر بحث تھی، ان دونوں انجینئرنگ بیویوں میں سخت جنگ میں حصہ ہو رہا تھا لیکن انہوں نے وزارتِ عظمیٰ قبول افغانستان کے صدر تھے، ان کے ساتھ انجینئرنگ بیویوں کے درمیان جنگ نے بہت تباہی پھیلائی۔ طالبان اسی خانہ جنگی کے رد عمل میں سامنے آئے تھے، میں نے اس مجلس میں قاضی صاحب مر حرم سے کہا کہ انجینئرنگ بیویوں کے ساتھ فریق بن لیا گیا تھا لیکن انہوں نے وزارتِ عظمیٰ قبول نہیں کی اور ان دونوں دھڑوں کے درمیان جنگ نے بہت تباہی پھیلائی۔ طالبان اسی خانہ جنگی کے رد عمل میں سامنے آئے تھے، میں نے کہا کہ یہ دونوں آپ کے سیاسی حلقوں کے لوگ ہیں، سیاسی فکر کے حوالے سے دونوں کا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے، آپ کوکس نے مشورہ دیا تھا کہ آپ گلبدین حکمت یار کے ساتھ فریق بن کر کھڑے ہو جائیں، آپ ہی ان میں صلح کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن آپ نے حکمت یار کے حق میں فریق بن کر خود کو جانبدار بنا لیا ہے اس لیے اب کون ان میں صلح کرائے گا؟ یہ بات سن کر قاضی صاحب تو خاموش ہو گئے لیکن مجلس کے دوسرے حضرات نے میری بات کی تائید کی۔

بہر حال قاضی حسین احمد ایک فکرمند، حوصلہ مند اور در دل سے بہرہ در را نہ مانتے، ان کی جدائی ہم سب کیلئے صدمہ کی بات ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دیں اور پسمند گان کو صبر جیل کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔

## اسلامی نظام کی جدو جہد اور اس کی حکمتِ عملی

مابنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- فوری ۲۰۱۳ء

ہمارے ہاں پاکستان کی معروضی صورتحال میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے دو ذہن پائے جاتے ہیں:

- ایک یہ کہ سیاسی عمل اور پارلیمنٹی قوت کے ذریعے اسلام نافذ ہو جائے گا،
  - اور دوسرایہ کہ ہتھیارِ اٹھائے بغیر اور مقتدر قوتوں سے جنگ لڑے بغیر اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔
- ایک طرف صرف پارلیمنٹی قوت پر انحصار کیا جا رہا ہے جبکہ دوسری طرف ہتھیارِ اٹھا کر عسکری قوت کے ذریعے مقتدر قوتوں سے جنگ لڑنے کو ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ دونوں طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ صرف ایکش، جبہوریت اور پارلیمنٹی قوت کے ذریعے نفاذِ اسلام اس ملک میں موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے، اور ہتھیارِ اٹھا کر حکمران طبقات کے ساتھ جنگ کرنا اس کے شرعی جواز یا عدم جواز کی بحث سے قطع نظر بھی عملاً مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ ہے کہ کسی مسلم ریاست میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہتھیارِ اٹھانے کی شرائط فقهاء کرام نے کیا بیان کی ہیں، اور خاص طور پر جمہور فقهاء احتجاف کا موقف اس سلسلہ میں کیا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا عسکری گروپوں کیلئے ملک کی فوج اور اسٹیبلشمنٹ سے جنگ لڑ کر کوئی علاقہ حاصل کر لینا اور اس پر قبضہ برقرار رکھ کر اس میں کوئی نظام نافذ کر لینا ممکن بھی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہوش مند شخص اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سلسلہ میں جدو جہد کے طریق کار کی حد تک ایران کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایران کی مذہبی تیاریت نے شاہ ایران کی تیاریت سے اخراج کر کے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ذہنی اور فکری بیداری کی جوانانگاہ بنایا، مسلسل سترہ برس تک محنت کے ذریعے اگلی نسل کو اس کیلئے تیار کر کے اسے اپنی قوت بنایا اور اس قوت کے ذریعے ہتھیارِ اٹھائے بغیر اسٹریٹ پاؤ اور تحریکی قوت کے نتیجے میں شاہ ایران کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں ایرانیوں کے مذہب کی نہیں بلکہ ان کی جدو جہد کے طریق کار کی بات کر رہا ہوں کہ ان کے کامیاب تجربہ کو سامنے رکھ کر کیا ہم اپنی جدو جہد کا طریق کا راستے نہیں کر سکتے؟

اگر کچھ دوستوں کو یہ حوالہ میرے قلم سے پسند نہ آ رہا ہو تو میں امریکہ کے سیاہ فاموں کی اس جدو جہد کا حوالہ دینا چاہوں گا جو اب سے صرف پون صدی قبل کالوں کو گروں کے برابر شہری حقوق دلوانے کیلئے منظم کی گئی تھی۔ ایک مذہبی لیڈر مارٹن لو ہر کنگ نے سیاہ فاموں کی اسٹریٹ پاؤ کو کو منظم کیا، پر آمن احتجاجی تحریک کو آگے بڑھایا اور صرف دو

عشروں میں ایک گول چلائے بغیر ۱۹۶۳ء میں اس وقت کے امریکی صدر جان ایف کینیڈی سے سیاہ فام آبادی کیلئے سفید فاموں کے برابر شہری حقوق کی دستاویز پر دستخط کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، دونوں کے کے مرکز میں گیا ہوں، ان کے رانہماوں سے ملاقاتیں کی ہیں اور ان کی جدوجہد کے مختلف مراحل سے واقع ہوں۔ میں افغانستان بھی گیا ہوں، بار بار گیا ہوں، روئی استعمار کے خلاف جہاد میں مختلف جنگی مجاہدوں پر حاضری دی ہے، افغان مجاہدین کی روئی استعمار کے خلاف جنگ کو جہاد سمجھ کر اس میں شریک ہوا ہوں، امریکی استعمار کے خلاف ان کی جنگ کو بھی جہاد سمجھتا ہوں اور حتی الوعظ اسے سپورٹ کرتا ہوں۔ لیکن پورے شرح صدر اور دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ دینی قصلب اور حمیت و غیرت میں توبلا شہر افغان مجاہدین اور افغان طالبان ہمارے لیے مشعل رہا ہیں لیکن نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے طریق کارکے حوالے سے ہمیں ایران کی مذہبی تحریک کا مطالعہ کرنا ہو گا اور مارٹن لو تھر کنگ کی تحریک سے واقفیت حاصل کرنا ہو گی۔ اگر پرآمن عوامی تحریک اور رائے عامہ کی منظم قوت کے ذریعے ”ناست“ کو دستوری شکل دے کر اسے نافذ کیا جا سکتا ہے تو ”خلافت“ کے احیا و قیام کیلئے یہ قوت آخر کیوں کام میں نہیں لائی جا سکتی؟

## افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: مقاصد و اهداف

مابنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۳ء

صدر او بمانے دوسری مدت صدارت کی پہلی پالیسی تقریر میں ۲۰۱۳ء کے آخر تک افغان جنگ ختم کر دینے کا باضابطہ اعلان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ القاعدہ کو غیر مؤثر بنانے کا ان کا ہدف پورا ہو گیا ہے اس لیے اب جنگ کو مزید جاری نہیں رکھا جائے گا۔

یہ جنگ القاعدہ کے خلاف تھی یا افغان طالبان اس کا اصل ہدف تھے؟ جن افغان طالبان کی حکومت کو نیٹو افونج کی عسکری یلغار کے ذریعے ختم کر دیا گیا تھا ان سے مذاکرات کی مسلسل کوششیں اس جنگ میں امریکہ اور نیٹو افونج کی ”کامیابی“ کی اصل کہانی بخوبی بیان کر رہی ہیں اور اس سلسلہ میں ہمیں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ جبکہ خطہ سے امریکی اور نیٹو افونج کے بڑے حصے کے انخلاء کے بعد صورتحال کیا ہو گی اس کے بارے میں کچھ کہنا شاید قبل از وقت ہو۔ البتہ پاکستان کی سیاسی اور فکری دانش کے بعض دائروں میں ممکنہ خطرات و خدشات پر جو اولیا ہمیشہ شروع ہو گیا ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے بعض دانشوروں کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ افغانستان میں افغان طالبان اپنی واپسی کی صورت میں پہلے سے زیادہ طاقت ور ہوں گے اور ایک بڑی قوت کے مقابلہ میں فتح کا احساس ان کی قوت کو دو اتنے کر دے گا۔ اس لیے پاکستان پر ان کے فکر و فلسفہ کے اثر انداز ہونے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص اس صورت میں کہ پاکستان میں طالبان کے فکر و فلسفہ کے حامل لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور بوقت ضرورت وہ ایک مؤثر قوت کی

صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہمارے ان دانشوروں کو اے این پی کے نزیر اہتمام منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس کے اس متفقہ موقف کے بارے میں بھی تحقیقات درپیش ہیں کہ پاکستانی طالبان کی طرف سے مذکورات کی پیش کش کو قبول کیا جائے اور مذکورات کے ذریعے مسئلہ حل کر کے امن کے قیام کو ترجیح دی جائے۔ حالانکہ اے این پی کی اس اے پی سی کا یہ موقف پوری قوم کی دولت کی آواز ہے اور موجودہ حالات کے تناقض میں باہمی جنگ و جدال کی دلدل سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ لیکن دانش کی ایک سطح کو یہ خوف لاحق ہے کہ اس سے طالبان کو اپنی سوچ اور وژن کے مطابق نفاذِ اسلام میں پیشرفت کا موقع مل سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کرنے سے قبل اس بات کیوضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ ہم نے اپنی گزارشات میں ہمیشہ افغان طالبان اور پاکستانی طالبان کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ فرق آج بھی پوری طرح ہمارے سامنے ہے۔

افغان طالبان جہادِ افغانستان میں روایی استعمال کی شکست اور سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد رونما ہونے والی خانہ جنگی کے رد عمل میں منظر عام پر آئے تھے۔ یہ خانہ جنگی مغربی قوتوں نے جہادِ افغانستان کے ذریعے سوویت یونین کے خلاف اپنے مقاصد کے حصول کے بعد افغانستان کو تباہ چھوڑ دینے کی شعوری یا غیر شعوری پالیسی اختیار کر کے پیدا کی تھی۔ اور اس خانہ جنگی ختم کرنے کی کسی سنجیدہ کوشش کی بجائے افغان مجاهدین کی مغربی اتحادی قوتوں نے نہیں ان کے حال پر چھوڑ کر اس خانہ جنگی کی عملاً حوصلہ افزائی کی تھی۔ افغان طالبان نے جہادِ افغانستان کے نظریاتی مقاصد کے حصول اور افغانستان کے اسلامی نظریاتی تشخص کے تحفظ کیلئے میدان میں قدم رکھا اور کامیابی حاصل کی جسے القاعدہ کی آڑ میں امریکہ اور نیویوکی فوجوں نے عسکری یلغار کے ذریعے ختم کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ افغانستان پر غیر ملکی جاریت کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور اسی جوش و جذبہ کے ساتھ لڑ رہے ہیں جس کے ساتھ انہوں نے سوویت یونین کی عسکری جاریت کے خلاف جنگ لڑی تھی۔

مگر پاکستانی طالبان کا دائرہ اس سے مختلف ہے۔ انہوں نے پاکستان میں نفاذِ شریعت کیلئے ہتھیار اٹھائے اور ان کا آغاز حکومت پاکستان کے ساتھ نفاذِ شریعت کے ایسے معاهدات سے ہوا تھا جو ملک کے دستوری فریم و رک کے اندر تھے مگر ان سے یہے گئے وعدوں کو عدم اتوڑ دیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پہلے صوفی محمد کے ساتھ اور پھر پاکستانی طالبان کے ساتھ کیے جانے والے معاهدوں کی پاسداری کی جاتی تو آج یقیناً یہ صورت حال نہ ہوتی جو ہمارے ان دانشوروں کو پریشان کر رہی ہے۔ ہم نے پاکستانی طالبان کے ہتھیار اٹھانے کی کبھی حمایت نہیں کی اور نہ ہی اب اسے درست سمجھتے ہیں لیکن ان کے اس مطالبہ کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ساتھ مختلف موقع پر جو معاهدات کیے گئے ہیں ان کی پابندی کی جائے اور ان پر عملدرآمد کیا جائے۔ بلکہ ہم اس سے آگے بڑھ کر یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ریاست سوات، بہاولپور اور قلات کو پاکستان میں شامل کرتے وقت ان کے عدالتی نظام کے بارے میں جو معاهدے کیے گئے تھے اگر انہیں سردخانے میں نہ ڈال دیا جاتا تو صوفی محمد پاکستانی طالبان اور عسکریت پسندوں کا دور دور تک کوئی وجود نہ ہوتا۔

اس لیے ہم اس تاریخی تسلسل کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے کہ آج کی صورت حال ان مذکورہ معاهدات کی خلاف ورزی کا رد عمل اور منطقی تیجہ ہے اور اس صورت حال سے نکلنے کیلئے قوم کو بحیثیت قوم ان معاهدات کی طرف واپس جانا ہو گا،

اس کے بغیر ان خطرات و غدشات کے سدباب کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے جس کا ہمارے دانشوروں کی طرف سے اظہار کیا جا رہا ہے۔ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ بعد کی ساری باتیں چھوڑ دیجئے، صرف ان معابدوں کی گرد جھاڑ کر اُنہیں سامنے لائیے جو سوات، قلات اور بہاولپور کی ریاستوں کو پاکستان میں شامل کرتے وقت کیے گئے تھے اور ان پر عملدرآمد کا اہتمام کر لیجئے، اس ساری شدت پسندی اور عسکریت کی ہوا کھڑ جائے گی۔

باقی ہی بات نفاذ اسلام کے وژن کی، ہم اپنے محترم دانشوروں کو یاد لانا چاہیں گے کہ پاکستان بننے کے بعد جمہور علماء اسلام نے علامہ اقبال کا وژن قبول کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ذریعے نفاذ اسلام کا راستہ اختیار کیا تھا اور قادر یانیوں کو مرتد قرار دے کر قتل کرنے کی بجائے ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر قبول کر لینے کا فیصلہ بھی اقبال کے وژن پر ہی کیا گیا تھا۔ مگر ہمارے ان مہریاں دانشوروں نے جمہور علماء اسلام کے اس اجتہادی فیصلے کا لئتا احترام کیا ہے؟ قرارداد مقاصد، پاکستان کی اسلامی نظریاتی شناخت، قادر یانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ، ناموس رسالت کے تحفظ کا قانون، اور دستور کی دو گمراہی دفعات منتخب پارلیمنٹ کے فیصلے ہیں۔ اور ان میں سے پیش فیصلے پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی چھٹو مرحوم کی سرکردگی میں ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارے بعض دانشوروں نے منتخب پارلیمنٹ کے ان جمہوری فیصلوں کے خلاف جمیلیہ کا اکار کھا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علماء کرام تو اقبال کے وژن پر آگئے تھے، انہوں نے اقبال کا وژن قبول کر کے اس کے مطابق جمہوری اسلامی ریاست کا راستہ اختیار کر لیا تھا اور جمہور علماء پاکستان آج بھی اس وژن پر قائم ہیں۔ لیکن حکمران طبقوں اور سیکولر دانشوروں نے عوام کے منتخب نمائندوں کے جمہوری فیصلوں کے خلاف جو روشن گذشتہ ساٹھ بر س سے اختیار کر کھی ہے اس کے رد عمل میں اس شدت پسندی اور عسکریت نے جنم لیا ہے جو پوری قوم کیلئے اخطراب کا باعث بھی ہوئی ہے۔ ہم ایک لمحہ کیلئے اس شدت پسندی اور عسکریت کے حامی نہیں ہیں لیکن جس روشن نے حالات کو یہاں تک پہنچایا ہے اسے تبدیل کیے بغیر اس پر قابو آخر کیسے پایا جاسکتا ہے؟ اس شدت پسندی اور عسکریت کے سدباب کیلئے دستور کی اسلامی بنیادوں کو تسلیم کرنے کا اعلان کیجئے اور ان پر خلوص دل کے ساتھ عملدرآمد کا اہتمام کیجئے، شدت پسندی کا راستہ خود بخوبی بند ہو جائے گا اور ان کیلئے قوم کے اجتماعی فیصلے کے سامنے سر نذر ہونے کے سوا کوئی آپشن باقی نہیں رہے گا۔

## افغان راہنما مولانا جلال الدین حقانی کی اپیل

روزنامہ اسلام، لاپور--- ۲۰ اپریل ۲۰۱۳ء

جوں جوں ایکشن قریب آرہے ہیں اہل دین کی تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ قوی سیاست میں حصہ لینے والی دینی جماعتوں یا پاکستان کے اسلامی نظریاتی شخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں پر یقین رکھنے والی پارٹیوں کے مشترکہ طور پر ایکشن لڑنے کی عمومی خواہش تقریباً دم توڑ گئی ہے اور باہمی سیٹ ایئچ جسمنٹ کے ذریعے باہمی مذاہاری کو روکنے کے

امکانات بھی معدوم ہوتے نظر آتے ہیں۔

آنے والے عام انتخابات کے بارے میں ہر ذی شعور سیاسی کارکن کا ہنا ہے کہ یہ انتخابات اور ان کے نتائج نہ صرف پاکستان کے مستقبل بلکہ پورے جنوبی ایشیا کی صورت حال کے حوالے سے انتہائی اہم ہوں گے اور خاص طور پر پاکستان کے اسلامی شخصیت کے بارے میں عالی سیکولر قوتوں کے ایجاد کی پیش رفت کا مدار اس ایکشن کے نتائج پر ہو گا، اسی وجہ سے ملک کے دیگر دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی پاکستان شریعت کو نسل کے فورم پر قومی سیاست میں شریک مذہبی جماعتوں سے اپیل کی تھی کہ وہ متعدد مذاہن اس ایکشن میں مشترک طور پر شریک ہوں یا کم از کم سیٹ ایڈ جسٹمنٹ کے ذریعے مذہبی ووٹ کے تقسیم ہو جانے کے امکانات کو کم سے کم کرنے کا کوئی لائحہ عمل طے کریں مگر یہ گزارش لائق التفات نہیں سمجھی گئی اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جمیعت علماء اسلام اور جماعت اسلامی کے انتخابی راستے جدا جدا ہیں۔ جمیعت علماء اسلام نظریاتی، جمیعت علماء اسلام مولانا سمیح الحق گروپ، اہل سنت یعنی سپاہ صحابہ، جمیعت علماء پاکستان، جمیعت اشاعت التوحید اور جمیعت اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے انتخابی امیدواروں کی بڑی تعداد میدان میں ہے اور میسیوں حلقوں میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صفت آراء ہیں، جس سے مذہبی ووٹ کے تقسیم ہو کر غیر موثر ہو جانے کے ساتھ ساتھ جگ ہنسائی کا سامان بھی فراہم ہو رہا ہے۔ ابھی ایکشن مہم کی شروعات ہیں مگر موبائل فون کے تیج سسٹم پر ایک دوسرے کے خلاف تبریز اور جملہ باڑی کا جو بازار گرم ہو رہا ہے وہ باعث شرم ہونے کی حد تک افسوسناک ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اس میدان میں ایک دوسرے کے خلاف کس حد تک آگے جانے کیلئے ڈھنی طور پر تیار ہیں۔

اس لیے جہاں ہم اس درخواست کو دہرانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیح الحق، مولانا عصمت اللہ اور مولانا محمد احمد لدھیانوی کے باہمی رابطہ کے ساتھ ساتھ اس سے قدرے و سمع دائرے میں مولانا ڈاکٹر ابوالخیر محمد زیمیر، جناب سید منور حسن، علامہ ابتسام الیٹ ظہیر، پروفیسر حافظ محمد سعید اور ان کے رفقاء کے ساتھ بھی باہمی رابطہ و مفاہمت کی کوئی صورت اس حد تک ضرور نکلنی چاہیے کہ مختلف حلقوں میں باہمی مذاہن آئی کے امکانات کو کم کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ یہ گزارش بھی اب ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انتخابی ہم کے دوران اپنے مقررین، کارکنوں اور مسیدیا کے مذاہ پر کام کرنے والوں کو ایک دوسرے کے خلاف ایسی زبان استعمال کرنے سے روکا جائے جو دینی حلقوں کی خفت اور سیکولر حلقوں کی تقویت کا سامان فراہم کرتی ہو اور اہل دین کیلئے جگ ہنسائی کا باعث بن جائے۔

اس موقع پر افغان مجاہدین کے عظیم راہنماء مولانا جلال الدین حقانی کی ایک سابقہ اپیل کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں جو انہوں نے اسی قسم کے انتخابات کے موقع پر پاکستان کے دینی حلقوں سے ایک مکتوب کے ذریعے فرمائی تھی، یہ خط اس وقت دیگر دینی جماعتوں کے راہنماؤں کے علاوہ مجھے بھی موصول ہوا تھا، اس میں مولانا حقانی نے جمیعت علماء اسلام کے مختلف دھڑوں کے پس منظر میں لکھا تھا کہ:

”پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی خاطر علماء کا باہمی برادرانہ اتحاد دینی تقاضوں کی لکار اور وقت حاضر کی اہم پاکار ہے جس سے نہ صرف پاکستان میں ملتِ اسلامیہ کی ایک عالمگیر باوار قار اسلامی قوت پیدا ہو“

جائے گی بلکہ موجودہ پر فتن دور کے بد عقیدہ، بے دین، ملحدین اور اسلام دشمن عناصر کے ناپاک حوصلے پست اور کافرانہ عزادم خاکستر ہو جائیں گے۔

اگر بزرگوارم جیسے حساس، خدا ترس، با اثر علماء ربانیین نے جمعیت کے ان دو گکروں اور دیگر دینی تنظیموں کے مختلف گروہوں کو سیکھا کرنے میں ہماری مدد فرمائی تو بخشیہ اللہ تعالیٰ و بفضلہ علماء اسلام کی یہ بکھری ہوئی تو قسم ایک دفعہ پھر متعدد ہو کر زندقا و الحاد کے پرستاروں کی سرکوبی کیلئے بنیان مر صوص ثابت ہوں گی۔

خدا نخواستہ اگر ہم اس دفعہ بھی آنے والے انتخابات میں حسب روایات سابقہ درون خانہ فرقہ بندی کی خانہ جنگیوں میں مصروف رہے تو پہلے سے کہیں زیادہ جمعیت کی راحت و مضبوط شخصیت متزلزل ہو کر انتہائی مذموم و مہلک نتائج سے ہمکنار ہو گی۔

اب تو ہمیں ماضی کے تلخ تجربات سے سبق لے کر محض رضاۓ مولیٰ کی خاطر تمام اختلافات و مشاہرات کو بالائے طاق رکھ کر پورے خلوص ولہیت کے ساتھ یک جسم و جان ہونا چاہیے تاکہ ابھی سے منتفہ طور پر پوری قوت و جانشناختی کے ساتھ آئندہ انتخابات اور دیگر اہم مسائل کیلئے منظم پالیسی کے ماتحت سرگرم عمل ہونے کے قابل ہو جائیں۔“

مولانا جلال الدین حقانی کی یہ اپیل اگرچہ کم و بیش دو عشرے قبل کی ہے لیکن موجودہ حالات میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابھی ہفتہ قبل یہ اپیل جاری ہوئی ہو۔ اس حوالے سے ہم دو گزارشات کرنا چاہتے ہیں:

- ایک یہ کہ پاکستان کے داخلی ماحول کے حوالے سے افغان مجاہدین کی ذمہ دار قیادت بھی یہی چاہتی ہے کہ پاکستان کی دینی جماعتیں قومی سیاست میں بھرپور حصہ لے کر اہم کردار ادا کریں اور متعدد ہو کر زیادہ سے زیادہ سیاسی قوت فراہم کریں۔

- اور دوسری یہ کہ افغانستان سے امریکی اتحادی کی فوجوں کے اخلاع کے بعد اگلے تین چار برسوں میں افغان مجاہدین کی سب سے بڑی ضرورت بھی یہی ہوگی کہ پاکستان کی دینی جماعتیں بالخصوص جمعیت علماء اسلام متعدد ہو کر قومی سیاست میں اہم اور فیصلہ کن پوزیشن حاصل کریں۔ اس لیے اگر ہم اپنے لیے نہیں کر سکتے تو ان غریبوں کی خاطر ہی باہمی رابطہ و مفاہمت کا ”کڑوا گھونٹ“ بھر لیں، ہو سکتا ہے ہمیں تلخ اور کڑوا لگنے والا یہ گھونٹ ان مظلوموں کیلئے ”آب حیات“ کا کام دے جائے۔

## قطر میں افغان طالبان کا دفتر

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۲۸ جون ۲۰۱۳ء

قطر میں افغان طالبان کا سیاسی دفتر محلے کے ساتھ ہی امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان مذکورات کا سلسلہ شروع ہوتا دکھائی دینے لگا ہے اور دونوں طرف سے تحفظات کے اظہار کے باوجود یہ بات یقینی نظر آرہی ہے کہ مذکورات بہر حال ہوں گے کیونکہ اس کے سواب کوئی اور آپشن باقی نہیں رہا اور دونوں فریقوں کو افغانستان کے مستقبل اور اس کے امن و سنجاق کیلئے کسی نہ کسی فارموں پر بالآخر اتفاق رائے کرنا ہی ہو گا۔ افغان طالبان اور امریکہ کے درمیان مذکورات کے حوالے سے مختلف خبریں نظر سے گزرتی ہیں توہن امریکہ اور ویٹ کالنگ کے درمیان ہونے والے مذکورات کی خبروں کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے جب ویٹ نام میں امریکہ کی فون کشی کے بعد وہاں کے حریت پسند گوریلوں نے ”ویٹ کالنگ“ کے عنوان کے تحت طویل جنگ لڑی تھی اور پھر طویل اور تھکا دینے والے مذکورات کے نتیجے میں امریکہ کی فوجی مداخلت کے خاتمه، ویٹ نام کی آزادی اور جنوبی اور شمالی ویٹ نام کے اتحاد کے مقاصد حاصل کر لیے تھے۔ افغان طالبان کو کم و بیش انہی مراحل کا سامنا ہے اور کسی بھی بڑے ملک کی فوجی مداخلت کے بعد اس سے گلو خلاصی کیلئے ان مراحل سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

افغانستان میں امریکی افواج اور نیٹوکی عسکری یلغار کے بعد ہم نے اس وقت بھی عرض کر دیا تھا اور اس کے بعد بھی وقتاً فوچا یہ گزارش کرتے آرہے ہیں کہ مداخلت کار قتوں کو بالآخر طالبان کا وجود تسلیم کرنا ہو گا اور ان کے ساتھ مذکورات کی میز سجانا ہو گی، اس کیلئے کوئی لمبی چوڑی فراست در کار نہیں تھی کیونکہ تاریخ نہ کامل اسی کوئتے ہیں اور تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص کی رائے اس سے مختلف نہیں ہو سکتی۔

افغان طالبان کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ ایک شدت پسند گروہ ہے جو اسلحہ اور جرکے زور پر افغانستان کا تسلط اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے جبکہ ہمارا موقف یہ تھا کہ ”طالبان“ صرف ایک گروہ کا نام نہیں بلکہ وہ افغان قوم کی حب الوطنی، خود مختاری اور حمیت اسلامی کی علامت کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں اور ایسی قوموں کو میدان جنگ میں کبھی شکست نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے مداخلت کاروں کو بالآخر یہی کرنا تھا اور افغان طالبان نے بھی داشمنی سے کام لیا ہے کہ مذکورات کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے اس سمت پیش رفت کا فیصلہ کر لیا ہے۔

یہ مذکورات ابھی وقت لیں گے، مذکورات کے دوران بلکہ اس سے پہلے بھی روٹھے اور منائے جانے کے کئی مراحل درمیان میں آئیں گے بلکہ بعض مناظر مایوسی کے بھی دکھائی دینے لگیں گے، مختلف حوالوں سے ایک دوسرے کے بارے میں بے اعتمادی اور تحفظات کا اظہار ہو گا، یہ مذکورات کئی بار ٹوٹنے ٹوٹنے جریں گے اور جڑتے جڑتے ٹوٹنے گے، لیکن یہ بات اب نوٹھہ قدر ہے کہ آخر کار یہ مذکورات مخفی تیجہ تک پہنچیں گے اور نہ صرف یہ کہ افغانستان مکمل آزادی اور خود مختاری کی منزل سے ہمکنار ہو گا بلکہ امریکہ اور نیٹو افواج بھی کسی نئے ہدف کی تلاش میں خود کو آزاد محسوس کریں گی۔

افغان طالبان افغانستان سے امریکہ اور نیٹو کی افواج کے انخلاء کیلئے جنگ لڑ رہے ہیں جبکہ اس سے قبل افغان

مجاهدین اپنی سر زمین سے سوویت یونین کی فوجوں کے اخلاع کیلئے جنگ لڑچکے ہیں۔ اس وقت افغان قوم کے سامنے بذف یہ تھا کہ سوویت یونین کی فوجیں افغانستان کی سر زمین سے نکل جائیں اور اب اس حریت پسند قوم کا ہدف یہ ہے کہ امریکہ اور نیویکی افواج افغانستان کا علاطہ خالی کروئی۔ مگر ایک فرق واضح ہے کہ اس وقت انہیں عالمی برادری حتیٰ کہ امریکہ کی بھی حمایت اور ادھار حاصل تھی جبکہ اب وہ تھا ہیں اور کوئی ان کے ساتھ کھڑا ہونے کیلئے تیار نہیں ہے۔ درپرداہ امداد و حمایت کی بات الگ ہے مگر ظاہری منظر یہی نظر آ رہا ہے کہ سوویت یونین کے خلاف تو عسکری جنگ کے ساتھ سفارتی سفارتی جنگ میں بھی عالمی برادری ان کی پشت پر تھی مگر امریکہ اور نیویک کے خلاف جنگ میں میدان جنگ کے علاوہ سفارتی حاذ پر بھی وہ اکیلے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے یہ افغان طالبان کی ذہانت و فراست کا بہت کڑا امتحان ہے اور اگر انہوں نے گذشتہ عشرے کے دوران اپنی کنٹکٹ کے پس منظر اور پیش منظر سے کچھ سبق حاصل کر لیا ہے اور زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر حقیقت پسندی کی بنیاد پر حکمت و تدریک ساتھ آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اس امتحان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوبامنوانے میں کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سوویت یونین کے خلاف افغان مجاهدین کی جنگ میں پاکستانی عوام بحیثیت قوم ان کی پشت پر کھڑے تھے، حکومت ان کے ساتھ تھی، ریاستی ادارے ان کی پشت پر تھے، علماء کرام خواہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں ان کے حامی و مد دگار تھے، دینی مدارس کے طلبہ اور مدد بھی جماعتوں کے کارکنوں نے افرادی قوت کا ایک بڑا حصہ انہیں فراہم کر دیا تھا اور مخیر حضرات نے بھی تعاون میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ مگر اس بار صورت حال بہت مختلف ہے حتیٰ کہ علماء کرام اور دینی جماعتوں گوگو کا شکار ہیں۔ افغان طالبان کو اپنے مشن میں بالکل صحیح سمجھتے ہوئے اور ان کی جنگ کو آزادی کی جنگ اور جہاد قرار دیتے ہوئے بھی وہ اس طرح ان کی حمایت نہیں کر پا رہے جس طرح سوویت یونین کے خلاف جہاد میں انہوں نے افغان مجاهدین کی حمایت کی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید قبائلی علاقوں کی صورت حال بھی ہے کہ حکومت پاکستان اور ریاستی اداروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کے طرز عمل اور کارروائیوں نے جو حالات پیدا کر دیے ہیں وہ پاکستان کی عوامی رائے کو افغان طالبان کی حمایت میں منظم کرنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن کر رہ گئے ہیں جبکہ میڈیا تا گوموئی طور پر اس قسم کا کردار ادا کرتا ہی رہتا ہے، اس سے کوئی شکایت کرنا ہی سرے سے فضول اور بے مقصد محسوس ہوتا ہے۔ لیکن کیا پاکستان کی دینی جماعتوں اور علماء کرام کو گوگو کی اسی پوزیشن میں رہنا چاہیے؟ اور ایک جائز مقصد کیلئے صبر آزما جنگ لڑنے والے افغان طالبان کو مذکور اسی طرح تھا چوڑ دینا چاہیے؟ ہمارے خیال میں اس سوال کا گہری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف ملکی رائے عامہ کو توجہ دلانا اور توجہ دلاتے رہنا شاید ہماری دینی ذمہ داریوں میں بھی شامل ہے۔ ہماری رائے میں اس وقت جن دائروں میں ہم کام کر سکتے ہیں اور ہمیں کام کرنا چاہیے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

- افغان طالبان کو عمومی سیاسی و اخلاقی حمایت مہیا کی جائے اور نہ صرف ملکی رائے عامہ بلکہ عالمی رائے عامہ کو

- بھی ان کے جائز موقف کی طرف توجہ دلانے کا اہتمام کیا جائے۔
- بین الاقوامی اداروں اور خاص طور پر عالمِ اسلام کے بین الاقوامی اداروں میں افغانستان کی آزادی و خود مختاری اور اس کے اسلامی شخص کی بحالی و تحفظ کیلئے لابنگ اور ذہن سازی کی قابل عمل صورتیں نکالی جائیں۔
  - افغان طالبان کی جدوجہد اور پاکستان کے قبائلی علاقوں کی صورت حال کے فرق کو واضح کیا جائے اور پاکستان کی داغی کشمکش کی ذمہ داری سے افغان طالبان کو بری الذمہ قرار دینے اور اصل زمینی حقوق کے اطباء کیلئے علمی و فکری محنت کی جائے۔
  - مذکرات کے دوران افغان طالبان کی ایک بڑی ضرورت یہ بھی ہوگی کہ مذکرات کو صحیح نتائج تک لے جانے کیلئے ان کا عسکری دباؤ کمزور نہ ہونے پائے، اس مقصود کیلئے ان کے ساتھ پاکستان کے علماء کرام، دینی کارکن اور اصحاب بُرخ اس فیصلہ کرن مرحلہ میں جو بھی تعاون کر سکتے ہوں اس سے گیرینہ کیا جائے۔
  - افغان طالبان ہمارے بھائی ہیں اور اپنے وطن کی آزادی اور اسلامی شخص کے تحفظ کیلئے مصروف جہاد ہیں۔ ان کی جنگ جس طرح سوویت یونین کے خلاف جائز تھی اسی طرح نیٹو افواج کی عسکری یلغار کے خلاف جنگ میں بھی وہ ہمارے تذکیک حق بجانب ہیں اور ہمیں اپنے حالات و ظروف کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی حق کا ساتھ دینے کے قابل عمل راستے ضرور نکالنے چاہیں۔

## افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: نئی حکومت کی ذمہ داریاں

مابنا نامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۱۳ء

نئی حکومتوں نے وفاق اور صوبوں میں اقتدار سنہجات لیا ہے اور اپنے اپنے ایکٹنڈے کے مطابق وہ مصروف عمل ہو گئی ہیں۔ انتخابات میں مرکزی حکومت اور صوبہ پنجاب میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کو جو مینٹریٹ ملائے ہے وہ خود اس کی اپنی توقعات سے بڑھ کر ہے، اس لیے اس کی ذمہ داری بھی دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت نئی حکومت کو جن چینیجوں کا سامنا ہے ان میں ڈرون حملوں کے ماحول میں ملکی خود مختاری کی بحالی، خودکش حملوں کے حوالے سے ملک میں بد امنی اور قتل و غارت کے روز افزوں واقعات، لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کا عذاب سر فہرست ہیں، اور میاں محمد نواز شریف نے وزارت عظمی کا حلف اٹھاتے ہی ان مسائل کے حل کیلئے پیشرفت کا اعلان کیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ مسائل ورش میں ملے ہیں اور گذشتہ حکومتوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہیں، یہ بات درست ہے لیکن صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ سابقہ حکومتوں کی غلط پالیسیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پالیسیوں کا رخت تبدیل کرنا اور قومی پالیسیوں کو صحیح رخ پر چلانا نئی حکومت کی سب سے بڑی ترجیح ہوئی چاہیے۔

افغانستان میں طالبان کے ساتھ امریکی حکومت نے مذکورات کا قدر میں اہتمام کر لیا ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ طالبان بظاہر ایک گروہ کا نام ہے لیکن اس نائل کے پیچھے دراصل پوری افغان قوم امریکی جاریت کے خلاف اسی طرح ملکی آزادی اور قومی خود مختاری کی جنگ لڑ رہی ہے جس طرح انہوں نے روسی جاریت کے خلاف جنگ لڑی تھی اور بالآخر کامیابی حاصل کی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ طالبان اور ان کی قیادت میں افغان قوم امریکہ کے خلاف اس جہاد اور جنگ آزادی میں بھی سرخوئی حاصل کرے گی اور افغانستان بالآخر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر دوبارہ نمودار ہو گا، البتہ ابھی اس راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں اور بہت سی مشکلات کا افغان قوم کو سامنا کرنا پڑے گا۔ البتہ اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ پاکستان کی حکومت اپنی ترجیحات کا از سر نوجائزہ لے اور نیٹو افواج کو افغانستان سے واپسی کا حفوظ راستہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ افغان قوم کی جنگ آزادی اور جہاد کے فطری اور نظریاتی مقاصد کی تکمیل کو بھی اپنی ترجیحات کا حصہ بنائے۔

امریکہ کی خواہش اور کوشش یہ نظر آرہی ہے کہ وہ بھی سوویت یونین کی طرح افغان قوم کو باہمی لڑائیوں میں مصروف چھوڑ جائے بلکہ اس کیلئے راستہ بھی ہموار کیا جا رہا ہے۔ حکومت پاکستان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ جہاد افغانستان کے فطری اور نظریاتی مقاصد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے نظریاتی شخص اور وطن عزیزی کی سالمیت و خود مختاری کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے افغان قوم کے مختلف عناسار کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی کے فروع کا اہتمام کرے تاکہ نیٹو افواج کی متوقع واپسی کے بعد وہی صورت حال دوبارہ نہ پیدا ہو جائے جو روئی افغان کی واپسی کے بعد پیدا ہو گئی تھی اور افغانستان کو ایک خونناک خانہ جنگی کی دلدل میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اس حوالے سے حکومت میں شامل ایسے افراد کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے جو ان معاملات کو سمجھتے ہیں اور ان سے ڈیپری رکھتے ہیں۔

اسی طرح ملک کی عمومی سیاست اور مذہبی جدوجہد کے ماحول میں بھی اس مسئلہ کے تناظر میں ہم آہنگی اور مفاہمت کے عمل کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں نے متحده مجلس عمل یا اس نوعیت کے کسی متحده فورم پر ایکشن میں حصہ لیا ہوتا تو پارلیمنٹ میں ان کی مضبوط الابی کے ساتھ ساتھ مشترک انتخابات کے دوران پیدا ہونے والی عوای بیداری کی لہر بھی آج افغان طالبان کیلئے مضبوط پشت پناہ ثابت ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اور ہمارا یہ نقطہ نظر ہے کہ ایسا نہیں ہونے دیا گیا جس کے مقاصد میں اس نازک مرحلہ میں افغان طالبان کو پاکستانی رائے عام کی پشت پناہی سے محروم کرنا بھی شامل تھا، بہر حال اب جو ہونا تھا ہو چکا اسے واپس نہیں لایا جا سکتا، البتہ اس کی کسی حد تک تلاش کی جاسکتی ہے۔

ہمارے خیال میں افغان قوم کو اس وقت ہماری طرف سے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے:

1. ایک یہ کہ نیٹو افواج کی واپسی کے بعد افغان قوم کو متحدر کھنے اور متوقع خانہ جنگی کی روک تھام کیلئے پاکستان کی حکومت اور متعلقہ ادارے مؤثر کردار ادا کریں اور اس کیلئے مضبوط منصوبہ بنندی کی جائے۔

2. اور دوسری یہ کہ پاکستان کی دینی قوتیں اور محب وطن سیاسی عناصر مذکورات کے اس مرحلہ میں افغان قوم اور

طالبان کیلئے مغضوب سیاسی و اخلاقی حمایت کا اہتمام کریں۔

کل کی طرح آج بھی افغانستان کا استحکام پاکستان کی ضرورت ہے اور کل کی طرح آج بھی پاکستان کے فطری حلیف افغانستان کے اسلام دوست اور آزادی پسند عناصر ہیں۔ ان حقائق سے نظریں چرانا پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے اور دنی بجماعتوں کو خاص طور پر اس مسئلہ پر سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے۔

پاکستانی طالبان کی صورتحال یہ ہے کہ ان سے تمام ترشکیات اور ان کے بارے میں تمام تر تحقیقات کے باوجود وہ بہر حال پاکستانی ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ:

- ماضی میں ان سے صحیح طور پر ڈیل نہیں کیا گیا، وہ عمل کاشکار ہوئے ہیں اور نام نہاد دہشت گروں کے خلاف مبینہ جنگ میں وہ بہت سی زیادتیوں کا نشانہ بنے ہیں۔
- ان کے ساتھ کیے گئے معابدوں کو ملاوجہ توڑ دیا گیا ہے اور انہیں اپنے علاقوں میں اپنی مرضی اور عوامی رائے کے مطابق معاشرتی نظام قائم رکھنے اور قانونی نظام قائم کرنے کے حق سے مسلسل محروم رکھا جا رہا ہے۔
- ان کے مذہب اور مذہبی اقدار کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافتی اور تہذیبی اقدار بھی یہ روشنی یا غارکی زد میں ہیں۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ہتھیار اٹھا کر درست کام نہیں کیا اور حکومتی رٹ کو چلچھڑانا اور مسلح افواج سے نبرد آزما ہونا ان کا صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ لیکن اس صورتحال کے اسباب کیا ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے ملک کے شہریوں کو اس انتہائی اقدام کا راستہ دکھایا؟ ان کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا اور ان اسباب و عوامل کا سدباب کرنا ہم سب کی قوی ذمہ داری ہے۔

اسی قسم کی صورتحال بلوچستان کے ناراض عناصر کے بارے میں بھی ہے اور اگر نئی حکومت ان معاملات کو حل کرنے میں سنجیدہ ہے تو اسے ان امور کا بہر حال اہتمام کرنا ہوگا۔ ہماری خواہش ہے کہ:

• امریکہ اور افغان طالبان کے مذاکرات کے پس منظر میں افغانستان کے استحکام اور محفوظ مستقبل کی خاطر پاکستان کے قوی کردار کے تعین کیلئے فوری طور پر قوی سطح پر آل پارٹیز کانفرنس کا اہتمام کیا جائے اور تمام سیاسی و دینی جماعتیں مل کر قوی پالیسی کا تعین کریں۔

• پاکستانی طالبان کے ساتھ مذاکرات کیلئے اس قوی جرگے کو اعتماد میں لیجاوے جو اس سلسلہ میں کچھ عرصہ سے سرگرم عمل ہے اور پاکستانی طالبان کو مستقبل کے حوالے سے تحفظ اور تعاون کا یقین دلانے کے ساتھ ساتھ ماضی میں ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلاشی کا بھی اہتمام کیا جائے۔

• حکومتی سطح سے ہٹ کر سیاسی اور دینی جماعتوں کو اپنے طور پر بھی کسی متحده فورم پر جمع ہو کر اس صورتحال کا جائزہ لینا چاہیے اور اپنی پالیسی اور ترجیحات کا تعین کرنا چاہیے۔ افغان طالبان ہوں یا پاکستانی طالبان، ان میں سے کسی کو بھی اس نازک مرحلہ میں تنہا چھوڑ دینا اور مناسب رہنمائی سے محروم رکھنا نہ ہمارے دینی مفاد میں

ہے اور نہ، اس میں پاکستان کا مقابلہ ہے۔

## ملالہ اور ملالئے

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۲۱ جولائی ۲۰۱۳ء

اقوامِ متحده نے لذتمنہ دنوں "ملالہ ڈے" منایا اور مختلف ممالک میں اس حوالے سے تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ خود ملالہ یوسف زئی نے بھی ایک بڑی تقریب سے خطاب کیا اور کہا کہ وہ نوجوانوں کے ہاتھ میں کلاشناکوف کی جگہ قلم اور کتاب پکڑنا چاہتی ہیں۔ یہ خواہش بہت معموم سی ہے اور ملالہ جیسی بھولی بھالی بچیوں کی زبانوں پر ہی آسکتی ہے، جبکہ مغرب اس بچی کی معصومیت اور اس کی معصوم خواہش کو ایکسپلائیٹ کر کے جو فونہ صاحل کرنا چاہتا ہے اور کر رہا ہے، محاورے کی زبان میں اس کی مالالہ یوسف زئی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔

اج مولانا محمد شریف چترالی کی کتاب "تحریکاتِ حریت" پڑھتے ہوئے "میونڈ" کی جنگ میں برطانوی استعمار کے خلاف اڑنے والی ایک خاتون "ملائے" کا تذکرہ نظر سے گزرا، جی چاہا کہ ملالہ کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ملانے کا کردار بھی قوم کی نظر میں رہنا چاہیے، کیونکہ قلم اور کلاشناکوف کا اپنا اپنا میدان ہے اور اپنی اپنی ضرورت ہے۔ تو ازن دونوں کرداروں کو سامنے رکھ کر ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہی تو ازن اس وقت امت مسلمہ کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ چترالی صاحب کیا لکھتے ہیں:

"قدھار کے قریب واقع میونڈ کی بستی کے ساتھ غیرت مند افغان مسلمانوں کی جرأت و شجاعت اور جاثری اور دلیری کی حسین یادیں والبستے ہیں۔ یہ وہ میدان ہے، جہاں غاصب و ظالم انگریز فوج کے ۱۲ ہزار مسلح جنگجو ملت افغان کے غراثت ہوئے شیروں کے زخمی میں آگئے تھے اور پورے لشکر میں سے صرف ۵۲ آدمی بھیں بدل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس جنگ کا مختصر احوال تاریخی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

کابل اور اس کے اطراف کی طرح جنوبی افغانستان میں کہی انگریز کے خلاف عمومی غم و غصے کی لمبیں دوڑ رہی تھیں۔ ہرات میں مجاہدین کے دستے جمع ہو گئے اور قدرھار پر حملہ کرنے کیلئے منصوبے سوچے جانے لگے۔ پورے ملک کی سطح پر کوئی غیر متنازع اور ولوہ انگریز قیادت نہ ہونے کی وجہ سے ملت افغان کی اجتماعی قوت منتشر تھی، جس سے انگریز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اسی اشاعت میں شمالی افغانستان سے ایک عام کمانڈر اور معمولی حیثیت کے سردار عبدالرحمن خان نے انگریزوں کے خلاف پورے افغانستان کے مسلمانوں کو متحد کر کے فیصلہ کن جنگ کرنے کا اعلان کیا اور اپنی فطری صلاحیتوں کی بنابرہ بہت جلد اس کی دعوت کا شہرہ پورے افغانستان میں ہونے لگا۔ ہرات کے مجاہدین نے اس دعوت کی خرسن کر میدان میں آنے کا

فیصلہ کیا اور ہرات میں حکومت کرنے والے محمد ایوب خان کے گورنر کو اعلان جنگ کرنے پر ابھارا۔ اس کے مسلسل انکار اور ٹال مٹول پر مجاہدین نے اس کو قتل کر دیا اور اس کے نائب حفیظ اللہ کی قیادت میں ہرات سے قندھار کی جانب کوچ کیا۔ محمد ایوب خان نے بھی حالات کی نزاکت کے پیش نظر ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۲ ہزار مجاہدین کا قافلہ فراہ اور گرشنک کے راستے سے روانہ ہوا جس کے ساتھ راستے میں ادھر ادھر کے دیہات کے مجاہدین بھی ملتے گئے۔ ۲۰ جولائی کو یہ قافلہ قندھار کے قریب میونڈ کے بے آب و گیاہ اور خشک میدان میں پہنچا۔ قندھار میں معین انگریز فوج کا ۱۲ ہزار کا لشکر قندھار کے کٹھ پلی حکمران شیر علی کے دستوں اور بھاری توپ خانے کے ساتھ مقابلے کیلئے پہنچا۔

انگریز فوج نے مجاہدین کو میونڈ کے میدان میں روکنے کا فیصلہ کیا جوہر لحاظ سے مجاہدین کیلئے تکلیف دھنا۔ قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ شیر علی کے بہت سے ساتھی بھی اس قوی جنگ میں شرکت کیلئے مجاہدین کے ساتھ آمے اور انگریزوں کو پہلے ہی مرحلے میں نفیاً تی شکست ہوئی۔ انگریزوں میں مجاہدین پر حملہ کرنے کی بہت نہیں تھی اس لیے وہ مجاہدین کو بانی اور رسد کی مشکلات میں پھنسا کر اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں تھے۔ لیکن مجاہدین نے اس چیلنج کا بھی مقابلہ کیا اور ۶ ہزار مجاہدین نے میونڈ کے میدان میں ایک پرانی کاربی صاف کر کے مرمت کی جس سے مجاہدین کیلئے پانی جاری ہو گیا۔ انگریز اور مجاہدین آمنے سامنے ہوئے اور انگریزوں نے جنگ سے بچنے کیلئے تمام حربے استعمال کیے لیکن ناکام ہوئے۔ شروع شروع میں چہ دن تک معمولی معمولی جھپڑیں ہوتی رہیں اور آخر کار ساتویں روز دشمن کے توپ خانے سے آگ بر سی شروع ہوئی۔ صبح سے دو پہر تک جنگ ہوتی رہی اور دونوں جانب کے ۵۰۰ آدمی مقتول اور ۸۵۰ زخمی ہوئے۔ مجاہدین کے کمانڈر حفیظ اللہ نے اچانک اپنی فوج کو ”پروت پوزیشن“ اختیار کرنے کا حکم دیا اور ان میں سے ۷ ہزار مجاہدین کو مختلف اطراف میں نکلے کا حکم دیا۔

انگریز یہ سمجھے کہ مجاہدین نے پسپا اُختیار کی ہے، اس لیے انگریزوں نے اپنے سامنے لڑنے والے مجاہدین پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اسی اثناء میں مجاہدین نے تینوں اطراف سے انگریزوں کے عقب پر حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور انگریز چاروں طرف سے گھیرے میں آگئے۔ آگ اور خون کے درمیان سے صرف چھ سو انگریز فرار ہونے میں کامیاب ہوئے لیکن مجاہدین نے ان کا بیچا بھی نہ چھوڑا اور ایک باغ کی چار دیواری میں پچھپے ہوئے ان انگریزوں کا بھی صفائی کر دیا۔ شیر علی صرف ۲۵ انگریزوں کو افغانیوں کا لباس پہننا کر قندھار پہنچانے میں کامیاب ہوا اور پوری انگریز فوج کے مجاہدین کے ہاتھوں ختم ہونے کی خبر قندھار میں جزل پر یہوز کو دی۔

اس جنگ میں بھی افغان خواتین نے نمایاں کردار ادا کیا، ان خواتین میں سے ایک خاتون ”ملائے“

کے نام سے آج بھی اپنی جرأت و ہبادری کی بنیا پر مشہور ہے۔ اس خاتون نے مجاہدین کے جھنڈے اٹھانے والے کمانڈر کو شہید ہوتا دیکھ کر فوراً اس کے پاس پہنچی اور اپنی جان کی بازی لگا کر مجاہدین کا جھنڈا اٹھایا اور اسے سرنگوں ہونے نہیں دیا۔ ملائے جہادی شاعرہ بھی تھی، اس کے دل گرامادی نے والے اشعار آج بھی افغانوں کی زبانوں پر ہیں۔ میونڈ کے میدان میں مجاہدین کا لہو گرانے کیلئے اس نے یہ شعر پڑھا تھا:

کہ پہ میونڈ کی شہید نہ شولی  
خدا گیو لالیہ پہ نگے تہ دی ساتینہ  
(اگر تم میونڈ میں شہید نہ ہوئے تو سمجھو کہ بغیر تی کی زندگی گزارو گے۔)

یہ خاتون اپنی آرزو اور جذبات کے مطابق میونڈ ہی میں شہید ہوئی اور وہیں آسودہ خاک ہوئی۔“

## افغان طالبان کی سرگرمیاں

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۲۳ جولائی ۲۰۱۳ء

افغان طالبان اور امریکہ کے مجوزہ مذاکرات اس وقت قطعیں کی حالت میں ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ باہمی اعتماد کی فضاقائم کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔ وزیر اعظم پاکستان کے مشیر برائے امور خارجہ جناب سرتاج عزیز کا کہنا ہے کہ یہ قطعی عارضی ہے اور ان مذاکرات میں پاکستان کا کردار سرحد سست صرف اتنا ہے کہ وہ مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کیلئے سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنے حالیہ دورہ کابل کے دوران انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ پاکستان افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات بحال کرانے میں مددوے گا۔

ہم اس سے قبل اسی کالم میں عرض کر چکے ہیں کہ اس قسم کے بہت سے مرحل آئیں گے لیکن چونکہ یہ مذاکرات دونوں فریقتوں کی ضرورت ہیں اس لیے بالآخر مذاکرات کی میز رجے گی اور دونوں کسی نہ کسی تینج پر بہر حال پہنچیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ان مذاکرات کے حوالے سے ہمیں ایک الجھن شروع سے پریشان کر رہی تھی کہ افغان طالبان کے موقف اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں اور بھل معلومات کہاں سے حاصل ہوں گی؟ اس لیے کہ افغان طالبان کی طرز پر پاکستانی طالبان کے نمائیں نے بہت سی باتیں خلط ملاط کر کھی ہیں اور خبروں اور تصریفوں کے مسلسل اختلاط کے ذریعے خود میڈیا نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ہر طرف دھنڈہ ہی دھنڈ دھماکی دیتی ہے، اور گاڑی کی ہیئت لائیں روش کرنے کے باوجود کچھ نظر نہیں آرہا کہ سڑک کدھر ہے اور جانا کس سمت ہے۔

طالبان اور جہاد کے عنوان سے متعدد جانکہماری نظر سے گزرتے ہیں مگر ان کی صورت حال بھی یہ ہے کہ کسی کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ افغان طالبان ہی کی نمائندگی کر رہا ہے اور اس کے پس پر وہ کچھ اور مقاصد نہیں ہیں۔ اس پس منظر میں ایک اردو جریدہ دیکھنے کو ملا ہے جو ماہنامہ شریعت کے نام سے شائع ہوتا ہے اور اس کی پیشانی پر

”امریتِ اسلامیہ افغانستان کا واحد ترجمان“ درج ہے جبکہ اندرومنی تائیل کے ایک چوکھے میں یہ عبارت موجود ہے کہ: ”ماہنامہ شریعت امریتِ اسلامیہ افغانستان کا اردو زبان میں واحد اور باضابط دینی، ثقافتی اور سیاسی مجلہ ہے جو امریتِ اسلامیہ کے میدیا و نگ اور شفاقت کمپین کی زیرِ نگرانی شائع ہوتا ہے۔ ماہنامہ شریعت افغانستان میں جاری کشکاش، حالات و واقعات اور مظلوم مسلمانوں پر روار کئے جانے والے بھیانک مظالم کا سچا اور چشمِ دیدِ عکاس ہے۔“

یہ جریدہ دیکھ کر ہمیں اس پہلو سے خوشی ہے کہ انتہائی محدود سطح پر سکی لیکن ایسا اور بخت ذریعہ میراً گیا ہے جس کے ذریعے افغان طالبان کے حوالے سے شائع ہونے والی کوئی خبر یا روپرٹ پڑھ کر یہ تسلی ہو گی کہ یہ افغان طالبان ہی کی خبر اور روپرٹ ہے اور اس کی روشنی میں متعلقہ مسئلہ کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہو جائے گی جو موجودہ حالات میں نعمتِ غیر متربہ سے کم نہیں ہے۔

ولیے افغان طالبان کو مذاکرات کیلئے آمادہ کرنے اور مذاکرات کی میز پر لانے والوں کی بھی یہ ذمہ داری بتی ہے کہ وہ ان کو مذاکرات کے ماحول میں لانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں میدیا کے افپ پر پائی جانے والی شدید دھنڈ کو کم کرنے کی بھی کوئی صورت نکالیں۔ کیونکہ جنگ ہو یا نہ جب تک دونوں طرف کی اور بخت اور صحیح معلومات میرانہ آئیں، نہ عالمی رائے عامہ کوئی صحیح نتیجہ اخذ کر سکتی ہے اور نہ ہی عالمِ اسلام کے عوام اور پاکستان کی قومی رائے عامہ کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

اس وقت ماہنامہ شریعت کا جون ۲۰۱۳ء کا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے جو طباعت و کپوزنگ کے مناسب معیار کے ساتھ اڑاتالیں صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں افغانستان میں افغان طالبان کی عسکری سرگردیوں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ مذاکرات کے حوالے سے تجزیاتی مضامین بھی موجود ہیں اور مختلف فکری اور سیاسی پہلوؤں پر تحریریں بھی اس کا حصہ ہیں۔ ہم اپنی دلچسپی کے دو تین موضوعات کے حوالے سے اس جریدہ کے چند مضامین کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

۲۰۱۳ء کے بعد مغرب کا مکملہ ”کے عنوان سے جناب اکرم تاشقین نے عالمِ اسلام پر مغرب کی تہذیبی یا خار اور اس میں مستشرقین کے مسلسل کردار کا تذکرہ کیا ہے اور اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ افغانستان سے مغربی فوجوں کی واپسی کے بعد اس خطہ میں ثقافتی کشکاش اور مغرب کی تہذیبی یا خار اپنے عروج کو پہنچ جائے گی۔ وہ اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں کہ:

”زارعِ ابلاغ کے ذریعے افغان عوام کے افکار کو مسخر کیا جائے گا، ان کی تہذیب، ثقافت، تاریخ، روایات، افکار، حیالات، شجاعت، بہادری، متنانت، سنجیدہ فکری اور علم پسندی کا مذاق اڑا کر اس کی تھیکی کی جائے گی۔ افغانوں کی ثقافت و تاریخ کو جاہلانہ اور وحشیانہ قرار دے کر خود افغانوں کی نظر میں اس کی اہمیت و عزت گھٹا دی جائے گی۔ افغان عوام شروع سے اسلام اور ایمان پر جان چھڑ کتے ہیں، ان کی مذہب پسندی کے خاتمه کیلئے بے حیائی اور فاشی کا سیلا ب بہادیا جائے گا اور مذہب سے بے گانہ کر کے ان کو آزاد خیال بنادیا جائے گا۔“

ہیں اکرم تاشفین صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ”امارتِ اسلامیہ افغانستان“ کے ماحول میں مغرب اور عالمِ اسلام کے درمیان جاری فکری و ثقافتی جنگ اور تہذیبی کشمکش کا اس درجہ کا شعور موجود ہے اور وہ افغانستان پر اس کے اثر انداز ہونے کے امکانات کا ادراک رکھتے ہیں۔ جنابِ حسنِ مومند نے ”روس کو دوبارہ افغانستان میں لانے کی کوشش“ کے عنوان کے تحت ان مبینہ ساز شوں کا تذکرہ کیا ہے جو امریکی اتحاد کی فوجوں کے اس خطے سے نکل جانے کے بعد روس کو افغانستان میں دوبارہ مداخلت کی ترغیب دے رہی ہیں۔ حسنِ مومند نے اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات اس پر ختم کی ہے کہ:

”افغانستان سے امریکہ اور نیٹ کے انخلاء پر روس کو بھی افغانیوں کی طرح خوشی ہونی چاہیے، اس لیے کہ وہ طالبان کو نظرہ نہ سمجھے، طالبان سے مطمئن رہے اور سی آئی اے کی مذموم ساز شوں سے بچنے کی کوشش کرے۔“

عبد القادر سیف صاحب کا ایک مضمون ”اسلام اور کمزیو مراسم“ کے عنوان سے ہے جس میں سرمایہ دارانہ معیشت کی خرایوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے امارتِ اسلامیہ افغانستان کے اعلیٰ سطحی ماحول میں سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے بارے میں پائے جانے والے جنبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ آخر میں ہم اس جریدہ کے آخری تائیں کے اندر ورنی صفحہ پر موجود افغان طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر مجاهد کا یہ پیغام قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو ”افغانستان کا مستقبل“ کا عنوان سے ہے اور ملا محمد عمر لکھتے ہیں:

”amaratِ اسلامیہ حکومتی اجراء داری کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ افغانستان تمام افغانوں کا مشترکہ گھر ہے جس طرح سب پر اس کی تعمیر اور ترقی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسی طرح الہیت و بر ابری کی شرط پر حکومت میں حصہ لینا بھی ہر ایک کا حق ہے۔ امارتِ اسلامیہ کی بھرپور کوشش ہو گئی کہ اختیارات اور اقتدار ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے جن میں حکومت داری کی بپوری الہیت ہو جو کہ پت نہ ہو، وطن کے ساتھ ملخص ہو اور ایمان داری کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنے والا ہو۔

امارتِ اسلامیہ حصولِ تعلیم کو اپنی قوم کی دنیاوی ترقی اور اخروی سعادت کا باعث گردانی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ امارتِ اسلامیہ نے اپنے دور اقتدار میں بجٹ کا بڑا حصہ تعلیم کیلئے مختص کر رکھا تھا اور آج بھی تعلیم و تربیت ان کی اولین ترجیحات میں شامل ہے اور اس کیلئے خصوصی کمیشن بنا رکھے ہیں تاکہ اپنی عوام کو تعلیمی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ لیکن بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اسکول بنڈ کر دیے جاتے ہیں، کچھ کو جلا دیا جاتا ہے یا طلبہ پر زہریلا مواد استعمال کر کے مجاہدین کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام شکست خور دشمن کی خفیہ ساز شوں کی ایک کڑی ہے جو مجاہدین کو بدنام کرنے کیلئے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

ہم خواتین کو اسلامی اصولوں، قومی مفادات اور اپنی شرعی ثافت کے مطابق تمام حقوق دینے کیلئے کمر بستہ ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قابض قوتوں کی آمد کے ساتھ ہی افغان عوام خصوصاً خواتین کو بہت سے مصائب اور مکالیف برداشت کرنا پڑا ہے یہاں تک کہ کئی خواتین مظلوم سے تنگ آگر خود کو جلا بیٹھیں اور بعض مظلوم خواتین کو انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا گیا، ان کی عنزیں پامال کی گئیں اور آج بھی یہ جرم مسلسل رکنے میں نہیں آ رہا جبکہ امارت اسلامیہ افغانستان میں افغان خواتین پر امن زندگی بس کر رہی تھیں اور ان تمام مصائب سے محفوظ تھیں“

افغان طالبان کے سربراہ ملام محمد عمر مجاہد کا یہ پیغام جہاں ان کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے وہاں افغان طالبان کے بارے میں عالمی سطح پر پھیلانے لگئے ہیں بہت سے شکوہ و شہادت کی حقیقت بھی کھول دیتا ہے اور دانشوروں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ افغان طالبان کے موقف اور سرگرمیوں کا اور یہ محل معلومات اور زمینی حقائق سے جائزہ لے کر قومی رائے عامہ کی دیانت داری کے ساتھ صحیح راہنمائی کریں۔

## افغانستان میں غیر ملکی تسلط کی مدد کی شرعی حیثیت

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۱۳ء

روزنامہ پاکستان لاہور نے ۲۱ آئتوبر کو آئی این پی کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ: ”ملک کے ممتاز عالم دین مفتی محمد تقی عثمانی نے افغانستان پر غیر ملکی تسلط میں سرکاری اور ہر طرح کی مدد کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے فتویٰ جاری کیا ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے حکومت پاکستان اس امر کی مجاز نہیں ہے کہ وہ پڑو سی مسلمان ملک پر غیر مسلموں کے قبضے کو تحکم کرنے میں غیر ملکی جارح قوت کی مدد کرے۔ فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ معاشر تنگستی کا خدشہ بھی پاکستان کی کسی حکومت کو اس مفاد پرست پالیسی کیلئے شرعی جلت فراہم نہیں کرتا۔“

فتاویٰ کا پورا قسم اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن اخبار کی یہ خبر اس بات کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ افغانستان پر امریکی اتحادی عسکری یلغار، جس کے نتیجے میں امارت اسلامیہ افغانستان کو ختم کر کے اپنی مرضی کی حکومت وہاں مسلط کر دی گئی ہے اور تب سے افغانستان میں جارح قوت کی عسکری کارروائیاں مسلسل جاری ہیں جس کے باعث ہزاروں افغان باشندے جام شہادت نوش کر چکے ہیں، اس کے بارے میں پاکستان کے دینی حلقوں کے جذبات اور موقف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کا یہ فتویٰ صرف ان کی ذاتی رائے نہیں بلکہ پاکستان کے جمہور علماء کرام اور دینی حلقوں کے جذبات اور موقف کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح سوویت یونین کی عسکری یلغار کے مقابلہ میں افغان عوام کی مسلح جنگ شرعی جہاد تھا اسی

طرح امریکی اتحاد کی عسکری جاریت کے مقابلہ میں افغان عوام کی جدوجہد شرعاً جہاد کا درجہ رکھتی ہے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت، ریاستی اداروں اور عوام کو جابر و ظالم قتوں کا ساتھی خنے کی بجائے مظلوم افغان عوام کا ساتھ دینا چاہیے۔

## پاکستانی طالبان کے ساتھ مذکرات اور مولانا سمیع الحق

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۳ جنوری ۲۰۱۴ء

اگلے روز نئے سال کے پہلے دن کی اخبار میں یہ خبر پڑھ کر اس امید کے برآنے کی کچھ آس لگ گئی ہے کہ وزیر اعظم میام محمد نواز شریف نے جمیعت علماء اسلام (س) پاکستان کے امیر مولانا سمیع الحق سے تفصیلی ملاقات کر کے طالبان کے ساتھ مجوزہ مذکرات کے بارے میں ان سے گفتگو کی ہے اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ پاکستانی طالبان کے ساتھ حکومت کے مذکرات کا ماحول پیدا کرنے کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور مذکرات کی طرف پیشافت میں کردار ادا کریں۔ مولانا سمیع الحق نے یہ ذمہ داری قبول کری ہے اور ایک انشرونیو میں اس سلسلہ میں حکومت کی پیش کش کو سنبھیڈہ قرار دیتے ہوئے کردار ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

مولانا سمیع الحق تو میں ایک عرصہ سے متjurk ہیں، پارلیمنٹ کے اہم ارکان میں ان کا شمار رہا ہے۔ جمیعت علماء اسلام پاکستان (س) کے مرکزی امیر ہیں لیکن طالبان کے ساتھ مذکرات کے حوالے سے ان کا اصل تعارف یہ ہے کہ وہ شیخ الحدیث مولانا عبد الحق رحمہ اللہ تعالیٰ کے فرزند اور دارالعلوم حقانیہ کوٹہ خنک کے مہتمم ہیں۔ روئی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان میں دارالعلوم حقانیہ اور حضرت مولانا عبد الحق کا دردار عالمی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے اور پاکستان کے ساتھ ساتھ وسطیٰ ایشیا میں جہادی تحریکات اور استعمار کے خلاف مزاحمتی کلپر کے فروغ میں انہیں علمی و فکری مرکز اور پشتیبانی کی حیثیت حاصل ہے۔ افغانستان اور اردوگرد کے ممالک کے علماء کرام اور مجاهدین کی ایک بڑی تعداد حضرت مولانا عبد الحق گرد ہے اور مولانا سمیع الحق کے اپنے شاگردوں کی تعداد بھی ان میں کم نہیں ہے۔

جہاد افغانستان کو دنیا بھر میں جہادی تحریکات کا منبع تجویح جاتا ہے جبکہ جہاد افغانستان کا سب سے بڑا علمی و دینی سرچشمہ دارالعلوم حقانیہ ہے۔ ان جہادی تحریکات میں بہت سی تحریکات اصلًا جہادی ہیں جبکہ بہت سی تحریکات کو دہشت گردی کے الزام کا صحیح یا غلط طور پر سامنا ہے۔ ان کی درجہ بندی آنے والا وقت ہی کرنے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عالم اسلام میں جہادی کلپر کے آگے بڑھنے کا ذریعہ جہاد افغانستان بنتا ہے اور جہاد افغانستان کی راہ ہموار کرنے میں جن اداروں اور شخصیات نے کلیدی کردار ادا کیا ہے ان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا نام سرہست ہے۔ حضرت مولانا عبد الحق ہمیں اس حوالے سے شیخ الہند حضرت محمود حسن دیوبندیؒ کے فکر و عمل کا نمائندہ سمجھتا ہوں کہ ایک طرف انہوں نے استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد کی صرف سرپرستی نہیں بلکہ آبیاری کی اور دوسری طرف پاکستان

کی دستور ساز اسمبلی اور پھر قومی اسمبلی کے منتخب رکن کی حیثیت سے اسلامی اصولوں کے مطابق ملک کے دستور کی تدوین و تشکیل اور قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی میں علمی اور فکری راہ نما کا کردار ادا کیا۔ قومی اسمبلی میں حضرت شیخ الحدیث<sup>ؒ</sup> کے خطابات اور دیگر پارلیمانی سرگرمیوں کی کچھ تفصیلات کتابی شکل میں جمع ہو چکی ہیں جو نفاذ اسلام کی دستوری اور جمہوری جدوجہد کرنے والے علماء کرام اور کارکنوں کیلئے "کامیڈیک" کا مقام رکھتی ہیں۔

حضرت مولانا عبد الحق<sup>ؒ</sup> کی فرزندی اور جانشینی کے اس اعزاز سے ہٹ کر قومی سیاست اور دینی جدوجہد میں مولانا اسمعیق الحق کا اپنا بھی ایک منفرد اور بھرپور تعارف موجود ہے اور افغان مجاہدین کے ساتھ ساتھ پاکستانی طالبان کے ساتھ ان کے روابط یا اس سلسلہ میں ان کا مفہما نہ کردار سب کے سامنے ہے۔ اس پس منظر میں اس عظیم قوی اور دینی خدمت کیلئے مولانا اسمعیق الحق کا انتخاب نئے سال کی کپبلی خوش خبری اور میاں محمد نواز شریف کا صحیح فیصلہ ہے جس پر دونوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس عمل کی جلد اور بھرپور کامیابی کیلئے دعا گو ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔

اس موقع پر ایک گزارش مولانا اسمعیق الحق سے اور ایک گزارش پاکستانی طالبان سے کرنا چاہتا ہوں۔

مولانا اسمعیق الحق سے تو یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ ایک اعزاز کے ساتھ بہت بڑا متحان بھی ہے جس کی نزاکتوں اور تھرات و خدشات کو وہ یقیناً مجھ سے بہتر جانتے ہیں، لیکن میں بھی اس میں ثواب کیلئے کچھ حصہ ذمہ دار ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاد افغانستان میں جوان سارے معاملات کا اصل منع ہے، جن اداروں، حلقوں اور شخصیات کا کردار رہا ہے ان کے ساتھ مشاورت کی اہمیت کو لازماً سامنے رکھیں اور خاص طور پر مولانا فضل الرحمن، سید منور حسن، مولانا ذاکر شیر علی شاہ، جنzel (ر) حمید گل، مولانا مفتی محمد فیض عثمانی اور مولانا مفتی عبدالرحیم کے ساتھ مشاورت کا اہتمام کریں تاکہ کسی درجہ میں کوئی غلطیاتی نہ رہ جائے۔

جبکہ پاکستانی طالبان سے میری گزارش ہے کہ وہ اپھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے ان کے تمام تر خلوص اور بے پناہ قربانیوں کے باوجود پاکستان کے اندر نفاذ شریعت کیلئے ہتھیار اٹھانے کی کبھی جمایت نہیں کی اور اس موقف پر اب بھی پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قائم ہوں۔ لیکن جذبہ جہاد سے بہرہ ور ملکیتیں کے ساتھ دلی ہمدردی کے باعث الدین النصیحة کے جذبے کے تحت یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق<sup>ؒ</sup> دینی جدوجہد کے دستوری اور پارلیمانی پسلوکا بھی مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ انہوں نے پاکستان کے داخلی حالات اور علاقائی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے ملک میں نفاذ اسلام کیلئے دستوری اور پارلیمانی جدوجہد کا جو راستہ اختیار کیا تھا، جس پر وہ آخر دم تک قائم رہے اور جس میں انہیں ملک کے جمہور علاء کرام بلکہ تمام دینی مکاتب فکر کی جمایت اور اتحاد حاصل تھا، وہ بھی دینی راستہ ہے اور شریعت اسلامیہ کے اصولوں کے مطابق راستہ ہے۔ میں آج کے عالمی حالات میں نفاذ اسلام کی پر امن جدوجہد کا راستہ روکنے کیلئے مختلف ممالک میں استماری قتوں کی سازشوں اور ان کے گماشتہ حلقوں کی کارستانیوں کا بحمد اللہ تعالیٰ پوری طرح اور اک رکھتا ہوں اور اس پر لکھتا بھی رہتا ہوں مگر اس کے باوجود یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کیلئے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق<sup>ؒ</sup> دستوری اور پارلیمانی جدوجہد ہمارے لیے صحیح راہ نمائی اور اسوہ فرماں کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ مشکلات کا راستہ ہے، صبر آزمائے، حوصلہ شکن ہے اور مایوسیوں کے برکیر قدم قدم پر کھائی دے

رہے ہیں لیکن موجودہ حالات میں قابل عمل راستہ بھی ہے۔ ہمارے پاکستانی طالبان اگر اس پر ہو پر بھی سمجھیگی کے ساتھ غور فرمائیں تو ہو سکتا ہے خیر کا کوئی بہتر راستہ نکل آئے!

## اسلام کا نظام حکومت: تصنیفی کاوشیں

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۹ جنوری ۲۰۱۳ء

حضرت مولانا محمد میاں المعروف منصور انصاری شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے تربیت یافتہ لوگوں میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور جمۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانو توی کے نواسے تھے۔ انہوں نے مفکر انقلاب حضرت مولانا عبد اللہ سندھی کے ساتھ آزادی ہند کی تحریک میں ان کے دست راست کے طور پر کام کیا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہ کابل چلے گئے تھے اور وہیں انہوں نے تحریکی جدوجہد کے تانے بانے بنے۔ جب حضرت مولانا عبد اللہ سندھی نے راجہ مہمندر پر تاب اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کے ساتھ مل کر آزاد ہند گور نمنٹ تشکیل دی تو مولانا منصور انصاری بھی اس کی کامیبی میں شامل تھے۔

مولانا منصور انصاری نے آزادی ہند کیلئے سیاسی تحریک منظم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کیلئے علمی و فکری محنت کی بذیاد بھی ڈالی اور فارسی زبان میں دو عمدہ رسائل ترتیب دیے جن میں عصر حاضر میں ایک اسلامی حکومت کے مجوزہ خود خال کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی نظام ہائے حکومت کے ساتھ اسلام کے نظام خلافت کا تقاضا مطالعہ پیش کیا۔ ان میں سے ایک رسالہ "حکومت الہی: دستور اسلامی امامت امت" کے نام سے ہے جو ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا رسالہ "کتاب اجتماعی انواع الدول و حریت الملل" کے عنوان سے اسی ضخامت کا حال ہے۔

یہ دونوں رسائلے ان کے فرزند مولانا حامد الانصاری نازی نے اب سے آٹھ عشرے قبل ۱۳۵۰ھ میں بجنوں سے شائع کیے تھے اور ان میں مصنف علیہ الرحمۃ نے عالم اسلام کے مفکرین کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کیلئے ان کے پیش کردہ خاکہ کے بارے میں اظہار خیال کریں اور اپنی آراء پیش کریں۔

مولانا منصور انصاری کے اس استفسار پر اس وقت کے علماء کرام نے کچھ لکھا ہیں اس کا ہمیں علم نہیں ہے لیکن خود ان کے فرزند مولانا حامد الانصاری نے "اسلام کا نظام حکومت" کے نام سے ایک خیم کتاب تصنیف کی جو اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب تصور کی جاتی ہے۔ ہمارے طالب علمی کے دور میں حضرت مولانا حافظ الرحمن سیوطہ حاروی کی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" اور حضرت مولانا حامد الانصاری کی کتاب "اسلام کا نظام حکومت" سیاسی ذوق رکھنے والے علماء اور طلبہ کیلئے مطالعہ کی اہم کتابیں سمجھی جاتی تھیں جبکہ راقم الحروف نے ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور میں "اسلام کا اقتصادی نظام" کی ایک تاخیص پیش کی تھی جو کئی قسطوں میں شائع ہوئی۔

اسلام کے نظام حکومت پر ہمارے معاصر علمی حلقوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور متعدد اصحاب علم نے

اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے مگر خود ہمارے حلقہ میں اس موضوع پر چند اس توجہ نہیں دی گئی اور **تشنگی کا احساس مسلسل باقی رہا۔** اسلامی نظام راقم الحروف کی خصوصی دل چکی کا موضوع بھی چلا آرہا ہے اور گذشتہ نصف صدی کے دوران میں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر سینکڑوں مضامین لکھے ہیں جن کا ایک مختصر خلاصہ ”اسلام، جہوریت اور پاکستان“ کے عنوان سے گذشتہ دونوں شائع ہوا ہے۔ مگر اس پر باضابطہ اور تفصیل کے ساتھ کام کی ضرورت اپنی جگہ باقی رہی ہے۔ بلکہ میرے خیال میں یہ موضوع اہل علم کے درمیان تفصیلی بحث و مباحثہ کا مقاضی ہے۔ کیونکہ انسانی سوسائٹی کے سیاسی اور تمدنی ارتقاء نے بیسیوں ایسے مسائل کھڑے کر دیے ہیں جن کا حل قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے گھرے مطالعہ اور تجربہ و تفہیم کے بعد علمی مباحثہ کی صورت میں ہی سامنے لا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں ممتاز افغان عالم دین مولانا عبد الباقی حقانی دامت فیضہم کی ایک تخفیم کتاب سامنے آئی ہے جس نے **تشنگی کے اس احساس کو خاصاً کرم کر دیا ہے۔** مولانا عبد الباقی حقانی امارات اسلامی افغانستان میں طالبان حکومت کے اہم عہدہ دار ہے ہیں اور اسلامی علوم کا گہر امطالعہ رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب عربی زبان میں ”السياسة والادارة في الإسلام“ کے نام سے دو تھیم جلدیوں میں ہے جس کا رد و ترجیح مولانا سید الامین انور حقانی اور مولانا عکیل احمد حقانی نے کیا ہے اور مجموعی طور پر کم و بیش سترہ سو صفحات پر مشتمل یہ تھیم کتاب دارالعلوم حقانیہ کوڑہ بنشک کے ادارہ مؤتمر المصطفین نے شائع کی ہے۔

**مولانا عبد الباقی حقانی اس کتاب کی تصنیف کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ایک مقصد یہ تحریر کرتے ہیں کہ**

”اسلامی حکومت کی بناؤت (تشنیل) اور چلانے کیلئے قانون کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے حالات کے مطابق حکومت کے بنانے اور چلانے کیلئے طریقہ اور دستور بنائیں۔ خصوصاً ان بھائیوں کیلئے جنہوں نے افغانستان میں عرصہ دراز کے خلاء کے بعد واقعی اسلامی حکومت چلانے کا عزم کیا ہے اور ان حضرات کا ارادہ ہے کہ بنی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفاء راشدینؓ کا طریقہ کار اپنائیں جو کہ کامیابی اور سعادت کا ذریعہ ہے اور اگر حقیقت میں اسلامی نظام کی حاکمیت کیلئے مجہد کرنے والے یہ طریقہ کار اپنائیں تو ان شاء اللہ فتح اور کامیابی کا ذریعہ ہو گا۔“

اس کتاب کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے مصنف قرآن و سنت، تاریخ خلفاء راشدینؓ اور فقہ اسلامی کے عظیم ذخیرے پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ طالبان حکومت کے ایک اہم عہدہ دار کے طور پر ان مشکلات و تجربات سے بھی گزرے ہیں جو آج کے دور میں نفاذِ اسلام کے سلسلہ میں کسی بھی حکومت کو پیش آسکتے ہیں۔

کتاب میں اسلامی حکومت کے قیام کی صورتوں، اس کے عملی ڈھانچے اور مختلف شعبوں کی تشکیل اور حکمرانوں کیلئے ضروری اوصاف و شرائط کی وضاحت کے علاوہ ایک رفاهی ریاست کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور فضل مصنف نے آیات و احادیث، تاریخی واقعات اور فقیہی جزئیات کا ایک وسیع خزانہ اس میں جمع کر دیا ہے جو اسلامی نظام کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے والوں کیلئے ضروری بنیادی مواد فراہم کر دیتا ہے اور اس سے اس علمی کاوش کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ نظامِ اسلام کے خدوخال کو جدید دور کے تناظر میں واضح کرنے کے جس کام کا آغاز ۱۳۵۰ء میں کابل سے ہوا تھا اس میں یہ وقوع پیش رفت بھی پون صدی کے بعد کابل ہی کے حوالے سے سامنے آئی ہے جو نیک فال ہونے کے علاوہ بہتر مستقبل کی نوید بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب ہر دنی مدرسہ کی لائبریری میں موجود ہونی چاہیے اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد کرنے والے ہر عالم دین اور کارکن کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں ملک کی رائے عامہ کو یہ بتاسکے کہ اسلامی نظام کے فوائد و ثمرات سوسائٹی کو کیا حاصل ہوں گے اور جب اسلامی نظام آئے گا تو ملک کے نظام و معاملات میں کیا تبدیلی آئے گی۔ بلکہ ہم اگر دنی مدارس کے استاذہ کو آمادہ کر سکیں کہ وہ قرآن کریم کے سیاسی احکام و قوانین سے متعلقہ آیات اور خلافت و امارت اور عدل و قضاء کے حوالے سے احادیث نبویہ کی تدریس میں اس کتاب کو اپنے مطالعہ کیلئے لازم کر لیں تو یہ ایک بڑی تعلیمی خدمت ہو گی۔

ہم مولانا عبد الباقی حقانی کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اسلامی نظام حکومت و سیاست کے بارے میں اتنا سچع علمی ذخیرہ مرتب کر کے ہم طلبہ کیلئے غور و خوض اور بحث و مکالمہ کا کلامیدان پیش کر دیا ہے۔ لیکن کیا ہم میں غور و خوض کی سکت اور بحث و مکالمہ کا حوصلہ کسی درجے میں باقی بھی رہ گیا ہے؟

## موجودہ صورتحال اور افغان طالبان کا موقف

ماہنامہ الشريعة، گوجرانوالہ --- فروری ۲۰۱۳ء

امریتِ اسلامی افغانستان کی اعلیٰ سطحی قیادت ان دونوں پاکستان کے سرکردہ علماء کرام اور دنی راہنماؤں کو اپنے موقف اور پالپیسیوں کے حوالے سے بریف کرنے کیلئے ان سے رابطوں میں مصروف ہے جو ایک خوشنگوار امر ہے اور اس کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ افغان طالبان کے بارے میں عالمی اور علاقائی میڈیا طرح طرح کی خبروں اور تبصروں کا سلسہ جاری رکھ رہے ہے جو عموماً غنی اور کردارشی پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ خود افغان طالبان کا میڈیا محاذاہ اس حوالے سے بہت کمزور ہے اور ان کے پاس اس کے وسائل بھی نظر نہیں آتے۔ اس خلاکوں کی حد تک باہمی رابطوں اور میں جوں سے پر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے امریتِ اسلامی افغانستان کی اس تازہ ہم سے ہمیں اطمینان حاصل ہوا ہے اور ہم اس کے جاری رہنے کی امید رکھتے ہیں۔

امریتِ اسلامی افغانستان کے چند سینیئر راہنماؤں کے ساتھ ان رابطوں کے دوران راقم الحروف کو بھی گفتگو کا موقع ملا ہے جس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

افغان راہنماؤں کا کہنا ہے کہ انہوں نے بیرونی عسکری جاریت کے خلاف جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اس کا اعتراف اب عالمی سطح پر بھی ہونے لگا ہے اور یہ رائے عام ہوتی جا رہی ہے کہ نیٹو تھا افغانستان میں طالبان کے خلاف اس جنگ میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکا اور اب وہ باعزت واپسی کے راستے تلاش کر رہا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے اور اس میں کسی طرح کا کوئی مبالغہ نہیں ہے لیکن اب امریتِ اسلامیہ افغانستان کو ٹپویتی اور میڈیا کے محاذ پر جن

مشکلات کا سامنا ہے اس کیلئے پاکستان کے دینی حلقوں کی توجہ اور سرپرستی ضروری ہے۔ مثلاً اسکی کمی ان کیلئے اپنی پوزیشن کی وضاحت اور بھی خواہوں کے ساتھ رابطوں میں بڑی رکاوٹ ہے۔ خصوصاً میدیا کے شعبہ میں غلط پروپیگنڈے کا جواب جس قدر زیادہ ضروری محسوس ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل دکھائی دیتا ہے۔

ڈپلو میسی کے مخاذ پر ان کا کہنا ہے کہ اب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ جانے سے پہلے کسی نہ کسی طرح حامد کرزی کو افغانستان کے ایک جائز حکمران کے طور پر تسلیم کرالیا جائے۔ اس کیلئے لوئی جزگہ اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی دینی قیادت کی اہم شخصیات کو مصالحت کے نام پر حامد کرزی کو جائز حکمران کی حیثیت دینے کی چال سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ گذشتہ سال کابل میں علماء کرام کی ایک بین الاقوامی کانفرنس اسی مقصد کیلئے منعقد ہوئی تھی جس میں شرکت سے انکار کر کے پاکستان کے سرکردہ علماء کرام نے اس چال کو ناکام بنا دیا تھا۔ اب پھر اسی طرح کا جال پھیلا یا جارہا ہے، اس لیے امارتِ اسلامی افغانستان کی علماء کرام سے یہ اپیل ہے کہ وہ اس سے ہوشیار ہیں۔ طالبان راہ نماوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ افغان طالبان نے یہ جنگ مظلوموں کے سب سے بڑے ہتھیار ”ندائی حملہ“ کے ذریعے لڑی ہے اور اس میں کامیاب حاصل کی ہے۔ اس ہتھیار کی علی الاطلاق مخالفت اور اسے مطلقاً حرام قرار دینے کے فتوے پر ان کے تحفظات ہیں اور وہ اس میں اپنانہ فضان محسوس کر رہے ہیں۔

اسی دوران طالبان راہ نماوں کی طرف سے ایک مفصل تحریری موقف تقسیم کیا گیا ہے جس کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ اسے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ کالم کا دامن نگہ ہونے کی وجہ سے اس کا صرف ایک حصہ ہم اس میں پیش کر رہے ہیں، مگر اس سے قبل میں اپنی گفتگو کا مختصر خلاصہ بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

رقم المعرف نے عرض کیا کہ جہاں تک افغانستان میں ہونے والے جہاد کا تعلق ہے ہم اسے افغانستان کی قومی آزادی کی جنگ اور شرعی جہاد سمجھتے ہیں۔ روایت استعمار کے خلاف ان کی جنگ بھی شرعی جہاد تھا اور امریکی استعمار کی عسکری بیخار کے خلاف ان کی مراحمت اور جنگ بھی شرعی جہاد ہے۔ اسی طرح امارتِ اسلامی افغانستان نے اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں خلفاء، راشدینؑ کی روایات کو جس طرح زندہ کیا ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا میں نقادِ اسلام کے نئے دور کا نقطہ آغاز ہے اور ہم اس کی کامیابی کیلئے پر خلوص خواہش کے ساتھ دعا گو بھی ہیں۔

حامد کرزی کو ہم افغانستان کا جائز حکمران تصور نہیں کرتے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ غیر ملکی فوجوں کے مکمل انخلاء کے بعد افغان عوام اپنی آزادانہ رائے کے ساتھ جو حکومت قائم کریں گے وہی جائز حکومت ہوگی، اس لیے حامد کرزی یا اس کے نمائندوں کے ساتھ ان معاملات میں کسی بھی درجہ کی یک طرفہ شرکت غیر اصولی بات ہوگی۔

福德ائی حملوں کے بارے میں ہمارا شروع سے یہ موقف ہے جس کا ہم کی بار اظہار کر چکے ہیں کہ یہ مظلوم اور بے بس قوموں کا آخری جگلی ہتھیار ہوتا ہے جو ہر دور میں استعمال ہوتا آرہا ہے اور آج بھی بے بس مظلوموں کیلئے یہ آخری ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کسی بھی شرعی جہاد یا جائز جنگ میں اس کے استعمال پر ہمیں کوئی اشکال نہیں ہے۔ البتہ پاکستان کے مختلف حصوں میں عام آبادیوں، مساجد، امام بارگاہوں، گرجاگھروں اور مارکیٹوں میں ان خودکش حملوں

کے ذریعے جو تابی پھیلائی جا رہی ہے، اسے ہم شرعاً درست نہیں سمجھتے اور یہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہیں۔ اس لیے پاکستان کا امن و استحکام صرف پاکستانیوں کی ضرورت نہیں بلکہ اسلام اور عالم اسلام کے بھی مفاد میں ہے اور اس میں بد امنی کا فروغ ملت اسلامیہ کیلئے باعث نقصان ہے۔ ہم ان حملوں کے بارے میں واضح تحفظات رکھتے ہیں اور جائز فدایی حملوں اور ناجائز خودکش حملوں کے درمیان فرق قائم رکھنے اور اسے واضح کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان کے اندر ہونے والی اس قسم کی کارروائیوں میں افغان طالبان کا کسی درجہ میں بھی کوئی حصہ نہیں ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ امارت اسلامی افغانستان ایسی کارروائیوں کی کسی طرح بھی حمایت نہیں کر رہی، لیکن میڈیا کے یک طرفہ پر اپیگنڈے کی وجہ سے اور ناموں کی مشابہت کی وجہ سے جو غلط فہمیاں پھیلی جا رہی ہیں ان سے نجات حاصل کرنے کیلئے اس فرق کو واضح کرتے رہنا از حد ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں امارت اسلامی افغانستان کے تحریری موقف میں جو وضاحت کی گئی ہے وہ اطمینان بخشن اور خوش

آئندہ ہے، قارئین کرام اسے بھی ملاحظہ فرمائیں:

”آخر میں امارت اسلامیہ کی پالیسی اور طریقہ کار سے اچھی طرح آگاہ کرنے کیلئے یہ چند وضاحتیں ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہمارے پاس کام کے طریقہ کار کیلئے جید علماء کی جانب سے تائید شدہ مرتب اصول اور لائجہ عمل موجود ہے۔ ہر طرح کے مسائل میں تجویہ کار شیوخ اور علماء کرام سے فتوے طلب کیے جاتے ہیں۔ آپ کے مشورے اور اطاعت کے چنبے سے ہر کام انجام دیا جاتا ہے۔ ہمارے فیصلے ہمارے جذبات کے نہیں اصولوں کے تابع ہیں۔ ہم دشمنوں کی سازشوں کی طرف متوجہ ہیں۔ دنیا کے حالات سے خود کو باخبر رکھتے ہیں۔ داخلی و خارجی سیاست میں امور کے بہتر نظم و ضبط کیلئے الگ الگ کمیٹیاں متعین کی گئی ہیں۔ ایک دوسرے کے کاموں میں بے جا مداخلت نہیں کی جاتی۔ اپنی بساط کے مطابق ہم نے کوشش کی ہے کہ کام اہل کار افراد کے سپرد کیا جائے۔ علماء کرام اور صاحب نظر لوگوں کے مشورے اور نقطہ ہائے نظر بڑی وسعت قلبی اور دل کی خوشی سے سنتے اور ضرورت کے وقت ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ہمارے طریقہ کار میں ہر معاملے میں بلا ضروری اور بے وقت دست اندازی اور لوگوں کو بے جا نگاہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ نہ کسی کو دھمکانے اور نہ تاوان کی غرض سے لوگوں کو انغوکرنے کو قانونی سمجھتے ہیں۔ اور نہ شک کی بناء پر کسی کے جان و مال کی جانب دست درازی کو جائز سمجھتے ہیں۔ مجہد کے نام پر بھتہ خوری مجہد کی شان نہیں سمجھتے۔ بے گناہ انسانوں کا قتل، کشیر آبادی اور مقدس مقامات پر ہدف کی تعیین کے بغیر حملے ہمارا کام نہیں اور نہ ہم کسی اور کو ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ عزت، ذلت، کامیابی اور ناکامی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہمارے ساتھ اس وقت شامل ہوگی جب ہم اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں گے۔ اور اس کے

احکام پر عمل کریں گے۔ اللہ کی مخلوق کو اذیت نہ دیں۔ لہذا تمام علماء کرام، صاحب نظر لوگوں اور اہل خیر سے ہماری توقع ہے کہ کچھ خود سریادشمن کے ائمیں جنس اداروں کے پنجوں میں جڑے ہوئے نام نہاد مجاہدین کی نازیبا حرکتوں کو امارت اسلامیہ کی جانب منسوب نہ کریں۔ تمام وہ اعمال جو شریعت کے اصولوں سے متصادم ہیں ہماری جانب سے اس کی تردید کی جاتی ہے اور اگر ہماری صفت میں کوئی ایسا کرے گا تو اسے شرعی سزا کا سامنا کرنا ہو گا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ، ہمارے مجاہدین کو اللہ تعالیٰ نے ان ناپاک امراض سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ایسے نامناسب اور ناجائز امور کی انجام دہی کے بعد اگر کوئی شخص اپنی نسبت امارت اسلامیہ کی جانب کرتا ہے یا محترم امیر المؤمنین کو پہنچانے کہتا ہے تو یہ شخص نام کا ناجائز استعمال ہے۔ ایسے لوگ امارت اسلامیہ کے مبارک نام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو لوگ امارت اسلامیہ سے مریوط ہوتے ہیں وہ امارت اسلامیہ کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ اور امارت اسلامیہ کی پالیسی یہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے۔ اگر کوئی اس سے سرتاہی کرتا ہے تو اس کا امارت اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی امارت اسلامیہ ایسے شخص کو مجاہد کہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم اور آپ کو تمام بے اطاعت، جاہ طلب اور نااہل لوگوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ آمین ثم آمین۔“ (۲۰۱۳ء ستمبر م۴۰)

## دہشت گردی کے خلاف قومی مہم

روزنامہ پاکستان، لاپور ۲۳ جولائی ۲۰۱۳ء

طبیب کسی بھی طریق علاج سے تعلق رکھتا ہو، مریض کا علاج شروع کرنے سے پہلے دو باتیں ضرور چیک کرتا ہے۔ ایک یہ کہ اسے بیماری کیا ہے اور دوسرا یہ کہ اس بیماری کا سبب کیا ہے۔ بیماری اور اس کے سبب کا تعین کیے بغیر کوئی معانکی کسی مریض کے علاج کا آغاز نہیں کرتا۔ پھر وہ صرف بیماری کا علاج نہیں کرتا بلکہ سبب کے سداباں کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ بسا اوقات سبب سے یقیناً چھڑانے کو بیماری کے علاج سے بھی مقدم کرتا ہے، اس لیے کہ جب تک سبب کا خاتمه نہ ہو کسی بیماری کے علاج کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوپاتی۔

ہم اس وقت تو می سٹھ پر دہشت گردی کے سداباں کی جس میں مصروف ہیں اس میں بھی علاج کے اس مسئلہ اصول اور طریق کار کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جو کہ دکھائی نہیں دے رہا۔ اور اس سے اصحاب فکر و دانش کی تشویش مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حدود میں حکومت کی رٹ کا قائم ہونا اور دستور کی بالادستی کو تسلیم کیا جانا ہر لحاظ سے ضروری اور ناگزیر ہے۔ اور کسی بھی دینی یا سیاسی مطالبہ کیلئے ہتھیار اٹھانا ملکی سالمیت، قومی وحدت اور ملی تقاضوں کے منانی ہے۔ افواج پاکستان دستور کی بالادستی اور حکومتی رٹ کیلئے جو کارروائی جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ شمالی وزیرستان میں آپریشن سے متاثرہ بے گھر شہریوں کی دیکھ بھال اور امداد کیلئے قوم کے مختلف اداروں اور طبقات

کی جو سرگرمیاں جاری ہیں، پوری قوم ان کے ساتھ ہے اور اس مشن کی کامیابی کیلئے دعا گو ہے۔ لیکن معاملات کو اس سطح تک لے جانے والے اسباب و عوامل کی طرف کسی ادارے یا طبقے کی کوئی توجہ نظر نہیں آرہی جو تشویشناک امر ہے اور اہل فکر و نظر سے سنجیدگی اختیار کرنے کا تقاضہ کر رہی ہے۔

بلاشبہ دہشت گردی ایک کینسر ہے جو پورے قومی وجود میں سرایت کرتا جا رہا ہے اور بد قسمی سے کربلائی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور سمیت ملک کے اہم مراکز اس کی زد میں ہیں۔ مگر ہمارے قومی پالیسی سازوں نے قومی جسم کے کینسر زدہ اعضا کو کاٹتے چلے جانے کی پالیسی کے ساتھ کینسر کا سبب بننے والے عوامل کے سدباب کو ابھی تک اپنی پالیسی میں شامل نہیں کیا۔ اس لیے ہم اس قومی کینسر کے علاج کی ریاست پالیسی کی حمایت کرنے کے باوجود یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت اور دیگر پالیسی ساز اداروں سے گزارش کریں کہ اسباب و عوامل کا سدباب کیے بغیر کینسر کا علاج کینسر زدہ اعضا کو کاٹتے چلے جانے کی صورت میں مسلسل جاری رکھنے کے نتائج پر ضرور غور کر لیا جائے اور اس سلسلے میں پالیسی ترجیحات کا ایک بار پھر جائزہ لے لیا جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کے شمال مغربی علاقوں سوات، جنوبی وزیرستان اور شامی وزیرستان وغیرہ میں حکومتی رٹ کو چینچن اور اس کے جواب میں فوجی آپریشن کے اسباب پر غور کیا جائے تو وہ سبب سب سے بڑے اور نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد افغانستان میں روس کے خلاف جنگ میں شریک ہونے والے ہزاروں ملکی اور غیر ملکی افراد کو جنگ ختم ہونے کے بعد اپنا ایجادناٹے کرنے میں آزاد چھوڑ دیا گیا اور کسی قومی پالیسی کا انہیں حصہ نہیں بنا یا گیا، جس کی وجہ سے ہرگز وہ نے اپنا ایجادناٹے کیا اور آج پوری قوم اس کا خمیازہ بگلت رہی ہے۔ سو ویت یونین کے خلاف افغانستان کے جہاد میں جو لوگ شریک ہوئے وہ پاکستانی شہری ہوں یا یہرون ممالک سے آئے ہوں، ان کی آمد اور جہاد میں شرکت خود ہماری ریاست پالیسی کا حصہ تھی۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان لوگوں کو جہاد کی تربیت دینے اور اس میں عملًا شریک کرنے کے عمل کے ہر مرحلہ میں ہم ان کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن رو سی فوجوں کی افغانستان سے والی کے بعد اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا کہ ہزاروں لوگوں نے ہمارے ذریعہ ہتھیاروں کی تربیت حاصل کی ہے اور انہیں ہتھیاروں تک رسائی بھی میسر ہے۔ اس لیے ان کے مستقبل کے پروگرام اور ایجادنے میں ان کی راہ نمائی اور نگرانی کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سندھ کے چند ہزار مسلح حروں کو توحیدت عمل کے تحت قومی نظم کا حصہ بنایا گیا تھا، لیکن جہاد افغانستان کے بعد ان سے کم از کم دس گنازیاہ مسلح افراد کے بارے میں کوئی قومی پالیسی ط نہیں کی گئی اور انہیں اس طرح آزاد چھوڑ دیا گیا کہ آج وہ حکومتی رٹ اور دستوری بالادستی کیلئے خطرہ بن گئے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کا اعتراف بہر حال کرنا ہو گا اور اس کی روشنی میں اس خطرے سے نمٹنے کی حکمت عملی اور ترجیحات طے کرنا ہوں گی۔ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلینٹن نے تو ایک موقع پر یہ اعتراف کیا تھا کہ رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد مجاہدین کے گروپوں کو نظر انداز کرنا ہماری غلطی تھی، مگر ہماری قومی قیادت ابھی اس کیلئے تیار دکھائی نہیں دیتی۔ جبکہ اس حقیقت کو تسلیم کر کے اس کی بنیاد پر قومی پالیسی کی تشکیل کے بغیر اس منسلک کے پائیدار حل کی کوئی صورت کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسرے سب ہمارے نزدیک نفاذِ شریعت کے اہم قومی تقاضے کو مسلسل نظر انداز کرتے چلے جانا ہے۔ حالانکہ اس مسئلہ میں اصولی طور پر کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔ دستور پاکستان نفاذِ شریعت کی بات کرتا ہے۔ ہماری قومی سیاسی جماعتوں کے انتخابی منشوروں میں اسلامی احکام و تعلیمات کی عملداری کی بات موجود ہے۔ جبکہ ریاستوں کو پاکستان کا باقاعدہ حصہ بناتے وقت اور اس کے بعد مختلف تحریکات کے ساتھ کیے جانے والے معاهدات میں اس کا باقاعدہ وعدہ کیا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی عملی صورت سامنے نہیں آ رہی۔ اس حوالے سے ایک عذر یہ کیا جاتا ہے کہ نفاذِ شریعت کیلئے طالبان کا وژن ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بات درست ہوتی اگر ہم نے دستور میں طے شدہ طریق کار کے مطابق نفاذِ شریعت کی طرف پیشہ رفت کی ہوتی اور منتخب پارلیمنٹ اور دستوری عدالت کے فیصلوں پر عملدار آمد کا کچھ نہ کچھ اہتمام کر لیا ہوتا۔ اس صورت میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ پاکستانی قوم کے جمہوری وژن کے مطابق ہم نے نفاذِ اسلام کیلئے یہ اقدامات کر رکھے ہیں، اس لیے اس کے بر عکس کسی وژن کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ نفاذِ اسلام کیلئے پارلیمنٹ کے فیصلوں، دستور کے تقاضوں اور عدالتِ عظیم کی واضح ہدایات کے باوجود کوئی پیشہ رفت موجود نہیں ہے۔ مگر نفاذِ شریعت کے مطالبات کو ہم ”طالبان کا وژن“ قرار دے کر مسترد کرتے چلے جا رہے ہیں، یہ بات نہ قرین انصاف ہے اور نہ ہی عقل و دانش اس کا کوئی جواز فراہم کرتی ہے۔

آج بھی نفاذِ شریعت کے حوالے سے طالبان کے مبینہ وژن کو روکنے کا راستہ یہی ہے کہ دستور و پارلیمنٹ نے ملک میں نفاذِ اسلام کیلئے جو فیصلے کر رکھے ہیں ان پر عملدار آمد کا اہتمام کیا جائے۔ اور طالبان کے ساتھ ساتھ پوری قوم کو یہ واضح پیغام دیا جائے کہ دستور و قانون اور عدالت و پارلیمنٹ کے فیصلوں کے مطابق نفاذِ اسلام کیلئے عملی اقدامات کا اتفاق کیا جا رہا ہے۔ اور یہ آغاز عملی کھائی بھی دے۔ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ دستور کے مطابق نفاذِ اسلام کو قومی پالیسی کا عملی حصہ بنانے کے اعلان سے ہی نفاذِ شریعت کے کسی تباadel وژن کے غبارے سے ہو انکل جائے گی۔

ہم دستور کی بالادستی اور حکومت رٹ کی بحالی کیلئے حکومت اور افواج پاکستان کے ساتھ ہیں اور شامی وزیرستان سے بے گھر ہونے والے لاکھوں افراد کی بحالی اور دیکھ بھال کیلئے ریاتی اداروں اور قوم کے مختلف طبقات کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ مگر یہ درخواست کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کینسر کا اعلان کرتے ہوئے کینسر کے اسباب کے سدّباب اور روک تھام کی بھی کوئی صورت نکالی جائے۔ ورنہ کینسر کا شکار ہونے والے ایک کے بعد دوسرے عضو کو کاشتہ چلے جانے کا آخری نتیجہ بہر حال ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہو گا۔

## آج کے مسلم نوجوان کا مقدمہ

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۲۰ ستمبر ۲۰۱۳ء

میری اس گزارش پر بعض دوستوں کو الجھن ہوتی ہے کہ کسی کے بارے میں یک طرف بات نہیں کرنی چاہیے اور اگر کسی فرد یا گروہ کے بارے میں کوئی شکایت یا اعتراض ہو تو اس سے بھی پوچھ لینا چاہیے کہ تمہارا موقف کیا ہے؟ اس کا

موقف از خود طے کرنے کی بجائے اس سے دریافت کرنا چاہیے اور آگوہ کوئی وضاحت پیش کرے تو اسے بکر مرتد کر دینے کی بجائے اس کا سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔ ہمارے ساتھ گذشتہ ڈیڑھ صدی سے یہ معاملہ جاری ہے کہ اکابر علماء دیوبند پر گستاخ رسول ہونے کا الزام مسئلہ دھرا یا جارہا ہے۔ عبارات پیش کی جارہی ہیں اور فتوؤں پر فتوے جاری ہو رہے ہیں۔ مگر اس حوالے سے خود ان اصحاب عبارات نے جو تحریری وضاحتیں پیش کی ہیں اور اکابر علماء دیوبند نے مقابله مسائل پر جو موقف بیان کیا ہے، اسے قبول نہیں کیا جا رہا اور یہ کہا جا رہا ہے کہ علماء دیوبند کا موقف وہ نہیں ہے جو وہ خود بیان کرتے ہیں، بلکہ وہ ہے جو معتبرین نے ان کی عبارات سے سمجھ رکھا ہے۔

اس تناظر میں آج کا ایک اہم مقدمہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو رفتہ رفتہ دنیا کا سب سے بڑا مقدمہ بتا جا رہا ہے، اور وہ ہے اس نوجوان کا مقدمہ جو خود کو مجہد کہتا ہے لیکن دنیا نے اسے دہشت گردی کا نائنٹل دے رکھا ہے اور اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے دنیا میں ہر طرف نہ صرف طاقت کا بے دریغ استعمال ہو رہا ہے بلکہ عالمی سطح پر متعدد محاذا قائم کر کے یہ عزم ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کو دنیا میں کہیں بھی زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جائے گا۔

آج جی چاہتا ہے کہ اس مجہد یاد ہشت گرد کا مقدمہ خود اس کی زبان میں پیش کروں، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اسے اپنی پوزیشن واضح کرنے یا اپنا موقف اور جذبات پیش کرنے کیلئے ابلاغ اور لائگ کا کوئی فورم میر نہیں ہے اور میریا کے تمام موثر رائے کے دروازے اس کیلئے شجر معمونہ کا درجہ اختیار کر کے ہیں۔ البتہ یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موقف سے یا اس میں سے کسی بات سے میرا تشقق ہونا ضروری نہیں ہے۔ میں اپنا موقف متعدد تحریروں میں بیان کر چکا ہوں اور ضرورت محسوس ہونے پر پھر بھی کسی موقع پر بیان کر سکتا ہوں۔ اس لیے آج صرف اس نوجوان کی بات کرنا چاہتا ہوں جو تھیار بکف ہے اور اپنے زعم میں اللہ تعالیٰ کے دین کی سر بلندی، اسلام کے غلبہ، کفر و طاغوت کے خاتمه اور قرآن و سنت کی روشنی میں عدل و انصاف کے قیام کیلئے اپنی جان کو ہیچلی پر رکھے ہوئے دنیا کے مختلف محاذاوں پر صرف آرا ہے۔ وہ فلسطین میں بھی ہے، عراق و شام میں بھی ہے، افغانستان میں بھی ہے، کشمیر میں بھی ہے، ناگچیر یا اور صومالیہ میں بھی ہے، شیشان و ترکستان میں بھی ہے، اور فلائن و ارakan میں بھی ہے۔ اسے مجہد کی فریاد کا عنوان دیں یاد ہشت گرد کا مقدمہ کہہ لیں آپ کی مرضی ہے۔ لیکن اس کی بات ضرور سینیں اور اس پر غور بھی کریں کہ جس صورت حال سے وہ دوچار ہے اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں اور وہ کون سے حالات بین جنہوں نے اسے اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ:

- میں ایک مسلمان ہوں اور قرآن و سنت پر ایمان رکھتا ہوں۔ مجھے قرآن و سنت میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان معاشرے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات و فرائیں کی عملداری قائم ہونی چاہیے اور ایک مسلمان حکومت کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ میں قرآن و حدیث کو کسی دینی مدرسہ میں پڑھوں، کالج اور یونیورسٹی میں اس کی سہولت میرا جائے، یا قرآن و سنت کی تعلیمات تک رسائی کا کوئی اور ذریعہ مل جائے، احکام و قوانین اور نظام کے حوالے سے قرآن و سنت کی تصریحات میں مجھے

کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور دنیا میں کہیں بھی چلا جاؤں ان کے معنی و مفہوم میں یکسانیت ہی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب عملاد کیتا ہوں تو مجھے یہ عملداری کسی مسلمان معاشرے میں نظر نہیں آتی اور کوئی مسلمان حکومت اس کیلئے تیار دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے بتایا جاتا ہے کہ مسلمان حکومتیں اس وجہ سے اس کیلئے تیار نہیں ہیں کہ آج کا عالمی نظام ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور مروجہ بین الاقوامی سٹم اور معاهدات میں اس کی کنجائش موجود نہیں ہے۔

- میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک میں عوام کو یہ حق دیا گیا ہے کہ ان کی اکثریت اپنے وطن کیلئے جس نظام کو پسند کرے اور جن احکام و قوانین کو نافذ کرنا چاہے، انہیں اس کا حق حاصل ہے۔ لیکن کسی مسلمان ملک کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جا رہا کہ اس کے عوام کی اکثریت خود اپنے ملک میں اپنے دین و مذہب کے احکام و قوانین کا نافذ کر سکے۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ الجزا اور مصر میں عوام کے اکثریت فیصلوں کو مسترد کر کے ان پر آمریت مسلط کر دی گئی ہے اور پاکستان کے عوام کی اکثریت اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے نفاذ اسلام کا دستوری حق حاصل کرنے کے باوجود اس سے محروم ہے، بلکہ سیکولر عالمی فورمز پاکستانی عوام کے منتخب نمائندوں کے طے کردہ اس دستور کو ختم کرانے کے درپے ہیں۔

- یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ دو مسلمان ملکوں انڈونیشیا اور سوڈان کی تقسیم ہوئی ہے اور غیر مسلم مسیحی آبادی کو اکثریت مسلم آبادی سے الگ کرنے کیلئے اقوام متحده کے ذریعے ریفرنڈم کرو کر ان کی الگ ریاستیں قائم کر دی گئی ہیں، لیکن کشمیر میں اقوام متحده کے باضابطہ فیصلہ کے باوجود اس ریفرنڈم سے عمد़اً گریز کیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں بین الاقوامی معاهدات اور جنرل آئیلی کی قراردادیں عالمی استعمار کے سامنے بے بھی کی تصور ہی ہوئی ہیں۔

- فلسطین میں وہاں کی قدیمی آبادی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے میں اسے نہیں بھول سکتا۔ اسرائیل گذشتہ نصف صدی سے امریکہ اور یورپ کی سرپرستی بلکہ پشت پناہی سے مظلوم فلسطینیوں پر ظلم و ستم کا جو بازار گرم رکھے ہوئے ہے، اس سے عالمی امن کے چودھریوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اور خاموشی کے ساتھ یہ انتظار جاری ہے کہ آہستہ آہستہ فلسطینیوں کی قوت مزاحمت بلکہ ان کا وجود بھی ختم ہو جائے تاکہ پورے مشرق و سلطی پر اسرائیل کی چودھراہٹ مسلط کرنے اور مسلمانوں کے قبلہ اول مسجد اقصیٰ کے بارے میں عالمی استعمار کے ایجادے کو مکمل کرنے کی راہ ہموار ہو۔

- مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ فلسطین ہزاروں سال قبل یہودیوں کا وطن تھا اس لیے اس زمین پر ان کا حق ہے، لیکن کوئی یہ بتانے کیلئے تیار نہیں ہے کہ انہیں پر مسلمانوں نے کئی صدیاں حکومت کی ہے، وہاں ان کا حق کیوں نہیں ہے۔ اور بغلہ دلیش کے پڑوس میں اراکان پر صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، آج بھی اس

- پٹ میں مسلم آبادی اکثریت میں ہے، لیکن انہیں وہاں کا باشندہ تسلیم نہیں کیا جا رہا، اور انہیں بے وطن کرنے کیلئے قتل و غارت اور ریاتی دہشت گردی کا عذاب ان پر مسلط کیا گیا ہے، اس پر اقوام متحده زبان جمع خرچ سے آگے کیوں نہیں بڑھ رہی؟
- افغانستان میں روئی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد شروع ہوا تو اس میں میری شرکت کو سراہا گیا۔ مجھے مجاہد قرار دیا گیا، میری حمایت و امداد کیلئے پوری دنیا ایک طرف ہو گئی اور مجھے حریت پسند اور فریڈم فائزہ کے خطابات سے نوازا گیا، لیکن میں نے اسی افغانستان میں امریکی فوجوں کی آمد اور تسلط کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو مجھے دہشت گرد ترار دے دیا گیا ہے اور میں دنیا کا سب سے بڑا حجم قرار پا گیا ہوں۔
  - مجھے بتایا گیا کہ افغانستان میں روئی افواج کی آمد جاریت تھی اور اس کے خلاف مسلح مراجحت جہاد تھا۔ لیکن مشرق و سطی میں، تیل کے چشمتوں پر اور اسرائیل کے جبر و تشدد کے تحفظ و دفاع میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجوں کی موجودگی جاریت کیوں نہیں ہے؟ مجھے اس سوال کا جواب نہیں دیا جا رہا، صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ فوجیں اس خطہ کی حکومتوں کی دعوت پر آئی ہیں، جبکہ تاریخ بتاتی ہے کہ افغانستان میں روئی افواج کی آمد بھی اس وقت کے افغان حکمران حفیظ اللہ امین کی باقاعدہ دعوت پر معابدہ کے تحت ہوئی تھی۔
  - مجھے یہ کہا جاتا ہے کہ یہن الاقوامی نظام کے خلاف ہتھیار اٹھانا جرم ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان ملکوں میں مسلمان حکومتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے، لیکن اس سوال کا کوئی بھی جواب نہیں دے رہا کہ پاس ہتھیار اٹھانے کے سوا کیا چارہ کار باتی رہ جاتا ہے؟ اور اس عقدہ کا حل بھی کوئی پیش نہیں کر رہا کہ مسلمان ملکوں میں مسلمان عوام کے منتخب نمائندوں کے جمہوری فیصلوں کو طاقت کے زور پر مسترد کر دیا جائے تو وہ عوام اپنے فیصلوں کی بحالی کیلئے کیا راستہ اختیار کریں؟
  - میرا عقیدہ ہے اور صرف میرا عقیدہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے تمام فقہی مذاہب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ کا قیام ملتِ اسلامیہ کا اجتماعی دینی فرضہ ہے، جبکہ عملی صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں اسلامی خلافت یا مارت کے قیام کو برداشت نہیں کیا جا رہا۔ بلکہ اوبما اور ٹونی بلیسٹر جیسے عالمی لیڈر بر ملا کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو خلافت قائم نہیں کرنے دیں گے۔
  - میرا مقدمہ سادہ سا ہے کہ:
    1. مسلمان ممالک میں غیر ملکی مداخلت کا سلسلہ بند کر کے ان کے عوام کو اپنے نظام و قوانین کے ہارے میں خود فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے اور ان کے اجتماعی فیصلوں کو مسترد کرنے کا مکروہ سلسہ ختم کیا جائے۔

2. عالمی لیڈر اور حکومتیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف بین الاقوامی معاهدات کی آئندی حفاظ آرائی ختم کر کے مسلمانوں کے دین اور ثقافت کا احترام کریں اور طاقت کے زور پر مسلم ممالک میں مغربی فلسفہ و تہذیب کو مسلط کرنے سے باز آجائیں۔
3. فلسطین، کشمیر، اراکان اور دیگر ایسے مظلوم خطوں کے مسلمانوں کو ان کے مسلمہ حقوق دلوانے کا اہتمام کیا جائے اور منافت کا سلسہ ترک کر کے انہیں عملہ انصاف مہیا کیا جائے۔
4. عراق اور افغانستان سے غیر ملکی فوجیں واپس بلائی جائیں اور مشرق و سطی کے عوام و ممالک کو آپس میں لڑانے کی نہ موم اور شرمناک سازش سے باز رہا جائے۔
5. مسلمان حکومتیں مغربی استعمار کی کاسہ لیسی ترک کر کے ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی ضمیر اور جنوبات کے مطابق اپنی خود مختاری بحال کریں اور ملی حیثیت وغیرت کا مظاہرہ کریں۔
6. خلافت اسلامیہ کا قیام ملتِ اسلامیہ کا اجتماعی دینی فریضہ ہے وراس وقت پوری امت اس شرعی فریضہ کی تارک اور گنہ گار ہے۔ اس پر توبہ و استغفار کا اہتمام کیا جائے اور خلافت اسلامیہ کے عملی قیام کی طرف موجودہ حالات کی روشنی میں پیش رفت کی جائے۔

مسلمان حکومتیں اور سیاسی قیادتیں اگر اس ایجنسٹے پر سمجھیدہ ہو جائیں اور عملہ بھی کچھ کریں تو مجھے ہتھیار اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اگر مسلمان حکومتیں بھی کچھ نہ کریں، مسلم ممالک کے عوام کے جہوری فیصلوں کو بھی قوت کے بل پر سبو تاٹ کیا جاتا رہے، اسلام اور اسلامی عقائد و روایات کے خلاف شفاقتی یلغار بھی دن بدن بڑھتی رہے، اور مسلمانوں کی سیاسی قیادتیں بھی ”ائیش کو“ پر تقاضت کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں، تو پھر مجھے بتایا جائے کہ کیا میں بھی اس موقف اور ایجنسٹے سے دست بردار ہو جاؤں؟؟؟

## کل کے مجاہد، آج کے دہشت گرد

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ ستمبر ۲۰۱۳ء

امریکہ بہادر نے مولانا فضل الرحمن خلیل کو بھی دہشت گردی کی عالمی فہرست میں شامل کر لیا ہے اور ان پر مختلف النوع پابندیوں کا اعلان کر دیا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اس میں اس قدر تاخیر کیوں ہوئی ہے؟ کیونکہ مولانا فضل الرحمن خلیل اپنے طالب علمی سے ہی جس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث دیکھے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ کام بہت پہلے ہو جاتا چاہیے تھا۔ اس لیے مولانا فضل الرحمن خلیل اگر مجھے اپنے رد عمل کے اظہار میں ترجیحی کام موقع دیں تو میں اس کیلئے صرف ایک شعر کے اس مصروف پر اتفاق کروں گا کہ

بہت دریکی مہرباں آتے آتے  
مولانا فضل الرحمن خلیل کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، اور اس دور سے جانتا ہوں جب وہ افغانستان میں روئی استعمار کے خلاف جہاد میں شرکت کیلئے مولانا ارشاد احمد شہید، قاری سیف اللہ اختر، مولانا مسعود کشمیری شہید، اور سعادت اللہ خان کے ساتھ مل کر دینی مدارس کے طلباء کو تیار کیا کرتے تھے۔ میں ان چاروں کو پاکستان کے دینی مدارس کے حوالے سے جہاد افغانستان کے ”ال سابقون ال الاولون“ کہا کرتا ہوں۔ پھر ان کے ساتھ کمانڈر خالد زیر شہید، مولانا مسعود از ہڑ اور دوسرے حضرات بھی شامل ہو گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ قافلہ بڑھتے بڑھتے لشکر جرار کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ مجھے مختلف اوقات میں ان سے ہر ایک کے ساتھ شریک کار ہونے کا موقع ملا ہے اور متعدد محاڈوں پر جانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔

لیکن افغانستان میں روئی استعمار کی مسلسل مداخلت کے خلاف مذاہمت کی یہ جنگ خود امریکہ بہادر کے نزدیک جہاد تھی، جنگ آزادی تھی، اور اس میں حصہ لینے والے ”فریڈم فائز“ شمار کیے جاتے تھے۔ اس لیے امریکہ اور عالمی رائے عامہ اس کی پشت پر تھی اور نہ صرف ہتھیار اٹھانا جائز تھا، بلکہ نوجوانوں کو اسلحہ کی تربیت دینا اور انہیں جنتگجو بنانا بھی کار خیر تصور ہوتا تھا۔ اس لیے کسی کو کوئی پریشانی نہیں تھی اور نہ ہی کسی کو کوئی اعتراض یا اشکال تھا۔ بات اس وقت بگڑی جب افغانستان سے روئی فوجوں کی واپسی کے بعد ان کی جگہ امریکی فوجیں اتریں تو ان فریڈم فائز زرنے کہا کہ غیر ملکی فوجیں توغیر ملکی ہی ہوتی ہیں۔ خواہ روئی کی ہوں یا امریکہ کی ہوں۔ کیونکہ افغانستان نہ سوویت یونین کا حصہ تھا اور نہ ہی امریکہ کی ریاست تھا کہ ان میں سے کسی کی فوجوں کی آمد کو ملک کا داخلی مسئلہ قرار دیا جاسکتا۔ اس لیے ان کے ہتھیاروں کا رخ امریکہ کی طرف مڑ گیا اور پلک جھپکتے ہی وہ ”فریڈم فائز“ سے ”دہشت گرد“ کے روپ میں آگئے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب افغانستان میں روئی استعمار کے خلاف جنگ عروج پر تھی اور نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر سے مجاہدین اس میں شریک ہونے کیلئے دھڑکادھڑ آہے تھے۔ ہم بھی سیاں اور صاحفی مذاہ پران کی حقی الوضع سپورٹ کر رہے تھے۔ ایک موقع پر روزنامہ اوصاف اسلام آباد کے دفتر میں بایکس بازو کے دو داش و دوستوں کے ساتھ گپ پش میں اس بات پر بحث ہو گئی کہ پاکستان کے مولوی اور دنیا بھر سے جہاد کے نام پر آنے والے نوجوان کس کی جنگ لڑ رہے ہیں؟ ہمارے عزیز ترین ساتھی مولانا اللہ و سالیما قاسم شہید بھی میرے ساتھ شریک گفتگو تھے۔ ان داش و دوستوں کا کہنا تھا کہ مولوی صاحبان امریکہ کی جنگ لڑ رہے ہیں اور اس جنگ کا فائدہ امریکہ کو ہو گا۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ تھوڑا سا منتظر کر لیں، جنگ میں کامیابی کے بعد اس خطہ کیلئے امریکہ بہادر نے جو ایجاد تجویز کر رکھا ہے، اگر یہ مجاہدین اس ایجاد کے کسی خانے میں فٹ ہو گئے اور اس کو انہوں نے قبول کر لیا تو میں آپ کا موقف مان لوں گا کہ انہوں نے امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ لیکن اگر انہوں نے امریکی ایجاد کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف بھی صفائحہ ہو گئے تو آپ کو میری یہ بات تسلیم کرنا ہو گی کہ ان مجاہدوں نے امریکی امداد و حمایت سے فائدہ ضرور اٹھایا ہے لیکن امریکہ کی جنگ نہیں لڑی بلکہ اس جنگ میں ان کے اپنے اہداف ہیں جس کیلئے وہ میدان میں اترے ہیں۔

آج منظر بالکل واضح ہو گیا ہے۔ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ہم سے یہ غلطی

ہوئی کہ ہم نے روئی فوجوں کی واپسی کے بعد مجاہدین کو تھا چھوڑ دیا۔ لیکن میری گزارش ہے کہ یہ غلطی بھی جان بوجھ کر کی گئی اور کچھ عرصہ انتظار ہوتا رہا کہ کیا ان مجاہدین کو امریکہ کے ”یور لڈ آڈر“ کے کسی خانے میں ایڈ جسٹ کیا جا سکتا ہے؟ قارئین کے ذہن میں یہ بات یقیناً ہو گی کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی امریکہ بہادر کچھ عرصہ خاموش رہا ہے جس سے یہ تاثر بھی قائم ہوا کہ کہیں یہ بھی امریکہ کی کسی حکمت عملی کا حصہ تو نہیں؟ اس دوران کچھ کوششوں کو میں بھی جانتا ہوں جو افغانستان میں طالبان کی حکومت کو امریکہ کے علاقائی اور علمی ایجنسیز میں ایڈ جسٹ کرنے کیلئے کی گئیں۔ اور جب یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ یہ لوگ امریکی ایجنسیز کے قبول کرنے اور اس میں ایڈ جسٹ ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں تو انہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف عالمی جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ اور آج اس جنگ کا دائرہ افغانستان، عراق اور شام کے علاوہ افریقہ کے ممالک تک وسیع کرنے کے باوجود ان ”دہشت گروں“ کا داماغ ”درست“ نہیں کیا جا سکا۔ اور وہ بدستور اپنے ہی ایجنسیز پر ڈالے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی سرگرمیوں کا دائرہ ننگ تر کرتے چلے جانے کی پالیسی بذریح آگے بڑھائی جا رہی ہے۔

ہمارے نزدیک افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد اسے مستحکم ہونے کیلئے کچھ وقت درکار تھا اور عالم اسلام کی دینی قوتوں کی مختلف شعبوں میں مسلسل اور بھرپور مد اور حمایت کی ضرورت تھی، جس منطقی تقاضہ تھا کہ اس دوران کوئی اور حمازنہ کھولا جائے اور تمام تر توجہات یہیں کیمپ کو مضبوط اور مستحکم کرنے پر مرکوز کر دی جائیں۔ ہم نے دھیے لبھ میں یہ بات کرتے اور لکھتے بھی رہے مگر نعروں اور ترانوں کی گونج میں دھیے لبھ کی ایسی باتیں کون سنتا ہے۔ چنانچہ بہت سے دوسرے محاذ کھلنے میں جلد بازی سے کام لیا گیا اور یہیں کیمپ بھی ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ مگر اب ”اے کاش ہم ایسا نہ کرتے“ کا ورد کرنے کے سواہم اور کیا کر سکتے ہیں؟

بہر حال مولانا فضل الرحمن خلیل کو عالمی دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کرنے پر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں امریکہ کی نظر میں وہ بدل گئے ہوں گے مگر ہمیں تو وہ اسی جگہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں جہاں وہ روئی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان میں کھڑے تھے۔ اور ان کی پیش پر عالم اسلام اور امریکہ بہادر بھی کھڑا تھا۔ وہ تو وہیں کھڑے ہیں، یہ پیچھے والے خدا جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں؟

## آرمی پبلک اسکول پشاور کا سانحہ

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۲۰ دسمبر ۲۰۱۳ء

۱۶ دسمبر کے سانحہ پشاور نے پوری قوم کو بہا کر کھڑا دیا ہے اور پاکستان کی سیاسی و دینی جماعتیں اپنے تمام تر انتلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دہشت گردی بلکہ درندگی کے خلاف متحد ہو گئی ہیں۔ ملک کے اخبارات اور میڈیا کے بہت سے

مراکر نے اس دن سانحہ سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے اسباب و اثرات کے حوالے سے مضامین اور پروگراموں کا اہتمام کیا تھا، مگر پشاور کے اس المناک سانحہ نے قوم کے غم کو بہکارنے کی بجائے ایک اور قومی سانحہ کے صدمہ سے اسے دوچار کر دیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں اس دن پشاور جا رہا تھا، مغرب کے بعد گلبہار کالونی کے ایک ہال میں انجمان خدام القرآن خیر پختون خواہ کے زیر اہتمام ”سود، یہود اور مظلوم مسلمان“ کے موضوع پر منعقدہ سینیار میں شرکت کا ارادہ تھا۔ ظہر کے بعد پشاور روڈ راولپنڈی سے نیو خان کی ولگن پر سوار ہوا تو میرے ساتھ بیٹھے ایک محترم مسافرنے موبائل فون پر ملنے والی اس افسوس ناک خبر سے آگاہ کیا، دل رنج و غم کی گہرائیوں میں ارتاچلا گیا۔ پشاور پکنچے تک بہت سی تفصیلات مل پچی تھیں اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ پورا شہر صدمہ اور غم سے دوچار ہے اور کار و بار زندگی معلوظ ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے میزانوں سے رابطہ کیا تو وہ بھی مضطرب اور بے چین تھے مگر انہوں نے کہا کہ آپ پشاور ضرور آئیں، آگے کی صورت حال دیکھ لیں گے۔

ولگن موڑوے سے شہر میں داخل ہوئی تو آگے جانے کے راستے بند تھے۔ ڈایور نے اس کی خبر دیتے ہوئے تمام مسافروں کو رونگ روڈ کے پل سے آگے ایک پڑوں پہ پر اتار دیا۔ میرے میزان انجمان خدام القرآن کے سید کریمی جہزی ڈاکٹر محسن محبوب تھے، ان سے رابطہ مسلسل جاری تھا، وہ مجھے وصول کرنے کیلئے گاڑی لے کر نکل گر کوئی راستہ نہ ملا، پھر موڑ سائیکل لائے اور گلیوں اور چھوٹے راستوں میں سے گھومتے ہوئے گلبہار میں سینیار کی جگہ تک پہنچا دیا۔ سینیار کی صدارت تنظیمِ اسلامی پاکستان کے امیر حافظ عاکف سعید نے کی اور اس میں ڈاکٹر اسد زمان، ڈاکٹر محبوب محسن، اور دیگر حضرات کے علاوہ صدر اجلاس، اور رقم الحروف نے بھی خطاب کیا۔ پشاور کے سانحہ کا غم مغلبل میں شرکاء کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ اس درندگی کی مذمت کی گئی، شہداء کیلئے دعا کی گئی اور ان کے خاندانوں کے ساتھ ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے مکمل سالمیت کے تحفظ، امن و امان کی بجائی اور بحران کے خاتمه کیلئے دلی جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ دعا بھی کی گئی۔

اپنے مضمون کے حوالے سے یہ سینیار بہت اہم تھا اور اس کی کچھ تفصیلات سے قارئین کو آگاہ کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر معصوم بچوں کے مقدس خون نے قلم روک لیا ہے اور ان کے خاندانوں بالخصوص ماڈل کی آہ و بکا اور دردناک چینیں کسی بھی اور بات کی طرف سوچنے نہیں دے رہیں۔

اس دہشت گردی کیلئے درندگی سے بڑھ کر کوئی تعبیر ممکن ہو تو وہ بھی ایک مسلمان اور پاکستانی کے جذبات کے اٹھاڑ کیلئے کم ہے۔ جناب بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد یاد آتا ہے کہ ایک دور آئے گا جب لوگ بھیڑ بے بن جائیں گے، اور جو شخص بھیڑ بانٹنے سے گزیز کرے گا اسے دوسرے بھیڑ یہ کھا جائیں گے۔ یہ بات بھی بھیڑ بانٹنے ہی ہے کہ کوئی گروہ اپنی بات کہنے کیلئے یا کسی بھی حوالے سے اپنا غصہ نکالنے کیلئے تعلیمی اداروں میں گھس کر اس کے اساتذہ اور طلبہ کو گولیوں سے بھومن ڈالے۔

پاکستان میں اسلحہ برداری اور کلاشنکوف کے ذریعے مسائل کا حل نکالنے کی یہ افسوسناک مہم رفع صدی سے زیادہ عرصہ سے جاری ہے۔ کریپی میں لسانی بنیادوں پر، بلوچستان میں نسل و قومیت کے عنوان سے، ملک بھر کے مذہبی ماحول

میں سنی شیعہ کشکش کے نام پر، اور کے پی کے اور اس کے ملکہ علاقوں میں نفاذ شریعت کے نعرہ کے ساتھ آگ اور خون کا جو حکیل کھیلا جا رہا ہے اس کے عنوانات الگ الگ ہیں۔ مگر ایجمنڈ ایک ہے اور ”ماشیر ماںڈ“ بھی ایک ہی ہے جس کا مقصد پاکستان کو خوفشار اور بدآمنی سے دوچار کر کے خط میں اپنی موجودگی اور تسلط کا جواز باقی رکھنا ہے۔ مگر بدقتی سے اس سارے کام کیلئے ایندھن بیٹیں سے مہیا ہو رہا ہے۔ اور پاکستان کی سالمیت وحدت پر کی جانے والی اس خوفناک فائزگ میں کندھا ہمارا ہی استعمال ہو رہا ہے۔

قاریئن کو اگر یاد ہو تو ہم نے افغانستان سے روس کی واپسی کے بعد متعدد ذرائع سے یہ حق و پارکی تھی کہ جن ہزاروں نوجوانوں نے جہاد افغانستان میں شرکت کر کے جدید ترین السلاح کی ٹریننگ حاصل کر کی ہے ان مکے مستقبل کا ایجمنڈ انہیں اعتقاد میں لے کر قومی و دینی راہ نماوں کو طے کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر انہیں اپنا ایجمنڈ اخود طے کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس کے تلخ تناج سب کو بھگتنا پڑیں گے۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے سامنے اس وقت بھی تھا، اور ہم نے اپنے کالملوں کے ساتھ ساتھ بہت سے سر بر آور دینی و سیاسی راہ نماوں کو ذاتی ملاقاتوں میں بھی توجہ دلائی تھی۔ مگر غریب شخص کی کون ستتا ہے؟

آج ہم جس دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہیں، اس سے نکلنے کیلئے قومی سیاسی کا نفرنس کا انعقاد اور مشترکہ پالان طے کرنے کا فیصلہ خوش آئندہ ہے۔ اور بعد از خرابی بسیار ہونے کے باوجود امید کا پہلو اس میں بہر حال موجود ہے۔ اس لیے ہم شہداء کے خاندانوں کے رنج و غم بلکہ پوری قوم کے اس مشترکہ صدمہ میں برابر کے شریک ہیں۔ اور قومی کا نفرنس کے فیصلوں اور عزمِ اعمم میں ثابت پیش رفت کیلئے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملک و قوم کو اس خوفناک اور المناک بحران سے نجات دلائیں، آمین یارب العالمین۔

اس حوالے سے ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ میڈیا کے بعض اہل کاروں اور کچھ مسلکی طور پر متصب راہ نماوں نے اس سارے سلسلہ کا تعلق دیوبندیت کے ساتھ جوڑنے کیلئے مخصوص پلانگ کے ساتھ ہم شروع کر رکھی ہے اور اپنی تمام تربیت الٹنی، امن دوستی اور قربانیوں کے باوجود بعض دیوبندی داشن ور بھی دفاعی پوزیشن پر کھڑے دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہمارے خیال میں یہ بھی ہے کہ ہم نے چند سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں تمام دیوبندی جماعتوں، مرکزوں اور حلقوں کو مجتمع کر کے ایک متفقہ موقف طے کیا تھا، مگر اس کے بعد اسے داخلِ دفتر کر کے پھر سے اپنا الگ الگ راگ الپا شروع کر دیا تھا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موقف کی فائدوں کی گرد جماڑ کر اسے ایک بار پھر ہر سطح پر قوم کے سامنے لایا جائے اور واضح کیا جائے کہ ہم نے اپنا متفقہ موقف اتنے سال قبل واضح کر دیا تھا، اس میں کوئی ابهام نہیں ہے، اور ہم آج بھی قومی وحدت، ملکی سالمیت و خود مختاری، نفاذ شریعت اور دہشت گردی کے حوالے سے قوم کے ساتھ کھڑے ہیں۔ آخر ہمیں اس موقف کے اظہار میں حجاب کیوں محسوس ہو رہا ہے؟

## افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات

روزنامہ اسلام، لاپور---۱۶ جولائی ۲۰۱۵ء

افغان حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات کا ایک دور مری میں مکمل ہو گیا ہے اور مذاکرات کو جاری رکھنے کے اعلان کے ساتھ دونوں وفد اپنے طن واپس چلے گئے ہیں۔ حکومت پاکستان کا کردار اس میں واضح ہے کہ یہ مذاکرات مری میں ہوئے ہیں اور اس سے قبل پاکستان کی سیاسی و عسکری قیادت کے کابل کے ساتھ مسلسل روابط بھی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

ان مذاکرات کیلئے ایک عرصہ سے تگ و دو کی جاری ہی تھی اور امید و یہم کے کئی مرحلے درمیان میں آئے۔ مگر یہ دونوں فریقوں کو مذاکرات کی میز پر لانے کیلئے محنت والوں کی کامیابی ہے کہ افغان حکومت اور طالبان کے نمائندے میز پر آمنے سامنے بیٹھنے ہیں اور دوبارہ گفتگو کی بات طے کر کے رخصت ہو گئے ہیں۔ مذاکرات میں کون سے امور زیر بحث آئے اور کیا امور طے ہوئے؟ اس سے قطع نظر مل بیٹھنا اور آئندہ مل بیٹھنے کا وعدہ کرنا ہی بہت بڑی کامیابی ہے جس پر دنیا بھر کے امن پسند حلقوں میں اطمینان کا افہام کیا جا رہا ہے۔

اب سے کئی عشرے قبل جب افغانستان میں مذہبی اور سیکولر حلقوں کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا تھا اور افغان عوام کی دینی قیادت نے اسلامی اقدار و روایات اور افغان تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے عنوان سے سیکولر قوتوں کے خلاف صف آرائی کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت کاظہ ہری منظر صرف اتنا تھا کہ افغانستان کی حدود میں سیکولر عناصر نے اپنے انکار و نظریات کے فروغ اور مغربی تہذیب و ثقافت کی ترویج کیلئے دینی حلقوں کی قائدانہ پوزیشن کو چلتی گردی رہتا تھا۔ بقول اقبال

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج  
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

کے ایجادے پر عمل درآمد شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ملا لوگوں نے بھی افغانستان کے کوہ و دمن کے ساتھ اپنارشتہ باقی رکھنے کیلئے صب بندی کا پروگرام بنایا تھا اور دونوں فریق آمنے سامنے آگئے تھے۔ مگر جب سوویت یوینین نے افغانستان میں سیکولر حلقوں کو سپورٹ کرنے کی پالیسی اختیار کی تو یہ کشمکش بین الاقوامی رخ اختیار کرتی چلی گئی اور بہت سے مرحلے سے گزر کر افغانستان میں سوویت یوینین کی باقاعدہ فون کاشی تک جا پہنچی۔ سوویت یوینین افغانستان کو سلطی ایشیا کی ان مسلم ریاستوں کے دائرے میں لانا چاہتا تھا جو کمیونیٹ انتقام کے بعد اس کے زیر تسلط آگئی تھیں، یا افغانستان کو راستہ بنائے گواہ کے ذریعے گرم پانیوں تک پہنچنے کا ایجادہ رکھتا تھا، یا دونوں باتیں یک وقت ایک ایجادے کا حصہ تھیں۔ بہر صورت اس کی مزاحمت میں افغانستان کے دینی حلقوں کے ساتھ پاکستان کے دینی حلقوں بھی شامل ہو گئے اور جہاد افغانستان کے عنوان سے ایک انسی جنگ چھڑکئی جس میں سوویت یوینین کے خلاف عالمی مورچہ رکھنے والا امریکی بلاک بھی شریک ہو گیا اور فترتہ رفتہ یہ جنگ ایک طرح کی بین الاقوامی جنگ بننی چل گئی۔

حضرت مولانا مفتی محمود پاکستان کی قومی سیاست میں دینی حلقوں کی سب سے مؤثر اور توانا آواز تھے۔ انہوں نے

اعلان کیکہ روں افغانستان کے ذریعے بلچستان میں آنا چاہتا ہے اور گوادر تک رسائی حاصل کر کے گرم پانیوں تک پہنچنے کا ایجنسڈار کھتہ ہے اس لیے یہ صرف افغانستان کا نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ بھی ہے، اور اس کی مزاحمت میں ہم بھی افغان مجاہدین کے ساتھ ہیں۔ پھر نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے مختلف حصوں سے جہاد کے جذبہ سے سرشار نوجوانوں کی افغانستان میں آمد شروع ہوئی اور طویل جنگ کے بعد روںی افواح کو افغانستان سے واپس جانا پڑا۔

یہاں ضمناً ایک بات جملہ مفترضہ کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کی گردش کا ایک پہلویہ بھی ہے کہ روں کو گوادر تک پہنچنے سے روکنے کیلئے طویل جنگ لڑی گئی جبکہ چین کو گوادر تک رسائی دینے کیلئے ”اقتصادی راہداری“ ہم خود تعمیر کر رہے ہیں۔ شاید اسی کو قرآن کریم میں تلک الایام نداولہا بین الناس سے تعجب کیا گیا ہے۔

افغانستان سے روںی فوجوں کی واپسی کے موقع پر ”جنیوامعاہدہ“ کی صورت میں مغربی دنیا نے اپنے مقاصد تو حاصل کر لیے مگر افغان مجاہدین اور دنیا بھر سے آئے ہوئے مجاہدین کے میسیوں گروپوں کو کسی مشترکہ ایجنسڈار کے بغیر تباہ چھوڑ دیا گیا۔ جس کا تجھہ افغانستان میں خانہ جنگی کے ایک نئے دور اور دنیا بھر میں عسکریت کے فروغ کی صورت میں سامنے آیا۔ آج پوری دنیا اس کا خمیازہ بھگلت رہی ہے جس کا اعتراف سابق امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلینٹن خود ایک بیان میں کرچکی ہیں۔

”جنیوامعاہدہ“ کی کوکھ سے جنم لینے والی اس افراتفری کے دور میں افغانستان کی وحدت کو بچانے اور جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کو برورئے کار لانے کیلئے طالبان نمودار ہوئے اور اپنے اہداف کے حصوں میں وقت طور پر کامیاب بھی ہوئے۔ مگر افغانستان کی وحدت اور جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل جن طاقتوں کے مفاد میں نہیں تھی وہ طالبان حکومت کے خلاف سازشوں کا ایک نیا جاہ مبنی میں کامیاب ہو گئیں۔ اس کے تیجے میں افغانستان میں سابقہ صورتحال صرف اس فرق کے ساتھ واپس آگئی کہ اب وہاں روںی فوجوں کا نہیں بلکہ امریکی اتحاد کی فوجوں کا تسلط تھا۔ چنانچہ حریت پسند افغان عوام ایک بار پھر اپنے ملک کو غیر ملکی فوجوں کے تسلط سے نجات دلانے کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ امریکی اتحاد بھی اپنی افواح کو افغانستان سے واپس لے جانا چاہتا ہے مگر جانے سے قبل ایک اور ”جنیوامعاہدہ“ کا اہتمام کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا مقصد پہلے ”جنیوامعاہدہ“ کی طرح افغان مجاہدین کو ان کی طویل جدوجہد کے نظریاتی اہداف سے دور رکھنا ہے اور اس خطہ میں اپنے ایجنسڈے پر عمل دارم کو یقینی بنانا ہے۔

افغان طالبان نے میدان جنگ میں تو اپنا وجود بلکہ برتری منوالی ہے مگر اب مذاکرات کی میز پر وہ ایک نئے امتحان سے دوچار ہو گئے ہیں۔ ان کی فراست و بصیرت کو اپنی تاریخ کے سب سے زیادہ خطرناک چیخنگ کا سامنا ہے۔ ہماری دعائیں افغان طالبان کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں عسکری میدان کی طرح سیاست و تدبیر اور فراست و بصیرت کے مجاز پر بھی کامیابی سے نوازیں۔ اور جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کی تکمیل میں فیصلہ کن مدد سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

## ملا محمد عمر مجاہد

روزنامہ اسلام، لاپور۔ یکم اگست ۲۰۱۵ء

گذشتہ ماہ کے دوران افغان طالبان کی طرف سے اس خبر کی تصدیق کردی گئی کہ ان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد کا انتقال ہو گیا ہے، انا اللہ وانا الیه راجعون، اور طالبان شوریٰ نے ان کے نائب ملا اختر منصور کو ان کی جگہ نیا امیر چن لیا ہے۔ ملا محمد عمر روysi استعمار کے خلاف افغان جہاد میں شریک رہے ہیں، اس میں زخمی بھی ہوئے تھے اور ان کی ایک آنکھ متاثر ہو گئی تھی۔ لیکن وہ گمنامی کے اندر ہیروں میں اس وقت ایک پھندار ستارے کی مانند نمودار ہوئے جب سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان بین الاقوامی طاقتوں کی طے شدہ پالیسی کے مطابق ایک نئی اور وسیع ترخانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔ کابل پر قبضے کی بڑی جنگ کے ساتھ ساتھ افغان مجاہدین اور تحیل شدہ سابقہ سرکاری افغان فوج کے مختلف گروپ افغانستان کے بہت سے علاقوں میں باہم بر سر بیکار تھے۔ پورا افغانستان افرانزی کا شکار تھا، سرداروں کی اس جنگ (لارڈز وار) نے افغانستان کے مستقبل پر سوالیہ شان لگادی تھا اور شاید بہت سی بڑی طاقتیں بھی بھی چاہتی تھیں۔ مگر قندھار کے ایک گمنام طالب علم نے اپنے طالب علم ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور افغان عوام کو لارڈز وار کی محنت سے نجات دلانے اور جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کی تکمیل یعنی نفاذ شریعت کو اپنا مقصد قرار دے کر یہ سرو سامان طلبہ میدان میں نکل آئے۔

طالبان کا ابتدائی ہدف یہ تھا کہ کوئی سے قندھار اور پھر مزار شریف تک کے تجارتی راستے پر علاقائی سرداروں نے جگہ جگہ ناکے لکا کر جبڑی بیکس و صول کرنے کا جو سلسلہ شروع کر کھاتھا اسے ختم کر کے تجارتی گزرگاہ کو محفوظ بنایا جائے۔ چونکہ ابتدائی لشکر کے زیادہ تر ترکارہ دینی مدارس کے طلبہ تھے جو جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف جہادی گروپوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے یہ لشکر طالبان کے نام سے معروف ہوا۔ اور پھر چند سو فراد سے شروع ہونے والا یہ لشکر رفتہ رفتہ ایک منظم فوج کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ انہوں نے نہ صرف تجارتی راستے صاف کیا بلکہ جو علاقے ان کے کثروں میں آتے گئے وہاں شریعت اسلامیہ کے مطابق امارتی نظام قائم کر کے افغان عوام کو اسلامی قویں کی برکات سے فیض یاب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جس کا مشاہدہ و اعتراف ملا محمد عمر کے پانچ سالہ دور حکومت میں عامی سطح پر بھی کیا جاتا رہا۔ انہوں نے اپنی حکومت کو ”امارتِ اسلامی افغانستان“ کا نام دیا اور دھیرے دھیرے کابل سمیت بیشتر افغانستان پر کثروں حاصل کر لیا۔

ملا محمد عمر گی حکومت کے تین کارناموں کا آج بھی بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے:

- لارڈز وار کا خاتمه یعنی سرداروں کی ان علاقائی حکومتوں اور باہمی جنگوں کا خاتمه جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

- انہوں نے اپنے زیر کثروں علاقوں میں عام افغان آبادی کو غیر مسلک کر دیا، یعنی ہر شخص سے اسلحہ واپس لے کر

افغانستان جیسے ملک میں ”وپن لیس سوسائٹی“ کا عملی نمونہ پیش کیا۔  
 ہیر وئن بنانے والے پوست کی کاشت جو طالبان کے دورے پہلے کبھی کنٹرول ہوئی اور نہ ہی ان کی حکومت  
 کے خاتمہ کے بعد سے اب تک ممکن ہو سکی ہے، میں الاقوامی روپرٹوں کے مطابق ملا محمد عمر کے ایک حکم سے  
 ایسے ختم ہوئی کہ ان کے حکومتی دائرہ میں شامل علاقوں میں ایک پودا بھی کاشت نہ ہونے کا محاورہ بولا جانے  
 لگا۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو میں الاقوامی اداروں کی روپرٹوں کا حصہ ہیں اور ان کا عملی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے، جبکہ ہمارے  
 تذکرے ان کے ساتھ ان امور کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔

- شرعی احکام و قوانین کا عملی نفاذ اور عوام کو شریعت اسلامیہ کے مطابق انصاف کی فراہمی۔
- گذگور ننس اور سادہ و فطری انداز حکمرانی کا ایسا نمونہ کہ بلاشبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز گی یاد تازہ ہو گئی۔
- امن عامہ اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو کا اس درجہ میں تحفظ کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے کابل کے  
 بازاروں میں دکانداروں کو دکانیں کھلی چوڑ کر نماز کیلئے مسجد میں جاتے دیکھا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک  
 ذاتی واقعہ بھی نہ بھولے گا کہ ایک بار میں چند روز کیلئے کابل گیا ہوا تھا۔ پل خشتی کی جامع مسجد میں نماز ادا  
 کرنے کے بعد بازار کی طرف نکلا تو چند سکھوں کی دکانیں دکھائی دیں۔ میں ایک دکان میں بلا کف گھس گیا اور  
 ٹھیک بخوبی زبان میں جب دکاندار کا حال احوال دریافت کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان  
 گفتگو ہی، میں نے اس سے پوچھا کہ سردار جی! یہ مولوی جب سے آئے ہیں آپ کیا تبدیلی و دیکھ رہے ہیں؟  
 اس نے بے تکلفی سے کہا کہ جب سے یہ مولوی آئے ہیں، ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو  
 اس نے بتایا کہ پہلے ہر وقت خوف و هراس کی کیفیت رہتی تھی، میرے دو بیٹے جو ان ہیں، ہم تینوں باری باری  
 آٹھ آٹھ گھنٹے پھرہ دیتے تھے، اور باقی گھروالے سوتے تھے۔ جب سے ان مولویوں کی حکومت آئی ہے  
 ”ایہہ مولبی پھرہ دیندے آتے اسی سکھ دی نیند سوندے ہاں“ یہ مولوی پھرہ دیتے ہیں اور ہم آرام کی نیند  
 سوتے ہیں۔

مجھے کابل اور قندھار دونوں گلہ ملا محمد عمر سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا ہے اور طالبان حکومت کے متعدد راہنماؤں  
 سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئی ہیں جن کے کچھ تاثرات اپنے بیسیوں کالموں میں وقتانہ قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا  
 ہوں، جبکہ اکثر حصہ بھی ”دریطن شاعر“ کی کیفیت میں ہے۔

الشیعہ اکادمی گوجرانوالہ نے اس سال پندرہ روزہ فلکی نشستوں میں میری گفتگو کا عنوان ”میری یادداشتن“ طے  
 کیا ہے جس کے تحت سال کے دوران ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ مجالس میں اپنی جماعتی، ملکی اور تحریکی سرگرمیوں کی  
 یادداشتنیں بشرط صحت و توفیق بیان کروں گا، اور انہیں ریکارڈ کرنے کے بعد قلمبند کرنے کا بھی پروگرام ہے، ان شاء اللہ

تعالیٰ۔ میں نے اس میں جہادِ افغانستان سے متعلقہ یادداشتوں کو ترجیح آپھلے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس لیے کہ روس کے خلاف جہادِ افغانستان کے آغاز سے طالبان حکومت کے خاتمہ تک جماعت الدین تعالیٰ کم و بیش ہر مرحلہ میں شریک رہا ہوں، جس کے مشاہدات و تاثرات بلاشبہ قوم اور تاریخِ جنگ کی امانت ہیں۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ رب العزت مجھے یہ امانت پوری دیانت اور شرح صدر کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

ان گزارشات کے بعد امیر المومنین حضرت ملا محمد عمر مجاهدگی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے رفقاء اور اہل خانہ کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان کے رفقاء و متولیین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

## جزلِ حمید گل مرحوم

روزنامہ اسلام، لاہور ۲۲ اگست ۲۰۱۵ء

جزلِ حمید گل مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی تاریخی جدوجہد اور تنگ و دو کے اثرات ایک عرصہ تک تاریخ کے صفحات پر جگل کتے رہیں گے۔ ان کا تعلق پاک فوج سے تھا اور ان کا نام جزلِ محمد ضیاء الحق مرحوم اور جزلِ اختر عبدالرحمن مرحوم کے ساتھ جہادِ افغانستان کے منسوبہ سازوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ جہادِ افغانستان جس نے تاریخِ کارخ مورڈیا اور جس کے ثبت و مفتی دونوں قسم کے اثرات سے پوری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے یا انہیں بھگت رہی ہے۔ جزلِ حمید گل مرحوم کا اس جنگ میں کیا کردار تھا؟ اس کے اظہار کا ایک پہلو یہ ہے کہ جہادِ افغانستان کے شیعہ میں سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی جس کی وجہ سے جرمنی متحد ہوا اور برلن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی دیوار توڑ دی گئی، تو زندہ دل جرمنوں نے اس کا ایک چھوٹا سا پھر جزلِ حمید گل مرحوم کو بھی اس نوٹ کے ساتھ بھجوایا کہ یہ دیوار چونکہ آپ کی کوششوں سے ٹوٹی ہے اس لیے یادگار اور اعتراض کے طور پر اس ٹوٹی ہوئی دیوار کا ایک پھر آپ کو بھجوایا جا رہا ہے۔

جہادِ افغانستان کی برکت سے نہ صرف جرمنی متحد ہوا بلکہ مشرقی یورپ کو کیونزم کے تسلط سے نجات ملی، وسطی ایشیا کی ریاستیں آزاد ہوئیں اور بالائیک ریاستوں نے بھی آزادی کا ماحول پایا۔ مگر اسے تاریخی ستم طریقی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جہادِ افغانستان میں فیصلہ کرن کردار ادا کرنے والے افغان مجاذبین اپنے ہی ملک میں ایک بار پھر غیر ملکی جاریت سے نبرد آزمائیں اور ان کی مدد کیلئے دنیا بھر سے آئے ہوئے مجاذبین اپنے اپنے ملکوں میں دہشت گرد کا خطاب پا کر خود اپنی حکومتوں کے ہجر کا انشانہ بنئے ہوئے ہیں۔

جزلِ حمید گل مرحوم کو جہادِ افغانستان کے ہیروز میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اگر صرف اسی اعزاز کو سینے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو جاتے تو تاریخ میں ان کا نام زندہ رہنے کیلئے یہ بات کافی تھی۔ مگر ان کا ہدف صرف تاریخ میں اپنے نام کو

محفوظ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ خود کو اللہ کا سپاہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جان شار، اسلام کا خدمت گزار، ملتِ اسلامیہ کا غم خوار اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی کارکن سمجھتے تھے۔ اس لیے زندہ دل جرمنوں سے ”خراب کا پتھر“ وصول کرنے کے بعد ان کے قدم رکے نہیں بلکہ وہ اگے بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کے حصول، پاکستان کو ایک صحیح اسلامی ریاست کی شکل دینے اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کے دفاع اور انہیں سپورٹ کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا اور اسی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنے اللہ کے حضور جا پہنچ، ائمہ و ائمہ راجعون۔

انہیں جہاد افغانستان کا منصوبہ ساز کہا جاتا ہے اور اس کے بعد انہیں پاکستان میں اسلامی جمہوری اتحاد (IA) کا خالق بھی بتایا جاتا ہے جبکہ افغانستان و پاکستان کے حوالے سے بہت سی تحریکات کے راہ نماوں میں وہ صفت اول میں دیکھتے جاتے رہے ہیں۔ ان کے طریق کار، سوچ اور اقدامات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر یہ بات تک و شبہ سے بالاتر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اسلام کی خاطر کیا، ملتِ اسلامیہ کا مفاد سمجھ کر کیا اور اسلامی جمہوری پاکستان کی خدمت کے جذبہ کے ساتھ کیا۔

میں بھی چونکہ اسی راہ کا مسافر ہوں اور اس سفر میں صحر انور دی کرتے ہوئے مجھے نصف صدی کا عرصہ بیت چکا ہے اس لیے جزل حمید گل مرحوم کے ساتھ رفاقت، ہم آنگی اور یا گفت فطری بات ہے اور یہ مختلف دائروں میں مسلسل رہی ہے۔ ملاقاتیں بھی رہی ہیں، مشاورت کا سلسہ بھی وقفہ و قسم سے موجود رہا ہے، متعدد تحریکات میں شرکت بھی رہی ہے، اور اہم قوی و دینی مسائل پر مشترکہ موقف کے اظہار کیلئے باہمی تبادلہ خیالات کے موقع بھی میسر رہے ہیں۔ جب اکوڑہ خیال میں افغانستان اور پاکستان کے دفاع کیلئے قومی سطح پر دینی و سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا کونشن حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی صدارت میں ہوا تھا اور دفاع پاکستان و افغانستان کو نسل کی تنشیل عمل میں لائی گئی تھی تو کونشن کا موقف تحریر کرنے کی ذمہ داری جزل حمید گل مرحوم اور رام الحروف کو سونپی گئی تھی۔ ہم دونوں جب اس مقصد کیلئے تھا ہوئے تو جزل صاحب نے کہا کہ مولانا! آپ ہی لکھیں، میں اس پر نظر ثانی کروں گا۔ چنانچہ ہم دونوں نے اس طرح اس کونشن کا اعلامیہ مرتب کیا اور اس کی میاد پر ایک نئی قومی کونسل وجود میں آئی۔

جزل صاحب آئی ایس آئی کے سر برہ تھے، انہیں اس منصب سے تبدیل کر کے جب ایک ٹینکنیکل قسم کا منصب دیا گیا تو وہ مستغفی ہو گئے۔ مجھے ان کے اس فصل سے اتفاق نہیں تھا اس لیے کہ سنیارٹی کی فہرست میں ایک دوڑم کے بعد ان کے چیف آف آرمی اسٹاف بننے کا چانس دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ مستغفی دے چکے تھے اس لیے اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ تحریک انصاف ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ایم کیو ایم کے ساتھ ان کا کوئی ثابت تعلق نہیں تھا، جبکہ ان کے مستغفی پر سیاست کی اک اس بیبل کا سایہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مستغفی ہوئے تو ہو ہی گئے البتہ بعد میں جب ہمارے خیال کے مطابق اس چانس کا مرحلہ گز گیا تو میں نے ایک ملاقات میں ان سے کہا کہ

”جزل صاحب! اب آپ کو اپنے غصے پر غصہ تو آرہا ہو گا۔“

جزل صاحب نے بلکہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کارخ کسی اور طرف موڑ دیا۔ جزل صاحب نظریاتی اور فکری

دنیا کے بھی جزل تھے۔ عالمی تاریخ اور بین الاقوامی معاملات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتے تھے، بروقت بات کہنے کا ذوق رکھتے تھے اور لگی پیٹی رکھے بغیر منہ پربات کرنے کا حوصلہ بھی ان میں موجود تھا۔ لاہور کے فلیٹی ہوٹل میں ایک سینما رخا جس میں جسٹس سید نیسم حسن شاہ مرحوم نے قرآن و سنت کی بالادستی پر بڑی اچھی گفتگو کی۔ راقم الحروف بھی اس میں شریک تھا۔ جسٹس صاحب مرحوم کے بعد جزل حمید گل مرحوم نے گفتگو کی تو جسٹس مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ جناب والا! جب آپ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر ”قرارداد مقاصد“ کو دستور کی بالادست دفعہ تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ تحریر فرمائے تھے تو قرآن و سنت کی بالادستی پر آپ کا یہ عقیدہ کونسے فریور میں محدث پڑا تھا جس کا آپ نے آج کے خطاب میں اظہار کیا ہے؟ جزل حمید گل مرحوم کے اس استفسار پر جسٹس صاحب مرحوم نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اور میرے دل نے بے ساختہ دعائیں دینا شروع کر دیں۔

جزل حمید گل مرحوم کی جدائی سے ہم اسلامی جمہوریہ یا پاکستان کی نظریاتی شناخت کے تحفظ اور ”اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام“ کی جدوجہد کے ایک عظیم جریل سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت الغردوس میں انہیں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسمند گان کو صبر و حوصلہ کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

## توبہ، اصلاح، تلافی

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ نومبر ۲۰۱۵ء

سابق برطانوی وزیر اعظم ٹوئنی بلیئر نے گذشتہ دنوں ایک ٹوئی چینی سے گفتگو کرتے ہوئے کہ عراق پر حملہ کے موقع پر وہاں ناجائز کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کی روپرٹ غلط تھی اور انہیں عراق پر حملہ کے تیجے میں داعش کے منظم ہو جانے کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس پر مذعرت خواہ ہیں۔ ٹوئنی بلیئر عراق پر امریکی اتحاد کے حملہ کے قائدین میں سے تھے اور انہوں نے سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بوش اور نائب صدر ڈیک چینی کا ساتھ دے کر نہ صرف اس حملہ میں برطانوی فوجوں کو شریک کیا تھا بلکہ وہ اس کا جواز پیش کرنے اور اس کو ضروری قرار دینے کی عالمی سطح پر وکالت بھی کر رہے تھے۔ عراق پر ناجائز کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری اور ان کا ذخیرہ کرنے کا لازام تھا جس کی عراق کے صدر صدام حسین بار بار تردید کر رہے تھے۔ بلکہ عراق کی حدود میں ایسے ہتھیاروں کی موجودگی کا سراغ لگانے والے بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تھے مگر باش، ڈیک چینی اور ٹوئنی بلیئر نے پوری دنیا میں آسمان سر پر اٹھا کر تھا۔ اور جب عراق کی ایٹھ سے اینٹ بجانے، دس لاکھ سے زیادہ انسانوں کے قتل عام، اور وہاں اپنی مرضی کی حکومت مسلط کر کے مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد بھی کچھ نہیں ملا تو اب اسے روپرٹ کی غلطی قرار دے کر اور ”سوری“ کہہ کر معاملہ کو فتح دفع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ٹوئنی بلیئر کی اس معافی پر مجھے دو تین اور معافیاں یاد آ رہی ہیں۔ معروف سائنس دان گلیبوی کے ساتھ چرچ نے جو سلوک کیا تھا اس پر صدیوں کے بعد سابق پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ نے کچھ عرصہ قبل کہا تھا کہ ہمیں اس غلطی کا اعتراف

ہے۔ جبکہ گذشتہ صدی کے دوران لیلیا پرائلی کے استعماری قبضہ کے دوران وہاں کے عوام پر کیے جانے والے مظالم پر اٹلی کے وزیر عظم نے چند سال قبل لیلیا کے دورہ کے موقع پر اسی طرح کا سوری کہا تھا۔ اور سابق امرکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے اگرچہ سوری کا لفظ کہنے کی رحمت نہیں فرمائی مگر یہ اعتراف کیا تھا کہ افغان جہاد کے بعد رو سی فوجوں کے واپس چلے جانے پر افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کو کوئی باہمی نظم طے کرائے بغیر اسی طرح کھلا چھوڑ دینا ہماری غلطی تھی۔

ٹونی بلیزیر کا ہمنا ہے کہ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ عراق پر حملے کے نتیجے میں ”داعش“ جیسی شدت پسند قوت ابھر آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر داعش منظم نہ ہوتی اور پورے مشرق و سطی میں سب بالادست قتوں کیلئے چینچ نہ بن جاتی تو عراق پر حملہ درست تھا اور منومنہ ہتھیاروں کی موجودگی یا غیر موجودگی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن چونکہ نتاں توقع کے خلاف سامنے آئے ہیں اس لیے عراق پر حملہ کو غلطی کہنا اب مجبوری بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں ہیلری کلنٹن کے اعتراف کا پس منظر بھی اسی طرح کا ہے کہ افغانستان سے روئی افوان کی وابسی کے بعد افغان مجاہدین کے گروپوں کو آزاد چھوڑ دیا اور ان کے مستقبل کا کوئی نظم اور ایجاداٹے کیے بغیر ان سے لاتعلق ہو جانا اصلًا تو اس لیے تھا کہ یہ آپس میں لڑتے رہیں اور خطے میں ہماری چودھراہٹ اور بالادستی قائم رہے۔ مگر اس بات کی توقع نہیں کی جا رہی تھی کہ درمیان میں طالبان اٹھ کھڑے ہوں گے جو سارا مزہ کر کر اکار دیں گے اور بجائے لینے کے دینے پر جائیں گے۔ اس لیے اب یہ احساس ابھر رہا ہے کہ انہیں اس طرح کھلا چھوڑ دینا غلطی تھی۔ ہیلری کلنٹن کے اعتراف اور ٹونی بلیزیر کی سوری دونوں کے پیچھے بھی نفیات کا فرمایہ ہے کہ چونکہ نتاں توقع کے خلاف سامنے آئے ہیں اس لیے اپنے اقدامات کو غلطی تسلیم کر لینے میں کوئی حرخ نہیں ہے۔

مگر کیا صرف غلطی کا اعتراف یا سوری کہہ دینا کافی ہے، اور کیا ایسا کرنے والوں پر اپنی غلطیوں کے نقصانات کی تلاشی کے حوالے سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ مغربی معاشرہ میں ”ھینکس“ اور ”سوری“ کی روایت ایک اچھی بات سمجھی جاتی ہے مگر اس حوالے سے دو باتیں میرے ذہن میں اکثر گھومتی رہتی ہیں جن کا ساواقت اظہار بھی کرتا ہوں:

1. ایک یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کو ھینکس بھی کہا جاتا ہے اور سوری بھی کہا جاتا ہے اور اسے تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے، مگر اپنے مالک و خالق رب العالمین کو ھینکس اور سوری کہنے کا تصور ہی مغربی معاشرہ میں ناپید ہو گیا ہے جو اس سوسائٹی کا اصل المیہ ہے۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ کسی کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے کے بعد بھی محض سوری کہہ کر معاملہ نمائادیا جاتا ہے جس کے نقصان کا سارا بوجھ اسی غریب کے کھاتے میں پڑ جاتا ہے۔

جبکہ آسانی تعلیمات اس سے مختلف بات کرتی ہیں۔ بائبل میں توبہ اور معافی کو ”لوٹ آنے“ اور ”رجوع کرنے“ کے مفہوم میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی بھی اس کا حصہ ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے اسے زیادہ وسیع انداز میں بیان کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے اس رویے کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ تورات کے بہت سے احکام کو چھپا لیتے ہیں اور بیان نہیں کرتے، قرآن کریم نے کہا ہے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کے مستحق ہیں مگر جو لوگ توبہ کر لیں وہ اس سے مُتنشق ہیں۔ جبکہ توبہ کیلئے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۰ میں تین لفظ استعمال کیے

گئے ہیں تابوا و اصلاحوا و بینوا

1. اپنے طرز عمل سے توہہ کر لیں،
  2. اپنے رویے کی اصلاح کر لیں،
  3. گذشتہ غلطی کی تلافی کرتے ہوئے چھپائے ہوئے احکام کو بیان کرنا شروع کر دیں۔
- اس لیے جب تک ٹوپی بلیز اور ہیلری کلینٹن غلطی کے اعتراف کے بعد اس غلطی کے نقصانات کی تلافی اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کا راستہ نہیں کرتے ان کے ایسے بیانات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

## مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۳ نومبر ۱۹۷۵ء

جامعہ حمادیہ کراچی کے حضرت مولانا عبد الواحدی جدائی گامغ ابھی تازہ تھا کہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ منتک کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ بھی داغ مفارقت دے گئے، اناث اللہ و انا الیہ راجعون۔ حضرت شاہ صاحب ملک کے ان بزرگ اور مجدد علماء کرام میں سے تھے جنہوں نے نہ صرف تعلیم و تدریس کی مندرجہ آباد کیا بلکہ زندگی بھر فنا فاذ شریعت کی جدو جہد اور اسلامی اقدار و روایات کے تحظی کی محنت میں مصروف رہے۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحمیڈ کے نامور تلامذہ میں سے تھے اور انہی کی مندرجہ بیان کردہ حدیث شریف کا درس دیتے رہے جس سے پاکستان، افغانستان اور اردو گرد کے دیگر ممالک کے ہزاروں علماء کرام نے فیض حاصل کیا۔ وہ حدیث میں اپنے شیخ حضرت مولانا عبد الحمیڈ کے علوم کے وارث و ترجمان، جبکہ تفسیر قرآن میں ایک اور عظیم المرتبہ شیخ حضرت مولانا احمد علی لاہوری اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی کے فیوض کے امین تھے۔ اس لیے بخاری شریف کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کے دورہ کی روایت بھی انہوں نے ہمیشہ قائم رکھی۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں متاز عرب اساتذہ سے استفادہ کیا اور امام التابعین حضرت حسن بصری کے تفسیری فیوضات پر گراں قدر مقالہ لکھ کر مدینہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سن حاصل کی۔ وہ بیک وقت اکوڑہ منتک، شیر انوالہ لاہور، اور مدینہ یونیورسٹی کی متنوع علمی روایات کے جامع تھے اور دینی صلابت کے ساتھ ساتھ توسع اور علمی رواداری کا عملی نمونہ بھی تھے۔

ایک بات میں جہلے بھی کئی بار لکھ چکا ہوں کہ رومنی استعمار کے خلاف افغان جہاد کو علمی و فکری آب یاری کا ماحول اکوڑہ منتک کی برکت سے میسر آیا اور وہی افغان مجاهدین اور ان کے بعد افغان طالبان کی جدو جہد میں پختگی اور سنجیدگی کا باعث بنا۔ اس سنجیدگی اور پختگی فکری کی قدر و قیمت عالم اسلام کے مختلف حصوں میں فنا فاذ شریعت کی متعدد تحریکات میں افراد و تفريطی کا مشاہدہ کرتے ہوئے صحیح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اور اس پر حضرت مولانا عبد الحمیڈ کی علمی عظمت، دینی حیثیت اور فکری صلابت کے آگے سرنیاز بے ساختہ خم ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کے اس علمی و روش کو سینے کے ساتھ لگانے والے چند گنے پچے افراد میں حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ نمایں مقام رکھتے ہیں، جبکہ مولانا تحقیق الحجت اور مولانا انوار

الحق کے ساتھ ان کی زندگی بھر کی رفاقت اپنے شیخ کے خاندان کے ساتھ ان کی بے لوث و فاداری کی علامت ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ مستقبل کا کوئی بھی غیر جانبدار مؤمن خوب جب گذشتہ صدی کے دوران جہاد کے احیاء، خاص طور پر جہاد افغانستان کے پس منظوظ نتائج اور دنیا بھر میں اس کے ثابت اور منقی اثرات کا تجزیہ کرے گا تو وہ اس کے علمی و فکری مجاز پر حضرت مولانا عبد الحق، حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی، اور حضرت مولانا مفتی محمود کی خدمات اور کردار کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ مولانا ڈاکٹر شیری علی شاہ اسی صفت بندی کی سینیڈ لائن کے بزرگ تھے اور ان کی ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

وہ علماء اور مجاہدین کے صرف استاذ نہیں تھے بلکہ مرتبی اور پاشت پناہ بھی تھے اور صحیح کاموں پر حوصلہ افزائی کے ساتھ غلط کاموں پر ٹوکنے کا ذوق اور معمول بھی رکھتے تھے۔ راقم الحروف کو ان سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا ہے۔ جامعہ نصرۃ العلوم میں متعدد بار تشریف لائے، حضرات شیخین کے ساتھ گھری عقیدت و محبت رکھتے تھے جس کی برکات سے ہم بھی مستفید ہوتے رہے۔ مختلف تحریکات اور اجلاسوں میں ان کے ساتھ رفاقت رہی اور بہت سے معاملات میں مشاورت کا تعلق بھی رہا۔ اب وہ نہیں ہیں تو انکھوں کے سامنے خلا خالا سامحوں ہو رہا ہے۔ اس غم میں ان کے خاندان کے علاوہ مولانا سمیع الحق دارالعلوم حقانی کے اسائد و طلبہ اور حضرت مرحوم کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مستفیدین کے ساتھ شریک ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند ترقی مائیں، آمین یا رب العالمین۔

## تین معاصر بزرگوں کے تصنیفی کارنامے

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۲ نومبر ۱۵۰۴ء

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیری علی شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے جنازے پر حاضری نہیں ہو سکی تھی اس لیے ۱۳ نومبر کو مرکز حافظ الحدیث درخواستی، حسن ابdal میں پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس اور سیرت کانفرنس کے بعد میں مولانا عبد القیوم حقانی کے ساتھ اکوڑہ منتک چلا گیا۔ حضرت مولانا ڈاکٹر شیری علی شاہ کے گھر کے ساتھ ان کی تعمیر کردہ مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد ان کے فرزندان، دیگر اہل خاندان اور مسجد کے نمازوں سے تعزیت کی۔ حضرت مرحوم کی قبر پر حاضری اور دعائے مغفرت کی سعادت حاصل کی اور اس کے بعد دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوا۔ حضرت مرحوم کا اصل خاندان تو دارالعلوم حقانیہ ہی ہے اور تعزیت کا سب سے زیادہ مسٹحق بھی وہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مادر علی ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی بھر ان کی تدریسی و تحریکی سرگرمیوں کی جوانانگاہ رہا ہے۔ حضرت مولانا سمیع الحق سے ملاقات بلکہ طویل نشدت ہوئی، حضرت ڈاکٹر صاحب گی وفات پر تعزیت اور دعائے مغفرت کے علاوہ متعدد ملکی و قومی مسائل پر تبادلہ خیالات ہوا اور مولانا سمیع الحق کی تصنیفی سرگرمیوں اور مسائی سے آگاہی حاصل کی۔ میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ اپنے تین معاصر بزرگوں کی محنت دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے بلکہ رشک ہوتا ہے کہ وہ تحریری مجاز پر مستند معلومات اور تاریخیں کا ایک بڑا ذخیرہ مرتب کر کے نئی نسل کے حوالے کر رہے ہیں جو بلاشبہ

ملک و ملت پر احسان کی حیثیت رکھتا ہے۔  
مولانا سمیع الحق

مولانا سمیع الحق نے جہاد افغانستان اور پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کے حوالے سے دستاویزات، خطوط اور خطبات کا خاصاً بڑا خیر محفوظ کر کھا ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ضمیم کتابوں کی صورت میں سامنے آیا ہے اور حال ہی میں مشاہیر کے خطوط و کتبات کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا نے بتایا کہ وہ ان دونوں دو موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے شیر اوالہ لاہور میں دورہ تفسیر پڑھا تھا، وہ اور مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ اکٹھے تھے، دونوں نے حضرت لاہوری کے تفسیری افادات قلمبند کیے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دیگر تلامذہ کی تحریری کا بیان بھی انہوں نے حاصل کی ہیں جنہیں سامنے رکھ کر وہ حضرت لاہوری کے تفسیری افادات قلمبند کر رہے ہیں اور تقریباً دس پاروں پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ دوسرا یہ کہ جزل محمد ضیاء الحق شہید کے دور میں ان کی قائم کردہ وفاقی مجلس شوریٰ نے نفاذ اسلام کے سلسلہ میں جو اقدامات کیے تھے اور انہیں بعد میں منتخب پارلیمنٹ نے اپنی توثیق کے ساتھ ملک کے دستور و قانون کا حصہ بنادیا تھا، مولانا موصوف اس کی تفصیلات اور متعلقہ دستاویزات و مباحثت جمع کر رہے ہیں اور انہیں مرتب کتابی شکل دے رہے ہیں۔ جو کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کا علمی و تاریخی ریکارڈ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی بھی مسلمان ملک میں نفاذ اسلام کی علمی و فکری بنیاد بن سکتا ہے۔ میں نے مولانا سمیع الحق سے عرض کیا کہ یہ آپ کی ہمت ہے کہ بڑھائیے اور عالالت کی اس کیفیت میں بھی اتنا قوی کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزم و ہمت میں اضافہ فرمائیں اور امت کو ان کے وجود و مساعی سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب کریں، آمین یا رب العالمین۔

مولانا اللہ وسايا

اس حوالے سے دوسری قابل رشک شخصیت علمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی رہنماء مولانا اللہ وسايا کی ہے جنہوں نے اپنی دیگر علمی و تحقیقی خدمات کے ساتھ ساتھ گذشتہ ڈیڑھ سو رس کے دوران قادیانیوں کے بارے میں مختلف مکاتب فلک کے تین سو سے زائد اصحاب قلم کی لکار شاہ کو ”اعتراض قادیانیت“ کے نام سے ساتھ جلدوں میں مرتب کر کے اتنے بڑے علمی و تحقیقی ذخیرہ تک علماء و طبلہ کو رسائی دینے کے علاوہ اسے تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازیں اور صحت و سلامتی کے ساتھ بھی زندگی عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

مولانا عبد القیوم حقانی

اس سلسلہ کے تیرے بزرگ مولانا عبد القیوم حقانی ہیں جن کی محنت کا دائرہ اکابر اور بزرگ شخصیات ہیں۔ وہ ان کی سوانح اور افادات کو مختلف حوالوں سے جمع کرتے ہیں اور ماہنامہ القاسم کی خصوصی اشاعتیں اور مستقل کتابوں کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں۔ حال ہی میں حضرت مولانا قاضی عبدالکریم اف کلچی کی حیات و خدمات اور افادات پر مولانا حقانی کی تصنیف آئی ہے جو اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر شیر علی شاہ اپ کی کتاب کب آرہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس پر بہلا حق ماہنامہ الحق کا ہے اور اس کے ضمیم نمبر کی تیاری ہو رہی ہے۔

مجلس احرار کی طویل تاریخ کے بارے میں الحاج مرزا غلام بنی جامباز رحمہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ جلدیوں پر مشتمل ”کاروانِ احرار“ مرتب کر کے اس قافلہ حریت سے نئی نسل کور و شناس کرایا تھا۔ جبکہ ہمارے یہ تین بزرگ دوست مولانا سمیع الحق، مولانا اللہ و سیاہ، اور مولانا عبد القیوم حقانی بھی اسی نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اور ہمارے جیسے ناکارہ لوگوں کی دعاوں کا بڑا حصہ سمیٹ لیتے ہیں۔ حضرت مولانا سمیع الحق سے ملاقات کے بعد میں نے رات مولانا عبد القیوم حقانی کے مدرسہ جامعہ ابو ہریرہ میں گزاری، اساتذہ و طلبہ کی ایک نشست میں چند معمروضات پیش کیں، اور صحیح نماز فوج کے بعد اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گیا جہاں مجھے بھریہ ناؤں کے سفاری کلب میں تنظیم اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ”اندراود سود کونشن“ میں شریک ہونا تھا۔ میرے دورہ حدیث کے ایک ساتھی مولانا سراج الدین ان دونوں عسکری سیپیوں را ولپنڈی میں اپنے فرزند حافظ خالد محمود کے پاس رہتے ہیں جو وہاں کی جامع مسجد کے خطیب ہیں۔ صحیح کاناشتہ ان کے ساتھ کیا جس سے ان کی بیمار پر سی کاموں قلع ما، اللہ تعالیٰ انہیں صحت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

## پاک امریکہ تعلقات: حقیقت پسندانہ تجزیہ کی ضرورت

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۲۳ جنوری ۲۰۱۶ء

وفاقی وزیر خواجہ محمد آصف کا کہنا ہے کہ ہم نے جہادِ افغانستان میں فریق بن کغلظی کی تھی اور پھر جزل پر ویز مشرف کے دور میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر بھی غلطی کی ہے، آئندہ یغلهٗ نہیں دھراں گے۔ انہوں نے یہ بات سعودی عرب ایران کشمکش کے تناظر میں کہی ہے۔

جہاں تک اپنی غلطیوں کو محسوس کرنے، ان کا اعتراف کرنے اور آئندہ غلطی نہ دہرانے کے عزم کا تعلق ہے، خواجہ صاحب کا یہ ارشاد خوش آئندہ ہے اور قومی سیاست میں اچھی پیش رفت کی علامت ہے کہ حکمران طبقات میں بھی اپنی غلطیوں کے اعتراف کی روایت آگے بڑھنے لگی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں حوالوں سے حالات و واقعات اور اپنے رویوں پر تفصیلی بحث و مباحثی کی ضرورت ہے تاکہ اس بات کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے کہ ہم نے اصلی غلطی کہاں کی ہے۔ جہاد افغانستان کا پس منظر یہ تھا کہ سوویت یوینین نے افغانستان میں اثرور سوچ بڑھاتے بڑھاتے اپنا نظام و فلسفہ مسلط کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تحفظ کیلئے مسلح اشکر کشی بھی کر دی تھی جس کے بعد میں افغان علماء کرام اور عوام نے مسلح مژahمت کا آغاز کیا جو بالآخر ایک بڑی اور بین الاقوامی جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ بہت سے پاکستانی رہنماؤں کو یہ خدشہ تھا کہ کمیونٹ نظام اور اثرور سوچ کا افغانستان میں استحکام اس کے پاکستان تک وسیع ہو جانے کا پیش خیسہ ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی افغانستان میں سوویت یوینین کی مسلح اشکر کشی کی آخری منزل گواہ دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ گواہ جہاں تک سوویت یوینین کی رسائی کو روکنے کیلئے طویل جنگ لڑی گئی مگر وہی رسائی یہیں کو مہیا کرنے کیلئے تجارتی راہداری کی تعمیر میں ہمارے قومی رہنماؤں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہر حال اس دور میں پاکستان تک کمیونٹ نظام کی وسعت اور گواہ تک سوویت یوینین کی رسائی کے خطرات نے صرف حکمران طبقات کو چونا کر دیا تھا بلکہ مذہبی

عناصر بھی متحرک ہو گئے تھے۔ اور ریاتی وقت کے ساتھ مل کر مذہبی حیثیت نے جہاد افغانستان میں پاکستانی عوام کی برآ راست شرکت کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔

بات بیہاں تک رہتی تو سمجھ میں آرہی تھی جیسا کہ اس دور میں مولانا مفتی محمود باریہ کہتے رہے کہ افغان مجاهدین صرف افغانستان کی آزادی کی جنگ نہیں لڑ رہے بلکہ پاکستان کے اسلامی شخص اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کیلئے بھی بر سر پیدا رہیں۔ مولانا مفتی محمود کی یہ صد آج بھی پاکستان کے طول و عرض کے مختلف شہروں کی فضای میں گونج رہی ہے کہ پاکستان کے شخص اور سالمیت کی جنگ افغانستان میں لڑی جا رہی ہے۔ لیکن جب افغانستان میں روکی جارحیت کے خلاف افغان مجاهدین کی جنگ کو امیابی کی طرف بڑھتے دیکھ کر امریکی استعمار نے اپنا ”لے“ تلاش روکر دیا تو معاملات میں بگاڑ پیدا ہوئے لگا۔ ہمیں یاد ہے کہ جہاد افغانستان میں امریکہ کی عملی دلچسپی اور کردار کے بعد افغان مجاهدین کے آٹھ گروپوں کا اتحاد قائم ہوا اور مولانا نصراللہ منصور شہید گواں کا سیکرٹری جزل چنانگیا تھا تو مولوی نصراللہ منصور نے اس بات سے اختلاف کیا تھا کہ امریکہ کو جنگ کی کمان میں حصہ دار بنا یا جائے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ حمایت اور امداد قبول کرنے میں حرج نہیں ہے مگر معاملات کو بیر وی کشوں میں دے دینا جہاد افغانستان کے مقاصد سے مطابقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس اختلاف کی وجہ سے انہیں جہاد افغانستان کا باقی دوران یہ ہوں ملک جلو اطمینی کی حالت میں گزارنا پڑتا۔ سو ویسے یونیک کی فوجوں کی واپسی اور حضرت صبغۃ اللہ مجددی کی صدارت میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد انہیں افغانستان واپس آنا نصیب ہوا تھا اور اسی دوران وہ جام شہادت نوش کر گئے تھے۔

امریکہ کو جہاد افغانستان میں اس درجہ کا عمل دخل دلانے میں کن لوگوں کا ہاتھ رہا ہے اور اس کیلئے کس سطح پر کام ہوا ہے؟ اس کی تفصیل مناسب موقع پر بیان کی جاسکتی ہے، البتہ اس کے تباہ ہم سب بھگت رہے ہیں اور خدا جانے کب تک بھکت رہیں گے۔

ہمیں خواجہ محمد آصف صاحب کے اس ارشاد سے اتفاق ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی تھی، البتہ یہ غلطی افغان مجاهدین کی حمایت و امداد میں نہیں بلکہ پورے جہاد افغانستان کی باغ دوز امریکہ بہادر کے ہاتھ میں دینے کے موقع پر ہوئی تھی۔ اور پھر یہی غلطی ہم نے مشرف دور میں دہرائی کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ خود لڑنے کی جائے امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بن کر ہم نے دہشت گروں کے ساتھ ساتھ ان عناصر کو بھی اپنا دشمن قرار دے دیا جو امریکہ کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے ہیں اور خطہ میں امریکہ کے خود ساختہ مفادات کی مخالفت کر رہے ہیں، جس سے دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ خود ابھیات اور شکوہ و شبہات سے دوچار ہو گئی۔

البتہ وزیر اعظم پاکستان کے مشیر امور خارج جناب سرتاج عزیز کی اس بات میں وزن ہے کہ خطہ کی موجودہ صورت حال امریکی پالیسیوں کی وجہ سے رونما ہوئی ہے اور سب کچھ خود امریکہ کا کیا دھرا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ محترم سرتاج عزیز کے اس موقف کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے، چنانچہ جہاد افغانستان کے آغاز سے اب تک کی صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجربیہ قوی تقاضے کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اصل حقائق تک رسائی اور ان کے غیر جانبدارانہ جائزہ کی سوچ اپنائی جائے۔ خدا کرے کہ ہم اس قوی ضرورت کی تکمیل کیلئے اپنی لا یوں اور حلقوں کے

دائروں سے ہٹ کر ملک کے بہتر میں کیلئے کوئی علمی و فکری کام کر سکیں، آئین یارب العالمین۔

## ملا اختر منصور کی شہادت کے بعد!

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۶ مئی ۲۰۱۶ء

امریکی ڈرون حملہ میں افغان طالبان کے امیر ملا اختر محمد منصور کی موت کی تصدیق سے پاکستان کے وزیر داخلہ چودھری شاہ علی خان نے یہ کہہ کر گریز کیا ہے کہ جب تک ڈی ان اے ٹیسٹ وغیرہ مکمل نہیں ہوتے اس خبر کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ لیکن مختلف بین الاقوای ذرائع کے ساتھ ساتھ خود طالبان کے حلقوں میں نئے نئے امیر کے انتخاب کیلئے نظر آنے والی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا منصور کی شہادت کا سانحہ رونما ہو چکا ہے، انا اللہ وانا الیہ راجحون۔ جبکہ دوسری طرف امریکی صدر باراک اوباما نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہہ ہے کہ امریکہ دنیا میں کہیں بھی اپنے تحفظ کیلئے ڈرون حملوں کا حق رکھتا ہے اور ملا منصور شہید گو قتل کرنے سے اس کا مقصد افغان طالبان کو مذکورات کی میز پر لانا ہے۔ ملا اختر محمد منصور کو طالبان کے بانی ملا محمد عمر مجاهدؒ کی وفات کے بعد افغان طالبان کا امیر منتخب کیا گیا تھا۔ جبکہ نئی صورتحال میں ان کے جانشین کے طور پر ملا محمد عمرؒ کے فرزند ملا محمد یعقوب اور مولانا جلال الدین حقانی کے فرزند سراج الدین حقانی کا نام نمایاں طور پر لیا جا رہا ہے اور مختلف تبرے سامنے آ رہا ہے ہیں۔ جبکہ اس سلسلہ میں مکمل اور صحیح صورتحال سامنے آنے میں شاید ابھی وقت لگے گا۔

یہ بات کم و بیش واضح ہے کہ امریکہ افغان طالبان کو اپنے ایجنسٹے پرلانے میں قوت کے بھرپور استعمال کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ان کے امیر کو مبینہ طور پر قتل کر دینے کے بعد بھی وہ اسے اپنی کامیاب قرار دینے کا حوصلہ نہیں کر رہا ہے۔ جیسا کہ امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان مارک ٹوائز نے اپنی ایک حالیہ برینگ میں کہا ہے کہ ”یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس حملہ کے بعد طالبان کو شکست ہو گئی ہے۔“

افغان طالبان دراصل روی جاریت کے خلاف جہاد افغانستان میں سرگرم کردار ادا کرنے والے ان عناصر پر مشتمل ہیں جنہوں نے سوویت یوینین کی واپسی کے بعد اس خطے میں نئے امریکی ایجنسٹے کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تھا اور جہاد افغانستان کے نظریاتی اهداف کی تکمیل کو اپنا مقصد قرار دیا تھا۔ جبکہ امریکہ کی خواہش اور کوشش تب سے یہی ہے کہ اس نے دنیا کی ”یک قطبی چودھراہست“ اور نئی علاقائی تقسیموں کیلئے جو ایجنسٹاٹے کر رکھا ہے، جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے تمام عناصر اس کے کسی نہ کسانے میں فٹ ہو جائیں اور اس ایجنسٹے کی تکمیل میں کردار ادا کریں یا کم از کم اس میں رکاوٹ نہ بنیں۔ بہت سے گروہ اس کے بعد سے اس ایجنسٹے کا حصہ بن چکے ہیں جن کی سرگرمیوں سے بالواسطہ یا بلا واسطہ امریکہ استفادہ کر رہا ہے۔

افغان طالبان اس کیلئے تیار نہیں ہوئے اور وہ افغانستان کی مکمل خود مختاری کے ساتھ جہاد افغانستان کے نظریاتی اهداف کی تکمیل کے عزم پر بدستور قائم ہیں۔ یہ دونوں باتیں نئے عالمی امریکی ایجنسٹے سے مطابقت نہیں رکھتیں کیونکہ

علمی حلقوں میں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار نظریاتی اسلامی ریاست نہ صرف دنیا میں استعماری عزائم کر رہا میں رکاوٹ بن سکتی ہے بلکہ پورے عالم اسلام میں خود مختاری اور اسلامیت کے جذبات کے فروغ کا ذریعہ بھی ثابت ہوگی۔ اسی لیے عسکری کارروائی کے ذریعے افغان طالبان کی حکومت کو ختم کیا گیا اور امریکی اتحادی مسلسل یلغار کے ذریعے انہیں صفحہ ہستی سے مٹانے کی مسلسل کارروائیاں جاری ہیں۔ مگر افغان طالبان اپنے اس موقف پر قائم ہیں کہ اگر افغانستان پر روسی عسکریت ناجائز تھی تو امریکی اتحادی عسکری یلغار بھی ملک کی خود مختاری کے منافی اور ناجائز ہے۔ اور وہ روس کی طرح امریکی عسکری جاریت کا سامنا بھی اپنے ایمان و عقیدہ کے تحفظ اور قومی خود مختاری کی بحالی کیلئے کر رہے ہیں۔

یہ بات اب بحث طلب نہیں رہی کہ امریکی اتحادی عسکری قوت اور عالمی سلطنت پر کردار کشی کی وسیع ترینم کے باوجود اور بہت سے عسکری گروہوں کو بالواسطہ یا بالواسطہ طور پر اپنے اجہدے کا حصہ بنانچکنے کے بعد بھی افغان طالبان کو اپنے ڈھب پر نہیں لاسکا اور نہ ہی انہیں قوت کے ذریعے ختم کر دینے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ یہ مقاصد مذاکرات کی میز پر لانے کی میز پر حاصل کرنا چاہتا ہے اور افغان طالبان کے اصولی موقف کی پرواکیے بغیر انہیں زبردستی مذاکرات کی میز پر لانے کیلئے اس قدر بے چین ہے کہ اس کیلئے ڈرون ہملوں کے ذریعے پاکستان کی خود مختاری اور سالیت کو دادا پر لگادینے میں بھی اسے کوئی چجانب نہیں ہے۔ امریکی صدر کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کسی آزاد اور خود مختار ملک کے اندر ڈرون حملہ اس کی سالیت اور خود مختاری کے منافی ہوتے ہیں اور اس حقیقت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ افغان طالبان محض ایک عسکری گروہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی قوت ہے جس کی بنیاد اسلام پر بے چک عقیدہ و ایمان کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی مکمل خود مختاری اور آزادی پر ہے جو انسانی حقوق کے اس نام نہاد چار ٹکا بھی تقاضہ ہے جسے امریکی اتحاد نے دنیا بھر میں اپنے تسلط و اقتدار کیلئے ہتھیار بلکہ کھلونا بنا رکھا ہے۔

امریکیوں کی غرض اب صرف یہ رہ گئی ہے کہ جو وہ چاہ رہے ہیں وہ کیوں نہیں ہو پا رہا ہے اور دنیا کے مستقبل کا جو نقشہ انہوں نے طے کر رکھا ہے کچھ لوگ امریکہ کے فریب کا شکار ہو کر اس میں فٹ ہونے سے انکار کیوں کر رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں افغان طالبان نے با مقصد مذاکرات سے کبھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی اب انہیں اس کا مورد الازم قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ اگر مذاکرات کا مقصد ان سے اپنی مرضی کی کسی دستاویز پر دستخط لینا ہے تو وہ شاید اس کیلئے کبھی تیار نہیں ہوں گے اور نہ ہی انہیں اس کیلئے آمادہ ہونا چاہیے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ملا اختر محمد مصوڑ کی شہادت نے دنیا کو ایک بار پھر یہ واضح پیغام دیا ہے کہ خود مختاری افغانستان کا حق ہے اور اسلام افغان قوم کا مُمقبل ہے جس سے انہیں محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے درجات بندے سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## ٹی وی پروگراموں کے طے شدہ اہداف

روزنامہ اسلام، لاپور۔ یکم جولائی ۲۰۱۶ء

رمضان المبارک کے دوران (۱۲ سے ۱۶ رمضان) پانچ دن کریبی میں گزارنے کا موقع ملا۔ ماہ مقدس میں مختلف ٹی وی چینلوں کی خصوصی نشریات میں سے جناب اینت احمد کا سنجیدہ اور با مقصد پروگرام ”روح رمضان“ اس سفر کا باعث بنا۔ میں عام طور پر ٹی وی پروگراموں سے گریز کرتا ہوں اور دعوت کے باوجود مذہرات کردیتا ہوں جس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے بہت سے اینکرز کی یہ پالیسی اور طریق کارہے کہ وہ اپنے مہماں کو بات کہنے کا موقع دینے کی وجہ سے اپنی بات کھلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور خاص طور پر مذہبی راہ نمائی کے بارے میں تو یہ بات طے شدہ ہے کہ مذہب کی نمائندگی کیلئے چن کرایے حضرات کو سامنے لایا جاتا ہے اور ان سے بعض باتیں حیلے بہانے سے اس انداز سے کھلوائی جاتی ہیں کہ مذہب کے نام پر کوئی دھنگ کی بات پیش نہ ہو سکے۔ اور جو بات بھی ہو وہ مذہب اور مذہبی اقدار پر عوامی پیشیں و اعتماد کو مزور کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ یہ بہت اور پر کسی سطح پر طے شدہ پالیسی ہے اور اس ماحول میں اگر کوئی سنجیدہ شخص اپنی بات کہنے کی کوشش بھی کرے تو اسے زبردستی کرنا پڑتی ہے۔ میں خود اپنے متعدد مراحل سے گزر چکا ہوں جن میں سے چند کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نائن الیون کے بعد جب افغانستان کی طالبان حکومت سے امریکہ یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ نائن الیون کے سانحہ میں مبینہ طور پر ملوث ہونے کی وجہ سے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالہ کر دیا جائے جس پر طالبان یہ کہہ رہے تھے کہ اگر کسی مسلمہ بین الاقوامی فورم پر یہ الزام ثابت کر دیا جائے تو وہ یہ مطالبہ پورا کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اس دوران اندرن کے ایک ٹی وی کی دعوت پر میں ایک پروگرام میں شریک ہوا۔ محترم لارڈ نذریں احمد بھی اس کے شرکاء میں سے تھے۔ بعض دانش ور حضرات یہ کہہ رہے تھے کہ جب امریکہ اسامہ کو ملزم سمجھتا ہے اور حوالگی کامطالبہ کر رہا ہے تو طالبان حکومت کو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے۔ جبکہ میرا موقف یہ تھا کہ طالبان حکومت کا یہ موقف بے وزن نہیں ہے کہ محض الزام پر وہ ایسا نہیں کریں گے جب تک کسی مسلمہ بین الاقوامی فورم پر اس کے ثبوت فراہم نہ کر دیے جائیں۔ پروگرام اردو زبان میں تھا اور لا یونیورسٹی ہم سب اردو میں بات کر رہے تھے لیکن میں نے جوں ہی یہ بات زور دے کر کہ امریکہ اس کیس میں مدعا ہے یا یہ جس کی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہے؟ تو پروگرام کا ماحول یکخت تبدیل ہو گیا، گفتگو انگریزی میں ہونے لگی، اور میں انگریزی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے خاموش تماشائی بن کر رہ گیا۔

اسی طرح ایک بار مجھے اسلام آباد میں پی ٹی کے ایک پروگرام میں کسی موضوع پر گفتگو کیلئے بلا یا گیا۔ میرزاں ایک معروف صحافی تھے جو دفات پاچکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔ انہوں نے پروگرام کا آغاز کیا اور میرا مختصر تعارف کرنے کے بعد گفتگو شروع کر دی۔ گفتگو یادہ تر علماء کرام کے طریق پر تنقید کے حوالے سے تھی، وہ مسلسل گفتگو کرتے چلے گئے، میں خاموش بیٹھاں رہا تھا، جب پروگرام کا طے شدہ وقت ختم ہونے کے قریب پہنچا تو میں نے مجبوراً مداخلت کی اور کہا کہ محترم! آپ نے مجھے اس موضوع پر گفتگو کرنے کیلئے بلا یا ہے یا اپنی تقریر سنانے کے لیے؟ یہ تو میں کسی

جگہ بھی ٹوی سیٹ کے سامنے بیٹھ کر سن سکتا تھا، اس پر وہ مجھے موقع دینے پر مجبور ہوئے اور میں بمشکل چند منٹ گفتگو کر پایا۔

تیرسا واقعہ اس سے بھی دلچسپ ہے۔ چند سال قبل میں اپنے بعض تعلیمی پروگراموں کیلئے کریچی میں تھا، ایک پرائیویٹ ٹوی چینل کی طرف سے دعوت ملی کہ ”اسلامائزیشن کیلئے ہوم ورک“ کے حوالے سے ایک پروگرام ہو رہا ہے، کیا آپ اس میں شریک ہوں گے؟ موضوع میری دلچسپی کا تھا اس لیے میں نے ہاں کر دی۔ جب پروگرام میں پہنچا تو گفتگو کیلئے چند دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ میزان نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کم و بیش طنزیہ لجھے میں سوال داغ دیا کہ آپ علماء کرام کے پاس نفاذ اسلام کیلئے کوئی ہوم ورک بھی موجود ہے یا ویسے ہی نظرے لگاتے چلے جا رہے ہیں؟ یہ کہہ کر انہوں نے سوال کا رخ ایک مولانا صاحب کی طرف کر دیا جن سے میں متعارف نہیں تھا لیکن مجھے اتنا اندازہ تھا کہ ان کی اس موضوع پر تیاری نہیں ہے، یا اس موضوع پر وہ مدل گفتگو نہیں کر سکیں گے۔ میں ساری تکنیک سمجھ گیا کہ اس سوال پر نامکمل اور نبہم جواب ہی ایک صاحب کی ضرورت ہے جس کیلئے یہ شرفی سے مولانا صاحب قابو کیے گئے ہیں۔ جبکہ اس سوال وجواب کے موقع پر میری موجودگی دکھانا بھی پروگرام والوں کی حکمت عملی کا حصہ ہے۔

میں نے مداخلت کی اور کہا کہ اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ میزان نے کہا کہ نہیں مولانا آپ سے ہم کچھ اور سوال کریں گے اور اس سوال کا جواب یہ مولانا صاحب ارشاد فرمائیں گے۔ میں اس پر ڈٹ گیا کہ نہیں اس سوال کا جواب تو میں ہی دوں گا۔ میرا اصرار اور ان کا انکار چند لمحے جاری رہا، بہر حال انہیں ہنخیار ڈالنا پڑا اور میں نے وضاحت کی کہ اسلامائزیشن کیلئے ہمارے پاس اسلامی نظریاتی کوںسل کی سفارشات اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کے ساتھ ساتھ تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی متعدد اجتماعی علمی و فقہی کاؤشوں کی صورت میں اس قدر مکمل اور جامع ہوم ورک موجود ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مسلم ملک نفاذ اسلام کیلئے اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

یہ چند ذاتی واقعات اس لیے عرض کیے ہیں کہ میں ٹوی چینل کے پروگراموں میں شریک ہونے سے عام طور پر گریز کرتا ہوں۔ البتہ انتق صاحب کا پروگرام چونکہ سنجیدہ اور با مقصد ہوتا ہے اس لیے اس میں شریک ہونے کیلئے مصروفیات میں سے ہر سال وقت نکالنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس رمضان المبارک میں بھی تین دن کے دوران سحری اور افطاری کے چھ پروگراموں میں شریک ہوا اور مختلف دینی عنوانات پر کچھ معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔

روزنامہ اسلام، لاپور---۸ نومبر ۲۰۱۶ء

چند سال پہلے کی بات ہے کہ کریچی میں ایک پرائیویٹ ٹوی چینل کے پروگرام کیلئے مجھے بلا یا گیا، پروگرام کا موضوع یہ تھا کہ ”کیا پاکستان میں نفاذ شریعت کا مطالبہ اور جدوجہد کرنے والے حلقوں نے کوئی ہوم ورک بھی کر رکھا ہے یا یہ محض ایک جذباتی نعرہ ہی ہے؟“ اس پروگرام کے ایک نے انتہائی تیکھے لجھے میں یہ سوال کیا اور مخفی میں شریک ایک بزرگ کی طرف رخ پھیر کر ان سے جواب کے مقاضی ہوئے۔ مجھے اس طریق واردات کا پہلے سے اندازہ تھا اور یہ بھی

علوم تھا کہ جن صاحب سے سوال کا جواب مانگا جا رہا ہے ان کی اس حوالے سے تیاری نہیں ہے، اس لیے میں نے تھوڑی سی سختی کے ساتھ مداخلت کی اور کہا کہ اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ چونکہ پروگرام لا یئو تھا اس لیے وہ زیادہ مزاجت نہ کر سکے اور میرا جواب انہیں سننا پڑا۔

میں نے عرض کیا کہ نفاذ شریعت کے حوالے سے پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کا ہوم ورک اور فائل ورک اس تدریج مکمل اور جامع ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں نفاذ اسلام کیلئے پیش رفت ہو تو ہمارا یہ ہوم ورک اس کیلئے بنایا دی اور اصولی راہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ طالبان کے دور حکومت میں مجھے قندھار جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے ان کے ذمہ دار حضرات کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے تک ہونے والے ہوم ورک سے استفادہ کریں اور اسے سامنے رکھ کر افغانستان کے ماحول اور ضروریات کے دائے میں اسلامائزیشن کی طرف پیش رفت کریں۔ ٹی وی چینل کے مذکورہ پروگرام میں اس حوالے سے میں نے تین کاموں کا ذکر کیا:

1. پرائیوریٹ سٹھپ پر مختلف مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی مشترکہ کاؤنسل جو ۲۲ دستوری نکات اور اس طرز کی دیگر بہت سی دستاویزات کی صورت میں موجود ہیں اور جن پر تمام مکاتب قرآن بھی متفق ہیں۔
2. حکومتی سٹھپ پر قیام پاکستان کے بعد علامہ محمد اسد گی راہنمائی میں قائم ہونے والے ادارہ اور اس کے بعد تعلیمات اسلامیہ بورڈ، اسلامی مشاورتی کونسل، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی مسلسل محنت اور ان کی وقوع روپورٹیں۔
3. وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیک بیٹھ کے متعدد اہم فیصلے جو نفاذ شریعت کیلئے اصولی اور عملی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

میری طالب علماء رائے میں اگر ان تین دائروں کی علمی کاوشوں کو منظم اور مرتب انداز میں سامنے لایا جائے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذ اسلام کے بارے میں اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ ہمارے ہاں جو کی ہے وہ راہنمائی کی نہیں بلکہ عملی اقدامات کیلئے سنجیدگی کی ہے اور ہمیشہ یہ غیر سنجیدگی ہی شرعی قوانین کے نفاذ میں حائل رہی ہے۔

البتہ ان علمی کاوشوں اور اجتہادی مسائی کے وقیع اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں فنی زبان و اسلوب کے ساتھ عوامی انداز میں منتقل کر کے منظم اور مرتب صورت میں سامنے لایا جائے، وہاں اس بات کا خلاعہ بھی میرے جیسے نظریاتی کارکنوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان علمی و اجتہادی مسائی کے واقعیتی پس منظر کو سمجھنے بغیر اس کی افادیت و اہمیت کا پوری طرح ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ لمحن صرف مذکورہ بالا علمی اداروں کے کام میں نہیں بلکہ ہمارے مفتیان کرام کے ان شخصی فتاویٰ کے بارے میں بھی در پیش ہے کہ ماحول، عرف اور تعامل میں تبدیلی کے باعث کسی مسئلہ میں روایتی موقف سے ہٹ کر کوئی رائے اختیار کی جاتی ہے تو وجہ واضح نہ ہونے کی وجہ سے وہ رائے کنفیوژن کا باعث بن جاتی ہے۔

چنانچہ اسلامی نظریاتی کو نسل، وفاقی شرعی عدالت، اور پریمجم کو رٹ کے شریعت ایپلیٹ بیٹھ جیسے اداوں کے علمی اور اجتہادی فیصلوں کے ساتھ ساتھ ان کے واقعی پس منظر، سماجی ضرورت اور ضرورت و تھال کے تقاضوں کو عام فہم انداز میں واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ اور میرے خیال میں تاریخی پس منظر اور واقعی ماحول کے مرحلہ وار تذکرہ سے یہ ضرورت کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔

## شدت پسندی، افغانستان، ضیاء دور

۱ جولائی ۲۰۱۶ء کو روزنامہ دنیا لا بور کے بفتہ وار میکرین میں شائع ہونے والے انٹرویو کے منتخب حصے

سوال: بعض حقوقوں کی جانب سے پاکستان میں شدت پسندی کو سید احمد شہیدگی تحریک کا تسلیم کہا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر گروپ دیوبندی کتب فکر ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: یہ تاثر بظاہر تو درست دھائی دیتا ہے کیونکہ جہادی تحریکیں فکری طور پر خود کو اسی کے ساتھ منسوب کرتی ہیں، اس کا بنیادی سبب میرے خیال میں جہاد افغانستان ہے۔ روس کی واپسی اور افغان جہاد کی کامیابی کے بعد عالمی طاقتوں نے اس پوری تحریک کو اس کے منطقی نتائج سے محروم کیا، اسی کار د عمل ہیں بعد میں شدت پسندی کی صورت میں دھکائی دیتا ہے۔ البتہ سید احمد شہیدگے کے بعد شاعر انہن کے زمانے میں یہ بتیلی آئی تھی کہ دیوبندی تحریک ایک نئی تشکیل کے تحت تعلیمی و تدریسی محنت اور پر امن سیاسی جدوجہد کے دور سے گزری۔ اس کے بعد ایک محمد دو دارہ میں اس کی تشکیل نو جہاد افغانستان کے زمانے میں ہوئی کہ روس کی جاریت کی وجہ سے وہی پرانے جنوبات پھر آگئے، لیکن جہاد افغانستان سے ہٹ کر دوسرے معاملات میں مجموعی طور پر دیوبندی حقوقوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

سوال: جہاد افغانستان کو اگر عالمی قوتوں نے منطقی انجام تک نہیں پہنچنے دیا تو کیا مذہبی تحریکوں کا داخلی نظام اتنا کمزور تھا کہ اس کے نتیجے میں ایسے عناصر پیدا ہو گئے جنہوں نے مسلمانوں اور عام شہریوں کی قتل و غارت سے بھی گریز نہیں کیا؟

جواب: یہ لمحہ فکری ہے۔ جب جہاد افغانستان ختم ہوا تو اس وقت میرے اندازے کے مطابق پینتالیس بچاں ہزار پاکستانی مسلح افراد وہاں سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ اس وقت میں نے بہت سی اہم شخصیات بالخصوص مولانا فضل الرحمن، جزل حمید گل اور مولانا اسماعیل الحق سے یہ بات کہی تھی کہ یہ قوت اگر کھلی چھوڑ دی گئی تو مسائل پیدا ہوں گے، اس لیے اس قوت کا کوئی مصرف تلاش کریں۔ میں نے مثال بھی دی کہ سنہ میں قیام پاکستان کے وقت کوئی سات آٹھ ہزار مسلح خر موجود تھے جنہیں اس نظام میں ایڈ جسٹ کر لیا گیا تھا، ورنہ وہ بھی آن ایک مسئلہ ہوتا۔ جہاد افغانستان کے موقع پر بھی میرا

کہنا یہی تھا کہ اگر اس بے پناہ قوت نے اپناراستہ خود بنایا تو تباہی آئے گی۔ یہی بات کافی عرصہ بعد ہیلری کلنٹن نے بطور امریکی وزیر خارجہ تسلیم کی کہ ہم سے اس معاملے میں غلطی ہوئی کہ افغان جہاد کے بعد مجاہدین کے گروپوں کو آزاد اور تنہا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے معاملہ بگزگیا۔

**سوال:** افغانستان کے طالبان کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے؟

**جواب:** افغانستان کے طالبان سادہ و مغلص لوگ ہیں اور ان کا تعلق نجلے طبقے کے افراد سے ہے۔ انہوں نے افغانستان کی آزادی اور اسلامی تخلیع مخالفانہ جنگ لڑی ہے لیکن انہیں مناسب سیاسی راہنمائی میسر نہیں آئی۔ جبکہ ان کے قیام کے فوراً بعد القاعدہ کے عنصر کی وجہ سے خرابی بہت تیزی سے برپی۔ میں نے اس وقت بہت سے دوستوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کیلئے طالبان کو سمجھم ہونے دو اور انہیں کام کیلئے وقت دو، کوئی دوسرا لڑائی مت چھیڑوں مگر یہ بات نہیں سنی گئی۔ القاعدہ کی بے وقت تشكیل اور فوری تحرک ہو جانے کی وجہ سے طالبان حکومت مسائل کا شکار ہوئی۔ اور ہر القاعدہ کی سرگرمیوں اور ادھر پاکستان میں تحریک طالبان کی تشكیل نے افغان طالبان کا شدن خراب کر دیا۔ یہ بات کہی پیش نظر ہے کہ افغانستان میں اگر کوئی پروپاکستان طبقہ ہے تو وہ طالبان ہے۔ لیکن ہم نے ان کے اعتماد کو ٹھیک پہنچائی ہے جس کی وجہ سے تعلقات میں دراٹیں پیدا ہوئیں۔ اور آج افغانستان میں ایسے لوگ بر سرافتدار ہیں جو بھارت کو اپنے ملک میں کھلی چھٹی دے رہے ہیں۔

**سوال:** عوامی سٹھ پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی طبقے کی جانب سے شدت پسندی کے رجحانات اور قتل و

غارمات کی واضح اور غیر مشروط مذمت نہیں کی جاتی۔ کیا اسی تنظیموں اور فکر کیلئے زرم گوشہ پیا جاتا ہے؟

**جواب:** شدت پسندی کی مذمت کرنے میں مذہبی طبقے نے کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن میڈیا کا روایہ اس معاملے میں انتہائی جانبدارانہ رہا ہے۔ ہمارے ملک اور عالمی میڈیا دونوں کی پالیسی یہ ہے کہ شدت پسندی کو تواجہ اگر کیا جائے لیکن سمجھیدہ مذہبی قیادت کی جانب سے جب اس کی مخالفت ہو تو اسے دبادیا جائے۔ میں خود اس رویے کا شاہد ہوں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں دیوبندی مکتب فکر کی پوری قیادت نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر شدت پسندی کی مخالفت کی اور اس کی مذمت میں باقاعدہ قرارداد منظور کی گئی۔ وہ قرارداد میں نے اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے لکھی تھی لیکن تمام کوششوں کے باوجود میڈیا نے اس کی عام مدرسے میں ہونے والے جملے کی طرح نظر انداز کر دیا۔

**سوال:** بعض حلقوں کے نزدیک مذہبی فکر کی جانب سے قومی ریاست کو مسترد کرنے اور عالمی سٹھ پر

خلافت کے قیام کو دینی تقاضا قرار دینے کی وجہ سے شدت پسندی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ خیال کہاں تک

درست ہے؟

**جواب:** عمومی دینی حلقے تو قومی ریاست کو قبول کر چکے ہیں۔ کچھ نے اگر نہیں کیا تو اس کیلئے سب کو یہاں طور پر ذمہ دار قرار دینا درست نہیں ہے۔ دینا میں جتنی بھی ریاستیں ہیں وہ اپنے دارہ کار میں رہ کر کام کر رہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؐ نے اس بات کو اس طرح بھی واضح کر دیا تھا کہ خلافت کسی علاقائی حکومت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ آج کی اصطلاح میں ایک

کفیلریشن کا نام ہے۔ یعنی امارات اپنی جگہ قائم ہوں اور خود مختار ہوں جبکہ ان کا ایک مرکر ہو جو کفیلریشن کی طرح کا ایک نظام ہو۔

اسی لیے میں اسے افغان طالبان کی عقلمندی کے فیصلوں میں شمار کرتا ہوں کہ انہوں نے افغانستان میں حکومت کے قیام کے بعد ”خلافت“ کا نہیں بلکہ ”امارت“ کا اعلان کیا۔ جبکہ داعش کی سب سے بڑی بے وقوفی بھی تھی کہ انہوں نے بات ہی خلافت سے شروع کی ہے۔ حالانکہ خلافت جب بھی بنے گی ایک کفیلریشن کی طرز پر بنے گی جس میں امارات کو پوری داخلی خود مختاری حاصل ہوگی۔ خلافت راشدہ کے دور کا اگر درست تحریزی کیا جائے تو وہ نظام کفیلریشن ہی کا تھا جس میں صوبوں کو خود مختاری حاصل تھی اور مرکزی حکومت ہر معاہلے میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

سوال: ضیاء دور کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: جزل ضیاء الحق مرحوم نے بعض اچھے اقدامات بھی کیے لیکن ان کی اپروٹ ذاتی سطح تک ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ادارے ان کے اقدامات کو سپورٹ نہیں کر سکے۔ دوسری جانب ایک روحانی یہ ہے کہ ان کے کھاتے میں کئی ایسے کام بھی ڈال دیے جاتے ہیں جو ان کی حکومت سے کئی برس پہلے شروع ہوئے تھے۔ مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۷۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ انہوں نے بعض اچھے کام کیے لیکن کئی کام دستور کی سطح پر پہلے طے ہو چکے تھے۔ ہماری افغان پالیسی کی تشكیل بھٹو دور میں ہوئی۔ عالمی میڈیا میں اس حوالے سے تفصیلات سامنے آئی ہیں بھٹو کی بلوجٹان میں فوج کشی کار عمل افغانستان میں ظاہر ہوا۔ اب چونکہ افغانستان میں مزاحمت مذہبی لوگ کر رہے تھے تو ان کا ساتھ یہاں کے مذہبی لوگوں ہی نے دینا تھا، لیکن اس کا سارا الزام جزل ضیاء الحق پر ڈال دیا جاتا ہے۔

## مولانا محمد امین اور کرنسی شہید کی کاوش

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰۱۶ء۔ ۲۰ اکتوبر۔

حضرت مولانا محمد امین اور کرنسی شہید کے بارے میں یہ معلوم کر کے مجھے ”میں نے یوں جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“ کی کیفیت اپنے دل میں محسوس ہونے لگی کہ انہوں نے افغان طالبان اور کمانڈر احمد شاہ مسعود شہید کے درمیان صلح کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ خواہش ایک دور میں مجھے بھی ستائی رہی ہے اور میں نے اس کا بعض موقع پر انہمار بھی کیا ہے۔ بلکہ ایک موقع پر قدر حار میں حضرت مولانا محمد بنی محمدؒ کے ساتھ ملاقات کے دوران ان سے عرض کیا تھا کہ روئی چاریت کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین کے تمام گروپوں کو افغانستان کے مستقبل کے بارے میں مل کر فیصلہ کرنا چاہیے اور اب بھی میری رائے یہ ہے کہ اس کے بغیر شاید افغانستان کو موجودہ دلدل سے نہ کالا جاسکے۔ کمانڈر احمد شاہ مسعود شہید کے بارے میں یہ بات میں ایک عرصہ قبل لکھا چکا ہوں کہ علماء کرام کے ایک وفد کے

ہمراہ پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی کے دور صدارت میں مجھے کابل جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت احمد شاہ مسعود وزیر دفاع تھے۔ انہوں نے مولانا نادراء الرحمن درخواستی اور رقم الحروف کو یہ کہہ کر اپنا مہمان بنالیاتاکہ میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی گاشاگر ہوں اور ان کے دورہ تفسیر میں خانپور میں شریک ہو چکا ہوں۔ میری اس بات سے بہت سے دوستوں کو شاید اتفاق نہ ہو مگر پورے شرح صدر کے ساتھ میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ جن جہادی گروپوں نے روئی جا رہیت کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا اور آپس میں متحداً مجاز بھی بنالیاتاکان کو دوبارہ اکٹھے ہونا چاہیے اور مل جل کر جہاد افغانستان کے منطقی تنائج کے حصول اور افغانستان کی آزادی و خود مختاری کیلئے مشترکہ لائجہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

----

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۱۸ اپریل ۲۰۱۶ء

میں نے ایک مضمون میں افغان طالبان کی قیادت سے یہ عرض کیا کہ وہ نفاذِ اسلام کیلئے پاکستان میں قرارداد مقاصد اور علماء کرام کے ۲۲ متفقہ نکات سے اسلامی نظریاتی کو نسل کی سفارشات تک کے عمل سے استفادہ کریں، اور جو سرکردہ حضرات پاکستان میں سیاسی اور عدالتی شعبوں میں نفاذِ اسلام کیلئے مسلسل سرگرم عمل ہیں ان سے رابہنمائی حاصل کریں۔ اس پر حضرت قاضی صاحب<sup>ر</sup> نے مجھے خط لکھا کہ ”انہیں اپنی فتح پر کام کرنے دو، انہیں ہمارے والی عادتیں کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟“ قاضی صاحب<sup>ر</sup> کے اس درد بھرے جملہ میں معانی کا ایک جہان آباد ہے۔ میری رائے تو تبدیل نہیں ہوئی اور اب بھی وہی ہے مگر حضرت قاضی صاحب<sup>ر</sup> کے اس درد دل نے اس تدریث کیا کہ جب بھی موقع ملتا ہے مختلف محافل میں اس کا اظہار کرتا رہتا ہوں۔

----

## پاک امریکہ تعلقات: جبر و مکر کی داستان

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ء

وزیرِعظم میاں محمد نواز شریف نے گذشتہ دونوں بوسنیا کے دورہ کے موقع پر سرایوں میں ایک گفتگو کے دوران ہماہ ہے کہ پاکستان چند سالوں سے مسلسل عالمی دباؤ کی زد میں ہے۔ یہ جملہ انہوں نے کس پس منظر میں فرمایا ہے اور اس عالمی دباؤ کا کون سا دائرہ ان کے سامنے ہے، اس کی تفصیلات تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ البتہ ان کے اس ارشاد سے ہمیں اتفاق ہے کہ پاکستان مسلسل عالمی دباؤ کا شکار ہے، مگر صرف چند سالوں سے نہیں بلکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی یہ ریاست اپنے قیام کے فوراً بعد ہی عالمی دباؤ کے دائرے میں شامل ہو گئی تھی اور تب سے نہ صرف اس دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اس کے دائرے کیے بعد دیگرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ دائرے رفتہ رفتہ ”ریٹرائزر“ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

۷۱۹۲ء میں جب پاکستان قائم ہوا تو امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ عروج پر تھی جس میں اس نو زائدہ ریاست کو اس تیزی کے ساتھ امریکی کیپ کا حصہ بنایا گیا کہ اس کا بعض حلقوں میں یہ مطلب لیا جانے لگا کہ شاید پاکستان کے قیام کا مقصد ہی بھی تھا۔ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان اس خارجہ پالیسی کے ماشر مائنڈ تھے۔ جبکہ وزیر عظم نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم کو اس مہارت کے ساتھ اس ”دام ہمنگ زمین“ میں پھنسایا گیا کہ ان کے تمام تر خلوص و دیانت کے باوجود ایک تلخ سوال ان کی سیاسی بصیرت و فراست کے اس باب کا یہیشہ کیلئے عنوان بن گیا ہے۔ وہ یہ کہ جب انہیں امریکہ اور روس دونوں کی طرف سے دورے کی دعوت ملی تھی تو انہوں نے یہ دونوں دعویٰں قبول کر کے توازن قائم رکھنے کی وجہے صرف امریکہ کی دعوت قبول کر کے اپنے ملک کو امریکی کیپ کے ساتھ وابستہ کیوں کر لیا تھا؟

ہم اس وقت سے امریکی کیپ کا حصہ چلے آرہے ہیں حتیٰ کہ روس کے خلاف امریکی معابدوں سیٹو Seato اور سنٹو Sento کا حصہ رہے ہیں۔ اور ایک مرحلہ میں تو اس حد تک ہم فرنٹ لائی پر آگئے تھے کہ بدھیر پشاور کے ایئرپیس سے پرواز کرنے والے جاسوس امریکی طیارے کی نشاندہی ہونے پر روسی وزیر عظم خود شیف نے اعلانیہ طور پر کہہ دیا تھا کہ ہم نے بدھیر کے گرد سرخ خوازہ لگادیا ہے اور اب وہ ہمارے نشانے پر ہو گا۔ ہم امریکہ اور روس کی اس سرد جنگ میں فریض نہ بننے والے ممالک کی غیر جانبدار تحریک کا رسی حصہ تو بننے تھے لیکن ہمارا عملی کردار یہیشہ سے امریکی اتحادی کارہا ہے اور آج بھی ہم اسی کا حصہ ہیں۔ جبکہ اس دوران:

- پاکستان کی شرگ کشمیر کو ایک لاپیچل مسئلہ بنانے میں امریکہ نے جو کردار ادا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔
- ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران امریکہ نے باہمی معابدات کی پاسداری سے کھلا اخراج کیا۔
- مشرقی پاکستان کو بلگلہ دلیش میں تبدیل ہوتے دیکھ کر امریکہ بہادر ”ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم“ کی تصویر بنا رہا اور اپنے اتحادی ملک کو تقسیم ہونے سے بچانے کیلئے امریکہ نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔
- جہاد افغانستان میں رو سی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کے بعد امریکی کیپ نے اپنے تمام مقاصد حاصل کر لیے مگر افغان مجاہدین اور پاکستان کو ان کی جدوجہد کے منطقی نتائج و فوائد سے محروم کرنے کیلئے ”جنینو امعاہدہ“ کے نام سے مکروفریب کا جو جاہ بنا وہ بلاشبہ امریکی مناقفত کا شاہ کار ہے۔
- پاکستان کی وہ جہادی قوتوں جن کی قربانیوں سے امریکہ نے افغانستان میں پورا فائدہ اٹھایا، مگر بعد میں انہیں بتدریج دہشت گروپوں میں تبدیل کرنے اور انہیں بدنام کرنے کیلئے جو ساز بازی کی گئی وہ بھی وقت کے ساتھ واضح ہوتا جا رہا ہے۔

پاکستان سے ہر طرح کی قربانیاں اور مفاد حاصل کرنے اور بدالے میں اسے تبدیل کے سوا کچھ نہ دینے کے بعد بھی ہم امریکہ کے ”فرنٹ لائی اتحادی“ ہیں اور اس کی ہر سزا بھگت رہے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں امریکی پالیسیوں اور طرز عمل کو سمجھنے کیلئے سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی کتاب ”فریڈریٹ نٹ ماسٹرز“ (آقانہیں دوست) کو ایک نظر

دیکھ لینا ضروری ہے۔ جبکہ اس حوالے سے مقام، اکنٹافات اور دستاویزات کی ایک وسیع دنیا محققین اور تجزیہ نگاہوں کی راہ دیکھ رہی ہے۔ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ امریکہ، بہادر اور اس کے اتحادیوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش چلی آرہی ہے جو اب شدت اور عروج کی آخری بلندی کو چھوٹی دکھائی دینے لگی ہے کہ:

- پاکستان اپنے نظریاتی اور اسلامی شخص سے دستبردار ہو جائے اور دستور و قانون کے ان تمام حصوں پر نصیحتی کیلئے چھپ دے جو اسلامی احکام و قوانین سے کسی درجہ کا تعلق رکھتے ہیں۔
- پاکستانی قوم اپنے خاندانی نظام اور تہذیبی روایات سے دست کش ہو جائے اور نکاح، طلاق، وراثت، خاندانی ماحول اور باہمی رشتہوں کے حوالے سے مغربی تہذیب و ثقافت کی بالادستی کو قبول کر کے اس کا حصہ بن جائے۔
- اسلامی عقائد کے ساتھ بے چک کمٹنٹ سے لاتعلق ہو جائے اور تحفظ ناموس رسالت، عقیدہ ختم نبوت اور مذہبی شعائر کی حرمت و تقدس سمیت تمام مذہبی معاملات کو دستور و قانون کے ماحول سے خارج کر دے۔
- ایسی قوت کے مقام سے پیچھے ہٹئے، اپنی عسکری اور دفاعی صلاحیت و قوت کو آقاوں کی مقرر کردہ دائرہوں میں محدود کر دے اور خاص طور پر مسلم ممالک کی عسکری قوت و صلاحیت کیلئے مقرر کی گئی ریڈ لائن کو کراس نہ کرے۔
- اقتصادی و معاشرتی ترقی اور خود کفالت کا خوب دیکھنا چھوڑ دے اور ”سی پیک“ سمیت تمام ایسے ترقیاتی پروگراموں پر نظر ثانی کرے جن سے چودھریوں کی چودھراہٹ متاثر ہوتی ہو۔
- پاکستان خود کو عالم اسلام کے وسیع تر دائے کا شعوری و نظریاتی کردار سمجھنا چھوڑ دے، اپنی تمام تر پالیسیوں کو داخلی و علاقائی دائرہوں میں محصور رکھے اور ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی تصور سے دستبردار ہو جائے۔ یہ وہی کردار ہے جس کا خطہ محسوس کرتے ہوئے افغان طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کیا گیا اور نہ ان سے زیادہ شدت پسند حکومتیں دنیا میں قائم رہیں اور اب بھی ہیں جن کے ساتھ یہ رویہ نہیں اختیار کیا گیا۔
- یہ وہ چند پہلویں جو پاکستان پر بڑھتے ہوئے عالمی دباو کے مختلف دائے ہیں، اس کی ایک جھلک ایمنسٹی ائرنسٹشپ کی حالیہ رپورٹ میں دیکھی جاسکتی ہے جس میں پاکستان کے دستور و قانون کی مختلف شقوق کو قابل اعتراض قرار دے کر ان پر نظر ثانی کیلئے زور دیا گیا ہے۔ جبکہ پاکستان کو اپنے تباری دائرے میں شامل کرنے کیلئے یورپی یونین کی عائد کردہ شرائط بھی اس صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں اور یہن الاقوامی معاہدات کا دباو ان سب پر مستزاد ہے۔ ستھم کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے کسی مسئلہ پر ان میں سے کسی ملک سے بات کی جائے تو ان کا دو ٹوک جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے قومی مفاد کے دائے میں ہی بات کر سکتے ہیں، ہماری پالیسیاں عوام کے منتخب نمائندے طے کیا کرتے ہیں، ہم اپنے ملک کے دستور و قانون سے باہر نہیں جاسکتے، ہماری تہذیبی اقدار اور قومی روایات ہی ہمارے اصل راہنماء ہیں۔ مگر جب پاکستان اور دیگر

مسلم ممالک کی بات ہوتی ہے تو قومی مفاد، منتخب نمائندوں کے فیصلے، دستور و قانون کی بالادستی اور قومی و تہذیبی روایات کی ساری دلیلیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ایک ہی بات حرف آخر قرار پاتی ہے کہ وہ کرو جو ہم کہہ رہے ہیں ورنہ ہمارے غنیظ و غصب اور کارروائیوں کا نتیجہ ہے جس کا عملی مشاہدہ افغانستان اور عراق میں لاکھوں انسانوں کے قتل عام کی صورت میں کیا جا چکا ہے۔

دوسری طرف ہمارا معاملہ یہ ہے کہ اس دباؤ بلکہ جب اور دھاندنی کا احساس تو پایا جاتا ہے لیکن ہم اس کا سامنا طبقات کی صورت میں الگ الگ کر رہے ہیں:

- عسکری قویں اپنے دائرہ کے دباؤ میں اپنی صلاحیت کے تحفظ کی فلکر میں ہیں۔
- معاشی اور اقتصادی حلقة اس دباؤ میں سے اپنے لیے راستے ملاش کر رہے ہیں، جنہیں کہ شرعی و دستوری تقاضے کے باوجود سودی نظام سے خاتمه کی کوئی راہ بھی دکھائی نہیں دے رہی۔
- مذہبی اور نظریاتی حلقة اس دباؤ کے مقابلہ میں صرف اپنی حد تک مورچہ زن ہیں۔ جبکہ مغربی ثقافت کی ترویج و اشتاعت میں حصہ لینے والوں کیلئے حوصلہ افزائی اور مراعات لیکن دینی اقدار کیلئے کام کرنے والے گروہوں کیلئے خوف وہ اس اور کرکٹشی کا ایجاد کا فرمان ہے۔
- سیاسی علقوں کو سرے سے اس کی کوئی فکر ہی نہیں ہے، انہیں صرف کرسی چاہیے اور لوٹ کھسوٹ کے موقع میسر ہونے چاہیے وہ جس راستے سے ملیں اور جس ذریعے سے آئیں انہیں اس کے علاوہ اور کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔

میرے خیال اور مشاہدہ میں ذوق القمار علی بھٹو مر حوم اور جزل ضیاء الحق مر حوم کے بعد سے ہمارے کسی حکمران کا کوئی سیاسی و ڈن اور ایجاد نہیں ہے۔ بھٹو مر حوم اور ضیاء الحق مر حوم کے سیاسی و ڈن کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کا و ڈن اظہر ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتا ہے، اگرچہ میری رائے میں ایسا نہیں ہے، لیکن یہ بات طے ہے کہ ہمارے یہ دونوں مر حوم لیڈر پاکستان اور عالم اسلام کیلئے ایک واضح ایجاد کر کتے تھے جس کیلئے وہ پوری طرح مصروف عمل تھے۔ ان کے بعد اقتدار، کرسی اور لوٹ کھسوٹ کے موقع کے سوا پاکستان کے سیاسی ماحول میں کسی کا کوئی و ڈن اور ایجاد دکھائی نہیں دے رہا۔

برطانوی نوآبادیاتی دور میں بر صیری کی سینکڑوں ریاستوں نے محمد و دسی داخلی خود مختاری پر قناعت کر کے باہر اور اوپر کے سارے معاملات برطانوی حکومت کے سپرد کر کے تھے۔ مجھے آج کی صورتحال اور ان ریاستوں کی حالت میں اس کے سوا عملی طور پر کوئی فرق دکھائی نہیں دے رہا کہ اس دور میں مسلم ریاستوں کو اپنے داخلی ماحول میں شرعی عدالتوں کے قیام اور شرعی قوانین کے نفاذ کی اجازت حاصل تھی جو کہ اب ہمارے لیے قابل عمل نہیں رہی، اس لیے کہ ہم قانون و تعلیم کے شعبوں میں بھی بیرونی ایجاد کے پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس پس منظر میں میاں محمد نواز شریف کے اس ارشاد سے اتفاق کرتے ہوئے ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ

پاکستان کے خلاف عالمی دباؤ کا سچ تناظر میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس کا سامنا طبقاتی ماحول نہیں بلکہ قومی ماحول میں کرنا ضروری ہے۔ اگر اس عالمی دباؤ کے متنوع دائروں کے پیچھے ماسٹر مائنڈ اور کنٹرول روم ایک ہے تو اس کا سامنا کرنے کیلئے طبقاتی دائروں سے نکل کر مشرکت کے ماسٹر مائنڈ اور کنٹرول روم کا اہتمام بھی وقت کا ناگزیر تقاضا ہے۔

## صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا بیان اور امریکی قیادت کی نفسیات

روزنامہ اسلام، لاپور۔ ۶ جنوری ۲۰۱۸ء

صدر ٹرمپ کے بیان پر پاکستانی قوم نے جس متفقہ موقف اور عمل کا انہیار کیا ہے وہ قومی و قاری اور حمیت کا ناگزیر تقاضہ ہے اور امریکہ کیلئے واضح پیغام ہے کہ بس! اب بہت ہوچکی ہے اور اس سے آگے کوئی بات قابل برداشت نہیں ہوگی۔ ٹرمپ کا کہنا ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو ان کے بقول گذشتہ پہندرہ سال کے دوران تینتیس ارب ڈالر دیے ہیں لیکن پاکستان نے دو غلے پن سے کام لیا ہے اور امریکہ کی توقعات کو پورا کرنے کی وجہے جھوٹ اور فریب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں پاکستانی حکومت کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ یہ مبینہ رقم جو ابھی تک پوری ادابی نہیں ہوتی، خیرات یا امدادرست نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کے خلاف مشترکہ جنگ کے اخراجات میں امریکہ کا واجب الادا حصہ ہے جسے امدادرست یا دینا درست نہیں ہے اور ہم اس رقم کا پورا حساب رکھتے ہیں، جبکہ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جو قربانیاں دی ہیں اور جو اقدامات کیے ہیں انہیں تسلیم نہیں کیا جا رہا۔

اس کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی، عسکری اور دینی حلقوں کی طرف سے امریکی صدر کے اس بیان کو مسترد کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور پارلیمنٹ بھی اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے رہی ہے۔ پاکستان کی حکومت، مختلف حلقوں اور اداروں کے اس ”ڈپلومیٹک سائننس“ سے کامل اتفاق اور اس کی بھروسہ تائید کرتے ہوئے ہم اس مسئلہ کا ایک اور پہلو سے جائزہ لینا چاہتے ہیں جس کا تعلق موجودہ امریکی قیادت کی نفسیات اور ذہنی طبع سے ہے اور اس حوالے سے ایک غیر رسمی مکالمہ کا حوالہ دینا چاہوں گا جو امریکی اداروں کے بعض افراد کو خود میرے ساتھ ہوا تھا۔

کم و بیش دس سال قبل کی بات ہو گی کہ میں ان دونوں امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے نواح میں شماں ورجینیا کے علاقہ اسپرنگ فیلڈ کے ایک دینی مرکزدار الہدیٰ میں قیام پذیر تھا اور مختلف حوالوں سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا کہ کچھ حضرات ملاقات کیلئے تشریف لائے جو ایشیان تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ ہمارا تعلق اسیٹ ڈیپارٹمنٹ سے ہے اور ہم آپ کے ساتھ کچھ مسائل پر گفتگو کیلئے آئے ہیں۔ میں نے خیر مقدم کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں اس کیلئے حاضر ہوں۔ انہوں نے ایک مسئلہ یہ چھیڑا کہ دہشت گردی دنیا بھر میں پھیلی جا رہی ہے اور اس پر قابو پانے کی کوئی صورت کامیاب نظر نہیں آ رہی، ہم بھتی ہیں کہ اس عسکریت اور دہشت گردی کا سرچشمہ وہ جہاد افغانستان ہے جو سوویت یونین کے خلاف کم و بیش ایک عشرہ تک جاری رہا اور اس میں دنیاۓ اسلام کے مختلف حصوں سے آگرہزاں مسلمانوں نے عملاً حصہ لیا اور وہاب دنیا بھر میں اس عسکریت کو پھیلانے کا باعث بن رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کی کیا

را کے ہے؟

میں نے گزارش کی کہ ہمیں اس سلسلہ میں حقیقت پسندی سے کام لینا ہو گا اور معروضی حقائق کی بنیاد پر صورتحال کا تجویز کر کے مسئلہ کا حل بکالنا ہو گا اور نہ ہم کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح مداخلت کے خلاف افغان عوام نے قومی خود منماری اور دینی شخص کی بجائی کیلئے جہاد افغانستان کے عنوان سے بغاوت کی تھی جس میں امریکہ اور عالمی برادری نے ان کا ساتھ دیا تھا اور سیاسی و اخلاقی سپورٹ کے ساتھ ساتھ بھرپور ملی و عسکری امداد بھی دی تھی۔ اس جنگ میں پاکستان کا حصہ سب سے بڑا تھا کہ لاکھوں افغان مہاجرین نے پاکستان میں پناہ حاصل کی تھی جبکہ ہزاروں پاکستانی نوجوان اس جنگ میں عملہ شریک ہوئے تھے۔ افغان روس جنگ میں کامیابی اور سوویت یونین کی پیساپائی کے بعد جہادی کیپ کے چاروں فرقیں (۱) مجاہدین افغانستان (۲) امریکہ اور دیگر عالمی جماعتیں (۳) پاکستان کی جہادی تنظیمیں اور ان کے پشت پناہ ادارے (۴) مختلف ممالک سے آنے والے ہزاروں مجاہدین یا ہمیں طور پر مغالطوں اور تنظفات کا شکار ہو گئے جس سے سب کارخ الگ ہو گیا۔ اور اس کے بعد اب تک جو کچھ ہوا ہے، ہو رہا ہے یا ہونے جا رہا ہے اسی کا شاخانہ ہے۔

امریکہ اور اس کے حواریوں کو یہ مغالطہ تھا کہ ہم نے ان مجاہدین کو پیسے دے کر سوویت یونین کے خلاف ان سے جنگ لڑوائی ہے اور انہیں یہ موقع تھی کہ ان کے اگلے ایجنڈے میں بھی یہ مجاہدین اسی طرح ان کا ساتھ دیں گے، وہ مجاہدین کو کارے کے سپاہی سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ صورتحال اس کے بر عکس تھی، مجاہدین کا اپنا ایجنڈا تھا اور اپنے نظریاتی اور قومی اہداف تھے جو امریکہ کے اگلے علاقائی ایجنڈے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے بلکہ اس سے متصادم تھے۔

دوسری طرف مجاہدین کی بڑی تعداد کا خیال تھا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغان عوام کی اس جنگ کو آزادی اور خود منماری کی جنگ سمجھ کر ان کا ساتھ دیا ہے، وہ آج کے امریکہ کو جارج واشنگٹن، ابراہام لنکن اور تھامس جیفرسون کا امریکہ سمجھ رہے تھے جو قوموں کی آزادی اور خود منماری کا علمبردار تھا اور انہیں سپورٹ کیا کرتا تھا۔ جبکہ وہ امریکہ تو اسی وقت دنیا کے نقشے سے غائب ہو گیا تھا جب امریکہ بہادر نے جاپان پر ایٹم بم بر سائے تھے اور کوریا اور بیانام کو فون کش کا نشانہ بنایا تھا۔ بہر حال دونوں طرف کے ان مغالطوں نے جہاد افغانستان میں شریک فریقوں کے راستے نہ صرف الگ الگ کر دیے بلکہ انہیں ایک دوسرے کے خلاف جماڑا کر دیا اور یہ جماڑا کرنی دن بدن پھیلتی جا رہی ہے۔

میں نے ان حضرات سے گزارش کی کہ اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ جہاد افغانستان جسے دنیا میں عسکریت یاد ہشت گردی کی موجودہ ہمہ گیر اہر کا سرچشمہ سمجھا جا رہا ہے اس میں شریک تمام فرقیں ایک دوسرے کا وجود تسلیم کریں، ایک دوسرے کے کردار کا اعتراف و احترام کریں اور مل بیٹھ کر اس مسئلہ کا حل بکالیں جو ان کی مشترکہ جدوجہد اور جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے اور جس نے پوری دنیا کو بد امنی کی جواناگاہ بنادیا ہے۔

اس کے ساتھ ایک بات میں نے یہ بھی عرض کی کہ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی یہ حکمت عملی چلی آ رہی ہے کہ کسی بھی تنازع یا معاملہ میں فرقیں مخالف سے گفتگو اور مذاکرات کیلئے اصل فرقی سے بات کرنے کی بجائے میز کی دوسری طرف بھی اپنی مرضی کے افراد کو بھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے معاملات طے نہیں ہو پاتے۔ یہاں یہ حکمت عملی نہیں

چلے گی بلکہ جہاد افغانستان کے تینجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کیلئے جہاد افغانستان کے اصل فریقوں کو مل بیٹھنا ہوگا، ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا اور ایک دوسرے کے کردار کا اعتراف کرنا ہوگا۔ اگر امریکہ اس کیلئے تیار ہے تو اس کی راہ ہموار کرنے کی محنت کی جاسکتی ہے ورنہ وہی کچھ ہوتا ہے گا جو اب ہو رہا ہے۔

یہ ایک مسئلہ تھا، دوسرے دو مسئللوں کی بات پھر کسی وقت عرض کی جائے گی، ان حضرات نے تو اس کے بعد اب تک اس گفتگو کو آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ البتہ اس موقع پر ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ امریکہ سے بات کرتے ہوئے اس کی موجودہ قیادت کی نفیات اور ذہنی سطح کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

## ملالہ دیوی اور قندوزو کشمیر کے شہداء

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۵ اپریل ۲۰۱۸ء

ملالہ دیوی کی ولن وطن واپسی اور قندوز کے دینی مدرسہ پر امریکی ڈرون حملہ کی خبریں ایک ہی دن قومی اخبارات میں پڑھنے کو ملیں اور ڈہن میں ان دونوں خبروں کے باہمی تعلق کے حوالے سے کئی سوالات گردش کرنے لگے۔ دیوی کے درشن میں ہمارے محترم وزیر اعظم شریک تھے اور یہ خبریں بھی سامنے آئیں کہ ملالہ نے کہا ہے کہ میں وزیر اعظم نہیں بننا چاہتی، جبکہ مستقبل میں وزیر اعظم کے عہدہ کے ایک بڑے امیدوار سیاستدان نے کہا ہے کہ وہ اسے وزیر تعلیم بنایں گے۔

سوشل میڈیا میں ثابت اور متفق دونوں پہلوؤں سے بہت کچھ پڑھنے میں آیا اور مجھے تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر ایک صدقی قبل کا وہ منظر یاد آگیا کہ جب خلافت عنانیہ کا تیپاچھے کرنے کے بعد مشرق و سطی کے بہت سے خاندانوں کو اس علاقے کی بندربانٹ میں شریک کر کے ان کی خاندانی حکمرانی کو جمہوریت کے علمبرداروں نے ان کا حق قرار دے دیا تھا اور ان کے ساتھ باتفاق معاہدات کیے تھے کہ یہ خاندان عالمی آقاوں کے مفادات کی تگہبائی کریں گے اور اس کے پرے میں یہ آقا ان کی خاندانی حکومتوں کو تحفظ دیتے رہیں گے تو مصر، لیبیا، عراق، یمن اور بعض دیگر علاقوں کے خاندانی حکمران فوجی اور عوامی بغاوتوں کا سامنا نہ کر سکے اور منظر سے غائب ہو گئے۔ جبکہ بعض خاندان بدنستور ان معاہدات کے مطابق پوری وفاداری کے ساتھ حکمرانی کر رہے ہیں اور حق الخدمت بھی ادا کرنے میں مصروف ہیں۔ مثال کے طور پر شام کے حکمران خاندان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ موجودہ صدر بشار الاسد کے دادا کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا کہ شام کی سنی مذہبیت اور علیت کو کارنر کرنے یا کم از کم کنشروں میں رکھنے کیلئے وہ شام کاظم سنبھالیں گے۔ ایک مذہبی اقلیت سے تعلق رکھنے کے باوجود اس خاندان کو جس طرح اقتدار میں لایا گیا یہ عالمی حکمرانوں کی چاکرستی اور مہارث کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دادا کے ساتھ معاہدہ کے بعد بشار کے والد حافظ الاسد کو شام سونپ دیا گیا اور اس نے شام کو بہر حال اپنے ڈھب پر لگالیا۔ اب اس خاندان کی تیسری پشت بشار الاسد کی صورت میں اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے اور بالآخر تو یہ اپنے تمام تر اختلافات اور باہمی معاہدات کے ٹکڑا کے باوجود بشار الاسد کے ہر حال میں تحفظ پر نہ صرف پوری طرح متفق ہیں بلکہ عملاً کر بھی رہی ہیں۔

اسی آئینے میں مشرق و سطحی کے دیگر خاندانی حکمرانوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور تاریخ کے جن طلبے نے ان خاندانوں کے ساتھ عالمی حکمرانوں کے وہ معاهدات پڑھ رکھے ہیں وہ اس بات پر ان سب کو داد دینے پر مجبور ہیں کہ ایک صدی قبل کے ان معاهدات کے کم و بیش بھی فریق پوری دل جنمی کے ساتھ نسل درسل ان کے پابند ہیں اور حق و فقاری ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے موقع پر کسی خاندان سے تو اس قسم کا معاهدہ ممکن نہیں تھا البتہ ایک خود ساختہ مذہبی اقلیت کو اس کیلئے تیار کیا گیا اور نوزائدہ ملک کی بآگ ڈور اس کے پاٹھ میں دینے کے سارے جتنی کیے گئے۔ جس کی ایک جملہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مر حوم کے اس تبصرہ میں دیکھی جاسکتی ہے کہ قادیانی گروہ اس ملک میں وہ حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے تاکہ ملک کی کوئی پالیسی اور فیصلہ ان کی منشا کے خلاف طے نہ ہونے پائے۔ مگر پاکستان کا مولوی مشرق و سطحی کی مذہبی قیادت سے مختلف تکال اور یہ ٹیڑھی پلی والا مولوی اس منصوبے میں کتاب کی ہڈی بن گیا، اس نے نہ صرف بھرپور مزاحمت کی بلکہ مسلسل محنت کے ساتھ پوری قوم کو اپنا ہمنوابالیا اور شام کی طرح پاکستان میں ایک معمولی مذہبی اقلیت کے ہاتھ میں پورے ملک کی بآگ ڈور تھما دینے کا منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔

اس پس منظر میں ملالہ دیوی کے عالمی پروٹوکول اور اسے دھیرے دھیرے آگے بڑھاتے ہوئے اس کے مند سے ملک کا وزیر اعظم بننے اور نہ بننے کی باتیں سن کر بساو قات ہنسی آنے لگتی ہے کہ ”نوبت بایں جارید“۔ گذشتہ روز وزیر اعظم اور وزیر تعلیم کے حوالے سے مذکورہ خبریں پڑھ کر دوسری جنگ عظیم کے دوران کا ایک لطیفہ ذہن میں تازہ ہو گیا کہ برطانوی فوج کیلئے پنجاب میں جری بھرتی کے دوران ایک میراثی خاندان کا نوجوان بھی پکڑ کر بھرتی کر لیا گیا اور اس کی ماں فریاد لے کر بھرتی آفس پہنچ گئی اور کہا کہ مجھ غریب عورت کے میئے کو آخر کیوں پکڑ لیا گیا ہے؟ بھرتی افسرنے اس عورت سے پوچھا کہ کیا وہ اس اعزاز کو پسند نہیں کرتی کہ اس کا میراثی برطانیہ عظمی کی ملکہ معظمہ کی فوج کا سپاہی بنے؟ اس خاتون نے جواب دیا کہ مجھے اس پر اعتراض تو نہیں ہے مگر جب معاملہ اس نوبت تک آپنچا ہے تو ملکہ معظمہ کو میرا مشورہ ہے کہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اب جرمنوں سے صلح ہی کر لے۔

بہر حال اس فضای ملالہ دیوی پاکستان کا چار روزہ دورہ مکمل کر کے اپنے خاندان سمیت وطن واپس سدھا رکھی ہے مگر اس کے چلتے ہی قوم کو قندوز کے دینی مدرسے پر امریکی ڈرون حملہ میں قرآن کریم حفظ کرنے والے سو سے زائد بچوں کی شہادت کی خر بھی مل گئی ہے جو شاید ملالہ دیوی کو الوداعی سلامی کی کوئی صورت ہو۔ جہاں تک ان مقصوم بچوں کی مظلومانہ شہادت کا تعلق ہے وہ اسی تگ دو کا تسلسل ہے جو غیر و جسور افغان قوم پہلے ایک عرصہ تک سوویت یوینین کی فوجی جاریت اور پھر امریکی اتحادی شکر کشی کا سامنا کرتے ہوئے گذشتہ تین نسلوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ اور اس با حیثیت قوم نے دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ یہ مزاحمت افغانستان کی سر زمین پر بیر و نی جاریت کے مکمل خاتمه اور اس کے آئندہ امکانات کے سدابات تک بہر حال جاری رہے گی۔ افغانستان کے ان شہداء کے ساتھ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی جاریت کا شکار ہونے والے مظلوم کشمیر شہداء کا تازہ خون بھی شامل ہو گیا ہے کہ وہ بھی بھارت کی فوجی جاریت کا سامنا کر رہے ہیں اور اپنے وطن کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم قندوز اور مقبوضہ کشمیر کے شہداء کی تازہ ترین قربانیوں پر انہیں خراج

عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کا خون رائیگال نہیں جائے گا اور اس سے کشمیر اور افغانستان کی آزادی کی منزل ان شاء اللہ تعالیٰ قریب آئے گی:

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

## موجودہ صورتحال میں افغان طالبان کا موقف

روزنامہ انصاف، لاپور--- ۶ جون ۲۰۱۸ء

امریکی وزیر خارجہ مائیک پومیونے گذشتہ دونوں سینیٹ کی خارجہ امور سے متعلقہ کمیٹی کو بریفنگ دیتے ہوئے افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کے سلسلہ میں نئی حکمت عملی اختیار کرنے کا عندیہ دیا ہے جس کا بنیادی نکتہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ طالبان کو مذاکرات پر لانے کیلئے ہر مرکن دباوڈا لاجائے گا۔ اور اس سلسلہ میں ان کے بقول افغان طالبان کی صفوں میں ”درست قیادت“ کی شاخت کی ضرورت ہے جو امن مذاکرات میں شرکت کر سکے۔

افغان طالبان کے ساتھ براہ راست مذاکرات کی کوشش اور انہیں بہر صورت مذاکرات کی میز پر لانے کی اس مہم سے اتنی بات تو واضح ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی عسکری میدان میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں اور اب وہ مذاکرات کی میز پر طالبان کو اپنے ایجادنے میں سیٹ کرنے کی تگ دوکر رہے ہیں۔ جہاں تک مذاکرات کا تعلق ہے وہ تو اچھی بات ہے کہ ایسے معاملات کا فیصلہ بالآخر مذاکرات کی میز پر ہی ہوتا ہے لیکن اس کیلئے طالبان پر ہر مرکن دباوڈا لانے کے ساتھ ان کی صفوں میں ”درست قیادت“ کی شاخت کی بات عجیب ہے۔ گویا امریکہ بہادر مذاکرات کی میز پر طالبان کی نمائندگی کیلئے لوگوں کو لانے کا خواہ شندہ ہے جو اس کے مطلب کے ہوں اور اس کے ایجادنے کو مذاکرات کے فیصلوں کی شکل دینے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ جبکہ ہماری معلومات کے مطابق طالبان کی صفوں میں ایسی ”درست قیادت“ کو صرف شاخت نہیں کیا جا رہا بلکہ اسی قیادت تیار کرنے کی کوششیں بھی ایک عرصہ سے جاری ہیں جو کامیابی سے ہمکار نہیں ہو رہیں اور نہ ہم مستقبل قریب میں اس کی کوئی توقع نظر آتی ہے۔

انہی میں سے ایک کوشش یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے کچھ نہ ہی حلقوں اور علماء سے یہ کہلوایا جائے کہ افغان طالبان جو کچھ کر رہے ہیں وہ شریعتِ اسلامیہ کا تقاضا نہیں ہے بلکہ ان کے خیال میں شریعت کا حکم یا تقاضا یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا جائے اور وہ مذاکرات کی میز پر جو ایجادنہ بھی پیش کریں اسے ان کی مہربانی سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اس حوالے سے دنیا کے مختلف حصوں میں ”علماء کافرنسوں“ کا ایک جال پھایا جا رہا ہے جن میں سے ایک کافرنس اندومنیشن میں ہو چکی ہے اور اس کی خبریں پریس کی زینت بن چکی ہیں۔ اس حوالے سے افغان طالبان کی ”امارتِ اسلامیہ افغانستان“ کی طرف سے دنیا بھر کے علماء اسلام کے نام ایک خط کھبوایا گیا ہے جو ان کے موقف کی وضاحت کرتا ہے مگر عالمی اور علاقلی اور میڈیا افغان طالبان کے خلاف ہمہ نوع خبروں اور تہرسوں کی بیغار کے ماحول میں ان کے موقف کو تھوڑی سی جگہ دینے کیلئے بھی تیار نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ہر لحاظ سے ان کا جائز اور مسلمہ حق ہے کہ ان کے

موقف کو ان کی زبان میں سامنے لایا جائے اور انہیں یک طرفہ میڈیا یا لیغار کے ماحول سے نکالا جائے۔ اس خیال سے ہم امارتِ اسلامی افغانستان کے اس کنٹوب کو اپنے کام کا حصہ بنارہے ہیں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے بارے میں خود کیا کرتے ہیں۔

”قابل قدر علمائے کرام و مشائخ عظام!

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے امید ہے آپ صحت و عافیت کے ساتھ ہوں گے۔ ہم امارتِ اسلامی افغانستان کے منسوبین و متعلقین اور تمام افغان عوام کی نمائندگی کے ساتھ نیک تمثیلیں اور اسلامی اخوت کی محبتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ افغانستان گذشتہ سترہ سال سے وقت کے سب سے بڑے طاغوت امریکہ کی جاریت کا شکار ہے۔ امریکہ چاہتا ہے افغانستان اس کی ایک مقبوضہ ریاست بن جائے، وہ یہاں عسکری مرکز اور ایمیل جنس اٹوے قائم کرے تاکہ جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا اور مشرق وسطی کے سامنے پرواقع اسلامی دنیا کے اہم ترین خطے افغانستان کی اسٹریٹیجک حیثیت استعمال کر کے عالم اسلام کو کمزور اور ختم کرنے کی سازشیں کر سکے۔ اگر امریکہ افغانستان سے متعلق اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی شہر نہیں کہ اس سے پاکستان، ہندوستان، وسطی ایشیا اور عرب ممالک میں بھی اسلامی فکر، مدارس دینیہ، علمائے کرام اور دین دار مسلمانوں کے مصائب و مشکلات میں اضافہ ہو گا۔ مذکورہ ممالک کی مسلم آبادی بھی مغربی شیطانی دسیسہ کاریوں کا ہدف بنے گی، لادینیت اور گمراہی، زور پکڑے گی، مغرب کی حمایت و تعاون سے سیکولر طبقہ اور فساق و فجار مضبوط ہوں گے، امت مسلمہ کے زوال کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گا۔ ماضی قریب کے عظیم مفکرین علامہ اقبال، شکیب ارسلان اور دیگر نے افغانستان کو ایشیا اور اسلامی دنیا کا دل قرار دیا ہے، اگر خدا نخواستہ امریکہ مسلم دنیا کا دل اجائزے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اس طرح امت مسلمہ اور دینی مسلسلوں کو ناقابلٰ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسلام کے سچے پیروکاروں کے خلاف موجود خطرات میں کئی گناہ اضافہ ہو گا۔

تاریخ کے اس خطرناک موڑ پر مجات کا راستہ یہ ہے کہ افغانستان میں امریکی جاریت کے خلاف امارتِ اسلامیہ افغانستان کی جہادی صفت کو مضبوط کیا جائے، اسے جانی، مالی، اخلاقی اور روحانی تعاون اور حمایت بھم پہنچائی جائے۔ اللہ الحمد! امارتِ اسلامیہ کے مجاهدین نے ۷۸ تک ۲۸ کفری جارح قوتوں کے خلاف استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے اب بھی برطانیہ اور سوویت یوینین کی طرح امریکی جاریت کو شکست دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں امریکہ

افغانستان میں کامیاب ہونے کیلئے سترہ سالہ دور میں اپنی تمام تر عسکری طاقت آزمائچا ہے۔ وہ اپنے اسلحہ گودام کے تمام تر خطرناک ہتھیار استعمال کرچا ہے۔ ہر طرح کی حکمت عملیاں بروئے کارلاچا ہے۔ جب کہ کامیابی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ گذشتہ سال اسلام و عالم اسلام کے سخت دشمن امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے افغانستان کیلئے اپنی نئی حکمت عملی سامنے لائی۔ ٹرمپ کی حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر افغانستان میں امریکی درندہ صفت فوج کے سربراہ جزل نیکولس نے ۱۸ مارچ ۲۰۱۸ء کو ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا:

”امریکہ اس سال طالبان (امریکت اسلامیہ) پر مختلف طریقوں سے دباؤ بڑھانا چاہتا ہے۔ ہم طالبان پر عسکری، سیاسی، جنگی کہ مذہبی دباؤ بھی ڈالیں گے تاکہ وہ جگہ سے دستبردار ہو جائیں۔ مذہبی دباؤ سے میرا مطلب یہ ہے کہ افغانستان، پاکستان اور پکھ دیگر ممالک کے مسلم علماء کی کانفرنس منعقد کی جائیں گی، ان کانفرنسوں میں طالبان کے خلاف فتویٰ جاری کر کے ان کے جہاد کی شرعی حیثیت کو اسلامی نکتہ نگاہ سے چینچ کیا جائے گا۔“

اب جب کہ ان کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ عنقریب کابل، اسلام آباد اور سعودیہ میں بھی ایسے اجتماعات منعقد کیے جائیں گے، ہم علمائے کرام اور مشائخ عظام سے یہ درخواست اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اس جیسی کانفرنسوں میں شرکت مختص سے بھی احتراز کیا جائے۔ کیوں کہ سمجھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ اگرچہ اس کانفرنس کا موضوع اور عنوان دینی ہے، اس میں عالم اسلام کے مسائل پر بھی بات کی جاتی ہے، اسے مسلم علماء کی مجلس قرار دیا جاتا ہے، مگر اس کا ہدف اور مقصد غلط ہے۔ اس کا اصل محرك اسلام کا شدید مخالف امریکہ ہے۔ وہ چاہتا ہے ان کانفرنسوں کے ذریعے افغانستان میں جاری جہاد کو کمزور کیا جاسکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علمائے کرام اس طرح کی کانفرنسوں میں جس نیت سے بھی شریک ہوں، جس مجبوری کی وجہ سے بھی شرکت کریں، دشمن بہر حال آپ کی وہاں شرکت مختص سے بھی فائدہ اٹھائے گا۔ ایسے اجتماعات میں علمائے کرام جتنی بھی حق بات کہہ لیں، دشمن اسے کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ دشمن کانفرنس کی انہی باتوں کو اچھا کر پروپگنڈا کرے گا جو اس کے حق میں ہوں گی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ انڈونیشیا کانفرنس میں کچھ شیوخ کرام نے کتنی اچھی اور معقول باتیں کہیں مگر میڈیا یا نے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ حتیٰ کہ ان پر سرسری تبصرے سے بھی گریز کیا گی۔ صرف وہی کچھ میڈیا اسکرین پر نمائیں کیا جو امریکی مفاد میں تھا۔ حتیٰ کہ بعد ازاں علماء کو بدنام کرنے کیلئے یہ بات بھی پھیلانی لگی کہ کابل انتظامیہ اور انڈونیشیا حکومت نے علماء کو ڈالروں کے پیکٹ دیے تھے۔ یعنی امریکہ ہر حال میں اپنے شیطانی مقاصد کی

تکمیل چاہتا ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی کانفرنسوں میں شرکت علماء کرام کی معاشرتی سماں کو نقصان پہنچاتی ہے جس سے علماء، طبائع، عام مسلمان اور محبوبین کے درمیان بداعتمادی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے جن قابل قدر علمائے عظام نے ساری زندگی مدرسہ و مسجد کے استغناء میں گزار دی ہے جو کہ اللہ فی اللہ امت مسلمہ کے شان دار مستقبل کیلئے ایک عظیم دینی خدمت ہے، ایسی مجالس میں شرکت سے ان کی سالہا سال کی محنت و مشقت سے قائم ہونے والا شخصی و دینی و قارضائی ہو کر رہ جاتا ہے، ان کی شخصیت کا احترام کمزور ہو جاتا ہے، نتیجہً عوام میں ان کا تعارف، حکومتی اور درباری ملا والابن ہو جاتا ہے۔ ہماری نظر میں اسلام، مسلمانوں اور خود علمائے کرام کی عزت و توقیر اور خیر و بھلائی اس میں ہے کہ ایسی مجالس سے گریز کیا جائے تاکہ اسلام دشمن تو قیں انہیں اپنے شیطانی اہداف کیلئے استعمال نہ کر سکیں۔ اللہ رب العزت ہم اور آپ سب کو شمن کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ فرمائے، آمین یارب العالمین۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

امارت اسلامیہ افغانستان“

## افغان حکومت اور طالبان کے مبینہ مذاکرات: دو اہم موقف

روزنامہ اسلام، لاپور ۱۳ جولائی ۲۰۱۸ء

۱۴ جولائی کے قومی اخبارات میں اے ایف پی کے حوالے سے شائع ہونے والی خبر میں بتایا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں او آئی سی کے زیر اہتمام ۱۰۰ اکارلز کے لگ بھگ مسلم اسکارلز کے ایک اجتماع میں افغان حکومت اور طالبان سے مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کا حل نکالنے کی اپیل کی گئی ہے۔ جبکہ دوسری طرف امارت اسلامیہ افغانستان نے بھی اس سلسلہ میں اپنا موقف جاری کیا ہے، صورتحال کو معروضی تناظر میں صحیح طور پر سمجھنے کیلئے دونوں کا مطالعہ ضروری ہے اس لیے ہم سردست یہ دونوں موقف قاریئن کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مناسب موقع پر کر دیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

او آئی سی کے زیر اہتمام منعقدہ اسکارلز کانفرنس کا موقف:

”مکہ (اے ایف پی) مکہ مکرمہ میں ہونے والے دروزہ اجلاس میں ۱۰۰ سے زائد مسلم اسکارلز نے افغانستان میں فوری قیام امن کی اپیل کر دی۔ او آئی سی کی طرف سے منعقد کی جانے والی عالمی کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ ہم سب افغان حکومت کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ امن واستحکام کیلئے افغان حکومت اور طالبان کو امن کیلئے مذاکرات کی میز پر بیٹھنا چاہیے، عسکریت پسندوں کی حکومت کے

خلاف جنگ غیر قانونی ہے، عسکریت پسند ہتھیار پھیک کرتومی دھارے میں شامل ہوں اور افغانستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ او آئی سی افغان حکومت کو ہر قسم کی مدد دے گی۔ تنظیم کے سیکرٹری جزل یوسف العشین نے اجلاس کے بعد مذیّیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فریقین فوری عارضی جنگ بندی کا معابدہ کریں اور اس کا احترام کرتے ہوئے برادر است مذاکرات کریں۔

اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کے منعقدہ اجلاس کا مرکزی نکتہ افغانستان میں قیام امن کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ سعودی نیوز ایجنٹی کے مطابق شاہ سلمان نے دنیا بھر سے آئے والے مسلم اسکالرز کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ سعودی عرب افغان مسئلے کا پر امن حل کیلئے پر عزم ہے۔ سعودی اخبار کے مطابق طالبان نے او آئی سی کی جانب سے کہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ نظر انداز کر دیا تھا۔ (روزنامہ دنیا، گوجرانوالہ۔ ۱۲ جولائی ۲۰۱۸ء)

**افغان طالبان کا موقف:**

”سعودی عرب میں علماء کا نفرنس کے حوالے سے امرت اسلامیہ کا اعلامیہ روپور ٹیش شائع ہو رہی ہیں کہ افغانستان سے متعلق عنقریب مملکت العربیہ سعودیہ کے جدہ شہر میں کوئی کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے۔ اس کا نفرنس کے بارے میں امرت اسلامیہ افغانستان درج ذیل چند نکات کو قبل توجہ سمجھتی ہے۔

افغانستان میں امریکی مارب غاصبوں کے خلاف موجودہ جہاد اسلام کی نگاہ سے کفری تہاجم کے خلاف فرض عین دفاعی جہاد ہے۔ دین اسلام کے تمام اصول اور فقہی مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مارب کافروں کی تجاوز کی صورت میں مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ یہ وہ واضح الہی حکم ہے، جس پر ہر بیان شخص کا کامل لیقین ہے۔

افغانستان میں موجودہ جہاد بین الافغانی جنگ یاقتال بین امسلمین نہیں ہے۔ یہ جنگ سترہ سال قبل اس وقت شروع ہوئی تھی، جب امریکہ نے فضائی اور زمینی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے افغانستان پر جاریت کی اور افغان مجاهد عوام نے اس کے خلاف دفاعی جہاد شروع کیا۔ اسی دن سے افغان عوام کے خلاف اس لڑائی کے تمام منصوبہ بندی، پالیسی، اخراجات اور پیشافت امریکہ کے ذمہ ہے، اگر بین الافغانی جنگ ہوتی، تو اس پر ڈیڑھ ٹریلین امریکی ڈالر خرچ نہیں ہوتے، اس میں ہزاروں امریکی فوجیں نہیں مارے جاتیں اور ہزاروں زخمی نہیں ہوتیں۔

فی الحال بھی اس جنگ کی نئی پالیسی امریکی صدر ٹرمپ کی جانب سے ڈیزائن اور عملی ہو رہی ہے اور اس میں طول لانے کی خاطر فوجی بجٹ امریکی کانگرس کی جانب سے منظور کیا جا رہا ہے۔ افغان عوام چشم

دیگواہ کے طور پر مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ان کے سروں پر امریکی ہیلی کاپٹر، ڈرون اور جیٹ طیارے منڈلا رہے ہیں۔ غاصب امریکی افواج کی موجودگی افغان عوام دیکھ کر رہی ہیں۔ یہ بات خفاق سے بہت بعد ہو گئی، جب کسی اور ملک میں افغان مسئلے کو بین الافغانی مسئلہ متعارف کر دیا جائے۔

امریکہ کے وہ حواری جو افغانستان میں غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے، جو اپنے دین، عوام، ملکی اور ملی اقدار کے خلاف لڑ رہے ہیں اور امریکہ ان کا سپورٹ کر رہا ہے۔ استعمار کی جانب ان کی موجودگی جگلی ماہیت کو بدل نہیں دے سکتی، کیونکہ وہ مستقل اور خود مختار لوگ نہیں ہے، بلکہ امریکہ کی جانب سے افغانوں پر مسلط کیے جاتے ہیں، امریکی پالیسی کو اپنارہی ہے، یہ اڑائی ابتداء ہی میں ان کے خلاف شروع ہوئی ہے، وہ مزدور ہیں، جس طرح افغان کمیونسٹوں کی موجودگی نے سویت یونین کے زمانے میں افغان جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ واضح الہی ارشادات موجود ہیں، کہ اگر کوئی مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دیں، تو ان کے خلاف مقابلہ مقدس جہاد ہے۔

امارت اسلامیہ کوئی باغی یاد ہشت گرد گروہ نہیں ہے، بلکہ امارت اسلامیہ 30 میلیون عوام کے اسلامی مطابعے اور حریت پسند مزاحمت کا نام ہے۔ امارت اسلامیہ کی عوام میں گھرے جڑیں ہیں۔ اب ملک کا 70 فیصد رقبے پر مجاہدین کی حکمرانی ہے۔ افغانستان میں امارت اسلامیہ کا افغان عوام کی امنگوں کے مطابق خود مختار اسلامی نظام کا ہدف ہے، امارت اسلامیہ شریعت کی روشنی میں علمی تعلقات، اچھے ہمسائیہ، دوستانہ تعلقات اور اقوام کی مشترکہ پر امن زندگی کا احترام رکھتی ہے اور دنیا کیسا تھے ثابت تعلقات چاہتی ہے۔ یہ بہت نا انصافی اور غیر مІظنی ہو گا کہ ایک مکمل ملت جو مایہ ناز تاریخ کا حامل ہے، وہ دہشت گردی اور بغاوت سے مسکی ہو جائے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے اور انہیں ایسا عمل نہیں کرنا چاہیے۔

ذکر وہ وضاحت کی روشنی میں اگر کوئی بھی صرف امریکی صدر ٹرمپ اور اس کے حامیوں کی خوشی کی خاطر دین کے صریح احکام کو باطل اعلان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ کے مجاہد ملت کو باغی اور دہشت گروہ کہتا ہے۔ یہ عمل امریکی غاصبوں کیسا تھے جا رہیت میں تعاون اور ضعیف مسلمانوں کی بیچنی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ولَا ترکنوا إلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمْسَكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلَيَاءِ ثُلَاثَةٍ  
تنصرون۔ (مودودی ۱۱۳)

نبی زر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من مشی مع ظالم لیقویہ وبویعلم انه ظالم، فقد خرج من الاسلام۔ (رواہ البیهقی)  
افغان عوام کو مملکت سعودیہ کے حکام اور علماء سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ اسلام اور کفر کے درمیان

جنگ میں امریکی غاصبوں کا ساتھ دیں۔ افغان عوامِ اسلامی انوت کی وجہ سے امید کرتی ہے کہ سعودی حکومت روسي کے خلاف جہاد کے ماندراں کٹھن حالت میں بھی افغان مستضعف عوام کا ہاتھ تھام کر ان سے تعاون کریں، افغان عوام اب بھی سعودی عرب کے ان امداد کا مشکور ہے، جب روسي جاریت کے دوران افغان مجاهد عوام کیسا تھکیا گیا تھا۔

جس طرح اسلامی کانفرنس نے کیونزم کے خلاف جہاد میں افغان عوام کی حمایت کی اور افغان عوام تاحال اس کے احسان کا مشکور ہے۔ موجودہ المیہ بھی میں اس کیونٹی کو افغان عوام کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا چاہیے اور افغان عوام کے برحق مزاحمت کی حمایت کریں۔

آخر میں مسلمان عوام اور مجاهدین کو تسلی دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے ناصر اور قادر رب تعالیٰ پر یقین ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے جہاد کو انگریز اور کیونزم کے خلاف کامیاب کیا اور اس وقت کی پر طاقتیں صفر ہوئیں، ان کی تمام سازشیں ناکارہ ہوئیں، اسی طرح امریکی قیادت میں استعمار بھی ناکام اور ذلیل ہو کر رہ گا، ان کی سازشیں ہماری مشروع مزاحمت پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالے گی اور ان کے خلاف افغان عوام کا موجودہ جہاد کامیابی کی ساحل کی جانب بہت سرخروئی سے پہنچ جائیگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وما ذاك على

الله بعزیز

(اماۃ الاسلامیہ افغانستان - ۱۰/۲۵ / ۱۳۳۹ھ - ش - ۱۸/۳/۱۴۳۹ھ - ق)

"2018/7/9"

## خادم الحرمين الشرifين کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۲۰۱۸ء جولائی

آج ۱۶ جولائی کے ایک قوی اخبار نے مکہ کمرہ میں او آئی سی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی مسلم علماء کانفرنس اور دانشوروں کی حالیہ کانفرنس کے حوالے سے خادم الحرمين شریفین شاہ سلیمان بن عبد العزیز حفظہ اللہ تعالیٰ کا ایک بیان شائع کیا ہے جس میں انہوں نے افغانستان میں جلد از جلد امن کے قیام کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے افغان حکومت اور طالبان سے کہا ہے کہ وہ مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کا حل نکالیں اور فرمایا ہے کہ افغانستان میں جلد از جلد امن کا قیام سعودی عرب کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ہم اس سے قبل اس کالم میں مذکورہ کانفرنس کے اعلامیہ کے ساتھ ساتھ افغان طالبان کی "اماۃ الاسلامیہ افغانستان" کا موقف بھی شائع کر کچے ہیں اور آج سعودی عرب کے محترم فرمائز و اکے ارشادات کی روشنی میں انہی کی خدمت میں کچھ مؤدبانہ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

عزت آب شاہ سلیمان بن عبد العزیز عالم اسلام کی محترم ترین شخصیت ہیں اور ان کے نام کے ساتھ خادم الحرمين

شریفین کا عنوان دیکھتے ہی ہر مسلمان کا سر نیاز خود بخوبی جھک جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ افغانستان میں امن کی خواہش ان سے زیادہ کسے ہو سکتی ہے یا کسے ہونی چاہیے؟ مگر تم بڑے ادب و احترام کے ساتھ ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ از راہ کرم اس سلسلہ میں امانت اسلامیہ افغانستان کے موقف پر بھی ایک نظر ڈالنے کی زحمت فرمائی جائے تو مسئلہ کا حل جلد از جلد نکالنے میں سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔

افغان طالبان کا موقف یہ ہے کہ ان کی جنگ افغانستان کے کسی طبقہ سے نہیں بلکہ وہ امریکی اتحاد کی افغانستان میں داخل ہونے والی فوجوں کے خلاف اپنے وطن کی آزادی، خود مختاری اور اسلامی شخص کیلئے اسی طرح لڑ رہے ہیں جس طرح انہوں نے سوویت یونین کے عسکری تسلط کے خلاف جنگ جہاد افغانستان کے عنوان سے لڑی تھی اور دنیا کے بہت سے دیگر ممالک کی طرح سعودی عرب نے بھی انہیں سپورٹ کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کابل کی موجودہ حکومت کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ وہ بیرونی عسکری قوت کے سہارے قائم ہے اور تمام تر عسکری و مالی امداد کے باوجود اسے افغانستان کے تین فیصد رقبے سے زیادہ پر کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ اس لیے وہ مذاکرات کیلئے تیار ہیں لیکن کابل کی حکومت کے ساتھ نہیں بلکہ وہ اصل فریق یعنی امریکہ کے ساتھ مذاکرات کریں گے اور ان مذاکرات کی پہلی شرط افغانستان سے امریکی اتحاد کی فوجوں کا انخلا ہو گا۔

جبکہ دوسری طرف امریکی حکومت کا موقف اس حوالے سے کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل چند باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اسی سال مارچ کے دوران افغانستان میں امریکی فوجوں کے سر برہ جزل نیکلسن نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ہم طالبان پر مذاکرات کیلئے دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ مذاکرات کی میز پر آئیں اور اس کیلئے مختلف ممالک میں علماء کرام کی کانفرنسیں منعقد کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں تاکہ طالبان پر مذہبی حوالے سے بھی دباؤ ڈالا جاسکے۔ اس کے بعد جوں کے دوران امریکی وزیر خارجہ مائیک پومپیو نے بھی امریکی سینٹ کی خارجہ امور سے متعلقہ کمیٹی کو بیرینگ دیتے ہوئے یہی بات کہی تھی کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ طالبان میں ”درست قیادت“ کی شاخت کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں جسے مذاکرات کی میز پر لایا جاسکے۔ جبکہ اگھی ماہ روان کی ۹ تاریخ گو امریکی وزیر خارجہ نے کابل کے ہنگامی دورہ کے موقع پر یہ فرمایا ہے کہ امریکہ طالبان سے مذاکرات کا حصہ بننے کیلئے تیار ہے لیکن طالبان امریکی انخلا کا انتظار چھوڑ دیں۔

اس تناظر میں مسلم حکمرانوں کو اپنے دباؤ کا رخص طالبان کی طرف رکھنے کی بجائے دوسرے فریق یعنی امریکی اتحاد سے بھی بات کرنا ہو گی کہ وہ افغانستان سے فوجوں کے انخلاء کے بارے میں ہٹ دھری چھوڑ کر اصل فریقین کے درمیان با مقصد اور با قرار مذاکرات کی صورت نکالے ورنہ خالی پانی ملوہتے رہنے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ امریکہ بہادر کو یہ بات یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ اس نے ویتنام کی جنگ میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۵ء تک پینتالیس ہزار سے زیادہ امریکی شہریوں کی جانوں کی قربانی کے بعد وہاں کے جنگجوؤں ”بیت کاگ“ سے براہ راست مذاکرات فوجوں کے انخلاء کی شرط پر ہی کیے تھے۔ اور فوجیں نکالنے کے بعد ۱۹۹۶ء میں ویتنام کو جنگی نقصانات کی تلافی کیلئے ۳۲۶ ملین ڈالر کی رقم بھی فراہم کی تھی۔ افغانستان کی یہ جنگ اس سے مختلف نہیں ہے اور اس کیلئے کوئی بکطرفہ الگ معیار قائم کر کے امن قائم نہیں

کیا جائے گا۔

امریکی قیادت کو ایک اور بات بھی یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ غیر ملکی فوجوں کی موجودگی پر اصرار کے ماحول میں کیے جانے والے معاهدات دیرپا نہیں ہوتے جس کی واضح مثال اب سے ایک صدی قبل ترکی کے ساتھ طے پانے والا ”معاہدہ لوزان“ ہے جس میں ترکی سے (۱) خلافت کے خاتمه (۲) شریعت کی منسوخی (۳) اور ترکی سے باہر خلافت کے زیر حکومت رہنے والے علاقوں سے دستبرداری کی شرائط غیر ملکی فوجوں کے زیر سایہ لکھوائی گئی تھیں۔ مگر ترک عوام نے اسے قبول نہ کرتے ہوئے صرف تین عشروں کے وقته سے اسلامی اقدار و روایات کی طرف واپسی کا سفر عنان میندریں شہیدیہ کے دور میں شروع کر دیا تھا جواب تک نہ صرف جاری ہے بلکہ مسلسل پیشہ رفت کر رہا ہے اور حالیہ صدارتی انتخابات کے بعد ترکی اس حوالے سے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کے طور پر ہماری شروع سے یہ رائے رہی ہے کہ یہ معاہدہ جبڑی تھا اور ”گن پونٹ“ پر کرایا گیا تھا مگر اب ترکی کے صدر حافظ رجب طیب اردو گان نے بھی گذشتہ سال اقوام متحده کی جزوں آنہی سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ معاہدہ لوزان ترک قوم کی رائے یہ بغیر جبراً مسلط کیا گیا تھا۔

ہم عزت مآب شاہ سلیمان بن عبد العزیز کی خدمت میں بصد ادب و احترام یہ گزارش کریں گے کہ وہ امریکہ بہادر سے بھی بات کریں اور عالم اسلام کے دیگر حکمرانوں کو ساتھ لے کر معروضی حقائق اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے افغانستان میں قیام امن کی طرف سنجیدہ پیشہ رفت کریں۔ ہم جیسے خدام ان کیلئے دعا گو ہوں گے اور جہاں تک ہمارے بس میں ہواتعاون و خدمت سے بھی گریز نہیں کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ شاہ سلیمان مسلم دنیا کیلئے بزرگ باپ کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ڈرتے ڈرتے ہم ان کی خدمت میں اپنی اس عرضداشت کے ساتھ ایک صدی بات کا اضافہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کیا ب معاهدہ لوزان کی طرح مشرق و سطی میں مغربی طاقتوں کے ساتھ ایک صدی قبل کیے جانے والے دیگر معاهدات پر بھی نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے؟ ہمارے خیال میں یہ امت کی اہم ترین ضرورت ہے مگر یہ درخواست ہم خادم الحرمین الشریفین کے سوا اور کس سے کر سکتے ہیں؟

## مولانا جلال الدین حقانی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۶ ستمبر ۲۰۱۸ء

مولانا جلال الدین حقانی وفات کی خبر دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی گہرے صدمہ کا باعث بنی ہے، ان اللہ و اناللہ راجعون، اور اس کے ساتھ ہی جہاد افغانستان کے مختلف مراحل نگاہوں کے سامنے گھوم گئے ہیں۔ مولانا جلال الدین حقانی جہاد افغانستان کے ان معمازوں میں سے تھے جنہوں نے انتہائی صبر و حوصلہ اور عزم و استقامت کے ساتھ نہ صرف افغان قوم کو سوویت یوینین کی مسلح جاریت کے خلاف صف آرائیکا بلکہ دنیا کے مختلف حصوں سے افغان جہاد میں شرکت کیلئے آنے والے نوجوانوں اور مجاهدین کی سرپرستی کی اور انہیں تربیت و حوصلہ کے ساتھ بہرہ دو کر کے عالم

اسلام میں جذبہ جہاد کی نئی روح پھونک دی۔ ان کا وہ دورہ بیس یاد ہے جب وہ انتہائی بے سروسامانی اور کسپری سی کے عالم میں سوویت یونین کی مسلح فوجوں کے خلاف نبرد آزماتھے اور سوویت یونین کے مخالفین ابھی صرف تماشہ ہی دیکھ رہے تھے، انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خدا مست لوگ آخر کس طرح دنیا کی ایک بڑی فوتو قوت کے خلاف اپنی مزاحمت کو جاری رکھ سکیں گے۔ مگر مولوی جلال الدین حقانی، پروفیسر صغیر صبغت اللہ مجددی، سید احمد گیلانی، مولوی محمد بنی محمدی، مولوی محمد یونس خالص، مولوی ارسلان رحمانی، کمانڈر احمد شاہ مسعود، انجینئر حکمت یار رحمن اللہ تعالیٰ اور ان جیسے دیگر باہمتوں لوگوں نے صبر و استقامت اور ایثار و قربانی کی وہ روایات زندہ کر دیں جن کے ذکرے ہم اسلامی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔

سالہا سال تک یہ کیفیت رہی کہ پرانے ہتھیاروں اور خود ساختہ دیسی بموں کے ساتھ وہ رو سی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے، بوتوں میں خاص قسم کے مخلوق بھر کر انہیں بموں کے طور پر رو سی ٹینکوں کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا اور گوریلا جنگ میں ان مجاهدین نے افغانستان کے دیہی علاقوں میں رو سی افواج کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ شیرالوالہ لاہور میں ہمارے ایک بزرگ مولانا حمید الرحمن عباسیؒ کا مستقل کام یہ تھا کہ اصحاب خیر کو توجہ دلائے ان مجاهدین کیلئے خوراک اور دیگر ضروریات جمع کرتے رہتے اور جب ایک ٹرک کے لگ بھگ سامان جمع ہو جاتا تو خوست کے مخازن پر سپلائی کر دیا کرتے تھے، اسی طرح پاکستان کے بہت سے شہروں کے علماء اور مخیر حضرات مجاهدین افغانستان کی امد اکیار کرتے تھے۔ اس دور میں خوست کے مخازن پر جانے والے چند نوجوانوں نے ہمیں بتایا کہ کئی کئی روز تک سادہ روٹی گڑ اور پیاز کے ساتھ کھانے کو ملتی تھی اور فقر و فاقہ کے ماحول میں وہ مصروف جہاد رہتے تھے۔ امریکہ اور دیگر عالمی طاقتیں یہ دیکھ کر بہت بعد میں اس طرف متوجہ ہوئیں کہ افغانستان کا ایک بڑا حصہ ان مجاهدین کے مختلف گروپوں کے زیر سلطان آگیا ہے اور رو سی فوجوں کی پشت پناہی کے باوجود کابل حکومت کا کثرول چند بڑے شہروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ جب مغربی ملکوں کو ان مجاهدین کی مسلح مزاحمت کی سنجیدگی کا اندازہ ہو تو وہاں میں اپنا حصہ ڈالنے بلکہ ہمارے خیال میں اپنا ”لی“ تلنے کیلئے میدان میں کوڈ پڑے۔ پھر اسلحہ، دولت اور وسائل کی ریل پیل ہو گئی اور اسی گھما گھمی میں امریکی کمپ نے افغان جہاد کو ہائی جیک کر کے اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ ہم نے دونوں دور آنکھوں سے دیکھئے ہیں، وہ دور بھی جب فقر و فاقہ اور خدا مతی کا ماحول تھا اور وہ دور بھی جب وسائل اور اساباب کی فراوانی تھی، دونوں میں برا فرق تھا مگر خدا شاہد ہے کہ جن حضرات نے اس فرق سے ذرہ بھرا تر نہیں لیا اور جن کے خلوص و جذبہ میں دولت و اساباب کی فراوانی کوئی تبدیلی نہ لاسکی ان میں مولانا جلال الدین حقانیؒ سرفہرست تھے۔

جہاد افغانستان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جب تک اس کارخ سوویت یونین کی طرف تھا اور یہ لوگ امریکہ بہادر کے عالمی حریف کے خلاف نبرد آزماتھے، وہ مجاهدین کہلاتے تھے، وائٹ ہاؤس ان کا نیخیر مقدم کرتا تھا اور امریکی کمپ کے مسلم ممالک بھی ان کی راہوں میں دیدہ و دل فرش را ہے کیوں ہوئے تھے۔ لیکن جوئی انہوں نے سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان کے دینی شخص کی بحالی اور نظام شریعت کے نفاذ کو اپنی منزل قرار دیا تو وہ دہشت گرد قرار پائے اور ان کا سب سے بڑا جرم یہ بتایا کیا کہ وہ افغانستان کو ہر قسم کی غیر ملکی مداخلت سے پاک ایک خود مختار ریاست بنانے کی

بات کر رہے ہیں، افغانستان کی قومی و تہذیبی روایات کے تحفظ کی بات کر رہے ہیں اور اپنے ملک میں شریعت کے نظام کے نفاذ کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تینوں ہاتھیں آج کی دنیا میں کسی بھی مسلمان ملک کیلئے جرائم کا درجہ رکھتی ہیں، خود ہمارے ہاں پاکستان میں ان تینوں ہاتھوں پر اصرار کرنے والے لوگ دہشت گرد یا کم از کم شدت پسند کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

مولانا جلال الدین حقانی گاہی بھی ”قصور“ تھا کہ انہوں نے جس طرح افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی جارحیت کو افغانستان کی آزادی پر حملہ تصور کر کے اس کے خلاف مذاہمت کی اور روسی کمیونزم کے نفوذ کو افغانستان کے اسلامی تشخص اور تہذیبی شناخت کے منانی فرادرے کرائے مسترد کر دیا، اسی طرح وہ افغانستان میں امریکی اتحاد کی افواج کی موجودگی اور مغربی فلسفہ و نظام کے سلطان کو بھی افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے وہ سوویت یونین کی فوجوں کی طرح امریکی اتحاد کی فوجوں کے خلاف بھی صرف آرا ہو گئے اور اپنے اس موقف پر آخر دم تک قائم رہے۔ انہوں نے امارت اسلامی افغانستان کا ساتھ دیا اور اس کیلئے مسلسل محنت کی، آج ان کی محنت اور جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ امریکہ افغان طالبان سے مذاکرات کی میز پر آنے کا مطالبہ کر رہا ہے اور اس کیلئے ہر جتن کر رہا ہے مگر افغان طالبان جن کے پاس خود امریکی حقوقوں کی روپرٹوں کے مطابق افغانستان کے بیشتر علاقوں کا کنٹرول ہے، مذاکرات کی میز سجائے سے پہلے افغانستان سے امریکہ کے مکمل انخلاء کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ افغانستان کی آج کی معروضی صور تھال اور نفاذ شریعت کی حقائق اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ افغانستان کی مکمل خود مختاری، غیر ملکی مداخلت سے نجات اور نفاذ شریعت کی جتنک لڑنے والے اس جنگ کی طوالت سے خوفزدہ نہیں ہیں کیونکہ جنگیں ان لوگوں کی سرنشت میں داخل ہیں، البتہ اس فیصلہ کن مرحلہ میں مولانا جلال الدین حقانی آن سے جدا ہو گئے ہیں جو بلاشبہ بہت بڑا صدمہ ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جو اُر رحمت میں جگہ دیں اور افغان قوم کو ان کے مشن اور جذبات کے مطابق مکمل خود مختاری سے بہرہ و فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

اس کے ساتھ ایک اور خبر ہمارے خاندان اور متعلقہ دینی حلقوں کیلئے صدمہ کا باعث بنی ہے کہ جمیع علماء برطانیہ کے رہنماؤں اور جامع مسجد برلنی مائچستر کے خطیب مولانا عزیز الحق ہزاروی گذشتہ روز اول پینٹری کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے ہیں، ان اللہ و انہا الی راجعون۔ وہ ہماری بڑی ہمیشہ کے دادا اور جامعہ نصرۃ الحلوم گوجرانوالہ کے فضل تھے۔ قاریئن سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور اہل خاندان کو صبر جیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

۱۳ ستمبر ۲۰۱۲ء کو روزنامہ وزارت، لاپور میں شائع ہونے والے انشویو کا ایک سوال

وزارت: حقانی نیٹ ورک پر لگنے والے امریکی اڑام کے بعد طالبان کا رد عمل کیا ہو گا؟

جواب: یہ حرہ طالبان پر مذاکرات کے حوالے سے دباؤ ڈالنے کیلئے اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو امریکہ مختلف

حوالوں سے طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہا ہے اور افغانستان کے مستقبل کے نقشہ میں طالبان کے کردار پر گفتگو چل رہی ہے، جبکہ دوسری طرف طالبان ہی کے ایک حصہ حقانی نیٹ ورک کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں حالیہ امریکی اقدامات کا مقصد اس کے سوا اور کیا آجھا جاسکتا ہے کہ امریکہ مذاکرات کے دوران طالبان کو دباو میں رکھنا چاہتا ہے تاکہ مستقبل میں ان کے کردار کو محدود سے محدود تر کیا جاسکے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بے فائدہ بات ہے اس لیے کہ طالبان نے لگزشتہ ۱۰ ابرسوں کی جنگ میں اپنی پوزیشن دنیا سے تسلیم کروالی ہے، لہذا افضلی تواریخ تناظر میں ہوں گے۔

## افغان تنازعہ کا تاریخی پس منظر اور اس کا نیا راؤنڈ

روزنامہ اسلام، لاپور ۲۳ ستمبر ۲۰۱۸ء

پاکستان کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے حالیہ دورہ افغانستان کے بعد افغان تنازعہ ایک نئے دور میں داخل ہوتا دکھائی دے رہا ہے جس سے امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان مذاکرات کی میز بچھانے کیلئے از سرنوکوشوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس مرحلہ میں نئی تجویز اور امکانات کا جائزہ لینے سے قبل اب تک کی مجموعی صورتحال پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری محسوس ہوتا ہے اس لیے ہم اپنے ایک طویل تجزیاتی مضمون کے کچھ متعلقہ حصے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ مضمون ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے نومبر/Desember ۲۰۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور ہماری ویب سائٹ پر ”مذہبی طبقات، دہشت گردی اور طالبان“ کے عنوان سے پڑھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون کے جہاد افغانستان اور امارتِ اسلامیہ افغانستان سے متعلقہ کچھ حصے درج ذیل ہیں:

یہ گزارشات دوبارہ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر افغان تنازعہ کو حل کرنے کی کوشش کرنے والی قوتوں سے سنجیدہ ہیں تو انہیں اس کے اسباب و عوامل، واقعیتی ترتیب اور زمینی حقائق کو پوری طرح سامنے رکھنا ہو گا اور نہ مغض لیا پوچھی سے بالآخر قوتوں کوئی نیا ”جیو امعاہدہ“ تو شاید اقوام متحده کے ریکارڈ میں شامل کر لیں گے اس سے افغان مسئلہ حل نہیں ہو گا اور نہ ہی یہ تنازع ختم ہو سکے گا۔ سرداست ان قوتوں سے، جو امریکہ اور امارتِ اسلامیہ افغانستان کے درمیان مذاکرات کیلئے سرگرم عمل ہیں، ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان کی کوششوں سے اصولی طور پر اتفاق ہے اور ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ با مقصد اور سنجیدہ مذاکرات کے ذریعے یہ مسئلہ جلد حل ہو تاکہ افغان قوم کسی حد تک سکھ کا سانس لے سکے۔ لیکن اس کیلئے ہمارے خیال میں چند فطری اور بنیادی اصولوں کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہو گا، مثلاً یہ کہ:

- افغان قوم کی تہذیبی روایات اور دینی اقدار کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ جب وہ اپنی آزادانہ مرضی سے اپنے لیے شریعتِ اسلامیہ کے عملی نفاذ کا فیصلہ کر رہے ہیں، جس کیلئے اگرچہ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں بے ترتیبی سے کام کیا ہے، لیکن بہر حال ان کی روایتی تہذیب و ثقافت کے تحفظ و تسلیل کو ان کا قومی حق تسلیم کرتے ہوئے ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے اور ان پر بیرونی تہذیب مسلط کرنے سے گریز کرنا اس مسئلہ کے

مستقل حل کیلئے نازیر ہے۔

- بین الاقوامی معاهدات میں ان کی جبری شمولیت کے تاثر کو دور کیا جائے اور انہیں اپنی آزاد و خود منمار قومی حکومت کے قیام کے بعد پرے اطمینان اور عوامی اعتماد کے ساتھ ان معاهدات میں شمولیت کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا جائے۔

- اور سب سے بڑی بات کہ امریکی اتحاد افغانستان میں اپنی عسکری موجودگی برقرار رکھنے کی بے جا صندح چھوڑ دے اور اسے اپنی انکا مسئلہ بنانے کی بجائے افغانستان سے بیرونی نوجوان کی واپسی کی حقیقی تاریخ بخواضخ اور دوٹوک اعلان کرے۔

ہماری خواہش ہے کہ افغان عوام کو اس مسلسل تکلیف کیلئے جلد نجات ملے، مگر یہ ان کے ایمان اور تہذیب کی قیمت پر نہ ہو بلکہ اس کی قومی خود منماری، وحدت و سالمیت اور نظریاتی و تہذیبی شناخت کے تحفظ پر ہو کیونکہ اسی صورت میں یہ مسئلہ مستقل اور پاسیدار طور پر حل ہو سکتا ہے۔

## مولانا سمیع الحق شہید

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۱۵ نومبر ۲۰۱۸ء

۳۱ نومبر منگل کو جامعہ فاروقیہ سیالکوٹ میں حضرت مولانا سمیع الحق شہیدؒ یاد میں تعزیتی سیمینار کا اہتمام تھا جس میں مولانا شہیدؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ عمومی دینی جدو جہد کی صورت حال بھی گفتگو کا موضوع بنتی اور کم و بیش اسی رائے کا اظہار کیا گیا جس کا گوجرانوالہ کے حوالے سے سطور بالا میں ذکر ہوا ہے۔ اس تعزیتی سیمینار میں جمعیت علماء اسلام (س) سیالکوٹ کے امیر حافظ احمد مصدق قائمی، جماعت اسلامی کے راہنمای جناب عبدالقدیر راہنی اور اہل حدیث راہنمای مفتی لفایت اللہ شاکر کے علاوہ رقم الحروف نے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر رقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرت مولانا سمیع الحق شہیدؒ اہل حق کے جری نما نکرہ اور اکابر کی روایات کے امین تھے جن کی المناک شہادت سے ہر باشمور مسلمان دکھی اور غمزدہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کیلئے مولانا سمیع الحقؒ کی جدو جہد اور خدمات کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کی ضرورت ہے تاکہ نوجوان علماء کرام اور دینی کارکنوں ان سے راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس مغل میں چند پہلوؤں کی طرف مختصر اشارہ کروں گا۔

- مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی زندگی کا ایک کامیاب مدرس اور محدث تھے، ان کی ساری زندگی تدریس و تعلیم میں گزری اور ہزاروں علماء و طلبہ نے ان سے استفادہ کیا۔

- ان کی جدو جہد کا ایک دائرہ صحافت اور تصنیف و تالیف کا تھا جس کا انہوں نے ماہنامہ الحق سے آغاز کیا اور دینی

- لڑپر میں مختلف خوالوں سے تیقیت اضافہ کرتے چلے گئے۔ فکری اخداد اور نظریاتی گمراہیوں کا مسلسل تعاقب کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے دینی جدوجہد کی یادداشتیں، دستاویزات اور دیگر ریکارڈ کو محفوظ و مرتب کرنے کا جو کام کیا ہے صرف وہ کام ہی کیا ہے اداروں کے کام سے زیادہ و قوت کا حامل ہے۔
- ۳۷ء کے دستور کی تفصیل و تدوین میں جن شخصیات نے دستور ساز اسمبلی میں سب سے زیادہ کام کیا ان میں حضرت مولانا عبدالحق کا نام نہیاں ہے جبکہ ان کی اس علمی و دستوری جدوجہد کے پس منظر میں مولانا سمیع الحق شہیدی شہنشاہ روز محنت کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے۔
- ۴۷ء میں پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو ایوان کے اندر مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا ظفر احمد انصاری، پروفیسر غفور احمد اور مولانا عبد الحصطفی از ہر چیز بزرگوں کی محنت نمایاں تھی مگر ان کی پشت پر مولانا سمیع الحق، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور مولانا عبد الرحیم اشرع جیسے اہل علم تحقیقی خدمات اور پیپر و رک میں مسلسل مصروف رہے اور ان کا اس محنت میں بڑا حصہ ہے۔
- جزل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف نے سینٹ آف پاکستان میں قرآن و سنت کی دستوری بالادستی کیلئے ”شریعت بل“ پیش کیا تو ملک بھر میں اس کیلئے ہر سطح پر جدوجہد منظم ہوئی اور قاضی حسین احمد، مولانا مفتی محمد حسین نعیی، مولانا ممیعن الدین لکھوی، مولانا محمد اجل جان اور ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ ہزاروں علماء کرام اور کارکنوں نے ”متعدد شریعت مجاز“ کے پلیٹ فارم پر پورے ملک میں پروجہ تحریک کا ماحول پیدا کر دیا۔
- افغانستان میں سوویت یونین کی لشکر کشی کے بعد افغان قوم کے جہاد آزادی کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ نہیں اور حضرت مولانا عبدالحق نے مجاہدین اور نظریاتی کارکنوں کی جو کھیپ فراہم کی وہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اور میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اسلامی تعلیمات کے فروع، اسلامی روایات و تہذیب کے تحظیت اور فکری و اعتقادی فتنوں کے مقابلہ میں جو کو دارالعلوم دیوبند نے پورے جنوبی ایشیا میں ادا کیا اسی کو دارالکوسلطی ایشیا کے دروازے پر بیٹھ کر دارالعلوم حقانیہ نے سلطی ایشیا میں پھیلایا اور میرے نزدیک دارالعلوم حقانیہ کو دیوبند ثانی قرار دینے کا مطلب یہی ہے۔ جبکہ اس جہاد میں بھی مولانا سمیع الحق کے کردار اور محنت کو کلکیدی حیثیت حاصل ہے اور اب اسی جہاد افغانستان کو اس کے نظریاتی اہداف اور فطری ثمرات سے محروم کر دینے کیلئے امریکہ کی قیادت میں جو عالمی گھٹ جوڑ مسلسل متھر کے اس کے خلاف بھی مولانا سمیع الحق شہید ایک مضبوط آواز اور رکاوٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ امریکی اتحاد جو مقابلہ میدان جنگ میں نہیں جیت سکا اسے وہ مذاکرات کی میز پر اپنے حواریوں کے ذریعے جیتنا چاہتا ہے، اس چال کو مولانا سمیع الحق اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کا مقابلہ بھی کر رہے تھے۔ ان حالات میں مولانا کی شہادت دینی حلقوں اور جہاد افغانستان کے

نظریاتی اهداف سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بطور خاص بہت بڑا صدمہ ہے۔  
اللہ تعالیٰ مولانا سمیع الحق شہید گوہوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کے ورثاء و متولیین کو ان کامشنا جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## افغان طالبان کو شاہ محمود قریشی کا مشورہ

روزنامہ اسلام، لاپور--- ۱۱ دسمبر ۲۰۱۸ء

وزیر خارجہ جناب شاہ محمود قریشی کا کہنا ہے کہ امریکہ نے پاکستان کا یہ موقف تسلیم کر لیا ہے کہ افغانستان میں امن و امان کے قیام کیلئے مذکورات ہی مسئلہ کا واحد حل ہیں اور افغان مسئلہ کا کوئی فوجی حل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے افغان طالبان سے کہا ہے کہ انہیں ہتھیار چھوڑ کر مذکورات کی طرف آنا ہوگا۔

افغان مسئلہ کے فوجی حل کیلئے امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جو عسکری یلغار کی تھی اس کی ناکامی کا اعتراف خود امریکی جرنیل متعدد بار کر چکے ہیں اور یہ بات پوری دنیا دیکھ رہی ہے کہ فوجی قوت کے ذریعے افغان عوام کو زیر کرنے کا امریکی منصوبہ بھی کارگر نہیں ہو سکا جبکہ اس سے قبل برطانوی استعمار اور سوویت یونین بھی بھرپور عسکری قوت کے استعمال کے باوجود اپنے اپنے دور میں ناکام رہے ہیں۔ اور افغان عوام کی یہ قوی روایت ایک بار پھر تاریخ کے صفحات میں ثبت ہو گئی ہے کہ انہیں قوت کے زور پر زیر کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے والوں کو بہر حال ان کی غیرت و حمیت اور اسلامیت کا اعتراف کرتے ہوئے باقاعدگفتگو کے ذریعے ہی باہمی مسائل کا حل ملاش کرنا ہو گا۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ امریکہ کئی بار یہ تقاضہ کر چکا ہے کہ افغان طالبان مذکورات کی میز پر آگر بات کریں اور افغانستان میں امن و امان کے قیام کیلئے گفت و شدید کارستہ اختیار کریں۔ طالبان کو بھی اس سے انکار نہیں ہے البتہ وہ جائز طور پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ امریکی اتحاد کو مذکورات سے قبل افغانستان میں اپنے فوجی مشن کو ختم کرنے کا اعلان کر کے فوجوں کی واپسی کا نائم ٹیبل دینا ہوگا، اس کے بغیر مذکورات کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ امریکہ اور اس کے اتحادی اس جائز اور معقول شرط کو قبول کرنے کیلئے ابھی تک تیار نہیں نظر آتے جس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اسے اپنی اناکا مسئلہ بنائے بیٹھنے ہیں، اور یہ وجہ بھی بعد از قیاس نہیں ہے کہ جن مقاصد اور اهداف کیلئے انہوں نے افغانستان پر عسکری یلغار کی تھی وہ ان سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں اور وہی مقاصد مذکورات کی میز پر حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ مذکورات کے موجودہ عمل میں ہمارے نیاں کے مطابق یہی پہلوکی ثابت پیش رفت میں رکاوٹ بن گیا ہے۔

سادہ سی بات ہے کہ سوویت یونین کی عسکری جاریت کے خلاف افغان عوام نے علم جہاد بلند کیا اور اپنی قوی خود مختاری اور اسلامی شخص کے تحفظ کیلئے میدان عمل میں آئے تو امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ اپنی مجاز آرائی میں اسے مفید سمجھتے ہوئے افغان مجاهدین کی حمایت کی اور انہیں مکمل پسروٹ کیا جس سے افغان مجاهدین کو سوویت یونین کے

خلاف جہاد میں کامیابی حاصل کرنے میں خاصی مدد ملی، البتہ وہ اس فریب کو نہ سمجھ سکے یا سمجھتے ہوئے بھی وقت سہولت کی خاطر تربیپ ہو گئے کہ افغان جہاد میں امریکی امداد افغانستان کی قوی خود مختاری اور اسلامی شخص کی بجائی کیلئے نہیں بلکہ سوویت یونین کے بکھر جانے کی صورت میں اس خط میں امریکی اجراہ داری کے قیام کیلئے ہے۔ اور یہیں سے جہاد افغانستان کی صورتحال یکسر تبدیل ہو گئی، جنیوامعاہدہ اس امریکی حکمت عملی کا شاہکار تھا جس نے افغانستان کو ایک نئی خانہ جنگی اور افراتفری سے دوچار کر دیا، اس دلدل سے افغانستان کو نکالنے کیلئے افغان طالبان سامنے آئے اور قوی خود مختاری اور اسلامی شخص کی شاہراہ پر پھر سے افغان قوم کو گامزن کر دیا، جونہ صرف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کیلئے بلکہ دنیا کی سبھی استعماری قوتوں کیلئے قابل قبول نہیں تھا کیونکہ عالمی سطح پر استعماری عزائم رکھنے والے تمام ممالک اور اقوام تمام تر باہمی اختلافات و تباہات کے باوجود اس نکتہ پر پوری طرح متفق ہیں کہ اسلامی شریعت کو دنیا کے سختے میں ملکی قانون و نظام کے طور پر برداشت نہیں کیا جائے گا، جبکہ افغان طالبان کی امارت اسلامیہ کا بنیادی ایجنسی اسی نفاذ شریعت ہے، چنانچہ اس سے ایک نئی کوشش کا آغاز ہو گیا جواب تک جاری ہے۔

اس صورتحال میں جبکہ افغانستان پر امریکی اتحادی عسکری یا لغوار اپنے اہداف حاصل نہیں کر سکی اور مذاکرات کی میز بچھائی جا رہی ہے، جنیواٹرز کے ایک اور معابرے کے تابنے بانے بنے جا رہے ہیں تاکہ امن و امان توکسی درجہ میں قائم ہو جائے مگر افغانستان کی کامل قوی خود مختاری اور افغان قوم کا اسلامی شخص بدستور ایہم کا شکار ہے اور ان کے گرد سازشوں کا حصہ مسلسل قائم رہے۔ اس موقع پر پاکستان کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کا افغان طالبان کو یہ مشورہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ ہتھیار چھوڑ کر مذکور اکرات کی میز پر آئیں، کیونکہ اس کا مطلب اس کے سوا بچھ نہیں بنتا کہ وہ امریکہ کی فوجی بالادستی تسليم کرتے ہوئے اس کی شرائط کے سامنے سرٹڈ ہو جائیں اور جو کامیابی امریکی اتحاد عسکری میدان میں حاصل نہیں کر سکا اسے افغان طالبان خود مذکور اکرات کی میز پر طشتہ میں سجا کر امریکہ بہادر کے حضور پیش کر دیں۔ ہم مذکور اکرات کے حق میں ہیں اور اسی کو مسئلہ کا حل سمجھتے ہیں لیکن شاہ محمود قریشی کا یہ منشورہ ہمارے نزدیک مذکور اکرات کیلئے نہیں بلکہ سرٹڈ ہونے کا مشورہ ہے جو کسی طرح بھی پاکستان کے شایان شان نہیں ہے اور حکومت پاکستان کو اس پر بہر حال نظر ثانی کرنی چاہیے کیونکہ اگر ویٹ نام کی جنگ میں امریکہ وہاں کے آزادی پسندوں (ویٹ کانگ) سے ہتھیار رکھوانے کی شرط کے بغیر مذکور اکرات کر سکتا ہے تو افغان طالبان کے ساتھ موجودہ پوزیشن میں مذکور اکرات میں آخر کیا چیز مانع ہے؟

## شکریہ مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ!

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ دسمبر ۲۰۱۸ء

گذشتہ دنوں افغانستان سے امریکی فوجیوں کی واپسی کے اعلان پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر مسٹر ڈونلڈ ٹرمپ کا ایک کالم میں ہم نے شکریہ ادا کیا تو بعض دوستوں نے اس پر الجھن کا اظہار کیا، مگر اس سے بڑا ایک شکریہ ادا

کرنے کو جی چاہ رہا ہے اس لیے ان احباب سے بیشگی معدتر خواہ ہوں۔

اے ایف پی کی رپورٹ کے مطابق اپنے حالیہ دورہ بغداد کے دوران صدر ڈرمپ نے امریکہ کے عالمی پولیس میں کے کردار کے اختتام کا اعلان کیا ہے اور اپنے (۱) سب سے پہلے امریکہ (۲) اکشیر القومی اتحادوں اور (۳) مشرق و سلطی کی جنگوں سے علیحدگی کے فیصلوں کا افاع کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ یہ انصاف نہیں کہ سب کا بوجھ ہم برداشت کریں، اب ہم ان کاموں کیلئے فتنہ نہیں دیں گے۔ صدر ڈرمپ نے کہا کہ ہم اس وقت پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں حتیٰ کہ ان ملکوں میں موجود ہیں جن کا کسی نے نام بھی نہیں سنایا، یہ محکمہ خیز صور تحال ہے۔ انہوں نے کہا کہ شام میں امریکی فوج کی تعیناتی میں توسعی کی امریکی جرنیلوں کی درخواست مسترد کر دی گئی ہے۔ وائٹ ہاؤس کے مطابق صدر ڈرمپ نے بغداد کا یہ دورہ عراق میں تعینات فوجیوں کو کرسس کی مبارکباد دینے کیلئے کیا تھا۔

امریکی صدر کے اس بیان کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ ویسا ہی خواب جو امریکہ کے سیاہ فام لیڈر مارٹن لو ہقر لینگ نے صدر جان ایف کینینڈی کے دور صدارت میں واشنگٹن میں سیاہ فام امریکیوں کے ملین مارچ سے خطاب کرتے ہوئے اپنی قوم کو دکھایا تھا اور وہ صرف خواب نہیں رہا تھا بلکہ جلد ہی اس نے تعمیر کا جامد بھی پہن لیا تھا۔ صدر ڈرمپ جب بر اقتدار آئے تھے تو ہم نے ایک کالم میں عرض کیا تھا کہ اس قسم کے صاف گولوگ دودھاری تلوار ہوتے ہیں جو دونوں طرف چلنے کی کیساں صلاحیت رکھتے ہیں، اور اس موقع کا اظہار بھی ہم نے کیا تھا کہ اب امریکی پالیسیوں پر میچدار ڈپلومیسی کی وہنہ کم ہو گی اور بہت کچھ صاف دکھائی دینے لگے گا، چنانچہ دھیرے دھیرے اسی طرف بات بڑھتی نظر آ رہی ہے۔

امریکہ نے پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی قیادت کے مذاق پر یورپیں قتوں کے اضھال کو دیکھتے ہوئے ان کی جگہ سنبھالنے کا فیصلہ کیا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ہیر و شیما اور ناگا سائی سے عالمی چودھراہٹ میں دھماکہ دار انظری کے ساتھ ایک نئی اور سائنسی نیک چودھراہٹ کا آغاز کیا تھا جو کچھ عرصہ تو یوٹ کنشروں رہی مگر آہستہ آہستہ اس نے چلمن سر کاتے ہوئے عراق، شام اور افغانستان میں اس چودھراہٹ کا آخری سین بھی دکھادیا۔ ورن جنگ عظیم اول سے پہلے کا امریکہ آج کے امریکہ سے قطعی مختلف تھا اور تاریخ کے ہمارے جیسے طالب علموں کو امریکہ کے ماضی اور حال یعنی جنگ عظیم سے قبل اور بعد کے امریکہ میں مطابقت کے پہلو متلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوتی ہے۔ پچی بات یہ ہے کہ اب سے تین عشرے قبل جب میں پہلی بار امریکہ کیا تو جیفرسن کی یاد گار اور پینٹا گون کے درمیان چند کلو میٹر کافاصلہ مجھے صد پوں کا سفر لگا، اور جیفرسن کی یاد گار کے سامنے میں کھڑا میں سوچتا گیا کہ کیا جیفرسن اسی امریکہ کا صدر تھا اور کیا ابراہام لنکن اور جارج واشنگٹن نے اسی امریکہ کیلئے اپنا سب کچھ نچھا اور کر دیا تھا؟

یہ سوچنا امریکیوں کا کام ہے کہ گذشتہ پون صدی کی عالمی چودھراہٹ نے انہیں کیا دیا ہے اور ان سے کیا کچھ چھین لیا ہے؟ ان کا یہ سفر مستقبل کیلئے تھا ایسا پھر اپنے ماضی سے محروم ہونے کے راستے پر سفر کرتے رہے ہیں؟ مگر تاریخ اور سماج کے کسی طالب علم کیلئے یہ بات بہر حال اطمینان کے ایک پہلوکی حیثیت رکھتی ہے کہ امریکی صدر مسٹر ڈنلڈ ڈرمپ امریکی قوم کے نفع و نقصان کو انصاف کے ترازو پر جانچنے کی سوچ رکھتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے سب سے

بھلے امریکہ، کیا القومی اتحادوں اور مشرق و سلطی کی جنگوں سے علیحدگی کا جواب ایجاد اپیش کیا ہے اس کی نزاکتوں، حسابت اور منفی و ثبت اثرات سے ہم بے خبر نہیں ہیں اور اسی لیے کسی خوش فہمی میں بتلا ہونے سے پچھاڑا ہے ہیں۔ مگر کسی امریکی صدر کی یہ بات بھی خوشی کی بات ہے کہ انہیں امریکہ کے عالمی پولیس میں ہونے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہم مزید تفصیلات میں جائے بغیر صدر ڈرمپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور ان سے کسی حد تک یہ موقع رکھتے ہیں کہ وہ شاید موجودہ امریکی قوم کو جنگ عظیم اول سے پہلے کے امریکہ سے روشناس کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔

## افغانستان سے امریکی فوجیوں کی واپسی

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۱۹ء

ایک عرصہ سے کان جو خبر سننے کیلئے ترس رہے تھے آج اس کا آغاز ہو گیا ہے اور امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے افغانستان سے فوجوں کی واپسی کے پروگرام کا اعلان کر دیا ہے، جس کے تحت آجھی امریکی فوج پہلے مرحلہ میں واپس جائے گی اور باقی نصف فوج کی واپسی کا بھی جلد اعلان کر دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں روز نامہ دنیا گوجرانوالہ میں ۲۲ دسمبر کو شائع ہونے والی خبر ملاحظہ فرمائیں جو رائز اور اے ایف پی کے حوالے سے ہے:

”امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے افغانستان سے آجھی فوج واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا، انخلاء کا عمل آئندہ چند ماہ میں شروع ہو جائے گا۔ جبکہ وزیر دفاع جیمز میٹش شام سے فوج واپس بلانے کے فیصلے پر مستغفی ہو گئے، انہوں نے استغفی صدر کو پیش کر دیا۔ امریکی صدر کے فیصلہ نے مغربی اتحادیوں کو پریشانی سے دوچار کر دیا۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز نے حکام کے حوالے سے بتایا کہ صدر ڈرمپ نے محکمہ دفاع کو حکم دیا ہے کہ افغانستان سے آئندہ مہینوں میں ۷ ہزار کے قریب فوجیوں کو نکال لیں۔ برطانوی خبر ساری انگلینڈ رائز کے مطابق افغانستان میں اس وقت موجود ۱۳ ہزار امریکی فوجیوں میں سے ۵ ہزار کو واپس بلایا جائے گا۔ رائز نے ذرائع کے حوالے سے بتایا کہ اس ضمن میں منصوبہ بندی کے زبانی احکامات دیے گئے ہیں، حکام کے مطابق تینی مدت میں فوجیوں کی تعداد میں کمی کی جائے گی؟ اس حوالے سے ٹائم لائن پر غور کیا جا رہا ہے لیکن یہ عمل ہفتلوں یا مہینوں میں مکمل ہو سکتا ہے۔ ابھی یہ واضح نہیں کہ افغانستان میں باقی نجاح جانے والی امریکی فوجی کس طرح مختلف اپیشنجری رکھیں گے؟ جس میں افغان فوج کی تربیت، زمینی کارروائی میں معاونت اور طالبان سمیت دیگر شدت پسند گروہوں کے خلاف فضائی کارروائیاں شامل ہیں۔ امریکی صدر افغانستان میں اپنے فوجیوں کی موجودگی کے زیادہ حامی نہیں رہے تاہم اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے غیر موقع فیصلہ کرتے ہوئے افغانستان میں ۳ ہزار اضافی فوجی بھیجنے کا اعلان کیا تھا، جبکہ رائز نے ذرائع کے حوالے سے بتایا ہے کہ صدر ڈرمپ نجی طور پر افغانستان میں امریکی فوج کی موجودگی

پر شکوہ کرتے ہیں اور حال ہی میں انہوں نے اپنے ایک اتحادی سے کہا تھا کہ ہم وہاں اتنے برسوں سے ہیں، ہم وہاں کیا کر رہے ہیں؟ ذرائع کے مطابق اب امریکی فوج میں کمی کے فیصلہ سے لگتا ہے کہ صدر ٹرمپ کے صبر کا پیانہ لمبیز ہو گیا ہے اور یہ اسالہ طویل جنگ صدر ٹرمپ کیلئے سابق بن چکی ہے اور کابل اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وزارت دفاع کے حکام نے سی این این کو بتایا ہے کہ صدر ٹرمپ افغانستان سے فوج کا انخلا چاہتے ہیں اور وہ جنوری یا فوری کے آغاز میں سینٹ سے صدارتی خطاب کے دوران فوجیوں کی واپسی کے اعلان کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

یہ خبر اپنے مندرجات کے حوالے سے بہت سے پہلوؤں پر گفتگو کا تقاضہ کر رہی ہے مگر ہم اس مرحلہ میں خوش فہمی یا جذباتیت کے حوالے سے ہٹ کر سری دست دو تین گزارشات کرنا چاہتے ہیں:

1. پہلی گزارش امریکی قیادت سے ہے کہ ہمیں اس کے فیصلہ سے خوشی ہوئی ہے کہ بالآخر زمینی حفاظت اور معروضی تقاضوں کا دراک کر لیا گیا ہے اور امریکی قیادت نے ان کا احترام کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو اگرچہ بعد از خرابی بسیار ہے مگر بہر حال خوش آئندہ ہے کہ ایک طویل اور بے مقصد جنگ کو کسی حد تک بریک تو گلی۔ ہمیں امید ہے کہ امریکی قیادت اس عمل کو مکمل کرنے کیلئے سنجیدگی سے آگے بڑھے گی، اس موقع پر ہمیں خدا جانے کیوں جارج واشنگٹن، ابراہیم لٹکن اور جیفرسن کا امریکہ یاد آ رہا ہے جو قوموں کی آزادی، ممالک کی خود مختاری اور انسانی جان کی حرمت و قدر کا علم بردار ہوا کرتا تھا، اور امریکی قیادت سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا ہم اس دور کی طرف امریکہ کی واپسی کا خواب دیکھ سکتے ہیں؟

2. دوسری گزارش پوری افغان قوم با خصوص طالبان کی قیادت امارت اسلامیہ افغانستان سے ہے کہ یہ آپ لوگوں کے صبر و حوصلہ، استقامت و عزیمت اور ترب و دانش مندی کا شمرہ ہے اور آپ اس پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں، مگر ہمارے خیال میں صبر و استقامت اور حوصلہ و ترب کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا ہے کیونکہ ہم فقیروں کو یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں رو سی وجہوں کی واپسی کے بعد کا ماحول دوبارہ قائم نہ ہو جائے کیونکہ جس طرح زمینی لڑائی میں پیچا ہونے والی وجہوں جاتے جاتے بارودی سرگینیں بچھا جاتی ہیں اسی طرح فکری، سیاسی اور ثقافتی پسپائی کے بعد بھی فکری بارودی سرگنوں کا جاں سنبھالنے والوں کیلئے وہاں جان بن جایا کرتا ہے جس کا ہم پاکستانی سات عشروں کا طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ اس لیے اس دام ہمنگ زمین سے بچھے کیلئے ہم دوچھوٹی چھوٹی درخواستیں کر رہے ہیں کہ

• اپنے مستقبل کا جو فیصلہ بھی کریں خدا را تویی تناظر میں کریں،

• اور ایک مستحکم اور خود مختار اسلامی افغانستان کے ظہور میں آنے تک افغانستان سے باہر کے معاملات میں انجمنے سے خود کو بہر حال بچا کر کھیں۔

ہماری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں اور رہیں گی، اللہ تعالیٰ افغانستان کو استحکام، خود مختاری اور اسلامی تشخص کی بحالی کی منزل سے ہمکنار کریں، آمین یا رب العالمین۔

3۔ جبکہ تیری گزارش ”جان کی اماں پاؤں“ کی تمہید کے ساتھ پاکستانی حکمرانوں اور مقتدروں سے ہے کہ خدا کیلئے پاکستان کی اسلامیت اور خود مختاری کے تقاضوں کو آپ بھی سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کی بحالی کی کوئی صورت ضرور نکالیں۔ اگر اپنے تمام ترضیع و انحلال کے باوجود افغان قوم اپنی اسلامیت اور خود مختاری کا پرجنم سربلند رکھ سکتی ہے تو پاکستانی قوم کو اس سے دور رکھنے کیلئے خود اس کی اپنی اسٹیبلشمنٹ رکاوٹ کیوں بنی ہوئی ہے؟

## عالیٰ استعمار کے رو بوٹس اور افغان طالبان کا امتحان

روزنامہ اسلام، لاپور ۲۰۱۹ء جنوری ۳

افغان طالبان کی طرف سے کابل انتظامیہ کے سربراہ اشرف غنی کے ساتھ مذاکرات سے دو ٹوک انکار پر اس بات پر اطمینان میں اضافہ ہوا ہے کہ تاریخ کا عمل اگرچہ ست رفتار ہے مگر اس کا رخ صحیح سمت ہے اور دھیرے دھیرے صورت حال واضح ہوتی چاہی ہے۔ امریکہ کی طرف سے ایک عرصہ سے افغان طالبان پر یہ دباؤ تھا کہ وہ کابل انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کریں یا کم از کم مذاکرات کے عمل میں اسے شمولیت کا موقع دیں، مگر امرات اسلامیہ افغانستان نے گذشتہ روز ہتمی طور پر واضح کر دیا ہے کہ اگلے ماہ سعودی عرب میں اس کے نمائندوں کے مذاکرات برہ راست امریکہ سے ہوں گے اور ان میں کابل کی کٹھپتی انتظامیہ کی شمولیت قبول نہیں کی جائے گی۔ افغانستان کی تاریخ، جہاد افغانستان اور امرات اسلامیہ افغانستان سے آگاہی رکھنے والوں کیلئے یہ بات خلاف توقع نہیں بلکہ باعث اطمینان ہے اور وہ اس اصولی موقف پر امرات اسلامیہ افغانستان کی استقامت اور کامیابی کیلئے مسلسل دعا گویں، آمین یا رب العالمین۔

اٹھارہ سال قبل جب امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ہمراہ افغانستان پر لٹکر کشی کی تھی، ہم نے انہی کالموں میں عرض کیا تھا کہ یہ مہم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگی اور اتحادی فوجوں کو بالآخر یہاں سے بے شیلِ مرام واپس جانا پڑے گا۔ اگرچہ ایسا ہونے میں ہمارے اندازے سے زیادہ تاخیر ہو گئی ہے جس کی وجہ بہت سے عسکری گروپوں کی جلدیازی اور بے تدبیری تھی کہ انہوں نے اردو گرد غیر ضروری جنگیں چھیڑ کر خود کو مشکل میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ افغان طالبان کیلئے بھی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں اور ان کے اس غلط طرز عمل کی سزا اپرے خطيہ بلکہ عالم اسلام کو جھلتا پڑ رہی ہے، گراس سب کچھ کے باوجود افغان قوم کی تاریخ اور مزاج کے پیش نظر یہ تو ہونا ہی تھا کہ افغانستان پر عسکری یلغار کرنے والی غیر ملکی فوجیں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے گھرو اپس چلی جائیں۔

مغرب کی یہ حکمت عملی برطانوی استعمار کے نوازدیاتی تسلط میں بھی رہی ہے کہ مسلم ملکوں کے دارالحکومتوں میں ہر

جگہ ”اشرف غنی“ بھادیے جائیں، جو امریکی استعمار کی بالادستی کے بعد بھی ہر طرف موجود ہیں اور استعماری آقاوں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں ہر جگہ یہی لوگ پیش رہتے ہیں۔ یہ لوگ سیاست و حکومت میں بھی ہیں، معیشت و اقتصادیات میں بھی ہیں، میڈیا اور لینگ میں بھی ہیں اور عسکری دائرے بھی ان کے وجود سے خالی نہیں ہیں۔ پورے عالم اسلام کی یہی صورتحال ہے۔ البتہ ایک فرق جو تاریخ کے میرے جیسے طالب علموں کو محسوس ہو رہا ہے کہ یورپی استعماری ممالک اپنی نوازدیوں میں جس کو ”اشرف غنی“ بناتے تھے اس کی عزت و احترام اور سیکریٹی کا خیال رکھتے تھے اور کام لے چکنے کے بعد بھی اسے تحفظ فراہم کرتے تھے، جبکہ امریکی استعمار کی شروع سے یہ پالیسی رہی ہے کہ جس سے کام لے لیا جائے، وہ اسے بے نقاب بھی خود کرتے ہیں اور اس کی تذمیل و تحریر بھی پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ فلپائن کے مارکوس، ایران کے رضا شاه پهلوی اور عراق کے صدام حسین کی مثالیں سب کے سامنے ہیں۔ اس کی نفیقات وجہ کچھ بھی ہو، ایک فائدہ اس کا یہ ہے کہ امریکیوں کی اس افتاد طبع کے باعث اب ایسے لوگوں کی تلاش کیلئے کسی خاص ریسرچ کا اہتمام نہیں کرنا پڑتا بلکہ استعمال کرنے والے خود ہی بول پڑتے ہیں اور ہر ایسے شخص کو خود اپنے ہاتھوں انعام تک پہنچایتے ہیں۔

ہم بھی پاکستان میں گذشتہ سات عشروں میں بہت سے ایسے لوگ بھگت چکے ہیں اور خدا جانے اور کتنے ہجھتتا پڑیں گے۔ سیاست، معیشت، لابنگ اور میڈیا کے ساتھ ساتھ فکر و دانش میں بھی بہت سے حضرات یہی ”کیپ“ پہنے ہوئے قوم کی راہنمائی بلکہ نمائندگی کا منصب سنبھال لے دیتے ہیں اور بے چاری سیدھی سادی پاکستانی قوم انہی کو اپنانما نہ کرہ اور ترجمان سمجھتے ہوئے چر کے پرچر کے کھائے جلی جا رہی ہے۔

مغرب کی سیاسی قیادت اور ارباب فکر و دانش سے ہم اس مرحلہ میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ انہیں معروضی حقائق کا دراک اور ان کا احترام کرنا چاہیے اور مسلم امہ کے ساتھ ان کے جو معاملات حل طلب ہیں اس کیلئے انہیں حقیقی قیادتوں سے بات کرنا ہوگی اور ”روبوٹس“ کو درمیان سے ہٹا کر مسلم امہ سے بحیثیت امت معاملات طے کرنا ہوں گے، ورنہ معاملات اسی طرح گڑبریز ہیں گے اور کوئی مسئلہ بھی صحیح رخ پر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ جناب شوکت عزیزی کے دور حکومت میں پروٹیٹنٹ مسیحی فرقے کے علمی سربراہ آرج بنشپ آف کنٹربری اسلام آباد تشریف لائے تو ہم نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا کہ آرج بنشپ آف کنٹربری مسیحی دینی کے پروٹیٹنٹ فرقے کے مسلم سربراہ ہیں، مگر ان کے سامنے مذاکرات کی میز پر بیٹھنے والے شوکت عزیز صاحب مسلمانوں کے کون سے مذہبی مکتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں؟ مذاکرات اصل فریقوں میں ہوں تو وہی نتیجہ خیز ہوتے ہیں ورنہ وہ محض ”مذاکرات مذاکرات“ کا کھیل بن کر رہ جاتے ہیں۔

دس بارہ سال قبل کی بات ہے میں امریکی ریاست و ریجیمنی کے علاقہ اسپرینگ فیلڈ کے ایک دینی مرکزدار اہلی میں چند روز کیلئے قیام پذیر تھا، پچھلے دوست ملنے کیلئے آئے جو دوسرے ممالک سے آگر امریکہ میں رہائش اختیار کرنے والے امریکی تھی اور اپنا تعلق کسی تحقیقاتی ادارے سے بتا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں کہ سوویت یونین کے خلاف جہاد افغانستان کے باعث دنیا بھر میں جو غیر ریاتی عسکریت پسندی بھیل گئی ہے اسے کس طرح کشرون کیا جاسکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ سادہ سی بات ہے کہ جن لوگوں نے یہ صورتحال پیدا کی ہے وہی مل بیٹھ کر اس

کا حل نکالیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ یہ سب کچھ صحیح ہوا ہے یا غلط مگر یہ تسلیم کرتا ہوں کہ سوویت یونین کے خلاف لڑی جانے والی جہاد افغانستان کی جنگ دنیا کے مختلف حصوں میں پر ایسویٹ عسکریت پسندی کا باعث بنی ہے اور اسے کنٹرول کرنے کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہوں، مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس سارے عمل میں دو فرقیت بنیادی کردار رکھتے ہیں۔ پہلے نمبر پر وہ افغان مجاہدین جنہوں نے سوویت یونین کے خلاف یہ جنگ لڑی ہے اور ان کی حمایت و امداد کیلئے دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے مسلمان ہیں، جبکہ دوسرا فرقہ امریکہ کی قیادت میں انہیں سپورٹ کرنے والے علمی ادارے اور حکومتیں ہیں۔ ان دونوں کی مشترکہ جدوجہد کی وجہ سے سوویت یونین پسپا ہوا اور افغانستان میں تشكیل پانے والی عسکریت پسندی دنیا بھر میں پھیل گئی، اب اس معاملہ کو کنٹرول کرنے کیلئے دونوں فرقیوں کو ایک دوسرے کا وجود اور کردار تسلیم کرنا ہو گا اور اس کے حل کیلئے مشترکہ سوچ چار اور منصوبہ بنندی کرنا ہو گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک مسلسل عمل میں تو دونوں شریک کارتھے اور ایک دوسرے کا اعتراف و احترام کرتے تھے لیکن اس کے مبنی نتائج کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال کر خود بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ غیر منطقی بات ہو گی جس کا نتیجہ ثبت نہیں ہو سکتا، اس کا حل صرف یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ان جہادی گروپوں کا وجود اور کردار تسلیم کریں جنہوں نے ان کے تعاون سے سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑی تھی اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ ان کے گھرائے کے سپاہی، نہیں تھے بلکہ افغانستان کی خود مختاری اور اسلامی نظام کے نفاذ کا اپنا ایجاد کر کتھے تھے، جنہیں حالات کے تقاضوں نے ان کے ساتھ شریک عمل بنایا تھا۔ یہ بات انصاف کی نہیں ہے کہ جنگ جیتنے والے دو گروہوں میں سے ایک فرقہ تو اپنے سارے ثمرات سمیٹ لے اور فوائد حاصل کر لے مگر دوسرے فرقہ کو ان کے اهداف و مقاصد سے محروم رکھنے کا طرز عمل اختیار کیے رکھے۔

افغان طالبان اور امارت اسلامیہ افغانستان کا معاملہ اسی نوعیت کا ہے، امریکہ اگر فی الواقع خطہ میں امن چاہتا ہے تو اسے امارت اسلامیہ افغانستان کا وجود تسلیم کرنا ہو گا، ان کے ایجاد کے احترام کرنا ہو گا اور کسی ”اشرف غنی“ کو ان کے سامنے میز پر بٹھا دیئے کی جو بات کرنا ہو گی اور براہ راست معاملات طے کرنا ہوں گے۔ ہمیں اس مرحلہ پر افغان طالبان کی یہ حکمت عملی درست معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے حالات کا صحیح ادراک کرتے ہوئے امریکہ سے کہدیا ہے کہ وہ براہ راست اس کے ساتھ مذاکرات کریں گے اور اس کے رو بلوں کو مذاکرات کی کرسی پر نہیں بیٹھنے دیں گے۔ البتہ یہ افغان طالبان کا بہت بڑا تحفہ ہو گا کہ وہ کس طرح افغانستان کے تمام طبقات کو عتماد میں لے کر ایک ایسی قومی حکومت تشكیل دینے میں کامیاب ہو سکیں گے جو افغانستان کی خود مختاری، استحکام اور نفاذ شریعت کی ضامن بن سکے، اور اس سلسلہ میں ایسی تمام بے تدبیر یوں سے بچنے کی کوشش کریں گے جن کی وجہ سے ان کے پہلے دور میں ”آئیں مجھے مار“ کی صور تھاں پیدا ہو گئی تھی۔ ہم افغان طالبان سے امید رکھتے ہیں کہ وہ معروفی حقائق کا اعتراف و ادراک کرتے ہوئے حقیقت پسندی کی بنیاد پر آگے بڑھیں گے اور افغانستان کی قومی خود مختاری کی حوالی کے ساتھ افغان قوم کے اسلامی تشخیص کے تحفظ اور جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل کیلئے حکمت و تدبیر سے کام لیں گے۔

ہم بحثتے ہیں کہ مغرب کے ساتھ مسلم امہ کے حل طلب مسائل میں ہر مسئلہ پر بات ہو سکتی ہے، اجھنوں کا حل نکالا

جا سکتا ہے اور تنازعات کو سلیحیا جاسکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ہر جگہ اور شعبہ میں مذاکرات اصل فریقوں کے درمیان ہوں، امارت اسلامیہ افغانستان اپنے اس اصولی موقف پر تحریک کیستھیں ہے اور اب امریکی قیادت کا امتحان ہے کہ وہ معاملات کو صحیح رخ پر آگے بڑھاتی ہے یا انھی اس کا مذکوٰ پیچھے عرصہ اور مذاکرات کے اس کھلی میں وقت برپا کرنے کا ہے۔

## پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ فوری ۲۰۱۹ء

گذشتہ روز ایک قومی اخبار کے آخری صفحہ پر مختصری خبر نظر سے گزری کہ افغانستان کے سابق صدر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی ۹۳ برس کی عمر میں کابل میں انتقال کر گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر نے ذہن میں ماضی کے بہت سے یاد گار مناظر ایک ایک کر کے تازہ کر دیے اور دل سے بے ساختہ مجد دی صاحبِ مرحوم کیلئے مغفرت اور بلندی درجات کی دعا نکلی، اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پسمند گان کو صبر جیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

پروفیسر صاحبِ مرحوم کا تعلق کابل کے معروف روحاںی خانوادہ سے تھا اور وہ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی بزرگ شخصیات میں سے تھے۔ سوویت یونین کے خلاف افغان عوام کے جہاد آزادی میں مجاہدین کے ایک مستقل گروہ کے سربراہ تھے اور جہاد افغانستان کے دوران مکملی اور بین الاقوامی سطح پر مسلسل متحرک رہے۔ میری ان سے ذاتی نیازمندی تھی اور باہمی رابطہ و تعلق بھی رہا۔ وہ ایک بارہ ماہی دعوت پر گوجرانوالہ تشریف لائے، مرکزی جامع مسجد میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کیا اور ایک میڈیکل لینک کی افتتاح کرنے کے علاوہ اپنے اعزاز میں دیے گئے بھرپور استقبالیہ میں جہاد افغانستان کے مقاصد اور مجاہدین کی سرگرمیوں کے حوالے سے تفصیلی لفتگوکی۔

یہ ایک بزرگ شخصیت کے طور پر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی کا اعزاز تھا کہ افغانستان سے سوویت یونین کے انخلاء کے بعد ملک کا ظالم و نقچلانے کیلئے جو عبوری حکومت متفقہ طور پر قائم ہوئی اس کا سربراہ انہیں چنگا گیا اور انہوں نے صدر کی حیثیت سے افغانستان کا اقتدار سنپھالا۔ یہ عبوری حکومت چہ ماہ کیلئے ایک معاهده کے تحت قائم ہوئی تھی، اس دوران کچھ حضرات نے ان کے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ ایک اسلامی ریاست کے امیر منتخب ہو گئے ہیں اس لیے انہیں اب اس منصب پر فائز رہنا چاہیے اور مدت گزرنے کے بعد اقتدار کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ اس موقع پر انہوں نے پاکستان سے اپنے دوست اور بھی خواہ سرکردہ علماء کرام کو مشاورت کیلئے کابل بلا یا جن میں رقم الحروف بھی شامل تھا، اپوان صدر میں ان کی زیر صدارت طویل مشاورتی اجلاس ہوا جس میں ان سے یہ کہا گیا کہ امیر زندگی بھر کیلئے ہوتا ہے اس لیے وہ خود کو چھ ماہ کی مدت تک مدد و دنه رکھیں۔ جبکہ ہم چند دوستوں نے یہ عرض کیا کہ انہیں معاهده کی پابندی کرنی چاہیے اور مدت پوری ہوتے ہی اقتدار اس حکومت کیلئے چھوڑ دینا چاہیے جو باہمی اتفاق سے قائم ہو جائے۔ میں نے اس مجلس میں ان سے گزارش کی کہ ایک بزرگ اور محترم شخصیت کے طور پر ان کیلئے تاریخ میں یہ اعزاز پچھ کم نہیں ہے کہ سوویت یونین کی نوجوں کے انخلاء کے بعد متفقہ آزاد حکومت کا سربراہ اُنہیں چنگا گیا ہے اور انہیں اپنے اعزاز کو تنازع

نہیں بنانا چاہیے۔ انہوں نے ہمارے اس مشورہ کو قبول فرمایا اور مدت گزتے ہی اقتدار نئے فیصلے کے مطابق پروفیسر بربان الدین ربانیؒ کے حوالے کر دیا۔

پروفیسر صاحب مرحوم کی دعوت پر کابل کے اس دورہ میں دیگر بہت سے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمن درخواستی بھی شامل تھے اور ہم دونوں نے اس وقت کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود شہیدؒ کی فرماںش پر چند دن کابل میں رکنے کا پروگرام بنالی۔ اس دوران ہماری ملاقاتیں حركت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولانا محمد بنی محمدؒ کے علاوہ مولانا نصر اللہ منصور شہیدؒ سے بھی رہیں جو میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ احمد شاہ مسعود مرحوم کا کہنا تھا کہ وہ حافظ الحدیث مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے شاگرد ہیں اور اپنے استاذزادہ مولانا فداء الرحمن درخواستی کی میزبانی کرنا چاہتے ہیں۔ ہر حال یہ دورہ ہم نے پروفیسر صبغۃ اللہ مجیدؒ کی دعوت پر کیا تھا اور ان کے ساتھ ایک یادگار مشاورت ہوئی تھی۔ مجیدؒ دی صاحب ایک باوقار اور محترم بزرگ تھے جن کے سب خیالات اور پالپیسوں سے اتفاق ضروری نہیں مگر افغانستان کی ایک بزرگ شخصیت کی وفات ہم سب کیلئے صدمہ کا باعث بنی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## دنیا کی ضرورت خلفاء راشدین والا اسلام ہے

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ منی ۲۰۱۹ء

برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے کچھ عرصہ قبل ایک تقریب میں اپنے دانشوروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ:  
 ”اسلام کا مطالعہ کریں اور بطور نظام زندگی اور تبادل سسٹم اسے استنبی کریں۔ لیکن اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے دو باتوں کی طرف مت ڈیکھیں، ایک یہ کہ ہمارے بڑوں نے اسلام کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے، دوسرایہ کہ اس وقت مسلمان کیسے نظر آرہے ہیں۔“

برطانیہ ہی کے ایک ممبر پارلیمنٹ جم مارشل نے چند سال پہلے لیسٹر میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

”جس اسلام سے ہمارے بڑوں نے متعارف کرایا وہ اور ہے، جو اسلام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ اور ہے، جبکہ دنیا میں اس وقت موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں میں جو اسلام نظر آتا ہے وہ ان دونوں سے مختلف ہے۔“

اصل بات یہ ہے کہ آج اسلام دنیا کی ضرورت بن گیا ہے اور موجود سیاسی، معاشری اور معاشرتی سسٹم کی ناکامی کے بعد اب آسمانی تعلیمات اور وحی الہی کی طرف رجوع کیے بغیر نسل انسانی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہا، جبکہ آسمانی تعلیمات اور وحی الہی اگر محفوظ حالت میں کسی مذہب کے پاس موجود ہیں تو وہ صرف اسلام ہے، لیکن کنفیوژن اس بات نے پیدا کر

رکھا ہے کہ کتابوں میں جو اسلام ملتا ہے اس کا موجودہ مسلمانوں کی زندگیوں اور معاملات سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا کو ضرورت دراصل کتابوں والے اسلام کی ہے، خلفاء راشدین والے اسلام کی ہے، ہماری زندگیوں والے اسلام کی نہیں، کیونکہ ہمارا یہ برائے نام اسلام تو ہمیں مشکلات و مسائل میں میں سہارا نہیں دے رہا، دنیا نے انسانیت کے مسائل کیا حل کرے گا؟

برصیر کی تحریک آزادی کے عظیم راہنماء مولانا عبد اللہ سندھی جب ماسکو گئے اور کیونٹ لیڈروں سے اسلام کے فلسفہ حیات اور نظام زندگی پر بات کی تو ان سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ فاسدہ اور ستم دنیا میں کسی جگہ عمل آراج کجھی ہے؟ مولانا سندھی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، اور یہی بات اسلام کے فروع اور دنیا میں اس کے دوبارہ غلبہ کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

اسلام نام ہے سادگی، قناعت اور جفاشی کا، اور یہ صرف تصوف کے موضوعات نہیں بلکہ سیاست کے بنیادی ستون بھی ہیں۔ سادگی، قناعت اور جفاشی کروڑوں روپے کی لاگت سے بننے ہوئے ایوانوں میں لاکھوں روپے کے خرچ سے اجتماعات کر کے ان عنوانات پر لکھ تقریبیں کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان اصولوں کو ذاتی اور اجتماعی زندگی میں عملًا نافذ کرنے کا نام ہے جس کا بہترین نمونہ خلفاء راشدین، حضرت عمر بن عبد العزیز یا ان کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان محی الدین اور نگزیب عالمگیر اور سلطان نیپور حبیم اللہ تعالیٰ جیسے نیک دل حکمران ہیں، اور سیاست و حکومت کا یہی انداز ہے جس کی آج کی دنیا کو ضرورت ہے۔

آج کے دانشور کتابوں میں اس طرز سیاست اور طرز حکومت کو پڑھ کر دنیا کے جغرافیے میں وہ خطے تلاش کرنے لگتے ہیں جہاں اس کی جھلک نظر آتی ہو مگر بدقتی سے دنیا کا کوئی مسلمان ملک اس کی جھلک پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک عرصہ کے بعد افغانستان میں طالبان کی حکومت نے سادگی، قناعت اور جفاشی کے ان سنبھری اصولوں کو اپنی حکومت اور سیاست کی بنیاد بنا کر دنیا کو کتابوں میں پائے جانے والے خالص اسلام کا عملی نمونہ دکھانا شروع کیا تھا، اس دوران مجھے کامل، قندھار اور جلال آباد میں طالبان کی حکومت قائم ہونے کے بعد جانے کا اتفاق ہوا تھا، ان کا طرز بودو باش اور لوگوں کے ساتھ معاملات کا انداز دیکھا، سچی بات یہ ہے کہ کتابوں والے اسلام کا عملی نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا تھا مگر بوجہ اس کا تسلسل قائم نہ رہ سکا۔

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس کی چاپیاں وصول کرنے کیلئے بذات خود تشریف لے گئے، اس وقت کیفیت یہ تھی کہ کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے تھے، ان کا غلام اونٹ پر سوار تھا اور نکلیں امیر المؤمنین کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تاریخ نے ایک اور منظر بھی دیکھا تھا کہ عیسائی علماء ہاتھوں میں پرانی نتائیں اٹھائے ان میں سے بیت المقدس کے فتح کی نتائیاں پڑھتے جاتے تھے اور ایک ایک نشانی کو حضرت عمرؓ میں دیکھتے جاتے تھے۔ اور بالآخر سب کے سب پکارا ٹھے تھے کہ بیت المقدس کی چاپیاں اس کے حوالے کر دو، ہماری کتابوں کے مطابق بیت المقدس کا فتح یہی ہے۔ آج پھر بیت المقدس فتح کا منتظر ہے اور وہ فتح اسی طرز کا کوئی درویش ہو گا جو دنیا کے پروٹوکول اور پرستیج کے مصنوعی ضابطوں کو رد کرتا ہو سادگی، قناعت اور جفاشی کے ساتھ آگے بڑھے گا اور بیت المقدس پر ایک بار پھر اسلام

کابلی پرچم اہرائے گا۔

## مختلف شعبوں میں علماء اور کلام کی مشترکہ جدوجہد کی ضرورت

۱۳ جون ۲۰۱۹ء کو ڈسٹرکٹ بار ایسو سی ایشن، باخ، آزاد کشمیر میں خطاب سے  
اقتباس

ایک وکیل محترم نے سوال کیا کہ امریکہ جب افغانستان سے نکلنے کی بات کر رہا ہے تو افغان طالبان اس کیلئے تعاون کیوں نہیں کر رہے؟ میں نے عرض کیا کہ امریکہ وہاں سے نکلنے سے پہلے افغان طالبان سے اس حکومت کو تسلیم کرنا چاہتا ہے جو اس نے کابل میں فوجی مداخلت کے نتیجے میں طاقت کے زور سے قائم کر رکھی ہے۔ افغان طالبان یہ بات نہیں مان رہے اور انہیں یہ بات تسلیم نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ اگر امریکہ اپنی مسلط کر کرde حکومت کو تسلیم کرے کے افغانستان سے جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالواسطہ طور پر افغانستان میں موجود ہنچاہتا ہے جو افغانستان کی قومی خود مختاری کے منانی ہے۔ اس لیے افغان طالبان کا موقف اس حوالے سے بالکل اصولی اور درست ہے کہ امریکی اتحاد کی فوجیں افغانستان سے غیر مشروط طور پر نکلیں اور افغانستان کے عوام کا یہ حق تسلیم کریں کہ ان کے تمام طبقات باہم مل بیٹھ کر کسی دباؤ اور مداخلت کے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔

محترم وکیل صاحب نے سوال کیا کہ جب کابل کی موجودہ حکومت افغانوں کی ہی ہے تو اسے تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں نے گزارش کی کہ سری نگر کی موجودہ حکومت کشمیریوں کی ہی ہے اور بظاہر عوام کے ووٹوں کے ذریعے آئی ہے، اگر بھارت کی حکومت آپ سے کہے کہ آپ سری نگر کی موجودہ حکومت کو تسلیم کر لیں تو وہ کشمیر سے فوجیں واپس لے جائے گا تو کیا آپ اس پیشکش کو قبول کر لیں گے؟ میرے خیال میں دونوں کامسلوں کا یہی ایک حل ہے کہ یہ وہی افواج وہاں سے نکلیں اور ان خطلوں کے عوام کو کمل آزادانہ ماحول میں اپنے فیصلے خود کرنے دیں۔ مسلط قوتوں کے نمائندوں کو حکمران تسلیم کر لینے کے بعد ان کے تسلط کاظماہی غاتمه کوئی معنی نہیں رکتا، یہ نوازدیاتی نظام کی ایک تبدیل شدہ شکل ہے جس کا عالم اسلام کے بیشتر ممالک میں ہمیں مسلسل سامنا ہے، اور یہ صورت حال حریت پسندوں سے آزادی کی ایک نئی جدوجہد کا تقاضہ کر رہی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۸ اور ۱۹ جون ۲۰۱۹ء)

## کشمیر، افغانستان، صدر ڈونلڈ ٹرمپ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۱۶ اگست ۲۰۱۹ء

امریکہ کے صدر جناب ڈونلڈ ٹرمپ کے دو بیانات اس وقت ہمارے ہاں زیادہ تر زیر بحث ہیں، ایک کشمیر کے بارے میں ہے اور دوسرا افغانستان کے حوالے سے، ان دونوں خطوں کے ساتھ ہماری ثقافتی، دینی اور جذباتی وابستگی ہے اس لیے فطری طور پر بحث و مباحثہ میں تنوع اور جذباتیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ صدر ٹرمپ نے وزیر اعظم عمران خان کے دورہ امریکہ کے موقع پر کشمیر کے مسئلے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان شائش کی تھی جسے پاکستان نے توقیول کر لیا گر بھارت کی طرف سے ثابت جواب نہیں آیا بلکہ اس کی طرف سے عملی جواب یہ ہے کہ بھارتی دستور میں مقبوضہ کشمیر کی انتیازی حیثیت ختم کرنے کی طرف پیشرفت ہو رہی ہے جس سے بھارتی دستور کی رو سے کشمیر متنازعہ خطہ نہیں رہے گا۔ جبکہ کشمیری عوام پر گذشتہ ستر سال سے بھارتی فوج کے مسلسل بڑھتے ہوئے مظالم پر عالم اسلام خصوصاً پاکستانی قوم مضطرب اور بے بیمن ہے، مختلف ادوار میں اس سلسلہ میں پیشرفت ہوئی مگر بھارتی ہٹھ دھڑی اور اقوام عالم میں اس کے اثرورسخ کے باعث معاملہ ہبڑا کھٹائی میں پڑتا رہا۔ اب ایک بار پھر اقوام متحده اور اآئی سی کو اس سلسلہ میں توجہ دلانے اور کشمیری عوام کے ساتھ ہم آہنگی اور یکجہتی کے بھرپور اظہار کیلئے پاکستانی پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ہونے والا ہے جو اس سلسلہ میں قومی طرز عمل اور عزم کا اعادہ کرے گا۔

کشمیری عوام ایک جائز مطالیبہ پر گذشتہ ستر سال سے جدوجہد میں مصروف ہیں اور مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں کہ اقوام متحده کے واضح فیصلوں اور عالمی برادری کے وعدہ کے مطابق آزادنا استصواب رائے کے ذریعے انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق دیا جائے، مگر یہ وعدہ پورا ہونے کی بجائے کشمیری عوام کے خلاف عسکری جاریت کا تسلسل قائم ہے جو بہر حال عالمی برادری کی انصاف پسندی پر ایک سوالیہ نشان ہے اور اس کا جس قدر جلد نوٹس لیا جائے بہتر ہو گا کہ بھارت نے بالآخر کشمیری عوام کا یہ مسلسلہ اور جائز حق دیتا ہی ہے۔

دوسری طرف افغانستان کے بارے میں صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان کو دو تین روز میں فتح کر سکتے ہیں مگر اس کیلئے دس ملین لوگوں کا قتل عام ہو سکتا ہے جو وہ نہیں چاہتے، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ یہ مسئلہ مذکورات کے ذریعے ہی حل کیا جائے جس پر امریکی حکومت کی گفتگو امور اسلامیہ افغانستان کے ساتھ جاری ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صدر ٹرمپ نے اس بیان میں دونوں طرف پیغام دیتے ہوئے جہاں افغانستان سے یہ کہا ہے کہ وہ اگر امریکی حکومت کی شرائط کے مطابق معاهدے کیلئے تیار نہیں ہوں گے تو کم از کم دس ملین افغان مارے جاسکتے ہیں، وہاں دوسری طرف وہ امریکی قوم کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک کروڑ کے لگ بھگ افغانیوں کو تباہ تباہ کیے بغیر افغانستان کو فتح نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ ہم صدر ٹرمپ کے اس بیان کو اس مفہوم میں لیتے ہیں کہ افغانستان کی سر زمین توبیخ کی جاسکتی ہے لیکن افغان قوم کو فتح کرنا امریکہ کے بس میں نہیں ہے۔

اس پس منظر میں ان مذکورات پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان جاری ہیں اور جس

کے بارے میں امرتِ اسلامی افغانستان کے نمائندوں کا یہ عنديہ یہ بھی سامنے آچکا ہے کہ کم و بیش ۸۰ فیصد معاملات پر اتفاق ہو چکا ہے اور باقی ۲۰ فیصد امور پر بھی جلد سمجھوتہ ہو جانے کی توقع ہے۔ جبکہ غالباً وہی بیس فیصد امور سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کرن ہیں۔ ہمارے خیال میں امریکہ اس بات پر بحصہ ہے کہ افغان طالبان کا بل کی موجودہ حکومت سے فوری بات چیت کریں جس کیلئے وہ تیار نظر نہیں آتے، جبکہ طالبان کی یہ شرط ہے کہ امریکی فوجوں کے انخلا کا شیڈول دیا جائے اس کے بعد باقی امور پر گفتگو نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اصل بات وہی ہے کہ امریکہ اپنی فوجوں کے انخلا کا شیڈول دینے سے قبل افغان طالبان سے کا بل حکومت کا وجود تسلیم کرنا چاہتا ہے جو اس ”امریکی اسٹائل“ کا حصہ ہے کہ دشمن کے ساتھ مذاکرات میں دشمن کی نمائندگی کیلئے بھی امریکہ کی مرضی کے لوگ بیٹھے ہوں اور اقتدار منتقل کرنے کی صورت میں اقتدار وصول کرنے والوں میں بھی امریکہ کی موثر نمائندگی موجود ہو۔ اس کی جو تاویل بھی کر لی جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ امریکی اسٹائل ہی نوابدیاتی نظام کی جدید ترین شکل ہے جسے وہ افغانستان میں بہر صورت قائم کھنچا ہتا ہے۔

جباں تک دس ملین افراد قتل کر کے فتح حاصل کرنے کی حکمی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں، امریکہ بہادر اس سے قبل دوسری جنگ عظیم میں جب جرمی کی نیکست کے بعد اس کا حلیف جاپان ہتھیار نہیں ڈال رہا تھا تو اس پر مجبور کرنے کیلئے امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیر و شیما اور ناگاساکی پر ایتم بگرا کر کم و بیش دو لاکھ افراد کو آغاٹاً موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لگتا ہے امریکہ کی حالیہ قیادت پر وہی نشرہ طاری ہونے لگا ہے، اللہ تعالیٰ اس دنیا کی حفاظت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## امتِ مسلمہ کی حالتِ زار اور اہل دین کی ذمہ داری

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ۶ ستمبر ۲۰۱۹ء

آن عالم جس المناک صور تحال سے دوچار ہے اس نے ہر دو مند مسلمان کو بے چین و مضطرب کر رکھا ہے اور بظاہر اس دلدل سے نئلے کی کوئی صورت بھی دکھائی نہیں دے رہی۔

- مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سنگینوں کے حصار میں نہتے عوام ظلم و تشدد کے ایک اور دور سے گزر رہے ہیں،
- روہنگیا مسلمان اپنے وطن اراکان (میانمار / برما) کی شہریت سے محروم ہو کر پڑوسی ممالک میں در بدر خاک چھانے پر مجبور ہیں،
- فلسطینی مسلمان گذشتہ پون صدی سے اسرائیلی جاریت کا سامنا کر رہے ہیں اور اپنے وطن کی آزادی اور خود مقتصاری کی منزل سے کوسوں دور نظر آتے ہیں،
- شام اور یمن میں آپس کی خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت نے شہریوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے،

- سنگینگی کے مسلمانوں کو اپنے اردوگرد کسی کی طرف امید کی نظر سے دیکھنے کی سہولت حاصل نہیں ہے،
  - جبکہ عراق، افغانستان اور لیبیا وغیرہ میں استعماری ساز شیش عروج پر ہیں۔
- مگر عالم اسلام کی قیادتوں کو اس طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہے اور وہ اپنی ترجیحات اور مفادات کی دنیا میں گام ہو کر رہ گئی ہیں۔ امریکہ بہادر افغانستان سے فوجیں نکال لینے کے ارادے کا اظہار کرتے ہوئے بھی وہاں کسی نہ کسی صورت میں اپنی ناگزینگی کے جتن کر رہا ہے، اور اقوام متعدد کشمیریوں کے ساتھ استصواب رائے کرنے کا وعدہ دہراتے ہوئے بھی اس وعدہ کی تکمیل کیلئے کسی پیشافت پر آمادہ نہیں ہے، جبکہ امت مسلمہ حیرت و اضطراب کے ساتھ اپنی قیادتوں کا منہ دیکھ رہی ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی آج ہمارے سامنے ایک زندہ حقیقت کی صورت میں جلوہ گر ہے کہ تداعیت علیکم الامم تداعی الاکلة علی قصعتها دنیا کی قومیں تم مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے تیار دست رخوان پر کوئی میزبان اپنے مہمان کو کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ آج ہم مسلمان دنیا کی قوموں کے سامنے ”ترلحہ“ کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں اور استعماری عزائم رکھنے والی ہر قوم حسب استطاعت اپنا حصہ وصول کرنے میں مصروف ہے۔ یقیناً یہ اس نوازدیتی دوڑ ہانغلی تیج ہے جو مسلم ممالک اوقام نے گذشتہ وصدیوں کے دوران مختلف آقاوں کی غلامی میں گزارا ہے، اور اس دوران سب سے زیادہ زور مسلمانوں کو ایمان و عقیدہ سے محروم کرنے، ان کی تہذیبی و اخلاقی اقدار کو ختم کرنے، اور ان پر دین و ثقافت کے ذوق و احساس تک سے محروم قیادتیں مسلط کرنے پر رہا ہے، چنانچہ آج اسی نوعیت کی قیادتیں عالم اسلام کی پاگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں اور ہم آزاد کھلانے کے باوجود ”ریبوت کنٹرول غلامی“ کے حصار میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس سال حج کے موقع پر میدان عرفات میں اپنے خطبے کے دوران فضیلۃ الشیخ محمد بن حسن آل شیخ حفظہ اللہ تعالیٰ نے اسی نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہمارے خیال میں سب سے زیادہ قابل غور اور لائق توجہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے مسائل و مشکلات پر قابو پانے کیلئے کچھ نہیں کر سکیں گے۔

ہماری سیاسی صورتحال یہ ہے کہ سماں گے لگ بھگ حکومتیں اور فوجیں رکھنے کے باوجود ہم اپنے فحیلے خود کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ہمارے معاشر وسائل میں نہیں ہیں، اور ہماری تہذیب و ثقافت مسلسل یلغارکی زد میں ہے جس کے باعث ہم اپنی نسل کے عقیدہ و ایمان کے حوالے سے بھی عدم تحفظ کا شکار ہو چکے ہیں، بلکہ فکری اور تہذیبی طور پر نسل ہمارے ہاتھوں سے نکلتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ مشکل صورتحال سے اہل دین دوچار ہیں جن کیلئے خدمات سر انجام دینے کا کام کھن سے کھن تر ہوتا جا رہا ہے کہ دین کی بات کرنا، کسی دینی تقاضے کی طرف حکمرانوں کو توجہ دلانا، اور دینی اقدار و روایات کے تحفظ کی خاطر آواز اٹھانا بتدریج ”جرم“ سمجھا جانے لگا ہے۔ اور معاملہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا ہے کہ دین کی بات کرنا کالقابلض علی الجمر جلتے انگارے کو ہاتھ میں لینے کے مترادف ہو جائے گا۔ مگر ان حالات میں سب سے زیادہ ذمہ

داری بھی اہل دین ہی کی بتی ہے کہ مایوسی کی دلدل میں ہستق چلے جانے والی امت کا عالم اس باب میں آخری سہارا بہر حال وہی ہیں اور جو بھی کرنا ہے انہوں نے ہی کرنا ہے۔

بسم اللہ تعالیٰ ہمارے پاس اکابر کی جدوجہد کا سلسل موجوہ ہے، ان کی روایات کا اثاثہ محفوظ ہے اور قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ فقہی احکام و قوانین کا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، ہمیں نہ صرف خود کو اس سنگین صورتحال میں امت کی راہنمائی اور قیادت کیلئے مستعد رکھنا ہے بلکہ نئی نسل کو بھی اس کیلئے تیار کرنا ہے، اور اپنے علمی، دینی اور روحانی ماضی کے ساتھ واپسی کو مختتم رکھتے ہوئے رجوع الی اللہ کا بطور خاص اہتمام کرنا ہے کیونکہ اصل قوت وہی ہے اور فیصلے وہیں ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اہل دین کے تمام طبقوں کو اس نازک وقت میں اپنے اپنے فرانکض صحیح طور پر سراج جام دیتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## کشمیر اور افغانستان کی تازہ صورتحال پر ایک نظر

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ ستمبر ۱۹۷۴ء

پاکستان کے آرمی چیف جزل قمر جاوید باغوہ اور امریکہ کی سٹرل کمانڈر جزل کینتھ میکنزی کے درمیان گذشتہ روزبی ایچ کیو راول پنڈی میں ہونے والی ملاقات خطہ کی موجودہ صورتحال بالخصوص کشمیر اور افغان مسئلے کے حوالے سے انہائی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے دور رہ نہ کی تو قعہ کی جاری ہی ہے۔

افغانستان کے حوالے سے امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان ایک عرصہ سے جاری مذاکرات اچانک ڈیڑلاک کا شکار ہو گئے ہیں اور یہاں اس وقت جب کہ مذاکرات کے پایہ تجھیل تک پہنچنے کی خبروں کے ساتھ ساتھ معاهدہ کیلئے صدر امریکہ کے ساتھ افغان طالبان کے وفد کی ملاقات کی تاریخ ہجت بھی تعین ہو چکتا، صدر ٹرمپ نے اچانک مذاکرات روک دینے کا اعلان کر دیا ہے جس سے معاملات ایک ڈرامائی رخ کی طرف مڑ گئے ہیں۔ یہن الاقوای حلک مذاکرات کی اچانک منسوخی کے اس عمل کو دانتہ ہاوس، پیٹنٹا گان اور امریکی اسٹیبلمنٹ کے درمیان معاهدہ کے معاملہ میں انڈر اسٹینڈنگ کے فقدان کا تیجہ قرار دے رہے ہیں جبکہ صدر ٹرمپ نے یہ کہہ کر اس کا سارا ملبہ طالبان پر ڈال دیا ہے کہ مذاکرات کے آخری مرحلہ میں کابل میں ان کی طرف سے کیا جانے والا حملہ اس کی فوری وجہ بنا ہے۔ حالانکہ اس قسم کے جملے مذاکرات کے دوران امریکی کمپ کی طرف سے بھی افغان شہریوں اور طالبان کے خلاف مسلسل جاری رہے ہیں، اور ابھی چند روز قبل ایسے ہی ایک حملہ میں بہت سے افغان شہری شہادت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

افغان طالبان سے اصرار کے ساتھ یہ تقاضہ کیا جا رہا ہے کہ وہ معاهدہ سے قبل جنگ بندی کا اعلان کریں، مگر امارت اسلامیہ افغانستان کا کہنا ہے کہ معاملات کا حقیقی طور پر باضابطہ اعلان ہو جانے سے قبل وہ سیز فائز کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کی یہ بات دو حوالوں سے قبل توجہ ہے، ایک اس لیے کہ وہ خود امریکی اتحادی افغان فورسز سے معاهدہ کے باضابطہ اعلان سے پہلے فائز بندی کا تقاضہ نہیں کر رہے، اور دوسرا اس حوالے سے کہ افغان عوام اس سے قبل

جنیوامعاہدہ کی صورت میں اس چال کا شکار ہو چکے ہیں کہ رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد کے معاملات طے کیے بغیر معاہدہ کا اعلان افغانستان کو ایک نئے بھر ان اور خلفشار میں دھکلنے کا باعث بن گیا تھا۔ باخبر حضرات جانتے ہیں کہ اس موقع پر جزوی خلائق شہید گا موقف یہ تھا کہ معاہدہ سے پہلے اس کے بعد کے معاملات سیٹ کر لیے جائیں تاکہ رو سی فوجوں کی واپسی کے بعد کوئی نیا بھر ان کھڑا نہ ہو جائے، مگر ان کی بات نہیں سنی گئی اور جنیوامعاہدہ کرنے والوں نے من مانی کر کے افغانستان کو خانہ جنگی کی ایک نئی دلدل سے دوچار کر دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ افغان طالبان کی موجودہ قیادت اس تجربہ کے اعادہ سے پچنا چاہتی ہے اور تمام معاملات طے کرنے کے بعد فائزہ بندی کا اعلان کرنا چاہتی ہے اور یہ بات ناقابل فہم بھی نہیں ہے۔ اس لیے امریکہ اور پاکستان دونوں کی سیاسی و فوجی قیادتوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ افغان عوام کو ایک اور ”جنیوامعاہدہ“ میں کیطرفہ طور پر جگڑ دینے کی بجائے ان کی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور انہیں پوری طرح اعتماد میں لیے بغیر کسی ایسے معاہدے کا رسک نہ لیں جو خطہ میں ان کی بحالی کی بجائے کسی نئے خلفشار کا عنوان بن جائے۔

دوسری طرف مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہم آزاد کشمیر کے بزرگ عالم دین اور پاکستان شریعت کو نسل کے مرکزی نائب امیر اول مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی کے اس بیان کو انتہائی قابل توجہ سمجھتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کو بھارتی بجروتشد کی موجودہ سُکنیں صورت حال سے نجات دلانے اور انہیں اقوام متعدد کے فیضلوں کے مطابق خود ارادت کا حق دلانے کیلئے جہاد کے باقاعدہ اعلان کا آپشن بھی زیر غور لایا جائے، یہ بات جہاد کے شرعی احکام کے حوالے سے تو ہماری ذمہ داری بنتی ہی ہے مگر اس لیے بھی سنجیدہ توجہ کی طلبگار ہے کہ آزاد جموں و کشمیر کی موجودہ ریاست جہاد ہی کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی اور جہاد کا وہ شرعی فوتوں جو دو گرہ مہاراجہ کے خلاف ۱۹۴۷ء میں سرکردہ علماء کرام کی طرف سے جاری کیا گیا تھا اور جس پر عملدرآمد کے ذریعے آزاد جموں و کشمیر کے موجودہ خطہ کو آزاد کرایا گیا تھا، اس کا وجود اور تسلیم ابھی جاری ہے اور پیشترفت کا تقاضہ کر رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہے کہ حکومت آزاد کشمیر، ریاست آزاد جموں و کشمیر کے ذمہ دار مفتیان کرام کا اجلاس طلب کر کے مشترکہ موقف اور سفارشات طے کرے اور پھر اس کی بنیاد پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وفاقی وزارت مذہبی امور تمام مکاتب فکر کے سرکردہ مفتیان کرام کا قومی اجلاس منعقد کر کے مشترکہ لائجہ عمل کا تعین کرے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ جہاد کے باضابطہ اعلان کا حق صرف ریاست کو ہے اور پر ایئیٹ سیکٹر میں کوئی شخص یا ادارہ اس کا مجاز نہیں ہے، مگر ریاست کا یہ اختیار اور حق اس استحقاق کو کام میں لانے کیلئے ہے، خاموشی اختیار کرنے یا شرعی ضرورت کو نظر انداز کرتے چلے جانے کیلئے نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں حکومت آزاد کشمیر اور پاکستان کی وفاقی وزارت مذہبی امور دونوں کو اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

## "اسلام کا نظامِ سیاست و حکومت": مولانا عبد الباقی حقانی کی علمی کاوش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۹ء

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اخri رسول کی حیثیت سے انسانی معاشرہ کو جن تبدیلیوں اور اصلاحات سے نوازا ان کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور ان سماجی تغیرات و اصلاحات کی سطح صرف دعوت و تلقین کی نہیں تھی بلکہ ان کے مطابق معاشرہ کی از سر نو تشكیل بھی جناب نبی اکرم نے خود فرمادی۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے آخری رسول یہ مشکل کر کے فزت و رب الکعبۃ فرماتے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوئے تو آپ کی تعلیمات صرف اقوال و ارشادات پر مبنی نہیں تھیں بلکہ ان ہدایات و فرمودات کے مطابق ایک تشكیل شدہ مشکل سماجی ڈھانچہ دنیا کے سامنے موجود تھا جسے آپ کی تربیت یافتہ جماعت حضرات صحابہ کرام نے ایک صدی کے عرصہ میں دنیا کے تین بر اعظموں تک پھیلایا۔ اور وہ "ریاستِ مدنیہ" جو بنی کریمؐ کے جانشین حضرت ابو بکر صدیقؓ نے سنچالی تھی اس کا دائرہ الگی صدی کے آغاز تک ایشیا اور افریقہ کے بہت سے علاقوں کا احاطہ کرتے ہوئے یورپ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اور "خلافت" کے عنوان سے دنیا ایک نئے عالمی نظام سے متعارف ہو چکی تھی جس کا تسلسل مختلف اتار چڑھا کے کئی مرحلے کے باوجود ادب سے ایک صدی قبل تک دنیا کے نقشے پر موجود رہا۔

اس نظام کی بنیاد قرآن کریم کے ارشادات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن پر چلی آ رہی ہے جسے عملی شکل میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایک آئیلیں سیاسی، معاشرتی، معاشی اور سماجی ڈھانچہ کے رنگ میں پیش کیا اور فقهاء عظام رحمہم اللہ تعالیٰ ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی علمی و فقہی توجیہات اور عملی تطبیقات کی صورتیں واضح کرتے رہے۔ جیسا کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشیدؓ کے کہنے پر قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسفؓ نے "كتاب الخراج" کے عنوان سے اسلام کے معاشری احکام و قوانین کو مرتب و مدون کر کے قانون و دستور کے طور پر ان کے حوالہ کیا جو ایک عرصہ تک قانون کے طور پر نافذ العمل رہا۔ جبکہ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں " مجلسیہ الاحکام العدلیہ" اور مغل دور حکومت میں "الفتاویٰ الہندیہ" کے نام سے انتہائی قابل قدر قانونی مجموعے مرتب و مدون ہو کر بطور دستور و قانون نافذ ہوئے اور وہ آج تک بھی ہمارے علمی و فقہی ذخیرہ کا قابل قدر حصہ ہیں۔

مگر گذشتہ دو تین صدیوں کے دوران جب عالم اسلام کے بہت سے ممالک استعماری قوتوں کی غلامی کا شکار ہو گئے حتیٰ کہ خلافت عثمانیہ بھی اب سے ایک صدی قبل ختم ہو گئی تو اسلامی قوانین و احکام کی عصری تقاضوں کے مطابق توجیہ و تعبیر اور تطبیق و تنفیذ میں ریاستی کردار باتی نہ رہا۔ البتہ جو طور پر اس حوالے سے جس علمی و فقہی جدوجہد کا آغاز امام عظم حضرت ابوحنیفہؓ نے آزادانہ اجتہادات و تعبیرات اور مشاورتی اجتہاد کی صورت میں کیا تھا وہ بحمد اللہ تعالیٰ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ عالم اسلام میں بیسوں علمی و فقہی حلقوں اور شخصیات اس دور میں اس کا خیر میں مصروف عمل رہے ہیں اور

آن بھی اس کا تسلیل قائم ہے۔

نوازدیاتی دور کے ظاہری خاتمہ کے بعد مختلف اسلامی ممالک میں نفاذ شریعت کے عنوان سے اسلام کے سیاسی، معاشرتی، عدالتی اور معاشری احکام و قوائیں کی معاشرہ میں دوبارہ عملداری کیلئے مبیسوں تحریکات کا آغاز ہوا جو مدد و جر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے، مگر عصر حاضر کے سماجی تغیرات اور معاشرتی تبدیلوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی احکام و قوائیں کی تطبیق و تفہیم کی عملی صورتوں کو از سر نو واضح کرنے اور اس دوران مختلف علمی و فقہی حلقوں میں کی جانے والی علمی، فکری اور فقہی محنت کے نتائج کو اجتماعی شکل دینے کا کام بھی تشنہ ہے، حالانکہ اس کی ضرورت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔

اس تناظر میں ہمارے فاضل دوست مولانا عبد الباقی حقانی کی ایک علمی کاوش ”اسلام کا نظام سیاست و حکومت“ کے عنوان سے چند سال قبل اردو اور عربی زبانوں میں سترہ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل دو خیم جلدیوں میں سامنے آئی، جسے ”مودودی المصنفوں دارالعلوم حقانی، اکوڑہ حنفی“ نے شائع کیا ہے، تو نفاذ شریعت کی بد و چہد کے کارکن اور تاریخ و سماجیات کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی اور ایک مضمون میں اس کا اظہار بھی کیا۔ اب اسی کتاب پر نظر ثانی کر کے بہت سے اضافوں کے ساتھ مولانا موصوف نے اسے از سر نو مرتب کیا ہے اور اسے ایک ہزار کے لگ بھگ صفحات کی دو جلدیوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ روز اسلام آباد میں ایک ملاقات کے دوران مولانا عبد الباقی حقانی نے اس کتاب کائی سرے سے مرتب شدہ مسودہ دکھایا تو یہی خوشی دو چند ہو گئی۔ مولانا موصوف کا تعلق چونکہ افغانستان سے ہے اس لیے میں اس خوشی کی معنویت کو الفاظ میں بیان نہیں کر پا رہا کہ انہوں نے آنے والے دور پا خصوص افغانستان میں ”امریتِ اسلامیہ افغانستان“ کی مسلسل پیشہ فرست کو سامنے رکھتے ہوئے مستقبل کی ناگزیر ضروریات کیلئے کس قدر وقیع، جامع اور متنوع علمی و فقہی ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبولیت و شمرات اور رضا سے بہرہ ور فرمائیں، اور نہ صرف افغانستان بلکہ پورے عالم اسلام کو اس سے استفادہ کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

البتہ اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے کہ قدیم و جدید فقہی و قانونی ذخیرہ اور عصری نظاموں پر گہری نظر رکھنے والے کچھ اصحاب علم و دانش آگے بڑھیں اور اس سلسلہ میں گذشتہ نصف صدی کے دوران مختلف علمی و فقہی دائروں میں جو وقوع کام ہوا ہے اس پر نظر ڈال کر حضرت امام ابو یوسف<sup>ؐ</sup> اور سلطان اور نگزیب عالمگیر<sup>ؐ</sup> کی سنت کا احیا کرتے ہوئے آنے والے حالات و ادوار کیلئے اسے ایک مرتب دستوری اور قانونی ڈھانچی کی شکل دے دیں تاکہ اسے کسی بھی موقع میسر آنے پر عملی نظام کے طور پر بروئے کار لایا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی صورت پیدا فرما دیں، آمین یارب العالمین۔

## کیا امریکہ مشرقِ وسطیٰ سے نکلنا چاہتا ہے؟

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۱۹ء

روزنامہ اسلام لاہور میں ۲۵ اکتوبر ۲۰۱۹ء کو شائع ہونے والی یہ خبر ملاحظہ فرمائیے:

”امریکی صدر ڈنالڈ ٹرمپ نے مشرقِ وسطیٰ کو خون آلو دمٹی قرار دیتے ہوئے خطے سے نکلنے کا عہد کیا ہے، وائٹ ہاؤس میں خصوصی خطاب کرتے ہوئے صدر ٹرمپ نے کہا کہ امریکہ مشرقِ وسطیٰ کی خون آلو دمٹی چھوڑ دے گا، امریکی صدر نے مشرقِ وسطیٰ کے تعلقات کی نوعیت تبدیل کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ مشرقِ وسطیٰ میں بہت امریکی سرو مز کے ممبران مارے گے، امریکہ کواب مزید دنیا کے پولیس میں کے طور پر رہنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم باہر نکل رہے ہیں اور اب کسی اور کو اس خون آلو دزمیں پر لڑنے دیں، ہماری فوج کی نوکری دنیا کی پولیس کی نہیں ہے۔

ٹرمپ کا کہنا تھا کہ دیگر اقوام لازمی آگے ہیں اور اپنے حصے کے مطابق کام کریں، میں مختلف طریقے سے انتخاب پر قائم ہوں جو امریکہ کو کامیاب کر سکیں، امریکی صدر نے مزید کہا کہ شام سے بڑے پیمانے پر انخلاء کے باوجود کچھ فوجی دستے شام کی آنکھ تنصیبات پر موجود ہیں گے کیونکہ ہم نے تیل کو محفوظ کر دیا ہے اور اسی لیے امریکی افواج کی کم تعداد ایسے علاقوں میں موجود ہے گی جہاں تیل موجود ہے۔

یاد رہے کہ ترکی کی جانب سے شمالی شام میں ۱۸ اکتوبر سے کربداغیوں کے خلاف بہار امن (پیس اسپر گنگ) کے نام سے فوجی آپریشن شروع کیا گیا تھا، ترکی اپنی سرحد سے متصل ۳۲ کلو میٹر تک کے شامی علاقے کو محفوظ بنانے کے لئے ۲۰ واں سالاکھ سے زائد شامی مہاجرین کو وہاں ٹھہرانا چاہتا ہے اور ترکی کا مطالبہ ہے کہ کردیشیا شمالی شام کی ۳۲ کلو میٹر کی حدود سے باہر چلی جائے اور یہ علاقہ ”سیف زون“ کہلا سکے۔“

یہ خبر پڑھتے ہوئے ایک دفعہ اس خیال سے ہم نے خود کو چیک کیا کہ کہیں نیند کی حالت میں خواب تو نہیں دیکھ رہے؟ پھر یہ شک ہوا کہ شاید صدر ٹرمپ اس گفتگو کے دوران نارمل حالت میں نہ ہوں۔ مگر یہ سوچ کر اصل بات سمجھ آگئی کہ یہ صدر ٹرمپ کی منظم حکمت عملی کا حصہ ہے جس کا ایک مظاہرہ افغانستان سے ان کے نکل جانے کے اعلان کے حوالے سے ہم دیکھ چکے ہیں، کیونکہ اسی نوعیت کے ارادے کا اظہار انہوں نے افغانستان کے بارے میں کیا تھا اور اس کیلئے افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کا ایک لمبا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا، مگر جب دیکھا کہ افغانستان سے امریکی افواج کی واپسی ان کے طے کردہ منصوبے اور مستقبل کے عزم کے حوالے سے نہیں ہو رہی تو اچانک ان مذاکرات کو ختم کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ ہمارے خیال میں ان کے ذہن میں یہ منصوبہ ہے کہ افغانستان سے امریکی اتحادی باور دی افواج کی تو

و ایسی ہو جائے مگر اس خطے کا نظرول بدستور ان کے بے ودی رضا کاروں کے ہاتھ میں رہے تاکہ ان کے مقاصد اور پالیسیوں کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ مگر افغان طالبان نے اس حکمت عملی کو بھانپ کر حکمت و تدبیر اور حوصلہ و جرأت کے ساتھ اس کا سامنا کیا جس کے تیجے میں اب امریکہ بہادر طالبان کے ساتھ مذاکرات کا نیا دور شروع کرنے سے پہلے اپنی حکمت عملی کو ”میک اپ“ دینے میں مصروف ہے۔

اس دورانِ مشرق و سطی کے بارے میں صدر ٹرمپ کا مذکورہ بالا ارشاد گرامی سامنے آیا ہے تو ہمیں یہ بھی ان کی اسی پالیسی کا تسلسل دکھائی دے رہا ہے جو افغانستان کے حوالے سے ہم دیکھے چکے ہیں بلکہ ابھی دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ شام میں ”تیل کی حفاظت“ کیلئے کچھ امریکی فوجی دستوں کی مستقل موجودگی کو انہوں نے ابھی سے ضروری قرار دے دیا ہے اس لیے اس سے مشرق و سطی کی صورتحال میں کسی بہتر تبدیلی کی توقعات کی کوئی کم از کم ہمیں سمجھ میں نہیں آ رہی۔

امریکہ بہادر نے دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست اور یورپی قوتوں کے متحده محاذاہ فتح کے بعد برطانیہ اور دیگر مغربی استعماری قوتوں کے مصلح ہو جانے کے باعث ”عالی پوپیس میں“ کا کردار سنبھالا تھا، جس کا آغاز ناگاہ ساکی اور ہیر و شیما میں اس کی طرف سے ایسی بمباری سے کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے مغرب کے استعماری عوام اور ایجنسیوں کی قیادت ابھی تک امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور اس نے تایوان، کوریا، جاپان، ویتنام، افغانستان، عراق، شام، فلسطین، بوسنیا، صومالیہ اور دنیا کے دیگر خطوں میں جو کردار اس حیثیت سے سرانجام دیا ہے وہ سب کے سامنے ہے جس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ اسے اس کے تناظر اور میک اپ کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس کیلئے صدر ٹرمپ اپنی کے امریکی صدور سے مختلف روپ دکھا کر دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ امریکہ بدل رہا ہے، بدلنا چاہتا ہے اور بدلنے کی حکمت عملی بروئے کار لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جبکہ وہ یہ بات اپنی طرح جانتے ہیں کہ ”تبدیلی“ تقریروں اور رسمی اعلانات سے نہیں آتی، اس کیلئے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنا پڑتی ہے، دوسری طرف کے اصل فریقوں کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے اور عملی اقدامات کرنا پڑتے ہیں۔ اس سب کچھ کیے بغیر تبدیلی کی کوئی بات دنیا کی آنکھوں میں دھول جھوکنے کے سوا آخر اور کیا کہلا سکتی ہے؟

## مولانا سمیع الحق شہید اور جہاد افغانستان

۵ نومبر ۲۰۱۹ء کو دارالعلوم مدنیہ ڈسکہ میں منعقدہ سیمینار سے خطاب کا ایک حصہ

مولانا سمیع الحق شہید گی تگ و تاز کا ایک بڑا دائرہ جہاد افغانستان بھی ہے جس کیلئے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خلک بلاشبہ علمی و فکری ”بیس کیمپ“ ثابت ہوا۔ دارالعلوم حقانیہ کو دارالعلوم دیوبند ثانی کہا جاتا ہے جو میرے خیال میں اس حوالے

سے درست ہے کہ جنوبی ایشیا اور سلطی ایشیا کے سلسلہ اکوڑہ ننگک میں پیچھے کر حضرت مولانا عبد الحمید اور دارالعلوم حقائیق نے دارالعلوم دیوبند کے فیضان کو سلطی ایشیا کی ریاستوں تک پہنچایا، جبکہ روئی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان کو علمی و فکری پشت پناہی مہیا کی۔ میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ جب روئی استعمار نے افغانستان کو اپنے اشور سوچ کے دائرہ میں شامل کرنے کیلئے فوجیں اور اس کے عسکری سلطاط کے خلاف علماء افغانستان نے جہاد کا اعلان کیا تو پاکستان میں انہیں علماء کے حلقوں میں سب سے زیادہ قین بزرگوں کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہوئی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحمید، حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود پاکستان میں جہاد افغانستان کے پشتیابن بنے اور اسے مکمل سپورٹ فراہم کی۔ اس سارے عمل میں مولانا آمیح الحنفی کا لیدی کردار رہا ہے اور انہوں نے نہ صرف علم و قلم کے ذریعے بلکہ تحریک و سیاست اور رائے عامہ کو منظم و ہموار کرنے میں بھی مسلسل محنت کی۔۔۔۔۔ (روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰۱۹ء۔ نومبر)

## معاہدات: ذمہ داری یا ہتھیار؟

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰۲۱ء۔ ۱ اپریل

امریکہ کے صدر مسٹر جو بائیڈن نے افغانستان سے فوجوں کے انخلا میں یک طرفہ طور پر چار ماہ کی توسعی کا اعلان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ معاہدہ کی مدت کے دوران انخلا مشکل ہے اس لیے اب افغانستان سے امریکی فوجوں کا انخلا میتی کی وجہ سے تباہ کے دوران مکمل ہو گا اور وہ بھی چند شرائط کے ساتھ مشروط ہو گا۔ اس کے ساتھ جرمی کے وزیر دفاع نے بھی کہا ہے کہ افغانستان سے نیٹو افون کا انخلا تباہ میں ہو گا۔

ایک عرصہ سے قطر میں امریکی حکومت اور افغان طالبان کے درمیان مذکورات کا سلسہ چل رہا ہے جس کے ایک مرحلہ میں دنیا نے یہ خوشخبری سنی کہ امریکہ نے افغانستان سے فوجوں کے انخلا کیلئے ۲۰۲۱ء آخری تاریخ مقرر کر دی ہے، اس دوران افغانستان کے مستقبل کا نقشہ طے کرنے کیلئے بین الافغان مذکورات کا آغاز ہوا جو بھی تک جاری ہیں جبکہ اس مسئلہ پر اب تک متعدد بین الاقوامی کانفرنسیں ہو چکی ہیں اور ترکی میں ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔

افغان مسئلہ کا تاریخی تناظر یہ ہے کہ افغانستان میں ۱۹۷۹ء کے آخر میں روئی افون کی آمد پر افغان قوم مزاحمت کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی اور افغانستان کی آزادی و خود مختاری کے ساتھ ساتھ اسلامی ثناخت کے تحفظ اور شرعی نظام کے عملی نفاذ کیلئے جہاد کے عنوان سے سوویت یوینین کی مسلح یلغار کے سامنے سینہ سپر ہو گئی۔ جہاد اور نظام شریعت کے حوالے سے پاکستان سمیت دنیا بھر کی مسلم اقوام و ممالک نے افغان عوام کی اس جدوجہد کا ساتھ دیا، جبکہ امریکہ اور سوویت یوینین کے درمیان ایک عرصہ سے جاری کولڈ وار کے پس منظر میں امریکہ اور اس کے حامی ممالک بھی جہاد افغانستان کے پشت پناہ بن گئے جس کے نتیجے میں افغان قوم افغانستان سے روئی افون کی واپسی کے مشن میں سرخو ہوئی۔ مگر اس کے بعد افغانستان کے مستقبل کی تشكیل میں راستے الگ ہو گئے:

- افغان مجاہدین اور ان کے دنیا بھر کے دینی پشت پناہوں کا موقف یہ تھا کہ افغان قوم کی تہذیب و روایات اور روس کے خلاف جنگ کے شرعی عنوان ”جہاد“ کے باعث افغانستان میں ایک اسلامی شرعی حکومت کا قیام اس تمام ترجود و جہد کا فطری اور مطلق تقاضہ ہے۔
- جبکہ امریکہ سمیت ان تمام حلقوں کی، جو اسے محض سوویت یونین کے خلاف ایک جنگ تصور کرتے ہوئے شریک ہوئے تھے، مسلسل یہ کوشش ہے کہ افغانستان سوویت یونین کیپ سے نکلنے کے بعد ایک اسلامی نظریاتی ریاست نئی کی بجائے عالمی سطح پر ان کے کیپ کا حصہ بن جائے اور ان کے بین الاقوامی مقاصد کیلئے استعمال ہوتا رہے۔ اس ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے افغانستان سے سوویت افواج کے انخلا کے موقع پر افغانستان کو ایک مختار قومی اور نظریاتی حکومتی ڈھانچہ فراہم کرنے سے جنیوا معاهدہ کے ذریعے عمد़ اگر یہ کیا گیا جس کے نتیجے میں افغانستان خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔

اور پھر اس نئی صورتحال کے رد عمل میں جہاد افغانستان کے نظریاتی کارکن طالبان کے عنوان سے سامنے آئے جو مسلسل جدو جہد کے بعد افغانستان پر کنٹرول حاصل کر کے ”امریتِ اسلامیہ افغانستان“ کے نام سے حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ طالبان نے افغانستان کو خانہ جنگی سے پاک کر کے کچھ عرصہ کامیابی کے ساتھ حکومت کی مگر گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد وہ امریکی عنایت کا شکار ہوئے اور امریکہ کی قیادت میں نیٹو افواج نے اس خط میں وہی محاذ سنبھال لیا جس کی کمان اس سے قبل سوویت یونین نے کی تھی۔ گویا یہ وہی جملہ آوروں کو ملک سے نکالنے کیلئے افغان قوم کی وہی جنگ لوث آئی جو روسی افواج کے خلاف تھی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اب مد مقابل روس نہیں بلکہ امریکہ تھا۔ البتہ جہاد افغانستان کے اس نئے راؤنڈ کے اهداف اور مقاصد بھی وہی تھے کہ افغانستان کو بہر حال ایک خود مختار، آزاد اور اسلامی ریاست بنایا جائے۔

تاریخ نے اس کے بعد یہ منظہ دیکھا کہ افغان قوم کی حریت پسندی اور اسلامیت کو زیر کرنے میں روس کی طرح امریکہ کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور بالآخر اسے افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کی میز پر آنا پڑا جس کے مختلف مراحل کے بعد یہ طے پایا کہ امریکہ اور نیٹو افواج کیم مئی ۲۰۲۱ء تک افغانستان سے نکل جائیں گی اور اس دوران بین الاقوامی مذاکرات کے ذریعے افغانستان کے مستقبل کی تقسیم کری جائے گی۔ مگر امریکہ کی طرف سے اس میں چار ماہ کی توسعی کا اعلان کیا گیا ہے جبکہ افغان طالبان کا یہ موقف سامنے آیا ہے کہ معاهدہ کے بعد سے اب تک کی مدت میں امریکہ اور اس کے سہولت کاروں کا ناٹھی میں جو طرز مسلسل چلا آ رہا ہے اس کے پیش نظر اس توسعی مدت کا استعمال بھی وقت گزاری اور امریت اسلامی افغانستان کا راستہ روکنے کے اقدامات میں صرف ہوتا نظر آتا ہے، اس لیے وہ توسعی کو مسترد کرتے ہیں اور اگر کیم مئی تک امریکی افواج نے افغانستان سے انخلاء مکمل نہ کیا تو وہ معاهدہ سے آزاد ہوں گے اور جو شرائط انہوں نے قبول کی تھیں وہ ان کے پابند نہیں رہیں گے۔ ہمارے خیال میں دو باتیں خاص طور پر تاکتی توجہ ہیں:

1. ایک یہ کہ اصل مسئلہ مدت کا نہیں اعتقاد کا ہے، اگر امریکہ اب تک معاهدہ پر عملدرآمد میں سنجیدہ دکھائی نہیں دیا تو اس نے اپنا اعتقاد خود خراب کیا ہے، اس کا فائدہ اسے نہیں دوسرے فریق کو ملنا چاہیے اور امریکہ کے سہولت کاروں کو یہ بات بہر حال ملحوظ رکھنی چاہیے۔
2. دوسری بات یہ کہ مسلسل مشابہات و تجربات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انسانی حقوق کی طرح بین الاقوامی معاهدات بھی ذمہ داری کی وجہ پر تحریکی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں، جو انسانی تعلیمات سے اخراج اور سارے معاملات انسانی عقل و دانش کے دائرے میں طے کرنے کے فلسفہ کا متعلق یتیج ہے کہ عقل کے ساتھ طاقت اور فریب کاری کا جوڑ اپنے لیے ہر بات کا جواز فراہم کر لیتا ہے، جبکہ طاقت سے محروم اقوام و ممالک اس کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں، آج کے عالمی فلسفہ کے تناظر میں دنیا بھر میں ہر سطح پر یہی کچھ ہو رہا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ بین الاقوامی سطح پر گذشتہ ایک صدی کے دوران ہونے والے معاهدات اور ہمارے ہاں پاکستان میں بھی بالخصوص نفاذ شریعت کے سلسلہ میں کیے جانے والے معاهدات جس کی تازہ ترین مثال ”تحریکِ لیک پاکستان“ کے ساتھ کیا جانے والا معاهدہ ہے، کو موضوع بحث بنانے کا تجویز کیا جائے تو یہ بات لکھ کر سامنے آئے گی کہ انسانی تعلیمات کی بنیاد پر انسانی اخلاقیات ہی اقوام و ممالک کو کسی بات کا پابند نہ اسکتی ہیں، ورنہ محض انسانی عقل و دانش طاقت اور فریب کاری کے زور پر اسی قسم کے مناظر دنیا کا مسلسل دکھائی رہے گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بدایت کارستہ نصیب فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

## امریکہ کی عالمی چودھراہٹ کا نیا راؤنڈ

روزنامہ اسلام، لاپور---مئی ۲۰۲۱ء

خبری اطلاعات کے مطابق امریکی صدر جو بائیڈن نے صدارتی دفتر کے سودن مکمل ہونے پر کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ دنیا کی قیادت سنبھالنے کیلئے تیار ہے۔ انہوں نے اس موقع پر کہا کہ افغانستان سے فوجیں واپس بلانے کا میکی وقت ہے، ہمیں پاکستان اور افغانستان کے درمیان اعتماد بحال کرنا ہے، ہم چین کے ساتھ تصادم اور روس کے ساتھ کشیدگی نہیں بڑھانا چاہتے وغیرہ وغیرہ۔

امریکہ نے سوویت یوینین کے ساتھ سرد جنگ کے خاتمہ اور افغانستان سے رو سی افواج کی پسپائی کے بعد ”نیوورلڈ آرڈر“ کے عنوان سے دنیا کی بیانیاتی شرکت غیرے چودھراہٹ کا پہلے سے اعلان کر رکھا ہے جس کے مختلف مراحل سے دنیا کی متعدد اقوام گزر چکی ہیں، اس لیے ہم یہ نہیں سمجھ پائے کہ دنیا کی قیادت پھر سے سنبھالنے کا یہ اعلان کس مفہوم میں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نیوورلڈ آرڈر کا سلسلہ آگے بڑھتا نہ کیجئے کر عالمی چودھراہٹ کا کوئی بیفارمولہ امریکی قیادت کے

ذہن میں آگیا ہے اور وہ اسے پھر سے دنیا کی قیادت سنبھالنے کی تیاری قرار دے کر نئی صفت بندی کی کوشش کر رہی ہے۔ ”و عالمی جنگوں کے بعد بربانوی استعمار کے اضھاراں اور عالمی معاملات پر اس کی گرفت کمزور پڑتے دیکھ کر امریکہ نے ناگاساکی اور ہیر و شیما میں دوائیں دھماکوں کے ذریعے لاکھوں بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر دنیا کی بجود ہڑاہٹ کے میدان میں قدم رکھا تھا، اس کے بعد سے امریکہ بہادر اس رخ پر مسلسل آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کے بعد نیور لڈ آرڈر کا اعلان اس کا نقطہ عروج تھا۔

اس تناظر میں صدر جوبائیڈن کا دنیا کی قیادت پھر سے سنبھالنے کا اعلان دنیا کی اقوام کیلئے ایک یا چلتی بھاجا سکتا ہے اور ہمارے خیال میں مظلوم و مغلوب اقوام کو خاص طور پر اسے اسی مفہوم میں لینا چاہیے۔ اس موقع پر مناسب ہے کہ امریکی بجود ہڑاہٹ کے اس دور پر ایک نظر ڈال لی جائے جو اس نے عالمی سیاست میں اپنی دھماکہ خیز اثری سے شروع کیا تھا اور اب وہ اس کے نئے راؤنڈ کی تیاری میں دھکائی دے رہا ہے۔

- امریکہ نے اسرائیل قائم کر کے عربوں اور فلسطینیوں کے انسانی و شہری اور قومی و مذہبی حقوق کی پامالی کے ساتھ ساتھ ان کے قتل عام اور در برداری کے جس سلسلہ کی پشت پناہی شروع کی تھی وہ ابھی تک جاری ہے۔
- امریکہ بہادر نے جہاں مختلف ممالک میں آمریتوں کو سپورٹ کیا وہاں لااؤں، کمبوڈیا، ویتنام، افغانستان، عراق اور دیگر ملکوں میں فوج کشی کر کے ان اقوام و ممالک کی آزادی و خود مختاری کو ایک مخصوص اجتنبے کے تحت پامال کیا۔

- اقوام متحده کا قیام دراصل اقوام و ممالک کے درمیان جنگ کو روکنے اور تباہات کو نمٹانے کیلئے عمل میں لایا گیا تھا۔ مگر امریکہ نے اس عالمی فورم کو نہ ہب کے معاشرتی کردار کے خاتمہ، مغربی فکر و فلسفہ کی بالادستی، اور اقوام و ممالک کی خود مختاری سلب کرنے کیلئے انتہائی مہارت کے ساتھ استعمال کیا۔
- خاص طور پر مسلم ممالک میں نفاذ اسلام کا راستہ روکنے اور اس کے مقابلہ میں لامد ہبیت اور مغربی تہذیب کو سپورٹ کرنے کیلئے اس کی مسلسل اور ہمہ گیر کاروائیاں بھی اب مخفی نہیں رہیں۔
- انسانی حقوق کے نائل کو نہ ہب و عقیدہ اور آسمانی تعلیمات سے بے بادوت کیلئے تھیار بنا دینا امریکہ بہادر کا خصوصی کارنامہ ہے جس کے زخمی انسانی ایک عرصہ تک برداشت کرتی رہے گی۔

ایک موقع پر امریکہ میں ہی انسانی حقوق کے موضوع پر ایک محفل میں گفتگو کے بعد کچھ دوستوں نے سوال کیا کہ امریکہ میں انسانی اور شہری حقوق کی پاسداری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ شخصی انسانی و شہری حقوق کی پاسداری میں امریکہ کا ماحول اور نظم پاٹی دنیا سے بہتر دکھائی دیتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ انسانی و شہری حقوق اور مذہبی و سیاسی آزادی صرف افراد کیلئے ہے یا اقوام و ممالک کا بھی اس حوالے سے کوئی حق ہے؟ اور پھر اپنے شہریوں کے حقوق کی حفاظت کیلئے دیگر اقوام و ممالک کی خود مختاری اور آزادی کو پامال کرتے چلے جانا انسانی حقوق کی کوئی خدمت ہے؟ چنانچہ اس ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کی قیادت کے نئے راؤنڈ کیلئے صدر جوبائیڈن کے حالیہ اعلان کے اہداف کو سمجھنا

کوئی مشکل کام نہیں ہے اور اقوام و ممالک کو اس کیلئے تیار ہنا چاہیے۔ اس موقع پر صدر جو بائیڈن سے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جناب صدر! ہم امریکہ اور امریکی قوم کا احترام کرتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ امریکہ نے برطانوی استعمار کی غلامی سے کس طرح آزادی حاصل کی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ شمال اور جنوب کی خوفناک خانہ جنگلی کے بعد امریکی قیادت نے دنیا سے غلامی کے خاتمه اور محروم و مغلوب اقوام و ممالک کی دادرسی کیلئے کن جذبات و عزائم کا اظہار کیا تھا۔ ہم ابراہام لنکن، جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن کے خیالات سے واقف ہیں اور چاہتے ہیں کہ امریکہ کی موجودہ قیادت بھی ان کے خیالات اور اعلانات کو ایک بار پھر پڑھ لے کہ ہم ان کے امریکہ کا احترام کرتے ہیں اور عالمی سیاست میں اس امریکہ کے جائز مقام کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں۔ مگر اس تاریخی حقیقت کو جھٹایا نہیں جاسکتا کہ آج کا امریکہ وہ نہیں ہے۔ غلامی کے خاتمه کا پرچم اٹھانے والا امریکہ آج اقوام و ممالک کی آزادی و خود منظری پر ٹکینیں تانے کھڑا ہے اور انسانی حقوق کی پاسداری کا یہ دعویدار آج پوری دنیا میں اہل مذہب بالخصوص مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور آزادی و خود منstrarی کیلئے ٹکینی خطرہ کا روپ دھارے ہوئے ہے، اس لیے ہم صدر جو بائیڈن کے اس اعلان کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ البتہ امریکہ اگر اپنی مذکورہ بانی شخصیات کے عزائم اور اعلانات کی طرف واپس چانے کیلئے سخیگی کے ساتھ تیار ہو تو اس کے ساتھ عالم اسلام کے ثابت معاملات کی بات سوچی جاسکتی ہے، ورنہ موجودہ امریکہ جتنی بار بھی عالمی قیادت کے کسی راؤنڈ کا اعلان کرے ملت اسلامیہ اور مسلم ممالک کے عوام اس سے کسی خیر کی کوئی توقع وابستہ کرنے کی بجائے اپنی ملی و مذہبی روایات کے تحفظ و دفاع کیلئے مسلسل مصروف کار رہیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## امریکہ کا پاکستان سے فوجی اڈوں کا تقاضہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۸ جون ۲۰۲۱ء

۳ جون کو لاہور میں ”ملی مجلس شرعی پاکستان“ اور ۵ جون کو ”علمی مجلس تحفظ ختم نبوت“ کے اجلاسوں میں شرکت ہوئی اور مختلف دینی راہنماؤں اور احباب کے ساتھ پیش آمدہ امور پر تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ ہم عنوانات کم و بیش ملک بھر کے دینی حلقوں میں مشترک طور پر درپیش ہیں اور آراء و خیالات میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، البتہ اجتماعی جدوجہد کیلئے علماء کرام اور دینی کارکن ہر جگہ کسی متحرک قیادت کے سامنے آنے کے منتظر ہیں بلکہ بعض حلقوں میں اس سلسلہ میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے کہ عوامی سطح پر قیادتوں کا مشترکہ موقف توضیح ہے مگر جدوجہد کا رخ اور طریق کا رسانے آنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ ان مسائل پر ان کاموں میں ہم پہلے بھی متعدد بار گزار شات پیش کرچکے ہیں، البتہ ایک بار پھر نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ افغان طالبان اور امریکہ کے مذاکرات کے نتیجے میں افغانستان سے امریکی فوجوں کے انخلا کے بعد

امریکہ نے پاکستان سے فوجی اڈوں کا جو تقاضہ کیا ہے وہ بھی ایک اہم مسئلہ کی صورت اختیار کر گیا ہے اور سنجیدہ دینی و سیاسی قیادتوں کی طرف سے اس کی دو ٹوک مخالفت کی جا رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی بھی عالمی طاقت کو اپنے ملک میں فوجی اڈے فراہم کرنے کو ملکی سالمیت کیلئے چیلنج ہے جسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ ہمارا سبقہ تجربہ ہے کہ ہم نے نائیں الیون کے بعد امریکہ کو افغانستان میں کارروائی کیلئے صرف راہداری فراہم کی تھی جس کے لئے اور ملکیں تباہ اب تک ہم بھلگت رہے ہیں، اس تجربے کے بعد ملک کا کون محب وطن شخص امریکہ کو فوجی اڈے دینے کی بات آرام سے نہیں سن سکتا۔ بہر حال یہ مسئلہ بھی عینی میں دوسرے مسائل سے کم نہیں ہے اور قوم اس حوالے سے واضح اور دو ٹوک انکار سننا چاہتی ہے۔

## سوویت یونین، افغانستان، امریکی اتحاد

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۲۳ جولائی ۱۹۷۱ء

یہ اس دور کی بات ہے جب افغانستان سے سوویت یونین کی افواج کی واپسی کے بعد امریکہ "نیور لڈ آرڈر" کی طرف پیش قدیمی کر رہا تھا۔ نیٹو کے سیکرٹری جزل نے "ابھی اسلام باقی ہے" کا نعرہ لکا کر اپنی جنگ کے اگلے راہنمی کی نشاندہی کر دی تھی اور جنوبی ایشیا کے حوالے سے منع علاقائی ایجمنٹ مختلف عالمی حلقوں میں تشكیل پار ہے تھے۔ اسلام آباد میں لیفت کے کچھ دانشوروں کے ساتھ ایک نشست میں یہ بات زیر بحث آگئی کہ افغانستان میں جو جنگ لڑی گئی ہے وہ امریکہ کی جنگ تھی جس میں اسلام اور جہاد کے جذبہ کے ساتھ شریک ہو کر قربانیاں دینے والوں نے امریکہ کی یہ جنگ لڑی ہے۔ میرانظہ نظر مختلف تھا، میں نے عرض کیا کہ اس جنگ کا آغاز امریکہ نے نہیں کیا تھا بلکہ افغان عوام نے سوویت یونین کی فوج کی شکی کے بعد اپنے وطن کی آزادی اور تہذیبی اسلامی تشخص کے تحفظ کیلئے یہ جنگ شروع کی تھی جس میں دنیا بھر سے ان کے اس موقف کی حمایت کرنے والے لوگ جہاد کے عنوان سے شریک ہو گئے تھے۔ آغاز کے دو چار سال تک اس جنگ کو مذاق بلکہ جنون سمجھا جاتا رہا مگر افغان مجاهدین کو بے سروسامانی کے باوجود مسلسل آگے بڑھتے دیکھ کر امریکی کمپنے نے اس کو تقویت دینے کا فیصلہ کر لیا جو بڑھتے بڑھتے اس جنگ کو "ہائی جیک" گر لینے کی صورت میں سامنے آیا۔ اس موقع پر سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑنے والے افغان مجاهدین کے آٹھ گروپوں کا اتحاد قائم ہوا جس کے سیکرٹری جزل حرکت، اقلاب اسلامی کے مولوی نصر اللہ منصور شہید تھے جو میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے، جبکہ افغان گروپوں کو سمجھا کرنے میں ایک موقع پر جمیعت علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور شیخ الحدیث مولانا عبدالحق آف اکوڑہ مختلف کا کردار بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ اور اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مغرب کے ساتھ معاملات طکرنے میں جو کچھ عملاً ہوا، مولانا نصر اللہ منصور کی رائے اس سے مختلف تھی، وہ مکمل خود سپردگی کی وجہ نبیادی معاملات پر اپنا کثرش روں قائم رکھتے ہوئے کچھ شرائط کے ساتھ مغرب کی حمایت و تعاون قبول کرنے کے حق

میں تھے، اور لبیت بات نہ مانے جانے پر انہوں نے جنگ سے لا تعلق ہو کر خود اختیاری جلاوطنی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اسلام آباد میں یافت کے دانشوروں کے ساتھ مذکورہ نشست میں جب بحث نے طول پڑا تو میں نے دوستوں سے عرض کیا کہ تھوڑا اور انتظار کر لیں اگر اس خطہ کیلئے امریکہ کے نئے علاقوںی ایجنسی کے لئے کوافغان مجاهدین نے قبول کر لیا اور اس میں ایڈ جسٹ ہو گئے تو میں آپ کا موقف کھلے دل سے تسلیم کر لوں گا کہ افغانوں نے سوویت یونین کے خلاف امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ اور اگر وہ امریکہ کے ایجنسی میں سیٹ نہ ہوئے تو آپ دوستوں کو میری بات ماننا ہو گی کہ افغانوں نے اپنی جنگ لڑی ہے جو افغانستان کی آزادی اور افغان قوم کے اسلامی و تہذیبی شخص کے تحفظ کی جنگ تھی جس میں دنیا کے مختلف حصوں سے مسلم مجاهدین جہاد کے شرعی فریضہ کے احیا کے جذبے کے ساتھ اس میں جو قریب شامی ہوتے چل گئے، جبکہ اس میں اپنے مفاد کیلئے شریک ہوا کہ اسے اس میں اپنے سردار جنگ کے حریف روں کی شکست کے امکانات دکھائی دے رہے تھے۔

البتہ باہمی معاملات کے تعین و تشکیل میں افغان مجاهدین "دائمہرنگ زمین" کا شکار ہو گئے چنانچہ "جنیوامعاہدہ" کے عنوان سے افغانستان میں مغرب کا نیا کھیل شروع ہوا جس کے نتیجے میں افغانستان کو جہاد افغانستان کے مطہر شرات یعنی نفاذ شریعت اور غیر ملکی مداخلت سے آزاد قومی خود مختاری سے محروم رکھنے کیلئے خانہ جنگی کے نئے راؤنڈ کا آغاز ہو گیا تو افغان مجاهدین کے انہی گروپوں میں سے نظریاتی اور تہذیبی ایجنسیاں کھنکھن کھنکھن کر کر اپنے نام سے "طالبان" کے نام سے اپنی نئی تشکیل کی۔ اور پوچنکہ افغان عوام کی اکثریت کیلئے اپنی طبیعی جنگ کے نظریاتی اور تہذیبی شرات سے محروم بہر حال ناقابل برداشت تھی اس لیے طالبان نے بڑھتے بڑھتے قندھار اور پھر کابل کا کنٹرول حاصل کر کے جہاد افغانستان کے مطہر شرات کا رخ متین کر دیا جو اس خطہ کیلئے امریکہ اور نیویوکے ایجنسی سے متصادم تھا۔

چنانچہ افغان مجاهدین اور سوویت یونین کے درمیان لڑی جانے والی جنگ طالبان اور امریکہ کے درمیان نئی جنگ کی صورت اختیار کر گئی جبکہ ان دونوں جنگوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں افغان مجاهدین کو دنیا بھر بالخصوص امریکہ اور عالم اسلام کی بھروسہ حمایت حاصل تھی مگر طالبان کو کوئی جنگ تھا لڑنا پڑی۔ اور تاریخ ان کے اس کردار کو بھی اپنے صفات سے محو نہیں کر سکے گی کہ انہوں نے یہیں سال تک تھا جنگ لڑ کر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مسلح افواج کو یہ کہتے ہوئے واپسی پر مجبور کر دیا کہ "ہم جنگ میں فتح حاصل نہیں کر سکے" جو اور شادِ خداوندی تک الایام نداولہا بین الناس کا مصداق ہے۔ اسے افغان قوم کی سخت جانی کہہ سمجھتے یا ان کی اسلام کے ساتھ بے لوث والبُشَّریٰ اور اپنی تہذیبی روایات کے ساتھ بے پک و فاداری کا رکرشم سمجھ لجھے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے، البتہ اس کے نتائج و شرات کا رخ ایک بار پھر اپنے اپنے مفادات کی طرف موڑنے کیلئے بہت سی طاقتیں کسی نئے "جنیوامعاہدہ" کا تاباہانہ میں مصروف دکھائی دے رہی ہیں۔

آج اسلام آباد کی مذکورہ نشست میں ہونے والی بحث کا نتیجہ مجدد اللہ تعالیٰ سامنے آگیا ہے کہ افغان قوم نے جہاد افغانستان میں امریکہ کی جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ امریکہ نے ان کی اس جنگ کو اپنے مقاصد کیلئے ہائی جیک کر لیا تھا جس میں اسے بالآخر ناکامی ہوئی ہے اور افغان قوم اپنی خود مختاری، اسلامیت اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا پرچم آج بھی پورے

عزم و استقامت کے ساتھ ہمارے کھڑی ہے، البتہ ان کی زیریب گنگناہٹ کے یہ الفاظ ہر واقفِ حال کو سنائی دے رہے ہیں کہ

”ہمیں ہمارے دوستوں سے بچاؤ، دشمنوں سے ہم خود نہ لیں گے۔“



# طالبان کا دوسرا دور (۲۰۲۱ء)

## افغانستان میں طالبان کا نیا دور: توقعات و خدشات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ اگست ۲۰۲۱ء

کابل میں طالبان کے پرآمن داغلہ پر اطمینان و مسرت کے اظہار کیلئے آج جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں طلبہ نے قرآن خوانی کا اہتمام کیا، قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی کلاس میں طلبہ نے مکمل قرآن کریم کی قراءت کی اور جہاد افغانستان کے مختلف مراحل کے شہداء اور مرحوم رہنماوں کو ایصال ثواب کیا گیا۔ اس موقع پر رقم الحروف نے درج ذیل خطاب کیا اور بزرگ استاذ مولانا عبد القیوم ھلگتی کی پرسوز دعا پر محل اختمان پذیر ہوئی۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج ہم خخف حوالوں سے اطمینان اور خوشی محسوس کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقدس کلام کی تلاوت کے ذریعے اس کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ کابل کسی خوبی خونزیزی سے نکل گیا ہے اور طالبان نے پرآمن طور پر اس کا نشوون سنبھال لیا ہے، اس میں کسی بھی حوالے سے کردار ادا کرنے والے سب لوگ ہمارے شکریہ اور تبریک کے مستحق ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ جس جہاد افغانستان کا آغاز برطانوی استعمار کی فوجی یلغار سے ہوا تھا اور برطانوی فوجوں کو افغان عوام کے جذبہ حریت کے مقابلہ میں پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی، اس کے بعد رو سی افواج نے افغانستان کو کثروں میں لینے کی کوشش کی تو افغان قوم نے جہاد افغانستان کے عنوان سے اس کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اسے شکست دی، جبکہ اس کے بعد جہاد افغانستان کے منطقہ تباہ کو تہذیبی و نظریاتی اهداف کو روکنے کیلئے امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں تو افغان قوم نے مسلسل بیس سال کی معزک آرائی کے بعد انہیں بھی ناکام واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ افغان قوم کا تاریخی اعزاز اور کریڈٹ ہے کہ اس نے کبھی غیر ملکی تسلط قبول نہیں کیا اور ہمیشہ اپنی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ کیا ہے۔

ان مراحل میں اس بات کی مختلف اقوام کی طرف سے سرتوڑ کوشش کی گئی کہ افغانستان کو وحدت سے محروم کر کے الگ الگ علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے، ہمیں خوشی ہے کہ اس کے باوجود آج افغانستان کی وحدت قائم ہے اور اسے تقسیم کرنے کے منصوبے دم توڑ چکے ہیں۔ افغانستان پر یلغار کرنے والوں نے اپنا پورا ازور لگایا کہ بہت سے دیگر مسلم ممالک کی طرح افغان عوام کو بھی اسلامی شریعت کے احکام و قوانین کی عملداری سے دستبردار کر دیا جائے، اس کیلئے تحریف و تحریص کے تمام حرے اختیار کیے گئے مگر افغان قوم آج بھی اپنے عقیدہ و ایمان اور اسلامی شریعت کے ساتھ وابستگی پر قائم ہے اور شرعی احکام و قوانین کے نفاذ و عملداری کیلئے پُر عزم ہے۔ قابضین کی ایک کوشش یہ بھی رہی ہے کہ افغان قوم کو اس کی تہذیب و ثقافت اور روایات سے بے گانہ کر دیا جائے مگریہ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی اور خوشی کی بات ہے کہ افغان قوم کی تہذیب و ثقافت اور قومی روایات آج بھی ایک معاشرتی حقیقت کے طور پر دنیا سے اپنا وجود تسلیم کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

ہم نے افغانستان کی وحدت، افغان قوم کی خود مختاری، شریعتِ اسلامیہ کی بالادستی، افغان تہذیب و ثقافت کے تسلیل اور غیر ملکی مداخلت سے نجات کیلئے ہمیشہ افغانوں کی حمایت کی ہے اور آج بھی اس پر پورے شعور و ادراک کے

- ساتھ قائم ہیں اس لیے اس موقع پر خوشی کے اظہار کے ساتھ ساتھ ہم ان خطرات سے بچ دکرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو افغان قوم اور اس کے خیرخواہوں کو دور پیش ہیں۔
- ہمارے خیال میں اب سب سے پہلا مرحلہ افغانستان میں امن کا قیام، نظم و نق کی بحالی، اور ملکی سالمیت کا تحفظ ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ امارت اسلامیہ افغانستان کی طرف سے اعلانات اور حکمت عملی اس سلسلہ میں حوصلہ افزائے ہے۔
  - ہمارے نزدیک قومی وحدت کا ماحول قائم کرنا افغانستان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ افغان قوم اور ملک کو زبان، نسل اور علاقہ کی بنیاد پر تقسیم کرنے میں ناکامی کے بعد ایسی شرارت توں کارخ دوسری طرف موڑا جا رہا ہے، مثلاً کل سے سو شل میڈیا پر ایک خبر گردش کر رہی ہے کہ طالبان نے سلفیوں کے مدارس بند کر دیے ہیں اور آج صبح سے ایک خبر چل رہی ہے کہ طالبان نے شیعوں کی عمارتوں سے ان کے جھنڈے اتارنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ افغانستان کی قومی وحدت کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کا ایک نیا رخ ہے جس سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے اور اسی باتوں کی حوصلہ ٹکنی ہونی چاہیے۔
  - اس موقع پر عالمی برادری اور مسلم ممالک کے ساتھ ساتھ پڑوں کی مدد کو بھی اعتماد میں لینے اور اعتناد میں رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ افغانستان اپنے نئے قومی سفر کا آغاز بہتر انداز میں کر سکے اور کسی کو اس میں دخل اندازی کا موقع نہ ملے۔
  - ان حوالوں سے مسلم ممالک کی ذمہ داری سب سے زیادہ بنتی ہے کہ وہ اپنے ثابت اور مؤثر کردار کے ساتھ سامنے آئیں اور تہذیبی اور قومی مقاصد و اہداف کے حصول میں افغان قوم کے معاون بنیں۔
  - عالم اسلام بالخصوص پاکستان کے دینی، علمی اور نظریاتی حلقوں کو بھی بیداری، حوصلہ اور حکمت عملی کا مظاہرہ کرنا ہو گا اور باہمی مشاورت کے ساتھ افغانستان کی تعمیر و ترقی، سلامتی و استحکام اور قومی و دینی روایات کے تحفظ میں افغان قوم کا ساتھ دینا ہو گا۔
- اللہ تعالیٰ افغان قوم کو یہ پیشرفت مبارک کریں اور سب کو اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین  
یا رب العالمین۔

## افغانستان کی موجودہ صورتحال اور ہماری ذمہ داری

۱۲۱ اگست ۲۰۲۱ء کو آسٹریلیا مسجد لا بور میں خطاب

بعد الحمد والصلوة۔ آج کل افغانستان کی صورتحال دینی اور سیاسی حلقوں میں، تقریباً ہر جگہ زیر بحث ہے اس مناسبت

سے دو تین گزارشات میں عرض کرنا چاہوں گا۔

(۱) پہلی بات یہ کہ افغان قوم کی عظمت اور حریت پسندی کو سلام ہو کہ اس نے بیرونی دخل اندازی اور غیر ملکی تسلط کو ہمیشہ کی طرح اب بھی مسترد کر دیا ہے۔ افغانستان پر برطانیہ نے قبضہ کی کوشش کی تھی جب انہوں نے تحدہ ہندوستان پر قبضہ کیا تھا تو برطانیہ کو ناکامی ہوئی تھی۔ پھر رو سی فوجیں آئیں، یہ تو ہمارے سامنے کام عاملہ ہے، اور اپنا پورا زور صرف کیا مگر افغانستان نے بھیثیت افغان قوم قبول نہیں کیا، سو ویت یونین کی افواج کو ناکام واپس جانا پڑا بلکہ اس کے نتیجے میں خود سو ویت یونین بکھر کر رہ گئی۔ تیسرا مرحلہ یہ کہ جب امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں تو افغان قوم نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور مزاحمت کی، اتنی شاندار مزاحمت کی کہ روس کے خلاف مزاحمت میں افغان قوم کو امریکی بلاک، عالم اسلام اور بہت سے ملکوں کی حمایت حاصل تھی، ایک لحاظ سے پوری دنیا ان کے ساتھ تھی، روس کے سارے مخالفین ان کے ساتھ تھے، لیکن امریکی اتحاد کی فوجی یلغار کے خلاف مزاحمت میں وہ نہ تھا تھے، ان کو در پر دہ کسی کی حمایت حاصل ہوئی ہو تو ہولیکن بظاہر پوری دنیا ان کی مخالف تھی بلکہ ان کا نام لینا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا فرمائی۔ اس پر یہ بات ایک دفعہ بھر واضح ہو گئی کہ افغان قوم خود پر کسی دوسرے کا تسلط قبول نہیں کرتی، یہ تیسرا تاریخی واقعہ ہے، افغان قوم کو اس پر سلام۔

(۲) دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ یہ تقریباً تین پشتون کی جنگ تھی، اب جب جنگ انہما کو پہنچی ہے تو اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی ہے کہ کابل کسی نئی خون ریزی سے نجیگیا ہے۔ یہ پوری دنیا کیلئے حیران کن بات ہے کہ طالبان کابل میں پر امن طریقے سے داخل ہوئے ہیں، کابل نے مزاحمت نہیں کی اور بغیر کسی لڑائی کے کابل طالبان کے کنٹرول میں آگیا ہے، اس پر خوشی کا اعلیٰ الہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تاریخ پر نظر رکھنے والے حضرات ہی جانتے ہیں کہ لکھاڑا مجہزانہ واقعہ ہوا ہے کہ کابل کسی مزاحمت کے بغیر سر نذر ہو گیا ہے۔

جبکہ پورے افغانستان میں ایسی صورت حال ہے کہ افغانیوں نے عمومی طور پر طالبان کی دوبارہ آمد پر مسروت کا اعلیٰ ہار کیا ہے، پھول پیش کیے جا رہے ہیں اور ان کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ یہ افغان قوم کے اجتماعی مزاج کی نشاندہی کرتا ہے کہ افغان قوم جہاں حریت پسند ہے کہ کسی دوسرے کا تسلط قبول نہیں کرتی، اسی طرح افغان قوم نے غیر ملکی تہذیب اور غیر ملکی نظریات کو بھی مسترد کر دیا ہے۔ اسلام کے ساتھ، شریعت کے قوانین کے ساتھ، افغان قوم کی تہذیب و روایات کے ساتھ افغان قوم کی کمٹنٹ آج بھی قائم ہے اور اس کا ایک بار پھر اعلیٰ ہار ہو گیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے جس پر ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرنا چاہیے، طالبان کو مبارکباد دینی چاہیے اور افغان قوم کے ساتھ تکھنی و ہم آہنگی کا اعلیٰ ہار کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ افغانستان کے روشن مستقبل کے حوالے سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ افغانستان کو تقسیم کرنے کی بہت دفعہ کوشش ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی کہ تقسیم نہیں ہوا اور افغانستان کی وحدت قائم ہے۔ دوسری افغان قوم کی شریعت اور اپنی تہذیب کے ساتھ کمٹنٹ قائم ہے، الحمد للہ۔ آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس جذبے کو سراہا جائے اور افغانستان کی وحدت و سالمیت کو سپورٹ کیا جائے۔

افغانستان اور افغان قوم کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت قوی وحدت کا ماحول قائم کرنا اور قائم رکھنا ہے۔ پہلے

بھی افغان قوم کوئی بار تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی، اب مزید کوششیں ہوں گی، زبان کے حوالے سے، نسل کے حوالے سے، مذہب کے حوالے سے، ملک کے حوالے سے، فرقے کے حوالے سے، تقسیم کے کئی تیج بوئے جا رہے ہیں۔ میں اپنے بھائیوں سے، اپنے ساتھیوں سے عرض کروں گا کہ افغان قوم کو اپنی وحدت کا ماحول قائم کرنے دیجیے، کسی قسم کی تفریق کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے، نہ مذہبی، نہ ملکی، نہ سیاسی، نہ علاقائی۔ اگر قومی وحدت کا ماحول قائم رہے گا تو شریعت کے ساتھ اور افغان قوم کی روایات کے ساتھ ان کی مکمل قائم ہے، ان کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا، ان شاء اللہ العزیز۔ ہمیں اس وقت ان کیلئے دعا کرنی چاہیے، اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، ان کی توقی وحدت کو سپورٹ کرنا چاہیے، شریعت اور افغان قوم کی تہذیب کے ساتھ ان کی مکمل کو سلام کرنا چاہیے، اور ان کے خلاف کسی قسم کی سازش میں حصہ نہیں بننا چاہیے، شعوری طور پر بھی نہیں اور غیر شعوری طور پر بھی نہیں۔

(۳) تیری بات، ایک عرصہ سے یہ جنگ چل رہی ہے، نصف صدی تو ہمیں بھی ہو گئی ہے اس جنگ کو دیکھتے ہوئے، کئی پستوں سے یہ جنگ چل رہی ہے۔ اب یہ ماحول سامنے ہے کہ دنیا بھر سے تقیدی تبصرے آرہے ہیں، باقی دنیا تو جو کرتی ہے کرے، مگر افغانستان کے ساتھ، طالبان کے ساتھ، شریعت کے ساتھ اور افغان تہذیب کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے حضرات توکم از کم اس جال میں نہ پہنچیں۔ سب سے مشکل مرحلہ یہ ہے کہ ہمدردی رکھنے والے دوست بھی جال کا شکار ہو رہے ہیں، کبھی ایک حوالے سے کبھی دوسرے حوالے سے۔ بہت سے حلقوں اپنے فارمولے، اپنی اپنی تجویں، اپنے اپنے تبصرے پیش کر رہے ہیں، ایک طوفان برپا ہے دنیا میں منقی پر اپیگنڈے کا، کردار کشی کا، جس کا ہم بھی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ میری یہ درخواست ہے اہل دین سے کہ طالبان کو سیٹ ہونے کیلئے وقت دیں۔ ہمارے اپنے اپنے فارمولوں نے ہمارا کیا حشر کر رکھا ہے کہ ہم ان کو مشورہ دیں گے؟ ہم خود ستر سال سے فارمولوں کی جنگ میں پہنچنے ہوئے ہیں۔ سب دوستوں سے ہاتھ جوڑ کر درخواست ہے کہ خدا کیلئے اپنے ستر سال کے ناماں تحریبے ان کے سرمت تھوپیے، ان کو آزادی سے کام کرنے دیجیے، وہ زپادہ بہتر جانتے ہیں افغانستان کو بھی، اپنے مستقبل کو بھی، قومی تقاضوں کو بھی، اور شریعت کو بھی، ہم سے بہتر سمجھتے ہیں، وہ بتلی بہیں اور شرعاً بتلی بہی کی رائے کو فوقيت حاصل ہوتی ہے۔

میں برطانیہ کے چیف آف ڈیفنസ ٹاف کے اس بیان کا خیر مقدم کروں گا کہ انہوں نے وہی بات کی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں، آج کے اخبارات میں چچی ہے کہ طالبان کو وقت دیں اور کام کرنے کا موقع دیں۔ میری گزارش ہے کہ روس نے کتنا وقت لیا؟ دس سال۔ امریکہ نے کتنا وقت لیا؟ بیس سال۔ ان غربیوں کو دس سال کا وقت تو دیں کہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکیں، اور دیکھیں کہ اپنی ترجیحات کے مطابق وہ کیا کرتے ہیں۔ میں برطانیہ کے کمانڈر کی اس بات کو سراہوں گا اور سب لوگوں سے درخواست کروں گا کہ ”امریت اسلامیہ افغانستان“ کو اپنی قوم کو اعتماد میں لینے کا موقع دیجیے، اپنے نظام کو مرتب کرنے اور نافذ کرنے کا موقع دیجیے، اور چند سال دیکھیے پھر سارے تبصرے کر لینا، جس نے ثابت کرنا ہے ثابت کر لے، جس نے منقی کرنا ہے منقی کر لے۔ فی الوقت ان کو آزادی کے ساتھ اپنے مستقبل کی تشکیل کا موقع دیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب نصیب فرمائیں اور ہمیں ان کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

## مسلم حکومتیں اور اسلامی نظام

۲۶ ستمبر ۲۰۲۱ء کو ادارہ النعمان گوجرانوالہ میں لیکچر

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج میں آپ حضرات کو موجودہ معروضی حالات میں اسلام کے قانون و نظام کو کسی بھی سطح پر تسلیم کرنے والی مسلم حکومتوں کی صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جن کے دستور و قانون میں اسلام کا نام شامل ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی حکومتیں اور ریاستیں ہیں۔ سعودی عرب، پاکستان اور ایران تو سب کے سامنے ہیں البتہ مرکش میں بھی سربراہ مملکت کو امیر المؤمنین کہا جاتا ہے جس کا پس منظر اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

(۱) سعودی عرب کا باقاعدہ نام ”المملکة العربية السعودية“ ہے جو آج سے کم و بیش ایک صدی قبل خلافت عثمانیہ کے بھرنے کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ اس ریاست میں ”آل سعود“ کے زیر اقتدار وہ علاقے شامل ہیں جن میں اس وقت مختلف معاهدات کی صورت میں آل سعود کے دائرہ اقتدار میں شامل کیا گیا تھا اور ان پر ہیں الاقوای طور پر آل سعود کا حق حکمرانی خاندانی اور نسلی بنیاد پر تسلیم کیا گیا تھا، جبکہ آل سعود نے حکمرانی کا حق ملنے کے بعد قرآن کریم کو اپنی مملکت کاریاتی مذہب اور دستور و قانون کی بنیاد فرادری نے کا اعلان کیا تھا، سعودی عرب کی حکومتی نظام میں الشیخ محمد بن عبد الوہاب کا خاندان بھی ”آل شیخ“ کے نام سے ایک معابرہ کے تحت شریک تھے اور ان کے درمیان تقسیم کا رچل آرہی ہے۔

سعودی عرب کا عدلی نظام مکمل طور پر قرآن و سنت کے تابع ہے جس کی برکات پورے ملک میں دکھائی دے رہی ہیں، البتہ اب موجودہ ولی عہد شہزادہ محمد نے یہ سوال اٹھادیا ہے کہ دستور و قانون کی بنیاد قرآن کریم کے ساتھ حدیث و سنت بھی ہے یا صرف قرآن کریم ہی ریاست و حکومت کی اساس ہے۔ بہر حال خاندانی حکومت ہونے کے باوجود اپنے دستور و قانون کے حوالے سے ایک اسلامی ریاست ہے اور حالات میں مختلف تغیرات کے باوجود اسلامی ریاست اور حریم شریفین کے انتظام و خدمت کے حوالے سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت و احترام سے بہرہ رہے۔

(۲) پاکستان ایک سیاسی اور عوامی تحریک کے نتیجے میں ۱۹۷۷ء کے دوران برطانوی استعمار کے تسلط کے خاتمه اور متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر وجود میں آیا تھا، اور اس نئی مملکت کے قیام کی تحریک چلانے والے قائدین نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کیلئے الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری کیلئے کر رہے ہیں، چنانچہ ملک کے باقاعدہ قیام اور مسلم لیگ کو اقتدار منتقل ہونے کے بعد اس کے ریاتی و حکومتی نظام کی تشكیل کا سوال کھڑا ہوا تو اگرچہ سیکولر حقوق اور لاہیوں نے پوری کوشش کی کہ اس نو زائدہ مملکت کو ایک سیکولر اور جمہوری ریاست کی حیثیت دے دی جائے مگر دستور ساز اسمبلی نے ”قرارداد مقاصد“ کی صورت اس کی نظریاتی بنیاد بھیشہ کیلئے طے کر دی کہ

(۱) حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔

(۲) حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو ہوگا، اور

(۳) پارلیمنٹ اور حکومت قرآن و سنت کے احکام کی پابند ہوں گی۔

ان اصولوں کی تشریح تمام مکاتب فکر کے ۱۳۱ اکابر علماء کرام نے متفقہ ”۲۲ دستوری نکات“ کی صورت میں کر دی جن میں سے بیشتر نکات دستور پاکستان کا باقاعدہ حصہ ہیں اور انہی اسلامی دستوری بنیادوں کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ عملی صور تجسس شروع سے اب تک اس سے مختلف چیزیں آ رہی ہے اور مقدار حلقے دستوری صراحتوں کے باوجود عملی طور پر اسلامی احکام و قوینین کو نفاذ و فروغ کا کوئی راستہ نہیں دے رہے۔ البتہ دستوری اساس کے لحاظ سے ہر ایک اسلامی ریاست ہے اور اگر دستور پر تمام ادارے اور طبقے خلوص کے ساتھ عمل کریں تو پاکستان اسلامی ریاست کے طور پر ایک آئینہ ملک کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آ سکتا ہے۔

(۳) تیسرا طرف ایران نے جناب آیت اللہ خمینی کی قیادت سے مذہبی انقلاب کے بعد خود کو ”اسلامی جمہوریہ ایران“ کی شکل دی اور اسلام کو ریاست کا سرکاری دین اور ”ائنا عشری فقة“ کو ملک کاریاتی مذہب قرار دیا، دستور کے مطابق ملک میں حاکیت اعلیٰ ”ایام غائب“ کی تسلیم کی گئی اور ان کی نمائندگی ”ولایت فقیہ“ کے عنوان سے ملک کے سب سے بڑے فقیہ کرتے ہیں جو اپنے دور میں خمینی صاحب تھے، اور اب جناب آیت اللہ خامنہ ای صاحب کو وہ مقام حاصل ہے جو متفقہ، عدیلیہ اور انتظامیہ سیاست تمام ریاستی و حکومتی اداروں کیلئے حکمران اعلیٰ اور فائل اخترائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ نظام حکومت چالنے کیلئے عوام کے منتخب نمائندوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے اور پارلیمنٹ اور حکومتی مناصب عوامی ایکشن کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ گواہ ایران میں اہل تشیع کے ائمۂ عشری طبقہ نے اپنے تصور امامت کو دستوری اور قانونی حیثیت دے دی ہے جو ان کے دائرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور وہ اس پر سختی سے قائم ہیں۔

(۴) اس پس منظر میں افغانستان اور طالبان پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔ طالبان نے اب سے دو عشرے قبل اپنے دور اقتدار میں افغانستان کو ”مارتِ اسلامی افغانستان“ کا عنوان دیا تھا جس میں امیر المؤمنین کے طور پر ملا محمد عمر مجاہد نے کم و بیش پانچ سال حکومت کی جس کے ثابت شرات و نتائج اور برکات کا ابھی تک عالمی سطح پر اعتراف کیا جا رہا ہے، اس کے بعد انہیں امریکی اتحاد کے ساتھ میں سال تک جنگ لڑنا پڑی جس میں سخرہ ہونے کے بعد اب پھر وہ پورے افغانستان میں بر سر اقتدار ہیں اور نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنے اقتدار اور نظام کو حقیقی شکل دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس موقع پر میں باقی تفصیلات سے قطع نظر دو باتوں کا بطور خاص تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

- ایک یہ کہ افغانستان پر طالبان کے کشوں اور حکومت کو تسلیم کرنے کی بجائے بین الاقوامی دہاء کے ذریعے انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ ان شرطیتی اور قیود کو بہر حال تسلیم کریں جو عالمی اداروں نے ان کیلئے طے کر کے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ زیادتی اور نا انصافی کی بات ہے، وہ اسلامی عقیدہ اور افغان شفافت کے ساتھ بے چک کمٹنٹ رکھتے ہیں اور ان کا ایک مستقل ”وٹن“ ہے جسے یکسر مسترد کر دینے کی بجائے معاشرتی تحریک اور سماجی عملداری کا موقع ملنا چاہئے۔ عالمی قویں اپنے نظام اور سوالائزیشن کو ہر جگہ مسلط کرنے کیلئے دباؤ، جبرا اور مکر کے جو حریبے مسلسل استعمال کر رہی ہیں وہ بجائے خود ان کے نظام و شفافت کے کھوکھلا ہونے کی علامت ہے۔ انہیں اگر اپنی سوالائزیشن کے انسانی سماج کیلئے مفید ہونے کا یقین ہے تو اس کا فیصلہ انسانی سماج کو کرنے

دیں جو تجربہ و مشاہدہ کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ تبادل نظام و ثقافت کے طور پر امارت اسلامی افغانستان کو کسی بیرونی مداخلت اور ڈیکیشن کے بغیر آزادی کے ساتھ اپنا نظام قائم کرنے کا موقع دیں اور کچھ عرصہ انہیں مکمل خود مختاری کے ساتھ اپنے نظام و ثقافت پر عمل کرنے دیں، تاکہ دنیا کے سامنے یہ بات واضح ہو سکے کہ انسانی سماج کی بہتری کیلئے مغرب کا نظام و ثقافت زیادہ کام آمد ہے یا اسلامی نظام و قانون زیادہ مفید ہے۔ یہ فیصلہ خود کرنے کا کسی بھی فرقی کو حق حاصل نہیں ہے، جبکہ مغرب بکھر فن طور پر دھونس، دھاندی، جب اور دباؤ کے تمام حرے انتخیار کر کے افغانستان میں اسلامی نظام و ثقافت کے نفاذ کا راستہ روکنے پر ٹھاکریا ہے۔

دوسری بات مسلم حکومتوں سے کرنا چاہوں گا کہ اسلام کے عقیدہ و ثقافت کے ساتھ وہ بھی اپنے ایمان و کمٹھٹ کا دعویٰ کرتے ہیں مگر عالمی دباؤ کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر رہے ہیں، ان کیلئے اپنے ایمان و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ واپسی کے اظہار کا طریقہ بھی ہے کہ وہ امارت اسلامی افغانستان کے راستے میں روڑے انکا نے کی بجائے اسے آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیں، وہ اگر تعاون نہیں کر سکتے تو رکاوٹیں کھڑی کرنے سے گریز کریں، ہمیں یقین ہے کہ اگر امارت اسلامی افغانستان کو کسی قسم کی بیرونی مداخلت اور ڈیکیشن کے بغیر کم از کم دس سال آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا تو دنیا کے سامنے اسلامی احکام و قوانین کو آئندہ میں نظام کے طور پر پیش کرنے کا جو خواب بانی پاکستان قائدِ عظم محمد علی جناح مر جو مونے پیش کیا تھا وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پڑوس میں امارت اسلامی افغانستان کی صورت میں دنیا ضرور دیکھ لے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۲۱ء)

## "دہشت گردی" کے خلاف جنگ میں ناکامی

۹ اکتوبر کو شاہدرہ لاہور میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر ابتمام "ختم نبوت کانفرنس" سے خطاب کا کچھ حصہ

ہم نے اب سے بیس سال پہلے ایک جنگ شروع کی تھی "دہشت گردی" کے خلاف امریکہ کی قیادت میں اس کے اتحادی کے طور پر۔ وہ جنگ ختم ہو گئی ہے، امریکی اتحاد اپنی ناکامی کا اعتراف کر کے واپس چلا گیا ہے اور یورپی پارلیمنٹ نے بھی اپنی ناکامی تسلیم کی ہے۔ طالبان یہ کھلم کھلا کہہ رہے ہیں کہ امریکہ کے ساتھ ہماری لڑائی حالتِ جنگ میں تھی، اب کوئی لڑائی نہیں ہے، اب نیا حوالہ ہے، لڑائی ختم ہو گئی۔ سوال یہ ہے اسلئے کی لڑائی تو ختم ہو چکی، ادھر سے بھی ختم ہو گئی اور

سے بھی ختم ہو گئی۔ البتہ تہذیب کی، ثقافت کی، عقیدے کی اور نظریے کی جنگ بدستور جاری ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی، افغانیوں کو ان کی تہذیب و ثقافت اور عقیدہ سے دستبردار کروانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کیا ہم اس جنگ میں بھی امریکہ کے اتحادی ہیں؟ جس جنگ میں ہم نے معابدہ کیا تھا وہ ختم ہو چکی، اب کس بات کا اتحاد ہے؟ میراللک کے اسنیک ہولڈرز سے سوال ہے کہ ہتھیاروں کی جس جنگ میں ہم امریکہ کے اتحادی تھے وہ جنگ ختم ہو گئی۔ اب جنگ عقیدہ و نظریہ، تہذیب و ثقافت اور افغان روایات کی ہے، کیا اس جنگ میں بھی ہم امریکہ کے اتحادی ہیں؟ میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم بحیثیت قوم اس تہذیبی جنگ میں امریکہ کے اتحادی نہیں ہیں بلکہ عقیدہ و مذہب اور تہذیب و نظریہ میں ہم افغان قوم کے ساتھ تھے، ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حکمرانوں سے گزارش ہے کہ پالیسیوں پر نظر ثانی کرو، اپنی پوزیشن واضح کرو اور قوم کا فیصلہ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ہتھیاروں کی جنگ میں فیصلہ کرنا آپ کا کام تھا لیکن عقیدے کی جنگ تمہاری نہیں ہماری ہے۔ یہ جنگ ہم اڑیں گے، ثقافت کی جنگ ہم اڑیں گے، نظریے اور عقیدے کی جنگ ہم اڑیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

## افغانستان کا بحران اور ہمارا افسوسناک طرز عمل

مابینامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۲۱ء

روزنامہ اسلام لاہور ۷ نومبر ۲۰۲۱ء کی خبر کے مطابق امریتِ اسلامی افغانستان کے وزیر خارجہ مولوی محمد امیر خان متنی اپنے وفد کے ہمراہ دو حصے پہنچ گئے ہیں جہاں وہ افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کے حوالے سے امریکی حکمرانوں سے مذاکرات کریں گے۔ جبکہ اخبار کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وفاقی وزیر اطلاعات و تشریفات جانب فواد چودھری نے اسلام آباد میں اپنی پی کے ملازمین کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلامی جنگ تو ختم ہو گئی اب باتوں کی جنگ جاری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ افغانستان کی جنگ ساڑھے تین گھنٹے میں ختم ہو گئی تھی جب کابل کے حکمران بھاگ گئے تھے اور امریکہ جنگ ہار گیا تھا مگر اب باتوں اور بیانیہ کی جنگ جاری ہے۔

ہمارے خیال میں فواد چودھری نے موجودہ صورتحال کے حوالے سے ایک ہم سوال کا جواب دیا ہے کہ جب تمہاری جنگ ختم ہو گئی ہے تو اب کیا ہو رہا ہے اور امریکہ کے ساتھ مذاکرات کے نئے مرحلہ کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے جس کیلئے دو حصے میں مذاکرات کے ایک اور دور کا آغاز ہو گیا ہے؟ وفاقی وزیر اطلاعات نے اس کی وجہ باتوں اور بیانیہ کی جنگ کو قرار دیا ہے اور ہمیں اس حد تک ان کی بات سے اتفاق ہے کہ اب جنگ باتوں اور بیانیہ کی ہے، مگر اس سے اگلی بات بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ صرف باتوں کی جنگ نہیں بلکہ نظریات اور تہذیب و ثقافت کی جنگ ہے جس کے ذریعے میدانِ جنگ میں افغان طالبان کے ہاتھوں واضح شکست سے دوچار ہونے والی وقتیں اس جنگ کے مقاصد کو معافی دیا اور نفیا تی حربوں کے ذریعے حاصل کرنے کے درپے ہیں، اور امریکی اتحاد اس کوشش میں ہے کہ فلسفہ و نظام

اور تہذیب و ثقافت کے غلبہ کا جو ایکنڈا وہ ہتھیاروں کی جنگ میں پورا نہیں کر سکا اس کی تجھیل کیلئے سیاسی، معاشی اور نفسیاتی ہتھیاروں کو بروئے کار لائکراپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر لیا جائے۔

ہمارے نزدیک اس وقت افغان قوم تین بھراؤں سے دوچار ہے جو زیادہ تر مصنوعی ہیں اور امریکہ اور اس کے حواریوں کی پیدا کردہ ہیں:

- افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کو افغان قوم کے علی الرغم ہین الاقوامی معابدات اور مغرب

کے سیاسی شکنخ میں جکڑ لیا جائے تاکہ وہ ان ہین الاقوامی معاملات کے بارے میں آزادی کے ساتھ خود کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔

- امارتِ اسلامی افغانستان کو ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ اور اپنے عقیدہ و ثقافت کے مطابق کوئی نظام قائم کرنے سے ہر قیمت پر روکا جائے۔

- افغانستان کو معاشری ناکہ بندی اور بایکاٹ کے ذریعے ایسے حالات سے دوچار کر دیا جائے کہ وہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر کوئی نظم قائم نہ کر سکے اور سنگین ترین معاشری بحران کو حل کرنے کی بجائے مسلسل بڑھاتے ہوئے افغان قوم کو مغربی فلسفہ و ثقافت کو بہر حال اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

اس مقصد کیلئے نہ صرف یہ کہ امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے بلکہ دنیا کو ان کی معاشری امداد سے دور رکھنے کیلئے ہر قسم کے دباؤ اور حرਬے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ امارتِ اسلامی افغانستان کے اس تقاضے کو بھی بے رحمان انداز میں نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ اگر خود افغانستان کے محمد اثاثی بھال کر دیے جائیں تو وہ کسی اور بیرونی مدد کے مقاضی نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ مسلسل ہو رہا ہے، ساری دنیا کے سامنے ہو رہا ہے اور پوری ڈھنڈتی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جس میں مغربی ملکوں اور استعماری قوتوں کا کردار تو سمجھ میں آتا ہے مگر مسلم ممالک بالخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان کا طرز عمل کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو ظلم کیلئے کسی اور کے حوالے کرتا ہے۔ جبکہ امت مسلمہ اس وقت خاموش تماشائی دھائی دے رہی ہے بلکہ جب بھی کسی عملی کردار کا موقع آتا ہے تو اس کا وزن اور جھگاٹ منفی نظر آنے لگتا ہے۔ ان حالات میں مسلم حکومتوں سے کسی خیر کی توقع تواب نظر نہیں آتی مگر علم و دانش اور رائے عامہ کا وہ میدان ضرور موجود ہے جس میں اربابِ فکر و دانش اگر کچھ کرنا چاہیں تو اس کا راستہ نکلا جاسکتا ہے۔

اس لیے ہم اربابِ علم و دانش سے گزارش کریں گے کہ وہ خاموش تماشائی بنے رہنے کی بجائے اپنے کردار کو موثر طریقہ سے ادا کرنے کی کوئی صورت پیدا کریں۔ جبکہ اصحابِ ثروت سے بھی بھی گزارش ہے کہ اس سنگین معاشری بحران میں اپنے افغان بھائیوں کی امداد پر سنجیدہ توجہ دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## افغانستان کی صورتحال: دینی حلقوں کی سرگرمیاں

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ دسمبر ۲۰۲۱ء

افغانستان کی صورتحال اور ہماری دینی و ملی ذمہ داریوں کے حوالے سے دینی و سیاسی حلقوں کو توجہ دلانے کیلئے پاکستان شریعت کونسل کی رابطہ ہم جاری ہے، اس سلسلہ میں کرچی، لاہور اور اسلام آباد کے قین اجلاسوں کی کارگزاری پیش خدمت ہے۔ تفصیلی گزارشات ۲۲ دسمبر کے اجلاس کے بعد پیش کروں گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۱)

”لاہور (پ) مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام اور دانشوروں نے افغانستان میں امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو فوری تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے اس کیلئے رابطہ ہم کا فیصلہ کیا ہے اور 22 دسمبر بھر کو لاہور میں ”آل پارٹیز افغان سیمینار“ منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے جو جمعیت علماء پاکستان کے رہنماء مولانا قاری محمد زوار بہادر کی میزبانی میں ان کے ادارہ میں ہو گا۔

یہ اجلاس ۲۲ دسمبر کو جمعیت علماء اسلام (س) کے سیکرٹری جzel مولانا عبد الرؤوف فاروقی کی میزبانی میں جامع مسجد خضراء سمن آباد لاہور میں پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جzel مولانا زاہد الرashدی کی زیر صدارت ہوا جس میں مولانا عبد الرؤوف ملک، قاری منصور احمد، قاری محمد زوار بہادر، عبد اللطیف خالد چیمہ، مولانا محمد امین ربانی، راتا مقصود احمد ایڈو وکیست، مولانا مجیب الرحمن انقلابی، مفتی شاہد عبید اور دیگر نئے شرکت کی۔ اجلاس میں فتح کا مل سے لے کر آج تک کی صورتحال کا بغور جائزہ لیا گیا اور اس امر پر مکمل اتفاق کیا گیا کہ امارت اسلامی افغانستان کو اخلاقی و سیاسی اور معماشی مدد فراہم کرنا پوری امرت مسلمہ کی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ ہر آہونے کیلئے دنیا بھر میں ہم چلانے کی ضرورت ہے۔ مولانا زاہد الرashدی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ افغان حکومت اور افغان عوام کو تہائیں چھوڑا جا سکتا، امریکہ جنگ کے ذریعے جو ابھی تاہر چکا ہے وہ اب معماشی دباؤ کے تحت منوانا چاہتا ہے، لیکن ہم رائے عامہ اور اہم شخصیات کو بیدار کر کے امر کی ایجاد نے کے سامنے رکاوٹ پیدا کرنا اپنے ایمانی جذبے کا تقاضا سمجھتے ہیں۔

مولانا عبد الرؤوف فاروقی نے اجلاس کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور سعودی عرب کو چاہیے کہ سب سے پہلے امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کریں۔ عبد اللطیف خالد چیمہ نے کہا کہ اسلام کی نشأة ثانیہ سے گھبرا کر عالم کفرنست نئے بینتے بدلتا ہے۔

اجلاس میں اس بات پر اتفاق کا انہصار کیا گیا کہ پاکستان کیلئے پر امن اور محفوظ افغانستان کی نعمت سے کم نہیں ہے جب کہ مکار دشمن پاکستان اور افغانستان میں قیام امن کا دشمن ہے۔ اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ امارت اسلامی افغانستان کی سیاسی و معماشی اور اخلاقی حمایت کیلئے ملک بھر میں کمپین چلائی جائے گی اور ایک وسیع رابطہ کمیٹی تشکیل دے کر اس مہم کو آگے بڑھا جائے گا۔ نیز زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو برینگ کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔

علاوہ اذیں مرکزی جمیعت اہل حدیث پاکستان کے رہنماء علامہ ابوسالم الہبی غلبیر نے اجلاس کے بعد عبداللطیف خالد چیمہ سے فون پر گفتگو میں اجلاس کے کمل فیصلوں سے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کمل تائید و حمایت کا اظہار کیا اور کہا کہ اس وقت مظلوم افغان عوام کو انسانی بحران کا مسئلہ درپیش ہے، ایسے میں ان کے حق میں آواز اٹھانا انسانیت کی بھی بہت بڑی خدمت ہے۔“

(۲)

”پاکستان شریعت کو نسل سندھ کی صوبائی شوری نے امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کے رویہ کو افغان عوام کی معاونت میں رکاوٹ قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں رائے عامہ کو بیدار و منظم کرنے کیلئے دوسری جماعتوں کے تعاون سے رابطہ عوام میں اور سفر ناموں کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

صوبائی مجلسِ شوری اک اجلاس آج جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن، نار تحکیم کیا ہے اور اس سندھ مولانا قاری اللہ داد کی صدرارت میں منعقد ہوا جس میں مرکزی نائب امیر مولانا شیداحمد درخواست اور سیکرٹری جزل مولانا زاہد الرشیدی نے بھی خصوصی شرکت کی جگہ دیگر شرکاء میں ڈاکٹر سیف الرحمن آرائیں، محمد اسلم شیخ ایڈوکیٹ، مولانا حافظ محمد اکبر، مولانا حافظ اقبال، مولانا قاری حضرت ولی، مولانا احتشام الحق نخیری، مولانا مفتی حبیب احمد درخواستی، مولانا شفیق، مولانا مفتی شاہ اللہ محمود، مولانا عبد الوہاب، مولانا عبد النان مکانیوی اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے امارتِ اسلامی افغانستان کے حوالے سے مسلم ممالک کے رویہ کو بطور خاص افسوسناک قرار دیا گیا کہ امارتِ اسلامی افغانستان کے کنٹروں کے بعد اسے تسلیم نہ کرنا افغانستان کو معاشی طور پر محصور کر دینے اور سفارتی دنیا میں تنہا کرنے کے مترادف ہے جو قطعی طور پر غلط بات ہے۔ جگہ افغانستان کے اٹاٹے امریکہ نے منجنڈ کر کر کے ہیں اور مختلف اطراف سے افغان عوام کی امداد کے راستے بند کر دیے گئے ہیں جس کی سب سے بڑی صورت ان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنا ہے۔

پاکستان شریعت کو نسل کے مرکزوی سیکرٹری جزل مولانا زاہد الرشیدی نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور رہنماؤں کے درمیان اس سلسلہ میں مشاورت اور رابطہ کا کام جاری ہے اور ۲۲ دسمبر بروز بدھ کو لاہور میں ایک کل جماعتی سیمینار میں مشترکہ حکمت عملی طے کی جائے گی اور اس کے مطابق ملک بھر میں تمام مکاتب فکر اور طبقات کے رہنماؤں کے ساتھ رابطہ قائم کر کے ہم کو آگے بڑھایا جائے گا۔

اجلاس میں اوپر ایک طرف سے ختم نبوت اور ناموس رسالت کے تحفظ کے قوانین کو تبدیل کرنے کے مطالبہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی طرف سے پیش کردہ تدبیحی اوپر ایک طرف سے آئندی میں پیش کیا جائے۔

اجلاس میں یورپی یونین کی طرف سے ختم نبوت اور ناموس رسالت کے تحفظ کے قوانین کو تبدیل کرنے کے مطالبہ کو مد اخلقتی الدین قرار دیتے ہوئے اسے مسترد کرنے کا اعلان کیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت کے حوالے سے کسی قسم کا یہ ورنی دباؤ قبول نہیں کیا جائے گا۔“

(۳)

"پاکستان شریعت کو نسل نے مسلم ممالک کے وزراء خارجہ سے مطالبہ کیا ہے کہ امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کو فوری طور پر تسلیم کر کے افغان عوام کو موجودہ سنگین معاشی بحران سے نجات دلانے کیلئے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کیے جائیں۔ یہ مطالبہ آج پاکستان شریعت کو نسل اسلام آباد کے سرکردہ علماء کرام کے مشاورتی اجلاس میں کیا گیا جس کی صدارت مرکزوی سیکرٹری جزل مولانا زاہد الرashدی نے کی۔ اجلاس میں مسلم وزراء خارجہ کی اسلام آباد میں تشریف آوری کا خیر مقدم کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلم حکومتوں کو امارتِ اسلامی افغانستان کو فوری طور پر تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کی آزادانہ حیثیت اور مسلم ممالک کی خود منتاری کے تحفظ کی طرف بھی سنجیدہ توجہ دینی چاہیے جو عالمی ایجنسیوں کے حصار سے نجات حاصل کرنے کے سامنے نہیں ہے۔

اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا زاہد الرashدی نے کہا کہ امارتِ اسلامیہ افغانستان کو تسلیم نہ کرنا افغان عوام کے ساتھ تعاون اور سنگین بحران میں ان کا ہاتھ بٹانے میں سب سے بڑی کاروٹ ہے۔ یہ بہت بڑا ملیہ ہے اور مسلم دنیا کے تمام طبقات اور اداروں کو اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مسلم حکمرانوں کو اپنی سوچ اور روایہ میں تبدیلی لانا ہوگی ورنہ وہ مسلم امہ کی نمائندگی کے حوالے سے بارگاہ ایزدی کے ساتھ ساتھ تاریخ میں بھی سرخو نہیں ہو سکیں گے۔

اجلاس میں مولانا شاء اللہ غالب، حافظ سید علی محی الدین، ملک سعید احمد اعوان، مفتی محمد عبد اللہ خان، مولانا عبد الماجد، مفتی خان محمد، سید ابیاں شاہ کاظمی، حافظ سید علی معین الدین، سید سعید الرحمن شاہ کاظمی اور دیگر حضرات شریک تھے۔

اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے امریکہ سے مطالبہ کیا گیا کہ افغانستان کے مخداما شاۓ فوری بحال کیے جائیں اور میدانِ جنگ میں اپنی شکست کو نہ اکرات کی میز پر فتح میں بدلتے اور معاشی ناکہ بندی کے ذریعے افغان قوم کو مغربی ایجنسیاں قبول کرنے پر مجبور کرنے کا طرز عمل ختم کیا جائے۔"

## ۲۲ دسمبر ۲۰۲۱ء کو "یوم افغانستان" منایا جائے

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۲۳ دسمبر ۲۰۲۱ء

amaratِ اسلامی افغانستان کی حمایت و تعاون کی طرف ملک کے دینی و سیاسی حلقوں کو توجہ دلانے کی مہم محمد اللہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں لاہور میں مختلف مکاتب فکر کا پہلا اجلاس متحده علماء کو نسل کے سربراہ مولانا عبد الرؤوف ملک کی دعوت پر ۲۸ اکتوبر کو آسٹریلیا مسجد میں ہوا تھا، اس کے بعد جمعیت علماء اسلام پاکستان (س) کے سیکرٹری جزل مولانا عبد الرؤوف فاروقی کی دعوت پر دوسرا اجلاس ۱۸ دسمبر کو مسجد خضراء میں منعقد ہوا، اور تیسرا اجلاس جمعیت علماء پاکستان کے مرکزوی راہنماء مولانا قاری زوار بہادر کی دعوت پر ۲۲ دسمبر کو جامعہ محمدیہ رضویہ لگبرگ میں ہوا۔ جبکہ ۵ دسمبر کو جامعہ انوار القرآن کرچی اور ۷ دسمبر کو جامعہ رحمانیہ ہمک اسلام آباد میں پاکستان شریعت کو نسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے

والے اجتماعات بھی اسی تسلسل کا حصہ ہیں اور ان اجتماعات کا سلسلہ ملک کے مختلف شہروں میں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۲۲ دسمبر کے اجلاس کے حوالے سے جمیعت علماء پاکستان کی جاری کردہ روپرٹ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، ملک بھر کے دینی احباب سے گزارش ہے کہ اس تسلسل کو قائم رکھنے اور اس میں وسعت کیلئے سرگرمی کے ساتھ ہر سطح پر محنت کریں تاکہ ہم افغان بھائیوں کی بروقت اور موثر امداد و حمایت کیلئے اپنی ملی و دینی ذمہ داری صحیح طور پر ادا کر سکیں۔

”ملک بھر کی نمائندہ مذہبی، سیاسی جماعتوں کا ایک اہم اجلاس جمیعت علماء پاکستان کے سینئر رہنماء علامہ قاری محمد زوار بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا، اجلاس میں جمیعت علماء پاکستان، جماعت اسلامی پاکستان، جمیعت علماء اسلام (س)، جمیعت علماء اسلام (ف)، پاکستان شریعت کونسل، مرکزی جمیعت الہدیث، مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام پاکستان، اسلامی جمہوری اتحاد، تحفظ ناموس رسالت مجاز سمیت دیگر مذہبی و سیاسی جماعتوں کے قائدین ڈاکٹر فرید احمد پر اچہ، مولانا عبد الرؤوف فاروقی، مولانا حافظ زبیر احمد ظہیر، مولانا محمد امجد خان، مولانا زاہد الرashدی، مولانا عبد الرؤوف ملک، مولانا محمد علی نقشبندی، حاجی عبد اللطیف چیمہ، مولانا محمد الیاس چنیوٹی (ایم پی اے)، ڈاکٹر شمس الرحمن شمس، حافظ نصیر احمد نورانی، مفتی تصدق حسین، رشید احمد رضوی، مولانا عبد الخالق ہزاروی، قاری جیل الرحمن اختر، مولانا محمد سلیم اعوان، مفتی شاہد عبید، مولانا مجیب الرحمن النقابی، مولانا یاسر رضوان سمیت دیگر رہنماؤں نے شرکت کی۔

ملک بھر کی دینی و سیاسی جماعتوں نے کہا ہے کہ پاکستان میں افغانستان کی صورتحال پر ادائی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کا اجلاس منعقد ہونا خوش آئندہ اقدام ہے، جس میں مسلم ممالک کی طرف سے افغانستان میں خوراک کی قلت، اشیائے خوردنوش کا نقدان ختم کرنے سے متعلق اہم اقدامات قبل تعریف ہیں۔

اجلاس میں کہا گیا کہ حکومت پاکستان اقوام عالم کا انتظار کیے بغیر امارتِ اسلامی افغانستان کو فوری تسلیم کرے۔

اجلاس میں امریکی حکومت اور اقوام عالم سے مطالبہ کیا گیا کہ امریکہ سمیت تمام دیگر ممالک اور مالیاتی ادارے افغانستان کے مجدد فنڈ فووی بحال کریں تاکہ افغان عوام اپنی مشکلات پر قابو پاسکیں۔

اجلاس نے ادائی سی سمیت دیگر اسلامی تنظیمات اور اسلامی ممالک سے مطالبہ کیا کہ وہ جتنا جلد ممکن ہو سکے افغان عوام کی مشکلات کو ختم کرنے کیلئے اقدامات کریں اور امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم

کرنے کا فوری طور پر اعلان کریں۔

اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ۲۶ دسمبر جمعۃ المبارک کو یوم افغانستان منایا جائے گا۔ ملک بھر کے خطباء اور ائمہ اسلامی ممالک سمیت اقوام عالم سے امارت اسلامی افغانستان کو فوری تسلیم کرنے کا مطالبہ کریں گے۔

اجلاس میں علامہ قاری محمد زدار بہادر کی سربراہی میں ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی جو اسلامی ممالک اور اسلامی تنظیمات سے رابطہ کے انہیں افغان عوام کی مشکلات سے آگاہ کرے گیا اور امریکہ سمیت دیگر ممالک کو خطوط ارسال کرے گی۔ یہ کمیٹی ابتدائی مشاورتی اجلاس ۲۶ دسمبر کو لاہور میں منعقد کر رہی ہے۔ اجلاس میں بھارتی حکومت کی طرف سے مقبوضہ کشمیر کے عوام پر ظلم و بربریت اور اسرائیل کی طرف سے فلسطینی عوام پر ظلم کی شدید مدت کی گئی۔

اجلاس میں بڑھتی ہوئی مہہگانی کی شدید مدت کرتے ہوئے اشیائے خورد و نوش، پژو و لیم مصنوعات کی تیموں میں ہوش رہا اضافہ، بچل اور گیس کی تیموں میں اضافے کو فوری طور پر واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا۔

## "عشرہ یکجہتی افغانستان" کا لائحہ عمل

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۰ دسمبر ۲۰۲۱ء

پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا مفتی محمد رویس خان الیوبی نے نئے عیسوی سن کا آغاز "عشرہ یکجہتی افغانستان" کے عنوان کے ساتھ کرنے کا اعلان کیا ہے جس کیلئے کونسل کا اعلامیہ درج ذیل ہے:

- دنیا کے تمام ممالک، بالخصوص مسلم حکومتیں اور حکومت پاکستان امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو باضابطہ تسلیم کرنے کا فوری اعلان کریں۔
- امریکہ اور دیگر مغربی قوتوں افغانستان کے مخدود فنڈز اور اشائے بحال کریں اور ان پر عائد پابندیاں ختم کریں۔
- افغانستان کی وحدت و خود مختاری اور افغان قوم کے عقیدہ اور تہذیبی روایات کا احترام کیا جائے۔
- کسی قسم کی بیرونی مداخلت اور دباؤ کے بغیر افغان قوم کو اپنے ملک کا نظام اپنے عقیدہ و ثقافت کی بنیاد پر از خود طے کرنے کا آزادانہ حق دیا جائے۔
- چار عشروں کی طویل جنگ سے پہلیے والی تباہی کے بعد افغانستان کی تعمیر نواور با وقار افغان معاشرہ کی بحالی کیلئے غیر مشروط طور پر بھر پورا مدد مہیا کی جائے۔
- امیر محترم کے اس اعلان کے حوالے سے احباب کو اس سلسلہ میں کرنے کے ضروری کاموں کی طرف توجہ دلانا

چاہتا ہوں:

1. پاکستان شریعت کو نسل کے تمام احباب اپنے معمولات و مصروفیات کی ترتیب پر نظر ثانی کر کے ان دس دنوں میں اس کام کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کریں اور دیگر ہم خیال جماعتوں کے ذمہ دار حضرات کو بھی تو جہ دلکراں کام میں شریک کریں، نیز فوری طور پر باہمی مشاورت کے ساتھ ترتیب طے کر لیں۔
2. اپنے اپنے حلقوں کا رہنمای علامہ کرام، دینی و سیاسی کارکنوں، تاجر رہنماؤں، قانون دان حضرات، اساتذہ اور دیگر طبقات سے افغانستان کے حوالے سے پاکستان شریعت کو نسل کے موقف اور مطالبات پر دخنخت حاصل کریں۔
3. اس دوران اپنے حلقة کے ایم این اے اور ایم پی اے حضرات سے وفد کی صورت میں ملاقات کر کے ان تک یہ مطالبات پہنچائیں اور انہیں اس بھی میں اس کیلئے آواز اٹھانے پر آمادہ کریں۔
4. اخباری نمائندوں اور سوشل میڈیا پر متحرک گروپوں اور شخصیات کو ان مطالبات کی حمایت کیلئے تیار کریں۔
5. جہاں اور جس درجہ میں علامہ کرام اور دینی و سیاسی کارکنوں کے مشترکہ اجتماعات کا اہتمام کیا جاسکے ان کا انعقاد کریں اور ان کی روپرٹس اخبارات اور سوشل میڈیا کے ذریعے عام کریں۔
6. سات جوئی کو جمعۃ المبارک کے اجتماعات میں اس موضوع پر گفتگو اور مطالبات کی حمایت کیلئے خطباء کرام اور علماء کرام کو توجہ دلائیں۔
7. تاجر اور مخیر حضرات کو اپنے افغان بھائیوں کی امداد و تعاون کی طرف توجہ دلائیں اور پاکستان شریعت کو نسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا عبدالرؤف محمدی کے ذریعے اس سلسلہ میں کام کرنے والے حضرات سے ان کا رابطہ کرائیں۔
8. دانشور اور کالم نویس دوستوں سے ملاقاتیں کر کے انہیں ان مطالبات کی حمایت کی طرف توجہ دلائیں۔
9. اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام مختلف گروپ بنانے کے سفارتخانوں سے رابطہ کریں اور ان تک یہ موقف اور مطالبات باضابطہ طور پر پہنچائیں۔
10. اور سب سے اہم کام یہ ہے کہ دینی اجتماعات بالخصوص نمازوں کے بعد دعا کا بطور خاص اہتمام کریں کہ اللہ رب العزت ہمارے افغان بھائیوں کو اس بحران سے جلد از جلد نجات عطا فرمائیں اور ”امارتِ اسلامی افغانستان“ کو افغانستان کی تعمیر نو اور اسے صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلامی ریاست بنانے کے موقع، توفیق اور قبولیت سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## سودی نظام اور مسلم ممالک

مابنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۲۲ء

روزنامہ اسلام لاہور ۲۰۲۱ دسمبر کی ایک خبر ملاحظہ فرمائیں:

”انقرہ (مانیٹر نگ ڈیک) ترک صدر رجب اردوان نے شرح سود میں اضافے سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں وہ کروں گا جو دین کہے گا۔ غیر ملکی خبر سماں ایجنسی کے مطابق ترک صدر رجب طیب اردوان نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مجھ سے شرح سود میں اضافے کی کوئی امید نہ رکھی جائے کیونکہ ایک مسلمان ہونے کے ناتے میں اسلامی تعلیمات کے تحت کام کرتا رہوں گا۔ واضح رہے کہ ترکی کی کرنی لیرا میں گراوٹ ہو رہی ہے اور ان حالات میں ترک صدر سے شرح سود میں اضافے کا مطالبہ کیا گیا تھا جس پر انہوں نے اعلان کیا ہے کہ شرح سود میں اضافہ نہیں ہو گا۔ ترک صدر کی جانب سے نئے مالیاتی نظام کے اعلان کے بعد دم توڑتے لیرا نے اپنی پرواز پکڑ لی ہے۔ ترک صدر کی جانب سے بینکوں میں پڑے ترک لیرے کی قدر و قیمت کی گارنٹی کا اعلان کیا گیا تھا جس کے بعد صرف چند گھنٹوں میں لیرا کی قدر میں ڈالر کے مقابلہ میں بین فیصد سے زائد اضافہ ہو گیا۔ ترک صدر کی نئی مالیاتی پالیسی کے تحت اکاؤنٹ ہولڈرز کو لیرا میں کرنی رکھنے پر ڈالر ایکچھی ریٹ پر تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ ترک لیرا کی ڈالر کے مقابلہ میں گراوٹ کو بینک کو رکھنے گے اور بینک ڈیپاٹ تاریخ کے مطابق فرق اکاؤنٹ ہولڈرز کو دیا جائے گا۔“

سود کے بارے میں اس بات پر اب ماہرین کام و بیش اتفاق دکھائی دے رہا ہے کہ سودی معیشت دنیا کے معماں نظام اور ماحول میں عدم توازن اور افراط و تنفسی کا باعث بنی ہے جس کی وجہ سے غریب اور امیر اقوام و ممالک اور طبقات میں تفاوت بڑھتا جا رہا ہے، جس کا حل سودی سسٹم کو یورپ گیرنگ کے نئی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ ورلڈ بینک کے ایک سابت ڈائریکٹر کے انت روایو کے حوالے سے ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں کہ معیشت میں ہوش برداشت کو ختم کرنے اور توازن پیدا کرنے کیلئے ان کے خیال میں شرح سود کو مم کرنا ضروری ہے جو انہوں نے ایک سوال کے جواب میں ”زیرہ“ بتائی تھی۔

اس کے ساتھ ہی سودی نظام غریب اقوام و ممالک کو عالمی استعماری قتوں کے معماں شکنجے میں جگڑنے کا ایک مکروہ جال بھی ہے جس کے ذریعے غریب ممالک کو استعماری پالیسیوں کے سامنے سر نذر ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی تازہ ترین مثال افغانستان ہے جس سے فوجی اخلاصے قبل امریکہ نے اس بات کا اہتمام کر لیا تھا کہ خود اس کے دور کے ملاز میں کی آٹھ ماہ کی تجوہیں واجب الادا تھیں جبکہ افغانستان کی مغربی بینکوں میں پڑی رقوم کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اور امارت اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم نہ کر کے افغانستان کیلیے یورپی تعاون و امداد کے قانونی ذرائع مسلسل بند رکھے جا رہے ہیں۔ جس کا اس کے سو اکیا مطلب ہو سکتا ہے کہ افغان قوم کی ہر طرف سے معماں جگڑندی کر کے اسے امریکہ اور یورپی

یونین کے عالمی اور علاقوائی ایکٹنٹ کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے جس میں عقیدہ و ثافت سے دستبرداری بھی شامل ہے۔ یہی حرہ اسلامی جمہور یہ پاکستان سمیت بہت سے مسلم ممالک کے خلاف ایک عرصہ سے آزمایا جا رہا ہے اور خود تک بھی کم و بیش پون صدری تک اس جال میں رہ چکا ہے۔

بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم نے اسی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اپنی وفات سے چند ہفتے قبل یہ ہدایت کی تھی کہ پاکستان کامعاشر نظام مغربی فلسفہ اور اصولوں پر نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات پر استوار کیا جائے۔ اور اس موقع پر انہوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ مغربی معاشری نظام نے انسانیت کو تباہی اور جنگوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ مگر قائدِ اعظمؑ کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمارے ارباب حل و عقدنے ملک کے معاشری نظام کو مغربی فلسفہ اور عالمی اداروں کے کنٹرول میں دے دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ ہم بحیثیت قوم عالمی مالیاتی اداروں باخصوص آئی ایم ایف کے آگے ”ملک ٹک دیم دم نہ کشیدم“ کی تصوری بنے ہوئے ہیں اور گورنر بخوبی کے بقول آئی ایم ایف نے قرضوں کے عوض ہم سے ہمارا سب کچھ لکھوا لیا ہے۔

عالمی مالیاتی اداروں اور مغرب کے معاشری نظام کے شکنجه سے نکلنے کی بات اس سے قبل ملائیشا کے سابق وزیر اعظم مہاتیر محمد بھی کرچکے ہیں اور جس کیلئے انہوں نے طریق کار اور ترتیب بھی پیش کی تھی مگر مسلم حکومتوں نے اس طرح توجہ دینے کی رسمت نہیں کی۔ اور اب اس تناظر میں ترک صدر رجب طیب اردوان نے سودی نظام کی خرابیوں کی طرف اسلامی تعلیمات کے حوالے سے توجہ دلائی ہے جو پورے عالم اسلام خصوصاً مسلم حکومتوں کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب کے معاشری نظام کی تباہ کاریوں اور اسلام کے معاشری اصولوں کی افادیت کے بارے میں قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم، ڈاکٹر مہاتیر محمد اور ترک صدر رجب طیب اردوکان کی باتوں کی طرف توجہ دیے بغیر ہمارے لیے اب اور کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ جس کی مسلم دنیا کے حکمران طبقات سے توکوئی توقع دکھائی نہیں دے رہی مگر کیا رہا بُل فرود انش اور اصحاب دین و شریعت بھی ملک و ملت اور دین و دانش کے اس ناگزیر تقاضے کو یکسر نظر انداز کر دینے کا فیصلہ کرچکے ہیں؟ اور کیا یہ بدستمی کی انتہا نہیں ہے؟

## افغان عوام کے ساتھ یکجہتی کی مہم

روزنامہ اسلام، لاپور --- ۱۲ جنوری ۲۰۲۲ء

پاکستان شریعت کو نسل کی طرف سے افغان عوام کے ساتھ بیکھڑی و ہم آئندگی کے اظہار کیلئے ”عشرہ بیکھڑی افغانستان“ منانے کا اعلان کیا گیا تھا جو دس جنوری کو مکمل ہو گیا ہے جبکہ امیر محترم مولانا مفتی محمد رویس خان الیوبی نے یہ سلسلہ جنوری کے آخر تک جاری رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں مرکوزی سیکرٹری اطلاعات کی طرف سے جاری کردہ اعلان درج ذیل ہے۔

”پاکستان شریعت کو نسل کے امیر مولانا مفتی محمد رویس خان الیوبی نے ”عشرہ بیکھڑی افغانستان“ کے

دوران افغان عوام کے ساتھ بھیتی کے اظہار کیلئے پاکستان شریعت کو نسل کے رہنماؤں اور کارکنوں کی مسلسل محنت اور مختلف دینی و سیاسی حلقوں کی طرف سے حمایت پر اطمینان کا اظہار کیا ہے اور ایک بیان میں کہا ہے کہ مسلسل بارشوں اور موسمی خرابی کے باوجود یہ مم افغان عوام کے ساتھ پاکستانی عوام اور دینی حلقوں کی ہم آہنگی کی علامت ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ جمعیت علمائے اسلام پاکستان (مولانا اسمیح الحق گروپ) نے اس مسئلہ پر کا جنوری کو اسلام آباد میں کل جماعتی سربراہی اجلاس طلب کر لیا ہے۔ پاکستان شریعت کو نسل کی توجہ دلانہم کا مقصد بھی یہی ہے کہ ملک کی دینی و سیاسی جماعتیں اس طرف سنجیدہ توجہ دیں اور ”امریت اسلامی افغانستان“ کی حکومت کو تسلیم کرانے، مغربی ملکوں میں محمد افغانستان کے اٹاٹوں کی بحالی، اور افغانستان کی تعمیر نو میں غیر مشروط تعاون کو اپنے ایکبندے میں شامل کریں۔

مولانا قاضی رویس خان ایوبی نے کہا ہے کہ اگرچہ عشرہ بھیتی افغانستان ۱۰ جنوری کو کامل ہو چکا ہے مگر ہم اس مہم کو مسلسل جاری رکھیں گے جس کیلئے ملک بھر میں جماعتی کارکنوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ پورا مہینہ یہ مم جاری رکھیں اور اس دوران مختلف طبقات کے رہنماؤں سے مطالبات کی حمایت میں دستخط کرنے کے علاوہ وکلاء، تاجروں، ڈاکٹر حضرات اور دیگر طبقات کی تنظیموں سے رابطہ کر کے قراردادیں منظور کریں۔ اور اس آواز کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنے کی کوشش کریں کہ امریت اسلامی افغانستان کی حکومت کو فوری طور پر تسلیم کیا جائے، مغربی ممالک افغانستان کے محمد فنڈزار اٹاٹے بحال کریں، اور موجودہ سینگین معاشی بحران میں افغان عوام کو ہر قسم کی امداد غیر مشروط طور پر مہیا کی جائے۔

انہوں نے پاکستان شریعت کو نسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا عبد الرؤوف محمدی کے سربراہی میں اسلام آباد میں افغانستان کے حوالے سے پاکستان شریعت کو نسل کی ملک گیر سرگرمیوں کو مربوط کرنے، دستخطوں کے ریکارڈ کو محفوظ کرنے اور افغان عوام کی امداد کیلئے مجاز اداروں کے ساتھ عوام کے مختلف طبقات کا رابطہ کرانے کیلئے ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جس میں مولانا محمد رمضان علوی، مولانا شاء اللہ غالب، مولانا حافظ علی محی الدین، سعید احمد اعوان اور مفتی محمد سعد سعدی شامل ہیں۔

عشرہ بھیتی افغانستان کے دوران ملک کے مختلف حصوں میں احباب نے خاصی محنت کی ہے اور سرکردہ حضرات کی طرف سے اس مم کی حمایت میں تائیدی دستخط اور بیانات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو مسلسل بارشوں کے باوجود خاصی حوصلہ افزاری ہے، اس کی تفصیلی روپت جنوری کے اختتام پر جاری کی جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ، سردست دوام پاؤں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

انٹریشنل نبوت مودمنٹ پاکستان کے امیر اور بینجا بمبی کے رکن مولانا محمد الیاس چنیوٹی نے نہ صرف اس

جدوجہد کی حمایت کا اعلان کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ انہوں نے پنجاب اسمبلی میں ان مطالبات کی حمایت میں قرارداد کیلئے تجویز بات قاعدہ جمع کرداری ہے۔ اس کے علاوہ پتوکی بار ایسوی ایشن اور ٹوبہ ٹیک سنگھ ڈسٹرکٹ بار ایسوی ایشن نے بھی ان مطالبات کی حمایت کی ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ بار کی قرارداد کا تمن درج ذمہ ہے:

”ڈسٹرکٹ بار ایسوی ایشن ٹوبہ ٹیک سنگھ حکومت پاکستان و دیگر اسلامی ممالک سے مطالبہ کرتی ہے کہ افغانستان میں خوراک کے بحران کو مد نظر رکھتے ہوئے اور انسانی حقوق و ہمدردی کا خیال کرتے ہوئے افغان حکومت اور عوام کی فوری مدد کریں اور انسانی جانوں کو بچانے میں معاون ہوں۔ نیز یہ کہ حکومت پاکستان ایک آزاد اور خود منختاریاست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے افغان حکومت کو تسلیم کرے۔ یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ نیٹو اور امریکہ افغانستان کے ضبط کئے گئے اثاثے فی الفور بحال کریں تاکہ لاکھوں افغان مرد، عورت، بچے اور بوڑھے دوائیوں اور خوراک کی عدم دستیابی سے لقمة اجل بننے سے نجسکیں۔ ڈسٹرکٹ بار اس بات پر زور دیتی ہے کہ یہ موقع ہے کہ دنیا افغان حکومت اور عوام کی مدد کر کے ان کوین الاقوامی قوئین اور سلامتی کیلئے پابند بنانے کی خاطر ساتھ لے کر چلے۔ نیز ڈسٹرکٹ بار ایسوی ایشن ٹوبہ ٹیک سنگھ اس سلسلہ میں پاکستان شریعت کو نسل کے تمام مطالبات کی حمایت و تائید کرتی ہے۔“

اس تناظر میں پورے ملک میں پاکستان شریعت کو نسل سے وابستہ علماء کرام اور دینی کارکنوں کے ساتھ ساتھ اس کے مطالبات کی حمایت کرنے والے تمام سیاسی و دینی رہنماؤں اور کارکنوں سے گزارش ہے کہ وہ پاکستان شریعت کو نسل کے ساتھ تعاون کریں:

- دینی و سیاسی رہنماؤں مطالبات کی تائید میں بیانات جاری کریں۔
- وکلاء بار ایسوی ایشن کے فورم سے اس کی حمایت کریں۔
- تاجر تقطیعیں حمایت کے ساتھ ساتھ عملی امداد کیلئے اس سلسلہ میں قائم کی جانے والی ”اسلام آباد کمیٹی“ سے رابطہ کریں۔
- علماء کرام خطبات جمہ میں افغان بھائیوں کے ساتھ بیکھنی کا مسلسل اظہار کریں۔
- پرنٹ اور الکٹرونک میڈیا کے دوست اس آواز کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک مؤثر انداز میں پہنچانے کا اہتمام کریں۔

تاکہ ہم سب مل کر اس نازک وقت اور سنگین بحران میں اپنے افغان بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم نہ کرنے کی اصل وجہ

۱۶ جنوری ۲۰۲۲ء کو جامعہ اسلامیہ محمدیہ فیصل آباد

میں خطاب

روایتِ تعلیمی سال کے دوران میرا معمول چلا آرہا ہے کہ بدھ کے روز جامعہ اسلامیہ محمدیہ فیصل آباد میں ظہرتا مغرب حاضری دیتا ہوں، دورہ حدیث کے طلبہ میں بخاری شریف اور حجۃ اللہ البالغۃ کے منتخب ابواب کا سبق ہوتا ہے، اور عصر کے بعد مسجد میں مختصر عمومی بیان ہوتا ہے۔ ۱۲ جنوری کو پاکستان شریعت کوئل فیصل آباد کے احباب نے سرکردہ علماء کرام کو بھی اس موقع پر دعوت دے رکھی تھی اس لیے افغانستان کی تازہ ترین صور تحال اور دینی عقائد کی ذمہ داری کے عنوان پر گفتگو ہوئی، اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد لله وصلۃ۔ افغانستان کی صور تحال یہ ہے کہ امریکہ اور نیویکی افواج کو اپنی ناکامی کے اعتراف کے ساتھ وہاں سے واپسی کو کچھ عرصہ گزر جا رہا ہے، امارتِ اسلامی افغانستان نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے جسے پورے افغانستان میں کثری و حاصل ہے، امن و امان کی صور تحال میں میں سے کہیں بہتر ہے، اور منے حکمران بار بار کہہ رہے ہیں کہ انہیں موقع دیا جائے وہ دنیا اور عالمی ماحول کے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہیں مگر اس کیلئے ضروری ہے کہ انہیں وقت دیا جائے تاکہ وہ افغان قوم کے تمام طبقات کو اعتماد میں لے کر اپنا نظام طے کر سکیں اور چار عشروں کی طویل اور خوفناک جنگ کے اثرات کو سیلٹتے ہوئے افغان عوام کے عقیدہ و ثقافت کی بنیاد پر مستقبل کی نقشہ بندی کر سکیں۔

مگر دوسری طرف صور تحال یہ ہے کہ ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا جا رہا بلکہ معاشری بحران اور سیاسی دباؤ کے ذریعے پیشگوی شرائط کے ساتھ انہیں نکست خورده قوتوں کے ایجاد نے کے مطابق افغانستان کے مستقبل کا نظام تکمیل دینے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلم حکومتیں بھی اس معاملہ میں افغان بھائیوں کا ساتھ دینے کی بجائے مغربی قوتوں کیلئے سہولت کا ری کاماحول قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اس معاملہ میں یہ پہلو بطور خاص قابل توجہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی افغان اسٹیبلشمنٹ کی اپنے دور کی آٹھ ماہ کی تجویزیں نئی حکومت کے ذمہ واجب ادا چھوڑ کر گئے ہیں، افغانستان کے اثنائے بہت سے مغربی ملکوں میں مجدد کر دیے گئے ہیں، اور افغانستان کی حکومت کو تسلیم نہ کر کے دنیا بھر میں ان کے ہمدردوں اور بی خواہوں پران کی امداد و تعاون کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ جسے میں یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ افغان قوم اس وقت شعب ای طالب میں محصور ہے اور ان کی مخالف اقوام و ممالک نے ان کے معاشر بائیکاٹ کا غیر اعلانیہ معاهدہ کر رکھا ہے جس پر سختی سے عملدرآمد کیا جا رہا ہے، حتیٰ کہ جو تھوڑی بہت مدد وہاں جا رہی ہے وہ بھی محاصرہ کرنے والوں کی مرضی اور طریق کار پر موقوف ہے۔

بعض دوست سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے اور خاص طور پر مسلمان ممالک ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس سوال کو سمجھنا ہم سب کیلئے ضروری ہے اور اس کا حقیقت پسندانہ جواب تلاش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ میرے خیال میں

اصل بات یہ ہے کہ سیکولر عالمی قوتوں نے یہ دیکھ کر کہ امت مسلمہ اسلام سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی طرح نہ ہب کو ذاتی اور اختیاری دائرے میں شامل کر لینے پر آمادہ نہیں ہے، انہوں نے یہ بات حتیٰ طور پر طے کر لی ہے کہ مسلمانوں کا اسلام ”شریعت لیس“ ہونا چاہیے یعنی وہ قرآن و سنت کے شرعی احکام و قوانین کے نفاذ کو اپنے ممالک میں ضروری نہ سمجھیں بلکہ اس حوالے سے باقی دنیا کے سیکولر ایجنسیز سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ جس پر مسلم دنیا کے مقندر حلقے تو شریعت کے بغیر اسلام کو عملاً قبول کر پکے ہیں گرے عالم اسلام بحیثیت امت اس کیلئے تیار نہیں ہے۔ شریعت کے احکام و قوانین پر عمل نہ کر سکنا الگ بات ہے اور احکام شریعت سے دستبرداری اس سے مختلف چیز ہے۔ یہ اصل کشمکش ہے جس میں عالمی سیکولر طاقتیں ایک طرف ہیں عالم اسلام کی رائے عامہ دوسرا طرف ہے۔ جبکہ مسلم دنیا کے برسر اقتدار حلقے اپنی پالیسیوں اور طریقے کار کے حوالے سے عالمی طاقتوں کے کیمپ میں دکھائی دے رہے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے اسلام کے دینی حلقے اور دینی مدارس و مرکز بھی سیکولر حلقوں کی طمعہ زندی اور کردار کشی کا ہر سطح پر صرف اس لیے مسلسل نشانہ بنے ہوئے ہیں کہ ان کے خیال میں عام مسلمانوں کی شرعی احکام کے ساتھ کمٹنٹ اور واپسی کا باعث یہ دینی حلقے اور مدارس و مرکز ہیں۔

اس پس منظر میں امرت اسلامی افغانستان اور افغان عوام بھی اسی منطقی طرز عمل کا نشانہ بنے ہوئے ہیں حتیٰ کہ چار عشروں کی طویل جنگ سے تباہ شدہ افغان معاشرہ اور قحط و افلاس کا شکار افغان قوم کو موجودہ معاشی بحران میں انسانی بینادوں پر غیر مشروط امداد و تعاون کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے جو بیک میلنگ کی بدترین شکل ہے۔ ان حالات میں پاکستان کے تمام طبقات بالخصوص علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ دینی ذمہ داری اور قبرو حشر میں جوابدی کو سامنے رکھتے ہوئے مظلوم افغان بھائیوں کی جو کچھ بھی ہو سکے امداد کریں جس کی معروضی صورتحال میں عملی صورت یہ ہے کہ:

- امرت اسلامی افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرنے کے مطالبہ کو زیادہ سے زیادہ منظم کیا جائے اور ہر سطح پر آواز بلند کی جائے۔

- قانونی اور اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے ان کی ہر ممکن مالی مدد اور معاشی تعاون کا اہتمام کیا جائے۔
- دنیا پر واضح کیا جائے کہ مغربی ممالک میں افغانستان کے مخدداشاوں کی فوری بحالی اور موجودہ معاشی بحران میں افغان قوم کی مدد کا غیر مشروط ہونا بھی انسانیت کا تقاضہ ہے۔
- اور اپنے افغان بھائیوں کیلئے بارگاہ ایزدی میں دعاوں کا اتزام کیا جائے کہ اللہ رب العزت انہیں اس آزمائش اور امتحان میں بھی سرخوبی سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

## مسلم وزراء خارجہ کو اسلام آباد میں خوش آمدید

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ مارچ ۲۰۲۲

مسلم ممالک کے وزراء خارجہ کی اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں آمد شروع ہو گئی ہے جہاں ۲۳ مارچ کو ان کے دورانہ اجلاس کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ ہم اپنے معزز مہماں کو خوش آمدیدی اور اہلاؤ سہلاؤ مر جبا کہتے ہوئے اس اجلاس کے حوالے سے چند معروضات ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

مسلم ممالک کے باہمی تعاون کے فورم اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کا وجود تمام ترقیات کے باوجود اس لحاظ سے بہر حال غنیمت اور حوصلہ افزایہ کہ مسلم ممالک کے حکمران و قاتوفقاٹ میٹنگ کر اپنے مسائل اور عالم اسلام کی مشکلات پر کچھ نہ کچھ غور کر لیتے ہیں اور موقف کا بھی اظہار کرتے ہیں جس سے اس حد تک اطمینان ضرور ہو جاتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کی صفائی میں ان مسائل و مشکلات کا احساس موجود ہے اور امید رہتی ہے کہ یہ احساس کبھی نہ کبھی اور اسکے پیشافت کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس حوالے سے عالم اسلام کی اصل ضرورت کیا ہے؟ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ہمیں پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظر بھومن حومہ کا وہ تاریخی تبصرہ یاد آ جاتا ہے جب انہوں نے بوسینا اور سربیا کی کشش کے دوران مسلمانوں کے قتل عام کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی بے بُی کا اظہار کیا تھا کہ

”اب توکوئی اوتومان لیمسپار (خلافتِ عثمانیہ) بھی نہیں ہے جس کے سامنے ہم اپنے دکھوں کارونارو سکیں۔“

یہ بے بُی آج بھی قائم ہے جس کی تازہ ترین صورت آج ہی کے اخبارات میں دیکھی جا سکتی ہے کہ شام کے صدر نے متحده عرب امارات کا دورہ کیا ہے جو امریکہ بہادر کو پسند نہیں آیا اور اس نے حکم کھلا اس پر ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ گویا ایک مسلمان ملک کے حکمران کیلئے دوسرے مسلمان ملک کا دورہ کرنے سے قبل امریکہ بہادر کی رضا اور ناراضگی کو دیکھنا ضروری ہے۔

اور یہ بھی عالم اسلام کی اسی بے بُی کی ایک واضح شکل ہے کہ افغانستان سے امریکی اتحاد کی افواج اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے والپس جا بھی ہیں اور امریکہ اسلامی افغانستان نے ملک میں امن و اتحاد کو برقرار رکھنے کی مثال قائم کر دی ہے، مگر پاکستان سمیت دنیا بھر کے مسلم ممالک امریکہ اسلامی افغانستان کو تسلیم کرنے کیلئے امریکہ بہادر کی پیشانی کی سلوٹیں شمار کرنے میں مصروف ہیں اور اس کی طرف سے ”این او سی“ جاری ہونے کے انتظار میں ہیں۔

مسلم ممالک کے قابل صد احترام وزراء خارجہ کی خدمت میں ہم اس موقع پر پہلی گزارش یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا اصل مسئلہ عالمی دباؤ اور بیرونی مداخلت کے اس ماحول سے نکنا ہے اور اپنے فیصلے آزادانہ ماحول میں خود کرنے کا حوصلہ اور اختیار حاصل کرنا ہے۔ جس کے بغیر ہم عالم اسلام کے کسی مسئلہ کو حل کرنے کا کوئی مؤثر راستہ اختیار نہیں کر

سلکیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام آباد میں منعقد ہونے والی مسلم وزراء خارجہ کی یہ کانفرنس اس کا آغاز ”امارتِ اسلامی افغانستان“ کو تسلیم کرنے اور افغان قوم کی خود مختاری اور ان کے عقیدہ و ثقافت کی پاسداری کے مسلمہ حق کی حمایت کے اعلان کی صورت میں کر سکتی ہے جس کی ہم ان سے بجا طور پر توقع رکھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں دوسرا ہم ترین توجہ طلب مسئلہ دنیا بھر میں اسلاموفوبیا کے بارے میں اقوام متحده کی حاليہ قابل تحسین قرارداد کو دیگر قراردادوں کی طرح ”داخل دفتر“ کر دینے کی بجائے اس کی بنیاد پر ایک منظم اور مریوط مضمون چلانے کا ہے۔ جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی قوتلوں اور لاہیوں کے پھیلائے ہوئے گمراہ کن شکوہ و شبہات کو دور کرتے ہوئے خلافتِ راشدہ کی طرز پر اسلام کی صحیح اور متوازن تعلیمات اور کردار کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں مصروفِ عمل اسلامی نظریاتی حلقوں اور مرکز کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ روایتی سفارتی حلقوں، سیکولر لاہیوں اور این جی اوز وغیرہ کو اس مہم کا ذریعہ بنانے سے اسلاموفوبیا کی موجودہ صورتحال میں بچری آنے کی بجائے اس کے مزید بگڑنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

یہ خبر ہمارے لیے اطمینان کا باعث بنی ہے کہ اس کانفرنس کے اجنبیز میں مسئلہ کشیر بھی شامل ہے جو کشمیری عوام کے ساتھ ہونے والے مسلسل ظلم کے باعث ان کا اپنا حق ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری بھی ہے، اور اس سے مسئلہ کشیر کو عالمی سطح پر ایک بار پھر اجاگر کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ فلسطین، اراکان اور دیگر خطوں کے مسلمانوں کی مظلومیت اور ان کے حقوق کی پالی بھی مسلم وزراء خارجہ کی توجہات کی منتظر ہے۔ جبکہ معروضی صورتحال میں مسلم ممالک پر مغربی اداروں اور این جی اوز کی فکری اور تہذیبی یا غار انتہائی فکر اگیز اور توجہ طلب مسئلہ ہے۔ عالمی اداروں، بین الاقوامی لاہیوں، مغربی حکومتوں اور سیکولر این جی اوز کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے معاشرتی اور تہذیبی باخوص خاندانی نظام و ماحول میں قرآن و سنت کے صریح احکام و قوینیں سے دستبرداری کیلئے تیار کیا جائے، جس کیلئے پوری مسلم دنیا میں چند مخصوص حلقوں کے سواعلم اسلام کا کوئی طبقہ تیار نہیں ہے، اور یہ کشکاش دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

مسلم وزراء خارجہ کو ان مسائل کا نوٹس لیتے ہوئے قرآن و سنت کے ساتھ مسلمانوں کی کشمئٹ کا ساتھ دینا چاہیے اور مغربی دنیا کی استعماری قوتلوں کو واضح بیغاں دینا چاہیے کہ وہ ہمارے دینی، تہذیبی اور معاشرتی معاملات میں دخل اندازی کے طرزِ عمل پر نظر نہیں کریں۔ ان گزارشات کے ساتھ ہم مسلم وزراء خارجہ کی کانفرنس کی میاپی کیلئے دعاؤ ہیں اور اپنے تمام معزز مہماں کیلئے خیر سگالی اور محبت کے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں، آمین یارب العالمین۔

## سلامتی کونسل اور امارتِ اسلامی افغانستان

روزنامہ اسلام، لاپور— ۲۸ مئی ۲۰۲۲ء

ایک قومی اخبار نے ۲۶ مئی ۲۰۲۲ء کو یہ خبر شائع کی ہے:

”اقوامِ متحده کی سلامتی کو نسل نے افغانستان میں طالبان حکومت سے کھا ہے کہ وہ خواتین اور بچیوں کے بنیادی حقوق اور ان کی آزادی کو سلب نہ کرے۔ سلامتی کو نسل نے افغانستان میں خواتین اور بچیوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہ تعلیم، ملازمت، شخصی آزادی اور معاشرے میں انہیں مساوی حقوق کی عدم فراہمی عالیٰ برادری کی توقعات پر پورا نہیں اترتیں۔ خواتین کی دوی میزبانوں کو پھرے کا پردہ کرنے اور انہیں گھر سے بوقت ضرورت ہی باہر نکلنے جسی پانڈیاں باعث تشویش ہیں۔ لہذا طالبان حکومت کو چاہیے کہ وہ افغان خواتین اور بچیوں کے بنیادی حقوق کا حفاظت کرتے ہوئے ایسے تمام قوانین کو ختم کرے۔“

اس سے قبل امریکی حکومت کی طرف سے بھی اس قسم کی تنبیہ سامنے آچکی ہے اور اب اسی کو سلامتی کو نسل کی طرف سے جاری کیا گیا ہے جو اپنائی سنجیدگی کے ساتھ توجہ طلب ہے۔

بنیادی حقوق اور مردوں عورت کی مکمل معاشرتی مساوات کے حوالے سے ہم ان کالموں میں بیسوں مرتبہ اٹھاہار نتیاں کرچکے ہیں اور ہمارا یہ واضح نقطہ نظر ہے کہ بنیادی حقوق اور مردوں عورت کی مساوات کے حوالے سے موجودہ عالیٰ فلسفہ و نظام کے بارے میں مسلم دنیا کے تحفظات ہیں جن کا تعلق دین و مذہب کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت سے بھی ہے اور انہیں نظر انداز کرنا قرآن و سنت پر ایمان رکھنے والے کسی مسلمان کیلئے ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تحفظات و شکایات کا اٹھاہار دنیا کے کسی ایک نقطے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کے مسلمانوں کی طرف سے ان کا مسلسل اٹھاہار کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے مسلم حکمران بالخصوص اوائی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کے سابق سربراہ مہاتیر محمد بھی عالیٰ رائے عامہ کو اس طرف بارہا توجہ دلا چکے ہیں اور ان پر نظر ثانی کا مطالیب کرچکے ہیں۔

ہمارا موقف منحصر ہے کہ اقوامِ متحده کے عالیٰ منشور اور بہت سے بین الاقوامی معاهدات میں دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کے مجموعی عقائد اور تہذیبی روایات کو نظر انداز کر کے اس فلسفہ و نظام کی بنیاد صرف یورپ اور امریکہ کے معاشرتی پس منظر اور تجربات پر رکھی گئی ہے، جبکہ مشرقی دنیا بالخصوص مسلم معاشروں کا پس منظر اور تجربات اس سے قطعی مختلف ہیں۔ اور اس طرح مغرب یعنی امریکہ اور یورپ اپنی تہذیب و ثقافت کو اقوامِ متحده اور بین الاقوامی معاهدات کے عنوان سے باقی تمام دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہیں جو کسی طرح بھی قرینِ قیاس اور قابل قبول نہیں ہیں اور ان پر متعلقہ تمام فریقوں کو اعتماد میں لے کر نظر ثانی کرنا ضروری ہو گیا ہے جس کیلئے اقوامِ متحده اور اسلامی تعاون تنظیم دونوں کو کردار ادا کرنا ہو گا۔

مغرب اس معروضی حقیقت کا ادراک کرنے میں بلاوجہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہے کہ مسلم امہ دنیا کے کسی خط میں اپنے عقیدہ و ثقافت سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہے بلکہ مسلم عوام قرآن و سنت کے احکام و قوانین کو اپنے معاشرتی ماحول میں نافذ و جاری دیکھنا چاہتے ہیں۔ مغرب کا یہ مغالطہ ابھی تک دور نہیں ہو رہا کہ یورپ اور امریکہ کے لوگ اگر مذہب کے معاشرتی کردار سے دستبردار ہو گئے ہیں تو مسلمانوں کو بھی ایسا کرنا چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہو رہا اور نہ ہی

مستقبل میں اس کا کوئی امکان دکھائی دے رہا ہے۔ اس لیے مغرب کے پاس اس کے علاوہ اب کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ کم از کم مسلم دنیا کی حد تک ”مرغ کی ایک ٹانگ“ کی ضد ترک کر کے مسلمانوں کی قیادتوں کے ساتھ مذکورات کا راستہ اختیار کرے اور پوری دنیا پر اپنا سلطنت ہر قیمت پر قائم کرنے کی بہت دھرمی چھوڑ کر مسلم عقیدہ و ثقافت کا معاشرتی وجود و کردار تسلیم کرتے ہوئے عالمِ اسلام پر اپنا فکر و فلسفہ مسلط کرنے کے طرز عمل پر نظر ثانی کرے۔

ہمارے نزدیک امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم نہ کرنے اور انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی شرائط ہر صورت میں منوالینے کے موجودہ عالمی روایہ کے پیچھے بھی مغرب کی بھی ضد اور بہت دھرمی کار فرمائے ہے۔ جبکہ اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلم دنیا کے بیشتر حکمران اپنے دین و ایمان کے تقاضوں اور اپنے ملکوں کے عوام کے جذبات و احساسات کی پاسداری کرنے کی وجہے عالمی اجنبیتے کے عنوان سے مغربی فکر و فلسفہ کی بالادست کیلئے کام کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اقوامِ مختلفہ اور اس کی سلامتی کو نسل کے ساتھ ہیں الاقوامی ادaroں سے گزارش کریں گے کہ وہ زمینی حقائق کا ادراک کریں اور مسلم عقیدہ و ثقافت کو ایک زندہ معاشرتی حقیقت تسلیم کر کے اس کے ساتھ مقابہت اور مذکورات کا راستہ اختیار کریں۔ جبکہ مسلم حکمرانوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ بھی آنکھیں کھول کر اردو گرد کے ماحول کو سنبھلنے کی کوشش کریں اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ مسلم امہ کو دنیا میں کہیں بھی اپنے عقیدہ و ثقافت اور اسلام کے معاشرتی کردار سے دستبردار کرنا ممکن نہیں رہا۔ اور اس کیلئے عالمی فورم پر مسلم حکمران اپنے دین و عقیدہ اور مسلم امہ کی غالب اکثریت کے جذبات و احساسات کی ترجیحی کی ذمہ داری ادا کریں کہ مسلم ممالک کے حکمران ہونے کی وجہ سے ان کا فریضہ یہی بتنا ہے۔

دوسری طرف امارتِ اسلامی افغانستان سے بھی ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ تہذیبی ارتقا اور ہیں الاقوامی معابدات و مسلمات کو یکسر نظر انداز کرنا بھی قرینِ قیاس نہیں ہے۔ جناب بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب جاہلیت کی تمام روایات و اقدار کو یکسر مسترد کر دینے کی وجہے خدماء صفا و دع ما در کے اصول پر جو باتیں قابل قبول تھیں انہیں برقرار رکھا تھا، اور جو باتیں عقیدہ اور اصول کے منانی تھیں انہیں مسترد کر دیا تھا۔ آج بھی یہی اصول اختیار کرنا ہو گا کہ جو امور شرعی اجتہاد کے دائرہ میں قبول کیے جاسکتے ہیں ان کے بارے میں روایہ میں لچک پیدا کرنا ہو گی۔ ہمارتِ اسلامی افغانستان کے علماء کرام کو یاد لانا چاہیں گے کہ عرف و تعلال کا تغیر مسائل و احکام کے تغیر کا باعث بنتا ہے۔ حتیٰ کہ ”عوم بلودی“ بھی ان معاملات میں اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً عورت کے چہرہ کے پرده کے بارے میں ہی غور کر لیا جائے کہ احتفاظ متفقین کے ہاں چہرہ اور ہاتھ پر دہ میں شامل نہیں ہیں، جبکہ متاخرین نے بھی معاشرتی تغیرات کے باعث انہیں پرده میں شامل کیا ہے۔ یہ بات ہم نے مسئلہ اور فتویٰ کے طور پر نہیں بلکہ مثال کے طور پر ذکر کی ہے اور ہماری گزارش ہے کہ امارتِ اسلامی افغانستان کو

- مذہب اور ثقافت کے معاملات کو باہم گلڈم کرنے کی وجہے ہر ایک کو اسی کے دائرے میں ڈیل کرنا چاہیے۔
- اجتہاد کی شرعی حدود میں جن امور کی گنجائش بنتی ہے انہیں یکسر مسترد نہیں کرنا چاہیے، اور

- ایسے معاملات کو روایتی طرزِ عمل کی بجائے افغانستان اور عالمِ اسلام کی سرکردہ علمی شخصیات کی مشاورت سے طے کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ مسلم حکومتوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنے مغرب نوازی کے طرزِ عمل پر نظر ثانی کریں اور امارتِ اسلامی افغانستان کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی بھرپور سیاسی، اخلاقی اور معاشی امداد کا اہتمام کریں، جبکہ اس نازک مرحلہ میں امت مسلمہ کے سرکردہ علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی و فکری حوالے سے افغان قوم و قیادت کی معاونت اور راہنمائی کا کردار ادا کریں۔